



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before
taking it out. You will be res-
ponsible for damages to the book
discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No.

Acc. No.

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book
Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

11/11/08

11/11/08
+ 11/11/08
22/11/08

۵۲
 (۶۸۳)

این قرآن مجید است که در روز ۱۳۰۰ هجری قمری در کربلا
 اقامت یافت و در روز ۱۳۰۰ هجری قمری در کربلا



شانی



افشانه منبر



جرعات

نور ہے
ماہ شمس
درمخت

ہر سال سالی کے
ہیں ان کی قیت مستط
میں وہیں لی جاتی
ہیں کہ سالی کے

جلد ۱۶	ساقی دہلی - افسانہ نمبر بابت ماہ جو ۱۹۳۷ء	نمبر (۱)
نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون
(۱)	میر وادیس - ایسے ایسے نگہاری	مشت بد
(۲)	دعوت	امین خرمی اسپاگوٹی
(۳)	کھانی کی کہانی - یاد دلانے والے	جناب اشرف صہبوی دہلوی - مشت فاضل
(۴)	دربار کیری کی ایک جھلک	شمس العلامہ مولانا عبد الرحمن مظاہر - صدر شعبہ السنہ دلی یونیورسٹی
(۵)	ایک پُرانا زمانہ اور لوہے کو تھیں کی سیر	انصر اشعر - حضرت آغا شاعر قریشی
(۶)	جھنگ کا گارڈ	جناب بہزاد خٹائی کھنڈی
(۷)	خود بھی کی سیٹی	حضرت اسلم جیراجوری - استاد جامعہ ملیہ دہلی
(۸)	دلی جون بلی ہے	مصور قطرٹ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی
(۹)	فستانہ آواز	پروفیسر مرزا محمد سعید ایم۔ اے۔ بی۔ اے۔ ای۔ اے۔
(۱۰)	خرافات	جناب سید امتیاز علی تاج - بی۔ اے۔
(۱۱)	کپڑے نہ جاتے نام و نیت	امین خرمی اسپاگوٹی
(۱۲)	دہلوی	جناب ایم۔ اسلم
(۱۳)	شب گل	جناب کاوڈ
(۱۴)	الوہ	مصور
(۱۵)	میرا بیٹا محبوب	جناب صادر
(۱۶)	تعلیم زریعہ صہبوی	ک۔ ش۔
(۱۷)	اندھی محبت	نور محمد جناب امتیاز علی صاحب
(۱۸)	انٹ لٹ	جناب مرزا نعیم بیگ چغتائی
(۱۹)	محبت کی سلی علی	جناب علی منظور حیدر آبادی
(۲۰)	کھانی	پیم۔ محمد ادراس
(۲۱)	غلام دلی مشت	جناب اشرف صہبوی دہلوی
(۲۲)	پرویں	جناب بشیر نیازی
(۲۳)	ایک خط	جناب سید وزیر حسن دہلوی
(۲۴)	سیر راستہ	جناب تابش دہلوی

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۳۷)	کوکلا - - - - -	جناب ڈاکٹر اعظم کوہی۔ سابق اڈیر کبیر آباد - - -	(۱۵۳)
(۳۸)	اندھا بھکاری - - - - -	جناب اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے (علیگ) - - -	(۱۶۳)
(۳۸)	عقد مکتوبہ - - - - -	جناب ل۔ احمد اکبر آبادی - - -	(۱۶۷)
(۳۹)	دل جس کو پیار کرے - - - - -	جناب قسیمی رامپوری - - -	(۱۷۳)
(۳۰)	بسنو کو - - - - -	مختصر مسٹر برلاس (از جاپان) - - -	(۱۷۸)
(۳۱)	فرحت کا انجام - - - - -	جناب انصار ناصری۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی - - -	(۱۸۸)
(۳۲)	استقبال - - - - -	جناب فضل حق قریشی دہلوی - - -	(۱۹۷)
(۳۳)	سوئے کی تلوار - - - - -	جناب جسٹس بیج آبادی - - -	(۲۰۰)
(۳۴)	فیصلہ - - - - -	جناب خواجہ احمد عباس صاحب - - -	(۲۰۱)
(۳۵)	دلہن - - - - -	جناب ایم۔ اسلم - - -	(۲۰۷)
(۳۶)	بنارس چار پہلوں کے گھوڑے - - - - -	جناب جانی شاد حسین۔ (آخر علیگ) - - -	(۲۰۸)
(۳۷)	مشرقیوں کے گھوڑے - - - - -	جناب احمد علی ایم۔ اے - - -	(۲۰۹)
(۳۸)	صبر و جہد - - - - -	مس سرور علی رائی گھار - - -	(۲۱۲)
(۳۹)	گھوڑے کی پیٹ پر - - - - -	جناب طاہر قریشی۔ بی۔ اے - - -	(۲۱۵)
(۴۰)	کچھ بڑی آنکھیں - - - - -	جناب مسعود جاوید - - -	(۲۱۸)
(۴۱)	میرے جن کا اندھارا - - - - -	جناب ظفر قریشی۔ بی۔ اے دہلوی - - -	(۲۲۳)
(۴۲)	پریم کہانی - - - - -	جناب سائو جعفری۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی - - -	(۲۲۵)
(۴۳)	الستام - - - - -	جناب غلام عباس (مولوی) - - -	(۲۳۱)
(۴۴)	بلیک زور ہونٹ - - - - -	جناب سید بادشاہ حسن (حیدر آبادی) - - -	(۲۳۳)
(۴۵)	عفت کی فسخ - - - - -	مختصر صاحب محمد عابد حسین - - -	(۲۴۰)
(۴۶)	بنت البحر - - - - -	مختصر طاہرہ دیوی مشیر لڑی - - -	(۲۴۵)
(۴۷)	پا پریدہ - - - - -	جناب صلاح الدین قریشی دہلوی - - -	(۲۴۹)
(۴۸)	سجک کے گے کی بٹیا - - - - -	مشرقی تہی کلا دیوی چودھری - - -	(۲۵۵)
(۴۹)	انور محمد کھٹ - - - - -	جناب سید محمد حسن - - -	(۲۶۰)

ہمسائی بکٹ پویم ہر قسم کی علمی و ادبی کتابیں موجود رہتی ہیں اور جو کتابیں موجود نہیں ہوتیں وہ ہمت کر دی جاتی ہیں۔ سب کتابیں احتیاط سے کچی جاتی ہیں۔ آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو سائی بکٹ پوسٹ سے طلب کیجئے۔ کیونکہ کتابوں کی بکری سے جو قلیل منافع ہوتا ہے وہ سب سائی کی طباعت و اشاعت پر صرف کیا جاتا ہے۔ سائی کو کسی رسم کی سرپرستی کا فائدہ حاصل نہیں ہے۔ اس کے سرپرست وہ سب حضرات ہیں جو ادبی ذوق رکھتے ہیں اور سائی کے حامد رہتے ہیں۔

بیتہ الہی الخیر الخیر

نگاہِ اولیں

افسانے کا بنیادیک احوال ہونا چاہیے، واقعات و خیالات میں جامعیت ہونی چاہیے اور یہ ایسے گنبد سے ہوتے ہوئے چاہئیں کہ پچھلے دنوں کا خیال ان میں جذب ہو جائے۔ اگر افسانے میں ذہن کو اکٹھا کرنے کا وہ لطیف بھی ہو تو سونے پر سناگ کہجئے۔

پبلک کا مذاق بہت کچھ بدل گیا اور بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ بیس سال پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟ عوام میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے مذاق تیزی کے ساتھ دارج کے کچھ کچھ جاتا ہے۔ جذبات میں بے جا پیدائش والی بچن کہانیاں اب عام طور سے بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ آج کل کا پڑھنے والا خیالات کی گہرائی میں اترنے اور تجزیہ کرنے کا شوگر ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار کی شخصیت کا انقباض کرنے کے لئے بھی امان نظر نہیں آتا۔ بعض وہ کہانیاں جنہیں پڑھ کر اب سے ربع صدی پہلے کے پڑھنے والے ابدیدہ ہو جاتے تھے اب انہی کہانیوں کو پڑھ کر آج کل کے بعض پڑھنے والے رسائے کی کوشش پر قہقہے لگاتے ہیں۔ یقیناً تاریخ کا سوال نہیں ہے بلکہ عوام کے ادبی مذاق کی ترقی کا ثبوت ہے۔ اس ترقی یافتہ ذوقِ ادب کا لحاظ بطور خاص ہر افسانہ نگار کو رکھنا چاہیگا۔ امید ہے کہ نئے لکھنے والے حضرات، اگر ان امور کو پیش نظر رکھیں گے تو انہیں ادیبوں کے ظلم اور اپنی مظلومیت کا کچھ زیادہ شکوہ نہیں ہے گا۔

پیش نظر افسانہ نمبر میں مضمون نگار حضرات کی حمایت سے نہایت پابندیہ افسانے جمع ہو گئے ہیں۔ دلی ریڈیو اسٹیشن کے انگریز صاحب کے ہم منہ گزار ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مضامین کے شائع کرنے کی اجازت دی۔ ذرا بارگاہی کی ایک جھلک۔ ایک پرانا زمانہ۔ فائدہ آزا۔ غزالی کی بیٹی۔ خرافات اور فولاد و عشق۔ ان مضامین کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اے۔ آئی۔ آر۔ دلی سے کیسے کیسے پیش قیمت مضامین نشر کئے جاتے ہیں۔ اتنا کہ اس کا ہے کہ جو مضامین نشر کئے جاتے ہیں ان کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس وقت تک مغربی شاعر کا قلم یاد آتا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۸)

افسانہ نویسی و داستان سرائی کے متعلق آئے دن ایسے ایسے مضامین ہمارے رسالے میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن کے متعلق بھی اردو میں چند کثافاتیں موجود ہیں۔ ہمارے لئے لکھنے والے بالعموم یہ غلطی کرتے ہیں کہ بغیر کچھ معلومات حاصل کئے افسانے لکھنے شروع کر دیتے ہیں۔ فن کا تو ذکر ہی کیا، مشاہدہ ان کا سطحی اور تجزیہ نہیں باطل ہوتا نہیں۔ ذاتی واقعات تو یوں ختم ہوتی۔ اب رنگینا کی علم، تو انہیں رحمت مطالعہ گوارا نہیں۔ یوں مشاہدہ اور مطالعہ دونوں معدوم جب کہ اس اہتمام سے افسانے لکھے جائیں تو نتیجہ معلوم۔ اس پر ادیب کی سرورہری کا شکوہ اور اس کے غرور و پندار پر غم و غصہ کا اظہار مستحکم۔

ہم نے وہ لطیف اٹھائے ہیں کہ دل جاتا ہے پھر ادیب کی سے پوچھا جاتا ہے کہ آخر آپ افسانے میں چاہتے کیا ہیں؟ اس کا جواب اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ یہ سوال آسان ہے۔ تاہم کسی حد تک ہم ایسے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

افسانہ نگار کے لئے سب سے ضروری امر یہ ہے وہ کچھ لکھے و کچھ پڑھے۔ اس کا بلاٹ مینا ہو یا پرانا، سب وہ ہوا یہ سچیدہ افسانے کی فضا قائم رکھیں۔ ہوا بھڑکنا، اس کے دوران مطالعہ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آنا چاہیے کہ ایک معقول پڑھنے والے کو جائیں آئے نہیں اور اس کی طبیعت اتنی اکتا جائے کہ کہانی اُدھوری ہی جھوڑے۔ اگر پڑھنے والے نے کہانی ختم کرنے سے پہلے پڑھنا ختم کر دیا تو کہجئے کہ افسانہ نگار نے مقلد بننا سبب رہا۔ افسانہ نگاری کے فن کے متعلق تفصیل سے یہاں کہنے کی مجالش

نہیں مغربی افسانہ نگاروں میں اس موضوع پر اختلاف آ رہا ہے۔ ایک جی۔ مڈلر کی بات ہے کچھ ہے اور اسٹوٹن اس سے پہلے کچھ اور کہہ گیا ہے وہ مختصر افسانوں کو نین جوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس سے بھی پہلے ایڈگار آلن پو افسانے کے اجزائے ترکیبی پر اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہے۔ بہر حال مختصر افسانوں کہجئے کہ یہ سب اس پر مشق ہیں کہ نئی حیثیت سے مختصر افسانہ نگاری میں باہم گزار الفاظ و شکل ہونا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ ہو چکا کہ اردو کے ایسے واقعات کا جو منہا کو پہنچتے ہوں۔

دعا

گداز جاودان یعنی دل بیدار مل جائے! فروغ مہر یعنی وسعتِ پندار مل جائے!
 مراسوزِ دروں ہو سرسراکِ آتشیں نال! مری طبع رسا کو شغلِ موسیقار مل جائے!
 تحنیل کو مرے مولا شہید جستجو کر دے! مرے پائے طلب کو برق کی رفتار مل جائے!
 مری جو آرزو ہو رزمِ ہستی کا مرقع ہوا! مری تیغِ خودی کو جوہرِ کردار مل جائے!
 عقابِ جستجو کو شہرِ جبریل دے یارب! شکارِ آہوانِ وادیِ اسرار مل جائے!
 یہی ہے زندگی ہو موسیقیگانہ دل اپنا! یہی ہے حریت آزادیِ افکار مل جائے!

ایں کندہ ہے جس پر اتم الاعلون کا وعدہ

ہمیں یقین کی وہ تیغ جوہرِ وار مل جائے

مین خدیجہ ربابی

کہانی کی کہانی

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ایک افسانے کے ماتحت ایک افسانے سے ہوتے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک زندہ رہتا ہے افسانہ بن کر زندہ رہتا ہے اور جب مرے گا تو دوسری ساری کہانیاں افسانہ بن جائیں گی۔ درحقیقت انسان خود ایک افسانہ ہے۔ قدرت کا بنایا ہوا۔ فطرت کا لکھا ہوا۔ چاہے یوں کہہ دو کہ افسانہ نظم ہستی کے ایک لطیف معرکے کی توضیح ہے جو اپنے اندر صد اہم نکات، ہزاروں افسانے رکھتا ہے۔ کچھ پوشیدہ کچھ ظاہری۔

عالم کی تخلیق کے ساتھ ساتھ افسانے یا کہانیاں بھی جلتی ہیں۔ لیکن ارتقا کی ہر منزل میں ان شکل میں فرق آتا جاتا ہے اور اپنے کردار کی خصوصیات سے متاثر ہو کر یہ مختلف رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کا بے پناہ اثر حالات کا تغیر پذیر طوفان اور وقت کی آلی و آرد گریبے اسباب میں جو انہیں ایک معیار پر نہیں رہنے دیتے۔

تھیں۔ کہانیاں سننا سننا احیاء بشری کا ایک دل خوش کن مشغلہ ہے۔ اس کو آرٹ کی شکل میں لانے کیلئے کچھ زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ مادہ تیار تھا۔ ادبی اور تمدنی نشوونما کے ساتھ ساتھ عقلی اور تعلیمی حاشیے چڑھانے کے۔ قدیم کہانیاں کہنے والے یا داستان گو عموماً گھر کے بڑے بوڑھے یا اعلیٰ رہنما ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے بچے اس راوی سے سناتے تھے کہ سننے والوں کو عبرت حاصل ہو۔ کچھ عرصہ بعد جب زندگی کی سادگی نظر فریب جتنے کی جذبات میں گونا گونی پیدا ہو گئی تو افسانوں میں بھی بگنی آگئی۔ کچھ اور لطف کے لئے وہ باتیں بڑھا دی گئیں جو واقعیت کے خلاف تھیں۔ سننے والے ان میں ان کہانیوں کو مضمون سے بے بس نہ سمجھتے تھے اور اس لئے سننے لگتے تھے کہ روزمرہ زندگی کی یکسانیت اور بے مزگی سے ہوائی حاصل ہو۔ ایسے قصوں کا پورا کا پورا سرمایہ عشق و عاشقی کے معاملات، بھرت اور پری کے وجود کی تصدیق اور جو انفرادی کے کارنامے ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ افسانہ گوئی ایک فن اور گھر کے چکر افسانہ گوئی پورا ایک آرٹ بن گئی۔

ان افسانوں، قصوں اور کہانیوں کو دیکھ کر یورپ والوں نے نااہلی پیدا کی۔ تاریخ اور قصص الاصلہ کے درمیان ادب کی دنیا میں ایک ابستامیان نکال دیا جس سے مشرق والے تقریباً بے خبر تھے۔ مغربی ناول نویس زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے جس سے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اسکا ارادہ حیرت دانا، خوش کرنا، ہنسنا یا غور و فکر کی الجھنوں میں ڈالنا ہے۔ مشرقی افسانے محض تعریف یا کبھی خاص مجلس کی تعجب کے لئے ہوتے تھے۔ اس لئے داستان کی تاریخی اور جغرافیائی صحت شرط نہ تھی لیکن مغرب نے ان سب ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے اور جہاں نہیں اس روش کو چھوڑنا پڑا ہے تو بے رحمی سے نہیں۔

افسانہ اور محبت کا رشتہ بہت پرانا ہے اور جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے یہ رشتہ اور مضبوط ہو جاتا ہے اور اس کو چاروں پہلوؤں پر پکڑ کر افسانہ بغیر محبت کے اور محبت بغیر افسانے بے رنگ اور بیکار رہ جاتی ہے۔ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت کی متروانی عورت کی یہی دو تصویریں ہیں جن کو ہر افسانہ اور ہر ناول پیش کرتا ہے۔ عشق کی ہی کہانی ہر قوم اور ہر تہذیب کے افسانہ نگاروں نے دہرائی ہے۔ باوجود اس کمزوری کے اور باوجود محبت کے اس تہذیب میں مثلاً ہونے کے ہر پہلو کی کہانی جدا کا نہ ہے۔ باغز ہے اور اچھوتی ہے۔ اور اس لئے جنہوں نے محبت کو دنیا کی تخلیق کار اور سمجھا ہے۔ غلط نہیں سمجھا۔

یورپ کے ناول اور افسانے بھی اس لطیف جذبے سے خالی نہیں ہیں عشق کا عصر قصہ میں جان ڈالنے کے لئے کتنے ناولوں میں پایا جاتا ہے۔ بہت سے اوجے اور بازاری مذاق کے ایسے بھی قصے ہیں جن میں ادبی یا اخلاقی کوئی ترقی نہیں بلکہ ان کا وجود تہذیب کو گندا اور انسانیت کو شرمندہ کرنے والا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا ہوتا ہے کہ ایک مغربی ناول عموماً ایسے کا کام دیتا ہے جس میں سوسائٹی اپنے عیب و صواب کو دیکھتی ہے اور اصلاح دہست کرنے کی جدوجہد کرتی ہے۔ انگلستان کے پہلے ناول نویس فلڈنگ نے اپنے ناول کے ذریعے سے اپنی قوم کو عظیم و

تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ جو اپنی حالت میں مست اور اشاعتِ فلم سے بے اعتنائی۔ پھر کیا تھا ناول نویسی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ غرض کہ ان مہیبتیں امر کی بے پروائی اور نا انصافی ایسے مؤثر الفاظ میں دکھائی جانے لگیں کہ اکثر کچھ تیز بگڑے ہوئے تھے۔

یہ سچ ہے اور جس نے کیا یا مشہور کیا ہے کہ ان ان حقیقت سے روپوش ہو کر افسانہ میں پناہ لیتا ہے، لیکن اگر شاعری کی طرف افسانہ نویسی کو بھی اس لئے ورنہ غلطی کا کالہ بتایا جاتا ہے کہ وہ حقیقت کی ان بلندوں سے اتنی جانتا ہے کہ وہ کبھی ہے جہاں پہنچنے کے بعد ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں تو کوئی شکوہ نہیں اور اگر ان کا منظر یہ ہے کہ ناول ہی بیات یا ریاضی کی کتاب ہو یا اس میں نام، صبح و سہرائی چلنے تو ناول۔ افسانے یا ڈرامے تک یا قوم کی وہ خدمت نہیں کر سکتے جس کے لئے یہ سچ رکھے گئے ہیں۔ آرٹ سے یہ امید رکھنا کہ وہ مذہب یا اخلاق کی قائم مقامی کرے اور انہی کٹر باتوں کی طرح اس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں بالکل غلط ہے۔ آرٹ کی خوبی صرف یہ ہے کہ وہ انسانیت اور تہذیب کی تخلیق کرے اور اپنی طاقتِ امن کے وقت امن اور انقلاب کے وقت انقلاب پیدا کرے۔

افسانہ نگار اور ناول نویس آرٹسٹ کی حیثیت میں کسی خاص مذہبی یا اخلاقی عقیدہ کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اس کا مشرب دنیا سے جذبات کی میر ہے۔ وہ دوسروں کو بھی یہی ترغیب دیتا ہے کہ عقیدوں کے چرے سے محروم، حسیات کا مقابلہ کر دو۔ کذب و صدقہ۔ نیک اور بد کا جو معیار مذہب اور اخلاق نے مقرر کیا ہے ایک آرٹسٹ اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ اس کو تنگ نظر کی کہتا ہے۔ اس کا ایمان، اس کا عقیدہ بہت پختہ اور نہایت سچا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی حدود میں سچا اور حقیقت گرد، رومشی میں دکھائی والا ہوتا ہے کہ سراسر فریب معلوم ہوتا ہے اور اس کی بلند پروازی اور معرفت کی بدولت ایک آرٹسٹ گمراہ سمجھا گیا ہے۔

بیسویں صدی کا ایک مشہور ناول نویس اناطل فرانس کہتا ہے: ”ہج کی تلاش ہے تو سائنس کی باگاہ میں جا۔ ادب کا مقصد تخلیقِ حسن اور صحتِ تخلیقِ حسن ہے۔ افسانے کو دلکش بنانا چاہتے ہو تو اسے زندگی کے معمولی تجربات سے بلند کرو اور امکانات کی بحث سے محفوظ رہو۔ اس کے لئے بے نیاز ہو جاؤ۔“

اسی طرح آخر کار کا قول ہے کہ ”صداقت، نو بصورت، تجزوں کا خالق، تو صنعت کا اظہار اور صنعت کا انحصار کا مقصد ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ افسانہ نویس، شاعر اور مصور مذہب کے بیٹھا ہوئے ہیں نہ اخلاق کے معلم۔ ان کا موضوع عموماً ایک انسان کی طبیعت ایک جذبہ کا گھیل ہوتا ہے، یا کبھی واقعہ کا اثر۔ اس سے بحث نہیں کہ بیان نفسیاتی ہو یا اخلاقی، بشرطِ کہ افسانہ نگار ذات میں سے خارج کر کے جرات سے پہلے ردی مصنفوں نے کی ہے۔ اس جذبہ عام انسان کو ناولوں اور افسانوں کی قدر دانی سے محروم کر دیا لیکن سچا ہو لوگوں کی ایک بڑی جماعت جو ان عشق اور حسن میں ڈوبے ہوئے قصوں کو اپنی نوبیات سمجھتے تھے متوجہ ہو گئے۔

لیکن بہت کا ناول سے فرق مبارک نہیں تھا۔ اس جذبے کے نیر نادوں اور افسانوں کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔ وہ لوگ جنہیں افسانہ کے اہل مسائل سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ جو مذہبی یا اخلاقی کتاب سمجھ کر انہیں نہیں پڑھتے جو صحت اپنی فرصت کے وقت ایک دلچسپ شکل یا پیسے ساوے الفاظ میں ایسے حسی جذبات کے لئے کہ گدی اور دل کو مسکراتا ہو اور پناہ جاتے ہیں۔ ایسے خشک اور ایسے فلسفیانہ رنگ کو پسند نہیں کر سکتے۔ ادبیات بھی سمجھنے کے لئے ہے۔ اگر ہم ناولوں اور افسانوں میں واقعات کی حقیقت اور حسی تعلقات پر اصرار کریں تو ناول کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ان کی دلچسپ فلسفیانہ حیثیت بالکل مٹ جاتی ہے۔ اور ان میں کچھ سسٹم کی کج رنگی آ جاتی ہے جو ہماری زندگی کا صحیح عکس نہیں۔

ناول کہنا اگر آرٹ ہے اور ان کا لگایا ہے کہ آرٹ ہے تو اس کے کھنڈے مذہبی گروہ ضرور میں مگر نفیات کے میدان کے راہبر ہیں۔ ہاں اگر کوئی مصور بھی جو عورت کی تصویر بنائے۔ کوئی شاعر یا نیاں، پر طبع آزمائی کرے اور کوئی فنانسنگر ہو جس پرستی کی ترغیب دے تو حقیقت میں تمدنی تباہی اور اخلاقی تنزل ہے۔ وہ شیک خرد گروہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے۔ لیکن یہ ان کا اپنا انعقاد۔ ان کی اپنی بے وجہ ہے۔ آرٹ کی کوئی خطا نہیں۔ ہماری دنیا۔ ہماری زندگی بلکہ ہم خود اعلیٰ، ادنیٰ، روزیل، اوچیل، جڑاؤ، مرکب ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ روزیل اور چیل میں امتیاز نہ کرنا، انسانیت اور بشریت زندگی کے راز کو نہ سمجھنا صرف ہماری فہم کی کمی ہے۔

پہلے سے کا قول ہے کہ میں تخیل کی جوائی پھل قصوں کو جانچنے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ ہر زمانے میں اس کی جو گہری زبان کے مطابق

دربار اکبری کی ایک جھلک

ہمارے جوں کے راجہ ہمایلی اکبر بادشاہ آگرہ راج رہے ہیں۔ وہی آگرہ جواب اکبر آباد ہو چکا ہے اور اس کا قلعہ بن چکا ہے۔ ہمارے جعفر کا آغا ہے۔ ہولی بھی جس کے آنے پر بقول بابر سارا ہندوستان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ قریب آج بھی ہے۔ سرسوں پھول رہی ہے۔ دشت دیو یاں سب زعفران زار بنے کھڑے ہیں۔ ہوا میں رنگ دلوں میں آئینگ، اور سروں میں ترنگ۔ بارغ در باغ گل دکھنا سب ہرے بھرے پھولوں سے لدے ہیں۔ سالے شہر کی آئین بندی ہوئی ہوئی، گلی گلی کوچہ کوچہ راستہ ہے۔ ہندو مسلمان، مرد، عورت، بوڑھے بچے، لڑکے بالے، بے دیکھے اپنے اپنے مقدور بھر لپے اچھے کپڑے پہنے ٹھٹ کے ٹھٹ بولتے ان راستوں کی طرف چلے جانے ہیں جو قلعہ کو جاتے ہیں۔ یہ راستے، ادھر کے مکانات، ان کی چھتیں، کاشانیوں سے بھر گئی ہیں یا بھرتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ خود قلعہ کی عمارت، سہاگ کا سرخ جوڑا پہنے کھڑی ہے۔ خندق سے لیکر برج بارہ بلکہ دیوار و کنگرے تک ایک ایک چیز سچی اور اپنے زیور سے لدی ہے۔ راؤ، راجہ، مہاراجہ، امیر، وزیر، رؤسا، سفراء، سپہ سالاران، نامدار و شاہزادگان کا مگاری سواریاں تورہ اکبری کے مطابق قلعہ کو جا رہی ہیں۔ کوئی صاحب فیل و نشان ہے، کوئی صاحب طبل و غلم، کسی کے آگے آگے تورغ و تھن تورغ ہے یا ماہی مراتب، کسی کے سامنے نقارہ و دھام بجاتا جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ نقارہ ہے مگر کیا مجال کہ خوب نقارہ کو چھو جائے۔ کسی کے سامنے نفیری بجتی جاتی ہے۔ اور کسی کے ساتھ صرف جھانچ۔ کسی کے ساتھ بہ سب لوازم امارت ہیں اور گاجہ یا جہ بھی ہر طرح کا بجاتا ہے۔ مگر خاص خاص جگہ پر پہنچا اور بند۔ سوار و پیادے، کوتل گھوڑے، اونٹ، ہاتھی باساز و براق، ہود و عمارت سے بچے ہوئے ان جلو سوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن کم و بیش اور علی قدر مراتب۔ قلعہ محلی تک عوام کی رسائی کہاں۔ وہ انہیں سواروں اور جلو سوں کا تماشہ دیکھتے آتے ہیں۔ ایسی سواریاں و اب سنگان دولت کی ابھی بہت سی آئینی اور قلعہ کو جائیں گی اور اُمرار اپنے اپنے جلوس کو جلوفانہ میں چھوڑ کر خود تمام جھام۔ ہاتھی یا گھوڑے پر تابہ نقارخانہ سوار جائینگے۔ کسی کا خاصہ یعنی لوازم جلوفانہ میں بھی جگہ نہ پائینگا۔ قلعہ سے باہر رہ جائینگا۔ کسی کو قلعہ کے دروازے یا اُس کے سامنے سے ہی پیادہ پا ہونا پڑینگا۔ یہ تماشے آپ یہاں ہونے دیجئے ہمیں جلدی ہے۔ قلعہ کے اندر پہنچنا چاہیے۔ کہ وقت تنگ اور دربار کی ساعت قریب آ رہی ہے۔

اوپر ہو، ہوا، کیا سماں ہے! یہ زمین سے یا آسمان، یہ چھوٹے چھوٹے باغچے ہیں یا خیابان و روضاں۔ یہ محلات دیوان ہیں یا مقصورہ روضاں۔ اس حوض کو ٹوہ پچھتے، کوثر کا ہمسرہ ہے۔ یہ نہر اسی سے نکلتی ہے۔ پانی اس کا اسی لئے شہد و شیر کا ہم رنگ ہے۔ نہر کے کنارے کنگرے و در تک موٹے موٹے خوش رنگ نملوں پر رو پہلی کھڑے سنہری کٹوروں کی جہرں لگے سرخ سرخ قند میں لپٹے رکھے ہیں۔ ہوں نہ ہوں اسی آب حیات سے بھرے ہیں۔ آگے چل کر یہ نہر و نہروں میں پھٹ گئی ہے۔ ایک اندر اندر گہیں اور جا بھلی ہے۔ یہ شاخ آبشار بن کر گرتی ہے۔ جس سے یہ معری نہر تھی اسی کی تہ میں دیکھنا کیا خوب

لہریا بنا ہے پانی بھی اسی نے بل کھاتا لہریا اور تپو رواں بنانا ہوا بہتا ہے، نہر میں جابجا فوارے لگے ہیں اور سب اُڑ رہے ہیں۔ کوئی چکر کھاتا ہے، کوئی چادر پھیلاتا ہے۔ کسی نے سادوں بھادوں کا سماں باندھا ہے اور پھواریں پڑ رہی ہیں۔ کسی سے چشمہ اُبل رہا ہے۔ غرض جو فوارہ ہے عجیب ہے۔ اس حوض شمن کو تو دیکھتے اُس کی شان ہی نزلی ہے۔ گوشہ گوشہ پر گلخان رنگارنگ پھولوں سے اور چنگیز تازہ تازہ میووں سے بھرے رکھے ہیں۔ حوض میں چھوٹا سا ہزارہ چل رہا ہے۔ اس کی پھواریں پھولوں اور پھولوں پر اوس بن کر گرتی اور ان کی تازگی کو طراوت و شادابی کا رنگ دے رہی ہیں۔ جابجا چاندنی کے کم سنہرے بادے سے بے کڑے ہیں۔ ٹیل ہزارہ استاں کے پنجرے بستنی سے کسے زری گوٹے سے زربفت بنے پڑے لٹک رہے ہیں۔ غرض باغ نہیں فردوس بریں ہے۔ حیران ہوں کہ دو آنکھوں کیا کیا دیکھوں۔ اس نے تصور کے رنگا کر اب دیوان خانہ پہنچتا ہوں۔

دیوان خانہ میں سر تا سر لہجور کی بادشاہی کا رنگا کا بنا ہوا ایک ریشمی قالین پکھلے جس میں بیل بوٹوں سے دیوار باغ بنا ہے۔ گستاخوش رنگ اور نظر فریب ہے۔ سجارانی و ایرانی قالین پانداز میں پڑے ہیں، عام دھام کے تمام درو دیوار سجراتی کُھواب، کاشانی نعل، بنا رسی زربفت، رومی بانات اور تاش تاشی سے آراستہ ہیں۔ دروازوں پر کشمیری شالوں کے پردے محرابی صورت پر بندھے ہیں۔ کوئی زردوزی ہے، کوئی گوٹے ٹپے ہٹک پیک۔ قیطن، کلا تین، مقیش۔ بادے پہاڑے اور بندھا ہوا ہے جگر حکمر رہا ہے۔ ستونوں نے ولایتی جامہ دار اور شجر کا جامہ پہنا ہے اور گل و گلخان لے کھڑے ہیں۔ چھت میں جس کی لا جو ردی زمین رنگ برنگ کے نقش و نگار سے فحاشات دو چرب بریں ہے سونے کا جٹاؤ ہزارہ بلوری جھاڑ لٹک رہا ہے۔ دروازوں میں محرابیاں ہیں۔ دیواروں پر شفق چادریں۔ کونوں میں چاندنی سونے کے گنگا جمنی سرد چراغاں لگے ہیں۔ فالوس احباب گلابیاں، لالہ، مردنگ گنول بھی جابجا لگے ہیں مگر اس خوبی سے کہ جگہ خود ان کو مانگ رہی ہے۔ ایک چینی بھی جگہ سے ہٹ جائے تو حُسن بدگمانی سے بدل جائے۔ دیوان خانہ کے آگے سقر لاط کا کہکشاں سانبان کھنچا ہے، اس سے آگے ایک اور اونچا شامیانہ ہے اور اس سے آگے اور اونچا۔ آخر میں دل بادل یا آسمانی شامیانہ ہے جسکی چھت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ چوبیس ان کی سب سوتے چاندی سے منڈھی، گلدستوں سے سجی ہیں۔ کب کب چیر کو دیکھتے ایک سے ایک اچھی ہی ہے۔ سب سے زیادہ نادر اور مخف سنگ مرمر کا اور رنگ یا تخت ہو جو خاص عام کے وسط میں رکھا ہے۔ چھت اسکی جگہ ٹاپ۔ نازک نازک مرمری ستونوں کے اوپر کھڑی ہے اور جابجا ستونوں سمیت جواہر زدا ہے جڑی ہے۔ اُس کے اوپر مُرخ نعل و سقر لاط کا شامیانہ ہے منکھل بدلاتی و جوہر۔ جس کی سنجاف میں موتیوں کی جھالک لگتی ہے اور نظر کو خیر کرتی ہے۔ تخت کے اوپر نعلی سند لگی ہے۔ حاشیہ اُس کا کوئی چھ سات گرہ جواہرات اور گندن سے مُرقع ہے۔ گھاؤ تکیہ و پشتی کا کہنا کیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے تیرے زیر آسمان کے سالے تھے ٹانگ دے ہیں۔

ابھی ہمیں خاص دعام میں بہت کچھ دیکھنا تھا اور آرام گاہ خاص کے سالے جا کر خاصہ و قورخان کی سیر کرنی تھی کہ

دفعۃً دیوان غلامی نسقی، نقیب، سیادل، چادش و چوہدر داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور درباری جن کے جلوسوں کو آتا ہوا ہم راستہ میں چھوڑ کر دیوان خانہ آپہونچے تھے دیوان خانہ کی طرف آتے دکھائی دئے۔ یہاں تک اپنے اپنے جہکی خانوں میں بیٹھے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ دربار کا وقت قریب آیا تو خاص و عام کا رخ کیا۔ ہر ایک اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ لوہہ کرنا کی آواز آئی۔ آکر بیٹھنے والے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دم قدم کو دیکھا۔ نسقی نے جس کو ذرا بھی خلاف قاعدہ پایا چھڑیوں کے ٹھوکوں سے سیدھا کر دیا۔ کیا مجال کہ کوئی چوں بھی کر سکے کچھ سمجھے یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس نے کہ بادشاہ آرام گاہ خاص سے چل پڑے۔ وہ سنکھ سجا۔ جہابی جہاں پناہ۔ بادشاہ سلامت! بادشاہ سواری خاصہ پر سوار ہو گئے۔ اب جب تک بادشاہ دیوان خانہ تک پہنچیں۔ سیادلوں کی بن آئی ہے۔ جہاں کسی امیر سے آداب دربار کے خلاف کوئی ذرا سی بھی حرکت ہوئی اسی کو انھوں نے آدلوچا۔ پکڑا اور نکال دیا۔ نیچے عود و عنبر کی انگلیٹھیاں بھی روشن ہو گئیں۔ سارا دیوان خانہ عطر و خوشبو سے جھک اٹھا۔ وسط دیوان میں گلاب کا ہزارہ اڑنے لگا۔ کتنا باریک ہزارہ ہو۔ بوند تک دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا خزانہ ہونہ ہوا اس طلافی کھڑے میں ہو جسکو یہ گرجی عورت کا اسٹیج بھل میں لئے کھڑے ہو۔ لوہہ شہنائی بجی۔ چادش پکائے "بادب باش۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔" جلوس آن پہونچا۔ اب کیا مجال کہ دیوان خانہ میں کوئی جنبش بھی کر سکے۔ پہلو کے دروازے سے ایک خواجہ سرا دیوان خانہ میں داخل ہوا۔ پھر چادش پکائے "بادب باش نگاہ بر قدم، جہاں پناہ، جہاں بادشاہ سلامت۔" سلامت کی آواز ختم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ سلامت نے بادشاہزادوں کو ساتھ لئے، اس طرح کہ بادشاہ و بادشاہزادے کو خواجہ سرا گھیرے ہوئے ہیں جیسے چاند کو ہالہ، دیوان خانہ میں قدم رکھا، سر پر چنور ڈھل۔ ہلے۔ ہو چھل ہوتا چلا آتا ہے۔ تو رخ خانہ کے خاصہ بردار پیچھے پیچھے ہیں۔ سارا دربار فرط تعظیم سے جھک کر دھرا ہو گیا، آداب بجالایا۔ بادشاہ ہزاف تخت کے قریب اپنی اپنی جگہ پر بٹھ رہے۔ بادشاہ زمین پر چڑھ کر تخت پر پہونچے۔ اور اللہ اکبر کہہ کر تخت کی مسند پر بیٹھ گئے کہ اکبر کا سلام اور انعام الہی کا شکر یہ ہی اللہ اکبر ہے۔ یہ آواز سننے ہی سارے دربار نے جل جلائے کہا اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ نفا رخانہ میں نقائے پر چوٹ پڑی۔ دمامہ بولا جیسے کوئی بادل گر جا شہنائی سے مبارک و سلامت کے بول نکلے۔ شادیا نہ بجنے لگا اور آس پاس کے ایوانوں سے ساز و سرود کی جالواز آواز آنے لگی۔

جہابی کا رنگ گندمی، قدمیانہ۔ بدن دھرا، سادہ لباس میں بھی نہایت جامہ زیب ہے۔ آج سالگرہ کا دن ہو بڑے کھیر کا لگائی جامہ زیب برہے۔ سر پر تاج ہے مگر نہ مغلی نہ ایرانی وضع کا بلکہ خود جہابی کی ایجاد ہے۔ ہندووانی کٹ سے لٹا جلتا ہے۔ سارا جواہرات سے مرصع ہے، موتی اور جواہرات کی لڑیاں اس میں لٹک رہی ہیں۔ جامہ پر قبائے نیمہ آستینیں ہوں اس کی آستینیں اور کھیر کوئی تین تین ٹکڑے طلائے و دھبہ جواہرات سے لپی ہے۔ سنجات پر موتی طے ہیں۔ دامنوں کے کونوں اور شانوں کے شے جگہ جگہ کر رہے ہیں کہ پٹی نگاہ

ان پر نہیں بھرتی۔ کمر میں مرتع مکر بند ہے اور اس میں خنجر لگا ہے۔ دائیں ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول ہے، بائیں میں ایک خوش غلات شمشیر گوتھی قبضہ سب مفرق بہ جواہر۔ بند شمشیر میں ایک بڑا ساموتی اور دو نعل آبادار آدیناں ہیں دونوں کلاویوں میں مرتع وچ پیچ، بازوؤں پر میرے کے بازو بند بند ہے، میں اور گلے میں مرتع ہار رنگ رہا ہو، کٹنی وطرہ پراقبال اکبری کا اور طرہ ہے، کسی آنکھ کو تنکاہ اور تنکاہ کو اس کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں ہو۔ تورخانہ کے چپے خواص تخت کے پیلوں میں دونوں طرف ہاتھوں میں اسلحہ خاصہ لئے ہے خود سرتا پاؤں پیچے کھڑے ہیں۔ قبول کر بھی نظر ان پر جہا پڑتی ہے تو زہر آب ہونے لگتا ہے۔

جہا ملی بادشاہ تخت پر بیٹھے ہی تھے کہ تعذوق فریق مبارک شروع ہوا۔ اکابر دولت اپنی اپنی باری سے آگے بڑھ کر بادشاہ پر زرد جواہر نشا کرنے لگے۔ جو اس رتبہ کے نہیں وہ پیش گاہ بادشاہی میں صدقات فریق مبارک پیش کرتے ہیں۔ اور اٹے پاؤں چلکر اپنی جگہ پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیجئے نذر شروع ہوئی، ولی عہد سلطنت کی نذر سب سے مقدم ہے۔ جواہرات و عجائبات کی کشتیاں آ رہی ہیں اور بادشاہ کے سامنے پیش ہو رہی ہیں۔ ہاتھی گھوڑے مرتع و زلف کے ساز و آواز سے بچے، ریوروں سے لے کر وہاں بے حجم جم کرتے پیش گاہ عالی سے گزر رہے ہیں۔ جہا ملی بیٹھے سے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ نذر کی فہرست لاکھوں کی ہو۔ ولی عہد کو جو انعام لے گا وہ کروڑوں سے کم نہ ہوگا۔

بادشاہزادوں کے بعد اُمراء سلطنت علی قدر مراتب اپنی اپنی نذریں پیش گاہ بادشاہی میں پیش کریں گے اور شاہانہ انعام و اکرام اور اضافہ منصب و اکرام پائیں گے۔ آخر میں دربار جس ترتیب چاہتا تھا اس کے برعکس ترتیب برخواست ہوگا۔

یہاں تک دربار سالگرہ ہے کل سے جشن بے تکلف شروع ہوگا۔ دعوتیں، ضیافتیں ہوگی۔ ناچ رنگ کی فحشیں جمیں گی۔ اور نہ صرف اکبر آباد میں، بلکہ ساری مملکت میں آج دربار لگا ہوگا۔ کل سے جشن سے گا۔ خوشیاں ہوں گی۔ ہم اور ہمارے عقور آخر کہاں کہاں جائیں اور کیا کیا دیکھتے پھریں، اس نے رخصت۔

عبدالرحمنؑ

سلوکی کا حسن بدی کا پناہ حسن تھا۔ اُس کا نالچ زعفر گناہ تھا۔ اس کا جذبہ کوہِ انشِ نفاں کی طرح تند اور لگی ہر دو پاس۔ محبت لاوے کی طرح مجلسِ شینے والی تھی اُس کے سانس میں زہر تھا اور بوسہ میں موت۔ وہ یوحنا کے بہوں کو چومنا چاہتی تھی مگر یہ خوار رسیدہ بزرگ اُسے اور اُس کی ماں کو کوستا تھا اور بڑا بھلا کہتا تھا۔ حاکمِ مریعِ اعلیٰ نے اُس کے حکم سے سلوکی ایک عظیم الشان دعوت میں باقی اور انعام میں اُس نے یوحنا کا کاسرا لگا۔ اُس خون آلود سرِ کشت میں سے اُٹھا کر سلوکی نے اس کے بویوں کو دیوانہ اور چوما اور گناہ خون اور موت کی اس رونگٹے کھڑے کر دیئے والی کہاں کی پڑھیے جو فرانس کے مشہور ادیب گسٹیو فلا بیر کی حسن کا رانہ تحریر کا ایک المولِ رتن ہے جس کا ترجمہ مولانا عنایت اللہ دہلوی نے کیا ہے قیمت صرف بارہ آنے اور علاوہ وصولِ لڑاک۔

لئے کا پتہ: سنائی بلڈ پوسٹل

ایک پُرانا زمانہ

اوٹے گنوں کی سیر

اپنے کئی جنگ پہلے اسی بھارت ورش بلکہ اسی دلی میں ہندو مسلمان بہایت پیار و اخلاص سے رہا کرتے تھے۔ گو مسلمانوں کی حکومت گئے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ مگر ایک ہوا میں سانس لینے والے۔ ایک آنہ جل سے زندگی بسر کرنے والوں میں بھائی بھائیوں کی طرح سے میل جول تھا۔ شادی، بیاہ، موت، زندگی غرض دنیا کے ہر کام میں وہ ایک دوسرے کے شریک تھے۔ بلکہ ہاٹ بازار۔ رستہ۔ گلی میں جب کوئی ہم حملہ یا پاس پڑوسی ایک دوسرے سے مل جاتا تو صاحب سلامت کے بعد وہیں کھڑے کھڑے کئی منٹ تک ایک دوسرے کی خیر صلا اور خاتمی معاملات پر چھتے پوچھتے ہونٹ خشک ہو ہو جاتے تھے۔ مثلاً تمہارے گھر میں خیریت تو ہو؟ بال بچے اچھے ہیں؟ گزارے کی کیا شکل ہے؟ اگر خدا سنا خوشہ کسی کے ہاں دکھ بیماری ہو جاتی تو یہ میرا چشم دید واقعہ ہو بغیر کسی مزدوری یا صلے کے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ اپنی اپنی معلومات سے فائدہ پہنچاتے اور آڑے تھڑے وقت میں تو عورت مرد۔ بوڑھے نوجوان سب کے سب گئے بھائی بہنوں کی طرح ایک دوسرے پر ہاتھوں جھاڑ کر رہتے۔ چھوٹے کی چھٹائی، اور بڑوں کی بڑائی کا اُس زمانے میں خاص امتیاز نہ تھا۔ آپس میں حصہ بخرالین دین۔ بیج بپیار۔ اس عام محبت اور بے فکری کے ساتھ ہوتا کہ اُس وقت میں اور تاج کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

بلا مبالغہ ایک روپیہ کے ۴۰ سیر گہوں میں بھر کے چنے۔ خالص بالکل خالص ڈھائی تین سیر کا بھی، جواب قیامت تک نہیں مل سکتا، کھلے بندوں بڑا بکٹنا تھا۔ بلکہ بیج یہ ہے کہ ایک روپے کا آٹا دو میاں بیوی ایک چھینے تک خوب الٹے پلٹے سے کہا کر بھی تمام نہیں کر سکتے تھے۔ دودھ۔ دہی۔ کھن ایسا زرد یا اور خالص کہ جنہوں نے کھایا بولس وہی خوب جانتے ہیں۔ تیل، لکڑی، ڈنکڑی، افراط کے ساتھ ملتے تھے۔ ساگ پات اور ترکاری تو کوڑیوں کے مول بکتی تھی۔ جس کا جی چاہے الغاروں کیلے کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ غریب غریبا نہیں، امیر لوگ کھاتے پیتے آدمی ایک پیسے میں چار سو دے لینے کے عادی تھے۔ اسپر بھی ملک میں کسی قسم کی بے چینی، پریشانی یا عام گھبراہٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ چسے دیکھو، ہندو مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی، سکھ، اس سرے سے اُس سرے تک ہنسی خوشی اور آمی جی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

دلی، ہائے وہ پشاش برس پہلے کی دلی بس کیا کہوں؟ مشہر کیا تھا ایک گلزار تھا گلزار فتح پوری سے لیکر چاندنی چوک گھنٹہ گھر، نواہ اور پھر غوثی دروازے سے دھڑل قلعہ تک شام کو وقت اگر تھا تو چھینکو تو سروس

ہی سروں پہ چلی جاتے۔ دوسری طرف نیا پانس۔ لال کنواں۔ حوض قاضی اور بھر چاؤڑی بازار سے جامع مسجد تک ایک عام تفریح گاہ تھی کہ شہر کے امیر و غریب روزانہ بنے سہارے۔ کچھ پیدل کچھ اپنی اپنی سواریوں میں گل گشت کرتے نظر آتے تھے۔ تیس ہزار دی کی طرف بھٹیک دو پہر کو جہاں اب لارڈ ڈفرن کا پل ہے بلکہ اس سے ذرا آگے جہاں نہر سعادت خاں لہریں لیتی تھی گرمی کے موسم میں یہ غریبوں کے لئے ایک جنت کا ٹکڑا تھا جس کے دونوں کناروں پر صد ہا سایہ دار درختوں کا جھرمٹ تھا۔ شوقی تیراک پل پر سے کودتے تھے۔ قسب قسم کی تیریاں دکھاتے تھے۔ شیخو والے۔ نہروں والے، اور خدا جانے کون کون والوں میں مقابلہ ہوتا تھا اور خلق خدا سب زیادہ کارخانہ دار لوگ بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

دو طرفہ سودا سلف بیچنے والوں کے خانچے۔ پھول والوں کے سبدر گل۔ لال انگلیاں باندھے سقوں کے کٹوروں کی جھنکار ہر آئندہ روز کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ جا بجا مسلمانوں اور ہندوؤں کی سبیلیں، پیادہ جن سے عام مخلوق سیراب ہوتی اور کوئی کسی سے دوسرا ہٹ کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، چاؤڑی بازار تو ہر شام کو بیچ بچ کا شاہی بازار بن جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس مغلیہ بازار میں خرید و فروخت کرنے والے سب سب فرد انات سے تھے اور یہاں سب مرد و شوقین جیوڑے اکثر جیبہ و شریف، کچھ اہل حرفہ بقدر قدرت اچھے اچھے لباس پہنے سہارے بٹکا کرتے تھے۔ کوئی باد یا ہر سوار ہے۔ کوئی فٹن خود ہانک رہا ہو۔ غطروں میں بے پھولوں کے آڑے کٹھے پہنے اوپر اوپر گڑ جاتے تھے۔ کہیں لفیری بج رہی ہے۔ کہیں خوش نکو باجے پر گاہے ہیں، کہیں چوک میں جتے والے ساتی۔ جتے لے کھڑے ہیں۔ غریب غرا جلتے جتے بٹھرتے، دوکش لگاتے اور پیسہ دو پیسہ ہاتھ پر دھریہ جاوہ جار مگر آج دی دی ہوا وہی شہر۔ مگر وہ حالت نہیں۔ نکبت ادبار اور عام افلاس نے خالق خدا کی صورتیں تک بگاڑ دی ہیں۔ ذوق پر کپڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ نوجوانوں کی لال سی جامیں خوگوشی کی نذر ہوتی ہیں۔ روزگار نایاب۔ علم و ہنر کو پہلے سے چہار چاند ہے اس پر بھی فراغت اور اطمینان قلب نایاب۔ حالانکہ ملک میں ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ زراعت اور غلہ کی پیداوار دگنی چو گنی ہو گئی ہے۔ خام چیلوں کی مانگ بہت زیادہ۔ آبپاشی کی کثرت۔ لیکن اس پر بھی جہاں دیکھو خاک اڑ رہی ہو اور پیسے ناں شہید کو محتاج۔

اسی زمانے میں ٹوٹے گئیوں کی سیر

اب میں پچاس برس پہلے کی ایک رنگیل صحبت کا ذکر کرتا ہوں۔ جس سے صاف معلوم ہو جائیگا وہ کیسا ہی جی اور مفکری کا زمانہ تھا۔ آویادش بخیر وہ برسات کا موسم۔ ساون بھادوں کی گھٹائیں دن رات جھوم جھوم کر برتی تھیں۔ کبھی ابر محیط آسمان رہتا۔ کبھی رنگا رنگ ایسے کیلے پھرنے لگتے۔ کئی کئی شوخ و شنگ ہجومی مختلف رنگ کے لباس پہنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جو گلگت میں۔

شدہ شدہ کبھی پھر یکایک ایسی اندھیری چھا جاتی کہ بلا مبالغہ دونوں پر اچھی خاصی رات کا دھوکا ہو ہو جاتا۔ غرض اسی تاریکی میں پھر جو بجلی چمکتی تو سفید براق بجلیوں کی لمبی قطار آسمان پر ایسی بجلی معلوم ہوتی جیسے کوری کی آنکھوں میں کاجل۔

بس اسی عالم میں اکثر شوقین جیوٹرے سیلانی پتھپی گویا اس شعر کا اعادہ کرتے گہروں سے نکل پڑتے تھے کبھی سادوں کی جھری اور کبھی بھادوں سے پڑا ایسا برس مہرے لٹکے چھا جوں برس ابھی برس ابھی پھر کھل گیا۔ ابھی پھر دھواں دھوار برستے لگا۔ وہ بجلی کا رہ رہ کر کوہنڈا۔ وہ بادل کی گرج اور گرج کے ساتھ ہی بار بار وہ موروں کا جھنکارنا، کوئل کی ٹوک، پیپے کی الاپ، ان چیزوں کو کچھ انہیں دلوں سے پوچھیے جو قدرت کے کرشموں کے دالہ و مشید ہیں۔ یا ازلی نے ہونے لوگ۔

الغرض ابے پچاس برس پہلے ہاکل ایسا ہی اک فرحت افرا دون تھا جبکہ برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پر سرد و دبستاں یاد و بایندہ کے موافق چند حسین حسین صورتوں کو لال سنہریوں پر سادوں کا جھولا جھولنے اور مار گانے کے لئے دیباے جمنائے کے لئے گنوں تک کھینچ لائی تھیں جس کو آج تک دلی دالے ٹکبو دروازہ یا نگاہ موت کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ پارٹی کی پارٹی عورتیں اور مرد و شکرم گاڑیوں میں لدے پھندے آموں کے ٹوکے۔ جامنوں کے جھپے، فرش فردش اور سامان خورد و نوش نے لب مسک آئے۔ گاڑیوں کو تو وہیں چھوڑا، پھر سب کے سب ہنسنے کھینچنے پاس ہی ایک آم کے تختہ میں آبراجے۔ یہاں آتے ہی دم کے دم میں ڈیرے ڈنڈے ڈال دیتے، فرش سمجھ گئے کرلیں چڑھ گئیں۔ آم اور جامنوں کے ڈھیر لگا دئے۔ اول اول دسترخوان بچھے۔ سب مل کر کھانا کھایا اور پھر سب نے ہاتھ منہ دھوا، پاؤں کی گھوریاں رچا۔ ایک ایک جوڑی باری باری سے جھوٹے لگی سس دقت لگی، کئی پھواری پڑے لگی۔ جو یکایک سانس سے ایک حسین ترین جوان ملاگیری رنگ کا نیچا کر نہ پہنے، شہزادوں کی سی اونچی سلمہ کی مسمر پر، دلی کی سپاٹ سلیم شاہی پاؤں میں، جوانی کے نشے میں جھومتا جھومتا اندھری آتا دکھائی دیا۔ بس اسے دیکھنا تھا کہ وہ سب کی سب حسین صورتیں مائے خوشی کے پھول کی طرح کھل گئیں بلکہ کھلے لاتی ہنسی دوڑی ہوئی اُس کے خیر مقدم کو گئیں۔ وہ آئے وہ آئے صالبا عالم، بس ہماری سیر پوری شہاگن ہو گئی۔ یہ لفظ گویا ہر اک کے ترجمان دل تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ حسین جوان بھی خوش خوش وہیں آ بیٹھا۔ پہلے تو اپنے میزبانوں کی خاطر سے کچھ منہ جھٹالا، اور پھر باری باری سے ہر ایک کے ساتھ جھولا جھولنے لگا۔ چنانچہ اسی طرح باری باری سے ہر جوڑی پاؤں جوڑ کر جھولتی اور باقی سب کے سب کھڑے ہو کر جھوٹے دیتے تھے اور زبان سے کہتے جاتے۔ ”آئے ہدردا کارے کارے“ بیشک ان میں سے کئی خوش گلو تھے۔ انھوں نے اس مار کو اس خوبی سے گایا کہ ایک سماں بندہ گیا۔ طرہ یہ کہ اس پر ہر اچھی صورت نے اداکاریاں بھی کیں۔ مگر بیچ یہ ہے کہ جب اُس جوان رعنا کی باری آئی تو وہ ظالم کچھ اس بلا کا خوش ٹکوتا تھا کہ اُسے ان پولوں کو

”آئے بدردا کا رے کا رے۔ آئے بدردا کا رے۔“ بغیر کسی اداکاری کے کچھ اس طرح گایا کہ سب پر اک عالم وجد طاری ہو گیا۔ بلکہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ گانا بھی ایک سحر ہے، جادو ہے، واقعی نعمت ہے خاص جس کو وہ خالق عطا کرے۔

آغا شاعر قزلباش

گنگا کا کنارہ

آنکھوں کو میسر ہے یہ دلچسپ نظارہ
اس طرح سو دریا میں ہو موجوں کو تلاطم
یہ بھیگے ہوئے گیسوئے شب تابہ کمر آہ
گرمی کی ہواؤں کا شب انداز ترنم
مصرف ہوا نشان میں اک حُسن سراپا
یہ جسم حسیں چاند سے تابندہ ہو زائید
وہ ابرکے پردے میں چھپا شرم کے مانے
انسان سے فارغ ہوئی وہ حُسن بسم
آنکھوں میں بھرا شک ہیں چہرے پہ اداسی
پہچان گئی دیکھ کے وہ مردِ حزیں کو
اک درد اٹھا قلب میں نہ بھل آئے
کہنے لگا ایجان تمنائے دل و جاں
تب حُسن یہ بولا ترے جذبے کے تصدیق
فانی ہو مرا حُسن مرا روپ ہے فانی
جس نے مجھے پیدا کیا وہ خالق عالم
تو اُس کو ذرا دیکھ کہ سدا رہی پیارا

تو دیکھ ذرا جلوہ لیلائے حقیقی

سید پرویز حسن

خزانچی کی بیٹی

خزانچی کی بیٹی کے دلچسپ انتقام کی داستان بغداد سے عراق عجم تک مشہور ہو۔ اسکو خود موصل کے بادشاہ نے اپنی زبان سے بیان کیا کہ جب میں شاہزادہ تھا اور میری عمر بیس سال کے قریب پہنچی تو میرے باپ نے جاہا کہ میری شادی کر دیں۔ نکلے اشارے سے میری والدہ نے محل میں ان لڑکیوں کو بلایا جن کے باپوں کی طرف سے بیعات آئے تھے۔ پھر مجھے طلب فرمایا کہ کبھی ان میں سے اپنے لئے منتخب کر لوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھی مگر کوئی بھی میرے دل کو نہیں کھینچ سکی۔

میرے باپ کو سخت تعجب ہوا۔ مگر وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ اس میں تقدیر کا کوئی بھید ہے۔ انھوں نے میرے دل میں بغداد ویکھنے کا بہت فوق پایا اس نے اجازت دیدی اور سفر کا ساز و سامان درست کر کے ایک محافظ دستہ بھی ساتھ کر دیا تاکہ میں جو وقت بغداد میں پہنچوں تو معلوم ہو جائے کہ موصل کا ولی عہد آیا ہے۔

راستہ میں ایک مقام پر ٹیسے بدوئی جماعت ہائے اوپر آ پڑی۔ ہر چہ کہ ہم نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ غالب آ گئے اور انھوں نے ایک ایک کو قتل کر ڈالا صرف میں باقی رہ گیا۔ جب میری طرف بڑے تو میں نے ڈانٹ کر کہا کہ میں موصل کا ولی عہد ہوں کیا تم بدشاہوں کے اوپر بھی ہاتھ اٹھانے کی جرأت کرنے لگے۔ ان کے سردار نے ہنس کر کہا کہ تم سے بہتر لشکار بھوکو دوسرا کہاں ہے گا۔ تمہارے باپ نے ہمارے بہت سے آدمی مارے ہیں ان کا بدلہ تم سے لیں گے۔ انھوں نے جھک کر ٹھیکہ لیا اور اپنے ساتھ اس جگہ لائے جہاں ان کے ڈیرے تھے۔ جھک کر ایک درخت سے لٹھروں اور خود کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔

میں اپنی اس مصیبت پر آسمان کی طرف منداٹھا کر روتا تھا۔ خدا کی شان کہ وہ جوں ہی فانی ہوئے ان کے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ تاجروں کا ایک قافلہ فلاں راستے سے گزرنے والا ہے۔ سب سے اسی وقت سنا جو کہ رواد ہو گئے۔ یقیناً سے ایک بوڑھی عورت اس درخت کی طرف آئی جس سے میں بندھا ہوا تھا وہ میری حالت دیکھنے لگی پھر بولی کہ کیا تیری ماں زندہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ منگو میری جوانی پر ترس آگیا۔ رسیاں کاٹ دیں اور ایک سمت اشارہ کیا کہ بھاگ جا۔

میں دن بھر اوقات بھر برابر چلتا رہا۔ جب اُجالا ہوا تو دیکھا کہ کچھ لوگ گدہوں پر سامان لاوے لئے جا رہے ہیں مہم بڑھا کر اس نے پوچھا کہ بغداد کا راستہ کدھر ہے۔ بولے کہ ہم وہیں چل رہے ہیں تم ساتھ ہو جاؤ۔ انہوں نے جب سنا میں لٹا ہوا پرہیزی ہوں تو بہت مہربان ہو گئے۔ تیسرے دن ہم بغداد میں داخل ہوئے۔

وہاں نہ میں کسی کو جانتا تھا نہ کوئی مجھے۔ ناچار ایک مسجد میں چلا گیا۔ دوسرے دن جب بھوکے سستا یا نوروزی تلاش میں نکلا ایک جگہ ایک حرمی دیکھی جس میں سے غریبہا روٹیاں لے کر نکل رہے تھے۔ دریا فنت سے معلوم ہوا کہ یہ حرمی کا مکان ہے جس کے یہاں ہر جمعرات کو غریبوں کو کھانا کھلایا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک حبشی نے کھانا سامنے لا کر رکھا۔ ابھی فانی نہیں ہوا تھا کہ زنا خانے کے پرہیز سے ایک نوجوان لڑکی نے سر نکال کر سلام کو

بُلیا اور کچھ کہا۔ میں نے ایسی حسین شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی صورت میری آنکھوں سے دل تک اتر گئی۔ اور محبت کا شعلہ ایسا بھڑک اٹھا کہ دماغ تک پہنچ گیا۔ قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ کھانے کے بہانے سے دیر تک بیٹھا رہا۔ خادمہ سیدھا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ یہ کون تھی جس نے تم کو بُلا دیا تھا۔ بولا کہ ہمارے آقا کی بیٹی زمرہ خاتون جو کبہہ رہی تھیں کہ اگر کھانا کم ہو تو اندر سے اور منگا لو۔

اب میں وہاں سے اُٹھا اور ایک طرف کو حیران و سرگرداں چل نکلا۔ آج تک میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا بلا ہو۔ مگر اس غزبت میں یہ مصیبت بھی سر پر پڑ گئی۔ دل کو کسی طرح قرار ہی نہیں آتا تھا۔ چلتے چلتے شہر سے باہر نکل گیا اور ایک قبرستان میں پہنچا۔ شام ہو گئی تھی جاتا تو کہاں جاتا۔ تکیہ ہی میں ایک دیوار کے قریب بیٹھ کر اپنی حالت پر رونے لگا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو پتہ آہٹ سنائی دی اور دیکھا کہ دفعۃً چار آدمی میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ پوچھنے لگے کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا آفت کا مارا پردیسی۔ وہ غور سے دیکھتے رہے پھر پوچھے کہ ہمارے ساتھ چلو۔ مجبوراً اُنکے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دور چل کر وہ ایک تہ خانے میں اُترے۔ کھانا لانے خود بھی کھایا اور مجھ کو بھی کھلایا۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ درجہ رہیں کیونکہ وہ آپس میں ایک بڑی چوری کا ذکر کر رہے تھے۔ جو انہوں نے حال ہی میں کی تھی۔ مجھ کو جوان اور پردیسی پا کر اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ کہنے لگے کہ ابھی ہم ایک ٹم پر روانہ ہونے والے ہیں تم کو چلنا ہوگا۔ میں نے دل میں کہا کہ اب یہ تیسری افتاد مجھ پر پڑی۔ جس کا خدا ہی جانتے کیا انجام ہو۔ دُرتا تھا کہ اگر اُنکا رہ کروں تو مار ڈالیں گے۔ بیٹھا دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ ناگاہ باہر سے شور سنائی دیا جس کے ساتھ ہی بہت سے سبھا ہی اندر آ گئے اور ہم سب کو گرفتار کر کے شہر میں لائے۔ رات بھر بند رکھا۔ صبح کو کوڑا ل کے سامنے پیش کیا۔

جو رہ جانے پہچانے ہوئے تھے اُنکو اپنے جرم کا اقرار کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ میں ایک پردیسی آدمی ہوں اگر قناری سے صرف کٹھری بھر پیٹے ان لوگوں نے قبرستان سے اپنے ساتھ کپڑا لیا تھا۔ چوروں نے بھی اس کی تصدیق کی اس وجہ سے کوڑا ل نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر اپنے پاس رکھ لیا۔ معلوم نہیں کہ اس کی غرض کیا تھی چند روز کے بعد وہ بہت مہربان نظر آنے لگا۔ میں نے اپنی شاہزادی کا ذکر تو اس سے نہیں کیا لیکن خزانچی کے کہہ جو واقعہ پیش آیا تھا بیان کر دیا۔ اس امید پر کہ شاید کوئی صورت وہ نکال سکے۔ پتہ وہ خاموش رہا پھر بولا کہ مشکل یہ ہے کہ میرے اور خزانچی کے درمیان پرانی عداوت چلی آتی ہے وہ میری بات کیونکر مانگا مگر تاہم صبر کرو میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکال دوں گا۔

چند روز کے بعد اُس نے تنہائی میں مجھے بلایا اور کہا کہ میں نے ایک اچھی تدبیر سوچ لی ہے۔ مگر تم اپنے آپ کو بصرہ کے قاضی کا بیٹا بتانا۔ پھر مجھے اچھے کپڑے پہنا کر ایک حجرہ میں بیٹھا دیا اور اپنے خاص ملازم کو خزانچی کے پاس بھیجا کہ ایک ضروری معاملہ میں گفتگو کرنی ہے اگر قدم رنجہ فرمائیں تو عتابت ہوگی۔ خزانچی اس سے خوف زدہ تھا۔ فوراً آیا۔ کوڑا ل نے نہایت اعزاز کے ساتھ اسکو مسند پر بیٹھا اور کہنے لگا کہ میرے اور آپ کے درمیان رنجش جو جس سے میں نادام ہوں۔ غرض سے میری خواہش اس کے آپس میں صفائی ہو جائے۔ اب خدا نے اس کے لئے ایک اچھی صورت نکال دی ہے۔ ایسے میں نے آپکو تکلیف دی۔ وہ یہ ہے کہ بصرہ کا قاضی میرا مومن ہے اسلئے بیٹا آپ کی لڑکی کی خوبیوں کو

مسن کر میرے پاس آگیا اور میرے ذریعے نکاح کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو ہم آپ ایک ہو جائیں گے۔ لڑکا مسن و جمال میں کیلتا اور علم و ادب میں فائق ہے۔ یہ کہہ کر مجھے بلایا۔ خزانچی نے دیکھا۔ گفتگو کی اور بہت پسند کیا۔ گھر جا کر منظوری کا پیغام بھیج دیا اور دن مقرر کر دیا۔ تاریخ پر کو تو ال نے لوگوں کو جمع کر کے شادی کی محفل آراستہ کی۔ اور نکاح ہو گیا۔ خزانچی مجھ کو اپنے گھر لایا۔ وہاں عورتیں جمع تھیں۔ نگارہی تھیں۔ سب نے مجھ کو دیکھا اور تعریف کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ زہرہ میری صورت، بات چیت خاصہ محبت کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو جب اٹھ کر ہم منہ دہو رہے تھے کو تو ال کا آدمی میرے وہ بیٹے کپڑے لے ہوئے آیا جو اس وقت میرے جسم پر تھے جب میں گرفتار ہوا تھا۔ اور کہا کہ یہ اپنے کپڑے لو اور کو تو ال صاحب کے کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں واپس کرو۔ یہ سن کر گھر کے لوگ گھبرائے۔ میں بھی حیران ہوا اور زہرہ مہبوت ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اب میں نے ساری داستان سنی تھی کہہ سنائی۔ زہرہ کو میری باتوں پر یقین آگیا وہ خوش ہو گئی۔ نیا لباس منگا کر مجھے دیا اور کو تو ال کے کپڑے واپس کر دیے۔ پھر بولی کہ کو تو ال نے ہلے گھر بھر کو ذلیل کرنے کی کوشش کی ہو میں اس سے بدلہ لوں گی اور انہیں سگو نہیں اسکا قرض ادا کر دوں گی جن سگو نہیں اس نے دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس نے دہو کا دینے کے لئے مجھے قاضی زادہ بتایا مگر حقیقت میں میں شاہنوازہ ہوں لہذا اسکی شرارت سے نقصان کیا پہنچا۔ جس کا بدلہ لینا ضروری ہو۔ مگر عورت جب انتقام پر اتر آئے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ بولی کہ تمہاری شہزادی کی کا معاملہ نہیں ہے تم اگر شہزادے نہ بنی ہو تو میرے لئے تمہاری محبت کافی تھی مگر اس نے دوست بن کر دشمنی کی ہے اس لئے بدلہ لینا لازم ہو۔ تم اجازت دیدو۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری رائے یہی ہے تو بہتر ہے۔

اُس نے سادہ لباس پہنا، اُوپر سے ایک معمولی چادر لپیٹ لی اور اکیلی کو توالی پہنچی۔ وہاں ایک طرف الگ کھڑی ہو گئی۔ کو تو ال نے آدمی بھیج کر دریافت کیا کہ کس نے آئی ہے۔ جواب دیا کہ ایک نہایت اہم ضرورت سے، جسکو تمہاری میں کو تو ال صاحب سے عرض کر دوں گی۔ اُس نے ایک حجرہ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود وہاں گیا۔ زہرہ نے اُس کے سامنے اپنے چہرے کو کھول دیا اور کہا دیکھتے کیا میں اندھی ہوں؟ کیا میرا چہرہ کالا ہو؟ کو تو ال دیکھ کر مدہوش ہو گیا، کہنے لگا نہیں نہیں یہ آنکھیں حور کی ہیں، یہ چہرہ بری کا، جو انکھوں کو اندھا اور اس چہرے کو کالا بتائے وہ خود اندھا ہے مگر اس سے مطلب !!

بولی کہ میں آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور آپ کی باتیں سن رہی ہوں کیا کوئی کہیں کیا بہری ہوں؟ بولا کہ بہرگز نہیں جو ایسا کہتا ہے اس پر خدا کی لعنت۔ مگر مدعا تو کہو۔

اب اس نے چادر اتار دی اور حجرہ میں خرام ناز سے چلنا شروع کیا اور کہا کیا میں ننگری ہوں کیا میرے پاؤں مخلوق ہیں؟ بولا کہ خدا کی قسم ایسی خوش نما رفتار اور ایسے خوبصورت پاؤں آج تک میں نے نہیں دیکھے کس کی آنکھیں چوٹ گئی ہیں جو تم کو ننگری کہتا ہے۔ مگر غرض تو بتاؤ یا محض سنانے کے لئے آئی ہو۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور لیل

کہ کیا میں کبٹری ہوں۔ پھر بال کھولتے اور کہا کہ کیا میں گنہگار ہوں؟ بولا کہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو تمہارا قد سرو ہے اور تمہاری زلفیں سنبل۔ مگر مقصد تو بیان کرو یا مارڈالنا ہی منظور ہے۔

اُس نے گرتی کی آستینیں چڑھالیں اور دونوں کلاٹیاں اُس کے سامنے کر کے بولی کہ جناب کیا میں لولی ہوں کیا میں گنہگار ہوں؟ بولا کہ کون مرد وہ ہے جو ایسا کہتا ہے یہ کلاٹیاں بلور اور بیجنائی ہاتھ چنار کے پنچوں سے بڑھ کر ہیں۔ مگر کچھ کہو بھی تو۔ میں تو دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔

اب وہ چادر اڑھکے بیچہ گئی اور نگلیں آواز میں کہنے لگی کہ جناب میں ایک رنگریز کی بیٹی ہوں جس کے دل میں نہیں معلوم کیا سالی ہے کہ وہ اپنے گھر سے جھک جھکا لانا نہیں چاہتا۔ جہاں جہاں سے شادی کے پیغام آئے کسی سے کہہ دیا کہ میری بیٹی گونگی اور بھری۔ کسی کو جواب دیا کہ لولی اور رنگریز ہے۔ کسی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اندھی ہے اور پانچ۔ یہاں تک کہ اب پیغام آئے بھی بند ہو گئے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں بھی دوسری عورتوں کی طرح سینے میں دل رکھتی ہوں۔ کب تک یہ ظلم و ستم آتی اور اس کے گھر میں پڑی مڑتی رہوں۔ کو تو ال نے پوچھا کہ آخر کوئی وجہ بھی ہے، بولی کہ وجہ تو اسی سے جو چھٹی چاہتے ہیں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اُس نے تو اس قدر سختی کی ہو کہ نہ بچے کہیں بچنے دیتا، نہ کسی عورت کو گھر میں آئے دیتا ہے۔ بڑی تدبیروں سے آج گھڑی بھر کے نکلے آپ کے یہاں آ سکی ہوں۔ آپ حاکم ہیں اور اللہ نے آپ کو عزت دی اور سیکسوں کا فریاد اور سنایا جو میری مدد کیجئے۔ ورنہ گھٹ گھٹ کر صراحت کیجئے۔ یہ کہتے ہوئے رونے لگی۔

کو تو ال نے کہا کہ میں پوری مدد کر دیتا اور خدا نے چاہا تو بہت جلد اس مصیبت سے رہائی دلا دیتا۔ یہ سن کر وہ شکر یہ ادا کرتی ہوئی اٹھی۔ کو تو ال نے گردن جھکا کر کہا کہ محترمہ اگر میں اپنا پیغام آپ کے لئے بھیجوں تو ناپسند تو نہ کرؤ گی، بولی۔ جناب اس سے بڑھ کر کوئی عزت جھک جھکا کر حاصل ہو سکتی ہے۔ بولا بس میں پھر اعلیٰ بیان رکھنے سب کچھ ہو جائیگا۔ پتہ کیا ہے؟ بولی۔ پل کے متصل۔ لال درمیر۔ عبدال رنگریز کا مکان جس کے آگے گجور کا درخت ہے۔ کو تو ال نے کہا چلیے میں کارروائی شروع کئے دیتا ہوں۔

فرد کو تو لولی سے سیدھی میرے پاس آئی۔ سارا ماجرا سنایا۔ ہم دونوں خوب ہنسنے۔ ادھر کو تو ال نے ایک آدمی عبدال رنگریز کے پاس بھیجا کہ وہ ڈرتا ہوا آیا مگر دیکھا کہ توقع کے خلاف کو تو ال صاحب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مزید پرسی کے بعد اندر حجرہ میں لیجا کر بٹھایا اور کہا کہ سننے میں آیا ہے کہ آپ کی لڑکی جو ان ہے اس لئے آپ کو تکلیف دی ہو کہ ایک پیغام پیش کروں۔ عبدال نے کہا مسکندہ تو اندھی اور پانچ ہے۔ کو تو ال مسکرایا اور بولا کہ ہاں وہ ایسی ہی ہوگی لیکن اگر اس پر بھی کوئی بیباہنے پر راضی ہو تو۔ اُس نے کہا جناب وہ سنگڑی اور بولی ہے۔ کو تو ال دل میں خوش ہو کر بولا کہ بالکل صحیح مگر دیکھا میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ عبدال نے کہا بھلا ایسا کون ہو جو ان عیبوں کے ہوتے ہوئے بھی اُس سے نکاح کر لے۔ بولا کہ وہ یہی شخص ہے جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ عبدال نے چلا کر کہا خدا اگوا ہے وہ آپ کے قابل ہرگز نہیں۔ بولا کہ اس سے آپ کو کیا۔ میں ان تمام عیبوں کے ساتھ بھی شادی بردھنا مند ہوں۔ عبدال نے دل میں سمجھ لیا کہ معلوم ہونا ہو اس کو کسی نے دھوکا دیا ہے۔ مجبوراً کہا کہ اگر آپ کو اصرار ہے تو پھر مجھے بھی رنکار نہیں۔

کو تو ال منظوریں مسکرتے خوش ہوا اور بولا کہ مہر کیا ہوگا۔ عبدال نے سوچا کہ جب یہ ایسا متوالا ہو رہا ہے تو کی کیوں کی جلتے کہنے لگا کہ ایک ہزار شرفی۔ اُس نے قبول کر لیا۔ اور اُسی وقت قاضی اور اپنے احباب کو بٹوایا۔ عبدال نے جمع کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ شادی کو تو ال صاحب اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ کوئی جسمانی عیب ایسا نہیں ہے جو میری لڑکی میں نہ ہو۔ لہذا اب میں میرے اوپر الزام نہ رکھا جائے۔ کو تو ال نے کہا کہ تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کے بعد قاضی نے نکاح پڑھایا اور مہر عبدال کے حوالے کر دیا۔ وہ لیکر روانہ ہوا اور کہہ گیا کہ گھر پہنچ کر میں لڑکی کو رخصت کئے دیتا ہوں۔

اُدھر کو تو ال کی بیوی کو گھر میں جب اس شادی کی اطلاع ہوئی تو اُس نے اُسی وقت اُسکو بلوایا اور گر بیان پکڑ کر کہا کہ میں ہرگز کسی سوکن کے ساتھ نہیں رہ سکتی جھگڑا بھی طلاق دو۔ نئی شادی کے لشہ میں بیوی کو طلاق دیدی وہ سو رہا ہو کر اپنے میکے کو چلی گئی۔

اب کو تو ال نوروس کا انتظار کرنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چار آدمی ایک صندوق اٹھائے چلے آئے ہیں۔ اب تک اسی خیال میں تھے کہ رنگرز کی بیٹی نے جو کچھ کہا ہے سچ ہی ہے۔ سب کو ہٹا دیا اور خود آکر صندوق کا پردہ کھولا۔ دیکھا تو اُسیں ایک اندھی ابا بچہ۔ کالی زندہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ منہ سے چیخ نکلی گئی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اب سمجھ میں آیا کہ کتنا بڑا دھوکا کھایا۔

بغداد کی گلی گلی میں یہ دوستان پھیل گئی اور یہ سبھی معلوم ہو گیا کہ کس نے یہ چکر دیا۔ چند روز کے بعد خراجی کے مشورہ سے میں خلیفہ کی قلمبوسی کے لئے گیا۔ انکو جب معلوم ہوا کہ میں موصل کا ولی عہد ہوں تو خوش ہو کر سینے سے لگا لیا اور کہا کہ ہم تو تمہارے انتظار میں تھے تو یہ کیوں ہوئی نہیں نے سفر کا واقعہ بیان کیا بغیر بابا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے تم کو سلامت رکھا مگر تم نے ناحق شرم کی جس حالت میں بندہ اب میں پہنچے تھے ہمارے پاس آنا چاہیے تھا۔ تمہارا باپ ہمارا دوست ہے۔ انہوں نے قصر خلافت میں ایک حصہ مخصوص کر کے جھکو حکم دیا کہ معذہنی بیوی کے وہاں رہوں۔ اسی درمیان میں خبر آئی کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا مجھے بہت رنج ہوا۔ خلیفہ نے تسلی دلائی اور پھر تین ہزار فوج کشا متہم کو موصل کی طرف روانہ کیا۔ یہاں ہم جس روز پہنچے سارے شہر نے استقبال کیا پھر میری تخت نشینی کا جشن منایا گیا۔ اب میں بادشاہ ہوں اور زمر و ملکہ جب کبھی رنکرین کے داہکا ذکر آتا ہے تو ہم خوب ہنستے ہیں۔

اسلم حیر چوری؛

چغتائی نمبر

جس میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے کم و بیش بیس ہائیت پاکیزہ مضامین شامل ہیں۔ مزاحیہ افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ اس میں بیش بہا کتابیں شہزادی، اور سوانہ کی رو میں، بھی شامل ہیں۔ تقریباً دو سو صفحے کا ہائیت قیمتی مجموعہ مضامین پر۔ قیمت ایک روپیہ معہ محمولہ لڑک۔

لے کا پتہ: سنائی بکڈپو۔ دہلی ۱

دلی جون بدلتی ہے

پہلے اندر پرست میں دلی کی نیوٹرٹی تھی، جہاں آج کل بُرا قلعہ ہے۔ وہاں کیر و پانڈو نے اپنا شہنشاہی دربار راج سوئیک کے نام سے کھاتا تھا اور اسی جگہ راجہ مشہور پال نے سری کرشن جی کی توہین کی تھی اور کرشن جی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ اور اسی جگہ جسے کنو مشہور بازی گاہ تھی جس پر مہاجرات جیسی عظیم الشان لڑائی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پھر اس جگہ نے جون بدلی اور شیر شاہ نے یہاں قلعہ بنایا۔ دین پناہ نام نہاد کھانا ایک خوبصورت مسجد بھی بنائی اور ایک مکان بنایا جس کو شیر منڈل یا شیر منزل کہتے تھے۔ افغان حکومت کے خاتمہ کے بعد ہائیوں دلی میں دوبارہ آیا تو اسی شیر منڈل کے زبیر چاند کیپٹن چوٹھائے نے لگا تو پاؤں پھسلا، گر پڑا اور مر گیا۔ تاریخ موتی: یہاں بادشاہ ازہام اقتدار اس قلعے کے غلب میں اکبر کی اتالیق ماہم انکھ نے مسجد بنائی اور ایک مدرسہ بنایا جہاں اکبر بھی کچھ دن بھر رہا۔ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اسی مدرسے میں پڑھتے تھے اور اسی مدرسے کے بڑے دروازے کی بلانی کھڑکی میں ایک جلیبی غلام چھپ کر بیٹھا تھا اور اُس نے اکبر پر تیر چلایا تھا جس کے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی زیارت کر کے واپس آ رہا تھا، اور تیرے اکبر کے بازو کو زخمی کیا تھا۔ اور اسی مسجد اور مدرسے کے شمال میں دلی کا لال چوک تھا اور ایک عظیم الشان دروازہ تھا جس کے کندھار ب بھی باقی ہیں۔ اس لال چوک میں بڑے بڑے جوہریوں کی دوکانیں تھیں اور ایران اور عرقند اور بخارا کے بڑے بڑے سوداگروں کی دوکانیں میں اپنا مال لے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ دوکانیں اب بھی موجود ہیں۔ لال چوک سے شمال کی طرف بڑھیں تو سڑک کے غلب میں پہلے مرزا بیگل کا مزار ہے اور پھر حضرت ملکہ رانی الدین یار پتانی کا مزار ہے اور سڑک کے شرق میں ٹیلے پر حضرت بابا بکھر حیدری طوٹی کا مزار ہے جہاں بانسوں پر بے شمار خشکے ٹھکیاں اونٹنی رکھی ہوئی ہیں۔

لال کوٹ اندر پرست دلی نے جون بدلی تو راجہ پرتھی راج نے لال کوٹ قلعہ بنایا۔ جہاں آج کل قطب مینار ہے۔ قطب الدین ایبک نے یہ قلعہ پرتھی راج کی فتح سے لے لیا۔ اور اسلامی دلی اسی جگہ آباد کر دی۔ ایبک کے بعد قطب تک دلی یہاں رہی پھر اس نے جون بدلی، قطب الدین کے پوتے کی قبائو نے جنما کے گناے ہوئے اور دلی اس پاس بسائی جہاں آج کل اوکھلے کا بند ہے۔ جلال الدین خلجی نے کیقباد کو قتل کر کے جنما میں ڈال دیا۔ اور غلام خاندان کی حکومت جنما میں اس جگہ ڈوبی جہاں آج کل جامعہ ملیہ کی عمارتیں بنی ہیں، اور ڈاکٹر انصاری دفن ہوئے ہیں۔ جلال الدین کے بعد غلام الدین خلجی نے پھر دلی کی جون بدلی اور سیرتی کے نام سے دلی بسائی جس کے کندھار مقبرہ صفدر جنگ اور قطب مینار کے بیچ میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ قطب الدین خلجی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا اور غیاث الدین تغلق نے حکومت حاصل کی تو دلی قطب مینار سے پنج میل شرق میں چلی گئی اور تغلق آباد کا عظیم الشان قلعہ تیار ہوا۔ تغلق خاندان کا خاتمہ ہوا تو حکومت نو دھویوں میں آئی اور انہوں نے چراغ دہلی کے قریب دلی بسائی۔ ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں باہر کے ہاتھ سے مارا گیا تو باہر نے قدیم دلی پر تنازعہ کی۔ اس کے بیٹے ہائیوں کو شیر کشا ائے ایمان بھگادیا۔ جب وہ واپس آیا تو بڑے قلعہ کے پاس شیر شاہ کی بسائی ہوئی دلی میں رہنے لگا۔ اکبر کا خوجہ ہوا تو اس نے انگریزوں کو ہاتھ دیا۔ جہانگیر کے زمانے تک دلی بُرے قلعہ کے اسی پاس رہی۔ شاہ جہاں نے یہ شہر بسایا جس میں لال قلعہ ہے اور جامعہ کے جنوب میں اردو بازار ہے اور رستہ لال قلعہ کے اوٹیر صاحب اس بازار میں بیٹھے سناٹی

کاسانہ لکھا کرتے ہیں۔

اب انگریزوں نے شاہجہاں کی دلی کے گوشہ غرب و جنوب میں ایک نئی دلی بسائی ہے جسکی عمارتوں کے مختلف نقشوں کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ یہیں کی اینٹ نہیں کاروڑا بھانجی سے لکنبہ چوڑا! اور حضرت اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ہے

مری نظروں میں اب کچھ رنگ دہلی جم نہیں سکتا دہلی مٹی کے تودے ہیں وہی جتنا کاپانی ہے

آؤ آگن اور سانحہ جتو اور جان اور روح کے لئے ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دہلی بھی ایک جیسے ہے اور ایک جان سے اور ایک روح ہے۔ نئی دلی کی عمارتوں میں کہیں رومنوں کا طرز تعمیر ہے کہیں یونانیوں کا کہیں جرمنوں کا کہیں ہندوؤں کا کہیں مسلمانوں کا اور کہیں جانات کا۔ یہ خصوصیت دنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے کہ وہاں جانات کا طرز تعمیر بھی ہو، میراث اسے لکھنؤ میں کوئی ہل قلعہ تاریخ کی مکان پر لکھا دیکھا تھا تو اس کی ہنسی اڑاتی تھی۔ نئی دلی میں جاؤ تو ہنسی نہیں آتی بلکہ رونانا ہے۔ کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہا گیا مگر اس اونٹنی کی کوئی گل سیدی نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے دلی نے اس نئی دلی کے ختم سے پہلے کوئی بیت لکھنا کر م کیا تھا کہ اس کو اس عجیب و غریب چون میں آنا پڑا۔

شاہجہاں کی بنائی ہوئی دلی میں ایک اور دوبارہ بھی تھا جس کے پاس اور بہت سے اچھے اچھے اور بازار تھے مثلاً: **اردو بازار** کی پہلی میں بقول مرزا غالب کے "انقلاب کا بندہ آیا اور اس نے ان بازاروں کی گندیلوں کو ہلا ہلا کر گرادیو" اب چاندنی چوک کی شہرک سے وکٹوریہ اسپتال تک ایک بڑا میدان سنسان پڑا رہتا ہے جس کو پریڈ کا میدان کہتے ہیں اور جس میں چاندنی چوک کی طرٹ و مندر ہیں اور وسط میں حضرت شیخ عظیم اللہ جہاں آبادی کی درگاہ ہے اور جنوب میں ایڈورڈ پارک ہے اور غرب میں سر ڈیوڈ کا مزار ہے۔ اس میدان کے جنوب میں ٹاٹا ٹرانزسمینا کی عمارت سے لیکر نعتان الملک کچھ مینا صاحب کے مطلب تک ایک لمبی شہرک چلی گئی ہے جس کے جنوبی کنارے کنارے بہت سے کتاب فروش اپنی دکانیں سجائے بیٹھے رہتے ہیں اب اس بازار کا نام اردو بازار رکھا گیا ہے کیونکہ اس بازار کے شمال میں جو پیش میدان پڑا ہے ایڈورڈ پارک اور جامع مسجد کے بیچ میں پورا اردو بازار کی جگہ تھا محبوب وہاں آتھا نے بنائے گئے ہیں تاکہ ایڈورڈ پارک اور جامع مسجد میں جانے والے اپنی انسانی ضروریات یہاں پوری کر سکیں۔ دلی میں سبیل گیسٹ میں بٹنے ہندو مسلمان ممبر ہیں وہ اس عجیب انتخاب کے ذمہ دار ہیں مگر وہ سچا رہے کیا کرتے! بس میدان کو لوگوں نے "جنگل" سمجھ رکھا تھا جہاں آزادی سے رات بھر کی گناہیں دور کی جاتی تھیں کیٹی نے وہاں پردہ دار محفوظ جگہ بنا دی۔

تو اب سوچنا یہ ہے کہ دلی نے جو اتنی جنیں بدلی ہیں تو اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ نئی دلی کو تو دلی کی چون نہیں کہہ سکتے۔ چون تو نہ شرقی ہے نہ غربی، مثالی ہے نہ جنوبی۔ آسمانی ہے نہ کوہستانی۔ نہ جنت سے اس کو کچھ تعلق ہے نہ دوزخ سے نہ اعراف سے۔ یہ ہے عجیب نہیں ہے۔ اور اگر کہیں ہے تو یہ ضرور ہے۔ اس واسطے میں تو سوائی کے سنانے میں ایک نشہ ہے جوئے آدمی کی طرح مجھ مجھ کر اور بہک بہک کر اور تشاہد کے کندھے پر ہاتھ ٹکا کر یہ کہتا ہوں کہ دلی اب چون نہیں بدلتی، اس کا جتنا تراجم ہو گیا تو آگن کا چنگر پورا ہو گیا۔ اب دلی کو برون کوکشل لگیا اسلئے دلی جتنی ہے ۵

ساتیا برہیز و درہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را

جب میں اپنی دونوں آنکھیں بند کئے چون کی ہر تاریخ شام کے ۵ بجے خوب تیز رو اور گرمی میں بیٹھا ہوا ہوں **افسانہ نمبر ۳۳** مضمون لکھوا رہا تھا تو میرے لڑکے ملی نے کہا یہ مضمون سنانے کے لئے نہیں سنائی کے افسانہ نمبر کیلئے

دیکھا رہے ہیں کہ کہا تو بیٹیاں بھی تو ایک افسانہ ہی لکھ رہا ہوں۔ ہر چہ جن جو بدلتی ہے گزرا ہوا افسانہ سُنا سکتی ہے اور اُنے والا افسانہ سُنی ہے۔ مجھے سناتی ہے اُنکھ لڑاتے دو اور اُس کی چشمِ غمور میں دُنیا بھر کے افسانے دیکھنے دو۔ میں ان سب افسانوں میں اپنی پیاری راج و لازمی ولی لینے والی من موزن ولی کی کہانی دھو دھو کر نئی چاہتا ہوں۔ جہاں بہت سی قوموں نے اپنی اپنی بیسی سُنائی اور کہتے کہتے چُپ ہو گئی تو کسی نے کہا ہے

چہن یونہی رہیگا اور ہزاروں جاسانور اپنی اپنی بولیاں سب بولی کر رہے جائیں گے
 سناٹے کے پاس کھڑے ہو جاؤں اور پوچھوں کیوں مسکرا رہا ہے تو بتاؤ یہ سانسے اونچے اونچے میناروں والی کیا تیر رہے تو وہ جواب دے
 شاہ جہاں کی نماز کا افسانہ پھر پوچھوں اور وہ درال لال دیواریں کہیں میں، تو وہ کہے، شاہ جہاں اور اس کی اولاد کا عشرت خانہ
 اور پھر بے تاریک خبر رسائی کے لئے کھولے گئے دروازے کا افسانہ، اور ایسی آواز میں جیسے موٹر کی ہوتی ہے ایسی نہیں جو سارنگی کے
 تاروں سے نکلتی ہے اور ایسی نہیں جو ساجن سیاں کے میٹھے بولوں میں سناؤ دیتی ہے۔ تو میں یہ افسانے سن کر میں کُن ہو جاؤں۔
 اور پھر ٹھپ ہو جاؤں — اور پھر کہوں کہ میں بات تم ہوئی۔ ع۔ ب۔
 خواب تھا کچھ کہہ دو کیا جو افسانہ تھا۔

ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی کا بخش تراجم

سلاہو

نجم البحر

شہرہ آفاق فرامیسی الشاہ پرواز گشتیہ نظام سیر کا شہ پارہ جس میں قراط جہت قدیم کی کئی جہتی تہذیب اس طرح از سر نو الفاظ پر تعمیر کی گئی ہے کہ اب سے دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ سلاسیو اور مائو کی محبت کی کہانی اس قدر حسرتناک ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رہتے ہیں۔

دخلیوں کی لڑائیوں کا بیان جب آپ پڑھیں گے تو سانس بھی روک کر لیں گے۔ غرض شروع سے آخر تک یہ کتاب عجیب و غریب چیز ہے۔ ضخامت ۵۵ صفحے قیمت تین روپے۔

علاوہ محصول لداک۔

پانچ ہزار سال پہلے جب اقصیٰ کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی تو رب ثمن کی سی بی ملک بزم الحمر کے سر بھنگا مخلوق میں آنکھیں کھولیں۔ یہ وہان چرمی، ہوان، ہونی اور پھر کسی کی آستیا، عشق شروع ہوئی جو دردِ المناک ہے۔ ساحرہ آنکھی کا جادو۔ ثوران کے مظالم۔ کیفی کی پراسرار ہستی۔ شمعون بنونی کی حسد۔ آفری۔ غرض اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنفت کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ اس کے دوران مطالعہ میں آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ ماضی کا دلکش نظم آپ حال کی آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں۔

ضمانت... ہم صفحت قیمت کا علاوہ محصول لداک

و خلیوں کی لڑائیوں کا بیان جب آپ پڑھیں گے تو مصنف کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ اس کے دوران مطالعہ میں آپ کو سانس بھی روک کر لیں گے۔ غرض شروعات سے آخر تک یہ کتاب عجیب و غریب چیز ہے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحہ قیمت تین روپے ہے۔

شعراست... صفات قیمت کا علاوہ محصول کا

میں نے کہا ہے۔ ساقی بکٹ پو۔ وصلی

فسانہ آزاد

اردو زبان کے شرمناک مصنف۔ فسانہ آزاد پبلشرز لالہ مرشار لکھنؤی کے برابر اور چند شاہدین سے بہتر خیال کے جاسکتے ہیں۔ لیکن غالباً اردو کی کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جو ہر پہلو سے فسانہ آزاد کی طرح کی جھی جائے۔ اس کا مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو بولستان خیال اور طہم ہوجہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں بھی وہی خیالات کی آہ مضامین کی کثرت اور بیان کی دلکشی ہے جو فسانہ آزاد میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ کتابیں فارسی سے اردو میں آئی ہیں۔ اور ترجمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فسانہ آزاد اردو ادب کی اپنی بنائی ہوئی چیز ہے اور ایجاد کی ذیل میں آتا ہے۔ خود مرشار نے اور کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کا نام فسانہ کے ساتھ لیا جاسکے۔ اس شہرت و خوبی کے باوجود یہ کہنا کسی قدر دشوار ہے کہ فسانہ آزاد کیا چیز ہے؟ اس کے مصنف کو عموماً ناول نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کو اردو زبان کا سب سے پہلا ناول نویس خیال کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم فسانہ آزاد کو ناول کہہ سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ناول کیا کہاں صحیح تعریف اپنے ذہن میں قائم کریں۔ یہ ایک طویل مضمون ہے اور پندرہ منٹ کی مختصر تقریر میں اس پر بحث کرنے کی مہلت نہیں۔ اٹالین فریخ وغیرہ میں جن سے لفظ ناول نکلے اس کے کچھ اور ہی معنی تھے۔ انگریزی میں بھی اس لفظ کی موقع کے لحاظ مختلف تعریف ہوتی ہے۔ لیکن عموماً اس کو ہر قسم کے بناؤں اور خیالی قصہ کہانیوں کے لئے بول سکتے ہیں مگر لفظ ناول کو ان میں سے معنوں میں لیا جاتا ہے تو فسانہ آزاد کو ناول کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر ناول سے ہماری مراد اس قسم کے قصہ ہوں جو اٹھارویں صدی سے آج تک انگلستان میں رائج ہے یہ تو فسانہ آزاد کو ناول کہتے ہوئے ضرور تامل ہوگا۔

اس کتاب کی حقیقت کو پہچانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کن حالات میں لکھی گئی تھی اور اس کے لکھنے سے اس کے مصنف کو کیا مقصد حاصل کرنا منظور تھا۔ فسانہ آزاد کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب لکھنؤ کی بادشاہت کو ختم ہونے لگی تھی۔ پچیس سال ہی گزے تھے وہاں کے امیر اور اس وقت حال لوگ ابھی تک اس سٹیٹ پرستی میں مبتلا تھے جس کی بدولت شاہانِ دودھ کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کچھ کی کچھ دولت ان نوابوں اور رئیسوں کے قبضہ میں موجود تھی اور وہ اس کو مرغباری بیٹریاؤں، جنگ بازی اور ان سے بھی زیادہ قابل اعتراض بازیوں میں سپردینے لگاتے تھے۔ اپنی حالت کو بدلنے کا ان کو مطلق کوئی خیال نہ تھا اور نہ چین کو ان ذہنی اور معاشرتی تغیرات کا کوئی احساس تھا جو مغربی تعلیم اور مغربی خیالات کی درآمد کی بدولت درپیش تھے۔ فسانہ آزاد کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس طبقہ کو اس کی صورت تکمیل کے آئینے میں دکھائی جائے۔ شاید وہ اپنی بھڑکی ہوئی شکل سے بیزار ہو اور اس کو سنوارنے کی کوشش کرے۔ اس قسم کے اصلاحی یا جھوٹے خاکے اور لوگوں نے بھی کھینچے تھے۔ اخبار اور دودھ پنچ میں بہت سے قابل امیروں کی مزاحیہ غرض منشاں ہوتی رہتی تھیں جس کا مقنا یہی تھا کہ ان نوابوں رئیسوں کو خوابِ خوش سے بیدار کیا جاسے۔ نواب سید محمد نادر کو نال دہار کی تم کا ایک مزاحیہ ادبی خاکہ ہے اور پہلے اور دودھ پنچ میں شائع ہوا تھا اب بھی کبھی لکھنؤ کے کتاب فروشوں کی فہرستوں میں نظر آتا ہے۔ مولانا اختر حسین الد آبادی جن کے کلام کو اس وقت بہت فروغ حاصل ہے ان کی جھوٹ اور مزاحیہ شاعری کی ابتدا بھی اور دودھ پنچ ہی سے ہوئی۔ اور دودھ پنچ کا براہِ جہیز اور اخبار تھا جسے اردو ادب کے عین اعظم منشی نوگلشور نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اگرچہ طرِیفانہ مضامین

کے لئے وقف نہ تھا لیکن چونکہ اُس زمانے میں سیاست سے لوگوں کو چند اداں و بعضی زنجی اور اخبار سینی کا تذکرہ نہیں معلوم کرنے کے علاوہ دہلی شوق کی تسکین تھا۔ اودھ اخبار کو بھی اپنے خبریادروں کی تقریر کا کچھ مسلمان دیتا کہ ضروری تھا یہ خدمت پندت رتن اتھہ سرشار نے جو غائب اُس وقت اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے، اپنے ذمے لے لی اور فساد آزاد کا ایک حصہ ہر پوچھ کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ کتاب کے ابتدائی ابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر مذکورہ اوہی خاکے ہیں جن میں سے ہر ایک لکھنؤ کی معاشرت کا ایک رخ دکھاتا ہے۔ اور اُن میں باہم سونے اس کے کہ کوئی ربط یا تعلق نہیں کہ وہ سب ایک ہی شخص یعنی آزاد کے مشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں۔ کیا یہ بچہنا دوست ہو گا کہ شروع میں سرشار کا خیال کوئی باقاعدہ اور منظم قصہ لکھنے کا نہ تھا بلکہ لکھنؤ کے قدامت پسند باشندوں کی روزمرہ کی زندگی کی ایک جھلک دکھانی مقصود تھی اور اُن کے پیش نظر بعض انجیز معنفین مثلاً ایڈمین اور ایشیل اور کٹر وغیرہ کے وہ اوہی خاکے تھے جو انہوں نے اپنے زمانے اور اپنے ملک کی معاشرت کی گنجائش اور اصلاح کے لئے لکھے تھے۔ بہر حال سرشار کا ابتداء میں کچھ بھی مقصد ہو لیکن قدرت نے اُن کو مصدقہ نظر دکھائی تھی کہ نہ صرف اس زندگی کے تاریک پہلو دیکھ سکتے تھے جس کی اصلاح منظور تھی بلکہ اُس کے ہر ایک پہلو پر اُن کی بچہ تھی اور اُن کا نور انشاں قلم اس کے تمام سیاہ و سفید کو روشن کرنے کے لئے کافی تھا اور اگرچہ شروع میں آزاد کی حیثیت اس زندگی کے ایک تماشا کی تھی لیکن جب وہ لکھنؤ کے چونک اور بازاروں، میلوں اور تہواروں کی سیر کرتے ہوئے اور انہوں کی مصطفیٰ کا لطف اٹھاتے ہوئے حسن آرا کے محل تک پہنچ جاتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں تو یہیں فساد آزاد کے ایک قصہ یا داستان ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا لیکن پھر یہ سولہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو کس قسم کا قصہ اور کس قسم کی داستان خیال کی جائے؟ میرا قیاس ہے کہ سرشار کا دوسرا مقصد ایک ایسے قصہ کی تصنیف تھا جو داستان امیر حمزہ وغیرہ پرانی قسم کی داستانوں اور مغربی نمونے کے نئے طرز کے ناولوں کے بین ہیں اور جس میں دونوں کی اوہی لطافتوں کو ایک جگہ جمع کیا جاسکے۔

پُرانی داستانوں کی طرح فساد آزاد میں خطائ عقل واقعات اور جادو اور طلسمات کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اور بہت سی باتا میں وہ ان کا ہر رنگ ہے۔ اول تو قصہ کی اٹھان باطل وہی ہے جو اکثر پُرانی داستانوں کی ہوتی ہے۔ قصہ کا ہیرو کسی عورت کے حسن چہلا کی شہرت منکر یا اس کی مصورت کی ایک جھلک دیکھ کر اُس کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ آزاد کی مشائسانی حسن آرا کے ساتھ کسی سنانا تعریف یا ایک آدھ جھلک سے کچھ زیادہ تھی لیکن اُن کے دل کے اُنے کا وہی ناگہانی ڈھنگ ہے جو پُرانی داستانوں میں دکھائی دیتا ہے اس کے بعد ان داستانوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت اپنی شادی کسی شریک مسخالی ہے اُن میں کسی بہت و شوار کام کی انجہ دہی یا کسی خطرناک ہم کی فتح ایک ضروری شرط ہوتی ہے۔ شاید کسی کو یہ خیال گزے کہ لکھنؤ کے چین اور آرام کی زندگی اور اُس وقت کے پُرامن دور میں ایسی شہرلوں کی کہاں انجی لیں گی لیکن جن اتفاق سے اسی زمانے میں ترکی اور روس کی جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستان بیا اور خصوصاً مسلمان ہندوستان میں کو اس جنگ سے بہت بڑی تھی اور عام طور پر اُن کی ہمدردی ترکی کے ساتھ تھی۔ حسن آرا کو بہ موقع مل گیا کہ میاں آزاد کو ترکی کی کہد سے بچے۔ اور اس طرح یہ ضروری شرط پوری ہو جاتے۔

پُرانی داستانوں میں ہر ایک پہلو ان کے ساتھ ایک عیار رکھتا ہے جو پہلو ان کے زود و قوت کی تائید اپنے کہد و فریب سے کرنے کے علاوہ نصیبت اور تحلیف پر اس طرح طرح کے جیلوں سے اس کا دل بہلانا اور اُس کی طبیعت کو آگسا کد ہوتا ہے۔ آزاد کے سنا تو تھا جس میں ہماری کا کوئی وہ نہ تھا لیکن اُن کی موجودگی سے آزاد کو وہی تعزیت اور بڑھنے والے کو وہی تعزیت حاصل ہے

ہے جو عیاروں سے ہوتی ہے۔ پُرانی داستانوں کی طرح فسانہ آزاد کو بھی زیادہ تر اپنے طبقے کے لوگوں سے واسطہ ہے اگرچہ خود آزاد کے متعلق تو یہ کہنا دشوار ہے کہ اس سوسائٹی کے کس طبقہ کا آدمی ہے اور اس میں بھی دھت ہے کہ امیروں اور رئیسوں سے لیکر پھیلا رہا اور گھسیاروں تک سے برابری کا برتاؤ کر سکتا ہے۔ جن تمام طبقے کے لوگوں کا ذکر آتا ہے وہ مولانا رئیسوں کے مصاحب کا مشیہ نشین یا ملازم ہیں اور فقہ میں ان کو کوئی مرکز یا حیثیت نہیں۔

سرشار کی تحریر کے اسلوب میں بھی نئی اور پُرانی طرز دونوں کا میل ہے۔ کہیں ان کی عبارت آج کل کی روش کی طرح سہل اور صاف ہوتی ہے اور کہیں قلم و سطر کے مطابق ریجین اور مقصد پر پُرانی داستان گوئی کا معمول تھا کہ جب کوئی نیا قصہ شروع کرتے تھے تو چند قہید دی الفاظ استعمال کرتے تھے جو داستان کا چہرہ دکھلاتے تھے یا چند اشعار ساقی نامہ، غزل وغیرہ کی تم کے قصے بیان کرنے سے پہلے بڑھ دیتے تھے۔ سرشار بھی اس رسم کو نبھانے کی کوششیں کرتا ہے اور شعروں کی جو بھر جاساں آزاد میں ہے وہ بھی بچائے خود پڑائے رنگ کے موافق اور نئے رنگ کے خلاف ہے۔ صبح و شام کی کیفیت، موسموں کا بیان، قدرتی نظاروں کا ذکر جس حد تک بھی فسانہ آزاد میں موجود ہے وہ سب پڑنے دھنگ کا ہے۔ یعنی اس میں مصنف کا ذاتی مشاہدہ کم ہے اور لفظی زیادہ۔ اور لفظ بھی اکثر وہی ہے جی پُرانی شاعری اور پُرانی داستانوں میں کثرت سے برتے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ فسانہ آزاد میں بہت سی خوبیاں ہیں جنہیں بنا پر اس کو یورپ کے اچھے سے اچھے ناول کے مقابل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس میں سرشار نے اپنی بے مثل قوت ایجاد سے بے شمار مرد اور عورتوں کی ایک نقلی دنیا پیدا کر دی ہے جن کے معاملات اصلی دنیا کے باشندوں کے معاملات سے بھی زیادہ رنگین اور بے لطف معلوم ہوتے ہیں۔ آزاد، خوبی اور حسن آرا سے واقعات کی دنیا میں ملاقات ہوتی ناگھن ہے لیکن سرشار نے اپنی قلم نگاہ سے ان میں ایسی جان ڈال دی ہے کہ وہ دوستوں کی طرح ہمارے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور دوستوں سے زیادہ ہم ان کے اچھے برے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بہت کم آف انہی نگاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے اگرچہ جذبات اور مناظر قدرت کے بیان میں سرشار رسمی لفظی کوائف نہیں بڑھ سکتا لیکن جہاننگ روزمرہ کی زندگی کا تعلق ہے اس کی قوت مشاہدہ بہت ہر وقت ہے اور فسانہ آزاد کے درقوں میں آج سے پچاس سال پہلے کے لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی نقلی تصویریں کثرت سے موجود ہیں۔ فسانہ آزاد بھی میری خوبی اس کی لطافت ہے جس کی نظیر اس سے پہلے یا اس کے بعد کی اردو ادبیات میں بہت کم ملتی ہے۔ اردو میں لطافت کے گہر صریح صرف اپنی زبان کے استعمال تک محدود رکھے جاتے ہیں جس کو مستحکم یا پڑھکر آدمی کو ہنسی آجائے اور اس زبان کو گندے اور محض لفظوں سے پاک رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں بھی جاتی۔ و خطرات جو ہنسنے ہنسانے کا موقع اور مل پیدا کر دے اور کانوں کو زیادہ خوشی کے تصور کو خوش کرنے کی کوشش کرے اور وہیں بہت کمیا ہے۔ اور غالباً یہ کہنا ناخوش ہو گا کہ سرشار اردو زبان میں آجی اور آجی لطافت کا موجد تھا۔ خوشی کا کردار فسانہ آزاد کی جان ہے۔ انیسویں کے متعلق ہندوستان میں ہمیشہ سے لطیف اور حکایتیں سننے میں تھری رہی ہیں۔ خوشی کو ان تمام آگے چلے انیسویں کا مجروح خیال کرنا چاہیے۔ لیکن سرشار نے اپنے قلم کی کو ایسی نزاکت اور لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کی ذلت اور حقارت کا کوئی خیال ہمارے دل میں نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا ایک قسم کا انس اور دلچسپی پیدا ہوتا ہے جو کتاب کو ختم کرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

بعض لوگ فسانہ آزاد کی غیر معمولی فصاحت کو ایک عیب خیال کرتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ انگریزی ناولوں کو

اپنے سامنے نوینکے طور پر رکھے ہیں اور ان سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابتدا میں انگریزی ناول بھی خاصے طویل ہوتے تھے۔ انیسویں صدی میں عام میلان اختصار کی جانب ہوا لیکن اب پھر ہر بار بارہ سو صفحے کا ناول دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس میں تنگ نہیں کہ فائدہ اڑانا بلکہ اسے بے انگریزی ناول سے بھی کچھ زیادہ طویل ہے۔ لیکن میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ سرشار کے پیش نظر ایک طرف انگریزی ناول تھے تو دوسری طرف ہندوستانی وراثت میں طوالت کوئی عیب نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا وصف خیال کی جاتی تھی۔ جو طبیعتیں طلسم ہوشربائی آٹھ اور پوسٹاں خیال کی نوچلوں کی خوشگرمیں ان کے لئے فساد آزادی کی چار جلدیں شاید کافی نہ تھیں۔ لیکن غالباً فساد آزادی کے اس قدر طولانی ہو جانے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ فساد اور اخبار میں ٹکڑے ٹکڑے ہر کرشتاں جو اور اس کے مصنف کو بھی اس کے ڈیل ڈول کو پہلے سے جانتے اور اندسے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ کتاب کا حجم بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان حالات میں ادبی تناسب کی توقع فضول ہے۔ تو سبھی فساد آزادی کے بہت کم حصے ایسے میں جھکو بھرتی کیا کہ ہمک نظر انداز کیا نہ سکتا۔ باخبر لوگوں کو سننے میں آیا ہے کہ سرشار کی طبیعت میں غضب کی آمد تھی جو کچھ لکھتے تھے نظم برہام شد اور بے ساختہ لکھتے تھے اور اپنے کلمے کو دوبارہ دیکھنا یا ترمیم کرنا ان کی عادت کے خلاف تھا۔

ایک مشہور ہندی مصنف نے فساد آزادی کا خلاصہ کرنے کی کوشش کی تھی اپنا اپنا مذاق ہے میں اور شاید اور بہت سے لوگ تو اس میں کوئی کاٹ بھانٹ پسند نہ کریں گے، تنگ مہر کا ایک چھوٹا سا خوش قطع حصہ جس کے عین بیچ میں ایک کمزور زانوہرہ لگا ہو اور جس کا پانی شیشے سے زیادہ چمکدار اور شفاف ہو وہ تھی بھلا لکھتا ہے۔ لیکن بعض آنکھوں کو کسی دریا یا تندی کی بے قاعہ و لیکن شاندار مردانی کا نظارہ اس سے بھی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔

نرگس جمال۔
مولانا نیاز فتح پوری لکھتے ہیں: ترجمہ ہر مترنگ کے ڈرائے جائزہ لگا۔ ہر مترنگ کا شہور و نامہ نگار ہمارے شاہ صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے۔ اور اس میں تنگ نہیں کہ ان کا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔
مترنگ کے ڈرائے عموماً چمکدار شیشے کے لئے نہیں ہوتے اسلئے ان میں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور ربطہ خواص ہی کی تسکین ذوق ان کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

مترنگ زیادہ تر عیش وصال اور اس کے مشتقات لکھتا ہے۔ اسی لئے اسکے یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت اور فطرت انسانی کی انوکھی جیسے ہم چاہیں تو روحانیت بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر طرح پائی جاتی ہے۔ نہ بہت انگریز منظر پیش کر کے دلوں کو ہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی نئی آشیایوں کے انساں نے سنا کر روع کے ٹھکان کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ان لطیف و پاکیزہ انعطافات کی داستان سنانا جو حسن و سبب پہنچتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور روح میں جذب ہو کر شاہراہ انسانیت کو متحرک بناتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوق سخن یہ ہوگا، اس کے یہاں خیال کی نزاکت، بیان کی ندرت، طرز آزادی و جدت اور معنی کے کھانڈے انعطافات کا سہارا بھی کچھ ہوگا، اور ایک غیر زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن متر شاہ احمد علی لے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خود ہی ذوق کے ادیب ہیں۔ قیمت صرف طرے بلکہ کامتار ساقی انکسار ہو۔ دھلی ۶

خرافات

پنواڑی اتنے پان لگاتے ہیں ان حضرت کا جائزہ لیا۔ جو دوکان پر ایک طرف تو ایک بھوڑے کتل میں بیٹے اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور جن کے سلسلہ کلام میں میری فرمائش اچانک غل انداز ہو گئی تھی۔

اگر کئی میں ذرا سا روزن ناریل منہ سے لگاتے کو نہ پونا یا سامعین عید پچھلی سے ان کی طرف متوجہ نہ ہوتے، تو یار لوگ ہی سمجھتے کہ بوری میں تمباکو کے سوسکے پتے رکھے ہیں۔

میں نے پنواڑی سے پان کے لئے کہا تو ان حضرت نے رک کہ ایک چھلپتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور پھر سر مور چپ چاپ ناریل کی طرف توجہ کر لی۔ انہماک کے عالم میں دو ایک کش لگاتے۔ پھر ایک نظر سامعین پر ڈالی۔ جو سامنے مونڈھوں اور لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے مینائی سے منتظر تھے، کہ پنواڑی مجھے بھگتاتے ہیں اور کتنا وقت لیتا ہے۔ اور کئی کتنی ہوتی پھر قی صاف کہہ رہی تھی کہ اس وقت کاروبار سے زیادہ اخلاق کے خیال نے لئے میری فرمائش کی تعمیل پر آمادہ کر دیا ہے۔

میں پان کھا کر منہ اور کھجی پونچھے کو جب سے روال نکال رہا تھا کہ سامعین کے انداز نشست اور چہروں سے ذہین مطالعوں کی سی توجہ ظاہر ہوئے تھی۔ اور انجانے غمان نصاحت و سبیل چھوڑ دی۔

کہنے لگے "نوبس صاحب اللہ تمہارا بھلا کرے۔ اب ہم اس فکر میں کہ آخر کو کس سرسبز بات ہے تو کیا ہے۔ امیروں سے بھی فقیروں سے بھی۔ پڑھے لکھوں سے۔ زاہلوں سے اور تمہارا بھلا کرے، بہروں سے، خنداؤں سے، صاحب لوگوں سے، ایسے صاحب دُنیا بھر سے سے پوچھ ڈالا۔ (ناریل کا کش لے کر سر کی جنبش نفی سے) ... کچھ نہیں۔ پر ہم نے بھی دل میں ٹھان لی کہ اگر زندگی رہی تو ایک دُنے نام تو ضرور در کر ہی گئے کہ آخر کو یہ ہمید سال ہے تو کیا ہے۔

(ناریل کے کش لیکر اور سر ذرا مڑے میں ہلا کر) گرنا خدا کا کیا ہوتا ہے کہ ایک رسد دار صاحب ہماری پڑوس میں آکر بس گئے۔ ... لے دیکھو، یہ کچھ اچھا سا نام تھا ان کا۔ سسز زبان تک "آکر لوٹ جاتا ہے۔ بیٹی رتی کہ خیر صاحب کچھ ایسا ہی نام تھا ان کا غرض کہ تو رسد دار صاحب تھے تو ہماری طرح زاہل ان پڑو۔ مگر ہندوستان سے تاہ لندن تک، اور صاحب تمہارا بھلا کرے۔ اور افریقہ اور کیا کہتے ہیں اسی کو برما اور دنیا، اور الم فلم میسوں جگہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے تھے۔ بڑے بڑے فرنگیوں سے میل جول تھا۔ واپس آکر بھی صاحب لوگوں میں کتے جاتے رہتے۔ یہی صاحب کے ہاں ڈالی والی چڑھاتے تھے، یہی صاحب کی میم صاحب بھی سنتی ہوئی تھیں ان سے۔ مگر صاحب واہ وا۔ واہ وا۔ کیا عورت تھی! ایک اچھی، ایک بہت ہی اچھی۔ اس قدر کی لائق اور پھر ایسی عورت کہ شادی کی بات ہے جو ہماری نظریے گذری ہو قسم ہے، امیر طبع اسلام کی۔ ہم نے بھی زمانہ دیکھ ڈالا جو جوانی کا جب زمانہ تھا ہماری۔ رکتل سر سے سرگ گیا۔ آنکھیں چمک آنکھیں، تنے پھول گئے، جھوٹ بوسنے والا کافر۔ والدہ ہر سے گزر جاتے تھے، قیامت پج جاتی تھی، قیامت۔

(پنواڑی سے) تو نے تو دیکھی ہے، وہ غمخور پان والی ... کیا چیز ہے؟ (خبر سے مسکرا کر) بڑھا چاہے، مگر اب بھی جب

دکان کے سامنے سے گزر جاتے ہیں ہم، تو سید نہام کے رہ جاتی ہے، ہم سے کہا کرتی تھی کہ میرا صاحب مجھے اپنے گھر میں ڈال لو۔ اپنی اسے دیتی تھی۔ اور صاحب تمہارا بھلا کرے، کبھی تھی کہ میرا سارا گھنا پانا۔ روپیہ پیسہ اور کیا نام اس کا کہ کپڑا لٹالے لو، مگر یہاں جو اسٹاکھا کر بھی دیکھا ہو تو جو کر کی سزا، بات کی تھی؛ بس ایک روز اسکا کہہ بیٹھے تھے کہ ”پھتو ذرا دوسیرے پان تو لگا دے“۔ میں صاحب قسم لے لو۔ جیسی جی چاہے تمہارا، وہ دن اور آج کا دن جو بہن کے سوا اسے اور کچھ جانا ہو۔ تو وجہ کیا؟ کہ تولی مرداں جان وارو۔ مگر جناب کیا کہنے ہیں اس کے بھی جگر سے کہ آج تک ہمارے نام پر کنواری بیٹی ہے۔

میں حضرت تو ہم صاحب سے جو ملاپ تھا ان کا، تو ہم دل میں سوچے کہ جس بات کی ہمیں دھن لگی ہے، وہ بس یہیں سے لڑک (انداز نشست میں کچھ ترمیم کر کے) لیجئے صاحب ہم نے رسد دار صاحب کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی جاکر بازار سے سودا سلف لادیا ان کا۔ اور صاحب تمہارا بھلا کرے، کبھی ان کی جبرو کا قارورہ حکیم صاحب کو دکھانے لگے۔ غرض کہ اسی طرح میل ملاپ بڑھا لیا۔ تم جانو دکانو دل سے راہ ہوتی ہو۔ رسد دار صاحب بھی ہم پر قربان ہو گئے۔ (ناریل کے دو چار چھوٹے چھوٹے اور ایک بڑا سا کٹل لیکر ہیرا پانی تو اس پاک پرور دکان کی چاہیے ہے

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار۔ نہ ہر اس سے یوں امید وار

(سامعین کی زبانوں، آنکھوں اور گردنوں کی تنہا نے کھلے دل سے تائید کی) لیجئے صاحب اب ہم اس تاک میں کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو اپنی منشا زبان پر لائیں، کہتے ہوئے گھبراہٹ بھی، کہ اگر ناں کر دے تو مفت میں بات بھی جائے۔ ادنیٰ آبرو ہی سے تر ہے۔ آبرو پر پانی بھر جائے، تو ٹھنکے میں بھی ستا۔ نہ کچھ ہنگام۔

اللہ کی قدرت، ان ہی دنوں ہمارے چلنے۔ مڑا باد میں پولیس میں ملازم تھے۔ وہ کرٹیل نوجوان کہ دیکھ کر اس کی قدرت یاد آتی تھی۔ ہاتھی کی طرح اینڈ اینڈ کر پٹتے تھے۔ ایک ایک بازو، خدا جھوٹ نہ بولائے تو (ہاتھ سے تبا کر) یہ یہ تھا بس صاحب تمہارا بھلا کرے تو انہوں نے مڑا باد کا کچھ خیرہ ہیں بھجوا دیے ہم تو اپنی بات کے فراق میں تھے ہی، تبا کو لے سیدھے رسد دار صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ انھوں گن کے پوسے تو میں ہی، تو ارکھ کے خیرے کی ایک جلم جو بھر کے دیتا ہوں، تو پھلک اٹھے۔ انھیں کھل گئیں، تمہاری قسم پوسے۔ قرآن خاں ان ہاتھوں کے، مانگ آج کیا اٹھتا ہے؟

بس ہمارا یہ سنا تھا کہ دل میں گد بدیج گئی۔ اٹھ کر مجرا عرض کیا، کہا، پیر و مرشد، اللہ کا دیاست کچھ ہے۔ راج پاٹ نہ سہی پیٹ کی گزر چلی جاتی ہے۔ ہاں ایک سوال ہے، جو اس کا جواب کھادیں، تو بھونکنا بھر پایا۔

کہنے لگے ”پوچھ کیا پوچھتا ہے؟“

ہم بھی کئی گولیاں ناں کھیلے تھے، کہا، پہلے قول دیجئے۔“

قول کا نام سنکر رسد دار صاحب بھر کے، مگر صاحب جھوٹے کے منہ میں خاک، میں بھی اُپر تلی چلوں پر چلیں پلائے گیا۔ آخر کہاں جاتے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر، قول ہار بیٹھے۔ پھر تو ہم بھی سمجھ لے کہ آج میدان مار لیا۔ لے مرے بھائی، جھٹ سامنے آ دست بستہ عرض کی، پیر و مرشد، فرنگی چپے سے کھانا کھاتے ہیں۔ ہاتھ سے نہیں کھاتے۔ اس میں کیا سید ہے؟

لیجئے صاحب ہمارا یہ گھنا تھا، تو آئے ہیں تو جانتے کہاں ہیں۔ گالی گلوں اور لہجہ پکڑ لو اور ایک آدھم چاویا۔ منگوا ہم کہاں

چھوڑتے تھے، سب کچھ چپکے چپکے لے گیا، تو صرف یہ کہ صاحب قول اپنے ہر دست و پا میں ہر طرف سے اپنی سیاست کی داد طلب کر رہی تھیں۔

آخر بولے: ”یہ ایک بڑے راز کی بات ہے، تو کسی سے کہہ مت“

یہاں تک داستان پہنچا کر آپ نہایت استغنا سے ناریل کی طرف متوجہ ہو گئے، ہر طرف سے اصرار ہو رہا تھا کہ تمہیں ہماری ہی قسم چھادو۔ ایک مغربی جو روز کی آسے جانے والی معلوم ہوتی تھی، ترجمی نظر سے بولی: ”ہمارا ہی لہو پتے جو بدلتا ہے، مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ میرا دکان پر یوں کھڑا ہونا کچھ بے موقع سا ہے، مجرمیں مقرر ہوں کہ داستان کا بقیہ حصہ معلوم کرنے کا امتیاق میری خودداری پر غالب آ رہا تھا۔ میں اپنے قیام کو معقول ثابت کرنا شروع کرنے کیلئے جو کچھ بھی کر سکتا تھا کرتا رہا۔ سگرٹ کی ڈبیا خریدی۔ سگرٹ اس میں سے نکال کر سگرٹ کیس میں بھرے، ایک سگرٹ سلگایا۔ بوٹ کے ٹیسے کھولنا اور باندھنا رہا۔ ادھر سامعین کا اصرار دم بدم بڑھ رہا تھا۔ آخر بولے: ”نئے اب کچھ منہ نہ نہتے بھی بیٹھا کرتے ہو کہ ہم طیس“ ہر طرف سے فراخ دل سے وعدے ہوتے۔ عجب دفعتاً بتا دینا بے موقع سامعین کو ہوتا تھا۔ آپ نے نظروں کو خوبانک بنا کر ناریل کی طرف توجہ نہ کی۔ انکار سے جب بے لطفی پیدا ہو گئی تھی، اُسے دھوکے میں آڑا دینا صغیر سامعین کے لئے بولے: ”کیا کہا جاتے.....“

ذرا دیر کو پھر ناریل کی طرف توجہ کی۔ دفعتاً نظروں کو برقی دوش سامعین پر ڈال کر بولے: ”مے دیکھو کسی سے کہنا تو ہوتی ہے“

لے آپ دوچار اور کوشش آپس میں سامعین ہر ممکن طرح اسے متعلق اطمینان دلانے کی کوشش کرتے رہے۔

”اور جو کسی سے کچھ کہا، تو پچھتاو گئے“

سامعین نے ایک دوسرے کی طرف تعجب کی نگاہوں سے دیکھا، دکان کے آئینے کے سامنے میرے ہاتھ بھی کال لٹائی ہو کر گئے۔ کسی نے دبی زبان سے پوچھا کہ کیا ہو گا؟

آپ نے ایک پراسرار غم کے ساتھ کہا کہ جو دیا۔

بلخٹ ادھر ادھر اضمیاد کی ایک نگاہ والی سر سامعین کی طرف بڑھایا۔ ”راہستہ سے بولے“ ناخن باغریگوں کے جوہر تھے میں ناخن، ان میں ہوتا ہے ایک طرح کا زہر، کیا کچھ؟ جو کہیں ان کا ناخن کھانے کو چھو بھی جاتے، تو سارا کھانا زہر پر ہو جاتا ہو۔ پھر نوادھر کھانا ادھر بیٹ، اور صاحب تمہارا بھلا کرے، یہ بھی بتاؤں، کیا یاد کرو گے، کہ فرنگی کا ناخن نایاب شے ہے، ہر ہر بڑے اسکے فرق میں میں بگڑاؤں ہوں جو کہیں ناخنوں کو ہوا بھی لگے دیتے ہوں۔ اندھی بہتر جانتا ہے، کہ کب تراشے اور کہاں پھینکے۔ میں۔ وجہ کیا کہ اس زہر کے ماسے کا کوئی علاج ہی نہیں۔ لاش کو اسٹوڈیو چھوڑ دیا۔ کیا جمال جو شبی بھی گزر جاتے، کہ کس شے کی کرات ہے، ایک اور بات بھی ہمیں معلوم ہوتی، کہ ان فرنگیوں کے ناخن ہر شے نہیں اور تراشے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہر اس کا ابھی ہیں، تین نہیں۔ کبھی فرصت ہوتی تو ش خاطر سے عالم کو پس گئے“

سامعین اس انہماک سے سن رہے تھے، گویا دنیا کے کسی بہت بڑے راز سے انہیں آگاہ کیا جا رہا ہے اور وہ بڑے فخر اور بڑی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اس بابا رامت کو اٹھانے کیلئے آدھ ہیں۔ انہیں مصروف چھوڑ کر تحقیق کا بقیہ حصہ اپنے اوقات فرصت میں مکمل کرنا ایک ارادہ کر کے گھر روانہ ہو گیا۔

کہیں نہ مٹ جائے نامِ دنیا

بڑا ہے گواہ تمام دنیا۔ الٹ پلٹ ہو نظامِ دنیا۔ غلط خیالِ دوامِ دنیا بگڑ رہا ہے توامِ دنیا

چھلک پڑا ہونہ جامِ دنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دنیا

نہ آتشِ اعتقاد باقی۔ نہ شعلہٴ اعتماد باقی۔ نہ صورتِ اتحاد باقی قلوب میں ہو فساد باقی

چھلک پڑا ہونہ جامِ دنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دنیا

معاشرتِ اک ملتِ سازی۔ ستمِ ظریفی ستمِ نوازی۔ نہ پاک بینی نہ پاکبازی۔ نہ ولستائی نہ دلگاہی

چھلک پڑا ہونہ جامِ دنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دنیا

قدمِ قدم پر قمار خانہ۔ گلی گلی میں سنگار خانہ۔ جو گھر بنے ہیں نگار خانہ تو در سے اشتہار خانہ

چھلک پڑا ہونہ جامِ دنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دنیا

فریگ نامِ عقلندی۔ خودی کے پرے میں خمِ پسندی۔ جہاں ہو پستی میں بلندی۔ وہ ذہنیتِ سرور و گنجی

چھلک پڑا ہونہ جامِ دنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دنیا

ابنِ خیب چھلک

دیوانی

حضرت اور مجرب کا مقولہ ہے کہ شکار کا ریبکاران است! وہیں ایک مدت سے اسی مقولے پر کار بند ہوں۔ موسم شروع ہونے لگا کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ گندہ موسم میں بھی ایک پہاڑی علاقے میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ دانی کھار میں ایک چھوٹا سا گڑھ تھا۔ وہی پندرہ برس گھر ہوئے ہیں ایک گولے کے پاس بٹھا ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد جب مجھے ان علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو جہاں کے رہنے والوں کی زندگی پر رشک سا آنے لگتا ہے۔ ہر بات بے بسا دنیوی دیکھ لیجئے۔ بناوٹ اور تصنع کا کہیں نام تک نہیں۔ مناظر طبیعت کی طرف دیکھتے تو حیرت و فریب اور جو گڑھ والوں کی طرح نظر کیے تو ایک عیب رو بیان انجیز زندگی نظر آئے گی۔ کارزار حیات بے نام شہر کے رہنے والوں کی نسبت یہ لوگ کچھ زیادہ ہی سیرگرم نظر آتے ہیں اور میرے خیال میں زندگی کا لطف بھی انہیں ہم لوگوں کے کچھ سوا ہی حاصل ہوتا ہوگا۔

تو خیر! میں گولے کا کہاں تھا۔ اس علاقے میں کبک، تسی، تیر، تیر، اور گندار کا شکار ملتا ہے۔ گولے کا لٹو کا میرا ہیر تھا۔ دنیا بھر کے کھیتے کہاں ہیں اس سے سن لیجئے۔ اور بچہ گولہ بھی خوب تھا۔ اور خدا کی پناہ میں تھا۔ اس کی باتوں میں مجھے بہت لطف آتا۔ چنگٹ پر تو وہ سب کچھ ہو کر بھی صبح و شام ضرور چلا جاتا۔ اور گھر والوں سے گاہے گاہے اس پر تازہ بھی خاصی پڑتی۔ آج وہ دو پہر سے غائب تھا۔ اس کے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ پارتوں کی ایک ٹولی کھار کے پاس میں جو حرام کے کھیت ہیں ان میں چنگ رہی تھی۔ مجھے اپنی ناہیرت انتظار تھا لیکن جب وہ عصر تک بھی وہیں نہ آیا تو میں ہنڈی نکال دیا۔ پہاڑوں کی طرف چل دیا۔ جن کھیتوں کا ٹونڈوں نے دیا تھا وہاں پارتوں کے ٹم کے نشان بالکل تازہ تھے۔ پائے

جس کھیت میں صبح چرنے کے لئے آتے ہیں دن ڈھلے بھی وہاں ایک آدھ پھیر ضرور کرتے ہیں۔ میں ایک پھر سے لگ کر ان کے انتظار میں بیٹھ رہا۔ کبھی کبھی کسی چٹان پر سے کبک کی آواز تو سنائی دیتی لیکن اس خیال سے کہ پائے ہندو کی آواز سنکر ہلکا نہ جائے میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دس پندرہ کبک پہاڑ سے اتر کر کھیت کے کنارے اکٹھے ہوئے۔ کبک رفتاری کے قہقہے کو اکثر سنے ہیں لیکن خدا کی قسم آج انکھوں سے دیکھ کر جوں تک آیا بیان نہیں ہو سکتا۔ جھوم جھوم کر دم اٹھانا، سینہ اٹھا کر بھاڑ کر چلنا اور مست انکھوں سے ادھر ادھر دیکھنا قیامت کے قہقہے سے کم نہ تھا۔ میں ابھی ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ واسے ہاتھ کی ڈھولناؤں پر مجھے پتھر دوں پہر کی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے پٹ کر دیکھا تو چار پانچ پائے پہاڑ پر سے نیچے اتر رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان بگھڑوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ کیونکہ ایک جھاڑی کے پاس جا کر یہ گئے۔ فائر تو میں کر دیتا لیکن فیصلہ زیادہ تھا۔ اس خیال سے کہ مٹا نہ زد میں آجائیں وہ کمر میٹھ رہا لیکن میرے دیکھتے دیکھتے ایک گھائی میں اتر گئے اور میں ہندو کی کندھے پر کر کے جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا ان کے پیچھے ہو گیا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں گاؤں سے اتنی دور چل گیا کہ راستے کا پتہ نشان نہ رہا۔ شفق کی لالی و شست و جل پر اس طرح عریاں بھی ہو گئی کہ عروس لڑکے کت دست پر خاندان واپس لوٹ جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ وہی پائے مجھے ایک چٹان پر کھڑے نظر آئے۔ فاصلہ تو کچھ زیادہ نہ تھا لیکن اس چٹان تک پہنچنے کے لئے مجھے ایک چکر کاٹنا پڑا۔ ہوا یہ کہ میرے پہونچنے پہونچتے پائے تو کسی اور طرف چلے گئے اور میں سستائے گئے تھے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

تو یہی یوں قامت اشجار اٹھ لیے کے جنوں کی طرح بھی یک یک ہمیں
سے نظر اٹے گئے لیکن رونے تاباں سے نقاب اٹھنے ہی ایک معلوم
ہوتا گیا جنت کی کوئی حور شجر و حجر پر نور کی بارش کر رہی ہے۔ اس
خاموشی اور سنائے میں کسی دور کے آتش ار کی دہی صدائے سوز
ساز آوازی کا عالم پیدا کر رہی تھی کہ اچانک میرے کانوں میں
ایک آواز پڑی۔ آواز نہیں بلکہ درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی غریبہ
ایک پہاڑی گیت تھا جس کا مفہوم اردو میں یوں ادا ہو سکے گا
دُنیا کا دُورہ دُورہ مدھوش ہو گیا ہے

ناروں میں حسنِ عالم مدھوش ہو گیا ہے

یہ آواز کبھی کسی کی کوک یا بیل کا نالہ نہ تھی۔ لیکن
اس دیر سے جس کی خاموشی میرے لئے سہاگن روح ہو رہی تھی
یہ غم انگیز صدائیں پیغامِ حیات سے کم نہ تھیں۔ آواز کہیں دور سے
آ رہی تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا۔

خاموشی میکہ سے میں نے خوش ہو گیا ہے

جی کہ کت از فطرت خاموش ہو گیا ہے

میں خون رو رہی ہوں خاموش سب جہاں کو

یہ خاموشی ہے پرتیم اس وقت تو کہاں ہے

معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فراقِ آتش ناروح کسی کی جگر میں نلا
شیون بر پا کر رہی ہے۔ میرے کان آواز پر لگے ہوئے تھے لیکن آواز

آنی اب بند ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ اطمینان سا ہو چلا تھا کہ خیر اس
بن میں اکیلا نہیں بلکہ یہیں اس پاس ایک اور متغیر بھی موجود ہے

جدھر سے یہ آواز آتی تھی میں اسی جانب ہوا۔ چاندنی جون پر بھی
اور کہیں کہیں لپک چاندنی تو کاوکیہ دیکھ کر قفس کر رہے تھے۔

پہلے سے جوں کے وقت پاس نہ پہنچنے دیتے اس وقت میں نے
قریب پہنچ جانا اور انہیں قریب تک نہ ہوتی۔ میں اس وقت چھوٹی

پہاڑیوں کے دامن میں رہا تھا۔ ہوا جو کہ بند تھی اس لئے یہاں
بھی کچھ زیادہ محسوس نہ ہو سکتا تھا۔

دست بچاؤ کے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور پشت کی جانب
وہ سر ہٹک پہاڑ تھے جن کی برف پوش چوٹیاں نثریائے ہم کام معلوم
ہوتی تھیں۔ اور انہی گھاٹیوں میں کہیں کسی آتش ار کی ترنم ریزوں سے
ایک کچھ سوز و ساز پیدا ہو رہا تھا۔ شام کی اس ہلکی روشنی میں
دشت و جبل کا منظر بے حد دلکش معلوم ہوتا تھا۔ اور بن کی ہوا بے
مستی کی بو آ رہی تھی۔ آپ جانتے تنکاریوں کے شوق اور دل سے بھی کیا
بھرے ہوئے ہی ہوتے ہیں۔ دل تو اس وقت یہ چاہتا تھا کہ کیا چاہا
جواس دیر لے میں ہی رات بسر کرنے کی کوئی صورت مل لے۔ لیکن
حالات واپس جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس نے بندوق اٹھا کر
توکل کے بھر دے پر چل دھرے آیا تھا ادھر ہی کو چوب۔ خیال تو یہ تھا
بستی زیادہ دور نہیں۔ تاہم دل میں ایک الجھن ہی پیدا ہو رہی تھی۔ اگر
لے چلتے چلتے بندوق کا ایک آدھ فائر کر دیتا۔ خوف سے نہیں بلکہ
اس خیال سے کہ شاید کوئی گندیا یا گولا آواز سکند اھر کو آجائے۔ لیکن
نہ تو کوئی گندیا ہی مدد کو آیا اور نہ ہی گولے کی بھری کی آواز سنائی دی
اور تھوڑی ہی دیر بعد میلانے شب کائنات سے ہلکا رہنے لگی اور
بامِ فلک پر مٹائے کسی کے آویزہ گوش کی طرح چلنے لگے جب تک
مکمل تھار لے کی جستجو میں لگا رہا لیکن جب تاریکی اجمعی طرح مسلط
ہو گئی تو تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے آ بیٹھا۔

یہ ظاہر تھا کہ اسی دیر لے میں رات بسر کرنے کی جو مجھے آرزو
تھی اب پوری ہو کر رہ گئی۔ لیکن سوال تو جا لے کا تھا۔ مصیبت
یہ تھی کہ میرے پاس دیسلانی بھی نہ تھی جو الاؤ ٹاپ سکتا۔ اب سر پر
جائے کی حالت تھی اور رات کاٹنے کا سہارا یہی بن کے چھلکے تھے۔ اتنا
ہی غصہ تھا کہ کوئی ہمارا گئے پہاڑیوں کے عقب میں سے چاند
علی آیا۔ پہلے تو گھسار کی وجہ سے چوٹیاں یوں چمکے لگیں جیسے کسی
سے چاندنی کی ڈلی رکھ دی ہو پھر بتدریج تمام کائنات حسن کی تزیین
سے چمک لگی۔ لیکن اہم ماہاں جب بھی یاد لوں گے مجھ میں آ جاتا

اوتہاں تلو کوہ پر اس طرح ضیا پاش تھا جیسے کسی حیدر کے اتے پر
 بنایا۔ میں اس بانج قدم جگہ اور دھڑ دھڑ دیکھنے لگا۔ آخر ایک شان
 پر مجھے ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ آپ جانیے! میں تو تم پرست تو
 ہوں نہیں۔ لیکن اس وقت میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اس دیر لے میں
 جس کا سکوت اور دہشت شاید ستاروں کے لئے اٹھکیاں کر رہی تھی۔
 میں کچھ دیر لے دیکھا رہا پھر جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس کی طرف چلا۔
 لیکن تھوڑے پر تیزی سے چلا کوئی آسان کام نہ تھا۔ غالباً اس نے بھی
 کچھ آہٹ سی بانی تھی کیونکہ اب وہ بھی اسی طرف جدھر سے میں اُسکی
 طرف جا رہا تھا دونوں ہاتھ گر کر رکے دیکھ رہی تھی۔ پھر جاگ اُسے
 ایک ہاتھ اٹھا کر اوپر چین کر کہا "ساجن" پھر میری طرف بھاگی۔ جگہ جگہ
 نشیب و فراز تھے۔ کبھی وہ سانسے آجاتی اور کبھی آنکھوں سے اوجھل
 ہو جاتی۔ میرا دل اب ذکا کچھ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شاید میں بھی
 گاؤں والوں کی طرح اسے ایک غیر مادی چیز ہی سمجھ رہا تھا۔ وہ میرے
 نزدیک پہنچ گئی۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی۔
 "تم آگے ساجن؟"

اب میرے سامنے کھڑی تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ پیشانی
 پر عرق کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ کوئی بس بائیں
 کے قریب سن وصل تھا۔ لائے سنہری بال تھے جو شانوں پر کچھ کھڑے
 ہوتے کمرے نیچے پہنچ رہے تھے۔ غزال کی طرح موٹی موٹی ونبالہ
 دارا نگین تھیں۔ ابھرا ہوا سینہ پٹے ہوئے کمرے کے اندر سے جوانی
 کے جذبات کا ترجمان تھا۔ لگی سائلی رنچت تھی اور خود غزال کی دلکشی
 اس فرسودہ سائلی میں بھی ایک شان ولبائی پیدا کر رہی تھی۔ یہ پیکر
 خاکی جس انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا تو اس کیفیت کو بہان
 نہیں کر سکتا۔ چہرے پر یابی برس رہی تھی اور خوبصورت سیاہ آنکھیں
 جن کی مستی شاید کسی وقت قائم آج کو بھی شرمندہ کر رہی ہو۔ اُس
 انہی کی آنکھوں کی طرح میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے میرے
 لبی بن نے سمجھنا نہ کیا تھا۔

چوکیا۔ اور دو چٹانوں کے درمیان ایک گھاٹی کی نظر آئی۔ کہیں کہیں پانی
 بھی چلتا تھا۔ حقیقت میں کسی پہاڑی ندی کا راگداز تھا۔ میں اسی کے
 کنارے کھڑے چلنے لگا۔ واقعی دنیا کا دُورہ دُورہ خاموش ہو چکا تھا۔
 شجر و جھری نیند کی آغوش میں مغموم ہوتے تھے۔ بجلائیں تو ایک راہ گم
 گروہ تھا۔ لیکن اس دیر لے میں اس وقت یہ فریاد و فغاں کرنے والی
 گون تھی؟ چلنے چلنے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ دیوانی ہی نہ ہو جس کا ذکر
 میں گولے کے لڑتے سے کئی بار سن چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی
 مجھے اس کے دیکھے کا شوق بہدا ہوا۔ آواز آئی تو دیر سے بند تھی لیکن
 اس کے سوز جگر سے لڑتے میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے،
 تھی یا تھی کا راستہ میدانوں کی طرف جارہا تھا۔ اور مجھے کچھ ڈھانڈ
 بھی بندھنے لگی تھی کہ شاید میں گاؤں کے قریب ہی کہیں جا سکوں۔
 پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اور نظر کے سامنے بڑے بڑے پتھر
 پور چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔ اور کہیں دُور فاصلے پر یہ سلسلہ ختم ہوتا
 نظر آ رہا تھا۔ اچانک پھر وہی آواز سنائی دی۔ لیکن اب کہیں قریب
 سے دی پہاڑی گیت جواز دو میں یوں ادا ہو سیکے گا
 مندر سے آ رہی ہیں ناقوس کی صدائیں

تقدیس کے ترانے گانے لگیں ہوا ہیں
 دھنچکے رنگ و بو کی زنجین ہیں نفا میں کو

خوابیدہ سخن کی پھر زندہ ہوئیں ادا میں کو
 یہ دنوں از منظرِ فطرت کا ترجمان ہے
 اسے ترجمانِ الفت اس وقت تو کہاں ہے

میں ایک پتھر پر خاموش بیٹھا تھا۔ گو آواز آتی بند ہو چکی تھی۔
 اس وقت میرے دل میں بھی ایک درد تھا اور یہ درد مجھے بھی
 کمر ہا تھا۔ کچھ فاصلے پر میدانِ نظر آ رہے تھے لیکن میں ندی
 کی راستہ چھوڑ کر اس آواز کے رخ چویا۔ یہاں بھی قدم قدم
 ب و فراز تھے۔ اور پہاڑیوں کا سلسلہ پھر قریب پہنچا تھا۔

وہ ہاتھ اٹھا کر بولی: "مٹ دیا روئے، جاگئے میرے ساجن کاٹے"

یہی لایا ہو؟

میں نے بندوق پھر بٹل میں دہائی۔

"تم نے تو نہیں کہیں دیکھا؟"

کسے؟ میں نے سنے پوچھا۔

"میرے ساجن کو؟"

"نہیں؟ میں نے کہا تھا کہاں ہے تمہارا ساجن؟"

"دل کے پاس، آنکھوں سے دور! اُسے جواب دیا۔

"تم اس وقت درخت میں کیوں گھوم رہی تھیں؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا: "ساجن کو ڈھونڈتی تھی۔

اُسے کو جو کہہ گئے تھے، کل بھی مجھ سے کہہ رہے تھے جنہاں میں تو آکر

تم کہاں ہو؟"

سر دی سے ہاتھ شل ہو رہے تھے، میں نے دونوں ہاتھ

جیب میں ڈال لئے۔ "ن بولی، تبیں جاؤ لگ رہا ہے؟"

"ہاں؟"

"تو آؤ؟" "ن بولی، میرے گھر چل کر بیٹھو؟"

"چلو؟"

وہ آگے آگے چلی۔ میں پیچھے پیچھے چلا، لیکن وہ اس تیز

سے چلی کہ میں لائبے لائبے دھڑک بھرنے کے باوجود پیچھے ہی رہ جاتا

کچھ دیر یوں ہی چلنے کے بعد وہ ایک اونچی سی چٹان کے پاس رکی

چٹان کے پاس ہی ایک معمولی سی کوٹھڑی تھی۔ گھاس بھوس کی چھ

نہی، وہ ہنسکر کہنے لگی: "یہ سے میرا گھر، اندر چل بیٹھو، میں آگ جلاؤ

تم آگ تباہیوں میں ساجن کو تلاش کرنے جاؤ گی، ٹھیک ہونا؟"

یہ کہتے ہوئے وہ اندر گئی، میں بھی اندر جا کر دیواروں کی

کھڑکیاں دیکھیں، یہاں پاس ہی ایک گڑھے میں کچھ چنگاریاں تھیں

تھیں۔ اس نے ان چنگاریوں پر سوکھی گھاس ڈالی اور پھونک

لگی۔ پہلے دھواں نکلنے لگا پھر شعلے آگ جلنے سے کمرے پڑنا

وہ کچھ دیر یوں ہی دیکھتی رہی پھر ایک آہ بھر کر بولی:۔

"نہیں! نہیں! مجھے دھوکا ہوا؟"

پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی:۔

"تم میرے ساجن کا سنبھال لائے ہو گے؟"

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

"نہیں! اُس نے تو مجھ سے کہا اور آنکھیں پھار پھار کر

میری طرف دیکھنے لگی: "کون ہو تم؟"

پھر ایک قہقہہ لگا کر: "شاید تمہاری گائے کو گئی ہو گی، اُسے

یہی تلاش کر رہے ہونا؟"

"نہیں!"

"تو تم ہو کون؟"

"میں راسخ بھول گیا ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"راستہ بھول گئے؟ کیسے؟"

گازوں والے تولے دیوانی بچتے تھے، لیکن باتوں سے تو

وہ ہرگز دیوانی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے پھر پوچھا:۔

"کیسے راستہ بھول گئے تم؟"

"میں شکار کے لئے نکلا تھا،" میں نے جواب دیا، لیکن

اندھیل ہو جانے کے باعث راہ بھول گیا۔

"تم گاؤں سے آئے ہو؟"

"ہاں! یہاں سے کہا،" کتنی دور ہو گا یہاں سے؟"

"گاؤں تو کچھ دور نہیں،" "ن بولی، لیکن میرے ساجن

مجھ سے بہت دور ہیں؟"

اس کے بال ہوا کے ساتھ رقص کر رہے تھے۔ چاند نے

بالوں کی سیاہ نقاب چہرے پر ڈال لی تھی اور اس اداس اور اس فضا

میں یہ جوان عورت دامن کی اور سی و سیا کی چیز معلوم ہوتی تھی کہیں

پاس کی چٹانوں سے ایک لکڑی بگڑتی کرخت سی آواز سنائی دی۔

میں بندوق سنبھال کر تیار ہو گیا کہ نکلے تو دھواں۔

”کون کہتا ہے؟“ میں نے کہا: ”بیٹھ جاؤ نا!“
وہ پھر بیٹھ گئی۔

”پانچ دیوالیان کتنا عرصہ ہوتا ہے؟“ اُس نے پوچھا۔
”پانچ سال!“

”ٹھیک!“ وہ سہل کر بولی۔ ”پوسے پانچ سال میں تو
ساجن کے جانے کی ایک ایک گھڑی گنتی رہتی ہوں!“
”کیا ہرچہ ہے؟“ میں نے کہا۔

”میں کبھی گولے کی بیٹی ہوں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”وہ بھی گوالا ہی تھا۔
ہم دونوں یہاں اپنی گائیں بھینسیں چرنے کو لایا کرتے تھے۔ انہیں
بہت گنت یاد تھے۔ ہم دونوں مل کر گایا کرتے۔ بڑے مزے سے۔
ڈھور چٹکتے چرتے۔ ہم گنت گانے دن رات ہر چٹھہ کھل امارتے۔
دونوں مل کر کھاتے۔ چل کھاتے اور گنت گاتے۔“

”میں نکھیں بند کئے بیٹھا تھا وہ زور سے میرے زانوں پر ہاتھ
رکھ کر بولی: ”سُن سُن ہو؟“
”اُسے سُن تو رہا ہوں!“

”اس کو ٹھہری میں پہلے کوئی میرا گی رہا کرتا تھا۔ لیکن وہ ہمارا
بیواہ ہونے سے پہلے ہی نہیں چلا گیا۔ جب بانی پڑتا تو ہم یہاں آ بیٹھے۔
ڈھور چرتے چٹکتے۔ ہم گنت گاتے۔ بڑے مزے سے۔ پھر ہمارا بیواہ
ہو گیا۔ ہم گاؤں میں رہنے لگے۔ ہمارے پاس بہت سے ڈھور ہو گئے۔
ابھی میرے ہاتھوں کی ہندی سیلی بھی نہیں ہوتی تھی کہ ایک روز میر
چولے کے پاس بیٹھی روٹی کھا۔ ہی تھی۔ ساجن پاس بیٹھے کھا رہے تھے،
ساجن جو تھے۔ سُننے میں گاؤں کا پھیل تھانے کے دو سپاہی ساتھ کو
آ گیا۔ میں نے گونجٹ نکال لیا۔ ساجن بولے: ”اُسے ہمارا جھجھون
کیجئے۔“

”لیکن ٹیل ڈانٹ کر بولا۔“ میں نے اسے کارنے بلایا۔
”مجھے!“ ساجن نے تعجب کہا: ”کیا جرم کیا کریں گے؟“
”جرم تو دم کی ہم نہیں جانتے!“ ٹیل نے اکر کر کہا: ”تیرا نام

روٹی ہوگی ایک کوئے میں سوکے پتوں کا انبار لگا تھا۔ اودھر اودھر کچھ
کڑیاں بھی رکھی تھیں۔ ایک دوڑتی کے گھر سے بھی تھی۔ اور ایک پھٹا
پُرانا کھل تھا۔ یہ بھی اس کو ٹھہری کی کُن کا تات۔
”بیٹھ جاؤ۔“ وہ بولی۔ ”وہ کھل رکھا ہے۔ جارا لگتا ہے تو اور دھو“
”میں آگ کے پاس بیٹھ گیا۔“

”بیٹھ جاؤ نا تم بھی!“ میں نے کہا۔
”نہیں!“ وہ بولی۔ ”میں تو جاؤں گی۔“
”کہاں جاؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔

”ساجن کو ڈھونڈنے!“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ جو آئے کو
کہہ گئے تھے؟“
”تو پھر نہیں آ گیا کیا کروں گا؟“ میں نے کہا: ”مجھے گاؤں کو ماتا
بتا دو۔“

”تم ابھی جاؤ گے؟“
”تو اور کیا! میں نے کہا: ہاں! یہ تو کہہ رہا ہے ساجن کو
کہاں؟“

”تمہیں معلوم نہیں؟“
”نہیں!“
”تو تب سے میری طرف دیکھنے لگی۔“
”تم گاؤں میں نہیں رہتے؟“
”نہیں!“

”تو تم میری بات سنو گے؟“ اُس نے میرے پاس ہی بیٹھے
ہوتے کہا۔
”ہاں! کیوں نہیں؟“

”تم مجھے دیوانی تو نہیں کہو گے؟“
”یہ کہہ دو! اٹھ کر کھڑی ہوگی اور دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر اور
میری طرف جھک کر بولی: ”کیوں جی؟ جو ساجن کو ڈھونڈے وہ دیوانا
ہوتا ہے؟“

فرح میں لکھا گیا ہے۔

تو وہ جہاں لگی ہیں انہیں خچے چڑھیں بچہ سے اٹھیک ہے نا!

اتنا کہ کردہ اٹھی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

جنا کے جانے ہی کھلیا جیک بجا ہی سی نظر آنے لگی، میں بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ عاضی باہتاب بچہ کا پڑچکا تھا، طفل انجم سر دھچکی تھی، آسمان پر بارشوں نے خیسے دیسے ٹھارے رکھے تھے اور کس کس کی فضا پر کھری لگی تھی، شبی تھی ہوتی تھی رگھڑی تو میرے پاس نہیں تھی جو وقت معلوم ہو سکتا لیکن تیار سا تو سیٹھنے والی معلوم ہوتی تھی، میں ایک پتھر کھڑے ہو کر ادھر ادھر اس بد نصیب عورت کو دیکھنے لگا، ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ پھر ایک بار وہی سوز بھری آواز سنائی دی۔

اب رات ہو چکی ہے مگر یہ کہہ سارو

دن رات سر پٹکتے رہتے ہو ابٹا اور

یہ تم مرا کہاں ہے لے نور پاش تارو

تم سے اگر ملے تو یہ کہن اماہ پارو

پیا سے تمہاری جو من سوخت نیم جاں ہو

اور پوچھتی تھی ہم سے پتہ مرا کہاں ہو

میراجی بھڑا، جنگ تو ختم ہو چکی تھی اور جن کے نصیب میں گھر دیکھنے تھے وہ واپس آ چکے تھے، اس وقت جتنا ایک بزدل جٹان پر کھڑی تھی اس کے بال سانپوں کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکے بادل کے ایک ٹکڑے کی طرف دیکھ رہی تھی، میں جلدی جلدی دم اٹھا تا ہوا اس کی طرف چلا لیکن پھر ابھی جٹان کے دامن میں پہونچا ہی تھا کہ اس نے زور سے ایک تہقہ مارا اور خوشی سے بری۔

وہ آگئے! سا جن!

یہ کہتے ہوئے وہ بھاگی اور خیم زون میں ایک کھدیل پھل گری۔

یہ سنگ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گاؤں میں کئی روز سے کپڑو صکڑ ہو رہی تھی، گھبرو جان زبردستی بھرتی کئے جاتے تھے، سا جن بولے: "ناہاراج! میں تو نوکری نہ کروں گا۔"

"نوکری تو تیرا باپ بھی کرے گا" پٹیل نے غصے سے کہا۔
"کوئی زبردستی ٹھوڑی ہی ہے، پاس سے میں نے پہلے سے کہا۔"

"چپ رہ چھو کری، پٹیل نے جھجک کر کہا۔"

پھر ایک سپاہی بولا: "سن بے اتخوہ کبی ملے گی اور انعام بھی۔"

"مجھے تنخواہ و نخواستہ نہیں چاہیے، سا جن نے بھی ذرا غصے سے کہا۔"

یہ سنتے ہی ساتھ دالے نے پاؤں سے سا جن کے ٹھوکر مار کر کہا: "پھر میرے کھڑے تری جو اس سن ہے ہیں پل ورنہ دور انتظام کرتا ہوں۔"

ہم غریبوں کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ سا جن کو پکڑ لے گئے۔ میں بھی روٹی ہوتی ساتھ ہوئی، کچھ دور جا کر سا جن نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا: "جینا! چنتا مت کیجئے، میں جلدی آجیواں گا۔"

"ابھی جائیں گے، کہہ جو گئے تھے، سا جن آئیں گے تو میں اپنا لال جڑا پہنوں گی، اٹھیک ہے نا؟"

"ہاں! ہاں! میں نے کہا، کیوں نہیں آئیں گے؟"

"نہیں! وہ میری طرف رازدار کی کے انداز سے دیکھ کر کہنے لگی: "وہ تو آچکے۔ مجھ سے خچے رہتے ہیں کہیں۔ کل میں یہاں لیٹی ہوتی تھی۔ سا جن دو دروازے میں اکھڑے ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی لیکن وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر مجھے پکا کر کہا: "جینا! ڈھونڈھ لو مجھے! لائیں اب جانی ہوں، انہیں ابھی ڈھونڈھ کر لاتی ہوں، لیکن اب میں ان سے بولنے کی نہیں بیٹھنے

ساجن: یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

پر گاؤں والے اس بد نصیب کی لاش اٹھا لائے اور مٹی کے پائے میں
رسم کے ساتھ اسے جلا دیا۔ وہی جتنا چاہے یہ لوگ دیوانی کہو تھے
اب یہ سادہ لوح اسے دیوی کہنے لگے۔

دن چڑھے جب میں گاؤں میں پہونچا تو میرے نشان تھکے

ایک۔ اسم۔

شب گل

زندگی، مصوویت، رنگینیاں جو شبِ شہاب
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
وہ ترا تصویر بننا و عشق و اشتعال
وہ محبت کی نگاہیں و سرورِ خیاں و قتال
وہ تبسم و ضیائے چہلکِ رُوحِ جمال
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
ایک سخن رنگ و ریشم تھا سکوتِ اخلاط
حسن میں دلی ہوئی تھی کارِ گاہِ انبساط
عشق تھا سرچشمہ حسنِ طرب زارِ نشاط
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
بھول سکتا ہوں کہیں نہ ساعتِ رنگینِ عذار
وہ ترا دینا ادا ہے خاص سے جامِ بہار
وہ متاعِ جلوہ کی رعنائیاں وہ لالہ زار
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
وہ ترا کاوش پر کرنا بارشِ لطیفِ عظیم
وہ ترا ہنسنا ہنسنا و ترا ذوقِ سلیم
وہ نشاطِ قہر، وہ برہم و سیلابِ شہیم
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
کاوشِ حیدر آبادی

چاندنی چٹکی ہوئی تھی پھول تھے نہکت فروش
ذرا ذرا تمنا نفا سے ناز کا جنت بدوش
میں تھا عتیق حسن اور تو تھا شہابِ برقی پوش
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
تو میری آنکھوں میں تھا شبِ ہزارہ نرگس بگاہ
وہ سنبھری بال، وفت، وہ خضر ام حشر گاہ
بھولی سے رخسار، آنکھیں نیلگوں ٹیڑھی گاہ
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
وہ طرب کا جشن و گلگوں بوں کا بہت ساز
وہ مسطر پنکھڑیوں کا جلوہ بانِ نواز
وہ نوید رنگ و بون لذت میں ناگزیر
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
وہ مرا کچھ پوچھتا تھا تیرا سخن التفات
وہ بکھرنا زلف کا نہ عشرتِ جام حیات
کیا کہوں کیا پتیر تھی نہ رات لے شاہِ نبات
ہائے کیوں کر میں شبِ گل کی حکایت چھوڑ دوں
وہ سہ وہ قہقروں کے موتیوں کی آب و تاب
اندنی فخرِ لطافت، مودت جو ہے مشاب

ہو جاتے۔ اس کو بھی برداشت کر لیا پر مصیبت اور تھی۔ وہ یہ کہ یہ حضرت حسیناؑ اس لئے طلب ہوتے تھے کہ سارا درجہ زیرِ مذہبِ مکہ دیں مثلاً حقہ کی چلو، بس طرف لے جا کر کچھ نہیں ذرا درست کریں تاکہ اُس کی خاک بجائے اُن کے چھوٹے گے ہماری انگلیوں میں آئے خیر سے اگلا دن بھی ساتھ ہی لکھا لہذا اُس کا پانی حضرت حسیناؑ ہماری سائڈ کی گھر کی میں پھینکیں۔ حسینا صاحب گھڑے ہوں تو ہمارے سر دیں۔ اور آمدورفت میں ہماری ہی ناک کی پھینگیوں میں اپنے کپڑے رکھیں۔ ایک منٹ میں دس مرتبہ ہم اُن کی آمدورفت کے لئے ٹانگیں ہٹائیں یا اخبار میٹیں۔ جوتے ہیں کہ حسینا کچلے رہے ہیں۔ کہیں بس تہ بھانڈے جا رہے ہیں کہیں ہماری بیچ پر ان کو پیر رکھ کر اوپر کے چٹان سے کوئی چیز اتارنے کی ضرورت ہو۔ بزرگ آدمی دیسے ٹھہرے کیا کیئے۔ مگر بدعتیں بھی محدود ہوں نتیجہ یہ کہ اور تو میں نہ تھا۔ اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ پہلے تو میں نے عرض کیا کہ اُنہو جو ضرورت ہو تو حسینا کے بجائے یہ خادم حاضر ہے۔ اس پر انکساف نہ ہوئی بلکہ بولے کہ:-

”جناب آپ منہ نہیں کر سکتے“

میں نے کہا: قبلہ جنہی جو جو منہ کرنے نہ مگر وہ منہ کھلا کر خفا ہو کر بیٹھ رہے خیر۔
دوسرا شیشیں جو آتا تو ان کو تو ضرورت نہ تھی لیکن کچھ اور سوچیں لہذا میں نے گھر کی سے گردن نکال کر چرخنا شروع کیا۔ اے اے اے...
”اے اے“ تو ”نوب کھا پھاڑ پھاڑ کر۔ یور زائل ہائس کیا آپ یقین فرمائیں گے کہ حج حسینا دوڑا چلا آتا ہے!۔! اوھر میرا اور میرے دوست کا اور دوسرے مسافر دل کا یہ حال کہ اسے ہنسی کے ٹوٹے جا رہے ہیں اور اوھر ان کا حال؟ نہ پوچھئے۔ مائے غصے کے لرز گئے اور ڈوٹ کر کہتے ہیں حسینا سے ”اے اے“ تو ”تجھے کس نے بلایا ہے؟“ مرے پر سوڑے وہ مضمون ہمارا۔ حال یہ کہ معلوم ہو کہ ہنستے ہنستے شاید مر جائیں گے۔

بھل گئی ہنسی ختم ہوئی۔ لاکھ جن کئے۔ اخبار پڑھا۔ دل بہلایا تب جا کر ہنسی کم ہوئی۔ اب میرے دوست نے جھک کر اور میں نے اُن کو ”اے اے“ کے لفظ سے فطرت کرنا شروع کیا۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا: ”تم بھی عجیب اے“ ”میرے منہ سے جبر نہ نکلاؤ تم بھی عجیب کیا لا جواب اے“

اس مصرعہ کو سن کر وہ حضرت چرنک چرے اور میرے اوپر برس پڑے۔ میں نے بہت کچھ معذرت کی۔ سمجھا یا قبلہ و کعبہ پر میرے دوست ہیں میرا ان کا مذاق ہے۔ میرے علاوہ اس درجہ میں کوئی اور اے اے نہیں ہے مگر وہ نہ مانے بمشکل لوگوں کی سفارش پر انہوں نے جان بخشی کی مگر اب اوھر میری طبیعت حاضر اوھر میرے دوست کی۔ شاعری ہونے لگی۔ مصرعہ پر مصرعہ نازل ہونے لگا چند یا دیں:-

تم بھی کیا لا جواب اے اے میں آپ عالی جناب اے اے میں
جنگلوں میں اے اے کی گدھ میں ان دنوں دستیاب تو ہیں

شباب اے اے میں۔ کباب اے اے میں۔ شباب اے اے میں۔ غرض کوئی لفظ نہ چھوڑا جسکو گھسیٹ نہ مارا ہو۔ ان سب کچھ باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی شیشیں نکل وہ اوجھنا نہ آیا۔ پچھارے ہی کی ہمت نہ بڑھی۔ پھر خود ہی آیا جو سہی تو حضرت پوچھتے ہیں کہ ”اے اے“ تو کیا مر گیا تھا؟

اب خود سوچتے کہ میں نہ ہنسوں لیکن دوسرے لوگ ہنسیں تو میں کیا منہ پکڑ لوں۔ خیر حسینا صاحب گئے اور ہدایت ہوئی کہ کب میں سے تولیہ نکالوں۔ وہ نکالی جو سہی تو ساتھ ہی اُس کے ایک شیشی پھٹ سے نیچے گر گئی اور ٹوٹ گئی۔ اس میں سے کچھ دوا بہنے لگی۔ ”اے اے“ تو یہ کیا؟ ”معلوم ہوا کہ خضاب کی شیشی تھی جو ٹوٹ گئی۔ فوراً فرمایا کہ ”اے اے“ دوسری شیشی کیا ہوئی؟“ اُس نے جواب دیا کہ ”جھاڑی گیا تھا نہیں بی“۔

چمک کر بولے "نہیں لی؟"

اُس نے کہا "جی نہیں لی۔"

ڈانٹ کر بولے "تجھے معلوم تھا کہ پرسوں دعوت ہوگی۔۔۔۔۔ اب؟۔۔۔۔۔ یہ کبکڑا دھڑی بہا تھ پھیرا کچھ سوچنے لگے۔"

خود سوچنے کے خضاب کی شیشی ایک ٹوٹ گئی دوسری لاپتہ یہاں شاموی کا یہ عالم کہ لذت ختم ہو گئی سب قافیہ کباب، شراب، ختم ہوئے پر خضاب کا خیال تک نہ آیا۔ سانسے ایک عدد ڈاڑھی بے خضاب! شیشی پھوٹی ہوئی! طبیعت یوں ایسی حاضر کہ کس مقصد کیلئے جاسے ہیں۔
تیجہ یہ کہ شعر موزوں ہو گیا، اور ایسا کہ ناگن کہ اپنے دوست کو نہ سناں۔

میں نے کہا "یار غضب کا شعر ہو گیا۔۔۔۔۔ چھاؤنی میں نہیں لی شیشی کو"

میں نے مصرعہ دوبارہ اٹھا یا۔

عرض کیا ہے۔۔۔۔۔ چھاؤنی میں نہیں لی شیشی

جب سب متوجہ ہو گئے تو میں نے دوسرا مصرعہ کہہ دیا۔

"ان دونوں بے خضاب۔۔۔۔۔"

یو رائل آئس میں عرض نہیں کر سکا کہ کیا ہوا۔ بس قتل نہیں ہوا۔ ہاتھ پائی بھی نہیں ہوتی اور نہ کوئی مسافر ہنسی کے سبب مر اسب بال بال ہے۔

اُس کے بعد تیرہت ہی ہوئی جو دہلی کا اسٹیشن آگیا۔ میں نے ہاتھ جوڑے۔ پیر پچیسے اور معافی مانگی مگر وہ حضرت نہ مانے او یہی کہا کہ "میاں مجھے تم کو نہ معاف کرو۔"

میں نے اپنے دوست کے اپنے والد صاحب قبلہ کے دوست کے مکان پر پہنچا۔ یہ شخص سرکاری ملازم نہایت ہی بُنہمی ہوئی طبیعت کے اور متین اور باوقار شخص ہے۔ میرے پاس میں نہایت ہی اچھی رائے رکھتے تھے۔

تیسرے دن دعوت ہوئی میں نے اپنے کو کپڑوں وغیرہ سے اس طرح دُرسٹ کیا جیسا کہ چاہیے۔ ڈاڑھی ہٹانے میں حد درجہ، بالندہ کیا۔ بال سوار سے لیں۔ اسی طرح بہترین کپڑے اور بہترین وضع سے پہنے۔ اپنے ہونے والے خُسرے ملاقات کرنا تھی!۔

دعوت سے کچھ قبل یہاں آئے۔ معلوم ہوا کہ صرف چار حضرات اور میں گئے۔ تین حضرات آگئے اور اب مجھے چوتھے کا پہنچنا تو انتظار تھا جن کی صاحبزادی کا شوق جھک کر یہاں تک لایا تھا۔ اور یو رائل آئس آپ یقین کیجیے گا کہ یہ حضرت آئے۔ کاشن نہ تھا آئے۔ آہ! مگر ایسی میری تقدیر کہاں۔ ساتھ میں "اے" بھی تھا۔ ان کو دیکھتے ہی میرا عجیب حال ہو گیا۔ عجز میں شاید ایسی عبرت ناک حالت کسی کی نہ ہوگی۔ مجھان کا گمان تک نہ تھا! اور ان کے آئے سے میری حالت بہتر ہو گئی میں اس وقت موت مانجھا تھا پڑھنی لٹی تھی ہنسی روکنے کے لئے میں نے دانتوں سے زبان کاٹ لی اور یقین دلاتا ہوں کہ شاید کام چل جاتا۔ اگر ساتھ میں حبیبنا نہ ہوتا یا میرے دوست نہ ہوتے۔ نتیجہ حد درجہ غناک نکلا۔ جی ہاں غناک۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب قہد کے دوست اُن کی پشروانی کے لئے بڑے مصلحہ فائدہ کے جو اُن کا تعارف مجھ سے کرانے پڑے ہیں تو یہی حتی الوسع ہنسی کو روکنا چاہا کہ کچھ بھلا کہ! ابھی حاضر ہوا کہ لاکھ چاہا کہ کمرے میں گھس جاسے کے بعد ہنسی کی آواز نہ نکلی۔ کمرہ کبوت دور بھی نہ تھا۔ مگر تفریح پر۔

کمرے کے باہر اندھنٹس گیا اور جیچ اپنے کتے پر گھونسنے لگا، اتنے زور سے کہ بیڑہاں گیا تباہ کہیں جا کر اس قابل ہوا کہ خاموشی نصیب کی۔ دور دروغل خانہ میں پہنچا، منہ دھویا، کھنکھارا۔ اللہ سے دعا مانگی کہ الٹی میری مشکل حل کرے۔ اویسین شریف دل میں پریشان ہوا باہر نکلا۔ کیونکہ قرآن پاک پڑھنے میں مجھے دعویٰ ہے کہ ہنسی روک سکتا ہوں۔ مگر یور رائل ہانس یقین فرمائیں کہ میرا یہ دعویٰ ہرگز ناکام نہ ہوتا اگر کم سے کم وہاں حسینانہ ہوتا۔ میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی ہے کہ یسین شریف بھول گیا اور پھر ڈھٹا پڑا۔

لوٹتے ہی میں نے دیکھا وہ حضرت اٹھ کر چلنے لگے۔ ان کو لاکھ روکا۔ لاکھ پکڑا، مگر وہ نہ مانے اور چلے گئے۔

میں عرض نہیں کر سکتا میرا کیا حال ہوا۔ تن بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ موت کی سی ٹھنڈک بیٹھ گئی۔ سناٹے میں آگیا۔ اور اب ہنسی بھی جاتی رہی۔ کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اتنے میں میرے میزبان صاحب نے آواز دی۔

میں کیا کرتا، پہنچا سب چپ تھے۔ میں بھی جا کر خاموش بیٹھ گیا اور طبیعت کی ناسازی کا ہڈر کیا، اختلاجِ قلب کا ہڈر کیا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔

مجھے اپنے دوست سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت یہ کہہ گئے ہیں کہ آدم گھنڈا بعد آتا ہوں اور محض اسی اجازت کے لئے اترتا تھا۔ اور یہ سننے ہی میرا دل جیچ چکر چڑھ گئے لگا اور دل ہی دل میں میں نے دعا مانگی کہ الٹی اگر وہ آئیں تو کم از کم ایسا گنہگار تو بنیں نہیں ہوں کہ میری اتنی دعا قبول نہ ہوگی کہ حسینان کے ساتھ نہ آدے۔

لیکن نہیں، وہ نہیں آئے۔ ان کا انتظار کیا گیا۔ پھر آدمی گھر پر پہنچا تو انہوں نے کہلا دیا کہ دفعتاً انکی طبیعت ناساز ہو گئی ہو اور وہ معذرت چاہتے ہیں۔ مجھ پر ہیں۔ سبکے سب خاموش ہو گئے۔ سمجھ گئے۔ دعوت انتہائی خاموشی سے جوتی — اور مجھ سے کچھ نہ کھایا گیا۔

دوسرے روز صبح کی گاڑی سے میں اپنے دوست کے بھاگ آیا۔ میرے میزبان خاموش ہے اور انہوں نے نہ تو ایک لفظ کہا اور نہ مجھے روکا۔

گھر پر والد صاحب نے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں نے تو ایسا سنا ہے کہ انہوں نے لڑکی کی دوسری جگہ کہیں ریسوں میں بیٹنی بھی کر دی۔ والد صاحب نے فوراً کہا: اوہو میں سمجھ گیا۔ پھر مجھے الزام دیا کہ میں نااندر ہا اور در کر دی۔ اور پھر میری شوئی تقدیر پر اظہارِ ماتحت کیا۔

لیکن تیسرے دن میرے والد صاحب کے دوست کا خط پہنچا۔ اس میں کیا لکھا تھا۔ یہ مت پوچھئے۔ اس لئے کہ صبح میں بتا دیکھا نہیں اور جھوٹ بولنے سے فائدہ کیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ والد صاحب نے یہ کہہ دیا کہ تم انتہا سے زیادہ نالائق ہو اور اب تم تمہارے معاملے میں کبھی نہ پڑیں گے والد صاحب خوب روئیں۔ میں گھر سے فوراً ہی نوکری پر بھاگا۔

یور رائل ہانس، خود غور فرمائیں کہ بھلا اس میں میری کیا خطائی۔ یہ تو توقع میر کا بدلتا تھا۔

کلو

یور رائل ہانس نے ناظر فرمایا کہ کس طرح میری شادی کی تجویز نہ دے گا تو ہوئی لیکن میری دوسری شادی نہ دے گا تو ہوئی۔ یہ کون کون تو؟ میرے دوست جو دہلی کی تو دوالی نجم میں میرے شریک تھے۔ ان کا اصل نام کلو نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا لیکن عرفیت ان کی کلو تھی۔ یہ کالے تھے اور اسی مناسبت سے ان کے والدین نے ان کا نام کلو رکھ دیا۔

جہاں تک میری فائز کا تعلق ہے میں کالے اور گورے کے تعصب سے بلا ہوں اور میرے سب گہرے دوست بھی گلو تھے لیکن بخدا جھکویہ خیر نہ تھی کہ عداوت کے چہرے کی کوئی طرح میرے نجی معاملات میں بھی دخل ہو سکے گی۔

وہی دلے واقعہ کے بعد والد صاحب تبدیل بہت دن تک مجھ سے خفا ہے۔ لیکن تاکے۔ ایک دن خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ایک خان بہادر کی لڑکی سے شادی طے ہو رہی ہے اور نصیحت فرمائی تھی کہ آئندہ کسی قسم کی حرکت نہ کروں۔ اس شادی کی خط و کتابت طے ہو کر کوئی ان کا اتنی آیا کہ وہ سخرہ مجھے چپکے اور بے چپکے سے دونوں طرح دیکھ گیا۔ پھر بھی خان بہادر صاحب کو صبر نہ آیا اور انہوں نے اب خود مجھے طلب فرمایا۔ طے یہ ہوا کہ انہی کے یہاں جا کر ٹھہروں۔ میں اس سے بید گھبراہٹ اور یہ سوچا کہ یہ امتحان تو اس سے بھی مشکل ہے۔ بھلا کیسے جھکویہ جھکویہ تو طے کر لیا کہ ہنسنا مجھے تعلقی نہیں۔

اطیاشن پر نہیں لینے کے لئے موٹا آیا۔ ایک نہایت ہی ٹھاٹھ کے بیٹھے میں جا کر ٹھہرے۔ خان بہادر صاحب بڑے فیضی تھے انہیں میری بھڑک تھی۔ ڈسٹرکٹ ہاؤس کے چیمبر میں بھی تھے۔ زمیندار بھی تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے خانی تھے۔ دوسری بیوی کی سب سے بڑی لڑکی سے شادی ٹھہر چکی تھی۔ دو دنوں بڑے آرام وہ کمر میں ٹھہرائے گئے۔ رات کو بیڑا کھٹک کا کھانا مارا اور کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں دوستوں نے چند امور پر غور کیا یہ ممکن ہے کہ ہم جو بھی لڑکی کو دیکھ لیں! کیوں نہ کوٹش کر دیں۔ دویم یہ کہ وہ مجھے ضرور دیکھے گی۔ بلکہ شاید لایا ہی رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تب کیا کریں۔ خان بہادر صاحب کے کسی بچے مختلف سائز کے تھے۔ ایک ان میں سے کوئی چار برس کا بڑا باتون اور بڑا بچہ۔ دوسرے دن بدناشتے کے خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے باتیں پوچھیں۔ لہذا میرے دوست نے اس سے پوچھا کہ "بھئی تمہاری آبا گوری ہیں کہ کالی؟" وہ ہنسکر بولا: "نہی؟"

میرے دوست نے اپنے چہرے کی طرف نگاہ کی رکھ کر کہا: "ایسی؟" (وہ خوب کالے تھے)

لڑکا ہنسکر اور بیڑا چاکر بولا: "نہیں؟" زور سے سر ہلاتے ہوئے: "جاری آبا گوری ہیں؟"

میرے دوست ہنسکر بولے: "دیکھو۔ ان سے کہنا کہ تم نہیں دیکھتے تھے؟"

"لیجے اوکاٹے؟" میں نے گرج کر کہا کہ "خبردار جو تو نے اس کو نہ لڑکی؟" اور یہ کہہ کر میں نے روک دیا۔

مگر انہوں نے بچے سے یاری کا ٹھٹھا ملے ہوئے گئے اور خوب باتیں مجھ کو معلوم بھی نہیں اور ان حضرات نے پھر عجیب حرکت کی۔ ایک انگریزی اخبار پڑھا تھا۔ اس کا ایک صفحہ نیکر عبارت میں الفاظ تلاش کئے۔ اور ان الفاظ کے نیچے سرخ نشان لگوا دیا۔ یہ الفاظ اخبار کے ایک ہی صفحے پر تھے لیکن مختلف سطروں اور مختلف کالموں میں تھے جن الفاظ کے نیچے نشان لگایا تھا ان سب کو ملا جائے تو حسب ذیل جملہ بنتا تھا: "میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور یہ اخبار اسے کرنے چاہے کہ انہی آبا گورے آؤ۔ پہلے باقیہیات یہ پوچھ لیا کہ کہاں ٹھہری ہیں اور ان کہاں ہیں معلوم ہوا کہ اپنے کمرے میں علیحدہ بیٹھی ہیں۔ لڑکا پہلے جا کر دیکھ آیا پھر مسکرا کر اخبار دیا۔ وہ اخبار نے چلا لیا۔ وہاں اندر جا کر اس نے اپنی بہن کو اخبار دکھایا۔ لڑکی بھی تیراں نے نظروں کو جو پڑھا تو جھٹ سے، ایک جگہ اسی اخبار میں لکھا ہوا تھا: "نہیں؟" اس نے اس لفظ کو خطا کشیدہ کر کے

بیمیدیا۔ اور جب یہ اخبار پہنچے تو واپس آیا اور میرے دوست نے دیکھا تو حضرت نے منہ پھاڑ کر مجھے بتایا۔ اور تجویز کی کہ اس کا پھر جواب دینا چاہیے۔

میں سخت گھبرایا اور میں نے کہا: میاں کالا۔ یاد رکھو کہ تمہاری عاقبت بگڑ دینگا اگر ذرا بھی تم اس معاملے میں غل جتنے پھر خان بہادور اگلا ویسے ٹھہرا۔ یاد رکھنا ہمارے گا ایک نہ گئے گا اور پھر جو شکایت کی کہ سہرا ل میں پڑا تو ایک نہ سونچا گا۔
آپ خود غور فرمائیں کہ یہ شخص کس تہذیب تیزی پر آمادہ تھا۔ یہ کہتا تھا کہ لڑکی کو، کچھ لینا سخت لازمی ہے۔ اور خط و کتابت ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن میں نہ مانا۔ اس لئے کہ لڑکی کے باپ اور بھائیوں کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اگر ان سے کم دینا بھی لڑکی ملی تو منظور۔ لہذا مزید گفتیش نہ کیا۔ بہر حال ابن حضرت کو بشکل روکا۔ خان بہادور صاحب نے تین سٹ بانڈ روز پڑی خاطر و مدارات کی۔ خوب سیر کروائی۔ اپنے دوست احباب سے خوب ملوایا۔ کئی جگہ چائے کیک کھلوئے۔ اور ہم وہاں سے خوش و خرم واپس آئے اور ہمارے پیچھے پیچھے ہی خان بہادور صاحب کا ایک خط ہمارے ہائے میں آیا کہ والد صاحب قبلہ کی باچیں کھل گئیں کہ اوہ جوں بھی کسی بیٹے کا باپ ہوں۔ بیحد خوش ہوتے۔ لیکن تقدیر کا بد کچھ اور تھا میں تو دو دن گھر ٹھہر کر چلا گیا اور اب میرے نام ایک گناہ خط عجیب و غریب پہنچا۔ یہ خط والد صاحب نے جوں کا توں بند بچھے بھیج دیا۔ اب اس کو جو کھول کر پڑھتا ہوں تو عجیب ممتہ کم و بیش حسب ذیل تھا۔

”جو کتاب آپ کے پاس تھی اس کو دیکھئے۔“

۱۰/۳ + ۲۰/۳ + ۸/۳ + ۴/۳ + ۱۰۰/۳ وغیرہ وغیرہ

غرض اسی تم کا ایک سوال مسالکھا تھا اور خط ختم۔ اور اس خط پر پھر اس شہر کی جہاں خان بہادور صاحب رہتے تھے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی کتاب نہ تھی میرے دوست کے پاس ایک چھوڑ تین کتابیں ساتھ تھیں جو باہر ہی کئی تھیں۔ اب میں سخت حیران کہ کیا کروں کیا نہ کروں اور یہ معاملہ کیا ہے۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا میں نے اپنے دوست کو مار کر کہہ دیا۔ وہ کہتے تباں کو خط دکھایا۔ تو پوچھا کہ کون سی کتاب تھی۔ کہنے لگے کہ میری ایک کتاب وہاں رہ ضرور گئی ہے۔ اگر تیری کا ناواں۔ اس کا نام بتایا اب بتائیے کیا کریں سوچے کہ لاؤ خان بہادور کی کو لکھیں پھر طے ہوا کہ تار دیکھو یہی سے منگالیں۔ چنانچہ یہی کیا۔

کتاب آتی تو بہت جلد ممتہ مل چو گیا۔ خیال اسی طرٹ چاچکا تھا۔ ۱۰/۳ کا یہ مطلب تھا کہ دسویں صفحے کی تیسری سطر کا چوتھا لفظ اور ان تمام لفظوں کو جو ذکر جو جملہ بنا تو دیو نا کو بچ گئے کیونکہ آپ یقین ماننے حسب ذیل عبارت سامنے تھی۔

”جس لڑکی سے تمہاری شادی طے ہو رہی ہے وہ لڑکی کسی طرح بھی تم سے شادی نہیں کرنا

چاہتی۔ مجھے امید ہے کہ تم ایک شریف اور عزیز روحان ہو اور اسے اور مجھے دونوں کو گھر بھر

کے لئے احساندہ کرو گے۔“

میں یہ عرض کروں کہ اس عبارت کو پڑھ کر میں کیسا کچل کر رہ گیا۔ حالانکہ میں نے لڑکی کو نہیں دیکھا تھا مگر مجھے یہ لڑکی بید پتلی۔ لیکن میں نے اور میرے دوست نے یہی طے کیا کہ جو نہ ہو یہ خود اس نے لکھا ہے لہذا قطعی شادی نہ کرنا چاہیے۔ یہ تو طے ہو گیا لیکن سوال یہ تھا کہ والد صاحب کو کون روکے گا۔ اور ادھر خان بہادور کو کون روکے گا۔ اس لئے کہ وہاں بعض حالات رفتار پر تھے۔ مجھے والد صاحب قبلہ کے مرنے کی کمزوری کا علم تھا چنانچہ ایک خط لے ان کو بھجوا دیا میں نے لکھ دیا کہ میں نے سنا ہے کہ لڑکی ذرا ”وسمی“ ہے۔ اور میں ہرگز

کہ کروں گا۔ اب دیکھیے کہ جو تشریح کو بھی تو نہیں نے یہ بتایا کہ کیسی اور نہ یہ بتایا کہ مجھ کو کیسے معلوم ہوا جب حیدر دیا گیا تو میں نے ایک صاحب سے بشرط راز و رازی زبانی کہہ دیا کہ وہ خدا کا بیت کرتی ہے اور میرے پاس اس کا ثبوت ہے اس سے زائد میں نہیں بتا سکتا۔ اگلے والد صاحب کی مرضی ہو تو میں حاضر ہوں۔

والد صاحب یہ سننے ہی چمک گئے۔ کہاں تو عورتیں لڑکی کا معائنہ کرنے جا رہی تھیں اور کہاں جُملہ معاملات التوا میں پڑ گئے۔ مجھے ہنہر معلوم والد صاحب اور خان بہادر صاحب میں کیا اور کسی چابی۔ شاید اسی ایسی فی کس سال بھر تک بھر کر فی گفت و شنید والد صاحب کی طرف سے نہیں ہوئی لیکن بچہ کو یہ معلوم تھا کہ وہ قد میں ضرور ہیں۔ مگر اسی دوران میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

میں ایک کام سے پرہیز کرتا تھا۔ سیکینٹ کلاس میں سفر کرتا تھا۔ میں بچہ کرکٹ کھانا تو ڈیپے میں دو مسافروں کو موجود پایا۔ ایک جوان لکھن شخص متاثری بیوی کے ساتھ تھا۔ اس کو خاص شہس چھو گیا۔ بہت جلد میں نے دیکھا کہ اُن کی نوکر بگم صاحبہ نے شاید مجھ کو ضرورت سے زیادہ غور سے دیکھا۔ اُن کی بارو دکھا میری دیکھنے کی ان کو محبت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اُن کو میری عادت بھی نہیں اور وہ یہ کہ کہ قسمی سے وہ واقعی دیکھنے کی چیز نہیں۔ میں اخبار پڑھنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اُن نوجوان خاتون نے اپنے شوہر قحط میں سے کچھ باتیں کرنی شروع کر دیں۔ میں حد درجہ متعجب رہا۔ ساہوکاروں کو کبھی شہس چھو کہ شاید یہ خاتون اس درجہ میں میری موجودگی کے خلاف ہیں اور گفتگو میرے بارے میں ہو رہی ہے اور ہر قسمی سے یہ واقعہ بھی تھا۔ میں نے مجبوراً رخ اپنا دوسری طرف کر لیا۔

لیکن بہت جلد ان حضرت نے میری طرف توجہ کی۔ مجھے سٹریٹس میں کیا پھر ایک اودھ سوال اودھ کا دریافت کر کے کہنے لگے۔ "میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟"

مجھے اس جملے سے ویسے ہی لپٹی ہے۔ میں اسے گردا گرد بہت نکلن ہے، دیکھا ہو گا۔ اس سلسلہ میں میری عادت ہے کہ قصداً میں معات کا نام لینے سے گریز کر کے اپنے خطاب کو توڑے کوئی پیدا کرنا ہوں۔ خود ہی ان خدان بہاد صاحب کا نام لیکر بولے کہ بیٹا یہ مجھے دہاں دیکھا ہو گا۔ اب ان نوجوان خاتون کا یہ حال کہ بیان نہیں کر سکتا، مسکراہٹ، شہزاد، حجاب اور گھبراہٹ، ایک فن ایسے کہ بیان نہیں کر سکتا، اور وہ لاکھ اپنے شوہر کرم کو روکتی ہیں مگر توبہ کہجئے، ایک تہہ لگا کر انہوں نے کہا۔

میں آپ کا اپنی بیگم صاحبہ سے تعارف کرتا ہوں۔ آپ ان کو جانتے ہیں اور یہ آپ کو

میں نے بڑھکر مصافحہ کیا اور عرض نہیں کر سکتا کہ میرا کیا حال اور ان کا کیا حال۔ چوٹ یہ چوٹ وہ حضرت بوسے۔

..... اور مجھے آپ کے اُن کالے دوست چھوڑ دی ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا: "قبیلہ، حمد رومی تو مجھ سے کیجئے نہ کہ میرے کالے دوست سے۔"

وہ بولے: "کیوں؟"

میں نے کہا: اس لئے کہ قابلِ ہمدردی تو میں ہوں نہ کہ وہ۔“

”بوسے: جناب آپ کیوں ہونے لگے۔“

میں نے کہا: "اور پھر کون ہو گا۔"

اب خدا انہوں سے تجسس کے ساتھ اپنی عظیم صاحبہ کو دکھیا جن کا تہرقی ہو رہا تھا اور بولے۔

”آپ... تو...“

میں نے کہا: ”حضرت اُمیدوار تو یہ خادم تھا....“

خود خاتون صاحبہ بھی چمک پڑیں اور وہ بھی بولے: ”ہیں!“

میں نے کہا: ”ہیں کیا....“

وہ بولے: ”آپ کا پیغام گیا تھا کہ ان کا؟ جناب کا اہم گرامی؟“

میں نے اپنا نام بتایا اور دیکھا کہ دونوں چونک پڑے۔ اور دونوں چپ۔ اور پھر جو نہیں ہنسی آئی ہے تو نہ پوچھئے حقیقت اب کھلی عجیب لطیف رہا۔ اُن کی بیگم صاحبہ نے چاہا کہ ان کا منہ بند کر دیں مگر وہ نہ مانے اور انہوں نے بتا دیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان محترمہ نے مجھے دیکھنا چاہا اور خود اپنے چھوٹے بھائی اور ایک اور سہیلی کی غلطی سے میرے سیاہ دوست کو مجھے بھلا اور نورانی ناپسند فرما کر اُن کے مشورے سے وہ عجیب و غریب خط لکھ دیا جس کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔ محترمہ اپنے شوہر کی زیادتی سے بے تحاشہ اور شرمندہ تھیں۔ انہوں نے بھی غائلہ زیادتی کی جو مجھ سے حقیقت کہہ دی۔ میں نے اُسی وقت اُن دونوں کے روبرو مجھے ارادہ کیا کہ آئندہ اس کا لے محسوس کو کبھی ایسے مشن پر نیکر ساتھ نہیں جاؤں گا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اس موقع پر میں خود چوٹ نہ کھاتا۔ لہذا میں نے ان حضرت سے کہا کہ ”حضرت۔ معاف کیجئے گا غلط فہمی کو دُعا دے مجھے کہ کم از کم کالے گوسے کی گفتیش پھر نہ ہوتی۔“

اور میں نے دیکھا کہ محترمہ شرم کے مارے عرق عرق ہو گئیں۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ میرا رنگ اُن کے شوہر محترم سے بہت زیادہ صاف تھا۔

تفصیل مختصر بقیہ سفر بہت لطیف کے ساتھ ملے۔ اور میری ہر نرم رخصت ہوئے۔ وہ نئی تال جا رہے تھے۔ مجھے یہ اقبال کرتے میں بالکل شرم نہیں آ رہی ہے کہ مجھ کو کوئی اور تخلیق ہوئی اور ایسی اچھی صورت شکل کی لڑکی محض غلط فہمی میں ہاتھ سے جاتی رہے کا بھید خلق تھا۔ اور اپنے کالے دوست کے اوپر تو یہی غصہ آیا۔ معلوم ہوا کہ کالوں کی دوستی ہی خوب نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے دوست کا رنگ میرے زندگی کے معاملات میں اس قدر دخل ہو گا۔

ایک موقعہ اُٹھنے کھڑا اور دوسرا کالے رنگ نے اور مجھے جب ہی سے اُن تمام توانمیں سے اتفاق ہے جو کالوں کے خلاف دُنیا میں پاس ہوتے رہتے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی

اے عورت تیرا نام خود داری ہے۔

اس مقولے کی صداقت ملک کے سب سے بڑے مزاح نگار۔

منصور ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی۔

کیا تازہ ترین تصنیف اور ظرافت کی پیش تصویر ”چچی“ میں دیکھئے ابڑی بی کا گھر دار اور دولہا بچہ میں اپنی طرز کی پہلی جینز ہے۔ چچی کی وفاداری اور جھوٹی بی کی خود داری کی کہانی سن کر آپ تڑپ تڑپ جائیں گے۔ قیمت چھڑے

میرا ایشیائی محبوب

(مشرق و مغرب کی ایک دلکش داستان)

— — — — —

طلباء ریونیورسٹی کی آٹا و بے نلکے اور عجیب و غریب زندگی کے حالات سن سن کر میری یہ خواہش روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی تھی کہ جلد از جلد میں بھی کسی یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے چند سال گزاروں۔ چنانچہ اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر میں نے اپنی یہ خواہش والدین پر ظاہر کی مگر انہوں نے اسے پسند نہ کیا کیونکہ وہ قلمو قلم تعلیم کے مخالف تھے۔ تاہم میں اپنی ضد پر قائم رہی اور چونکہ میں انجی راکوٹی اور چینی لڑکی تھی اس لئے میرا اصرار ان کے انکار پر غالب آیا اور میں یونیورسٹی میں داخل ہوئی۔

یہاں میری پہلی دوستی نے میرا تعارف ایک نوجوان طالب علم جن سے کر لیا جو نہایت نیک اور اخلاقی شخص تھا۔ شاید ہم دونوں کے تعلقات آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ جاتے کہ میں کئی روز اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی مگر اسے اس نے ایک ایسے شخص کو میری ملاقات کرنے کے نام نہ کر دیا جس کی یاد سے آج دل کے سوراخیں بس کر میری زندگی بحال کئے دیتے ہیں۔ جن اکثر اس شخص کی تعریف کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس سے زیادہ قابل طالب علم آج تک یونیورسٹی میں نہیں آیا۔ اور یہی نہیں بلکہ بڑے بڑے پروفیسر بھی اس کی لیاقت اور طہیت کے حقدار ہیں۔ اس کا نام میری لی تھا اور میری اس سے ملاقات نہایت دلچسپ طریقے پر ہوئی۔ ایک شب ہفت کے ایک صوفی عالم کی تقریر سننے کے لئے جب میں اپنی سہیلی کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو تمام مجلسیں بھر گئی تھیں جس سے میں بڑی مایوسی ہوئی لیکن اتنے میں میں نے جن کو اپنی طرف بلانے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا چنانچہ ہم دونوں جن اور اس کے ساتھی کی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔ جہاں سے وہ ہمارے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں اور میری ایک طرف کھڑے ہو جائیں گے، آپ اور ام سے بیٹھ جائیے۔" جن نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔
 سامعین تقریر سن رہے تھے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جن اور اس کے دوست کو مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے تھے اور میری کی نظریں بھر چکی ہوئی تھیں۔ مگر میں یہ دیکھ کر بالوں کو تجڑ میں رہ گئی کہ میری لی — چینی — تھا جس کا جتن لے کر بھی نہ کر سکی کہ میں کیا بھول چلی تھی۔ وہ تھا اور اس کے چہرے سے وقار چمکتا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے بازوؤں پر رکھے ہوئے تھے اور انھیں — وہ سیاہ مکتوی آنکھیں — اپنا خاموش اور پرسکون جادو مجھ پر کر رہی تھیں جب میں نے پیشکش اپنی لگا لی اس جین مرد پر سے ہٹائیں تو انھیں ایک دعوہ اور اس کی طرف دیکھنے کے لئے چلنے لگیں، دوبارہ دوبارہ، وہ جاتے گتے بار بار تبت کا بڑا صوفی روحانی بادشاہ گریبا تھا اور میں نے بھی چند لمحات تک اس سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوشش میرے دل کے خلاف بغاوت کر رہی تھی اور میں مجبور ہو گئی کہ میری گود دیکھے جاؤں اور جب میں اس کی طرف دیکھتی تھی اس کی سیاہ مکتوی آنکھیں میری نظروں کو کئی لمحات تک گرفت میں لے رہی تھیں اور مجھ پر ایک نامعلوم کینکاری ہو جاتی۔

میرے تہ و تہ پر اپنے مخصوص انداز میں ہنسنا۔ تم میری سیدھے کھلے ہوتے پھولوں کی طرح ہو! یہ بیکارگی میں اُس کی تحریر اور جدت بھر
آواز سنگر بالکل اُس کے قریب ہوئی۔ بید قریب!!

اُس رات کے بعد بہتری کے لئے میرے دل میں جو جذبات بیدار ہو چکے تھے، انہوں نے جھکوبے قابو کر دیا۔ میں ہر وقت اُسے
ساتھ رہنا چاہتی تھی اور اس ارمان کو پورا کرنے کیلئے میں دُنیا کی ہر شے قربان کرنے کو تیار تھی۔

جن کی ایک خوشگوار شام کو بہتری اور میں ایک ایسی راہ چل رہے تھے جہاں کوئی تیسرا نہیں دیکھتے اور سننے والا نہ تھا۔ ہم دونوں
خاموش تھے کیونکہ ہفتے بعد میں گھر جانے والی تھی اور میرا کاروبار فرسائیل ہمارے داخل پر مسلط تھا۔ دفعتاً بہتری ٹھہر گیا اور آواز
لہنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دے میں نے بھی فوراً ہی اس کی طرف دیکھا۔

”اے ملے رخصا! ہم اور تم ایک پر سکون دنیا میں سفر کر رہے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تیر اور طوفانی رعبہ جلد ہمارے
مشتی کو کہیں پہلے جاسے گی۔“ سنگر ایسا بگڑا ہوا تھا کہ اُنھوں میں سجدہ کی جھلک رہی تھی۔ ہم کو وہاں لوٹ جانا چاہیے، اُسے خوبصورت
پھول! ایسا نہ ہو کہ پھر ہم بے بس ہو جائیں۔“

میں جانتی تھی اس کا کیا مطلب ہے لیکن مجھنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ بھی ہو بہتری! مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں طوفانی زوے پر
نہیں ڈرتی جب تک۔۔۔ جب تک۔۔۔ تم میرے ساتھ ہو!۔۔۔

اس کے معصوم لب میرے بالوں کے قریب آئے۔ اُس نے مترنم آواز میں کہا: ”میرے آبا و اجداد کی عقل گمراہ کے بادل کی طرح
ہے جو آسمان میں پھل جاتا ہے۔ اُسے گل کو نہ پار! میں تم سے محبت کرتا ہوں، بہت گہری، بہت سچی اور نازیبست کرتا رہو، لیکن
میں محبت کرنی نہیں چاہتا۔ تم بالکل بھولی اور کمن ہو لے میری محبوب! اسلئے میں تمہارے پاس سے چلا جاؤں گا۔“

”نہیں، نہیں، میں بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔ اگر تم میرے پاس سے چلے گئے۔ تو میں مرجاؤں گی۔ میں نے اُسے
سینے پر سر رکھ کر لہانہ انداز میں کہا: ”بہتری! میں مرجاؤں گی۔“ اور اس وقت مجھے ایسا ہی مخصوص ہوا تھا۔

اُس نے میری پریشانی سے ملول ہوتے ہوتے میرے رخساروں پر سے آنسو پونچھے۔ ”میں تو تمہاری ہی بہتری کے لئے کہہ
ہوں اُسے آسانی پھول! کہ ہم کوشا دی نہیں کرنی چاہیے۔ میری محبت تو دایمی ہے گی، تمہاری البدنہ۔۔۔“ لیکن میں۔۔۔
فورا ہی اُسکی پیشین گوئی کی تقلید کر دی۔ ”تم کیوں شبہ کرتے ہو میں پیشہ تم سے محبت کرتی رہوں گی!“

کاش میں سمجھ سکتی کہ وہ کس قدر چاہتا ہے ایک ماہ بعد ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ مگر میں نے اسے سارا نہیں رکھا۔ بہتری کو
ابھی مگر میں گمراہیوں میں رہنا تھا چنانچہ ہم نے کالج سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لے لیا اور وہاں بسنے بسنے لگے۔ بہتری آواز
دور دور کالج جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ ہم دونوں خوش تھے، بہت خوش، تنہا، اکیلے۔ دُنیا کے بھیلوں سے دور، زلزلے سے
فرجوں سے الگ! میرے والدین کو میری شادی سے بید صدمہ ہوا، خصوصاً میری ماں تو یہ جان کر کہ بہتری کوئی سہ قریب الملک چوگٹ
چنانچہ انہوں نے میرے خطوط کے جواب تک نہ دیے۔ تاہم میں مسرور تھی اور شادی کا دوا کیل زمانہ بے فکر اور خوش و خرم شہل کی طرح
کرتے لگی۔ بہتری کی عدم موجودگی میں گمراہ کے خاموش اور پر سکون دن مجھے انعامِ اللہ سے غافل کر دیتے اور شام ہوتے ہی وہ دونوں
کے دختروں کے نیچے چوہوں سے لڑتے ہوئے مٹ جاتے اور بہتری مجھے محبت سے لہرے پر سوزنٹے، اور دونوں انجیر اور انجیر

ہستائیں سنایا کرتا میں مستقبل کو بالکل بھولی ہوئی تھی، ہیرہ کی کے طلسم کو توڑنے کے لئے مجھ میں تاب ہی کہاں سے آتی!۔

۱۱۱۱

یہ معلوم کر کے کہ میں مغرب ماں بننے والی ہوں مجھے فنا ناگ اور ساگذا کہ یہ تیسری ہستی ہماری مسرت بے پایاں میں نعل انداز ہو گئی مگر ہیرہ کی اس سے بے حد خوش تھا اس نے ایک ہوشیار اور تجربہ کار نرس کو گھر پر بلوایا اور چند ماہ بعد میرے ہاں کچھ پیدا ہوا۔ میں کئی روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی، اور کافی عرصے بعد میں اس قابل ہوئی کہ ہیرہ کی کی پریشانی کو جو اس کے مضطرب چہرے اور بے خواب آنکھوں سے چوہا تھی اپنی کمزور مسکراہٹ سے دُور کر سکوں۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی بھی عود کر آئی ہو۔ تم بچے کو دیکھنے کی مشتاق ہو گئی، اس نے محبت سے کہا: ”وہ تندرست و توانا ہے۔“ یہ لہجہ ہیرہ کی خوش خوش بچے کو لے آیا اور اسے ہیرہ کی خوش میں لٹا دیا۔ ”دو نئے نئے ہاتھ ہوا میں کیل رہے تھے ہیرہ کی نے بچے کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا دیا کہ میں بچے کو دیکھ سکوں لیکن..... میرے سر پر دل سے کی زمین ٹل گئی میں نے پھر غور سے دیکھا۔ یہ میرا بچہ تو نہیں ہو سکتا..... یہ..... یہ معنی خیز صورت چھٹی آنکھیں، چھٹی ناک! یہ میرا بچہ کیسے ہو سکتا ہے!۔

”جاؤ..... لے جاؤ اسے یہاں سے! میں بُری طرح چچی۔ یہ کریہہ المنظر شکل!..... یہ میرا بچہ نہیں ہو سکتا! نکل جاؤ، یہاں سے!“

ہیرہ کی دم ہو گیا اور اہستہ سے اس نے بچے کو اٹھالیا۔ یہ اس کا بچہ تھا، اُسی جیسا! لیکن مجھے تو اس امکان کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔

تو رنجی تھی کہ میرا بچہ مجھ جیسا ہوگا۔!!

میری چھینٹیں کُن کر نرس کے میں لگتی، ہیرہ کی سہا ہوا کھڑا تھا، اس کے چہرے پر حسرت اور دُعا سی چھاری تھی اور بچہ اس کے سینے سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے غیر معلوم چور رہے تھے۔

”بچے تنہا چھوڑ دو..... مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔“ میں نے بے اختیار ہو کر کہا ”میں اب تمہاری صورت بھی دیکھنی نہیں چاہتی، میں تم سے بیزار ہو چکی ہوں۔“

نرس بولی ”سٹرپی! ان پر سرمایہ کیفیت طاری ہے، اگر آپ تھوڑی دیر کیسے باہر چلے جائیں تو اچھا ہو۔“

ہیرہ کی خاموشی سے اپنے بچے کو جسے میں نے قابلِ لغزین سمجھا، سینے سے جٹائے باہر چلا گیا۔

اس غیر متوقع صدمے سے میری حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ہیرہ کی میرے سر ہاتے رات رات بھر بیٹھا چکے چکے رہتا تھا اور مجھے تسکین دینے کی مقدمہ برکوش کیا کرتا تھا۔ میں بالکل بول نہ سکی۔ میری ماں کو بلا دیا اور اسے کہتے ہوئے سناتے ہیں اس باری! میں تمہاری ماں کو جلد بلاؤ گا۔“

میرے والدین آئے اور جب میں سفر کے قابل ہو گئی تو مجھے واپس لے گئے۔ بچے کو دیکھ کر وہ حقیقتِ حال سے واقف ہو گئے۔ وہاں سے آج کل کے آئندہ ہم سے یہ ذکر بھی نہیں کیا۔ ہیرہ کی کی طرف سے میرے دل میں اتنا زیادہ منفرد ہوا ہو گیا تھا کہ میں محبت ہی کہ مجھے اس شخص سے اس قدر گہری محبت ہوئی تھی کیوں! میں نے اس سے شادی ہی کیوں کی جو اس کا بچہ جننے کی ذہن آئی!۔ آخر میں اس سال کی یاد میرے دل سے بالکل غوج ہو گئی، جب ایک نامور المرحوم اور پاک بخت کرنے والی روح نے مجھے اپنی پناہ

میں لیا تھا۔ کوئی دو سال بھی نہ گزے ہوئے کہ میرے پاس یونیورسٹی کا رسالہ آیا جس میں کالج نے پروفیسر میری کی کی پبلنگ چلن ہیں بوقت موت پر اظہارِ رنج و الم کیا تھا میں بھی افسردہ ہوئی لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سرے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ اور وہ بچہ؟ میں نے یقین کر لیا کہ دن بھی مر چکا ہوگا۔ اور اس طرح میری کتاب زندگی کا یہ اہم و حق ہمیشہ کیلئے الٹ دیا گیا۔

چنانچہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۷ء

دوسرے سال میری منگنی جیریلڈ سے ہو گئی جو ایک کاروباری فرم میں ملازم تھا۔ میرے باپ نے اس سے میرے لڑکپن کی شادی کا ذکر کر کے اسے ساتھ ساتھ اُسے یہی بتا دیا تھا کہ میرا پہلا شوہر مر چکا ہے لیکن اُس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میری منگنی تھا اور نہ میں نے کبھی یہ قصد پھیرا۔ شادی کے بعد ہم لندن کے نواح میں ایک خوبصورت مقام پر رہنے لگے۔ ایک برس بعد ہائے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور ہم نے اس کا نام رتھور رکھا۔ اس کی آنکھیں اپنے باپ کی سی اور بال میرے جیسے تھے۔ اور بہت جلد ہم دونوں کی مرکزِ محبت بن گئی۔ بے شمار دن آسودگی سے گزرے۔ ہاں اس کا یہ گیارہ سال کے عرصے میں میرے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پھر آرام سے گزرنے لگی میں اب اوجھڑ کر چلی تھی اور اپنا مگڈلشٹ کی تلخ کام یا کو باغی نے کم کر دیا تھا۔

ایک دن میرا شوہر دفتر سے آکر گھٹے لگاؤ میں شنگھائی جانے والا ہوں اور فرم کا مالک چاہتا ہے کہ اُس کی لڑکی بھی وہاں کی سیر کر لے۔ اس نے اگر تم اس کی سیر کرانی کیلئے چلی جاؤ تو وہ تمہارے اور رتھور کے اخراجات خوشی سے برداشت کرے گا۔ جیریلڈ اور رتھور شنگھائی جانے کے لئے بہت بے قرار تھے مگر میں نہ جانے وہاں کیوں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے پاس چونکہ کوئی معقول وجہ نہ تھی اسلئے بہت جلد ہم شنگھائی روانہ ہو گئے۔ میری سیر اور رتھور بہت جلد ایک دوسرے کی سہیلی بن گئیں اور اس سفر سے بید خوش تھیں۔ شنگھائی کے ہوٹل میں ہماری ملاقات جیریلڈ کے دوست پٹریم، اُس کی بیوی اور برادرِ بستی جو رتھور سے ہوئی اور اُن کے اصرار پر ہم نے اُن کی یہ دعوت قبول کر لی کہ ان کے جھوٹے خوشنماکان میں چل کر وہیں جو شہر کے شور و غل سے قریباً چاس میل کے فاصلے پر تھا جیریلڈ اور ہم کام کاج سے فارغ ہو کر رہنے کو یہاں لے آئے تھے البتہ جو رتھور اور رتھور لازم ہائے ساتھ ہر وقت رہے کہ ہمیں مختلف مقامات کی سیر کرائیں، لیکن مجھے اب شور و غل نہ تھا اور یہ خاموش جگہ مجھے دیرانِ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اُن پر نام چنیدوں سے نامعلوم خوف سا لگتا تھا جو سامنے دریا کے کنارے اپنی راہ چلا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے لڑکیوں کو کہہ دیا کہ وہ گھر سے دور نہ جائیں۔ ایک ملازم نے بتایا کہ یہ غریب چینی انقلابی ہیں اور کبھی کبھی یہ لوگ رہزنی بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر عموماً جاتی نقصان نہیں پہنچاتے صرف روپیہ مانگتے ہیں۔

دریا کے کنارے کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک سمارٹہ کنشت چین (بدی بنکدہ) کے کھنڈرات تھے۔ ہم نے ایک وزیرِ مال کی بھی سیر کی۔ لیکن ہمارے ایک ملازم دنگ نے ہمیں بتایا کہ یہاں بہت سے غار اور پوشیدہ مقامات ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکے کیونکہ اُن میں بہت سے جھک سکے چاہو گزریں ہیں۔

ایک دن میں ایک چینی فقیر تھا اور اُس نے اپنا نام واہ کو بتلایا۔

”آپ انگلستان سے آئی ہیں؟ اُس نے پوچھا۔

”ہاں! کیا تم انگریزوں کو پسند کرتے ہو؟“ روز جو ابابولی۔

”واہ بوجھنے لگا۔“ میرا ایک دوست ہے اسکو انگریزوں سے خاص پوچھی ہے۔“

”کیا تمہارا دوست انگریزوں کو پسند کرتا ہے؟“ لڑکیوں نے وہی سوال دہرایا۔

”واہ بوجھنے لگا۔“ میرا دوست ہے کہنے لگا تو ہم دونوں مشنری اسکول میں پڑتے تھے لیکن میرا دوست انگریزستانی کو بھیجی کا ناخ نچایا

کرتا تھا۔ ایک دفعہ تو بازار میں اُس نے اس پر کچھ بھینک دی۔ اس کے بعد ہم نے بہتری کی کہیں کہیں وہاں سے بھاگ آئیں؛ لڑکیاں یہ سنکر بڑے زور سے ہنسیں۔

دوسرے دن میں باغ میں بیٹھی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ واہ بوجھنے لگا اور اس کے ساتھ میں ایک اور شخص ایوار پر سے مجھے جھانک رہے ہیں۔

”لی ہونگ! اس جگہ کو دیکھو۔ واہ بوجھنے لگا اپنے سانچی سے کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ لی ہونگ کی وہ — سیاہ انگلیں — جن سے تحقیر و ملامت برس رہی تھی — میرے دل کو چھنی

کر دیں گی۔ چلن کے وہ تمام خون جن کو میں اب تک بھولنے کی کوشش کرتی رہی، اس وقت میرے دل و دماغ پر چھائے اور میں ہاں

سے بھاگ کر چھب جانا چاہتی تھی۔ لی ہونگ اور واہ بوجھنے کی طرف چلے گئے تھوڑی دیر چلکے دن سترہم اور دونوں لڑکیوں کے پاس تو

گڈے جو پانی سے تھیل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ لی ہونگ کچھ دیر تک وہاں ٹھنک کر ان کو گھورتا رہا۔

اس وقت کے بعد سے، گھر سے باہر نکلنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دن میں ایک آدھ مرتبہ میں لی ہونگ کی جھلک ضرور

کہیں اس پاس پھر تے ہی دیکھ لیتی تھی۔ اور ہر دفعہ وہ سیاہ و داغی اور متفرق آمیز نظریں مجھے کھاتی جاتی تھیں۔ جو رخ لے دیکھا ایک

دفعہ کہنے لگا: واہ بوجھنے لگا ہے وہ شخص نصف انگریز ہے۔“

”نصف انگریز!؟“ میرے منہ سے حیرت و استعجاب میں نکلا۔

”ہاں! وہ کہتا ہے کہ اس کا باپ ایک زبردست عالم تھا۔ پبلنگ ہنورسٹی میں پروفیسر — اور لی ہونگ کے

بچپن ہی میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت سے یہ ورہرہ بھیک اٹھا پھرتا ہے۔“

مجھے ایسا معلوم ہو گیا کہ کوئی میری روح صلب کر رہا ہے۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے بند کر لئے اور رات بھر کی خیال سے

لرزتی رہی۔ میں سمجھ گئی تھی، اب سمجھ گئی تھی، اتنا سنا، جو انصاف و لاس، مجھے اس جگہ اس لئے بھیجا تھا کہ ندامت اور ملامت میرے

ایمان کو پہنے تیروں سے مُردہ کر دیں اور میں سمجھوں کہ دنیا اتنی وسیع نہیں کہ اس کا کوئی حصہ مجھے اپنے شرناک اعمال کے نہ ملنے

دلنے نتائج سے محفوظ رکھ سکے۔

آخر کار میں نے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کر دیا کہ جو نہاں ہو جائیگا، اُنچا نچلی ہونگ کی آنکھوں سے بچے گی میں نے پھر

کوئی کوشش نہیں کی میں وہ ہونگ ٹھنک نہ دل اس طرح جلی گئی کہ روح بیاختی اور جسم تکلیف میں مبتلا۔ وہ بھی میرے پاس ہی آگیا۔ مگر

میں نے دیکھتے ہی ناگہانی اضطراب میں چلائی: ”جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں کتنا نہیں ہوں جسے تم دھتکار سکتی ہو؟“ اُس نے غلین آواز میں جواب دیا۔

کا نپتے ہوئے میں نے پوچھا: تم چاہتے کیا ہو؟
 کچھ بھی نہیں میں مغربی عورتوں کو جتنا چاہتا ہوں کہ مجھے اُن سے نفرت ہے۔ میں..... میں..... انہیں مار ڈالنا چاہتا ہوں؟
 اُس کی سیاہ آنکھیں ہلک آنکھیں اور میں ذکر بھیجے بی، مگر وہ بھی قریب آگیا اور کہنے لگا: میری ماں — ایک انگریز عورت تھی.....
 مشنری اسکول میں انہوں نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ میری ماں نے مجھے تجارت سے کیوں محکمہ ادا کیا۔ میرا
 باپ ایک جید عالم تھا..... وہ فخر سے سر بلند کر کے کہنے لگا: میں بھی عالم ہوتا — مگر — میرا معزز باپ مجھے تعلیم دینے
 کے لئے زندہ رہتا! :

میں نے آہستہ سے پوچھا: آخر تم چاہتے کیا ہو؟ — مجھے — کیوں بتا ہے ہر؟
 لی ہونگ نے اپنے شانے ہاتھ میں اس نفرت کا اظہار کیا کرتا ہوں جو میرے دل میں روز بروز مستون مزاج یوں کیلئے
 بڑھتی جاتی ہے۔

وہ وہاں سے دریا کے کنارے کنارے جانے لگا۔ میں اُس کی طرف کھڑی تھی رہی۔ کاش مجھے کوئی اس سوال پر روح مجسم
 غم و غن سے آواز دے سکتا!
 روز اور میری، دنگ کے ساتھ مچل کا شکار کر رہی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر میں نے دیکھا کہ واہ بو اور پانچ چھ اوچھندیوں نے
 لی ہونگ کو کچھ باتیں کر کے لڑکیوں کو گھیر لیا اور دنگ کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ بے قابو ہو کر میں اُس طرف چلی ہوئی دوڑی۔ انکو چھوڑ دو
 — چھوڑ دو۔

مسنز جم بھی میری آواز سن کر اٹھیں اور ہم دونوں لڑکیوں کو چھڑانے کیلئے جدوجہد کرنے لگیں۔
 اتنے میں میں نے لی ہونگ کی آواز سنی۔ جلدی کرو — صرف لڑکیوں کو بھگالے جاؤ۔
 ہم دونوں واہ بو سے لڑ رہی تھیں اور باقی چینی لڑکیوں کو لے جا رہے تھے۔ میں نے چنچ کر کہا: لی ہونگ! ایسا نہ کرو۔
 — ان کو چھوڑ دو۔

اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا، اُس کی آنکھیں زہر میں تھیں۔ ہوتی عوار میں معلوم ہوتی تھیں۔ کل تمہارے مرد شگنائی کا آجائیکے
 اُن سے کہہ دینا کہ روپیہ تیار رکھیں، لڑکیاں نہیں واپس لے جائیں گی۔ میں واہ بو کو اُن سے لٹنے بھجوا دیا۔ روپیہ تیار رکھنا اس سے
 بھروسے خافوں سے بچ جائیں گے۔

میں نے لی ہونگ کو پکڑ لیا اور میری آنکھیاں اس کے کہہ ٹول میں اٹھ گئیں۔ واپس چلی جا۔ اے انگریز عورت! اسے
 لی ہونگ مجھے تجارت سے بے ہوش ہٹانے جو تے بولا: روپیہ تیار رہے لڑکیاں واپس بھیج دی جائیں گی!
 مسنونہ سہی لی ہونگ: میں نے التجا کرتے ہوئے کہا: تم یہ کچھ کیا ہے جو تم جیتے بھی نہیں! وہ میری لڑکی ہے۔ تم —
 ہیرتی لی کے — اور وہ تمہاری — ہیں ہے!!

میں نیم ہوش ہو کر گر پڑی۔ اُس نے مجھ کو دیکھنا لگا گوارا نہیں کیا۔ دوسرے میں نے روز کی خیف صدا سنی۔
 "ماں! — ماں!"

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور منہ زخم میرے پاس۔

ممنوعہ کی تسلی اور محمد دی سے متاثر ہو کر میں نے اپنی کہانی کا کچھ حصہ اُسے سُنا دیا۔ وہ کہنے لگی کہ یہ لوگ لڑکیوں کے ساتھ کوئی تشدد نہیں کریں گے، صرف رویہ بد چاہتے ہیں۔

”کیا خبری ہوگک انتقام لینے پر آنا وہ ہو جاتے ہیں نے روتے ہوئے کہا۔
جیر لڈ اور جیم دو سے رون دو پہر کو آئے، دو گتے راستے ہی میں اُن کو اس واقعے سے مطلع کر دیا۔ اپنے شوہر کی صورت دیکھ کر
میں ایک اور خوف سے لرز گئی۔ اُسے جب میری گذشتہ زندگی کا حال معلوم ہو گا تو اس کا اعتماد اور محبت چکنا چور
ہو جائے گی۔“

جیر لڈ، واہو کا انتظار کئے بغیر فوراً بت کہہ کے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ان بھنگا منگوں کی جاتے قیام تھی۔ جلد گھر پہنچا رہا، باقی سب جیر لڈ کے ہمراہ ہو گئے۔ جب ہر بھنگہ سے کے قریب پہنچے تو ایک بندہ وقف چلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی نصرت و جرن پٹنی کھنڈ میں سے نکل کر ہماری طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے ہمیں گھیر لیا اور دوپے کا مطالبہ کیا۔ میں دوڑ کر پی ہو گیا کے پاس پہنچا۔ اس کی پیشانی سے عیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

”میری بچی کہاں ہے؟“

عین اسی وقت واقعہ رونق پڑی اور میری کونکلیوں سے کچر کچر ہماری طرف لانے لگا مگر باقی مینی ان کو پھر گھسیٹ کر واپس لے گئے۔ یہ دیکھ کر چہرہ لڑے نہ رہا کیا اور اس نے چینیوں پر گولی چلا دی۔ چینی بگڑ گئے اور پھر سے ہوسے شیروں کی طرح میرے شوہر اور بچہ پر ہل پڑے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لی جہنگ اور اُس کے ساتھ اس کا دوست واہ کو چاہتے تھے کہ لڑائی کیوں کو بغیر روپے کا مطالعہ کے دوا کر دیں لیکن دوستوں نے لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے، چنانچہ انہوں نے بچائے لی جہنگ پر حملہ کر کے زخمی کر دیا تھا..... مگر سب سے بڑا وجہ مجھے اندیشہ تھا کہ لی جہنگ مجھ سے انتقام لے کر مرے گا۔

”اسے کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ لی ہونگ۔۔۔ یہ میری سچی بات ہے۔۔۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

ہماری نظریں ہیں۔ اب کن سیاح انکھوں سے دے سفر آورده حشرات معدوم ہو گئی تھی۔ ہاں اس جہی کو کوئی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

میرا شوہر غصے سے چلا یا اس گدے سے کہیں عاجزی کرتی ہوا یہ کہکرنی ہوئی کی طرف جھپٹ کر آیا اور اس کے چہرے پر ایک زور سے ٹکرایا۔ لی ہوئی کی طرف حرکت نہیں کی۔ زبان سے ایک لفظ تک نہ نکالا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے دوست نے قہر لے کر اس کی طرف بندوق تاقی ہے، دو کھلی کی طرح بندوق اور میرے شوہر کے درمیان آگیا۔ گولی لی ہوئی کے پار ہوئی اور نہ لڑکھڑاکر گر پڑا۔

آتشِ جنوں سرد ہو گئی۔ لوگ کی ہونٹ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے شکستہ آواز مگر ٹھکانہ لہجہ میں کچھ کہا اور وہ پہلی جلدی سے

نہ کیوں کوئے لئے میں نے دیکھا کہ لی ہوگئی کی دھک اور رخ سے لبر پڑا نکھیں بچے ملاش کر رہی ہیں۔ جیر لہ بھی اُسے — جس نے اپنی زندگی میں اس کی جان بچائی — اپنے قدموں میں لٹکا دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

میرا دل اب بھی تک پوشیدہ تھا اور کسی طرح بچے یقین ہو گیا تھا کہ لی ہوگئی اپنے منہ سے کچھ نہ کہے گا لیکن جب میں نے اُسے عالم ہانکئی میں دیکھا تو میرے دل پر حیرت میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں — کچھ کہہ رہی تھیں کچھ التجا کر رہی تھیں۔ میرے دل میں ترنم کا ایک طوفان چا ہو گیا۔ وہ میرا ہی تو بچہ تھا، میرا ہی خون، ادھ غریب و ناتواں جسم، وہ بھوکھی روح جیڑی — میرے محبوب — لی کا تو بیٹا تھا!!

میں اب بھی وہاں سے اپنا راز محفوظ ٹھیکہ کر سکتی تھی مگر نہیں، میری روح بچا بچا کر کہہ رہی تھی "جان غریب بند ہو جانو! آنکھوں کی خاموش التجا لوٹوں لے جاؤ اُسے پاس جاؤ اور اسکو اپنے سینے سے لگائے" اُنکی آنکھیں یہی التجا کر رہی تھیں مگر کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہے گا۔

میں وہیں بیٹھ کر لی اور اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میں اس نازیبا حرکت پر حیرت متاثر ہوں" اس کا سانس اٹھ کر چکا تھا، وہ "رک رگ کہہ رہا تھا" اس بچی کو کوئی تھلید نہیں پہنچائی تھی — مگر پھر بھی اس کی ماں کو تو تکلیف ہوئی ہوگی۔ — بچہ نہ جانے اپنے ماں باپ کی کیوں خواہش کرتا ہے ... میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ جیسی خاتون مجھے یہ عزت بخشیں۔"

میرا دل بھرا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ رحم میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ میری روح گناہ کی بیڑیاں توڑ رہی تھی۔ اسکی ہجوم اس لڑکے کی جوتہا اور کوئی دم کا ہانہ ہے!"

منہ زخم لڑکیوں کو گھر لے گئی اور میں نے اپنے شوہر کو اپنے پاس بٹھا کر کہا "اس نے تمہاری جان بچائی ہے جیر لہ! اس نے کچھ سکین آمیز باتیں کرو" اور گویا اگلہوار ہوا، میں نے اسہ سے کہا "یہ — میری لی کا بیٹا ہو — میرا بیٹا!"

جیر لہ کا چہرہ اتر گیا لیکن میں نے فطری پرواہ نہیں کی میں تو اعزاز کر رہی تھی کہ "یہ میرا بیٹا ہے" ملے خاتون! آپ کس قدر رحم دل ہیں! لی ہوگئی کے مرنش ہونٹ سخت ہوتے جلدے تھے۔

"ہیری لی — کیا جینی تھا؟" جیر لہ نے لکٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں! میں اسہ سے بولی مجھے کوئی یاد رہا تھا" وہ ایک زیر دست عالم تھا!

لی ہوگئی کے بستر پر خوشی اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنے معزز باپ کے پاس سو دوڑ اُس نے بیکسل کہا "ہاں بیکنگ میں ہونہ خاک ہے"

"ہاں — ہاں — ایسا ہی ہوگا" میں نے اس سے وعدہ کیا۔

اگرچہ جیر لہ صدمے سے دم بخود تھا، پھر بھی اسے احساس تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بچہ اپنی زندگی کے آخری سال لے رہا ہے جس نے اس کی جان بچائی۔ وہ لی ہوگئی پر جھک گیا اور پیار سے اسکی پیشانی پر سے موت کا پسینہ پونچھنے لگا۔

لی ہوگئی کی نظریں میرے چہرے پر سے نہیں ٹھٹھکیں۔ اس نے اپنا دھار میرے سینے سے ملا دیا۔ کیا کوئی فنی طاقت ہے

کے اُس کو جسے یہاں اس لئے کھینک لائی تھی کہ پچھلے دنوں میں اُن کی آغوش میں دم توڑے؟۔۔۔ آغوش جس نے پیدائش کے وقت نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیا تھا؟ میں نے اس کے رخسار پر اپنے لب رکھ رکھے اس کے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ ماں۔۔۔ اُسکے منہ سے آخری بار بصد حسرت دیاں نکلا اور اُس کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں۔

جب جیرلڈ نے اُسے میری آغوش میں سے لیکر اپنی آغوش میں لیا تو میرے دل میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔

”بائے بیکنگ میں اس کے باپ کے پاس سلا دو! اور جیرلڈ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: اہں پیاری! یہ وہیں سو بیٹکا۔“

چند دن بعد ہم وطن روانہ ہو گئے۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جب اس دُست ہوئے اور میں کچھ سمجھ سکے تو قابل ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے شوہر کے منوم دہر اس میں رہنے کی وجہ، جو اس کی روحانی اذیت کا باعث ہوئی، یہ بھی کہ میرا ایک بچہ تھا۔۔۔ جو میری سنگدلی کی وجہ سے جب تک جیا، وہ دو ڈاؤن کا محتاج رہا۔ جیرلڈ اس دُکھ میں خود کو مبتلا تھا، کاش وہ مجھے بھی اس میں شریک کر لیتا! اس کی اُداس آنکھیں اُسکے دل کا پتہ دے رہی تھیں، کاش وہ مجھ پر بھی اپنی زبان سے اس کا اظہار کر دیتا!۔

ایک سپر مارکیٹ میں اپنے شوہر سے کہا: جیرلڈ میں تمہاری بھرت کی سستی نہیں ہوں پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے محبت کرو۔۔۔ مجھے اب تمہاری محبت کی بید ضرورت ہے۔۔۔ میں عین جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی مجھے زبردستی دھکیل رہا تھا۔۔۔ مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔۔۔ اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ بیس سال کے بعد بھی میں اس سے نہ بچ سکی تو کانپ اُٹتی ہوں۔ میرے بچے کو میری آغوش میں اس لئے موت آئی تھی کہ میری سزا پوری ہو جائے اور میں خود ہی تمام عمر اس کی دعا مانگتا رہا؟۔۔۔ جیرلڈ اب نہیں پہچانتی تھی کہ میں رہی، مجھ پر ترس کھاؤ!۔

جیرلڈ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا: میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش پر جیہ نام ہوں جیرلڈ! میں سزا ہے جی کہ کہاں تک!۔۔۔ اور رُخدا جائے یاد، مجھے تڑپنے کیلئے کب تک زندہ رہنے سے؟۔۔۔۔۔ تنہا ہے بغیر تمہیں اور بھی بے یار و مددگار رہ جاؤں گی۔ جیرلڈ! مجھے اپنی محبت دے دو!۔

میرے شوہر نے میرا ہاتھ اپنے میں لے لیا جس سے میں اطمینان اور سکون سا محسوس کرنے لگی۔

گھر پہنچے ہیں دو ڈھائی مہینے چڑھ چکے تھے۔ ایک دن روزے ٹھیکین آواز میں کہا: اتنی۔۔۔ نہ جانے لی ہونگ مجھے کیوں یاد آتے جاتا ہے!۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اُن کہنے لگی: ”ابا کہتے ہیں کہ میں اُن واقعات کا ذکر تک نہ کروں مگر چھی اتنی اصرار اس دنو مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے۔ وہ بُرا آدمی تو نہیں تھا، کیوں اتنی؟ اس نے ابائی جان بھائی اور اس کے علاوہ جب دن چینی ہیں غار میں گئے تو اس کا سلوک ہائے ساتھ نہایت شریفانہ تھا۔ اس نے ہمیں کھانا کھلایا اور پھر وہ فرش پر میرے دربارہ بیٹھ گیا۔ چند لمحات تک وہ میری طرف حسرت اور محبت سے دیکھتا رہا، پھر اُس نے انگریزی میں کہا: چھوٹی بہن!۔۔۔ چھوٹے سے سبب کے پھول! مجھے اس سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ اور دیکھنا اتنی! اس نے مجھے ایک رام وہ

بستر پر ڈال دیا اور جب میں سو کر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ دن خود زمین پر لٹا ہوا ہے اور آتی! — رو رہا ہے!! اُسے مجھے اور میری بولے جانے کا پڑا رنج تھا، تمنا؟ اُسے یاوہ کے مجھے روناسا آجاتا ہے — میں چین کے تمام واقعات ایک نہ ایک دن بھول جاؤں گی خرافی — لی ہونگ کو کیسے بھلا دوں؟

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ لی ہونگ نے تمہارے باپ کی جان بچائی تھی روز! — بہادر — تمہا! — بیاتے اس سے گلو گھر پر کہہ اور اس طرح اُس ٹھکانے سے ہوتے بچنے کی اندوہناک یاد میں ایک اور دردناک یاد کا اضافہ ہو گیا۔ لی ہونگ نے میری بچی کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا! — دن جانتا تھا کہ دن بچی کون ہے!! — اور وہ اُسے لئے رو رہا تھا!! — یہ بہار کا موسم ہے اور گلہ نشہ گرمیوں کے واقعات بہت دیرینہ معلوم ہوتے ہیں۔ حیرت انگیز دفتر سے آنے والا ہے اور روز بروانے پر اس کا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی محبت آپس میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شاید یہ میرا خیال ہی خیال ہے کہ حیرت انگیز روز کو صرف اپنی بچی سمجھتا ہے اور میری برائے نام — کیونکہ میرا بچہ تو وہ تھا۔

ہوا کے ایک لطیف جھونکے نے سبب کے سپید بھول روز کے بالوں پر کبھی دے ہیں اور وہ اپنے باپ کے ہاتھ میں ملتا ہے آ رہی ہے لیکن میرا دل دور بہت دور ایک ایسی سنسان جگہ مصروف نام ہے جہاں ایک بہادر بچہ اپنے عالم اور معزز باپ کے پہلو پر پہلو جو خواب ہے۔

صادق الخیری

ہاٹ (نگری سے ماخوذ)

تعلیم زدہ

جسے دیکھئے، نوکری کا ہے سائل
تجارت سے واقف نہ گھیتی کے ماہر
غلامی کے فن میں مگر جاق چوبند
وطن کی محبت، نہ قومی حمیت
بچتے ہیں مسراحہ ہے چاکری میں
نہت رہی ان میں باقی نہ جرات
دامغان کے مغلوں، دل انکے مہرہ
یہ آزاد اخلاق! یہ پیر نفس!
یہائی لے، یہ ام لے، یہیں بدتر زحائل
نہ صنعت کے لائق نہ حرمت کے قابل
ہوا ان کو تعلیم سے بس یہ ماحیل
یہ ہونے میں خود فوج دشمن ہیں شال
ایسی بریں قافلہ ایسی پرہیز
ہوئے ہیں یہ کجبت پڑھ لکھ کے ہنر
ارادے فسر، خبیلات باطل
رذائل ہیں ان کی نظر میں فضائل

کسی اور کو ان سے امید ہو کیا
خدا کے پیڑے خدا سے غافل

(ک ش)

اندھی محبت

(جب محبت کے اندھے دیوتا کیو پڈ کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟)

منظر ہو گا

پہلا منظر

حادثہ

ان کا جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ آنکھوں نے وہ دیکھا اور آواز
نے وہ محسوس کیا کہ الامان الحفیظ! کا راجا ملک ایک بڑے پھرے پھرے
مکراتی اور پیچھے ڈھولوں شرک پر پھسلنے لگی۔ پھر اس کے بعد کیا
ہوا اس کا بچے پر نہیں میرے حواس جیسے کسی اتھاہ تاریکی میں
دوب ہے۔

کار شاید کسی کھٹیں جاگ رہی ہو، شاید کسی پہاڑ سے ٹکرائی
ہو، میں ہیوشن ہو چکی تھی۔

پہلا منظر ۲

تاریکی

پانچ دن کیسے گزرے! مجھے اس کا مطلق احساس نہیں
پیشانی پر اور سر کی پشت پر ایسی چوٹیں آئی تھیں جنہوں نے مجھے
سُدا کر رکھا تھا۔ اس پر شدید بخار نے حواس مختل کر دیے تھے
پانچویں دن جب مجھے کچھ ہوش آیا اور میں نے اپنی جگہ
اٹھانے کی ایک ناکھانوں کا کوشش کی تو دیکھا کہ میرے میں ایک گہرے
تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی بے روح تاریکی — جسے میری آنکھوں
نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اگرچہ میرا سر بیٹوں میں جکڑا ہوا
تھا مگر میں نے اسے آہستہ سے گھما کر دیکھ کر دیکھنے کی کوشش
کی۔ مگر بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں نہ کوئی درجہ ہے نہ
روشنی کا کوئی دوسرا اہتمام۔ اچانک سرد اور تاریک قبر کی یاد نے
میری روح میں ایک نشتر گھونپ دیا۔ میرے دل نے کہا:

”پانچ دن سے شہر شرملاک جلتے ہوئے ہیں کار کا ایک
ایسا خوفناک حادثہ پیش آیا جس نے میری کتاب زندگی میں ایک
عجیب و غریب باب کا اضافہ کر دیا۔

موٹر کار کی پھلی سیٹیں سامان کو لدی ہوئی تھیں۔ چچا جعفر نے
سامان کا ایک جڑ بکھر چکی سیٹ پر ٹھونے جلنے کی بجائے بہتر کھجا
کر ڈائیو کر کوسا نہ دلیں اور اس کی سیٹ پر خود وقتی افراد چڑھ جائیں۔
چچا خود اگلی سیٹ پر بیٹھے کار چلائے تھے اور دیکھنے کے پہلو میں دو تیز
لے اور دھڑکے مناظر دیکھ رہی اور اسے کاجا نہ بے رہی تھی۔
جہاں کہیں پر خطر راستہ کوئی اچانک موڑ نظر آتا دکھائی دیتا نہیں بلکہ
آگاہ کر دیتی ایسی ہی صبح کی خوشگوار خلک ہوا پہاڑی راستوں کی
ناہوار گھاٹیاں، کہیں آہستہ آہستہ چٹے، کہیں بل کھاتی ہوئی تھیں
کہیں گہرائی کا کافی چڑیاں، کہیں سرسبز صحرے کے غردہ میسرے۔
ان تمام چیزوں نے میں سید غلط کر رکھا تھا۔

دفتائیں نے دوڑ میں سے دیکھتے ہوئے کہا: ”چچا! چچا!
ایک اور پر خطر موڑ آگیا۔ رفتار ڈال دیں گریجے آف، یہ سیاہ غار!
راستہ بھی بہت ناہوار ہے۔“

چچا جان کے منہ میں موٹا سا سنگار تھلا گول گول آداریں
بولے: ”تردد نہ کرو۔ بہت آہستہ چلا تو تاخیر کا اندیشہ ہے۔
میں شام سے پہلے شرملاک پہنچنا ہے۔ وہاں وکیل میرا

قرب سے روئے کھٹے ہو گئے۔

اور بیچ بچہ پڑی: چچا! چچا! جعفر! چچا جعفر!

پانچ دن کے بعد کلینک میں میری آواز منگروںس ودر پڑی۔

"خاتون! کیا بات ہے، کیا بات ہے! تم کیسی ہو؟ میں نرمی سے"

"نرس" میں نے گھبرا کر روتے ہوئے کہا: خدا کے لئے

کسے میں رو رہی کرو۔"

"رو متی؟"

"ہاں، میں نے کہا: یہاں کوئی رو رہی کیوں نہیں ہے؟"

نرس نے قریب آکر میری نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں

بھر بولی: "دن کا وقت ہے خاتون!"

میں گھبرا کر اٹھنا چاہتی تھی۔ مگر میری گردن اکڑی ہوئی

تھی، میں بے بسی سے کھٹے پر گر پڑی اور روئے گئی: "نرس مجھے

بہر طر اندھیرا ہی اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں

دیتا۔ مجھے تم بھی دکھائی نہیں دیتیں، چچا کہاں ہیں؟ ہاں؟

چچا!۔"

"میں ابھی مگر جعفر کو بلا رہی ہوں،" نرس نے کچھ گھبراتے

ہوئے لمحے میں کہا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

میں مسکایاں لیتی ہوئی بستر پر پڑی رہی۔

"مینی! مینی! ریتا! کیسی ہو؟" چچائی آواز آئی۔

"چچا! چچا! آپ کہاں ہیں؟ آپ مجھے دکھائی نہیں دیتے؟"

"نقاہت کا سبب ہو گا، مینی! چپ چاپ پڑی رہو۔"

تم پانچ دن بے ہوش رہی ہو، یہ کہتے ہوئے اگر مجھ پر جھک گؤ

اور میری پیشانی چوم لی

میں بے اختیار رو پڑی۔ چچا میرا دل بیٹھا جاتا ہے

مجھے کچھ نہیں سو جاتی دیتا۔ کیا اب لوگ مجھ سے ہنسی کر رہے

ہیں؟ کیا باہر آکر اب جھک رہا ہے؟ ہاں میری آنکھیں! میری

آنکھیں کیا ہوئیں؟ وہ ٹھکی ہیں یا بند؟ یہ کیا ہو گیا؟"

معلوم ہوتا تھا چچا جعفر کو میری باتوں پر ہریان کا شہر

ہو رہا ہے۔ بار بار کہتے: "نرس! ابھی کچھ لینا۔ کہیں بجار زیادہ تیز نہ

ہو گیا ہو؟"

دو جناب میں نے آدھے گھنٹے پہلے حرارت دیکھی تھی۔

نارل تھی۔"

"تو نرس۔ فوراً ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر دو۔"

دس منٹ بعد ڈاکٹر ہوئی۔ اس نے مجھ سے چند سوال

کئے۔ پھر جی آواز میں چہ کہہ کہا اور انہیں کمرے سے باہر لے گیا۔

میں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا: نرس! ڈاکٹر نے کیا

کہا ہے؟ کیا میری بھارت جاتی رہی؟"

نرس نے کچھ بتانا شاید مناسب نہ جانا صرت اتنا کہا۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہا، کوشش کیجئے کہ نیند آجائے۔ یہ کہہ کر وہ میرے

مجھے خٹک کر لے گئی۔ میں مسکایاں لیتی ہوئی ایک ہنسن افزا

اندھیرے میں چپ چاپ پڑی رہی۔

چچا ۳۷

علاج کی تجویز

مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ آدھ گھنٹے بعد

میں نرس سے پوچھ رہا کہ مینی! نرس اب کیا چاہے گی؟"

شام کو چچا جعفر چپ چاپ میرے کمرے میں داخل

ہوئے۔ میں نے ان کے قدموں کی ہٹ سنی۔ وہ آہستہ آہستہ

قریب کھڑے ہوئے۔ میں منتظر تھی کہ کوئی بات کریں گے مگر انہوں

نے کوئی بات نہ کی۔ وہ شاید میری آنکھوں کو غور سے دیکھ رہے

تھے۔

آخر گھبراہٹ سے کہا: چچا!۔"

"ہاں! ہاں! ریتا!۔"

"آپ چپ کیوں ہیں؟ میرا جی گھبرا رہا ہے میری آنکھیں

کو کیا ہو گیا چچا جان؟ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں؟ میرے منہ سے ایک آہ نکلی۔

چچا ضبط کر کے بولے: "نہیں بیٹی، یہ عارضی اسٹے۔ مہینوں چاہا تو ڈیڑھ دو مہینوں میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کی آوازیں ایک دلدوز درو پہنا رہی ہیں۔

میں بچ پڑی۔ ڈیڑھ دو مہینے اتنی مدت اس اندھیرے میں رہو گی؟ ہاتے اب کیا ہو گا؟

چچا بولے: "بیٹی، اس طرح رویا نہیں کرتے میں نے آج مشہور ڈاکٹر شیڈی سے ملکر مشورہ کیا ہے۔ ان سب کی یہی رائے ہے کہ ڈاکٹر شیڈی کو بلانا چاہیے۔"

"وہ کون ہیں؟" میں نے مایوس لہجے میں پوچھا۔
"ڈاکٹر شیڈی مشہور ماہر چشم ہیں۔ انہوں نے بعض پیدائشی نابیناؤں تک کو بصارت بخش دی ہے۔ وہ شہر اک سے تین سو میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اور اتنے مصروف، دی ہی کہ شادی کہیں باہر جاتے ہیں؟"

"تو پھر وہ یہاں کیوں نہ آئیں گے چچا؟"

"نہ آتے تو نہیں انکے ہاں جانا پڑے گا۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہاتے! تو لوں کہئے مجھے اندھوں کے ہسپتال میں رہنا ہو گا۔ میں اندھی ہو گئی، گویا زندگی کی تاریکی میں ادھر ادھر بھٹکا کر دوں گی، کوئی میرا نصیب نہ ہو گا! میں نے اندھوں کے کسی افسانے پڑھے تھے۔ ان کی نمر از زندگی کی بے رنگ یکسانی سے بجز بی واقف تھی۔ اب یہی کیفیت میری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں کتابیں پڑھ سکتی، نہ صبح اور شام کا حسن دیکھ سکتی۔

میرے دل پر چوٹ سی گئی۔ اور میں نے اپنا سر دوسری طرف پھیر لیا۔

"بسی رورہی ہو؟"

"نہیں چچا جان۔ میں نے ضبط کر کے کہا۔"

"پھر ایسی کیوں ہو؟" انہوں نے معتم لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ٹھک گئی ہوں۔"

"بیٹی، افسر وہ نہ ہو۔ انشاء اللہ ڈاکٹر شیڈی کا جواب آئے ہی علاج شروع ہو جائے گا۔ یا تو وہ یہاں آئیں گے یا میں تمہیں وہاں لیجا دوں گا۔"

"اچھا چچا جان۔" میں نے اپنے زخمی جذبات کو چچا سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔

چچا جعفر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور میں گھبر کر روئے گئی۔ میرے لئے اب دنیا میں۔ اس وسیع اور روشن دنیا میں کچھ بگنی نہ رہا تھا۔ تاریکی! صرٹ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی! شاید سامنے کا دریچہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے ٹھنڈی اور نہمت ہیز ہوا کے جھونکے کمرے میں آ رہے تھے۔ رات کی چڑیاں ٹانچے میں بگ دلی سے سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ مگر نہیں۔ نہ زنجب پھولوں کو دیکھ سکتی تھی جن سے مجھے جنت تھی۔ نہ خوش گلو بند دلی کو جن سے مجھے عشق تھا۔ آہ! تاریکی نہ گئی۔

چچا جعفر

معائنہ

ڈاکٹر شیڈی کا جواب آ گیا کہ وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ البتہ ہم کو وہاں آ جانے کے لئے لکھا تھا۔

اسی شام چچا اور میں اور برٹنی بوٹمی نرس کو کو فیروز مراد

ہو گئے۔ جو ہمیں ہم وہاں پہنچے ڈاکٹر شیڈی کے پرائیویٹ سکرٹری نے

ہمیں ایک ٹبے ہل میں بٹھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک نہایت شیریں مردانہ

آواز آئی: "تسلیم سر جعفر!"

دھول ڈاکٹر متاثر ہو گیا۔ اُس نے میری تکلیف کے لئے میری ٹوٹ پھوٹ پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا۔ بولا: بالآخر اُس کو یہ منظور ہے کہ آپ کی بصارت آپ کو واپس نہ لے کر جو بری لیکن اچھے رکھتے ہوئے بھی زندگی کو تازہ کرنا ایک جتنا لینا اور بغیر انھوں کے بھی زندگی کو راز رکھنا انسان کے لئے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

ان فلسفیانہ باتوں پر غور کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ پُرے ہی کے عالم میں روٹی ہے۔ مگر ڈاکٹر، بغیر انھوں کے ساری زندگی کیسے کئے گی؟ میں کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی۔ کوئی خوشگمانہ نہیں سمجھ سکتی۔ اب کیا ہو گا ڈاکٹر؟

ڈاکٹر نے میرے سر پر ہاتھ سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: خاتون خوف نہ کیجئے۔ میں پوری کوشش سے آپ کا علاج کر دوں گا۔ لیکن اگر قدرت کو یہ منظور نہ ہو کہ آپ اپنی زندگی تازہ کیس کا میں تو اس کا انتظام ہوں گی ہوسکتا ہے کہ آپ کی قوت سامعہ کیسے دچھپا کر ہٹا لی جائے۔ آپ جین پیڑوں کو دیکھ دیکھیں گی مگر خوبصورت الفاظ سن سکیں گی۔ جین رنگ گلاب کا دل پھلا میں گئے۔ ڈاکٹر نے اُس سے میرا سر کھینچ کر اپنی پشت والی کشن سے لگا دیا۔ اور مجھ سے کہا کہ اس کی طرف دیکھیں۔ اپنے اسسٹنٹ کا امداد سے جو بہت خاموشی نوجوان معلوم ہوا تھا وہ دیر تک میری آنکھوں کا معائنہ کرتا اور مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھتا رہا۔ آخر کچھ دیر بعد اطمینان بخش پھیرے میں بولا: خاتون زیبا! میرا خیال ہے کہ بایں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ پہلے کچھ دن آپ کا علاج کیا جائے گا اور اس کا اگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا تو آپ رٹن کیا جائیگا۔

میں دونوں کے لئے تیار ہوں ڈاکٹر! میں نے کہا۔

پھر تم کمرے سے باہر چل گئے۔

پہرہ ۵

مریض اور معالج

چٹاکی آواز آئی۔ تسلیو، پر میری بھانجی اور اپنی مرلیفہ میں۔ ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا ہوا کہ ایک معلوم ہوتا تھا۔ میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

چٹا جانے کی تفصیل بیان کر رہے تھے میں چپ چاپ ایک کوپڑ پر بیٹھی باگلوں کی طرح ایک بے بسی کے عالم میں سر اودھر اودھر پھردتی تھی۔ میرے لئے اس سہ نظام میں کسے کی آوازوں اور نئی خوشبودوں کے اوج کچھ نہ تھا۔ اپنی غمزدگی کا درد دل پر لئے اٹھائی ہوئی تھی۔

دفعہ چٹاکی آواز آئی۔ بیٹی زیبا! ڈاکٹر نے یہی تمہاری آنکھوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ انکے ساتھ چل جاؤ۔

میں چپ چاپ ڈاکٹر کی ہوئی۔

”بھارت دیکھ کر میں آپ کو بہادر دیکھ کر چلوں۔“ ڈاکٹر شہزیادی کے لئے کہا۔ وہی آواز غریبوں کی طرف اور سر ملی تھی۔

میں چپ چاپ ڈاکٹر کے ہاتھ سے جھونکے گیا چلی گئی۔ پچھلے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک دروازہ اس سے نکلا اور ہم دونوں اس میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا: خاتون۔ میں آپ کی آنکھوں پر ششاعیں ڈال کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک ہلکی سرخ سیا روشنی محسوس کرتی ہیں یا نہیں؟ یہ کہتے ہوئے وہ میری کرسی کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور جبکہ کمریزا سر کرسی کی پشت پر ٹکرا پڑتا ہی کے بال بٹاتے۔

”میں اپنی آنکھیں بند کر لوں؟“

”جی ہاں۔ اگر آپ کو کوئی روشنی محسوس کریں تو مجھے بتائیے۔“

لیکن ڈاکٹر: ”میں اس قدر میری زبان سے نکلا۔ اگر میں نے

کوئی روشنی محسوس نہ کی۔ تو کیا ہو گا؟ کیا میں جیتے کیلئے اندھی ہے؟

میری آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔

ڈاکٹر شیدی کے زیرِ علاج مجھے دوپٹے لٹا کر گئے چچا جعفر جیسے مصروف آدمی کا اپنے شہر سے باہر رہنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ ان بوری نرس کو میرے پاس چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔

میری آنکھوں کی اب تک وہی کیفیت تھی۔ زندگی ایک کدو بھری تاریکی میں گزر رہی تھی۔ وہی چند لمبے میرے لئے خوشگوار ہوتے تھے جب ڈاکٹر شیدی میرے پاس آتے تھے۔ اور کئی بار ٹھٹھکا کر موضوع پر گفتگو چھیڑ کر مجھے اس میں ایسا سنبھک کر لینے کہ سوائے ایک ہی مضرت کے مجھے اور کئی بات کا احساس نہ رہتا۔

وہ علموائے موضوعوں پر گفتگو کرتے یا ان میں میری کچھ بیدار کرتے جن کے متعلق آنکھیں برکھنے والے بھی پتلی کی آنکھوں سے کام لے سکتے ہیں۔ آغازِ آخر میں۔ قدیم تہذیبیں۔ یونانی فلسفہ۔

نفسیات اور ایسے تو کے دوسرے موضوعوں پر وہ کوئی بات چھیڑ کر میرے تخیل کو الگ راستہ سمجھا دیتے۔ اور میں انکے متعلق اپنی بساط کے مطابق بات میں سے بات پیدا کرتی رہتی۔ اور نہ معلوم فی الواقع ایسا تھا یا محض میری حوصلہ افزائی کی غرض سے ڈاکٹر علموائے میری ذہانت اور اندازِ فکر کی بہت داد دیتے۔

یہ خیال افروز صحبتیں لذت بھی ہوتی تھیں اور طویل بھی۔ شہید میرے علاوہ خود ڈاکٹر بھی ان سے کم لطف اندوز نہ ہوتے تھے۔ شہزادہ ہی دن بعد انہی فرصت کا سارا وقت بلکہ بعض اوقات اپنا کام اپنے مسٹنٹ کے سپرد کر کے میرے پاس آ بیٹھتے۔ اور کوئی محنگو

وہیں سے شہر درخ کر دیتے جہاں بھلی صحبت میں ہم نے اُسے غم کیا تھا۔ خیالی باتیں نہ کرتے تو میرے احساسات کا خیال رکھتے ہوتے ان کی آنکھیں میری آنکھوں کا کام سہرا انجام دیتیں اور وہ آس پار کی ایک ایک چیز جیسے دیکھنے کی میں خواہش کرتی بڑی تفصیل سے مجھ سے بیان کرتے تھے۔ ذرا رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ علاوہ

مجھ سے ہمدردی ہونے کے ڈاکٹر کے دل میں میری قدر بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر کے رخصت ہو جانے کے بعد بعض اوقات مجھے بہت دیر تک اپنی ابا نیائی کا احساس تک نہ ہوتا۔ میرے تخیل کے لئے سوچنے اور غور کرنے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ موجود رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی عملی زندگی کا کوئی واقعہ مجھ میں اپنی ابا نیائی کا احساس تازہ کر دیتا تو اس تمام خود فراموشی کی کسر عمل جاتی کہ پھر مکان کے سوا اور کوئی شے میرے لئے باعثِ تسکین نہ بن سکتی۔

ایک شام میں دیرپے کے پاس کوچ پر بیٹھی تھی۔ سردی پکے کے باہر نکل رکھا تھا۔ درختوں پر ٹیلوں کے نئے سنائی نے سبے تھے کہ بچاک مجھے ایک سٹریٹ ٹان سنائی دی۔ اور پھر ایک خاص بھیجی بھیجی خوشبو آئی۔ معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر شیدی میرے قریب بنی کہیں ہو گئے۔ کیونکہ جب کبھی وہ آتے ہیں خوشبو کر کے ہی پہل جاتی تھی۔

اسی وقت ڈاکٹر کی آواز آئی: ”میں آپ کو درپے میں بچھکر اُدھر آ رہا تھا۔“

”نہیں یہاں چڑیوں کے نئے سن رہی تھی ڈاکٹر کیا ابھی آپ ہی کئی مصرعہ لکھنا لے رہے تھے؟“

”جی ہاں۔ وہ میں ہی تھا۔“

”کتنا پیارا راگ تھا۔“ میری زبان سے نکلا۔ جب بصارت گئی میری قوتِ سامعیت بڑھتی جا رہی ہے ڈاکٹر۔ کیا آفتاب غروب ہو گیا؟

ڈاکٹر میرے قریب آکر کھڑے ہو گئے پھر کہا: ”مجھے ابھی غروب ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کسی طرف کو چاند طلوع ہو رہا ہوگا۔“

”کیسے میں آپ کو باغ میں لے جاؤں۔“

میں فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کا سہارا دیا۔ ڈاکٹر شیدی دوازدہ قدم مضبوط آدمی معلوم ہوتے تھے۔ سنائی آواز بھی بہت دلفریب تھی۔ جس وقت ہم دونوں باغ کے زینے پر اتر گئے اچانک میرا دل دھڑکنے لگا۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت بھی ہوگا!

میرا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ شکل دیکھوں۔

بعد وٹھ باغ کے رینے پر چپ چاپ کھڑے ہے۔

پھر ڈاکٹر شیدی نے کہا: اب چاند طلوع ہو رہا ہے، بیٹے

پڑا کی گئی، روشنی کا نینے لگی، چاند بہت سفید ہے، بہت

زور دے کر ہی بل ہے، میں ان کی آواز تو اب بھی سنتی ہوئی ہوں؟

”ہاں آواز آ رہی ہے، کیا کہنے تھے پودے بھی بھوم ہے

ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں اتنی تیز ہوا نہیں، میں سر بلند درختوں کی پھنیاں

بل رہی ہیں، نیچے، چاند اب کچھ اوپر کو بڑھ گیا۔ بہت کسا یہ درخت

معلوم ہوئے لگا۔“

”کیا بہت کئی گئے ہیں؟“

”ہاں گریوں کا آواز ہے، کچے بہت لگے ہیں، چلیے،

اچھو فوٹے کی طرف لے چلوں؟“

ہم دونوں فوٹے سے بائیں ایک کمرچ پر چلیے، وہ کہنے لگا

”فوٹے پر ایک عورت کی گردن ترش ہوئی ہے عورت کی دونوں

آنکھوں میں سے بائیں غل رہا ہے، گویا آنسو بہ رہے ہیں؟“

میں بول اٹھی: ”آہ کتنا المیہ کا ٹھیل ہے۔ نہ جائے ایسا

بٹ کیوں تراشا لگا؟“

”چاند کی کوئی ننھی ننھی بوندوں بہ گئے تھیں۔ بیٹے ابھی

مہانے سانسے سے ایک جگل خرگوش بھاڑی میں بھاگ گیا۔“

سھر سھر آتے لگی تھی ہوگی؟“

”ہاں تھی، ڈاکٹر آج تو آپ باہل دی خدمت انجام

دے رہے ہیں جو کبھی میری آنکھیں دیا کرتی تھیں، میں سوچ رہی تھیں

اگر میں یہاں سے، یوں کسی کو گھر پر میری آنکھوں کا کام کون دیکھا؟“

ڈاکٹر دلتے چپ رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بغور دیکھ

رہا ہے، میں کچھ شرمائی گئی اور بولی: ”ڈاکٹر؟ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

چپ بیٹا؟“

ن ہلے: ”آپ نے ابھی مجھ سے سوال کیا تھا کہ آپ یہاں

سے ہاؤس گئیں تو گھر پر آپ کی آنکھوں کا کام کون انجام دے گا۔ تو

خاتون آپ کا جو بہترین دوست ہوگا اس کا سب سے بڑا فرض یہی ہوگا کہ

آپ کی آنکھوں کا کام دے؟“

”میں ہاؤس لے چے میں ہوں۔“ ”مگر میں تو کوئی بھی ایسا دوست

نہیں رکھتی ڈاکٹر، بالفرض اگر دیا کوئی عمل بھی لے تو اسے اتنی فرصت

کہاں ہوگی کہ اپنی زندگی کے تمام کام چھوڑ کر مجھے دینا کی باتیں سنایا

کرے۔ ایسی جلدی تو فرشتوں میں ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں آپ کو

فرشتہ سمجھتی ہوں؟“

”کوئی بھی ایسا دوست نہیں؟“ ڈاکٹر نے مکر پر پوچھا۔ اسی

آواز میں سنجیدگی اور درد بھر اچھا تھا۔

”کوئی نہیں ڈاکٹر؟“ میں نے کہا۔

”کیا، کیا۔۔۔۔۔۔ یہ خدمت میں انجام دے سکتا ہوں؟“

”میں حیران ہوئی۔ کیا۔۔۔۔۔۔ کون سی خدمت؟“

”یہی۔۔۔۔۔۔ کہ زندگی بھر آپ کی آنکھوں کا کام میرے

الفاظ دے سکیں؟“

”زندگی بھر؟۔۔۔۔۔۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”یہ کیونکر ممکن ہے؟ زندگی بھر۔۔۔۔۔۔ میں ہانگوں کی طرح

سوال کئے جا رہی تھی۔“

میرا حیرت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر شیدی نے اپنا

ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا اور بھاری آواز میں بولے ”زیبا!

میں زندگی بھر اس خدمت کو انجام دوں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ شدید

بڑی شدید۔“

میں لرز گئی۔۔۔۔۔۔ اصرار محبت کے فقرے سننا اچھا

چاہنے والے کا چہرہ نہ دیکھنا کس قدر عجیب ہوتا ہے، ایسا معلوم

ہوتا تھا جیسے کہیں دوسرے ایک حکمرانی راگ میرے کانوں میں پہنچ

رہا ہے۔ میں از خود رفتہ ہو کر ڈاکٹر پر پڑی میری زبان سے صرف اتنا گل سکا "شیدی!"

شیدی نے مجھے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ لرزتی ہوئی آواز سے میرے کان میں پوچھنے لگے: "زیبا! تمہیں کب مجھ سے محبت ہے؟"

میں بے خودی کے عالم میں بولی: "یقیناً۔ مجھے تمہاری آواز سے عشق ہے۔ میں تمہارے فلسفیانہ اور شاعرانہ فقرات کی شیدا ہوں۔"

————— ❦ —————

رنگین اندھیرا

اس عہد و بیان کے بعد محبت کا ایک نہایت بُر لطف اور رنگین دور شروع ہو گیا۔ میری رگ رگ میں ڈاکٹر شیدی کی محبت ساغر جیسی معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی آواز کے سنتے ہی میری خوابیدہ رُوح جیسے جاگ اُٹھتی۔ اُن کے مضبوط ہاتھ کو چھو کر میں کئی زندگی حاصل کرتی تھی۔

میری زندگی کی پہلی محبت تھی۔ اور یقیناً آخری! اب یہ ہر روز کا معمول ہو گیا تھا کہ اپنے کام سے فلدراع ہو کر شام کے وقت شیدی میری طرف آجاتے اور مجھے باغچے میں چل قدمی کرواتے۔ دِگھنٹوں پتوں کا ہنسا آسمان کا رنگ شفق کی سرخی، پھولوں کی رنگین زندگی کی کہانی مجھے سناتے رہتے۔ میری آنکھیں نہیں تھیں مگر شیدی کے فقرات نے آنکھوں کی کو بہت حد تک بھلا رکھا تھا۔

اس دوران میں چچا جعفر تین دفعہ ایک ایک دن کے لئے آئے اور مجھے دیکھا کہ باپوس سے چلے گئے۔

آخر جب ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک ن شیدی نے کہا: "زیبا! معلوم ہوا کہ تم اپرین کرنا ہی چاہتے تھے۔"

یہ سن کر میں ڈر گئی۔ "شیدی۔ مجھے اپرین کے نام سے ڈرگتا ہو نہیں سکتا ہوں۔ پہلے میں اپنی تابینائی سے سزا تھی مگر اب محبت نے میری روحانی آنکھیں جگمگا دی ہیں۔ مجھے اب اپنی آنکھوں کی پرواہ نہیں رہی۔"

"مگر پراری!" اُنہوں نے پیار کے لہجے میں کہا: "تم مجھے بھی تو نہیں دیکھ سکتیں؟"

میں چل گئی۔ ہاں شیدی! اللہ مجھے تمہارے دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔ تم خود ہی مجھے بتا دو تم کیسے ہو؟ میں تمہاری آواز سن کر اندازہ لگا سکتی ہوں کہ تم کتنے حسین ہو گے۔ اچھا مجھے دیکھئے تو دو۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کا چہرہ ڈھک لیا۔ "تم سید حسین ہو۔ تمہاری آنکھیں لمبی لمبی ہیں۔ تمہاری پیشانی کٹاؤ ہے۔"

"یہ سب کچھ صحیح۔ مگر زیبا! خیال کرو جب ہماری شادی ہوگی..... جب ہمارے تھے تھے بچے ہوں گے۔ اس وقت آنکھوں کی ضرورت کس قدر محسوس ہوگی؟ شیدی کی آواز میں ایک ارتعاش تھا۔

میں شہر کا دوسری طرف دیکھنے لگی۔ پھر شرمیلے انداز میں بولی: "شیدی کیا باتیں کرتے ہو؟"

شیدی مجھے اپنے بازوؤں میں لیکر بولے: "میں غلط نہیں کہتا۔ کچھ عرصے بعد تمہیں اپنی آنکھوں کی ضرورت محسوس ہوگی۔" تو بھر بعد کچھ سڑک پر بلکڑی گئی بولی: "ہاں دیگ، آپ بچہ کہتے ہو؟ اندھی ہو کر مصیبت ہوتی ہے۔ ہے نا؟"

"خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے میری زیبا! اندھی بیوی تو مفید ہوتی ہے مصیبت کیوں ہونے لگی؟ مگر میں نہیں چاہتا کہ تم آنکھوں جیسی نعمت سے زندگی بھر محروم رہو۔ اگر تمہیں اس بات کا خیال ہے کہ میں اندھی بیوی کو مصیبت سمجھتا ہوں اور محض اپنے

فائدے کے لئے تہا رہی انھوں کا آپریشن کرنا چاہتا ہوں تو میں تم کو تہا رہی سوجوہ نامیاتی کی حالت میں شادی کرنے پر تیار ہوں۔ کچھ عرصے بعد تمہیں خود انھوں کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت تمہارے کہنے پر میں آپریشن کروں گا۔ زیبا! اب تمہارا اطمینان ہو گیا؟

میں مسکرائی۔ شیدی، اگر تم زندگی بھر مجھ سے ایسی ہی محبت کرو گے جیسی آج کرتے ہو تو میں اپنی آنکھوں کی کمی کو کبھی محسوس نہ کروں گی۔ میرے پیارے شیدی! تمہیں نہیں معلوم دن رات محبت مجھے فخر سے ملنے رہتا ہے ایک فردوسی زندگی ہے۔ میری آنکھیں آجائیں گی تو تمہارے محبت مجھے الفاظ بھی کم ہو جائیں گے کیونکہ پھر ان کی ضرورت نہ رہے گی۔ نہیں شیدی۔ میں اندیشہ ہی اچھی۔ مجھے تمہاری محبت میسر ہو تو پھر نہ دنیا کی کا کوئی غم نہیں۔

یہ مسکرت شیدی کتاب ہو گئے۔ زیبا، پھر تو میں شادی میں دیر نہیں لگانی چاہیے۔ اس واقعے اعتبار پر ہماری مشترکہ زندگی کا آغاز ہو تو کیا ہو؟۔۔۔ اصل مرحلہ تو سر جعفر کی منظوری کا ہے۔ انہیں اب تک اس کا بھی علم نہیں کہ یہاں ہم میں کس شہادت کی محبت ہوئی ہے؟

میں دیکھ لیتی ہوں۔ مگر میرا خیال ہے چچا کو تم کا اعراض نہ ہو گا۔ کیونکہ۔۔۔ آخر انہیں بھی تو میری نامیاتی کا خیال ہو گا کہ۔۔۔ نامیاتی سے شادی کون کرے گا؟

شیدی ہل اٹھی۔ نہیں نہیں۔ ایسا خیال نہ کرو۔ یہ سُرخ گلاب کی پتی جیسے ہونٹ، اور یہ منہ پرے بال اور یہ معصوم بھولا بھولا چہرہ ہر نوجوان کی ناپیڑن کی چیز نہ کہنا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر کسی کو نامیاتی کا خیال تک نہیں آ سکتا۔



تمکمل آرزو

آخر میرا خیال درست نکلا۔ یعنی جب ڈاکٹر شیدی نے چچا کو

میرے لئے درخواست کی تو انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔ مگر ضرور کہا: ڈاکٹر شیدی!۔۔۔ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں کچھ دلوں کو خوف کیجئے۔ ایک نامیاتی لڑکی سے شادی کرنا غور طلب معاملہ ہے اس پر کافی سوچ لیا ہے؟ میں انہیں چاہتا کہ آئندہ آپ کی ازدواجی زندگی میں اس کی نامیاتی کی وجہ سے دشمنی پیدا نہ ہو۔ ڈاکٹر شیدی کی دل فریب آواز آئی: میں کافی غور کر لیا ہے۔ دراصل نتیجہ یہ ہو چکا ہے کہ مجھے خاتون دیر بہتر ہوئی اس دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آپ اطمینان رکھیے۔ افسانہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہوگی جس سے زیبا کو ان کی نامیاتی باعث کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

پھر تو میں مطمئن ہوں۔ چچا نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد اسی شام ڈاکٹر شیدی بھی جا گئے۔ میرے پاس آئے اور مجھے اپنا لیا۔۔۔ زیبا، زیبا، مجھے تمہارے تمہارے چچا نے اجازت دیدی۔

پندرہ دن بعد اپریل کے آخری ہفتے کی ایک شام ہمارا عقد نہایت خاموشی سے ہو گیا۔ شیدی کہہ رہے تھے اس شام اپنے لیے، امانوں والے عودی لباس میں ناز مورتیا کے پھولوں میں لپٹی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کہ شبنم و عشق کی دیوی۔

ہم نے اپنے "ایام عودی" ایک چمکیے ساحل پر وہ میری زندگی کا انتہائی پر مٹھن اور رنگین زمانہ تھا۔ مجھے کا زیادہ صدمہ نہ رہا تھا مگر میں محسوس کرتی تھی کہ شیدی کی یہ تھی کہ میری بصارت بحال ہو جائے۔ اور ایک چاہنے والا یہ تھا ہونی چاہیے۔

چنانچہ ایک دن جب میں دیرپائی میں کھڑی سمندری ٹھٹھ اندر زچہ رہی تھی وہ آگئے اور کہنے لگے: زیبا! آؤ ہر لے پالیا شہ ہوئے جیسے تم فردوس میں بیٹھے ہو۔

تہاری آنکھیں ہوتیں تو یہ غلط بھی نہ رہتی جو میرے دل میں خار بن کر کھنک رہی ہے۔

میں مسکرا کر بولی: اگر میری ناپائیداری کا صدمہ ہماری سسرت میں خلل انداز ہو رہا ہو تو میں آپریشن کیلئے تیار ہوں شیدی۔

”کیا واقعی؟“

”ہاں شیدی۔ باطل۔“

”تم بڑی عقلمند لڑکی ہو۔ زینبا۔ سوچو تہاری آنکھیں تھپتھپاتی تو ہماری زندگی کس قدر روشن ہوگی۔“ اس کا خیال دوسرے سسرت سے مجھے پاگل بنا دیتا ہے۔ تم مجھے دیکھ سکو گی۔ اپنے شوہر کو۔“

میں بیٹاب ہو کر بولی: اللہ وہ وقت کتنا مبارک ہو گا! تمہیں دیکھنا! اپنے پیارے شیدی کو دیکھنا۔ میری تمام رنج و غصہ میری آنکھوں میں آجائے گی۔ پھر ایک لمحے کے بعد کچھ انس و جن کے لہجے میں بولی: مگر شیدی اب میں تمہارے دل کی آواز سن رہی ہوں۔ آنکھیں آٹھائیں گی تو ہماری محبت بچ چاہے بچ جائیگی۔ شیدی ہمیں بڑے۔ پاگل لڑکی۔ کوئی اتنی سی بات پر ہنسی کر کہو دیتا ہے؟

”کیوں نہیں شیدی؟“ میں کہنے لگی۔ کیوں نہیں؟ مجھے تمہارے محبت بھرے فقرے آنکھوں سے کہیں زیادہ محبوب ہیں۔ میں ان فقروں کو کہہ دوں گی ان سے محروم ہو جاؤ گی۔“

شیدی بولے: تمہیں تو محض میرے فقروں سے محروم ہو جائے گا اندیشہ ہی مگر۔ کیا مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں پیدا ہو سکتا کہ تہاری آنکھیں آتے پر کہیں۔ کہیں میں تہاری محبت دہی سے محروم نہ ہو جاؤں؟

میں کچھ نہ سکی۔ ایں۔! محبت سے محروم؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ شیدی دو لمحے خاموش رہے۔ بجائے کیا کر رہے تھے۔

میں نے پھر پوچھا: شیدی، بولنے کیوں نہیں؟ تم محبت سے محروم کیوں ہونے لگے؟

شیدی کہنے لگے: زینبا! میں صاف صاف بتا دوں؟۔۔۔ دیکھو مجھے معاف کرو۔ میں نے بڑا دھوکا دیا۔ اور شاید اس دھوکے کا انکشاف اب بعد از وقت ہو۔ مگر اب بتاؤ دیتا ہوں کہ میں کوئی جیون آؤں نہیں ہوں۔“

میں کچھ حیران ہوئی۔ مگر جب میں اپنی آنکھوں سے تمہارے چہرے کو ٹوٹتی ہوں تو مجھے جین معلوم ہوتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ آنکھوں کا محسوس کرنا اور بات ہے اور آنکھوں سے دیکھنا علیحدہ بات۔ اب تم مجھ سے محبت کرتی ہو اسلئے ہی میں تمہیں جین معلوم دیتا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد محبت ہو گی۔ میں جین معلوم ہو جاؤ گی۔“

میں کچھ پریشان سی ہو گئی تھی بولی: پیارے شیدی! پھر تو میں اندیشہ کیا تھا۔“

شیدی ہلکی ہنسی ہنسنے لگی جس شخص کی ہنسی اتنی ہوشیار اور موسیقی آمیز ہو وہ بد صورت ہو سکتا ہے؟۔۔۔ کہنے لگے: ”دیکھا! آخر ڈر گئیں نا۔ لیکن نہ۔۔۔ میری بد صورتی تمہیں اندھا نہیں رکھ سکتی۔ ایک وفادار شوہر تناؤ، غصہ، غم نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی بیوی کے لئے ہر قربانی پر تیار ہو جاتا ہے۔ خواہ مجھے دیکھنے کے بعد تم مجھ کو نفرت ہی کر دو۔ مگر میں ضرور تمہاری آنکھوں کا آپریشن کر دوں گا۔ یہ کہتے ہی مجھے صحن باغ میں لے آئے۔“

میں کچھ سوچنے لگی۔ باغچے میں سناٹا تھا۔ درجی گے پاس ایک ننھا سا پرندہ گارہا تھا۔ سمندر کی موجوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

بڑی دیر بعد میں نے سر اٹھایا: شیدی، تم کہاں ہو۔؟ اندر سے پن کے بعد اس سوال کی بجائے عادت ہو گئی تھی پھر بولی: تم بکھن چپ ہو گئے۔ کیا سوچ رہے ہو؟

”پیارے! میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب محبت کے اندر سے دیوتا
کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟“

میں نے ایک گہری سانس لی ”شیدی! تم بڑے بدگمان
آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجھے تمہارے حسن یا بد صورتی سے یقیناً محبت
نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ یقیناً کرو تم سے۔ کاش میں اپنا دل
کھول کر تمہیں بتا سکتی تم میری آنکھوں کا آبرؤ میں کرو اور دیکھ لو۔
میری محبت کا دریا تمہاری صحبت کے مٹلے میں ہمیشہ اندھا
ہی رہے گا۔“

”کیا تم دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہو زیبا؟“
”انہوں نے پوچھا۔“

”ہاں! میں میرے پیارے شیدی! دل کی گہرائیوں سے۔“
”تم مجھے ہمیشہ محبت کرو گی زیبا؟“
”ہمیشہ شیدی!“

یہ سن کر شیدی نے مجھے مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں
جکڑ لیا۔

کشمکش

اس گفتگو کے دو سر پہنچے میرے آپریشن کی تیاریاں
ہوتے گئیں۔
چچا جعفر اور ڈاکٹر شیدی مجھے تسلی دلا رہے دیتے
رہتے تھے۔

آخر وہ پہنچا تک دن اٹھا اور میرا آپریشن ہوا۔ وہ وقت
مجھے گزر گیا۔ اب میری آنکھوں پر پٹی لپی ہوئی ہیں۔ کمرہ
اندھیرا رکھا جاتا تھا۔ نوپس دن میری پٹیاں کھلنے والی تھیں۔
مگر اگر میری قسمت میں ہوا تو نو دن کے بعد میں اپنے محبوب شوہر
کا چہرہ دیکھ سکتی۔ نہ پوچھتے وہ یا ہم کس میسراری اور تفریق

میں کھڑے۔

جس صبح میری پٹیاں کھلنے والی تھیں، اس کی رات شیدا
کمرے میں کچھ گھبراتے گھبراتے سوتے۔ زہرا آج کی شام
کرتی چاہتے کیا پتہ؟ شام ہماری صحبت کی آخری شام ہو۔ اور
بعد کیا پتہ ہماری تقدیر بدل جائے؟
مجھے صدمہ ہوا ”شیدی! تم ایسی باتیں کرو مجھے تو میرا
ابھی کھل کر پھینک دینا!“

شیدی بولے ”تو پھر شیدا آج ہی شام سے زندگی
بدل جائے۔“

میں چکر بولی ”اگر میری آنکھوں کی روشنی سے
زندگی تاریک ہو جائے گا اندیشہ ہے تو میں کبھی نہ چاہوں گی
”آنکھیں آجائیں۔“

”اچھا زیبا! کل تمہاری محبت، اور میری کم روٹی
میں بولی: بیشک ہو گا۔ شیدی! عورت اپنے شوہر کا
چاہتی ہے خصوصاً ایسی زندگی، جس نے اپنی زندگی میں شو
کبھی کی مرد سے محبت نہ کی ہو۔ کیا تم کو علم نہیں میں نے
کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔“

شیدی بغور میرے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے
خاموش تھے بجز تھوڑی دیر بعد جھک کر میرے رخسارہ
اور بولے ”اچھا زیبا! خدا حافظ۔“ دیکھا جائے گا کہ جب
اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہو؟
میں مسک کر بولی ”دیکھ لیسا۔“

پہنچہ ۹

حسن یا محبت؟

دوستہ دن کی صبح کو میں کبھی نہیں بھول سکتی
خواہ خواہ میرے دل میں دوسرا سا پیرا کر دیا تھا۔ او

بصارت بجال ہوتی ہے یا نہیں۔ جو بھی جاتی تو پھر طرح طرح کے اندیشے تھے۔ میں خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ معبود! مجھے اس امتحان میں کامیاب کر۔ کبھی اپنے دل سے آپس کرتے تھی کہ کیا واقعی جس شخص کی میں شہدائی ہوں جسے میں دنیا کا بہترین مرد سمجھتی ہوں وہ کم رو اور کمر بہ منظر آدمی ہے؟ — کیا اسے دیکھ کر میری محبت لرز جائے گی؟ — میں یہ دعا نہیں کرتی کہ وہ بد صورت نہ ہو بلکہ یہ دعا کرتی ہوں کہ اُسے دیکھ کر میری محبت سہم نہ جائے۔ مجھے شہدائی سے محبت ہے۔ محبت ہے۔ میرے قدم اس راہ میں کبھی نہ ہٹیں گے۔ مگر پھر آپ سے آپ دل سرگوشی میں کہنے لگتا ہاں! لڑکی۔ محبت کا تعلق تو دل سے پہلے آنکھ سے ہے۔ محبت دیکھ کر ہوتی ہے۔

غرض میری رات شدید ترین اضطراب میں کئی صبح ہوئی تو دل مائے اندیشوں کے بیٹھا جا رہا تھا۔ جب شہدائی میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں ہانپ رہی تھی۔ بے بس ہو کر ان کو پلٹ گئی۔

”جیسا! میری زینا! کیسی سو رہی ہو؟“
”میں اچھی ہوں۔ مگر ایک سسکار رہی تھی۔“

”کیوں؟ میری قسمت پر سو رہی ہو؟“ انہوں نے جھاری آواز سے پوچھا۔

میں ضبط کر کے بولی۔ میں سوچ رہی ہوں تھی مدت بعد میں دنیا کو کیسے دیکھوں گی! اس خیال سے خوف معلوم ہوتا ہوا۔ میں نے شہدائی کا گرم سانس اپنے زخا پر محسوس کیا پھر بولی۔ شہدائی جب میں تم پر پہلی بجاہ داروں کی تو میرے دل کی کیا حالت ہو گی! — اُف میرے اللہ! —

شہدائی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”جیسا، یہ تمہاری آنکھوں کی ٹپٹیاں میں نہیں کھولنا چاہئے ورنہ لگتا ہے۔ میرا سسٹنٹ ہے محبت انجام لے گا۔“

”جیسا تمہاری مرضی شہدائی۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ تم کھولو گے۔ اور دنیا میں سب سے پہلے مجھے تمہاری حسین صورت نظر آئے گی۔“

”اگر وہ حسین ہوتی تو ایسا ہی ہوتا زینا!“
آخر وہ وقت آگیا کہ میری ٹپٹیاں کھولی جاسے۔ لگیں۔ میں چپ چاپ لیٹی تھی۔ میرے اطراف دو تین ڈاکٹر دل کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی معلوم ہوتا تھا کہ شہدائی بھی اس کمرے میں موجود ہیں۔

آخر چپ کھل گئی۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھنے کو کہا۔
”اُف وہ لمحہ! ہٹکوں کو ہٹکوں سے جدا کرنا۔ روشنی کیلئے! یا ابدی تاریکی کے لئے۔“ اسے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے ہلک ٹھٹھائی۔

میں لرز گئی۔ اور ایک چچ سی میرے منہ سے نکل گئی۔ روشنی کی پہلی کرن میں نے محسوس کی۔ اس دھندلی روشنی میں سے کمرے کے رنگ ابھرتے اور واضح ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں ایک سبز دیوچوں والے حسین کمرے میں کوپ پر پڑی تھی۔ کھڑکی میں سے آسمان نظارہ افروز تھا۔ دھندلی نیلا۔ روشن حلم سے مسکراتا ہوا آسمان۔ ”شہدائی! شہدائی!“ میرے منہ سے نکلا۔ شہدائی نے مجھے میری آنکھیں داپس دیدیں۔ یہ آنکھیں کے پیاسے ہاتھوں کا قرشر ہے میرے دل میں محبت کا ایک پتھر اُبلنے لگا۔ اس شخص کو دیکھنے کے اشتیاق نے مجھے ہانگ بنا رکھا تھا جس سے مجھے محبت تھی اور جس نے مجھے آنکھیں کھلی تھیں۔

دفترا پرے کے پاس مجھے کچھ آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور جب کہہ شہدائی! — مردانہ حسن و جاہت کا ایک نفیس نمونہ پردے کے پاس کھڑا تھا۔ لمبی لٹلی آنکھیں۔ سنہرے بال۔ حسین رنگ۔ نہایت منحنیہ چہرہ۔ میں بخود ہو کر اس کی طرف

گئی۔ وافر شوق سے میری زبان سے مثل ایتنا غلام میرے شیدی :-
نوجوان نے سر جھکا کر مجھے سلام کیا۔ بھاری آواز میں بولا۔
”ڈاکٹر شیدی بھر میں مغز خاتون میں اٹکا اسٹنٹ ہوں :-
”او۔۔۔۔۔ میں نے بایں لیے میں کہا مجھے غلطی ہوئی کیا
آپ براہ کرم انہیں بلا دیں گے :-

اسٹنٹ بولا۔ پانچ منٹ میں خودی آجائیں گے۔
وہ اپنے اس وقت کے اضطراب کو مریض میں مٹانے کی کوشش
کر رہے ہیں :-

میں اپنا اشتیاق چھپا رہی :- اسٹنٹ تم کو معلوم ہے کہ
نیم مدت سے اندھی میں نے اپنے شوہر کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا آپ
مجھے بتائیے کہ وہ کسے ہیں :-

وہ مسکرایا وہ۔۔۔۔۔ مثل پیپا پر ڈاکٹر شیدی کی تصویر
دیکھی ہے اور کہتے :-

میں مثل ہیں کے پاس گئی اور تصویر اٹھائی :- یہ شیدی کی
— میرے دینی زندگی کی تصویر ہے؟ میرے اللہ :- میرے منہ
سے ایک آواز گئی :- یہ ایک پالیس سالہ مرد کی تصویر تھی۔ پیشانی
فرائض مگر نقش نہایت بھروسے چہرے پر کچھ کی برس رہی تھی ہار
نام تصویر پر کچھ ایسی بے رونق اور بد صورتی چھائی ہوئی تھی کہ
میرے ہاؤس تلے کی زمین گل گئی۔ سامنے فدا دم آجینے میں اپنا
کا ہیروہ جسم دیکھ کر میں لرز گئی۔ مجھ کی نازنین عورت یہ کس مرد
کی محبت میں گرفتار رہ گئی :-

اسٹنٹ مجھے بغور دیکھ رہا تھا بولا۔ بھولی خاتون! کس
سہج میں کھڑی ہو؟ آپ کی کچھ دنوں کی ہائینائی نے آپ کی زندگی
سے بڑی بدسلوکی کی۔ جب ڈاکٹر شیدی سے آپ کی شادی ہوئے
تو کئی بلدیہ راجی چا جا کہ کسی غصہ طعن پر آپ کو ان کی بد صورتی
کے راز سے آگاہ کر دوں۔ مگر آپ جانتے ڈاکٹر شیدی کا بھلا
ایسا موقع مجھے کب جیتے لگے تھے۔۔۔۔۔ آخر انہوں نے

دی کیا جس کا مجھے اندیشہ تھا ان کی عمر چالیس سال کی ہو گئی تھی
تجربہ کی زندگی کی تمام ذمہ داری انکی شکل پر عائد ہوتی ہو۔ اس
علاقے کی تقریباً تمام لڑکیوں نے انہیں بائیکاٹ کر رکھا ہے آخر
انکی بے بسی آپ کو یہاں پہنچا لائی :-

میں ششہ کھڑی تھی۔ اور ٹھکی ہانڈھ کر اس حسن کے
دلوں کو دیکھ رہی تھی جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ باطل انسانوں
کے بہرہ و کاس حسن و جمال دکھنا تھا کچھ ویرانہ میری نظر اپنے شوہر
کی تصویر پر گر گئی۔

”مگر مجھے ڈاکٹر شیدی سے محبت تھی۔۔۔۔۔ محبت ہے
میں نے بھولی سے کہا۔

”آپ کی محبت نامانی کی مرہون محنت ہے۔ اب آپ اپنی
آنکھوں سے مشورہ لیجئے۔ یہ تو یہ ہے خاتون رہیا۔ آپ سی نازنین
لڑکی کو ڈاکٹر صاحب جیسے کہ وہ انسان کے ساتھ دیکھ کر میرے
دل پر چھریاں چلے چکی ہیں :-

”آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں اسٹنٹ۔۔۔۔۔ محبت
کا دار و مدار حسن پر نہیں ہوتا :-

نوجوان اسٹنٹ لطف پر آواز میں ہنس پڑا۔ ایمان سے
کہتے آپ کو اپنے شوہر کی تصویر کو دیکھ کر باؤسی نہیں ہوئی :-

میں بولی :- اس کے لئے میں پہلے سے تیار تھی۔ شیدی نے
مجھے خود بتا دیا تھا کہ وہ حسین نہیں ہیں مگر۔۔۔۔۔ میں کبھی تھی۔۔۔۔۔
سے انکی شکل ایسی توتہ چلی :-

”اگر آپ کوٹ پر ہوتو کھڑکی کو جھانک کر دیکھ لیجئے۔ وہ
برآمدے میں ایک مریض کو کچھ دوا میں لے رہے ہیں :-

میں دھڑکتے ہوئے دل سے کھڑکی کی طرف گئی، اور
جھانک کر دیکھا۔ وہ میرا دل بیٹہ لگا۔ وہ تصویر سے زیادہ بد صورت
تھے کیا ہماری شخص کی پرستش کرتی ہوں؟ کوئی عورت اس سے
محبت کر سکتی ہے :-

میں سر کپڑا کر ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔

خوبصورت اسٹنٹ باہر چلا گیا۔

نوجوان اسٹنٹ سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے ایک گھر سے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ گہرے سبز رنگ کی بھائی زیب گلوتھی۔ وہ ایک افسانوی انداز میں مجھ پر ٹھک کر بلائے خاتون زیب! آپ بڑی جلد باز لڑکی ہیں۔ مجھ آپ سے زیادہ تعجب مجھے آپ کے چہرے پر ہوتا ہو انہوں نے آپ کو اس تاریک غار میں کیوں پھینک دیا؟ کیا ڈاکٹر کی دولت اور ثروت نے انہیں اندھا کر دیا تھا؟

میں جلدی سے بولی۔ "نہیں ہیں۔ سر جعفر کو دولت و حشمت کی مطلق پرواہ نہیں۔ انہوں نے یہی سوچا ہو گا۔"

اندھی لڑکی۔ "یہ ظلم ہے صریح ظلم۔ اسٹنٹ نے کہا: آپ کی حسین لڑکی اگر اندھی بھی تھی تو کسی کو کیا پرواہ ہو سکتی تھی؟ مثال کے طور پر میں خود اپنے آپ کو نہیں کر سکتا تھا۔ اگر آپ ہی اندھی بوی مجھے مل جاتی۔ تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب۔"

میں نے روکا۔ "ہاں۔ اسٹنٹ دیکھا کہ آپ؟ میں تہا ہے چیت کی بوی ہوں۔ تم بہت نامعقول شخص بن گئے۔"

"معاف کرنا خاتون زیب! مجھے سے نفرت ہوئی۔"

میں نے روکھا۔ "کہا: اچھا تو اب آپ براہ کرم ڈاکٹر شیدی کو بلائیں، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا۔" یہ کہہ کر اسٹنٹ باہر چلا گیا۔

جب مجھ کے اندھے دیوتا ملی انھیں پیدا

ہوتی ہیں

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر شیدی اپنے گرفت وضع کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں آئے اور

"زیبا! انہوں نے کہا۔ اُنکی آواز میں لڑش تھی۔

"شیدی! میری زبان سے نکلا۔ اور ساتھ ہی جوم جذبات دو موٹے موٹے انسویں سے زخار بر دھل آئے۔

"زیبا! انھیں مبارک! پچ تم دیکھ سکتی ہو؟ اس روتی ہو؟ کیوں کیا میری تقدیر پر؟ انہوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا۔ اُنکی آواز ایک انوکھے طور پر دردناک معلوم ہو رہی تھی۔

میرے حواس جیسے سُت ہو گئے تھے۔ "نہیں شیدی نہیں!" یہ کہہ کر چائے کیوں میں سکپاں لینے لگی۔

وہ کسی قدر قریب آئے۔ "زیبا۔ جب محبت کے اندھے دیوتا ملی انھیں پیدا ہوتی ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔۔۔ سکپاں۔ اپنے کتے پر بچتا۔۔۔ انسو۔"

میں مضطرب کر کے بولی۔ "نہیں شیدی۔ میں اپنے قول پر قائم ہوں میں اب بھی۔ تم کو کچھ۔۔۔ تی ہوں۔"

"ہاں۔ چاہتی تو ہو۔ مگر کیا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہو کہ نہایتی کے ایم میں جس داری سے مجھے چاہا کرتی تھیں وہی داری اب تک موجود ہے؟"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "شیدی۔ مجھے آنکھیں نہیں چاہئیں۔ مجھے تمہاری محبت چاہیے۔ میری آنکھوں میں کوئی تیزاب ڈال دو۔ تاکہ پھر میں اپنے خوابوں کے جزیرے میں تمہاری ہی محبت کا گیت گاسکوں۔ میرے شیدی! آنکھیں بڑی فساد ہی ہوتی ہیں۔ یہ مجھے نہیں چاہئیں۔ مجھے محبت کی اندھی آنکھیں چاہئیں۔ یہ کہتے ہوئے میں رونے لگی۔

"زیبا! میں تمہاری زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا ایک مدت

تک میری ویران زندگی تمہاری اور تجھ کے عالم میں بسر ہوتی رہی۔ پھر تم آئیں اور میں نے تمہیں دھوکا دیکر تمہیں اپنے محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ اب جبکہ تمہاری بے صارت کمال ہوئی ہے میرے دھوکے

کے لئے روپوش چاؤں ہی میری سزا ہے

”شیدی، ایسی باتیں نہ کرو“

”کیوں ایسی باتیں نہ کروں زریبا؟ آخر مجھے اپنا کم روٹی کا احساس ہے۔ اپنے جرم کا احساس ہے۔ تمہارے حسن کا احساس ہے۔ ہر روز تم میری محبت کا مقابلہ دوسروں سے کر دو گی۔ میرے حسین اسٹنٹ ہی سے کرو گی۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تم مجھے اور اسے یکجا دیکھو گی تو تمہارے دل پر کیا گزری گی؟“

میں بیقرار ہو گئی۔ ”شیدی، تم بے حد بدگمان ہو؟ اسی وقت میری نگاہ اتفاق سے الماری پر جا پڑی۔ اس میں ایک شیش نظرائی جس پر کسی تیزاب کا نام علی لفظوں میں لکھا تھا۔ میں نے الماری کی طرف اٹکی سے اشارہ کر کے کہا: ”وہ الماری میں کیا چیز رکھی ہے؟ کوئی تیزاب ہے؟ میں اسے اپنی آنکھوں میں ڈال لوں گی۔ اور ہمیشہ کے لئے اندھی ہو جاؤں گی۔ پھر تو ہماری زندگی مزے سے کئے گی نا۔؟“

یہ کہہ کر میں الماری کی طرف بڑھی۔

شیدی جلدی سے بولے ”شہر وہیں پھر اندھا بننے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی کردہ شکل ہمیشہ کے لئے چھپا لوں گا۔ اپنی آنکھیں ضائع نہ کرو۔ جب حسن دیکھنے کو مل جاتے تو آدمی کو اندھا نہیں ہونا چاہیے۔“ پھر وہ دیکھنے کی طرف گئے اور ہلکی آواز میں کہا: ”اسٹنٹ!“

اُسی وقت اسٹنٹ اندر داخل ہوا۔ وہی حسین چہرہ، وہی میٹھی مسکراہٹ۔ وہی دل میں گھر کرنے والی لٹیلی آنکھیں۔ میں نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔

شیدی نے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا: ”زریبا! نصاف پسند ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں میں تم حسین لڑکی کے ناقابل ہوں۔ شاید آنکھیں مل جانے کے بعد یہ نوجوان تمہارا زیادہ موزوں رفیق ثابت ہو سکے۔“

کھلم کھلا ٹوٹ بچکا ہے۔

”مگر شیدی، میں ہریشان لہجے میں بولی: ”تم نے میری کھوکھو آپریشن کیا ہی کیوں؟ میں خوش تھی۔ میں اندھی تھی اور محبت کی پرستار تھی۔“

”وہ میرا انسانی فرض تھا زریبا“

”آہ تم بہت نیک ہو شیدی“

”تم نے اپنی آنکھیں بند کیوں کر رکھی ہیں؟“ شیدی نے پوچھا اچھی آواز میں ایک درد تھا۔

”مجھے اسکی عادت ہو گئی ہے شیدی۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں تو میں خواب اور افسانے کی سرزمین پر ہوتی ہوں۔“

”اور جب وہ کھل جاتی ہیں تو ایک دیوتا آدمی تمہارے دلاور و تخیلات کی عمارت کو مسمار کر دیتا ہے۔ یہی بات جانتا؟“ انہوں نے نہایت افسردگی سے پوچھا۔

”نہیں شیدی، ہرگز نہیں۔ مجھے آنکھیں بند رکھنے میں محض اس لئے مزہ آتا ہے کہ مجھے اپنے عشق کے ابتدائی دن یاد آجائے ہیں۔ جب میں اندھی تھی اور تم نے پہلے پہل اظہارِ ارادہ کیا تھا۔“ شیدی نے ”میرا بازو چھوا اور کر کے دوسری طرف لے گئے۔ پھر ایک جگہ لے کھڑا کر کے کہا: ”زریبا۔ اب آنکھیں کھولو۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے قد آدم آئے۔ میں ہم دونوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔ میں بہوت ہو کر اپنے حسین اور کلاہیدہ اور اپنے شوہر کے بعد سے اور کمر بہ منظر کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ میرا دل خون ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنا منہ نہ لہجہ لوں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور باوجود انتہائی کوشش ضبط کے میرے آنسو نکل آئے۔

شیدی نہایت دل شکستہ نظر آئے تھے: ”زریبا! اب تم نے دیکھ لیا؟ میں تمہارے قابل نہیں۔ اگر دنیا میں نصاف کوئی چیز ہے تو مجھے چاہیے کہ تم سے معافی چاہوں اور ہمیشہ

میں حیران ہو کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ مایوسی اور صدمہ سے من بھرا ہوا چہرہ تھا۔

میں نے نرم اور سبے سب کے لیے میں کہا: "شیدی تم کو کچھ کہہ رہے ہوئے نہیں سمجھتے۔ تمہارا دل مارا بیکار ہو گیا ہے۔"

شیدی نے سنجیدگی سے کہا: "زیبا میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ خدا حافظ زیبا۔ مجھے معاف کر دو۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک آخری نظر مجھ پر ڈالی اور باہر چلے گئے۔

میں بچ بڑھی۔ اسسٹنٹ، اسسٹنٹ، انہیں بلاؤ۔ دیکھو۔ یہ تیزاب کی ٹیشی۔ میں یہ تیزاب اپنی آنکھوں میں ڈال رہی ہوں۔ میں اندھی ہو رہی ہوں۔ اپنے شوہر کی خاطر۔"

یہ کہہ کر میں نے شیشی کا کارک کھول لیا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ شیشی میرے ہاتھ سے دوڑ جاگئی اور اسسٹنٹ نے قریب آکر کہا: "دیوانی ہو گئی ہو؟ یا مگر وہ شکل اب تمہاری زندگی سے باہر ہے نفعت میں اپنی آنکھیں کھول گھوٹی ہو؟" شدت مسرت سے اس کی آواز عجیب ہو رہی تھی۔

"کیونکہ۔۔۔ کیونکہ اسسٹنٹ مجھے محبت چاہیے صحت محبت۔ ڈاکٹر شیدی حسین نہ سہی۔ مگر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دلی محبت۔ ایسی محبت۔ جس نے میری اندھی دنیا کو روشن کر دیا تھا۔ میرا اس محبت کو کھو نہیں سکتی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔"

"زیبا!"

میری رُوح کانپ گئی۔ میں۔ یہ کس کی آواز ہے!۔ ڈاکٹر شیدی!!

میں نے آنکھیں کھولیں۔ اسسٹنٹ! کیا ابھی ڈاکٹر شیدی نے مجھے بلایا تھا؟ میں بچ بڑھی ہوں مجھے ان ہی سے محبت کرو۔ انہیں بلاؤ۔ انہیں بلاؤ۔ اپنی شیشی آنکھوں سے مجھے نہ دیکھو۔ میری محبت حُسن کی محبت تھی۔ میری محبت اُن کی محبت ابھی اتنا محبت کو بچا رہی ہے۔

"میری طرف دیکھو زیبا! کیا میری آنکھیں تمہیں محبت کا سبق نہیں پڑھا سکتیں؟ مجھے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھو۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو۔ شاید اس طرح تم اس میں میری سمجھا محبت کو پاسکو اپنی آنکھیں بند کر لو اور میرے چہرے کو ٹٹولو۔"

میں اس نوحان کو تک رہی تھی کہ اچانک ایک نئے کانپے ہوئے احساس سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور نہ معلوم فطرت کے کس اصرار پر جوش اضطراب کے کس تقاضے پر میں نے آپ سے آپ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور تاریکی کی قدیم فاقہ میں ایک بار پھر میری ذی جس آنکھوں کے سہارے ایک بیقراری سے اُسے چہرے کے نقشہ محو ٹٹولنے لگے۔

میرے منہ سے اچانک ایک جھج جھج گئی۔ اور میں نے ایک اضطراب کے عالم میں اپنی کتاب آنکھیں کھول دیں۔ اور حیران ہو کر اس حُسن کے مجھے کو دیکھنے لگی۔ میں! شیدی! میرے شیدی!!

وہ خاموش کھڑا کھڑا تھا!۔

حجاب امتیاز علی

دو شاعرانہ نشر کی کتابیں

نغمات موت۔ حجاب امتیاز علی کے غزلک مضامین کا مجموعہ۔ ہر مضمون یک ہی متاثر کرتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی کی تصویر انہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی کے قصص مضامین کا مجموعہ۔ ہر مضمون نشر کی شکل میں ہے۔ ادب لطیف بہترین نمونے۔۔۔۔۔ قیمت ۸۰ روپے۔

اَلطُّبُط

رہا بچلا ہو گیا، جالے اُچی بلان، تو محکم سم ہیں، مُنہ سے بولیں نہ سرے کیلیں۔

میاں عاجز، ساں کا ناگ میں دم، خسر بریٹان،
لگے جالے دلیاں حیران، کون کون سے ڈھنگ نہ ہرتے، کیا
کچھ نہ کیا، حیدہ بانو تھیں کہ آج بولیں یہ کل بولیں۔

آہ! جو پہوار مانوں سے لائی گئی تھی کہ گھر کی رونق
بڑھائے گی، اُس نے جتنی سادہ کر سب کا ناطقہ بند کر دیا۔

جَوّا بختا دو بیگ ہو گا دو کھڑے بیٹھیں، کوئی کہتا تھا،
ماتے شرم کے زبان میں کھلتی، کسی نے آسیب کا غلّ بتایا،
مٹیا پھوس عقیدے کی بڑی بوڑھیاں جادو ٹوٹے کا اثر بھیر۔
اکثر رشتہ داروں کا خیال تھا، کسی نے کچھ کھلا پلا کر کھلا مار دیا
ہے۔ ۱

غرض عجیب قیاس آرائیاں ہوئیں، طرح طرح کے
مشورے کئے گئے، مگر ہوا ہوا خاک نہیں۔

دیک روز بختا دو بیگ کے بیٹے خورشید علی صاحب جو اپنی
بچپنی سے ملے تھے، اور بھائی جان کا حال پوچھا، تو معلوم ہوا،
دیے تو ٹھیک ہیں، مگر کوئی نہیں۔

”اچھا ابوتی نہیں، تو کوئی ہوئی میں جانوں، خورشید
علی صاحب نے کہا۔

بختا دو بیگم بہ بیٹا، کوئی ہوتی تو صبر آجاتا، سستی ہوں کیلے میں سرے
بھائی سے کچھ بات چیت کر لیتی ہے۔
خورشید علی! بس، اور کسی سے نہیں بولیں!۔

شادی کے دوران میں، ہنسلی سیلیوں نے حیدہ بانو کے
دس پونہ پٹی تھی، کہ سسرال میں وقت چاہے تو خبردار کسی کو بولیو
نہیں، زبان نسا کی جڑ ہے، دُنیا بھان کے نفعے میں بھڑکی زبان
کے ہی سبب اٹھتے ہیں۔

اس انجھرنے حیدہ بانو پر جا دو کر دیا۔ سسرال جا کر وہ چپ
سادھی، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا مینوں خاص گھر دلے سے پھوٹے
مُنہ بات کہنے کی روادار نہ ہوئی۔

کچھ دن تو یہ اداس کوپ بندائی، تلے ٹلے کی پُوریشیل
میں چر چار با، کہ واہ وا خال بختا دو کو مری ہوئی ایسی سب کسی کو
نفسیب ہو، بڑی شرمیلی ہے، کوئی کچھ کہا کہے، کیا حال جو اُلٹ
کر جواب ملے۔

لیکن ہرات کی حد ہوتی ہے، آخر کرب تک، زبان ہی سے
تو دوسرے جانوروں پر انسان کو نفیست حاصل ہے، جب کوئی
ہر وقت مُنہ میں گوشت کی گھٹائیاں بھرے رہے، تو کیوں نہ اس
پاس دلوں کا دم لگے۔

حاصل کلام یہ کہ جس خصلت نے لوگوں کو حیدہ بانو کا
گمردہ کر رکھا تھا، وہ بال جان ہو گئی، اور دلوں کا قتل خاموشی توڑ
کی کویشیں جوڑنے لگیں۔ بھڑکی، دھمکی، ٹھٹھکی، برہمی، خوشامد،
پیرزنی، پھر چار با، کو سادہ قید تھا کہ، کھار کھا گیا، مگر اُچی جُواری
کھلی تھی نہ قفل۔

دیے کہنے کو حیدہ بانو گھر کا کام کاج بھی کرتی تھیں،
لیکن کس طرح، کوئی اکثر سامنے رکھ دیا، گھر گھٹ کاٹے کاٹے
آٹا گوند سے تھیں، نمک مرچ ہلدی دھنیا کی رکابی دی سل پر
مسالا ٹھٹھا تھیں، کسی جید کی کمی تھی سے انہیں بحث نہیں، دُور دراز

نہ سکے۔

خورشید علی۔ ہو کیوں نہ سکے، پھوپھی! ناں ہو سکے اور بڑی آسانی سے۔

بختا وریگم (خوش ہو کر، پھر دلہن ہونے لگے گی)۔

خورشید علی۔ اچی صاحب بولنا بھی کیسا خوب چلیں ملن پھاڑ پھاڑ کر ایک دفعہ کو محلہ سر پر اٹھائیں۔

بختا وریگم۔ اچھا... تو وہ ایسی کیا ترکیب ہے؟

خورشید علی۔ ترکیب کیا معمولی سی بات ہے، پھوپھی! ناں! موقعہ دیکھ کر کوئی جھوٹا الزام لگائیں، جب وہ اسے کاشیں تو آپ ہرگز نہ مانیں، برابر الزام پر الزام لگاتے جائیں۔ بھابی جان کتنی ہی تشنایا آپ ایک نہ سنیں، اپنی ہی کھے جائیں!

یہ نسخہ فی الحال صرف تین روز کے لئے ہے، چوتھے دن حاضر ہوگا، ضرورت ہوتی تو دوسرا طریقہ بدل دیا جائیگا....

چند روز بعد

خورشید علی صاحب نے بختا وریگم کو الزامات کی دو تین صورتیں بتائیں، چند فقرے اور خاص خاص الفاظ ذہن نشین کر لئے، پھر طریقہ استعمال سمجھا کر رخصت ہو گئے۔

ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، کوٹھے کے کوار پھیڑے جا چکے، دھڑ دھڑاہٹ ہوئی بختا وریگم سمجھ گئی کہ اں اب دلہن بی ادھر لے دالی ہیں۔

فوراً چھاڑو استعمال نہیئے پھر چھل اور چپکے سے کواروں کی اوٹ (اڈر) میں جا کھڑی ہوئیں، جون ہی حمیدہ بالونے لگنے لگی کھلی اور نیچے میں قدم رکھا، ساس صاحبہ چھاڑو تان کر چلیں۔

"کیوں ری چڑیل یہ کیا ہو رہا تھا۔ ہاں وہی تو میں کہل ہر وقت کوٹھے پر کیوں رہتی ہے، تو ظاہر آج معلوم ہوا کہ نے نے ذرا سہے خصم کو، لڑکیاں ہی نہ بچاتی ہیں تو نام نہیں؟"

لو کھلا حمیدہ بچاڑی نے کاسے کو کسی کی کڑی بات سنی

بختا وریگم۔ اے بیٹا! آدمی بات نہیں کرتی، تیرا بھائی جو مانہ ہو، سارا سارا دن اوپر کوٹھے پر کمرہ بند کئے پڑی رہتی ہے، کبھی اس طرف آتی بھی تو کیا سوا ہاتھ کا گھونگھٹ کاڑے، بالکل چپ چاپ... کتنے ہی تعویذ گنڈے بھی کئے....

خورشید علی۔ بھلا تعویذ گنڈے ایسے کاموں میں چلتے ہوئے، پھوپھی! اہاں۔

بختا وریگم۔ میں تو تیرے بھائی کی شادی کر کے بھیتائی، دن اور تیرے پھوپھا پھوپھی چلے جاتے ہیں، دلہن زینے کی کنڈی لگائے گئے، کچھ کمرے میں پڑی رہتی ہو، بیٹا! اب کیا کریں، دو سال ہوئے کوٹھے کی بجھے ہی کچھ معلوم ہو تو بتا، بڑی پریشانی ہو رہی ہو۔

خورشید علی۔ پریشانی کی کیا بات، پھوپھی! اہاں! وہ تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بختا وریگم۔ (خوش ہو کر) تیرے منہ میں مٹی شکر، بیٹا! بٹے ٹوٹ کا کام ہے، ہاں تو علاج میں خرچ کیا ہوگا۔

خورشید علی۔ خرچ درج کا ہے کا، نیچے پیسے ٹکے دوست نہ گنیں تو بات ہی کیا رہی۔

بختا وریگم۔ سچ کہتو! اے میں تو طاقوں سیانوں میں بڑا پیسہ لگا چکی ہوں، پھر دیکھو تو فائدہ رتی بھر نہ ہوا۔

خورشید علی۔ جی رتی بھر، عدلے چاہا سولہ لکے ٹھیک ہو جائے، ہٹ پٹ باتیں کریں، ایک ہی دن میں دو سال کی کسٹریٹ جاتے۔

بختا وریگم۔ (دلائل لیکر) صدے گئی بیٹا! تو پھر جلدی کر علاج کر، میرا لالہ!!

خورشید علی۔ خیر علاج کرنا تو آپ ہی کو پڑیگا، میں صرف ترکیب بتا سکتا ہوں، نہایت اعلیٰ درجے کی۔

بختا وریگم۔ تو بیٹا ترکیب ہی بتائے! خورشید علی۔ سبک آپ کر رہی، جیسا کہوں؟

بختا وریگم۔ ضرور کروں گی، پر بیٹا! اسی نہ بتائیو کہ مجھ سے ہو

بختاوردیگم۔ میراجی چاہتا تھا ابھی اسکو یہاں بلاتی، لیکن کیا کردوں، اس وقت تک پہلی عادت کا اثر باقی ہے، شاید نہ بولے۔ خورشید علی۔ تو خیر ابھی جلدی بھی کیا ہے۔

بختاوردیگم۔ مگر نہیں یہ بھی کوئی بات ہوئی..... میرے لئے پان تولائے..... دلہن! لے دلہن!! یہ خورشید کیا ہے، ذرا پان تولاد اس کے لئے!!!

جواب: خواب تو کوئی آیا نہیں، البتہ پانڈان کھڑا، دو تین منٹ میں حمیدہ بانو گھونگھٹ کاڑھے آئیں، غاصدان سمیت تین چار سلام کئے، اور سہی ہوئی سی رگڑی۔ اوں ہوں میں نہیں کھاتی، بختاوردیگم نے کہا: "ہاں بیٹا خورشید!"

خورشید علی صاحب ایک پان اٹھا کر اداب بجالاتے۔ دلہن صاحبہ تھیں کہ جیسے جان بھی لاکھوں پائے۔ بے پاؤں اٹھنا ہی بار، باورچی خانہ میں۔

بختاوردیگم خورشید علی سے، دیکھا بیٹا! یہ حال ہے۔

خورشید علی۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

بختاوردیگم۔ اب کیا کردں بیٹا! میرا تو دم گھسا کر رہا ہے، ان باتوں سے۔

خورشید علی۔ یہی کہ ایک شگوفہ اور سہی کسی وقت، اچکے پور اہل علاقہ ہو جائے گا۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے خورشید علی صاحب نے

اجازت چاہی۔ بختاوردیگم بولیں، اچھا خیر ایک پان تولاد رکھا تھا، لے دلہن! باورچی خانے میں کیا کر رہی ہو، خورشید جانا

ہے، پان لاؤ!!

حمیدہ بانو نے دوبارہ غاصدان پیش کیا، ایک گھوری اٹھا کر خورشید علی بولے۔

بھابی جان کیسا مزاج ہے؟

اٹکے تو گویا پیروں تلے کی زمین نکل گئی، جیسے کسی نے

آوارہ ہوئے، ارسی سلام دے لے کر پہلی بات جو انہوں نے کی، یہ تھی۔

"بھوپتی اماں! بھابی جان کا کیا حال ہے؟"

بختاوردیگم نے خوش ہو کر جواب دیا۔

صدے جادو! ابھی ترکیب بتائی، تیرے جاتے ہی کوٹھے کے کوار دھڑ دھڑائے، میں بھی کہ جھارواٹھا چپکے سے نیچے میں جا کھڑی ہوئی، جوں ہی دلہن نے کھوٹے کو اڑھائی کر کہا۔

"کیوں ری یہ ٹوکی کہ رہی تھی ابھی ابھی، انوہ! اسی کو سارا سارا دن کوٹھے سے نہیں اترتی کہ سستے سے نکھیں لڑائے؟"

پُسنک بڑی چکرائی۔ لگی برابر سے جواب دینے، میں نے اس کا خوب فضیلت کر لیا، وہ تو یوں کہو پڑوسنیں، نگین، اس وجہ سے میں نے اُسے تو کوٹھے پر ٹوٹا دیا، اور ادھر ادھر کی باتیں بنا کر لے لے والیوں کو ملا۔

پڑوسنوں سے گھر خالی ہونے پر کرک کہ دلہن کو اواز دی، روٹی دھوئی آئی، تھر تھر کا پتی ہوئی، میراجی تو بہت کڑھا مگر دلی ہی ناراض صورت بنا سے رہی، بلکہ اور زور کھڑکی۔

"قطامہ! رو کر ڈرائی ہے، ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا"

اب دیکھ کیسا اصلاح کرتے ہیں، کہ دنیا تیرے جسم میں ٹھوٹے! لے اوسان ہو گئی، پھوٹ پھوٹ کر روٹی، گھگھیا گھگھیا کر لگی تصور معاف کرانے، میرے قدموں پر لوٹ گئی، بشل میں نے کہا۔

"خیر ایک تو چھوڑے دیتی ہوں، آئندہ کچھ دیکھنے سننے پر آیا تو یاد رکھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

خورشید علی۔ اچھا اب وہ بولنے بھی نہیں پائیں؟

بختاوردیگم۔ سخت عجیبی میں یوں ہی کچھ ہاں ہوں کہ دیتی ہے... لے بیٹا تو اتنا بھی نہیں تھا۔

خورشید علی۔ دفتر رفتہ باطل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بھی ٹپی پلید کی، اری دلدر آخو کر کیا تیرے خاندان میں کہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔
 اے تو بہ! کہاں کا گھونگٹ اور کیسی وضع داری، اوساں جاتے رہے، چیم سے قد مجھ کو دپسینہ میں نہائی ہوئی، حلق خشک، زبان لے کا بوجھ صورت تانبہ، تانبہ۔ کبوتر کی طرح غنر غنر کر کے بھڑائی ہوئی آواز سے بولیں۔

اے! اے! اے! ارے!!!
 بخنا اور ریگم۔ (غضبناک ہو کر) چپ چر وار..... بس اس گھر میں تیرا گذار نہیں..... بجٹی بے حیا تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔
 حمیدہ بانو! آپ..... مجھ سے..... کیوں..... ناراض ہیں؟.....

بخنا اور ریگم۔ شاہاش ٹپھی شاہاش، اب یہ بات بنائی، ہا سے اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں، اچھے سے اچھا پہنتے ہیں، خوشامد کرتے مٹہ سونگھا جاتا ہے، تیرے بھادیں نہیں۔ ہم نے اپنی ہاتھوں اپنی قسمت بھڑائی، کلیجہ نکال کر رکھ دیا..... آخر کئی نہ اپنی اوقات پر۔

حمیدہ بانو! (منت سے) میری کھال کی جوتیاں بنائے، ان نہ کر دے، مگر واسطہ خدا کا الیا بہتان نہ باندھے، رحم کرے میرے حال پر!

بخنا اور ریگم بھلا کا ہے کو تو جہ دینے لگی تھیں، انہوں نے تو لہن طعن کا تار باندھ دیا، حمیدہ بانو کی حالت بغیر ہوئی گی، آخر اُسے وہیں چھوڑ گئی۔ حکمت اپنی چار پائی پر! بیٹھیں، حمیدہ بھی سایہ کی طرح لگی چلی آئی۔ کھڑی کھڑی چکیاں لے رہی تھی، اپنے گھر کا۔

دور جو میرے سامنے سے غائب گئی۔

بجاری میں سکت نہ رہی گھٹنوں کے نل زمین پر گر گئی، اور اس کے قدم پچھلے گرم گرم آسٹوؤں کا مینہ برسائے تھی،

ٹکٹے میں کس دیا، ادھر چو جا جائے نہ ادھر، کھڑی کھڑی کسار رہی تھیں، بخنا اور ریگم نے کہا۔

آہ! بیٹا خورشید! کیا کیسا بھمائی ہوں، یہ ہے کہ غلط ہے ہی میں نہیں لاتی..... اپنے ٹکٹے میں مری جاتی ہے..... اری لڑکا کیا کہہ رہا ہے..... کچھ سنا..... بولتی نہیں..... ہائیں!.....

گھونگٹ سے مری سی آواز آئی: "شکر ہے!"
 اور دلہن صاحبہ نے رساں سے باورچی خانہ کا رخ کیا، خورشید علی صاحب اپنی چھوٹی اماں سے رخصت ہونے اور دوا تک پہنچنے گئے، بخنا اور ریگم نے کہا۔

بیٹا خورشید! یہ دلہن سلام کر رہی ہیں!!
 دیکھتے ہیں جو پٹ کر تو باورچی خانہ کی دلہیز بربھائی جان بغلی ساں بورڈی کھڑی تھیں۔

چنچنچہ ۵۵ پنچنہ
 گلاب حمیدہ بانو کے مزاج میں بہت کچھ تبدیلی آچکی تھی، جو حمیدہ بانو شفیق ساس کی انتہائی تلوتو کے باوجود دو سال شمس سے نہ نہیں۔ شیطان طوفان کے خون سے ہر وقت خیر مانگا کرتی تھیں، بلکہ ساس کو رضامند کرنے کا بھی کچھ خیال پیدا ہو گیا تھا، لیکن یکایک کیونکر پہلی روش بدل دی جاتی۔ یہ اپنے شش و پنج میں مبتلا رہیں، ادھر بخنا اور ریگم صاحبہ موقع تاک رہی تھیں اس ادھیڑ میں کوئی ہفتہ عشرہ مکمل کیا۔

ایک روز جبکہ گھر میں کوئی نہ تھا، اتفاقاً بخنا اور ریگم کو تقاضا حاجت کا تقاضہ ہوا۔ جو پہلی آپ بیت الخلاء کے قریب پہنچیں، اندر سے ہونکھکارس، اچی جناب پھر کیا تھا، زین پر لوٹا رکھ بھری ہوئی شیرنی کی طرح پھیل پھیں۔

تو ہے کو کو غضب خدا کا، کووہ پچائے میں ٹپھی روٹی کھا رہا ہے..... (سربٹ کر) ہاتے ہاتے دانیال کی

ایسی روئی ایسی روئی، بختاوردیگیم کا جی بھڑایا، چندے ساکت رہ کر ارشاد ہوا۔

”بول! اب کیا چاہتی ہے؟“

حمیدہ: ”ہاتھ جوڑ کر میرا قصور معاف کیا جائے۔“

بختاوردیگیم: ”پُرقار لچھ میں (اچھا خیر).... اس دفعہ اور صبر کرتی ہوں۔“

اس پر حمیدہ کو ایک بار اور زور شور سے رونانا، پھر ناراضگی کے خوف سے کمزور پڑتی ہوئی اٹھی اور لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی گھر دھکی کے پاس پہنچی، جہنمی میں منہ ہاتھ دھو کر دوسرے دالان کی چار پانی پر جا بیٹھی۔

سوچنے لگی کہ دیکھو یہی ساس ہیں جو مجھے دیکھ کر پھولی نہ سہاتی تھیں، میرے کیسے کیسے جو چلے کرتی رہیں، کھوں

سوجھے سوچتے بچا رے کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، یکایک خیال آیا کہ آفہ! ہونہ ہو یہ سب کچھ حد سے زیادہ خاموشی کا نتیجہ ہے، میری جیب سے سنگ آکر انہیں ایسی نفرت ہو گئی کہ صورت

کی روداد اور نہ میرا افسوس! میں نے بڑی غلطی کی۔ ایسی شفیق سدا کا دل دکھایا اس کی سزا ہی جی چاہیے تھی۔

اتنی پیش کے بعد اصل معاملہ مجھ میں آیا، پھر نہ یہ تم تم کو اور نہ ساس صاحبہ پر ہم، گھر پہ خوشحالی برستے لگی۔

جیسے خدا نے ان کے دن پھرے، ایسے سب کی کے پیسے۔ آمین۔

میرزا فریم بیگ چشتانی

۞۞۞۞

دائے کا جہنم

اٹالیہ کے مفکر اعظم دائے کی روئے لکھڑے کہ دینی والی ”دائے جہنم“ جسے شرق و غرب کے علماء کرام اور وحید العصر مفکرین مختلف طور پر

دُنیا کی عظیم ترین تصنیف

تسلیم کی ہے اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ دُنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اب

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

رسالہ ساقی دہلی۔ بابت، کتبہ بریلو میں کمال حسن اہتمام سے شائع ہوا ہے

جسے اردو کے بہترین مترجم

مولوی عنایت اللہ، دھلوی، بی۔ اے، سابق ناظم دارالترجمہ، حیدر آباد، دکن۔

نے

دکھ، دلچسپ اور مؤثر انداز میں کمال جانفشانی اور عوق ربڑی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے!

اس میں کم و بیش ساٹھ مئی تصاویر ہیں اور شروع میں دلتے اور اسکی مجاہد پٹرس کی سرنگی آرٹ پیٹ۔ مشر انصار ناہری۔ بی۔ اے، ایل ایل نے ابتدا میں ایک نہایت عمدہ تنقیدی مضمون لکھا ہے جس میں بتایا کہ دائے کے لیے پھر خصوصاً اسکی غیر فانی مثنوی ”جہنم اہیات“ عالم میں ایک نئی فانی

محبت کی پہلی تجلی

نہ تھا جب کو ممکن کے دل میں ارباں چوٹ کھانیکا
 نہ تھے دستِ ہوس کا جب لہو کی تڑپیں سو
 ہو تھا جب نہ شیریں کامِ خسرو جس شیریں سو
 خوشی آشنا دنیا میں جب فریاد کا ڈھب تھا
 الگ معورہ حسرت سے قیسِ عامری جب تھا
 نوحِ عاشقی میں جب انہاس کا نہ پھپھاتا تھا
 خیال آرا نہ تھا خوابِ زینچا جب زمانے میں
 نہ تھا آگاہ جب ذوقِ نظر باری تکلف سے
 نہ تھا اپنے اثر کا شوقِ چشموں کو جب اندازہ
 نیاز و ناز میں جب فرق کو نہایت مشکل تھا
 فدا ہا بیل نے کی جانِ اقلیم کی الفت میں
 انہیں دونوں نے دنیا میں محبت کی بنا ڈالی
 محبت کے طربِ آموز نے مل کے گاتے تھے
 یہ دونوں ایک شبِ جا بٹھے دریا کے کنارے پر
 تفسار اُس طرٹ قلیلِ ساسفک آتا ہے
 بحرِ لکھتی ہو آتش اُسے سینے میں قابت کی
 جہاں بھی جب کبھی جاتے ہمیشہ ساتھ جاتے تھے
 تبسم چاند کا دوانکے ہر دلکش اشارے پر
 نظر آتی نہیں صورت انہیں اپنی حفاظت کی
 پہلیں میں ختم کرتا ہوں یہ درد انگیز انسانہ

علی شکر حیدر آبادی
 نتیجہ اس کا مجھ سے کیوں نہ پوچھے کہ جو فرزانہ

سچی کہانی

قارئین سنائی اسپینا کے پردہ پر تو آپ بہت سے فلم دیکھ چکے ہیں۔ آج سنائی کے صفحات پر ایک فلم دیکھئے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر آپ نے توجہ اور اطمینان کے ساتھ اسے ملاحظہ فرمایا اور آپ کے تخیل نے بھی آپ کی تھوڑی سی مدد کی تو دورانِ مطالعہ میں یقیناً آپ ایسا محسوس کرنے لگیں گے جیسے کسی سینا ہال میں بیٹھے ایک نہایت دلچسپ فلم دیکھ رہے ہیں۔

شاید اس حقیقت کا میں پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں کہ کسی افسانہ کا پلاٹ اپنے دماغ سے پیدا کرنا میرے بس کی بات نہیں میں صرف واقعات کو افسانہ کی شکل میں پیش کر سکتا ہوں۔ اسی لئے ”سچی کہانی“ کو میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے لیکن میری دوسری کہانیوں میں اور اس کہانی میں ایک خاص فرق ہے وہ یہ کہ جس قدر واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں وہ بعض جزئیات و تفصیلات کو جو مقرر کر دینا سب سے سبب بچانے خود توہتے ہیں لیکن آپس میں ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا میں نے انہیں اس طرح مروڑا کر دیا ہے کہ ایک مسلسل داستان بن گئی۔

پریم بھاری

پیش کش

ایسا سوال نہیں۔ ہمارے پاس سفارش کہاں ہے؟
باپ :- یہ تو کڑی ہے کس حکمہ میں؟
امرسنگھ :- اہستہ تیار ہو کر حکمہ سناتا ہے۔

”ٹریفک منیجر کے دفتر میں ایک اسٹنٹ کلرک کی ضرورت ہے۔ تنخواہ پینتیس روپے ماہوار، دو روپیہ سالانہ ترقی۔ بی۔ اے ہونا ضروری ہے۔ عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ درخواست خود لیکر حاضر ہو۔“

دستخط ٹریفک منیجر۔ ای۔ سی۔ ریلوے۔
باپ :- تو پھر بیٹا تم ہی تو بی۔ اے ہو۔ عمر بھی تمہاری پچیس سال سے کم ہے۔ عرضی دینے میں کیا ہرج ہے۔ شاید ٹھکڑا ان یہ جگہ تمہیں گودا دے۔

امرسنگھ بادل ناخواستہ درخواست لکھ کر ریلوے

(ایک غریب محلہ۔ چھوٹا سا گھر جسکی ہر چیز سے افلاس برس رہا ہے۔ امرسنگھ پریشان حال گھر میں داخل ہوتا ہے۔)

امرسنگھ کا بوڑھا باپ :- بیٹا، کچھ کام ملا؟
امرسنگھ :- نہیں بتاجی۔ جہاں جاتا ہوں یہی جواب ملتا ہے کہ جگہ خالی نہیں۔

باپ :- دین بولوئے یہ اخبار ابھی بھیجا ہے اور اخبار امرسنگھ کی طرف بڑھتا ہے اور کہا ہے کہ اس میں ایک نوکری کا اشتہار چھپا ہے۔ تم بھی عرضی دیدو۔

امرسنگھ :- (پہلے اشتہار پڑھتا ہے پھر کہتا ہے) عرضی دیکر کیا ہو گا۔ ایک جگہ کے لئے تو تو نا اُمید دار ہوتے ہیں۔ پھر جس کی سفارش ہوتی ہو اسے جگہ مل جاتی ہے۔ لیاقت کا تو کچھ

رکھیں گے۔

ٹریفک میجر: *Send them away Back*
 پالو۔ دفعہ ہواں سے۔ نہیں تو قلیوں سے ہوا کے ٹکڑاؤں کا
 ایک شخص۔ بدعاش، تو ہمیں قلیوں سے ہوا کے ٹکڑاؤں کا
 پتہ کتنے ہوسے بالو کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہے۔ دھینک شستی
 قلی ہے بالو گر پڑتا ہے۔ دفعہ کے قلی اور دوسرے بالو
 بھل آتے ہیں اور اس شخص کو مارنے لگتے ہیں۔ سب کھڑے
 دیکھ رہے ہیں۔

وہ شخص: *جلا کر* بھائیو! تمہیں غیرت نہیں آتی؟
 بے تصور کو یہ خام پارٹ کر رہے ہیں اور تم کھڑے دیکھ
 رہے ہو۔ جمع ہو کر جلا کر دو اور دوسرے والوں پر حملہ کر دو
 ٹریفک میجر: *Get away you damned*
oot. Get away you bloody swines.
 ایک شخص صاحب ہمارے کے تانچے رسید کرتا ہے
 دودھ جاگرتا ہے صاحب بھگتے ہیں۔ بھگتے ہیں گر پڑتے ہیں
 ہر حال دفعہ میں ٹھس جاتے ہیں دفعہ کے باقی لوگ بھی کبھی
 طرح دفعہ میں داخل ہو کر دروازے بند کر دیتے ہیں۔ مجھ
 کا بیان دس رہا ہے۔

ایک شخص: *توڑ دو دروازہ، مار ڈالو سراسر ادا دیکھو*
 توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹریفک میجر پولیس کو ٹیلیف
 کرتا ہے۔ اتنے میں دروازہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لوگ اندر گھس
 جاتے ہیں۔ صاحب ہمارے ایک مین کے پیچھے چھپ جاتے ہیں
 بعض بالوں اور قلیوں کی ٹھوڑی سی پٹائی ہوتی ہے
 میں شور مچاتا ہوں کہ پولیس آگئی، پولیس آگئی، لوگ وہ
 سے نکل کر بھگتے ہیں۔ پولیس ڈنڈوں سے مارنا شروع
 کرتی ہے۔ مجمع پھر بکھرتا ہے۔ بھگتے والے ہٹ پڑتے
 ہیں پولیس سے ماپیٹ ہوتی ہے ایک پولیس والا گریپ

کے دفتر کو روانہ ہو جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر دیکھتا ہے کہ کئی سو
 آدمی دفعہ کے سامنے موجود ہیں۔ سب امیدوار ہیں۔ خاصہ
 ہنگامہ برپا ہے۔ لوگ طرح طرح کے لباس پہنے ہیں۔ رومی
 ٹوپی، پگڑی، فیلٹ کیپ، دھوٹی، پاجامہ، پتلون، سبھی
 نمونے موجود ہیں۔ ٹھوڑی دیر میں ایک چپراسی دفعہ سے
 نکلتا ہے اور کہتا ہے:
 چپراسی: صاحب ابھی آتے ہیں۔ تم لوگ ایک لین ہیں
 کھڑے ہو جاؤ۔

سب ایک قطار بناتے ہیں جو تقریباً ایک فرلانگ
 تک چلی گئی ہے۔ ٹریفک میجر اپنے ہالکے ساتھ دفعہ سے
 نکلتا ہے اور اس کی رعایت کو دیکھ کر خیران رہ جاتا ہے۔
 ٹریفک میجر: مانی گاؤ۔ یہ سب لوگ کینڈی ڈیٹ ہو؟
 پالو۔ ہاں حضور۔ یہ سب کینڈی ڈیٹ ہیں۔
 ٹریفک میجر: ویل، ہم ان سب کو نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا
 ڈکٹ نہیں ہے۔ ہم کھالی ایک آدمی مانگتا ہے۔ اچھا صرف
 ایک ڈزن آدمی روک لو۔ باکی دس سرد۔
 پالو پہلے بارہ آدمیوں کو علیحدہ کر کے باقی سے
 کہتا ہے کہ آپ لوگ جائیے۔

چند آدمی آتے ہیں۔ تو پھر بلایا کیوں تھا؟ ہماری عرضی تو
 دیکھی ہوئی۔
 چند آدمی آتے ہیں۔ اور ان بارہ آدمیوں کو تم نے کیسے
 جھانٹ لیا۔
 کچھ آدمی آتے ہیں۔ ہم تو ان سے بہت پہلے کے آئے ہوئے
 ہیں۔ صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔
 لائن ٹوٹ کر ہجوم ہو جاتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ
 کہتا ہے۔
 پالو اچھے جاؤ یہاں سے شور مچاؤ ہے ہم چاہیں گے

کرتے کیوں ہر شخص اس شخص میں پرگراہی ساری زندگی رہا ہو کرتا ہو۔ کیوں تعلیم کو تعلیم کے لئے حاصل نہیں کیا جاتا۔ کیوں فقط تعلیم ہی کو روزی کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ سب کو تو نہیں لیکن چند بھائیوں کو میں کام سے لگا سکتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے جو صاحب شادی شدہ ہیں وہ اس طرف آجائیں اور جو کنوارے ہیں وہ اس طرف۔

(دو گروہ ہو جاتے ہیں)

مکرجی :- رکنواروں سے مخاطب ہو کر آپ صاحبان میں سے جو لوگ بالکل آزاد ہیں یعنی جن کے ذمہ والدین یا دوسرے عزیزوں کی پرورش نہیں وہ ایک طرف نکل آئیں۔

(تھوڑے سے آدمی نکل آتے ہیں)

مکرجی :- (اس قیل جاعت سے) آپ میں سے جو شخص مضربنا گذارہ لیکر ملک کی خدمت کرنا چاہے وہ میرے ساتھ چلا آئے۔

(دس آدمی مکرجی کے ساتھ ہو لیتے ہیں)

امر سنگھ :- (آگے بڑھ کر) بالوجی میں بالکل آزاد تو نہیں ہوں۔ ٹوڑے ماں باپ کی خبر گیری میرے ذمہ ہو مگر میں دلچسپی رکھتا ہوں۔

مکرجی :- مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر آپ کی مدد کرنا اس وقت میرے اختیار میں نہیں۔

(امر سنگھ بالوں ہو کر ہلٹ جاتا ہے)

مکرجی :- (اپنے ساتھیوں سے) آئیے۔

سب ساتھ ہو لیتے ہیں۔ پارک سے چکر مار کر پرانے ہیں اور ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹرام سے اترتے ہیں اور مکرجی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

مکرجی :- بھائیو! میں کوئی دو لاکھ آدمی نہیں ہوں۔ دلچسپ

لوگ اس کی پکڑی چھین کر دھکیاں کر دیتے ہیں۔ آخر پولیس فائر بریکنگ کو ٹیلیفون کرتی ہے جو فوراً پہنچتا ہے۔ مجمع پر پانی سے حملہ کیا جاتا ہے لوگ بھاگتے ہیں اور گرتے ہیں۔ کسی کی ٹوپی، کسی کا جوتا، کسی کی پکڑی رہ جاتی ہے۔ سینکڑوں غریبوں کے کاغذ اڑنے پھرتے ہیں۔ لوگ کچڑ میں پھسل کر گرتے ہیں۔ پھر اٹھتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ غرض مجمع منتشر ہو جاتا ہے۔ مجمع کا ایک حصہ ایک خاص سمت میں بھاگتا ہے اور ایک پارک میں پہنچ کر پھر جاؤ ہوتا ہے۔ اتنے میں مسٹر مکرجی آپ پہنچتا ہے۔ ان لوگوں کو اس حال میں دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور پوچھتا ہے۔

مکرجی :- یہ کیا قصص ہے؟

ایک شخص :- فقہ کیا ہے بالوجی۔ ٹی۔ ایم۔ کے دفتر میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ کئی سو گرجہ بیٹھ کر عرضیاں لے کر پہنچ گئے۔ ٹی۔ ایم نے اور اس کے بالوں نے لوگوں سے بدزبانی کی۔ بس اس پر جھگڑا ہو گیا اور مار پیٹ ہوئی۔ آخر پولیس آگئی اور لوگوں کو بہت مارا پیٹا اور آگ بجھانے کے انجن سے پانی برسا کر مجمع کو منتشر کر دیا۔

مکرجی :- ہاتے بد نصیب ہندوستان! اچھا آپ سب لوگ بی۔ اے پاس ہیں؟

چند آوازیں :- جی ہاں۔

ایک آواز :- میں ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ہوں۔

ایک اور آواز :- میں ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ہوں۔

مکرجی :- بھائیو! ایسی اعلیٰ تعلیم کے بعد بھی آپ کو تیس پینتیس روپے کی نوکری نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ بد قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے مگر تیرے پوچھتے تو قصور ساز و خود آپ کا ہے۔ کیوں آپ لوگ کوئی اور کام نہیں سیکھتے کیوں عیشہ و رہنمائی نہیں۔ کیونکہ صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں

ایک سیوک اور وطن کی خدمت کرنے والی ایک سوسائٹی کا کارکن ہوں۔ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کو کیا کام کرنا ہو گا؟
کئی آوازیں:- آپ فرمائیے:-

مکرجی:- کام بٹلانے سے پہلے کئی اور باتیں آپ کو بتانا ضروری ہیں۔ میں ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی مصیبت کا اصلی سبب کیا ہے؟
ایک آواز:- یہ کچھ آپ ہی بتا دیجئے۔

مکرجی:- ہماری تمام مصیبتوں کے ذمہ دار ہمارے دلش کے دو ائمہ لوگ ہیں جو خیرہوں کا خون چوس چوس کر اپنی تہلیلان بھرتے اور عیش کرتے ہیں۔

ایک آواز:- آپ سچ کہتے ہیں۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں میں جانتا ہوں کہ غریب کسانوں پر کیا گذرتی ہے۔ بد نصیب صبح سے شام تک مل چلاتا ہے۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی کو جاتا ہے مگر اس محنت کا بدلہ اسے اتنا بھی نہیں ملتا کہ پیٹ بھرے کو دیکھی سوکھی روٹی اور تھن ڈھانکے کو موٹا چھوٹا کپڑا میسر آجائے۔

مکرجی:- اور مزدور کی حالت ان سے بھی بدتر ہے وہ سارا دن اور کبھی کبھی ساری رات محنت کرتے ہیں مگر انہیں جو مزدوری ملتی ہے وہ کسی طرح بھی ایک انسان کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ دھپتے کے پنے چاب کے دن گزار دیا۔ میلی پھیلی پھین ہوئی ایک منگولی پاندھ لی اور رات کو فٹ پاتھ پر پڑ رہے۔ یہ ان کی زندگی ہے اس سب کے ذمہ دار مالدار ہیں۔

دو ایک آوازیں:- تو بتائیے ہیں کیا کرنا ہو گا؟
مکرجی:- ابھی بتاتا ہوں۔ ہماری سوسائٹی کا مقصد دولت مندوں کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ آپ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ گاؤں گاؤں جائیں اور کسانوں میں ان کے حقوق کا احساس

پیدا کریں اور اسی طرح مزدوروں کو سمجھائیں کہ کس طرح مالدار لوگ تمہاری محنت سے کمائی ہوئی دولت اپنی جھولیوں میں بھر لیتے ہیں اور بیدردی سے خرچ کرتے ہیں۔

ایک آواز:- اس کے سوا کچھ اور؟
مکرجی:- ہر وہ کام اور وہ قربانی جس سے ہماری تحریک کو قوت پہونچے۔ آہستہ آہستہ پورا پروگرام آپ کو بتا دیا جائیگا جس پر عمل کرنے سے ہماری غلامی کی زنجیریں کٹ کر گر جائیں گی۔ اور غلامی اور بے روزگاری کا نشان مٹ جائیگا۔ سوسائٹی یعنی دلش سیوک منڈل کی طرف سے میں آپ کا بیس روپیہ ماہوار الاؤنس مقرر کرتا ہوں۔ جن صاحبوں کو ہمارے مقصد سے اتفاق نہ ہو وہ آزاد ہیں۔ جاسکتے ہیں، کوئی مجسوردی نہیں۔ اور جن صاحبوں کو اتفاق ہے انہیں حلفیہ اقرار کرنا ہو گا کہ وہ آخری دم تک آزادی کی اس جنگ میں شریک رہیں گے۔

سب:- ہم تیار ہیں۔ لائے حلف دیجئے۔
مکرجی:- خدا آپ کو کامیابی دے۔ آپ کا یہی قول آپ کا حلف ہے۔ (اس کے بعد مکرجی سب کو بیٹھ بیٹھ روپے تقسیم کرتا ہے اور کہتا ہے:-)

مکرجی:- پروگرام کی تفصیل اور بعض ضروری باتیں دوسرے وقت بتائی جائیں گی۔ اس لئے آپ لوگ رات کو نو بجے تشریف لائیں۔

(سب جاتے ہیں)

پبلک گارڈن

ایک بچی اسکیننگ روپ پر اچھل رہی ہے۔ کچھ بچے بھاگ دوڑیں مصروف ہیں۔ بعض کھلایاں بچوں کو گاڑ رہے

میں بٹھائے لئے جا رہی ہیں کہیں لوگ بچوں پر بیٹھے ہیں کہیں سبزہ پر۔ ایک چینی کا غدے پھول اور کھلونے بیچ رہا ہے۔ بینڈ اسٹینڈ کے گرد بہت سے لوگوں کی ہجوم ہے۔ بینڈ بج رہا ہے۔ ایک جوان آتا ہے اور ایک لڑکا جو ان عورت کی بیٹھ چھوٹا ہے۔

عورت :- (پلٹ کر) ہلو موہن !

موہن :- ہلو شانتی !

شانتی وہاں سے نکل آتی ہے اور دونوں ساتھ ساتھ ایک طرف کوچا جاتے ہیں۔

شانتی :- حیدر آباد سے کب واپس آئے ؟

موہن :- آج صبح ہی تو آیا ہوں اس وقت نہاری طرف گیا تھا یہ معلوم ہوا کہیں باہر گئی ہیں میں نے کہا ممکن ہے تم ادھر آئی ہو۔ بس میں بھی چلا آیا۔

شانتی :- اتنا تم بھی چھوٹے موٹے پروفٹ (محض کچھ صحر) ہوتے جاتے ہو۔

موہن :- ہلے لگتا ہے۔ ایک خالی پنچ کی طرف اشارہ کر کے چلو وہاں چل بیٹھیں۔

شانتی :- چلو۔

جا کر دونوں پنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک نہایت خوبو جوان فوجی دروی پہننے ذرا فاصلے پر جا رہا ہے۔ موہن اُسے دیکھ کر اپنا ہاتھ بلند کر کے ہلاتا ہے اور کہتا ہے ”ہلو پریم“

پریم ”ہلو موہن“ کہہ کر مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔

شانتی :- بڑا جمیلا جوان ہے۔ یہ کون ہے موہن ؟

موہن :- میرا اسکول فیلو اور بہت پیارا دوست ہے۔ اسکا نام پریم سنگھ ہے۔ بڑا خاندانی آدمی ہے۔ بزرگ بھی بہت دو لمند تھے۔ اب بھی اچھی خاصی حیثیت ہے۔ فوج میں

پکستان ہے۔ کچھ ایسا لمبا چوڑا خروں نہیں۔ بس ایک بوڑھی ماں ہے اور ایک چھوٹا بھائی اندر سنگھ، وہ بھی فوج میں سیکنڈ لفٹیننٹ ہے۔

شانتی :- اچھا! تو ابھی شادی نہیں کی ؟

موہن :- نہیں۔

شانتی :- آج کل لڑکوں میں کنوارے رہنے کی بیماری

بہت زور شور سے پھیل رہی ہے۔

موہن :- نہیں، یہ بات نہیں شانتی۔ یہ بیچارہ تو ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ روپ کماری کو تو تم جانتی ہونا ؟

شانتی :- کون روپ کماری ؟

موہن :- ارے وہی ڈاکٹر ٹنڈن کی بیوی۔ اُس روز اسکول کے جلسہ میں تم نے ملاقات نہیں کر لی تھی ؟

شانتی :- (کچھ سوچ کر) ہاں ہاں یاد آ گیا۔ بڑی مغرور عورت ہے، معلوم ہوتا ہے اپنی صورت پر بڑا ناز ہے۔

موہن :- ہاں وہی۔ پہلے اُس نے پریم سے محبت کے پیٹنگ بڑھائے اور شادی کی خواہش مند ہوئی۔ پریم اسے بہت چاہنے لگا تھا اور بظاہر وہ بھی اُس پر جان دیتی تھی مگر

یہ سب سکاری تھی۔

شانتی :- یہ کیسے ؟

موہن :- یہ ایسے کہ پریم کے ایک کشمیری دوست، کپور سے چھپ چھپ کے ملے گی۔ ایک روز پریم نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ وہ بہت غیرت دار آدمی ہے۔ بس فوراً تعلقات قطع ہو گئے۔

شانتی :- تو پھر ڈاکٹر ٹنڈن سے کیسے شادی ہوئی !

موہن :- بات یہ ہوئی کہ کپور تو نیپاک ولایت چلا گیا۔ ٹنڈن نے اُسے کہیں ہسپتال کے چیری فٹو میں دیکھ لیا اور اسکا گانا بھی سنا ہے۔ وہ اس کی دولت پر کچھ

تو ہم نکل آئیں گے اور ان کو چھڑانے کی کوشش کریں گے۔
تم پہنے تھوڑی دیر ہم سے جھگڑا کرتا۔ پھر ان کو چھوڑ کر
بھاگ جاتا اور ہماری موٹر میں بیٹھ کر غائب ہو جاتا۔
پریم :- Good Good! (گڈ گڈ)

مکرجی :- بد معاش، جھوٹا نہیں کا۔ (مارنے کو جھڑپی اٹھاتا
ہے پریم کو دکھاتا) میں نے تو اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔
وہ شخص :- (گڑ گڑا کر) بالو جی غریب آدمی کو کاہے کو
پھنساتے ہو پھر پریم کے پاؤں چھو کر (حضور ہمارے
مافی باب ہیں، ہمیں چھوڑ دیجئے۔ ہمارے بال بچے حضور کو
دعا دیں گے۔

موہنی :- سبھوت ہو کر مکرجی کی طرف دیکھتی ہو۔ مکرجی کچھ
کے سنے بغیر روانہ ہو جاتا ہو۔ وہ شخص رونے اور ہنسنے لگتا ہے۔

پریم سنگھ (مکرجی کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہو کون شخص؟
وہ شخص :- حضور ہم تو یہ بھی نہیں جانتے۔ ہم سے تو ایک
روز بازار میں ملاقات ہوئی تھی۔

پریم :- اور یہ دو آدمی جو بھاگ گئے یہ کون تھے؟
وہ شخص :- غور! انہیں بھی بالو جی اپنے ساتھ لائے تھے۔
ہم نہیں جانتے۔

پریم موہنی کی طرف دیکھتا ہے۔
موہنی :- اب جانے دیجئے اس گنجت کو۔
وہ شخص :- بگوان آجکا بھلا کرے مافی جی۔
پریم :- جاؤ۔ دفع ہو۔

وہ شخص ہاتھ جوڑ کے سلام کرتا ہو اور منبر رفتار
سے چلا جاتا ہے۔

پریم :- (موہنی سے) اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو گھر
تک پہنچا دوں۔

کھڑی ہے۔
وہ شخص :- حضور (ہاتھ جوڑ کے) معاف کر دیجئے۔
پریم :- چپ رہو! اس کے بعد موہنی سے) آپ کے کہیں چوٹ تو
نہیں لگی۔

موہنی :- جی نہیں۔ میں آپ کو لگی، بیدار شدہ گزارہوں کو اپنے
ان بد معاشوں سے میری جان بچانی (مکرجی کی طرف اشارہ
کر کے) شاید ان بچاروں کے کچھ چوٹ لگ گئی ہو۔ اس بد معاش
نے انہیں گرا بیا تھا۔

پریم :- (مکرجی سے) آپ کے تو کہیں چوٹ نہیں لگی؟
مکرجی :- جی نہیں۔

پریم :- اس بد معاش کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔
مکرجی :- بیشک۔ مگر انشوس ہو آئیں آپ کے ساتھ نہ چل
سکونگا۔ مجھے ایک نہایت ضروری کام ہو (کھڑی دیکھ کر)
انوفہ بڑی دیر ہوئی (یہ کہہ کر چلنا چاہتا ہے)
وہ شخص :- (مکرجی کے پیروں کو پھٹ جاتا ہو) حضور خدا
کے لئے مجھے بچائیے۔ میں مرجاؤنگا۔

پریم اور موہنی ذرا متعجب ہو کر آتے اور مکرجی کو دیکھتے
ہیں۔ مکرجی کچھ گھبرا جاتا ہو۔

مکرجی :- ہم کچھ نہیں جانتے۔ (یہ کہہ کر پھر چلنا چاہتا ہو،
وہ شخص مذہب مکرجی کے قدم پکڑ لیتا ہو اور کہتا ہو) سرکار
میں مرجاؤنگا۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے
بچے ہیں۔ آخر میرا کیا (دش ہے۔

پریم سنگھ (ادبھی حیران ہو کر اس شخص سے) (ادھر دیکھو!
(وہ شخص ادھر متوجہ ہوتا ہو) ہمیں بتاؤ کیا بات ہو؟

وہ شخص :- حضور۔ بالو جی نے ہم لوگوں سے کہا تھا کہ ہمیں
پندرہ پندرہ روپے ملیں گے۔ تم لوگ ان باقی جی کو اٹھا کر
لے بھاگنا۔ ہم پاس ہی چپے رہیں گے۔ جب یہ مندر چائی

موہنی :- میں آپ کی بھرتی ہوئی ہوں۔ مگر آپ کی تکلیف ہوگی۔
پریم :- نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

دونوں چل رہے ہیں۔ سڑک پر پوچھ گچھ کی باتیں ہیں
اور موہنی کے گھر پہنچتے ہیں۔ موہنی کا مکان دو مندر اور
عالیشان ہے، موہنی بڑے احترام اور تواضع سے پریم
کو بٹھاتی ہے۔

موہنی :- ساری زندگی آپ کا احسان دہو رہی تھی (یہ کہہ کر)
بڑی محبت بھری نظروں سے پریم کو دیکھتی ہے۔

پریم :- (بہت متاثر ہو کر) واہ وہ بات ہی کیا تھی۔

موہنی :- کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟

پریم :- میرا نام پریم سنگھ ہے۔ اور آپ کا نام؟

موہنی :- میرا نام موہنی ہے۔

پریم :- موہنی۔

موہنی :- جی۔

پریم اور موہنی دونوں ایک دوسرے کو بڑی محبت
بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔

پریم :- آپ اس مکان میں اکیلی رہتی ہیں؟

موہنی :- جی ہاں۔ ایک ملازمہ اور ایک پتاجی کے وقت
کا لڑکا ملازم۔

پریم :- اچھا تو کیا آپ کے پتاجی.....

موہنی :- جی ہاں۔ پتاجی کو پرلوک سدھارے کوئی چٹہ
چینیہ ہوتے تھے۔

پریم :- اور آپ کی اماں جی؟

موہنی :- وہ تو میری پیدائش ہی کے وقت سو گئیں
جو کئی تھیں (ایک منٹ کے بعد نہایت محبت انگیز انداز

سے) پریم سنگھ کی ایک ماں آپ کا پتہ پوچھ سکتی ہوں۔

پریم :- (مسکرا کر) یہ شک یہ کہہ اپنا کاڈ نکال کر موہنی

کو دیتا ہے۔

موہنی :- (کاڈ دیکھ کر) اچھا تو آپ کیلپن میں زور و قف
کے بعد آپ کے مانا پتا زندہ ہیں؟

پریم :- پتاجی کو دنیا سے سدھارے تو بہت دن ہوئے
اماں جی کا سایہ ابھی ہمارے سر پر قائم ہے۔ بس اب ہم گھر
کے کل تین آدمی ہیں۔ اماں جی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی
اندر سنگھ۔

موہنی :- (مسکندگی سے) کل تین آدمی۔ یعنی آپ کے بال
بچوں کو چھوڑ کر۔

پریم :- (مسکندگی سے) جی نہیں، سب کو جوڑ کر۔

موہنی :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔

پریم :- مزید دیوی ابھی میں نے شادی نہیں کی ہے۔

موہنی :- (تجسس اور مسرت کے ساتھ) اچھا!

پریم :- آپ اس شخص کو جانتی ہیں جسے آج آپ کو یہ تکلیف
پہنچائی؟

موہنی :- نہیں پریم سنگھ کی۔ میں نے تو آج سے پہلے کبھی
اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔

پریم :- خیال ہوتا ہو کہ میں نے اسے کیوں دیکھا ہے۔ اچھا
اب اجازت ہے؟

موہنی :- بہت اچھا! یہ کہہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ پریم بھی
کھڑا ہو جاتا ہے۔

موہنی :- اب کب ملاقات ہوگی؟

پریم :- جب آپ جانیگی۔

موہنی :- (مسرور ہو کر) بہت اچھا۔ ابھی تو میں پورے ط
برآ بیکار شکر یہ بھی (انہیں کر سکی۔ خیر دوسرے وقت

ہی (یہ کہہ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتی ہے)

پریم :- چھوڑیے اب اس ذکر کو کر لیتے ہوئے موہنی کا

خام بیستہ۔ ٹھیک اسی وقت چمپا داخل ہوتی ہو اور بڑے غور سے پریم کو دیکھتی ہے۔ ہاتھ ملانے کے بعد۔
پریم :- اچھا۔ آداب۔
موتی :- آداب۔

امر سنگہ کا مکان

دو کابی دروازہ پر آکر کھٹکا کرتے ہیں۔

اندر سے آواز :- کون ہے ؟

ایک کابلی :- باہر میں آؤ۔

دروازہ کھلتا ہو۔ امر سنگہ کا باپ باہر آتا ہے اور کابیوں کو دیکھ کر غصہ پریشان ہوتا ہو اور پوچھتا ہو۔

بڑھا :- کیا ہے خان ؟

خان :- امر سنگہ کہاں ہے ؟

بڑھا :- باہر گیا ہے۔

خان :- کب آئیگا۔

بڑھا :- کچھ معلوم نہیں۔

خان (اپنے ساتھی سے پشتوں پر کچھ کہتا ہو پھر بڑھے سے)

بابو ! ہم کتنی دفعہ آیا۔ امر سنگہ ملتا نہیں، اشام کو ہم پھر

آئیگا۔ اسکو لولو ہمارا روپیہ آج ضرور دینا ہوگا۔ دو مہینہ

ہو گیا، روپیہ بھی دیتا نہیں۔ سود بھی دیتا نہیں۔ روز وعدہ

کرتا ہے۔ آج دیکھا۔ کل دیکھا، صبح دیکھا، شام دیکھا۔ اگر آج

روپیہ نہیں دیکھا تو ہم کل ناش کروئیگا۔ پھر بہت اُس کا

مشکل ہوگا۔

بڑھا :- خان، آجکل ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ امر سنگہ

بے روزگار ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے ابھی سود

میں دیر ہو گئی۔ آپ پندرہ دن اور ٹھہر جائیے چاہے ہوگا

ایک ایک پانی آپ کا بھگتان کر دینگے۔

لٹے میں امر سنگہ آہ پوچھتا ہے۔

امر سنگہ :- خان سلام

خان سلام :- ہمارا روپیہ کا بندوبست کیا ؟

امر سنگہ :- خان میں بہت شرمندہ ہوں کہ اس دفعہ بہت

دیر ہو گئی۔ آپ نے جہاں لٹے روز صبر کیا ہے وہاں چند روز

کی جہلت اور دیدیئے آپکا بڑا احسان ہوگا۔

خان :- جہلت، جہلت، جہلت، کتنا روز جہلت دینگا۔ ہم

نہیں جانتا۔ ہمارا روپیہ ابھی دینا ہوگا۔

امر سنگہ :- خان بھلا اسوقت روپیہ میرے پاس کہاں ہو۔

خان :- کچھ پروا نہیں۔ گھر کا سامان بچو اور کسی سے قرض

لو۔ مگر ہمارا روپیہ آج دینا ہوگا۔ ہم ابھی لے لیگا۔

امر سنگہ :- (باپ سے) پتا چلی آپ اندر چلے۔ (دو نوں باپ

بیٹے گھر میں جانا چاہتے ہیں۔ خان امر سنگہ کا کوٹ پکڑ کر پھینچتا

ہے۔ کوٹ جھڑے پھٹ جاتا ہے۔)

خان :- کدھر جاتا ہے۔

امر سنگہ :- چھوڑ دے میرا کوٹ

خان :- نہیں چھوڑیگا۔

امر سنگہ :- جا عدالت میں عدالت ناش کرو دے۔ عدالت

سے لے۔

خان :- عدالت سے کیوں لیگا۔ عدالت کو روپیہ نہیں دیا۔

تہیں دیا ہو۔ تم سے لیگا۔

دوسرا خان پشتوں پر کچھ کہتا ہو۔ را بکیر جمع ہو جاتے

ہیں، کچھ حملہ کرنے آ جاتے ہیں۔

ایک ٹپو سی۔ جانے دو۔ جانے دو خان۔ جھگڑا کرنے سے

کیا فائدہ۔

خان :- ہم جھگڑا نہیں کرتا۔ ہم اپنا روپیہ مانگتا ہے۔

امر سنگہ :- تو روپیہ دینے سے کس نے انکار کیا۔ یہی تو کہا تھا کہ چنند روز ٹھہر جاؤ۔

خان :- ہم ایک دم نہیں ٹھہریگا۔ ابھی لیگا۔ ابھی لیکے جائیگا۔ پڑوسی :- خان ہمارے کہنے سے پندرہ دن کی مہلت اور دیدہ۔ اگر پندرہ دن میں یہ نہیں دیکھا تو ہم دیکھا۔

خان :- تم دیکھا ؟

پڑوسی :- ہاں ہم دیکھا۔

خان :- اچھا، تمہارا بات سنی دیکھے گا۔

یہ کہہ کر دونوں شان پشت میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ امر سنگہ اور اس کا باپ گھر میں پہلے جاتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ راہگیر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اسنے میں ایک بالو دروازہ کھٹکھٹاتاؤ۔ امر سنگہ نکلتا ہے۔

بالو :- بڑے جھوٹے آدمی ہو جی تم۔ کہہ کے آئے تھے کہ سات تارین کو ضرور وہ نوں جینے کا کر یہ پہنچاؤں گی آج پندرہ تاریخ آگئی۔ اب تک تمہارا پتہ نہیں۔ تین دفعہ ہمارا آدمی بھی حیران ہوا۔ گھر پر بھی تمہارا پتہ نہیں چلتا۔

امر سنگہ :- بالو جی میں آج کل سخت پریشان ہوں۔ آخر وہ برس سے ہم آپ کے کر یہ دار ہیں۔ برابر وقت پر کر یہ دیتے رہے۔ اب چند جینے سے یہ دیر ہو تو کئی ہے۔

بالو :- اچھا تو لاؤ اب دو۔

امر سنگہ :- بالو جی میں آٹھ دن سے برابر آپ ہی کے روپے کی فکر میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ کرب تک کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ آپ چند روز اور ٹھہر جائیے۔

بالو :- (طنز پر) چند روز اور ٹھہر جائیے۔ شرم نہیں آتی کہتے ہوئے، اندھیر سے ڈھائی مہینہ کا کر یہ چڑھ گیا۔ دھڑکی اور ڈیاں آن تک نہیں دیں۔ اب ان چالوں سے کام نہیں چلے گا۔

کرا یہ ابھی دیدہ اور کل صبح مکان خالی کر دو۔ نہیں تو اس کا نتیجہ بہت خراب ہوگا۔

امر سنگہ :- (منت سے) بالو جی بھگوان نے آج کو بہت کچھ دیا ہے۔ پندرہ برس روپے بغیر آپکا کونسا کام اٹکا پڑا ہے۔ ہمارے اوپر دیا کیجئے۔

بالو :- (اور تیسر ہو کر) بھگوان نے بہت کچھ دیا ہے تو ہم نے کسی کا کچھ چھین لیا ہے۔ خبریت اسی میں ہو کہ کرا یہ دیدہ۔ اور چپکے سے مکان خالی کر دو۔ نہیں تو کھٹیا پڑیا سب نیلام کرادو گیگا۔ بہت بے عزت ہو گئے۔

امر سنگہ :- (مجبور ہو کر) جو آپ نے جی میں آئے کیجئے اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

بالو :- (بھی بات ہے۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیں اس کا یہ کہہ کر بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ امر سنگہ پھر گھر میں آتا ہے۔)

امر سنگہ :- (اپنی ٹوڑھی، اس سے) اماں بڑی بھوک لگی ہے۔ دل :- جتنا ابھی تو کچھ جی نہیں پکا۔ تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آٹا، وال، چاول، سب چیزیں ختم ہو گئیں۔ اب تم کچھ لاؤ تو کیجئے۔

امر سنگہ (چپ چاپ چلا جاتا ہوا اور محلہ کے بننے کی دکان پر پہنچ کر) لالہ جی دس سیر موم لے چاول اور پانچ سیر زہر کی وال اور دیدہ کیجئے۔

لالہ :- بھیا، ہم نے اٹھارہ کالین دین بند کر دیا۔ کتنے لوگوں کے پاس :- وہیہ اٹکا ہوا ہے۔ قرض لے کر کوئی دینا ہی نہیں چاہتا۔ تم نے بھی اب تک پہلے مہینہ کا بھگوان نہیں کیا اور تازہ قرض لینے کو آکھڑے ہوئے۔

امر سنگہ :- لالہ جی آخر اسے ہمارا برسوں سے لین دین ہو رہی ہے۔ ابھی تو کوئی کوڑی ماری گئی ہے۔

لالہ :- نہیں ماری تو نہیں گئی، لیکن ہم ایسا ہو پا رہے ہیں کہ نہ۔

آجاتا ہے۔

ایک راہگیر: ساری خطا موٹر وے کی ہی۔
دوسرا راہگیر: ہارن نہیں دیا۔ ایک دم موٹر کھادی۔

تیسرا راہگیر: ہاتھ نہیں دکھایا۔ غریب کا خون کر دیا۔
پہلا: اس کا نتیجہ بھی معلوم ہو جائیگا۔

امر سنگھ (راہگیروں سے): آپ کو کون کون سی دینی ہوگی۔
کئی راہگیر: ضرور تو راہی دینگے۔

سپاہی: ہم سب رپورٹ بولیں گے۔ غریب کا خون ایسے
نہیں جانے گا۔

پولیس والا گاڑی کا نمبر لیتا ہے اور مالک کا پتہ وغیرہ
پوچھ کر لکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کو تو راہی چلو۔

بالو (جو موٹر چلا رہا تھا اور شہ میں مدہوش ہے):
Get away, you go and report. —
یہ کہہ کر گاڑی چلا دیتا ہے۔

ڈاکٹر منڈن کی کوٹھی: نہایت عالیشان عمارت
خوبصورت باغیں باغ۔ کمرے بہترین سامان اور فرنیچر سے
آراستہ۔

ڈاکٹر منڈن اپنے کمرہ میں ٹہل رہا ہے۔ ٹائپ کئے
ہوئے کچھ کاغذات اُس کے ہاتھ میں ہیں جنہیں ہار بار اٹک
پٹک کر دیکھتا ہے۔ پھر ایک نفاذ میں بند کر کے میز کی دسائیں
رکھتا ہے اور نالا لگا دیتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کمرہ میں چلتا
ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ بیک بک غصہ کی شکل بنالیتا ہے
الماری کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے پھر برابر والے کمرہ
کو زور زور سے دھدھکیاتا ہے۔ اُس کمرہ میں اس کی بیوی
یعنی روپ کمار کی اپنے سنگھار میں مصروف ہے۔ زرد برق
لباس پہنے آئینہ کے سامنے چہرہ پر پوڈر لگا رہی ہے جب تکھا۔

پچھلا حساب صاف کر دواتا ہے کہ لچاؤ تو کچھ ڈر نہیں مگر
اس طرح ہم نہیں دے سکتے مگر جمع ہوتا جائے اور ایک پیسہ
ادا نہیں ہوتا۔

امر سنگھ: میں بہت جلد آپ کا سب حساب بیباقی کر دوں گا۔
لالہ: نہیں بھتیجا اب ہم اُدھار نہیں دینگے۔

امر سنگھ: لالہ جی آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ
ہمارا روپیہ و دروپیہ کا اعتبار نہیں کر سکتے۔

لالہ: اچھا تو کب بھگتان کر دے۔
امر سنگھ: پسلی تاریخ کو۔

لالہ: تنہا کسے کہنے سے آج دے دیتا ہوں مگر پہلی تاریخ
کو ضرور حساب صاف کر دینا۔

امر سنگھ: ضرور۔
لالہ چاول اور دال تول کر امر سنگھ کے حوالہ کرتا ہے
امر سنگھ ٹھہرتا ہے۔

امر سنگھ: (ماں سے) پتا جی کہاں گئے؟
ماں: میں تم سے کہنا بھول گئی تھی کہ نک بھی نہیں رہا،
جب تم چلے گئے تو یاد آیا۔ میں نے انہیں ایک پیسہ دیا کہ
نک لے آؤ۔ آئے ہی ہو گئے۔

امر سنگھ کا باپ سرٹک پر چلا جا رہا ہے۔ دور رہا آتا
ہے سامنے سے ایک موٹر آ رہی ہے۔ موٹر والا شاید نشہ میں
ہے ہارن دے بغیر ایک موٹر موڑ دیتا ہے۔ بڑھا موٹر
سے ٹکرا کر گرتا ہے، موٹر اس کے اوپر سے گزر جاتی ہے
اور وہ فوراً گر جاتا ہے، مجمع ہو جاتا ہے، لاش خون میں
تر بتر پڑی ہے۔ اسٹے میں امر سنگھ بھی آہو پچھتا ہے اور
باپ کی لاش دیکھ کر چیخ مار کر اُسے پٹ جاتا ہے۔ کچھ فاصلے
پر ایک سپاہی ڈیوٹی پر کھڑا ہے۔ ہنگامہ دیکھ کر وہ بھی

اپنا سر پکڑ کر صوفے پر گر پڑتی ہو اور گزشتہ واقعات گنتی ہے۔

(گڈری ہوئی باتیں۔ عالم خیال میں)

پریم اپنے کمرہ میں ڈریسنگ کون پہنے کوچ پر اخبار دیکھ رہا ہے۔ روپ کماری چپکے سے داخل ہوتی پریم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے پریم آہستہ روپ کماری کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر اپنے پر رکھ لیٹتا ہے۔ پھر اس طرح کھینچتا ہے کہ روپ کماری کال اس کے کال سے چھو جاتا ہے، پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پریم سنک۔ روپو!

روپ کماری۔ پریم۔

اس کے بعد دونوں ہم خوش ہو جاتے ہیں اور بوس ہوتے ہیں۔

پریم سنک۔ کیوں روپ کیا تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چاہو روپ کماری۔ زندگی کی آخری سانسوں تک پریم دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے۔ دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ پریم سنک۔ کن؟

آواز۔ کپور۔

پریم سنک۔ (Come here) کم این۔

اس کے بعد پریم سے۔ کپور اندر داخل ہوتا ہے۔ دونوں سے نمٹنا کر کر

کپور۔ (واہ جناب۔ ابھی تک آپ ڈریسنگ کون آ گھڑی دیکھ کر) آٹھ بجے دس منٹ آئے ہیں سائڈ بچے بیچ شروع ہو جائیگا۔

پریم سنک۔ میں ابھی دس منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں

کمل ہو گیا تو بڑے مفردانہ انداز سے ڈاکٹر ٹنڈن کے کمرہ میں آتی ہوا ایک ہاتھ میں خوبصورت بیگ اور دوسرے میں چھتری ہے۔ گویا کہیں پہلنے کی تیاری ہو۔ ڈاکٹر ٹنڈن متوجہ نہیں ہوتا۔ چہرہ پر مصنوعی غصہ کے آثار ہیں۔ تھوڑا سا پہلنے کے بعد۔ ڈاکٹر ٹنڈن۔ روپو۔ اس باجی کینہ کی بابت میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

روپ کماری۔ (متکبرانہ) کون باجی کینہ؟

ٹنڈن۔ کون باجی کینہ؟ وہی جرات دے گئے (اور تمہیں ذیل درمرو کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہو۔ اور زیادہ صاف صاف کہوں؟ وہی تمہارا پرانا چیتا۔ اب بھی ہیں؟

روپ کماری۔ (دہانت سخت ہوئی) ذرا اپنے ہوش میں بیٹے شریفوں کی طرح بات کیجئے۔ کیا اس شخص کا نام نہیں ہے؟ ٹنڈن۔ (رجو اس نشا میں کتنی پریشہ جاتا ہو۔ کتنی کڑی گتے گھسیٹ کر) کیسی بھولی ہوا ابھی تک نہیں سمجھیں! اس کا نام ہے پریم سنک۔ اب سمجھ میں آیا۔ شرم تو نہ آئی ہوگی؟

روپ کماری۔ اس گفت گو سے سخت براگندہ ہو کر بالوجی آپ انسانیت سے ہات کریں تو میں جواب دوں۔ آخر اس بدذات نے کیا کیا۔

ٹنڈن۔ (دو جہا ہو کر) اس نے تم پر، دورگی کی تہمت لگائی ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس کے پاس تمہارے ہاتھ کی کوئی تحریر سند ہے جس سے وہ اس الزام کو ثابت کر سکے۔

روپ کماری۔ (دو ہاتھوں کی طرح اپنی جگہ سے تڑپ کر) سند میرے ہاتھ کی تحریر سند! ہرگز نہیں۔ میری کوئی تحریر کسی کے پاس نہیں۔ جو کہتا ہے وہ جھوٹا ہے اور جو نہیں کرتا ہے وہ احمق ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن روپ کماری کی پرانگی اور اضطراب دیکھ کر کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ روپ کماری دونوں ہاتھوں سے

(روپ کماری ایک جھجھری بستی)

~~~~~

گڈری ہوئی باتیں۔ عالم خیال میں

روپ کماری کا مکان۔ روپ کماری پر تکلف لباس

پہنے پیا نو سجاہی ہو، کپور سن رہا ہو۔ جب وہ ختم کرتی ہو تو کہتا ہے۔

کپور۔ اچھا روپ اب چلتا ہوں۔

روپ کماری۔ اچھا۔ پیا نو چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور

دونوں ہم آغوش و لب بوس ہوتے ہیں۔ یکایک پریم سنگہ

داخل ہوتا ہے اور انہیں اس حال میں دیکھتا ہے۔ پریم سنگہ

کو دیکھ کر دونوں گھبرا جاتے ہیں۔

پریم سنگہ۔ (ظن اور غفٹہ سے) معاف کرنا۔ مجھے معلوم

نہ تھا کہ یہ کہہ کر فوراً واپس ہوتا ہے۔ روپ اچانک پریم!

کہہ کر اس کے پیچھے پلکتی ہے اور دروازہ تک جانے جاتے

اُسے پکارتی ہے۔ پریم سنگہ کچھ کہے بغیر روپ کماری کو

دھکا دیکر اچانک دامن چھڑا کر چل دیتا ہے۔

~~~~~

روپ کماری ایک جھجھری بستی

~~~~~

گڈری ہوئی باتیں۔ عالم خیال میں

(Charity (Variety Show for Hospit

اسٹیج پر ایک وچرن رقاصوں کا پنج ختم ہوتا ہے۔

لیلیاں جتنی ہیں پردہ کرتا ہی۔ ایک شخص سائڈ میں سے نکل کر

تتا ہے (اس کے ہاتھ میں پروگرام ہے)

صاحبان! ہمیں افسوس ہے کہ ماسٹر ہیڈے باؤنچکا

گرام میں چھٹا نمبر ہے (پروگرام دیکھتے ہوئے) یکایک

تحت خراب ہوجانے کی وجہ سے نہ کہے۔ اس نے سب پروگرام

کا ساواں نمبر شروع ہوگا اور مس روپ کماری اپنا جواب

گنا سنا کر اپنے اپنے کمال کی داد دیں گی۔

پردہ اٹھنا ہی۔ روپ کماری بڑے ناز و انداز سے سامنے

آتی ہیں۔ تالیوں کے شور سے اُنکا استقبال ہوتا ہی گڑسی پر

بٹھکر ہارمونیم بجا کر جو برابر ہی میز پر رکھا ہوا ہے، یہ

گنا گاتی ہیں۔

اک پیاری صورت پدل کی جویا ہے

سینہ کے اندر یہ محشر ہرپا ہے

کالی کالی دست گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں

دست کی بھولی پسری باتیں پھر یاد دلاتی ہیں

آموں کے نیچے پد جھولا ڈالا تھا

مستی چھاتی تھی پدل متوالا تھا

پینگ بڑھائے جاتے تھے آواز ملا کر گاتے تھے

جب آنکھیں مل جاتی تھیں شرما کر چپ ہوجاتے تھے

پھر طوفان اٹھتا پد دونوں کے من میں

بڑھ کر پڑ جاتیں پد یا نہیں گردن میں

گائے دوران میں ڈاکٹر ٹنڈن اور اس کا ایک دوست

جس نے ابھی اعلان کیا تھا ایک طرف کنا سے پرہیز ہونے

ہیں۔

ٹنڈن۔ شنکر! یاد کیا غضب کا گلاب۔

شنکر۔ اور صورت۔

ٹنڈن۔ اوہ۔ صورت تو قیامت ہو۔

شنکر۔ بدن کس قدر خوبصورت ہو۔

ٹنڈن۔ تصویر پر تصویر۔

شنکر۔ آنکھیں کتنی حسین ہیں۔

ٹنڈن۔ اوہ، جادو ہیں، جادو، شنکر! یا میرا تو دل اختیار

ہوا جاتا ہے۔

(روپ کماری ایک جھجھری لیتی ہو)

گڈری ہوتی باتیں۔ عالم خیال میں

روپ کماری پریم کو خط لکھتی ہو۔

”پریم میرے پیارے۔ الفاظ نہیں ملے جوانی شرمندگی اور بے قراری کا اظہار کر سکوں۔ ایسور کی بھی گتھ گاروڑ تہااری بھی۔ مکر میری حالت رحم کے قابل ہو میں نے ڈاکٹر ٹنڈن سے شادی کر کے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ خدائے واسطے میری خطاوں کو معاف کر دو۔ قسم کھا کر کہتی ہوں پریم۔ رات دن تہااری یاد کے سوا اب مجھے اور کوئی کام نہیں۔ کل رات کو میں آگیلی ہوئی۔ تمہارا انتظار کروں گی۔ دیکھو اگر نہ آئے تو یاد رکھنا میرا خون تمہاری گروں پر ہو گا۔“

تمہاری بچان۔ روپ،

راہ اس پریم کا خط لا کر دیتا ہو، روپ کھو لکھ دیتی ہو۔

سمن ٹنڈن آپ کا خط ملا۔ افسوس، یہ کہ میں حاضر نہیں ہو سکتا میں نہیں جانتا کہ ہمارے درمیان کسی قسم کا بھی کوئی تعلق باقی ہے۔ جہاں باقی نہ رہا کرتا تہا میرے خط لکھنے کی تکلیف نہ کیجئے۔ اگر آپ نے اس کے خلاف کیا تو میں یہ خط ڈاکٹر ٹنڈن کو دکھا دوں گا۔ فقط۔

پریم سنگھ

(روپ کماری ایک جھجھری لیتی ہو)

گڈری ہوتی باتیں۔ عالم خیال میں

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اودھ ڈاکٹر رستوگی (ایک نوجوان)

اس کے بعد دونوں کچھ کا نا پھوسی کرتے ہیں۔

سمنکر۔ (ایک ایک اندر بلند آواز سے) اچھی بات ہو۔

ٹنڈن پھر اہستہ سے کچھ اٹکے کان میں کہتا ہے۔

سمنکر۔ اچھی بات ہے۔

یہ کہہ کر سمنکر اٹھ جاتا ہو۔ گنا ختم ہوتا ہو۔ تالیوں کا شور۔ روپ کماری سامنے آ کر تیلیم بجالاتی ہو۔ سمنکر اسٹیج پر آ کر اعلان کرتا ہے۔

سمنکر۔ صاحبان۔ مس۔ روپ کماری کے گانے سے خوش ہو کر ہمارے شہر کے مشہور اور ہر دل عزیز ڈاکٹر ٹنڈن صاحب نے ہسپتال کے اس چیرٹی فنڈ میں پانچ سو روپیہ عنایت فرمایا ہے۔

تالیوں کا شور۔ پردہ گر جاتا ہے

## ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

ٹنڈن۔ روپ۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں نے صرف تمہارے حسن و جوانی کی وجہ سے تم سے شادی کی۔ مگر واقعہ یہ ہو کہ میں تمہاری صورت سے زیادہ تمہاری باطنی خوبیوں کا دلدادہ ہوں۔

روپ کماری۔ اور میرے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کی دولت کے لالچ میں آپ سے شادی کی۔ کاش وہ جانتے کہ روپ کماری پیسے کی لوبھی نہیں۔ وہ کمال کی قدردان ہو۔ وہ انسانی خوبیوں کی عاشق ہے۔

ٹنڈن۔ (بے انتہا خوش ہو کر) اصل بات یہ ہو کہ لوگ ہماری خوش قسمتی کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں اور طرح طرح سے دل کے پھوپھوے پھوٹتے ہیں۔ اچھا روپ۔ اب سب بچ رہے ہیں۔ مریض انتظار میں ہوں گے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔

روپ کماری :- رستوگی ! میں ایک بات تم سے پوچھتی ہوں۔  
رستوگی :- پوچھئے۔

روپ کماری :- ڈاکٹر ٹرنڈن تمہارے استاد ہیں نا؟  
رستوگی :- بیشک۔

روپ کماری :- اور میں اُن کی بیوی ہوں؟  
رستوگی :- بیشک۔

روپ کماری :- اور تم نے مجھ سے وہ تعلقات بیدل کے جو  
صرف میاں بیوی کے درمیان ہونے چاہئیں۔ تم نے اپنے  
استاد کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔

رستوگی :- او۔ رو۔ پو۔ مجھے اس طرح ذلیل دیکھو میری رگوں  
میں شریف خون ہی مگر ہاتے تمہاری محبت نے مجھے بالکل  
اندھا کر دیا۔ گناہ کہ اب میں گناہ نہیں سمجھتا۔ رو۔ پو تیرے لئے  
اب اگر مجھے جہنم کے غار میں بھی گودنا پڑے تو میں اس کے  
لئے تیار ہوں۔

روپ کماری :- یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔

رستوگی :- کہنے کی باتیں نہیں۔ روپ مرد جو کہتا ہے وہ  
کرتا بھی ہے۔

روپ کماری :- مگر اس کا کیا ثبوت کہ تمہیں واقعی مجھ سے  
پتی محبت ہے؟

رستوگی :- ثبوت ! ثبوت میں کیا بتاؤں۔ ہاں جس طرح جی  
چاہے آزما کر دیکھ لو۔

روپ کماری :- فرض کرو میں کہوں کہ فلاں شخص کو قتل کر  
ڈالو۔ تو؟

رستوگی :- تو کیا۔ کل ہی اُسکی لاش خون میں لوٹی ہوئی۔

روپ کماری :- (خفارت آمیز ہنسی کے ساتھ) افادہ آپ  
اس قدر بہادر ہیں۔

رستوگی :- بہادر نہیں۔ محبت میں اندھا اور دیوانہ۔

روپ کماری :- اچھا تو سنو۔

(ایک منٹ کا نا پھوسی ہوتی ہے)

رستوگی :- اچھی بات ہے۔ ایشور چاہے تو ایک ہفتہ کے اندر اندر  
میں اُسے دوسری دُنیا میں بھیج دوں گا۔

~~~~~

رات کا وقت ہے۔ پریم اہستہ اہستہ سڑک پر جا رہا ہے۔
ایک گلی آتی ہے۔ گلی کے کنارے ایک شخص سُنہ پر نقاب ڈالے
کھڑا ہے۔ جب پریم سنگھ گلی کے برابر سے گزرتا ہے تو وہ شخص
پچھتے پریم سنگھ پر چھری کا وار کرتا ہے۔ پریم اور کوٹ
پہنچے۔

پریم سنگھ :- آہ مار ڈالا! کہہ کر گزرتا ہے۔ قاتل دوسرا دار کرنا
چاہتا ہے کہ پریم اس پرستولی کا فیر کرتا ہے۔ وہ گولی کھا کر
آہ کر کے دھم سے پچھے کو گزرتا ہے، لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔
پولیس آ جاتی ہے۔

پولیس مین :- ارے! کب تان پریم سنگھ!

ایک شخص :- (قاتل کا نقاب الٹ کر) ارے یہ تو ڈاکٹر
رستوگی ہے۔

~~~~~

روپ کماری ایک جھجھری لیتی ہے۔ پھر نہایت جوش  
میں کھڑی ہو جاتی ہے اور خود بخود کہتی ہے :-

پریم کماری :- اچھا پریم! اگر تجھ سے اپنی رسوائی کا بدلہ نہ  
دیا ہو تو میرا نام روپ کماری نہیں۔

پھر کچھ دیر سوچتی ہے۔ پھر ایک نوکر کو آواز دیتی ہے :-

راہداس ! راہداس !

راہداس حاضر ہوتا ہے۔

روپ کماری :- راہداس ! دیکھو سیکرٹریٹ میں خیرم امکان پر  
جا کر کپتان پریم سنگھ کو دریافت کرنا اور موجود ہوں تو اُن سے

کہنا کہ بانی جی نے آپ کو بلا لیا ہے۔ بہت ضرور کام ہے۔ ایک شخص کی جان کا معاملہ ہے۔ آنے کا وقت پوچھ لینا۔  
راہداس :- بہت اچھا۔

راہداس کو روانہ کر کے روپ کماری خود مکان سے باہر آتی ہے۔ موٹر ڈرائیور کو آواز دیتی ہے :-  
ما دھو! ما دھو! جلد موٹر نکالو۔

ما دھو :- (رو روئی پوش ڈرائیور) بہت اچھا حضور۔  
ما دھو جلد موٹر نکال کر لاتا ہے۔ روپ کماری سوار ہوتی ہے۔  
ما دھو :- کہاں چلے گا حضور۔

روپ کماری :- (کچھ سوچ کر) اچھا اس وقت نہیں کل گیا جاتے گا۔

موٹر سے اتر پڑتی ہے، پھر کہتی ہے :-

”دیکھو ما دھو! باوجودی پچیس نوکھدینا کہ ذرا مارواڑی لائبریری تک گئی ہیں۔ ابھی آتی ہیں!“  
یہ کہہ کر چل دیتی ہے۔ سڑک پر پہنچ کر ٹیکسی والے کو آواز دیتی ہے۔ ٹیکسی!

ٹیکسی میں بیٹھ کر۔ لاکس لین چلو۔

ٹیکسی روانہ ہو جاتی ہے۔ لاکس بین بیوٹیکم روپ کماری اتر پڑتی ہے۔ اور ٹیکسی چلے کر غصت کر کے کچھ دور پیدل چل کر ایک بوڑھے دو فروش کی دکان پر پہنچتی ہے۔

دو فروش :- کیا چاہیے حضور؟

روپ کماری :- (راہداس کو دیکھ کر) اندر چلے تو بتاؤں۔  
دونوں اندر چلے جاتے ہیں۔ اندر پہنچ کر :-

روپ کماری :- میں نے سنا ہے کہ آپ زہر بھی بیچتے ہیں۔  
دو فروش :- جی ہاں، میں ہر قسم کے زہروں کی لینسٹ فراہم کرتا ہوں۔  
روپ کماری :- مجھے ایک نہایت قاتل زہر چاہیے۔

دو فروش :- یہ سب نسخہ لائی ہیں؟

روپ کماری :- نسخہ اسٹو کیا ہے؟

دو فروش :- زہر تو کسی ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر نہیں مل سکتا۔

روپ کماری :- (پریشان ہوتی ہے) پھر کچھ سوچ کر) میں آپ کو منہ مانگی قیمت دوں گی۔

دو فروش :- بانی جی۔ سوال قیمت کا نہیں، قانون ہے۔

روپ کماری :- میں عمر بھر آپ کی احسانمند رہوں گی۔

دو فروش :- (کچھ سوچ کر) آپ تو بہت مجبور کرتی ہیں۔

روپ کماری :- آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔

دو فروش :- اچھا ایک ڈرام زہر کی قیمت آپ کیا دینی ہے؟

روپ کماری :- جو آپ چاہیں۔

دو فروش :- ڈھائی سو روپے۔

روپ کماری :- (متحیرانہ) ڈھائی سو روپے! ایک ڈرام زہر کی قیمت ڈھائی سو روپے!

دو فروش :- جی ہاں ڈھائی سو روپے۔ آپ کے خیال میں ایک

انسان کی جان کی قیمت ڈھائی سو روپے بہت زیادہ ہے؟

روپ کماری :- (کاٹ کر) ہلے کی طرف دیکھتی ہو، مگر میں

تو اتنا دہیہ ساتھ نہیں لاتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس

کل نٹو روپے ہیں مگر آپ کے اطمینان کے لئے میں اپنا ہار

آپ کے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔ کل روپیہ بچاؤ دینی اور ہار منگنا

لوں گی۔

ہار اتار کر بڈھے کے حوالے کرتی ہے۔ بڈھا ہار کو اچھی طرح

جانچتا ہے اس کے بعد :-

دو فروش :- آپ ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں (کہہ جاتا ہے۔

ایک چھوٹی سی سفید شیشی لیکر آتا ہے) بانی جی! یہ نہایت قاتل زہر

ہے پھر خونی یہ کہ نہ اس میں رنگ نہ بو، نہ مزہ۔ ذرا سی ویر میں

کام تمام کر دیتا ہوں۔ بس ایک گوند کافی ہے۔

روپ کماری :- میں آپ کی بدشکر گندہ ہوں شیشی لیکر اپنے بیگ

میں رکھ لیتی، اور سورہ پے کے نوٹ پڑھنے کے حوالہ کرتی پڑھنے کے بعد چلی جاتی ہے۔

دو افروش :- (تنہا میں) جو توف عورت بچے احمق بنانے آتی تھی۔ نہ جانے کس بیگناہ کی جان لیستی۔ خیر ایک ماشہ خالص پانی کی قیمت ڈھائی سو روپیہ کم نہیں۔

## پریم سنگھ کا باغیچہ

پریم سنگھ اور موہن ٹہل رہے ہیں۔

موہن :- یہ کب کی بات ہے؟

پریم سنگھ :- اسی دن شام کو جب تم باغ میں نہیں تھے اسی دن کی بات ہے۔

موہن :- اچھا تو پھر دوسری ملاقات کا وعدہ کیوں نہ لے لیا۔ پریم سنگھ :- حافقت اور کیا۔

موہن :- تعجب ہو کہ تم جیسے استاد سے اور ایسی چوک۔

پریم سنگھ :- ہاں موہن میں اس وقت کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ دوپہر سے قطع تعلق کے بعد کبھی کسی عورت سے مجھے دلچسپی نہیں ہوئی۔ لیکن اس فتنہ کرنے تو کچھ جادو یا

کر دیا۔ موہن میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایسی بھولی اور معصوم صورت ہے کہ بے اختیار دل اس کی طرف کھینچتا ہے۔ اُس دن سے آج تک ایک لمحہ کے لئے وہ تصویر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر خط لاکر دیتا ہے۔ پریم سنگھ اُسے کھول کر پڑھتا ہے اور خوشی سے اُس کا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ پریم سنگھ بھی خط پڑھ رہی رہا ہے کہ موہن کہتا ہے۔

موہن :- موہنی کا خط ہے؟

پریم سنگھ :- آج نہیں۔

موہن :- کیا لکھا ہے؟

پریم سنگھ :- بلایا ہے۔

موہن :- کب؟

پریم سنگھ :- مشکو (خط پڑھتا ہے) پریم سنگھ جی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو میرے کے دن شام کے پانچ بجے تشریف لائیے۔ بہت شکر گزار ہوئی۔

موہنی

پریم سنگھ خط کو مکھڑا ہستہ آہستہ پڑھتا ہے۔ پھر چھٹا ہڑ سو لکھتا ہے۔ (موہن سے) دیکھنا موہن! خط عظمیٰ دو باہر ہو کر

مگر یہ تین دن کیسے کھینچے؟ آج تو مشکل ہے نا؟

موہن :- ہاں مشکل ہے۔ تین دن کہاں۔ بس کل ہی کا دن تو پنجہ میں ہے۔

پریم سنگھ :- پھر تین دن ہو تو آئے۔ آج کل۔ برسوں۔ موہن نہ معلوم مجھے اس دفعہ کیا ہو گیا ہے۔ اس قسم کی بے چینی تو پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

دونوں ٹہلے ہوئے مکان کے اندر چلے جاتے ہیں۔ ملازم اطلاع دیتا ہے کہ ایک شخص کہیں سے آیا ہے۔ ملنا چاہتا ہے۔ پریم سنگھ موہنی کا خط چھپا لیتا ہے اور کہتا ہے :- بلاؤ۔

رامداس داخل ہوتا ہے اور اوپر سے سلام کرتا ہے۔

پریم سنگھ :- کہاں سے آئے ہو؟

رامداس :- حضور ڈاکٹر ٹیڈن صاحب کے یہاں سے آیا ہوں۔ ہائی جی نے حضور کو بلایا ہے اور کہا ہے کہ جس دن حضور کو فرصت ہو تشریف لائیے۔ بہت ضروری کام ہے۔ ایک آدمی

کی جان کا معاملہ ہے؟

پریم سنگھ :- (تیزی چڑھا کر) آخر کام کیا ہے؟

رامداس :- حضور مجھ سے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔

پریم سنگھ سوچنے لگتا ہے۔

موہن :- پریم میرا خیال ہے کہ بات کو بڑھاؤ نہیں۔ ہو ہی آؤ تو اچھا ہے۔ آخر معلوم تو ہو کہ قصہ کیا ہے۔ جنگ سے صلح ہو رہی ہے۔

موٹر کے پاس آکر ہاتھ دکھایا مگر وہ بڑھا شاہد پر اتھا کہ اُس نے ہارن کی آواز نہیں سنی۔ اور شاہد کم سوچ بھی تھا کہ اُس نے موٹر کو آتے ہوئے نہیں دیکھا، آخر موٹر کے نیچے آگیا۔

تیسرا گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ: تم نے کیا دیکھا۔

تیسرا گواہ:۔ حضور اسوقت مٹی موٹریں آتے پیچھے آرہی تھیں۔ ہارن کی آواز میں نے ضرور سنی مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس موٹر نے ہارن دیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ موٹر کے پاس آکر اس موٹر کے بالونے ہاتھ دکھایا۔ لوگ ایک طرف ہو گئے مگر وہ بڑھا بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر موٹر سے ٹکڑ ہوئی اور گر گیا۔

امرسنگ: (پھر ایک بار چلا کر) حضور یہ سب جھوٹ ہے۔ ان سب کو رشوت دیکتی ہے۔ اُس وقت تو یہ سب کہہ رہے تھے کہ بالونے غریب کو مار ڈالا۔ آج کیسے پلٹ گئے۔

مجسٹریٹ: خاموش۔ خاموش۔ فیصلہ پسیر کر سنا یا جاسکا۔ یہ کہہ کر مجسٹریٹ ایک کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ تماشائی بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں مگر جی بھی موجود ہے۔

مگر جی: فیصلہ تو ظاہر ہے۔ غریب کے خون کی قیمت ہی کیا۔

(سب لوگ ہانپناں آتے ہیں۔ امرسنگ کے آنسو جاری ہیں مگر جی امرسنگ کو ایک طرف لیجاتا ہے۔)

مگر جی: مسٹر امرسنگ! مجھے سخت افسوس ہے کہ تمہارے نوٹس باپ کی اس طرح جان گئی۔ امیر دل سے جہاں مقابلہ ہو وہاں انصاف کا کوئی سوال نہیں۔ مگر غریبوں کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔

امرسنگ: (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) نہیں بابو جی غریب کی خدا بھی نہیں سُنتا۔ مگر میں اپنا انصاف آپ کو دکھاؤں گا۔

مگر جی امرسنگ کی پیٹھ تعظیماتا ہے۔ Young man

پہریم سنگھ: ابھی بات ہو۔ (اپنی ڈائری دیکھتا ہے۔ پھر رمداس سے) کہنا کہ سچے سچے دن تیسرے پہر کو چار بجے آؤنگا۔

رمداس کے چالے کے بعد پہریم سنگھ کوچ پر لیٹ جاتا ہے (موہن سے) نہ جانے موہن یہ جڑ پل بجے کس مصیبت میں پھنسا گئے۔

موہن:۔ اے کچھ بھی نہیں میرا تو خیال ہے کہ وہی خطا وہیں ملے گی۔ دسے بھی دو، تمہارے ہے کس کام کا۔

## عدالت کا کمرہ

امرسنگ: مدن مال (میں نے موٹر سے امرسنگ کے باپ کو پھیل ڈالا تھا)۔ سپاہی: تین گواہ، مجسٹریٹ، کورٹ انسپکٹر، مدن کا وکیل اور کچھ تماشائی۔ ایک گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ: تم نے کیا دیکھا۔

گواہ:۔ حضور میں اس وقت دور سے پرستہ گزر رہا تھا۔ موٹر سامنے سے آرہی تھی موٹر نے ہارن دیا اور موٹر کی طرف ہاتھ دکھایا۔ ہم لوگ رگ گئے مگر وہ بڑھا بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر موٹر سے ٹکڑ ہو گئی۔

امرسنگ: (دراچلا کر) ارے اتنا سفید جھوٹ۔ (مجسٹریٹ) حضور اور لوگوں سے ہلچے۔ ساری خطا.....

مجسٹریٹ: خاموش رہو! ہاں پھر کیا ہوا؟ گواہ:۔ بس حضور وہ بڑھا موٹر کے نیچے آگیا اور پل گیا۔ دوسرا گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ: (دوسرا گواہ سے) تم نے کیا دیکھا۔

دوسرا گواہ:۔ حضور میں تو موٹر کو سامنے سے آتے دیکھ کر پہریم سنگھ کی گئی تھا۔ موٹر نے دوڑ رہی تھی ہارن بکا یا اور



یگ میں۔ غصہ سے کام نہیں چلیگا۔ صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ کیا ابھی تک آپ کو کوئی کام نہیں ملا ؟  
امر سنگہ :- نہیں بابو جی۔ اب تک بالکل بیکار رہوں۔  
مکرجی :- مجھے نہایت افسوس ہے۔

امر سنگہ :- کیا کہوں بابو جی! آج کل میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ بوڑھی ماں کا خیال نہ ہوتا تو آج میں بھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتا۔ دھڑا گھوٹوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں، مکرجی :- کاش اس طرح جان دینے کا کچھ حاصل ہوتا۔ آپ کی طرح ہزاروں بے روزگار آپ سے زیادہ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اسوقت ایک مختصر سا کام تو میں آپ کو دلوا سکتا ہوں۔

امر سنگہ :- کیا کام۔

مکرجی :- وہ کام جو ہر شریف انسان کو کرنا چاہیے۔ یعنی دلش کی سیوا۔ مگر ہاں اس میں ذرا خطرہ ہے۔  
امر سنگہ :- میں کسی خطرہ کی پروا نہیں کرتا۔ آخر فائدے کے مرنے سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ دلش کی سیوا میں جان جائے۔

مکرجی :- اچھی بات ہے (اپنا کارڈ دیتے ہوئے) رات کو آٹھ بجے اس پتے پر مجھ کو سیلئے۔ اسوقت تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ (جیب سے روپیہ نکالکر) یہ لیجئے، مین روپے۔ اس سے آپ اپنی اسوقت کی ضرورتیں پوری کیجئے۔  
امر سنگہ بے انتہا خوش ہوتا ہے اور شکر یہ ادا کر کے روپیہ لے لیتا ہے اور دونوں چلے جاتے ہیں۔

## موہنی کا مکان

موہنی سادہ مگر خوبصورت لباس پہنے پریم کی منتظر ہے۔

کبھی گھنٹہ نظر ڈالتی ہے۔ کبھی اپنی دوستی گھڑی دیکھتی ہے۔ میز کے پاس گھڑی ہو کر ایک اخبار کے ورق اُلٹی پلٹی ہے پھر لٹے رکھ دیتی ہے۔ کمرہ میں ٹپٹے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ گنگنائی جاتی ہے۔ پھر گراموفون کھول کر ایک ریکارڈ چڑھا دیتی ہے ایک منٹ قریب کھڑے ہو کر سنتی ہے پھر ٹپٹے لگتی ہے۔ پھر ایک تصویر کے سامنے ہنر کر لے غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ پریم آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ موہنی کی اس طرف پٹھن ہے۔ پریم سنگہ دبے باؤل آتا ہے اور دونوں ہاتھ موہنی کے کاندھوں پر رکھ دیتا ہے۔ موہنی چمک کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔ پھر پریم کو دیکھ کر مسکراتے لگتی ہے۔  
موہنی :- آداب۔

پریم سنگہ :- آداب۔

موہنی :- میں تو ڈر گئی تھی۔

پریم سنگہ :- (مسکراتے ہوئے) آپ کیا بھی تعین ؟  
موہنی :- کچھ بھی نہیں۔

پریم سنگہ :- شاید یہ سبھی ہوں کہ یہ پریم سنگہ بھی کہیں اس روز ٹپٹے ہر دعاگوں کا ساتھی تو نہیں۔

موہنی :- (ہنستے لگتی ہے) تشریف رکھیے رددلوں بیٹھ جاتے ہیں۔

پریم سنگہ :- موہنی دیوی۔ یہ عورت کون سی جو اس روز میرے جاتے وقت یہاں آئی تھی۔

موہنی :- کون چمپا ؟ وہ ڈاکٹر ٹنڈن کے یہاں ملازم ہے۔ اُن کی بیوی نے کسی کام سے میرے پاس بھیجا تھا۔

پریم سنگہ ڈاکٹر ٹنڈن کا نام اور اس کی بیوی کا ذکر سن کر سخت مضطرب ہو جاتا ہے۔ فقط ”اوہ“ اس کے منہ سے نکلتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔

موہنی :- کیوں پریم سنگہ جی۔ آپ پریشان کیوں ہو گئے ؟

پریم۔ کچھ نہیں۔ میں..... میں، کچھ نہیں۔ پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔

موہنی۔ شاید آپ اصلی بات مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ اور پہل مجھے کوئی حق بھی نہیں کہ آپ کا کوئی راز آپ سے پوچھوں۔ پریم سنگھ۔ راز تو کچھ ایسا نہیں۔ مگر سکر آپ کو افسوس ہوگا۔ جو لوگ آپ کے دوست ہیں وہ میرے خون کے پیہتے ہیں۔

موہنی۔ (حیرت سے) کون لوگ؟

پریم سنگھ۔ ڈاکٹر ٹنڈن اور اُن کی بیوی۔

موہنی۔ مگر آپ نے انہیں میرا دوست کیسے سمجھ لیا۔ ڈاکٹر ٹنڈن یوں تو میرے چچا ہیں مگر شاید اُن سے بڑھ کر میرا بدخواہ و دشمنیوں کوئی نہیں۔

پریم۔ (حیرت سے) ڈاکٹر ٹنڈن۔ آپ کے چچا؟

موہنی۔ جی ہاں۔

پریم۔ مگر وہ تو عیسائی ہیں۔

موہنی۔ جی ہاں وہ مشن اسکول اور مشن کالج کی تعلیم کی برکت سے جوانی ہی میں عیسائی ہو گئے تھے۔ سب گنگہ والوں نے انہیں جھوڑا بتا تھا مگر پتا جی آخر دم تک اُن سے ہٹے رہے اور اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ عمر میں وہ پتا جی سے بہت بڑے ہیں میری بدقسمتی کہ مرتے وقت پتا جی انہیں کو میرا سرپرست مقرر کر گئے۔

پریم سنگھ۔ موہنی دیوی! یہ شخص ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑا ہے اور اس کی بیوی نے بھی اپنے ایک بیہودہ خط کی خاطر مجھے قتل کرانے کی کوشش کی تھی مگر پرمانے بال بال بچا دیا۔

موہنی (بہت متاثر ہو کر) پریم سنگھ جی۔ مجھ پر کئی انہوں نے پتا جی کے مرنے کے بعد بڑے بڑے ستم توڑے ہیں کئی دفعہ

مجھے جینے کی تدبیریں کر چکے ہیں۔

پریم سنگھ۔ ادھ! ایسی بے غرقی!

موہنی۔ غیرت کا وہاں سوال ہی نہیں۔

(چائے آتی ہے۔ دونوں پیتے جاتے ہیں اور باتیں کرتے جاتے ہیں۔)

پریم سنگھ۔ اب مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر چپا کے ذریعہ سے ڈاکٹر ٹنڈن کو میرے یہاں آنے کا حال معلوم ہو گیا تو شاید پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔

موہنی۔ نہیں۔ اس کا آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ چپا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں نے پہلے ہی احتیاط اس کو منع کر دیا ہے کہ آپ کے یہاں آنے کا حال کسی کو معلوم نہ ہو ورنہ کسی کو نہیں بتائیگی۔

پریم سنگھ۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا اُس باغ لے

بالو کا تو کچھ پتہ نہیں چلا۔

موہنی۔ پرسوں میں ٹہلنے لگی تھی تو باغ میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت معذرت کرنے لگا کہ میرا اس واقعہ سے اور اُن لوگوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ میں تو آپ کا خیر خواہ ہوں۔ اور آج سے نہیں۔ کئی چھینے سے۔ جبے پہلی مرتبہ آپ کو باغ میں دیکھا تھا۔

پریم سنگھ۔ اُس کا نام کیل ہے۔

موہنی۔ مگر جی اپنا نام بتایا تھا۔

پریم سنگھ۔ کرتا کیا ہے؟

موہنی۔ کچھ معلوم نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔

پریم سنگھ۔ پھر آپ نے کیا کہا؟

موہنی۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے آپ ہمدردی کر کے تشریف لے جائیے۔ پھر کسی دن کچھ دیر تک بیہودہ

دیکھتے ہیں۔ موہنی شرمہا کرنا نہیں سہی کر لیتی ہو۔  
پریم سنگھ :- ”اچھا آداب“ کہہ کر روانہ ہو جاتا ہے۔

## مکرجی کی قیام گاہ - چھ بجے شام کا وقت

مختصر مکان۔ تھوڑا سا سامان، مگر ہر چیز نہایت صاف  
سُتھری۔ مکرجی کمرہ میں کھڑکی کے برابر نہایت خوش و خرم آرام  
کر سی پر میٹھا اخبار دیکھ رہا ہو۔ ڈاکٹر ٹنڈن داخل ہوتا تو۔  
مکرجی نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کرتا ہے اور بڑے  
احترام سے بٹھاتا ہے۔  
ڈاکٹر ٹنڈن :- ”سُکھا کر“ مکرجی آج تو آپ بہت خوش نظر  
آتے ہیں۔

مکرجی :- ”آپ کا خیال صحیح ہو۔ واقعی آج میں بے انتہا خوش  
ہوں۔ اور آپ کو بھی یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ دس بلک گیا  
بے روزگار نوجوان گریجویٹ اور ہمارے دلش سپوک منڈل  
میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (حیرت اور سرت سے) واقعی؟

مکرجی :- واقعی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- خدا جائے آپ کیا جادو کرتے ہیں کہ اچھے  
اچھے تعلیم یافتہ لوگ آپ کی باتوں میں آجاتے ہیں اور آپ کے  
کہنے سے بڑے بڑے خطرناک کام کر دیتے ہیں۔ اچھا ان  
لوگوں کو کیا سبق پڑ پایا۔

مکرجی :- وہی پرانا سبق کہ تمہاری غلطی اوپرے روزگاری  
کے ذمہ دار دولت مند لوگ ہیں۔ ملک کی غلامی کا سبب صرف  
مالدار ہیں۔ ان کا خاتمہ ہو جائے تو کل ملک آزاد ہو جائے  
اور یہ ساری بلائیں ایک منٹ میں کا فور ہو جائیں۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اور صوبہ لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا؟

باتیں بکنا ہی رہا۔ میں اٹھ کر چلی آئی۔

پریم سنگھ :- دراصل ایسی ہمارا ملک اس قابل نہیں کہ جوان  
لڑکیاں تنہا سیر و تفریح کے لئے باہر جائیں۔ ہم لوگوں کے خلاف  
جیسے ہیں ظاہر ہے۔ آئندہ آپ کو احتیاط کی ضرورت ہو۔ اگر اب  
کہیں ملاقات ہو اور وہ آپ کے کچھ کہے تو فوراً پولیس کو بلا کر  
اس بد معاش کو گرفتار کر دینا۔ مجھے افسوس ہو کہ اس دن  
مجھ سے بڑی چوک ہوئی۔

موہنی :- پریم سنگھ جی۔ میں آپ کی مہربانی اور ہمدردی کا  
شکر یہ ادا نہیں کر سکتی۔ جس دن سے آپ کے ملاقات ہوئی  
ہو میرے دل کو بڑی ڈھارس ہو گئی ہو اور آج تو مجھ ایسا  
محسوس ہو رہا ہو کہ..... (یہ کہتے ہوئے بڑی محبت سے  
پریم سنگھ کی طرف دیکھتی ہو۔ پریم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں  
لے لیتا ہو)

پریم سنگھ :- (آنکھیں ملا کر) کیسا محسوس ہو رہا ہے؟

موہنی :- (سر جھکا کر) نہ جانے میں کیا کہہ رہی تھی۔

پریم سنگھ موہنی کے ہاتھ سے کھیلتا ہو۔ موہنی سر جھکا  
خاموش ہے۔

پریم سنگھ :- اچھا اب اجازت ہے؟

موہنی :- اتنی جلدی!

پریم سنگھ :- کچھ ضروری کام ہو۔

موہنی :- بہت اچھا۔ (دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

موہنی :- اب کب ملاقات ہوگی؟

پریم سنگھ :- بہت جلد۔ اب میں آپ کے خط کا انتظار نہیں  
کر دوں گا۔

موہنی :- شکریہ۔

پریم موہنی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا  
پھر دونوں ایک دوسرے کو نہایت پر شوق نگاہوں سے

دیگئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اس پر خاص طور پر زور دیا کہ یہ سینکڑوں ہزاروں مفت کے دھرم شالے، مسافر خانے اور آسٹھم کون چلا رہا ہے!

مکرجی :- ارے آج ہم مفلس نہ ہوتے تو ہمیں ان خیرات خانوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- پھر انہوں نے کہا کہ ملک میں صنعت و خف کی جو کچھ بھی ترقی ہے یہ کس کے دم سے ہوئی ہے بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں جن کے ذریعہ سے لاکھوں مزدوروں اور غریبوں کا پیٹ پلٹا ہو کس کی بدولت قائم ہیں؟

مکرجی :- یہ کارخانے ہی تو لعنت ہیں جنہوں نے ہندوستان کی ساری دستگاریاں اور صنعتوں کو تباہ کر دیا (طنز پر) اور ان سے غریبوں کا پیٹ پلٹا ہے؟ غریب اور مزدور نہ ہوں تو یہ کارخانے چل بھی سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ٹنڈن :- آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ دو تین دنوں نے کسی کا کچھ جعین تو نہیں لیا۔ اپنی لیاقت اور محنت سے دولت پیدا کی ہے، نالائقوں اور کاہلوں کو حسد ہو تو ہے۔

مکرجی :- کیا کہنے تمہاری لیاقت کے۔ ڈاکٹر صاحب آپ یقین کیجئے کہ اس قسم کی تقریروں سے ہماری تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ لوگ مرض کا سبب جانے بغیر

مرض کا علاج چاہتے ہیں۔ جب تک بے روزگاری کے دور کرنے کی سیل نہ نکلے گی ہماری تحریک فنا نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ ہزاروں اسکول اور کالج موجود ہیں اور

ان میں ہی کلرک بنانے والی تعلیم جاری ہے بے روزگاری روز بروز بڑھتی ہی جائیگی۔ ڈاکٹر صاحب بھوک بھری چہرہ ہے۔ یہی اسکول اور کالج کے لڑکے، یہی تمہارے بے روزگار گریجویٹ بیٹ کی خاطر ڈاکو اور خونخوار بن جائیں گے۔ دو تین دن

مکرجی :- تسلیم کیجئے نہ کرتے۔ بات ہی معقول ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- لیکن بڑے زور شور سے آپ کی تحریک کی نفی شروع ہو گئی ہے۔ کل وکٹوریہ پارک میں جلسہ تھا بابو! چنڈ نے بڑی دھواں دھارت تقریر کی اور لوگوں کو بتایا کہ لدار کا اور دو تین دنوں کے خلاف جو غریب مزدوروں اور کسانوں کو ابھارا جا رہا ہے یہ محض خود غرض لوگوں کی چالیں ہیں جو وہ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے چل رہے ہیں۔

مکرجی :- خراس کی کوئی دلیل بھی دی یا بسروں ہی؟ ڈاکٹر ٹنڈن :- ایک دلیل کیا بہت سی دلیلیں دیں انہوں نے کہا کہ اس وقت جو کچھ بھی غریبوں کے فائدہ کا کام ہو رہا ہو وہ سب میروں ہی کے دم سے ہو۔

مکرجی :- (حقارت سے) ہونہ۔ غریبوں کے فائدہ کا کام دغا باز مکار کہیں گے۔ ان بے ایمانوں کو ایسی باتیں کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔ اور کیا کہا!

ڈاکٹر ٹنڈن :- کہا کہ آخر یہ سینکڑوں پبلک ہسپتال قیمتی خانے، محتاج خانے کس کے روپے سے چل رہے ہیں۔ یہ ہزاروں اسکول سینکڑوں کالج اور کستہری، یونیورسٹیاں جنہیں سرکار سے برائے نام مدد ملتی ہے اور جنہیں کروڑوں روپیہ سالانہ کا خرچ ہے کس طرح قائم ہیں۔

مکرجی :- مکرجی پوچھتا ہوں کہ یہ اسکول اور کالج آخر ہیں کس مرض کی دوا۔ کلرک بنانے کی فیکٹریاں ہیں جو انسانوں کو اپنا بچ کر کے بے روزگاری پھیلارہی ہیں۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- انہوں نے کہا کہ ملک کی بڑی بڑی انڈسٹری اور سوشل تحریکیں کیلئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟

مکرجی :- یہ سب تحریکیں مالداروں کی جپٹیں مضبوط کرنے کیلئے چلائی جاتی ہیں۔ دو تین دن کیلئے روپیہ کیوں نہ

آہی یہ عیاراں نہیں چلیں گی۔ مہربانی کر کے آپ میرے کاغذات واپس کر دیجئے۔

مکرجی :- (ہنکرت) کاغذات تو اب واپس نہیں مل سکتے۔ ڈاکٹر ٹنڈن :- (غصہ میں کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے) کاغذات نہیں مل سکتے! (جیب سے پستول نکال کر) کاغذ تو میں آپ کے اسی لیے لوں گا۔ ابھی آپ ڈاکٹر ٹنڈن سے واقف نہیں ہیں اگر مجھے تنگ کیا تو ابھی سازش کا سارا کچا کھول دے گا۔ ابھی جناب بڑے گھر میں تشریف رکھتے ہوئے۔

مکرجی :- (رہنایت اطمینان کے ساتھ) ڈاکٹر صاحب! تین دن ہو گئے۔ یہ گیدڑ بھکیاں کسی اور کو دکھائے گا۔ پولیس کو اگر خبر ہو گئی تو مجھ سے پہلے آپ جہنم واصل ہو گئے۔ میں دوسری حکومتوں کا باضابطہ ایجنٹ اور جاسوس سہی مکرجی کا کام تو سب آپ ہی کرتے رہے ہیں ہسٹن کے متعلق رپورٹیں تو سب آپ ہی تیار کر کے ہاوسر بھجواتی ہیں۔ روپیہ تو اکثر آپ ہی کی معرفت تقسیم ہوا ہے جس کی رسیدیں میرے پاس موجود ہیں، ہلکے دیش سیدو مکندل کے بعض جیلے بھی تو آپ کے مکان پر ہوئے ہیں۔ میں چھنسا تو آپ ضرور پچ جائینگے۔ یاد رکھئے میرے لئے تو بچت کے اور بھی کئی رستے ہیں مگر آپ یقیناً گتے کی موت مانے جائینگے۔ آیا خیال شریف میں؟

ڈاکٹر ٹنڈن مغلوب ہو کر دیکھا ہو جاتا ہے اور رہنایت پریشانی اور عاجزی کے بوجھ میں کہتا ہے :-

اچھا پکا وہ ذاتی کام کیا ہے؟

مکرجی :- پہلے یہ فرمائیے کس موہنی دیوی سے آپ سے کیا رشتہ ہے!

ڈاکٹر ٹنڈن :- وہ میری بہتی ہے۔

مکرجی :- اور آپ کے قانونی سرپرست بھی ہیں؟

کو لٹیں گے اور اپنا پیٹ بھرینگے! انہیں میں سے انارکسٹ اور ٹیرسٹ پہلا ہونگے جو ملک کے امن و امان کو تباہ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- مکرجی آپ نے تو آج میرے بھی ہوش اڑائے۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ جس کے پاس بھی کچھ سرمایہ ہو اسکی جان مال - ہرگز نہیں۔ میں تو خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ

اس موجودہ تعلیم کی اصلاح کی طرف کسی کا خیال نہ جائے۔ ملک کی غلامی کی زنجیریں انہیں بے روزگار کر رکھی ہوں گے ہاتھوں کیٹیگی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اچھا مکرجی اب کچھ کام کی بات کیجئے آج کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کہتے روپیہ بینک سے لے آئے؟ مکرجی :- روپیہ تو میں لے آیا مگر وہ رپورٹ؟ ڈاکٹر ٹنڈن :- (خوش ہو کر کاغذ کا ایک پیکٹ جیب سے نکالتا ہے) رپورٹ یہ موجود ہے۔

مکرجی اسے بڑے شوق سے لیتا ہے۔ کھول کر ایک نظر اس پر ڈالتا ہو اور ہنکرت دوسرے کمرے میں رکھ آتا ہے۔ واپس آ کر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (بے چینی کے ساتھ) اچھا تو اب روپیہ عنایت فرمائیے۔

مکرجی :- (رہنایت نرمی سے) روپیہ موجود ہو مگر.....

ڈاکٹر ٹنڈن :- (رہنایت بے صبری سے) مگر کیا؟ مکرجی :- مگر یہ کہ آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہو گا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کام تو دوسری حکومتوں کا ہے۔ میری ذات کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک ذرا سا کام میرا بھی کر دیجئے تو روپیہ فوراً حاضر ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (رہنایت غضبناک ہو کر) میرے ساتھ

ڈاکٹر ٹنڈن :- ہاں۔

مگر جی :- نہایت خوش ہو کر تب تو کام سہل ہو۔ دراصل میں سوہنی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام کرادیکھئے اور

سات ہزار روپے آپ کے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (قدرے اطمینان کے ساتھ) یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ میں کل ہی سوہنی کو آپ کے حوالہ کر دوں گا لیکن اس رپورٹ کے معاوضہ میں ہمارا آپ کا اقرار تو دو دن ہزار نکاحا۔

مگر جی :- آپ جلدی نہ کیجئے۔ باقی ضروری کاغذات بھی لے آئیے اور وہ تین ہزار بھی لے لیجئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (چھی بات ہے۔ میں ابھی سوہنی کے یہاں جاتا ہوں۔

مگر جی :- ہاں، ایک بات میں آپ کو کہنا بھول گیا۔ سوہنی سے میں کئی مرتبہ مل چکا ہوں۔ مگر کبھی اس نے مجھے لکھا مطلب کا موقع نہیں دیا اور نہایت بد اخلاقی سے پیش آئی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں اسے ٹھیک کر لوں گا۔ (فوراً چلا جاتا ہے)

اس کے جلیقے بعد مگر جی پلنگ پر لیٹ جاتا ہے سوہنی کی تصویر پر نکال کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے :-

”کیا پیاری صورت ہے“

## ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کمار کی بناؤ سنگھار کے بہترین لباس اور زیور پہنے پریم سنگھ کی منتظر ہے۔ چپا کو آواز دیتی ہے۔

روپ کمار :- چپا !

چپا آئی ہے۔

روپ کمار کی ہر کچھ دیر سوچتی ہو پھر سر اٹھا کر (چپا ! یہ صاحب جو ہمارے یہاں چائے پر آ رہے ہیں یہ بہت تیز چائے پیتے ہیں۔ چپا :- تو میں بہت تیز چائے بنا لوں گی۔

روپ کمار :- نہیں۔ اسکی ایک اور صورت ہو۔ ولایت ٹالوں نے چائے کا ایک جوہر نکال لیا ہے۔ پیالی میں ایک بوند ڈال دینے سے چائے نہایت تیز اور خوش مزہ ہو جاتا ہے مگر جو لوگ اس کے عادی نہیں وہ نہیں پی سکتے۔ میں نے تو ایک دفعہ انہیں کے یہاں پی تھی تو چکر اُٹیا تھا اور غشی کی سی حالت ہو گئی تھی۔

(یہ کہتے ہوئے میز پر سے ایک صندوق اٹھا کر کھولتی ہے اور زہر کی سفید شیشی نکال کر چپا کو دیتی ہے) دیکھو ! اس میں سے ایک بوند لکھی پیالی میں ڈال دینا۔

چپا :- بہت اچھا۔

روپ کمار :- چپا ! طح خیال رکھنا میری پیالی میں ہرگز نہ ڈالنا۔ دیکھ بھول نہ جانا، کبھی ایسا نہ ہو کہ ان کی پیالی میں بھی نہ ڈالے۔

چپا :- کہتے تو میں شیشی خود انہیں کو دیدوں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خود ڈال لیتے۔

روپ کمار :- (جھلا کر) تو کو کبھی کی ہیں کہتی ہوں انہیں معلوم نہیں ہونا چاہئے، تو کہتی ہے شیشی انہیں کو دیدوں۔ چپا :- (ڈر کر) اب سمجھ گئی۔ معاف کر دیجئے۔ پہلے میں سمجھی نہیں تھی۔ آپ اطمینان رکھیے۔ جیسا آپ نے حکم دیا ہو ویسا ہی ہو گا۔

(چپا جاتی ہو۔ روپ کمار کی اسے پھر بھارتی ہے اور کہتی ہے)

روپ کمار :- چپا ! میرے خیال میں یہ بہتر ہو گا کہ یہ چپا دودھ میں ڈال دینا۔ ممکن ہو کہ نہ بنائی چائے آئے تو وہ سمجھ جائیں۔ سمجھ گئے تو پھر ٹھٹھ ہی کیا رہے گا۔

چمپا بہت اچھا۔ (جاتی ہے)

کو نہیں بھولے۔ ابھی تک تمہارے سینے میں انتقام کی آگ  
بھڑک رہی ہو۔

پریم سنگھ :- (روپ کماری کی طرف دیکھ کر) روپ۔ انشور  
جانتا ہے کہ انتقام کا تو میرے دل میں وہم و گمان بھی  
نہیں۔ ہاں.....

روپ کماری :- (بات کاٹ کے) اگر تمہارے دل میں  
انتقام کا خیال نہیں تو پھر میرا وہ خط جو میں نے تمہاری  
محبت سے مجبور ہو کر تمہیں لکھ دیا تھا کا پے کو اپنے  
پاس رکھ چھوڑا ہے۔ مجھے واپس کیوں نہیں دیدیتے؟  
پریم سنگھ :- (متاثر ہو کر) روپ تو یقین رکھو کہ اس خط  
سے ہرگز تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچے گا اور میں تم سے  
وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے نقصان پہونچانے کی  
کوئی کوشش نہ کی تو میں ہرگز وہ خط کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔  
اب میرا دل تم سے بالکل صاف ہے۔

روپ کماری پریم سنگھ کی باتوں سے بالکل مطمئن نہیں  
ہوتی۔ گھنٹی بجاتی ہے۔ چمپا آتی ہو۔ روپ اشک سے کہتی  
ہے کہ چائے لاؤ۔

روپ کماری :- پریم میں تمہاری بھڑک کر گذارہوں۔ اب  
تم وہ خط مجھے دو یا نہ دو، مجھے بالکل اطمینان ہو گیا۔ تم  
یقین رکھو! میں آئندہ ہرگز تمہیں نقصان پہونچانے کی  
کوشش نہ کروں گی۔

پریم سنگھ :- (آنکھیں ملا کر) اچھا روپ اگر ابھی تمہارا خط  
واپس دیدوں تو کیا قسم کھا کے وعدہ کرو گی کہ پھر مجھ سے  
کوئی سرکار نہ رکھو گی۔

روپ کماری :- (دہائیت عاجزی سے) جیسی چاہے قسم  
لے لو۔ پریم! یہ دھماکی قسم۔ اچی عزت کی قسم۔

پریم سنگھ کا دل بہت نرم ہو جاتا ہو۔ اپنے کوٹ کی

گھنٹہ چار بجاتا ہے۔ رام داس پریم سنگھ کے آنے  
کی خبر دیتا ہو۔ روپ دروازہ تک جا کر پریم سنگھ کو لیکر آتی  
ہے۔ پریم سنگھ روپ کماری سے ہٹ کر بیٹھتا ہو۔ وہ فوجی  
دردی پہنے ہوئے ہو۔ جیب میں پستول، اور کمر میں تلوار  
لگی ہے۔ چہرہ پر پریشانی کے آثار ہیں اور اُدھر اُدھر  
دیکھتا ہے۔

روپ کماری :- (مسکرا کر) سرکار نے یہ ہتھیار کیوں بے  
ہیں۔ خدا خواست کسی دشمن سے لڑنے جانا ہے؟  
پریم سنگھ :- (متانت سے) نہیں، یہاں سے مجھے پرید  
پر جانا ہے۔ اچھا فرمائیے کیا حکم ہے!

روپ کماری :- (دہائیت دلرباانہ انداز سے) حکم تو نہیں  
ایک التجا ہے۔ پریم تمہیں یقین تو کیوں آنے لگا کہ بد نصیب  
روپ تمہاری محبت کو آج بھی نہیں بھولی۔ میں جانتی ہوں  
کہ خدا نے تمہیں بہت شریف اور فیاض دل دیا ہے اور  
مجھے امید ہے کہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے مجھ سے  
جو قصور ہوتے تھے انہیں ضرور بھول گئے ہوتے۔

پریم سنگھ :- (اپنی تلوار سے کھیلے ہوئے) روپ! کیا  
تم سمجھتی ہو کہ جو کچھ تم نے کیا اُسے بھلا دینا ممکن ہے! ایک  
بیگناہ جس نے محبت کے سوا اور کوئی جرم تمہارا نہیں  
کیا تم اُس کے قتل کے ورپے ہوئیں۔ شاید تمہارے یہاں  
کایا ہی قانون ہے کہ پہلے ایک شخص سے محبت کرنا۔ پھر اس کا  
خاتمہ کر کے دوسرے سے دل لگا لینا۔ آہ روپ تو تم نے  
میرے کلیں میں جو نا سورا دل دے دیں انہیں میں کس طرح  
بھولی سکتا ہوں۔

روپ کماری :- (رحمت غمزدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے  
اپنا سر کھپکتی ہے) ہاتے پریم۔ ابھی تک تم پرانی باتوں

کہا کہ ایسے شریف اور بہادر جوان کی جان لینا ہمارا پاپ ہے۔ میں اس میں ہرگز شریک نہیں ہو سکتی۔

پریم سنگھ کو چمپا کی سچائی کا یقین ہو جاتا ہے۔ پیشی اُس کے ہاتھ سے لیکر دیکھتا ہے۔ اس پر زہر لگھاتا ہے۔ پڑھکر تھرا جاتا ہے۔ پھر چمپا میں ہاتھ ڈالکر کچھ روپے نکال کر چمپا کو دیتا ہے اور کہتا ہے۔

”بھگوان تمہیں اس نیکی کا بدلہ دیکھا“ یہ کہہ کے چلتا ہے مگر دفعۃً اُس کا خون جوش میں آتا ہے اور دیوانوں کی طرح روپ کماری کے کمرہ کی طرف پلٹتا ہے۔ چمپا سدا راہ ہوتی ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے۔

چمپا ابا بوجی، میرے اُپر رحم کیجئے! میں تباہ ہو جاؤ گی۔ پریم سنگھ۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔

روپ کماری پریم سنگھ کے جانے کے فوراَں بعد اٹھتی ہے۔ خط میز پر سے اٹھاتی ہے۔ غور سے دیکھتی ہے۔ دیاسلائی جلاتی ہے کہ اسے جلا ڈالے۔ یکایک بھاری پاؤں کی دھستک آواز سُنی ہے۔ خط کو لپٹے بلاؤں میں چھپا لیتی ہے۔ پریم سنگھ سخت غضبناک اور بدحواس گر جتا ہوا داخل ہوتا ہے اور تلو اکھینچ کر روپ کماری کی طرف بڑھتا ہے۔ روپ کماری چلاتی ہے۔

آہ۔ پریم۔ اسے تمہیں کیا ہو گیا۔

پریم سنگھ۔ دگر بکرا، غدار، قاتل، خونی۔ تو نے مجھے زہر دیدیا لگا خطا پس کر۔

روپ کماری پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور کہتی ہے۔

تم سے کس نے کہا کہ تمہیں زہر دیا گیا۔

پریم سنگھ یہ کہا کسی نے نہیں۔ میں اپنی حالت سے سمجھ رہا ہوں۔ آہ۔ اسے کلیجہ چھنکا جاتا ہے۔ جلدی کر رہا اب گرتا ہوں اور تجھے بھی ٹھکانے لگاتا ہوں۔

جیب میں ہاتھ ڈالنے خط نکالتا ہے اور روپ کی میز پر رکھ دیتا ہے۔ اسے میں چمپا جانتے لیسکر آتی ہے۔ اُسے دیکھکر روپ سخت مضطرب ہوتی ہے۔ ایک سکنہ کی سی حالت اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ پریم سنگھ کچھ نہیں سمجھتا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ دو بیٹا یوں میں چائے لٹٹا رہا ہے، جب دودھ ڈالنا چاہتا ہے تو روپ کہتی ہے۔

روپ کماری۔ میری بیالی میں دودھ نہ ڈالنا۔ میں بچوں سے سادہ چلتے بیٹی ہوں۔

پریم سنگھ چائے بنا کر بڑے فوق سے پیتا ہے روپ کماری اس تمام وقفہ میں خاموش اور سخت مضطرب رہتی ہے۔ چائے پینے کے بعد۔

پریم سنگھ۔ روپو۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت تمہاری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت آرام کرو۔ اچھا پھر کسی دن ملاقات ہوگی روپ کماری کی حالت اور بھی خراب ہو جاتی ہے۔

روپ کماری۔ ہاں پریم نہ جلے کیوں اس وقت میری طبیعت بہت بگڑ رہی ہے۔ معاف کرنا۔

پریم سنگھ۔ آداب۔

روپ کماری۔ آداب۔

پریم سنگھ جاتا ہے۔ روپ کماری اُسی حال میں صوفے پر بڑبڑاتی ہے۔ دروازہ سے نکلتے وقت چمپا پریم سنگھ کو روک کر کہتی ہے۔

چمپا۔ بالو جی! آج میں نے آپکی جان بچالی۔ اور یہ عرق جو ہائی جی نے دیا تھا کہ دودھ میں ڈالوں، میں نے نہیں ڈالا۔

زہر کی شیشی چمپا کے ہاتھ میں ہے۔ پریم سنگھ سخت حیرت اور غور سے چمپا کو دیکھتا ہے۔

چمپا۔ میں اُن کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ میں نے اپنے دل میں



چاہتے در نہ بہت سے کام خراب ہو جائینگے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو منڈل کا سردار مقرر کروایا جائے۔ تاکہ میری غیر حاضری میں سب کاموں کو اپنی ذمہ داری سے انجام دے۔

ایک شخص :- تو پھر جسے آپ پسند کریں مقرر کر دیجئے۔  
مکرجی :- چنانچہ بھروسے اور لیاقت کا سوال ہی میرے نزدیک آپ سب لوگوں کا مرتبہ برابر ہو مکرجی دیش سیوک بننے کے بعد نمبر ۱۱ ایک سو گیارہ نے جو قربانیاں کی ہیں انہیں دیکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ اگر آپ لوگ بھی پسند کریں تو انہیں کا اس مدت کیلئے سردار مقرر کر دیا جائے۔  
سب :- بہن آپ کی بات سے بالکل اتفاق ہے۔

اگر سنگھ :- رکھڑے ہو کر (میں سب بھائیوں کا اور سردار کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزت دی گئی۔

مکرجی :- اچھا یہ مسئلہ تو طے ہوا اب ایک سوال اور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کی ضرورتوں کیلئے ہمارے پاس کافی روپیہ موجود ہے لیکن پھر بھی ہمیں اس طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ آج کل پولیس چونکہ بڑی سرگرمی سے ہماری جماعت کا پتہ لگانے میں مصروف ہے اس لئے کچھ دنوں قتل، اخون اور اسی قسم کے دوسرے ہنگاموں سے دُور رہ کر زیادہ آسان اور خاموش طریقوں سے روپیہ حاصل کرنا بہتر ہوگا۔  
ایک شخص :- خاموش اور آسان طریقہ کیا جو سکتا ہے ؟  
مکرجی :- سب سے پہلے یہ بتانا ہوں۔ رائے ہمارے ورنہ ماری داکس کو تو آپ سب لوگ جانتے ہیں ؟

ایک شخص :- نہیں میں نہیں کون نہیں جانتا۔  
مکرجی :- ہاں وہ ہمارے شہر کے سب سے بڑے دیش اور ڈونٹی آدمی ہیں انکے صرف ایک ہی بچہ ہے۔ اگر اُسے (دیکھو وہ کھڑے ہیں) کڈنیپ کر دیا جائے تو چالیس یا پچاس ہزار روپیہ مل جاتا

روپ کماری :- (برخ مار کر) ارے دوڑو۔ دوڑو۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ پریم سنگھ تلوار اُس کے گلے پر رکھ دیتا ہوں اور کہتا ہوں :-  
"خط فوراً واپس دیدے"

روپ کماری خوف کے طے بلاؤ زمین سے خط نکال کر پریم سنگھ کے سامنے ڈال دیتی ہے۔

پریم سنگھ :- (خط اٹھا کر) زندہ رہ گیا تو اس دعا بازی کا مڑہ چکھاؤ نکھا، اس وقت تو چھوڑے دیتا ہوں۔

نور اکرم :- یہ نکل جاتا ہے۔ روپ کماری بڑی بڑی حالت میں اٹھ کر صوفے پر جا پڑتی ہے۔ پھر چند منٹ میں اٹھ کر :-  
"بدبخت اہل نک تو خود را کھ کا ڈھیر ہو گا"

## Royal Bakery رائیل بیکری

ایک شخص صندوق نے بیکری میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور۔ اس کے بعد ایک اور۔ پھر مکرجی پہنچتا ہے۔ جلسہ شروع ہوتا ہے۔

مکرجی :- آج ایک خاص ضرورت سے میں نے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے۔ باہر سے جو خبریں آرہی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شہروں میں ہمارے دیش سیوک اب اُس سرگرمی سے کام نہیں کر رہے ہیں جس طرح ابتدا کی تھی۔ شاید انکا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ یا وہ تھک گئے ہیں بہر حال جو صورت بھی ہو۔ ایک بار پھر اُن میں اسٹیم بھرنے کی ضرورت ہے۔

ایک شخص :- پھر آپ نے اس کے لئے کوئی تدبیر سوچی ؟  
مکرجی :- ہاں۔ اس طلب کے لئے مجھے دورے پر جانا ہو گا۔ ممکن ہے واپسی میں تین چار ہفتے لگ جائیں۔ اتنی مدت تک ہمارا (Cashier) سینئر لیغیر لیڈر کے نہیں رہنا

معمولی بات ہے۔

ایک شخص :- مگر خود بچہ کا کڑیپ کرنا تو سہل نہیں جس وقت گھر سے نکلتا ہے اس کی حفاظت کیلئے کتنے ہی آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مکرجی :- یہ سب پہلوئیں نے سوچ لئے ہیں۔ بچہ کی نرس ایک جوان بچہ کو ہی نمبر ۱۲ نے اس سے دوستی کر لی اور شام کے وقت وہ بچہ کو جوا کھلانے اور بارغ میں ٹیپے کے لئے نکلتی ہے۔ نمبر ۱۳ نے کیلئے بارغ کی بوٹری تک جائیگی۔ بچہ بھی ساتھ ہوگا۔ باقی کام آسان ہے۔ نمبر ۱۲ کے علاوہ دو آدمیوں کی اور ضرورت ہوگی۔

ایک شخص :- آپ حکم دیں وہ چلا جائے۔  
مکرجی :- نمبر ۱۲ اور نمبر ۱۰۔

دونوں :- (کھڑے ہو کر) بہت بہتر

پتہ چھ

## موہنی کا مکان

(پریم سنگھ داخل ہوتا ہے)

پریم :- (ملازمہ سے) بالی جی ہیں۔  
ملازمہ :- جی ہاں۔

پریم سنگھ :- کیا کر رہی ہیں۔

ملازمہ :- اوپر کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔

پریم سنگھ :- اچھا ہمارے آنے کی اطلاع کرو۔

ملازمہ :- بہت اچھا۔ (دھاتی ہو جسوقت زینے پر چڑھنے لگتی ہے پریم اسے پھر آواز دیتا ہے)۔

پریم سنگھ :- مگر دیکھو۔

ملازمہ بیٹھتی ہے۔

پریم سنگھ :- اطلاع کی ضرورت نہیں ہم خود چلے جائیگے۔

دبے پاؤں زینہ پر چڑھتا ہوا اور آہستہ کمرہ میں داخل ہوتا ہوا۔ موہنی میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ پریم سنگھ آہستہ آہستہ جا کر اسے آغوش میں لے لیستابہ۔ موہنی تڑپ کر اس کی گود سے نکل جاتی ہو۔

پریم سنگھ :- موہنی دیوئی مجھے معاف کرنا۔ میں بالکل بے اختیار ہو گیا تھا جو بالکل دیوانوں کی طرح تھیں آغوش میں لے لیا۔

موہنی :- (بیٹابانہ پریم سنگھ کی طرف بڑھتی ہو اور شرمائے ہوئے انداز سے) پریم سنگھ جی! یہ کہہ کر پریم سنگھ کا ہاتھ حجام لیتی ہے)

پریم سنگھ :- یہ کیا لکھا جا رہا تھا۔

موہنی :- کچھ نہیں۔ یہ کہہ کر مین کی طرف بڑھتی ہو اور خط اٹھا چاک (دو ٹکڑے) کر ڈالتی ہے۔

پریم سنگھ :- شاید کوئی راز کی بات ہو۔ معاف کیجئے گا میرے تو یوں ہی بے خیالی میں پوچھ لیا تھا۔

موہنی :- (گھبرا کر) نہیں پریم سنگھ جی۔ راز کی بات آپاں دیکھ سکتے ہیں۔

پریم سنگھ :- میرے دیکھنے کی چیز ہوتی تو آپ اسے پھاڑ کیوں ڈالتیں۔

موہنی :- آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں لگا غدا پریم سنگھ کی طرف بڑھا کر) میری خاطر سے دیکھ لیجئے۔

پریم سنگھ :- نہ بانی ہی بتا دیجئے۔

موہنی :- نہیں۔ میں نہیں بتاؤں گی۔

پریم سنگھ :- آخر کیا ہرج ہے۔

موہنی :- اور آپ خود ہی پڑھ لیں تو کیا ہرج ہے۔

پریم سنگھ خط لیکر باواں بلند بڑھتا ہے۔

پریم سنگھ :- تم نے تو کہا تھا کہ اب جلد ملاقات ہوگی۔

موہنی :- (کچھ سوچ رہی ہے پریم کے سوال کا جواب نہیں دیتی، پھر کہتی ہی آہ پریم اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس تین دن میں میں کیسی مقررہ رہی ہوں۔ ایک ایک گھر کی طرح ایک ایک برس کی مانند گزار دی ہو۔ جیسے کوئی قید میں ہو۔ تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرے حال پر ترس آجائے اور تم مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔

(موہنی کی آواز بھڑجاتی ہے۔ ذرا دیر خاموش رہتی ہے اس کے بعد) ہاں تو پریم، تم مجھے میرے دشمنوں سے بچاؤ گے۔ مجھ بیکس کی مدد کر دے گے؟ مجھے اپنی حفاظت میں لے لو گے؟ (آنسو گرنے لگتے ہیں۔)

پریم سنگھ :- او۔ جان۔ خدا کیلئے..... مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہو۔ بتاؤ تو آخر تمہارے دشمن ہیں کون لوگ؟

موہنی :- ایک تو یہی، امکو جی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیفے دن رات میری فکر میں لگا رہتا ہو۔ کل صبح میں انہی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی راستہ میں ملیا۔ کہنے لگا کہ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے۔ میں نے کہا مجھے فرصت نہیں۔ اور میں جیل پڑی۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہ تمہیں میری بات سننی ہوگی۔ میں نے کہا تم اپنا راستہ لو نہیں تو میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔ پولیس کا نام سنکر گھبرا گیا اور کہنے لگا کہ اچھا حق جانا ہوں مگر اس بدسلوکی کا نتیجہ بھی دیکھ بھنا۔ بس جب میرا دل لرز رہا ہے۔ خدا چلے یہ بدعاش کیا کرے گا۔

پریم سنگھ :- نہیں موہنی تم بالکل فکر نہ کرو۔ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

موہنی :- (کچھ سوچ کر) اور دوسرا دشمن۔ خود میرے چچا ڈاکٹر ٹنڈن۔

پریم سنگھ :- چچا۔ تم نے چچا کہتی ہو۔ موہنی، آدم گمشدہ خوشخوار ہو

تمہارے خط کا انتظار نہیں کرؤں گا۔ مگر تمہیں اپنی مصروفیتوں میں شاید ایک.....

موہنی :- (پریم سنگھ کے ہاتھ سے خط چھین کر) بس اب نہیں پڑھنے دوں گی۔

پریم سنگھ بیتاب ہو کر دونوں ہاتھ موہنی کے کندھوں پر رکھ دیتا ہے۔ پھر دونوں ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔

پریم سنگھ :- موہنی، یہ تین دن اور تین راتیں جس چینی اور میسراری سے گٹی ہیں، اب میرا ہی دل جانتا ہو۔ خاموگر کل سے تو میری بُری حالت تھی۔ تڑپ تڑپ کے رات کاٹی ہے۔ مگر یہ لو کر کی محنت غلامی ہے، لاکھ چاکا کڑوں مگر نہ آسکا۔

موہنی :- (نظر پٹی کٹے ہوئے) پریم سنگھ جی۔ کیا واقعی ابکو میرا تنا خیال ہے۔ کیا میں ان سب باتوں کا یقین کر لوں ایک مرد جسے خدا نے حسن، دولت، عزت، جواغردی سب ہی کچھ دیا ہے وہ ایک بے یار و مددگار اور گناہ لڑکی سے بھلا کیوں محبت کرے گا۔

پریم سنگھ :- موہنی، میں تمہاری محبت کے قابل تو نہیں مگر ایشور جانتا ہے کہ تمہاری محبت کچھ اس طرح میری رنگ رنگ میں.....

موہنی :- (بیتا بانہ) آہ۔ پریم بیکہ کہہ کر پریم سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ پریم اسے زور سے پیچھ لیتا ہو اور اس کے لبوں کو چومتا ہے۔ موہنی پر ایک نیووی سی طاری ہو جاتی ہو۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی ہے اور اس کا سر پریم کے بازو پر چپے کو ڈھلک جاتا ہے۔ ایک منٹ کے بعد دونوں جدا ہوتے ہیں اور پھر گفتگو شروع ہوتی ہے۔

پریم سنگھ :- اس دن کے بعد پھر تو مکوجی سے بیعت نہیں ہوئی۔ خدا جانے کیوں مجھے اس شخص سے دلی نفرت ہو گئی ہو۔

یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر زہر کی سفید نشی نکال کر موہنی کو دکھاتا ہوں، اپنی بیوی کی معرفت اس بدعاش نے مجھے زہر دلا ہی دیا تھا وہ تو یہ کہو کہ چپا کو مجھ پر رحم آگیا۔ موہنی :- (نہایت گہرا کریششی پریم سنگھ کے ہاتھ سے لیتی ہے اور دیکھتی ہے، لیبل پڑھ کر لکھا ہے) آہ۔ یہ تو کوئی بڑا قاتل زہر معلوم ہوتا ہو، کیا چپا نے تمہاری جان بچائی ہے پریم سنگھ :- ہاں چپا نے۔

موہنی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یکایک ملازم گھبرائی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی ہے۔

بی بی :- بی بی :- ڈاکٹر صاحب آگئے۔

پریم سنگھ موہنی کی طرف دیکھتا ہے۔ موہنی نہایت پھرتی سے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کر پریم سنگھ کا ہاتھ پکڑے۔

موہنی :- پریم اس کمرہ میں آ جاؤ۔

پریم سنگھ :- مگر.....

موہنی اُسے کھینچتی ہے اور زبردستی اُس کمرے میں داخل کر دیتی ہے اور کہتی ہے۔

موہنی :- پیارے میری رسوائی کا خیال کرو، پھر خود کُری پر دیکھ کر کتاب دیکھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن داخل ہوتا ہے (موہنی :- روبرے احترام سے) منسکار چاچا جی مزاج کیسا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- جیتی رہو میٹھی۔ بہت دنوں سے تمہیں دیکھا نہ تھا۔ ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا مگر کاموں میں کچھ رہا۔ ادھر مریضوں کا، نجوم۔ ادھر سائنسٹوں کا کام۔ سر کھانے کی ہولت نہ تھی آج جیسے تیسے وقت نکالا۔ تم تو جی ہو۔

موہنی :- ہاں چاچا جی آپ کی دُعا سے بچی ہوں۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- کچھ دیر سوچ کر موہنی آج تمہارے

لے ایک بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے ایک نہایت دو تندر آدمی سے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ کل صبح آٹھ بجے میں آکر تمہیں لیجا ڈنگا۔ شادی کی رسم میرے مکان پر ادا ہوگی۔

موہنی ٹنڈن کی یہ باتیں سن کر بالکل بدحواس ہو جاتی ہے کتاب کھول کر پڑھنے لگتی ہے تاکہ ٹنڈن اس کی حالت کا کچھ اندازہ نہ کر سکے۔ ٹنڈن جواب کا انتظار کرتا ہے۔ جب کچھ جواب نہیں ملتا تو کہتا ہے۔

ٹنڈن :- موہنی تم جانتی ہو کہ میں تمہارے باپ کی جگہ پورا رشتہ کے علاوہ قانوناً بھی میں تمہارا سرپرست ہوں۔ اور تمہارے متعلق ہر بات کے طے کرنے کا مجھے پورا اختیار حاصل ہے۔

موہنی اب بھی کچھ جواب نہیں دیتی۔ برابر کتاب دیکھے جاتی ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- میٹھی میں تمہارے اس خرم و بختی کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ تمہارا ہونے والا شوہر کیسا نیک، شریف اور معزز آدمی ہے۔

پھر کچھ دیر چپ رہتا ہے۔ موہنی اب بھی خاموش ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن :- موہنی تم سنی نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کل صبح آٹھ بجے تمہیں میرے یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ سمجھ گئی۔

موہنی :- (دیر فرودختہ ہو کر کتاب کو پٹک دیتی ہے) چاچا جی میں بہری نہیں ہوں۔ سب کچھ میں نے اچھی طرح سن لیا اور آپ بھی میرا جواب سن لیجئے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- بدجھلا کر کیا کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا سیر، گھوسا مار کر ایسا ضرور ہو گا میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ کل صبح تمہیں یہ کام کرنا ہی ہو گا۔

موہنی :- (حقارت آمیز قسم کے ساتھ) آپ کو میرے ساتھ اس قدر ہمدردی کیسے ہو گئی جو.....  
ٹنڈن :- اوه۔ یہ ہے کیا بلاتہا۔ تمہارا شوہر اس سے دس گنا زیادہ اور بہتر نہیں خریدو گیگا۔

موہنی :- چاچا جی۔ کیا واقعی وہ بہت مالدار آدمی ہیں ؟  
ٹنڈن :- (دہنایت مسرور ہو کر) ہاں بیٹی۔ ڈھائی ہزار پیڑھینہ تو انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ جاندا کی آمدنی الگ ہے۔ لکھتی آدمی ہیں۔

موہنی :- (مصنوعی حیرت سے) لکھتی آدمی ہیں! اچھا چاچا جی۔ آپ جیسا حکم دینگے میں ویسا ہی کروں گی۔  
ٹنڈن گڑھی پر بیٹھ جاتا ہے اور اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

موہنی :- مگر آپ نے من کا نام نہیں بتایا۔  
ٹنڈن :- (دس کر) میرا خیال ہے کہ تم انہیں جانتی ہو شاید باغ میں ایک دفعہ وہ تم سے مل ہی چکے ہیں۔  
موہنی :- (گھبرا کر) کیا آپ کا مطلب مگر جی سے ہے ؟  
ٹنڈن :- تم ٹھیک سمجھیں۔

موہنی سخت پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر یکسر ایک آہ کرتی ہوا اور کچھ دیر خاموش رہتی ہے سوچتی ہے پھر کہتی ہے۔

اچھا چاچا جی، ایک میری عرض ہے۔ میں شادی کیلئے تیار ہوں مگر مجھے اتوار تک کی ہجرت دینے کی۔ اس کے بغیر ناممکن ہے۔

ٹنڈن :- (کچھ دیر سوچتا ہے پھر کہتا ہے) خیر اس میں کوئی ہرج منج نہیں لیکن وعدہ کرو کہ اتوار کے دن تم بخوشی اس رسم کو ادا کرنے دو گی۔

موہنی :- میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔  
ٹنڈن :- (دکڑھی سے گھڑے ہو کر) تو بس ٹھیک ہے۔

چاہتا ہے مگر دروازہ اندر سے بند ہے۔  
ٹنڈن :- (موہنی سے) باہر سے بھی تو اس کمرہ کا دروازہ ہے نا؟ موہنی سر کے اشارہ سے "ہاں" کہتی ہے۔ ٹنڈن باہر جاتا ہے۔ پریم سنگھ اس کمرہ میں خاموش کھڑا دروازہ سے کان لگا لگاتے ان دونوں کی باتیں سنتا ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ تھک کر ذرا پیچھے ہٹتا ہے تو میرٹس لگ کر لگتی ہے اس پر چینی اور شیشہ کے برتن رکھے تھے۔ وہ سب زمین پر گر پڑتے ہیں اور چور چور ہو جاتے ہیں۔ پریم جب کھڑا ہوتا ہے کہ ٹنڈن دوسرے دروازہ سے آ رہا ہے تو فوراً یہ سادر دروازہ کھول موہنی کے کمرہ میں آ جاتا ہے۔ موہنی اس ہنگامہ سے سخت ہرجاس ہے اور دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی ہے۔

پریم سنگھ :- (آہستہ سے) موہنی تم اپنے چچا سے اتوار تک کی ہجرت مانگ لو اور شادی کا وعدہ کر لیں باقی میں دیکھ لوں گا۔  
یہ کہہ کر موہنی کا ایک بیار لیکر خاموشی کے ساتھ مکان سے نکل جاتا ہے۔ ٹنڈن اس کمرہ کو ناگوار دیکھتا ہے مگر کوئی وہاں موجود نہیں۔ پھر جس دروازے سے گیا تھا اسی دروازے سے واپس آتا ہے۔

ٹنڈن :- تعجب ہے۔ یہ کون تھا جس نے تمام برتنوں کا چور کر دیا۔  
موہنی :- میری بد قسمتی ہو ادھر کیا۔ بیٹھے بٹھلے مفت میں

موبہنی کی پیشانی کا بوسہ دیکر روانہ ہو جاتا ہے۔

چمپا :- (حیران ہو کر) کیا سچ ہے آپ ان میں سے ایک کا غدہ خریدنا چاہتے ہیں؟

پریم سنگھ :- سچ ہے۔

چمپا :- (دشکر) اچھا کتنے میں لیجئے گا۔

پریم سنگھ :- جو قیمت تم مانگو۔

چمپا :- نہیں آپ بتا دیجئے۔

پریم سنگھ :- سنو روپے۔

چمپا :- (خوشی سے) یہاں ہو کر (نٹوٹے) آپ سنو روپے مجھے دیدیتے۔

پریم سنگھ :- بیشک۔ اسی وقت۔

چمپا :- مگر میں بائی جی کو کیا جواب دوں گی؟

پریم سنگھ :- تمیں اب وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہوگا اگر تم پسند کرو تو میرے یہاں رہ سکتی ہو۔

چمپا :- اور کوئی اونچ نیچ ہوگی تو آپ بلالیاں لیں گے۔ میرا دپر تو کوئی بات نہیں آئے گی؟

پریم سنگھ :- نہیں۔ تم بالکل بیفکر رہو۔

چمپا :- (خوشی سے) چل کر! تو میں بھی تیار ہوں۔

پریم سنگھ :- سنو روپے کے نوٹ نکال کر چمپا کے حوالے کر دیتا ہے۔

پریم سنگھ اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا ہو۔ کسی منکڑا دیتا ہو۔ کسی اس کا چہرہ نہایت غمگین ہو جاتا ہو۔ کسی جمانیاں لیتا ہے۔ گویا رات بھر نہیں سویا ہو۔ نوکر اگر خبر دیتا ہو کہ ایک چھو کر آئی ہے۔

پریم سنگھ :- یہاں بیچو۔

(چمپا داخل ہوتی ہے)

چمپا :- مشکراہ باپو جی۔

پریم سنگھ :- (دہانیت خوشی کے ہوا میں) چمپا۔ کہو آج ادھر کیسے بھول پڑیں۔

چمپا :- ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی مشرک مگر جی کے یہاں گئے ہیں۔ چلے وقت کچھ ضروری کاغذات نیز بھول آئے۔ بائی جی نے کہا کہ ابھی آئے پاس پہنچا دو۔ ساتھ ہی آپ کی خبر معلوم کرنے کو بھی کہہ دیا ہے۔ اُن کا خیال ہو کہ آپ کے دشمن کیسے اس ڈنیلے سے مدد چاہتے ہوئے۔ باپو جی، انہیں کسی طرح معلوم نہ ہونے پائے کہ اس معاملہ میں میرا بھی ہاتھ ہے۔

پریم سنگھ :- نہیں چمپا تم بالکل اطمینان رکھو۔ اور یہ کاغذات کیسے ہیں؟ میں دیکھ سکتا ہوں؟

چمپا :- (کاغذات پریم کی طرف بڑھا کر) دیکھ لیجئے۔

پریم سنگھ بغور کاغذات کو دیکھتا ہو اور کچھ ایک اسے منستے نکلتا ہو (مہمہ جی مہمہ جی) گڈ گاڈ۔ پھر کچھ پڑھتا ہے۔ پھر کچھ سوچتا ہو۔ پھر سر اٹھا کر چمپا سے :-

پریم سنگھ :- میں ان میں سے ایک کا غدہ خریدنا چاہتا ہوں۔ ہو کو کیا قیمت لوگی؟

چمپا :- باپو جی کیا آپ مجھے بتا رہے ہیں۔

پریم سنگھ :- نہیں چمپا۔ دل ٹپکی نہیں۔

## مگر جی کا مکان

ڈاکٹر نڈن سخت ہرجاس داخل ہوتا ہے۔

نڈن :- مگر جی غضب ہو گیا۔ جلد کوئی تدبیر کیجئے نہیں تو؟ سب کا خاتمہ ہے۔

مگر جی :- (حیران و پشیمان ہو کر) آخر ہوا کیا۔

نڈن :- وہ کاغذات تم آہستے۔

مکرجی :- (اور بھی گھر کر) کون سے کاغذات؟

ٹنڈن :- وہی رپورٹ۔

مکرجی :- اودہ غضب۔ آخر کم کیسے ہو گئے؟

ٹنڈن :- آج صبح یہاں آتے وقت میں نے وہ کاغذات کس

میں سے نکالے اور کڑ پینتے وقت جیب میں رکھنے کے بجائے

وہیں میز پر پھول آیا۔ رستے میں خیال آیا۔ جیب میں دیکھا

تو نڈارو۔ فوراً گھر واپس گیا۔ لفافہ میز پر موجود نہ تھا۔ سنر

ٹنڈن نے کہا۔ میں نے اس خیال سے کہ آپ کو دوبارہ آنے کی

محکفیت نہ ہو چمپا کے ہاتھ وہ کاغذات مشر مکرجی کے یہاں

بھیجے تے۔ میں فوراً پلٹا۔ راستہ بھر چمپا کو دیکھتا ہوا آپکے

یہاں آیا۔ آپکے دروازہ پر تالا پڑا دیکھ کر پھر گھر واپس گیا مگر

چمپا نہ یہاں پہنچی نہ وہاں۔ میں نے اور میرے لوگوں نے

سارے دن اُسے تلاش کیا مگر کہیں کجمنت کا پتہ نہ چلا۔

نہ جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔

مکرجی :- چمپا کو ان کاغذات کی اہمیت معلوم تھی؟

ٹنڈن :- نہیں۔ اُسے کیا خود سنر ٹنڈن کو بھی معلوم نہیں

تھا کہ اس لفافہ میں کیا ہے۔

مکرجی :- تب تو کچھ ایسی خوف کی بات نہیں۔ آپ موہنی

کو میرے حوالے کر دیکھتے ہیں خود آہندوستان سے روانہ

ہو جاؤ گے۔ پھر آپکے کوئی اندیشہ نہیں۔

ٹنڈن :- موہنی سے تویں رات مل لیا اور سب معاملہ طے

ہو گیا۔ تو اس کے دن صبح کو آپ کی شادی ہو جائیگی۔

مکرجی :- بہت خوش ہو کر، ڈاکٹر ٹنڈن! سچ تو یہ ہے کہ

میں نے آپ کی طرح محبت والے اور شریف انسان نہیں دیکھے۔

اچھا موہنی بخوشی راضی ہو گئی؟

ٹنڈن :- ہاں بخوشی راضی ہو گئی۔

مکرجی :- شادی کے بعد میں فوراً ہی موہنی کو یہاں

سے روانہ ہو جاؤ گے (بے انتہا خوش ہے)۔

ٹنڈن :- اچھا تو اتوار کے دن صبح کے ۸ بجے مع اپنے چند

دوستوں کے میرے مکان پر پہنچ جائیے۔ جہانوں کا زیادہ

ہجوم نہ ہو۔

مکرجی :- نہیں۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔

ٹنڈن چلا جاتا ہے۔ مکرجی آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے

اور گنگنٹانے لگتا ہے۔

## موہنی کا مکان

موہنی نہایت بیقرار نظر آتی ہے۔ کھڑکی کے باہر چمپا کمر

بار بار دیکھتی ہے، پھر کیا ایک روئے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد

پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔ موہنی اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے۔ پریم

اُس کے گلے میں باہنیں ڈال کر پیار کرتا ہے۔ موہنی اُسی طرح

بیٹھی رہتی ہے۔

پریم سنگھ :- (موہنی کا چہرہ غور سے دیکھ کر) یہ کیا ہے تم رو

رہی تھیں؟

موہنی :- رونے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اپنی آنکھوں

کے سوا اور کسی پر بس نہیں چلتا۔

پریم سنگھ :- لیکن آخر اس کا سبب؟

موہنی :- سبب؟ ہاں ٹھیک تو ہے۔ آپ کو اپنے کاموں میں

کہاں خیال رہا ہوگا۔ لیکن میں کیسے بھول سکتی ہوں کل اتوار

سے۔ میری شادی یعنی موت کا دن۔ آپ ایسے گئے کہ خبر ہی

نہ لی۔ اس مصیبت سے بچنے کا آپ تو صرف ایک ہی رستہ ہے

کہ آج رات کو کچھ کھا کے سو رہوں (یہ کہہ کر پھر اسکی آنکھوں

سے آنسو ٹپکتے لگتے ہیں۔ پریم اُسے اپنے آغوش میں سے کر

آنسو پونچھتا ہے۔)

پریکشم سنگھ :- اچھا تو اس کے لئے آپ اتنا پریشان ہو رہی تھیں۔  
دھوہنی کے ہاتھ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہوں، دھوہنی اگل صبح  
تمہاری سب محبتوں اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتے گا۔  
تمہارے سب دشمن ایک ساتھ جیل کی اندھیری کوٹھڑیوں  
میں پڑے ہو گئے۔ آج تو تمہارے لئے انتہائی خوشی کا دن ہے۔  
دھوہنی :- میں تو کچھ نہیں سمجھتی آپ کا کیا مطلب ہے؟

پریکشم سنگھ :- یہ بدعاش ڈاکٹر ٹنڈن ہندوستان کے  
متعلق خفیہ رپورٹ مرتب کر کے مکر جی کی معرفت کسی بیرونی  
حکومت کو بھجواتا رہا ہے۔ مکر جی اس حکومت کا جاسوس  
اور ایجنٹ ہے۔ اس کے علاوہ اس مکر جی نے ایک زبردست  
سازشی پارٹی بنائی ہے۔ جو دیش اور قوم کا نام لیکر چوری۔  
ڈاکہ۔ قتل۔ خون اور ایسی قسم کے تمام خطرناک کام کر رہی  
ہے۔ ملک کے امن و امان کو تباہ کر ڈالا ہے۔ کسی کی جان،  
مال، آبرو، کوئی چیز محفوظ نہیں۔ وہ خفیہ رپورٹ چمپا کی  
معرفت میرے ہاتھ آگئی اور میں نے اسے پولیس کے حوالے  
کر دیا۔ اس طرح ان سب شیطانوں کی تباہی کا پورا پورا  
بندوبست ہو گیا۔

دھوہنی :- چمپا کے ہاتھ وہ رپورٹ کہاں سے لگی؟  
پریکشم سنگھ :- مکر جی کے یہاں جاتے وقت ڈاکٹر ٹنڈن وہ  
کا غذات اپنی میز پر بٹول آیا۔ اسکی بیوی نے چمپا سے کہا کہ  
یہ کا غذات مکر جی کے یہاں ڈاکٹر صاحب کو دے آئیں تو  
انہیں پھر آنا پڑیگا اور یہی دیکھتی آئی کہ پریکشم سنگھ ابھی مرا  
پا نہیں۔ چمپا پہلے میرے یہاں آگئی، کا غذات اس سے لیکر  
میں نے دیکھے۔ ان میں یہ رپورٹ بھی تھی جو میں نے تنور دپے  
میں چمپا سے ختم پدی۔

دھوہنی :- مکر جی چمپا، بیچاری کا کیا حشر ہو گا۔  
پریکشم سنگھ :- حشر کیا ہوتا۔ اب وہ میری ملازم ہے۔

دھوہنی :- (مسرود ہو کر) یہ تو خوب ہوا۔  
پریکشم سنگھ :- مکر جی تنہا ہی اسی تکلیف تمہیں بھی کرنی پڑیگی۔  
دھوہنی :- وہ کیا؟  
پریکشم سنگھ :- اے یہ پایا، کہ ایک ایسی مجلس ترتیب دی جائے  
جس میں یہ سب سازشی شریک ہوں اور ایک ساتھ گرفتار  
کئے جائیں۔

دھوہنی :- لغتہ تو خوب ہو مگر مجھے کیا کرنا ہو گا۔  
پریکشم سنگھ (مشکوکہ کر) اگل صبح مکر جی سے تمہاری شادی ہو نا؟  
دھوہنی :- آہاں۔

پریکشم سنگھ :- بس تو قطعہ تمام ہوا۔ تم حسب وعدہ اس  
مجلس میں حاضر ہو جانا۔ باقی میرے ذمہ۔  
دھوہنی :- پیارے مجھے تو اس بکیر سے اسے الگ ہی رکھو تو  
اچھا۔

پریکشم سنگھ :- دھوہنی میں خود اسے پسند نہیں کرتا مگر اسے  
بغیر چارہ نہیں۔ ابھی میں نے تم سے بیان کیا کہ یہ سازش  
ملک کے لیے ہے امن و امان کو تباہ کرنے والی ہے اور ہر  
شخص کے جان و مال کے لئے اس سے خطرہ ہے۔ اس کا مٹانا  
دیش کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے اسلئے ان خدازوں کی  
گرفتاری میں تمہیں بھی مدد کرنی چاہیے۔

دھوہنی :- جیسی آپکی خوشی۔  
پریکشم سنگھ :- تم بالکل اطمینان رکھو۔ اب ہمارے راستے میں  
کوئی کاٹنا باقی نہ رہیگا۔ اچھا اب چلتا ہوں۔ ابھی اور بھی  
کچھ کام باقی ہے۔  
دھوہنی :- اچھا۔

پریکشم سنگھ دھوہنی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیکر پیار کرتا  
ہے اور جلدی سے روانہ ہو جاتا ہے۔



## ڈاکٹر ٹنڈن کی کوشی

ٹھیک آٹھ بجے صبح مسٹر مگر جی موہاپنے چند دوستوں کے ڈاکٹر ٹنڈن کے مکان پر پہنچ جاتا ہے۔ روپ کماری سبکا بڑے تپاک سے استقبال کرتی ہے اور ڈرائنگ روم میں لپکا کر بٹھاتی ہے۔

مگر جی :- ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں ؟  
روپ کماری :- ابھی آتے ہیں۔ آپ کی دواہن کو لینے گئے ہیں۔

خوشی سے مگر جی کی چھین کھل جاتی ہیں۔ اتنے میں ڈاکٹر ٹنڈن کی موٹر آپہنچتی ہے۔ ٹنڈن اور موہاپنی اترتے ہیں۔

موہاپنی نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے ہے مگر جی موٹر کی آواز سن کر کمرہ کے باہر چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر اور موہاپنی

سے آداب عرض اگر کرتا ہے۔ موہاپنی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے اور روپ کماری بھی اس کے ساتھ جاتی ہے ٹنڈن اور مگر جی ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ مگر جی اپنا انجی کپس

کھول کر چند زیورات نکال کر دیتا ہے۔  
مگر جی :- یہ میری طرف سے موہاپنی دیوی کو پہننا دیکھئے۔

بھر اپنے ملازم کو آواز دیتا ہے۔  
مگر جی :- فوددار ! فوددار !

فوددار :- حضور۔  
مگر جی :- وہ کپڑوں کا بکس لاؤ۔

فوددار فوراً ایک چھوٹا سا بکس پیش کرتا ہے۔  
مگر جی :- (بکس کھول کر) یہ موہاپنی دیوی کی ساڈی اور باقی

کپڑے ہیں۔ یہ بھی انہیں پہننا دیکھئے۔  
ٹنڈن :- بہت اچھا۔

یہ سب چیزیں نوکری کے ہمراہ دوسرے کمرہ میں لیجاتا ہے۔  
جہاں موہاپنی اور روپ کماری بیٹھی ہیں۔ کپڑے اور زیورات

دونوں کو دکھاتا ہے اور تعریف کرتا ہے۔ روپ کماری ایک چیز کو اٹھا کر دیکھتی ہے اور تعریف کرتی ہے، موہاپنی بالکل خاموش ہے۔ ٹنڈن واپس آ جاتا ہے۔ اسے میں میری رجبہ راجا صاحب بھی آ جاتے ہیں اور اب یہ سب لوگ دوسرے کمرے میں جاتے ہیں۔ موہاپنی وہ سب زیورات اور دیوی ساڈی پہنے دواہن بنی غمر مانی بیٹھی ہے۔ سب سے دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔

مگر جی کا ایک ساتھی :- (دراستہ اپنے ہمراہی سے)۔ چند دواہن یہ تو بالکل جھوکی ہے۔ یہ بڈھا اس سے بیاہ کر لگیا۔

چند :- اس میں نئی بات کونسی ہے۔ ہمارے یہاں ہمیشہ ہی سے ایسا ہوتا آیا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اچھا رجبہ راجا صاحب۔ اب آپ اپنا کام شروع کیجئے۔

رجبہ راجہ :- بہت اچھا۔ (چپاسی سے) بھولو رجبہ راجہ لاؤ۔  
مگر جی تلخ غلامی عمل بہت زیادہ شراب پی لی ہے نفی میں

بالکل مدہوش ہو رہا ہے۔ بیکاک کھڑا ہو جاتا ہے اور ٹنڈن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

مگر جی :- ڈیرڈاکٹر ٹنڈن۔ اگر وہ بد معاش عورت چمپا ہاتھ آ جائے تو اس کی بوٹی بوٹی کر ڈالنا۔

چمپا کا ذکر سن کر موہاپنی بچہ بن جاتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔

ٹنڈن :- (دیکھ کر) اس وقت ان باتوں کا کیا موقع ہے۔  
مگر جی :- نہیں۔ اگر آپ اس کام میں ذرا سستی کی تو میں

آپ سے بھی ناواض ہو جاؤں گا۔  
بیکاک پانڈل کی چاب ٹنڈن کی دیتی۔ سبکان کھڑے

کرتے ہیں۔ پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔  
مگر جی :- (پریم سنگھ سے) آپ کون صاحب ہیں ؟  
پریم سنگھ :- شاید آپ بھول گئے۔ اُس روز شام کو جب

نصیب نہیں ہوتا۔

اندر سنگہ :- اماں جی۔ اب آتے ہی ہو گئے۔

اخبار بیچنے والے لڑکے کی آواز آتی ہے :-

”ایک زبردست سازش کا انکشاف۔ کپتان پریم سنگہ کا کارنامہ۔ سازشیوں کا سرغنہ گرفتار ہو گیا!“

ماں بیٹے دونوں کان کھڑے کرتے ہیں۔ اندر سنگہ کچھ کہے

بغیر فوراً اپنی بندوت چھوڑ باہر نکل جاتا ہے۔ اور اخبار کا پرچہ لیکر بڑھتا ہوا آتا ہے۔

بڑھیا :- کیا خبر ہے بیٹا؟

اندر سنگہ بڑھکرتا ہوا ہے۔

”ایک زبردست سازش کا انکشاف۔ کپتان پریم سنگہ کا کارنامہ۔ سازشیوں کا سرغنہ گرفتار ہو گیا۔ کچھ مدت سے

ایک انقلابی جماعت ملک میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہی تھی۔

یہ لوگ ملک اور قوم کا نام یکے بعد دیگرے کا نام لیتے تھے۔

کو اپنے گروہ میں شامل کرتے ہیں اور ان سے طرح طرح کے

خطرناک کام لیتے ہیں تفصیل ابھی معلوم نہیں مگر سنا جاتا

ہے کہ پچھلے دنوں سیٹھ گندن لال کے یہاں جو ڈاکہ پڑا تھا وہ

انہیں لوگوں کا کام تھا اور دیوالی کے موقع پر ہم کا جو حادثہ

ہوا تھا اس کے بھی یہی لوگ ذمہ دار ہیں۔ دو تہہ دو کی ٹوٹنا

اور غریبوں کی تھوڑی بہت مدد کرنا یہ ان لوگوں کا شغل رہا

ہے دوسری حکومتوں سے خفیہ سازیاں بھی رکھتے ہیں۔ اور

پوشیدہ طور پر ہر قسم کی اطلاعیں ہندوستان کے متعلق یہ

لوگ دوسری حکومتوں کو بھیجتے تھے۔ کپتان پریم سنگہ نے

اس سازش کا پتہ لگا دیا اور آج صبح جبکہ اس جماعت کا سرغنہ

مکرجی نامی ڈاکٹر ٹنڈن کی لوجوان بھتیجی موہنی دیوی سے

شادی کی غرض سے اپنے چند ساتھیوں سمیت ان کے مکان

پر پہنچا اور شادی کی رسم ادا ہونے ہی والی تھی کہ پولیس نے

آپ اپنی دہلی کو کٹنپ (مکرجی) کو اپنے فٹے باغ میں

آپے ملاقات ہوئی تھی۔

مکرجی :- دیوانہ دار اٹھ کر بس خاموش۔ فوراً یہاں نکل جا۔

نہیں تو مارا جائیگا۔

ٹنڈن :- پریم سنگہ سے ایہ شادی کی مغل ہو میدان جنگ

نہیں۔ آپ نے کیسے تکلیف فرمائی۔

پریم سنگہ :- مجھے نہایت افسوس ہو کہ اس شادی کا انجام

بخیر نہ ہوا۔

مکرجی :- کیا کہتا ہے؟

پریم سنگہ :- رہا تھ اٹھا کر خاموش!

اسی لمحہ آٹھ پولیس والے داخل ہوتے ہیں ان کا افسر

لگے بڑھ کر :-

”عورتوں کے سوا آپ سب لوگوں کو میں سرکاری حکم

سے گرفتار کرتا ہوں“ سب بدحواس ہو جاتے ہیں۔ موہنی پریم

کا ہاتھ پکڑ کر کہہ سے نکل جاتی ہے مکرجی یہ دیکھ کر ایک آہ

کر کے دم سے گر پڑتا ہے۔ روپ کماری بھی حیران ہو صرف

”اچھا“ اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ پولیس والے سب کو ہتھکڑیاں

پہنا دیتے ہیں۔ باہر لاری کھڑی ہے اس میں بٹھا کر سب کو

قید خانے پہنچاتے ہیں۔

## پریم سنگہ کا مکان

پریم سنگہ کا چھوٹا بھائی اندر سنگہ اور اسکی بڑھی ماں

بڑھیا لکڑی پڑھتی تھیں رہی ہے۔ اندر سنگہ اپنی بندوت منا

کر رہا ہے۔ دیوالی گھڑی یا تیج بجاتی ہے۔

بڑھیا :- اندر! پریم اب تنگ نہیں آیا۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا۔

نہ جانے سارا دن کہاں گزار دیا۔ چھٹی کے دن بھی گھر پر نہ

چھاپا مارا اور سب کو گرفتار کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ٹنڈن جو شہر کے مشہور ڈاکٹر اور پبلک ورکر ہیں وہ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔“

ماں بیٹے دونوں خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنے ہیں پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔ موہنی اس کے ساتھ ہے۔ بڑھیا اٹھکر پریم سنگھ کو نگے لگاتی ہے۔ پریم سنگھ اپنی ماں اور بھائی سے موہنی کا تعارف کراتا ہے۔

پریم سنگھ۔ ہاں کی طرف اشارہ کر کے (موہنی سے) بیڑی اماں لا ندر سنگھ کی طرف اشارہ کر کے (میرا بھائی اندر سنگھ۔) اماں اور بھائی سے مخاطب ہو کر موہنی کی طرف اشارہ کر کے، مس موہنی دیوئی (موہنی ہاتھ جوڑ کر دونوں کو مشکرا کر کرتی ہے۔) بڑھیا اور اندر سنگھ دونوں موہنی کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں) پریم سنگھ۔ یہ آپ لوگوں سے ملنے کی بہت آرزو مند تھیں۔ بڑھیا۔ بیٹھو بی بی۔

موہنی آداب کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔ پریم سنگھ۔ اماں! اخبار میں آپ نے پڑھ لیا ہو گا کہ میں نے ابھی ان کے چچا اور ہونے والے شوہر کو گرفتار کر لیا اور شادی روک دی۔ آپ حیران ہو گئی کہ پھر یہ میرے ساتھ کیسے چلی آئیں۔ اور آپ لوگوں سے ملنے کی کیوں آرزو مند تھیں۔ وصال ڈاکٹر ٹنڈن کی زبردستی سے۔ ان کی مرضی کے بالکل خلاف شادی ہو رہی تھی۔ میرے وقت پر پہنچ جانے سے یہ بلا ہم کے سر سے اٹ گئی۔ اب میں نے ہمیشہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے کیونکہ ان کا کوئی سرپرست اور والی وارث نہیں ہے۔

موہنی۔ (پریم کی ماں سے) اماں جی۔ درہل میں پریم سنگھ کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے میری شادی نہیں کی بلکہ میری جان بچائی ہے۔ میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ اس

مخوس رسم کے ادا ہونے سے پہلے کچھ کھا کے سو رہو گی۔ دنیا میں اب آپ لوگوں کے سو امیرا کوئی نہیں رہے یہ کہہ کر ہنسنے لگتی ہے) بڑھیا۔ بیٹی۔ اب جی نہ کڑھاؤ۔ بھگوان اچھا ہی کرے گا۔ جو کچھ مدد ہم سے ہو سکتی ہے اس کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں۔ موہنی۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔

اندر سنگھ۔ بھیا آپ نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ یہ سب کچھ ہو ایکس؟ اخبار میں تو کوئی تفصیل نہیں لکھی۔

پریم سنگھ۔ اس کام کا میرا ہاتھ سے ہونا کچھ ایشور ہی کو منظور تھا ورنہ میں نے تو کوئی خاص کوشش نہیں کی تفصیل فرصت میں سنا دوں گا۔ مجھے ابھی پولیس کے دفتر واپس جانا ہے۔ خیال تھا کہ ماں پریشان نہ ہو گی۔ ادھر موہنی دہلی سے بھی وعدہ کیا تھا کہ تیسرے پہر کو آپ لوگوں سے ملا دوں گا اسیلے چلا آیا۔

بڑھیا۔ بیٹا بھگوان تجھے کامیاب کرے اور اس سے زیادہ عزت دے۔

پریم سنگھ۔ (اندر سنگھ سے) ہاں اندر ایک ضروری بات تمہیں بتا دوں۔ پولیس کی تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان لوگوں کی ایک خاص علامت ہے یعنی (ass) سمجھ رہے ہیں) ریڈنگ اس را ایک کارٹھی کی ٹوپی دکھا کر جس پر ریڈنگ اس ہنا ہے) اس طرح کی جماعت میں داخلہ کے وقت تمہارے نام ایک دوسرے کو نہیں بتائے جاتے۔ نہ بعد میں معلوم ہوتے ہیں۔ ہر شخص کا ایک نمبر مقرر کر دیا جاتا ہے اور اس علامت کے ذریعہ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کو پہچان لیتے ہیں۔

کوئی اس علامت کو ٹوپی پر بنایا ہوتا ہے کوئی کوٹ پر۔ کوئی نکلٹی پر۔ کوئی بن یا نکلٹی میں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سلام کی جگہ دیش سیکو کی ہے، کہتے ہیں پولیس نے ابھی اس بات کو پوشیدہ رکھا ہے کہ کہیں سازش اس سے طبع

ہو کر اس علامت کو علیحدہ ذکر دیں۔

موہنی :- (یکایک) دیکھنا پریم سنگھ جی، اس انگوٹھی میں بھی یہی نشانی بنی ہوئی ہے۔

پریم :- اندر اور بڑھیا تینوں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہیں۔

پریم سنگھ :- یہ شادی کے تحفہ والی انگوٹھی ہے نا؟

موہنی :- جی ہاں۔

پریم سنگھ :- ٹھیک ہے۔ اب آپ اسے پہنے ہی رہتے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے کوئی مفید کام نکلے۔ ماں سے مخاطب ہو کر

اچھا تو مال اب میں جاتا ہوں۔

موہنی بھی کھڑی ہو جاتی ہے۔

موہنی :- (پریم کی ماں سے مخاطب ہو کر) اماں جی آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں۔

بڑھیا :- بڑے شوق سے۔ جب تمہارا جی چاہے آسکتی ہو۔ تمہارا گھر ہے۔

موہنی :- میا آپ کی بہت فکر گذاروں۔ اچھا آداب۔

بڑھیا :- جیتی رہو۔

موہنی :- (داند سے) بھیا آداب۔

اندرا سنگھ :- آداب۔

پریم سنگھ اور موہنی دونوں جاتے ہیں۔ بڑھیا پھر رہنے لگتی ہے۔ اندر سنگھ پھر اپنی بندوق صاف کرنے لگتا ہے۔

اندرا سنگھ :- (ماں سے) اماں! بھیا ضرور موہنی دیوی سے شادی کر لیں گے۔

بڑھیا :- پھر کیا ہرج ہے بیٹا۔ ہمیں تو انکی خوشی سے خوشی ہے اور بچہ یہ ہے کہ بڑی چچی لڑکی ہے۔

اندرا سنگھ :- ہاں یہ بات تو ہے۔

پریم سنگھ :-

مدن لال دیکھ کر مڑتے اندر سنگھ کا باپ بچل کر گر گیا تھا

اپنے بیڈ روم میں سلپنگ سوٹ پہنے سہری پرلیٹا ہے۔

انگڑائیاں لے رہا ہے، آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر بند کر بیٹتا ہے۔

یکایک کہیں قریب سے گانے کی آواز آتی ہے۔ مدن چونکتا ہے۔

آنکھیں ملتا ہے جدھر سے آواز آ رہی ہے اُدھر کان لگاتا ہے۔

گانے کی آواز برابر آ رہی ہے۔ دو تین منٹ تک ایسی طرز

مستعار ملتا ہے پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس

جا کر ہمہ تن گوش ہو کر سنتا ہے۔ پھر یکایک کسی خیال

کے آجانے سے اپنی میز کی طرف پلٹتا ہے۔ دراز میں کوئی چ

تلاش کرتا ہوا نہیں ملتی۔ ادھر ادھر ڈھونڈتا ہے۔ آخر

کرسی پر نشال پڑی ہوئی ہے اسے اٹھا کر دیکھتا ہے اور

ایک چمڑے کا بکس پڑا ہے۔ اٹھا کر کھولتا ہے۔ اس

دودھ بین ہے۔ دو درمیں بیکر فوراً پھر کھڑکی کی طرف

ہے اور گانے والے کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گانا

آواز برابر آ رہی ہے۔ روپ گمار ہی اپنے مکان کی دور

منزل میں اپنے کمرہ میں بیٹھی تان پور سے ہر گار ہی۔

مدن بالوں سے دیکھ کر اپنا ہونٹ کاٹتا ہے اور گانا

رہا ہے اتنے میں گانے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔

تان پور رکھ دیتی ہے اور راداس کو آواز دیتی ہے۔

راداس اچانک لاو۔

یہ کہہ کر کھڑکی کے سانسے کھڑی ہو جاتی ہے اور

دیکھنے لگتی ہے۔ گانا بند ہو جانے کے بعد مدن فوراً براہ

کمرہ میں جاتا ہے۔

مُنو! مُنو!

مُنو! ابھی تک پٹنگ پر پڑا سو رہا ہے۔ مدن

جمعہ بھوڑتا ہے۔

مُنو! مُنو!

مُنو فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔

مُنو:- سرکار!

ہوئے سازش کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے۔

مُنو:- جی ہاں دی۔

مدن:- جلدی ادھر آؤ۔

مدن:- تب تو اور بھی رستہ صاف ہو۔

مُنو کو ساتھ لیکر مدن اپنے کمرہ میں آتا ہے۔ کھڑکی کے

برابر کھڑا کر کے دُور میں اُسکے ہاتھ میں دیتا ہے۔

مُنو:- نہیں سرکار۔ یہ کام ایسا سہل نہیں۔

مدن:- سامنے دیکھو!

مدن:- مُنو کچھ بھی ہو۔ یہ کام تو کرنا ہی ہوگا۔ میں تو مری

طرح مر گیا۔

مُنو دُور بین سے دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:-

ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ مدن سے مخاطب ہو کر آداب

مُنو:- واہ وا۔ کیا پیاری صورت ہو۔

عرض ہے سرکار!

مدن:- مُنو! میں تو مر گیا۔

مدن:- آؤ پہلوان میں ابھی تمہیں بلوائے ہی والا تھا۔

مُنو:- سرکار وہ چیز ہی ایسی ہے۔

پہلوان:- بندہ خود ہی حاضر ہو گیا۔ فرمائیے کیا حکم ہے۔

مدن:- اے کجفت ٹوٹے اسکی آواز نہیں سنی۔ قیامت کا

مدن:- پہلوان آج تمہاری عقلندی اور دوستی کا امتحان ہے۔

کھلا ہے۔

پہلوان:- سرکار! خادم اسی دن کیلئے ہوئے ہیں کہ وقت

مُنو:- سرکار آپ نے کہاں سنا؟

پر آفکے کام آئیں۔ ہمیں جان بھی جائے تو پروا نہیں۔

مدن:- (انکلی سے اشارہ کر کے) جاتے ہو اس مکان میں

کون رہتا ہے؟

مدن:- اے میں تو سو رہا تھا۔ یکایک کان میں گانے کی

پہلوان:- نہیں سرکار مجھے تو نہیں معلوم۔

اور آتی بس آنکھ کھل گئی۔ پھر میں نے دُور میں اٹھا کے

مدن:- پیڈاکٹر ٹنڈن کا مکان ہے۔

دیکھا۔ ابھی یہ تان بٹورائے گا یہی تھی۔ مُنو جی کہتا

پہلوان:- کون! دی ڈاکٹر ٹنڈن جو سازش کے

سے بچ ہیں۔ ہاتے کیا پیاری آواز ہے۔ ہمیں اس مکان

سلسلے میں پکڑا گیا ہے؟

میں آئے آج چاروں ہونگے اور آج تک خبر نہ ہوئی کہ

مدن:- ہاں دی۔ تم نے اُسکی بیوی کو دیکھا ہے!

آسمان کی حورِ بخل ہی میں موجود ہے۔ مُنو کچھ تدبیر کرو۔

پہلوان:- نہیں سرکار! میں نے تو نہیں دیکھا۔

تو:- سرکار تدبیر تو کی جاتے مگر.....

مدن:- ہاتے قیامت کی قیامت۔ اور کہیں تم اس کا گانا

سن لو تو اپنی جانگی بائی اور زہرہ بائی اور گوہر جان سب کو

بھول جاؤ۔

سینکڑیا اور خرید لی۔ وہ تو ایک بڑے مخزن اور دولت مند

پہلوان:- سرکار سے کہاں ملاقات ہوئی۔

میں:- کس کی بیوی ہے؟

مدن:- اے ملاقات ہی ہو جاتی پھر کیا شکل تھی۔ میں نے

تو:- ڈاکٹر ٹنڈن کی۔

ابھی ابھی اُسے سانس ملنے دے رہا ہے میں لاشارہ کر کے کھڑے

میں:- کون ڈاکٹر ٹنڈن۔ دی تو نہیں جو دس پندرہ دن

دیکھ اور ذرا دیر پہلے وہ یہیں بیٹھی گا رہی تھی۔ بس دل تپ گیا میں تو میری طرح مر گیا پہلوان۔ ملاقات کی کوئی تدبیر کر رہیں تو میری جان پر بن جائیگی۔

پہلوان :- سرکار معاملہ تو بہت ٹیڑھا ہے مگر ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔

مدن :- وہ کیا؟

پہلوان :- دُرگا پوجا کے بہانے سے سرکار نواح اور دُشہ کا ایک جلسہ کریں اور اُس میں سب پڑوسیوں کو بلائیں، اس طرح تعارف ہو جائیگا بعد میں تنور سے نکل آئیں گے۔

مدن :- اور اگر انہوں نے دعوت قبول نہ کی تو۔

پہلوان :- نہیں سرکار رہیں ہم اُن سے دعوت میں شریک ہونے کا وعدہ لے لیں گے بعد میں بندوبست کریں گے۔

بلکہ اس تفعہ کو ایسی فیصل کئے دیتے ہیں، سرکار وہاں تشریف لے جلیں اور خود دعوت دیں۔ ممکن نہیں کہ وہ ہٹکار کر سکیں۔ مُتو۔ ہاں سرکار پہلوان کی باتوں سے بالکل ٹھیک ہو۔

مدن :- تو پھر میں کُترے پہن لوں۔ اتنے تم معلوم کرو کہ کُتر پر میں کہیں باہر تو نہیں جاتی تھیں۔

پہلوان :- اچھا سرکار۔

مُتو اور پہلوان جاتے ہیں۔ راستہ میں۔

پہلوان :- کہو دوست کیسی جڑی۔

مُتو :- اُسے تاقابل ہیں تمہاری حکمت کے۔ مگر بات تو جب ہے کہ کھیل ذرا لمبا چلے تو یاروں کا بھی کچھ ہاتھ ہو۔

پہلوان :- تم دیکھتے جاؤ۔ اب یہ احمق جانا کہاں ہے۔ مدن تیار ہو جاتا ہے۔ اتنے میں پہلوان اور مُتو واپس آ جاتے ہیں۔

پہلوان :- سرکار ابھی وہ باہر نہیں گئیں۔

مُتو :- پہلوان اور مدن قینوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔

کوشی میں جاتے ہیں۔ اطوار کرتے ہیں۔ نوکر ڈرانگ روم میں لہجہ کر جھاتا ہے۔ روپ کماری داخل ہوتی ہے۔ تینوں کھڑے ہو کر کُترے آداب عرض کرتے ہیں۔ وہ بھی جواب دیتی ہے۔

پہلوان :- آپ ہمارے راجہ مدن لال صاحب آف پنج پورہ ہیں۔

روپ کماری :- اچھا! آپ ہی نے یہ برابر ڈالی کوشی کی ہو؟ مدن :- جی ہاں۔

روپ کماری :- تشریف رکھئے۔

سب بیٹھ جاتے ہیں۔

روپ کماری :- جناب نے کیسے تکلیف فرمائی۔

مدن :- میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینے آیا ہوں۔

روپ کماری :- فرمائیے۔

مدن :- بات یہ ہے کہ دُرگا پوجا کے موقع پر ہر سال ہمارے یہاں پنج پورہ میں پنج گانے کا جلسہ ہوا کرتا ہے۔ اب چونکہ میں تبدیل آپ ہوا کی غرض سے یہاں آیا ہوا ہوں اس لئے خیال ہے کہ جلسہ ہمیں کر لیا جائے۔ دراصل یہ ایک خاندانی رسم ہے اور پُشتوں سے ہوئی چلی آتی ہے اس لئے میں اسے

جند کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم لوگ یہاں برہمنی ہیں اور جب تک ہمارے سب پڑوسی

روپ کماری گھنٹی بجاتی ہے۔ رامداس آتلیہ

روپ کماری :- سنگٹ لاؤ۔

رامداس سنگٹ لاتا ہے۔

شریک نہ ہوئے۔ جلسہ بالکل بے لطف رہے گا۔

روپ کماری خود راجہ صاحب کو سنگٹ پیش کرتی ہو۔ راجہ صاحب شکر یہ کہہ کر سنگٹ لے لیتے ہیں۔ روپ کماری دُوبہ میز پر رکھ دیتی ہو اور مُتو اور پہلوان سے کہتی ہے کہ آپ بھی شوق فرمائیے۔ دونوں ایک ایک سنگٹ لے لیتے ہیں۔

اس لئے آپ سے عرض ہے کہ پرسوں شام کو ہمارے یہاں تشریف لائے اور ہمیں شکریہ کا موقع دیکھئے۔

روپ کماری :- بہت اچھا۔ میں حاضر ہوں گی۔

مدن :- مگر شب کا کھانا بھی آپ کو دہیں کھانا ہوگا۔

روپ کماری :- اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔

مدن :- تکلف تو کچھ نہیں لیکن اگر آپ اس حقیر دعوت کو قبول

کر لیں گی تو مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔

روپ کماری :- آپ کی خوشی اسی میں ہو تو مجھے کوئی عذر نہیں۔

مدن :- بڑی ہر بانی۔

پہلوان :- ہم لوگ آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔

روپ کماری :- واہ صاحب اسیں شکریہ کی کونسی بات ہو۔

مُتو :- (پہلوان سے) پڑوسی ہونے کی حیثیت سے آخر ہمارا

بھی تو آپ پر کچھ حق ہے۔

روپ کماری :- ضرور۔

مدن :- تو اب اجازت ہے۔

روپ کماری :- بہت اچھا۔

مدن :- آداب۔

روپ کماری :- آداب۔

مُتو اور پہلوان :- آداب۔

موتوں میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی میں واپس آتے ہیں۔

مدن :- پہلوان دیکھا؟

پہلوان :- ہاں سرکار دیکھا۔ سرکار کا انتخاب پھر ایسا ویسا

تو نہیں ہوتا۔

مدن :- اور اخلاق کیسا اچھا ہے۔

مُتو :- کیا بات ہے اخلاق کی۔

پہلوان :- مگر ایک بات میں کہو نہ گا۔ سرکار کے قدموں کی قسم

بار بار سرکار کو میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آخر ایسے بچیلے

جوان بھی تو روز روز دیکھنے میں نہیں آتے۔

مدن :- اب لگے تم مجھے بنانے۔

مُتو :- نہیں سرکار۔ یہ تو پہلوان نے سچ کہا۔ جس وقت اُس نے

سکڑت سرکار کے سامنے پیش کیا اُس وقت سرکار دیکھتے کہ کس

انداز سے اُس نے سرکار کو دیکھا۔

مدن :- (مسکرا کر) اور تم سمجھتے ہو کہ میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

اُسے میں تو اُس کی ایک ایک ادھ کو تاثر رہا تھا۔ اچھا پہلوان۔

اب یہ کھانے اور گانے والے کا انتظام سب تمہارے ذمہ ہو۔

پہلوان :- سرکار سب سچائی بجاتے ہیں ہوجاینگا۔ میں

ابھی جا کر دو طاقوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ اور کھانے کے

لئے فریو کینی کو بھیجک دیدینگے۔

مدن :- اچھی بات ہے کتنا روپیہ درکار ہوگا!

پہلوان :- بس یہی کوئی سات آٹھ سو روپیہ میں سب

(انتظام ہوجاینگا) مدن نوٹ لگا لکر دیتا ہے۔ پہلوان نوٹ

لے کر مُتو کو دیتا ہے (اور کہتا ہے)۔

پہلوان :- اب بھی مُتو یہ روپیہ تم رکھو اور حساب بھی تم ہی

رکھنا۔ حساب کتاب میری جان اُچھتی ہے۔

مُتو روپیہ لے لیتا ہے۔

مدن :- تو حساب کتاب کی ضرورت ہی کیا ہو گی غیر کا معاملہ

ہے! جتنا اُٹھیکا اُٹھ جائیگا۔

پہلوان :- نہیں سرکار۔ حساب جو جو بخشش سوسو۔

دونوں سلام کر کے چلے جاتے ہیں۔

Royal Bakery رائل سکیری

سازشی جمع ہیں۔

امر سنگہ جو صورت بھی ہو۔ سردار کا چھڑانا ہمارا فرض ہو۔

میں نے سمجھا تھا کہ ہے عہد وفا، عہد وفا  
تجّ کہا تم نے کہ مجبور تو آزاد نہیں

کیا کہوں کیلئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں  
دل میں اک تیر ہو پوست، تری یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آئیگا بھی قدغن، تو نہیں  
قید ہے جسم، تو کیا لوح بھی آزاد نہیں

کیا کروں آہ بھلایا نہیں جانا مجھ سے  
وہی پیمانِ محبت جو نہیں یاد نہیں

بنتے بنتے تری تصویر بڑھ جاتی ہے  
یاس میں آہ تصور بھی تو آزاد نہیں

چاندنی، موسمِ گل، صبحِ جن، خلوتِ ناز  
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہو کچھ یاد نہیں

گناہِ غم ہونے کے بعد مصلِ برخواست ہوئی، ہو۔ مدنِ لال  
ہماؤں کا شکر یہ ادا کرتا ہے۔

مدنِ لال۔ میں آپ صبا جان کا بیچد شکر گزار ہوں کہ  
آپ نے تکلیف فرما کر اس فعل میں شرکت کی اور مجھے عزت  
بخشی۔

ایک ہماؤں۔ میں سب لوگوں کی طرف سے اور خود اپنی طرف  
سے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ہم لوگوں کی خوش  
قسمتی ہو کہ آپ سے تعارف ہو گیا۔ اور آپ کی انتہائی عنایت  
ہے کہ آپ نے ہم لوگوں کو مثل اپنے خاص دوستوں کے دعوت

چاہے اس میں چند جانیں ہی کیوں نہ جائیں۔

ایک۔ لیکن فقط جان دیدہ بنے سے کیا نتیجہ اگر ہم سردار کو  
نہ چھڑا سکیں، جان دینے والے ہمارے پاس کافی ہیں، لیکن  
انتہیاء تو نہیں۔

اگر سنگد۔ ہاں یہ ٹھیک ہو۔ سردار کی گرفتاری سے ساری  
اسکیں تنہا ہو گئیں ورنہ اب تک انتہیاءوں کی کیا کمی ہوتی۔  
دوسرا۔ اگر کافی قیمت دی جائے تو انتہیاء رائج بھی جتنے  
ہا ہیں مل سکتے ہیں۔

ایک۔ لیکن اس وقت زیادہ رد یہ بھی تو ہم خرچ نہیں کر سکتے۔  
اگر سنگد۔ ملے بہادر بنارسی داس کے بچہ کو (کھلم کھلا کر)  
رکڈ نیپ کرنے کی اسکیم آج تک اپنی پیڑی ہوئی ہو، کیوں اُسی  
پر عمل نہ کیا جائے۔

دوسرا۔ بات تو ٹھیک ہے۔

ایک۔ ہاں اگر یہ تدبیر عمل گئی تو سب کام درست ہو جائینگے۔  
اگر سنگد۔ تو پھر آج ہی اُسکے لئے دن مقرر کر دینا چاہیے۔  
مسٹر نمبر ۱۲۔ آپ کب آسانی سے اسکا بندوبست کر سکیں گے۔

نمبر ۱۲۔ کل بتا سکر تھا۔

اگر سنگد۔ اچھی بات ہے۔

راجہ مدنِ لال کے یہاں ڈنر اور ڈانس پارٹی

کھانا ہو رہا ہے۔ بہت سے مرد اور عورتیں شریک ہیں۔  
روپ کماری مدنِ لال کے برابر بیٹھی ہو۔ باتیں ہو رہی ہیں کھانا  
ختم ہوتا ہے۔ سب بڑے کمرہ میں آتے ہیں، گانا شروع ہوتا  
ہے۔ بس کنول کماری ایسیچیز غزل گاتی ہیں۔

ہنس رہا ہوں، لبِ محبوبہ نہ فریاد نہیں  
کوئی کیا جلے کہ غم دیدہ ہو ملے، خدا نہیں



اور محفل میں شریک کیا۔ اچھا گڈ نائٹ۔

مدن لال :- گڈ نائٹ۔

ہمان اپنی اپنی گاڑیوں اور موٹر کاروں میں سوار ہو کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

مدن لال :- (روپ کماری سے) آپ کی کار نہیں آئی ؟

روپ کماری :- میں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ وہ ہے ہی گے قدم کا فاصلہ۔ یوں ہی چلی جاؤ گی۔

مدن لال :- اجازت ہو تو میں پوچھا دوں۔

روپ کماری :- نہیں۔ اب آپ تکلیف نہ کیجئے۔

مدن لال :- تکلیف تو نہیں خوشی ہو گی۔

روپ کماری :- اچھا تو چلئے۔

دونوں ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ جب روپ اپنے مکان میں داخل ہونے لگتی ہے۔ مدن اس کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے :-

مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔

روپ کماری :- اب کل۔

یہ کہہ کر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتی ہے۔

## ڈاکٹر ٹنڈن کی کوٹھی

تقریباً آدمی رات کا وقت۔ روپ کماری ابھی مدن کی پارٹی سے واپس آئی ہو اپنے سونے کے کمرہ میں پہنچ کر سب زیورات اتار کر میز پر ڈال رہی ہے اور کپڑے اتار کر ایک طرف گرہی پر رکھ دیتی ہے۔ لباس شب خوابی پہن لیتی ہے۔ بڑے آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔ پھر ایک انگڑائی لیتی ہے اور مدھنشی نکل کر کے مسہری میں داخل ہو جاتی ہو۔ نائٹ لائٹ روشن ہے۔ امر سنگہ خاکی لباس پہنے مٹہ پر نقاب

ڈالے۔ مکان کے عقب سے کپڑا ڈھکیں داخل ہوتا ہے اور مسرونی

زمین کے راستہ اوپر کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ پستول ہاتھ

میں ہے۔ ایک کمرہ میں سے گزرنے کے۔ کھڑکی سے کوکڑ روپ کماری

کی خواب گاہ میں پہنچتا ہے۔ میز پر پڑے ہوئے زیورات کو

دیکھتا ہے۔ سب کو ہاتھ سے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔

پھر باقی کمرے کا جائزہ لیتا ہے، میز پر ایک صندوق پر رکھا ہے۔ اُسے کھولتا ہے۔ کسی چیز سے ٹھوکر لگتی ہے۔ کھٹکا ہوتا ہے۔

روپ چوٹتی ہے۔ امر سنگہ فوراً پردہ کے پیچھے چھپ جاتا

ہے۔ روپ کماری مسہری سے نکل آتی ہے۔ ادھر ادھر دیکھتی ہے۔

پھر پردہ کو ایک طرف کھینچتی ہے جس کے پیچھے امر سنگہ ہاتھ

میں پستول لئے مٹہ پر نقاب ڈالے کھڑا ہے۔ روپ کماری اُسے

دیکھ کر چیخ مارے گرتی ہے اور بیہوش ہو جاتی ہے۔ امر سنگہ

ایک لمحہ خاموش کھڑا اُس کو دیکھتا ہے پھر کچھ سوچ کر اپنا

نقاب اٹک دیتا ہے۔ روپ کماری کو اٹھا کر مسہری پر لٹاتا

ہے، میز پر صراحی رکھی ہے۔ نکاس میں پانی اُٹھیل کر روپ کماری

کے برابر مسہری پر بیٹھ کر روپ کماری کے چہرہ پر پانی کے چھینٹ

دیتا ہے۔ میز پر سے راشننگ پیڈ کا گتے کر روپ کماری

کو پٹکھا جھٹکتا ہے۔ دھنڈ میں روپ کماری آنکھیں کھولتی

ہے اور خاموشی کے ساتھ خوفزدہ آنکھوں سے امر سنگہ کو

دیکھتی ہے۔

امر سنگہ :- بائی آپ ڈر رہے ہیں۔

روپ کماری اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ امر سنگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

روپ کماری :- آپ کون ہیں ؟

امر سنگہ :- میں کون ہوں ؟ (دھر جھکا کر) آپ کیسے بتاؤں کہ

میں کون ہوں جو کوئی بھی ہملا آپ کا مجرم ہوں۔

روپ کماری بڑے غور اور دھچپی سے امر سنگہ کو دیکھتی

ہے، امر سنگہ جیسے روپ کماری کے زیورات نکال کر اس کے سامنے

ہیں۔ وہ بھی عدالت سے صاف چھوٹ گیا۔ اسی کو لوٹنے اور قتل کرنے کے لئے آیا تھا۔ کمرہ میں داخل ہونے کے بعد جب میں نے میز پر زیورات اور گری پر آپکے کپڑے پڑے دیکھے تو یقین ہو گیا کہ میں غلطی سے کہیں اور ٹکس آیا لیکن ان زیورات کو میں نے اپنی اور دوسری مجلسی اور فافٹھی کا علاج سمجھ کر اٹھا لیا، کمرے کی تلاشی لے رہا تھا کہ شاید کچھ اور مل جائے گنگے سے آپکی آنکھ کھل گئی۔

روپ کماری :- آپ تو کوئی بہت ہی شریف اور تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔

امرسنگھ :- دہلی :- کیا شریفوں کے یہی کرتوت ہیں۔ آہ خدا اس بے روزگاری کو غارت کرے، جس نے چور ٹاٹا کو، خونی سب کچھ بنا دیا۔

روپ کماری :- کیا میں آپکی کچھ مدد کر سکتی ہوں ؟

امرسنگھ :- میں آپکا بیوٹھکے گزار ہوں۔ بس اتنا کہیے کہ میرے تصور کو معاف کر دیجیے۔

روپ کماری :- اب اس ذکر کو جانے دیجیے۔

اٹھک میز کی دوازہ کھڑکی ہے اس میں سے کچھ نوٹ نکالتی ہے۔

روپ کماری : مجھے آپ کے ساتھ بے انتہا ہمدردی ہے اور مجھے بے انتہا خوشی ہوگی اگر آپ میری اس حقیر مدد کو قبول فرمائیں گے۔

امرسنگھ :- محبت اور شکر کی نظروں سے روپ کو دیکھتا ہے، اگر آپ یہ رقم مجھے قرض کے طور پر دیدیں تو عمر بھر آپکا احسان نہ بھروں گا۔

روپ کماری :- جس طرح آپ کا جی چاہے۔

امرسنگھ :- (درد پیہ میسر) آپکا بہت ممنون ہوں۔

روپ کماری :- (ایک منٹ کے وقفہ کے بعد) آپ سے ایک

ڈالہ تیار ہے۔

امرسنگھ :- دہلی مجھ سے بڑا تصور ہوا۔ معاف کر دیجیے۔

روپ کماری : سخت حیران ہو کر امرسنگھ کو دیکھتی ہو، پھر کہتی ہے :-

روپ کماری :- آپ کو بتانا پڑ چکا کہ آپ کون ہیں !

امرسنگھ :- دہلی : وہ کوئی اچھی بات نہیں ہے آپ جانتا چاہتی ہیں۔

روپ کماری :- نہیں۔ بتائیے۔

امرسنگھ :- میں ایک چور، ڈاکو، خونی ہوں اور کیا بتاؤں یا ایک مصیبت کا مارا ہوا ایک بد نصیب انسان۔

روپ کماری :- (امرسنگھ کا ہاتھ پکڑے) بیٹھ جاسیے۔

(امرسنگھ بیٹھ جاتا ہے) اب تفصیل سے سنائیے کہ آدھی رات کے وقت آپ میرے کمرے میں کیسے آئے۔

امرسنگھ :- چوری کر کے آیا تھا۔

روپ کماری :- تو پھر چوری کر کے بھاگ کیوں نہیں گئے ؟

امرسنگھ :- جب آپ گر کر یہ ہوش ہو گئیں اور میں نے آپکو دیکھا تو میرا دل بے اختیار ہو گیا۔ آپکی موہنی صورت نے

مجھے قید کر لیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ خوف بھی ہوا کہ یہ ہوش

چھوڑ جانے میں کہیں آپ کی جان کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔

میرا رادہ بدل گیا۔ پھر دھڑل میں آپکے یہاں چوری کے ارادہ سے آیا بھی نہ تھا۔ مجھ سے بھول ہوئی مجھے بتایا

گیا تھا کہ نمبر ۱ کی کوٹھی میں بیج پورہ کا جوان اور بدعاش

راجہ ٹھہرا ہوا ہے۔

روپ کماری :- ادہ۔ وہ تو نمبر ۱۱ میں ہیں۔

امرسنگھ :- متوڑے دن ہوتے ہیں شراب کے نشے

میں میرے بوڑھے باپ کو اپنی موٹر سے کھل کر مار ڈالا پھر رشتہ

دے کر گرا ہوا کو توڑ دیا اور جس طرح دو تین دن انصاف خریدتے



نرس :- لیکن مسند رگر کی کو خبر ہوئی تو غضب ہوا جائیگا۔  
مسند :- خبیث ہر جائیگی۔ تم اپنی خالہ کے گھر دیہی پور جا رہی ہو۔

نرس :- (مسکرا کر) یہ تو ٹھیک ہی۔ مگر.....

اتنا کہہ کر بچے پلٹ کر دیکھتی ہی۔ بچہ غائب ہے۔

نرس :- (گھر کر) سستی کہاں چلا گیا۔

گھرائی ہوئی اس طرف جاتی ہو اور چلا کر پکارتی ہے :-

ستی، سستی، سستی۔

اور نہ پا کر شور مچاتی ہے۔

لے دو دو۔ دو دو۔ سستی کو لے گئے۔ سستی کو لے گئے۔

نمبر ۱۲ چپکے سے کھسک جاتا ہے۔

یہ سیدھی تھی

## ڈاکٹر ٹرنڈن کا مکان

روپ کماری اور امر سنگھ ایک صوفے پر پاس بیٹھے ہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔

روپ کماری :- رات آچے جلنے کے بعد بہت دیر تک نیند نہ آئی، آنکھ لگی تو پھر آپ کو خواب میں دیکھا۔ یہ نہیں بتا دو گی کس طرح دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر میں آنکھ کھل گئی۔

امر سنگھ محبت بھری نظروں سے روپ کماری کو دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے :-

یہ آپ کا ریڈیو کام کرتا ہے۔

روپ کماری :- آہاں۔

آنکھ ریڈیو کو (set) سٹ کر دیتی ہے۔ خبریں

سیان کی جا رہی ہیں۔

(۱) ریاست راجپور میں ایک دوسرے کا بچہ پیدا ہوا ہے۔

(۲) دہلی میں لالہ ہر نام داس کی سات برس کی بچی نے

بیان کیا کہ میں پچھلے جنم میں مٹھرا کے ایک صرف کنندہ لال کی بیوی تھی۔ گندہ لال اپنے پچھلے جنم کی بیوی سے ملنے کے لئے دہلی بلانے گئے ہیں۔ روز ہزاروں مرد عورت اس لڑکی کو دیکھنے آتے ہیں اور لالہ صاحب کے مکان پر ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔

(۳) بے روزگاری سے تنگ آ کر ایک نوجوان بلیڈ پر سہانے نئے کانپور میں، دیہاتے گندکائیں ڈوب کر جان دیدی معلوم ہوا ہے کہ دو برس ہوئے اُس نے قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا مگر آپ تک باکل بیکار تھا۔

(۴) بھوک ہڑتال کی وجہ سے دیش سیوکوں کے سرغنہ مشر مکر جی کی حالت رات سے بہت نازک ہے۔

(۵) آج کپتان پریم سنگھ کی کوششوں سے ایک دیش سیوک اور گرفتار ہوا ہے اور عارضی طور پر کپتان صاحب کی خدمات محکمہ پولیس کو دیدی گئی ہے۔

امر سنگھ غصہ سے کاٹنے لگتا ہے۔ پھر جیت رومال نکال کر چہرہ کا پینہ بونچھتا ہے۔ روپ کماری کی نظر رومال پر پڑتی ہے۔ (سپر رومال سے جھڑک کر اس بنا ہے۔ روپ کماری :- لا متیغرا نہ) اچھا امر سنگھ جی آپ بھی دیش سیوک ہیں ؟

امر سنگھ :- (حیران و مضطرب ہو کر) آپ نے کیسے جانا ؟ روپ کماری :- (رومال کی طرف اشارہ کر کے) اس ریڈیو کلاس سے۔

امر سنگھ :- آپ بھی دیش سیوک ہیں ؟ روپ کماری :- (الٹی آنکھ تری دکھلا کر حسب پریدہ کر س بناؤ) جی ہاں میں بھی دیش سیوک ہوں لیکن مکر جی کی گرفتاری کے بعد سے میں دیش سیوک منڈل کے حالات سے باکل بیخبر ہوں۔ اس وقت مجھے یہ معلوم کر کے ہے اتنا خوشی ہوئی کہ

نظروں سے اُسے دیکھتی ہے۔ امر سنگہ بیٹاب ہو کر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے اور لب بوس ہوتا ہے۔

## شائع عام

ایک شخص نہایت بد حال مٹرک پر چڑھا جا رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بھوکا ہے، چلتے چلتے مٹرک کے کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ امر دودھ کی ٹوکری لے کر ایک کچنرٹن برابر سے گزرتی ہے۔ یہ شخص ہلچائی ہوئی نظروں سے امر دودھ کو دیکھتا ہے پھر چپکے سے پیچھے پیچھے جا کر ٹوکری میں سے کئی امر دوٹھا لیتا ہے اور فوراً کھانا شروع کر دیتا ہے۔ عورت خبردار ہو کر شور مچاتی ہے۔ لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور باقی امر دوٹس سے چھین کر کچنرٹن کو دیدیتے ہیں اور اس شخص کو مڑا بھلا کہنا شروع کرتے ہیں۔

وہ شخص یہ کہیں کیا خبر دے کہ میرا کیا حال ہے۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھا یا ہے۔ بھوک سے جان بھل رہی ہے۔ ایک راہگیر۔ تو مزدوری کی ہوتی یا لوگوں کا مال لوٹنا غرض کر دیا۔

وہ شخص یہ مزدوری کہاں ہے مزدوری؟ ایک اور راہگیر۔ (طنز و حقارت سے) کہاں ہے مزدوری؟ بد معاش کہیں کا۔ چوروں کیلئے مزدوری کہاں سے آتی۔ وہ شخص۔ بس خبردار۔ اب ایک لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا۔

ایک اور راہگیر۔ اس چوٹے کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے۔

ایک اور آدمی۔ جواب تک نہیں بولا تھا اُسے جاؤ بھتیجاؤ۔ کاٹے گری کے پیچھے پٹے ہو جاؤ اپنا کام دیکھو۔

آپ دیش سیکو کہ ہیں۔

امر سنگہ۔ اور مجھے آپ سے زیادہ خوشی ہوئی۔

روپ کماری۔ اچھا اب تک آپ لوگوں نے پریم سنگہ کی کوششوں کے روکنے کا کیا بندوبست کیا۔ دراصل ہماری جماعت کی بربادی کا باعث یہی شخص ہے۔

امر سنگہ۔ ایسور چاہے تو دیش کا یہ دشمن اسی ہفتہ گرفتار ہو جائیگا۔ اور جلد اپنے کئے کی سزا پائیگا۔

روپ کماری۔ امر سنگہ جی میں بیان نہیں کر سکتی کہ اس وقت آپ کے ان چند جلوں نے مجھے کس قدر خوش کر دیا۔ بھگوان آپ کو کامیاب کرے۔ ہاں ایک بات تو میں آپ سے پوچھنا چاہوں گی۔

امر سنگہ۔ وہ کیا؟

روپ کماری۔ اس وقت منٹل کا سردار کون ہے؟

امر سنگہ۔ نمبر ایک سو گیارہ۔

روپ کماری۔ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔

امر سنگہ۔ اُن سے ملکر کیا کیجیے گا۔

روپ کماری۔ میں اُن سے اتنا کر دیتی کہ جس طرح ہو جلد سے جلد اس بد معاش پریم سنگہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

امر سنگہ۔ میں آپ کا یہ پیغام سردار کو پہونچا دوں گا۔

روپ کماری۔ شاید آپ کو مجھے اعتراض نہیں جو آپ مجھے اُن سے ملانا نہیں چاہتے۔

امر سنگہ۔ تعجب ہے؟ آپ کو امر سنگہ کے متعلق ایسی بدگمانی ہے۔ اچھا فرمائیے۔ منٹل کا سردار آپ کے سامنے موجود ہے۔

روپ کماری۔ (متحیرانہ) امر سنگہ جی۔ آپ خود؟

امر سنگہ۔ جی ہاں۔ لیہ کہہ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ روپ کماری کے دونوں کان دھڑکنا شروع ہو جاتے ہیں۔

وہ شخص :- ہائے قسمت۔ دنیا نہ جینے دیتی ہو نہ مرنے دیتی ہو  
بھائی میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ مجھے میرے حال  
پر چھوڑ دیجئے۔

امر سنگہ :- آخر کچھ اپنا حال تو کیجئے۔ شاید میں آپ کی کچھ  
مدد کر سکوں۔

وہ شخص :- مجھے اب کئی مدد نہیں چاہیئے۔ بس مجھے اس نامراد  
زندگی کا خاتمہ کر لینے دیجئے۔

امر سنگہ :- ہمت سے کام لو بھائی۔ جوان ہو اتنا درست  
ہو، خود کو کتنی بزدلوں کا کام ہو۔ اور جان ہی دینا ہو تو دیش  
کی سیوا میں جان ددکے نام بھی ہو اور کام بھی۔

وہ شخص :- اچھی باتم میں جائے وہ دیش جو اپنی اولاد کو  
روٹی بھی نہ دے سکے۔

امر سنگہ :- بھائی آپ کی طرح لاکھوں انسان بے روزگاری  
سے بہ حال ہیں۔ نہ پیٹ کو روٹی نہ تن کو کپڑا۔ کیا آپ کے جان  
دینے سے یا اور بہتوں کے خودکشی کر لینے سے یہ بے روزگاری  
کی بلا دیش سے دور ہو سکتی ہے۔

وہ شخص :- تو پھر آپ کا یہ مطلب ہے فائے کر کر کے مرجانا چاہیئے  
امر سنگہ :- نہیں آپ میرے ساتھ آئیے میں آپ کو وہ تدبیر  
بتاؤں گا جس سے آپ کو بھی فائدہ پہنچے اور دیش کی بھی  
بھلا ہو۔

دونوں چپ چاپ بھاٹک کے اُس طرف آجاتے ہیں  
اتنے میں ٹرین گزر جاتی ہے۔ بھاٹک خود بخود کھل جاتا ہے۔  
امر سنگہ اپنا صندوق اٹھایا ہوا ہے اور اُس شخص کو اپنے  
ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ دونوں روانہ ہو جاتے ہیں۔  
امر سنگہ :- آپ کو کام مل جائیگا آپ گھر رہیں نہیں۔

وہ شخص :- کہاں سے مل جائیگا۔ آج تو بڑھ چکا ہے۔ ہو گیا ملے  
پھرتے ہوئے جہاں جاؤ یہی چاہے ملتا ہو کہ جگہ خالی نہیں۔

اُس شخص کا ہاتھ پکڑ کے) تم میرے ساتھ آؤ بھائی۔  
مجمیع منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ آدمی ایک دوائی کمال کراس  
شخص کے حوالہ کرتا ہے اور کہتا ہے :-

لو، کچھ ایک کھالیں لادو دوائی دیکھ اپنی راہ لیتا ہے  
وہ شخص کچھ دیر کھڑا سوچتا ہے۔ پھر ایک دکان سے پوریا  
خسید کر کھاتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ روانہ ہو جاتا  
ہے۔ لیول کراسنگ (Crossing) آتا ہے۔  
ریل کا پھانک بند ہے۔ یہ شخص کو دکر ریل کی پٹری کے  
کنائے کنائے ایک طرف کوچلا جاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔

امر سنگہ کا ذہن بے پرواہ چھوٹا سا صندوق نے جا رہا  
ہے۔ صندوق پر لکھا ہے (Crossing) ریل بیکر۔  
(Crossing) کراسنگ لیول کراسنگ آتا ہے۔ پھاٹک  
بند ہے۔ امر سنگہ ٹھہر جاتا ہے۔ دو ایک منٹ کھڑا رہتا ہے۔  
ادھر ادھر ٹرین کو دیکھتا ہے۔ بہت اندھیر ہے۔ ایک جانب  
پٹری پر کوئی چیز پڑی نظر آتی ہے۔ امر سنگہ اپنا صندوق  
اُتار کر زمین پر رکھ دیتا ہے، کھول کر اُس میں سے ایک ٹوچ  
(Screw) نکالتا ہے اور اُس طرف روشنی ڈالتا ہے۔ روشنی  
میں فاصلے پر ایک شخص پٹری پر لیٹا نظر آتا ہے۔ امر سنگہ  
پھاٹک کو پھانک کر اس طرف جاتا ہے اور اُس شخص کو اٹھاتا  
ہے۔

وہ شخص :- (بگڑ کر) جاؤ اپنا راستہ لو۔

امر سنگہ :- بھیا اس وقت آپ کی عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ آپ  
میرے ساتھ چلیئے۔

وہ شخص :- میری عقل بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم  
اپنا کام دیکھو۔

امر سنگہ :- نہیں۔ اب میں آپ کو اکیللا ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔



اس کے علاوہ سوسائٹی کی ایک خاص نشانی بھی ہے یعنی (Cass Community) ریڈ کراس۔ یہ ہر وقت آپ کو اپنے پاس رکھنی چاہیئے۔ چاہے ٹوپی پر بنائیے چاہے کوٹ پر، چاہے اُنکوٹھی یا ٹین میں۔ اس کی مدد سے سوسائٹی کے سب ممبر ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں (اسکے بعد سکرٹری سے) مسٹر نمبر ۵ کا الاؤنس دیدو۔ سکرٹری میں روپے کے نوٹ اس شخص کے حوالے کرتا ہے۔

امر سنگھ :- یہ آپ کا ایک ہینڈ کا الاؤنس ہے۔ وہ شخص :- میں آپ کا بیلڈنگ گڈار ہوں۔

امر سنگھ :- اس وقت سب بڑا کام یہ پیش ہے کہ پاکستان پریم سنگھ جس نے ہماری جماعت کو تباہ کر ڈالا ہے۔ جس طرح بنے جلد سے جلد اُسے گرفتار کیا جائے۔ سب :- بیشک۔

امر سنگھ :- اس لئے کل چار آدمیوں کی ضرورت ہوگی، (سکرٹری سے) دیکھو تو کل کس کس کی ڈیوٹی کا دن ہو؟ سکرٹری :- نمبر ۱۳۔ نمبر ۱۰۔ نمبر ۱۲ اور نمبر ۱۱ سے نمبر ۱۳ تک۔

امر سنگھ :- بس تو پہلے چار آدمی جائینگے۔ تفصیل کل صبح بتائی جائیگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس وقت تک ہتھیاروں کی بہت کمی ہے۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تھوڑی سی ہمت سے اس کا بندوبست بھی بہت آسانی سے ہو جائیگا۔

ایک :- وہ کیا صورت ہے؟

امر سنگھ :- آج ہی مجھے خبر ملی ہے کہ شکار یوگی ایک باڈی رامن گمر کے جنگل میں شکار کیسے کیسے جا رہی ہو۔ یہ لوگ اتوار کی رات کو روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ کم سے کم دس بارہ

بندوقیں ہونگی۔ میگزین بھی کافی ہوگا، اگر یہ سب سامان ہاتھ آگیا تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی، اس کے متعلق مفصل پروگرام کل رات کو طے کیا جائیگا۔ مجلس برخواست ہوتی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر لگ جاتے ہیں۔

نمبر ۵ :- (امر سنگھ سے) اگر آپ کی اجازت ہو تو کل کی ہم پر میں بھی جانا چاہتا ہوں۔

امر سنگھ :- اچھی بات ہے۔ تو پھر رات کو ہمیں رہ جائیے کیونکہ صبح ہی جانا ہے۔

نمبر ۵ :- بہت اچھا۔

## ڈاکٹر سٹن کا مکان

روپ کماری اور مدن لال ایک صوفے پر بیٹھے ہیں۔ مدن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ روپ کماری خاموش ہو۔ مدن :- تو آپ کا خیال ہے کہ میری محبت محض بناوٹی اور نمائشی ہے۔ روپ کماری :- میں نے تو یہ نہیں کہا۔

مدن :- ہاں کہا تو نہیں۔ مگر میرے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اُس کے تو یہی معنی ہیں۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایک عیاش آدمی محبت کرنا کیا جانتے۔ روپ :- یہ سچ ہے میں نے بہت آداریگی کی ہے لیکن پھر بھی آخر میں انسان بنی تو ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل اور دل میں محبت کا جذبہ ہے۔

روپ کماری :- شاید ہو۔

مدن :- شاید ہو؟ ہاں تمہیں کس طرح یقین آ سکتا ہے روپ مجھے اقرا ہے کہ میں آدودہ تھا ہر جاتی تھا عیاش تھا مگر تم نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ میری ساری آرزوئی کامر کر



کر دیا ہے۔ جب تک اُسے موت کی گود میں نہ دیکھ لو گی میرے دل کو چین نصیب نہ ہوگا۔

مدن سنائے میں آجاتا ہے تھوڑی دیر تک خاموشی رہتی ہے۔

روپ کماری: (دلظن سے) سن لیا آپ نے؟

مدن: ہاں سن لیا۔ روپ شاید تم پر سمجھتی ہو گی کہ میں محبت کی دیوی کو جان کی بھینٹ دینے سے ڈرتا ہوں۔

روپ کماری: شاید۔

مدن: نہیں روپ اس کا تجربہ تم بھی کر سکتی ہو۔ (دو بار پرستے ایک چھری اتار کر جو آرائش کئے گئی ہوئی تھی) اپنے ہاتھ سے فتح کر ڈالو۔ اگر اُن کر دل تو مرو نہیں۔ اور اگر کہو تو اپنے ہاتھ سے اپنا گلہ کاٹ کے رکھ دوں۔

روپ کماری: اس سے مجھے کیا فائدہ۔

مدن: فائدہ؟ ہاں نہیں اس سے کیا فائدہ۔ خیر جو کچھ ہو۔ میں تمہارے اپنی جان قربان کر سکتا ہوں لیکن کسی اور کے خون سے ہاتھ دھو سکتا ہوں۔ (میرا دل کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا۔ روپ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک رہا تو.....)

روپ کماری: رات کا شکریہ ایک اور سہل تدبیر بھی ہے۔

مدن: وہ کیا؟

روپ کماری: پریم ایک چھو کری برہمڑی طرح مرتا ہے۔ اگر چند روز کے لئے غائب کر دیا جائے اور یہ افواہ اُڑا دی جائے کہ وہ مار ڈالی گئی تو مجھے یقین ہے کہ پریم دوبارہ جوجائے گا۔ اور خود سرکلز انگرا کے صرحا بیٹھا۔

مدن: (خوش ہو کر) ہاں یہ کام میں کر سکتا ہوں۔

روپ کماری: کب؟

مدن: تین دن کے اندر اندر۔

اب صرف ایک ذات ہو اور وہ تم ہو۔ روپ اب مجھ میں بالکل صبر کی تاب نہیں۔

روپ کماری: مجھے بہت افسوس ہے۔

مدن: نہیں بہت افسوس ہو۔ کاش افسوس کی جگہ تمہیں حمد ملتی ہوئی۔ وہ روپ تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرے سینہ کے اندر کیسا طوفان چا ہوا ہو کیا قیامت ہو کہ تم میرے پاس ہو پھر بھی مجھ سے دور ہو۔ کہوں روپ تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا تمہاری صورت سے تو نہیں معلوم ہوتا کہ تم اس قدر بیدار رہو۔

یہ کہہ کر روپ کماری کے ہاتھ تھام لیتا ہے۔

روپ کماری: (سر جھکا کر) مدن میں سب کچھ جانتی ہوں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ لیکن جب تک اپنے دل کو چین نہ ہوا اس کیسے محبت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

مدن: روپ میری ساری دولت تمہارے قدموں پر نثار ہو۔ اگر تم اس سے اپنے دل کا چین خرید سکو۔

روپ کماری: آپ کی محبت کا شکریہ۔ مگر افسوس ہے کہ دولت میرے درد کا علاج نہیں۔ عیش و راحت کے ضروری سامان تو خدا کی مہربانی سے یہاں بھی کم نہیں مگر اس سے حیرت کیلچہ کا ناسور تو نہیں بھر سکتا۔

مدن: آخر بیان تو کرو۔ شاید میں کسی کام آسکوں۔

روپ کماری: بیکار ہی بیان کرنا۔ یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔

مدن: پھر بھی بتانے میں کیا نقصان ہو۔

روپ کماری: آپ کو ابھر رہے تو سن لیجئے پریم سنو کہ گو آپ جانتے ہیں؟

مدن: وہی نا جس نے ڈاکٹر صاحب ڈسٹرکٹ جی کو گرفتار کر لیا ہے۔

روپ کماری: ہاں وہی۔ اس معاملے میں میرے کیلچہ میں ناسور ڈال دیتے ہیں میرا بھر لگھو بلکہ میری ساری زندگی کو تباہ و برباد

روپ کماری :- یقیناً۔  
مدن :- یقیناً ایک منٹ خاموش رہ کر، اچھا اسکے بعد۔  
روپ کماری :- اس کے بعد روپ تمہاری موگی۔  
مدن :- (خوشی سے بیتاب ہو کر) ہوئی شرط! لاؤ ہاتھ!  
روپ کماری ہاتھ دیتی ہو۔ مدن چونکا جانتا ہے۔  
روپ کماری ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔  
روپ کماری :- پہلے شرط پوری ہونی چاہیے۔  
مدن :- (افسردہ ہو کر) اچھی بات ہے۔

## پبلک گارڈن

باغ کے ایک ایسے حصہ میں جہاں نسبتاً بہت کم لوگ  
آ جا رہے ہیں موہنی ایک بچہ پر نہایت افسردہ ٹھہری ہوئی ایک  
نوجوان مرد اُدھر سے گزرتا ہے۔ موہنی کو دیکھ کر ٹھٹکتا ہے  
پھر چل پڑتا ہے کچھ دور جا کر آہستہ آہستہ پلٹتا ہے قریب  
آ کر پھر ٹھٹکتا ہے۔ اس وقت موہنی کا ہاتھ بچہ کی پشت پر رکھا  
ہوا ہے۔ اس طرح کہ (Miss) ریڈ کراس دہلی  
انگوٹھی جو اس کی انگلی میں ہے سامنے ہے۔ اُسے دیکھ کر نوجوان  
بچا ایک موہنی کے سامنے آ کر :-  
”دیش سیک کی جے“

موہنی چونک پڑتی ہو مگر فوراً سنبھل کر اسی طرح جواب  
دیتی ہو۔

”دیش سیک کی جے“ آپ کا نمبر ؟

نوجوان :- نمبر ۹۹ (نیاؤے)

موہنی پر تشریف رکھئے۔

نوجوان :- (بہت خوش ہو کر بیٹھ جاتا ہے) دیوڑی! میں نے کبھی  
آپکو منڈل کے جلسوں میں نہیں دیکھا۔

موہنی :- میں منڈل کے جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوتی۔ میں  
دیش سیک منڈل کے سردار کی جی کی جیملی ہوں۔ جس دن وہ  
گرفتار ہوئے اُس دن ایک اُس وقت ہماری شادی ہوئی تھی۔  
نوجوان :- (چونک کر) اچھا تو موہنی دیوڑی آپ ہی ہیں۔

موہنی :- جی ہاں جب سے وہ گرفتار ہوئے میں منڈل کے  
حال سے بالکل بیخبر ہوں۔ آہ، بھگوان ناس کرے اس بدذات

## پریم سنگھ کا مکان

پریم سنگھ اپنے کمرہ میں کپڑے پہن کر باہر جانے کیلئے  
تیار ہو رہا ہے۔ ملازم داخل ہوتا ہے۔

ملازم :- حضور ایک سپاہی پولیس صاحبکے یہاں سے آیا  
ہے۔ ملنا چاہتا ہے۔

پریم سنگھ :- کہہ دو آتے ہیں۔

اس کے بعد کوٹ پہنکر باہر نکلتا، جو سپاہی باقاعدہ  
سلام کرتا ہے اور کہتا ہے :-

سپاہی :- حضور! بڑے صاحبکے سلام لہلا ہو اور حضور  
کو فوراً بلا دیا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔

پریم سنگھ :- (کچھ سوچ کر) اچھا تو ایک گاڑی لے لو۔

سپاہی :- حضور موٹر موجود ہے۔

پریم سنگھ اور سپاہی دونوں موٹر میں سوار ہوتے  
ہیں۔ دوسرا سپاہی پیٹے سے موٹر میں موجود ہیں۔ موٹر چل پڑتی  
ہے جس وقت آبادی کے باہر سڑک پر پہنچتے ہیں  
اچانک دوسرا سپاہی پریم سنگھ کو پٹ جالتے ہیں۔ تیسرا سپاہی  
مدد کرتا ہے۔ تینوں ملکر پریم سنگھ کو باندھ لیتے ہیں اور منہ

موہنی :- اماں! پریم سنگھ جی کا پتہ لگ گیا۔ وہ دیش سیکورس کی قید میں ہیں۔ پیرسوں صبح میں انہیں چھڑانے کے لئے جب رہا ہی ہوں۔

بڑھیا :- بیٹی خدا کیلئے کہیں تم خود ان بد معاشوں کے حال میں نہ پھنس جانا۔ پولیس کو اطلاع کیوں نہ کر دی جائے۔ موہنی :- بنیں اماں جی۔ اس وقت پولیس کو اطلاع کرنے میں پریم سنگھ جی کی جان کا خطرہ ہے۔ بیٹا اندر سنگھ بھی نہیں آتے۔

بڑھیا :- وہ تو ابھی گیا ہے اور کل کسی وقت آئیگا۔

موہنی :- تو پھر جس وقت آئیں مجھے چپا کے ہاتھ فوراً ہلا بیٹھے گا اُن سے کچھ ضروری مشورہ کرنا ہو۔

بڑھیا :- اچھی بات ہے۔

موہنی انشکار کر کے رخصت ہوتی ہے۔

## آدمی رات کا وقت

ایک مڑ موہنی کے مکان سے کچھ فاصلہ پر گرا بڑی تھی۔

تین نقاب پوش اس میں سے اترتے ہیں۔ مکان کا دروازہ

بند ہے۔ یہ لوگ اُتر کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں اور مکان کے

اند پونچنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کچھ فاصلہ پر ایک مکان

سے ملا ہوا ایک بلند درخت ہے۔ ایک آدمی اس پر چڑھ جاتا ہے۔

اور اس برستے مکان کی چھت پر گر کودتا ہے۔ وہاں سے

چھتوں چھتوں، چھپتا ہوا موہنی کے مکان کی چھت پر پہنچتا

ہے۔ مکان میں اُتر جاتا ہے اور دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس کے

باقی دو ساتھی بھی مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مکان میں

بالکل اندھیرا ہے۔ ٹورچ کی روشنی میں ٹھوٹے ہونے ایک

کمرہ میں پہنچتے ہیں جس میں ایک پنگ پر کوئی سو رہا ہے۔

پریم سنگھ کا جینٹلمن سیکور برادریا لڈا سا وقعہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے اُس کا خون نہ بہاؤنگی آرام سے نہ بیٹھونگی۔ اس ارادہ سے میں کئی دن سے اُسکی گھات میں تھی مگر پیرسوں نے نہ کہ وہ یکایک غائب ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں ؟

نوجوان :- دیوڑی آپ پریم سنگھ خوش ہوئی کہ پریم سنگھ دیش سیکورس کی قید میں ہے۔

موہنی :- رے! انتہا خوشی کا چہرہ بنا کر م واقعی ؟

نوجوان :- جی ہاں۔

موہنی :- او بھگوان۔ تیری بڑی ہر بانی۔ بھائی کسی طرح مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ غصہ اور بے رحمی سے میرا کچھ پھینا جاتا ہے۔

میں چھری کے ایک ہی وار میں اُس خونی کام تمام کر دوں گی۔

نوجوان :- پیرسوں صبح میں ڈیوڑی پر وہاں جاؤنگا۔ سردار

بھی وہیں ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اُن سے مل لیں۔ پھر جیسی اُن

کی صلاح ہو ویسا کیا جائے۔ آپ کہیں تو میں آپ کو اپنے

ساتھ لے چنوں۔

موہنی :- میں عمر بھر آپ کا احسان نہ بھولونگی۔ پیرسوں صبح کو

آپ جہاں کہیں وہاں آپ کو بل جاؤں۔

نوجوان :- یہیں مل جائیے۔

موہنی :- بہت اچھا۔ دیش سیکورس کی ہے۔

نوجوان :- دیش سیکورس کی ہے۔ (دونوں جاتے ہیں)

## پریم سنگھ کا مکان

موہنی بہت ہی گھبرائی داخل ہوتی ہے۔

موہنی :- اماں جی آداب۔

بڑھیا :- جیتی رہو بیٹی۔ استغدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو ؟

ایک شخص آگے بڑھ کر ایک کبل ٹکے اوپر ڈال دیتا ہے۔ عورت جاگ اٹھتی ہے اور چیخ مارتی ہے۔ ایک آدمی اُسکے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے۔ پھر اُسے باندھ دیتے ہیں اور کاندھے پر بٹا کر باہر لے آتے ہیں۔ پھر موٹر میں ڈال کے روانہ ہو جاتے ہیں۔

— میری بیٹی —

مدن لال جیڑ مسرور روپ کماری کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ روپ کماری سنبھلا کر رہی ہے۔  
مدن :- روپ، کام ہو گیا۔  
روپ کماری :- (بے انتہا خوش ہو کر) سچ!  
مدن :- حق۔

روپ کماری :- (جیتا ہوا) دو ڈگر مدن کو پٹ جاتی ہے پھر یکایک تڑپ کر اُسکے آغوش سے نکل جاتی ہے) مگر جب تک میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں مجھے اطمینان نہیں ہو سکتا۔  
مدن :- تو وہ کونسا مشکل کام ہے۔ ابھی چل کے دیکھ لو۔  
روپ کماری :- اچھا۔

یہ کہہ کر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کمرہ سے باہر نکلتے ہیں اور بڑی عجلت سے موٹر میں سوار ہو جاتے ہیں جو باہر انتظار کر رہی ہے۔ موٹر تیزی سے روانہ ہو جاتی ہے۔  
موٹر چلی جا رہی ہے۔ ایک دفعہ مدن روپ کماری کو زور سے چٹائیے گا۔  
ٹھوڑی سی کشمکش کے بعد روپ اُس سے جدا ہو جاتی ہے۔ موٹر بچ پورہ بلیس پہنچتی ہے۔ نوکر چاکر استقبال کو دوڑتے ہیں۔ مٹو اور پہلو ان بھی موجود ہیں۔

مدن :- (پہلوں سے) کہاں ہے پہلو ان!  
پہلو ان :- سرکار تشریف لائے۔  
پہلو ان آگے آگے اور مدن اور روپ پیچھے پیچھے جاتے

ہیں۔ کئی کمروں سے گذر کر ایک کمرہ میں پہنچتے ہیں۔ ایک عورت رسیوں سے بندھی ہوئی ایک کرسی پر پڑی ہے۔ روپ کماری کو دیکھ کر ایک چیخ مارتی ہے، روپ اُسے دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتی ہے۔

روپ کماری :- آہ! حرامزادی! اب دفعا بازی کا نتیجہ دیکھ لے۔

یہ کہہ کر چھری لیکر نکلتی ہے۔  
مدن :- روپ نہ کیلتے۔ یہ کیا غصہ کرتی ہو۔  
روپ کماری :- (مدن کو جھٹکا دیکر) چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ سارے فساد کی جڑ یہی ہڈیات تو۔  
مدن اور روپ میں کشمکش ہو رہی ہے۔

مدن :- مگر پہلے تو کبھی تم نے موہنی کا کوئی تصویر نہیں بتایا۔  
روپ کماری :- لے لے یہ موہنی ہے کب؟ یہ تو میری ملازم چمپا ہے۔ جو میرے یہاں سے خفیہ کاغذات لے کر بھاگ گئی تھی اور جس کی وجہ سے ہم پر یہ تباہی آئی۔  
سب حیران ہو کر چمپا کو دیکھتے ہیں۔

مدن :- چمپا؟  
روپ کماری :- ہاں چمپا۔ مدن دیکھو اس وقت مجھے چھوڑ دو۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے انتقام لے لینے دو۔  
مدن :- روپ ذرا صبر سے کام لو۔ یہاں سے یہ کہاں جاؤ گے۔ موہنی کا حال تو اس سے پوچھ لینے دو۔ پھر نہیں افسوس ہے۔

روپ کماری بیٹھ جاتی ہے۔  
مدن :- چمپا۔ موہنی کیا ہوئی۔  
چمپا :- ہمارا جج مجھے کچھ نہیں معلوم۔ شام کو پریم سنگھ جی کی اماں نے مجھے بھیجا کہ موہنی دلو کی بولا لاؤں گی۔ انہوں نے

کامیاب ہو جائیگی لیکن اگر ہم لوگ رات میں کسی وقت واپس آجائیں تو دن نکلنے سے پیشتر آپ مع سٹپ پولیس کے پہنچ جائے۔ اندر سنگھ :- بہن تم خواہ خواہ اپنے کو خطرہ میں ڈال رہی ہو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گا۔ موہنی :- نہیں بھئی آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ (یشور چاہے تو سب اچھا ہی اچھا ہو گا۔ یہ لوگ موٹر میں (ریبلنگ کارڈن) باغ کے دروازہ پر پہنچ جاتے ہیں۔

موہنی :- بس اب آپ یہیں کہیں ٹھر جاتے۔ موہنی باغ کے اندر چلی جاتی ہے۔ اندر سنگھ باہر رہ جاتا ہے۔ موہنی اسی جگہ پہنچتی ہے نمبر ۹۹ اس کا منتظر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر دیش سیلوک کی جے۔ کہتے ہیں۔ دونوں بہت خوش نظر آتے ہیں۔ باغ سے نکل کر نمبر ۹۹ ایک ٹیکسی کو آواز دیتا ہے۔ دونوں اس میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اندر سنگھ اپنی موٹر میں اس ٹیکسی کا تعاقب کر رہا ہے۔ موہنی کی ٹیکسی بہت آگے ہے۔ اندر سنگھ بار بار دوڑنے سے دیکھتا ہے آخر موہنی کی ٹیکسی ٹھہرتی ہے اندر سنگھ بھی اپنی موٹر روک بیٹھا ہے۔ نمبر ۹۹ اور موہنی اتر پڑتے ہیں اور ٹیکسی رخصت کر دی جاتی ہے۔ نمبر ۹۹ اور موہنی کچھ دور پیدل چلتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک اور موٹر ٹرانکی منتظر ہے اس میں بیٹھ کر پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اندر سنگھ فاصلے سے تعاقب کر رہا ہے۔ آخر موہنی کی موٹر رکتی ہے۔ موہنی اور نمبر ۹۹ دونوں اتر کر کھنے پینے میں داخل ہوتے ہیں۔ اندر سنگھ بہت دور فاصلے پر اپنی موٹر روکتا ہے اور اور موٹر کو ایک طرف چھپا دیتا ہے۔ خود دوڑ میں اٹھ کر لے چھپتا ہوا ان کا تعاقب کرتا ہے۔ یہ لوگ ایک بڑی گڑھی میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے کچھ حصے ٹوٹ ٹوٹ کر کھنڈر

کہا کہ میری طائزہ کام سے اپنے گھر کی ہو۔ تم یہاں ٹھہر جاؤ اور جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں رہنا۔ وہ جو تکین تو پھر نہ آئیں۔ شاید رات کو وہیں رہ گئی ہو گی۔ سرکار میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی خبری نہیں کی۔ روپ کمار سی :- (جھٹاکر کچھ کڑی سے کھڑی ہو جاتی ہے) حرا ضرادی، مکار، جھوٹی کہہ کر پھر چپا کی طرف چھپتی ہے ملاؤں روک لینا ہو اور کہتا ہے۔

مدن :- میرا خیال ہو کر ابھی اسے یہیں قید رکھا جلتے اس بہت سی مفید باتیں معلوم ہو گئی۔ اور اب چلے موہنی کا پتہ چلا کہ اسکی گرفتاری کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ کہہ کر روپ کا ہاتھ پکڑ کے کمرے سے باہر لے آتا ہو اور موٹر میں بیٹھنا چاہتا ہے۔

روپ کمار سی :- اچھا میں اس سے ایک بات اور پوچھ لوں۔ سب پلٹتے ہیں۔ روپ اٹھینان سے چپا کے پاس جاتی ہے۔ چھری جو مدن نے اس کے ہاتھ سے چھین کر وہیں میز پر ڈال دی تھی۔ اٹھا کر اچانک چپا کے سینے میں بھونک دیتی ہے۔ سب اسے کر کے رہ جاتے ہیں چپا تڑپنے لگتی ہے اور فریسی دیر میں سرور ہو جاتی ہے۔

مدن :- (سخت ہدحوں ہو کر بیلوان اور منوسے) جلد سے جلد بسے دفن کر دو اور کسی کو کانوں کا خبر نہ ہو نہیں تو ہم میں سے کسی کی جان کی خیر نہیں۔

پہلوان :- (رہنایت پریشانی کے عالم میں) اچھا سرکار۔

دن کا وقت۔ موہنی اور اندر سنگھ ساتھ ساتھ پریم سنگھ کے مکان سے نکلتے ہیں۔ باہر موٹر کھڑی ہے۔ اس میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ موہنی :- اول تو امید ہے کہ میں ایسی ہی اُن کے چھٹلے میں

کمرہ سے باہر نکلتی ہو اور اُس طرف پہنچتی ہے جہاں پر یریم سنگہ قید ہے۔ سرن نمبر ۹۹ پہرے پہرے بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا ہے۔ موہنی کی طرف اُس کی پیٹھ ہے۔ موہنی چپکے چپکے جا کر پستول اُس کے سامنے کر دیتی ہو اور کہتی ہو۔  
خاموش! کھڑے ہو جاؤ۔

نمبر ۹۹ کھڑا ہو جاتا ہے۔ موہنی اُسے ایک طرف ہٹانے کا اشارہ کرتی ہے۔ وہ ہٹتا ہے۔ یریم سنگہ دوڑ کر اپنی کونٹہ کے دروازہ پر آتا، دو اور حیران ہو کر کہتا ہو۔  
موہنی!

موہنی: یریم سنگہ جی۔  
یریم سنگہ: موہنی کو ٹھہری کی گنجی، اسکی جیب میں ہو۔  
موہنی: (نمبر ۹۹ سے) گنجی زمین پر ڈال دو۔  
نمبر ۹۹ گنجی جیب نکال کر موہنی کے آگے ڈال دیتا ہو۔  
موہنی گنجی اٹھا کر دروازہ کھول دیتی ہو۔ یریم سنگہ نکل آتا۔  
اور نمبر ۹۹ کی بندوق اٹھا لیتا ہے۔  
یریم سنگہ: (نمبر ۹۹ سے) آگے آگے چلو۔

نمبر ۹۹ آگے آگے چلتا ہے اور یہ دونوں پیچھے پیچھے ایک دروازہ سے گزرتے ہیں۔ چند قدم چل کر نمبر ۹۹ اس زائے کو کھینچ لیتا ہے جو جھٹ میں ٹنگ رہی ہو۔ الارم بج جاتا ہے۔ یریم سنگہ جھٹا کر اُسے گولی مار دیتا ہو۔ وہ آہ کر کے گرتا ہو۔  
یریم سنگہ: موہنی جلدی کرو۔

موہنی کا ہاتھ پکڑ کے تیزی سے بھاگتا ہو۔ ابھی چند قدم جاتا ہو کہ بہت سے قدموں کی آواز آتی ہے۔  
یریم: آہ! قیمت نے اب بھی ساتھ نہ دیا۔  
دونوں پھر ہٹتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔  
کے دوسری طرف بہت سے مسلہ لوگ آ جاتے ہیں۔  
کی آدمی: (چلا کر) دروازہ کھول دو۔

ہو گئے ہیں اور کچھ حصے ابھی تک میچ و سالم باقی ہیں۔ اندر سنگہ پلٹ آتا ہے۔

نمبر ۹۹ دروازہ پر ڈیش سیوک کی بجے کھتا ہو۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔ دونوں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ پھر بند کر دیا جاتا ہے۔

نمبر ۹۹: (پہرہ دار سے) سردار میں؟  
پہرہ دار: نہیں۔ وہ تو صبح سے کسی ضروری کام سے شہر گئے ہیں۔

نمبر ۹۹: (موہنی سے) سردار کے آگے تک آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

موہنی: (پھری نکال کر) آہ! اب تک انتظار کرنا پڑ چکا۔  
نمبر ۹۹: موہنی کو اپنے ساتھ ایک کمرہ میں لیجاتا ہے جہاں کافی ہتھیار اور میگنرین موجود ہے۔ کمرہ میں داخل ہو کر نمبر ۹۹ بیٹیاں نیکر وغیرہ فوجی وردی پہن لیستا ہو اور موہنی سے کہتا ہے۔

نمبر ۹۹: آپ ٹھوڑی دیر یہاں آرام کیجئے۔ میں ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔ سردار کے آگے بنی آپ کو ان سے ملا دوں گا۔

یہ کہہ کر چلا جاتا ہے۔ یریم سنگہ کی کوٹھری کے دروازہ پر پہنچ کر پہرہ دار سے گنجی لیتا ہو اور اُس کو رخصت کر دیتا ہے۔ پہرہ دار اُسی کمرہ میں آتا ہے جس میں موہنی بیٹھی ہے۔ موہنی کو دیکھ کر ڈیش سیوک کی بجے کھتا ہو۔  
موہنی بھی اسی طرح جواب دیتی ہے۔ یہ شخص وردی اتار کر سادہ کپڑے پہن لیستا ہو اور چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد موہنی اٹھ کر ادھر ادھر ہٹتی ہے۔ ہر چیز کا اندازہ کرتی ہے۔ خصوصاً ہتھیاروں کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر اپنے کپڑوں میں سے ایک پستول نکال کر اچھی طرح اسکی جانچ کرتی ہے اور پھر اپنی ساڑی میں چھپا لیتی ہے۔ دو منٹ کے بعد

پریم سنگھ کچھ جواب نہیں دیتا۔

ایک - دروازہ توڑ ڈالنا چاہیے۔

دروازہ توڑنا شروع کرتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص کہتا ہے: ہر وہ! دروازہ مت توڑو۔ دوسرے بھی بند کرو ورنہ کل نہ سکیں اور بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔

ایک اور - بالکل ٹھیک۔

فورا لکڑیوں، پتھروں اور مٹی کے انہار سے دروازہ دوسرے بند کر دیا جاتا ہے۔

اور غمر اس نکتے میں گھانا کھالا جاتا ہے۔ سب کھانا شروع کرتے ہیں۔ جب کھانا قریب قریب کھایا جا چکا ہے یکایک دیش بیگوں کی ایک مسلح جماعت جس کا سردار نمبر ۵، وہی نہیں گھیر پتی، ہوا اور سب بندوقیں اور کارٹوس ایک کرکٹسٹیم زون میں غائب ہو جاتے ہیں۔

ایک شکاری - (دکڑے پاجامہ والے صاحب) یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ دو دو پڑھیل پر تو یہاں سے گاؤں ہی۔ وہاں چل کے کھانا کھا لیتے تو ایسی مصیبت تھی مگر تمہارا تو دم نکلا جا رہا تھا۔

پاجامہ والا - میری وجہ سے ہوا یا بندوقوں کی وجہ سے ہوا، میں تو اسی وجہ سے ہمیشہ سے محملی کے شکار کا طوفان ہوں۔ پھر میں نے کیا ان حراسر اددوں سے سازش کر لی تھی کہ ہمیں ٹوٹ کے لیجانا۔

ایک اور شکاری - میری بندوق دادا جان کے وقت کی تھی، غدر میں انھوں نے کسی رئیس سے چھین لی تھی۔ اب ایسی چیز نصیب نہیں ہو سکتی۔

پاجامہ والا - بس تو یہ ساری نحوست تمہاری ہی بندوق کی تھی۔ چوری کا مال چوری میں گیا اور دوسروں کا بھی نقصان کر گیا۔

ایک اور شکاری - اب ان فضول باتوں سے کیا فائدہ۔ فورا چل کے پولیس کو خبر دینی چاہیے۔

پاجامہ والا - رہنشان ہو کر کیا؟ ابھی پھر چلنا ہو گا ابھی کھانا کھایا ہے۔ یاد رکھو تو خدا کا خوف کرو۔ ذرا دم تو لینے دو۔ پولیس کو فورا خبر کرنے سے بندوقیں تو سنسنے رہیں۔

ایک اور شکاری - (رجل کر) اچھا تو اب تم یہاں آرام کو ہم تو جاتے ہیں۔

(سب چل پڑتے ہیں)

دس بارہ شکاریوں کی ایک پارٹی جنگل میں چلی جا رہی ہے۔ کچھ برس پہلے ہیں۔ کئی ہاٹ پیسٹ پہنے ہیں۔ ایک بہت چڑے چمکے صاحب فقط کرتے پاجامہ میں ہیں۔ ہیٹ سب کے سروں پر ہیں۔ کئی ٹاڈم ساتھ ہیں۔ ایک کے پاس شکار گتے ہوتے پرند ہیں۔ ایک کے پاس لفٹن کیریر ہیں۔ ایک کے سر پر صندوق ہے۔ ایک کے سر پر کچھ اور سامان لادے۔

ایک شکاری - (دکڑے پاجامہ والا) بس بھائی۔ اب مجھ سے نہیں چلا جانا۔ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔

دوسرا شکاری - بڑے ڈھبے آدی جوجی۔ صبح ڈھائی سیر بچا ناشتہ ٹھونس چکے ہو۔ اب بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ پہلا شکاری - اچھا جو کچھ ہو۔ مجھ سے اب آگے نہیں چلا جائیگا اب ایک قدم بڑے تو میں گر پڑو گا۔

(سب ٹھہرتے ہیں)

تیسرا شکاری - اچھا تو پھر اب میں ٹھہرائیں کھانا کھالیں اور تھوڑا سا آرام کر لیں اس کے بعد آگے چلیں گے۔

سب سامان اٹا رہا ہے۔ بندوقیں ایک طرف کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ کارٹوسنگی پیشاں انہیں پر شکوہ جاتی ہیں۔ جائزہ بھائی جاتی ہے۔ صندوق میں سے رکابیاں نکالیں

امر سنگہ :- اب سمجھا۔ مجھے کہیں نے اس خونی قتل سے روکا گیا تھا۔  
 ناکا :- مایابی دیکھ کر وہی چھڑا اپنے سینے میں بھونک لیتی ہو اور گر کر مر جاتی ہے۔

پھر فیر کرنا ہو اور کہتا ہے :-

خون کا بدلہ خون۔

ہستول خالی جاتا ہو۔ بدن گاڑی میں نیچے دیک کر بیٹھ جاتا ہے۔ روپ کماری شوری جاتی ہے۔

روپ کماری :- امر سنگہ اندر کے اب فیر نہ کرنا۔

امر سنگہ :- (اگر حکم) بس خاموش رہو۔

یہ کہہ کر ایک فیر اور کرتا ہو۔ گولی بدن کی پیٹھ میں لگتی ہے اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہو۔ اتنے میں پولیس کی لارہ جس میں پریم سنگہ۔ اندر سنگہ موہنی۔ بچہ اور پولیس والے ہیں آپہنچتی ہے۔ اب دونوں طرف سے گولیاں چلتی ہیں۔ آخر ساداشی مغلوب ہو جاتے ہیں اور سب گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔

روپ کماری ایک مقتول سازشی کی کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

کمر بستہ چھانک کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آ جاتا ہے۔ موہنی کے اوجھا سا زخم گھٹا ہے۔ روپ اپنی

قارئین سناؤ! خاتمہ پر اس افسانہ کے معرض تحریر میں آنے کی وجہ بھی سن لیجئے کہ وہ بھی دلچسپی خالی نہیں بلکہ اس داستان کا ایک حصہ ہو۔ کپتان پریم سنگہ میرے بہت عزیز دوست ہیں۔ جس روز موہنی دیلوی سے اُن کی شادی ہوئی میں نے یہ پوری داستان اپنے ہاتھ سے لکھ کے درہایت خوبصورت جلد بندھوا کر "بندہ عروسی" کے طور پر اُنکے نذر کی۔ موہنی اور پریم دونوں نے اس ناچیس ہدیہ کو اُن بہت سے قیمتی تحفوں سے کہیں زیادہ پسند کیا جو رش دی کے موقع پر اُن کے دوستوں نے انہیں دئے تھے۔

جیسا کہ میں ابتدا میں بیان کر چکا ہوں اس افسانہ کے بعض واقعات کا آپس ایک دوسرے کو قیاسی نہیں لیکن اس افسانہ کی خاطر انہیں باہم مربوط کر دیا ہو۔ تاہم اس داستان کا ایک بہت بڑا حصہ پریم اور موہنی کے واقعات و زندگی پر مبنی ہو۔

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

پہلے سچہ سچہ

## عمدہ ڈرائے

صدید زبول :- اشتیاق حسین صاحب قریشی کا بہترین ڈرامہ انسانی کیفیات اور قلبی واردات کو بہترین انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ قیمت ۱۰ رو۔

نقش آخر :- اشتیاق حسین صاحب قریشی کا تاریخی ڈرامہ جس میں غدر علی کے واقعات و قدیم تہذیب کی آخری جہلک کیجئے۔ قیمت ۱۰ رو۔

گناہ کی دیوار :- اشتیاق حسین صاحب قریشی کا طبعزاد و درامہ حقائق کو تشبیلی پیرامیں بیان کیا گیا ساقی گناہ کے فلسفہ کو بیان کیا ہو۔ قیمت ۸ رو۔

نفرت کا بیج :- اشتیاق حسین صاحب قریشی کا تاثر ترین ڈرامہ جس میں محبت اور نفرت دونوں قسم کے جذبات کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ رو۔

انجام :- پروفیسر عجیب بی۔ اے ڈاکٹر کا ایک اعلیٰ ڈرامہ جس میں انسان کی خود فریبی اور جمہور کی مذہبیت کی پردہ دور کی گئی ہو۔ قیمت ۱۴ رو۔

کہنیتی :- پروفیسر عجیب بی۔ اے ڈاکٹر کا ایک اخلاقی ڈرامہ جس میں مسلمانوں کی مذہبی اور قومی رہنمائی کی گئی ہے۔ قیمت ۸ رو۔

بچے کا پتہ :- سناؤ! ایک ڈرامہ جو دلچسپ ہے۔



# فولادی عشق

وائرلس کی ایجاد کے بعد بجلی جو کسی غضب الہی کی ایک اہم قوت کی مہر ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے حیرت انگیز کارناموں سے دنیا اب تک حیرتزداد قوت ہوئی ہے اس سے ہمیں زیادہ عجیب و غریب ثابت ہونے والی ہے۔ ہر انسانی ضرورت اس کی قوت مند ہوتی جاتی ہے۔ صدم سے لے کر ہر کم تک اسی کے کسٹے نظر آنے لگے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے لئے ابھی بہت سی چیزیں اس قدر دھڑکے پڑا سر اڑانہ میں موجود ہیں۔ قدرت کی لامتناہی فضا میں سائنٹفک جدوجہد کا جتنا وسیع میدان اس نے پیش کیا ہے شاید ہی قدرت کی کسی دوسری معنی طاقت کو نصیب ہوا ہو۔ اس کی سیکڑوں کرانیں، ہزاروں جادو گریاں ہم دیکھ چکے ہیں، دیکھ رہے ہیں اور خدا معلوم کتنی ابھی دیکھنی باقی ہیں۔

ایکس ریز کے کمالات ہم دیکھ چکے۔ باطن کے سارے راز کھل گئے۔ وائرلس جہاز بھری نظروں کے سامنے ہیں جن کا آبی سفر بیروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ریڈیو طیارے بھی کر رہے ہیں اپنا تسلسلہ جانے کے لئے موجود ہیں کسی ہوا بازی کی ضرورت ہے نہ پائلٹ کی حاجت۔ آوازوں کا انقباض اور انتشار بھی عمومی بات ہو گیا ہے۔ لندن کی تقریریں دہلی میں سن لیجئے۔ موٹریں سفر کرتے کرتے دنیا کے واقعات سے باخبر ہو جائیے۔ ٹیلی وژن پر آواز بھی سنئے اور صورت بھی دیکھئے۔ سینٹریل بیئر پر دے کے تصویریں ناپنے لگی ہیں۔

یہ عجائبات تو تھے ہی۔ اب کچھ دن سے ایک عجیب ترین تجربہ ہو رہا ہے اس کے کو ریڈیو رابوٹ (Radio Robot) کہتے ہیں۔ یہ مصنوعی انسان ہے جو ریڈیو کے ذریعہ سے سارے کام کرتا ہے۔ چوراہوں پر اس سے رہنمائی کی جاتی ہے۔ ناجائز جہازوں میں یہ مضبوط پائی کا سفر انجام دیتا ہے۔ بیگنوں اور سیبک اوروں میں بلورینوں کا گھبراہٹ ہونے دیتا۔ ایسیج پر باغیوں کے اشارے سے رقص سکھاتا ہے۔ یہ سب مختلف شکل و صورت کے ہوتے ہیں جو کام ان سے لینا منظور ہوتا ہے اس لحاظ سے ہاتھ پاؤں سے اور گردن حرکت کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ لائٹ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس فولادی پتیلے میں کچھ اس قسم کی احساسی قوت رکھی ہے کہ پیر کی آہٹ اور روشنی کی شعاع سے یہ زندہ ہو کر فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔

ایک پروفیسر نے اس میں کیم اور فٹسٹ ورفاسٹ کا خاصہ بھی رکھا ہے۔ مزاج پوچھتا ہے۔ جواب دیتا ہے۔ شکر ہے ادا کرتا ہے۔ سگرت پیتا ہے۔ دوسرے کا سلگنا کرتا ہے۔ بیئر کے حق گھر کے پاس کھڑے ہو کر کشائشوں کی گنتی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح لب کے ایک ماہر نے اسے رو بوٹ بنایا ہے جو علم تشریح کی تعلیم کے لئے ایک بہترین چیز ہے۔ اس کے اندر تمام انسانی اعضا موجود ہیں اور وہ سب متحرک ہو سکتے ہیں۔ بلوغتی سے یہ تکلیف کا اظہار کرتا ہے۔ امراض کی زحمتوں کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ مینی کے موقع پر ہنست ہے اور رونے کی جگہ روت ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بالکل آنکھ کی ساخت پر بنائی گئی ہیں۔ آنکھ بند کرنے کی مشق ان پر کی جاتی ہے۔

جو سن کے ایک جادوگر نے تو یہ غضب دکھایا ہے کہ اس بجلی کے گھولنے میں جان ڈال دی ہے۔ ستم ظریف نے اس میں جذبات بھی پیدا کرنے چاہے ہیں جن میں پہلے جن عشق کے جذبے کی آواز سنائی گئی۔ اور عیبیہ انسانوں کے لئے ہلاکت آفریں اور تکلیف دہ ہے ویسے ہی ان فولادی دل و گڑن والوں کے واسطے بھی ثابت ہوا۔ بنائے کو تو بنانے والے نے پلیسی پتیلے بنا ڈالے۔ اور ان کا چہرہ جہرہ۔ خدو خال۔ ہاتھ پاؤں۔ کمر۔ چال وصال۔ لب و لہجہ، وہی نزاکتیں اور لغزیمیاں بھی نمودیں جو اس قسم کے جذبات کے لئے ضروری ہیں۔ مگر جب ہر طرف سے ان کے عاشقہ کی داستانیں، ان کے پریشان کن واقعات سامنے آئے گئے اور پولس کی باز پرس نے ناک میں دم کر دیا تو یہی ایسا آدمی کہ دردناک جذبات بھی ہو گئی۔

یاد رہے تنوع پر مہر ہے۔ وہاں کی جدت پسندی نے اول اول اس طرح کافی قوت کی۔ سینکڑوں پتیلے و فوسفور جی اس نے نکال کر کے لئے نوجوان مسک کا پتلا خیر۔ تو کسی نے ایک حسین بھلی اپنی دل کی کاغذ پر کھینچ کر رکھ دی۔ چنانچہ ایک ایسے نے مددگار کی ضرورت محسوس کی اور قریب کے مکان میں ایک پتلا۔ دو قوں اپنے انگوٹوں کی فراخ دستیوں کی بدولت پرستان کا، ہم حوں کی مدد سے اپنے سر کو دھچک دیا۔

سامنا ہو گیا۔ جذبہ محبت رنگ لایا۔ شام ہوئی اور دونوں غائب، رفتہ رفتہ بالکون کو ان کی عدم موجودگی محسوس ہوئی۔ نہانش کی گئی۔ محو میوہ ایک روز اس فولادی پتلی لٹی کے آقا ہو اٹھا۔ ہوئے اتفاق سے قریب کے پارک میں نکل گئے۔ پھرتے پھرتے ایک گوشہ میں کیا دیکھو وہیں کہ ان کی لٹی اور ان کے پڑوسی نواب کا فولادی خدمت کار ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھیں پہلے غصہ آیا۔ پھر عجیب اچاند منٹ تک ان کے معاشقہ کی سیر دیکھتے رہے۔ لیکن جب ان کی بے تعلقی ختم ہونے پر ہی نہیں آئی تو انھوں نے غمگناہہ لبوں میں کچا کر رکھا۔ لٹی! یہ کیا ہو رہا ہے؟

لٹی نے ہلٹ کر جو دیکھا تو اپنے آقا پر نظر پڑی۔ اپنے کچھ جواب دیتے وہ تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔ اور فولادی نوجوان مزہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ بیچک مالک نے اپنے پڑوسی نواب کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اور ایک خطا ان کے موصعہ ڈاکٹر کو لکھا کہ آپ کے ان تیلوں کا جذبہ تشدد سے گزر گیا ہے۔ اس کی تہیر ہوئی چاہئے۔

ادھر تو لٹی کی مالک نے لٹی ڈاکٹر کو بتایا اور اس نواب کی بیچم نے اپنے ڈاکٹر کو علامت کی اطلاع دی اس سے وعدہ لیا کہ آئندہ لٹی کے ساتھ کہیں نہیں جائیگا۔ لیکن گوشت کے بنے ہوئے انسانوں میں جب محبت کے نقش بن کر نہیں مٹ سکتے ہیں تو ان فولادی پتلیوں کے یہ جذبات کب کب کھوٹا ہو سکتے تھے۔ چپ چپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اور جب کبھی ان پر سخی کی گئی کسی بھی جواب ملا کہ ہم مجبور ہیں۔ فولادی سخی نے ہمیں وابستہ کر دیا ہے، مجبوراً لٹی کا رفاہہ پیچ دی گئی اس درخواست کے ساتھ کہ اس کے دماغ کا وہ خاندان جس میں محبت پرورش پاتی ہے خدا ننگ کر دیا جائے۔ کارخانہ جاتے جاتے لٹی ڈاکٹر سے اشارے کرتی گئی جو اپنی کوٹلی کے برآمدے میں کھڑا ہوا دیدار بادی کا متفرق تھا۔

لٹی دست بدست وگرسے کا رفاہہ پہنچی۔ تو ڈاکٹر بھی تماشائیوں کی میز میں موجود تھا۔ ڈاکٹر جب لٹی کو اپنے خاص کمرے میں لے گیا تو ڈاکٹر لنگ نے دروازہ کے شیشوں میں سے سجائے شروع کیا۔ کھڑے اپنے اڈار درست کرتے ہوئے لٹی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"لی! تم نے ہماری ہر زندگی کو بدنام کر دیا!"

"بدنامی! میں نے تو آپ کے کمال کو چار چاند لگا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب!"

"پھر تمھارے مالک کو تمھاری شکایت کیوں پیدا ہوئی؟"

"رقابت!"

"رقابت کیسی؟"

"وہ اپنے لئے میری محبت کا طالع رکھے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی ہوس رانیوں کا جواب دوں۔ مگر فولادی میں نرمی کہاں۔ فولادی دل کو مٹا کر کرنے کے لئے فولادی ہی دل چاہئے!"

ڈاکٹر بیٹھ کر سچہ ہو گیا۔ وہ اپنی ایجاد پر نازاں تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے پیدا کئے ہوئے احساسات اس درجہ مکمل ہیں۔ اس کی فطرت کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ اس آتما میں لٹی کی نظر دہانے پر پڑی۔ دیکھا کہ ڈاکٹر لنگ کھڑا آسمان پر اڑ رہا ہے۔ لٹی بے چین ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے گئے۔ ڈاکٹر نے اپنے اڈار سنبھالنے لٹی کے قریب گیا اور اس کے بالوں کے نیچے لکڑی پر کچھ ٹوٹے لگا۔ پھر یہ معلوم کر کے کہ لٹی نہ رہی ہے اس نے پوچھا: لٹی! تم کیوں رو رہی ہو؟

لٹی۔ "اس لئے کہ آپ محبت کو مٹا چاہتے ہیں!"

نفسرت! وہ محبت جس سے دوسروں کو تخلیق ہوئے ان کے قابل ہے۔

انجی! م۔ پڑو۔ کیا؟

کہنتی!۔ پروفیسر عجیب بی۔

لی۔ اس طرح کہ میرے ساتھ ایک اور زندگی تباہ ہونے والی ہے۔  
ڈاکٹر۔ وہ کون ہے؟

لی۔ ڈارلنگ!

ڈاکٹر قنبرہ مارکوسنا اور یہ کہہ کر، مصنوعی زندگی بھی کتنی محسوسات سے لبریز ہو سکتی ہے: "اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس مشین کا اوپر کا حصہ کھول ڈالا۔ دماغ کے کل پوزوں پر غور کیا۔ کچھ جھوٹی پھیپھیں تھیں۔ کسی کے انقباض چاٹو کی نوک سے کھرچے کسی کے گہرے کئے۔ کوئی پیچ ڈھیلا کیا۔ کوئی گسا۔ اور پھر اس نے ہر پوزہ کو اپنی جگہ رکھ کر کوسری جگہ جوڑ دیا۔

لی زندگی ہو گئی اب اس کی نگاہوں میں نہ پیلا سا سیلاب تھا نہ اس کے چہرے پر وہ آفات قلبی کی علامتیں۔ وہ محض ایک فولادی پیلا تھی۔ ڈاکٹر نے کمرے کے کواڑ کھول دیئے اور کہا: "لی جاؤ۔ اپنے مالک کے پاس جاؤ۔ اب تم سے اس کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

آگے آگے لی تھی اور پیچھے پیچھے ڈارلنگ۔ راستہ میں کیمرہ بہ ڈارلنگ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن لی نے اسکاٹھا کر دیا۔ "بھیا۔ اس جگہ پہنچ کر جہاں سے دوڑوں کو الگ ہونا چاہئے تھا جب ڈارلنگ نے لی کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ: "لی کیا تمہاری محبت میرے لئے ختم ہو گئی؟ کیا مجھ کو تمہاری طرف سے واپس ہونا چاہیے؟" "اُوہ ہاتھ جھٹک کر یہ کہتی ہوئی کہ: "محبت! ایسی محبت! میں اس جذبہ پر بالکل غالی ہوں" روانہ ہو گئی۔ اور ڈارلنگ حیرت زدہ ہوا اس کو کھڑا کھڑا رہ گیا۔ ایک عجیب تاثر تھا۔ فولادی پتیلے کا دل پانی ہو ہو کر آنکھوں سے بہ رہا تھا۔ جسم ہر طرف ادا تھا اور اس کی ساری مصنوعی دنیا تا ایک تھی۔

خدا معلوم کتنی دیر ڈارلنگ اس جو داہرے پر کھڑا رہا۔ آخر ایک سخت گرفت نے اسے جو نکال دیا۔ اس نے اپنے مالک کو خفا ہوتے ہوئے دیکھا۔ آقا کی ہر طاعت کا جواب صرف آنسو تھے۔ جب طاعت ادا آنسوؤں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو تنگ آکر ڈارلنگ بولا "میرے آقا! اب میں آپ کے مطلب کا نہیں رہا۔ جبکہ میرے حال پر چھوڑ دیجئے باکہر خانہ بھجھ کر لی کی طرح میرے دماغ کی کل بھی درست کر ایجئے" آقا نے ڈارلنگ کو کوئی جواب نہیں دیا اور اس کو ساتھ لے کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ بھر ڈارلنگ کی نگرانی کوئی بڑی کیونکہ وہ ہر دوس قدم پر تنگ جانا تھا اور بچوں کی طرح چلنے لگتا تھا۔

گھر پہنچ کر آقا ادا ان کی ہم صاحب میں دیکھ بھال نہ کیا۔ صاحب ڈارلنگ کو بھی لی جیسا جذباتِ محبت سے بیگانہ بنا پا چکے تھے۔ وہ اس کو محض ایک بوائے دیکھتا پسند کرتے تھے۔ لیکن گھر کی مالک یہ سادگی چاہتی نہ تھی۔ وہ اس میں حسن و عشق کے تمام کوششیں دیکھنا چاہتی تھی جو شہنشاہِ دنیا کا ایک ضروری جزو ہے۔ ایسے معاملات میں مستحق بہت صنفِ نازک کی ہو کرتی ہے۔ اس لئے ڈارلنگ کا عشق یہ دستور کار فرما رہا۔ اور ڈارلنگ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر لی اور صنفِ لی کے خیال میں محو ہو گیا۔ مالک اور مالک میں اس سے متعلق کوئی دفعہ شکریہ بھی ہوئی۔ خانہ داری کی زندگی بد مزہ ہوتے ہوئے رہ گئی۔ مگر نہ ڈارلنگ کا علیحدہ کرنا امکان میں تھا اور نہ ڈاکٹر اس کی اصلاح کرانا۔

ڈارلنگ اس اندرونی کشمکش سے بہت بے چین تھا۔ ادھر لی کی محبت اس کو چھبے تی جلی جاتی تھی اور ادھر مالک کا ٹھکانہ عشق آٹھ پہر اس کی جان لگائے لیتا تھا۔

دو روز رنج و عذاب است جان مجنوں را : بلایِ محبتِ اہلی وقتہ لیسلا

اس کنش کش کا انجام یہ ہوا کہ ایک دن ڈارلنگ نے اس حیران نصیب زندگی سے تنگ آکر خود کشی کی شان لی۔ ہمدردی ربا اور، خبر با کوئی زہریلی جیسے تو اس فولادی جان کے لئے کچھ مؤثر نہ تھی۔ مشین کی موت کے لئے تو مشین کی ترتیب کا اشتہار ہی ہونا چاہئے اور یہ ترتیب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ جہاں لی پر دستکاری کی گئی تھی۔ چنانچہ وہ موقع کا منتظر رہا اور نہ تو کب اس کی مالک ہو چڑھا گئی کہ یہ بھی پیچھے سے نکل گیا اور قریب کے پارک میں ایک مڑناں جگہ جا بیٹھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنی گردن کے پیچھے ڈھیلے کوئے مشدوع کئے۔ جو پیچھلنا یہ آئے وہ درجا کر پھینک آتا۔ اس طرف دماغ کے کئی ضروری پرزے بھی اس نے نکال کر پھینک دیئے۔ اب اس کے بے جان ہونے میں محنت نہ تھی مگر کئی کوسرہ دھڑ سے الگ کر دیا جانا جس کے لئے دو گار کی ضرورت تھی۔

نہ کاروان کہاں؟ آخر اس نے کسے ہو کر زود سے اپنے بدن کو جنبش دی۔ اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے سر کو دو پھینک پالا۔

سر کا الگ ہونا تھا کہ ایک ہونا کہ آواز بھی پانی کا ایک خوارہ سا چھوٹا اور ڈار لنگ کا سار جسم پُرزے پُرزے ہو گیا۔  
صبح کو پولیس اسٹیشن پر ہزاروں تماشا بینوں کا اجتماع تھا۔ بیسوں فولادی پُرزے بکھرے پڑے تھے۔ فولادی پٹیلے کی خودکشی بڑے کو  
عنوان سے اخباروں میں خبریں شائع ہو رہی تھیں اور ذخیرہ پولیس اس خودکشی کی تحقیق کے لئے سرگرم کاغذی محکمہ سرانجامی میں ایک  
نئی جہتی اس لئے ہر شخص دلچسپی لے رہا تھا۔  
اشرف صوبوی (نئی نسل)

## ”پرویں!“

بہت ممکن تھا میں راز محبت فاش کر دیتا  
مگر دنیائے شعر و نثر کا خواب میں ”پرویں!“  
ترے دلکش نظم کی حسین خاموشیاں آئیں  
پنہ کوشتیاں گزریں تو پھر یہ خوشیاں آئیں  
نہ رکست میں افشاء \_\_\_\_\_ گوئی پہلو میں دل ہوتے  
”ندامت“ نے مری دیکھے \_\_\_\_\_ غلام مضمحل ہوتے  
جودل میں ہر وہ تجھ پر ہی عیاں اوکاش کر دیتا  
\* \* \* \* \*  
بہت ممکن تھا اراد عشق طشت از بام ہو جاتا  
مگر حُسن و لطافت کا ہجوم مری میں ”پرویں!“  
تری پر کیفیت نظروں کی سرور افشائیاں آئیں  
ترے جوش جوانی کی حسین طغیائیاں آئیں  
نہ ہو سکتا یہ ظاہر \_\_\_\_\_ گوئی پہلو میں دل ہوتے  
مرے جذبات نے دیکھو \_\_\_\_\_ غلام مضمحل ہوتے  
یہ حسرت ہی رہی لے کاش میں ”بنام“ ہو جاتا

اشرف صوبوی

# ایک خط

ایک دن صبح ہی صبح اختر میرے ہاں آئے۔ کہنے لگے جلوس عثمان ساگر طلیس عثمان ساگر دکن دیس کا ایک خوبصورت تالاب ہے۔ کیا ہے؟ اچھی کا دل ہے کہ خود بھی شاداب ہے، دوسروں کو بھی شاد کام کرتا ہے۔ ابھی شہر میں چل پھل نہ ہوئی تھی۔ زندگی کچھ سوئی کچھ جاگتی تھی۔ کہیں سڑکوں پر ایک دو ہر دو منظر آجاتے۔ کبھی سن سے کوئی موٹر گزر جاتا۔ اس وقت اختر موج دودھ میں تھے۔ یہ موج میں ہوں تو احباب ان کے ساتھ ساتھ بے پھر تے ہیں۔ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ موٹر نے ہٹنا کارا بھرا۔ ایک نرم ہچکولے سے چلا۔ پھر یہ جا، دو جا۔ بات کی بات میں عثمان ساگر جا پھونچے۔ شہر سے اس تالاب تک صبح کی تازگی اس طرح مربوط تھی۔ جیسے کنول نے آجے ابھر کے سطل آب پر کھل جلتے ایساں پارک کے ایک گلدوس حصے میں لپ آب ہو بیٹھے۔ ہلکا ہلکا ابر چھایا تھا۔ تالاب کا پانی جھولا جھول رہا تھا۔ بڑی ہی پیاری صبح تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یقینی نفاٹھنڈی ہوا، دھیمی روشنی آج ہم سے محبت کر رہی ہے! ہمیں اختر نے اپنے نورپ جانے کا بھی ذکر چھیڑا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ پند قص سے سیر چن کو جاتا تھا! اجتنی دیر ہم وہاں بیٹھے رہے، جتنے روانی سانس لے، اب تک چیتے سے نہیں اترے۔ اختر کو دلایت جا کر برس بھر سے اوپر ہو گیا۔ آج بھی جب کسی جدائی کا خیال اٹھے وہی منظر انکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ اور جیسا کہ ایک بچے نے کہی کہا ہے، اپنا دل بھی بے اختیار کہنے لگتا ہے کہ جدائی ایک ہیرا نیا کر گئی جو میں کا نام یاد دوست ہے!۔

اسی پروہی دوست کے ایک خط سے آپ کی ادبی خیافت کرنی ہے۔ یہ امانت میں خیانت کی صورت ضرور ہو کہ ایک ذاتی چیز منظر عام پر آ رہی ہے۔ مگر میں اس خیال سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتا کہ اس خط کی داد دینا بلکہ داد نہ دلوانا بھی بد نوعیت ہے!

لندن

جزیری مستانہ

ذہر.....!

یہ سبھی کوئی انسانیت ہے۔ میں برابر خط لکھ جاؤں، آپ یا تو جواب نہ دیں، یا وہیں تو دودھ کرنی۔ گویا دونوں میں تو باتیں ہوں وہ بھی اران گھائی کہ دل بھی نہ بھرے، سوچا تھا اب کے میں بھی نہ لکھوں گا۔ مگر ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ لکھنا ہی پڑا! اچھا سنئے، مگر حواس جمع کیجئے۔ جگر بھی تمام لیجئے، مجھے یاد پڑتا ہے، پہلے خطوں میں میں نے کہنے کوئی سرکس کا کچھ حال لکھا ہے۔ بھر مرن لیجئے کہ بڑے منجھ کا مقام ہے۔ یہاں ایک نرم دن درنا شیش ہے جس سے اوپر آنے کے کئی راستے ہیں ہر راستہ ایک علیحدہ سڑک پر ٹھنسا ہے۔ رن راستوں کے بچوں بیچ جو جگہ جھوٹی ہوئی ہے، اسی کے نیچے اسٹیشن ہے۔ اور اوپر کا حصہ سرکس کہلاتا ہے۔ یہاں سہرا راہیسیوں کا منی صورتیں مل جایا کرتی ہیں۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہوں۔ آپ ان کے پاس سے گزرتے انہوں نے بستم فٹ پائ، جی چاہے تو آپ بھی ہنس دیجئے۔ چلیئے دوستانہ ہو گیا! کیوں نہ ہو، یورپ متحدہ اور آزاد ملک ہے۔ یہاں عورت کے مرو سے زیادہ حقوق ہیں۔ مگر یہ بات ہندوستان میں جھگڑا میں نہیں آسکتی۔ مشاہدے کی چیز ہے۔ تو ہاں پرسوں کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر نیاز اور فہیم کرس کی چھٹیاں مناساے پاس لے گئے ہیں۔ یہاں کرس کا کاپو چھنا۔ دس ہندو دن پہلے سے بازاروں میں گھاگھی ہوتے لگتی ہے۔ گویا ہائے ہاں عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ خرید و فروخت بڑھ جاتی ہے۔ دکان مکان بھٹے ہیں۔ چوہن خوشی خرمی چھا جاتی ہے۔ مگر مزے کی سیر یہ ہر

کہیں کرسمس کے دن بازاروں میں ہل سستا ہوا ہے، سب اپنے اپنے گھروں میں جشن مناتے ہیں۔ یہ بھی عجیب سیر جوتی ہے لیکن سال نو ہے نوروز کی بڑی بہار کا دن ہوتا ہے۔ اسی طرح انکس و سبر کی رات میں بچے دلی سرکس خصوصیت سے دلہن بن جاتا ہے۔ اچھی اچھی صورتیں، اچھی پوششیں، جدھر دیکھو اگھ گھ نہیں ٹھہرتی۔ چوں چوں رات بولتی ہے، دل کی خوشیاں بھی برھتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اور رات کے بارہ بجے کو ہوتے اور سب کی نظریں گھڑیوں پر جم گئیں۔ بارہ بجنے لگے تو سب خاموش ہو گئے۔ بارہ بج چکے تو سال نو کی مبارک سلامت ہونے لگی۔ اک دھوم مچ گئی۔ مصلحتے ہوئے، مصلحتے ہوئے، آرزوئے شباب کے نقشے کچھ گئے، اخیر ہم سب یار دوست مل کے بٹھے۔ رات کا کھانا کوہ نور رستوران میں کھایا کرتے ہیں۔ بعد میں سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ دوستوں میں ایک صاحب ہیں، ان کی ذرا اور قسم کی طبیعت ہے، اس نے ہم نہیں ملتی کہا کرتے ہیں۔ اتفاق سے آج بھی ساتھ ہیں۔ ان کی سنگت سے اس وقت ہمیں بھی اپنے آپ پر خیال پیدا ہوا کہ یہ تو برا غضب ہے کہ سینما میں جتے آئیں، سب کے ساتھ کوئی ہو۔ اور ہم جو ہم میں تہا رہیں! کچھ بوج تو تنہا نہ جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے رستوران گئے۔ کچھ کھا یا پیادہ۔ اور ٹرین میں بیٹھ کر ہنڈن سنٹرل اسٹیشن پہنچے۔ وہاں اترے۔ باہر آئے تو دیکھا کہ یورپ دروازوں کی چھت میں ایک لڑکی کچی نظروں چپ چاپ کھڑی ہے۔ عیسیٰ دوستانہ کرنے میں جرأت کے ادوی بن گئے ہیں۔ مگر پھر ہندوستانی ہیں۔ پنج ہے کہ پشت ہا پشت سے جو چیز لھانا بلکہ خون میں رچ گئی ہو اس کا سال دو سال میں مکمل ہانا آسان نہیں۔ اس لئے سنا ہے، جرأت کرتے ہیں، مگر نیا دوستانہ کرنے میں بیشر تمھجک بھی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لڑکیوں کو غلاب کرنے میں انہیں پسپائی ہوتی۔ پھر بھی اس لڑکی کو دیکھ کر سولے عیسیٰ کے بھلا کون تھلا جے، سمجھتے ہیں ان سے زیادہ ہندوستانی ہیں! لیکن ڈاکٹر کو مذاق تو سمجھا، فرمایا، ان کو سمجھے ہو؟ عیسیٰ نے ڈاکٹر کو بغور دیکھا، کیوں؟ ڈاکٹر نے نہایت سفیدگی سے کہا۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر یہ تجربہ یہ ہے کہ آپ خیر سے باتیں بناتے ہیں! یہ سٹنکر سب نے قہقہہ لگایا۔ اور عیسیٰ آسانی سے بن گئے مگر پھر کچھ سنبھل کر کہا۔ برادر، تم زرا خشک! تم صابن کا بھادو کیا جانا ہو! اس پر ڈاکٹر نے مسک کر کہا۔ صابن کا بھادو تو آپ جانیں! ایسا تو یہ جانا ہوں کہ ابھی سے آپ کے ہونٹ خشک ہو گئے چہرے پر چٹا میاں سی چھٹ رہی ہیں!۔ اسپر سب ہنسنے لگے اور عیسیٰ نے مڑا ہٹا کہا۔ اچھا صاحب! تو پھر تم ہی یہ ثواب کماؤ! اجب اوروں نے بھی عیسیٰ کی ہاں میں ہاں ملائی تو ڈاکٹر راضی ہو گئے۔ کہا اچھی بات ہے، تم سب کی ہی خوشی ہے تو یہی سمجھا۔

ڈاکٹر کی اس بات پر سب کو حیرت ضرور ہوئی۔ یہ بڑے مضبوط کردار کے انسان ہیں۔ کبھی اس قسم کی باتوں میں نہیں پڑتے۔ مگر صرف یہ دیکھ کر کہ اجاب لفظ کے خواہاں ہیں، چلے گئے۔ اور ایک دو منٹ میں اسی لڑکی کو ساتھ لے آئے۔ یعنی، لڑکی کیا تھی! گوہر شب چراغ تھی! ایمانہ قد، گداز جسم، بھولی بھالی، بشرے پر صحت کا آلالہ۔ سانس میں نگہت شباب! ڈاکٹر نے یہ حقیقت سن کر ہم سب تعارف کر لیا۔ پھر سب ملکر سینما چلے گئے۔ سینما کا نام ایسے سید ہے۔ یہاں کے متوسط سینما گاہ میں ہے۔ ٹکٹ لئے، اندر گئے۔ اندر جاتے ہوئے ایک بڑے نفیس قالین پر سے گزرتے ہیں۔ گیٹ پر سے ایک سندی ساتھ ہو گئی تھی۔ جس نے دھبہ کر کے آرام سے بٹھا دیا۔ ہاں میں سبز دھبی روشنی تھی۔ اور بڑے تل میل کے ساتھ ایک سر پلاٹہ نوج ہاتھ۔ یہاں کی ساری نشیں گھنار غل کی ہیں اور بڑی خوبصورت بنی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان نو خیر حسن کی دلا ریاں کوئی سیاہ، کوئی گھنار لباس زیب تن کئے، سفید سفید تاج نالو پٹیاں پہنے پھر اکر تھیں۔ افقی سینے پر پیادری پیادری کشتیاں آویزاں۔ جن میں مختلف قسم کے چاک لیٹ۔ اور یہہ



سے پیش تائی۔ بعد میں سینا گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے پوچھا، اس! تعجب ہے تم کل ہم جنابیوں کے ساتھ چلنے پر برا راضی ہو گئیں! کہا، تم نے کچھ ایسی خبر پائی ہے مدعو کیا تھا کہ مجھے اتکار کا بار نہ رہا۔ اس کے بعد طبی کاروائی والا قصہ چھڑا۔ ہم نے کہا کہ وہ آپ سے بہت نادم ہیں۔ تو بٹنے لگی اور کہا، بات یہ ہے، انہیں غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے مجھے بھی یہاں کی اور لڑکیوں جیسا سمجھا۔ مگر نہ میں خود ناشائستہ بنتی، نہ انہیں بٹنے دیتی! اسے میاں! انیب کا بند تو یہ ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیوں اس! تم بلا کٹکے کل ہمارے ساتھ چلی آئیں۔ تمہیں یہ خیال بھی نہ گزر کہ ہم لوگ "کالا" آدمی کھلاتے ہیں! یہ سنکر خوب ہنسی اور کہا۔ ڈاکٹر! کبھی باتیں کرتے ہو۔ کیوں جی یہ تو بتاؤ خدا کا بھی کوئی رنگ ہے!! واقعہ یہ کہ کبھی لڑکی کیا ہے آفت جان ہے! خوب صورت، خوب سیرت، بہت سی "ایمان" جانے کے لئے کچھ باقی رہا! اس لئے سینہ اس لئے گھر پہنچا کہ ہم تو ایسے بگ ٹپ چلے کہ مگر کبھی نہ دیکھا اور اپنے ٹھکانے کی گری و دم لید۔ رات میں دو گھنٹے تک ملان واقعات پر غور ہوتا رہا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب بھول کر بھی اس سے نہیں ملیں گے۔ یار کہو گے تو سہی کہ بڑے بے سے ہو، مگر کیا کریں، اس کی لڑکی، یورپ سامعہ، ہم سے بے زبان، یقین مانوں، عناصر کے سچوگ پر بھگ سے اڑ جانے والا مادہ کہا ہوتا!!

وزیر حسن دہلوی

پہنچنے

## ”سمرِ راسے“

کل شام ٹھٹھا ہوا لگ راہ سے گذرا  
دن کا سیاہی سے بدلتا ہوا نقشہ  
ہیں تیرگی شام کے پرے میں افق سے  
نئی تیرگی کی جنبش جو سرد و آفریں مجھ کو  
اک برق سی نظروں میں مری کو ندر ہی تھی  
ہر نقش قدم راہ کا تھا ماہِ منور  
ہیں درجہ فضا نور سے لبریز تھی، گویا  
ناگاہ مرے پاس سے اک شمع ہنکرتی  
ہر کام پر اک شہر اٹھا ہوا گذرا  
اک تیر ہوا اک مرے دل میں ترازو  
مظلوم بھائی نے مری داد طلب کی  
”بیل بہت خوش شدہ و گل بہت چلک

کرتا ہوا دنیا سے تخیل کے نظام سے  
جیسے کوئی گیسو سے پریشاں دمنوائے  
رہ رہ کے فضا میں کوئی کرتا تھا اشارے  
پہتے نظر کے مجھے نغمات کے دھارے  
انفاس میں جذبات کی رتھیں تھے شرارے  
تھے خاک کے ذرات دیکھتے ہوئے تارے  
پانی سے چھلکے ہوئے کوثر کے کنارے  
نقشہ چہرے، گھیسے شب بگ منوائے  
کرتا ملک الموت کو نظروں کو اشارے  
بھرتا ہوا خاموش فضا دل میں طرے  
آواز چار تھیں پرتی شرم کے مارے  
لے لے بھارتی انکراں است بہارے“

نابلس دہلوی

۴۴۴



# بلی بچ

اور کچھ دیر بتتی نہیں کہ وہی شرتی آکر کہنے لگتی ہے: "بھئی، بھئی، بھئی نہیں لے گا۔"

تو کھاروی بھر کر لپکتا ہے اور برنی منہ میں رکھ کر شرتی کا چہرہ نوچنے لگتا ہے۔ جس پر شرتی کہتی ہے: "ہٹ بدعاش!" بدعاش بھلا کیوں ہٹنے والا ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں کے پنجوں سے اس کا ایسا منہ کھسکھسا کر شرتی چلا پڑتی ہو۔ دیکھ لے رہی تھیں، تو پھر بچے کے گئے؟

بیٹے پر بھی اماں کہتی ہو۔ اور کھلا برنی۔ تبھی یہ بڑا نہال کر رکھ گیا جو تو اسے برنی کھلائی مانتی نہیں۔

اُسکے چار چہرے بعد رہا نہ رہے کار چلدے سے۔ انہیں بلانے چوک مانا آگئیں اور وہ بچاے نہ بچے پہلے تو خوب بچے بچے مانا کے دلے سارے بدن پر چڑھ گئے۔ بدن پر کپڑے تلے کو ٹھوڑے بچا چیب چوڑی کھیلے لٹکائے اور تانہ پر بھی، پلک کے اوپر بھی دلے تھے۔ بیٹے ہی پلک کے نیچے چھ روز تک سوئے تو برتن میں چار چاند دگری تیار ہوا، انھیں بند کر دیں دنگے کو برتنے کو بے کھوڑے کھائے۔ جہانے تھے کھانہ کو ایک پل میں نہی نہ داس کوٹ سو پٹے نہی کھوٹ۔ جدھر سے آدھری بچے شرتی پر بند ہو گئے کھانے اور گھر سے بندہ جلتے تھے۔ کل کی طرح نہی۔ کھانے میں سر رہتا تب تک وجہ بالو چھیلتے رہتے۔ دم نہ رہا تب بے دم ہو رہے تھے چوک کے دائروں سے وجہ بابو کا کنول سا سندر منہ ایسا ہو گیا تھا کہ ڈر لگتا تھا۔ انھیں اُس میں نثار دھیں۔ چہرے پر اٹھی ہوئی ناگ ساخت نہ ہو پاتی تھی۔ اور منہ کی بات پوچھتے نہیں۔ اس حالت میں اُن کے بیٹ میں نہ کچھ کھانا ہو پختہ نہ کوئی چنے کی چیز کچھ ٹھنڈے پانی کی بندوبست جو ماننے انداز پر چھان کر اس کے منہ کے ہونٹوں کے چھ میں چوادی جاتیں وہ پانی

گھر میں ایک شرتی نام کی لڑکی تھی۔ پیچھے سے وہ موٹی ہو گئی، چار پوتوں کی ماں بنی اور چل بسی۔ سستے ہیں بڑی ہو کر اپنے تیز مزاج کے لئے سر نہام تھی۔ سستے ہیں، بچے اس لئے کہنا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ میری لڑکی تھی پر میرے سامنے تو اس کے مزاج کی ترشی ظاہر ہوتے ہوتے میں نے نہیں پائی۔ ہاں بدن کی بھاری طبیعت میں اور عادت میں آرام پسند وہ پیچھے سے ضرور ہو گئی۔ میں تب کی بات کہتا ہوں جب شرتی بہت چھوٹی تھی۔ کوئی تین برس کی ہوگی۔ اُس وقت وہ بہت ڈوبی تھی، تو بلی بلی تھی اور میں اُس کی بڑی لڑکی تھی۔ لڑکیوں میں چھپن سے کچھ مان بن جاتا ہے۔ اپنے پھوٹے بھائی جس کا نام بھئی بھی تھی اور وجہ کمار بھی تھا اس کو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ پسند تھا تو سینٹ کر لپٹے جو کسے لئے کہ لپٹی۔ مٹھائی ملتی تو بھی خود نہ کھا کر اُسی کھیلے اٹک دھر چوڑی کٹی بارو کھانے لگا۔ طاق کی جس ٹوک میں سن مار کر وہ جن پسوں کو چھ کرتی رہی ہے ان میں سے زیادہ تر کبھی کبھی غائب بھی ہو گئے ہیں۔ اور مٹھائی اُس کے بھندار میں کچھ کچی بھی ہے سے تو وہ سوکھ سا کھ کھتی ہو گئی ہے۔ لیکن ان باتوں سے سبق لیکر شرتی اپنے چلن کو نہیں بدلتی تھی۔ پیچھے سے تو پھر وہیں بٹور رکھتی اور اپنے حصے کے کھیل کھلتے یا میوہ مٹھائی بھی اسی طرح بچہ کے لئے بچ کر چھوڑتی۔

اور پھر جو اصلی بچہ سے کم نہ تھا۔ بڑا اودھی لڑکا تھا۔ شرتی بلی سے جیسے وہ نواب صاحب ہے شرتی کا سب پیار لیتا ہو۔ اور بدلتے میں سے خوب ملتا ہے۔ وہ کاٹتا ہے نوجوا ہے اور بہن کو خوب رلاتا ہے۔ بڑی بہن ہونے کا فائدہ اٹھاتیں کہتا۔ شرتی بچا کی خوب روتی ہے، روتی روتی اماں کے پاس جا کر شکایت کرتی ہو

نیک بھی گئے ہیں۔ امید ہوئی کہ شہرِ بقی اچھی سبک اٹھنے گی، مجھے اُس کے چہرے پر دکھائی دیا گویا اُس کے اندر کی جی ہوئی تکلیف چھڑ گئی ہے۔ وہاں جیسے اُس کے درد کو دیکھنا جا رہا ہے۔ گویا کانسے کو زور کڑوہ درد اب ضرور بہہ پڑے گا۔ لیکن کن کانسے آگاہ کر بھی آتش کو زلاک کر نہیں سکتے وہ نہیں رہتی۔

اُس کی ماں اس بات پر ڈرے بھر گئی، شہزادی کو ایک ساتھ ایسی عقل مند ہو جاتے دیکھ کر اُس کی ماں حیدہ بس اور لاچار اپنے کو محسوس کرتے تھی۔ شہزادی کا سن نہیں پہلا، نہیں بچکا اور وہ خالی بھی نہیں ہوتی۔ وہ ایسی بھری رہی کہ گناہ تو نہ کہہنے کی ضرورت ہی گویا تھے نہ جو اس کی ماں نے بیچارگی کے لیے میں مجھ سے بار بار کہا تھا۔ ارے کیا وہ بھی مجھے چور کہہ رہی جاتی تھی۔ اُسے کیا چور کہا تھا۔

تم بتاؤ نامیں کیا کروں؟  
لیکن میں کیا سناؤں۔

تین روز بیخفا ہوئے دن شہر کی گھاٹ پر گر گئی۔ اُسے  
 بخار ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے بخار بہت تیز ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو جاتی  
 اور بڑے بڑے تختی۔ اُس کی ماں کی فکر کا ٹھکانہ تھا۔ ڈاکٹر بھی  
 لئے حکم اور دوا کی لئے پریکٹس کی بیگلی کم ہوئے میں ذاتی سببوں  
 سو برس کے گھنٹوں میں کچھ اترتی۔ اس وقت کم کم شہر کی کمرے  
 کی محبت کی طرف دیکھتی دیا اور کو دیکھتی۔ تب وہ اپنی ماں کو بھی  
 پہچانتی تھی مجھے بھی پہچانتی تھی پر مائے سنے مانوسے کچھ کہنا تھا  
 نہیں سنی انھوں سے دیکھتی اور اسی طرح سچا ٹوٹا لیکر انہیں انھوں  
 سے دوا اور کی طرف دیکھتے تھی۔

نہیں بھارت میں بیٹا شری ہے۔

میں بچا کرتی : اوستو، اومیری میٹارانی، اومیرے میٹے جی :  
شرتی منکر چنکتی اور آنکھیں پھیلا کر میں دیکھتی رہتی۔

وہ بہت دُبی ہوئی تھی۔ تن میں سینکڑے سی ہڈیاں باقی تھیں۔  
اُس وقت جب کبھی سوتے سوتے وہ مسکراتی تھی تب دیکھ کر من

وہجے بابو کو مانوس ہو چکے تھے اور تمکین ہو چکا۔ وہجے بابو کو یہ سب کھانا چاہتے۔ اُس مسکراہٹ کو دیکھ کر آنسو روکنا مشکل ہو جاتا۔ منہ ایسا ڈونڈا پھر کسی ایسا بابا لگتا تھا کہ۔

خیر وہ دوسری کہانی ہے۔ سات اٹھ روز اپنی ماں کی گود میں پڑے رہ کر ان کی اور ماما سیتلا کی چھینا جھپٹی میں دوتے باوتے ایک ہفتہ تو نکالا۔ اُس ہفتے کے بعد باپو یہاں سے نگر توڑ خدا جاتے کہاں کیسے چل پڑے۔ ڈاکٹر بھی رہ گئے، سرائی کی اماں بھی رہ گئیں، ہم بھی رہ گئے۔ ان دو بچی وہ جاتے والوں میں شرتی کا نام ایسا ایک نہیں آتا۔ شاید اس سے کہ وہ اپنی کسی گنتی کے لائق نہیں تھی۔ لیکن دوتے کے چل دینے پر وہ تو عیسے ایک ہی دن میں چالیس برس کی ہو گئی۔ اُس کا بچی غائب ہو گیا۔ اُس کے متعلق نگر نے نہ کچھ پوچھا نہ پاچھا۔ وہ بالکل بے رونی۔ جب کہا نہ دیکھا لیا اور کام کہا کام کر لیا۔ اور اُس کا ہنسنا اڑ گیا تھا۔ نہ اب وہ چلتی تھی نہ شکایت کرتی تھی۔

میں نے کہا: بیٹا شہریت!

اُس کے منہ پر سنسکر کوئی سُرخی نہیں آئی۔ مانو اُسے کچھ جیت نہ ہو۔ ن میرے پاس آئی اور اُنک کھڑکی چوکنی ہو گیا کہ وہ جی ہو۔ بابو جی مجھے گود میں لینا چاہتے ہو تو سلیو میں کھڑکی ہوں، میں سانس نہیں تو:

میں نے اُسے گود میں کھینچ کر کہا: بیٹا شربت، ٹھوڑی میں  
تھوڑا دل کر کہا: بیٹا سحر و کیا بات ہے؟

کچھ بولی۔ میں نے گود میں نزدیک کھینک کر اسے چومایا۔ کارا میں سے کہا: بیٹا، تجھے پاؤں تازی۔ وہ تو طالعاً لایا تھا!

میرادل یہ کہتے کہتے خود بھڑک اٹا، بات مڑے مکان کی  
ہت میں نے جان بوجھ کر کمی کی کہ جس سے لڑکی روے تو، لیکن  
وہ لفظ بھی بھڑلاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ لفظ شرتی کی بھڑ

ایک سترت کے ساتھ بڑے درد اور ڈر سے بکھر جاتا تھا۔ لیکن نیند اسے بہت کم آتی تھی۔ اتنی کل ہی اسے کب بڑتی تھی کہ اسے نیند آئے۔ نیند آتی تو اسے بیوٹی کی نیند کہنا چاہیے۔ اس بے چوٹی میں بڑ بڑاہٹ جاری رہتی جو اس میں سے مائوچی بچانی جان کو کھینچ کر باہر پھینک رہی تھی۔

ایسے ہی دیدہ ہاں سات روز بیتے۔ اس کی ماں سب سداہ ہزار کرب کا لہری سے سرسارے بیٹھی رہتی تھی۔ بچی کی ہلکی ذرا دیر کو لگ جاتی تب ہی اس کی کھڑے کی بچی کو چھوڑتی تھی۔

بڑے دیر دیر تھکی مے کمرٹی کی ماں نیند کی پری کو مائو مٹی کی ہلکوں پر بھاتی اور جب وہ نیند کی پری ان ہلکوں پر چب ہو کر سو جاتی تب ہی وہ ماں ہلکے ہلکے پاؤں دھرتی ہوئی وہاں سے کہیں جاتی۔

بچی کی حالت گرتی ہی گئی۔ چھینے کی چاہ ہی جیسے بھیڑے دیر ہوئی جاری تھی۔ ڈاکٹر ہارے لگے اور کچھ دیروں کی بچہ میں بھی کچھ بات تھیک نہ بیٹھی۔ بس بچی کی ماں کا جی ہی کچھ اس بلے میں کچھ تھاکر کیں مٹی کو نہ جانے دو گئی۔

بچہ تو ٹوٹ گیا تھا پر بدن چھینا ہی چلا جاتا تھا۔ ہذا کوئی ایک نہ لگتی تھی۔ مائو اب تو نہ اپنی ماں کی دھواؤں اور اسے ارادے کی بچگی کے بل پر ہی جی رہی تھی۔

ایک روز سترتی کی آنکھ چھتیں ٹھٹھکے کے بعد کہیں جا کر گئی۔ اس وقت ماں ذرا اسے چھو کر وہاں سے اٹھی پر اس بچہ وہ ادھر چوکتی ہی تھی۔ کوئی آہٹ ہو کر نہ جھٹکتی کے پاس دوڑا بیٹھ وہ انکھی جی ہی تھی کہ اس طرف سے کسی کے باریک چپا نے کی آواز اس نے سنی۔ وہ بھاگی گئی کہ دیکھتی ہے کہیں سے مٹی کے کھٹولے پر نفا سانی کا بچہ ایک آگیا ہے۔ مٹی نے دونوں ہاتھوں میں اسے زور سے دبوچ رکھا ہے اور وہ کہیں کہیں کر رہا ہے۔

ماں کو تے دیکھ کر ہی اس نے کہا: "اماں تلی بچہ!"  
اس گھڑی اس کے چہرے پر جیسے کچھ ٹوٹی ہوئی سداہ کی جھلک دکھائی دی اور یہ کہتے کہتے اس بچی کے بچے پر سے اس کی انگلیاں کہیں کچھ دھیلی نہ ہو گئی ہوں اس لئے اور بھی اس بچے کو بچوں میں دبوچ کر مٹی نے کہا: "اماں تلی بچہ!"

بچی کے بچے نے بھی زور سے کہا: "کیں کیں کیں! تو بھی گویا وہ اپنے پر قابض اس مالک پن سے بچھڑنا نہ چاہتا تھا۔  
بچی کا بچہ سوکھا سا تھا۔ مائو کی نے مٹہ میں لیکر اسے بڑی طرح چھوڑ دیا ہو۔ وہ سہا ہوا تھا۔

مٹی نے کہا: "اماں دودھ دھو!"

اماں نے خوش ہو کر کہا: "دودھ پتے گی بیٹا!"

مٹی نے تی کے بچے کو دکھا کر کہا: "تلی بچہ اماں!"

ماں ڈر کر بولی: "بیٹا اسے چھوڑ دے، بچے دے مار دے!"

یہ کہہ کر اس کے ہاتھوں میں سے اس بچے کو لیکر

الگ کر دینے کے لئے آگے بڑھی۔ مٹی نے اپنی مٹیوں کو مضبوط

کر لیا۔ اسے چہرے پر دکھائی دیا کہ گویا وہ مقابلہ کر گئی اور بچہ بھی

مائو مخا لغت میں لگیا یا۔

ماں پاس آتے آتے رگ گئی۔ دیر اور ملائم اور میٹھی

بانی سے بولی: "بیٹا اسے چھوڑ دے، جانور ہے، بچے دے مار دے"

گاڑ دیا۔

مٹی نے کہا: "اماں تلی بچہ دودھ پتے، لیکر بچے کو اس نے

زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

ماں لوٹ کر ایک کٹوری میں دودھ لے آئی۔

مٹی نے بچے کو گردن دبوچ کر اس کا منہ کٹوری میں رکھنے

بچے کہا: "بی، دودھ پتی بچہ!"

لیکن بچہ اپنی گردن چھٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دودھ کی طرف مائل نہیں ہوا۔ مٹی نے اس پر تین چار ٹپٹڑا سکے

جہاں سے کہا۔ نہیں ہے گا تو دودھ نہیں پئے گا اور پھر بے رنجی سے اُسکے منہ کو کھڑی میں ٹھونس کر کہا: بی بی! یہ

لیکن اب بھی بی بی کا وہ بیوقوف بچہ اپنی ہٹ پر ہی قائم تھا۔ اُس نے دودھ پیا ہی نہیں۔ مٹی نے اُسے پیٹا دیا۔ اُس کے بعد اُس کو بڑے پیار سے تھپکا۔ اُسکے بدن کو سہلایا۔ اُس کے منہ کو اپنے منہ کے پاس لجا کر پیار کیا اور اُس کے گالوں کو اپنے گالوں سے رگڑ کر کہا: بی بی! میرے بی بی بچے میرے بچے ہو کہہ کر اس بدشگون اُس بی کے بچے کا منہ بھی اسے چوم لیا۔

اس مرتبہ بی بی کا بچہ اپنی چھوٹی کی جیب نکال کر کڑی کا دودھ چاٹ کر پینے لگا۔ لڑکی کو یہ دیکھ کر بڑی خوش ہوئی اُس میں اس بچے کے لئے محبت جاگ اُٹی۔ پھر وہ ایک بیک زندگی کی جست بھی اُس میں کھوئی نہ رہی اُس دن سے وہ ابھی ہونے لگی۔ ہیشہ بی کے بچے کو اپنے

سے چٹا کر ہی سوتی۔ بچنے پر کبھی وہ نہ ملتا تو اُسے پائے بنا خود چین لیتی نہ پھینچتے لینے دیتی۔ اُس کے بعد تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ وہ پہلے پھر لکھ کر خوب موٹی بھی ہو گئی۔

آپ کا تعلق افسانہ پالاک کہانی لکھو۔ کہانی لکھنے کو تیار ہو کر سوچا ہوں کہ کیا لکھنا ہو گا۔ ایسے ہی اُسے وقت تار والا اگر ایک تار لے گیا۔ خدا کا رحم دیکھو کہ کیسا عجیب و غریب ہے۔ تار

میں خبر آتی ہے کہ شہر کی عمر کی۔ تار والا ابھی گیا ہے۔ شہر کی عمر کی اپنی بی بی بھی۔ اگلی تو آپ ہوں نہ کہنے دیکھئے کہ دے بھی چکے

ملا تھا جو بچپن میں مجھ سے لٹا بھی گیا، تو بھی زندگی بھر شہر کی کو لکھتی ہی سمجھتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے چھوٹے بچے۔ تار پالاک بچے

بی بی کی یاد ہوائی سواپ کو سنا دی جو۔ اُسید ہے کہ سنکر آپ کہانی لکھ کر ہونے سے ہمیشہ بچیں گے۔

جسند رگزار

ۛۛۛۛۛۛۛ

## فاؤسٹ

مترجمہ

شاہد احمد بی بی اے رانزی دھلوی

فاؤسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و مخزن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

فاؤسٹ ڈاکٹر ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔

شہرہ آفاق شاعر المانیہ کو سنے گئے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفہ سمجھنے کے مسائل کو شہوانہ آٹھ کا لباس پہن کر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سہا بھی ہے اور بے یگانگ بھی۔ فاؤسٹ فلسفی کی عقل اور شاعر کے عقل کی آخری حد ہے۔ یعنی بدی، حسن، عشق، غنا، خون، قتل اور موت کی داستانیں انہیں کتابی صورت میں سامنے ہو گئی ہے۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ: ساقی بکٹ پور، دھلوی

## گوکلا

اساتذہ کا ہمینہ آیا جاسے گاؤں بدک پور کے نصیب جاگ اٹھے، اگر ایک طرف کسان گھر کے گئے برتن بچ کر بیلوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے تو دوسری طرف گاؤں کا بنیا بھال تھا اُس کے گھر میں چاندی برس رہی تھی مگر مجھے ان جمیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، آم اور جامن کے باغوں میں بہا رہی۔ میں گاؤں کے چند نشانہ باز منجھے لڑکوں کو اپنے ساتھ نیکر باغوں کی سپر کرتا پھرتا تھا۔ جس باغ میں ہمارا گڈر ہوتا تو قیامت ہی آجاتی اپنے ہم تو دو چار ہی کرتے مگر ہمارے ڈھیلوں کی بو چھار سے بچے آموں کا زمین پر ڈھیر لگ جاتا، میں زمیندار کا لڑکا تھا۔ زمیندار اپنے گاؤں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ غریب آسامیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ میری شرارت پر کوئی فریاد کریں، میرے ہی بل پر گاؤں کے لڑکے بھی اکڑتے پھرتے تھے۔

ساوَن کا ہمینہ شروع ہوتے ہی ہم بھال ہو گئے۔ وہ جھوم جھوم کر بادلوں کا آنا۔ مینہ کی چھا چھم۔ پانی کا شور، ہوا کی سائیں سائیں۔ کوئل کی گوک۔ مور کی جھنکار۔ گاؤں میں چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ باغوں میں آم کا ٹپکا لگ رہا ہے۔ جامنیں پٹاپٹ گر رہی ہیں اور ہم ان کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا نہ فکرِ معاش تھی اور نہ دنیا کے جھکڑوں سے کوئی خاص غرض۔ دن بھر کھڈی۔ رگی ڈنڈا وغیرہ کھیلتا اور باغوں کی سیر کرنا اور رات کو آرام سے سو جانا یہی ہماری زندگی تھی۔

ہمارے گاؤں کے قریب ہی ٹھاکر چسترا لال سنگ کا بھی ایک گاؤں رام نگر تھا ہم نے سنا کہ ان کے باغ میں نہایت عمدہ اور شیریں آموں کے درخت ہیں رات کو ہم نے مشورہ کیا اور علی العباد ان کے باغ پر دھاوا بول دیا۔ چھوٹے کمسن بچوں کو عقل و فہم سے ایک قسم کی نفرت ہوتی ہے ان میں اپنے ساتھیوں میں زیادہ عقل مند اور بہادر بنانا تھا پھر بھی میں اپنی عقل سے کام نہ لے سکا میں نے ٹھاکر صاحب کے بارگ کو بھی اپنے ہی گاؤں کا باغ کھپا۔ اسی دو چار ہی آم توڑنے پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ کچھت مایوں نے ہمیں کچھ اس ترکیب کے گرفتار کیا کہ کسی کو فرار ہونیکا موقع ہی نہ مل سکا ورنہ اپنے گاؤں میں تو ہم شیر تھے ہمیں اس کا ناز تھا کہ ہمیں پکڑنا آسان نہیں ہے۔

بارگ کے قریب ہی ٹھاکر صاحب کا خوش نما مکان تھا، مالی میں گرفتار کر کے ان کے پاس لے گئے ٹھاکر صاحب اپنے گھر کے سامنے نیم کے بیڑے کے نیچے چار پائی پر بیٹھے تھے ان کے قریب ہی ایک من موہنی جیتی جاگتی گجڑا کیسل رہی تھی۔ مجھ سے شاید دو ہی ایک سال چھوٹی رہی ہوگی۔ ٹھاکر صاحب کا باغ چہرہ دیکھ کر سبکے ہوش اڑ گئے۔ ہم نے سمجھ لیا کہ اب ہم بہار پڑی لیکن جب مایوں نے مال مسرودہ جو انہوں نے ہماری جیب تلاشی سے برآمد کیا تھا ٹھاکر صاحب کے سامنے رکھا تو وہ مسکرائے۔ سوکھے دھانوں پر پانی پھیر گیا ان کو مسکراتے دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی۔ چونکہ ظاہری حیثیت اور لباس سے میں ہی اپنے ساتھیوں میں کچھ ممتاز نظر آیا۔ اس نے ٹھاکر صاحب سے پہلے میرا ہی حسبِ نسب دریافت کیا میں نے بھی طفلانہ انداز کے ساتھ اپنے ہتھ بھائی کا نام بتا دیا ان کا نام سننے ہی ٹھاکر صاحب مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھالیا میری وجہ سے سب ساتھیوں کو بھی

معافی مل گئی، مال مسروقہ کے علاوہ اور بھی عمدہ عمدہ خوش رنگ پکے ہوئے آسم میرے سب ساتھیوں میں تقسیم کر کے انکو رخصت کر دیا گیا، لیکن جب میں چلنے کو تیار ہوا تو ٹھاکر صاحب نے مجھے روک لیا اور کہا کہ تم بھر وشام کو میں تم کو تہاے گھر پہنچا دوں گا۔ اتنا کہہ کر انھوں نے مجھے اس موہنی خوبصورت گجریا سے ملا دیا اس کا نام کوکلا تھا وہ ٹھاکر صاحب کی لاڈلی بیٹی تھی کوکلا سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، ہم دونوں تھوڑی ہی دیر میں ایسے گھل مل گئے گویا ہم عرصہ سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اُس نے مجھے اپنی گڑیاں دکھائیں۔ مجھے گڑیوں سے کوئی خاص اُنسیت نہ تھی، میں اس فن کا ماہر نہ تھا پھر بھی میں نے ان گڑیوں کی دل کھول کر تعریف کی، میری طرف سے کوکلا بہت خوش ہوئی، مجب میں شام کو اُس سے رخصت ہونے لگا تو وہ بہت رونی مگر جب میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں پھر جلدی ملوں گا تو وہ چپ ہو گئی، ٹھاکر صاحب ہم دونوں کی یہ لوٹ باہر کے پریم سے بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ کوکلا کی ماں نے تو یہاں تک کہا کہ ان دونوں کی جوڑی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ میرے ساتھ ٹھاکر صاحب نے نفیس اور لذیذ آمول کی ایک ٹوکری بھی بھیجی، جب میں ٹھاکر صاحب کے ملازم کے ساتھ اپنے گھر پہنچا تو پتا چلی مجھے مارنے کو دوڑے، لیکن ٹھاکر صاحب کے ملازم نے بچا لیا۔ ٹھاکر صاحب میرے والد کے نام میرے متعلق ایک سفارشی چٹھی لکھ دی تھی جسکو پڑھ کر والد صاحب کا عقدہ جاتا رہا۔

اب مجھے رات دن کوکلا ہی کا خیال رہنے لگا۔ اس کے ساتھ کھیلنے میں مجھے خاص خوشی حاصل ہوتی تھی، میں ہر دوسرے پندرہ دن رام نگر پہنچنے لگا، آمول کے لالچ سے نہیں بلکہ اپنی پیاری گجریا کوکلا کے ساتھ کھیلنے کیلئے، ایک مرتبہ میری ماں نے کوکلا کی ماں کی دعوت کی، جب کوکلا اپنی ماں کے ساتھ میرے یہاں آئی تو میری خوشی کا کوئی شک کا نہ تھا میں نے بھی کوکلا کو اپنی چٹھی پڑائی کتا میں۔ اچھی خراب پسلیں و سلیٹ وغیرہ دکھائیں۔ باطن میں چاہے کوکلا کو وہ چیزیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہو یا مگر اُس نے میری خاطر میری علیقت پر اظہارِ خوشنودی کیا۔

کچھ دن یوں ہی گزرے مگر پھر پتا چلی نے مجھے دیہاتی مدرسے میں داخل کر دیا۔ اب مجھے کوکلا سے ملنے کا بہت کم موقع ملے لگا۔ جب اتوار کی چٹھی ملتی تو میں رام نگر ضرور جاتا اور اپنی کوکلا سے مل آتا۔ دو چار سال کے بعد جب میں نے دیہاتی مدرسہ کا چوتھا درجہ پاس کر لیا تو پتا چلی نے مجھے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کیلئے میرے چچا کے پاس سہارنپور بھیجنے کا ارادہ کیا۔ مجھے اس خبر سے کچھ خوشی ہوئی لیکن ریج زیادہ ہوا۔ خوشی اس کی تھی کہ شہر میں ریل۔ موٹر۔ کھیل نمائشے وغیرہ کا تلف اٹھاؤں گا، شہر کی ہیئت، تعریف سُننا تھا مگر دیکھنے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ ریج اس کا تھا کہ میں اب کوکلا سے جدا ہو جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک دن کوکلا سے جدا ہونا ہی پڑا۔ سہارنپور جانے سے ایک دن پہلے جب میں کوکلا سے ملا تو وہ مجھ سے پٹ کر روئے گئی، میں بھی اُس کے ساتھ اُس وقت تک روتا رہا جب تک میری آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہو گئے۔ اب ہم جھوٹے بچے نہ تھے ہم نے لڑکپن میں پریم کا جو پودا لگایا تھا وہ اب درخت کی شکل اختیار کر کے ہی والا تھا کہ قسمت نے ہمیں جدا کر دیا، رخصت ہونے سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو اپنی دائمی محبت کا یقین دلایا۔

سہا پنہونچ کر عرصہ تک میرے دل میں گولا کی یاد چمکیاں بستی رہی لیکن نئے نئے دوستوں کی صحبتوں میں بڑھ کر رفتہ رفتہ میرے دل سے گولا کا خیال کم ہونے لگا۔ میں نے اُس سے کیا قول و قرار کیا تھا سب بھول گیا۔ شہر کی دوسری طرف نے دیہاتی زندگی کی یاد کو میرے دل سے محو کر دیا۔ اپنے دوستوں میں گلی ڈنڈا اور کبڈی کا ذکر کرنے سے میں شرمانے لگا۔ اب تو کریکٹ، فٹ بال اور بالی کے کھیلوں ہی سے مجھے ایک قسم کا عشق تھا۔ میں جب کبھی شہری زندگی کا اپنی دیہاتی زندگی سے مقابلہ کرتا تو مجھے بیچ معلوم ہوتا کہ برساتا ہے مجھے دیہات میں کیوں پیدا کیا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی اپنے گاؤں بدلنہ لور نہ گیا۔ چچا نے جب اس کی وجہ پوچھی تو میں نے کہہ دیا کہ میری تعلیم کا نقصان ہو گا۔ مگر دوسرے سال پتا جی نے گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے زبردستی گھر بلا لیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میری آمد کی خبر سن کر میرے لڑکپن کے ساتھی میرا کٹش چلا ہوا۔ رام پھل بنیا۔ رام بھروسہ طاح۔ جگدو اور دھونی۔ مکنا چار وغیرہ وغیرہ ملے آئے۔ گاؤں میں اونیٹھ کا بہت کم سوال ہوتا ہوا آپس میں برادرانہ محبت ہوتی ہے میری آمد سے میرے لنگوٹیا پاروں کو بہت خوشی تھی گاؤں بھر میں یہی چرچا تھا کہ ”ہمارے راجن بالو آئے ہیں اب پھر گلی ڈنڈا اور کبڈی کے جن ہوں گے؟“ چنانچہ جب سب میرے دروازہ پر آکر جمع ہو گئے تو مجھے مجبوراً گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ شہر میں رہ کر اب میں اپنے خیال سے ہند بن چکا تھا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں ان گنوار لڑکوں سے ملوں مگر ماما جی نے مجھے سمجھایا کہ ان غریبوں سے نفرت کرنا اچھی بات نہیں، اپنے پتا جی کو دیکھو وہ سب کیسا مل جل کر رہتے ہیں، یہ سب لڑکے تو تمہارے بچپن کے ساتھی ہیں، بہت دنوں کے بعد تم آئے ہو جا کر ان سے دو چار باتیں کر لو اس سے تمہاری عزت شکم ہو جائے گی۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو سب لڑکوں نے جھک کر مجھے نہایت ادب سے سلام کیا۔ انہیں کے ساتھ میں نے اپنے لڑکپن کا زمانہ گزارا تھا۔ ان کے ساتھ گاؤں میں بھی چرائی تھیں باغوں میں چوریاں بھی کی تھیں۔ خاک و مٹول میں لت پت ہو کر کبڈی اور گلی ڈنڈا کا کھیل بھی کھیلا تھا۔ تمک مرتج، دھنیا پودینہ کے ساتھ کچے بھر کھاتے تھے، بدیا گھ جیٹھ کی آندھی میں انہیں کے ساتھ کبھی باغوں میں آسم پٹنے تھے، لڑکپن کی سب باتیں یاد آگئیں، میری شہریت خاک میں ملنے والی تھی کہ ایک گنوار لڑکا مجھے خاموش دیکھ کر بول اٹھا۔ ”راجن بالو، انکوٹ پتلون مان کر سلطان مالوم (معلوم) ہوتے ہیں“ اتنا سنتے ہی میں چونک اٹھا۔ اس گنوار کی ہتھکڑی دیکھ کر مجھے ان سے نفرت معلوم ہونے لگی شہر کی تربیت و معاشرت نے مجھے جذبات بنا دیا تھا میں نے ان کے پاس گھر آ رہنا یا ان سے باتیں کرنا بھی ہتک سمجھا، چنانچہ میں اپنا منہ پھیر کر وہاں سے چل دیا۔ میری اس بے رحمی کا ان سب پر خاص اثر ہوا۔ سب ہنستے آتے تھے مگر منہ لٹکا کر واپس ہونے لگے مگر مجھے ہنسی کوئی پروردہ تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ گنواروں کی چاہے کتنی ہی ہتک کیوں نہ کی جائے مگر ان کے دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا مگر یہ میری بھول تھی غلطی تھی، آج جب کہ میں اپنی زندگی کے قریباً اڑتیس سال گزار چکا ہوں مجھے اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ محبت و دیرینہ سے آپ دیہاتیوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں لیکن شان امارت دکھا کر آپ ان کے دلوں کو موہ نہیں سکتے۔ غریب گنوار دھنیں بھی خود داری کا مادہ ہوتا ہے یہ اب مجھے پتہ چلا ہے۔

بدن پونہنچ کر مجھے گولا کی پھر یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ معلوم نہیں اب گولا مجھ سے لے گی بھی یا نہیں اب تو وہ

شاید محبت بردہ کرے گی، دو تین دن تک یہی سب کچھ سوچتا رہا مگر پھر دل کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر ایک دن رام نگہ پنچ گیا۔ بنگرا فوس وہاں کو کلا نہ تھی وہ کئی بیٹے سے اپنی نانی کے یہاں تنہا گئی ہوئی تھی۔  
اسی طرح جب کبھی میں چھٹیوں میں بدن پور گیا تو اتفاق سے کوکلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔

پہلی کتاب (۳)

کئی برس گزر گئے۔ زمانے کے انقلاب سے بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوئے، میں نے میڈیکل کالج لکھنؤ سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور رسول ہسپتال غازی پور میں میری تعیناتی ہوئی وہاں مجھے ہر قسم کا آرام تھا، تنخواہ کے علاوہ پرائیویٹ پریکٹس سے بھی میری کافی آمدنی ہو جاتی تھی، ملازمت سے پہلے ہی میری شادی ہو چکی تھی اور اب میری شریعتی جی بھی میرے ہی ہمراہ رہتی تھیں۔

برکھارت کی اندم میری رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں، ارہ رو کر بجلی چمکتی تھی کچھ بوند باندی بھی پوری تھی۔ ہوا سن سن چل رہی تھی گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں کہ باہر سے کسی نے مجھے آواز دی ایسے وقت میں باہر نکلے کو جی تو نہیں چاہتا تھا مگر غلامی بڑی بلا ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ ممکن ہو کہ اسپتال میں کسی مریض کی حالت بہت خطرناک ہو اور کمپونڈ روم مجھے بلانے آیا ہو میں مجبوراً گھر سے باہر نکلا۔ میرا کمپونڈ روم جی کے ساتھ کھڑا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ نے مجھے فوراً بلایا ہے موٹر سائے کھڑی ہے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کا نام میں نے شہنا تھا وہ غازی پور کے ایک مشہور ٹھیکہ دار تھے مگر مجھے ان سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کو اپنی فیس سے عرض رہتی ہے میں ان کے ملازم کے ہمراہ فوراً ان کے مکان پر پہنچا۔ راستہ میں ملازم سے دریافت کرنے سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ سنگھ بہت بیمار ہیں۔

ٹھاکر صاحب کے دروازہ پر جب موٹر کھڑی ہوئی تو ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ میری پیشوائی کیلئے آگے بڑھے یہی ٹھاکر صاحب تھے، ان سے ملنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ تھے تو گورے چٹے مگر ضعیفی نے ان پر اپنا قبضہ جمالیا تھا چہرہ پر بھجریاں پڑی تھیں اور کمر کچھ جھک چلی تھی ان کے قریب ہی ایک ملازم لائٹن نے کھڑا تھا، معمولی مزاج پرسی کے بعد ٹھاکر صاحب مجھے مریضہ کے کمرے میں لے گئے چلنے میں ان کے ہاتھ لڑکھڑا رہے تھے میں سمجھ گیا کہ ٹھاکر صاحب پر لالہ پری کا نشہ تھا۔ مریضہ بیہوش تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے گھونگھڑے سیاہ بال ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھونرے پھول پر بیٹھے ہوئے دس چوس رہے ہیں، ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا تھا اور دوسرا دل کے قریب پڑا تھا اس حالت میں مجھے وہ حسن کی دیوئی نظر آئی اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال کی رہی ہو گی مجھ سے ملازم نے تو کہا تھا کہ سنگھ بیمار ہیں لیکن میں نے اس مریضہ کو ٹھاکر صاحب کی لڑکی سمجھا میں نے اس کی بغض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہے، میں ضروری دوائیوں کا کبس لینے ہمراہ لے گیا تھا، بڑی شکل سے مریضہ کے منہ میں ایک دوا ڈالی، اس کا فوری اثر ظاہر ہوا اور مریضہ نے کچھ حرکت کی۔ ٹھاکر صاحب ایک کرسی پر بیٹھے جوئے جھوم رہے تھے یکبارگی فرمائے گئے۔ ڈاکٹر صاحب علاج مکمل (معقول) ہونا چاہیے روپے کی کوئی فکر نہ کیجئے گا



ہا ہا ہا ہا..... ٹھا کر صاحب کی تعلیت کا مجھے یہ پہلا تجربہ تھا میں نے ان کی کلباس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور مریضہ کو کچھ دوا پلائی اس مرتبہ مریضہ نے دوا پیئے ہی کیا بارگی آنکھیں کھول دیں پہوشی میں اس کا چہرہ روشنی سے کچھ ہٹا ہوا تھا ہوش میں آتے ہی اس نے میری طرف دیکھا چہرہ پر لالٹین کی روشنی پڑی۔ میں سناٹے میں آگیا۔ میرے سامنے میرے لڑکپن کی ساتھی میری پیاری تجربہ کار کوکلا لیٹی تھی۔ کوکلا کے چہرہ اور ہاتھ پر تلے اُن کے دیکھنے سے مجھے ادھر بھی اطمینان ہو گیا کوکلا نے بھی مجھے پہچان لیا۔ جس طرح پانی کی لہروں سے ٹکرا کر کنول کا پھول ہچکولے کھائے لگتا ہے اُسی طرح کوکلا کی مدد بھری آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں۔

میں نے گھبرا کر ٹھا کر صاحب کی طرف دیکھا۔ شراب نے انہیں مدہوش بنا دیا تھا وہ اب کمری پر غافل پڑے تھے۔ میں نے اپنے دل کو بہت سنبھالا پھر بھی میری زبان سے نکل گیا۔ ”کوکلا! کوکل کوکل“ راجن بالو! خواہیدہ محبت نے کروٹ لی، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کُردنے سے چمکنے لگی میری طبیعت بگڑنے لگی اب وہاں زیادہ ٹھہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا میں نے کوکلا سے کہا: ”گھبرنے کی کوئی بات نہیں اب آرام سے سوؤ کل سویرے میں دوسری دوا بیجوں گا“ کوکلا نے دبی زبان سے کہا: ”آپ ساہد روڈاکٹر علاج کرنے کو لے توں روز بیارہوئے کو تیار ہوں لیکن بالو! آپ کیا سمجھتے ہیں میرا مرض لا علاج ہے“ میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: ”اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں شے وقت میں نے ٹک ٹک کر کوکلا سے ٹھا کر صاحب کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: ”آپ کی تعریف ہاں کوکلا پھر تہدیدہ ہو گئی اس نے بھڑکی ہوئی آواز میں جواب دیا: ”یہی تو میری جیون تیا کے کھیو تیا میرے سوامی ہیں“ یہ سنکر رنج و غم سے میرا سین پھٹنے لگا۔ آہ کوکلا کے ماں باپ نے کیا سمجھا اپنی کسن پھول سی قبول صورت لڑکی کا بیاہ اس شرابی بوڑھے سے کر دیا اس وقت کچھ اور پوچھنے کا موقع تھا۔ ایک طرف کوکلا سسکیاں بھر رہی تھی اور اس کے قریب ہی اس کا لاپرواہ شرابی شوہر بدست پڑا تھا میں ان دونوں کی حالت پر آنسو بہاتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ ساری رات مجھے اچھی طرح سے نیند نہ آ سکی۔ میں اتنے عرصہ تک کوکلا سے کیوں غافل رہا اب آنسو بہانے سے کیا ہوتا تھا وہ ہمو چکا۔ میں نے لڑکپن میں کوکلا سے جو قول و قرار کیا تھا وہ نباہ نہ سکا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔

— — — — —

کوکلا اچھی ہو گئی اس کے بعد ملائے یہاں اس کی آمد و رفت شروع ہو گئی میری بیوی سے اس کا ہنپنا ہوا گیا۔ وہ اب مجھ سے کانا پرعہ کرتی تھی گو وہ کبھی کبھی مجھ سے دوچار باتیں کر لیتی تھی، میں نے کئی مرتبہ اس سے دریافت کیا کہ وہ ٹھا کر صاحب کے ساتھ خوش ہو یا نہیں مگر اس نے اس کا جواب کبھی نہ دیا، مجھے چند دنوں کے بعد یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ چونکہ کوکلا کی ماں کے خاندان میں کچھ نقص تھا اسی وجہ سے جب برادری میں کوئی معقول شوہر نہ مل سکا تو کوکلا کے ہاتھ نے عبسور اپنی لڑکی کو بوڑھے ٹھا کر صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔

کوکلا کے شوہر بوڑھے ہوئے پر بھی بہت رنگین مزاج تھے۔ خود کو باز راجن کا جوہری سمجھتے تھے۔ بڑے گھمے تو معمولی تھے قسمت کے دہنی تھے شیکھاری میں ان کو کافی منافع ہو جاتا تھا ان کا خیال تھا کہ عورت صرف دولت کی پرستار ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے وہ کوکلا کو بھی دولت کی باندی سمجھتے تھے گھر میں خادمہ تھی کوکلا کیلئے ہر قسم کا آرام میسر تھا، اگر ٹھا کر صاحب کے گھر میں کسی بات کی کمی تھی تو وہ محبت کی۔ ٹھا کر صاحب کو شاید اس کا تجربہ ہی نہ تھا کہ جو ان عورت و دولت سے زیادہ پریم کی بھوکا ہوتی ہے بازاری عورتوں کو رجھانے کیلئے ٹھا کر صاحب بالوں میں حضاب اور آنکھوں میں سرمہ بھی لگاتے تھے مگر کوکلا سے محبت کمیز مایوس کرنے کا انہیں وقت ہی نہ ملتا تھا۔ کوکلا کے لئے ٹھا کر صاحب دو چار نفیس ساڑیاں لائے تھے وہ انہی کو بڑا احسان سمجھتے تھے۔ حالانکہ میں نے سنا تھا کہ ٹھا کر صاحب نے بازار حسن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یا اپنے اور کسی کام کے بہانے سے کوکلا سے اس کے طلائی زیورات تک (جر وہ اپنے میکے سے لائی تھی) مانگ لئے اور کسی مہاجن کے یہاں گرو دی رکھ دئے جنہیں چھڑانے کی مہین کوئی فکر نہ تھی، یہ تھی ٹھا کر صاحب کے گھر کی حالت مگر جب کبھی میں نے کوکلا سے اس کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہا تو وہ ٹال مٹالی۔ شراب کی زیادتی نے ٹھا کر صاحب کے دونوں پھیپھڑے خراب کر دئے تھے جس سے رات کو انہیں کہاںسی کی بہت تکلیف رہتی تھی اس سے ان کی صحت پر بھی بہت بُرا اثر پڑا تھا ایک مرتبہ رات کو ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی وہ کسی اور ڈاکٹر کے زیر علاج تھے مگر اس مرتبہ غائب کوکلا کی سفارش سے میں بلایا گیا، دس بجے رات کا وقت رہا ہو گا نکلا بی مسرو دی پڑ رہی تھی جب میں ٹھا کر صاحب کے کمرہ میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ٹھا کر صاحب پیننگ پر نڈھال پڑے ہیں۔ ان کے پیننگ کے پاس ہی کوکلا سر جھپکائے کھڑی تھی اس کے دونوں گال جو اناد کے پھول کے مانند سُرخ تھے پہلے پڑ گئے تھے۔ اس دن اس نے مجھ سے کوئی خاص پردہ نہیں کیا بلکہ میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں مایوسی بھی تھی اور حسرت بھی، اور کہا: ”ڈاکٹر صاحب! جس طرح بھی ہو میرے بچے کو بچا لیجئے میں آپ کا بہت احسان مانوں گی“

میں نے کوکلا کو ہر طرح سے اطمینان دلایا اور ٹھا کر صاحب کا بہت دل لگا کر علاج کیا جس سے اُن کو بہت فائدہ ہوا۔ لیکن مکمل فائدہ نہ ہونے پایا تھا کہ ٹھا کر صاحب نے میرا علاج بند کر دیا۔ میں نے شراب پینے کی ممانعت کر دی تھی لیکن ٹھا کر صاحب نے میرا کہنا نہ مانا۔

کوکلا میرے یہاں تیسرے چوتھے دن آجایا کرتی تھی، میری بیوی سے اس کا دل بہت پہل گیا تھا لیکن عورتیں شک و بدگمانی کی مورتی ہوتی ہیں اس سے میری نیک خلعت بیوی بھی نہ بچ سکی۔ جس طرح روشن چراغ سے کالا کاجل نکلتا ہے اُسی طرح میری بیوی کے پریم سے بھی شک و شبہ کے کالے بادل اُمنڈتے دکھائی دینے لگے، اُس نے کوکلا کو بیکار چھڑینا شروع کیا، پہلے تو کوکلا نے مذاق سمجھا لیکن وہ آخر کار میری بیوی کے دلی جذبات کو سمجھ گئی اور اُس نے میرے یہاں کا آنا یک سخت بند کر دیا۔

اس کے تھوڑے دنوں کے بعد میرا تبادلہ غازی پور سے بنارس کا ہو گیا۔ چلنے سے پہلے میں نے بہت چاہا کہ کوکلا سے ملی کر میں اُس سے اپنی بیوی کی بے وجہ بدگمانی کی معافی مانگ لوں لیکن مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔

————— ❦ —————

سال بھر کے بعد میں تین ماہ کی رخصت ایس کر جب اپنے گاؤں بدن پور پہنچا تو مجھے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ کوکلا بیوہ ہو گئی ہے اُس کا سہاگ اُجڑ گیا ہے۔ میں نے لوگوں میں کوکلا ہی سے محبت کا سبق پڑھا تھا، جوانی میں جب میں نے

بھول چکا تھا تو اتفاقاً اُسے ایک بوڑھے کی شریک زندگی کی حیثیت میں دیکھ کر میری محبت میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ لیکن اب — جب کہ وہ بیوہ ہوئی تو محبت و ہمدردی کے ساتھ ہی میں اس کی سچی پوجاری بن گیا۔ وہ مصیبت کی ماری۔ دُنیا کی سستانی اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی تھی اگر اس کیلئے میرے دل میں سچی اور پاک محبت نے جگہ پائی تو یہ کوئی پاپ کی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ سماج کے ٹھیکہ دار میری سچی و پاک محبت کو اچھی نظر دے نہ دیکھیں گے مگر میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ میں وقت نا وقت جنگل کی طرف نکل جاتا اور گوکلا کی بدھیمی ہی پر نہیں بلکہ اس سماج کی حالت پر بھی آنسو بہاتا جو کمسن لڑکیوں کو بوڑھے مردوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ میں رام سنگھ بھی کئی مرتبہ گیا لیکن مجھے گوکلا سے ملاقات کرنے کا موقع نہ مل سکا میری دلی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ تنہائی میں گوکلا سے مل کر اُسے اطمینان دلادوں کہ میں اُس کا دلی ہمدرد ہوں اور اس کے دکھ درد میں شریک ہوں مگر کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

الہ آباد کا ماگھ میلہ قریب تھا میں نے سنا کہ گوکلا وہاں اسٹان کرنے جائے گی جس روز میلہ تھا میں علی الصبح مادھو پور اسٹیشن پر پہنچ گیا میں نے اپنی بیوی سے بھی نہ کہا کہ میں الہ آباد جا رہا ہوں وہ ہمارے پاک صاف دلوں سے واقف ہی نہ تھی اگر اسے معلوم ہو جانا کہ میں الہ آباد جا رہا ہوں تو شاید وہ شکی مزاج عورت خود بھی میرے ہمراہ جاتی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ گوکلا کا ڈول کی عورتوں کے ساتھ جا رہی ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی خاص رشتہ دار نہ تھا۔ میلہ کی وجہ سے بہت بھیڑ تھی پلیٹ فارم پر ٹرین آئی تو ایک شور مچ گیا کسی کسی کی خبر نہ رہی دیہاتی عورتیں اور مردوں کو جہاں بھی جگہ ملی گھس پڑے میں نے سکند کلاس کا ٹکٹ لیا تھا بیچاری گوکلا حیران و پریشان اور دھڑلے دھڑلے جگہ کی تلاش میں پھر رہی تھی گاڑی نے سیٹی دی اب میں نے دُنیا کی جھوٹی لالچ کو چھوڑ دیا اور اپنے ڈبہ کا دروازہ کھول کر گوکلا کو آواز دی۔ گوکلا یہاں آ جاؤ گوکلا نے میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پہلے کچھ ٹھنکی اور پھر میرے ڈبہ میں چلی آئی۔ اس ڈبہ میں میرے اور گوکلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش تھے اس کے بعد میں نے کہا: ”گوکلا! میری اس جرات کو معاف کرنا۔ میں بہت چاہتا تھا کہ تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کروں آج مجھے بس کاموقع مل گیا۔“

میں سمجھتا تھا کہ گوکلا میری اس جرات یا کتناخی پر کچھ لعنت ملامت کرے گی یا خفا ہوگی مگر اُس نے اپنی شرافت سے مجھے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر تک وہ چُپ رہی اس کے بعد وہ کہنے لگی۔ ”مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کا اس طرح تنہائی میں ملنا کوئی اچھی بات نہیں ہو دُنیا کیسا کہے گی؟“

”جب ہم دونوں کے دل صاف رہیں تو ہمیں دُنیا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”لیکن ہم کو دُنیا میں رہنا ہے۔ آپ تو مرد ہیں آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا لیکن میں ایک بیوہ عورت ہوں جلد بدنام کر دی جاؤں گی۔“

”کوکلا! تم بس کی پروا نہ کرو۔ میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں، میرے دل میں کوئی بُرائی نہیں۔ میں تم سے سچی دہاک محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ بالے ہن سے!“

”کیا آپ قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے سچی اور پاک محبت ہو؟“

”کیا میں آپ کو کوئی شک ہے؟“

”شک ہوتا تو میں آپ سے اس وقت تنہائی میں کیوں ملتی؟“

میں نے جب قسم کھا کر کوکلا کو اپنی پاک محبت کا یقین دلادیا تو اُس سے کہا کہ ”کوکلا! یہ تو بناؤ کہ تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو۔ کیا انہوں سے کوئی پردہ کرتا ہے؟“

”کوکلا نے کہا: ”مجھے شرم معلوم ہوتی ہو، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ کہتے۔“

اب چڈائی کی گھڑی قریب آ رہی تھی میں نے معصوم کوکلا کے نرم و گداز ہاتھ کو تھام لیا اور بخود ہی میں اُسکو دہانے لگا اس وقت ہم کانپ رہے تھے دونوں طرف سے پریم ساگر موجیں مارنے لگی تھیں نے کہا: ”کوکلا! میں تم سے کبیں طرح بتاؤں کہ میرے دل میں تمہاری کتنی عزت ہو۔ تم اپنے دل کو کبھی چھوٹا نہ کرنا مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ سمجھنا جس طرح تم نے آج مجھ سے میرے دل کا حال دریافت کیا ہے کیا تم بھی مجھ سے سچ سچ بتا سکتی ہو کہ تم کو کبھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟“

”کوکلا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ الہ آباد کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا اس کی خاموشی سے بے چین ہو کر میں نے پھر کہا۔ ”نیکدل کوکلا! ہاتھ جوڑنا ہوں میرے سوال کا جواب جلدی دو۔ تم کو میری قسم! اپنی پاک محبت کی قسم جلدی جواب دو!“

”کوکلا نے مجھے ہاتھ جوڑنے دیکھ کر کہا۔ ”ہاں! ہاں! یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ میں تو آپ سے چھوٹی ہوں آپ میرے دل کو نہ چھیڑتے تو بہتر تھا۔ یہ سوال مجھ سے نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ راجن بالو! آپ آج میرے ضبط پر کبھی گرا دی، بارود کے اندر آگ نہیں چھپ سکی، آپ مجھ سے پاک محبت کرتے ہیں مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی، شاید آپ کو معلوم نہ ہو مگر میں آپ کے دلی حالت سے آج سے نہیں بلکہ عرصہ سے واقف ہوں لیکن میری ہمیشہ یہ خواہش تھی کہ آپ کی محبت کا جواب محبت میں نہ دوں، لیکن جب آج بات کھل ہی گئی آپ نے قسم بھی کھالی کہ آپ کی محبت سچی دہاک ہے تو اب کچھ چھپانا بیگوار ہے۔ میں نے عورتوں کو دنیا میں سب سے بڑھ کر پیارا پریم ہوتا ہے، وہ پریم ہی کی بھوک ہوئی ہیں جو ان کی عزت کرتا ہے جو ان سے محبت کرتا ہے وہ بھی ان سے محبت کرتی ہیں جو انہیں اپنا سمجھتا ہے اس کیلئے وہ جان دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ عورتوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اپنے جانے والے کو نہیں پہچان سکتا، لیکن وہ شرم و حیا سے اس کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ لیکن آج جن باتوں کو میں نے اب تک چھپا رکھا تھا ان کو مجبوراً ظاہر ہی کرنا پڑا میری اس کمزوری کو معاف کیجئے گا۔ مگر راجن بالو! میں یہی کہوں گی کہ آپ نے اپنی محبت کی ہوا سے میری محبت کی چنگاری کو بھڑکا دیا۔ سوچئے تو ہسی اس کا نیچہ کیا ہو گا۔ کیا دنیا ہماری اس پاک محبت کو اچھی نظروں سے دیکھے گی۔ جب آپ کی بیوی بھی اس بات کو پسند نہ کر سکیں کہ ہم ملیں یا باتیں کریں تو دوسرے تو نہ حلوم کتنا بدنام کریں گے۔ مگر ٹھہریے.....“

آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں نے سمجھ لیا۔۔۔ برسوں سے میں نے آپ محبت کی منکر آپ کو اس کا پتہ بھی نہ چل سکا آج تک کسی کو خواب میں بھی میری محبت کا حال نہ معلوم ہوا۔ دیکھتے عورتیں اپنے دل کو کتنا سنبھال سکتی ہیں۔ میں نے آج تک کبھی نظر بھر کر بھی آپ کو دیکھنے کی جرات نہیں کی، اور شن کے سکھ سے بھی میں نے خود کو محروم رکھا مگر آج آپ نے میرے دل کو ایسا چھیڑا کہ سب کچھ کہنا ہی پڑا، اب میں ادب کچھ کہنا بیکار سمجھتی ہوں اب کچھ کہتے بھی نہیں بنتا سنگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ سے زیادہ دُنیا میں کسی سے بھی محبت نہیں کرتی اور جب تک جنوں کی اس محبت کو بنا ہونگا۔ آپ بھی میری اس محبت کی لاج رکھیے گا، اگر میں آپ کو اس جنم میں نہ پاسکی تو دوسرے جنم میں اُمید ہے کہ ضرور پاؤں گی۔ لیکن یہ کیا ہے آپ روئے کیوں ہیں اور فنا تو عورتوں کی قسمت میں لکھا ہے آپ تو مرد ہیں آپ کو روئے سے کیا کام۔ آپ کے لئے تو دُنیا میں سکھ ہے چین ہے آرام ہے مجھ غریب بیوہ کے لئے آپ کیوں آنسو بہاتے ہیں۔ تجھ ایسی ہزاروں بیوہیں ہندوستان میں پڑی ہیں آپ کہاں تک روئے گا۔۔۔

میں جوش محبت میں دیوانہ ہو گیا مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا میں نے اس کے خوبصورت نرم و نازک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر پیار کیا۔ گو کلانے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میری اس گستاخی پر وہ جتنا بھی لعنت طامت کرتی میرے لئے کم تھا، لیکن پاک طینت صاف دل گو کلانے مجھے معاف کر دیا۔

دہتیں گزریں زمانہ ہو گیا لیکن میرے دل سے کسی وقت بھی گو کلانے کی یاد نہیں جاتی، اس کا پاکیزہ ٹکھڑا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہوا اور گو کلانے! جہاں تک مجھے معلوم ہے گو کلانے صدق دل سے مجھے یاد کرتی ہے۔ ہمارے درمیان سماج کی دیوار کھڑی ہے جس کا توڑنا آسان نہیں۔ لیکن ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت و درگزر ابھی سماج کی طاقت سے باہر ہے۔ ممکن ہے کہ جٹا دھاری مہنت اور سماج کے وہ جھلکتے جوتیوں والے بیواؤں کے مال پر ہاتھ صاف کر کے مال پورا کھا لگا کر اپنے بدن کو اور موٹا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو بیواؤں کی کوئی ہستی ہی نہیں سمجھتے، ہماری اس پاک محبت کو بھی گناہ کہیں لیکن اگر پریم کرنا بھی پاپ ہو تو دُنیا میں کوئی کام یاب نہیں ہو سکتا۔

عظیم (گریوی)

## تائیس

یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف اناطولی فرانس کا شہ پارہ ہوا اس میں جسم و روح کے تصادم کے مسئلہ کو مضمر قدیم کی ایک عروس بازاری کی داستان کے طور پر نہایت دلنفریبی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تمام دُنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر الکلامی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے علاوہ معمولی لئے کا پتہ۔ لکھائی بنگلہ پورہ جی۔

## اندھا بھکاری

گھنٹ کا ایک مکروہ محمد — پچھلے پہر کا وقت  
جاڑے کی راتیں — ٹھنڈی ہوائ کے جھسکا

ہوا آڑی اور بھلائی بدبو سے جو پھل ہو رہی ہو گلیوں میں آجوروں کے ٹکڑے، بوتلوں کی کپڑیں، ٹھہرے پتل اور اندوں کے چھیلے  
بکھرے پڑے ہیں۔ ٹوٹاؤں سے چھلکے سر ہی ہیں، بھجیوں کے نیچے آئی نہایت کی قیمت رکھی ہوئی ہے — روپے کم اور پیسے زیادہ۔  
پہرے داروں کے "جاسٹے" رہیں ہو، کی سہلے بارگشت کتوں کی "بھوں بھوں بھوں" میں سنائی دیتی ہے۔ آسمان پر کچھ تارے کوڑھ  
کے داخل کی طرح چھلکا رہے ہیں۔

وہاں ایک گھٹا، اس کی دواہریں ہانس کی گھجیوں پر مٹی کے تودے چڑھا کر بنائی گئی ہیں۔ چھ پرچوں کا کڑا اور دروازہ مین کا اکر  
دوانے کے سامنے ایک ہیڈ لائٹ لٹائی ہوئی ہے۔ جیسے سردی کے بارے کبھی کبھی اپنی موٹی کھال کو سکوڑ لیتے ہیں اور پھر اطمینان سے  
جگائی کرنے لگتے ہیں۔ "دوست دیکھو تو آئی انھیں مندر کے چوٹے چھوٹے دیوں کی طرح چمک اٹھتی ہیں۔

اس گھر کو سب لوگ "اندھا ٹولا" کہتے ہیں۔

گاڑی بان کے جسم پر ایک موٹا کپڑا تھا، ایک ہاتھ میں نایل کی گر لٹری، دوسرے میں چڑے کا چابک۔ اس نے ٹین پر چابک کے  
دستے کا ایک ہاتھ لگایا اور بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً اندر اندر سے اس کے کچھ لوگوں کے جہانیاں ملنے اور کھارے کی آواز سنائی  
دی۔ کتے کان پھڑپھڑا کر ایک طویل "اوہو" کے ساتھ صبح کا بھن گئے تھے پھر آدمیوں کے ٹٹول ٹٹول کر چلے اور لٹکھڑانے کی آہٹ  
سنائی دی۔

اندسے نفل میں پنا بھولا دیا، ہاتھ میں کلری سے کیے بعد دیگرے باہر نکلے گئے۔ ان کے پیچھے کتوں کا نفل ایک دوسرے کو بھنبھن  
ہوا باہر آیا۔ گاڑی بان چابک سے کوچ کوچ کر انہیں گھنے لگا۔ سولہ سترہ — دو اب بھی سو رہے ہیں۔ ایک اندھا ایک اندھی۔ ایک دوسرے  
کا کات بنے اب بھی سو رہے تھے۔

گاڑی بان اندر گیا۔ ایک لٹکھڑا ہوا چابک کا جھپٹا اور اندھوں کی چیخ۔ مرد وہیل کی کھال زندہ انسان کی کھال پر، اور ان  
دونوں کی رگڑ، ایک دردناک فریاد بن کر روش کی مٹے کھائی اور سی میں کھو گئی۔

روز بھی جوتا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے یہ اندھے ایک گاڑی میں بٹھا کر مختلف جگہوں پر چھوڑ دیتے تھے۔ وہ دن بھر وہاں بیٹھ کر وہ  
بیک بیک لٹکھڑاتے تھے۔ راہ چلتوں کا رجم حاصل کرنے کے لئے ان میں سے کوئی نگاہا بن جاتا تھا کوئی اپنا چڑا اور حیرت انگیز تھا اور  
کوئی تھکلیاں لپیٹ کر سڑک پر پڑ جاتا تھا۔

وہ سب اندھے تھے، وہ کبھی نہ دیکھ سکتے تھے ان میں سے کسی کی پٹلیاں سفید تھیں۔ کفن کی طرح۔ کسی کی آنکھیں سڑخ تھیں  
سے ایک تم کی ویسی شراب۔

ہون کی طرح۔ کسی کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے۔ قبر کی طرح۔ یہ بے بصر اور پتھرائی ہوئی آنکھیں غلام میں کسی نامعلوم شخص کو ڈھونڈنا کی تصویر  
 میں بھی آئینہ آتے تھے۔ وہ اندھے بھکاریوں کی آنکھیں تھیں۔

وہ سب خدا کو یاد کرتے تھے۔ اندھا گھوڑا کالا کیل نے خدا کی راہ پر۔ ”میرا جیل بھرے تجھے مولا ہے“ اندھے کا سوال  
 ہے سب کے اوپر۔

خدا کی رحمت جھوٹے ٹکڑوں اور کافی کوڑیوں کی شکل میں ان پر نازل ہوا کرتی تھی۔ انکے بے رنگ نیکل میں ہمیشہ سوکھی روٹیاں  
 اور کچی چٹائیاں ادا کرتی تھیں۔ راہگیروں کی ٹھوک سے بچنے کے لئے وہ چوراہے کے تاب وان کے قریب بیٹھ جاتے تھے۔ اس تاب وان  
 میں سماج کی ساری غفونت اور غلاظت بیک جا جمع ہوا کرتی تھی۔ جو عمری کلہر طیبہ کے فیض سے کھانے والوں پر حلال ہو کر باہمی ملک  
 بٹھا جاتی، اُسکے ہیٹ کی آلائش اور بچے ہوتے پر تاب وان میں بڑے رہتے تھے۔ نرم نرم گوشت ان ان کے لئے، گرم گرم خون کتوں  
 کے لئے اور اتنی جیل کوڑوں کے لئے۔ شریفیوں کے کھانے سے جو کچھ بچ جاتا تھا۔ سڑے ہوئے پھل اور سوکھی روٹیاں۔  
 وہ تاب وان کے حصے ہیں آتا تھا۔ دو پہر کو جب اندر رفت کچھ کم ہو جاتی تھی تو پتے کتوں کی مدد سے اندھے تاب وان کا جائزہ لیتا  
 لہرتے تھے۔ گوشت خور کے شہری لگی ترکاریاں اور پھل اپنے اندھے دوستوں کے آگے ڈال دیتے تھے اور وہ ایک نعرہ سرکے ساتھ  
 ملنے کے نیچے آواز دیتے تھے۔ پھر وہ مجھ مجھ کر سڑنے چلنے والوں کو دعائیں دینے لگتے تھے۔

اس طرح اندھیرا ہوجاتا تھا۔ وہ گھینسا گاڑی کی آبی اور بچے بعد وگرنے ان اندھوں کو لاڈ لپٹے ٹھکانے لے جاتی تھی۔  
 وہاں پہنچ کر جو دھری ان سب کی جامہ تلاشی بیٹا تھا۔ ہر فرد کو روز کم از کم چوٹی کما آبی پڑتی تھی۔ اگر کوئی اس کو کم لاتا تو اسے کھانا  
 نہیں ملتا تھا اور مارا لگ پڑتی تھی۔

مذہ کے بھٹیاں خانوں میں برتنوں سے جو جھوٹا بکھرا ہوا تھا ان ایک یکدیگر کر کے اندھوں کے لئے بھجوا دیتا تھا۔ انکے جیل میں چھٹی  
 پٹیوں کیسے ہوتے چاندلوں اور بائی دھیموں کا دھیر لگ جاتا تھا۔ کتے جیل میں منہ وال کر پڑتی تھاتے تھے اور اسے جڑے میں دبا کر اس  
 اس طریقے سے چباتے تھے گویا کوئی پکا کر آیا اپ رہا ہو۔ اندھے نہیں دیکھ نہ تھے تھے جب آواز سے پتہ چلتا بھی تو وہ ایک آدھ بار دھنگار  
 جڑے ہو رہتے تھے۔ کتوں کے سوا ان کا ہمد اور غلہ اکر کون تھا۔ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔

پھر وہ پٹی اور پٹی ہوتی چٹائیوں پر اپنی ٹڈیاں بچھا کر لیٹ جاتے تھے۔ اندھے ایک طرف اندھیاں دوسری طرف۔ اور  
 تھے ان دونوں کے بائیں، سخت گیر والدین کی طرح، ایک مد سکندری قائم کر دیتے تھے جب اندھے کو ریس میں اپنی دعائیں یاد کیسا  
 کرتے تو پہلے تو کتے، دھیان سے سننے اور آخر میں ایک درشت آئین کے ساتھ وہ بھی لٹکے جھنڈا ہوجاتے تھے۔

پھر اندھوں کی اندھیری دنیا میں خاموشی چھا جاتی تھی۔ آرتی کا گھنٹہ ہوا میں ہلکا سا نرم پیدا کر کے چپ ہو جاتا تھا اور اذان  
 کی آواز بھی فضا پر تھر تھر کر کھو جاتی تھی۔ بلند بہت دور سے ایسی دکنی سازگی کی ریس میں، پھر دی کی طرح بھنسناسی تھی۔

جب اندھیرا دور ہو گا تو صبح ہوگی۔ لیکن اندھوں کی دنیا میں کسی سوچ نہ بچے گا۔ دعائیں دیکھتے، سوکھی روٹیاں اور کتے  
 یہی اندھوں کا سنسار تھا۔

ایک شام کو جب اندھے اپنی کوٹھری میں لے گئے تو کتوں کی باز پرس سے انہیں کسی اجنبی کی موجودگی کی اطلاع ہو گئی۔ انہوں نے اپنی حساس ناکوں کو ہر طرف گھما کر فوراً جانچ لیا کہ اُن کے گرد وہیں کوئی اندھی عورت شامل ہو گئی ہو۔

”کیا نام ہے جی تمہارا؟“ ”جننا“

”آواز میں جوانی کا رہی تھی۔“

”تینا جنم اندھا نہ تھا۔ کبھی دن بھی آنکھ دلاتھا، کبھی دن بھی ہر رنگ کو دیکھ سکتا تھا۔ ہر صورت کو پہچان سکتا تھا۔ وہ کیسا سازی کے کسی کارخانے کا مزدور تھا۔ ایک روز تیراب کی بوتل پٹ گئی، اُسکے کچھ چھینے تینا کی آنکھوں میں پڑے اور وہ اندھا ہو گیا۔ کارخانہ والوں نے اُسے نکال دیا۔ برسوں وہ مارا مارا پھرتا رہا اور اب یہاں آچکا۔“

ابھی اُس کے تین بیٹے جوانی کی رنگ مارتے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی دن شدت سے محسوس کرتا تھا کہ تاریکی کی عین چادر کو پھاڑ کر کوئی چیز روشنی میں آنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اسے خیرات میں کچھ دیتا تو اُس کی پیٹھ پھرتے ہی دن لے لے ایک گندی گالی دیتا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اگر اس میں قوت ہوتی تو وہ ان بیسوں کو اگ میں تباہ کر ان خیلوں کے چوٹوں پر رکھ دیتا۔ وہ باؤا بلند راہ گھروں کو بددعا میں دیا کرتا تھا اور یہ لوگ کوئی پہنچا ہوا درویش بھیکر اس کی عزت کرتے تھے۔

جوانی کا مقابلہ میں جوانی کی رات بھینکے گی تو تینا کو زندہ میں یہ محسوس ہوا کہ کوئی اُس کی گدڑی کھینچ رہا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کوئی کتا ہے لیکن ایک نرم ہاتھ اُس کے پیروں سے لگا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جاؤ الگ رہا ہے جننا؟“

”ہاں جی“

تینا نے اپنی گدڑی اُسے اڑھادی اور خود پیتا لے بیٹھ گیا۔ اُس کی زندگی بھر زمین تھی جس میں ایک پودا خود بخود اُبھرتا تھا۔ تینا اندھے میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے وہ دن یاد آئے جب اُس کی رگوں میں تازہ خون بہتا تھا۔ کس طرح کھیت کی ایندھنوں پر وہ بہاؤ لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ غلیں سے پانی کی کلیسوں کو توڑ دینا، سر سے گھاس کے گٹھوں کو گرادینا، لڑکیوں کے بیٹھے بیٹھے کوٹنے۔

وہ دن اور اب!!

اندھوں کو اپنے لگنے لگا گیا چارٹے کی راتوں میں دھوپ مل آتی ہے۔ جننا کے بھوے گیت سن کر اُن کی بے نور آنکھیں پر غم چو جاتی تھیں۔ اس کی اظہار سنی انہیں ایک نئی مسرت کا پیام دیتی تھی۔ جب وہ چلتی تھی تو اندھے سہم جاتے تھے کہ کہیں وہ گرنے پڑے کسی راتیں آئیں اور گدڑ گئیں۔ ایک بار جب سب سوچے تھے تو جننا نے تینا کو اپنی زندگی کا افسانہ سنایا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور اندھی ہونے کے باوجود حسین تھی۔ اس کا باپ کسی مہاجن کی دوکان پر مٹھی تھا۔ جب جنگ کی طرچہ چودہ سال کی ہوئی تو اُس کا باپ مر گیا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو بڑی ماں اور اندھی بیٹی کی دست گیری کرتا۔ ایک ایک کر کے تمام زیور اور برتن بیسے کی نذر ہو گئے۔ تاہم ان کے دکھ کے دن نہ بیٹھے۔ خستہ حالی بڑھتی گئی اور فاقوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے تو قلم والوں میں سے کوئی ایک دو وقت روٹی دیدیتا تھا۔ لیکن آخر کب تک۔

انہیں دنوں جننا کے گھر اُس کی کسی دور دراز کی خالہ کاانا ہوا۔ جاتے گیسوں ماں عرصہ سے اُس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔



مئی روز تک اماں اور خالہ ایک کوٹے میں بیٹھ کر سرگوشیاں کرتی رہیں۔ ایک روز ماں نے جتنا سے کہا کہ آج تجھے اپنی خالہ کے گھر جانا ہے۔ صبح سے اُس کی نگھی چوٹی ہونے لگی، اور جب جتنا اپنی پراسرار خالہ کے ساتھ رکٹا پر بیٹھ گئی تو اُسے اپنی ماں کی ہچکیوں کی طاز صاف سنائی دے رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں جتنا کا دل اندر سے بیٹھنے لگا اور وہ کسی آنے والی مصیبت کے خوف سے آپ ہی آپ لرز اُٹھی۔

خالہ نے جتنا کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ گھر پہنچتے ہی اُسے طرح طرح کی مٹھائیاں بکھلائیں۔ دیر تک اسکا ہانڈا سنگار کرتی رہی۔ تاہم جتنا کا خوف ہر آن بڑھتا ہی جاتا تھا۔

بہت دیر ہو گئی، دوا چلے، نیچے کی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سنائی دی، دم اتنے بھاری تھے کہ جتنا سمجھ گئی، کوئی مرد ہے۔

دروازہ کھلا اور خالہ جان آئیے سیٹھ جی، کہتی ہوئی آگے لپکیں تھوڑی دیر دونوں میں کانٹھوسی ہوتی رہی، پھر روپوں کی چمن چمن ہونے لگی۔ جتنا بھی جتنا کے پاس آئی، اُسے اُٹھل میں روپے باندھ دئے اور اُسے بچکار بچکار کر باہر چلی گئی۔

قبل اس کے کہ جتنا کچھ سمجھے، اُسے اپنے منہ پر کسی جانور کا گرم گرم سانس محسوس ہوا۔ اس کے منت ہاتھوں نے جتنا کی کانیاں پکڑ کر اُسے اپنے آغوش میں گھسیٹ لیا۔  
جب جتنا گھر لوٹی تو وہ عورت بن چکی تھی۔



کمی شام کو جب حسب دستور اندر سے فقیر مینسا گاٹھی پر لوٹ گئے تھے، تو گاٹھی بان اور چودھری میں باتیں ہونے لگیں۔

”چودھری، اور جو بھی ہوتی تو نوڈیا سندر“

”جی، ایسی ویسی آسٹونے کی چڑیا تھی۔ پورے پانچ سو روپے ملے، تھوڑے نہ بہت، بھتا، لڑکی کی تھی، گڑیا تھی گڑیا۔“

”بھونے سے کیا ہوا؟“

”جینا کے ہوش اڑ گئے۔ بھڑائی ہوئی آواز میں پوچھا: چودھری، کیا بات ہے؟“

گاٹھی بان زور سے ہنسنا اور اُس کے منہ پر کوڑے کا دستہ کو بھڑکھڑاتا دیکھتا، بہت مزے کئے، اب چڑیا لڑ گئی۔ وہ اندر ٹھکانے

لگ گئی، اب بھر پٹیا کرنا۔“

چودھری نے گاٹھی بان کے ہاتھ سے کوٹا لیا اور تینا کو بیدار دی سے پٹینا شروع کیا لیکن تینا جس وجہات پٹھا رہا۔ وہ کیوں

دئے، کیوں ٹوٹے، اب زندگی میں رہ گیا تھا۔ اُس کی دنیا ایک مرتبہ پھر روشن ہوتی تھی، لیکن آج وجہات سدا کیلئے بجھ گئی۔

سُورج مغرب میں ڈوب چکا تھا اور گلی کے قلعے گھنگھروں کی طرح ہوا میں ناچ رہے تھے۔

تینا نے کھانے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ جب چودھری کا تینا فقیروں کے چٹیل میں ٹکڑے ڈال کر باہر چلا گیا تو وہ چُپکے سے اٹھا، لکڑی

تھمیلی اور باہر نکل گیا۔

مشک جلد ہی تھی۔ اندھا لپکتا ہوا ایک گلی میں گھسنا اور اس بھولی بھلیاں میں غائب ہو گیا۔

ہر راہگیر سے رو پوچھتا، بھائی تم نے کسی اندھی بھکارن کو ادھر جاتے دیکھا ہے؟ اُسے کوئی حقارت سے اُسے گھور کر چاہتا تھا، کوئی ایک دھبہ جھاڑتا تھا، کوئی ہنس پڑتا تھا۔ جب کوئی سُنان سڑک آتی تو اندھا اپنی بے بھر نگہیں آسمان کی طرف اٹھا، آواز میں "جتنا جتنا" بھارے لگتا تھا۔

اُدھی رات گزرتی اور نینا چلتے چلتے ٹھک گیا، جھولا سر ہانے رکھ کر وہ فٹ پاتھ پر لیٹ گیا اور فوراً ہی سو گیا۔ معلوم نہیں اُسوتا رہا لیکن سینکڑوں آدمیوں کے شور و غوغا نے اُسے چرچا دیا۔ پہلے تو وہ سمجھا ہی نہیں کہ باجر کیا ہے۔ لیکن جب تاہر توڑ کئی لٹھ اُس پر پڑ چکے تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ پولیس والوں کی لٹھیاں ہیں۔ پولیس لٹی لٹھیاں — قسمت سے زیادہ جابر اور دوست سے بے مروت! پولیس کی لٹھیاں — طوفان سے زیادہ تیز اور امیروں سے زیادہ بھس۔ فٹ پاتھ پر سونے والے آواز کروا کر دوسرے زلزلے کے لئے آج پولیس کا سب دی "ہڈ" نکلتا تھا۔

اندھا بھکاری کی کہناں بھاگتا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگتا رہا۔ بابائیں اندھا ہوں، لیکن لٹھی بھی اندھی ہوتی ہے۔ جب یہ اندھی گڈرچی کو تینا آگے بڑھا، اُس کے سر اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ کسی بارگرا اور پھر اٹھ کھڑا۔ جب وہ اس سڑک کے موڑ پر پہنچا تو اُسے سامنے کے کوٹھے سے گانے کی آواز سنائی دی۔ اندھے کی روح کا پیہ یہی رو آواز تھی جس کی جوتیں وہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ لیکن یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ گیت کی تان اکثر دھیانہ تہمتوں میں ڈالتی تھی۔ بیچ بیچ میں بوتلیں اوپر سے نیچے گر کر چکنا چور ہو جاتی تھیں۔ اندھا سڑک پر بیٹھ گیا۔

آسمان سے ایک تار اُٹھا، اُس نے اندھے کو دیکھا، لیکن اندھا اُسے نہ دیکھ سکا۔

اخت حسین رسلے پوری

## لال قلعہ کی ایک جھلک

ملا ناٹماز فتحپوری فرماتے ہیں: "سید ناصر زبیر فریق (مروم) کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے دکھایا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار شاہ ابوالفتح کے زمانے میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی اور اُس انتہائی انحطاط کے زمانے میں بھی وہاں کی پچیدوں کا کیا عالم تھا۔ سید زبیر فریق دہلی کے مشہور دانش پرور دانشور تھے اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جس کا باب ایک فرد بھی باقی نہیں۔ زبان کی حلاوت بیان کی شیرینی۔ اُردو سے محلی کے لٹکائی محاورے، تہذیبِ قدیم کے حوالہ و مراجع کا بیان۔ الغرض اس چھوٹی سی کتاب میں وہ چیز نہیں ہے جس سے اس وقت دانش پرور کی بڑی سے بڑی کتاب خالی نظر آتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لینے سے پہلے اُس وقت تک کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں جب تک ختم نہیں ہوئی۔ اور جب ختم کر چکا تو تاثر کا یہ عالم تھا کہ اکھ اور دو دونوں رو رہے تھے۔"

قیمت صرف ایک روپیہ (طہر) علاوہ محصور لٹاک

پٹنہ کا پتہ: ساقی بک ڈپو، وحلی

## عفتِ مکرر

جہاں کے چہرے پر جوانی کی شان ابھی باقی تھی، اور اُس کے گنے بال بائچن کا طرہ معلوم ہوتے تھے۔ اُسکی روشن آنکھوں کو نکلنے والی بچاں پر نرم بھی نہیں اور نفوذ کر جانے والی بھی۔ اُس کی شان میں غور کی آمیزش تھی اور اُس کی ادا خود داری و سر بلندی کی صورت تھی۔ اُس کی شخصیت کچھ اس نوع کی تھی جس میں سے سکون آمیز لطافت طلبی کی قوت نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ اور اس میں ایک فاتح کا سا انداز تھا جسے اُس کے اونچے قد نے اور ابھار دیا تھا۔ وہ اعلیٰ اور اثر انداز ذہانت کا دلورنا معلوم ہوتا تھا۔

’ملک کے ایک سر سے دوسرے سر تک اُسے نام کا شہرہ تھا، اور دولت اُسکی کنیز بن گئی تھی۔ کوئی دروازہ ایسا نہ تھا جو اُس کے لئے ہر وقت کھلا نہ ہو، اور کوئی صحبت ایسی نہ تھی جہاں اس کا غیر مقدم تپاک سے نہ ہوتا ہو۔

وہ ایک شاعر تھا، ایک خوش فکر ذاتی جس کا ذہن تصور کر سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا، اور مہر سے ایسی خوش سلوبی سے ترتیب دے سکتا تھا کہ دوسرے اپنی اپنی ذہانت کے مطابق تصور و مشاہدہ کر سکیں۔ غرض اس کی انفرادیت کا پورا دابر حکمران اور پورا تھا۔ جہاں کے متعلق بلاتامل کہا جاسکتا ہے کہ اس کی فکر پکا ذہانت کے قدرتی حق لئے اسے ان لوگوں میں بادشاہ بنا رکھا تھا۔ جس کے عالی حیلا اور روشن تصورات، انسانی زندگی کے الام و مصائب کا ہم ثابت ہوتے تھے۔ اسکی تخیل کے باغ میں فرزندگی کے پھول کھلتے تھے۔ فطرت یعنی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی زبان سے بولنے لگتے، چشموں کی گنگناہٹ، پرمردوں کی چہا باہٹ، محبت کی حریت، احساں کی نزاکت، تہذیب کے انداز اور تمدن کی آویزشیں اُسکی بنائی ہوئی تصویروں میں زندہ ہو جاتے تھے۔ اس کا فن شاعر ایک جادو تھا۔

سیر کی غرض سے جہاں لاہور سے نکلتے آیا ہوا تھا۔

### چند چند

تجربہ کے خدو خال میں ہلا کی جا ذہیت تھی۔ اس کی صورت میں انتہا کی نظر فریب تھی۔ اُس کی آنکھیں مدھ ماتی تھیں، لٹن سے نکلنے والی بچاں تنک محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے دہانے کی ساخت تجربہ کے اندر بڑھے ہوئے جذبہ آمیت کا اظہار کر رہی تھی۔ بن کھائی ہوئی زلفوں کی ایک خود سرٹ، اس کی بچی مگر فرخ پیشانی پر کھیلنے رہنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسا دُکھ استہزا جو انسانی طبع و مزاج کا مطالعہ کرنے والوں یا ایک جاہل و ناتراشیدہ آقا کے ذہن و جذب غلام یا اس شخص کی صورت میں نظر آتا ہے جسے حقیقت و صداقت کے تجربہ کی خفاک و حار کا احساس ہو چکا ہو۔ اس استہزائے میرزا مطلب انداز طبیعت کے اس اظہار سے ہے جسے اصطلاح میں ’کلیت‘ (مطلق یہ دیو جاس گئی) کہا جاسکتا ہے۔

سینا میں ابتدائی نغمہ بج رہا تھا، آدھی سیر اُسکی اچھے اُستاد کے تخیلات بیان کر رہا تھا۔ بیٹے اور سارنگی سے دل آویز بول گل



ٹھیک اس حالت میں ایک فرشتہ غیب نمودار ہوتا ہے اور یہ فرشتہ اس کا حافظہ فرشتہ ثابت ہوتا ہے ایک سترہ سال کی لڑکی پر مردہ سے بھول کی ایک تصویر، رات کے وقت ایک گلی میں موٹر سے بچے ہوئے نالی میں گر جاتی ہے۔ یہ اُسے اٹھاتا ہے۔ وہ ناتواں ہے، اس نے کچھ بھوک ہے جس اتفاق سے نوجوان کی جیب میں کچھ دام تھے۔ وہ جھٹ لگ جلنے کے خیال سے گرم دودھ لاکر پلاتا ہے۔ لڑکی کے حواس بر جا ہو جاتے ہیں۔ وہ اُس کے گھر پہنچانے جاتا ہے۔ راستے میں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کا شوہر ادبش ہے اور اپنی کن بروری سے بس اتنا تعلق رکھتا ہے کہ وقت بہ وقت جب ضرورت پڑتی ہے، بیوی کو مار پٹ کر اُس کے سیکے بھیج دیتا ہے تاکہ وہ اپنے باپ سے کچھ رقم لے آئے یا مال کا اندوختہ۔ ورنہ ہفتوں صورت نہیں دکھاتا اور نہ پروا کرتا ہے۔ طلاق دینے پر بھی رضامند نہیں ہوتا کہ اُسے اپنی ضرورتیں مل جاتے کا اندیشہ تھا۔

اس بلا نصیب نوجوان کو اس روز ایک مشاعرے ایک نظم کی قیمت حاصل ہوئی تھی اور شاید وہ اس طرح اپنے نایبندہ ہائے طبع کو کسی کا مشتعل نہ کرتا اگر وہ اس رقم کو احتیاج سے دائمی مغفرت کے لیے کیے کیے نامزد کرتا اُس نے دن میں ٹھکان لیا تھا کہ ایک شب حسب خواہش دلی کھائی کر اس زندگی کو خیر باد کہدے گا لیکن اس وقت اُس کے سامنے ایک ہم تر مسئلہ پیش ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ساری پونجی اُس لڑکی کو دیدیتا ہے۔ اور جب اُس کے گھر سے اپنے مکان پر پہنچتا ہے تو اپنی خود کشی یا مہج کی نان و ننگ کی فکر کے عوض اپنی طبیعت میں ایک قسم کی جولانی اور آئنگ محسوس کرتا ہے۔ زمانے کو تاریک و غلیظ دیکھنے کے بدلے اسے شفاف و نورانی دیکھتا ہے۔ اب وہ دنیا سے نفرت نہیں کرتا بلکہ رافت برتنا چاہتا ہے۔

صبح جب وہ بیدار ہوتا ہے تو نہایت سکون آمیز حیات کی حالت میں ایک مظلوم افتادہ لکھتا ہے۔ خود اپنا افسانہ جو ابھی انجام کو نہیں پہنچا ہے، لکھ دیکھنے کے بعد اس کو پڑھتا اور سکوٹتا ہے۔ ایک موقر رسالے کے دفتر میں جاتا ہے اور معقول معاوضہ پاتا ہے۔ یہ کامیابی اسے براہ راست اس لڑکی کے پاس لے پہنچتی ہے، کیونکہ اُس کے خیال میں اس کامیابی کا سبب اس کی ذات تھی۔ وہاں پہنچ کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ رات اُس کا شوہر آیا تھا اور یہ انداز بتانے پر کہ اُس نے یہ رقم کہاں سے پائی کہو بہانہ کر کے ڈال گیا اور رقم چھین لے گیا ہے۔

نوجوان حسن مجروح و سوگوار کی اس صورت کو شفا خانے لے جاتا ہے اور جب تک اُس کی چوٹیں اچھی ہوں براہ رُکے پاس جاتا رہتا ہے، اُس کی دعاؤں و فداؤں اہتمام کرتا ہے، اُس کے لئے لباس پہنا کرتا ہے۔ اُس کے پاس جیسے کہ اس کا دل بہلاتا اور لطف و مہربانی کی باتیں کرتا ہے۔ لڑکی جس نے اس مہر و انعامات کا مزہ اُکھی ہے چکا تھا اُس سے ملوث ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ شفا خانے سے نکلتی ہے تو نوجوان کے ساتھ چلی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ پہنے لگتی ہے۔

ایک مصیبت زدہ کی احسانمندی، اور ایک محبت کی بھوک کی محبت کے جذبات، ایک غریب لڑکی سے جو اور بھی خدمت کرا سکتے ہیں وہ اس نوجوان کی دینی ہی خدمت مشروع کر دیتی ہے۔ اس محبت آمیز خدمت کا تجربہ اس نوجوان کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

لڑکی نہ صرف خوش چل تھی بلکہ ذہن بھی تھی، اور اس کے ساتھ جب محبت بھی شامل ہو تو نوجوان پھر کیوں نہ فر دوسی مستزوں سے آشنایا ہو جائے! اب وہ جو کچھ لکھتا ہے وہ شائع ہوتا ہے، اور اُس کی شہرت، عزت، اور ساتھ ساتھ دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

عیش و عشرت کی زندگی بعض نازک فطرتوں کو جو نصیادیتی ہے، اور بعض مستطبیعتوں کے لئے ناقابلِ مزاحمت کٹش رکھتی ہے۔ فرداوی دولت کی جگہ گھٹا ہٹ سے ایک فلسفہ ہی بچ سکتا ہے۔ شاید اس نوجوان کی شاعری نے ایسی جگہ اسے فیلسوفیت کا سبق نہیں دیا تھا۔ ورنہ کامیاب و کامران ہو کر اس میں یہ کیفیت رونما نہ ہوتی۔ یہ نوجوان سماج میں مقبول عالمِ پاکر رفتہ رفتہ اس لڑکی کی طرف بچے پیدا ہونے لگتا ہے، اور پھر بچے رحمی سے بھی باز نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی اس حالت کو سہارا نہیں دیتی تو ایک روز اسے چھوڑ کر بھاگتی ہے اور پھر پتا نہیں چلتا۔

اس نوجوان کی کامرانیاں اتنی مشکل تھیں کہ اس لڑکی کے چلے جانے کا اس پر معمولی اثر ہوتا ہے، اور اس کی معمولی تلاش و جستجوئی اس کی بڑھی ہوئی مصروفیتوں میں گم ہو جاتی ہے۔ فطری رنج و افسوس ہوتا ہے لیکن سوسائٹی کی رنگ ریبوں میں جلد محو ہو جاتا ہے۔ اس کی آرزوؤں کے پورا ہونے پر اسے اور امیدوں کے برکتے رہنے سے اس نوجوان میں غرور کی شان پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ اپنی حالت پر متغیر ہے، کیونکہ عالی خاندان اور بڑے جلال و تین کا متمتع اس کے غیر مقدم میں فرسٹ راہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب یہ تمام مصروفیتیں اور دلکشیاں اس کا دل نہیں بہلا سکتیں اور وہ اپنے قلب کے اندر ایک خلا کا احساس کرتا ہے۔ اس ذیل اور مسترحم حالت کا احساس کرتا ہے جو کہ ایک مرد کو ایسی ہی حالتوں میں ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں ایک بلی کی ٹپس اس وقت اٹھتی ہے جب اسے وہ لڑکی یاد آتی ہے جس نے اسے فنا ہونے سے بچا لیا۔ جس سے وہ واقعی محبت کرتا ہے۔

یہ نوجوان خود جہاں تھا۔

گزرے ہوئے زمانے کا خیال گزر گیا۔ جہاں کی چشمِ تصور کے سامنے سے ماضی کا غبار جھٹ گیا اور سامنے تجریدِ طبیعتی نظر آئی۔ وہ لڑکی تجریدِ طبیعتی۔ لیکن کیا وہ واقعی تجرید کو دیکھ رہا تھا؟ کیا تجرید کو سمجھتا ہے؟ اس درجہ دلیل ہو گئی ہے؟ اس کے آگے جہاں کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا، بھڑکے کے اب کیوں ہو سکا؟

اس سوال کے ساتھ استادِ عشق نے اسے فلسفہ کا پہلا سبق پڑھایا۔ کیا تجرید بالعمول ہے؟ کیا اسے ملعون ہی رہنا چاہیے؟ اگر ایسا ہو تو ساری دنیا ملعون ہے۔ وہ خود سب سے پہلے ملعون ہوا۔ اسی خیال میں اس کا سر جھکانے لگا۔

لیکن یہ حالت بھی اتنی تھی۔ فرزانگی محبت نے اس کے کان میں کہا کہ اس کی یہ عصیبت ایک خام کاری ہے اور یہ اظہار اس خام کاری کا آخری اظہار تھا! جہاں نے محسوس کیا کہ محبت کا ضابطہ تمام قوانین سے بالاتر و قوی تر ہے۔ اس خیال کے ساتھ اس پر ایک سگون، ایک پُرستِ سکون کی حالت طاری ہو گئی۔ اب وہ روشنیوں کو زیادہ جگمگ دیکھ رہا تھا، موسیقی زیادہ مشاعرہ محسوس ہو رہی تھی۔

جہاں نے محسوس کیا کہ تجرید حقیقت اس کے جذبات اور خیالات کی جگہ ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ تجرید کو بے خطا سزا دی! اس خیال نے اس کی آئینہ دل میں بجاں پیدا کیا اور اس کی ساری ہستی ہل گئی۔ بیلا اور سارا گئی آخری سانس لینے ہی کا لمحہ، اب وہ خدا سے باتیں کر رہا تھا یا خدا اس سے!

تجربہ نے ابھی تک جہاں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ٹونفوہ و ساز کو دیکھ نہ رہی تھی، موسیقی کے خیالوں میں گھوٹی ہوئی تھی۔ اور

اپنا درود دکھ، سب بھول گئی تھی۔

بچہ بچہ

دیکھنے والوں نے جمالی کے اس طرح کھڑے ہو جانے کو نشست کے انتخاب کی وجہ باور کیا ہو گا۔ اس کے سوا وہ اور کیا کچھ سیکھتے تھے، جمالی اپنی جگہ سے بڑھا، اور اس کا ہات نرمی و محبت کے ساتھ تجڑ کے شانے پر جا ٹھہرا۔ اُس نے چونک کر دیکھا، ہیں! جمالی! وہ بیابان ہوئی۔ کاسپنے لگی جمالی کا چہرہ دیر نادوں کی طرح دکھنا نظر آیا۔ تجڑ سب کچھ بھول گئی، اور صرف یہ محسوس کرنے لگی کہ جمالی تو اس کا جان جاں ہے۔

لیکن وہ مٹا ہوا گ پڑی۔ اس کا خیال جاگا، اس طرح ذلیل و خوار ہو چکے کے بعد؟ اس سوال سے اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ محبت کی نظر تیز اور دور رس ہے۔ جمالی سمجھ گیا۔ وہ برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہات اپنے ہات میں دبایا۔ گویا اُس نے کہہ دیا کہ محبت کا قانون نہ والا ہے۔ اس کی پہلی دفعہ درگزر و فراموشی ہے!!۔ اس متیقن نے تجڑ کے سامنے محبت کے تقدس اور شاندار مستروں کی ضمانت پیش کر دیں۔

ٹھیک اس موقع پر پاکستانیہ و مقدس موسیقی کا آخری نغمہ جمالی اور تجڑ ہر اس طرح ہر سا جیسے آسمان سے نزول برکات ہو۔ محبت نے دونوں کو کامل بنا دیا تھا۔

”آؤ چلو، محبت کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ جمالی نے، سکواٹھاتے ہوئے کہا۔

ل۔ احمد

بچہ بچہ

## سرگزشت غُور

ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کی شادی ماں باپ نے روپے پیسے کی لالچ میں ایک دامدار بوڑھے سے کر دی، اُس کے خونخاک نتائج اور بد مزہ زندگی کی جو تفصیل نوجوان دلہن نے اپنے روزنامے میں دینے کی تھی وہ روزنامہ چین و عن کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں اپنی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ صرف نام اور متعبد بدل دئے گئے ہیں تاکہ کسی کا راز فاش نہ ہو، واقعات سب وہی ہیں جو اس مظلوم دلہن کو پیش آئے۔ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی تھی مگر اس کے علاوہ مرضی اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی گئی جس کے بالوں کی سیاہی شرمندہ خضاب تھی اور اس کی ہنسی بھی نفی تھی۔ اس بُرے معاملے کو بھی برداشت کر لیا جاتا مگر اس کی آوارگی اور بے پروائی نے نفی دلہن کا دل توڑ دیا اور اسی شکستہ دلی کے موقع پر وہ شخص آگیا جس سے دلہن کو دراصل محبت تھی۔ یہیں اس روزنامے کی جان ہو چکی کہ عشق و ہوس مٹا نہیں امتیاز ہوتا ہے اور اسکے پرہیز سے معلوم ہوتا ہے کہ بھلا اور شریعہ بیویاں اپنے شوہروں سے حد درجہ شادی، نسل پر دشت اور منتظر ہونے کے باوجود بھی اپنے گھر پر عصمت کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ بڑے جہاں، جوان دلہن اور اسکے محبوب عشق کا کیا شہر ہوا یہ بیان کرنے کی چیز نہیں بلکہ پرہیز کا چیز ہے۔ اس سے زیادہ دردناک اور عبرت انگیز بات یہی آپ نے اوکھیں نہ پُرس ہوگی۔ یہ ڈائری اس واقعہ پر کہیں باپ لڑکے لڑکیاں اور ہر عمر کی عورتیں اپنے بچوں کو تاکہ آئندہ اُن سے کوئی ایسی لغزش نہ ہوئے پاسے (۲۸۰) صفحے کی جید و صحیح کتاب ہو۔ اس پر شاہد احمد صاحب کا طرز بیان سونے پر سہاگہ ہے۔ قیمت چار روپے۔

محکم دہشتہ ساقی بک واپو۔ دہلی

# دل جسکو پیدا کرے!

اُنکر غائب ہو گئی۔

اسکے بعد تقریباً چھ ماہ تک بیماری طاقات نہیں ہوئی۔ مگر کس قدر آسانی سے چھ ماہ کھدا ہے۔ یہ طویل مدت مجھے چھ صدی کے برابر معلوم ہوئی۔ میں روز ر سکودل میں یاد کیا کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُنکر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔

افسوس محبت اپنے نزول کا وقت محل دیکھنے کی عالمی نہیں ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں اپنی بیوی کی مسلسل علالت (رجو اب سخت خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی) کے باعث سخت پریشان و غیر مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ بیوی کی بیماری کا تعلق تھا کہ اُس کے لیے جلد از جلد اچھی سے اچھی طبی امداد ہم پہنچائی جائے۔ بہتر سے بہتر مقام پر اس کو رکھا جائے اور زیادہ کمزور نہ ہو۔ وقت اُسکے پاس صرف کیا جاتے۔

میں بھی اپنے متعلقین کے باب میں بے پرواہ اور کم اتصالات نہیں رہا ہوں۔ میں ہر سونے سے سخیالی قربت واری یا علائق خون، تعلقات نبھاتے رہے گا عادی نہیں ہوں، بلکہ انسانی فرض جبکہ ان سے رد البط قائم رکھتا ہوں اور اس فرض شناسی ہی سے ہمیشہ نقصان اٹھاتا رہتا ہوں۔ قطع نظر بیوی کی مجربیت کے میں نے بے پاس فرض اس کے علاج میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ لیکن وہ صحت یاب ہوئے میں، یا قدت اسکو مصیبت کرنے میں خدا جانے میری جانب سے کون سے مگر القدر انسانی جذبے کی قربانی کی منتظر تھی کہ اس کی مصیبتانی کے کوئی آئندہ ہی نظر نہیں آتے تھے! میں نے اپنی جہانی آسائش، اپنے مطالعہ کی راحت اور دوستوں کی سوسائٹی کی مسرت سب کچھ بیوی

یادیں تیری جہاں کو کھینچنا جانا ہوں

بھولنے والے کسی جھکوکھی یاد آتا نہیں!

چار سال سے وہ مجھے چاہے جاری تھی اور محکمہ مطلق اسکا احساس نہ تھا۔ یہ کہنے میں تو شاید غیر منطقی کر رہا ہوں کہ محکمہ احساس نہ تھا میں اکثر دیکھتا تھا کہ اس کی باحیاسین تھیں میرا دور تک غائب کیا کرتی تھیں۔ تعطیلات میں وہ میری آمد کی بھینے سے منتظر رہا کرتی تھی اور جب میں اس کے مکان پر پہنچتا تو مسرت و شرم کی درمیانی حالت میں مجھ سے کہتی "میرا خیال تھا کہ تم چھٹیوں میں لکھنؤ چلے جاؤ۔ اچھا چلو یہاں آگئے۔ نہیں روز۔۔۔" اس کے بعد مسرت پر حیا غالب آجاتی اور وہ چپ ہو جاتی۔ ان باتوں سے مجھے دھندلا سا خیال ہو گیا تھا کہ وہ میری بے کیف، ہستی میں وہ کبھی ہوتی ہے۔ مگر محض دیکھی۔

آہ یہ کہنے کن ہے کہ کوئی نہیں چاہے اور تم کو خبر نہ ہو۔ باوجود اس تصور کہ رکھا دے وہ میرے عشق فہم دل سے اپنے جذبات محبت کی ہر وہ داری نہ کر سکی۔ ایک روز میں بالاخانہ پر سوتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے صبح اُس سے اپنے رومال دھوئے کی درخواست کی تھی جن کو سکھانے کے لئے اُس وقت وہ اوپر آئی تھی۔ مجھ پر غم غوغائی سی طاری تھی اور اسی حالت میں میرا باپ ہاتھ برسی طرح پٹنگ پر سے نیچے ٹھک رہا تھا۔ اس کی نظر ٹٹکی گئی۔ آہستہ سے اُسکو سنبھالا اور میرے سینے پر رکھ دیا۔ میری آنکھ کھل گئی وہ اب تک میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں نے شکر یہ ادا کیا۔ "آپ کے رومال صاف کر دئے گئے ہیں۔"

"بڑا کم فرمایا! میں نے مزید شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ نیچے کسی کے پیر کی چاپ ہوتی اور وہ بجلی کی طرح دوسری راہ سے



اور کوئی باطنی قوت کان بکڑ کر کہتی، کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟ کیا تیری پس میں صداقت ہے؟ کیا تیری تمام حرکات غیر منافقانہ ہیں؟ میں اپنے تمام حواس جن کر کے جواب دیتا ہوں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچے دل سے کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں صداقت، آب زبان سے کہہ رہا ہوں، پھر دل کی گہرائیوں میں سے ایک طویل مسلسل اور بلند قہقہہ بلند ہوتا جس کی غلیظ تھوکر، مکروہ تھوٹیک اور گندے انگڑائے میں کئی منٹ تک چھنی صعوبت میں مبتلا رہتا۔

ان دو متضاد قسم کی نگہ کش نے میری عجیب حالت کر دی تھی۔ آنکھیں بڑی کی طرف نکلیں تو آنکھوں کا نور کسی اور جگہ، حواس یہاں تھے تو حسیات کسی اور جگہ، دماغ یہاں تھا تو دل کسی اور جگہ۔ ایک دن میں نے سوچا کہ تبدیل آب دھوا کے نئے بیوی کو الہ آباد لے جاؤں۔ اس کی آب دھوا بدل جائے گی اور میں بھی اپنی شہر کو دیکھ لوں گا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ ان دونوں چیزوں میں میرے لئے مقام کیا چیز تھی۔ خیر تو الہ آباد پوچھا۔

اب آب کے گھر میں کیا حال؟ یہ شمس نے مجھ کو پوچھا۔ بدستور حالت ہے۔ شمس مجھے کل ایک نئے امر کا کٹھن ہوا ہے، میں نے کہا۔

وہ کیا؟

وہ کچھ کہہ رہی تھی شادی ہونے والی ہے عید کے چاند میں، شمس نے شرمناک سر جھکا لیا۔

بتاؤ نہ شرمناک کیوں ہو؟ مجھے جیسے یہ معلوم ہوا تھا کہ کسی شادی ہونے والی ہے عجیب حالت تھی۔ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ولی بیٹھا، اب ولی بیٹھا۔ اس سے یہ سوال کرنے میں میں اندوہ کے شائبہ کو نہ چھپا سکتا تھا۔ میرے لب تھر تھر رہے تھے۔ وہ اب بھی چپ رہی۔ جب میں نے قسم دلائی تو دھیسے سے بولی۔ آخر اس قدر اصرار سے کیوں پوچھ رہا ہے نہیں آپ۔ باطل بچے ہی پڑ گئے، اس کے بعد نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ میری حالت

سول کے خذ کر دی تھی۔ لیکن وہ غلط بے زبان، بات کا مستلزم بیان جو روز موت کی طرح میرا ماتر و وزن و عرض کے ساتھ برقرار تھا، بعض بعض تسلیم نہیں کریں گے لیکن اس عجیب اور دیگر وہ وزن تھا، خباثت سے زیادہ صلابت تھی۔ پابندی تھی۔ محبت کی تھیں ناہین کی تعریف میں، خباثت، وغیرہ جیسے نامبارک وغیرہ شہری ہیں۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ محبت کی انتقام مجھے آخر کئی طرح تو لینے دیجئے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ میں نے اپنی خارجی و جسمانی وی کی تیار داری کی خاطر ترک کر دی تھیں۔ بے پرسل ضرب لگا کر بھی میں اس کو اس قابل، ذور و بھری بیوی کی تندرستی کی کوششیں رض و وجہ ان میں ہمیشہ جنگ رہی ہے ہائے اندر زار تک چوٹی تھی۔ پہلے بیوی کا علاج کرتا تھا، ادا دھرو دنیا والوں کا خوف، اسرار و قربا، بنا فرض شوہرانہ، جدو دی انسانی، لہیت، ادا حد محبت کی ہری کی پڑ پڑ مسکراہٹ!۔ بات، اس زندگی کے خوش میدان، اس چونا علاج سے فتح کیا جاسکتا ہے۔

سرماہ کی آخری پانی تک تمہارا علاج کر دوں گا۔ سانس تک تمہاری تیار داری میں صرف سے کہتا۔ دفعتاً دل کو ایک جھٹکا سا لگتا اور لب پر تحیر و طنز آمیز قہقہہ کی آواز آتی ہیں ذل کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگتا۔ بے اپنی بیوی کو تندرست کر دینے کی منت ہو جاتا۔ میرے منہ پر ایک طمانچہ سا لگتا

متنیت نمی۔ طرح واضح میں تم سے محبت کرتا ہوں شمسہ، میں تمہیں پوجتا ہوں۔

میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی تم کو مجھ سے چھین کر لے جاتے۔

”اور چار سال سے کہاں تھے؟“

”میں چار سال سے جہنم میں تھا لیکن گذشتہ چھ ماہ تو تمہاری محبت نے مجھے بہشت میں پہنچا دیا۔“

”تو میں بھی چار سال چھ ماہ سے جہنم میں تھی اور تمہارے ساتھ ہی بہشت میں داخل ہوئی ہوں۔“

”شمسہ کیا تم کو بھی مجھ سے محبت ہے؟“ میں نے خوشیاد دریافت کیا۔

”ہاں۔ خدا کے لئے جانہ انسانیت میں ہی رہو۔ میں چار سال سے تمہارے خیال میں رہا ہوں۔ لیکن راہِ تم تو مجھ کو چھنے ہوتے ہو۔“

”میری روح۔ محبت پرست دلوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مادی طور پر متحدہ نہ جائیں۔ ہماری محبت آسمانی ہے۔“

”آسمانی محبت آپ آسمان پر جا کر کیجئے۔ ہم کو حقائقِ فطر انداز نہیں کر دینے چاہئیں راہِ۔“

”ہماری باہل مایوسی محبت میں ایکل مید کی شعلہ بھی ہو شمسہ۔ میری بیوی بیمار۔“

میری زبان رک گئی۔ اب اندرونِ سینہ سے قہقہہ کی آواز نہیں آ رہی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی قوتِ تحسین و مرجا بچار رہی ہے۔ آہِ خطِ ناکِ قوت۔

”راہِ ایہ خجل؟“

”شمسہ مجھے معاف کر دو۔ آہ لیکن۔“ میں جبرِ بہرہ کر رہ گیا کیسا خوشگوار خجل تھا لیکن کتنا بھیانک بھی۔

”شمسہ تم میری ہو۔ میری۔“

”مگر ایک عزیزِ زندگی کی قیمت پر۔ اُف قدرت کی ستم ظریفی۔“

”ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ میں نے اس کی پیاری نظروں کی زد سے ہٹ کر کہا۔“

”شاید اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک گہرے سانس کو غیر متعلق نفس میں خارج کر گیا ہے۔“

”میری ولی مبارکباد قبول کر شمسہ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

”مگر مجھے دُعاؤں دینے میں آپ منہ کیوں بنورتے جا رہے ہیں؟“ اس نے پھر شرفی سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

میں نے بہت جلد اپنی حالت کو سنبھالا اور بولا۔ ”بچے دل کو جو دُعاؤں مانگی جاتی ہیں وہ رو کر ہی مانگی جاتی ہیں۔“

”تو آپ میرے لئے اس باب میں بچے دل کو دعا کرتے ہیں؟ اس لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا۔“

”ہاں۔ میں نے دینی زبان سے کہا۔“

”اچھا بوں کہیے کہ میں واللہ بچے دل سے دعا کرتا ہوں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔“

”نہیں۔“

”کیوں نہیں؟“

”نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری شادی ہو جائے۔“

”کیوں نہیں؟“

”میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے جدا ہو جاؤ، ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لی جاؤ۔“

آخر کیوں نہیں چاہتے؟

”بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی علت نہیں ہوتی۔“

”ہاں۔ اس نے ہنس کر کہا۔“

”نہیں باسحق۔ آفتاب زیادہ روشن۔ وجودِ باری کی

رہو گچھا یہ کہتے ہوئے مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوا گویا میں نے کوئی زبردست کام کیا ہے۔

شمسہ تندرست، جوان، حسین، شوخ و ذہین اور محبت پرست۔ رخصتہ بیارہ موت کے چٹل میں گرفتار، لاغر، کمزور، صحت باختہ۔ اور — اور میری راہ میں، ہر راہ میں سنگ گراں۔ شادی سے قبل میں اُس کو نہیں جانتا تھا نہ وہ مجھے جانتی تھی۔ لیکن شادی کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم ایک دوسرے کو موت سے جاننے تھے۔ وہ مجھے کس قدر چاہتی تھی اور میں بھی اس کی محبت کی کس قدر قدر و احترام کرتا تھا! آہ لیکن وہ بیوی تھی۔ یعنی اس حقیقت مسلمہ کی شکاز ہستی جس کو اثرات بچائی ایک باطل معمولی ہستی بنا دیا کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کا شوہر تھا۔ فرض شناس شوہر نہیں اس کو آسانی سے نہیں مرنے دے سکتا تھا۔ بیڑ کسی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا تھا، شمسہ کی محبت کی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا! شمسہ کی درناغازی بڑی ہی بے حل تھی۔ میں نے اس کو کیوں چاہنا شروع کر دیا۔ میری تمام توجہ کی سعی میری بیوی تھی۔ وہی ہے گی۔ شمسہ کی کل مشاوری ہو جائے گی۔ وہ دوسرے کی امانت ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی۔ نہ تو یہ اُس کی غلطی ہے جس کا ازالہ بہت جلد ہو جائیگا۔ ہاں اُس وقت یقینی ہو جائے گا جب وہ دوسرے کے آغوش میں پہنچ جائیگی۔

میں رخصتہ کے سر پرانے آرام کر رہی ہوں خیال میں دراز ہو گیا اور نہ معلوم کب نیند آئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو تین باتوں کا مجھے سیکے پہلے اشارہ ہوا۔ میری گردن انسانی بازوؤں سے کسی ہوتی تھی میں کمری میں باطل بچھا ہوا پڑا تھا اور میرے قریب کسی سینٹ کی بھینسی بھی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے کعبہ کو سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور شمسہ کو اپنے قریب پا کر دیوانوں کی طرح اس کی طرف نظر بچا کر

”نہیں بہر صورت تم میری ہو! چھا اپنی پیاری زبان سے بھی کہو کہ تم میری ہو!“

”ہاں شاعرانہ زبان میں تمہاری ہوں۔ لیکن ہم میں بہت بُدبہ ہے زائد۔ مجھے تعجب ہے کہ تم مجھ سے کس طرح محبت کر بیٹھے۔ میرا تم سے محبت کرنا بکاس تھا کیونکہ میں ابھی آزاد ہوں۔ لیکن تم ”برلے“ دیگراں“ ہوتے ہوئے بھی میری محبت میں گنجل چکس گئے۔“

”سبحان اللہ! گویا تمہارے خیال میں آزاد و پابند کی تخصیص محبت کیا کرتی ہے۔ نہیں میری جان۔ دل جس کو پیار کرے۔“

شمسہ خاموش ہو گئی۔

شمسہ ”میں نے پھر مسلمہ کلام جاری کیا۔ آداب ہم ذرا وضاحت سے بات چیت کریں۔ اگر قصداً تمہارے ”موافقات“ کو ہماری راہ میں سے ہٹا دینے کا کرم کرے۔ میں خود بخود چپ سا ہو گیا۔ بیارہ کا ستر کم و طول چہرہ میری نکول کے آگے آگیا اور اس کی زبان سے کبھی یہ کلمے ہوتے الفاظ سیر کاٹوں گے گوتے گوتے میں گونجے ہوئے۔ تم میرے علاج میں کسی قدر انہک سے کام لے رہے ہو نہ تو اب۔ تم مجھے نہیں مرنے دو گے۔ مجھے امید کہ نہیں مرنے دو گے۔“

دفتر میرے منہ سے ایک دشت کی چچ کل کی تین لپکاٹھا۔ بڑی شکل سے اپنے کو سنبھالا اور بے اختیار شمسہ کے سامنے بے آنکھ بھاگا۔ بیوی کے پاس پہنچا تو اُس کی آج حالت خراب تھی مجھے دیکھ کر ایک تہم افسردہ اُس کے خشک ہوں پڑ گیا۔ میں نے اپنے لاغر ہاتھ کے میرا ہاتھ تھاما۔ اور بولی ”جب تم سے پاس آجاتے ہو تو میری بیماری آدمی جانی رہتی ہو۔ بیٹھے ہو۔ میرے ہی پاس بیٹھے رہو۔ اب کہیں بچانا۔“

”نہیں نہیں! میں جاؤنگھا۔ گھبراؤ نہیں میں یہیں بیٹھا

موجود تھے۔ قوت فیصلہ باطل مہر کی تھی۔ پاس فرض شمس کی سنان  
محبت کے چرکے کھاتے کھاتے میری آنکھوں کے سامنے پڑا مٹپ  
رہا تھا۔ انسانیت و ہمدردی مجروح ہو کر کونے میں منہ دے  
رو رہی تھیں۔ میں دُنیا کے نظام کو نہ دہلا کر دینے والی تھی نہ  
محبت کہتے ہیں۔ اپنے قوی ہاتھ میں احمدی کا نشان لے سکھرانہ  
نشان سے کھڑی نظر آرہی تھی۔ میری حالت بڑی ہی قابلِ رحم تھی۔  
اس قدر قابلِ رحم کہ مجھ کو خود کو اپنی حالت زار پر ترس آنے  
لگتا تھا۔ یہ انسان کی انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے کہ اس کو خود  
اپنے پر رحم آنے لگے۔ بقول امیر

دیکھتا ہوں مجھی آئینہ تو روتا ہوں امیر  
اپنی حالت پر خود آتا ہے ترحم جھکو

عید کا ہنسنے لگا لیکن مع پیامِ محرم کے۔ ایک روز شمس  
کے والد کا خط آیا۔ ایک بڑا سافاد تھا۔ کھولا تو اس کے  
اندر ایک چھاپا ہوا اکاڑا نکلا۔ وہی پرانے زمانے کی اوروں شمس کی  
شادی طے ہو چکی تھی اور یہ اسی کا دعوت نامہ تھا۔ خوب آخر  
اُس کی شادی قرار پائی گئی۔ اس شادی میں مجھے شریک ہونے  
کی کیوں دعوت دی جا رہی ہے۔ میری تو بیوی پیار ہے۔ دل  
پیار ہے۔ شمس کیا کہتی ہے۔ کیا وہ بھی جا رہی ہے کہ میں اپنی قبر  
اپنی آنکھوں سے نبی ہوئی دیکھوں؟ یہ لوگ مجھے مٹا دیں  
شریک کہے متوقع ہیں کہ میں اپنی نماؤں کی پالی پر دل کھول کر  
مسرور ہوں؟ اُن کے فریبِ مسرت میں براہِ رُئی مسرت کر لیں  
معاذ اللہ۔

اگر اس شادی کو ہو نا تھا تو اس کو میرے علم میں نہ لایا  
کیا ضرورت تھی۔ چپ چاپ کیوں نہیں ہو گئی ہم جو مصیبتیں  
نازل کی جاتی ہیں کیا ان کا تقدیر کی جانب سے ہم کو کوئی  
نوٹس دیا جاتا ہے؟ پھر اس اُم المصائب شادی کے باب میں  
مجھ پر یہ کرم کیوں کیا گیا؟ کیا یہ بات تیری شانِ کرمی کے

پھر فرما رہی کی خیال سے پریشان ہو کر رقصیہ کے بڑنگ کی طرف بھا  
جواب خالی پڑا ہوا تھا۔

• رقصیہ کہاں گئی؟ میں نے اپنی حالت سنبھال کر اور شمس کے  
نازک بازوؤں سے اپنی گردن آزاد کر کے دریافت کیا۔

• کچھ جی کے ہاں۔

• اور تم یہاں کب نازل ہوئیں؟

• ہاں میں بلا ہوں کہ نازل ہوئی کیوں؟ آزاد اس میں کیا  
تصور نہیں ہے میرا یہ ہے۔ یہ اللہ جی تھی کہ تم کو چاہی جی۔ حالانکہ  
تم ایک محبت پرست بیوی کے شوہر ہو۔ میں تم سے معافی چاہتی  
ہوں۔ اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ اپنی بیوی کے اور آپ کے باہر  
حائل نہیں ہوگی۔

ہاں اس وقت مجھ پر کس قدر نفیاتی و بادِ طرا۔ اگر  
شمس یہاں آکر اس وقت اپنی محبت بھاری تو میں اپنے لگے تھے  
کی بنا پر ضرور اس کو ایس کر لے میں کامیاب ہو جاتا لیکن وہ  
ظالم تو خود سمجھنے لگی۔ اہ عورت جب محبت قبول کر کے مڑ  
سے کھینچنے لگتی ہے تو عمر کی روح جسم سے کھینچنے لگتی ہے۔ اس  
وقت تمام مردانہ خود داری۔ عہدِ پندار و غیث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔  
اس نفسیاتی مسئلہ کی بنا پر شمس نے بھی مجھے پھر جیت لیا۔ میں  
اپنے تمام پچھلے فیصلے کو فراموش کر کے دیوانہ وار کھڑا ہو گیا اور  
اُس کو اپنے بازوؤں میں جھک کر کے بولا۔ میری روح ایک ذرا  
سے مذاق کا آئنا برآں نہیں۔ شمس محبت تو جس کے حقے کی ہوتی  
ہے اُسی کو ملکر رہتی ہے۔ اس میں بیوی و غیث کی کوئی خصوصیت  
نہیں۔ تو میری ہے اور میں تیرا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیرا  
ہوں شمس۔

جب بیوی کو یہاں بھی کوئی فائدہ نہ ہو تو میں واپس  
اس کو اپنے وطن لے آیا۔ جنگِ عظیم کو آپ کیا اہمیت دیتے ہیں۔  
میرے مختصر پتے میں آج کل صدمہ جنگِ عظیم کے خونیں خضر

شایاں تھی؟ افسوس۔

شتمہ کی شادی ہو گئی۔ یہیں کس دل سے اس میں شریک نہ تھا  
لیکن جانا بڑا۔ قدرت کا عتاب صرف اسی پر ختم نہیں ہو گیا تھا کہ نہ  
اس اپنی عمارت کو گرنے شادی میں شریک ہوا۔ بلکہ میں نے اپنی منحوس  
آنکھوں سے اُس کو گولہ بننے دیکھا میں نے اپنے دیدارِ خونبار سے  
اس کو زخمت ہوتے ہوئے دیکھا اور میرے علم میں اس کی سہاگ  
کی رات کو لا پگیا۔ یہ میں جنابِ محبوبتِ انعامات۔

کہتے ہیں اور ہم بھی مدت سے سن رہے ہیں کہ اس خراب آباد گیتی کا نظام نہایت ہی معقول طریقے پر قائم ہے۔ اس لغو خیال پر میں تمام دنیا کو ایک بقیہ حقارت بلند کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ نظامِ عالم کے یہی معنی ہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کا سازگار ہے۔ وہ ہماری زندگی سے مساعدت کرے۔ اگر برا لگندہوں کے باوجود بھی آپ اس پورے نظامِ عالم کے مزاج میں تو ایک گولی

روزان میں جو کورکیل ٹھوکرے کی کیوں نہیں تعریف کرتے! اس شادی کے پندرہویں یوم بعد میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ہال انتقال ہو گیا۔ تاکہ میں سمجھ سکوں کہ میں غفلت پر اس وقت پہنچا ہوں جب نیشنل غفلت ہی نہ رہا۔ حسرتیں اس وقت پوری ہوئی جب سینہ مدفون حسرت بن جائے گا۔ میں کہتا ہوں اگر بیوی کو نامی تھا۔ اگر یہ ہونا ہی تھا تو اس وقت کیوں نہ ہوا جب اسکو ہونا چاہیے تھا۔ یہ پندرہویں روز پہلے کیوں نہ ہوا؟؟

میں نے بھی میدانِ زندگی کے بہت کم ہزینت خوردہ برخود صوفیوں کی طرح تصوفِ دکان میں بنا لینی چاہی، نماز، ذکر و تلاوت کو شعارِ حیات بنالیا۔ زندگی کی تلوار کو بچ دیا۔ لیکن میں تین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میری حقیقی سجدہ کون ہے۔ اگر اسکو بھی عبادتِ ریاضت شمار کیا جاسکتا ہو کہ انسانِ اسلامی ارکان کے ساتھ کامل منت پرندہ کرے تو میں آجکل ایک زبردست مریض ہوں۔

قتیسی رامپوری

ہر دلعزیز مصطفین کی گستاہیں

مہر سہتی۔ یمن کی شرحوں اور فتن کی گرمیوں کا ایک دھندلا اور جلال نما اور عظیم اسائنہ، ۲۰ صفحہ خوبصورت جلد۔ قیمت ۱۰/-

گناہ کی رائیں۔ سات عورتوں نے اپنے گھر عصمت کو کس طرح خوبصورت اور کیوں نہیں پر مجبور ہو گئیں؟ عورت کی بے بسی دیکھئے۔ ۲۰ صفحہ

ناظم کی آپسیستی۔ ایک خاتون کی عبرت انگیز آپسیستی فتن کی اور فتن و داستان یمن کی کہ وہ ناک کہانی، خوبصورت جلد۔ ۲۰ صفحہ

طاسم سامری۔ پنجاب کے شہر برکٹس حضرت اہم مسلم کی تاریخی حقیقت میں جیت انگیز پر لکے ہیں ہوشیار واقعات درج ہیں، ۲۰ صفحہ

غفر حیات۔ رنگین ایٹلے مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ادب لطیف کے دلکش شے ہے، جذبات و تاثرات کی مصدوری۔ ۲۰ صفحہ

ایٹلے کے خطوط اور روزنامے۔ دو افسانہ کی ایک نئی گشیدہ جو پیش کی کہ اور تاریخ زیادہ ہے، ایک ہی تصویر کے دورخ قیمت ۲۰ روپے ۳۰

عیب۔ عجیب کلب کے عجیب لمہ ولے کے عجیب حالات، پھر کتنی ہوئی آپ بیتیاں۔ ۲۰ صفحہ

والن قصور۔ میل ہندوستانی نائیڈو کے رنگین گیتوں کا دلکش ترجمہ، مثنوی تمدن کی خوبصورت تصویر۔ ۲۰ صفحہ

فات موت۔ جاب قیاز علی کے نفاک مضامین کا مجموعہ، ہر مضمون میں متاثر کرتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی کی تصویر انھوں نے سانسے پھونکی ہے، ۲۰

ب زریں۔ جاب قیاز علی کے قصص مضامین کا مجموعہ ہر مضمون میں روشنی بکری دل میں آتا ہے، ادب لطیف کے بہترین نمونے۔ ۲۰

۲۰ صفحہ کہتہ کہ نالی بکٹ پر، دہلی،

## مُسُکُو

ایک گاؤں میں کسان کے بچے گھر کے سامنے تار والے نے بایسکل ٹھیرائی اور وہ پوپہ پوپہ کہہ کر آواز دی۔ کسان کی ضعیف العمر بیوی بچی پس رہی تھی۔ تار کا نام سنکر پریشان و دواڑے پر گئی۔ تار بیکر شکر یہ ادا کیا اور کسان کو جانکر دیدیا۔ وہ دھان صاف کر کے میل وندھا ہوا تھا۔ تار پھر گھر اس کے مڑ جھاتے ہوئے جہرے پر خوشی کی لہریں ہویا ہو گئیں۔ دوران مطالعہ میں کی بار وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے گھوڑے و انت کمال کمال کر بے ساختہ ہنس دیا۔ بڑھی کسیانی جو ہنوز سہمی ہوئی کسی خبر کی منتظر گھر کی تھی کچھ مطمئن ہوئی اور اب بغیر پوچھے نہ رہ سکی۔ تار کیسا ہے؟ یہ کسان نے اپنی رفیق حیات کی طرٹ انتہائی مست خیر نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "یاد آ رہا ہے۔ آج ہمارے سنے کیسا خوشی کا دن ہے۔ ہم دونوں کو خدا کی درگاہ میں شکر یہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ کامیاب ہو کر وطن واپس آ رہا ہے۔" ہاں بیٹے کی آمد کا مژدہ شکر باریغ ہو گئی۔

دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کاموں سے بے نیاز ہو کر پھر بیٹے کی آمد و زندگی پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے کہ دفعتاً دھرتی تار لرزے لگی اور اس غضب کا شدید زلزلہ آیا کہ تمام گھر ٹل ہندوئے کے جھرنے لگا۔ دونوں دم بخود ایک دوسرے کو مایوسانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھئے زمین کے نکلے گی۔ کسان کی چھوٹی بچی مائے خوف کے اس کے سینے سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ اس کی خوبصورت اور میٹھا گڑیاں جن سے بیٹی وہ کھیل رہی تھی آنا فنا تختوں سے گر کر فرش زمین پر دراز ہو گئیں کسی کو کچھ مدد نہ تھی، جو جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ زلزلہ سے گاؤں کو کافی نقصان پہنچا۔ خدا خدا کر کے امن ہوا۔

~~~~~

"یاد آو" نے ایک معمولی بڑے لکھے کسان کے گھر میں جنم لیا تھا۔ اس کا بھٹائی گاؤں کی فضا ہی میں بسر ہوا۔ باپ اپنی حیثیت کے مطابق تعلیم دلائی۔ مگر یہ ابھی تشدد تھا۔ اس کا نصب العین بڑا شاندار تھا۔ وہ اپنے مستقبل کو بڑے اونچے پالنے پر سنوے ہوئے دیکھنے کا زرد مند تھا اور قدرتا علی و مانع کا مالک۔ ہر وقت اپنی ترقی کے لئے ہاتھ پیراتا۔ بچپن سے بڑے باب کو کھیتوں میں چااولوں کی کاشت کرتے دیکھا کرتا تھا۔ جس میں انتہائی محنت شاد کے باوجود خاطر خواہ پیداوار نہ ہوتی تھی۔ یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ جا کر جدید کاشت کاری کے طریقے سیکھے۔ ہر وقت ہی خیال دل و دماغ میں جاگزیں تھا۔ جب موقع ملتا باب سے کہنا سنتا۔ غریب کسان اپنی مفکوحال سے ناچار جن اس کے دربار میں آکر دیوس جو جاتا۔ وہ کسی طرح بھی یورپ کی تعلیم کا کھیل نہ ہو سکتا تھا۔ بڑھی کسیانی سے بار بار کہا کاش میرے پاس اتنی جمع پونجی ہوتی کہ "یاد آو" اپنی آرزو پوری کر سکتا۔ کامی سنا۔ اگر میرا ہی کہتے تو چااول کی فصل اچھی ہونے لگے اور میں پھر سب اخراجات کو پس پشت ڈال کر اس کو یورپ بھیج دوں۔ اُسے وہاں جانے کا بڑا شوق ہے۔ یاد آو" ہونہار زمانے کے ساتھ چلنے والا وہی فہم تھا۔ وہ ہر محنت سخت محنت کو خوشی برداشت کر سکتا تھا۔ اس کا حوصلہ بلند اور دماغ روشن تھا۔ ہر لغزیزی کا یہ عالم تھا کہ جہاں اس میں کمیت میں جا ملتا سب انھوں پر جھاتے۔ گاؤں کے لوگوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

لڑکی والے عام طور سے اچھے بیروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ایک نے بڑے کسان کے ہم عمر بھتیجی نے پائپ کا لباس

کھینچتے ہوئے کہا: ”کچھ۔ یا ادا سال“ کا بھی فکر کیا۔ اب تو وہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا ہے اپنی زندگی میں ہاتھ پہلے کر دو۔ کسان نے دپڑے ہوئے سہی نما چہرے پر ہاتھ پھیر کر ایک ہلکی سی مگر معنی خیز گہری مسرورہ کھینچی۔ اور زمین پر دروہ کی شکل بنائے لگا۔ تاکہ اوجھلے کہا بڑے فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ جواب دیا: ”کیا کہوں شادی بیاہ سب پیسے کا کھیل ہے۔ اگر میرے پاس کچھ اثاثہ ہوتا تو یقیناً جالا سب سے پہلے اسے کچھ سیکنے یورپ روانہ کرتا۔ تاکہ اوجھلے کسان کے اس خیال کو سن کر دنگ رہ گیا۔

”کیا بچ کہہ رہے ہو اگر یہ جی مذاہ کی خیال ہے تو میں دھوکے کے ساتھ کہتا ہوں کہ تمہارے لڑکے کی نسبت بڑے امیر اور مورتائی خاندان میں بد آسانی کر سکتا ہوں۔“

”کیوں غریب آدمی سے غول کرتے ہو۔“

”غول کیسا تم راضی ہو جاؤ پھر دیکھ لیتا۔“

کسان کے دل ہی دل میں خوشی کے لہو بجھنے لگے۔ تاہم اسے یقین نہ آتا تھا کہ ایسا نایاب رشتہ میرے جیسے معمولی شخص کے لڑکے کو خواب میں بھی میسر آ سکتا ہے۔ اس نے اپنی تنگی مادی بڑھاپے سے بے مدنی تھکیں جن سے شکر گزاری ہوئی تھی اٹھا کر تاکہ اوجھلے کو دیکھا اور جاپانی دستور کے موافق کر کو خم دے دیکر شکریہ ادا کیا۔ مجھے ہر طرح منظور ہے۔ اگر تم سچ بول سکتی کرو تو میں مگر بھر احسان مند رہو مگر میری مالی حالت تم پر خوب روشن ہے۔ ہر بات صاف اور اچھی طرح فریق ثانی پر واضح کر دینا۔“

پہچان

اداء طبی چتر پھیلاتے آئے دالے وقت کی گھڑیاں گئی رہی تھی۔ ”بسو کو“ ایک بڑے امیر اور مورتائی خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ ”اداء“ نام میں پلی بڑھی قبول صورت، نازک اندام، وضو دار ہے۔ ”وٹا بے“ اور ”جی موتو“ اپنی تخت جگہ کو لاؤ پیار میں بال پس کم محض مضو گوشت اور چال و چوڑی دیکھنے کے حاشا حاشا آرزو مند ہیں۔ ان کی دلی آہنا ہے کہ اسکو بہتر سے بہتر تیز وار چو بی بنائیں اور ہر ہنر میں ماہر کرنے کی سعی ملین کریں۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی جو کچھ جانتے ہیں اسکو سکھاتے ہیں ہمت تنہا ہیں۔ دیگر ہنروں کے لئے معمول اور معلومات لازم رکھ چکے ہیں۔ ہر تعلیم اور فن سکھانے کیلئے دن اور اوقات معقول ہیں۔ ”بسو کو“ بذات خود تمام ہنروں میں کمال حاصل کرنے کیلئے اپنے ماں باپ سے زیادہ شوق کا اظہار کر رہی ہے اور سرگرم عمل ہے۔

جاپانی وضع کے جو ستامی دالے کمرے میں فرش پر ایک جرمن آتالیق خوبصورت فوجی لڑکی کو بسیٹ پر بٹھا رہا ہے۔ لڑکی نے ”کٹور“ کا نام دہرایا اور جرمین کٹور پر سوالات کرنے لگی۔ ”بسو کو“ بڑے شوق و محبت جرمین زبان سیکھ رہی ہے۔ اس کا باب بھی باوجود گہر سیدہ ہونے کے جرمین زبان کی باریکیاں عبور کرنے میں بڑی تندرستی سے مصروف ہے۔

ساتھ سے چار ستامی دالے کمرے میں باپ بیچیت ہان کے مضابطے کے لباس میں دو زانو بیٹھا ہوا ہے۔ ”بسو کو“ ”میزبان کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ خوشگوار کو تو زیب تن کے چھانوہ کو کمال سالن سامنے رکھے اسکی تیاری میں مصروف ہے۔ سامنے ”توکونا“ میں شہور کوشٹ کی فادام تصویر آویزاں ہے۔ اس کے نیچے چوکی پر ایکے نوبو مگرز کی آرائش گل ہے اور اس کے پہلو میں گوتم بھاگا مجتہد رکھا ہے۔ دونوں کی نشست پر خامت اور آداب مجلس سے کسی قریبی رشتہ کا احتمال تک نہیں ہوتا۔ ہر دو طرف تدبیر انداز موشی ملاری ہے۔ ”بسو کو“ نے بڑی نزاکت سے پچھلی وار ڈبہ اٹھا یا اور مڑا لے انداز سے ہان کے چپے سے جاسے کا سبز سفر سفوف

نجل کو پیاسے میں ڈالا۔ پھر سرخ رنگیہا رومال سے چھو پچھو مقررہ جگہ پر رکھ دیا۔ اب آہنی کتلی سے ننھی سی دنگیاسے گرم پانی نکالا اور پیاسے میں ڈال کر مختلف سے کیتلی کے منہ پر ڈھکیا رکھ دی اور بائیں کے برش سے چائے کو پھیلتا۔ اس کے بعد سرخ رومال پر چائے کا پیالہ رکھ کر دیکھ کر اسے بائیں کے پیالے لاکر رکھا۔ اس نے پیالہ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا اور کر کو خم دیکر "مسکو" کا شکریہ ادا کیا۔ پھر پیالہ اٹھا کر ہتلی پر رکھا۔ اور تین دفو چکڑے کر اس کے تین گھوٹ پئے۔

آٹھ ستانی کے کمرے میں ایک جاپانی خاتون کی شاخووی میں "مسکو" "یوری" پھول کی شاخ کو خم دیکر "شن" کی جگہ لگا رہی ہے۔ معتبر نے "تانی" شاخوں کے چھوے کی اصلاح کر کے اس سے "سوتے" کی شاخیں جوڑیں اور پھر گلدان پر نقادانہ نظر ڈال کر اسے شاباشی دی کہ خوب پھول بجائے۔

کئی دن کی مسلسل مارش سے نیلگوں سا بامان اپنا گرد و غبار دھو دھلا کر صاف ستھرا بکھر رہا ہے۔ مطلع صاف ہے۔ دن بڑا پسندیدہ اور خوشگوار ہے۔ ہانسیم پیام بہار لے اٹھائی پھر رہی ہے۔ برن کے مارے لے لکھے برہنہ درخت نیکو پوش کے لے لگے گرام ہے ہیں۔ سردی سے ٹھکھری ہوئی شاخیں برگ و گل لانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ پٹنیوں پنچھی دانے ڈھنکے رہے ہیں۔ ہر شاخ گل زمین کی گردوش پر نگاہ جمائے ہوئے اپنا اپنا کمال دکھانے کے لئے مضطرب ہے۔ باہر میدان میں "مسکو" باپ کے ساتھ تیر اندازی کی مشق کر رہی ہے۔

سورج کی ضیاء تاب کر رہی دن بدن قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ مادر گیتی جو کڑوڑوں میں ہر کو اپنے شکم میں لے بیٹھتی تھی، اب بہانہ پر ہسم اللہ کا خم بڑھ چکی۔ اور اب جائزے کی تمام نی کو ابخرات کی شکل میں اگل اگل کر لپی ہو رہی ہے۔ "مسکو" نازک کمر میں تلوار باندھے باپ کی منتظر ہے۔ پھر کی گنگا" میں اس نے بڑی ہوشیاری اور بھرتی سے تلوار کا دار لپی تلوار سے اس خوبی سے روکا کہ باپ خوشی سے اچھل پڑا۔

جاپانی ناچ گانا اور "کو تو" بجانا ہوشیار جاپانی مصلح کی زیر نگرانی جاری ہے۔ "پیانو" سکھانے کے لئے سفر فی اُستانی مفت دے رہے۔

چینی امبرائیڈری میں درج سے اول انعام حاصل کر چکی ہے کشتی رانی اور تیرنے میں باپ کی شاگرد ہے۔ ایک ماہر استاد کی انالیتی میں خوش نویسی سیکھ رہی ہے۔ نقاشی پر فائز میں تمغہ دل چکے ہے۔ چینی ادب کی تعلیم کچھ تو مدرسہ میں حاصل کی تھی اور اب ایک یونیورسٹی کے پروفیسر سے اس کی تکمیل کر رہی ہے۔ غرض کہ کوئی ہنر ایسا نہیں جو شاہ تہ خاتون کا زیور ہو اور وہ اس سے محروم ہے۔

چھوٹا

بہار کا موسم شروع ہو گیا۔ ہری ہری کو پتلیں بچھڑنے لگیں۔ درخت نئے نئے لباس پہنے تشکر معبود میں مجسم ہے ہیں۔ زمین پر ہنرہ آگ آیا۔ بکلیوں نے چوئیں کھول کر ترانہ نظمت گویا۔ غنوں نے داہو کو بہار میں بہار کر دی۔ شہلی آدم نے لباسے اُمار پیچھے۔ اور گلے پھلے پیارے پیارے لباس پہن لئے۔ یہ ہی موسم جاپانی خاتون کی طرح طرح کی خوبصورت "ادویوں" کا منظر پیش کرتا ہے۔ "مسکو" بھول کر کہہ دیا اور اس پر موری امبرائیڈری کی "ادوی" باندھے گھر کے وسیع باغ میں چل تدی کر رہی ہے۔ حوض میں تم قلم کی پانتو پھلیاں چھوٹی ہوئی ہیں اور وہ اُن کو اٹے کی گولیاں بناتے کر کھلا رہی ہے۔ جانوروں کو کھلاتے پلاتے دُور جاگلی۔ یہاں ہر روز

نے ان گھیرا انہیں ترکاری کے ٹکڑے سے رہا ہے۔ بڑی شاداں و فرحاں ہے۔ چایکے دورے کسی کی آواز پر کان کھڑے کیے۔ اُس کی نوکر ”اوجو سما“۔ ”اوجو سما“ پتھر پتھر کر تلاش کر رہی ہے۔ وہ لمبے دیکھ کر دوڑی ہوئی آئی۔ اور جھک کر کان میں، خون میں سنسنی پیدا کرنے والا مڑوہ سنا۔ ”اونیساں“ واپس آ رہے ہیں۔ (بڑا بھائی یعنی منکیر) خوشی میں اچھلنے لگی۔ ”جگ بکتی ہو“ اب سب جانوروں کو چھوڑ چھاڑ کر ترکاری پھینک واپس چلی۔ اچھلتی کودتی جا رہی ہے۔ راستہ میں جو جانور ملتا ہے اُس سے کبھی جاتی ہے۔ ”اونیساں“ واپس آ گئے۔ اسی بیچ دی میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر دھما ہو گیا۔ خوشی میں ایسی وارفتہ تھی کہ بچہ کنوں تک نہ سٹکڑی۔

کمرے میں پہونچی باپ سے کہا ”او تو سما“۔ ”اونیسا“ کو لینے ”یو کو ہامہ“ چلیں گے۔ وہ ہنسنا اور ہنسنے لگا۔ جب ”تو کیو“ میں آجائیں گے اُس وقت نٹنے جائیں گے؛ رات کو عالم خواب میں بندر گاؤ یو کو ہامہ کی سیر کر رہی ہے۔ جہاز یو کو ہامہ سے روانہ ہو رہا ہے۔ مسافر ڈک پر کھڑے ہیں۔ الوداع کہنے والے احباب واع ”بندر گاؤ کے کسے کھڑے کا فذ کی رنگین پٹیاں جہاز پر پھینک رہے ہیں۔ زمین اور جہاز کے درمیان ہوا میں رنگین پٹیوں کی چادر تیری ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ بھراں نصیب سلاں ہے۔ ایک پتی ”سٹوکر“ کے نیچے تھمے میں ہے۔ چایکے اُسکی پٹی ٹوٹ گئی۔ گھبرا کر باپ کو پتھر سے لگی کہ یہ کیا بد شگونی ہوئی، وہ قریب ہی سو رہا تھا۔ بیدار ہوا۔ خواب سٹوکر سلی کی کمر پر گزرنے والی خیالات میں پریشان نہ ہو کہ تو یورپ واپس بھی آ گئے۔

خجہ پھل

”چچی بومار“ جہاز یورپ واپس آ رہا ہے۔ ڈک پر ایک نوجوان کے پہلو پہ پہلو دلکش خدو خال کی چرم لڑکی اپنی سنہری لبت پریشان میں نازک انگلیوں سے چھلنوں کو سنواراتی ہوئی سمندر سے ملن اندر زہور رہی ہے۔ ”یامادا“ اپنی محبوب چرم دونوں سے تکتے حسین رُپا پر لٹو ہے۔ اس کی محبت میں سرشار دنیا و مافیہا بے خبر الفت کے ستر لاپ رہا ہے۔ دو کسے خیال کا دل و دماغ میں گم رنگ نہیں۔ اُس نے ”دوتھہ“ کو دنیا کا گلوپ دکھا کر ”جو کو“ کا ذکر چھپ چھپاں بڑے بڑے وسیع اور زرخیز میدان ہیں، میں انہی میدانوں میں کاشت کاری کرنے کا آرزو مند ہوں۔ ہمارے پاس اب پائنت اور زمین بوسی کرنے کے لئے آجمن ہوئے ضروری ہیں۔ دوتھہ بھی سہانے خواب دیکھ رہی ہے۔ دونوں ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں انجیر ہیں۔ ”یامادا“ جدھر جدھر جاتا ہے پری سا یہ کئے ساتھ ساتھ ہے۔

جب جہاز بندر گاؤ یو کو ہامہ کے قریب پہونچا تو کو و فنجی نے بادلوں سے سر نکال کر ان کا استقبال کیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے طعنی ہوئی بغیر سوز نظر آرہی ہے۔ بڑا دلچسپ منظر ہے۔ نگاہ واپس لوٹتے پہاڑیاں رگڑ رہی ہے اور کسی جیتے بڑھی اس مبارک منظر سے سے محروم ہوئے کیلئے رضانہ نہیں۔ ”یامادا“ نے اچھی سے پہاڑ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے دوتھہ کو دکھایا۔ ”ونیساں“ کو پہاڑ اس کی طرح کیڑہ تنہا کھڑا ہوا اس کا تہ مقابل نہیں۔ چایا نیوں کا یہ محبوب ترین ”یامادا“ ہے۔ یو کو ہامہ ”بر دو لوں جہاز سے تریڑے اور ریل میں سوار ہو کر تو کیو روانہ ہوئے۔ راستہ میں فلک بوس گاڑیں، دلکش منظر دل کو بھانے کیلئے ڈھبھی میں مزید اضافہ ہیں۔ ”دوتھہ“ نے سوالات کی بھرمار کر دی۔ ”یامادا“ بڑے شوق و انبساط کے ساتھ اپنی منظور نظر کو وطن کی ایک ایک چیز دکھا دکھا کر سرور ہو رہا ہے۔

دونوں نے امپرل ہول میں قیام کیا۔ داخل ہوا ہی تھا نام وغیرہ لکھنے کے لئے قلم نکالتا تھا کہ ہول کے لازمے "دانا بے" کا خط دیا۔ لکھا تھا میں لڑکی سمیت آپ سے ملے آ رہا ہوں۔ خطرہ صکھیں برنگہ کی موٹی موٹی ٹینکیں پر لٹکیں۔ دوسرے روز "دانا بے" "مُسکوکہ" کو ساتھ لے کر ہول پہنچے۔ چونکہ کچھ روز ہول میں ٹھہرنا چاہتے تھے اس لئے انہیں بھی پتہ لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ "مُسکوکہ" یورپین لباس میں ملبوس باپ سے کچھ دُور کھڑی تھی۔ سامنے کے زینے سے جا پانی چھینے کا ایک نوجوان ایک غیر ملکی لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ملے ہنستا ہوا نیچے اترا۔ دو کسے دیکھ کر ٹھنکی۔ اس کے حسرت دار مان سے پُر ہسترت سے لبریز اچھوتے دل میں گھونسا لگا۔ دوتھ نے بوٹی سی اٹھتی ہوئی نگاہ والی اور دونوں آگے بڑھ گئے۔ ایک دوسرے کو کوئی نہ پہچان سکا۔ "دانا بے" لکھری رہے تھے کہ "یاما دا" نے پہچان کر ہاتھ ملایا۔ یورپ کی آب دہرائے اس کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔ "دانا بے" اس کو مضبوط قد اور چوچال دیکھ کر خوش ہوئے مگر ساتھ ہی ایک خوش رو کا مٹی سی پرئی بال حسینہ کو زیب پہلو دیکھ کر دل ہی دل میں متحجب ہوئے۔ یاما دا نے خود دوتھ کا اپنی دوست کہہ کر تعارف کر دیا جس حسینہ سے ہاتھ ملانے کے بعد دوسرا دھڑ دیکھ کر کہا "مُسکوکہ" کہاں ہے۔ وہ غریب افسردہ خاطر دل کو سنبھالے قریب ہی کھڑی تھی۔ کچھ بھر پہلے اس کا دل خوشی سے بھولانے لگا تھا۔ حیران و ششدر بھی کہ جن کا دل کو محبت بھرے کام اور فراق کے گنگے شگ سے منسنے کی امید بھی وہ کیا سن رہے ہیں۔ کاش کانوں میں پارہ بھر جاتا۔

باپ اپنے ساتھ لیکر آیا اور "یاما دا" سے کہا "یہ "مُسکوکہ" ہے۔ اس نے دُور سے نیچے نگاہ سے جھک کر سلام کیا اور ہر سوت لکھتے پرے ہٹ کر گھر میں کو گھورتی رہی۔ دوتھ نے خود ہاتھ بٹھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ "مُسکوکہ" کے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ قلبی صدمے نے صاف شفاف رنگ پر زعفران مل دی۔ بل کے بل میں مرجھا گئی۔ باپ کے ساتھ کمرے میں آئی اور کوئی پرندہ حال پر کڑکے روئے لگی۔ باپ بھمدار اور زمانہ شناس تھا اپنے غم کو چھپا کر بیٹی کی دُکھ بھرتی کرنے لگا۔ "مُسکوکہ" کے ہنگامہ اور بنشاش چہرے پر غم دالم کی گھاٹیں چھلنے لگیں۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں ان میں بار بار آنسو بہا رہیں جنہیں دیکھ کر باپ کا کیچھنہ کوتاہ تھا۔ وہ بیٹی کی رنجیدگی اور غلامی امید الناک واقعہ سے سہرا سمٹتا تھا۔

دوتھ بڑی شرمینک نیک طینت اور بھمدار بھی۔ جلد بات کی تہ کو پہنچ گئی۔ اوپر پہلی بوجھ لی۔ اس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ یاما دا نے نسبت کو بر دے میں رکھا۔ اس کے نیک دل میں "مُسکوکہ" سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا اور عزم مضبوط کیا کہ یاما دا کا دل کسی نہ کسی طرح اپنی طرف سے پھیر کر محبت کی اصل مسخ کی طرف مائل کر دے۔ یہ خیال کر کے کہ اس لڑکی کی زندگی میں جس حال ہوں بڑی پشیمانی ہوئی۔ اس نے "مُسکوکہ" سے رحم بڑھائی چاہی۔ ہول ہی میں اس کے کمرے میں لے جانے لگی۔ "مُسکوکہ" کے شکوتہ دل میں دوتھ سے ملنے کا قطعی سکت نہ تھا یہاں تک کہ اس کے خیال سے لکھنوں سے دریا رواں ہو جاتا تھا۔ "دانا بے" ہمیشہ دوتھ سے تباہ سے ملا کرتے تھے۔ باپ کے مجبور کرنے سے بیٹی بھی باول نا خواستہ ملتی تھی۔ پہلی مرتبہ جب دوتھ ہول کے کمرے میں "مُسکوکہ" سے ملے مٹی تو وہ آنسوؤں کے موتی پروردی تھی۔ باہر سے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باپ نے "مُسکوکہ" کو آواز دی جب اسی آواز پر بھی آنسو نہ تھے تو کہنے لگا کیا تم سہو دہائی کی بیٹی نہیں ہو؟ کیا سمجھو راقی اپنے غم پر قادر نہیں ہوتے؟ اس پر "مُسکوکہ" کو کچھ غیرت آئی اور آنسو پوچھ کر اسکو آواز دی کہ اندر چلیے۔ آئے پر اس سے خلق سے ملی۔ "دانا بے" دو تین روز ہول میں رہے اور چلتے وقت یاما دا کو دعوت دیکر رخصت ہوئے۔

ایک دن یاد آو اور دوتھ پوئل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ سامنے سڑک پر چھاپائی سپاہ کا ایک دستہ مارچ کرتا ہوا نظر آیا۔ سپاہ کا دیکھنا تھا کہ اس کے خیالات میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ چونکہ میں کس لشے میں سرشار ہوں، اور کس راہ پر جا رہا ہوں۔ ہمارا مسلک ملک و قوم کے لئے ایثار و قربانی ہے۔ انہیں منعات کا میں اہل نہیں تو کیا جاپانی قوم کا ایک فرد کھلانے کا کسی طرح بھی سختی ہو سکتا ہوں۔ میرے ملک کا ایک ایک پتہ مادرِ مکر سے سپاہی پیدا ہوتا ہے اور تواریخ کی جھادوں میں پل بڑھ کر ملک و قوم کا محافظ بن جاتا ہے۔ اور ہر خوشی سے لبان کرتی اس کا شیوہ۔ اسی قربانی سے ہماری قوم کی ترکیب ہوتی ہے اور اسی سے ہم نے دنیا کی نظروں میں عزت حاصل کی ہے۔ کیا میرے لئے زیبا ہے کہ ایثار سے گھر اڑوں! انہیں! مجھے روتھ کی محبت کی بھینٹ والدین کے حکم کی بجائے اور میرے چڑھائی چاہیے۔ ان خیالات میں ہر وقت غرق رہنے لگا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے یہی نکتہ تھا کہ کسی طرح اس گٹھی کو کھینچاؤں۔ اگرچہ اسے روتھ سے کوئی وعدہ وعید نہیں کیا تھا تاہم اتنے عرصے کی دوستی کا پاس تھا۔ گھٹنوں خاموشی میں ہل کر غور و فکر کرنا کہ خوش اسلوبی سے معاملہ کیا ہو جاتا۔ خود بخود اس کی دلچسپی پال کی پڑنے لگی اور اب یہ روتھ سے کہنے لگا۔ روتھ محل اور لفظ ان پسندیدگی تھی۔ اس کے اطوار کو تاڑ گئی۔ ان اپنی لمبی چوڑی داستانِ محبت کی جڑیں تک عرصہ ہوا کھانکھا مگر پھینک چکی تھی۔ کوشش کرنے لگی کہ "میسو کو" کا خیال اچھی طرح اس کے دل میں جما دے یہی مشغلہ تھا جب اور جس وقت ملاقات ہوتی "میسو کو" اور اس کے آئندہ خزانہ کی بابت گفتگو کرتی۔ یاد آو کے لئے طبیعت کا خلیجوان اس درجہ ناقابلِ برداشت ہوا کہ طہا کر ہا ایک دن دن اپنا ساٹھ گیسٹا تھا کہ روتھ کو الوداع کہہ کر رخصت ہوا۔

شہینہ بیگم

سیدھا چلنے باپ کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے، زمیندار بیج بونے میں مصروف تھے۔ باب اپنے باپ کے گاؤں میں پہنچا تو راستے میں دیکھا بڑا باپ پتلی پتلی دلی میں کھڑا ہل چلا رہا ہے۔ چند منٹ کھڑا دیکھا کہ آخر قدم بڑھا کر "او تو ساں، او تو ساں" پچو! باپ دیکھ کر دوڑا ہوا۔ حالتِ بیتابی میں ہی کے تھکے پھرتے ہاتھوں سے بغلیں ہونا چاہتا تھا کہ دشتا کپڑے خراب ہونے کا خیال آیا اور ہاتھ دبے ہی سمجھنے لگے۔ یاد آو اسے بھرتے ہاتھوں سے مٹا فو کیا۔ انونے نے بہ اصرار بیٹے کے ہاتھ کو سٹکیس لے لیا اور گھر کو روانہ ہوتے۔ تھوڑی دیر چلے گئے کہ بہن نظر آئی۔ وہ پانی کے گڑھے میں گڑیوں کی کٹی چلا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر گود میں اٹھالیا۔ بہن نے چومتے ہی سوغات طلب کی۔

گھر پہنچا تو ماں کو انجینی کے پاس بیٹھا دیکھ کر ڈیڑھی ہی سے اوکساں، اوکساں، اور دی۔ بیٹی کسی نے مڑ کر دیکھا تو یاد آو کھڑا تھا۔ اٹھ کر قریب آئی اور کہا: "ما! کتنا بڑا ہو کر آیا ہے! او! او! او! محبت ماری جوش میں آئی اور ہڈی پٹے پٹے رخساروں پر خوشی کے نشوونڈھلنے لگے۔ یاد آو دونوں ہاتھ فرش پر پڑے ہوتے جھکا ہوا تھا۔

کئی دن بعد بنیان اور نیکر بہن کو کھیتوں میں جا دھکا۔ نے آدھ جدید آواروں سے بیخیز زمین صاف کی، جنگلی جھاڑیاں اور اڑا ہل سب کاٹ کر پھینک دیں۔ انونے دیکھ کر متحجب ہوا کہ دونوں کام گھنٹوں میں کر کے میدان صاف کر دیا۔ یاد آو اسے کھیت کی کٹی و دو تھوں میں اٹھا کر دیکھی، اور چلکانی دیکھنے کی غرض سے ویسے ہی دونوں ہاتھ منہ پر لے لے۔ انونے نے کہا: "ای سوچی دار کیوں کی شے ہے نا، کھیتوں میں ہل چلائے کیسے بیخیز کر دی جانوں پر عذاب تھا۔ یاد آو اسے اب پاشی اور ہل چلانے کے لئے بنی ہوئے

کی تجربہ باجے سامنے پیش کی یہاں سے فراغت پا کر بہن کو کندھے پر بٹھا گھر پہنچا۔ کمان کمانی تہیں کر رہے تھے کہ ڈاکیر نے پانا داکے نام کا خط دیا۔ "الزے" نے نغمائے نواں پلٹ کے دیکھا اور پیٹے کو دیدیا۔ خط پڑھ کر حکم آیا اور سوچ میں پڑ گیا اور بغیر کچھ کہے پھر پہن موٹریں چل پڑا۔



دو تھ کی آمد و رفت مسکو کے ہاں برابر جاری تھی۔ دنانا بے نے وضع داری کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ ایک دن روتھ کی دعوت تھی جب وہ مکان پر پہنچی تو مسکو زار و قطار رو رہی تھی۔ باپ نے ہنسنا بھانا مگر اس کا آسوتھنا تھا نہ تھا۔ بدقت بولی یہ روتھ میرے لئے بڑا صبر آزمایا ہے۔ پانا داکے نے کہا تھیں اس بات کا زور بھی کھاتا تھیں کہ وہ تمہارے والدین کی جہاں ہے۔ کیا جہاں کا اسی طرح استقبال کیا کرتے ہیں۔ اس فقہ سے نے جاو کا انٹریا اور فوراً آسوتھنگ کر کے اُسے ڈیوڑھی میں لیے گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے کھانے کے کمرے میں لائی۔ مسکو نے خود روتھ اور پانا داکے کے ساتھ بڑے کھانا چنا۔ بار بار دیکھ کر بے کے بھائی دروہ نے اسے کا "شوما" کھولتی اور کھانے کی کشتیاں لالا کر دونوں کے سامنے رکھتی۔ جب سب کھانا قریب سے چن چن کر تھوڑے کے سامنے جھک کر کھانا پیش کرنے کے آداب کے موافق شکریہ ادا کیا۔ روتھ، ہاشی (تیلیوں) سے کھانا کیا جانے لے بڑی دقت ہوئی۔ ہاشی سے کھانے کی کوشش کرتی تھی مگر کوئی چیز گرفت میں نہ آتی تھی۔ مسکو نے ہاشیاں بکڑنی سکھائیں۔ کھانے کے بعد روتھ مسکو کا کمرہ دیکھنے گئی اور وہاں اس کو شادی کا کیونو دیکھانے کی درخواست کی۔ مسکو نے بڑے غور و فکر کے بعد الماری کھولی اور کیونو نکال کر دکھایا۔ روتھ نے تعریف کی اور مسکو کو پہنکر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے غڈ کیا کہ وقت پہلے میں نہیں پہن سکتی۔



دنانا بے میٹھی کی زدہ حالت دیکھ کر شب و روز فکریں تھے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مجلس چند عزیزوں کی موجودگی میں منعقد کی جائے اور اس میں پانا داکہ کو مدعو کر کے معاملہ کو یکسو کیا جائے۔ مجلس میں تمام لوگ جمع تھے۔ پانا داکہ انتظار ہو رہا تھا کہ وہ داخل ہوا اور سلام کر کے صدر جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے تفریق کی اور مسکو کو سے گفتگو کرنی چاہی۔ دنانا بے نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔



مسکو بہت رنجیدہ اور شکستہ دل ہو رہی تھی۔ اس نے پوشیدہ طور سے مہربان مجلس کے شوے سے اُسنے اور دل میں ٹھانی کہ اس پانی دنیائے سولے منہ موڑنے کے دو سرا اعلان نہیں۔ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آئی اور الماری سے جسرت ویاس انگبار آنکھوں سے شادی کا کیونو نکال کر فردی میں بندھا، اور گھر سے زار و نزار غائب ہوئی۔ چلتے وقت کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظم کے کچھ بند لکھ کر چھوڑ گئی۔

جس وقت گھر کے دروازے سے نکلی مگر مگر کوئے کوئے نے براہ الوداعی نظر ڈالی۔ مندر میں پہنچی شروع و خضوع سے دعا مانگی۔ مندر کے دو طرف آسمان تک پہنچنے والے سکڑا پکے درخت پھولوں سے لدے پھندے تراز و وحدت کا رہے تھے۔ تمام میدان میں پیازنی رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ جدر نظر اٹھتی تھی درختوں پر پھول ہی پھول تھے۔ چوں کا نام نہ تھا۔ شاخیں بھی ان میں چھپی

روٹی تھیں۔ ٹھنڈ دھنوں پر بچوں کا نعل ناظم معلوم ہوتا تھا۔ کائنات قدرت کی مدح ثنائی سے عقل عاجز اور زبان گنگ تھی۔ لہذا ہوا سے کوہ بلاشبہ بارش ارم کا منتظر ہیں گمراہ تھا۔ سوختہ دل مسکو کو دنیا کی ہر چیز سے بیزار مٹا اٹھا ہے اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ ٹریم کا اٹیشن آیا۔ مسافروں سے بھری ہوئی ٹریم گولڈ لٹری ہوئی دروازہ ہوتی مسکو کو سوار ہو گئی۔ اسامہ پہاڑ کے دامن میں ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں کچھ لٹے کھڑی ہے۔ چند منٹ کے توقف کے بعد اس نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ پہاڑ کی چڑھائی اچھے اچھے سورا کا سانس پھلا دیتی ہے۔ یہ لڑکی ہلکی چٹانک بھر کی لڑکی بہ ہزار وقت بے کو کھینچ رہی ہے۔ دم بھولا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں جواب سے ہے۔ میں۔ پیشانی عرق ریز ہے۔ راستہ بیڑھا سیدھا، اونچا نیچا دشوار گزار ہے۔ جگہ جگہ ٹھک کر دم لیتی ہے اور چاروں طرف مایوسانہ بچوہ ڈالتی ہوئی گھر آٹنگ آتش فشاں پر پہنچا اور کرنی چڑھتی چلی جا رہی ہے تشنگی سے برا حال ہے۔ بار بار خشک زبان لب نازک پر بھینچتی ہے۔ منہ کا لعاب بھی تقریباً خشک ہو چکا۔ ہوا اس قدر مخالف ہے کہ کبھی کسی طرف ہے اور ہوا کے بے درد جھونکے نے کسی طرف جاتے ہیں۔



یاد آ جا جب مسکو کے کمرے میں پہنچا تو وہ موجود نہ تھی۔ چاروں طرف تلاش ہوئی۔ ماں گھبرائی گھبرائی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ یاد آ کا سامت ہوا تو اس نے بڑی غم سوز آواز میں کہا: "سارا گھر چھان مارا مسکو کا پتہ نہیں۔ وہ اپنا وہن کا کیمو تو بھی ساتھ لے گئی۔" یہ سنکر یاد آ کا دل شمی میں گلیا۔ پہلو کی دیوار پر اس کی تحریر کر وہ نظم نظر پڑی۔ ایک ایک مصرعہ تیر کی طرح دل میں چھپتا چلا گیا۔ نظم۔

پہاڑ آئی۔

سکورا کے پھول کھلے۔

ہوا چلی۔

عین شباب میں شہرازہ بھر گیا۔

آہ! سمورائی کی جان!

سکورا رہنمائی کر رہا ہے۔

پیروں نے کی چین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا اچھا گیا۔ حالت سرا۔ سگی میں کبھی کمرے میں آتا اور کبھی برآمدے میں جو اس غصہ سست پڑ گئے، کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ باہرے اوسان کھڑا تھا کہ نگاہ اور باطنی کوہ آتش نشان سے دھواں ٹھکانا دیکھ کر ایک دم خیال اس طرف منتقل ہو گیا۔ موٹر پر سوار ہوا اور نہایت تیز رفتاری سے چلا ہوا دامن کوہ میں پہنچا۔ بد قسمتی سے گھبراہٹ اور ہلدی میں ایسے دامن میں پہنچا جس کے نیچے جھیل پڑی بہہ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر پریشان ہوا۔ کنارہ جھیل پر کوئی اجنبی بیٹھا کش نگار تھا۔ کچھ ہوا اس کے پاس گئی اور راستہ دریافت کیا۔ اجنبی نے کہا: "جھیل کو پار کر کے پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ مگر آج دن خراب اور ہوا تیز ہے۔ پہاڑ پر چڑھنا خطرناک ہے۔ یاد آ پر کبھی نصیحت کا اثر نہ ہوا۔ اور کچھ سوچ کر پہاڑ پر چڑھنے کا جتنا آثار جھیلکا۔ دم سے جھیل میں کود پڑا تیرتا ہوا کچھ دور پہنچا تھا۔ دم گھٹنے لگا جھیل پر گزندہ کالٹیف دھواں

چھایا ہوا تھا۔ سانس سیناؤ شور تھا۔ کھانسی کے مائے برہ حال۔ کہیں کہیں ٹھنڈ و رفت جھیل میں کھرے اپنی زیر آب زندگی پر نوحہ خواہ تھے۔ تھک جاتا تو ان کا سہارا ایستا۔ اور پھر تیرنا شروع کر دیتا۔ بڑی تکلیف اور دشواری کے بعد کھائے لگا۔ چند قدم زمین پر چلکر اودھا گر گیا۔ تھوڑی دیر بے حال پڑا۔ پھر ہاتھ پر چڑھنا شروع کیا۔ پہاڑی راستہ ٹیڑھا سیدھا، ڈھلوان تھا۔ جگہ جگہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ آگے چڑھ کر جلتے جھلکے پتھر آئے۔ لگے اور پاؤں کباب ہونے لگے۔ بہت کمر ہاتھ مچ پاؤں یاری نہ دیتے تھے۔ جڑ میں جل چکر جھپٹی ہو گئیں۔ تلووں میں جھالے بیٹنے لگے۔ خدا یاد دار تھا۔ ایک جگہ تکلیف سے بھرپور ہو کر پاؤں پچھڑا کر بیٹھ گیا۔ مگر مٹلائی گا کہیں براہ راست فٹنٹ کی چوٹی پر لگی رہیں۔ چند ہی منٹ میں کھڑا ہو گیا۔ آتش الفت کی دہنی ہوئی چنگاری بھڑکی اور درودل نے اُنک کر چلنے پر آمادہ کیا۔ لنگڑا ہوتا ہے ہوئے پتھروں اور ناہموار راستے پر چڑھنے لگا۔ دیوانوں کی طرح حال سے بچال دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر چلنا آواز میں رسوگو، رسوگو پچارتا۔ زہر لی گیسیں تمام سہارے پر منڈالنا منڈال کر انیوالوں کو دعوت اصل دے رہی تھیں۔ کئی دفعہ سوختہ پاؤں نے جواب دے دیدیا۔ اور پاؤں کو ہاتھ میں لے کر ہو بیٹھا۔ مگر معناتطبی کشش کبھی منٹ دو منٹ سے زیادہ آرام نہ لینے دیتی تھی۔

خیر و خیر

رسوگو چوٹی پر پہنچی تو آتش فشاں کا کھولنا ہزار غار نظر آیا۔ اس میں چنگاریاں چمک رہی تھیں اور دلدل پک رہی تھی۔ کتو ہی جازمگ اس کے پیٹ میں سما چکے تھے مگر اس کی جڑ تک نہ پہنچی تھی۔ جب اور جس وقت دیکھے اپنی آغوش کھوئے منتظر تھا۔ خونِ شباب منہ کو لگا ہوا تھا۔ ہر سال تو جون سیوت اور لاڈلی کتوں کو بھگم کر جاتا اور دکار نہ لیتا۔ رسوگو تنہا غار کو دیکھ کر ہسم رہی تھی اور انھیں بند کر لیتی۔ صورت پر ہتائی ٹھنڈی۔ پیر مردہ رُخساروں پر رسوگو لڑیاں ڈھلکے لگیں۔ جوازمگ تنہا ہامون کی ٹھڑیل گن رہی تھی۔ خوف سے رواں رواں سر رہا تھا۔ آخر سوچنے لگی دیکھا فانی غم و الم کا گھر ہے۔ گوتم بدھ کے پاس پہنچ کر یزدان لیا جاتے گا۔ عقیقہ میں آرام ہی آرام ہے۔ اب مجھے کس کا خوف۔ اس خیال کے آتے ہی بدھ کی خیالی تصویریں سامنے آئے لگیں۔ اور مصروف دعا ہوئی۔ طبیعت کو قدرے سکون ہوا۔ الا اللہ کر کے اٹھی کھانپتے ہاتھوں سے فردی کھولی اور بادل گریاں کیونکہ کو کندھے پر ڈالا۔

خیر و خیر

یاد آدھ چلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ پاؤں تقریباً زخمی ہو چکے تھے۔ چوٹی سے چند گز کے فاصلے پر بیجان سا پڑا تھا۔ سامنے رسوگو کیونکہ بہت ہی ہلکا دکھائی دی۔ اسے سہے اوسان خطا ہو گئے۔ آواز دینی چاہی مگر نہ سکی۔ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس خیال نے کہ اب گڑی اب گڑی طاقت رفتار سلب کر لی۔ اٹھنا چاہا مگر دھیبہ تھا۔ جوں توں کر کے جلا ایک ایک قدم سو سو من کا تھا۔ رسوگو کو اپنے خیال میں خوف خدا سے لو لگاتے کیونکہ بہن رہی تھی کہ دفعتاً یاد آدھ اپنے پیچھے سے جا کر بغیر ایک حرف کے جھٹ سے کیونکہ آتا رہا۔ مگر نہ دیکھا، سکتہ میں رہ گئی۔ خاموش کھٹی رہی۔ پھر خیف سے زیر لب تمج کے ساتھ سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی۔ سوختہ پاؤں نے دامن صبر کی وجھیاں اڑا دیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیروں کو تھام کر وہی کیونکہ نوان پر ڈال دیا۔ شادی مرگ نے غشی سے ہم آغوش کر دیا اور گر پڑی۔

کو و آتش فشاں جوش میں آکر تھوہ چنگاریاں، لاوا اگلنے لگا۔ پہاڑ پر دھواں دھواں مسلط ہو گیا۔ اس تہکی آتش فشاںی ہوئی کہ پہاڑ سے پتھر نکل کر جھیل میں ہوتا بیاں چھوڑنے لگے۔ زلزلے اور آفت دھاتی۔ اس پاس کے مکان آتش کوڑے۔ بہزار وقت یا ماویہ ہوش مسکو کو گو دھیں اٹھائے پہاڑ سے اترا اور نیچے سرے میں لایا۔ جوش میں لانیسی تدابیر کہیں۔ بار بار طعن میں پانی چراتا۔ تھوڑی دیر میں مسکو کوڑے اٹھ کھولی۔ یا ماوڑے فرط محبت حد تک پشیمانی انکی پیشانی پر رکھ دی اور آسٹوں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ سخت سخت اور رنج و الم نے یا ماو کی صورت پر ناخوش گوار اثر ڈالا۔ اور وہ بستر علات پر گر گیا۔ صورت مگر جھانکی۔ سنگ سنو لگیا۔ دونوں پر بندے آرام کری پر پڑا تھا۔ جس کو اس کی بیماری سے نگر مند ہے۔ طرح طرح سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہر وقت اس کے سامنے مثل گل کے کملی رہتی ہے۔ سامنے بھی کی تو بجاری ہے اور وہ سر بلا نغمہ چھیر کہ یا ماو اسرو دھنے لگا لیے لٹے اٹھ بیٹھا پر ستارنگا ہوں سے بچھا۔ مسکو پاس آتی دونوں زخمی باؤوں کو ہاتھ میں لیکر ہوسمیں۔ غمی موتو چاتے کی کشتی۔ لے کر آئیں اس میں ایک خطر رکھا تھا۔ یا ماو نے خط پڑھا اور مسکو کو دیکر کہنے لگا۔ تھوڑی اچھی لڑکی تھی۔ میں نہیں کھو چکا تھا اُسی نے واپس دلایا ہے۔

مسرور لاس (ازجاپان)

تصانیف مصوٰر ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائیؒ

کولتار۔ مفسر خیر اور برسر ارنال، شوخ و رنگ رنگین کی جھیر چھاڑ۔ اور ایک عورت کی دردناک زندگی عجیب غریب کتابت قیمت عام شمر میر ہوئی۔ ایک خاتون کی مصوم شہزادہ سدر دھچپ میں کہ کتاب چھوڑے کوئی نہیں جانتا چار تصویریں اور زمین سرورق۔ جلد ۱۔ ۱۰
برج ظرافت۔ انگوٹھی کی مصیبت اور دیگر اجیر فضائل کا مجموعہ۔ ہر افسانہ ظرافت کی روت پر۔ اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۰
روح لطافت۔ ہمارائی کا خواب اور دیگر افسانے جنکو پڑھ کر آپ ہنستے ہنستے روٹ جائیں گے۔ پہلا افسانہ لا جواب قرار دیا گیا ہے۔ ۱۰
کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت کس طرح مرد کے بہتے میں جاتی ہے۔ ابتدائی حصہ خیر انساوال اور آخری حصہ رُلا نیوالا۔ ۱۰
حنا نم۔ چٹائی صاحب کی تازہ ترین کتاب جس کا ایک ایک افسانہ ظرافت کی جاں ہے۔ یہ مصنف کی بہترین تصنیف ہے۔ جلد نہری ۱۰
جنت کا بھوت۔ ایک پرکھل نوجوان اور ایک حسین غریبہ کی پر لطف داستان مانے ہستی کے ایک پیٹ میں بل پڑ جائیگے۔ جلد ۱۰
ملفوظات ثانی۔ ایک کتے کی خود نوشت سوانحی، اگر کتے کی زبان ہوتی تو وہ اپنے جذبات کس طرح ادا کرتا۔ اپنی طرز کی پہلی کتاب۔ ۱۲
تعلیقیں۔ ایک بی۔ اے۔ پاس خاتون کی شادی کے بعد کی بھائی کی گزرتی ہے؟ انجام کار کیا ہوتا ہے؟ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۰
مرزا جی۔ بھگتو کے بچے مرزا جی اور لنگے جاب کا ایک نہایت دلکش ڈرامہ۔ واقعہ علیشاہ کے زمانے کے لکھنؤ کی ایک جھلک ۱۰
فرز ندیم۔ سرحدی افسانوں کے متعلق ایک عبرتناک افسانہ۔ غیرت، دیانت و شرافت کا مرقع ہے۔ اس پر مصنف کا طرز بیان۔ ۱۰
قرض مقرر ارض حجت است۔ اس متعلق پر مصنف نے اندازے فساد لکھا ہے کہ پڑھنے سے عیاں نہ ہوتی آجاتی ہے۔ ۱۰
سدر وال۔ سرزمین دین کے سات خطرناک سالوں اور لکھے جاننا ہنسوںی کا حیرت خیز افسانہ۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ ۱۰

رہے کا پہلہ۔ سبلی بکٹ پو۔ دہلی کو

فرحت کا انخسار

سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کی آوازیں تاریکی پھیلنے جاری تھیں۔ کمرے کے دروازے کے گرد نوکروں کا جھوم تھا جن کے درد متوشش چہرے پر خوف و وحشت کے آثار تھے۔ میرے پہونچنے ہی سے سبے راستہ چھڑ دیا میں نے چلا کر آوازیں دیں۔ "فرحت!! فرحت!!" دروازے میں اندر سے قفل کھٹکھٹا تھا۔ جب سب دور لگا کر ہمارے توبہ وقت تمام آوازوں کی مدد سے دروازہ توڑا گیا میں تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ نوکروں میں سے کوئی بھی میرے ساتھ اندر نہیں آیا، کسی نامعلوم خوف نے غیر محسوس قوت کے ساتھ ان کو روک رکھا۔ کمرے کی آواز تاریکی میں اکیلا کھڑا تھا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بجلی کے سوچے کی تلاش میں میرے قدم آلودہ ہاتھ پیسینا چیزوں سے ٹکرائے، پیسینا کے خوشنما مرتبان، ابوسنی چو کھٹوں والی تصویریں۔ کاشی کے گلڈان وغیرہ بیش قیمت نوا در جو اس کمرے میں بے غنتی بھرے تھے میرے راستے میں حائل ہوئے۔ میرا سر جھکا ہوا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی طویل العامت انسان سفید لباس پہنے اپنے برف جیسے خنک ہاتھوں سے مجھے پکڑ رہا ہے۔ میں نے بھر بھارا "فرحت!!" لیکن میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ اچانک میرا ہاتھ کسی گدار آواز کی جھپٹ پر پڑا جس کو چھوئے پر ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مُرے کا سر جو جسم۔ خوف و وحشت کی ایک ہلکی سی جھپٹ کے ساتھ میں پیچھے ہٹا اور لو لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ چند سکند کے بعد جب حواس فراموش ہوئے تو میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ سوچے پر رونا اتفاق سے قریب ہی تھا۔ پکچپکاتے ہاتھوں سے میں نے ٹپن دلیا۔ بجلی کی کچی خوشخوار دوند نے کیخوں آلودہ آنکھوں کی طرح وہلک اٹھی۔ میں نے دیکھا کہ فرحت سنگا مینر کے سامنے ایک کرسی پر نیم دراز ہے۔ میرا دل حلق کے قریب دھڑکتا ہوا معلوم ہوا "فرحت!!" "ہیکم!!" کہتا ہوا میں اُسی طرف لپکا۔ کیا وہ بھی یہ پتھر کا جوتہ "فرحت ہی تھی؟ سفید ترقاق لیشی ساری میں لپٹی ہوئی یہ بیان ثبوتی کما میری بیوی کی بھی؟ مجھے اس کے پچانے میں کافی دیر لگی۔ اپنی حلقی ہوئی وحشت زدہ آنکھوں سے حیرت و شگواؤ اُٹھتا ہے کہ ساتھ میں اس برف کے مانند سرد و سفید دھیر کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی بے نور آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں درمیانے والے نئے آئینہ پر چمکی ہوئی تھیں۔ پتیلیاں کچھ کچھ اوپر کیڑھی ہوئی تھیں سیاہ کھونگر بالے بل پوری لمبائی تک بکھرے پڑے تھے جیسے غضبناک سمندر کی موجیں۔ بائیں ہاتھ کرسی کے نیچے گر پڑا تھا۔۔۔ درتے سرزے لپکپکاتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔۔۔ بجلی کے سے جھٹکے کے ساتھ میرا ہاتھ خود بخود کھینچ گیا۔ وہ اپنے تمام زیورات جو بڑے جاوا اور شوٹس سے بنوائے گئے تھے ہڈ ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ کے جھٹلے سے اس کا مردہ ہاتھ ہلا۔ چوڑیوں کی جھنکار نے مجھے پھر ڈوبا دیا۔ کپسین یہ لاش زندہ تو نہیں؟ اور در سلجھکر میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کا لباس نقیس اور بھینٹی خوشبو سے مسطر تھا۔ میں نے اس کے بھیا یک چہرے کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر سامنے والے آئینے میں اُس کے عکس کو۔ کیا واقعی یہ فرحت ہی تھی؟ فرحت تو سن کی دیوی تھی اور یہ عورت تو مینیالی راکھ کا ڈھیر ہے۔ لیکن اُس کے نیلے ہونٹوں پر اُس کی وہی خصوصی ہرلی سکاٹھ لکھ کر رہی تھی۔ یہ تلخ استہزاء میرے مسکراہٹ سے صرف فرحت ہی کے ہونٹوں پر اُسکی تھی۔ بے شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اپنے قدیم نوکر عبدال کو آواز دی۔ عبدال ڈرتا ہوا آیا اور ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ وفادار ملازم نے اپنی مالک کے ہاتھ جوئے اور دم چھوکر ڈائریں مار مار کر روئے لگا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔

میں نے اپنی مُردہ بیوی کی قیمتی پوشاک اور بھیناٹک چہرے کی طرف دوبارہ نظر ڈالی۔ اور پھر عبدل کی کجی عقیدت پر ہنسا۔ یہ ممکن نہیں۔ اس سنگارہ کے سامنے جھک کر اپنی شرافت کا خون کمرہا تھا۔

”عبدل۔ جاؤ۔“ میں نے جلا کر کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ یہ عورت کسی تھی جس نے فرشتہ جہنما تھا مگر اصل میں یہ زہریلی ناگن تھی۔۔۔ شاید تم کو اس رات کا واقعہ معلوم نہیں۔ مگر خیر، تم جاؤ۔ اس کمرے سے فوراً نکل جاؤ۔ کل صبح یکم صاحب کا شاد و جلوس نکلے گا۔ اس کے لئے انتظام کرو، جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

”اکیلا؟“ عبدل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ہاں، کل چاہے زمین اس کی مالک بنجاتے لیکن آج یہ میری ملکیت ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر صاحب، یہ تو دیکھنا چاہیے کہ موت کیسے دانت ہوئی؟“ عبدل نے مستفسر نہ کہا۔

”یہ تو صاف ظاہر ہے۔۔۔ میں نے میز پر سے ایک چھوٹی سی خالی شیشی اٹھاتے ہوئے کہا۔“ یہ دیکھو اس پر پو آئزن لکھا ہے۔ جہنمیت سہل تو کتب۔ اور یہ دیکھو۔۔۔ میز پر بہت سے کاغذ بکھرے پڑے تھے۔“ بیگم صاحبہ نے چند وچسپ دستاویزات بھی تحریر کی ہیں۔ مجھ پر کا آخری پیام الفت تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ یکم صاحب ادب سے بھی شغف رکھتی تھیں۔ اب تم جاؤ اور مجھے اس شہ پارے کو پڑھنے دو۔ جاؤ۔“

عبدل بادل ناخواستہ چلا گیا۔ اور میں اپنی جان نواز فرحت سے آخری باتیں کرنے کے لئے اور ان کی رومان انگریز تحریر سے بصیرت حاصل کرنے کے لئے اکیلے رہ گیا۔

خوف و ہراس، غم و غصہ کے تمام آثار میرے دماغ سے یک قلم محو ہو گئے۔ جو اس بجائے البتہ دل کی دھڑکن بدستور رہتی تھی میں فرحت کے قریب ایک کمری پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”ہاں، فرحت۔ مجھے یقین تھا کہ تم بھی کروگی۔ اُس بات کی ناپاک حرکت کے بعد تمہیں دُنیا میں رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا تھا۔

اب تمہاری وہ سحر انگیز آنکھیں کیوں پتھر انگیں جن سے تم میرے صادق دوست کا دینا گرویدہ بنانا چاہتی تھیں، وہ شیرینی، وہ ملامت اور تمہاری مسکراہٹ کا وہ زہر لالہ سب فنا ہو گئے۔ اچھا ہوا۔ کہو نہیں کیا کہنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مَرُوے سن سکتے ہیں۔

یہ کیا تم نہیں سن رہی؟ خود فرط نے انتقام لے لیا۔ میرے معصوم دل کو ٹھکرا کر تم نے میرے سچے دوست پر اپنا جاؤ دھلائی کی کوئی شے

اگئی۔ یہ اس کا انجام ہے۔ تمہیں بدلہ دینا ہو گا اُس بیوفانی کا جو تم نے میرے ساتھ کیا۔ اُس رُوحانی تکلیف کا جو تم نے اپنی شرمناک

حرکتوں سے مجھے پہونچائی۔ اُس دغا فریب، جھوٹ اور سکر کا جو تمہارے خیر میں داخل تھا۔ کیا میں تمہارا معافی نامہ پڑھوں؟“

میں نے سمجھ بے ہوئے کاغذات کو بچھا لیا۔ ساتھ ہی میں نے اپنی جاؤ و ماگن سرور و شگین فرحت کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ٹکے

باقی چہرے کی نیچے سے سفید نشی اور دیرینہ جھلک رہا تھا میں نے بڑھکرا اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ خدا معلوم کیوں، ایک لمحے کے لئے میرے

دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس کے قلب کی نازک دھڑکن سن سکوں۔ لیکن وہ ہوش کے لئے ساکت ہو چکا تھا۔ کسی

لڑکی کی جبر پر میرا ہاتھ لگا۔ میں نے ذکر ہاتھ گسیٹ لیا۔ ایک سیاہ بھونرالا سانپ اُس کی کمر کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ یہ مجھ میرے

اُس دوست سے نذر کیا تھا جس پر میری رومانی فرحت فریفتہ تھی۔ سیاہ موتیوں کا نہایت خوبصورت سانپ جس کی آنکھوں میں ملی

میرے جڑے ہوتے تھے اور منہ میں بکلس تھا جس سے یہ سانپ ایک سپیٹی کی خدمت انجام دیتا تھا۔ اُتوہ مرتے دم تک فرحت نے اسے اس عزیز سانپ کو اپنے سے الگ نہ کیا۔ مردہ جسم سے لپٹا ہوا یہ سانپ اس وقت بالکل زندہ معلوم ہوتا تھا اور یقیناً مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی مگر یہ اس وقت اپنا پھین اٹھا کہ کھینکا سے مارنے لگتا۔ سامنے والے آئینے میں نے اپنا عکس دیکھا، فرحت کے ہینڈنگ عکس کے برابر۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس معلوم ہوا کہ فرحت کی مندیالی پیشانی پر نفرت کی شکنیں پڑیں۔ لیکن نہیں، اس کے نیلے بون پر وہی مسکراہٹ قائم تھی۔ البتہ تیرے گے سختی کے ساتھ بند ہو جانے سے یہ مسکراہٹ اور زیادہ بھیاں بک ہوئی تھی۔

مُند ہوا کہ جھوٹا آیا۔ فضائیں مٹی جھیں سنائی دیں۔ کھڑکیاں ہلیں، پردے کا پنے۔ فرحت نے بے سیاہ بال لہراتے۔ کمرے کی فضائیں خوشبودار تریل کی ہلک پھل تھی۔ لیکن اس خوشبو کے مین مین شاید ایک نم کی بنا دہی تھی۔ جب سکون ہوا تو میں خط منجھالا اور اطمینان سے پڑھنا شروع کیا۔

پیشینہ

بھونکی القاب آداب کے خط اس طرح شروع ہوا۔

”میں نے تیرے کہہ کیا ہے کہ میں مکر کر رہی تھی۔ کسی جذباتی ہچان کے تحت نہیں بلکہ پورے غور و خوض کے بعد میں نے یہ اہل فیصلہ کہا ہے۔ میرا دماغ شدید کرب میں مبتلا ہے اور میرا جسم زندگی کے بوجھ سے دبا جاتا ہے۔ ان سب تھکوتوں کا ختم کر دینا ہی انتہا ہے۔ موت کے خیال سے اس وقت خوف کی بجائے کچھ اُسنیت سی معلوم ہوتی ہے۔ کتنی خوشی ملی بات ہے کہ اپنی مصیبتوں کے انتقام کے لئے کسی غیبی طاقت کی نعمتوں احسان نہ ہوئی بلکہ خود اپنے ہاتھ سے ان کا تذکرہ ہوئی۔ دل کی اگر بچاؤ صحران احصاب کے ارتعاش اور خون کے اہل کو میں اپنی مرضی سے ذرا سی دیر میں ساخت کر دوں گی۔ مبارک ہے یہ ارادہ اور شامش سپر اس اضماع کو۔ اپنی بھر پور جوانی میں میں اس زندگی، اس بل و نہار اور اس دنیاسے بیزار ہوں۔ الحمد للہ کہ جلد ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ دنیاسے جانے وقت مجھے اپنے محبت کی نورانی آنکھیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور میں۔ چوہیں ہر کی طویل عمر میں صرف چند لمحوں کیلئے میں نے اُسے اپنا بنایا۔ یہ چند لمحے میری زندگی کا عطر تھے۔ افسوس اب وہ چلا گیا۔ وہ جس کے دم سے میری دنیا آباد تھی۔ جس کی زندگی سے ہر نرسکراہٹ میرے ارمانوں کی آبادی میں چراغاں کر رہی تھی۔ وہ چلا گیا اور اُسے بغیر میرا زندہ رہنا باعث ہے۔ میرا وجود دنیا کی بیٹیہ پر بوجھ ہے۔ اپنے جاہل اور غمخس شوہر کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں، بلکہ نہاں سے کہیں اُس کی ہلک گردنت سے نجات حاصل کر رہی ہوں۔ یہ حضرت بھی خود داری اور ناموس کا پاس رکھتے ہیں، چوہیں اور انہیں بے سنی الفاظ کا آئمر الیکر حضرت سلامت نے مجھ سے علیحدگی اختیار کرنے کی دھمکی دی ہے۔ بڑے عزت والے ہیں۔ اس قسم کا آدمی اس کے علاوہ اور کون ہی کیا سکتا تھا۔ اگر اس نے مجھے سمجھا ہوتا۔ میرے جذبات کا پاس کیا ہوتا۔ اگر اس عشق و محبت کا فدا سا بھی اظہار کیا ہوتا جس کی میں بھوک تھی تو شاید مجھے اس کی طرف سے افسوس ہوتا۔ لیکن اُس نے میرے ساتھ بالکل وہی پرناؤ گیا جو ہر مرد پر ضرورت کے ساتھ زیادہ کر سکتا ہے۔ مجھے اچھے سے اچھا کھلایا۔ اچھے سے اچھا پہنا دیا۔ رہنے کو کوٹھی، خدمت کو نوکر چاکر، اور اس کی ناشائستہ خواہشات کی آسودگی کے انعام میں زندہ جاوید رہا۔ لیکن کیا میں نے

میرے ساتھ ہمدردی کا ذرا سا بھی برتاؤ کیا۔ کبھی میرے مضطرب دل کی دھڑکن محسوس کی کبھی میری خاطر سے اپنے جذبات کی فراوانی کو روکا۔ کبھی خفیت سے ایثار سے بھی کام لیا۔ کبھی نہیں۔ شادی کے چار طویل سالوں میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔ اب جبکہ میرا راحت روح اور یہ خفیت دونوں عمر بھر کے لئے مجھ سے علیحدہ ہو گئے تو میں آزاد ہوں۔ اس چھوٹی سی نبض کو جس کا سننا بڑا نام یعنی زندگی ہے، جس کی بات ایک کمزور تانگے سے زیادہ نہیں، میں ابھی آسانی سے توڑ ڈالوں گی۔ مجھے خوشی ہے آج اس وقت مجھے اس ارادے سے باز رکھنے والا کوئی نہیں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں جو میرا ہاتھ پکڑے اور اس کمزور آگے کو نہ توڑنے دے۔ کوئی نہیں!!

آج قبر کے کنارے تک پہنچ کر میں اپنی گذشتہ عمر پر نظر ڈالتی ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ زندگی جس کو میں اب ختم رہی ہوں کس طرح شروع ہوئی۔ ایک سبق جو مجھے بچپن سے سکھایا گیا یہ تھا کہ میں اپنے اپنے کپڑے پہنوں اور بناؤ مذکار کر کے لوگوں کو یہ چاہا کروں۔ بھولی بھالی فرحت کے نرم رخساروں پر بڑے بڑے کھوسٹ اپنے تباہ کوئی بولنے ہونٹوں سے بڑی شفقت کیسا تھہر سار کیا کرتے تھے۔ کتنی پیاری بچی ہے! "کیسی بھولی!" وہ مجھے اپنے ہونٹوں سے باز دے دیتی تھی کہ کپڑے سے چٹا کر دیتے تھے۔ کتنی حرمزدگی تھی۔ بچپن ختم ہوا جوانی آئی۔ شوق دارمان کی چنگاری جو اپنے بزرگوں کیادات و خصائل کے مشابہ سے میرے دل میں پیدا ہو چکی تھی ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ میرا دل چاہنے لگا کہ ہر مرد میری لپٹ لے لے دیکھ کر مسرور ہو جائیں۔ ہر نوجوان مجھے حاصل کرنے کی تمنا میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور میں سب کے خوابوں کی نیت دیوی بننا بنکر سب کو خوش رکھوں اور کئی کے ہاتھ نہ آؤں۔ چنانچہ اس شعل لطیف میں اپنی بہترین کوشش صرف رستے لگی۔ طبیعت میں جولانی، دلولہ اور خیالوں میں رومانی محبت رچ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ادب کی طرف نال ہوئی۔ شاعری اور محبت کے افسانوں میں میں خود اپنی واردات تلاش کرنے لگی۔ ہر بچہ ناول شاعر اور ہر محبت کا پوجیاری افسانہ نویس میرا ہی بظاہر آئے لگا۔ عشق و محبت کے جوشیلے قصے، عاشق و معشوق کی رنگینی ملاقاتوں کے عرباں بیانیوں میں مجھے خاص لطف ملنے لگا۔ ہر وقت انہی خیالی تعلقوں میں رہنے لگی۔ مجھے خود اپنی ذات اور اپنے ان جال نواز رومانی خیالوں سے کس قدر لیت ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک میں اپنے خیالی مجھیں کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ "اے دنیا سے جاتے وقت پتھریال نے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں کی تمام رنگینیوں اور بہار آفرینیوں سے رخصت ہوتے وقت جب تک کہ شہتات کا جائزہ لیتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ کھر لک میں رکھے ہوئے پتھرے میں سے بنگالی مینا جیسا بھری آواز میں کو کی۔" فرحت کی مینا۔" بیگم کی پیاری!!۔ یہ پیاری مینا کتنی خوش تھا ہے۔ اُسے تو خوش ہونا ہی چاہیے کیونکہ وہ انسان نہیں ہے۔ اس کی پیاری باتیں مجھے کتنی پسند ہیں۔ انھوں میں آنسو آگئے۔ یہ بچاری مجھے کتنا یاد کرے گی۔ یہ خیال کہ میں اس کی مالک مرچتی ہوئی اور یہ پھر کبھی اپنے لیے میں بولا کرے گی۔ فرحت کی مینا۔!!

یہ کمزور خیالات میری ہمت بہت کئے دیتے ہیں۔ میں نے مینا کو بچہ سے لے کر وہ لہجہ محبت کی مادی مجھے جدا

نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میں نے جھک کر برسے کر دیا۔ اب وہ آپس میں پھر کچھ کرتی ہوئی، ایک درخت سے دوسرے درخت پر ہارٹی پھر رہی ہے۔ قید سے رہائی حاصل کرنے پر کتنی خوش ہے۔ کیا مجھے بھی اپنے قفسِ عصر کے نجات حاصل کرنے پر خوشی مل جائے گی؟۔ شاید!!

دو ایک فقرے ذرا در دھرے آگئے۔ جن پر مجھے ذرا امت ہے۔ مجھے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں۔ مجھے اپنا بیان جاری رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح میں اپنی افسانہ کا تجربہ کر سکتی ہوں گی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میری رومانی ذہنیت اور شہادت کی شعلہ روانیوں کی واحد ذمہ دار میری تعلیم اور میرا حوالہ ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ سترہ برس کی عمر میں میرے والدین نے "شادی کے بار بار" میں مجھے ایک انمول سونے کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر۔ جلسوں میں۔ ادھر ادھر، بڑی بوڑھیوں کی لاپٹی نظریں مجھ پر پڑنے لگیں۔ اپنے ہونا بار اقبالند صاحبزادوں کے لئے، انہیں ایک معقول دہن کی تلاش تھی، ادھر میرے والدین بچاؤ سے قریب سے گزرتے تھے، ان کو ضرورت تھی ایک ایسے مالدار شخص کی جس کی غایت سے ان کے تمام دلدرد دور ہو جائیں۔۔۔ ان حالات میں مجھے بہت جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ میرا ختمیہ سودا ہونے والا ہے۔۔۔ محبت کے خیال ہی سے محبت کرنے والی دو شہزادوں کے لئے یہ خیال سو اپنا روح ہو گیا۔۔۔ اپنے خیالی جنم کے انتظار میں زبان بے چینی محسوس کرنے لگی۔۔۔ اس عرصے میں میرے میسوں نوٹ لکھنے اور جگہ جگہ بھیجے گئے۔ بعض حلقوں میں میری قیمت کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی تھیں بعض خریداروں کے لئے میری مقررہ قیمت و حوصلہ ممکن ثابت ہوئی۔ اسی اثناء میں میری ملاقات میری سوچو وہ ہمسائی سے ہوئی۔ وہ نیکی کا مجسمہ، اخلاق کی تپتی اور محبت کی دیوہی تھی۔ اس نے مجھے چند عمدہ کتابیں پڑھنے کو دیں، جن سے میں نے اپنے خیالات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔۔۔ اس وقت جبکہ میں لپ گوتھ میں ہوں میری نیک ہمسائی اپنے گھر میں بغرافت و کجسب گھریلو کاموں میں مصروف ہوئی۔ میں چاہوں تو اپنی مدد کے لئے آئے بلا سکتی ہوں۔ وہ دوڑی دوڑی آئے گی اور نہایت کمرے تعاضد؟ مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کے سوسو جن کو کہے گی۔ مجھ سے لپٹ جائے گی۔ نہر کی پیشانی جو میرے قریب رکھی ہے اسے توڑ پھینٹے گی۔ مجھے چڑھ کر اپنے گھر لے جائیگی۔ ایک عجیب خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا۔۔۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے آہستہ سے بٹائی ہوں۔ شاید وہ سُن لے اور آجائے اور پھر شاید میرا وہ بدل جائے۔۔۔ قسمت شاید دوسرا ماستر اختیار کر لے۔ شاید!!

میں نے اس کا نام لیکر پکارا۔ آہستہ سے تین مرتبہ۔ اس نے نہیں سنا۔ وہ نہیں آئے گی۔ آج خدا سے اپنا فرشتہ رحمت نہیں بنائے گا۔۔۔ میرے دل کے زخموں کی کیا خبر۔ اگر وہ میری اصلی سرشت جان لے تو کچھ؟ کس قدر نفرت کرنے لگے۔ خیر،

اب وہ زمانہ آیا جبکہ میرا خیالی محبوب جس کی جستش کرتا میرا واحد مقصد تھا تسلیم کی شکل میں نمودار ہوا۔ ایک دشتیا مسترت نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔۔۔ میرے دماغ پر کبھی ادھونئی طاری ہو گئی۔ میرے خواب میں کیسے خوش آمد شعلے بھڑک اٹھے!

زہر کی شیشی میرے قریب رکھی ہے۔ میں نے اچھپے سے اُکی طرف دیکھا۔ مجھے اس نئی سی شیشی سے کس قدر اُنسیت معلوم ہوتی ہے۔ سفید جیسے موتی۔ ایک چوڑی بھر بھی نہیں۔ بھر بھی یہ بوند بھر پانی مجھے موت کے تاریک بلبلے میں بہہ نہ سکا اور دنیا کی تمام رنگ رنگ مفلحوں سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دینگا۔ اس نئی سی شیشی کو کتنی عظیم الشان خدمات انجام دینی ہیں۔ میرے جسم میں حلیف سا ارتعاش ہے۔ جو خوف و ہراس کے سبب نہیں بلکہ اعصاب کی کمزوری کے سبب اس وقت مجھے پریشان کر رہا ہے۔ موت کے قریب کی وجہ سے گوشت پوست اعصاب خود بخود لرز رہے ہیں۔ اُن زندگی تیری محبت اُنکو کتنی عزیز ہے!!

اب میں بالکل تیار ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ اپنے اس اقدام پر میں تاویلیں اور خواہ خواہ کے عذرات تراشنا نہیں پاتا ہوں۔ میں جیسی سپیدانی اور میرے ماحول نے جیسا مجھے بنا دیا ویسی ہی ہوں۔ مغرور، مسکراں اور باغی۔ خود پسند، جذباتی۔ اُسے جس کو میں پھانسی ہوں حاصل کرنے میں مجھے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی، چاہے اس میں مجھے اپنے شوہر کے ساتھ یہوصافی کرنی پڑے۔ شوہر کے ساتھ وہاں میرے نزدیک اجتماعِ ضدین ہے۔ اگر میں بری ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ آنکھ کھول کر میں نے دنیا میں دیکھا کہ سب اسی طرح کرتے ہیں۔ صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ میں نے ذرا ضد سے کام لیا اور دوسرے خوشامد اور چاہا پوسی سے کام نہ لیتے ہیں۔ میں صاف صاف کہہ سکتی ہوں کہ میرے تمام افعال کی ذمہ دار وہ ستمنا ہے جس میں میں کی پڑی اور ملک کے وہ مایہ ناز فلسفی ہیں جن کی تصانیف پر میں ایمان لاتی۔ میری شادی ہونی بالکل اسی طرح جیسے میرے طبقہ کی ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے۔ یعنی روپیہ سے۔ میں نے محبت کی بالکل اسی طرح جیسے میری قماش کی ہر لڑکی محبت کرتی ہے یعنی جہانی حسن سے۔ اور ان میں مرد ہی ہوں یا اسی جیسے میری فطرت اور میری ذہنیت کی ہر لڑکی مرگئی۔ قدرتی موت۔ سے یا میری طرح از خود۔!!

میں زہر پینے ہی والی تھی کہ سامنے والے آئینہ میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ میری ماں کا چہرہ تھا۔ اُن کے نورانی چہرے پر آنسو بہ رہے تھے۔ انہوں نے میرا نام لیکر بچارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ میرا دل زور سے دھڑکی اٹھا اور سر چلنے لگا۔ کچھ دیر تک میں کمری کے سہارے کھڑی رہی۔ پھر میں نے میز کی دراز میں سے بوڑھی کلون کی شیشی نکالی اور اپنا رومال اس خوشہ میں تر کر کے پیشانی اور کندھوں پر رکھا تاکہ طبیعت ذرا بجال ہو جائے۔ طبیعت بجل ہو جائے!!۔ اِس فقرے میں کتنی تڑپ ہے۔ قبر کے قریب پہنچ کر طبیعت کی بھائی کا خیال۔ کیا خوب!! اس عطری خوشبو کتنی عمدہ ہے۔ مجھے خوب یاد ہے یہ میں نے کہاں سے خریدی تھی۔ ہمارے شادی کی سی ہوتی تھی۔ نئی نویلی دلہن کے چاؤ میں میرے ستر راج بہادر نے شیشی شکل میں خریدوائی تھی جبکہ ہم ہاتھ میں ہاتھ دے مال پر نہیں رہے تھے۔ اس "سہانی" یاد پر میں ہنس پڑی ہوتی کی کسی چمک والے خوبصورت دانت آئینے میں نظر آئے۔ ابھی اچھی طرح دیکھنے کے لئے میں دوبارہ ہنس۔ اور اس سے میری آواز کتنی شیریں صاف، اور دلکش ہے۔ کاش ان ٹیٹس بیاہتا حق کی قدر کرنے والا کوئی ہوتا!!

تجلی سے کبھی زیادہ تکلیف دہ ہے جو میرے سینے میں پھر ہاں چلا رہی ہے۔ میری ماں اور مجھے قریب لگتی ہیں، اٹلا ٹھنڈا برف ہاتھ میں اپنے ماتھے پر محسوس کر رہی ہوں۔ میری پیاری ماں !!!

ہر طرف اندھیرا اب مجھے اپنا چہرہ بالکل نظر نہیں آتا۔ ایک دھندلا سا عکس معلوم ہوتا ہے اور میں — مجھے سانس دینا بھی دشوار ہے۔ سخت پیاس — میں اب کچھ بھی نہیں سکتی — آہ کوئی ہوتا جو مجھے دو گھونٹ پانی بلا سکتا۔ خدا — مجھے قوت دے کہ میں اس ظلم کو چننے اور بکڑے رہوں۔ لیکن نہیں میرا وقت آپہنچا — بہت کسا عجیب عجیب شکلیں میرے ارد گرد جمع ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ تاریکی — آگ — گرمی — پیاس — بے میرے مردہ ہاتھ صرف ایک کھنکھاتا سا آواز دے رہا ہے جس میں اپنے محبوب بے بسیم کو آخری سلام لکھنا چاہتی ہوں — ٹھیکہ دو — لوگ مجھے گھسیٹ رہے ہیں۔ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ کون ہے جو مجھے دھکیل رہا ہے۔ سب چیزیں ناہنجار رہی ہیں — آہ! پیاس — سکیم — پانی — آگ —

میں نے خط ختم کیا۔ اچانک دیوار پر مجھے کئی کاسیہ نظر آیا اور میں دہشت کے مارے بیہوش ہو گیا۔

مسٹر انصار ناصری ٹی تین کتاہین

حسن و عشق کی دردناک داستان چند راتے محبت کی اور اپنا سب کچھ اس کے چھینے کی دیار عزیز اقربا دوست جان مال و دولت خانہ دانی اعزاز سب کچھ اس نے اس لئے چھڑا کر ایک محبت بھرا دل اس کے لئے دھڑک رہا تھا۔ پھر عیش کا زمانہ آیا مگر چند راتے ہی بہت فحشہ تھا۔ اور مصائب نے ہجوم کیا۔ عشق کی ناکامیوں اور نامراد یوں نے محبت کی کہانی میں خون کا رنگ بھرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ————— قیمت ایک روپیہ (طہر)

نجم فوری تجر ایک محبت کرنے والی بیوی اور اپنے بچے پر جان چھڑکنے والی مانی تھی۔ مگر محبت نے اُسے جذبات کو اندھا کر دیا اور اس نے اپنے غضب کو ایک اوباش کی خاطر چھوڑ دیا۔ مگر اس کا رد عمل ہوا اور بہت خفنگ ہوا۔ بچے کی مانتے اُس کا سکون خاطر غارت کر دیا۔ اپنا غم بھلا کر دیکھو وہ دنیا کی آلائشوں میں بہتی رہی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے عاشق کو مار ڈالا۔ گناہ اور موت کی یہ لہر نہ خیر تمہیں آپ کے رونے بھرنے کو دیگی۔ قیمت ۱۲۔

مسلمی اسکے داماد کے ڈر سے سالوئی کا ترجمہ سلی کا نام ایسا بچان اٹھ نہ تھا کہ اس نے اپنے سوتیلے باپ حاکم صوبہ کو بخود کو دیا اور انعام میں یو تھان پیغمبر کا سر لٹکا حاکم قول ہار چکا تھا۔ اس نے پیغمبر کا سر کاٹ کر سلی کو دیا دیا گیا۔ سلی نے اس کے لہو سے سر کے گرد بھوں کو دیو اور دار جو منہ شروع کیا اور حاکم کے حکم سے سلی کو خود مار ڈالا گیا۔ ناصر صاحب کے ترجمے میں اصل کی سب خوبیاں متقل جوئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔

خیر کا پتہ۔ سالی باک یو۔ واصل ہو

نے لکھا ہے۔ ساقی بکثرت پیر و صلیبی ہو

افرو داتی کا ایک باب۔

استقبال

ناموں کے منوئی، اعتبار سے منتخب گئے تھے۔ پہلی سب کے ذمے دن کی خدمات تھیں۔ اور سلیس کے ذمے رات کی۔ اسی طرح دروازے کی حفاظت، افرو داتی کے بہتر شہرت کی گنجائش۔ ہر چہ خیر و فخر کی محاسبہ، اگر دیکھا دار و غریب۔ اور سب سے آخری دایو سیدی ہاتھ مخصوص تھی جو روم کے چھ خیر اور اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی پر مامور تھی۔

افرو داتی کے عزیز اہل خانہ تھے۔ کیونکہ وہ سب زیادہ حسین اور لائق محبت تھے۔ اکثر وہ اپنی والدہ کے ساتھ تاش میں گور جھانے میں شریک کار رہتی تھی۔ اسی لئے وہ اونی قوم کے محنت کاموں میں شہتہ تھی تاکہ اُس کے نزدیک وہ حسین اور ہاتھ دار و غریب رہ سکیں۔ اسی استثناء کے ماتحت وہ اپنے بالوں کو بھی فیستور رکھ سکتی تھی۔ اسی لئے اکثر لوگ اُسے ایک آزاد عورت تصور کرتے تھے۔ اور اس مخصوص کام کو وہ پینتیس برس کی کثیر رقم کے عوض بالکل آزاد ہوئی ہوئی تھی۔

باقی کی ساتوں کنیزیں اس درجہ خوشبودار اور لائق تحسین حد تک شائستہ تھیں کہ وہ ان کو بہت زیادہ فخر داتا کرتی تھی۔ اور کبھی ایسے نہیں ہوئے کہ وہ ان کو ہزارہے بغیر باہر لے جی۔ حالانکہ مکان کو باہر سے کچھ چور دینا خطرناک تھا۔ اسی کی اسی نا امانیت اور لاشی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ اندر داخل ہوئے گا یا سانی مورچیل لگا تھا۔ تاہم وہ اس دعوت انتقاد تک جس میں فراغ نفس بھی دعوئی تھی گور داتی تقدیر کی حقیقت سے لاعلم تھی۔

اسی شام فراغ نفس سب پہلے وار د ہوئی۔

وہ سرنگ کی بوتھاں میں بیوی تھی جس کے ماضی پر

باقی کو شاہ بازار کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہوئے پچیس سال گزر چکے تھے۔ یاوں بچنا چاہتے کہ اُس کی عمر چالیس سال کے گپ جگ تھی اور اس اثنا میں اُس کے حسن کی رعنائیاں بھی باورنگ بدلتی تھیں۔

اسکی ماں نے جو عرصہ دما ز تک اُس کے مکان کی منتظر اور تعمیر حیات کے ضمن میں بطور شہر کار رہی تھی، اس کو حسن اخلاق اور کفایت شعاری کے وہ زبیں اصول بھادے تھے جن پر عمل پیرا ہونے سے زندگی کا کافی سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ لہذا اب وہ اپنے ذاتی تقدر گداری و فساد طبی کی تسکین دولت کے ذریعہ یا سانی مورچیل بھی جیکہ باقی کے عمر اُس کا حسن ظاہری و درون خطاط کی تمام منزلیں طے کر چکا تھا۔

زیر کثیر کے عوض نوجوان کنیزوں کو بازار سے خریدنا ایک ایسا اصرار تھا جسے دوسری بازاری عورتیں ضروری سمجھتی تھیں اور اکثر تباہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس باقی نے کمال دقت پر ایک صحت ایک صحت کو اپنے لئے کافی سمجھا۔ اور آئندہ کے لئے بغیر کسی خرید و فروخت کے پورا ایک کتبہ بھی چھوڑ دیا جو اس کے لئے باعث شہرت ثابت ہونے کے لائق تھا۔

دس سال کے عرصے میں اُس کی کنیز کے لبوں سے سات خوبصورت مخلوط النسل لڑکیاں پیدا ہوئیں اور تین لڑکے بھی جن کو فرائض چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ یہی نظام جوان ہو کر گوارا و محبت میں رقیب و رسیا و ثابت رہنے لگتے ہیں۔ اُس نے ساتوں لڑکیوں کے نام سات ساتوں کو موسوم کئے تھے۔ اور ان کے پیٹے جدا گانہ طور پر چھانک لیکن جو سگانے

لے سورج و یوتا مصر کے عہد قدیم میں نیل کے واسطے ہراس نام کا شہر اور ایک عظیم الشان پہاڑ تھا۔ بلکہ چاند کی دیوی۔ اصل لفظ سلیسی ہے۔ جگہ غالباً مزین سے مطلب ہے جو جگہ کا دیوتا تھا یا نا۔ لیکن اس نے بھی اصل لفظ آؤس ہے۔ لہذا شہوت پرستی کی دیوی۔ افرو داتی سے متعلق ہے۔
یونانی صنایع میں تجارت کے دیوتا کو ہرمیس کہتے ہیں۔ اسی سے ہرمیون بنایا۔ جگہ زحل۔ یونانی صنایع میں اصل لفظ کروٹوس ہے۔ اسی سے بنا لیا گیا ہے۔ جگہ ان ستاروں میں سے جو زحل کے گرد گھومتے ہیں ایک کا نام دایوس ہے۔ اسی سے دایوسیدی بنایا گیا ہے۔ دراصل یہ ساتوں لفظ مصنف نے زہر دہی شق کئے ہیں۔

سونے کی تلوار

کل پھر ہاتھ صحن چین میں کٹاں کٹاں اپنی ادھیر زوجہ کے ہمراہ اک جواں
شوہر کی بے وسیلہ جوانی پر الاماں بیوی کے مالدار بڑھاپے کی سختیاں

بے مال و زرت بباب کا تھا شیب پر مدار ان بھڑکیوں کی راہ پر چاندنی کے تحفے قدم
تھیں بھڑکیاں جو زوجہ کے چہرے پر بین کم سو باہو اتھاسا زوجہ جوانی کا زیور و ہم
شوہر کے عارضوں میں باغ فراہ و غم گاتی ہوئی فزائیں تھی بس سستی ہوئی بہار

پانی کی ایک بوند سے مہربان تھا شہر حیران شکوہ قطرہ شبنم سے تھا گھر
چھلے کے طہرات سے لہ زائیں تھا میشر ذرے پر آفتاب جھکانے ہوئے تھا سہر
کمزور یوں کو زور پہ حاصل تھا اقتدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی رنج بوستان سرشار ہو چلی تھی زمیں پست آسمان
زوجہ کے ساتھ ساتھ تھا شوہر رواں دال اک موڑ پر مڑے ہی تھے دونوں کرانچال
گزری ادھر سے ہو کے اک آئینہ رو نگار

اس طرح جیسے ناز کوئی ڈالتی ہوئی ابرو کے بل سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
تلوار سی ہر ایک پچک تو تھی ہوئی گاتی ہوئی ادائیں، نظر بولتی ہوئی
زنگیوں کے پچ و خم میں سے موج آہٹار

شوہر کی اٹھ کے خم گئی اس شوخ پر نگاہ ہلکوں نے سب کیاں ہی بھر لی نظر آہ
جی بھاؤ زوجہ میں شہر اشتباہ پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پستاہ
آفت کی کلکشن تھی، قیامت کا غلفشار

رحمت سے اس جیسے گنہگار توڑ دے کوئی بہک کے ساغر سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے
شوہر نے یوں جھگائی نظر ہو کے شرمسار

اتنا ڈراغیب کہ تپنے لگا جگر بیگانہ دار آنکھ اٹھائی ادھر ادھر
گرم دن ہلائی بیوی نے غصے سے دھکڑ یعنی متابع زوجہ نے شوہر کے حلق پر
سونے کی بڑھ کے پھیر دی شمشیر آبادار

جوشِ سماج آبادی

فیصلہ

بہنی کی گھرائی اور مزہنی بیچ بیکار کے ہنگامہ میں شمالی ہند کے دو چار اردو دواں ذواؤں کا کسی موقع پر اکٹھا ہونا ایک دلچسپ حادثہ ہوتا ہے۔ باقاعدہ تعارف کی رسم بھی ضروری ہو جاتی ہے اور بے تعلقت گفتگو فوراً چھڑ جاتی ہے۔ کل شام کا دوا خیر ہے کہ ہم تین دوست درنی کے مقام پر ہمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے گپ کر رہے تھے مسئلہ زیر بحث "محبت" تھا۔ میں حسبِ معمول حق کو ایک دماغی بیماری کو تشبیہ دے رہا تھا۔ مجھے مابشوش ہے ایسی ہی ہمدردی ہے جیسی ہاگس خانہ کے رہنے والوں سے اور گو ممکن ہے کہ میں بھی کبھی اس مرض کا شکار ہوں (جیسے کہ یہ ممکن ہے کہ مجھے توبہ ہو جائے یا میں پاگل ہو جاؤں) میرا یہ عقیدہ کہ عشق دماغی خرابی کی علامت ہے کسی کمرور نہ ہوگا جیسے اس نظریہ کی تردید میں سے شاعر دوست سید کمالی کر رہو۔ جو عشق کو زندگی کے خواب کی تعبیر اور کائنات کے نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اور موتی لال (جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے) مجھے پریم کی اہمیت اور پریم کے رہسوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب وہ کسی کے عشق میں غرق ہو جاتا ہے۔ محرومہ کمالی کے شاعرانہ شکل کو مجھنے سے قاصر تھا۔ موتی لال شادی کو بہت کی حواج سمجھتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق تاؤنا مہیاں بیوی کا رشتہ قائم ہونے بغیر اس کی محبت مکمل نہیں ہو سکتی۔ کمالی کو ضرور سے موتی لال کی مخالفت کر رہے تھے۔ غالب اور اقبال، عمر خیام اور نظامی، کیش اور سیکلے کے اشار اپنے نظریہ کی ثبوت میں پیش کر رہے تھے۔ "محبت کڈے کڈے کا کھیل نہیں ہے۔ شادی بیاہ سماج کے بنانے ہوئے نہ ٹھکوتے ہیں اور عشق ان کی قید سے آزاد ہے۔ عشق کو سماجی رسم و راج کا باند بننا اور کویلیاں پینا نا ہے۔" کمالی پورے شاعرانہ جلال کے ساتھ اپنے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ مندر کی ہر س زرد شور سے ساحل سے غمراہی تھیں۔ دیکھو ہر س بھی میری تائید کر رہی ہیں۔ کمالی نے کہا۔ اسی وقت ایک غیر معمولی جسامت کی لہرائی آ رہی تھی زور سے ساحل کی دیوار سے محرمائی کر پانی کی ایک پوچھاڑے نہیں جھگڑا اور اپنا مقام چھوڑ کر ہم دوسری جگہ بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

ساحل تعریفاً سانس، قناد و چار موٹریں دور دور کھڑی تھیں جن میں شہر کے بیٹھ ہو گئے آئے تھے۔ ان کے علاوہ صرف ایک آدمی اور نظر آیا۔ وہ جاری طرف آ رہا تھا۔ شیر اور ادنیٰ کوئی دربار چاہا۔ ننگے سر، بال ہند کی کندھ سے پریشان۔ یہ تو کوئی اپنی طرف کا آدمی معلوم ہوتا ہوگا۔ موتی لال نے کہا۔ اور جب نودار دقت پر پہنچے گدڑ تو کمالی نے اس کو مدعاں کیجئے گا "بہر گھر آیا۔ کمالی کو بغیر جان پہچان ملاقات پر بھالے کا لکھ ہے۔ "آپ تو ہماری طرف کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ آگونی خاص جلدی نہ ہو تو تشریف رکھئے۔ یہ سیکر دوست موتی لال ہیں اور یہ" ہمارا اتفاق پورا کرتے ہی کمالی نے پوچھا۔ اور آپ کی تعریف؟ "نودار دے جو کوئی تیس برس کا نوجوان تھا اپنا نام جاد بتایا اور کہا کہ وہ بہنی کی سیر کی خاطر آیا تھا اس کی شکل صورت معمولی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب اندر دگی تھی گویا وہ دنیا کی ٹریڈی کی نہ کو پایا ہو۔ دوسرے لہجہ سے وہ معمولی حیثیت کا پڑھا لکھا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔

کمالی نے ہماری بحث کا خلاصہ حاد کوٹ نایا جواب بے تعلقی سے ہمارے ہمراہ میٹھا سگریٹ پلی رہا تھا۔ آپ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرمائیے۔

نودار دیک خشک اور کھجائی کی ہنسی ہنسا اور ساتھ ہی ایک کھنڈ کے لئے کچھ گہرا سا گیا گویا کسی نے اس کا کوئی اہم راز ہرے مجمع میں بیان کر دیا ہو مگر بہت جلدی اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور ایک نیا محو کش جلا کر کش لیتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تینوں صاحبان فطرت کہتے ہیں۔

ہم تینوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ تینوں مختلف عقیدے کس طرح جمع ہو سکتے تھے؟
 "اور شاید آپ سب فطرتی پریمی ہیں،" حاد نے مسند کی طرف نگاہ کو تے ہوئے کہا۔
 "آپ تو کوئی فطرتی فلسفہ معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کسی قدر طنز پر لبوس کہا۔ میرا خیال تھا کہ حاد ہم لوگوں سے مذاق کر رہا ہے۔

”صاف کیجئے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ یہ کچھ متعجب سا ہو گیا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ میں آپ سب سے آگاہی بھی کرتا ہوں اور اختلاف بھی مثلاً آپ کا کہنا صحیح ہے کہ محبت ایک دماغی بیماری ہے۔ مگر ایسی بیماری جس سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ میں بھی مانتا ہوں کہ شاعروں نے محبت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ دنیا کی شاعری نے محبت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انسانی و جسمانی اور سماجی حقیقتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ مگر آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ کسی مرض کا بہترین علاج اس کی بھوکنا ہے۔ محبت کے موجودہ نظریہ کی ذمہ داری ہمارے سماجی حالات پر ہے جس سماج میں ہزاروں سے ایک شادی بھی فریقین کی مرضی سے نہ ہوتی ہو۔ اور جہاں شہری عورتوں کی ایک بڑی تعداد پر دس میں دو بچی ہو۔ وہاں شاعر اگر خیالی مشقوں سے محبت نہ کریں تو اور کس سے کریں اور آپ؟ اس نے کہا۔ اس سے مخاطب ہو کر کہا: ”آپ پر کہتے ہیں کہ محبت کو شادی بیاہ کی قید سے آزاد ہونا چاہئے۔ اور میرا نظریہ تو یہ ہے کہ انسانی ارتقاء کی مکمل ترین منزل میں ہم سب قسم کے قوانین سے آزاد ہوں گے۔ مگر موجودہ سماجی حالات میں موتی لال صاحب کا خیال صحیح ہے کہ شادی ہی محبت کو اصلیت کے معنی میں ناسستی ہے۔ ایسے ایک میں جہاں ان کے والدین اپنی اولاد کو ان کی مرضی کے خلاف شادیوں میں بھوک دیتے ہیں آزاد محبت کے خواب دیکھنا بیکاری کا شغل نہیں تو کیا ہے؟ جتنی محبت پر یکبارہ خیالی محبت کرنے کے بجائے اگر آپ ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی پسند پر شادی کرنے کا حق دلانے کے لئے جہاد کریں تو ہزاروں زندگیاں برباد ہوں گی۔“

اب ہمیں حاکم کی گفتگو میں دلچسپی ہو چکی تھی۔ میں نے کہا: ”آپ بات تو بہت معقول کہہ رہے ہیں۔ اور شاید آپ اس نتیجہ پر اپنے ذاتی تجربہ سے پہنچے ہیں۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو کیا آپ ہمیں بھی اپنے راز میں شریک کر سکتے ہیں؟“

حاکم کے چہرے پر دھڑک بھر اٹ کے آثار پائے گئے۔ ”گویا باتوں باتوں میں کسی نے اس کے پوشیدہ دلی جذبات پر سے پردہ ہٹا دیا ہو“۔ ”جی نہیں“ اس نے اپنی گھبراہٹ کو دور کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے تو عشق و محبت کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ البتہ میرے ایک عزیز دوست پر چند واقعات ایسے غمزدہ ہیں جو شاید اس مسئلے پر روشنی ڈال سکیں۔ کیونکہ تقریباً وہی واقعات ہر متوسط درجے کے ہندوستانی مسلمان گھر میں پیش آتے رہتے ہیں۔ اور شاید کسی حد تک یہی صورت حال ہندو گھر میں بھی عام ہے۔“

ہمارے استاد پر حاکم نے اپنے دوست کا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ اس کو بھٹ بولنے کی عادت نہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ ہم فوراً ہی ہمسہ گئے کہ چنانچہ رز دوست وہ خود ہے۔

”میرا دوست (حاکم نے بیان کیا) جو اتفاق سے میرا ہم نام ہی تھا دہلی کے ایک شریف گھر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرحوم والد بچپن میں تحصیل لڑ رہے تھے اور رشوت لینے میں بھی بخل نہ کیا تھا۔ کالی خانہ آدھوڑی تھی جس کی آمدنی سے حاکم اور اس کی ماں قانع اہالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے باپ اپنے زمانہ کے حاکم سے خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ اور چونکہ سرکاری نمک گھیا پتھاس نے اپنے دکانے کو بھی انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلوای تاکہ کوئی اچھی سرکاری نوکری مل سکے۔ غرض حاکم مشن کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک سویتہ اولاد داغ اور عروس کرنے والا دل لے کر آیا تھا۔ تمام تعلیم، فلسفہ، معاشیات اور لالچ کی تعلیم نے اس کے خیالات میں فحاش اور بے رحمی پیدا کر دی تھی۔ وہ فحش ناموش پسند اور بے رحم نوجوان تھا۔ کالج کے دوستوں کو اس کی جنسی دلچسپیوں سے دور رہنا تھا۔ اس کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جہاں پر دس تھوڑے سے کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں غالباً سرشت نہ کی۔ جن میں بھی باجی جاتی تھیں تو بڑے پستے پر بھی تانچے پر چادر بندھوا جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اور تجربہ نے پڑھ کے نقصانات کو ہمسرہ پر واضح کر دیا تھا۔ لیکن بچپن سے ماں باپ کی اطاعت کا ایسا سبق پڑھا گیا تھا کہ کبھی یہ بہت نہ پڑتی تھی کہ اپنے خیالات کا اظہار خود اپنے گھر میں کر سکے غرض وہ ایسی دنیا میں رہتا تھا جہاں غیر عورتوں کا جن میں وہ رومانی دلچسپی سے کئے نام بھی نہ تھا۔ اس کی کلاس میں دو چار لڑکیاں پڑھتی تھیں لیکن ان کی بات کرنا اس کو کبھی بہت نہ ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ سوائے سینما کے روپ کی پردے اور بازار یا شہر پر کسی بے پردہ عورت کی ایک جھلک دیکھ لینے کے وہ دوسری صفات سے بالکل نا آشنا تھا۔“

پہلی روکی جس سے اس کی ملاقات ہوئی لعلیت تھی۔ وہ اس کے کالج کے ایک آزاد خیال پروفیسر عبدالرحیم کی اکلوتی لڑکی تھی اور ایف ایل میں بہت تعلیم حاصل کرتی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم انگریزی ادب پڑھاتے تھے اور چونکہ حاکم اپنے کلاس میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا اس میں کافی دلچسپی لینے لگے۔

اس دلچسپی کی ایک وجہ اور یہی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم اس قسم کے آزاد خیال "لوگوں میں سے تھے جو اپنی بیویوں کو اس لئے پردہ سے باہر نکالتے ہیں تاکہ ان کی آؤشیں اہل سوسائٹی میں کھل سکیں اور بیٹیوں کو اس لئے پردہ نہیں کراتے تاکہ کسی آئی۔سی۔ ایس سے شادی ہو جائے۔ پردہ توڑنے کے سماجی اور انسانی فوائد ان کے پیش نظر نہ تھے۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ان کی بیوی ان کے ہمراہ کلب جاکے اور ان کی بیٹی کی شادی کسی آئی۔سی۔ایس یا کسی قسم کے کسی دوسرے اعلیٰ سرکاری عہدہ دار سے ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حاکم میں ٹیپی ہوتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ وہ بی۔ایس کے لئے کرنے کے بعد آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں ضرور شامل ہوگا۔ اور قوی امید تھی کہ کامیاب بھی ضرور ہو جائیگا۔ یہی سوچ کر انھوں نے ایک دن حاکم کو اپنے اہل چاہ پڑایا۔ پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو وہ بھی تیار نہ ہوئے تھے۔ بلقیث نے ہمان کا استقبال کیا۔ یہ حادثہ کے لئے بہلا سونے تھا کہ اس نے کسی لڑکی سے دوبارہ بات کی ہو۔ اس لئے وہ قدرتی طور پر گھبراہٹا تھا۔ مگر بلقیث نے جو اٹھارہ برس کی عمر میں نہایت تیز اور ہوشیار تھی اس کو بہت جلد باتوں میں لگا لیا۔ گفتگو کے دوران میں نظر چاکر حاکم بلقیث کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی مشابہہ نہ تھا۔ بلکہ انہیں اور گلزار کی دھڑکی میں کوئی مماثلت ہی نہ تھی۔ اس کے سیاہ گھونگرے بال اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں بلقیث کی خصوصیات تھیں۔ ان آنکھوں میں حادثہ کے لئے خاص کوئی تھی۔ اس نے اپنی خوب صورت آنکھیں فقط ایک مہرہ شکار میں ایک ہرن کی دلچسپی میں۔ جب تک بلقیث اس سے باتیں کرتی رہی اور اس کے بعد جب پروفیسر اور ان کی کوٹھی میں شامل ہو گئے حاکم کی نگاہیں بار بار بلقیث کی طرف اٹھتی رہیں۔ جب حاکم اور پروفیسر عبدالرحیم نے ایک ادنیٰ مسئلہ پر بحث چھیڑ دی تو بلقیث کی والدہ جن کی علمی قابلیت و حاجی بی و حاجی امی اٹھ کو مہل نہیں لیکن وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ گفتگو کے دوران میں حاکم نے اس کی طرف نگاہ کی تو اس انداز میں وہ اور یہی مہل معلوم ہوئی۔ اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں پر سہارا دے خاموش بیٹھی تھی۔ حاکم کو فوراً خیال ہوا کہ اس طرح وہ ایک موتیا کی گلی سے کس قدر مشابہ تھی۔ چارپینے کے بعد جب حاکم رخصت ہوا تو بلقیث نے امید ظاہر کی کہ وہ آئندہ وہی کسی بھی ملتا رہے گا۔

اس رات کو جب معمول جب حاکم کتابیں لیکر پڑھنے بیٹھا تو اس کے دماغ میں شام کی یاد تازہ تھی۔ بار بار کتاب کے صفحے پر الفاظ سمٹ کر دوہراں جیسی خوبصورت آنکھیں بن جاتے اور پھر وہی الفاظ پھیل کر ایک سکرانا ہوا معصوم چہرہ بن جاتے جو موتیا کی گلی سے مشابہ تھا۔ اس رات حاکم کی پڑھائی نہ ہو سکی۔

بلقیث سے اس ملاقات نے حادثہ کی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی تنہائی اور اندھیرے میں کسی رفیق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ جتنے لڑکے اس کے دوست تھے ان کی جگہ میں جس کو اب دشت ہوئے تھے۔ وہ بھٹسے اور بھونڈے مذاق کرتے۔ اس کی قدرتی جھینپ اور سلوہ لومی پر بستے اور حاضری مسائل پر اس کے سنجیدہ حیرات کو حاضرت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک طالب علمی زندگی کا مقصد نہ کرنا کیلنا، اپنے کپڑے پہننا اور دنیا کی ہر لڑکی کے متعلق ناشائستہ انداز میں، بے زنی کرنا تھا۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حاکم کی آمد و رفت پروفیسر عبدالرحیم کے پاس ہے تو انھوں نے اس کے اور بلقیث کے متعلق بھی بہت مذاق کو شروع کیا جو حاکم کو سخت ناگوار لگتا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس مذاق کی نہ میں حصہ ہے بلقیث ان لوگوں کی بجائے حاکم جیسے سیدے اور گہرے شخص میں کیوں دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان لوگوں کی پھر چھاڑنے اس کو دل میں اپنے اور بلقیث کے تعلقات کی جانچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلقیث سے ملنے اس کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں ان کو ایک دوسرے میں کافی دلچسپی ہو چکی تھی۔ مگر بلقیث کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ ان میں سے کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ برخلاف اس کے وہ حاکم کا خاص خیال رکھتی۔ حاکم کو یہاں یہاں سے ملاقاتیں سے خاص شغف تھا۔ اس کی خاطر بلقیث نے بھی جواب تک کالج کی دوسری لڑکیوں کی طرح علمی ریاست سے نااہل تھی ان مسائل میں دلچسپی لیتی ضرور کی۔ حاکم کے مشورے سے سفیدہ لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اور دل ہی دل میں حاکم کی شکر گزاشت کی کہ اس نے ایسی زبردست اور دلچسپ دنیا کا دروازہ اس کے لئے کھول دیا۔

حاکم کے دل میں بھی بلقیث کی شخصیت آہستہ آہستہ گہر کر رہی تھی۔ گو اگر اس سے کوئی کہتا کہ اس کو بلقیث سے محبت ہے تو وہ فوراً اس کی تردید کر دیتا لیکن یہ واقعہ تھا کہ اس سے ملنے کی خاطر وہ دنیا کے بڑے سے بڑے کام کو ہٹو کر دیتا۔ وہ بلقیث سے اپنے مستقبل کے متعلق گفتگو کرتا۔ اپنی امیدیں، ارادے اور انگلیں سنا اور جس عہدہ کی اور دلچسپی کے ساتھ بلقیث اس کی باتیں سن کر اس کو کہیں اور نہ نصیب ہو سکتی تھیں۔ بلقیث اس کو بلقیث سے محبت تھی؟ یہ وہ سوال تھا کہ اکثر اس کو پریشان کرنا تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ایک دوسرے کو

معاملات میں دیکھی جیتے تھے۔ حادثہ طیس وڑنا منٹ جیتا تو بلقیس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور بلقیس امتحان میں اول آئی تو عائد نے محسوس کیا کہ گویا یہ خود اس کی کامیابی تھی۔ کیا اسی کا نام محبت ہے؟ اس کا عائد فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ عشق کے عالم بنی جنوں والے مہم کا خاکہ نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگر بلقیس کو اس کو ملنے کی مخالفت کر دی گئی تو قیس بخدا کی طرف تار مارا نہ پھرے گا۔ مگر پھر بھی اگر بلقیس سے اس نے اس کو ایک ہفتہ بوجا مانا تو وہ بھوکھا بھوکھا رہتا۔ کسی بھی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیا وہ بھی بلقیس سے شادی کر کے اس کو تمام عمر کے لئے اپنی رفیق بنائے گا۔ مگر اپنے خاندانی حالات اس کی نظر کے سامنے تھے اور یہ بتانا مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گھر والے ایک بے پردہ لڑکی کو بوجا بنائے پورا جتنی بوجائیں۔ اسی الجھن میں وہ دل کو یوں بھی بھسا کہ شاید بلقیس کے دل میں اس کے لئے دوستی کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ ہی نہیں ہے۔ اور آخر اس میں ایسی کوئی خوبی تھی جس کے لئے بلقیس اس سے محبت کرے؟ ایسی حالت میں اس سے شادی کر لینا خیال ہی دل میں لانا بیکار تھا۔

”اسی زمانہ میں ایک اب واقعہ ہوا جس نے عائد کے دلی سوالات کا جواب دیدیا۔ مگر ساتھ ہی اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ہوا یہ کہ عائد نے اپنی بی بیں بھابھا کو سارے راز کا۔ لاپرواہی کی بدولت طیس یا ٹیٹھا نے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ہفتہ تک کراچی ہی جاسکا کہ عائد نے بلقیس ہی سے مل سکا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ پردہ لکھ کر بھیج دے۔ مگر اس کے خوف سے خاموش رہا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی ماں بے پردہ لڑکیوں کے خلاف ہے۔ اور اگر اس کو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے دوستی بلقیس کے ساتھ ہے تو وہ اندھنہ ہوگی اور ممکن ہے کہ اسے ملاقات کو حکمتاً بند کر دے۔ اس معاملہ میں عائد اپنی ماں سے بحث نہ کر سکا تھا۔ صدیوں سے اس کی خاندان کی عورتوں کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ پردہ مذہب اور ایمان کا جزو ہے اور شرف ان کی نشانی ہے۔ وہ ایک بار اس نے اپنی ذہنی زبان سے پردہ کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر پھر دھڑا اس کی ماں نے اس سے سختی کے ساتھ ڈانٹا کہ اب بہت بڑی لڑکی تھی کہ بچے پر دلی کی حریت میں ایک نظم بھی زبان سے نکال سکے۔ جب اس کو سنا کہ آئے آئندہ نہ ہوئے اور بلقیس کراچی میں معلوم ہوا کہ وہ بیابا ہے تو اس سے نہ رہا گیا اور اپنے باپ سے اجازت لے کر عائد کو دیکھنے اس کے گھر پہنچی بلقیس کو آتے دیکھ کر عائد حیران رہ گیا۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ لوگوں کے کہنے سننے کی پردہ کئے بغیر اس سے ملنے کی خاطر اس طرح تہ تیہا پہنچی تھی اس دن اس کا بھابھا تھا۔ اپنی صحت کا یقین دلا کہ اس نے بلقیس کو جلد ہی ہی خدمت کر دیا لیکن اس وقت پہلی بار اس کو معلوم ہوا کہ اس کو بلقیس سے اور بلقیس کو اس سے محبت ہے۔

بلقیس گھسے گھسی بی بی تھی کہ گھر کی مالاکا تو نے عائد کی اماں سے ہنس کر کہا۔

”لو ہو قادی گھر دیکھ گئی۔ مبارک ہو۔“

اس کا یہ کہانی تھا کہ عائد کی اماں (جس کا نام دوسرے کہے میں بی بی تھی گویا ایک بے پردہ لڑکی کی شکل دیکھنا ہی ان کو ناگوار تھا) اس پر برس پڑیں۔ ”خبردار جو ایسی بات سننے لگا کی ہو۔ نوج یہ خرچ میری ہوئے۔ نہ عائد نہ خرم۔ میرے گھر میں ایسی لڑکیوں کا گھرنہ ہوگا۔“

عائد کو بچہ اندازہ ہوا کہ باوجود اپنی اہم تمام فوجوں کے اس کی ماں پردے کے معاملہ میں کس قدر متعصب ہے۔ یہ اس کو کہنے سے معلوم تھا کہ وہ پردے کی سخت حامی ہے اور بے پردگی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے اس نے بلقیس سے اپنی دوستی کو گھروں سے چھایا یا تھا۔ اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس کا تعصب اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ ایک شریف اور معصوم لڑکی کی مخالفت تھا اس بنا پر جو جتنی کہ وہ متوسط درجے کے عروج کے مطابق بڑھ رہی تھیں۔ یہ تو انتہائی بے انصافی اور مزاح تھا۔ عائد کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت ماں سے بحث کرے۔ اس کو حال کر کہ پردہ مذہب کا جزو ہے و عصمت کا محافظ بلکہ ایک بیکار و درج ہے جس کی یہ دولت لاکھوں عورتیں دیتی، اختلاص قلب اور دوسرے مہلک امراض میں مبتلا ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ بلقیس کی فوجیوں، اس کو خاندان اس کی انسانی سہمدی، اس کے ایتنا، اس کی اخلاقی حرارت کا ذکر کرے اور اپنی ماں کو اس لڑکی کی حرمت کرنے پر مجبور کرے۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بیکار بات ہوگا۔ اس کی ماں اپنی عمر کے لحاظ سے ابھی فاضل تعلیم یافتہ تھی۔ عقل مند اور دانا تھا تو جتنی تمام محلہ والوں سے اس کا برتاؤ ایسا تھا کہ سب اس کی حرمت کرتے تھے۔ غریبوں کی پرورش اور ضرورت مندوں کی امداد کے لئے وہ کبھی مدینہ نہ نکرتی تھی۔ ہر ایک سے خفا و غم کی جھڑپ لڑتی تھی۔ ہمدردی، محنت، ہمدردی جس طرح بھی ممکن ہوتا دوسرے کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتی۔ اس کی زبان سے کسی کے لئے کچھ اچھ کوئی برا لفظ نہ نکلتا۔ لیکن تنگ نظر نہ تھی تعلیم اور عداوت کی غلطی نے اس کو اور اس قسم کی دوسری عورتوں کو پردے کے معاملہ میں اول درجہ کا متعصب بنا دیا تھا۔

ان کی حالت اس پہنی تیزی کی مانند تھی جس کو چالیس سال تک اندھیری کوٹھری میں قید رکھنے کے بعد جب ہلکیا گیا تو سرورج کی روشنی سے اس کی آنکھیں اس قدر کھل چکی تھیں کہ اس نے گڑگڑا کر درخواست کی کہ اس کو کچھ اسی اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ اس کو اپنی ماں کے خلاف کوئی غصہ نہ تھا۔ لیکن قیدی پر کیا غصہ کیا جاسکتا ہے جو اپنی بیڑیوں اور بنگلوں سے محبت کرے۔ امدان کو اپنے لئے باعث آسائش سمجھے۔ لیکن حامد کے دل میں بے پناہ غصہ تھا اس رواج اور ان رسوم کے خلاف جو اس چہالت اور اس ظلم کے لئے ذمہ دار تھیں۔ گھنٹوں وہ بیٹھا سوچتا کہ کس طرح اس کا ملک اس پر حق کی لعنت سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چرچ اس نے اپنے اہل حق کے آئندہ تعلقات کے مسئلہ پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوا کہ وہ اپنی ماں کا لاش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ضعیف تھی، بیمار تھی اور اس کو اپنے لڑکے سے زہد محبت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کوئی سمجھ نہ پایا تھا۔ رواج کے مطابق غصہ نہ کر اکثر صلح کر لی۔ اسی لئے کسی زوجیت کے غرض گوارہ تعلقات پیدا نہ ہو سکے۔ کئی اولادیں نادانی اور چہالت کے باعث بچپن میں ہی مر گئیں۔ شہر کے انتقال کے بعد اس کا کوئی تھا تو حامد تھا۔ وہ حامد پر زور نہ کر سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے خلاف اپنی ماں کے موجودہ رویے کے ہوتے ہوئے بغلیں سے تعلقات قائم رکھنے اور اس سے شادی کرنا اس لڑکی کے ساتھ بھی بے انصافی تھی۔ حامد کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اپنی عزیز ترین دوست کو ایسے گھر کی بہن بنے جہاں اس کی عزت نہ کی جاتی ہو۔

لیکن کیا انصاف کی رو سے وہ بلیغ کی محبت کو اپنی ماں کی محبت پر قربان کر کے اس طرح ٹھکر اٹھا سکتا تھا۔ جس لڑکی نے اس جیسے عزیز چچ بچک اور کمزور ان کے لئے آٹا کچرا کیا ہو، اس کی زندگی میں پہلی بار دوسری جنس کی رفاقت کے لطیف مفکر کو اعلیٰ کیا ہو۔ اس کی خاطر درجنوں شیل مسکین اور امیر لوگوں کی پرولہ نہ کی ہو۔۔۔ کیا اس کے ساتھ ایسا سلوک جائز تھا۔ تمام رات حامد اسی اندھیری میں گھرا۔ ماں کی محبت یا بلیغ کی محبت؟ ان میں سے ایک کو بھی وہ قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ صبح ہوتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کی ان دو محبوب ترین بہنیوں کی محبت پر اپنی عزت اور اپنی شخصیت قربان کر دے گا۔

بحار سے محبت ہونے پر چچ حامد کا دلچسپ واپس آیا تو بلیغ نے اس کے ہر تاؤ میں ایک عجیب تبصرہ بنی محسوس کی۔ اس نے اب پروفیسر عبدالعزیم کے گھر جا کر رہنا شروع کر دیا۔ کبھی بلیغ تہمتی تھی تو بدلتی تھی سے گھڑ موڑ کر کسی اندھ سے باتیں کرنے لگتا، دوسری راتوں میں زبردستی کھس کر بیٹھا اور صام لڑکوں کی طرح بعد سے مذاق کرتا۔ وہ حامد کو کسی پادری کا بیٹا سمجھتا تھا اب ان کا حامد شریاؤں میں غلام بن گیا۔ آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھمے پھریں گے کوٹھوں پر جاننا شروع کر دیا۔ سال کے اخیر تک حامد کی آواز گلی کا سکر جم گیا۔ امتحان میں ذلت کے ساتھ خلیں ہوا۔ گھمے نے دل میں ایسا محسوس کیا کہ گویا اس نے دنیا سے کچھ بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب بلیغ کو اس سے جتن کے بجائے نفرت ہو گئی تھی۔ اس عرصہ میں حامد اور بلیغ کے تعلقات کا رنگ ایک ایک بدل جانے لگا۔ چچ کے حلقوں میں طرح طرح کی چیمبرلیناں ہو رہی تھیں۔ ان پر بد مذہبوں، حاسروں اور بلیغ کے کلام فاضل کو اچھا موقع ملتا تھا۔ لیکن تو یہ بھی کہتے تھے کہ حامد کی سابقہ پادری فقط ایک دکھاوا ہی تھی۔ تاکہ بلیغ پر اپنا اثر جمائے اور "مطلب نکل جانے کے بعد" وہ اپنی اصلیت پر فائز رہے گا۔ لیکن اب اس کا خیال تھا کہ بلیغ بھی دوسری انکیوں کی طرح ایک آئی سی ایس شوہر کی تلاش میں تھی۔ حامد جیسے لائق طالب علم اس کو یہ بھی کہہ کر دوسروں کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہو گا۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ حامد کے سرے سرے کواری ملازمت ہی کے تحت ہے تو اس نے ایسے بیکار آدمی کو دستاویز بنانا غرض جیسے متناقض باتیں بلیغ کا دلچسپ کر دیا۔ اس نے اپنا نام لٹا لیا۔ حامد کی طرف سے نا امید رہا جس کو وہ غلط اور وفا داری کا پتہ بھی تھی بلیغ مردوں کی ذات سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو گئی تھی۔ اب کی دوسرے سے محبت کرنا اس کے لئے حق تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد شہر گیا کہ "دبان خلق" کے حلقوں سے بچنے کے لئے اور اپنے باپ کے اصرار پر اس نے ایک فنی فٹنٹ سے شادی کر لی۔

اتنا کہ بعد ترک گیا اس کی آنکھیں ڈھیل جاتی ہوئی تھیں۔ گمراہ معلوم ہوتا تھا گویا بقیہ شہر اس کے دل کا بوجھ بکھا ہو گیا تھا۔

"اس کے بعد؟" موتی لال نے خاموشی کو توڑا۔

"اس کے بعد" حامد نے کہنا شروع کر دیا۔ "اس ٹریڈ کی آخری باب شروع ہوا۔ جس غلط سے بلیغ کی شادی ہوئی وہ قتل و دہشتاں شریاں ہو چکے پرمشیدہ دیاروں میں مبتلا تھا۔ ایک سال ہوا۔۔۔۔۔۔ اس کی آواز اصل سے نکلتی تھی اور وہ زمین کی طرف جھرا نہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔

جیسے کوئی تعلق کا اقبال کر رہا ہو۔ ایک سال ہوا وہ دونوں ان حضروں کا شکار ہوئے لگاتار کی ماں نے اس کی شادی ایک رشتہ دار لڑکی سے کر دی۔ جو دائم المریض تھی اور جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ ازدواج کا بوجھ نہ سنبھال سکیگی۔ مگر خاندانی لال بھیکاروں نے ڈاکٹروں کی رائے کو بنیاد نہ بنا کر اٹھا کر لڑکی کو شادی دے دیا کہ شادی تو ایسی کسی مرد سے جس سے تمام مرض دور ہو جائے ہیں۔ حاکم جول میں اس شادی کے اندر خلافت خفا ماں کے ارادے کے مقابلے میں اپنی آواز اٹھانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ بھتیجیوں سے قطع تعلق کے بعد اس نے طے کر لیا تھا کہ اس کی ماں اگر کسی اندھی بھائی انگڑی، لولی لڑکی سے بھی اس کی شادی طے کرے گی تو وہ اس کو بھی غمزدار کرے گا۔ اس کی حالت غیب تھی اس نے درواز پرست سماج سے اس راہ تھی جو چیز اس کے لئے بھتیجیوں کے چھٹ جانے سے بھی کہیں زیادہ ناقابل برداشت تھی وہ یہ احساس شکست تھا۔ سماج اس کو ایک بے پناہ سمندر معلوم ہوتی تھی جس کی طرف خاک ہو جوں میں ہر انسان کی انفرادی شخصیت اور ہر انفرادی ذہنیت کے لئے موت کا سامان ہے۔ وہ ان جو اثر و رد میں سے نہیں تھا جو اپنی جنت کے سہارے سماج کے ساگر کو پار کر کے اپنے خلات کی بنیادوں پر نئی مینیا بسائے ہیں۔ وہ غمزدار تھا۔ دنیا کی بزدلوں کی طرح اس نے چند فیڈرل سے پریشان ہو کر جو پھینک دیئے۔ اب اس کی گنتی بھنوں میں تھی۔ اور اس کے ساتھ دوسروں کی گنتی بھی۔

سکینہ جس کو اپنی شادی طے کرنے میں کوئی دخل نہ تھا جب حسد کی بیوی بن کر آئی تو اس نے شریک زندگیوں کی طرح شوہر کی طرح حُرمت کرنے کی کوشش کی۔ مگر جس کے دل کا شیشہ ایک بار ٹوٹ جائے وہ پھر نہیں جڑ سکتا۔ حادثہ نے اپنی بیوی سے کبھی سب سے منہات نہ کی۔ وہ بیچاری بیاہیمشہ سے تھی۔ چھ ماہ بعد اسی غم میں گھر کر گئی۔ حادثہ کی ماں بھی کچھ عرصہ بعد چل بسی۔ اکثر پردہ دار عورتوں کی طرح اس کو کوئی کام مرض نہ تھا شوہر کے مرنے کے بعد وہ فقط اس ایسہ پر زور تھی کہ حادثہ کا سہرا دیکھے۔ بیٹے کی آمد کی تو اس نے ناگوار زندگی کی بد عنوانیوں پر معمول کیا۔ اور تین جلدی ممکن ہو سکا اس کی شادی سکینہ کے ساتھ کر دی۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ حادثہ کو مرض لاحق تھا اس کا علاج تھا آسان نہ تھا جب شادی کے بعد بھی اس نے دیکھا کہ حادثہ کی حالت بہتر نہ ہوتی تو اس کی ماں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایسا ہونا بار بار اس سے اس کو وہ تمام خاندان والوں کو بڑی بڑی اہمیتیں وابستہ تھیں یوں دیکھتے دیکھتے تباہ ہوا چارہ تھا۔ ایک باخیل ہونے کے بعد کالج سے اس نے بیفٹ کے لئے نام کٹا لیا تھا۔ اور وہ رشتہ داروں کے اصرار کے اس نے سرکاری نوکری کے لئے کوشش کرنے سے انکار کر دیا یہ شراب نوشی اور کمزوریوں پر جاننا جو اس نے بھتیجیوں کا دل اپنی طرف سے پھرنے کے لئے شروع کیا تھا اس کی مستقل عادت بن چکا تھا۔ ماں نے لاکھ کوشش کی سمجھایا، ڈانٹا لیکن حادثہ کی حالت نہ بہتری۔ بیٹے کی طرف سے ایسی بے بسیاں کھل کر ٹوڑیا۔ اور وہ بچاری بغیر پر جلتے کر اپنے بیٹے کی زبوں حالت کی ذمت دار شاید وہ خود تھی اس کو دنیا سے ہمیشہ کے لئے کچھ کر گئی۔

محمی اس کی موت نے حسد کے دل میں یہ خوفناک سوال پیدا کر دیا کہ کیا وہ خود اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار تھا یا کیا اس نے ایک بے پروا ہو کر مسد سے بچا کر اس کو اس سے بھی بڑا صدمہ اپنی آوارگی سے نہ پہنچایا تھا۔ جو متبانی اس نے اپنی ماں کی جنت کی خاطر کی تھی اب بیکار و غم آئے تھی۔ اس کو یہ بھی مشہد ہوا کہ بھتیجیوں سے قطع تعلقات اس نے ماں کی خاطر نہیں شاید سماج کے خوف سے کیا تھا۔ اور ساتھ ہی اس کو اس خیال نے بھی مستیلا کر رکھا ہے بھتیجیوں کی بیوی کی موت کے لئے بھی وہ خود ہی ذمہ دار ہو۔ اگر اس نے پرے سے مدد کی نہ کر دی دیکھنے کی بجائے بہت سے کام لیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ ان تینوں میں سے ایک جان بھی بچا رہتی۔ اسی خیال نے اس کو تقریباً پانچ بنادیا۔

رات اندرون اس کا حسیب اس کو لازم دیتا تھا۔ وہ اتنا پریشان ہو گیا کہ وہی بھی جائداد کو بیچ کر آوارہ گردی کو نکل گیا۔ کمرٹا یہ سفر سے دل کو سکون حاصل ہو۔ مدلی سے گلہ۔ گلہ سے مدراس۔ مدراس سے بمبئی۔ لیکن اس جیسا کہ خیال نے پہنچا ہوا چھوڑا ۷

ہم لوگ حادثہ کی کہانی بڑے غم سے سن رہے تھے۔ یہ تو مصافحہ ظاہر تھا کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اور جب اس نے شک کر بولنا بند کیا تو اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ یہ سنہ میں مشر اور وہ اس طرح جانپ دل تھا جیسے شکاری کتوں سے بھر کر ہرن موت کے لئے تیار ہوتا ہے۔ جب حواشی لنگر شروع ہوتی تھی تو میں یہ خیال بالکل نہ تھا کہ ایک اجنبی بہن ملاقات میں اپنی زندگی کی داستان سناؤ اسے لگے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی مذکورہ کہانی کا ہی مشن سننے کے لئے اس قہر قہر تھا کہ وہ اسے یہاں سے پر اس نے تین غیر متعلقہ شخصوں کو شروع سے اخیر تک مستام

تفصیلات سناؤ الیس۔

”تو کیا وہ کسی فیصلے پر پہنچ سکا؟“ کمالی نے فتوویٰ دیکر خاموشی کے بعد سوال کیا۔

”ہاں“ حاتمہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ جیسے عدالت میں فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ ”اس نے فیصلہ کیا کہ وہ غم تھا۔“

اور یہ کہتے ہی وہ اٹھا اور تیزی سے دستہ اٹھاتا ہوا چل دیا۔ جب تک ہم میں سے کوئی آواز دے سکے وہ کمالی دور نکل گیا۔

کمالی نے کہنا شروع کیا۔ ”عشق جو کائنات کی بنیاد اور رمز حیات کی اصلیت ہے سراج کے دھنی حالات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔۔۔“

لیکن وہ دفعہ ٹھہر گیا۔ اس وقت شاید خود اس کو بھی ان شاعرانہ الفاظ کے کوکھلے اور خوبنور کا احساس تھا۔

اس عرصہ میں حاتمہ دور ایک لفظ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ عید کائنات میں ایک بے حقیقت لفظ جیسے ہی طعین و لفظ ہی لفظ سے اگھیل

ہو گیا۔ پھر معاملہ پر وہی مستانہ تھا اور سورج ایک خوش نصیب درخت میں ڈوب رہا تھا۔

خواجہ احمد عباس

دُھن

یشی اور گہری نیند اپون کے ٹنڈے ٹنڈے جھونکے اور ٹہاگ کے دن ایسا
کیستی اور شبنم کی رعنائی۔ اور ایک دل غصہ مند۔

آرزو

جیسے سینہ پر آب پر راتوں کو چمکنے والے مستارے اپنا عکس دیکھ دیکھ کر
مکراتے ہیں۔ جیسے سادوں کی کالی کالی راتوں میں جڑھ جھجک جھجک کر

کیف حیات کا پتہ دیتے ہیں۔

جیسے بادشاہوں کے گھر محنت سے جھانک جھانک کر سوئی ہوئی کائنات پر
نور کے دریا بہا رہا ہے۔

جیسے شبنم عارضی گل پر اس بندیا کی طرح چمکتی ہے جو کسی سینہ کی پریشانی پر ضیا پاشی
کر رہی ہو۔

اسی طرح دُھن

آرزو کے گہوارے میں جیسا کہ گودیں۔ شوق اور تنہا کے صوبے میں خیالوں کی دنیا
آباد کرتی ہوئی اپنے نئے گھر میں تدم کرتی ہے۔

ایم۔ اسلم

بنارس جابر ہاؤس لکھنؤ سے

کسی میں جسرا تیں ہو گشت کی
کوئی جوگ خود گنگ وجن کا

نظر اب جو اعلیٰ کیا دیکھتا ہوں
مستی ہونٹوں پہ اس کو گھیلی ہو
گم گم ایک کا ہی شال ادرے
شوق آلود گورے شال اس کے
"سنہری رات" گلیسوں لٹے ہے
گلانی رنگ بازو میں بھرا ہے
نمود حسن ہے گویا نقشہ میں
کہاں یہ خوش اثرین کو دیکھوں

اٹھ کچھ زندہ ہوئی جابر ہی ہے
ہو میں میریوں ہمسرا ہی ہے
اُدھر گنگا کے کنارے پریریں پہنچی
اٹھ کچھ اس طرح انکڑائی لیسک
فلک کا آخری تار اٹھی ٹوٹا
نظر سے سیکڑوں میں لٹا لٹا
معاذ گشت بدل دی آساں کی
لے سر پر سنہرا اقبال نسلی
سنہری ریت ہیروں تو جڑی ہے
فضائیں گونج اٹھی گشتی آواز
کس سنا ہونے پہلی کرن سے
خدا رکھے تجھے صبح بنارس

کہ پیش تو ہے چھوڑ آیا
ای کا نہ کو دیکھے جابر ہاؤس
یہ کیا کشی آگے جابر ہاؤس

کوئی نازک اداویزی جبر کا
کسی میں حسن زردانی دجن کا

تصور کا منٹا ڈوبا جو انسو
مقابل ایک لڑکی سورہی ہے
حسین نازک کھانی سر کے نیچے
وہ پیشانی پہ کعبے بال اس کے
پہلی قوس ابرو میں لے ہے
ادا سے ہاتھ سینہ پر دھر ہے
تو ج اس کے سینہ کا نظریہ میں
میں اس کے حجبی بیڈیں گم ہوں

ہو اب سر ہوئی جابر ہی ہے
برابر بریل دولہی جابر ہی ہے
یہی بیٹی بھائی شوق کرنی
اُدھر وہ سج کی رعنائی لیسک
ادا سے کاروبان ہوش ٹوٹا
نگاہیں اس طرح دریا پڑا لیں
اٹھی ہستی ہوئی ٹھکر کی جھانکی
سحر اور شوق کی شال نسلی
کہ پانی پر پر کھولے پڑی ہے
جلی ہر سبز سبز پر لے ساز
شوق بیٹی اٹھکے باچکین سے
مری تینیں پر سنا گئی رس

مرا بیل نکل جانے پہ سمجھا
ای کا نہ کو دیکھے جابر ہاؤس
یہ کیا کشی آگے جابر ہاؤس

بنارس جابر ہاؤس لکھنؤ سے
ہو اقبالوں پر نغمہ گارہی ہے
بنارس کے سفر کی رات ہے پھر
اُٹھ پرنا چتا ہے سب جھنگل
فلک پر چاند دھڑا جا رہا ہے
توں کی ایک دُنیا پھر رہی ہے
تصویریں ابھی سے گھاٹ پر ہوں
کڑی ہے میں پر لگی سنبھلے
بدن کا جوڑ ہوئی جاتی ہے ساری
بنائی زلف سینہ پر پڑی ہے
لے ہے ہاتھ گردن کی متالی
جلنے آتی ہے منت کی بقی
کڑی ہے ہار جوڑے پر لپیٹ
ہنسنے کے لئے تو قوتی ہے
کوئی سردی سے قہر نہ کہتی ہو
کہیں گیسو جوڑے جا رہے ہیں
الگ بیٹی ہے سیر ہی پر چپاری
کڑی جیتی ہے میل مٹائی شرن
کوئی سر پر بھری چھا لے ہے
کنول ہوں جس طرح پانی پر روشن
کیجئے کے لئے ایک جسم کا ری
ہو سینہ میں ششہ کی چل ہو جو
کسی کے جسم کا سونا ناک رہا ہے
کسی کا چاند سا سینہ نیل
گستاخوں میں ٹوٹ گلوں کو سنا
صبا کا لوب جسم مر رہی ہیں
جوانی ہے کوئی ہے جوانی !
کسی میں تیر کی شیشی مشرقات
قدس میں کوئی مادہ صافی

چلا ہوں ایک ہر رنگ بوسے
اُٹھ کو بریل دوری جابر ہی ہے
بتان ماہ وصل کا ساتھ ہے پھر
ہوا ہر رہی ہے سرد آسپس
کوئی لگا دل میں بیٹھا گارہا ہے
مری آنکھوں میں گنگا پھر رہی ہو
سرا ہا شوق و حسرت کی نظر ہوں
کوئی کس میں گھونٹ نکالے
بناتی ہے کوئی کین کنواری
کوئی گنگا میں کج روئے کھڑی ہو
وہ خودیت ہو کر بخت کرنیوالی
کوئی آج کل میں تیر پھول بیتی
کوئی نازک بدن جابر ہی ہے
کوئی بازو سے جوشن کھلتی ہو
کوئی پانی کے اندر صافیتی ہو
کہیں پتہ جوڑے جا رہے ہیں
وہ ایک دُنیوں میں کھنکھاری
گم گم بال کھولے کوئی جو گن
کوئی تو فیض میں گنگا جل لے ہے
کہیں گورے خشک ہاتھ چندن
وہ گورے بازووں پر سیرج دھاری
گھے ہو کوئی حسد دل رہی ہے
کسی کی سیکھ میں امرت بھرا ہے
خاک شیشے کی عارض میں فطال
گسی لکھیں گلابی آنکھوں پر
ستاروں کی دیکھ جسم جیس میں
بدن شاداب جھکے ارغوانی
کسی میں تیر کی کاروب رنیت
کوئی حسرت میں تیر کی جوانی

مستر شمس الحسن

طرے کر لیا کہ تیری مٹلوں کی تمام ہڈیوں پر عمل کر کے اپنی بیوی کو بھی تندرست اور خوبصورت بنائے رکھیں گے۔ یہ بچے بھی بس غلطی سے ہو گئے۔ بہر حال اب ان بچوں کی وجہ سے مٹر حسن کی فکریں تو نفاذ ہو گئیں لیکن ان کی بیوی کی حیثیت بڑی حد تک ان کے بچوں کی آیا کی ہو گئی۔ ہر وقت ان کی وجہ سے بیماری کچھ نہ کچھ سناتیں مٹر حسن کے سپر سٹڈنٹ لے ایڈ بچوں کے لئے ایک ٹھکانہ چھوڑا تھا۔ وہ خود آتا تو خرچ نہ کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایک گدھ پال لیا جس پر ان کے بچے ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔

مٹر حسن کو قدرت نظر تپے بنازی اور اطمینان دے رکھا تھا۔ ان کو اپنے سوائے کسی اور جیسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ گھر میں کچیاں پڑتے تو ان کو پرواہ نہ ہوتی۔ حالانکہ بڑا بچہ ان کا بڑا لالہ تھا۔ بیوی بیماریاں بھاریں جاکر تیں تب بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ البتہ ان کی تکلیف اور بے چینی اور بڑھ جاتی۔ اس لئے جسے شام کو گھر میں گھستے اور دوسرے دن جب تک دفتر نہ پہنچے جانے ہر وقت خرچ پائی کرتے۔

نکھانے کا ٹھیک ہے، نہ ملنے کا۔ سارے گھر میں بچوں کے پوڑے پڑے رہتے ہیں۔ یہاں ایک نے پشاپ کر دیا، وہاں دوسرے نے گندہ کر ڈالا۔ دربانگ روم میں منوں خاک جمع ہو گئی۔ کوئی آجائو تو کیا کہے گا!

غرض یہ خراب ہے، وہ خراب ہے، بہر حال انہیں اپنی تکلیفوں کا تو پورا احساس ہوتا تھا، لیکن بیوی بیماریاں کی مدد کوئی درکنار مال کو پوچھتے ہی نہ تھے۔ وہ غریب بیماریں ملتی رہیں لیکن وہ مل کو کسی پانی بھی نہ دیتے۔ ایسی حالت میں بیوی بیماریاں کی ہر سانس کا برا بھال رکھتیں۔ اور صبح سے شام تک بچوں، ناشتہ، کھانے وغیرہ میں ملتی رہتیں۔ شیل سے کوئی گھڑی فرصت کی ملتی چو اپنی پڑوسنوں سے جا کر ملتیں۔ اس پر بھی کوئی تفتیشی ہوتی رستی۔ میاں کسی بات سے ملتی خوش نہ ہوتے تھے۔ ان کو کام صرف اتنا تھا کہ صبح کو بڑے دن چڑھے اٹھتے اور دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے دانتوں، آنکھوں، بال، غرض چپ کا بغور معائنہ کرتے۔ گھنٹہ بھر نوٹ کرے کہ سینے میں لگاؤ پڑے پھر پھڑی ہاتھیں ملکر ہونچوں کو تاؤ دیتے ہوئی کھانڈاؤ، دفر دلاؤ، ہوجاؤ۔

مٹر شمس حسن گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے۔ ہر سال چھپنے دلی اور چھپنے بنگلہ پور جا کرتے۔ پہاڑ پر جانے کا عہدہ ملتا تھا، سرکاری کوارٹر کا کرایہ بہت کم تھا، اس لئے اوپر بچے آنے جانے کی زحمت کے علاوہ کوئی اور تکلیف نہ تھی۔ پھر وہ رؤسا، اور امیران کے ساتھ ہر سال پہاڑ پر جاتے تھے۔ مگر ہر دو دوستوں کو جانے والوں میں ان کی عزت زیادہ تھی۔ ہر شخص کا دل بوندہ نہیں کہ ہر سال پہاڑ پر جایا کرے۔ پہاڑ کی اور نیچے کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شملہ پر لوگوں کے لئے ٹوب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکافول کے کرانے حد سے زیادہ تھے، دوسرے زندگی بڑی ہنسی۔ پھر رواد آباد سے شاید ہی کوئی ہر سال پہاڑ پر جایا کرتا ہو۔ البتہ سر محمد طوب ہر سال جایا کرتے تھے، اور ان کے بعد۔ مٹر شمس حسن۔ چنانچہ لوگوں کی نگاہوں میں مٹر شمس حسن، جواب اپنے آپ کو "ایس حسن" کہنے لگے تھے۔ سر طوب کے بعد دوسرا درجہ رکھتے تھے۔ شاید اگر ان کے پہلے بھی "سر" لگا ہوتا تو وہی بازی جیت جاتے۔

ہر کیف جو کچھ ہی ہو۔ اب تو مٹر شمس حسن تھے اور شملہ کی رہائش۔ یار دوستوں میں، جو دفتر ہی کے لوگ تھے مٹر حسن کو کافی ہر دلچسپ تھے۔ لیکن اس ملاقات دور ہی کی تھی۔ البتہ کسی بھی چادر ویز کی دعوت کو دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں کچھ زیادہ خرچ نہ ہوتا تھا۔ بیوی سلیقہ والی تھیں سب کچھ گھر ہی میں تیار ہو جاتا۔ تاہم مٹر حسن بازار کو بھی کچھ شلو الیا کرتے، اس لئے نہیں کہ وہ اچھا ہوتا تھا، بلکہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ صرف گھر کی تھی ہوئی چیزوں پر مال دیتا ہے۔

ان کی شادی ہوئے چھ برس ہو چکے تھے، اور اب ایک لڑکی اور ایک لڑکا موجود تھا، بچے ہوتے تو اس سے بھی زیادہ، لیکن اتفاق سے شملہ پر لڑکا بازاں میں ایک کباڑی کے دکان سے انہیں۔ "میری مٹلوں" کی ایک آدھ کتاب سیسے دامن مل گئی۔ ان کتابوں کا ان پر اثر ہوا۔ اس کے علاوہ وہ بارہا اس بات پر ہی غور کیا کرتے تھے کہ اگر ان خیرینوں کے اتنے کم بے نہیں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی بیویاں تندرست و توانا اور خوش قسمت رہتی ہیں۔ ان کے ہم کیسے جگ اور سٹول ہوتے ہیں۔ اس وجہ کی انہوں نے بھی

مدد نہیں کر سکتے۔ کیسے دھڑکے کر رہے تھے لیکن جب کام پڑا تو کہنے لگے کہ سپرٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کٹ کاٹ کے اس نے سنگھ کو فرسٹ ڈویژن دیدیا۔ امداد اس سے کام تک نہیں سنبھلا ۛ

غرض اسی طرح کی باتوں میں وقت گزرتا۔ دوپہر کو نفلن کے وقت جب چھٹی ہوئی تو نفلن روم سے چائے، تھوس، سینڈویچز وغیرہ منگوا کر کھا لیتے۔ بیوی برابر کوئی نصیحتیں کرنا نہ سہتہ ساتھ لے جایا بیٹھے اور لوگ بھی تو لے جایا کرتے ہیں۔ لیکن یہ تعلیمت کون گوارا کرتا۔ شروع شروع میں میٹیاں اور شامی کباب لے لے گئے۔ پھر کچھ روز زعفران میں چار کچھ تھوس اور انڈر اوغیر لے جانے لگے۔ لیکن یہ تجربہ بھی کچھ کامیاب نہیں ہوا۔ دفتر میں جتنے انگریز اور انڈیگو انڈین تھے ان کے گھر دوسرے نوکر نفلن لے آتے تھے۔ کچھ انڈیگو انڈینوں کے نوکر اپنے ساتھ ان کے کتے بھی لے آتے تھے۔ کچھ لوگوں نے دفتر ہی میں انتظام کر لیا تھا۔ یہ طرح نے بھی دفتر ہی میں انتظام کر لیا۔ انگریز بیویں لے آتی ہیں کافی منسج بیٹھتا تھا، اس لئے چار اور تھوس برسی انتظامی۔ کھانی کو میز پر پاؤں رکھ کے کرسی میں بیٹھ جاتے۔ اور چیت کی طرف دھواں اڑا اڑا کے بڑی آسودگی سے سگریٹ پیٹے، یا کچھ اور لوگوں سے دی دفتر کی ہائنتے۔ شام کو مال روڈ کا چھوٹا گھر کے عورتوں کو گھورتے اور بیٹھتے بٹھلاتے اپنا بھاری جسم لے، اپنے ہونے بہت دیر میں گھر آتے پھاڑ پڑھتا، انار کی حیثیت شکایت رہتی تھی۔ چارپی، اودا، انگریز چار کچھ دیر بیوی سے بات چیت کی یا بچوں سے کھیلے، بیٹیں تو ڈراٹنگ روم میں بی بیروانا سگریٹ یا انگریز کا کوئی معمولی ناول جو کسی کبار دیکھے کے یہاں سے خرید لائے تھے لے کے بیٹھ جاتے۔

وہ بیوی سے اکثر کھاتے تھے۔

”ڈراٹنگ روم میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟“ انگریزوں کی عورتوں کو دیکھ کر آرام اور عیش سے بہتی ہیں شام کو کھانے کے بعد، بیٹے ڈراٹنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن تم تو سنی ہی ہیں ۛ

بیوی بیچارہ فدا کرنے خیال کی تھیں، ان سے کر سبیلوں پر چڑھ کے نہ بیٹھا جاتا تھا۔ ایک آدمی انہوں نے کو بیٹھ لی لیکن ان کی ہاتھیں ہمیشہ لڑکھ لڑکھ کر کسی پر آ جاتیں اور وہ آتی باقی مارتیں۔

دفتر میں کسی کو ”بلو“ کسی کو ”گڈ مارٹنگ“ کرتے ہوئے گھستے۔ پھر ذرا ناپ کرنے والی رادھوں کی طرف سے گزرتے۔ اگر کسی نے غصہ اٹھانے کے دیکھ لیا تو جیس کھل گئیں۔ دھڑکی سے بلو، گڈ مارٹنگ کرتے۔ اور غصہ خوش اپنی میز پر بیٹھتے۔ اگر سرور اچھا تو کسی اور کی میز پر بیٹھ جاتے۔ اور پھر وہی دفتر کی باتیں چڑھا جاتیں۔ یہی کام کی کثرت کی شکایت یا کسی کی کائی

”ڈراٹنگ کو دیکھو۔ کس قدر تنہا ہے۔ جس دن سے

فرسٹ ڈویژن ملا ہے سیدے منہ بات بھی نہیں کرنا۔

کام تو آتا نہیں، لیکن اسے آپ کو فروغ دیتا ہے۔

کل ہی میرے پاس نائل لے کرے۔ دوڑا ہوا آج پٹرین

دراڈ ہو جانا لکھنا کوٹ بھوں۔ اور اگر میرا کوئی کام ہو

تو کھانا جواب دیدیتا ہے۔ سیران تخت کی کھانا ہے

میں تو اس جیسے دس کام ایک دن میں نکال کر بیٹھ

دوں۔ مگر یہاں خوش فہم سے کرنی آتی ہے۔ اور وہ میر

سے شام تک ڈورون کے آگے پیچھے رہتا ہے۔ اگر

ڈورون (سپرٹنڈنٹ) کو ڈالیاں نہ چھوڑا تو کو

بھی فرسٹ ڈویژن نہ ملتا۔ مگر یہی ہم سے تو اس طرح

خوشاد ہو نہیں سکتی۔ دفتر کے بعد افسر کے ہم صاحب

کے پاس سلام کرنے پہنچ جاتا ہے۔ اور بازار کو سودا

تک لا دیتے ہیں عار نہیں۔ انہیں دھوئی بندوں کی

تو ہم سب کا ستیا اس بار کھا ہے۔ یہ بے ایمان

انڈیگو انڈین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کے جوتے ہی

صاف کیا کریں۔ اور سب اپنی خوشامروئی کی بدولت

اور اوپر سے بڑے پٹرین بنے ہیں۔ یہاں تو دلدار

جی حاضر کرتے رہتے ہیں، باہر نکلتے ہی گالیاں سناتی

ہیں، ادا ملک کی آواز دی کے گیت گاتے ہیں جیسے

گولمالک کو آواز دی کر لیں گے۔ لیکن انگریزوں سے تو

توان ہی لوگوں سے، اور یہ تو دیکھو کہ ایک دوسرے

کو کیا لکھتے ہیں۔ میں ایک کے پیچھے کی دیر پر

پھر تو چاروں طرف ہندو بی ہندو کھانی دیتے ہیں

رہتے صاحب جنہاں نے دیکھو سپرٹنڈنٹ ہو کر

ہی اپنی برادری میں چھ ہندو بھرتے۔ ہم لوگ تو ملی کا

لوگ نہیں، منصور صاحب بھی سکریٹری ہوئے لیکن

ایک آدمی سلمان کو رکھنا دلیا ایسا ہم لوگوں کی کئی کوئی

لیکن مہرمن کو یہ ہر معلوم ہوتا تھا۔
"کوئی دیکھے گا تو مذاق اڑائے گا۔ انھیں کرسی پر بیٹھنا نہیں آتا۔"

"ایک تو ایسے ہی کونسا آرام ملتا تھا اور اب یہ
معیشت کے ان پر ہی ہے۔ کسی بات کا بھی ٹھیک
نہیں۔"

بیوی بیماریا کی عادت سے عبور نہیں۔ دوسرے جب کسی وہ
اس کمرے میں بیٹھتیں تو خواہ مخواہ مہرمن کو اس بات کا خیال آتا اور وہ
اپنی بیوی سے کہتے۔

بیوی بیماری تو مرنے والی ہی رہی تھیں، یہ سنکر اور بھی ہنس
جاتا۔ جو کچھ ہو سکتا بلنگ پر پڑے ہی پڑے کرتیں، میاں کے ناشتر
کے لئے ٹھیکیاں لٹاتا، انڈا پکاتا یا صلا بناتا۔ مگر اپنے لئے کچھ نہیں۔ جو بچا
دن بھر مارے مارے پھرتے۔ مگر میں ایک مرد اور ایک لڑکا تو تھا۔
جب بیوی کا یہ حال ہوتا تو نوکروں نے بھی لاہروا ہی شروع کر دی تھیں
کے کمرے سے بدلے ہوئے دونوں گدگداتے۔ شام کو مہرمن اس پر
بھی بچتے۔

"دیکھو تو انگریزوں کی بیویاں کیسے اپنا سب کام
خود کرتی ہیں۔ کپڑے دھونا بازار سے سودا لانا، آجر
تم ہی کیوں نہیں کرتیں۔ اس سے صرف کفایت
ہی نہیں ہوتی بلکہ سامان بھی اچھا آتا ہے اور دست
بھی اچھی بنی رہتی ہے۔ سڑ زرائع کی سیم کو دیکھو آجر
وہ بھی تو انگریز ہے لیکن میاں کے لئے سگریٹ
نیک خود ہی بازار سے لاتی ہے۔"

آخر کو بیوی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا لیکن اس
سے کیا ہوتا تھا۔ آئے دن ذرا ذرا سی بات پر میوں کے حوالے دیتے
جاتے اور کھانسی پھینکی ہوتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی پتھر پر، کبھی بیوی کی
"ہندوستانی عادت۔"

آخر کار بیماری کو دق ہو گئی۔ کچھ روز وہ اپنے بھار کو چھانے
دہیں۔ جو شاندار وغیرہ چلتی تھیں۔ لیکن مرض میں روز بروز زیادتی ہی ہوتی
گئی۔ مہرمن روز کہتے۔

"یہ کیا ڈوسنگ بنا کر ہے۔ کام و دام کو نہیں کرتیں۔ جو الگ
لئے پھرتے ہیں۔ نہ بچے وقت پرناشتہ لے نہ کھانا۔ مجھے کام کرنا ہوتا
ہے۔ دن بھر دفتری چیزیں اور گھر پر یہ اور مصیبت۔"

جب تک بنا بیماری کی کرتی تھیں۔ ہندوستانی بیوی کی بھی
کیا زندگی ہے!۔ اپنے آپ کو میاں کا غلام سمجھتی ہے۔ مصیبتیں اٹھانے
پر بھلائے، بچنے بچنے، ان کو بالے۔ میاں کا خیال اس کے کام کاج
کے اور بجائے آواز اجتماع بلند کرنے کے منہ سے اُن کی ت کا۔
غرض مہرمن کا حال اتنی ہی ہوا گیا، اب تو مہرمن کو بھی خیال
آیا اور ایک روز ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیا۔ اور پھر اپنی ذمہ داری کو کٹھن
ہو گئے۔ اور ڈاکٹر سے حال کہنے کے لئے بھی کوئی نہ ہوتا۔ غرض ہوا
سے کوئی خائف نہ ہوا۔ اب ان کا یہ حال ہو گیا کہ چار پانی پر پڑی تیر
آنکھوں میں چلنے پڑنے اور رنگ سیاہ ہو گیا۔ بھانسنے سے ہم چھوڑنا
اور کھانسی کے سارے جراثیم۔ اکثر تو انھیں ایسی کھانسی آتی کہ سہل

بچوں کا تو ذرا حال دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے اُن کی
ماں مرنے والی اور وضع ہو گئے ہیں کس قدر تھک چکے
ہوئے ہیں۔ نوکروں کے بچے بھی اتنے گندے نہ بن
ہوں گے۔"

بیوی کا یہ حال تھا کہ پانی پینے کے لئے اٹھنے کی ہمت باقی نہ
رہی تھی۔ میاں کو یہ تو حق تھا کہ نام ہی کے لئے نہ، بھر کے کام میں
لے جاتا تھا۔ ان کو اپنے آپ ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔

آخر کار بیوی نے اپنی حالات کا حال اپنے بھار کو لکھ دیا۔ اُن کی
ماں کو بھیجیں ہی پڑی تھیں۔ والد نے سنا تو بہت پریشان ہوئے۔
اور چھوڑ آئے، اُن کی خالہ بھی جنھوں نے ان کو بالائے نقاشی کر ڈالی
..... ہوئی آئیں۔ دونوں والد اور خالہ، اُن کی حالت دیکھ کر
روئے پٹنے لگے۔ لیکن مہرمن بھر بھر کہہ رہے۔

"ابھی صاحب! آپ لوگ نافی اس قدر پریشان
ہو رہے ہیں۔ بھار ہٹ کی کیا بات ہے۔ معمولی
بھار ہے۔ ڈاکٹر کو دکھا دیں چکا ہوں۔ کچھ دوا
ٹھیک ہو جائیں گی۔ نہ معلوم انھوں نے آپ کو
لکھ ہی کیوں دیا۔"

اب جو کچھ گھر میں اور آدمی آگئے تھے مہرمن اور بھی بیکار
ہو گئے۔ شام کو مال روڈ کے بجائے ایک چکر کے دو چکر لگاتے۔
رات گئے گھر آتے، اور بیوی کو کمرے میں بھانسنے پڑے
کمرے میں چلے جاتے۔ اگر بہت چھوٹا تو اس کے دل میں یہ مکان

ہوا کی ہر گرا۔ مٹھن نے کڑکی کے باہر دیکھا۔ سامنے اونچے پہاڑوں کا
سلسلہ رات کی تاریکی میں سیاہ اودھنم، آسمان تک چلا گیا تھا پہاڑ
کے دامن پر یکایک ایک الاؤ کی آگ بج رہی، لیکن فوراً ہی دب گئی۔
اور اندھیرے کے علاوہ کچھ نہ دکھائی۔ دیتا تھا۔

جیوی کے: ان مالوس کن الفاٹھ نے مٹھن پر کچھ ایسا اثر کیا
کہ وہ اپنا غصہ بھول گئے۔ اور جیوی کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر بولے:-

"نہیں اس طرح کی باتیں مت کرو۔ تم اچھی ہو

جاؤ گی۔ اتنی ہر سال کیوں ہوتی ہو؟ کل میں نے

میں کیوں کو بگاڑتے تھے؟ دیکھا دوں گا بڑا ہوسٹیار

ڈاکٹر کے۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے؟

ایسا معلوم ہوا جیسے ان بکلوں نے ان کے اندر نئی جان
ڈال دی۔ ان کے چہرے پر اس خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے
جو ایک غلام کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا آقا اس سے
کبھی اچھی طرح بات کرے، یا کہنے کی وہ وجہ اندھیریت جو اپنی مالک
کے پیار کرنے اور بچکانے سے اس پر جاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت
بیگم حن کا ہی ہی جانتا تھا کہ بچہ کو اپنے میاں کے قدم چوم لیں۔
اور وہ بستی پر پڑے پڑے اپنے اچھے ہونے اور میاں کی خدمت
کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔

صبح اٹھ کر مٹھن نے ڈاکٹر میکین کو ٹیلیفون کیا۔ اُسے
دس بجے سے پندرہ گھنٹہ تک، اس نے اس نے دس اور گیارہ
کے درمیان آٹھ گھنٹہ کیا۔ مٹھن کو تو دفتر جانا تھا اس لئے پندرہ
سے کہہ کر چلے گئے۔

شام کو دفتر سے ذرا جلد واپس آگئے اور غلام معمول اپنی
جیوی کے کمرے میں چلے گئے اور دوسرے سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیا
کہتا تھا۔ انھوں نے کہا:-

"وہ دیکھ رہا ہے، وہ ابھی بخیر کر رہا ہے لیکن
وہ کہتا تھا کہ میں ان کے شوہر کے بات کرنا چاہتا
ہوں۔"

اس پر مٹھن بولے: "کیوں؟"

"تو مجھے معلوم نہیں۔ وہ کچھ انجینئر وغیرہ دینے

کو کہتا تھا؟"

"تو مجھے کیوں بات کرنا چاہتا ہے؟"

کی صفائی کی جاتی ہے مٹھن کوئی دس یا پندرہ منٹ کے لئے جیوی
کے پاس جا بیٹھتے لیکن تمام وقت اس طرح کا لیکچر دیتے کہ جیوی کے
آستونہ بنے۔ وہ کہتے:-

"اگر کام کا دن میں دل لگاؤ۔ اٹھ کے کیوں نہیں بیٹھ

جاتیں۔ ذرا انہو طبیعت ٹھیک کیسے ہو۔ پڑے

پڑے کھانا بھی مضمر نہیں ہو سکتا؟"

اور جیوی کا یہ حال تھا کہ پلنگ پر جیوی شکل سے اٹھ کر بیٹھ

سکتی تھیں۔

جب کبھی مٹھن سے بات چیت ہوتی کام کی شکایت

کرتے۔

"آج ان کا کیا حال رہا؟ مجھے تو آج کل کام کی

وجہ سے سہرا ٹھانسی بھی بہت نہیں ہوتی۔ آنڈیکسٹر

(Cases) آتے ہیں کہ ڈھیر اکٹھا ہو گیا ہے

اس قدر کام ہے کہ اب جا کر فیسٹی ملی ہے؟"

پھر کھانا کھانے کے بعد اگر بہت خیال آیا تو جیوی کے پاس

ایک آدھ منٹ کو کھڑے کھڑے ہوتے اور اس کے بعد بستر میں لیٹ

جاتے، اور کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔

ایک روز رات کو انھیں جیوی کی کچھ ایسی محنت آئی کہ گھڑی
دور کے لئے ان کی جا رہا ہے کے پاس جا بیٹھ گئے۔ ان کے سسر
اسی وقت کہیں چلے گئے تھے۔ جیوی کی خالہ دوسرے کمرے میں نماز پڑھ
رہی تھیں۔ مٹھن کی جیوی چار پانی سے ٹی ٹرو سے کی طرح پڑی
تھیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں پھٹ پر گزرتی ہوئی تھیں اور سانس
کے چلنے کی آواز غرغرا رہی تھی، جیسے پہاڑ کی چوٹی پر دھڑکن میں ہوا کا
فٹانا۔ مٹھن نے جیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سامنے میسج پر
ٹوکوں، ٹوکوں اور گدڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فرش پر پڑے اور کچر
چھترے پڑے تھے۔ مٹھن کی آنکھ ان چیزوں پر پڑی اور ان کی جیوی
پر بل آگئے۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ جیوی کے کمرے کو جسٹش
ہوتی، اور مٹھن کا پتہ پتہ کی خوف آواز میں وہ کہنے لگی:-

"میری دوسرے آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔

آپ اور شادی کر لیجئے۔ میں بچوں کی نہیں میری

وجہ سے آپ تکلیف نہ اٹھائیے؟"

ان کی آواز بڑھ گئی، اور ایک گرم آستون کے کٹر پر پڑا

ہو جائیں۔ باہر رختوں میں ہو کا چلتا ایک آہ کی طرح یاس کن مسلم ہو تاکھا۔

مشرعن کی بیوی نے ان کی طرف کئی دفعہ غم اور یاس کی دیکھا اور وہ بھی بیوی کو تسلی دینے لگے۔ لیکن بیوی نے میاں کا ہاتھ پڑا تھا میں نے لیا، اور دھسکے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ان کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ وہ ناامیدی سے اپنے میاں کا ہاتھ چھین رہی ہیں جیسے اب ان کو بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اور جیسے وہ یائیں مہارے کے لئے ان کی پاس اپنے میاں کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس معصومانہ حرکت میں وہ درد اور گداز تھا، زندگی میں وہ یاسانہ التجا جو انسان موت کو کرتا ہے۔ وہ حسرت بھری خواہش جو کوئی کرتے وقت اپنے جھوٹے کرتا چکر کھمچے اس آخری وقت میں نہ چھوٹا، اس جس موت کی بولناکی تھی، وہ درد جو موت کے سامنے انسان پر غالب آجائے وہ درد انگریز حسرت جو دنیا کی چیزیں چھوڑتے وقت، اپنے جیموں سے جدا ہوتے ہوئے انسان کو اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ تم رشتہ ہو رہے ہیں اور پھر بھی واپس نہ آئیں گے۔ یہ زہرہ رہنے، رہنے بولنے، محبت کرنے اور گرتے جانے کی موجود غرض تھی۔ اس وقت جب انسان ناامید ہو چکا ہے کہ اب اسے موت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس ذرا سی درد بھری حرکت میں وہ دیارے محبت ہو جڑن تھا جن نے مشرعن کو بھی منہ دکھایا۔ ان کا ہاتھ کاٹنے لگا، اور انھوں سے آسنوئی دو دواؤں میں ٹپک پڑیں۔ ایک ایک ہوا جگنو کے میں اگلی، فیصلی ایک لہر چمکنے کے بعد پھر تازیکی میں غائب ہو گیا، زور سے بجلی چکی، دھبہ پاؤں میں ہو کا سناٹا بڑھ گیا۔

مشرعن کا کاکام اپنی بیوی کو بوجھانے گئے۔ اور وہی کی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد غلطہ واپس آئے۔ گھر ان کو اکسلا اکسلا دیا سونا مسلم ہوا۔ لیکن ایک آدھ روز قبل اس کے عادی ہو گئے۔ وہی سے روزانہ بیوی کی تحریریت کے حفظہ تھے۔ لیکن جیموں کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مولویوں کو دکھایا۔ ٹوٹے ٹوٹے کئے گئے۔ گھٹے تعویذ کئے گئے لیکن کسی چیز سے فائدہ نہ ہوا۔ روز بروز حالت خراب ہی ہوئی گئی۔ آخر کار ایک روز مشرعن کے پاس تار اگیا کہ اکی بیوی اس دنیا سے فانی سے رخصت ہو گئیں۔ اور آپ آزاد ہیں۔

”میاں تم آخر کو شوم ہو۔ اس خیال سے کہتا ہو گا کہ تم زندہ دار ہو“

”میں کیا کروں گا؟ دوا کے لئے کہتا ہو گا کہ بازار دوا دے۔ اور کیا لیکن مرض کیا بتاتا تھا؟“

”یہ تو مجھ سے کہا نہیں۔ غائب۔ وہ کہتا تھا انشاء اللہ آرام ہو جائے گا“

”تو آخر مرض کیا بتوڑ کیا؟“

پہلے تو سر سے خاموش رہے پھر کچھ دیر بعد بولے:-

”مشادی تم سے اسی کے بارے میں بات چیت کرے گا؟“

”تو صاحب ہیں کیا کروں گا۔ کیا آپ سے نہیں کہہ سکتا تھا؟“

”میاں تم آخر شوم ہو“

”لیکن میری کچھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں گا۔ آپ آخر چھپا کیوں رہے ہیں؟ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ دق بتاتا تھا...“

شمر سے ویسے ہی تشکر اور پریشان تھے۔ یہ سن کر شمر سے لال ہو گئے۔ مریض کے منہ پر اس صفائی سے کہہ دیا تم کو قوت ہو گئی ہو لیکن وہ پُرانے خیال کے آدمی تھے اور دوا دے کچھ نہ بولے۔

مرض ہو چکا تھا، اور ڈاکٹر میکین کے علاج سے بھی بیوی کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ پانچ اگلی خالہ اور والد نے یہ صلاح دی کہ ان کو دوائے جاگو جیموں کو دکھائیں۔ پہلے تو مشرعن نے کہا کہ یہ دوائے کے مریض کو گرمی میں لے جائے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور جیموں کے علاج میں دھم کیا ہے، صرف جھوٹے قندے چلائے ہیں۔ نہ مرض بچا نہیں، نہ ٹیک علاج کر رہا۔

لیکن ان لوگوں کے اصرار سے راضی ہو گئے۔

تو ارکا دن ان لوگوں کے وقی جانے کے لئے مقرر ہوا۔ ہفتہ کی رات کو چوتھے شمر سے اور غلیہ صاحب اسباب وغیرہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے، مشرعن اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھے۔ وہ جاہلانی کی پاس خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور پچھلی آسائشوں کا خیال کر کے ایک حسد منعم تھے۔

آسمان پر لٹکے بادل چھائے ہوئے تھے کسی کسی کوک

آواز نہ ہوتی تھی۔ بادلوں میں تیزی سے بجلی چمکتی اور پھر پہلے کی نسبت وہ اندھرا ہو جاتا۔ بجلی کی ٹپک میں بیوی کا زرد چہرہ سفید اور چھایا

ٹپک افتاد اور انھوں کے گڑھے اور چہرے کی پڑیاں نمایاں

گئے۔

کچھ روز تو مٹھن جنس میں رہے۔ مگر کی بربادی اور آرام کے ختم ہونے کا خیال دس پندرہ روز تک ان پر نمایاں اثر کرتے رہا۔ اور بچوں کے خیال نے ان کی پریشانی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن چند ہی روز کے بعد وہ نئی زندگی کے خواب دیکھنے

اور اب وہ دوسری شادی کرنے کی فکر میں ہیں۔ کئی ایک پیغام آچکے ہیں۔ لیکن انھوں نے طے کر لیا ہے کہ بغیر لڑکی کو دیکھے اور بغیر اس سے ملے ہوئے شادی نہ کریں گے۔

احمد علی

مسبوحی

نور کے دامن ہیں جس کا وہ سندر استخوان
چوڑی کی لکھنی گت جسل پریوں کا استخوان
وہ کا نظر وارو

یہ نقشے خاموش
شہر دعا ہیں مد بخش
چمین سہہ ہیں ہوش

یہ کا نظر وارو

تو یہ اشنان کی مائی کیا جیس بل دکھلائیں
ہلریں جب لہرا کر آویں ساپن سے بل کھٹیں
دھرتی کو یہ تارو

عزایں اور مستور

شہر دعا سے سے پو۔

دستِ طلب سے دودر

یہ کا نظر سے

اُم کا نظر توڑوں کے توڑے چھڑوں کی یہ آواز
ہر دے کی دھڑکن پہ ناچے پریم کا کوسل راز
گیت وہ پایا چلیا
کاؤں میں بس گھولیں

بول انوکھے بولیں
پٹ ہر دے کے گھولیں
یہ کا نظر سے

جھنڈوں کے دھولوں کی سیلے شہر دھلکے دھار لگ
اٹھ سن پانی پاپ کو دھوئے جاگ خدا راجا لگ
لوہہ موہ کو ماریے

نفلوں کے شہیدانی
دو آنے، ستودانی
اٹھ، دسے رام دُہانی

یہ کا نظر سے

مندرجب، نعمت ہیں ساکن، اور دیوی خاموش
سامری کے دُربار کنا سے چمین سہہ ہیں ہوش
پانی کو اٹکائے

نہیں آگ لگائیں
دُوری سے تڑپائیں
اب نہ دیکھے جائیں

یہ کا نظر سے

سر و پانی ہنگام

گھوڑے کی پیٹھ پر

اس غریب لکڑہ کا انحصار شوہر کی محدود آمدنی پر تھا۔ ان کے ہاں دو بچے تھے۔ وہ شروع سے غریب چلے آتے تھے اور اب اس خوفناک طاقت کا شکار ہو رہے تھے جو ظاہر میں قائم کئے والے خاندانوں میں عموماً رونما ہوتی ہے۔

ہیکڑ کی پرورش آبائی جاگیر کی دیہاتی فضا میں ہوتی تھی۔ بوڑھا بچہ اس کا تالیق تھا۔ یہ خاندان کوئی آستانا میر نہ تھا مگر اس کے تمام افسانہ اداری پڑنشین برقرار رکھنے کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ جب ہیکڑا بیس سال کا ہو تو اسے کلرک کی حیثیت سے بحری دفتر میں پندرہ سو فیٹ ایک سالانہ کی ایک اسامی مل گئی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو شروع ہی میں زندگی کے تلخ مصائب جھیلنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ زندگی میں قائم رکھتے ہی اس کے چچا دو پیچ عقدوں کو منسلک الیناس کی طاقت سے باہر تھا۔

دفتر میں اس کے پہلے تین سال بڑی مصیبت میں گزرے۔

اس نے اپنے چند بھوکے سب سے رشتہ داروں کو، جو زمانہ کی گردش کے باعث اس کی طرح مفلوک الحوائش تھے۔ از سر نو اپنے طبقہ اچھا کر لیا۔ اور اس طرح اس نے طاقتور لوگوں کا ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیا۔

اس کا تم رسیدہ گھوڑا غریب خاندان کے تمام افراد، جو زندگی کے جدید سالیس حصے آستانہ تھے چند سال فردہ مکاناتوں کی بوسیدہ چھتوں پر بیٹھ بیٹھے۔ ان مکانات کے پچھلے حصوں میں ایسے خطاب یافتہ لوگ مقیم تھے جو ہیکڑ کے خاندان کی طرح گردش ایام میں مبتلا تھے، اور انھیں خطاب یافتہ لوگوں میں اس نے ایک غریب، نوجوان لڑکی سے..... شادی کر لی۔

چار سال کے عرصہ میں ان کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ غریب نے ان پر غضب ڈھا دیکھا تھا۔ ان کی سیر اور ان چند راتوں کے سوا جو فریضے کے بل بوتے پر وہ موسم سرما میں تماشا گاہوں میں گذارتے تھے، ان کا کوئی شغل نہ تھا۔

موسم بہار کے آغاز میں ہیکڑ کے افسر نے کچھ زمانہ کام اس کے سپرد کر دیا جس سے اس نے تھوڑے کے علاوہ تین فرانک اور کمائے۔ بہت تھکا کر کے بعد ان کی صلاح شہری کہ اس رقم سے ایک فینٹ کو بچائے۔

ہیکڑ نے اپنی بیوی سے کہا: "ایسے موٹے بھی کھار آتے ہیں۔ میں تمہارے لئے ادھیڑوں کے لئے ایک بند بچی کر لیا۔ پرے لوں گا اور خود گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جاؤں گا۔ اس طرح میری وقت خراب گزرتی گئی۔"

ایک ہفتہ انھوں نے اپنی باتوں میں گذار دیا۔ ہر شام دفتر سے واپس آتے ہی ہیکڑ اپنے بڑے لڑکے کو ٹھنڈوں پر ادھر پیچھے اچھا لکھتا۔ بھینس بنایا جس سے اس نے ابھی اس طرح گھوڑے پر چڑھیں گے، اور لاکھ سا ادھن کر سیوں پر اچھا، اچھا کرنا رہتا۔ اس طرح میرے آبائی کل سے بچ چکے ہیں گئے۔"

کھانے کے وقت ہیکڑ اپنی شہسواری کے متعلق بڑے بڑے ہوائی قلعے بناتا اور کہتا: مجھے سواری میں خوب مہارت ہے۔ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہوا تو اس پر دیکھنا کیا غضب ٹھکانا ہوا۔ پھر خوشی میں تالی جا کر بیوی سے کہتا: "اگر وہ مجھے کوئی شوق اور تیز رفتار گھوڑا دے تو لطف آجائے جب میری شہسواری دیکھنے کے قابل ہو۔ اگر من اتفاق سے اس وقت دفتر کا کوئی ساتھی مل جائے تو اسے تعریف کرتے ہی پتھر مقررہ وقت پر بھیج دوں گا۔ ہیکڑ کے دروازے کے سامنے اکھڑے ہوئے۔ گھوڑے کو سسٹے کے کپڑوں تک دیکھنے کے لئے انتہائی احتیاج کے ساتھ وہ پیچھے آئے۔ اس وقت اس نے اپنی پتلون پر بیٹے باندھ رکھے تھے اور اس سلسلے سے ختم کر رہا تھا جو اس نے ایک روز پہلے لکھا۔ اس نے گھوڑے کی ہر ایک ٹانگ کو یکے بعد دیگرے اٹھا کر بھی طرح دیکھا، ہاتھ پیر کس کی گردن، پسلیوں اور پیٹھ کا مشاہدہ کیا۔ ہیکڑ کھول کر اس کی عمر کا اندازہ لگایا۔ تمام افراد کے کہنے ہوئے تھے ایک ہی منٹ میں اس نے تمام گھوڑوں کے متعلق اور انھیں اس کے لئے کہنے متعلق سب کچھ بیان کر دالا۔ جب ہر ایک فریاد بھیجی میں آرام سے بیٹھ گیا تو ہیکڑ نے اپنے گھوڑے کی کاٹھنی کا ملاحظہ کیا۔ اور اس

پھرتی اور وقت سے ایک ہی جہت میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا کہ گھوڑا اس کا دیک کر اچھلنے لگا۔ سیکڑ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ مگر ذرا سنبھل کر بولا "مظہور ذرا سنبھلو" اور جب گھوڑا ذرا ٹکا تو بیوی سے بوجھنے لگا: "کیا تم سب تیار ہو؟" وہ سب سہم آہنگ ہو کر بولے "ہاں" اور یہ "خالہ" چل پڑا۔

مگر ایک تماشائی کی آنکھیں سیکڑ پر چلی گئیں۔ وہ انگریز سوار کی طرح ذرا کلفت سے زمین پر اوپر نیچے اچھل رہا تھا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی گھوڑے کی ایال پر گر پڑے گا۔ اس کی آنکھیں سامنے کی طرف مگڑھتیں اس کے ماتھے پر ٹھن پڑے تھے اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ایک بچہ اس کی بیوی کی گود میں تھا اور دوسرا لڑکے کے پاس تھا۔ ہر منٹ کے بعد وہ بچوں کو خطاب کر کے کہتے: "اپنے آبا جاناں کی طرف دیکھو" اور بچے تازہ ہوا اور سر کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے چھین مارنے لگتے۔

گھوڑا اس بے پناہ شور سے ہلک کر اچھلنے کوڑنے لگا۔ اسے روکنے کی کوشش میں سیکڑ کی ٹوپی زمین پر آ رہی۔ چھٹی کے کوچان نے نیچے اتر کر ٹوپی کو اٹھایا اور سیکڑ اسے پہن کر چلنے لگا۔ بچوں نے یہ کیسا شور مچا رکھا ہے انھیں ہنس کر دیکھا اور گھوڑا ڈر کر ہوا چلا گیا۔ وہ کھانا ساتھ لے آئے تھے۔ ایک سڑھ زار میں بیٹھ کر انھوں نے تیسرے پہر کا ناشتہ کیا۔ اگرچہ گھوڑوں کی مخالفت کے لڑائی پائل چسبان کھاتا تھا مگر سیکڑ ہر منٹ کے بعد یہ معلوم کرنے کے لئے گھوڑے کے پاس جا ناگناں شایدا اسے کسی چیز کی ضرورت ہو۔ وہ اسے ہاتھ سے چھتی دیتا اور روٹی، ایک اور میٹھے سے اس کی تواضع کرتا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا: "دیکھو بڑا دلکی چلنے والا جانور ہے۔ پہلے یہ مجھے گرایا ہی جانتا تھا مگر تم نے دیکھا تا میں نے اسے کتنی جلدی سنبھال لیا۔ اب اس نے مجھے چسبان لیا ہے"

آئی دفعہ گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں سے راستہ بھر پڑا تھا۔ سورج کی شعائیں تیزی سے پڑ رہی تھیں۔ جن سے گاڑیوں کا روشن اور سازگار پینل چمک رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نہ لگی کاموں میں مارتا ہو ایک بے پایاں مسند درخت پر رواں ہے۔

اس بے پناہ آواز کا ہر جھک سیکڑ کا گھوڑا ایک بے قابو ہو گیا۔ اور گاڑیوں کے درمیان سے ہو کر طرح گزرتا ہوا اسٹیل کی جانب بھاگ نکلا۔ سیکڑ نے اسے قابو میں لایا۔ امریکی کوشش صرف کڑالی۔ گرے سود۔ میں بھی میں اس کے بیوی بچے پیٹھے تھے۔ وہ بہت پیچھے رہ گئی۔ سیکڑ کا گھوڑا اب ایک داییں جانب کو بھرا۔ ایک زمیندار ملک کو عبور کر رہی تھی۔ سیکڑ چلا یا۔ بچو بچو "مگر زمیندار شاید یہی تھی وہ آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ بیچارے گھوڑے کی زد میں آگئی اور اس وقت کے فاصلے پر جا پڑی۔ اسی وقت بے شکم آواز میں بلند ہوئیں۔ سوار کو پھینک دیا جانے لگا۔ سیکڑ چاہتے تھے اس کو چھوڑا تھا اور گھوڑے کی ایال میں بیٹھ کر زور زور سے چلا رہا تھا۔ مدد مدد! سیکڑ ایک دھماکے کے ساتھ گھوڑے کے مسکے نیچے زمین پر اتر گیا۔ سپاہی اس کے پیچھے بھاگ بھاگ آ رہے تھے۔ انھوں نے جھٹ اسے آغوش میں لے لیا۔ اسی وقت اس کو لگا ایک جرم غیر واپس جمع ہو گیا۔ ایک بوڑھا جو کلفت لباس پہنے ہوئے تھا۔ بالخصوص کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا: "اگر تم گھوڑے پر چڑھنا نہیں جانتے تھے تو کھڑی بیٹھ رہتے۔ بازو میں لوگوں کو پامال کرنے کیوں نکل آئے تھے؟"

چار آدمی زمیندار کو اٹھائے نمودار ہوئے۔ وہ بالکل مردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد چڑچھا تھا اور اس کی ٹوپی ٹیر ہی ہو کر خاک آلودہ ہو چکی تھی۔

بوڑھا بولا: "اس بڑھیا کو کسی ڈاکو کی دوکان پر لے جاؤ۔ ہم پولیس اسٹیشن کو پہنچے ہیں۔ آدمیوں کا ایک خادمہ گروہ سیکڑ کے پیچھے آ رہا تھا۔ دوسرا بیویوں نے اسے تمام رکھا تھا۔ اور ایک نے اس کے گھوڑے کو پکڑ رکھا تھا۔ بالکل اسی اہل وقت سیکڑ کے اہل و عیال کی کتنی نمودار ہوئی۔ اس کی بیوی نے جو زور دیا اس میں اپنے شوہر کو دیکھا چوں کو کتنی ہی میں اتفاق ہو کر چھٹ اس کی طرف بھاگی۔ سیکڑ اسے کہنے لگا: "بات کچھ نہیں یہ بڑھیا سیر گھوڑے کے نیچے لگی۔ میں ابھی گھر واپس آ جاؤں گا"

پولیس اسٹیشن پر سوالات نہایت مختصر تھے۔ سیکڑ نے اپنا نام اور ملازمت کی جگہ پولیس والوں کو بتا دی۔ ایک سپاہی بڑھیا کے متعلق خبر لایا اور کہنے لگا کہ اس کا نام دام سامن ہے۔ وہ پچھلے سال کی عمر رسیدہ عورت ہے اور تمام عمر خادمہ کا کام کرتی رہی ہے۔ وہ اب ہر ش میں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر وہ بڑی کلفت میں ہے۔ جب سیکڑ نے شکار گروہ ذہن ہے تو اس کی جان میں جان آئی اور اس نے

بعد کیا کہ وہ بڑیا کی بیماری کے تمام اخراجات برداشت کر لگا۔

سیکڑو ٹیسٹیشن سے فوراً اس ہسپتال میں پہنچا جہاں بڑیا بیٹھائی گئی تھی۔ دوا دینے پر ان دنوں ایک جم غفیر کھڑا تھا۔ دو ڈاکٹر اس کی تشخیص میں مصروف تھے۔ کہنے لگے "اس کی بڑیاں میچ و سلامت ہیں۔ محض یہ کہ کہیں اندرونی طور پر کوئی ضرب پہنچی ہو؟"

سیکڑو نے بڑیا سے پوچھا: "کیا اتنی زیادہ تکلیف ہے؟"

"اں میں بڑی تکلیف میں ہوں"

"کس جگہ زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہو؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندرونی اعضا آگ میں جل رہے ہیں۔"

ڈاکٹر آگے بڑھ کر سیکڑو سے مخاطب ہوا "کوئی آگ ہی اس علامت کا موجب ہو؟"

سیکڑو نے کہتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں"

"تو اس بڑیا کو علحدہ صحت گھر میں پہنچا چاہئے۔ وہ پھر ایک روزانہ پر اسے داخل کر لیں گے۔ کیا اس کا انتظام کر دیا جائے؟"

سیکڑو نے بڑے خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان سے گھر کو چلا گیا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی۔ اسے دلا سہ دیتے ہوئے اس نے کہا "پھر ڈیوٹی۔ اب تو اس کی حالت بہت بہتر ہے۔ میں نے اسے صحت گھر میں ڈھونڈ دیا ہے۔ وہ تین روزہ میں صحتیاب ہو جائیگی۔"

دوسرے روز کا کچن کے بعد وہ علامہ سائمن کی تیمارداری کو گیا۔ وہ مڑے لے کر بجلی پی رہی تھی۔ سیکڑو نے پوچھا: "اب کیسی ہو ماما؟"

"بڑیا نے جواب دیا: "خاک آگام نہیں میں تو زندہ و مدھور ہوں۔"

ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ بڑیا تین روزہ تک صحت گھر میں رہے۔ ماما اگر کوئی پیچیدگی رونما ہو جائے۔ تین روزہ کے انتظار کے بعد سیکڑو پر ایسا کی تیمارداری کو گیا۔ اس کی جلد اب بالکل صحت پر مبنی تھی۔ اور اس کی سنجھیں ایک دہری تھیں۔ مگر جو بیوی اس نے سیکڑو کو آتے دیکھا۔ وہ چلنے لگی۔ میں حرکت تک نہیں کر سکتی۔ اسے اب تمام عرصہ اسی حالت میں رہوں گی۔"

پیشہ سیکڑو کو کہہ کر برآمد ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کے مریض کی حالت دریافت کی۔ ڈاکٹر نے تجاویزیں دے کر صحت پریشان ہوں۔ جب ہم اسے اٹھانے لے ہیں یا اس کی چارپائی کا مڑ باندھنے لگتے ہیں تو یہ مگر پتہ نہیں چلے لگتی ہے اور میں اس کے بیان پر یقین نہ کر سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک میں اسے لٹا نہ دیکھ لوں میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعی ٹھکانا ہے۔"

بڑیا نے تھکے انداز میں ڈاکٹر کے یہ الفاظ سنے۔ ایک ہفتہ نہیں دو ہفتے، حتیٰ کہ ایک ہفتہ گزر گیا مگر ماما سائمن چارپائی چھوڑنے کا نہیں لیتی۔ سب کو کھٹ لگتی تھی۔ جسم پر گوشت بھی آگیا تھا۔ وہ دوسرے مریضوں سے خوب تمیزی کرتی تھی۔ یوں صلوم ہفتہ تھا جیسے پچاس سال کی جاں فشانی کے مدد و زندگی کے باقی تمام آرام سے چل پالی پر بسکنا چاہتا ہے۔

سیکڑو ہر روز ہی اس کے پاس آتا۔ اور اسے اسی حالت میں پہنچے چلتے دیکھتی۔ جب وہ گھر واپس جاتا تو اس کی بیوی مشکہ ہو کر پوچھتی: "اب ماما ہی ہے؟" سیکڑو اس کا انداز میں جواب دیتا۔ بالکل اسی طرح۔ تھکان کوئی فرق نہیں۔"

انہوں نے خادم کو بھی معزول کر دیا۔ کیونکہ بڑیا کی بیماری کا خیر نہ آنے کے باعث خادم کی آخر کار وہ ایک مزید بوجھ محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے حتیٰ المقدور کفایت شغلی کی۔ سیکڑو نے بڑیا کی حالت پر غور کرنے کے لئے چادر انہوں کی خدمات طلب کیں۔ جب وہ نقیض کھڑے ہوئے تو ان دنوں سے یہ کہا: "بڑیا کو کھانا دے کر چلا چاہئے۔ یہ سیکڑو چلا جائے۔" بھلے اس وقت میں ہرگز نہیں چل سکتی۔"

انہوں نے ماما کو سہارا دے کر خدمت دم گھٹایا۔ مگر اس نے اپنے کو ٹھہرا کر فرش پر گر لیا اور اس زبرد سے چلائی کہ انہوں نے مجبور ہو کر سے پھر چارپائی پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے اپنی اپنی تشخیصیں مختلف تھیں مگر حقیقت بتا دیا کہ "بڑیا اب کام کمان کر لینے قابل نہیں رہی۔"

جب سیکڑو نے یہ مسئلہ اپنا بیچ کر دیا تو سر میں کھینچنے لگی: "اُسے میں لے آؤ یہاں خوب تو کم ہوگا۔"

سیکڑو نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: "کیا ایسا ہوگا؟" وہی جواب دیا کہ "یہ تو میرا کام ہے کہ میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہو؟"

طاسر قریب (دنی شے):

(توجہ)

بے اختیار ہوں پر خنداز ہو جاتے ہیں۔ جو خود ناکارہ اجل ہونے کے باوجود اپنے نیچے اُبلتے ہوئے طوفان کی تڑجائی کر دیتے ہیں۔
میں نے کہا یہی سوچ رہا ہوں کہ دنیا الٹی کیوں نہیں گھوم جاتی۔ وقت کی رفتار معکوس کیوں نہیں ہو جاتی!!
”کس لئے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لئے کہ اپنے گلے میں تھارے ٹکڑی بازو حاصل دیکھنے کی اذیت کو محسوس جانے کے لئے مجھے اُن گزدرے ہوئے ایام کی ضرورت ہے جب مجھے اس کا خیال ہی نہ تھا۔“

”تو تھیں اس چیز کا انتظار نہ تھا۔“

”مجھے اس کا طبعی مذاق نہ تھا۔“

”لیکن تم اب اس کو اذیت کچھ کو محسوس کرنا کیوں چاہتے ہو؟“
اس نے اپنے بازو میری گردن سے جدا کر کے ہوتے کہا۔

”اس واسطے کہ میں تمہیں محسوس جانے پر مجبور نہ ہو جاؤں۔“

چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی اور تاج محل پر شام کو آتیوں کا جو ختم ہو رہا تھا۔

اس نے ٹھوکر آواز میں پوچھا: ”میں بھی نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟“

دھڑکنے ہوئے دل کے ساتھ میں نے یہ الفاظ منے۔ اور اپنی ساری حسارتوں کو جیت کر کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔
”تم چاہتی ہو کہ میں تم سے محبت کروں اور تمہارا ہو جاؤں۔ تمہیں اپنا بناؤں؟“
میری آواز کھل گئی۔ میرے ہاتھوں ایک رستی چمکی سی گئی۔ دور دوری تھی۔

یہ خاموش جواب تمہارے سوال کا!!

میں نے لڑنے ہوئے ہاتھوں سے سکوت کے ساتھ اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور گینائی کی پوری تصویر منہ کر کے بولا۔ لیکن جاتی ہو حضرت، اس کا انجام کیا ہوگا؟
”کیا؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”شادی!“

”پھر؟“

”پھر۔۔۔ آسودگی۔۔۔ افسانہ لالہ جنابیت۔۔۔ افسردگی۔۔۔ بلی اور۔۔۔ جسدِ بلی۔“

اس نے خاموشی کے ساتھ سر ہکا لایا۔ میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ وہ میرے خیالات کو کہاں تک سمجھ رہی ہے۔ لیکن نا کس

تیر دو گلاب کے بھول۔ ایک دوسرے سے اس قدر وسیع۔
— ایک دوسرے کی پاکیزہ محبت میں سرشار۔ یہ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہیں۔ جو تم سوچ رہے تھے؟
”ہم سوچ رہے؟“

”یہی کہ تم مجھے محبت کرتے ہو۔“ اس کی آواز میں تھوکی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے متانت کے ساتھ پوچھا: ”تم کس بنیاد پر ایسا کہتی ہو؟“
اس نے اسی طرح نظریں جھکا کر ہوتے کہا: ”اس بنیاد پر کہ میں یہی تم سے۔“

اس کی عمر میں کلانی پر میری لڑکت ایک نشید ہو چکی تھی لکھ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی بڑھوت سیلاب میں میرے پاؤں زمین سے جدا ہو گئے ہیں۔ جذبات کے اس حشر خیز بوجھ میں جس کی یاد کا احساس آج بھی میرے ہوش کی قوتوں کو لرزادیتا ہے۔ خدا معلوم میں نے کیا کہا اور کیسے کہا۔

دھڑکنے ہوئے ہوش سا آ رہا تھا۔ ایک آندھی جی کہ چند لمحات میں آئی اور پھٹی گئی۔ میری آنکھیں کھلیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور اس نے۔۔۔ آہ اس نے ایک بے پناہ کشتی کے ساتھ میرے کچلے ہوئے (پانی مناسب) ہیں غائلے کر دیں۔

یہ دوسری ضرب تھی میرے جذبات کے آئینے پر!

مگر اس دفعہ بڑی کی بجائے ایک خود دارانہ شعور میری روح پر طاری ہو رہا تھا۔ میرے دل پر ایک طوفان کی سی خاموشی سونپی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کبھی سے اختیار سے بغاوت کر کے کچھ کہہ رہا ہوں۔ مجھے میں یا حضرت کوئی بھی نہیں ٹھیک۔ مگر حضرت شکرا رہی تھی لہذا اس مخصوص انداز میں جو فطرت صرفہ ایسے ہی موقع کیلئے عہدت کو کھاتی ہے۔ اُس کے قسم میں ایک آرزوئے غموض ”مطلوبہ“ وہ آندھوں کے دلہا کا چین طرزِ مصنفہ ایک نوجوان شوقِ دستِ بیزہ ہی جانتی ہے۔ اور جس کے سامنے نرینہ کا کوئی مرد کج رنگ لڑہ بلا غلام ہو کر بیٹھ نہیں رہ سکا۔

”کیا سوچ رہے ہو تو؟“ اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

کون جانتا ہے کہ جب عورت اس طرح کچھ بولتی ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے! آگ پر اُبلتے ہوئے پانی میں جس طرح بے غلہ جنب پیدا ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جنبات کے خیال میں انسان

زبردست احساس میں مگھٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

”وقت کا پیچھا چھوڑنا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لفظ کے بغیر مجھے ساتھ چل دی۔

وگھڑیہ پارک کی اس کشادہ روش پر جو عذوب آفتاب کے ساتھ ساتھ ہی ہزاروں تم کے چھوٹوں کی مستانہ ٹھٹھ سے محو ہو جاتی ہے۔ حادی کا رخاں خراباں حادی تھی۔ میں نے نہایت دیکھتے ہیے میں اس سے پوچھا۔ ”کیا نتیجہ نکالا تم نے عشرت؟“

”صرف ایک تبصرہ۔ وہی جو ہر شخص تمہاری گھٹگو سے اٹھ کر نکلتا ہے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ تم معصوم و کم سن بچوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی جی کو کھول دینا چاہتے ہو۔“

”تقلید پرستی کے آثار کس درجہ حادی نظر آتے تھے۔ اس کے اس خیال پر!“

”سفر عشرت۔“ میں بولا۔ ”تمہاری دنیا میں جس چیز کو اب تک محبت کہا گیا ہے اس کا دیر پاکیو نہ نہیں۔ اگر گس ہے۔ ہزار گس اگر گس!!“

اپنی روح کی ساری قوتوں کے ساتھ کسی کو اپنے شوق و محبت کا مرکز بننا تو دنیا کے اپنی ملک بنانے کے لئے بنیاد ہوتی ہے۔ کیا یہ تفکر نہ آنے کے قرآن ہیں؟ محبت ایک خود غرضی ہے اور خود غرضی سے نہ اپنے

نظر پرورد کو کسی ہے کہ اسے اگر گس سے منسوب کرنے میں پسندیش کیا جائے؟“

”نہ اپنے حلاوت! اس نے کار کے معیار و رفتار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔“

وہ اس طولانی گفتگو سے کٹا گئی تھی۔ میں نے ایک لمحہ کیلئے اس کی طرف دیکھا۔ حسین جبین پر وہ معصوم مل تھاں ملاتے۔

”تم ناراض ہو گئیں عشرت؟“ میں نے ایسے اندر دیکھ کر پوچھا۔

”جس میں کہا کہ مجھے اپنی آواز اپنی محسوس نہ ہوتی تھی۔ شاید میں نے سچ تک کوئی بات اس پر میں نہ کہی تھی۔“

مگر وہ خاموش تھی۔

اور اسی طرح وہ خاموش رہی۔ صبح کے بعد شام اور شام کو صبح دے پاؤں چپ چاپ میری زندگی کی دھڑکن سے گھڑتی چلی۔

تو میری خوشنود کے مشاغل میں اب عشرت کے لئے باقی نہ رہے۔

مگر اس کی عدم موجودگی میں اسی جیسے اور بہت سے ”لطیف رب“ سترم رہتے تھے۔ کچھ دنوں میں آداسی رہا لیکن آخر حال نے ماضی کو فراموش کر دیا۔

میں نے ملک حیات کے آغوش میں اب اگر کوئی ”چاند“ نہ تھا تو کیا۔ تابناک ستاروں کا ایک جوم۔ کھٹکنا تیس۔ یہ سب کچھ تو ابھی باقی تھا۔ میری رات ابھی بالکل دیران نہ تھی۔

مگر آخر یہ رات بالکل اندھیری ہو کر رہی۔ کالے کالے داؤں ہیبت تک بلاؤں کی طرح آئندہ آنے اور میری زندگی کے سارے ستاروں کو میسر ”چاند“ کی طرح کہیں چھپا دیا۔

ان سب نے بھی وہی کہا جو عشرت نے کہا تھا۔ اور پھر وہی کیا جو عشرت نے کیا تھا۔

میرے معصوم بکریا سدی دنیا کا انداز نگہ غلط ہے۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ہی دیوانہ ہوں۔ دیوانہ۔ فراموش کار۔ اور غرض پرست؟

دل میں غلش ہی ہے۔ آداسی! لیکن سوگواریاں جھڑ پرستی نہیں ہو سکیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہاں حیات کی کسی نے حادی و دستوں کو چین لیا ہے۔ کوئی چیز جو ان تمام دستوں میں سائی تھی ابیں چھن گئی ہے۔ کوئی چیز اور اک کے صدد سے توجہ

تر۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ چیز ایسی نہیں جسے زندگی کا اسم ضروریات سے کہہ سکتے ہیں۔ فراموش نہ کر سکیں۔

دواہ ہوئے ذبیح میری شریک حیات ہر ملک ہے۔

وہ ایک تیس سالہ بیوہ عورت تھی۔ سلع کی تنگ نظری کی عروج۔

جناب پرست دنیا کی ٹھکانی ہوتی۔ اب تک اس نے فاقوں کی جاں نثار ماذنیت اور آئندوں کے درمیان شام کو مسج کیا تھا۔ اب وہ میری شریک زندگی ہے۔ مسرود۔

بے فکر!!

مجھے اس سے محبت نہیں۔ دنیا کہتی ہے کہ بے تو کہنے دو۔

ہاں مجھے اس سے محبت نہیں اور وہ جذبہ بے اختیار

جسے میں پسندیدگی کہتا تھا۔ بقائے ذات کے لئے میں کھانا پیسٹا ہوں۔ کام کا تاہوں اور موتا ہوں۔ بقائے جن کیلئے میں نے اس سے

شادی کی!

مگر وہ کہتی ہے ”مجھے تم سے محبت ہے۔“

یہ قوت کہیں کی!

مسعود جاوید

میسے جیون کا اندھیارا

بنگالی زبان اور سماج کا ایک نقشہ

نہیں ہے۔ جتنے اچھے گھر بیٹے اور بڑا جہیز دینے کی اوندھ ننگی کے آراموں کے جو جوتے میں نے بنائے تھے وہ سب مٹ گئے۔ یہ کہہ پتا چلی کہ کیا اس لیے لگے۔ میں نے انہیں دلاسا دیا۔ اور وہ طوفان کی رات میں میں نے اپنے باپ کی مالی تباہی کا حال دیکھا رو رو کر گنڈا روئی۔

میسے پتا چلی کہ موت اس صدمہ کی وجہ سے خواب رہنے لگی۔ میسے کہہ جانے اور دلاسا دینے کے باوجود ان کی کوئی دھار اس زندگی میں نہ دیکھا۔ آخر ایک دن وہ ہی ہوا جو ہونا تھا۔ شام کو دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے دو آدمی پتا چلی کو گودی میں لے ہوئے مکان پر لپکے آئے۔ معلوم ہوا کہ کیا ایک ان پریشی کا دورہ پڑا اور وہ کڑی پرے دھم سے گر پڑے۔ ڈاکٹر بلاوا گیا۔ مجھ ڈاکٹر نے دیکھا کہ مایوسی کا اظہار کیا اور دو ہی دن میں وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

موت اور تباہی انسان کے کس قدر قریب رہ چکا ہو گئی ہوئی گزرتی ہے اس کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔

اگرچہ اما کے گھر مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی مگر مایوسی طبیعت کی عورت تھیں۔ اما اگرچہ میری خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے مگر پتا چلی کے گھر کا سا آرام کہاں۔ اول تو ماما جی کا خود کنیز بیت تھا۔ دوسرے آمدنی معمولی۔ چھ بیٹے تک تو میری عاصی آؤ بیگت ہوئی رہی۔

مگر اس کے بعد شادی تک ماما کے گھر میں جو میری مدد کرتی ہوئی خانہ کوشن پریمی بن چکا تھا۔ ماما نے مجھے ایک فنوں بڑھ رہا اور وہ ماما سے لڑنے لگا۔ جھگڑنے لگیں جس کی کچھ نہ کچھ وجہ مجھے متعلق ہوئی تھی۔

میں اب چودہ سال کی ہو چکی تھی، اور شادی کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ ماما کی کسی شوخی تھی۔ مگر جب کوئی میری لڑکا جہیز میں دیکھتا تو میرے لیے نیک میرے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ میسے ماما خود ایک غریب آدمی تھے اور میری شادی میں جہیز دے ہی کیا کتے

یہ کہانی ہے ایک اندھ صابرے جیون کی، ایک پر شور و طوفانی زندگی کی جس میں لطف و انبساط کی گھڑیاں چند اور مصائب، آلام و تپت کے خود آن گزرتی ہیں۔ میں ایک معزز باپ کے ہاں پیدا ہوئی تھی اور ایک سرکاری ملازم تھے اور میں ان کی اگلی روٹی تھی۔ آواز نغمہ بنی تھی کیونکہ میری ماما کا انتقال میسے بچپن میں ہو گیا تھا اور میسے تپا کینے سوائے میسے کوئی اور چیز نہ تھی جس پر وہ اپنی کوہنہ، دولت اور جان نثار کر سکتے۔ میری تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے پیش و آرام ایسے وسیع پیمانے پر ہوئے کہ مجھے اسے امیر لڑکیوں کو بھی سیر نہ آئے ہوں گے۔ میرا پورا نام سر تر بالا تھا۔ مگر پتا چلی مجھے ستر کے رس جسے نام سے پکارتے تھے۔

دن کے بعد دن گزرتے چلے گئے اور میں ہوشیار ہو گئی۔ ایک شام جبکہ موت آمدنی اور بارش کے طوفان کے تمام کائنات کو لپکا پیا رکھا تھا میسے پتا چلی کا حال گھر واپس آئے ان کے جسم پر بالوں کے آٹا پائے جاتے تھے اور میں اُداس دیکھ کر ان کے قریب نہ جی دیکھا ان کے چہرے پر آنکھوں سے ڈھلکے ہوئے چند موٹی بکھرے ہوئے تھے۔ میں یہ ماجرا دیکھ کر گھرائی کیونکہ میسے پتا چلی میں خوش ہونے والے لوگوں میں سے تھے۔ کبھی ان کو اُداس و شکر نہ دیکھا تھا۔ ہر وقت ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے رہتے تھے۔ آج کی حالت دیکھ کر مجھ پر گئی اور پتا چلی سے لپٹ کر پوچھا۔

”پتا چلی کیا ہوا۔ میسے اچھے پتا چلی آپ پریشان کیوں ہیں؟“ پتا چلی نے میسے سر پر ہاتھ پیرکتے ہوئے جواب دیا۔ نادان لڑکی میسے امدادوں کی دنیا فاکس مل گئی ہے۔ جتنے اچھے اچھے بہت تیری زندگی اور آرام کے بنائے تھے سب ختم ہو گئے۔ میرا دلیر میں تنہا، جتنے حلوں ہے، میری بیٹی، میری زندگی کا سہارا، ساری ٹکٹوں زندگی کا بیج کیا ہوا، رو پیسہ ابی تنہا میں تنہا وکیل ہو گیا۔ پیادہ ستر میں بالکل بھٹکا ہو گیا ہوں۔ ایک کوئی ہی نہیں

ملنے نہ کی جو گنا یا سی موز مدار کی بنانی مگر کھانا گیا۔

بال کھول کر شکاہی تھی اور آہستہ آہستہ ٹپل رہی مگر کچا کچا میری
تفطیر لڑکے پر پڑی جو مجھے برابر کے مکان سے گھور رہا تھا۔ لڑکا باری
کی دھج سے زرد مرد اور بہت لاغر تھا۔ وہ اس قدرہ نظر تھا کہ براہِ میری
طرف گھورے جا تھا۔ میں اس کی یہ بات دیکھ کر غصے آئی لیکن میں
کے بعد میں نے دیکھا کہ جب بھی میں کوٹھے پر چڑھتی وہ زرد و سیاہ لڑکا
مجھے ہانکنے کے لئے آجھڑتا۔ مجھے یہ بات از حد ناگوار معلوم ہوئی۔

اور میں نے اوپر جا بھاڑ دیا۔ مگر ایک اور طرف سے فوجش ہوئی۔
ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک طرف کا بازو تھا اس سرنگ پر میں نے
دیکھا کہ کچھ لوگ مجھے کسے کی کمر کی طرف تھک رہے ہیں۔ میں
نے کمر کی بند کردی اور اس بات کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسرے روز چوٹی
میں نے کمر کی کھولی کچھ خوش فکری سے لوگوں کا پھر مجھے دیکھا۔ یہ لوگ کمر
کی طرف برابر دیکھے جاتے تھے۔ اب مجھے اس بات سے ابھی آگ ہی
لگی تھی کہ کیا بیان کروں۔ ایک بار تو ایک جوان اس دیکھ کی طرف
منہ کئے اندھاؤ صند گزر رہا تھا کہ ایک عکاس سے سے ٹکراتے اور دھرتے
مڑتے پچا۔ عکاس کوں کی یہ بدحواسی کہ میرے کمر کے کونٹوں کی بدحواسی
اس واقعہ سے بھی کم نہ ہوئی۔ میں نے حالات کی یہ رفتار دیکھ کر سب
کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازہ بند کر دیا۔ چاروں دیگ بند کر کے
میں رہی۔

مگر ایک روز میرے کوٹھے کے کمرے کے کمرے کیوں بند
کر دیں۔ کیا میں مار ڈالنے کا خیال ہے۔ صاف ہو آنے دو۔
میں ان سے بھلا کیا کہتی۔ بہت جڑ بڑھ کر کھڑکیاں پھس
کھول دیں۔

ہماری بلڈنگ کے ایک حصہ میں ایک بابو قود نام کے رہا کرتے
تھے جو میرے کمرے کے دھڑ کے درشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ میری کلاس
اور گھر کے اور لوگ بلکہ سبھی کے سبھی آدمی، فاسکرو تھیں اس
مٹھن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ تو میری فاسکرو دیکھتی تھیں۔ ابھی
دو بجے ہی کہ قود ایک آدھارہ مڑا، آدھارہ خیال اور بیوقوفانہ تنگی گند
والا آدمی تھا۔ عموماً میرے کمرے سے اس کا گھر پر لیتا تھا۔ ایک روز وہ انکے
ہمراہ ہمارے گھر آیا۔ میں گھوٹ کسے کہ ایک طرف کو بہرہ پٹی۔ وہ بات
چیت کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز پھر آیا۔ پھر ایک بار آیا۔ اور اب اس
کا آنا ایک سول ہو گیا۔ اس نے میرے درخت پر سے یہ بھی شکایت
کی کہ میں پردے کیوں کرتی ہوں۔ برا۔ دیکھو دادا میں مختار ہے مگر آتا
چھوڑوں گا اگر اب بھالی نے پردے کیا۔

نئے اور بہت پریشان تھے اور کسی بار گھر میں اس کا ذکر بھی ہو چکا تھا۔ آخر
کار ایک لڑکا خوش قسمتی سے ایسا ہی مل گیا جو باوجود اسے ہونے کے مجھ
سے شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ یہ چاہتا تھا خواہ لڑکی بہتر میں
ایک ہیسہ نہ لانے مگر خوب صورت اور خوب ستی ہو میرے لباس
رشتہ کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔

ہوتے ہوئے مجھے بھی خجسہ ملی جب میں نے یہ رشتہ تاکہ
کوئی لڑکا دنیا میں ایسا ہی موجود ہے جو مجھ ابھی کو بغیر چیز نے اپنی
بیوی بنانے کے لئے آمادہ ہے تو دل ہی دل میں میری آواز نے کہا۔
”ہے دو لڑکا جو میرے حال پر اتنا مہربان ہے تو کیا
ہوگا۔ میرے ساتھ کیسا سلوک کریگا۔ میں کس منہ سے اس بھلوں کی
تعلیق کروں جس نے میرے دو لڑکا کو ایسا زہر دل دیا ہے۔“
میری شادی اس لڑکے سے ہو گئی جو ایک زمیندار تھا خوش حال
اور نئے خیالات کا طر فدار۔ (نوجوان۔

جبے سرال میں میں نے قدم رکھا تو سب لوگ میری خوبصورتی
کو سراہنے لگے۔ ساس نے کہا یہ بہت خوش نصیب اور بھلا ہے۔ وہ
ہے جس نے دیکھا میری خوش نصیبی کی خوشخبری دی!

میرا شوہر مجھے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اب میں نے محسوس کیا
کہ مسرت اور شادمانی ہی دنیا میں کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس ہی دہانے
میں بہت آئی، بہت والی بہت، کائنات کا ہر ایک ذرہ خوش و
خوشی کی آواز ہے جسکے رہا تھا۔ ہر چیز میں ایک قسمی سرور و مسرت کا
سمندر میں لے رہا تھا۔ نیلا آسمان۔ بہرے مجھے دھت گندمی
زمین عرض ہر ایک چیز میں ایک شادمانہ خوشی و خوش کام بہرہ معلوم ہوتا
تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میری زندگی کا سہارا ابھی میرا غافل دل و
جان سے مجھے چاہتا تھا۔ اور میں اپنے دنیا کی خوشی میں سرور
دے رہی تھی۔ اس لئے کائنات کی ہر چیز میں کی انہماکیاں اپنی بہتر
سے اپنی تھی، اور شادمانی اور سکون و راحت کے گیت لاتی دکھائی
دیتی تھی۔

ہم ایک بہت بڑے مکان میں رہتے تھے جہاں کی گرائڈ
باد تھے جن میں اچھے لوگ بھی تھے اور بڑے لوگ بھی حیات کو دنیا کا
حصہ ہے کہ اچھے اور بڑے سب ہی قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا
میں نے مجھے بھی ایک تجربہ ہو جا جس کا بیان مجھے ضروری معلوم
ہے۔

ایک دن شام کے وقت میں ہانگاپنے مکان کی چھت پر

پریم کہانی

تھا۔ وہ مجھے ایک حقیر سی لڑکی کے منہ سے اخراجات کے لئے دیتا۔ اور قیہ تمام روپیہ اپنے پاس رکھتا۔ چلی کی روشنی آہ آگ کی بجائے اب وہ پھر مجھے قیل کا لیب جلائے اور آئیل اسٹوسے کھا کر پانچ گیارہ بجو کر راتا۔ حادثہ کے فوراً بعد اس نے موٹر فوٹ کو دی اور ریڈیو کسٹ بھی اس ہمانہ سے فروخت کر ڈالا کہ وہ اس کی آواز سے بےزار ہوتا ہے۔ بس اوقات ہمارے کپڑے بوسیدہ رہتے۔ اور اگر میں بسے یا بالاس خریدنے کو گیتی تو نصف سے آگ بگولا ہو کر مجھے کو سننے لگتا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت فضول خرچ ہوں۔ حالانکہ میرا مطالبہ محض ضروریات زندگی کو دور کرنا ہوتا۔ چند تیرہ برسے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تمہارے علیحدگی اختیار کروں۔ مگر پھر مجھے اس کی حالت پر حیرت آجاتا۔ گزشتہ دو سال اس نے مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ لہذا میں اس کی بساط غنیات یاد کر کے اس ارادہ سے باز رہتی۔ میں نے سوچا کہ کچھ عرصہ بعد وہ خود مجھے اللہ لے گا۔

اب تمہارے ایک اور عادت بدلنا چاہی ہوگی۔ تمہاری کہ وہ اکثر نصف شب کے وقت بیدار ہو کر مکان میں ادھر ادھر گھومتے لگتا تھا۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو جب اچانک میری آنکھ کھلی تو میں اسے بستر پر نہ پا کر سخت تعجب ہوئی۔ ایک لمحہ بعد مجھے طوق کرہ سے جہاں چند پڑائے صندوق اور ٹینک ویزہ رکھے ہوئے تھے کھد آواز سنائی دی۔ میں فوراً دروازہ کے قریب پہنچی اور کوڑا ڈرا سا ٹھول کر اندر جھانکنے لگی۔ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور کمار ایک چھوٹا سا ٹینک کھوئے ہوئے ٹیکسٹوں کی تہ میں نہایت احتیاط سے کوئی چیز چھپا رہا تھا۔ میں حیران ہو کر وہاں لوثی اور چھپائی لڑکی کو صبح تک اس معاملہ پر غور کرتی رہی۔ کیا اس نے اپنا تمام سرمایہ اس ٹینک میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے خوب یاد تھا کہ جب اس کا دلغ خراب ہوا تھا اس نے ایک کوڑی کا حساب کسی ایک میں نہیں رکھا تھا۔ اور وہی ایک برس کے دوران میں نہ معلوم کہاں روپیہ جمع کرنا رہا تھا۔ اس شب کو روٹ کر سننے کے لئے واقعہ مذکور کے چند دن بعد ایک دن دوپہر کے وقت جبکہ کمار گھر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے

میری شادی کو تقریباً دو برس گزرنے کے بعد ایک گھنٹہ ایک ناخوش گوار حادثہ نے میری ہر حسرت زندگی کو دشوار بنا دیا۔ میری خوشی ہر گھنٹہ کے صاف میں کہ ایک غفلت روا ہوا ہو گیا جو دکانی کے ہزاروں تھا۔ مجھے خود اس ام کا احساس ایک ماہ بعد ہوا جبکہ وہ ایک نیک دل و فاضل انسان کی بجائے ظالم بھوس اور جٹی بن چکا تھا۔ دراصل کمائیں یہ تبدیلی موٹر کے حادثہ کا نتیجہ تھی۔ اس کی موٹر ایک گھنٹہ ایک درخت سے ٹکرائی تھی اور اس کے سر میں بظاہر ایک خفیف سی چوٹ آئی تھی۔ مگر وہ تقریباً ایک گھنٹہ ہوش رہا تھا۔ ابتدا میں تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ شہادت ضرب کا اثر ہے جو خود بخود رفع ہو جائے گا۔ چار پانچ ماہ گزرنے کے بعد جب کمار کا دماغی توازن بحال نہ ہوا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی شخصیت اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ اس کی حرکات بسا اوقات نہایت وحشیانہ ہوتیں اور نہایت معمولی سی بات پر بھی ڈھنگ لگتا۔

میری طبیعت معمولی آدمی اور دل منسوب رہنے لگا۔ میں کوئی مرتبہ کو شش کی کہ وہ اپنی نسبت کسی ڈاکٹر سے مشورے۔ مگر وہ مجھ پر ڈھنگ سے مارنے پر آمادہ ہو جاتا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی صحت بالکل درست ہے۔ اسے خود کے میں خاموش ہو جاتی اور اس کے یہ کہنے کی حرکات نہ کوئی کہ اس کو دماغ میں خلل آچکا ہے۔ حادثہ سے پیشتر کمار چھ پر بہت جہاں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جان سے عزیز سمجھتے تھے اور ہمارے دل نہایت سکون و راحت سے گزر رہے تھے۔ بہترین لباس زیب تن کرنا پسند کیا جاتا۔ دوستوں اور عزیزوں کو دعوتیں دینا۔ ہر روز شام کو موٹر میں سیر و تفریح کے لئے نکلتا۔ غریبہ نامہ نہ پڑھتا۔ آسائش میں نہیں تھا۔ کمار ایک انگریزی فرم میں شغری بنائے گیا تھا۔ جس کی خواہ نہایت معقول تھی۔ اسل کا دستہ تھا کہ ہر ماہ خواہ لاکھ میٹر کے والے کو دیتا۔ اور میں جب ضرورت اس کو صحت کرتی۔ گویا ہم خوب تھا شے سے ہمراہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر اب کمار میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ وہ بہت بے چارہ بن گیا

چکھتا اور میری زندگی اس گھر میں نہایت مخدوش تھی۔ اب میں کسار سے علیحدگی اختیار کرنے کی تجاویز سوچتی رہی۔ میں ابھی خوبصورت و جوان تھی اور مفت میں اپنی جوانی برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بھی مضبوط تھے۔ اور میں منت کر کے اپنا پیٹ پال سکتی تھی۔

— (۲) —

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک شام کو کمٹار اپنے ہمراہ پریم نامی ایک خوب صورت نوجوان کو گھر لایا جو کئی سال سے اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ پہلے بھی چند تیرہ ماہ کے مکان پر آیا تھا جبکہ کمٹار کی حالت درست تھی۔ کمٹار نے آتے ہی مجھے کہا "کھلا آج سے پریم ہمارے ہاں رہ کر گیا کیونکہ جس جگہ وہ رہائش رکھتا ہے وہ اس کے لئے سموزوں نہیں ہے۔ میں نے اسے وہ باغ والا گھر کرایہ پر دینے کا وعدہ کیا ہے جو ہمارے مکان کے عقب میں واقع ہے" وہ پریم حاصل کرنے کی کتنی معقول تجویز ہے۔ میں نے اپنے دل میں تو ہونے نہایت خند پشانی سے پریم کا استقبال کیا۔ پریم ایک ام از قد و خوش وضع اور خوب صورت نوجوان تھا اس کی گہری سیاہ آنکھیں اور اس کے گھٹنہ کے بال نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کمٹار کا مزاج نہایت ہندی اور چڑچڑا تھا۔ مگر پریم کے بولوں پر ایک لمبی آنکھ رخصاں تھی جس دل ہی دل میں اس کی جہاں نوازی سے مشکور ہو رہی تھی کیونکہ اپنی مفادہ حالت کے منظر میں اس کی گہری خدمت نہ کرتی تھی غیر اچھوڑی ہوئی روٹی پریم کو ہی میں نے پریم سے معذرت کرتے ہوئے مسرت نواں پرلا رکھی اور جب کمٹار ختم کر چکے تو کمٹار ہمیں باتیں کرنے کے لئے چھوڑ کر کسی کام کے لئے باہر نکل گیا۔

"کھلا! پریم نے مجھ سے کہا" اگر میں کمٹار کے کہنے پر ہاں آیا ہوں مگر دراصل میں خود مختار سے ساتھ چند باتیں کرنی چاہتا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کچھ عرصہ سے کمٹار کی حالت بدل چکی ہے کیا تم بتا سکتی ہو کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اس کا دل عام صحیح نہیں رہا! میں نے ضمانت سے جواب دیا۔ "دن بدن اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جاتے ہیں اس کی مزید کوشش بھی کی ہے۔ مگر وہ اکثر سے مشورہ لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

"مختار سے خیال میں یہ اس موٹر کے حادثہ کا نتیجہ معلوم ہوتا؟" پریم نے مستطفا کر کہا۔

اس کے عزیز خاندان کا پتہ لگانا چاہا۔ میں اپنی چابیوں کا گتھا نیکو فوراً اس کے پاس پہنچی اور خوش قسمتی سے کمٹار کا ٹھکانہ کھولنے میں کامیاب ہو گئی یہ دیکھ کر میری رستہ کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کپڑوں کے درمیان ایک کثیر قسم نقدی اور نوٹوں کی صورت میں نہایت احمیات سے لکھی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ دنیا ایک ہزار روپیہ ٹھکانے میں موجود تھا۔ فی الحقیقت اس نے اپنی تمام کٹائی اس ٹرنک میں جمع کر رکھی تھی۔ میں نے چاہا کہ چند ایک نوٹ ہزاروں ٹھکانے کے غصہ و ظلم کے خیال سے لرز گئی۔ اگر اسے پرکھ لیا تو میرا پشیمانیتیں تقاضا ہو گا سے بیشتر تین چار تیرہ دھبے زور و خوب کر چکا تھا۔ لہذا میں بدستور ٹرنک مغل کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

دن گذرتے گئے۔ کمٹار کے عزیز بڑے کا خیال بروقت میرے دل و دماغ پر مستقل رہتا۔ مجھے اپنی حسرتہ حالی پر درد آتا تھا کیونکہ اب میں پہلی ہی امیرانہ زندگی نہیں کر سکتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہی پہلی ہی فارغ البالی کے ایام بسر کروں۔ مگر اتنا روپیہ پاس ہوئے کہ باوجود کمٹار مجھے ایک پانی تک دینے کا روادار نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر تیرہ پھر اسے ڈاکو سے مشورہ لینے پر مجبور کروں۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اگر اس کے علاج کے لئے آپریشن یا انیس دس کئی ضرورت پڑے تو یہی وہ بآسانی اخراجات برداشت کرے گا۔ چنانچہ ایک دن درختی ڈرے نہایت الفت آمیز ہو جس اس سے کہا "کمٹار! تم جانتے ہو کہ میں انھیں کتنے چاہتی ہوں۔ ہماری شادی کے ابتدائی دنوں میں کتنی فوجی دصرت میں بسر کرتے تھے۔ تم نے بھول کر بھی کوئی بات پردہ افغان نہیں رکھی تھی مگر اب میں دیکھتی ہوں کہ تم ہمیشہ مجھ سے متفرق ہوتے ہو کیونکہ اب اس بات کی دلیل نہیں کہ مختار سے دماغ میں ضرور کچھ غلط واقع ہو چکا ہے۔ میں تم سے منت کرتی ہوں کہ میری خاطر فقط ایک تیرہ کسی ہی مسئلہ کا پانچ سو گروہ یقیناً مختار کی حالت ابھی بھی بچاؤ کی"

جو میں سے سے اس نے یہ الفاظ سنے وہ مختار سے الگ

گھلا ہو گیا۔ مجھے بڑا ہلاکتہ ہونے اس نے دونوں باتوں کو میری گردن و بوجھ کر اس زور سے دبا لی کہ میری آنکھیں ابلنے لگیں۔ نہایت غضب آلودہ لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "غوب! تم جانتی ہو کہ مجھے یوں اپنے راستے سے ہٹا کر میری تمام عمر کی کسائی پر اپنا ہاتھ صاف کر دگی؟"

فریادیں ہفتہ تک میری گردن میں درد محسوس ہوتا رہا۔ اب میں کمٹار سے انتہائی خائف رہنے لگی۔ کیونکہ میرا شوہر دیوانہ

میرا دل سینے کے اندر شدت سے دھڑکنے لگا۔ کیا اس چاقو سے کٹا رہے قتل کرنا چاہتا تھا۔ باپنی حفاظت کے لئے پاس رکھنا سوتا تھا۔ میں نے چاقو پر ستر ہادی جگہ رکھ دیا اور خوف زدہ ہو کر دو سو کے پاس پہلی آئی۔ تمام ہاتھوں میں کسی پتیلی ہوئی خوف سے سیدہ ابھی میرے قریب ذرا آنکھوں کی ٹٹا کرتے مجھے لگ کر دکھایا۔

"تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟" اس نے غصہ سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے ڈالنا چاہا۔ مگر پریم کی موبو کی کٹیاں آتے ہی میری ہمت بندھی اور میں نے چاقو کا دھاقہ اسے صاف صاف بتادیا۔

"کٹا رہا اس چاقو کو اپنے پاس رکھ کر مت سو یا گھر مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔" میں نے فوراً سے ہونے کہا۔

"سنو،" کٹا رہے جواب دیا: "اگر تم نفع مند کٹا رہے سامان کا جائزہ لیا کرو گی تو میں ہی چاقو تمہاری گردن میں پیوست کر دوں گا۔" وہ انتہائی غیظ میں تھا والد اس کی آنکھوں سے خشک لہجے سے کہتے۔

وہ گھڑی میں تمام عمر نہ بیڑوں کی۔ جو مکان کسی وقت بیسٹو لئے گھوڑہ پیش و دستر کتاب مجھے کاٹ کھائے کو دوڑتا تھا۔ یہاں سہی ہوئی کوئی پریم جی اور کٹا رہے میری جانب رخ کئے گھڑی کی کڑی پیر کٹا رہا۔ سورج کی ادھیں شفا میں اس کے سر کو سہری بارہی میں عجز کی غصہ ناک لگا ہیں مجھے قتل کا پیام دے رہی تھیں۔ مجھے یقین نہ تھا کہ وہ کٹا رہے میری کٹا رہے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اور جس میں اپنے دن کی انتہائی گہرائیوں سے پیار کوئی تھی۔

*** (۳) ***

اس دن کٹا رہے راستہ کے سویرے ہی کام پر چوگلیہ پتہ کی میری پریم نے رات کا واقعہ میں دہلی پریم سے بیان کیا۔ اس نے مجھ کو رائے دی کہ کٹا رہے کو بروہی ہسپتال میں کٹا رہے کے دماغ کا معائنہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ دوا نہ ثابت ہو تو اس سے طبیعت کی بہت شدت سے دہلی تھی کیونکہ اس کے پاس رہنے سے میری زندگی محفوظ رہی تھی اور جان بچ کر ہلاکت میں بڑا سخت نادمی تھی۔

"- ذہن کر دو کہ ڈاکٹر اسے دوا نہ دے اور وہیں ڈیڑھ گھر آتے ہی وہ میرا خالق کر دے گا۔" میں نے گھبرا کر پریم سے پوچھا۔

"کٹا رہے یہاں ہوتے ہوئے تم اس بات کی غم نہ کرو" پریم نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں نے ان بات میں سسر دیا۔ وہ گھریٹ کے لیے بے کس کھاتے ہوئے مجھے پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہڈی سے میں دل ہی دل میں اپنی حالت پر غصہ کر رہی تھی۔

"میں اس سے بہت ڈرتی ہوں پریم۔" میں نے بالآخر جواب دیا میری آنکھوں میں آنسو آئے اور نہایت سے میں نے منہ پھیر لیا۔

"میرا غصہ یہ خیال تھا کہ کٹا رہے کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔" پریم نے کہا "اکام پر میں اس کی حکمت تعجب خیز ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ پہلا سا خوش خلق انسان نہیں رہا۔ وہ کہتا تھا کہ تم کو سناہ کرنا چاہتی ہو۔ اور وہ تمہیں زرد کو بھی کر چکا ہے۔ اگرچہ میں اس معاملہ میں تمہاری خاطر خواہ انداز میں کر سکتا تھا میں تمہیں بھول کر موجودہ حالت میں تمہاری حفاظت کے لئے میرا یہاں نہیں رہتا تھا۔ ضروری ہے کیونکہ کٹا رہے دہشت سے یہ سیدہ نہیں کہ وہ غصہ میں آکر کسی دل تمہیں جان سے مار ڈالے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" میں نے انہماک سے کہتے ہوئے کہا۔ پریم اگر تم میرے پاس رہنا پسند کرو تو میں تمہاری جیب منوں ہوں گی۔"

لگے دن باغ والا کہہ پریم کے لئے خالی کر دیا اور وہ اپنا سامان وغیرہ لے آیا۔ اب میرے دن بھر ایمان سے گزرنے لگے۔ کٹا رہے بھی مجھے فوراً کے لئے کچھ نیاں رقم دینی شروع کر دی۔ اور یہ دو وقت کا کھانا بہترین دلہنہ دینا پاتی۔ میں خود کو نے سہ سے بھلا بھلا جو ان محسوس کر رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہی سابقہ شاہ کی میری زندگی گندوں۔ مگر میں مجبور تھی۔ پریم کٹا رہے میری مجبوریوں کو بھٹاتا تھا۔ مجھ سے اس کے متعلق کچھ نہ کہتا۔

چند مہینے آرام سے گزرے ہوئے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کوئی نفع مند کا وقت بھگا۔ میری طبیعت قدرے منہمک تھی۔ اور نہ زندہ آنے کے باعث میں اپنے بستر پر گردش بدل رہی تھی۔ کٹا رہے نے سب سے پہلی چار پائی پر خوب تھا۔ ایک ایک حرکت غیر ارادی سے میرا ہاتھ کٹا رہے کے نیچے کے نیچے جگا میں گھر آکر لہجہ بیٹھی کیونکہ میرا ہاتھ کی تیز دھار آہ سے میں ہوا تھا میں نے اسے حمایت احتیاط سے تنہا کے نیچے سے نکالا۔ وہ کھڑکی کے قریب سے لگ کر چاند کی روشنی میں بہ نظر فوراً دیکھا۔ یہ ایک لباس خوب چاقو تو جو نہ روز قبل باہر ہی ملنے سے گھر گیا تھا۔ خوف کے مارے

— (۴) —

چند روز بعد میں شراکت کے ملاقات کی ادا سے کٹار کے طرز عمل کی نسبت مفصل حالات بتائے۔ میری التجا پر وہ ایک دوست کے ہم سفر لے کٹار کو دیکھنے کے لئے مکان پر آیا۔ کٹار کا غصہ اور تلخ کلامی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ جو کوئی بھی اس کے قصد کی زد میں آتا وہ اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دیتا۔ ڈاکٹر نے اس کی بدحواسی اور یہی پہلی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ قطعی طور پر دوا نہ ہو سکا ہے۔ دو ہفتے بعد میرا ڈاکٹر کھل سے کٹار کو علاج کے لئے ہسپتال کا داخل کر دیا گیا۔ مجھے کھل نے بتایا کہ میں نے اپنے شوخ کے علاج میں سخت کوتاہی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ اس کے سر میں چوٹ آنے کے باعث اس کے دماغ پر ضروری رباؤ پرچکا تھا اور یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ جو اس کے راتھوں سے ذہن بچی رہی۔ دراصل اس کی دھت نے اسے اتنا سکس بنادیا تھا کہ وہ قطعی طور پر مرد کشی پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ آپریشن کا ہونا نہایت ضروری معلوم ہوتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اس کے خلاف تھے کیونکہ اس صورت میں بھی کامیابی کی ایک قسم یہ امید تھی۔

گھر آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ ایک بہت بڑا وزن میرے کندھوں سے اتر گیا ہے۔ کٹار کو ہسپتال میں داخل کرانے میں پریم نے میری کافی مدد کی اور دو سے دن وہ خود بھی اپنا سامان وغیرہ باہر کر کسی دوسری جگہ کرایہ پر چارہا۔ اب میں نے کٹار کے خزانہ کو صرف کرنا شروع کیا۔ میں نے چند ضروری اشیاء خریدیں۔ اپنے لئے کئی عرصہ لباس سلائے۔ اور مکان کو از سر نو رنگ کر دیا کہ تمام کمرے میں میت سامان سے آراستہ کئے۔ میں نے اپنا پیالہ دوست کرایا اور ریڈیو بھی بنا عرصہ دیا۔ الغرض میں نہایت خوش تھی کہ ایک بہتر تبصرہ زندگی کی کھوئی ہوئی سڑکوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ کٹار کے علاج کے لئے میں نے ایک خاصی رقم ہسپتال میں جمع کرادی۔

پریم اب بہت کم ہنس رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ پھر سے پاس چلا آئے کیونکہ میں اسے دل سے پیار کرتی تھی۔ اور مقتضائے شباب مجھ ہی تھا کہ میں زیادہ عرصہ تک تنہا نہ رہوں۔ جب میں اپنا نیا لباس زیب تن کر کے میاؤ جانے میں مصروف ہوئی تو میرا دل بے اختیار پریم کو اپنے پہلو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میری تہ میں نے خیال کیا کہ خود پریم کے مکان پر جاؤں مگر میری بہت کمزوری تھی اور میں خاموش ہو کر رہ جاتی۔ ایک مدت میں نے برہم کو کچھ ہندو کلام کے پسند

میں نہیں کہہ سکی کہ اس وقت کیوں مجھ پر غم ہے ہوشی کی حالت طاری ہونے لگی۔ شاید یہ شب بیداری کا نتیجہ تھا یا ان نالام سہمتا کا اثر تھا جو کٹار کے سفاکانہ طرز سلوک نے میرے دل و دماغ میں پیدا کر دیے تھے۔ میرا سر جھکنا لگا۔ کمرے کا تمام ساز و سامان مجھے ناچتا دکھائی دیا اور میں بہز پر کمبیاں ٹیک کر جھک گئی۔ عین اسی وقت میں نے پریم کے بازو اپنی گھم میں جاملے ہوئے محسوس کئے۔ چند لمحات بعد میرے حواس کا ہونے تو پریم پرستور میری گھم میں ہاتھ ڈالنے لگا رہا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پھول سے پیار کرتا ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ کج کیوں خود کو دوسرا دل پریم کی طرف کھینچا تھا۔ میں غریب اور بے طور پریم کی خوش تمنا میں گری ہوئی تھی اور اس کے بازو میری کمرے کو دھت ہو رہے تھے۔

”جان سے عزیز کٹا“ پریم نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ اور بے اختیار ہو کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اس کے شیریں لب خود بخود میرے بسوں سے ہوست ہو گئے۔ رات وہ مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت سے لرز رہا تھا۔

”کٹا! اچھے صاف کر دو! اس نے معذرت کرتے ہوئے گہرا نہیں قسم کھاتا ہوں کہ ایسی حرکت کسی نہ کروں گا۔ پیاری کٹا! میں کیسے کہوں کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ کٹار کی دھت کہا لائے طاقتور لکھ کر اس کی بیوی سے میں نے معاشقہ شروع کر دیا۔ آہ! اس کتاب بزدل ہوں!“

”نہیں پریم! انصو دم دونوں کا ہے۔“ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ”آہ میرا دل بے عرصہ دھڑک رہا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم ہمارے یہاں سے چلے جاؤ۔“

”نہیں کٹا! اب ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ پریم نے ایک قسم کے جملے کہہ کر کہا۔ ”میں تمہیں کٹار کے پاس تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں ہلاک نہ کر دے۔“ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کبھی تمہارے قریب نہ جی جس بات نہ کروں گا۔“

پریم پر صبح اپنے قول کا پکا ٹھکانا۔ اگرچہ میں اسے اپنے دل سے نوکری کی کوشش کرتی تھی۔ تاہم اس کا خیال آتے ہی میرے جسم میں سے پلوں کی فحش کی ہر ذرہ قطعی ادا میں اس کے اولین بوسہ محبت کی چاشنی اپنے ہونٹوں پر محسوس کرتی کٹار کے طرز عمل میں مطلق تبدیلی نہ ہوتی۔ وہ بہت سوچا کرتا تھا۔ اس دھڑکے سونامی مجھے جان کے خوف سے تمام مدت دوسرے کمرے میں صوفے پر سونپا ہوا۔

مارکن نامی جو دائی امراض کا علاج مخصوص تھا چند روز کے ہی ہسپتال میں آیا ہوا تھا۔ لگا کر کامائے کرنے کے بعد اس نے یقین دلایا تھا کہ اپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔ اس خبر کو سنتے ہی پریم ادیس حیرت سے ایک دو سوکے کا منہ کھینے لگے۔ میں جہاں تھی کہ ایسی زبردست ذمہ داری کیسے برداشت کروں۔ اگر اپریشن سے لگا کر موت واقع ہوگئی تو تصور میسر ہوگا۔ اور اگر وہ صحت یاب ہوگا تو میرا اور پریم کا ساتھ قطعی ناممکن تھا۔ پریم کے کہنے پر میں اپریشن کی اجازت میسر دی اور ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ تجربے سے بد راجہ راجھے مطلع کرے۔ اچھے دن صبح کے وقت لگا کر اپریشن کیا گیا۔ دوپہر کے بعد میں اور پریم بیٹھے ہوئے گنگو میں مصروف تھے کہ اچانک ہسپتال سے مجھے حب ذیل پر موصول ہوا:-

اپریشن کی حیرت انگیز کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں! ڈاکٹر مارٹن

مارکا مضمون پر صدمہ جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی میں کو بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے صدمہ آتا یا دے کہ میری آنکھوں سے اندھیرا چھا گیا اور ادیس ایک دم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے پلنگ پر بیٹی ہوئی تھی۔ پریم میرے قریب بیٹھا ہوا میرے ہاتھ چوڑے یاد تھا۔ اس کے بون پر ہر محنت ثبت تھی اور ہر سانس سے پریشانی کے آثار عید تھے۔ میں سخت مضطرب تھی۔ تارک مضمون نے میرے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا تھا۔ اپریشن کی کامیابی اس امر کی دلیل تھی کہ مارکاب وہ قبل و عالم نہیں رہا ہوگا۔ جس نے تین برس تک میری زندگی کو دھمنا کر رکھا تھا۔ لگا دو بارہ خوش خلق دوسرا شوہر بن گیا ہوگا اور رفیقہ سعادت آمین بھو کی بجائے ہونٹوں پر پہلا سا قسم تھاں ہوگا۔ جس کی ایک جھلک مجھے جود یادگار تھی۔ میں اس بات سے ڈرتی تھی کہ جب وہ میری حیرت کا خیال دل میں لئے گھر واپس آئے گا تو میری اور پریم کی لفت کا نقشہ دیکھ کر کیا خیال کرے گا۔

اس تارے نے مجھے زیادہ پریم پر اثر کیا۔ متواتر کئی روز تک میں نے کھڑکھا۔ اور نہ ہی مجھے کچھ بات چیت کی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کس سوچ میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ مارکاب کو رے طور پر صحت یاب ہونے کے لئے ابھی چند ماہ ہسپتال طرنا ہے لیکن ایک ایک ہفتہ بعد جب دروازہ پر دستک نہ کر میں باہر نکلے تب مجھے یہ دیکھ کر حیرت جراتی ہوئی کہ لگا دو دنوں سے پریم کو سکون تھا۔ لگا دو گھر پہلے کی نسبت اب

بلا بھلا میں ایک پیش قیمت سا مٹی میں لمبوسے مٹی سے اس کا انصاف کر رہی تھی۔ جب وہ آیا تو میں دروازہ تک اس کو لینے گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے سرخ روشنی کے طے جیسے آثار مودا تھے۔ پہلے تو کچھ دریم رہا پڑا ہوا تھا۔ پھر ان کی نسبت بات چیت کرنے لگے۔ جواب ہمارے نزدیک عرصہ سے مرجھا تھا۔ پریم نے اس زمانہ کے واقعات سنائے جب اس کی کمار سے انتہائی دوستی تھی اور جب لگا کر شریف الطبع و دیکھل انسان تصور کیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اپنی خوشی کے بولے ہوئے ایام کا تذکرہ کیا۔ جب کتار کو مجھے انتہائی الفت تھی اور ہم نہایت راحت و اطمینان سے دن گزارتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمار کی روح حملہ درمیان کھڑی ہوئی ہماری حیدری کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

میں کمار پریم رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ میں اسے دروازہ تک چھوڑے آئی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے جانے نہ دوں۔ اور بے اختیار اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ لیکن وہ دروازے پر اکرک گیا۔ اگرچہ اس کے لب بند تھے تاہم اس کی آنکھیں اس کے دل کا راز کہہ رہی تھیں۔ اچانک ایک نامعلوم جذبہ سے متاثر ہو کر میں نے اس کا باد بچھڑا۔ ہونے محبت میری آواز میں کہا: پریم مجھ جو کومت جاؤ۔ میں بیان تنہا نہیں رہ سکتی۔ میری آنکھوں پر آنسو برے ہوئے تھے۔ اس نے دھڑے نال کیا۔ لیکن فوراً ہی پھر اپنی آغوش محبت میں لے گیا۔ کمار یاری میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس والہانہ شناسی کا کیسے اظہار کروں جس نے مجھے دوا نہ بنا رکھا۔ مجھے شادی خوشی جان سے عزیز ہے اور میں خود نہیں چاہتا کہ غیر ایک لمحہ کے لئے جدا کروں۔ میں کل ہی یہاں بچھا آؤں گا۔

اب پریم اور میں نہایت خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ میں نے خدمت کے لئے ایک ماما مقرر کر لی۔ وہی مکان جو میرے لئے سوان روح بنا ہوا تھا اب فردوس میں ہے۔ میں نے کمار سے شادی زندگی قابل رشک تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ ہماری یہ حیرت ابدی صحت اختیار ہو رہی ہے۔

*** (۵) ***
دل نہایت مہنی خوشی گزرتے گئے۔ لگا کر خیال قرینا قرینا جسے دل سے خوب چھوٹا تھا کہ بکثرت بجلی کی شعلت کے ساتھ پھیلنا لگا۔ ایک عجیب موصول ہوئی میں اس کے دل کے دل کا اپریشن کرنے کیلئے لگا جانے طلب کی گئی تھی۔ انگلستان سے ایک ماہر ڈاکٹر

قدسے بیعت دلاؤ تھا نام اس کی سبکوں میں وہی بیٹی سی بخت کی
چمک تھی جو ہمارے ابتدائی زمانہ میں تھی جو دنیا باریگرتی میں کافی
دیہوت رہنے کے بعد بکھلت بکا اٹھی "گمار" میرے پیارے گمار
یقیناً تم باکل تندرست ہو گئے؟

"ہاں" اس نے مجھے حاسد از نظروں سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ اس کا ہر قدرے تاسف آمیز تھا۔ شاید وہ اپنے پرانہ اندہ خیالات
کو بھیک کرنے میں شکیست محسوس کر رہا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے؟" گمار نے کہا۔ "جیسے میرے
دل میں سے کوئی تار تک پردہ اٹھ گیا ہے۔"

میرے اشارے پر وہ مکان میں داخل ہوا۔ اور آتے ہی
کھرکی کے قریب اپنی دیرینہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے ساز و سامان کا
جائزہ دیتے ہوئے وہ بولا۔ "تم نے مکان کی آرائش میں نمایاں تبدیلی
کی ہے۔ خوب آئیڈیوکی یا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس پرلے ریڈیو کا
کیا ہوا؟"

"تم نے خود اسے مرصع ہو افروخت کر دیا تھا۔ کیا تم بھول گئے
ہو گمار؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔" اس نے ماتھے پر شکن ڈالکر دوسرے
پرہیزگیزی سے ہونے لگے گنگو موڑ کے حادثہ سے قبل کے واقعات
جن میں کئی سال پہلے میں میں زبان آسانی سے سمجھ سکتا ہوں۔ لکھا:
میرزا خاں ہے کہ میں تھیں کالی حرم تک ایذا پہنچا گمار؟

"گمار! میں نے غرضی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہارا قصور نہیں
تھا۔" میری آنکھوں میں آنسو میرے آنسو میں آگے نہ کھینچی۔

"پہرے میں تو مجھ سے ملے ہسپتال آ رہا تھا۔ گمار نے بکھلت
سینہ پر ہر کہا۔

"تم سے ملنے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں" وہ کہتا تھا تم دونوں ایک دوسرے کو دل سے

چاہتے ہو۔
"گمار! میں بخت نام ہوں کہ میں نے تم سے بیوفائی کی؟ میں

نے بڑی جھل سے رک رک کر یہ الفاظ ادا کئے۔
"اس بات کی ضرورت نہیں؟" اس نے فوراً کہا۔ "پریم نہتا۔

غیب محبت و شکر آدی ہے اور یقیناً مجھے بھالت میں ہی سمجھو
اس نے مجھے تمام واقعات میں دشمن متادے دیے ہیں۔ شاید بخت
ہو کہ اگر میں لاطمی میں مکان پر آیا تو تمہارے داندے آگاہ ہو کر میرے

دل کو صدمہ نہ ہوگا۔"

میرا جسم لرز اٹھا۔ میں عجیب کش کش میں مبتلا تھی۔ میرے
لے پریم کو بھونچنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ اس کی بدولت میں نے نئے صدمے
سے زندگی میں متوسل حاصل کی تھیں۔ وہ میری زندگی کا جزو لاینفک
بن چکا تھا۔

"گمار! اب صرف تم ہی اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہو گمار۔
نے میرے چہرے پر ہلکے سا جاکر کہا۔ "پریم یا گمار! تمہیں دونوں میں سے ایک کا
انتخاب کرنا ہوگا۔"

"گمار! مجھے معاف کرو؟" میں نے اپنے بھائیوں کو مشکل
دا کرتے ہوئے کہا۔ میں بہت ہی محنت سے یہاں پہنچا ہوا ناممکن ہے۔
اس لئے میں نے تمہیں اپنے دل سے محسوس کیا۔ میرے نزدیک تم
بالکل ہر کچھ تھے۔ آہ میں نے شباب کی لذتوں سے محروم ہونے
کے لئے کس قدر غلطی کی۔ اور کتنی بھلت سے کام لیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ
تمہاری محبت کی یاد میں مصیبت کے دن گزار دوں۔" میں نے دونوں
ہاتھوں سے منہ چھانپ لیا اور زار زار رونا شروع کیا۔

چند منٹ بعد جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گمار بدستور
میرے پاس کھڑا تھا۔ "بس میں صرف یہی جانتا چاہتا تھا۔" اس نے

پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس کی نگاہیں
کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ "میں تمہیں زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا۔
چونکہ تم پریم کو دل سے چاہتی ہو۔ اور یقیناً پریم ہی تمہارا انتخاب ہے۔

لہذا اب جہاں تک تمہارا اور پریم کا تعلق ہے تم مجھے اپنے نزدیک رو
ہی سمجھاؤ۔ عفو آراء سے زندگی بسر کرو۔ آٹا کہہ کر وہ دروازہ

کی جانب ہڑا۔ اور میرے اصرار کے باوجود مجھے ہٹا چھوڑ کر بہ سرعت
باہر نکل گیا۔ میں بے بس ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور کافی دیر تک روتی

رہی۔

اس واقعہ کے تیس روز پولیس نے مجھے ایک نش کی شناخت
کے لئے بلایا جو دریا سے برآمد ہوئی تھی اور جسے وہ گمار کی نش تصور کر

تھے۔ میں نے جا کر دیکھا تو نش گمار ہی کی تھی۔ اور پھر اس نے لاپتہ
ڈوب کر مکان کو خود ہی تھی۔ پولیس نے رپورٹ کر دی کہ گمار گنگو
بھٹ کو خود گنگو کا ارتکاب کیا گیا۔ مگر میرا دل ہی جانتا تھا کہ گمار کی

کہو خود واقع ہوئی۔ اس کے یہ الفاظ سترہویں کے کالوں میں گنگو نے
تھے کہ جہاں تک تمہارا اور پریم کا تعلق ہے تم مجھے اپنے نزدیک خود
ہی کہو۔" پھر اس نے اپنا آخری وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔

(ایڈیٹر: منبر)

المقام

کے بعد اس نے شاعر کے دریافت کیا۔

”کسی نہایت ہی غیر معمولی واقعہ کو متاثر ہو کر آپ نے نظم ”پرستش
کے ہوگی؟“

• تمہارا خیال غلط ہے اس نے جواب دیا۔ بڑے شرع خواہ اور دانا کے بارے میں انتہائی معمولی تحریک پر وجود میں آتی ہیں۔ نہایت کم ماری شے اعلیٰ ترین اور بڑے عید کا باعث بن سکتی ہے۔ جو کہ ادب و سو فیصدی الہام ہو کہ اسے اور خیر یا جو کہ صرف رائے نام۔ قلم تیبہ باد نہ کر اور اگر ماہوں کی تعلیم ایک جیو نیکی کی صورت اختیار ہو کہ کبھی بڑے نامندہ حیرت و امتحان ہے اس کا یہ نہ تھکے۔

شاعر نے اس کے شوک و غم کو نے کیلئے وہ واقعہ اس طرح بیان کیا

ملک کا سب سے بڑا شاعر مرثیہ کے دو بچے شاعرہ سے لڑتا
اس دن اسی کی نظم حاصل شاعرہ بھی گئی۔ اس نے ایک ادبی سالہ
کاغذ پر اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ لیا۔
قیام گاہ پر پہنچ کر شاعرہ نے اُسے اپنی نظم دکھوا دی۔

دنیا ایک زبردست دھوکا ہے،
 یہاں تک احمق مزین قیامت ہی نہیں ہیں جوہ نظر آتی ہیں۔
 اس میں بسنے والے ہر شخص نے اپنے آپ کو دھوکے میں
 مبتلا کر رکھا ہے۔
 زندگی طعناں لہریں ہے۔

ہم گنبدِ نذر کے لئے اپنی چوٹی چوٹی مسرتیں قربان کر دیتے ہیں۔

اور اپنی اس قربانی کی حقیقی قیمت کو نہیں سمجھتے ہیں۔
ہم جائزہ لے کر ناچار نظر پڑنے سے دولت میٹھے ہیں۔
اس امید میں کہ یہ ہماری آئندہ زندگی کو بڑھوتری دے گا،
لیکن ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں،
کیونکہ ہم زندگی کے خیر خواہ ملک جب دولت میں مصروف
رہتے ہیں،

اور موت کے بعد میں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملتا۔

ہماری رومیں اپنی محنت سے ادروں کو مستفید ہوتے دیکھ کر بغیر ادب و مافی ہیں۔

کیونکہ ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں اپنے لئے کرتے ہیں،
صرف اپنی ذات کے لئے!!

ملک کے سب سے بڑے خانہ کائنات میں شہیادہ حاصل کرکے ادبی
سالہ کا نائنواں ہے آپ کو خوش نصیب تصور کرنے کا عقیدہ ادا کرنے
(طبعی زاد)

پلیکٹ زن ہو مل

..... دھڑ دھڑ دھڑ.....

کوئی میری خواب گاہ کے کسے کے کوڑھونک رہا تھا۔
کب سے؟ یہ میں نہیں جانتا، اللہ آتنا خیال ہے کہ اول تو میں جیسا
کہ خواب میں الف لیلہ والی کہانی ”کھل جاسم سم اور نہ ہو جاسم سم“ دیکھ
رہا ہوں اور شاید ہی دل میں غرض تھا کہ دھڑ دھڑ دھڑ کھلا اور
اُدھر حسد اندہ ہی خزانہ ہے اور بس۔

”کھل جاسم سم“ زب لب بڑبڑا رہا تھا کہ میں نے دروازہ کھلنے
کی جبر جاسم کی آواز سنی۔ اب مجھے اپنی کرامت پر شبہ نہ تھا۔ اور
میرا دل غشی سے بلیوں بھل رہا تھا۔ مجھ دروازہ کھلنے ہی ایک
مغص غصہ (میرے پرانے نوکر کا نام) کی صحت چکل کا میری طرف
آنا نظر آیا۔ ارے یہ غصہ کہاں میرے پوشہ خزانہ کے پاس؟
میں نے دل میں کہا ”بڑا لالچ ہے یہاں بھی پیچ گیا کبوت؟“
”سرکار، سرکار!“ غصہ میرے قریب پہنچ کر مجھے جگانے لگی
کوشش کر رہا تھا۔

اول تو مجھے اپنی آنکھوں پر ہر دم نہ ہوتا تھا۔ پھر کانوں
پر۔ معاملات کی جیدگیوں کو سمجھنے سمجھنے تک کبوت نے مجھے مجھو مجھو
کر ہوشیار کرنا شروع کیا۔ اور جب اس طرح کبوت بنی تو میری عقل نے
کام کو ناسرور دیکھا ”کہاں کا خزانہ اور کہاں کی الف لیلہ کی داستان
وہی میرا گھر تھا۔ وہی خواب گاہ اور وہی میرے انوکھو غدا“

اب صفت کشوش یعنی کہ اتنی رات گئے وہ مجھے کیوں جگا
رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ تو تھا نہیں کہ شریف آدمی تین بجے صبح ہی سے
کھٹے پیٹے پھر گیا ہوا۔ چور یا شیطان تو کہیں مگر میں جس
نہیں گیا۔ غصہ تھا ہی دیکھنے دل کا بودا وہ میں سمجھا کہ ہونہ ہو ہی واقعہ
ہے۔ پر جانے میں کوئی ڈھونڈ تو ہوں نہیں لیکن بہر حال انسان
ہوں اور تنہا خانسہ بٹری ہی ہے کہ بھانجے والوں کے آگے اور ڈو
والوں کے پیچھے ہوجائے۔ میں بس اسی خیال سے بستر سے اٹھ بیٹھا
اور جائے امن تلاش کرنے کی فکر میں دماغ پکائے لگا۔

”معاذ کینے سرکار! کیا آپ کے پاس ڈھانی روپے ہیں؟“
غصہ نے خلاف توقع پوچھا۔

”ڈھانی روپے؟“ جو کچھ میں قدر شوب تھا کہ کوئی دھڑل

سوال کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ہی وہ رہا۔

”جی ہاں سرکار ڈھانی روپے“ وہ کہنے لگا۔ بالخصوص
آئے ہیں اور ان کی موٹر گاڑیہ ادا کر رہے؟

”بآخریا ہے؟“

”جی ہاں“

”تین بجے صبح کے؟“

”جی ہاں“

”تھار ادماع خواب ہو گیا یا ن کا؟“

”نہیں سلوم سرکار“

میں کچھ نہ سکا کہ بآخری اتنی رات گئے آنا کیا معنی رکھتا ہے
اور مجھ بھی تو کیسے کہ جبکہ کبوت سے اس کا روتہ میرے لگو متحرک
ہو رہا تھا۔ یا تو ایک زمانہ تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص دن ہوگا۔
جبکہ ہم ایک دوسرے سے ملتے نہ ہوں گے اور یا یہ کہ پہلے ہی ہمیں دنوں
سے ہماری ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے
مکان سے اب بہت دور رہنے لگا تھا لیکن یہ رہائش کا سلسلہ عارضی
تھا۔ اور ان کے چچا کی غیر حاضری میں وہ ”گوشہ عافیت“ کی بجائی
کہہ رہا تھا۔ ”گوشہ عافیت“ آبادی سے دور ایسا پُر فضا مقام پر
غرض خانہ جنگی تھا جس کو باقر کے چچا باقر کے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ سداغ
گرمیوں میں وہ چھتیاں منانے ٹنڈے مقام پر چلے گئے تھے۔ اور
چونکہ مکان خالی رکھنے میں صفائی اور دیکھ بھال نہ ہونے کا خطہ تھا۔

اس لئے انھوں نے بطور عارضی باقر کو گوشہ عافیت میں پھونک کر دھکا
تھکدات کرے۔ مگر میں باقر کے علاوہ پرانے نوکر چا کر کسی تھی۔

ہاں تو جب سے باقر کا قیام گوشہ عافیت ”میں ہوا تھا ہے
ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ کوئی خط و کتابت۔ البتہ ٹھکانے دن پہلے
خلاف توقع ایک لغافہ مجھے ملا۔ یہ باقر نے میرے نام سے بھیجا تھا۔ اس میں
بچیس روپے کا ایک چمک تھا۔ اداس میں مختصر ملاحظہ میں میں
یہ لکھا تھا کہ یہ رسم انھوں نے مجھے کوئی چھ ماہ قبل بطور قرض نہ
لی تھی۔ اداس چونکہ ان کی مالی حالت قسمت بد ہو رہی ہے اس لئے
انھوں نے قرض کی ادائیگی کی طرف توجہ کی۔ ملی حالت ہی کے سلسلہ
میں غالباً انھوں نے لکھا تھا کہ وہ کوئی کاروبار کر رہے ہیں۔ مجھے اس

تھی اسی طرح یاد نہیں ہے کہ کونسا کاروبار کیا تھا۔

”موتروں والا انتظار کر رہا ہے سب کا۔“

غصہ کے اس جھلنے بھجے ہو گیا۔ اور یہ جان کر کہ یہ وقت جو بچ چکا نہیں ہے میں نے غصہ کو بتایا کہ وہ دور رو پئے آگے آئے نیز کی دوا میں سے لے سکتا ہے۔ پتہ معلوم کر کے غصہ چلا گیا اور میں لہہ سنبھل کر آگے بیٹھا۔ پھر خیال کیا کہ کیوں نہ بات کر لے لیوں۔ اور واقعات معلوم کر لوں۔ اس خیال سے برابر کے کمر میں گیا جہاں آکر پہلے سے موجود تھا۔

”ہائیں! یہ کیا ہوا؟ اس حالت میں؟“ میں نے منہ سے آکر کے لباس کو دیکھ کر بے ساختہ نکلا۔

واقعیہ تھا کہ آکر کے جسم پر صرف تھیں اور پیرا جامہ تھا۔ نہ ٹوپی، نہ شیشہ، نہ دانی، نہ جوتہ اور نہ آنکھوں پر چشمہ جس کے بغیر دھار میں ہی نہ سکتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور صورت پر ہونیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا تم اس لباس میں اتنی رات گئے شہر میں محوم رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! محوم نہیں رہا تھا بلکہ سیدھا عاتقی طرح گوشہ نشین یہ مختار رہا تھا۔“

”اچھا تو تیرا تو مختار ہے ہاں کوئی ذمہ داری مل سکے گی؟“

”ذمہ داری؟ اس وقت؟“

”ہاں ذمہ داری۔ اس وقت نہیں، کل۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے تم ہمیشہ دودھ و دوا پیاں رکھتے ہو اور سب سے زیادہ کام کی بات یہ ہے کہ مختار اور میرا سب کا کل برا ہے اس لئے مختار دانی میں نہیں سکتا ہوں۔ اور ہاں شیر دانی اور جوتہ تو خیر مل ہی جائیگا۔ تم جبریت سے میرا منہ کبوں تک رہے ہو؟“ دیکھتے نہیں کہ میں بیک بینڈی ٹوڈ گوش آ گیا ہوں۔ اور کل مختار کے لباس میں زندگی کا ایک نیا دور ہی اٹھنے والا ہوں۔“

موتروں کی دیر تک خاموشی رہی۔ کیونکہ میں تو اس قدر جبریت زدہ تھا کہ کچھ کہتے بن نہیں پڑتا تھا۔ اور آکر کی حالت یہ بھی کہ گویا ہر کسی سمجھ میں ہے۔

”تمہارا کبھی عیب حال ہے، ابھی مالدار ابھی دیوالیہ۔“ آکر نے آخر کار تمہرے سکوت توڑ دی۔

میری بھڑکیں خاک نہ آئیں کہ تین بچے میرے کوئی متعلق نہیں

شیر دانی، ٹوپی اور جوتے کے چلا آتے اور پہلے کمرے میں آگے بکھڑا وہ تھی زندگی شروع کرتا تھا۔ اور پھر تجارت کے شیب و فراز پر طبع آزمائی کرنے لگے تو اس کے دوامی توازن کے متعلق کیا خیال کرنا چاہئے اسی لئے میں نے جی میں آئی کہ ہوں۔ انسان و مار کا بھیجیہ حال ہے ابھی بھڑا اور ابھی پاگل! ”مگر میں اس وقت جبکہ میں یہ فقرہ کہنے ہی والا تھا اس نے پوچھا۔“

”تھیں کچھیں رو پئے کچھ کچھ ملا ہو گا؟“

”ہاں! ملا تھا؟“ میں نے آکر کیا۔

”خیر متوقع طور پر۔ ہوں!“

”ہاں یونہی مجھ لو؟“

”ان دنوں تھیں معلوم ہے کہ میری آمدنی کیا تھی؟“ اس نے پوچھا اور جو ایک انتظار کے بغیر سلسلہ جاری رکھا۔ ”اس میں مجھ سے کہیں مدد ہے کی رقم اتنی جتنی ان دنوں کہ اس سے پہلے شاید ہی میری نظر میں اس کی اتنی کم وقت ہوتی ہوگی۔ کیونکہ میرا کاروبار دراصل اس وقت خوب دوروں پر چل رہا تھا۔“

”مختار کاروبار۔“

”ہاں اس میں کاروبار؟“

”کس قسم کا؟“

”ہوٹل کا۔ ہوا یہ کہ ذمہ داری قبضہ ہوئی جبکہ چاہا تو میں گزارنے“ ”اوتی“ چلے گئے اور گوشہ عافیت کی محنت کی۔ ”میں نے زنگنے۔ تو مجھے دفعہ خیال گذر گیا کہ اس دلکش جنگل میں اٹھایا جائے۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ کس قدر نقصان مقام پر ہے اس کے علاوہ چونکہ وہ کافی اونچے مقام پر ہے اس لئے شہر ابھی رہتا ہی میں نے سوچا کہ اگر اس کو چھپا آبا کی جگہ ہوٹل میں بدل دیا جائے تو بہت آمدنی ہو سکتی ہے۔ تم نے تین مہینے قبل اجاروں میں اٹھنا دیکھے ہوں گے کہ ایک نیا ہوٹل پرنس اور شہنشاہ مقام پر کھلا ہے۔ جہاں بہت شہرے گزریاں اور رام سے گزر سکتی ہیں۔ وہ بہت بارات دراصل میں سے ہی دیئے ہوئے تھے۔“

”جہاں تک مجھے یاد ہے تمہارے چاؤ تو مکان کو کر رہا ہے یہی دینا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ اکثر ان لوگوں کو برا بھلا کہتے تھے جو مکان لگاؤ اس لئے ہیں کہ خود میں لیکن جب وہ بن جاتا ہے تو کر رہا ہے جس میں اس کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں نے بیچ میں چل دیا۔“

کے ساتھ لڑا کہ سب سب جہان میری خاطر داریوں کے سبب ممنون احسان تھے۔

پتہ کہتا ہوں کہ وقت ایسا نرے میں گنتا تھا کہ کچھ نہ بچو۔
گپ منب، سیر و تفریح اور پیش و عشرت کا ہر وقت بازار گرم رہتا تھا۔
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب ایک دوسرے کے گھر کے دوست
ہیں۔ نہ بھائی کا ٹھکانہ میرانی کی ملکیت، بس چین سے کٹتی تھی۔ اپنی
بیابادی کے کارنامے، جنگ کی نقشہ کشی، شکست و فتح کی تفصیل کرنی
کچھ اس طرح تک ہر جگہ کرنا تھا کہ گھنٹوں گزر جاتے تھے اور
وقت محسوس تک نہ ہوتا تھا۔ شیخ جی کا رنج کیلئے اپنے ساتھی سے
الغہ جانا۔ اور اپنی برج دانی کے ثبوت میں ہیڈ و سرور کو انٹرویو
بھٹنا اور وہ سید صاحب کا کزن کو شہر دے دے کہ شیخ جی کیلئے
کھانا کرایا بڑی حرا دیتا تھا۔

تم جانتے ہو کہ پیش کے دن کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ مہینہ
ہو گیا اور مجھے کوئی نو سو روپیہ فائدہ ہو گیا۔ لیکن مجھے تو قیامت ہی کہ کم از کم
ڈیڑھ دو مہینے ہی رفتار اور رہے گی۔ اور یہی سیدی امید کچھ عیب بھی
نہیں تھی۔ کیونکہ چاہا یا کی عادت ہے کہ جب وہ سیر و تفریح کے لئے
باہر جاتے ہیں تو بھی جلدی واپس ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔
مگر ایک صبح جبکہ میں باہر گیا تھا اور سامان خریدنے میں مصروف
تھا کسی نے میرے گنٹے پر ہاتھ رکھا اور یہ انداز ایسا بے تحاشانہ تھا کہ
نے نہایت خلوص کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو سامنے میرا صاحب کھڑے ہیں۔
تم جانتے ہو میرا صاحب کو کدو چھاپا کے ہاں اکڑاتے جاتے ہیں اپنے
پورے بٹے کٹے۔!

”کیا ہے باقر، چمے تو ہو؟“ میرا صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں! آپ کی دعا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تھیں تو اطلاع مل چکی ہوگی؟“

”کابھی؟“

”تمہارے چچا بابا کی واپسی کی؟“ انھوں نے جواب دیا۔

”ہاں کہتا ہوں کہ میرا خون خشک ہو گیا۔“ چچا بابا کی واپسی
میں نے دل میں کہا۔ ”اے اب کیا ہوگا میرے انتظامات، میرا ہوش
اور وہ جو میں نے ابھی متعدد بہانوں سے چھپائی رقم حاصل کر لی
اور اس کو بڑی حد تک رنگ ریاں مٹانے میں آؤ ابھی چمکے ہوں۔
کس طرح مکان خالی کر سکوں گا، اور کیوں کہ معاملات پرفت با
پاسوں کا؟“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے“ وہ کہنے لگا۔ ”اور اسی لئے تو انھوں نے
جاتے جاتے جو مجھے نصیحت کی وہ میری کزبرداریاں مکان کا یہ پرندہ
دنیا کی نئی می سوچیں کس طرح ممکن تھا کہ میں اس بڑے مکان میں تین
تین بار رہتا ہوں خصوصاً یہ خیال پیدا ہونے کے بعد کہ اس موقع کی بہت
فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔“ خیر تو ہوا یہ کہ جو جہن میں نے اشتہارات
دینے جتنی درجی لوگ قیام کے لئے ”گورنمنٹ عاقبت“ آئے لوگ۔
وہ کچھ اس طرح ہی میرے ساتھ اشترک سل پر آباد تھے۔ اس کو میں نے
بسم اللہ کہہ کر لوگوں کو غیر ناشترک کیا۔ ابتدا ہی میں آٹھ شافر
قیام پر رہ گئے۔“

”روزانہ کیا کر لیا کرتے تھے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”پانچ روپے روز“

”کھانے کے ساتھ؟“

”ہاں۔“

”تو تو اس طرح روزانہ چالیس روپیہ کی آمدنی تھی۔“

”اندر سبج بالکل نفع گویا میں روپیہ۔ اس طرح
چھ سو روپے ہوا واقعی منافع تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ آٹا کے واپس
ہونے تک یہ کدو باجلاؤں کا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ کم از کم تین مہینے
میں واپس ہوں گے۔ اور یہ اندازہ تھا کہ انھیں اس سے زیادہ
بھی حصہ ملے گا۔“

”چھا تو تم نے خود نوش اور رہائش کا انتظام کر لیا؟“

”میں نے پوچھا۔“

”اوہ! یہ کیا مشکل تھا۔ روپیہ میں چھپکے۔ بہت سو ساف
نے ٹوکی ایک ہفتہ کے اخراجات چنگی ادا کر دیئے تھے۔ ان کی تعداد
نصف تھی۔ تین چار ہاؤس نے چالیس چالیس روپیہ ادا کر دیئے۔
اور ایک صاحب کوئی نوی چھ روپیہ دار تھے وہ غریب انھوں نے ٹوکی
ایک مہینے کی قسط ادا کر دی۔ سچا رہ کر لکھنا ٹیک ادا تھا۔ مزید
فرخندہ دھڑکی تو ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ چچا بابا نے ضرورت سے زیادہ
سامان جمع کیا ہے۔ مگر کے کو کچھ کاروں کے علاوہ دیکھ میں نے
بڑھائی دھڑ بڑا دم رکھ لئے تھے۔ کامیابی کی سب سے بڑی وجہ
یہ ہوئی کہ تم جاتے ہو میں تو جہاں بھی اچھا ہوں لیکن سب نان
کی حیثیت سے میری قابلیت بہت زیادہ اچھی ہے۔ ہمارے لوگ گھنٹا
کا ٹیکل ان کی آسائش کا کاغذ خود نوش کی پسندیدہ انشائیہ فری
میں بہت مشتاق ہوں اور اس دفعہ تو انتظام اس قدر سلیقہ

کہتے ہیں۔

میں معلوم وہ اور کیا کیا کرتا تھا اس کو منجھنے اس سختی سے لوگ دبا کہ وہ بکثرت غصے سے لرز گیا۔

"میرا ایک دوست ہے" باورچی نے تجویز پیش کرنے کی تہیہ شروع کی "وہ اخنڈے قسم کا اگر اس کی خدمات حاصل کی جائیں تو وہ بہت جلد میں اس شکل سے بجات دلا سکتا ہے۔"

مگر اس طرح ایک ہیرو نے پوچھا۔

"ایک بیچ وہ صفائی کے اسٹیکر کے لباس میں نازل ہوگا اور جسے ٹھکانا انداز میں مکان کی صفائی پر اصرار اصرار سے شروع ہوگا۔" باورچی نے اپنی تجویز دہرایا کی بیان کوئی شروع کی "آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ کچل لوگوں کو کس درجہ ضبط ہو گیا ہے کہ موروں، ہالوں اور صفائی کے دوسرے انتظامات جواب ہونے سے وہ بائیں ہستی تبدیل اس کا لحاظ کرتے ہوئے آگودہ ایک ماہر اند تئید کرے گا تو لوگ یقیناً بیمار یوں کے غصے سے جھاگ جائیں گے۔"

چنانچہ تجویز مجھے بہت معقول اور شریعہ نامعلوم ہوئی۔ موروں کے علاوہ کسی اور نے دوسری تجویز اس سے بہتر پیش نہیں کی اس لئے اتفاق آرا درجہ میں ملے یا ایک باورچی کے غنڈے دوست کی خدمات منتظرہ بقدر فوراً حاصل کی جائیں۔

دوسرے دن میں جب قرار داد اپنے ہانوں کے کمر وٹیں یہ پوچھ گیا کہ آدھی قسم کی بد تو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ سہول نے انکار کیا مگر میں برابر اصرار کرتا کہ مجھے رات بھر تیرے بعض اسٹیکر نہیں آتی تھی۔ بسے تاک میں دو گھر رکھا تھا اور یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ ہوا خراب ہو کر امکان نظر آ رہا ہے۔

شیخ بی نے تو میری بات کی طرف توجہ بھی نہ کی البتہ کرنل جو کچھ مل گیا بہت ڈرتے تھے اس لئے میں ایک قسم کا مشہور پیدا ہوا۔ کہ کہیں جو باغیہ تو نہیں مرا۔ تھوڑی دیر میں نے دیکھا کہ کرنل کی تبلیغ نے ایک ہلکا سا اشتراک پیدا کر دیا۔ میں خوش تھا کہ اندھا ایک چاہے دو آئیں۔

پچیس برس باورچی کا دوست اپنے آپ کو صفائی کا انسپٹر بناتے ہوئے پیچھا اور مکان کی نالیوں اور دوسرے صفائی کے انتظامات کی دیکھ بھال کر کے قسم قسم کے نقصان بیان کرتے تھا۔ جب کہ متعلق کہنے لگا کہ ہونے ہو کوئی جو ہمارا ہو گا تو شہر میں اکثر جگہ پرے گھر چوہوں اور چونچوہے نہیں ہوں رہا ہے کہ جو کہاں کہاں رہا ہے اس نے ضرور دی ہے

بیشرب صاحب جا چکے تھے اور میں اسی سوچ میں کھڑا تھا کہ کچھ عرصے بعد بھوش آیا تو سامان خریدے بغیر واپس ہو گیا اور دن بھر یہی سوچتا رہا کہ اس طرح مکان خالی کر اڈاں تو نامکن تھا کہ میں ان سے صاف صاف کہہ دیتا مگر چونکہ پہلی قسم اور قیام کے معاہدات میں نے کچھ اس طرح میں کہنے تھے کہ وہ مجھ پر قانونی چارہ جوئی کر سکتے تھے بلکہ مکان خالی کرانے کے لئے مجھے چاہنا تو ایک عرصہ تک جہازوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنی پڑتی۔ بالآخر میں نے اپنے ملازمین کی ایک کانفرنس طلب کی کہ ان سے مشورہ کروں۔

شام کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں اس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ جوتوں کو پالش کرنے والا ایک لاکا۔ دو بیرے۔ ایک باورچی۔ ایک غیر اور دو لوگ انیاں سب کے سب وقت مقررہ پر جمع ہو گئے۔ عورتوں کو میں نے کرسی دی اور باقی سب کھڑے رہے۔ البتہ لوگ فروش پر ہی ہل گیا۔ میں میز پر بیٹھا تھا کہ کارروائی شروع ہوئی اور میں نے واقعات "الف سے ٹی ٹی تک" سنا دیے۔ اور اس کے بعد اظہارِ انوس کے کئی ووٹ پاس ہوئے پھر تدریس میں اہ تجویزیں پاس ہوئی شروع ہوئیں۔

"میرے راستے میں" جوتوں کو پالش کرنے والے لوگ نے تجویز پیش کی "میں سب کو فوراً جوتوں کا لباس پہن لینا چاہئے اور آٹھوں ہانوں کے کمرے میں آدھی رات کے کھس جانا چاہئے اور کچھ ایسی کوئٹیں کرنی چاہئیں کہ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں۔"

ایک نوکرانی تو جوت کے خیال ہی سے ہم گئی لیکن باورچی نے یہ کہہ کر تردید کی کہ "فرغن کر و اگر ان میں سے کوئی نہ کوئی سہارا نکلا اور جوت پریت کو کھار میں نہ لایا تو۔؟"

"یقیناً کرنل تو جوت سے ڈرنے والے مفہوم نہیں ہوتے اس لئے میرے خیال میں یہ رائے فضول ہے" میں نے کہا۔

"اچھا تو یوں ہو سکتا ہے" لوگ نے دوبارہ شور مچا دیا کہ ہم میں سے کوئی اسٹیشن بیچنے اور آپ کے چھاپا کو وہاں سے ڈالے۔"

"اڈا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں میری عمر اسی گھنٹے سے ہے جو چور ایک لکھا کرتے ہیں" اس نے سلسلہ جاری رکھا اور ایسی جگہ پر انھیں قید کر کے کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ آپ ان سے وقتاً فوقتاً دیر بھی آگوشہرت ہنسے تو دوسری کر سکتے ہیں۔ اور بھوش کا کاروبار دہائی کھ پر چرند

کہ سارا مکان صاف کر دیا جائے اور فوراً خالی کر دیا جائے۔ در پیلنگ سے متاثر ہونے کے کافی امکانات ہیں۔

اس نفسی ایکٹ کے جاتے ہی لوگ اپنے اپنے بستر باندھنے لگے اور میں بہ ظاہر ان سب کی عذباتی پریشانی پر غور و نظر کر رہا تھا لیکن دل ہی دل میں خوش تھا کہ تیرنشا نہ پر لگا۔ لیکن عین اسی وقت سید صاحب جو باز آگئے ہوئے تھے وارد ہوئے اور یہی چل چلاؤ کی تیاریاں دیکھ کر حیران ہو گئے۔

”اب میں کرنل صاحب پر کیا ہے؟“ انھوں نے پوچھا۔

”چلو چلو تم بھی بستر باندھ لو“

”کیوں خیریت تو ہے؟“

”ارے میاں خیریت ویریت کہاں کی۔ یہ مکان تو پیلنگ سے متاثر ہو رہا ہے پیلنگ سے“

”پیلنگ سے؟ کس نے کہا۔“

”ابھی ابھی ایک صفائی کا انسپکٹر آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو ایکٹم کی بدولت آ رہی ہے یہ جو پیلنگ کا چارٹرنگ جس کے سپرد ہوتی ہے“

”مجھے تو کسی قسم کی بدبود مزہ آ نہیں رہی ہے۔ سید صاحب نے کہا شروع کیا۔“ تبھی آپ لوگوں کی ناک میں اس دھڑکیوں کی سوسڑ ہوئی تھی“

اس کے بعد انھوں نے متفقہ شروع کی اور سارا گھر جان بوجھ سب کے اور سب بالیاں اور ہر چیز پر غور و نظر کیا لیکن ان کی تفتیش میں نہ چھاپا ہی ملا اور نہ انھیں کہیں کسی قسم کی بوہی آئی۔

”کون انسپکٹر آیا تھا؟“ انھوں نے سلسلہ جاری کیا۔ ”معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تم اناڑوں کو دیکھ کر وہ آؤنا گیا۔ کرنل صاحب شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے بھی حکم دیا کہ پیلنگ میں چند سال ملازمت کی ہے اور صفائی کے سارے انتظامات اور چڑھوں کی بدبود مزہ سے خوب واقف ہوں اور اسی تجربہ کی بنا پر سو سو روپیہ شرط دے کر تیار ہوں۔“ نامکمل ہے کہ اس گھر میں کوئی پیلنگ کا چارٹرنگ ہو۔ بات یہ ہے کہ بہت سے بدعاش انسپکٹر وہ محاذ اپنا رعب گھٹاتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ وہ معاملات کی دوسری چیز بھی نہیں جانتے“

”تو سید صاحب آپ کے خیال میں وہ انسپکٹر کوئی کوئی لفٹنگ تھا؟“ شیخ جی نے پوچھا۔ ”اور نہیں تو کیا لفٹنگ، ہم عاشق اور دغا باز کہیں کا ہے کہ ہوتا

ہوں کہ اگر میں ہوتا اس وقت تو خوب گت بنا تا مردو کی“

”تو میرے مکان میں چھوڑنا چاہئے؟“ کرنل نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں چاہے آپ لوگ چھوڑ دیں مگر غنہ تو ہرگز نہیں جاتے گا۔“ سید صاحب نے غور سے کہا۔

”تو میں تم ہی صاحب سے سادہ ہیں۔“ شیخ جی نے کہا۔

”اور جب تم دونوں جو تو ہم بھی ہیں۔“ سمجھ لو۔“ کرنل نے کہا۔

ان تینوں کا ساتھ دوسرے پارچہ مہاؤں نے دیکھ کر تہیہ

کر لیا۔

”مگر سید صاحب انسپکٹر بلا دو۔“ مٹھوٹ مٹھوٹ کیوں کہت

میں نے اپنی ایکم کو ناکام ہوتے دیکھ کر کہا۔

”بھائی صاحب تم کیا مانو رہی تھے ہوسہارے سامنے کے

مجھے تو یقین ہے کہ وہ اصل انسپکٹر ہی رہا۔“ سید صاحب نے ناک کا تخت

کیا اور پھر اخون خشک ہو گیا۔

”کیا کہا، اصلی نہ تھا؟“ شیخ جی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں ابھی مجھے اور غنہ سے بہت سے ایسے بھکی ہیں

جو خواہ مخواہ شریفوں کو پریشان کیا کرتے ہیں“

”یہ سب اہل تو کہتا ہے کہ وہ کوئی چوروں اور ڈیلروں کا سا

تھا؟“ کرنل نے جذبات پیدا کی۔ ”آپ لوگ تو خوب جانتے ہی ہیں کہ گریٹ

اپنی ٹولی میں سے ایک ہوشیار شخص معائنہ موقع کے لئے ایک دن قبل

اس مکان میں بھیجے ہیں۔ جہاں انھیں ڈاکر ڈالنا منظور ہوتا ہے“

”کرنل نے میرے منہ سے بات چینی لی۔“ سید صاحب نے کہا۔

”مگر یہ تو اس سے بھی بُری نہ ہے۔“ شیخ جی نے ذہنی زبان

سے کہا۔

”تو یہ تم تو سہے جاتے ہو۔ ارے میاں مرد جو مرد۔ اس قن

توش پر یہ دل غورہ۔ لا حول ولا یت“

شیخ کو عزت آگئی اور انھوں نے حاضرین کو یقین دلایا کہ

وہ تو دوسروں کے خیال سے کہہ رہے تھے۔ ویسے وہ حق تھا چار

چوروں کے لئے کافی ہیں۔ اس پر کرنل نے اپنے چہرہ اور اپنی نئی بند

کا ذکر کے سب کو بہت دلائی بلکہ یہاں تک صحت صاف کہہ دیا کہ ہم

سے کوئی بھی جاگ نہیں سکتا اور جو بھی ایسی کو پیش کرے گا کرنل اس کو

اچھا جائیں گے۔ مزید یقینان کے لئے انھوں نے اپنی نعمات ہر شخص

کے لئے وقف کر دیں۔ خواب گاہ کا کہہ کھلا رکھنے کا دھمکا دیا اور ہر

شخص کے کمرے سے اپنے کمرے کو ایک تار کے ذریعہ مل کر لیا۔

”کرل صاحب مجھ آپ کے نشانہ نے خطا کیسے کیا؟“ میں نے کرل کی رعوت کو دھکا دینے کے لئے کہا۔

”ہم فوجیوں کا نشانہ خطا کرنا ناممکن تھا۔ میں نے عہد ہوا میں پستول چلایا، اگر کرل نے صورت نمونہ کا نشانہ شروع کیا، کیرم کو میرا مقصد تو قتل کرنا تھا بلکہ ڈرانا تھا اور وہ مدد کے لئے پورا ہوا گیا۔ چھ گولیوں کا پستول ہے۔ دکھا آپ نے یہ کہ کر کرل، اپنا پستول مجھے تفصیل کے ساتھ دکھانے لگے۔“

”آئیے ذرا تلاش کریں چوڑی اور کمر“ میں نے مشورہ دیا۔

”وہ کہیں دیک کر لیا تھا تو اسی ہو گا۔ اتنا نڈر جو نہیں کہلا تا۔“

اس قسم کے بہادر سوائے فوجیوں کے اور کوئی پیشہ ور نہیں ہوتے۔ کرل نے سلسلہ جاری رکھا، ”میری رائے میں تو آرام سے سو رہنا چاہئے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب کی دفعہ اگر اس نے جرات کی جسکی توقع قطعی نہیں ہے تو میں مار ہی ڈالوں گا مردود کو۔ آپ بیٹھے ہیں۔“

میں نے بھی بات نہیں ختم کرنی مناسب سمجھی اس لئے ان کی رائے سے اتفاق کیا بلکہ انھیں کہے تک چھوڑ دیا۔ لیکن رہ رہ کر ایک بے اطمینانی سی بیدار ہو رہی تھی کہ کس نے ایسی جرات کی ہوگی۔ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیکس چوڑی کا دروازہ ہونگی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور خیال ہی گز نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر اسی فکر میں مبتلا رہا۔ سوئے کے لئے لیٹا لیٹا شکل میری آٹھ لگی ہوئی کہ کسی نے مجھے جھجھوٹا۔ اور بچ کہتا ہوں کہ مجھ حیا نڈر غصے کی بھی روح فنا ہونے کے قریب ہو گئی۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی میں نے سمجھ لیا کہ ہر وہ وہ چور بگڑ چینی کی کوشش کرتا ہوں تو آواز حلق سے نہیں نکلتی۔ اور مقابلہ کی فکر کرتا ہوں تو جرات نہیں ہوتی۔

”بقرا باقرا“ میرے کانوں میں آواز آئی۔

”ہائیں یہ تو بچا کی آواز ہے۔“ میں نے دل میں کہا۔

ادب جو آنکھیں کھولتا ہوں تو بچ بچا بچا بکھڑے میں بچہر میں کچھ دن تھا کہ حقیقت ہے یا خواب۔

”بقرا یہ بادی کی کو کیا ہو گیا؟ دیوار تو نہیں ہو گیا کہ موت؟“ بچا نے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا۔

”میں گھٹیا اور آنکھیں ملے ہوئے لیٹ کر سوئے مجھے کہنے لگا۔“ جی۔ جی۔“

”بادی باقی ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔“ بچا اتانے سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اس کے ہاں پستول کہاں سے آگیا۔ کہیں کہنت نے میرا

پرس سکھا سکتا ہوں۔ ایک مدت تک ہالنگ کے حکم کے ملازمت کی ہے۔ اور یہ نہیں کہ ادھر ادھر رہا ہوں بلکہ ذمہ دار عہدہ دار کو فراموش انجام دینے ہیں۔“

”ارے بھائی اُبھتے کیوں ہو؟“ شیخ جی نے مصالحت آمیز طرز اختیار کی۔

”دیکھئے تو شیخ جی اگر کرل صاحب رعب کا ٹھٹھے ہیں ہم پر۔ میں سب کچھ بہہ سکتا ہوں لیکن دولت اور تنگ برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے لمبی کوئی فوجی کندہ ہونہ سمجھ رکھا ہے۔ سید صاحب نے مجھ بھلا کر کہا۔“

”اب آپ تو فوجیوں پر حملہ کرنے لگے، اگر کرل نے بھی ذرا تیز ہو کر کہا آپ تو اپنے پیشہ کے متعلق کچھ نہیں سکتے۔ اور یہ بھلا اپنے پیشہ کے متعلق کس طرح من سکوں گا اور پھر لوں بھی فوجی ذرا ہونے ہی ہیں تیز مزاج۔“

قریب تھا کہ دونوں میں زبانی جمع و خراج کے بعد دونوں گتہ گتہ ہو جائیں کیونکہ کرل بابا۔ اسٹین لائٹ رہے تھے۔ اس لئے میں نے بچ بچا گولیاں بھی کرل کو بھجوا دیں اور کبھی سیدہ کو روکنا۔

جوں توں کرل کے دنگ گزرتا گیا لیکن کسی نے بھی جانے کا نام نہ لیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جانے۔ اسی سویرے چار بجے شام ہو گئی اور رات کا کھانا کھا کر میں ہماروں سے ملانی چاہ کر اپنے کمرے میں واپس ہو گیا۔ نیند تو کیا آتی بستر پر کوڑیں لے رہا تھا نصف کے قریب رات گزرجی تھی کہ کیا میں نے پستول کی آواز سنی اور ایسی ہوش و داس یک جا نہ کئے تھے کہ دوسری آواز آئی۔ اب تو بستر پر لیٹا نہ گیا۔ فوراً اٹھ بیٹھا اور دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کھولتا ہوں تو کرل صاحب ہمارے پستول گھماتے اور چال میں ایک خاص بائکین پیل کے کچھ جوتے مچاتے چلے آ رہے ہیں۔

”کیوں کرل صاحب خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کہتا تھا کہ وہ اسٹین چھوڑنے کی حاجت سے نکل سکتا تھا اگر کرل نے سلسلہ شروع کیا۔ میں بستر پر نہ اوپر سے گیا اور لوں گی خیال کرنا تھا کہ ذرا ہوشیار سوؤں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ہم فوجی تینہ کے قابو میں نہیں آتے بلکہ ہم تینہ کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں جو جی میں نے بیڑھیوں پر کسی کے پاؤں کی چاپ کی آواز سنی، خود پستول جھنکا ہوا بستر سے کود نکلا اور بیڑھیوں پر کسی کا سایہ دیکھ کر چوڑی طرح فریاد کیا۔ مگر کہنت بچ کر نکلی گیا۔“

پستول تو اتھیا نہیں لیا؟

”جی! جی!“ میری کچھیں خاک نہیں آ رہا تھا۔

”یہ جی جی کیا کہہ رہے ہو؟ کہتے کیوں نہیں کچھ کہتے دیوانہ ہوا ہے کجوت؟“

”جی۔ جی!“

”معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ڈر گئے ہو بہت۔“ چچانے تسلیم کر لیا۔ ”میں چونکہ بغیر اطلاع کے دفعہ آگیا تھا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری نیندیں غفل انداز ہوں۔ اس لئے دے پاؤں نہ چمک رہا تھا کہ سیدھا خواب گاہ پہنچ چکے۔ سو جاؤں لیکن عین جیکڑیا ہوا غم کچھ کا تھا باورچی میری خواب گاہ سے نکلا اور بغیر کچھ سوچے بچے ایک شہر کی لڑکیں لے آؤں بھی وہی اور یقیناً اس نے میری آواز پہچانی ہوگی اس لئے بھی اس نے دوبارہ ڈر کیا۔ وہ تو خیر سست گزری کہ وہ بلائ نہ چلے پستول چلا رہا تھا میں اسی کیفیت جان کر واپس ہوا اور بیڑھیوں کے چوڑے ایک جانے اس تلاش کر کے ایک کچھ لکھا گیا۔ ذرا اطمینان ہوا تو تھکے کمرے میں چلا آیا کہ پوچھوں کہ وہ اتھ گیا ہے؟“

”جی ہاں باورچی رات ہی سے کچھ دیر اندھن کی حرکتیں کر رہا تھا۔ اور یقیناً اب تو پریشان ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پستول یقیناً خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے چلا آیا آپ میری بات سنئے اور فوراً ہی ہوٹل کار اسے لینے صبح کو زین واقعات پر قابو پا کر آپ سے ملوں گا۔“ میں نے بات بگنی دیکھ کر صوٹ موٹ کا قصہ سنا لیا۔

”لیکن یہاں تھا راتہا رات باہمی تو خطرناک ہے۔“ چچا ڈر رہا تھا۔

کہا۔

”نہیں نہیں آپ میری فکر نہ کیجئے۔“ میں نے غصے کا اظہار کیا۔

”میں جانتا ہوں کہ باورچی کو کس طرح قابو میں لانا چاہئے۔ اب آپ جلدی کیجئے۔“

چچا آبا اور میں اور انٹے سے گزر رہے تھے اور وہ میری رائے پر عمل کرنے کو تیار تھے۔ لیکن چلتے چلتے وہی نہیں اپنا لباس تبدیل کرنے کا کہہ کر نظر پڑا بغیر کچھ کہنے سے وہ اس میں کھس پڑے۔ میں نے اُمید سے روکنے کی کوشش کی کہ کیونکہ اس میں سیدھا صاحب رہتے تھے مگر چچا میں سے روکنے نہ سکے۔ ان کا دروازہ کھولا تھا کہ سیدھا صاحب جو ایک بستر پر سہیٹے ہوئے تھے اور پستول کی آواز پر اوسان خطا کر چکے تھے دفعہ یحرج پڑے۔ ان کی صیغے سن کر کنز صاحبہ شیخ جی اور دوسرے مہمان سب ہی دوڑ پڑے۔

اب بات بنانی نہ صرف مشکل بلکہ نامکن تھی اسلئے میں ڈیڑھ ہی غنیمت جانا کہ سر پر پاؤں کھٹکے جاگ نکلوں سب کو ایک دوسرے سے غمگین تھا ہونے کیلئے میں مکان کے باہر دوڑا اور اس اتفاق سے ایک کرایہ کی موٹر پاس ہی نظر پڑی تو اس میں سوار ہو کر دم تک پہنچ سکا۔

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ نہیں نے پوچھا۔

”چچا کچھ بھی ہو میرا وہ ارادہ قویہ ہو کر صبح کی پہلی گاڑی کو چھوٹا ہوا تھا باقر نے بیان کیا۔ کیا تم مجھے پچاس روپیہ قرض نہ دے سکو گے؟“

سیدھا و شاہ حسین (حیدر آباد دکن)

پریم کہانی سلسلہ صفحہ ۲۳۰

اور میں ایک دم سوتے سے چونک اٹھی ہوں۔ پھر نام رات مجھے خوف سے نیند نہیں آتی۔ میرا غصہ اندھی اندھ مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے شتاب کی رسم توڑ لی و طعنہ ہونے کی خاطر اس نیکل شوہر کی پردہ نہ کی۔ اور اس و عمر دی نو اُسے جان دینے پر مجبور کر دیا۔

ساجو جعفری
لیٹلے ڈیل لیلانی

ایک ہفتہ بعد پریم سے میں نے شادی کر لی۔ اس واقعہ کو اب ایک سال گزر چکا ہے۔ میں اب ایک بچی کی ماں بن چکی ہوں۔ لیکن اُمشہ مرتبہ کہہ سکی معصوم دلاور شخص مجھے خواب میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ مست ہری لگا ہوں سے مجھے دیکھتا ہے۔

محبت کی منت

اگرچہ رشیدہ نے پھر پر ہی تعلیم پائی تھی مگر وہ قابلیت میں تھی۔ لمبے پاس لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی ماں اور باپ کی جائیداد کی واحد وارث تھی۔ اپنے علاوہ کا انتظام وہ خود کرتی تھی اور اس عمر تک کہ اس کا کمالی جو خود بڑے شغف سے اس کی قابلیت کے معترف تھے۔ کریبن نے خانداری اور دستکاری میں بھی رشیدہ کو برتری کر دیا تھا۔

احمد کے چھوٹے بھائی محمود کا بھی نے جوانی ہی میں اپنی اور اپنی بیوی کی جائیداد پر یاد کوڑی تھی۔ اور اب حیدر آباد میں دو ڈھائی سو کے فوٹے اور اسی میں اپنا گھر رکھتے تھے۔ ان کا اکوڑا لڑکا مسلم شاہید پڑھ رہا تھا۔ اس میں ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک وحید خوش حال جوان تھا اس کے خیالات بلند اور ارادے اونچے تھے۔ تاہم وہ رشیدہ خاندانی غور سے بھی ملاحظہ تھا۔ وہ بھی جھٹکتا تھا کہ کم ذات میں سب سے اونچے ہیں۔ کوئی اور ہمارے برابر ہی نہیں کر سکتا۔

رشیدہ اور اس میں بچپن سے بہت دوستی تھی۔ ایک تو قریبی پریم عمر کی وجہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں کو سوائے اکند و سرور کے اور کسی کے ساتھ میل جول کی اجازت نہ تھی۔ دس پندرہ برس کی عمر تک ان دونوں کا ہر وقت ملتا رہا۔ اس کے بعد محمود حیدر آباد چلے گئے۔ اور ان دونوں رفیقوں میں جدائی ہو گئی۔ مسلم اگرچہ بڑا جاکر بھل گیا۔ اسے نئے نئے دوست مل گئے۔ اب بھی اس کے دل میں رشیدہ کی یاد چمکیاں لیتی رہتی تھی۔ جب تک اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی شادی رشیدہ سے ہو گئی ہے رشیدہ کی یاد اور بھی بفرار نہ کئے گئی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب سیدہ بچ جائے اور رشیدہ کو دیکھے۔ بارہ وہ ایم۔ اے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی ماں اس کے ساتھ سیدہ بچو روانہ ہوئی۔

رشیدہ کو اس مسلم بہت یاد آتا تھا جب وہ حیدر آباد گیا تو وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ وہ بہر وقت اداس رہتی۔ اور کسی کام میں اس کا دل نہیں اچھلنے کی تہائی اور پریشانی سے بھر گئے۔ انھوں نے طرح طرح سے اسے بھلنے کی کوشش کی۔ کبھی گاؤں سے باہر جا کر گھوڑے کی سواری سکھاتے۔ کبھی اپنے ساتھ شکار کو لے جاتے۔ مگر نہ تو کبھی اس کے لئے چھٹے۔ کبھی ایک استاد اور اسٹائیاں اس کے چڑھانے

کا نامی خاندان سیکڑوں برس سے نہایت اور نہایت میں مشہور ملا تھا۔ انہیں بابت سے ان کے ماں اپنے خاندان ہی میں شادیاں ہوتی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم اصل نسل سادات ہیں جن میں کسی قسم کا میل نہیں۔ ان کے خورہ کا یہ حال تھا کہ اور عام مسلمان تو پرے رہے وہ دوسرے شید خاندانوں کو بھی اپنے سے کم ذات سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ جس نے اپنی بیٹی یا بیٹا بیٹا بیٹا دیا اس کی نسل خراب ہو گئی۔ وہ اپنے لڑکوں لڑکیوں کو نیکو بالا بھنا گوارا کرتے تھے۔ دوسرے خاندان میں شادی کرتے۔ ایک کمرچی بڑے کھوسے سے بیانی بنی منظور، ایک جوان لڑکی کو دو دو چیتے بے سے شادی کرنا اور انگریزوں کی جگہ سیدہ کو خاندان کو دوسرے لگانا خاصہ تیر یہ ہوا کہ وہ خاندان جو کبھی سترہ اسی آدمیوں کا تھا پھر بڑے ہوئے بالکل چھوٹا سا رہ گیا۔ اب صرف احمد کا بھی اور محمود کا بھی اس خاندان کے نام پیدا ہوا تھا۔ محمود کا بھی اور ان کی بیوی سیدہ کے بعد عرصہ سے حیدر آباد میں رہنے لگے تھے۔ اور احمد کا بھی اپنی لڑکی رشیدہ کے ساتھ سید بچو میں خدان کی ملکیت تھا۔ ہر تھے اور کبھی بھی جاکر اپنی کو بھی احمد نزل میں قیام کرتے تھے۔

رشیدہ جب پیدا ہوئی اس وقت اس کی ماں گورگڑی تھی۔ اس کو ایک عورت کریبن نے پالنا تھا۔ یہ ذات کی چٹائی بڑی شریفانہ اور وفادار عورت تھی۔ جس روز رشیدہ پیدا ہوئی اسی روز کریبن کے بھی لڑکی پیدا ہوئی تھی چچا کی کا خاندان دو مہینے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ احمد کا بھی نے رشیدہ کو اس کے سپرد کر دیا اور اس نے اس محبت اور پیار سے رشیدہ کو پالا جسے بھی ماں پالتی ہے۔ رشیدہ کو بھی کریبن سے بڑی محبت تھی اس سے ایک دن بھی جسد اہرنا گوار نہ کرتی تھی۔ تاہم خاندانی خرد و اس میں اپنی موجود تھا۔ یہ بات اس کو نہ بھولتی تھی کہ کریبن کی چٹائی ہے اور وہ خود اصل نسل سیدانی۔

احمد کا بھی کہ رشیدہ سے بہت محبت تھی۔ ان کی زندگی کی محبت فائنٹ بہ لڑکی ہی تھی۔ ان کی محبت میں پدرانہ شفقت سے زیادہ اور محبت کا رنگ تھا۔ وہ اس بچی کی کو دیکھ کر دیکھ کر جیتے تھے۔ انھوں نے سے اعلیٰ درجہ کی اور دفعتاً اور انگریزی تعلیم دلوائی تھی۔

نمبر شمار	مضنون	صاحب مضنون	صفحہ
(۱)	انجامِ اولین	شاہ	(۲)
(۲)	سبیلین	مولانا عایت اللہ صاحب سائق ناظم دارالترجمہ حیدر آباد دکن	(۳)
(۳)	فردوسِ خواب	جناب میر حسین ظفر	(۴)
(۴)	معارف	جناب امین حسین (سیالکوٹی)	(۵)
(۵)	جدیدِ کور	جناب صادق انجمنی ایم۔ اے؛ کچھارہ جسطہ	(۶)
(۶)	غزلیات	جناب کوکب شاہ جہاں پوری	(۷)
(۷)	منتِ جگر	جناب جگر مراد آبادی	(۸)
(۸)	قلب کی سپر	جناب شان الحق حق دہلوی	(۹)
(۹)	مچھ جانے دو	جناب اختر حسین رستگار پوری بی۔ اے	(۱۰)
(۱۰)	چنگ	جناب نعیمی محمد	(۱۱)
(۱۱)	رنگِ بقیاس	دنیلوفرہ	(۱۲)
(۱۲)	طکونِ غروب	قمر۔ جناب استیلا علی	(۱۳)
(۱۳)	ایک تنقیدی سوال	جناب سید علی منظور (حیدر آبادی)	(۱۴)
(۱۴)	عبدوحی	جناب تاجش دھولوی	(۱۵)
(۱۵)	بیانی	جناب نیاز تنجہ بی۔ اے	(۱۶)
(۱۶)	سینا کمانی	جناب اشرف سبوتی دہلوی	(۱۷)
(۱۷)	کے صحت	جناب الطاف شہیدی	(۱۸)
(۱۸)	پتک	جناب مشا و لطیف	(۱۹)
(۱۹)	صحت کی اچھی	جناب منظور ملک بی۔ اے	(۲۰)
(۲۰)	سے صحت کے گرد	جناب کاوش حیدر آبادی	(۲۱)
(۲۱)	صحت کے علم و تربیت	جناب مرزا سیف علی خاں صاحب ہاشم دار	(۲۲)
(۲۲)	وہاں سے واپسی	جناب نیاز بی۔ اے (ملک)	(۲۳)
(۲۳)	شیان کی طرف	جناب خواجہ حسن عباس بی۔ اے	(۲۴)
(۲۴)	تطویر	جناب فرحت کانبہری	(۲۵)
(۲۵)	مرد کا	جناب سید محمد حسن ایم۔ اے۔ عظیم آبادی	(۲۶)
(۲۶)	نکاح	شاہ	(۲۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہنگامہ اولین

بعض نے مضمون نگار حضرات کو شکایت کی کہ ان کے مضامین سنائی میں شائع نہیں کئے جاتے۔ سنائی کے مضامین کے انتخاب میں نئے اور پرانے لکھنے والوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں کیا جاتا۔ جب کوئی مضمون آتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مضمون نگار نے لکھا کیا ہے، پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لکھا کیا ہے۔ کچھ شوق مضمون نگار لکھنے لکھتے یہ سمجھ گئے ہیں کہ انہیں کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں لکھنا چاہیے۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کون سا پرچہ کس قسم کے مضامین شائع کرنا ہے چنانچہ رسالے کی روش کے مطابق لکھنے لگھاتے رہتے ہیں۔ نئے مضمون نگار عام طور سے ان امور کو مد نظر نہیں رکھتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین بالعموم واپس کئے جاتے ہیں لیکن بعض نے لکھنے والے تو ایسے ایسے پاکیزہ مضامین لکھتے ہیں کہ دیکھا کر تعجب ہوتا ہے۔ یہی وہ حضرات ہوتے ہیں جن کے سہارے آگے چلکر میاں صاحب قلم ہوئے اور وہ عام میں یہ کچھ شوق بہلائے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو مضامین کی واپسی سے بدل نہیں ہونا چاہیے بلکہ آئندہ کوئی ایسا مضمون لکھیں جسے اوڈیٹر اگر معاوضے کے ساتھ نہیں تو کم از کم شکر یہ کے ساتھ قبول کر لے۔ ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو مضمون آپ لکھیں وہ شائع ہی ہو، اور اسی پرچے میں جو جس کو آپ بھیجا ہے۔ ہر پرچے کے اوڈیٹر کی کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ مثلاً اسے اپنے پرچے کے پڑھنے والوں کے مذاق اور ان کی توقعات کا بطور خاص محاط رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ لازمی نہیں ہے کہ جو مضمون سنائی میں شائع نہ ہو وہ کہیں اور بھی شائع نہ ہوئے خلقِ خدا تنگ نیست، ہاتے تر الگ نیست۔ سنائی میں اس کی اشاعت پر کیوں اصرار کیا جاتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں صرف سنائی ہی آپ کی غایات کا مستحق کیوں ہو۔ آخر سنائی ہی کو آپ کے مضامین شائع کرنے کا فخر کیوں حاصل ہو؟ اور رسالے نے ایسا کونسا قصہ کیا ہے کہ اس سعادت سے محروم رہیں؟ اور دوسرے کے اوڈیٹر کو بد قسمتی سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ علاوہ خواستگار معافی ہوئے کے وہ آپ کے عطیہ کی واپسی کی وجہ بھی تفصیل سے بیان کرے۔ یہ غریب چیز دیکھو کہ اس کی انسانیت میں بھی کافی مشابہ کی گنجائش ہے۔ صرف مضامین پڑھنے کی مشین نہیں ہے بلکہ اسے کاپیوں اور پروڈوں کی تصحیح کے علاوہ اکثر منیجر کے فرائض بھی ادا کرنا پڑتے ہیں۔ ان میں سے بعض بد بختوں کو پرچے کی کتابت بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ واک کا تھیلہ بھی خود ہی لا کر لے جانا پڑتا ہے۔ غرض اس مظلوم چیز کی جان پر اور عذاب کیا کہیں کہ آپ اپنی ناراضگی سے اس کی رہی سہی زندگی بھی اجیر کر دیں۔ اس کے لئے یہی سزا کیا کم ہے کہ وہ آپ کے مشورہ و نصیحت سے محروم ہو جائے۔ اس کا قصہ تو اسے لائقِ داری پڑا ہے لیکن بعد از ترنم نہ ہو گا اگر اس بد بخت کی جان بخشی فرمائی جائے اور اسے اس کے حال زار پر چھوڑ دیا جائے تاکہ از خود اپنے کھیر کر واد کو پہنچ جائے۔ ع۔

برو سولال بلاغ باشد و بس

شاہ

ۛۛۛۛ

(بگسلہ گزشتہ)

سمبلین

چوتھا منظر - بادشاہ شہرِ اندرا کا مکان۔

پوتی اس اور فلاریو اندر آتے ہیں۔

پوتی اس - آپ کچھ خوف نہ کریں۔ بادشاہِ برطانیہ کے پھر ہرمان ہوئے گا مجھے اتنا یقین ہے جس قدر کہ اس بات کا یقین ہے کہ ایموجن کی عزت اُسکے ساتھ رہے گی۔ کبھی اس میں فرق نہ آئیگا۔
فلاریو - بادشاہ کو اپنے اوپر پھر ہرمان کرنا کی کوئی تدبیر تم نے سوچی ہے؟

پوتی اس - کچھ نہیں صرف وقت اور زمانے پر بھروسہ ہے۔
نہن ہے کوئی وقت ایسا نہ کہ مزاج میں تبدیلی واقع ہو۔ سو وقت تو میرے لئے چل رہا ہے جس میں کانپ رہا ہوں۔ نہن ہے کہ گرم موسم دیکھنا بھی قسمت میں آتا ہو۔ بجز ایسی امیدوں کے جن میں خوف زیادہ تر شامل ہے میں آپ کی اس توجہ اور محنت کا کوئی بدل نہیں کر سکتا۔ اگر یہ امیدیں بھی غلط ثابت ہوئیں تو پھر میرے لئے موت سے پہلے آپ کے احسانات کا معاوضہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔

فلاریو - جو کچھ میں نے آپ کے لئے کیا اس کا معاوضہ آپ کی خیریاں اور آپ کی یہ خوشگوار صحبت بخوبی ادا کر رہی ہوں۔ جنگ تو آپ کے بادشاہ نے ہمارے قیصرِ اٹلیس کا پیغام سن لیا ہوگا۔ کاسیس کو جو یس امیرِ سفارت بن کر گیا ہے۔ وہ اس کام کو بڑی خیر خود خوبی سے انجام دے گا۔ اور امید ہے کہ بادشاہِ برطانیہ قیصر کو خراجِ ادا کرنا منظور کر لے گا۔ اور جس قدر بقایا اس کے ذمے ہے وہ مکمل ادا کر دیا جائے گا اور ایسا پیش نہ کرنے کا ہم رومانیوں سے بھلائیہ والے مقابلہ کریں۔ پہلے جو

کچھ گزر چکا ہے اُسے آپ کے برطانیہ کے لوگ اب تک انوس کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

پوتی اس - گو سہا سئی تدابیر سے کماحقہ مجھے واقفیت نہیں مگر میرا یقین تو یہی ہے کہ آخر اہم دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائیگی۔ اور آپ بہت جلد نہیں گئے کہ فرانس میں جو رومانی فوجیں اس وقت موجود ہیں وہ ساحلِ برطانیہ پر اتر جائیں گی اور بجائے اس کے کہ خراج کا ایک حصہ ادا کیا جائے یہی خبر سننے میں آئیگی کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ جس زمانے میں آپ کا کہا اور جو یس سیزرِ برطانیہ والوں کی کوششِ فزونِ جنگ میں دیکھ کر ہنسا تھا، گو ان کی جنت و شجاعت کو دیکھ کر اس کی تیوری پر بل پڑے جاتے تھے، اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب لڑائی میں شش اور ان کی جو افرادی دونوں کو شامل کر کے ان کی آزمائش کی جائیگی تو پھر وہ ایک ایسی قوم ثابت ہونے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔
(دیاچو اندر آتا ہے)

فلاریو - مجھے پتا چھو گیا آ رہا ہے۔

پوتی اس - معلوم ہوتا ہے کہ جہاز سے اترتے ہی نہایت تیز رفتار گھوڑوں نے آپ کو یہاں تک پہنچایا ہے اور بحری سفر میں بھی آپ کو گوشوں کی ہواؤں نے بادبانوں کو جھلا کر آپ کے جہاز کی رفتار کو تیز کیا۔

فلاریو - یاچو آپ کی واپسی موجبِ مسرت ہوئی۔

پوتی اس - میں سمجھتا ہوں کہ واپسی میں اس قدر محنت کا باعث جواب کا اختصار ہوگا۔

یاچو - آپ کی جیوی تو واقعی اتنی حسین ہیں کہ ان سے زیادہ حسین عورت

میری نظر سے کبھی نہ گزری تھی۔

پوستی مس۔ آخر وہ جن دنیک میں سب سے بڑھ کر نہیں ہے تو پھر بہتر ہو کہ وہ اپنے حسن سے دعا باز دلوں کو دھوکے میں ڈالے اور خود بھی دھوکے میں پڑ کر مجھے فریب دے۔

یا چیمو۔ لیجئے یہ اس کا خط ہے جو اس نے آپ کو لکھا۔

پوستی مس۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سب غیرت ہوگی۔

یا چیمو۔ غالباً ایسا ہی ہوگا۔

فلان رو۔ ہاں یہ تو کہتے ہیں کہ آپ وہاں گئے جو کائنات کو کیوس دربار پر مٹانے میں پہنچ گیا تھا؟

یا چیمو۔ اس کا انتظار ہو رہا تھا مگر پہنچا نہ تھا۔

پوستی مس۔ یہاں تک تو سب خیر رہی۔ آپ فرمائیے کہ میرے اس

انگوٹھی کے ہیرے میں وہی چمک ہے جو تمہاری باب اتنی چمک نہیں

رہی، اور اب وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ اسے قبول کریں۔

یا چیمو۔ اگر میں اس ہیرے کا سستی نہ ہوتا تو جو اشرفیاں میں نے

شرط میں لگائی تھیں وہ آپ کی ہوتیں۔ جتنے مسافروں وقت

کیا ہے میں تو اس سے دو چند سرفروں کو تیار ہوں بشکریہ ایک شب

ایسی شایر شریفش و فساد کی برطانیہ میں بسر کرنے کو نصیب ہوتی ہے کہ

اب آپ کی یہ اعظمی میں جیت گیا ہوں۔

پوستی مس۔ اس ہیرے کو جیتنا آپ کیسے مشکل بات ہے۔

یا چیمو۔ مطلق نہیں۔ آپ کی بوی تک پہنچنا بہت آسان تھا۔

پوستی مس۔ یہ پھر اتنا محنت ہے کہ آسانی سے کسی کو نہیں مل سکتا۔

یا چیمو۔ آپ کی خالوں کا حاصل کرنا بہت آسان بات تھی۔

پوستی مس۔ آپ اپنی ناک کی کوکھ میں آپ سمجھیں کہ چھڑا

اور منہ بہ ہم ہیں جو اتنا اس کے مطابق اب جان پر بازی لگا کر

آپ کو مجھ سے لڑنا پڑے گا۔

یا چیمو۔ اگر اب اپنی دلی پی پر میں یہ ثابت نہ کر سکوں کہ میں نے

آپ کی بوی پر قابو حاصل کر لیا تو پھر جان کی بازی لگا کر لڑتا

خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ در نظر ہر تھا کہ ہم کو جان پر کھیل کر

لڑنا پڑتا، لیکن اب تو مجھے یہ دعویٰ ہے اور کہتا ہوں کہ آپ کی

بوی کی عزت اور آپ کی انگوٹھی کو میں جیت گیا ہوں۔ اس میں آپ

یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے کیونکہ یہ جو کچھ

ہو اسے ہماری آپ کی رضامندی سے کہا ہے۔

پوستی مس۔ اگر ایسا ہوا ہے اور آپ اسے ثابت بھی کر دینگے تو

پھر یہ ہاتھ موجود ہے، انگوٹھی آپ کی ہو جائیگی۔ اور اگر ایسا نہیں

ہو تو پھر جو بیتان آپ نے میری بوی پر لگا ہے اور اس کی عزت کو

داخل لگا نا چاہا ہے اس کی سزا میں آپ کو آپ کی تلوار میری ہو جائیگی

یا میری تلوار آپ کی یا دونوں قتل ہو جائیں گے اور دونوں تلواریں

بے وارن ہو کر مرستہ چلنے والے کے ہاتھ لگ جائیگی۔

یا چیمو۔ سنئے جناب جو کچھ میں نے دیکھا یا کہا وہ اتنا ہی سچ ہوگا

جس قدر کہ میں اسے سچ ثابت کر سکوں۔ مجھے ثبوت میں تم کھلنے

کی نوبت نہ آئے گی۔ واقعات سن کر آپ خود کہنے لگیں گے کہ

کسی حلفیہ بیان کی ضرورت نہیں۔

پوستی مس۔ اچھا فرمائیے کہا دیکھا اور کیا کیا؟

یا چیمو۔ پہلے تو آپ کی بوی کی خواہش تھی، جہاں مجھے اتنا کہنا

ضروری ہے کہ میں سوا نہیں۔ کمرے کی چیزیں دیکھنے میں مصروف

رہا۔ وہاں کے دیوار پوش ریٹین مجھے اور وہ پہلی کام ان پر بنا

تھا۔ تصویر جہان دیوار پوشوں پر بنی تھی وہ ملکہ مصر کی تصویر

کی تھی جبکہ وہ اپنے رومن عاشق سے ملی تھی۔ دریا سے کدو

طغیانی پر تھا۔ پانی نما روں سے اونچا ہو گیا تھا۔ پانی کی زیادتی

یا کشتیوں کی کثرت یا محض خود و صنعت اس طغیانی کا باعث

معلوم ہوتا تھا۔ تصویر میں قوت و حسن اس درجہ تھا اور جمال

اس کے ہنسے میں لگا گیا تھا وہ اتنا نفیسی تھا کہ اس انسان

حیران تھا کہ مصدقہ کے حسن و صنعت کی تعریف کرے یا قیمتی مال

کی، جو تصویر میں لگا یا گیا تھا تعریف کرے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ

مصورے تصویر میں جان ڈال دی ہے۔

پوستی اس :- بالکل سچ فرماتے ہیں۔ لیکن ہر کہان دیوار پوشوں کا ذکر آپے مجھ سے یہاں یا کسی اور سے سنا ہو۔

یاجیمو :- ان کے علاوہ اور باتیں بھی تو ہیں جن سے میرے بیان کی تصدیق ہوگی۔

پوستی اس :- بیشک۔ ورنہ آپ کی عزت معرض خطر میں ہو جائیگی۔

یاجیمو :- آشدان کمرے کی جنوبی دیوار میں تھا اور وہاں ایک محبت سے تمنا میں پاکہ آن دی و آئنا پانی میں نہایت دکھائی گئی

ہے۔ ایسا حسین مجسمہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس میں جان پڑی ہے اور وہ کچھ بات کرنے کو ہے۔ بہت تراش بھی اپنے کمال میں فطرت کا ہر تھما، اور اس صفت میں

فطرت ہی کی شکل وہ بھی خاموش تھا، بجز اس کے کہ جان نہ ڈال سکتا تھا اور کوئی بات نہ چھوڑی تھی۔ سانس البتہ نہ تھا

لیکن ترکیب اعضاء میں یہ شکل بالکل فطرت کے مطابق تھی۔ پوستی اس :- لیکن یہ تاہم تو ایسی ہیں جو آپے کہیں سن لی ہوگی

کہونکہ یہ مجسمہ وہاں بڑی شہرت رکھتا ہے۔

یاجیمو :- حجت پر سولے کی منبت کاری میں فرشتے بنے ہیں اور آشدان کی چابی کے دونوں طرف جو مجسمے کھڑے ہیں انجا ذکر

تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ دونوں مجسمے خالص چاندی کے تھے۔ عیش کیو کیلے ہیں، انھیں ان کی اندھی ہیں اور ایک ایک پاؤں

پر بڑی نرمی اور خوبصورتی سے کھڑے ہیں۔ دوسرے پاؤں مشعلوں پر ٹکے ہیں۔

پوستی اس :- کیا آپ کے اس بیان سے اُس کی حقت میں کوئی غلط پیدا ہو رہا ہے؟ میں نے ہاں کہ یہ سب کچھ آپے دیکھا اور آپکا

حافظ قابل تعریف ہے۔ آپ کے اس بیان سے اس شرط میں کوئی فرق نہیں آتا جو آپ رکھتے ہیں۔

یاجیمو :- رجوش اٹھا کر دکھاتا ہے، اس زیور کو تھوڑی دیر

دکھائے ہیں آپ مجھے معاف کریں گے۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنی مشقت کے لئے یہ حرکت کرتا ہوں۔ بلکہ جو کچھ میں نے کہا ہے

اُس کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔ اب میں اس جوش کو پھر وہیں رکھے دیتا ہوں جہاں سے میں نے اُسے نکالا ہے۔ اور

یہ زیور بھی اسی ہیرے کے ساتھ رہیگا جو آپ کی گھسٹری میں ہے۔ اور وہ لؤلؤ خیر لب میبہ ہی ہاں رہیگی۔

پوستی اس :- بخدا۔ ذرا مجھے اُسے بغور دیکھئے دیکھئے کیا حقیقت میں یہ جوش وہی ہے جو میں نے اُسے دیا تھا۔

یاجیمو :- میں آپ کی بیوی کا منون ہوں جنہوں نے یہ جوش اپنے بازو سے اُتار کر مجھے دیا۔ واللہ جس انداز سے اُسے بازو سے

اُتارا تھا وہ صورت اب تک میری آنکھوں میں ہے۔ اس انداز و اُس نے اس مخنے کی قیمت اور اس کی رونق بڑھا دی اور کتنی تھیں

کہ کبھی میرے دل میں اسکی بڑی قدر تھی۔ پوستی اس :- لیکن ہے کہ یہ زیور اس لئے اُتار کر دیا ہو کہ آپ

لئے مجھ تک پہنچا دیں۔

یاجیمو :- اپنا خط پڑھئے۔ میں اس میں لکھا کچھ لکھا ہے؟ پوستی اس :- نہیں ہیں۔ خط میں کچھ نہیں ہے۔ آپ کا فرمانا

سچ ہے۔ اب اتھ سے اٹھ کھڑی اُتار کر پاجیمو کو دیتا ہے۔ اب تو میری نظریں یہ گھسٹری و بار قائل ہے جس کے دیکھنے کو

انسان مر جانا ہو پس کج کو کھی کو متوجع نہیں رہنا چاہیے کہ عزت جن اور دنیا کی مشابہتیں ایک ہی عورت میں جمع ہو سکتی ہیں۔ اور نہ

اسکی توقع رکھنی چاہیے کہ جب کوئی غیر مروتی کی بیوی کو بھلائے پس اس کی طرف مائل ہوگا تو میری بیوی کی وفاداری شہرہ کے ساتھ قائم رہیگی

جو اور کج سے ہی بات کہنی پڑیگی کہ عورت اپنے عہد و بیان کی کج سے وہ عہد و بیان کرتی ہیں یا بند نہ رہیگی۔ وہ اپنی نیکیوں کیساتھ خود

باوفا نہ رہیگی۔ اور اُن کے نزدیک بیان وفا کی مجبوریاں کوئی چیز نہ رہیگی

انکی نیکیاں کوئی چیز نہیں۔ اس بیو فانی کی بھی کوئی حد نہ رہی۔

ناز ہے کہ ظاہر ہونے کیلئے کیا خوب جگہ ملی ہے۔ اپنی جان کی قسم میں نے اس تل کو چڑھا تھا اور اسکے جوتے ہی وہ اشتہار دوبارہ پیدا ہوتی جیسے پہلے سیر کر چکا تھا۔ پوتسی اس آپ کو تو یہ تل چڑھا یاد ہو گا۔

پوتسی مس۔ ہاں اس تل سے ایک دو سکر داغ کا ثبوت بھی ملتا ہو جو اتنا بڑا ہے کہ اگر دوزخ میں سولے اس کے کوئی دوسرا لگا نہ ہو تو بھی وہاں نہ سما سکے۔

یا چیمو۔ آپ کچھ اور بھی سننا چاہتے ہیں؟

پوتسی مس۔ بس اب اس حساب کتاب کو بند کرو۔ ایک مرتبہ ہونا اور لاکھ مرتبہ ہونا ایک ہی بات ہو۔

یا چیمو۔ میں تم کھانے کو تیار ہوں۔

پوتسی مس۔ تم کھانے کی ضرورت نہیں۔ اب تو تم اگر یہ قسم بھی کھاؤ گے کہ میں نے کچھ نہیں کیا تو میں تم کو جھوٹا سمجھ سکوں گا۔ اور اگر انکار بھی کرو گے کہ تم نے مجھے ایسا شوہر نہیں بنا دیا جس کی بیوی کے ساتھ تم نے نہ کیا کیا ہے تو یقین جانو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔

یا چیمو۔ میں کئی بات بھی انکار نہ کر دینگا۔

پوتسی اس۔ اگر وہ اس وقت میرے سامنے ہوتی تو میں اسے پھڑ سے پھڑ سے کر دیتا۔ جہاں وہ ہے اب میں وہاں جاؤں گا اور اس کے ہاتھ کے سامنے سر دبا کر بھی کچھ کر دینگا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور میرے ہاتھوں میں آئیگی۔

(چلا جاتا ہے)

فسلار لویو۔ طبیعت قابو سے باہر ہو گئی۔ دل پر سے صبر کی حکمت اٹھ چکی ہے۔ یا چیمو تم بازاری جیت گئے۔ آؤ اس کے پیچھے پیچھے چلیں اور جو عقدہ اس کو اس وقت لپٹے اوپر ہے اسے کسی طرح دود کر دیں۔

یا چیمو۔ میں دل و جان کھیلنے کیلئے حاضر ہوں۔

فسلار لویو۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ اتنی جلدی فیصلہ نہ فرمائیے۔ یہ انگوٹھی آپ اپنی اپنے ہی پاس رکھئے۔ یا چیمو آسے ابھی جیتا نہیں ہو۔ ممکن ہے کہ یہ جوشن آپ کی بیوی نے کہیں کھو دیا ہو۔ ممکن ہے کہ اس کی کسی خواص کو رشوت دیکر اسے چرایا گیا ہو۔

پوتسی مس۔ ہاں درست ہے۔ ممکن ہے کہ کسی چور کے ہاتھ یہ جوشن پڑا ہو۔ میں میری انگوٹھی مجھے واپس دیکھنے اس کے جسم کی کوئی علامت یا نشان تلاش کرتا ہوں، مگر نہ یہ زیور تو اس کے پاس سے چرایا گیا ہے۔

یا چیمو۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے بازو سے میں نے لٹے اتارا ہے۔

پوتسی اس۔ دیکھئے یہ قسم کھا رہے ہیں۔ وہ ضرور سچے ہیں۔ قسم ہو کہ انہوں نے تم کھانی ہے۔ اب یہ انگوٹھی وہ اپنے پاس رکھیں جو کچھ یہ کہتے ہیں سچ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جوشن میری بیوی نے کھیر تم نے کیا ہو گا کیونکہ اس کی خواہشیں سب عزت و برو کی عزتیں ہیں اور وفاداری اور نیک خواہی پر صحت لے چکی ہیں۔ زیور چور ہاں ہرگز ان کا کام نہیں اور جوری بھی کسی اجنبی کے کہنے سے کرنی ان کے لئے ممکن نہیں۔ نہیں یا چیمو نے میری بیوی کے ساتھ لذت و وصل حاصل کی ہے۔ اور یہ میری بیوی کی بیوفائی کا پورا ثبوت ہے۔ اسے اس

اس نقصان کیساتھ حرام کار ہو یہ کیا خطاب بھی پایا۔ لو اب اگر کام کی جرت لو اور اس جرت کو تم اور دوزخ کے شیطین باہم تقسیم کر دو۔ فسلار لویو۔ ذرا صبر کرو۔ یہ باتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی نیکی پر.....

پوتسی مس۔ بس اب اس ذکر کو چھوڑیے۔ اس نے ضرور اس کی آبروریزی کی ہے۔

یا چیمو۔ اگر آپ اور زیادہ ثبوت اس بات کا مانجئے ہیں تو میں، چھاتی کے نیچے، ہاتے جس کے مساس میں کیا لطف آیا تھا ایک قدرتی نشان غالی کی شکل کا ہے۔ اور اس تل کو اس بات پر

پانچواں منظر۔ غدار کے مکان کا ایک دوسرا کمرہ۔

پانچواں اندر آتا ہے۔

پوتی مس۔ کیا دنیا میں اس کے سوا دوسرا طریقہ نہیں کہ عورتیں مردہ کی تہہ صفت کی شریک بھی جائیں۔ ہم سب ولد الحرام ہیں۔ اور وہ مرد بزرگ و محترم جنہیں میں باپ کہتا تھا مجھے علم نہیں کہ میرا بیٹا کب اور کہاں اور کس نے نقش کیا۔ معلوم نہیں کس سکہ بندے والے نے اپنے آزار و اذی سے مجھے ایک جھوٹا اور جعلی سکہ بنا کر رائج کیا ہے۔ لیکن میری ماں تو دہریہ و آنتا کی مثل پارہ سا اور پاکدامن عورت تھی۔ اور بیوی کی حیثیت سے بھی اپنے وقت کا عظیم الشان عقیقہ تھی۔ اسے انتقام ایسا انتقام! اجازت پیش و آرام سے اس نے مجھے حرم کر دیا۔ خدا نے نفس سے مجھے منع کرتی رہی۔ تیسرے چہرے پر شرم و حیا کی وہ سرخیوں آتی رہیں جنہیں دیکھ کر پھر فرط زحمت کا مزاج بھی گر جاتا ہے۔ میں تو مجھے اپنا پاک و عقیق کہتا تھا جیسے تازی پرست آسمان سے گری ہو اور ابھی تک سورج اس پر نہ چمکا ہو۔ کیا ممکن ہے کہ میں اپنی ذات میں وہ چیزیں دریافت کروں جو عورت کا زائید ہونے کی وجہ سے مجھ میں ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ مرد میں کوئی تحریک جو اسے برائتوں کی طرف راغب کرے

ایسی نہیں جو عورت کی طرف سے اس میں نہ آتی ہو۔ ان برائتوں میں خواہ جھوٹ بولتا ہو، خواہ خوشامد کرتا، خواہ دھوکا اور فریب دیتا۔ یہ سب باتیں قدرت کی طرف سے ان میں آتی ہیں۔ ہوا پرستی مٹے بے خیالات کی طبیعت میں اسی کی طرف سے آتے ہیں۔ انتقام کتنی محبت جاہ و دولت، طرح طرح کے عذروں، سخت، بُری خواہشیں، غیبت، بدگوئی کے خیالات، غرض تمام دنیا برائیاں جن کے نام لے جاسکتے ہیں اور جن کی کیفیت شیطان ہی پر روشن ہے، یہ کُل یا ان کا کوئی حصہ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ کُل برائیاں صرف عورت کی طرف سے مرد میں آتی ہیں۔ عورتیں دن و رات میں ثابت قدم نہیں۔ ان کی طبیعت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ایک بُرائی جیسے پیدا ہوتے ابھی ایک گھڑی بھی نہیں ہوتی۔ دوسری بُرائی سے جو اس سے بھی کم دیر تک رہے گی بدل جاتی ہے۔ اب عورتوں کے خلاف مضامین لکھو، لکھا اور ان سے ہوش بیدار کر دو۔ ان پر لعنت بھیج دو۔ اور میری سب سے بڑی نفرت کا اظہار اسی میں ہے کہ خدا کو دعا لگا دو کہ ان کو جو کچھ اُنکے دل میں ہے وہی وہی کرتی رہیں۔ اس سے بہتر طریقہ ان کو آزار پہنچانے کا ظالم شیطان کے پاس بھی نہ ہوگا۔ (چلا جاتا ہے)

جزو ثالث

پہلا منظر۔ برطانیہ۔ قصر بلیکین کا ایک دیوان۔
بادشاہ اور ملکہ اور کچھ شاہی لباس پہنے ایک
دروازے سے اندر دوسرے دروازے سے
کاسٹین لیکوس اور اس کے ہمراہی داخل ہوتے
ہیں۔

بلیکین۔ فرمائیے۔ قیصر غلط ہے کیا چاہتے ہیں۔
لیکوس۔ ایک زمانہ ہوا کہ جو لیکوس سیزر جس کی یاد اب تک

لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے اور جس کا تذکرہ ہمیشہ لوگوں کے
کافوں اور زبانوں کو مسرور کرتا ہے گا اس جزیرہ میں وارد ہوا
تھا۔ اور اس جزیرے کو اس نے تعمیر کیا تھا۔ اس وقت کا اسی سیلان
آپ کے چچا تختہ شاہی پر چلے گئے۔ ان کی تعریف و توصیف تیز
کی زبان پر ہرگز اس سے کم نہ تھی جس قدر کہ بادشاہ موصوف کے
کام اعلیٰ دار فرشتے۔ اور وہ حقیقت میں اسی تعریف کے لائق بھی
تھے۔ بادشاہ برطانیہ کا اسی سیلان نے اپنی طرف سے اور اپنے بعد

جیسے انڈے کے پھلکے ہوں۔ اس خوشی میں کاسی سیلان نشاۓ
برطانیہ نے تعلقون تقدیر پر اب قابو پایا کہ سیر کی تلوار اس کے
ہاتھ سے چھین لی۔ سرحد برطانیہ کے لوگوں نے اپنے شہر چرافان
کے۔ اہل برطانیہ کی ہمتیں بلند ہو گئیں۔

کلوٹن۔ یعنی جناب۔ اب خراج باطل نہیں دیا جائیگا۔ ہماری مملکت
اُس وقت سے ہے جب آپ نے ہمیں باجگوار بنایا تھا۔ اب طاقت و
شوکت میں کہیں ترقی پھر گئی ہے۔ اور برطانیہ کے لوگ اب ہمت و
عزم میں پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اب
کوئی سیر نہ بھی سوجو دہیں ہے جو ہم سے خراج وصول کرے سیر نہ
کی ناکیں گوبی اور پھر سی ہوتی ہیں لیکن بچے اور سیدھے ہتھیار اب
سولے ہائے دوستی کے پاس نہیں۔

سمبلین۔ فرزند تم اپنا والدہ کو پوری بات کہہ لینے دو۔

کلوٹن۔ ہم میں یہ سیرے ایسے احمق ہیں جو تلوار کو بادشاہ کا کسی سیلان
سے بھی زیادہ مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ میں بھی انہی
میں سے ہوں، لیکن یاد رہے کہ میرا بازو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ خراج
کیسا خراج ہم کیوں کھی کو خراج دیں؟ اگر سیر میں اتنی طاقت ہو
کہ کالے کھل کا ٹکڑا سونچ برتانے اور سورج کی روشنی اس
طرح ہم تک آنے سے روک دے تو پھر روشنی کا محصول ہم ادا کرنا
گوارا کر لیں گے۔ ذرا بادشاہ سلامت حضور سمجھ لیں کہ اب ہم کیوں
خراج نہیں دیں گے۔

سمبلین۔ آپ کو معلوم رہنا چاہیے کہ جب تک آپ کے منہ اور
گتہ رخ رومانی ہم سے سیر خراج وصول کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے
ہم باجگوار سی باطل آنا دہیں گے۔ سیر کا شوقی ملک مجبری
اتنا برٹھا ہوا تھا کہ دنیا کے دونوں سروں تک وہ پہنچ چکا تھا۔
نئے پلاکس وچ کے ہمالے کندھوں پر خراج کا یہ جوار تھا۔ مگر اب
ایک جری اور جنگ و دو م کیلئے ضروری ہو کہ وہ اس جسے کو تار سبکی
اور ہم بھی اپنے کو دنیا کی بہادر اور جوار و دو موں میں شمار کرنے لگیں۔

برطانیہ کے جن اہلدار ہوں اُنہی طرف تین ہزار پونڈ سالانہ بطور خراج
کے سلطنت روم کو ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے
یہ خراج ادا نہیں کیا گیا ہے۔

ملکہ۔ مگر اب آپ کو حیرت پر یہ حیرت اور ہوگی کہ یہ خراج آئندہ
بھی کبھی ادا نہ کیا جائے گا۔

کلوٹن۔ جب تک وہ سربراہ کیوں سیر پیدا ہوں اس وقت تک تو
بہت سے قیصر روم کے تخت پر بیٹھیں گے۔ برطانیہ اب خود اپنی
ایک دنیاسے کسی کا محتاج نہیں۔ اور اب ہم خود زندہ رہنے کیلئے
کسی کو کچھ نہ دیں گے۔

ملکہ۔ وہ زمانہ اب نہیں ہے جبکہ رومانیوں نے ہم سے خراج وصول
کیا تھا۔ اب ہمارے حق میں زمانہ اتنا بہتر ہو گیا ہے کہ ہم کسی کو
خراج دینا گوارا نہیں کر سکتے۔ بادشاہ سلامت۔ میرے آقا اور
سرور حضور زیاد فرمائیں کہ آپ کے آبا و اجداد مع اس شجاعت و
تہور کے جو اس جزیرے کے لوگ رکھتے تھے اپنے زمانے میں
کیا کچھ نہ گئے۔ اور خود یہ جزیرہ وہ ہے جو رب البحر بینین کا بیغ
ہے جو بلند چٹانوں اور پہاڑوں کے حصار میں محفوظ ہے جس کے
گرد و مندر کی پر مشورہ موصیں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ جہاں کبیر
کہیں ایسی دلیل ہے کہ جہاز اس میں ہل نہیں سکتے۔ چلنا تو درکنار
بٹیسے بڑے جہاز چلیں تک اس میں غرق ہو جاتے ہیں البتہ
اتنا ضرور کہو گی کہ جلیں سیر نے ہمارے اس جزیرے پر ایک
زمانہ نہ ہوا کہ ایک قسم کی فح ضرور حاصل کی تھی لیکن یہ جزیرہ وہ
نہ تھا جس میں سیر روم کے جتنے کہتا کہ میں آیا۔ دیکھا۔ اور فح
کر لیا یہ سخت شرمندگی کے ساتھ، اور میں مرتبہ یہ شرمندگی اسے
اٹھانی پڑی کہ ہمارے ساحلوں سے لے پسا ہونا پڑا۔ و مرتبہ
شکست کھا کر واپس ہوا اور ہمارے طوفانی سمندر میں اس کے جہاز
کا غڈی ناو میں معلوم ہونے لگے اور اس کے جہاز موجوں کے
ملاطم میں چٹانوں سے ٹکرا کر اس طرح موجوں پر تیرنے لگے

اس لئے تاحہ امکان اپنی مخالفت کرنا میرے لئے لازمی ہے۔ مجھے علم ہے کہ پاتوقی اور ولایتی قوموں نے حفظِ عہد کے لئے ہتھیار اٹھائے ہیں۔ اس نظریے سے اہل برطانیہ اگر سبق نہیں توں اتنی اور نا مجھ ثابت ہوں گے۔ لیکن قیصر بھی اتنا بیوقوف نہ رہے۔

لوکیوس :- اس کا ثبوت اہل برطانیہ کو دینا ہوگا۔ کلکٹن :- بادشاہ سلامت نے آپ کی تشریف آوری کو جو بہ مسرت فرمایا ہے۔ اب آپ ایک آدھ دن ہمارے پاس قیام رکھ کر ہمارے مکمل تماشوں اور تفریحات میں شرکت فرمائیں۔ اس کے بعد اگر آپ ہم سے ملنے آئیں گے تو آپ کو ہمارے سمندر بہت گہرے نظر آئیں گے۔ اگر آپ نے ہمیں شکست دیکر ہمیں جزیرے سے نکال باہر کیا تو جزیرہ آپ کا ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کو برٹش میں آپ شکست کھا گئے تو پھر سارے جزیرے کے زار و زغن آپ کو کھا کر خوب موٹے مانے ہو جائیں اور اس طرح یہ کل قند خاں کو پہنچ جائیگا۔

لوکیوس :- بہتر ہے تو پھر ہی ہوں۔ سمبلین :- آپ نے اپنے آقا قیصر کا پیغام نہیں پہنچا دیا۔ اب آپ ہمارا جواب قیصر کو پہنچا دیں۔ باقی جو کچھ ہیں کہنا ہے وہ آپ کی تشریف آوری پر اظہارِ مسرت ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر :- قصر شاہی کا دوسرا کمرہ۔ پتائیہ

ہاتھ میں ایک خط لے آتا ہے۔

پتائیہ :- افسوس، حرام کاری کا الزام یہ کیسا لگایا ہے۔ یہ کیوں نہیں کھا کہ کون شیطان ہے جس نے اس پر ایسا بیہودہ الزام عائد کیا ہے۔ کیوں توں میرے آقا۔ یہ زہر کس نے تیرے کان میں بھرا ہے۔ وہ اتنی کا کون خبیث ہے جس نے اپنی زہر آلود زبان اور زہریلے ہاتھوں سے تجھے جو ہمیشہ کانوں کا کچا تھا ایسا یقین

کلوٹن اور [ہاں۔ بلاشبہ ہم اپنے تئیں ایک جبری اور امر لے رہا ہوں۔ بہادر قوم بچتے ہیں۔

سمبلین :- تو پھر آپ قیصر کو اطلاع کرو دیں کہ بادشاہوں میں ہمارا مورث اعلیٰ ملکی تیسوا تھا۔ اس نے ہمارے لئے قوانین وضع کئے تھے۔ اور یہ اس کے وضع کئے ہوئے قوانین کی باندی تھی جس نے ہمارے ساتھ قیصر کی لڑائیوں میں بڑے بڑے فیل والے اپنی توپوں کو اب دوبارہ زندہ کرنے اور آزادی کے ساتھ ان پر کاربند ہونے میں اس وقت و ہمت کے ساتھ دشمن سے لڑنا جو ہم اس وقت رکھتے ہیں ہمارا سب سے بڑا کام ہوگا۔ خواہ یہ امر روحا کی ناراضی ہی کا باعث کیوں نہ ہو۔ بادشاہ ملی تیسوا نے ہمارے قوانین وضع کئے تھے اور وہ پہلا برطانوی تھا جس نے سونے کا تاج اپنے سر پر رکھا تھا اور جس نے اپنے تئیں بادشاہ کہا تھا۔

لوکیوس :- سمبلین مجھے افسوس ہے کہ یہ جو کچھ آپ فرمایا وہی مجھ قیصر افسوس کے گوش گزار کرنا پڑیگا۔ یہ وہ قیصر ہے جس کے دربار کے خدام میں اتنے بادشاہ اور شہزادے ہیں کہ آپ کے پاس اتنے نوکر اور خدمت گار نہ ہوں گے۔ اب وہ آپ کا دشمن ہو گیا۔ پس اب سنیے کہ میں قیصر کی طرف سے آپ کو اشتہارِ جنگ دیتا ہوں۔ اب اس کا وہ قہر و غضب نازل ہوگا جس کا روکنا یا دفع کرنا غیر ممکن ہوگا۔ پس میں آپ کو قیصر کی طرف سے مخالفت اور مقابلے کی اطلاع دیتا ہوں۔ مگر اپنی طرقت آپ کی خاطر و ملا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سمبلین :- کاشیں آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعثِ مسرت ہوئی۔ آپ کا قیصر وہ ہے جس نے مجھے۔ نانٹ۔ کانٹا دیا تھا۔ میری جوانی کا زمانہ زیادہ تر قیصر ہی کی خدمت میں گزارا ہے۔ یہ شان و عزت جو میں رکھتا ہوں درحقیقت اسی کا ایک عطیہ ہے، اور یہی چیزیں اب جزیرہ مجھ سے چھینی چاہتا ہے۔

ہو۔ اور یہ کہ میرا شوہر مہرچ و تندرست ہے۔ خوش ہے۔ مگر خوش نہیں بھی ہے کیونکہ ہم دونوں جدا ہیں۔ یہی سبب بڑا غم ہے۔ اور یہی غم کرنے دو غموں میں بعض غم علاج پذیر ہوتے ہیں اور مغارت کا یہ غم ایسا ہی ہے جس سے عشق توانا اور مضبوط ہوتا ہے۔ بس جو کچھ اس میں ہوتا تھا ہی ہو۔ اے موعیٰ فہر اجازت لے کہ سبھیے توڑوں۔ مبارک تھیں وہ شہد کی مکھیاں جنہوں نے روزِ عشق کو مقفل کرنے کیلئے یہ موم پیدا کیا تھا۔ عاشق اور وہ فحرم جو سکر کی بہریں توڑ کر قید خانے جاتے ہیں۔ محرم تو قید خانے جاتے ہیں مگر تو مائتہ عشق کے اور ارق کو مقید کرتا ہے۔ خدا کرے کہ خط میں بھی خبر ہو۔

خط کو لکھ کر پٹھنی ہے۔

تمہارے باپ کا قبر ناک انصاف اگر مجھے اس کی سلطنت میں قدم رکھنے لے تو وہ میری موت کا اتنا باعث نہیں ہو سکتا جس قدر کہ اے میری سب سے عزیز جان تیری آنکھیں دیکھتے ہی پھر مجھے زندہ کر دیں گی۔ اب میں کہہ رہا کہ علاقے میں لغزور و ہیلن کے مقام پر لگایا ہوں۔ اب جو کچھ تمہارا عشق نہیں صلا رح ہے وہی کرو تمہاری ہر خوشی اور مسرت کا جو یاں اور اپنے قول و قرار پر ثابت قدم

میں ہوں تمہارا بیوہ تیرا دوستی مس

پسانو، سنا تم نے۔ وہ تو لغزور و ہیلن میں ہے۔ جاؤ گیلر سے ایسا گھوڑا لاؤ جس کے پر گے ہوں۔ لویہ خط خود پرٹھ لو اور فوراً بتاؤ کہ لغزور و ہیلن یہاں سے کتنی دور ہے۔ اگر کوئی جس کا شوق ملاقات کم ہو اس راستے کو ایک ہفتے میں طے کرنا ہو تو پھر میں کیوں اس مسافت کو ایک دن میں پیادہ پا طے نہ کر لوں۔ اے وفادار پسانو اگر تجھے اپنے آقا سے ملنے کا اتنا ہی انتظار ہے جس قدر کہ مجھ کو اپنے شوہر سے ملنے کا ہے تو یہ سچ ہے کہ تیرا انتظار میرے انتظار سے کم نہیں، لیکن وہ ضعیف قسم کا ہے۔

ولادو! بے وفا! ہرگز بیوہ نہیں۔ یہ سزا اس کو صدق و وفا کی وجہ سے دی جا رہی ہے۔ وہ ایک بیوی کی طرح نہیں بلکہ ایک بیوی کی طرح اپنی محنت و عصمت پر ایسے بے جا حملوں کے مقابلے کیلئے تیار ہے۔ اے آقا اب تیرا دل اس کی طرف سے ایسا کھوٹا ہوا ہے کہ میری توقع میری اتنی کھوئی نہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اسے مار ڈالوں۔ تیرے حکموں کو بچانی اور محبت سے بجالانے کے جو وعدے میں نے کئے تھے تو کیا وہ بھی ہیں کہ میں اس کی جان لوں، اس کا خون کروں۔ اور اگر ایسے کام میں واقعی آپ کی کوئی اپنی خدمت بھی ہوتی تو میں اسے بجا نہیں لاسکتا تھا۔ اگر میری خدمت گذاری ایسے ہی کام میں رہ گئی ہے تو میں آپ کا خدمت گذار بننا نہیں چاہتا کیا میری صورت میں کوئی بات ایسی نظر آتی ہے کہ میں انسانیت سے خارج ہو کر ایسا بے دردی کا کام کر سکتا ہوں؟ (خط پڑھتا ہے) ”جو خط میں نے لے لیا ہے مجھے اسے پڑھ کر جو حکم وہ نہیں دے گا اس میں تمہیں پورا موقع ملے گا۔“ اے موزی کا خدا کے ٹکڑے جو سیاہی میں خط کی سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ ہے۔ اے گل اور بے مٹی چیز! کیا تجھی ایسی بے دردی کے کام میں معاون و مددگار ہے۔ گویا ہمیں تو صاف اور بے گناہ نظر آتا ہے۔ اور اب چون خود آ رہی ہے۔ تجھے کیا علم ہے کہ میرے آقا نے مجھے کیا حکم بھیجا ہے۔

(ایوجن اندر آتی ہے)

ایوجن! پسانو! کہو کیسے ہو؟
پسانو، حضور میرے آقا کے پاس تو ایک خط آیا ہے۔
ایوجن! تمہارا ہی آقا کیوں وہ تو میرا بھی آقا ہے۔ لیو تیرا کوئی لائق سے لائق نہیں مجھی اختر شناسی میں اتنا کمال نہیں رکھتا ہو گا ہر قدر کہ میں اپنے شوہر کے لکھے ہوئے حروف کو پہچانتی ہوں۔ ان حروف سے انجم فلک کی طرح آئندہ کے حالات منکشف ہونگے۔ میرے اچھے خداؤ! اس خط میں جو کچھ ہو وہ لذتِ عشق سے معمور

ایکوجن میں نے خوب غور کر لیا ہے۔ اور دھرمی دیکھا ہے اور دھرمی بھی۔ لیکن ہر طرف میری راہ میں ایک غبار سا حال ہے جس پر سے میں گزر نہیں سکتی۔ ہر پہلو پر کوئی نہ کوئی خرخشہ لگا نظر آتا ہے پس خدا کے لئے جا اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہی کر۔ زیادہ بات کرنے کی گنجائش نہیں۔ سوائے مرقور و پہونچنے کے اب کوئی دوسری بات نہیں۔

تیسرا منظر۔ رولڈ کا علاقہ۔ ملک پہاڑی ہے۔ پہاڑ میں ایک کہن ہے کہن میں بلاریوس داخل ہوتا ہے۔ گدیوس اور اردوس پیچھے پیچھے ہیں۔

بلاریوس۔ آج کا دن تو اتنا اچھا ہے کہ گھر میں بیٹھے کوئی نہیں جانتا اور گھر بھی وہ جس کی چمتائی بھی ہو جیسے ہمارے گھر کی ہے۔ لڑکوں جھک جاؤ۔ یہ دروازہ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ خدا کی تعریف اور صبح کی عبادت میں خالق کے سامنے جھکو۔ بادشاہوں کے دروازوں کی تحرائیں بلند ہوتی ہیں کہ دیو اور جنات بھی گلاہ لٹکائے بنسیر آفتاب کو سلام کئے ان میں سے گزر جائیں۔ مرجا۔ اے خوش زمین مرجا۔

گدیوس۔ مرجا۔ اے بہشت بریں۔ مرجا۔

اردوس۔ مرجا۔ اے فردوس بریں۔ مرجا۔

بلاریوس۔ لڑکوں! سامنے والے پہاڑ پر ننگار گرنے پر چڑھ جاؤ۔ تم جوان ہو۔ ہاتھیں مضبوط ہیں۔ ابھی میدان سے آنا ہوا تم کو پہنچ جاؤ گا۔ جب تم اوپر پہونچو جھکریچے دیکھو گے کہ میں ایک جھوٹے پرستار کے برابر نظر آتا ہوں تو نہیں معلوم ہو گا۔ کہ جس مقام پر تم ہو وہ کسی چیز کو بڑا اور کسی چیز کو چھوٹا کر کے دکھاتا ہے۔ بسبب اس بات کہ محسوس کرو تو پھر وہ قطعاً یا اگر ناچار بادشاہوں اور بادشاہی ربادوں لڑائیوں اور لڑائیوں کی چالوں اور چیلوں میں نہیں سنا رہا ہوں؟ کوئی خدمت اسوجہ سے خدمت مقرر نہیں کی جاتی کہ ایک خاصہ طریقہ پر کی گئی تھی تاکہ فیکہ خدمت لینے والا خدمت خوش

مگر میرا شوق ملاقات تو حد سے گزرا ہوا ہے۔ بس بتائے عشق و الفت کے صلاح کار اور اپنے منہ سے جلد جلد الفاظ نکال کر میرے کانوں میں انہیں اس طرح بھرنے کہ وہ مبارک مقام مرقور و پہونچ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اور یہ بھی بتا کہ صوبہ ویکز جس میں یہ مقام واقع ہے کیونکر ایسا خوش نصیب ہوا کہ میرا محبوب اس وقت وہاں موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سب سے پہلی بات سوچنے کی ہے کہ ہم یہاں سے خفیہ طور پر کیونکر نکلیں۔ اور روانگی اور واپسی کے زمانے میں یہاں سے اپنی عدم موجودگی کا کیا غذر پیش کریں۔ سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلتا کیونکر ہو۔ عہد و سعادت کے سوچنے کی ابھی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر تو بے کوی غور کیا جاسکتا ہے۔ بتاؤ کہ گھوڑے کی سواری کو ایک شخص نہیں کتنا فاصلہ طے ہو جائیگا؟

پسائیو۔ ایک سورج کے نکلنے سے دوسرے سورج کے نکلنے تک کوئی بیڑا میل طے ہو سکیں گے۔ شہزادی صاحبہ آپ کا اس تک پہونچنا سخت دشوار ہو گا۔ (علیہ کہتا ہے) خدا جلے اس تک پہونچنے میں کتنی دیر اور دیر جانا پڑے۔

ایکوجن۔ اے ہمیں رفتار میں اتنی سستی۔ آناست تو کوئی مجھدم بھی قتل ہونے منتقل کی طرف نہ جانا ہو گا۔ میں نے تو گھوڑ دوڑ میں لوگوں کو شرطیں لگائے تھے اب جن کے گھوڑے لٹے تیر ہوتے ہیں کہ شیشے کے ساعت نما میں ریت بھی گر کر ان کی تیز رفتاری کو نہیں پاسکتا۔ مگر یہ سب باتیں بیکار ہیں۔ جاؤ اور میری خواہشوں سے کہو کہ بیماری کا غذر کریں اور کہیں کہ وہ بادشاہ کے سلام کو گئی ہے۔ اور فوراً گھوڑے کی سواری والا لباس حاضر کریں۔ مگر وہ زیادہ قیمتی نہ ہو۔ جتنا کہ ایک معمولی زمیں دار کی بیوی پہنے اس سے زیادہ قیمت کا نہ ہو۔

پسائیو۔ حضور شہزادی صاحبہ پہلے اس بات پر اجماعی طرح غور کر لیں۔

ہی نہیں ہوتی جب دنیا کی باتوں کو اس نظر سے دیکھو گے تو بیٹھ اچھا سبق ملے گا اور ہم اس راحت کو محسوس کریں گے جو ایک ادنیٰ گیر طرا اپنے پروں کے غفل میں چھپا بیٹھا محسوس کرتا ہے۔ اس ادنیٰ گیر طے کو وہ راحت محسوس ہوتی جو شاہین بلند پر۔ از کو نہیں، گوئس کے پر مضبوط اور اس کی پرواز بلند ہوتی ہے لیکن جب طوفان آتا ہے تو ادرہ سے ادرہ جھونکے کھاتا پھرتا ہے، ہماری زندگی بہ نسبت اس شخص کی زندگی کے زیادہ راحت و امن کی ہے جو کسی امید کی غمت میں رہتا ہے، اس کی بد مزاجیاں برداشت کرتا ہے۔ ہماری زندگی زیادہ دولت رکھتی ہے بہ نسبت اس کی زندگی کے جو رشوت لینا ہے اور کچھ کام کر کے نہیں دیتا۔ ہماری زندگی زیادہ قابلِ فخر ہے بہ نسبت اس کے جو فقی لباس پہنتا ہے اور ورزش سے جس نے پوشاک ایسی نفیس تیار کی ہے، اپنا ادب اور تعظیم کرتا ہے مگر اتنا نہیں ہوسکتا کہ ورزشی لینے حساب کی کتاب میں قیمت کی وصولی درج کر دے۔ ایسی زندگی ہماری زندگی کے مقابلے میں کچھ وقت نہیں رکھتی۔

گداریوس۔ آپ یہ سب کچھ اپنے تجربے سے درست کہتے ہیں۔ ہم غریب جن کے پر و پر زے ابھی تک نہیں ملے ہیں ہم تو بھی اپنے آشیانے سے دور اڑ کر نہیں گئے۔ ہمیں تو اس آشیانے سے باہر کی ہوا تک نہیں لگی۔ لیکن ہے کہ ہماری زندگی بہترین ہو۔ اور آپ جو دنیا کے گرم و سرد کو جھیل چکے ہیں، آپ کے نزدیک ہماری یہ زندگی زیادہ شیریں ہو اور وہ آپ کی زیادہ عمر کے مناسب حل ہو لیکن ہمارے لئے تو وہ ایک لاعلمی کی کال کوٹھری ہے۔ ہماری سروسماحت تو صرف اتنی ہے کہ بستر پر لوٹ لے۔ یا وہی قرضہ کا قید خانہ ہے جس کی حدود سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتا۔

اروہیرگیس۔ جب ہم آپ کی عمر کو پہنچیں گے تو کس بات کا ذکر کیا کریں گے۔ جاڑے میں جب دسمبر کا تاریک مہینہ آئے گا، باد و باران میوہ پر ہونگے تو اس غار میں جو ہمیں گائے کھاتا ہے ٹھنڈا اور سردی

کے اوقات کیا باتیں کر کے گزاریں گے۔ ہم نے تو دنیا دیکھی ہی نہیں جانوروں کا ساحل ہو گیا ہے۔ شکار کی ترکیبوں میں البتہ ہم رد و باہ سے کم نہیں اور جو شکار ہم کھاتے ہیں اس کے حاصل کرنے میں ہماری خوشخواری بھی بیڑوں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ ہماری ہمت جو انفرادی تو صرف اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جب ہم کسی شکار کو بھگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم تو اپنے اس نفس کو ایک طائر خوشنوا کی طرح سر و گاہ بناتے ہیں۔ اور اس قید میں بھی گیت گاتے ہیں گویا ہم آزاد ہیں۔

بلاریوس۔ یہ تم کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو اگر تم کسی شہر میں رہ کر وہاں کی لین دین، جہاز کا ذاتی تجربہ رکھتے ہوئے ایکسی شاہی دربار میں شامل ہو کر وہاں کی سازشوں اور جرم کو سمجھو واقف ہوتے جن سے نہ غلط ہوئے بن پڑتا ہے نہ رہتے تو تمہیں دنیا کی حقیقت معلوم ہوتی۔ بادشاہی درباروں میں چوٹی پر پہنچنے کے ہی معنی ہوتے ہیں کہ بلندی سے پستی میں گر دے یا سمجھو کہ یہ چوٹی ایسی پھسلوان ہوتی ہے کہ ہر وقت گرنے کا خوف ساتھ لگا ہوتا ہے۔ اگر تم کو لڑائیوں کا تجربہ ہو تو جان میں غمت، مشقت ہر وقت خطروں کے تلاش کرنے میں صرف کرنی پڑتی ہے تاکہ عزت و ناموری حاصل ہو تو پھر معلوم ہوتا کہ خطروں کی تلاش ہی میں یہ عزت و ناموری ختم ہو جاتی ہے اور بدنامی کی یادگار بھی اسی طرح قائم ہو جاتی ہے جیسے کہ نیکنامی کی ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچھے کاموں کا انعام بُرا ملتا ہے اور اکثر نیک کاموں کا انجام نفرت و بیزاری ہو جاتا ہے اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ ناکہ وہ خطا کی برسرِ تسلیم ختم کرنا پڑتا ہے۔ لڑکچہ! یہ کہانی دنیا مجھ میں پڑھ سکتی ہے۔ میرے جسم پر درد مانیوں کی تلواروں کے داغ اب تک موجود ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے بڑے لوگوں میں میرے کاموں کی شہرت آؤں درجے کی تھی۔ بادشاہ مجھ پر نظر نہ رکھتا تھا۔ اور جب شجاعت و سپہ گری

اس غار میں رہتے ہیں جہاں جھک کر انہیں داخل ہونا پڑتا ہے لیکن فطرت مجبور کرتی ہے کہ اس ادنیٰ حالت میں بھی دوسروں کو برکھیر امیر و سرور بن کر رہیں۔

بڑا لڑکا جسے سمجھتے ہیں گھڑیوں کہتا تھا اور جو تخت جطانیہ کا وارث بھی ہے تم ہے کہ جب میں تین پانچ دنوں دلیہ اسٹول پر بیٹھ کر لڑائیوں میں اپنے کارنامے سناتا ہوں تو جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے ان میں گویا اس کی روح جسم سے مفارقت کر کے جا پونجی ہے۔ کہتا ہے کہ اس طرح دشمن زخمی ہو کر گرے گا اور اس طرح اپنے کسی گروہ پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ یہ کہتا جاتا ہے اور بادشاہوں کا خون اس کے رخساروں پر جھلکتا جاتا ہے۔ میری باتوں کو سنگداری کے مطابق ایسے جوش و خروش سے کرتے ہیں کہ تپہ کہ پب نہ میں تیر ہو جاتا ہے اس کا چھوٹا بھائی کا فردل جس کا نام بادشاہ نے اور دیکھیں رکھا تھا، وہ بھی اپنے بھائی کی طرح میری تقریر پر سنگداری کرتوں اور جیشوں میں اپنی جان لٹا دیتا ہے۔ اور ان حرکتوں سے بھی زیادہ پرجوش الفاظ میں اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے۔ سنو، شکار اٹھا ہے۔ ملے بادشاہ سمجھتے ہیں، خدا اور میرا ضمیر گواہ ہے کہ تو نے میرے حق میں نفعی بے انصافی کر کے مجھے جلاوطن کر دیا۔ اس غصے میں میں نے تیرے دونوں بیٹوں کو جن میں ایک دوسرے کا اور دوسرے کا تین برس کا تھا چڑایا۔ اس خیال سے کہ میرا تو نے مجھے جلاوطن کر کے مجھے میری جائداد اور زمینوں سے محروم کیا ہے اس طرح میں بھی تجھے تیرے تخت کے داروں کی محروم کر کے لاوارث کر دوں گا۔ یورپی جو ان کی دایہ تھی، یہ بچے کسی کو اپنی مال بچتے رہے۔ اب لے دیا یہ دونوں بچے روز تیری قبر پر جا کر تیرے حق میں دعاے خیر کرتے ہیں اور مجھ بلاروس کو جس کا نام اس وقت مورگن ہے، یہ دونوں اپنا باب جلتے ہیں۔ شکار اٹھا ہے۔

چوتھا منظر۔ بطور دہیون کے قریب ایک گاؤں

کا ڈکڑا تا تو سب سے پہلے میرا نام لیا جاتا۔ اس وقت میری شان اس درخت کی سی تھی جس کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹی پڑتی ہیں۔ مگر ایک رات ایسی آئی، جسے ڈکڑوں کا طوفان کہو یا کچھ اور کہ میرے سب پھل گر گئے۔ پھل ہی نہیں گرے بلکہ پتے بھی سب جھڑ گئے اور موسم کی سختیاں پھیلنے کو نہیں باطل بے برگ و بار ہو گیا۔

گھڑیوں۔ ایسے اختلافات تو راستے کے رد و بدل سے پیش آیا کرتے ہیں۔

بلاروس۔ میرا قصور کچھ نہ تھا۔ اس کا حال میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ دو بد مصائبوں نے میرے خلاف جھوٹا طعن دیا۔ میری عزت و حرمت کا مطلق خیال نہیں کیا گیا اور مجھے ٹھٹھٹ کا یقین کر لیا گیا۔ ان بد مصائبوں نے قسم کھا کر مجھ پر یہ الزام عائد کیا کہ میں رومانیوں سے مل گیا ہوں اور اس جرم کو ثابت کچھ کر مجھے جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ اور اب میں برس سے یہ پہاڑ اور اس کے متعلق جس قدر زمین ہے وہی میری دنیا ہے۔ یہاں میں کا ناداری اور آزادی سے بھر دواں رکھتا ہوں۔ اور یہاں میں خدا کے نئے قرضوں کو ادا کرتا رہا ہوں جو پہلے کبھی ادا نہ کئے تھے۔ بس اب اٹھو، اس پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ یہ باتیں جو اس وقت ہوتی ہیں شکاروں کی سی نہیں ہیں۔ آج جو پہلے شکار مار گیا وہ آج کے کھانے پر میرا ہونگا اور باقی دو بطور خدمتکاران کے حاضر رہیں گے۔ اس کھانے میں نہ ہر کا اندیشہ نہ ہوگا جس کا اندیشہ درباری ضیافتوں میں کثرت رہتا ہے۔ جاؤ، میں آگے کی واہیوں میں ملونگا۔

(گھڑیوں اور امیر بچے جھپٹتے ہیں)

دیکھو فطرت کی چکاروں کو ٹپ کرنا کتنا مشکل ہے۔ ان لڑکوں کو خبر نہیں کہ وہ ایک بادشاہ کے فرزند ہیں اور نہ ان کے باپ سمجھتے ہیں کہ اس کے دونوں بیٹے زندہ سلامت ہیں۔ یہ لڑکے سمجھتے ہیں کہ وہ میرے ہی بچے ہیں۔ گو وہ ادنیٰ حالت میں

کی زمین پسانو اور ایوچن داخل ہوتے ہیں۔

ایوچن۔ تم نے توجہ میں گھوڑے سے اترتی ہوں کہا تھا کہ مفلور کا مقام بہت قریب ہے، میری ماں نے بھی کبھی مجھے میں میرا اتنا انتظار نہ کیا ہو گا جیسے کہ میں اس مقام کو دیکھنے کی منتظر ہوں۔ پسانو! بتاؤ کہ پوسی کس کہاں ہے۔ پسانو! تیرے دل میں کیا بات ہے، تو مجھے اس طرح گھوڑے جاتا ہے اور کیوں ایسی دردناک آہیں تیرے کیچے سے نکل رہی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تو اس وقت سخت پریشان ہے اور پناہ حال کچھ زبان پر نہیں لاسکتا۔ اتنا خوف کیوں کھاتا ہے۔ بہت سے کام لے کہیں تیری طرح اس خوفناک مقام کو دیکھ کر میرے حواس بھی تم نہ ہو جائیں۔ بات کیا ہے۔ یہ کاغذ کیا توجھے دیتا ہے؟ تیری کجا ہیں اتنی ناہریان کیوں نظر نہ لگیں۔ اگر اس کاغذ میں کوئی اچھی خبر ہے تو خوش ہو، ہنس، اور اگر کوئی بُری خبر ہے تو جو صورت ——— تو نے بنائی ہے وہی رکھ۔ یہ خط تو میرے شوہر کا ہے اس انٹی بد بخت نے جہاں زہرینے والے بہت رہتے ہیں زہر خورانی میں تمام ملکوں کو مات کیا ہے۔ تجھے کوئی مشکل درپیش ہے۔ پسانو! تم کہے کیوں نہیں۔ تمہارے بیان سے مکن ہے کہ کچھ تو اس سخت حالت میں تخفیف پہنچانے جس کے پڑھنے سے درتی ہوں کہ میری نوبت مرنے کی نہ ہو جائے۔

پسانو۔ آپ خود ہی مہربانی فرما کر بے پڑھ لیں تاکہ ایک معلوم ہو کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں اور تقدیر مجھے کس ذلت و خواری تک پہنچانا چاہتی ہے۔

ایوچن۔ خط پڑھتی ہے۔..... پسانو! تیری بیگم نے میرے بہتر پر میرے ساتھ بیوفانی کی۔ اس کا ثبوت مجھے ایسا ملا ہے جس نے میرے دل کا خون کر دیا میں کچھ دایمی تباہی باتیں سن کر ہنسی لکھ رہا ہوں، بلکہ میرے پاس ایسا مضبوط ثبوت موجود

ہے کہ جیسا میرا بیخ و الم تیرا خون آشام ہے اور مجھے اس کا اتنا ہی یقین ہے جیسے کہ انتقام کا انتظار ہے پس پسانو! سن لے یہ کام تجھے میری طرف سے کرنا پڑے گا، اگر تیرا ایمان اس کے گناہ سے نہ رنگا ہو تو تو اپنے ہاتھ سے اُس کی جان لے۔ اور میں اسکا موقع تجھے مفلور دیوں میں دیتا ہوں۔ میرا خط اس مضمون کا کہ میں وہاں جا رہا ہوں، پہنچ گیا ہے اگر تو تلوار کا تھام لگانے سے ڈرا اور مجھے اس بات کا یقین نہ دلایا کہ تو نے اُس کا سر قلم کر دیا ہے تو میرے لیے اسکی حرام کاری میں قلم بھونکا۔ اور تجھے اپنی طرف سے ایک منکھراہ نوکر کچھ لگو لگا۔

پسانو۔ میں تلوار کیا کیوں گا۔ اس خط ہی نے اس کا گلہ کاٹ دیا۔ ہاں بہت دیر بہتان، قہاری دھار تو تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے۔ قہاری زبان میں دن زہر ہے کہ دریاے نیل کے کل سانپوں میں اتنا نہ ہو گا تمہارا تنفس ہول کے ساتھ دنیا کے چاروں گوشوں میں پھوٹی باتیں شہر کر رہا ہے۔ بادشاہ اور بادشاہ بیگمیں، رہائش اور سلطنتیں، بیابانی اور بن بیابانی عورتیں، یہی نہیں بلکہ قبر کے تاریک کونے کھنڈروں میں بھی بہتان کی آواز اُٹھانے لگی ہے۔ شہزادی صاحبہ حضور نے خط میں کیا پڑھا؟

ایوچن۔ میں نے اُس کے بستر پر اس کے ساتھ بیوفانی کی۔ پسانو! بیوفانی کس کو کہتے ہیں؟ کیا بیوفانی اس کو کہتے ہیں کہ راتوں کو جاگ کر اُس کے لیے بیقرار رہوں گے یا کہ راتوں اور گھنٹوں تک اُس کے لیے روتی رہوں، اگر نیند آئی بھی تو اُسکی کے خواب دیکھا کروں۔ اور خواب میں اُسے دیکھتی ہی چونک پڑوں اور روتی جاگ ہوتی جاگ اٹھوں۔ کیا بستر پر بیوفانی ایسا کا نام ہے؟

پسانو۔ افسوس! بے نیکی و خاتون۔

ایوچن۔ میں اور... بیوفانی کروں۔ لے دل تو گواہ ہے۔ پسانو، جس وقت تو نے میرے شوہر کو حرام کار کہا تھا تو تیری

اب اس گھر میں سوائے غلوں کے دوسری چیز نہیں، تیرا آقا جو اس گھر کی دولت تھا اب اُس میں نہیں ہے۔ اُس کے حکم کی تعمیل کر تو اچھے کاموں میں تو ایسا بہادر تھا۔ اب کیوں بزدل بنتا ہے۔

پسا نیو۔ دور ہولے ظالم تلوار میرے ہاتھ سے ایسا گناہ نہ کروا۔

ایموجن۔ لیکن مجھے مزا ضرور ہے۔ تیرے ہاتھ سے نہ مری تو پھر تو اپنے آقا کا ننگ حلال نہیں، خود کشی کے خلاف خدا کا حکم سخت ہے۔ اس وجہ سے یہ کمزور ہاتھ اور کمزور ہو گئے ہیں۔ آ، دیکھ سینے میں دل یہاں ہے۔ اس کے سامنے سے سب چیز بڑھتا ہے دیتی ہوں کہ تیرا ہاتھ نہ رکے اور تیری تلوار میرے سینے میں اس طرح اتر جائے جیسے کہ وہ اپنے پہلے زبان بنام میں چلی جاتی ہے۔ ارے یہ کیا ہیں۔ یہ بیوفائیو تو اس کے صحائف عشق و فانی جو اب باطل ہو چکے ہیں۔ وطن ہو دور ہو، اے میرے دین و ایمان کے عاقل ترنے والو۔ تم اب میرے دل کا پردہ ہٹا کر رہو گے۔ اس طرح یہ قوف شاگرد، چھوٹے استاد کا یقین کر کے گمراہ ہیں۔ وہ جن کے ساتھ بیوفائی کی جاتی ہے اس دور کی تیزی کو جلد محسوس کرتے ہیں لیکن دعا باز کے حق میں بھی یہ دروغت رنج و تکلیف کا مقدمہ ہو جاتا ہے۔ لیو تو اس تیرے ہی لئے ہیں نے اپنے باپ کی نافرمانی کر کے اسے ناراض کیا اور بڑے بڑے شہزادوں کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ ایسے وقوعے شاذ و نادر کہاں ملتے ہیں۔ اس خیال سے انفس ہو تا ہے کہ جب تو اس عورت کو اب تیرے پاس ہے بیزار ہو جائے گا تو تیرا دل مجھے یاد کر کے کیسا رنج و عذاب میں مبتلا ہو گا پسا نیو! مہربانی کرو۔ مجھے قتل کرو۔

بھیرے قصائی سے پوچھتا ہے کہ تیری چھری کہاں ہے جب میں خود درخواست کرتی ہوں اور تو نہیں سنا تو اس سے معلوم ہوتا ہے تو

صورت خبیث ہو گئی تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ نہیں، تیری صورت خاصی اچھی تھی۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ کسی خوش رنگ چڑیا نے، جسے فطرت نے نہیں بلکہ رنگ آمیزی نے حسین بنایا ہے اسے اپنے دام میں تجھے گرفتار کر لیا ہے۔ میں غریب تو اب اس کے لئے نازہ بچھل نہ رہی۔ میں تو اب اُن پوش کوں میں ہوں جن کا چلن جاتا رہا۔ میں تو ایک پہنی ہوئی پوشاک کی طرح اس قابل بھی نہ رہی کہ دیوار پر لٹکا کی جاؤں۔ مجھے تو اب پھانسی پر پڑے پڑے کر رہا ہوں سمجھا گیا ہے۔ ہائے! مردوں کے عہد و بیان، تم تو عہدوں کے حق میں قانون کے خیر ہو۔ تیری ہر وفادار کے وعدوں کی نسبت سوائے اس کے کیا سمجھا جائے کہ وہ سب فریب اور دھوکہ ثابت ہوئے والے تھے۔ وہ ایسی چیز نہ تھی جو زمین کو قدرتی طور پر اُگے وہ تو عورتوں کو دام میں لاسنے کی باتیں تھیں۔

پسا نیو۔ میری اچھی بیگم، میری ایک بات سن لیجئے۔ ایموجن۔ ایسی بات کے زمانہ میں وہ لوگ بھی جو اچھے تھے اس وجہ سے بڑے اور بے ایمان سمجھے گئے کہ انہوں نے تجوں کی بات نہیں سنی اور سچے اُس وقت چھوٹے سمجھے گئے جبکہ سنیان نے رُو کر رُو کر وجہ والوں کو مجبور کیا کہ وہ کاٹ کاٹھڑا شہر ہو گئے ہیں۔ تو پھر اپنی چھوٹے آنسوؤں نے سچے آنسوؤں کو جھوٹا کر دیا جو دوسروں کی آنکھوں سے گرے تھے۔ اور حقیقی مظلومیت پر کسی کو رحم نہ ملے دیا۔ اسی طرح تو پستی اس بغدادی سے پستی میں گر کر دل اور ایمان رکھنے والوں میں اپنا برا اثر پیرا کر کے اُن کو چھوٹا اور چھوٹی قمیضیں کھانے والا بناتا ہے گا۔ پسا نیو! آ تو اپنی ایمان کو سلامت رکھ۔ آ، اور اپنے آقا کا حکم بجالا پھر اگر اپنے آقا سے ملے تو کہنا کہ میں اُس کے حکم کی کتنی پابند رہی ہوں۔ دیکھ میں خود تلوار بنیام سے کھینچتی ہوں۔ اب یہ برہنہ تلوار اپنی ہاتھ میں لے اور میرے خانہ دل میں اسے چلا اور مجھ لے کہ

پلے آقا کا حکم بجالانے میں کسی کڑا ہے۔

پسانیا ہو۔ لے خانوں با وفا جس وقت سے مجھے یہ حکم ملا ہوا سوقت سے اب تک میری ہلک نہیں چھکی ہے۔

ایموجن۔ پھر قتل کر کے سوکیں نہیں رہتا؟

پسانیا ہو۔ ایسا کرنے سے پہلے بہتر ہو کہ میں اپنی آنکھیں نکال ڈالوں۔

ایموجن۔ تو پھر تو نے اس کام کا قصد کیوں کیا تھا؟ خود آیا اور مجھے اتنی دور تک لایا۔ گھوڑوں کو مفت میں تکلیف دی۔ قتل ضائع کیا۔ محل میں میرے غائب ہونے سے الگ بھل جی ہوگی، اب میں واپس ہرگز نہ ہونگی۔ جو وقت اور موقع تیرے کام کیلئے مناسب ہے اُسے تو کیوں ضائع کرتا ہے۔ جب شکار زد میں ہے تو پھر کیوں مُنہ مڑتا ہے۔

پسانیا ہو۔ یہ سب اس لئے کہ وقت سوچنے کو مل جائے اور یہی بیدردی کا مرتبہ نہ ہوں۔ میں نے ایک تدبیر سوچی جو میری اچھی بیگم ذرا صبر سے لے سن لو۔

ایموجن۔ کہتے کہتے زبان تھکا ڈلی۔ کہہ، میرے کان تو سن پئے ہیں کہ میں بیسواہ ہوں۔ اس سے بڑھ کر کئے لئے کیا زخم ہو گا اگر زخم کی نہ کچھ ہو پئے کی کوشش نہ کر لیکن جو کچھ کہتا ہے کہہ۔ پسانیا ہو۔ بیگم! یہ تو میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ آپ محل واپس نہ جائیں گی۔

ایموجن۔ ضرور دل میں آیا ہو گا۔ کیونکہ تو تو مجھے قتل کرنے لایا تھا۔

پسانیا ہو۔ نہیں یہ بات ہرگز نہ تھی۔ لے کاش! جتنا میں یاغذا ہوں اتنی عقل بھی رکھتا ہوتا تو پھر آپ کو میرا مقصد بہتر شکل میں نظر آتا۔ بالکل ممکن ہے کہ میرا آنکھی دھوکے میں آگیا ہو۔ کسی حراز نے جو اپنے فن میں کمال ہوا آپ کو اور آپ کے شوہر کو یہ سخت آذیت پہنچائی ہو۔

ایموجن۔ کوئی رونا کی بیسواہ ہوگی۔

پسانیا ہو۔ نہیں۔ اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں پوسٹی کر کو آپ کے مر جانے کی اطلاع دیتا ہوں اور ثبوت میں کوئی خون آنودہ چیز جیسا کہ وہ طلب کرتا ہے سمجھ دیتا ہوں۔ محل میں آپ کی تلاش ہوگی اس سے اور بھی آپ کے مرنے کا یقین ہو جائے گا۔

ایموجن۔ پسانیا ہو! سگریہ زمانہ میرا کیہ نگرے گا۔ کہاں رہو گی۔ کیونکہ چرونگی۔ اس زندگی میں چین و آرام کہاں نصیب ہو گا کیونکہ شوہر مجھے گامہ میں مڑ چکی ہوں۔

پسانیا ہو۔ اگر آپ محل کو واپس گئیں۔۔۔۔

ایموجن۔ نہیں وہاں تو ہرگز نہ جاؤ گی نہ محل ہے نہ باپ اور نہ اس تند خو، ذلیل اور احمق کوکلیں سے کوئی مطلب ہے۔

پسانیا ہو۔ اگر آپ محل واپس نہ گئیں تو پھر برطانیہ کو بھی خیر باد کہنا ہو گا۔

ایموجن۔ پھر تو ہی بنا کہ کہاں رہوں۔ کیا سورج سارا برطانیہ ہی پر چمکتا ہے کیا رات اور دن صرف برطانیہ میں ہوتے ہیں۔ دنیا کی عظیم جلدیں برطانیہ تھا مگر اب ان میں نظر نہیں آتا ایک وسیع تالاب میں بظ بزرگ کا آٹ سیانہ معلوم ہوتا جو میرے خیال میں تو ایسے انسان بھی ہیں جو برطانیہ سے باہر رہتے ہیں۔ پسانیا ہو۔ یہ خیال درست ہے اور میں خوش ہوا کہ آپ کے ذہن میں کوئی دوسری جگہ بھی آئی۔ رونا کا سفیر لیو کیوس کل مدفود ہیون میں لے والاس۔ اگر آپ اپنی تاریک قسمت کی طرح اپنی طبیعت کو بھی ایسا بنا لیں کہ کچھ دل کی بات تک کوئی نہ پہنچ سکے اور ایسی باتوں کو چھپائے رکھیں جن سے آپ کو خطرہ ہو تو پھر آپ کو موقع مل سکتا ہے کہ آپ پوسٹی مس کے قریب رہیں۔ گو وہ اپنے کام غمی طریقہ پر کرتا رہے گا مگر دوسروں کی زبانی آپ کو اس کی نقل و حرکت کے حالات معلوم ہوتے رہیں گے۔

بود و باش ہوگی تو ذریعہ معاش کیا ہوگا تو اس کیلئے میں حاضر ہوں در کئی اس کے دینا کرنے میں قاصر نہ رہوں گا۔

ایموجن :- بیشک تمہیں میرے آرام کا فکر ہے۔ ہر حال میں خدا مجھے روزی پہونچاتا رہیگا۔ پسائیو! اچھا اب تم جاؤ اور جتنی باتیں غور کرنے کی ہیں جہاں تک وقت اجازت دیکھا ان پر غور کریں گے جس کو شش پر اس وقت میں نے کمر بستہ بندی پڑا ہے میں عالی ہمتی سے کام لوں گی۔ پسائیو۔ اچھا خدا حافظ۔

پسائیو :- بیگم اب تھوڑی دت کے لئے میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں غیر حاضر رہنے سے بھجا جائے کہ محل سے میں آپ کو کہیں لے گیا ہوں اسے نیک اور شریف شہزادی یہ ایک صند دیتی ہے جو ملنے لے مجھے دی تھی اس میں بڑی قیمتی دولہے، اگر جہاز پر سفر کرتے ہیں، دوران سفر ہوا بھون میں ناتوانی سے طبیعت مضطرب معلوم ہو تو تھوڑی مقدار میں لیمو کھالیمے کا سب ٹھیک دودر ہو جائے گی۔ اب کہیں درختوں کے سایہ میں جا کر یہ مردانہ لباس پہن لیجئے۔ خدا امن و عافیت کی

راہوں میں آپ کا ہادی و نگہبان ہو۔

ایموجن :- آئین۔ پسائیو! میں تمہاری شکر گزار ہوں۔

پاچا جال منظر :- سبلین کے قصر کا ایک کمرہ۔

سبلین، لک، کلون، کھیسوس سفیر، دربار کے

اُمراء اور خدام خاص داخل ہوتے ہیں۔

سبلین :- میں جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا۔ اب آپ رخصت ہوتا ہوں۔

لیوکوس :- شاہ عالی جاہ۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ قیصر کا فرمان میرے پاس آیا ہے کہ میں فوراً برطانیہ کو روانہ ہو جاؤں اور اہل افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اب ہمارا قیصر آپ کا دشمن

ہے۔

سبلین :- آپ سمجھ لیں کہ ہماری رعایا قیصر کے جوئے کو اپنی گردن

ایموجن :- کاش یہی ہوتا۔ مگر اس میں میری عزت و ناموس کو خطر ہوگا لیکن اس کے باطل تلف ہو جانے کا احتمال نہیں، میں اسے لئے تیار ہوں۔

پسائیو :- اب سنیے بات یہ ہے کہ آپ اس بات کو تو بھول جائیں کہ آپ عورت ہیں اور کارفرما کی جگہ جس کی آپ کو عادت ہے، دوسروں کی حکم برداری اختیار کریں۔ خون اور نفاست جو عورتوں کی سہیلیاں ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ جن وحیا کیساتھ اگر آپ ہمت و دلیری، حاضر جوابی، لڑنا بھڑنا، ترش مزاجی بھی سیکھ لیں نہیں ملکہ اپنے رخساروں کے رنگ روپ کو بھی فراموش کر دیں اور ان کی حفاظت و آرائش کی پروا نہ کریں اور سخت دل بن جائیں۔ افسوس اس کے سوا دوسرا علاج نہیں۔ فوراً قناب جو ہر کہہ و مہ کے بوسے لیتا رہتا ہو آپ اپنا حاضر بھی اسے پیش کریں اور اس محنت و توجہ کو جو چہرے کی آرائش و زیبائش میں صرف ہوتی تھی اور جس پر جو نو دی کو بھی رشک آتا تھا ترک کریں۔

ایموجن :- جو کچھ کہتا ہے مختصر کہو میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں اور ابھی سے مرد معلوم ہونے لگی ہوں۔

پسائیو :- لیکن اپنے کو مرد سمجھنے سے پہلے آپ مردوں کی وضع قطع اختیار کریں۔ میرے خیال میں مرد کا لباس، یعنی کرتہ، ٹوپی، کمر بند یا اور ایسی ہی چیزیں جو مردانہ لباس سے متعلق ہیں موجود ہیں۔ پس مرد کا کھیس بدل کر جو ان ہونے میں تو آپ کے شبہ ہے نہیں۔ آپ شریف و نجیب کھیسوس لیوکوس کے سامنے جائیں اور اس سے ملازمت کی درخواست کریں اور اس کو بتائیں کہ کوئی کام آپ کو ملے گا۔ اور یہ بھی اس سے کہیے کہ موسیقی کا اگر آپ کو شوق ہو تو وہ بھی جانتی ہوں۔

ایسا شک وہ خوش ہو کر آپ سے ملے گا۔ لیوکوس نہایت مغرور اور بڑا سا شخص ہے۔ راہ یہ امر کہ غیر ملک میں جب اپنی

پر رٹے آجائے گا۔

ملکہ۔ اس کام میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ پوری محنت اور طاقت کیساتھ اسکی طرف متوجہ ہونا ضروری ہو۔

سمبلین۔ چونکہ ہم بھی ایسا ہی سمجھ رہے ہیں اس لئے مقابلہ کیلئے پوری تیاری کی ہے۔ لیکن اے پیاری ملکہ ہماری بیٹی کہاں بڑا رومانی سفیر کے آئے پر جو دربار ہم نے کیا تھا اس وقت وہ ہمارے سلام کو حاضر نہیں ہوئی۔ جب وہ ہمارے سامنے آئی ہے تو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ ہماری طرف اس طرح دیکھتی ہے گویا از سر تا پا مجسم کینہ و بغض ہیں۔ یہ نہیں سمجھتی کہ ہم اس کے بھلا چاہنے والے ہیں۔ اُسے یہاں طلب کیا جاتے۔ کیونکہ ہم نے اس کی بے ادبیانہی گوارا کی ہیں کہ ہماری عظمت و بزرگی اب اسکی اجازت نہیں دیتی۔

(دربار کا ایک خادم ایوجن کو بلانے لگتا ہے۔)

ملکہ۔ بادشاہ سلامت جبے پوٹنی اس یہاں سے جلا وطن ہو کر چلا گیا ہے۔ ایوجن کی زندگی باطل تنہائی میں گذرتی ہے اب حضور کچھ ایسا علاج کریں کہ یہ تنہائی کا مرض اس کا رفع ہو اور اس بیماری سے وہ صحتیاب ہو۔ حضور سے یہ بھی التجا ہے کہ اس سے گنگو میں سختی سے پیش نہ آئیں۔ وہ ایسی نازک مزاج ہے کہ ذرا ساخت لفظ بھی اس کے لئے ایک شدید صدمہ ہو جاتا ہو اور ہر صدمہ اسے قریب موت کر دیتا ہو۔

سمبلین۔ ایوجن کہاں ہے۔ اور اپنی اس بے ادبی کا کیا عذر رکھتی ہے۔

خادم۔ خداوند! شہزادی صاحبہ کے تمام کمرے مقفل ہیں میں نے بہت کدوائے کٹکھٹائے مگر جواب نہ ملا۔

ملکہ۔ جب آخر مرتبہ میں اس سے ملی ہوں تو کہتی تھی کہ اُسے تنہائی بہت پسند ہے اور یہ کہ اُسے معاف فرمایا جائے ناسازی مزاج کی وجہ سے وہ حضور کے سلام کو بھی نہیں اسکی پوجا کو

پر رکھنا گوارا نہیں کرتی۔ رہے ہم تو ہمارے بادشاہی شان و عظمت کو کم کرنا مناسب نہیں۔

لیو کوکس۔ اب مجھے خشکی میں سفر کرنے کا پروانہ راہ واری ملغورہ ہیون تک کا طلب کرنا ہے۔ ملکہ کی خدمت میں عرض ہو کہ خدا حضور کو ہمیشہ شاد و آبا و رکھے۔

ملکہ۔ اور آپ بھی ہمیشہ شاد و آبا و رہیں۔

سمبلین۔ اہمرا دربار آپ سفیر روماکو جہان تک وہ کہتے ہیں رومی شان و عظمت کیساتھ پہنچا دیں۔ لیو کوکس خدا حافظ۔

لیو کوکس۔ حضور رہا تمہاریں۔

گلوٹن۔ بادشاہ کے دست مبارک کو خلوص دل سے ہاتھ میں لیجئے۔ رہا میرا تمہارا تو وہ اسوقت آچکا و دشمن ہے۔

لیو کوکس۔ واقعات جو پیش کئے والے ہیں وہی بتائیں گے کہ انجام کار کون نجات ہوا۔ اچھا۔ رخصت۔ خدا حافظ۔

سمبلین۔ اہمرا دربار آپ سفیر روماسے اس وقت تک جدا نہ ہوں جب تک کہ ہم دریائے سیورن کو عبور نہ کر لیں۔ خوش رہو لیو کوکس۔

(لیو کوکس سفیر اور اُمرائے چلے جاتے ہیں۔)

ملکہ۔ سفیر رومایہاں سے اپنی پیشانی پر شکن ڈالے گیا ہے لیکن ہمارے لئے یہ موجب فخر و مسرت ہے کہ ہم نے اس کو اپنی جبین پر نل ڈالنے کا موقع دیا۔

گلوٹن۔ یہ تو خوب ہوا۔ کیونکہ آپ کی بہادر رعایا برطانیہ کی یہی خوشی تھی۔

سمبلین۔ لیو کوکس نے قیصر کو یہاں کے لوگوں کے احوال سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہماری جگہ رتھ اور ہماری مرکب سوار فوجیں لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوں۔ قیصر کی جوفوجیں

اس وقت گالیہ (فرانس) میں موجود ہیں وہ تیار ہو کر اور رومانی لشکر فرانس میں آکر ان سے مل جائے گا اور پھر فرانس کو برطانیہ

ملکہ :- "علحدہ کہتی ہے، خدا آج کی رات اس کو زندہ رکھ کر دوسرے دن زندہ دیکھنے دے۔"

(ملکہ باہر جاتی ہے۔)

کلوٹن :- "ایموجن سے تو مجھے عشق بھی ہو اور نفرت بھی۔ وہ حسین ہو اور شاہانہ مزاج رکھتی ہے، تنہا سب اعضا میں وہ حسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ کسی عورت بلکہ بہت سی عورتوں کو بھی یہ بات نصیب نہیں۔ اُس کی ہر چیز تمام عورتوں سے بہتر ہے۔ اگر تمام عورتوں کا حسن ایک جگہ جمع کیا جائے تو یہ حسن بھی اُس کی خوبی اور عنایت کو نہیں پہنچتا۔ یہ وجہ تو میرے عشق کی ہے اور نفرت کی وجہ یہ کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور اس کی خبیث پلستی میں اُس کی عقل پر کچھ ایسا جادو کر دیا ہے کہ اُس کی تمام خوبیاں غارت ہو چکی ہیں اور یہ وجہ ہے کہ میں اُس سے نفرت کرتا ہوں۔ نفرت ہی نہیں بلکہ اس سے بدلا کاٹنا چاہتا ہوں کیونکہ جب احمق اور بیوقوف ———

(پہنائندہ داخل ہوتا ہے۔)

کون ہے؟ کہاں جاتا ہے۔ ادھر آ۔ اسے قہر م ساتی، حرانی، تیری بیگم کہاں ہے۔ جج جج بنا۔ در نہ تجھے ابھی جہنم کے مٹھنوں کے چولے کر دو گئے۔

پہنائندہ :- "خیر ماشد، یہ حضور کو کیا ہو گیا۔"

کلوٹن :- "تجہ تیری بیگم جس کا تو نوکر ہے کہاں ہے۔ تم ہے یہ بات ایسی ہے کہ ایک دفعہ پوچھا پھر نہ پوچھو گنا۔ یہ بھید اگر تو نے نہ کھولا تو تیرا دل حیر کر اس میں سے نکال لو گنا۔ کب وہ پونسی مس کے پاس پہنچ گئی۔ پونسی مس کو وہ لے جس کے کنارہ ذلت و سفاہت سے ایک رتی بھی کوئی نہیں نکال سکتا۔ پہنائندہ :- "میری بیگم کب سے نہیں ملتی ہیں۔ پونسی مس تو آجکل رو دیا ہے۔"

کلوٹن :- "میں تو ایموجن کو پوچھتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ خدا باہر

رو زندہ سامنے حاضر ہو کر اُسے آواز بجالانا ضروری تھا۔ اُس نے جی کہا تھا کہ میں حضور کو اس امر کی اطلاع کر دوں لیکن کو مانی سفیر کے وارد ہونے سے جو ربا رہا اُسکی معذرت میں آپس عرض کرنا بھول گئی۔ یہ بھول میرا قصور ہے۔"

سمبلین :- "اُس کے کمروں کے دروازے کیوں مقفل ہیں اور وہ موجود بھی نہیں ہے جو ہم میرے دل میں اٹھ رہے ہیں خدا کر کہ وہ غلط غلیں۔"

(بادشاہ باہر جاتا ہے۔)

ملکہ :- "کلوٹن میرے فرزند تم بادشاہ کے پیچھے پیچھے جاؤ۔"

کلوٹن :- "اُس کے نوکر پستانو کو بھی میں نے دو دن سے نہیں دیکھا۔"

ملکہ :- "جاؤ۔ دیکھو ہوتا کیا ہے۔ پستانو جو اپنے آقا کا اس قدر خواہ ہے تیرے پاس میری دی ہوئی ایک دوا ہے خدا سے فید ہے کہ اُس کی غیر حاضری اس وقت اس وجہ سے ہوئی کہ میں نے وہ دوا کھالی ہو۔ کیونکہ وہ اس دوا کو ہر مرض کیلئے خیر سمجھتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایموجن کہاں گئی۔ مگر جب ناامیدی حد سے زیادہ گذری ہو تو جذبہ عشق کے پر ہلکے دلی کی تلاش میں نکل گئی ہو۔ غرض مرے یا اپنی عزت غارت کرنے کو جو کچھ بھی ہو کہیں نکل ضرور گئی ہے۔ ہر صورت میں ہر مقصد پورا ہوتا ہے اب تاج بھٹائیہ جس کو میں چاہتی تھی کو ملے گا۔"

(کلوٹن اندر جاتا ہے۔)

کہو فرزند کیا حال دیکھا۔

کلوٹن :- "یہ تو یقینی بات ہے کہ ایموجن کہیں بھاگ گئی ہے۔ اندر ایسے اور بادشاہ کی تسلی کیجئے۔ اُن کی حالت تو سخت قہر و غضب کی جو رہی ہے۔ کسی کی بہت نہیں کہ اُن کے قریب آسکے۔"

میں کہوں بڑی سچائی اور صفائی کے ساتھ کرتا رہا۔ پھر ایسے دیندار پسانیاؤں پر شکریہ ادا کروں گا۔ اور ہر وقت تیری ترغیب دولت کی سفارش کے لئے میں موجود ہوں۔

پسانیاؤں حضور فرمائیں کیا کام ہے۔
کلوٹن :- میں جب تو نے اس لفظے پوسٹی میں کسی خدمت پر اتنے صبر و شہادت قدمی سے کی ہے تو پھر مقتضائے منت گذار یہی ہے کہ تو میرا بھی نعمتی اور جفاکش ملازم ہو جائے۔ بتا تو میرا ملازمت کیلئے تیار ہے؟

پسانیاؤں حضور اس ناچیز کو کب عذر ہو سکتا ہے۔
کلوٹن :- واہ۔ واہ کیا بات ہو۔ اچھا ہاتھ لا۔ اور لے یہ میرے روبرو کی تھیلی اپنے پاس رکھ اور اتنا اور بتا کہ کیا تیرے پاس یہ آقا کی کوئی پوشاک ہے۔

پسانیاؤں حضور چہ تو مگر مکان پر ہو۔ اور یہ پوشاک وہی ہے جسے پہن کر چلتے وقت وہ شہزادی ایموجن سے ملتا تھا۔
کلوٹن :- اچھا تیری پہلی خدمت یہ ہے کہ وہ پوشاک مجھے لائے اور بس پہلا کام جو تیرے کرنے کا ہے وہ یہی ہو کہ وہ پوشاک فوراً حاضر کرے، بس ابھی جا اور لا۔

پسانیاؤں حضور ابھی جا کر لانا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

کلوٹن :- مجھ سے ملغور دہیوں میں ملاقات کرنا ایک بات پسانیاؤں سے پوچھی بھول گیا۔ لو اب میں لے باؤ کے لیتا ہوں۔ آج حرامی پوسٹی میں تو مجھے جان سے مار دینا کہیں یہ پوشاک آجی تو بات تھی۔ ایک زمانہ ہوا کہ ایموجن نے کہا تھا۔ اور جو کچھ کہا تھا، اسکی معنی اور تشریح آج زبان پر آتی ہے۔ کہا تھا کہ ”پوسٹی میں کسی کے پیچھے پڑنے پر پڑے بھی میرے دل میں تیری وقت اور عزت رکھتے ہیں کہ یہ میری نجیب حسین صورت اور میرے شرمغزہ خصال میری نظر میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے تو میں اب

اگر کھڑا ہوں۔ بس اب سچی بات کہہ ڈال نہیں۔ میرا اطمینان کر۔ ایموجن کو کون لگایا۔

پسانیاؤں :- لے میرے لائق آقا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔
کلوٹن :- یہی فرماتا ہوں۔ لے میرے لائق حرامی لے ابھی دریافت کر کے بتا کہ تیری کیم کہاں ہے۔ اس کے سوا دوسری بات منہ سے نکلی، مانجھے لائق آقا کہا۔ جی جی بتا دو تیرے چپ پہنے پر تجھے سوکھ حوالے نہ کیا ہو تو بات نہیں۔

پسانیاؤں :- تو پھر اس کاغذ کو بٹھیں۔ اس میں جو کچھ ہے اس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔
(ایک خط کلوٹن کو دیتا ہے)

کلوٹن :- اچھا میں پڑھتا ہوں۔ میں تو اس کا تعاقب قیصر کے تخت تک کروں گا، وہ بھی کیا ہے۔

پسانیاؤں :- (علحدہ کہتا ہے) بچا ہے، ورنہ پھر آپ کے غارت ہو جانے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور ہے۔ خط پڑھ کر اس کے پیچھے آپ دوڑیں گے تو ضرور مگر اسکو کوئی خط نہ ہو گا۔
کلوٹن :- ہائیں یہ کیا لکھا ہے۔

پسانیاؤں :- (علحدہ کہتا ہے) مجھے تو اب ایموجن کے مرنے کا حال ہے آقا کو لکھنا ہے۔ اور لے ایموجن خدا کرے تو تمام آفات محفوظ سفر کرتی رہے اور ایک دن خیریت سے تجھے یہاں لانا نصیب ہو۔

کلوٹن :- بتاؤ خط تاجا ہے یا نری ہناوٹ ہو۔
پسانیاؤں :- حضور میرے خیال میں تو —

کلوٹن :- لکھا ہوا تو پوسٹی میں کس کے ہاتھ کا ہے۔ اس کا خط اگر پہچانتا ہوں۔ پسانیاؤں اگر تو بالکل ہی بدہوش نہیں ہے تو میرا ایک کام کر لے۔ اور جو کام میں بتاؤ کہ ان کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی حزم و گماں کر نیکو

بیوفانی نہیں کر سکتا۔ مفلور دھیرن کو آپ جی کو خبر دے کر
لے جائیں جس کی تلاش میں آپ جا رہے ہیں وہ آپ کو وہاں کب
ملتی ہے۔ لے خدا کی برکت! اس پر برابر نازل ہوتی رہو۔
اس احسن کی راہ کھولی اور رفتار سست ہو۔ اور سوائے محنت
تحلیف کے اس کا دوسرا انجام نہ ہو۔

چھٹا منظر۔ دیکھ کا علاقہ۔ بارہویں کی کہن کے
سانے ایوجن لڑکوں کے سے کپڑے پہنے نظر آتی ہو

ایوجن۔ اب معلوم ہوا کہ مردوں کی زندگی بھی کیسا محنت و
مشقت کا ایک نامحتمل سلسلہ ہے۔ تھک کر چور چوکی ہوں۔ دو
راتیں زمین کو اپنا بستر بنایا میں تو بیمار ہو جاتی۔ مگر قصد اور ارادہ
نے سنبھالے رکھا۔ پہاڑ کی چوٹی سے جب پستائیوں نے بتایا تھا کہ
دیکھو وہ مائے مفلور دے تو وہ بہت پاس معلوم ہوتا تھا جب
کوئی مصیبت کا مارا سفر فرمائے مقامات کے قریب آنا جانا ہی
کہ جہاں سے راحت و آرام نصیب ہو تو یہ مقامات اس سے
دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ راہ میں دو فقیروں نے بتایا تھا کہ
جس راستہ پر جا رہی ہو وہ ٹھیک ہے۔ غریب محتاج اپنا
اس بات کے سمجھنے میں کہ سفر کی صعوبتیں ان کے گناہوں کی سزا
یا نیکیوں کی آزمائش ہوتی ہے خطا کرتے ہیں۔ لیکن انکی یہ خطا
قابل حیرت نہیں۔ جبکہ خود اسودہ اور دو لٹمنڈ شکل سے بھی
چچ بات کہتے ہوں سرور کی حالت میں خطا کرنی زیادہ مجروح
کرنے والی چیز ہے بہ نسبت اس کے کہ تنگدستی میں کوئی مجبورت
ہوے۔ غلطی اور خطا بادشاہوں میں مبنی بڑی چیز ہے فقیروں
میں نہیں ہے۔ لے میرے آقا اور شوہر اب گو تیرا شمار بھی اپنی
خطا کاروں میں ہے۔ اس وقت مجھ کی بھی مگر تیرا خیال کرتے
ہی مجھ جاتی رہی۔ لیکن اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ مجھ
کے مائے گری پڑتی تھی۔ ذرا دیکھوں یہ کیا مقام ہے۔ یہاں
سے تو ایک راستہ جانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو کچھ عجیب حشرناک

انی پوسٹی اس کی بھی پرانی آئین میرے گلے میں ہوگی اور میں تیرے
مرنے کو شہر ہنگام۔ پہلے تو پوسٹی اس کو تیرے سامنے قفل کروا
پھر وہ میری جسارت و جرات کو دیکھے گی اور پھر میری یہ
جسارت و دلیری اس کی نظر میں آجی میں سوائے میری تحقیر و
تذلیل کے دوسری بات نہیں۔ اس کی سخت اذیت اور موجب
ندامت بن کر نظر ہوگی جب پوسٹی اس زمین پر مرنا چاہو گا اور
میں اس کے مردہ جسم پر اپنی تقریر کر دوں گا جس کی توہین اور ذلت
خواری کے ساتھ اس کے قفل ہونے کا ذکر ہو گا اور پھر اسے
گھسیٹنا ہوا بادشاہ کے دربار میں حاضر کروں گا اور سرور بار
خوش ہو ہو کر کہوں گا کہ ایوجن نے میری توہین و تذلیل کی
تھی اور میں اب بدلائنا لکھ نہایت خوش اور مسرور ہو جاؤں گا۔
(پتا ہو، پوسٹی اس کی پوشاک بیکرا ہو،)

کیا یہی اس کے کپڑے ہیں؟

پسائیو۔ حضور! اسی کے یہ کپڑے ہیں۔

کلون۔ ایوجن کو مفلور دھیرن گئے کتنا زمانہ ہوا۔

پسائیو۔ ابھی تو وہ وہاں پہنچی بھی نہ ہوئی۔

کلون۔ اچھا یہ کپڑے ہمارے کمرے میں لیکر حاضر ہو۔ اور یہ

دوسری بات ہے جس کا حکم ہمیں دینا ہوں۔ تیسرا حکم یہ ہے

کہ جو تدبیریں اور چالیں تم ہماری دیکھو وہ ہرگز کسی پر ظاہر نہ

کرو۔ بس میری خدمت کئے جاؤ۔ پھر تمہاری ترقی لازمی ہے۔

اس وقت تو مجھے مفلور دھیرن جا کر اپنا بدلائنا لگا ہے۔ کاش

آج کو میرے شانوں پر پہن گئے ہوتے تو ان کو تیرے ہاں جلد سے

جلد پہنچ جاتا۔ آؤ دیکھو۔ بے ایانی نہ کرنا۔

(کلون چلا جاتا ہے۔)

پسائیو۔ یہ تو آپ میرے نقصان کی بات بھی کیونکہ آپ کے

ساتھ وفاداری کرنی اپنے آقا کے ساتھ ہے ایانی کرنی ہے اور

میں اپنے آقا کے ساتھ جس کے برابر بھائی دوسرا نہیں، کبھی

یہ کوئی پری ہے۔

گداریوس: کیوں کیا بات ہے؟

بلاریوس: تم ہے۔ یہ تو کوئی فرشتہ ہے۔ اگر فرشتہ نہیں ہو تو حسن و زیبائی کا بہترین نمونہ ہے بالکل نو عمر ہے۔ لڑکا معلوم ہوتا ہے۔

(ایموجن قریب آتی ہے۔)

ایموجن: گھر کے اچھے مالگو مجھے کوئی نقصان نہ پہونچاؤ۔ اندر قدم رکھنے سے پہلے میں نے آواز دی اور خیال تھا کہ جو کچھ میں اس وقت کھا رہا ہے وہ آپ سے مانگ لیتا یا بہ قیمت حاصل کرتا۔ میں بچ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کی کوئی چیز چرائی نہیں، گو سونا چاندی فرش پر کچھ بڑا تھا۔ مجھے جو کچھ میں نے کھا ہے اس کی قیمت حاضر ہے۔ میں تو کھانا کھانے ہی یہ قیمت یہاں رکھ دیتا اور جس کی وجہ سے اس وقت یہ کھانا ملا ہے اس کے حق میں ملے خیر کر کے جانے والا تھا۔

گداریوس: روپیہ۔ روپیہ۔ اے لہو جوان یہ تم کیا کہتے ہو۔ سونا چاندی دنیا میں جتنا ہے خدا کرے وہ سب خاک ہو جائے ابھی تدر تو انہیں لوگوں میں ہوتی ہے جو ناپاک خداؤں کے ماننے والے ہیں۔

ایموجن: آپ تو خدا ہونے لگے۔ اگر اس قصور میں آپ مجھے مار ڈالیں گے تو مجھ لیجئے کہ اگر میں یہ قصور نہ کرتا تو خود ہی مر جاتا۔

بلاریوس: آپ کہاں جا رہے تھے؟

ایموجن: لغو و ہیون جانے کا قصد تھا۔

بلاریوس: آپ کا نام کیا ہے؟

ایموجن: میرا نام فدی ہے۔ میرا ایک عزیز بھائی جا رہا ہے۔

اس کا قصد ظہور دے جہاز پر سوار ہونے کا ہے وہاں جا رہا تھا کہ رستے میں بھوک سے بیٹاب ہو گیا اور یہ قصور مجھ سے ہوا کہ

گھر سے معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہو کہ میں اندر نہ جاؤں لیکن فلتے اور شدت کی بھوک فطرت کو مجبور کر دیتی ہے اور ان میں بہت پیدا ہو جاتی ہے۔ امن و امانی بزدل پیدا کرتی ہے۔ سختی اور مصیبت ہمیشہ جفا اور عالی بہت پیدا کرتی ہے۔ اے کوئی یہاں ہے اگر کسی نے دل میں خدا کا ترس ہو تو بولے ماوراء گرجی کوئی این انہیں ہے تو پھر وام لے اور روٹی ملے۔ کوئی یہاں ہے کچھ جواب نہیں ملا۔ بس میں اندر جاتی ہوں بہتر ہے کہ تو ابرہہ نہ کروں۔ اگر کوئی دشمن ہے تو خدا کرے اس کا دل بھی میری طرح کمزور ہو۔۔۔۔۔ (اندر جاتی ہے۔)

(بلاریوس۔ گداریوس۔ اردیریکس اندر آتے ہیں)

بلاریوس: پولیڈور نے توج اپنے تمہیں بڑا زبردست شکاری ثابت کیا ہے بس آج کھانے پر وہ میزبان ہے اور میں در کا دیں خدا شکار اور باورچی کی حیثیت رکھیں گے جیسا کہ شروع میں ہم یہی تجویز کیا تھا۔ ان ان محنت و مشقت میں کبھی اپنا پسینہ نہ بہانا اگر اس کی ضرورت ہے کی اسے امید نہ ہوتی۔ آؤ۔ بھوک ایسی تیز ہے کہ جو کچھ کھائیں گے اس کا ذائقہ اچھا ہو جائیگا۔ تمہیں میں اگر پھر یہی پٹرس گے تو گہری مینڈ لے گی۔ مگر جو حیش و آرام کے بندے ہیں ان کو پروں کے نرم تکیے سخت معلوم ہونگے۔ خدا اس گھر میں ہمیشہ امن و سلامتی رکھے۔ اے غریب گھر جب ہم باہر تھے تو تو یہی اپنا ننگراں تھا۔

گداریوس: میں تو بہت تمک گیا ہوں۔

اردیریکس: تمکا تو میں بھی بہت ہوں۔ مگر بھوک کے مائے بر حال ہے۔

گداریوس: کچھ ابلایا تھا خدا گوشت گھر میں موجود ہے۔ جب تک شکار رک کر تیار ہوئے کھا کر کچھ سہارا کر لو۔

بلاریوس: دغا میں جھانکنا ہے اور کہتا ہے ٹھیکر و اندر مست جاؤ۔ وہاں تو کوئی بیٹھا کھانا کھا رہا ہے میں بھٹکا ہوں کہ

آپ کے گھر میں داخل ہو کر کچھ کھانا کھالیا۔

بلاریوس، اے حسین نوجوان! آپ ہم کو بالکل ہی وحشی گنوار نہ سمجھئے اور نہ اس وحشتناک مقام کو دیکھ کر جہاں ہم رہتے ہیں، ہماری طبیعت کا اندازہ کیجئے۔ خوب ہو کہ آپ یہاں آ گئے۔ اب تو خاصی رات ہو گئی ہے۔ سفر پھر شروع کرنے سے پہلے ہم آپ کی آسائش کا سامان کریں گے اور آپ کے یہاں قیام کرنے کے لئے شکر گزار ہونگے، اور جو کچھ ہمارے پاس حاضر ہے وہ نوش کیجئے۔ لڑکوں! ان جہان کے یہاں گئے پر اظہار مسرت کرو۔

گدیریوس، اگر آپ عورت ہوتیں تو میں براہ راست کوشش میں رہتا کہ آپ مجھے اپنا خادم تصور کریں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ عورت ہوتے کی حالت میں مولیٰ جاسکتیں تو میں آپ کی قیمت دینے کو تیار ہو جاتا۔

ارودییرکس، میں تو غنیمت سمجھتا ہوں کہ آپ مرد ہیں مگر عورت ہوتے تو خدا جانے آپ کے عشق میں کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑتیں، میں آپ کا اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ اور آپ کا یہاں آنا ایسا ہی مبارک سمجھوں گا جیسا کہ بھائی کا آنا، بھائی کے حق میں مبارک ہوتا ہے۔ اب آپ خوش ہوں کہ اس وقت آپ حلقہ احباب میں ہیں۔

ایوجین، حقیقت میں میں اس وقت دوستوں ہی کے نہیں بلکہ بھائیوں کے پاس ہوں (ہلچلہ کہتی ہے) لے کاش تم میرے باپ کے فرزند ہوتے تو پھر باپ کی نظروں میں میری وراثت نہ ہوتی جواب ہے۔ اور پھر پوچھی اس سے میں درجہ مساوات پر ہوتی۔

بلاریوس، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان کسی فکر اور تکلیف میں ہے۔

گدیریوس، کاش میں اس کی فکر دہریٹانی کو دود کر دیتا۔

بلاریوس، لڑکوں! سنو! کان میں کچھ کہتا ہے،

ایوجین، کیسے دل دالے یہ لوگ ہیں! اس غلام کے سوا نہ لگے پاس ملک ہے نہ زمین، اس میں وہی بادشاہ اور بادشاہ کے درباری ہیں۔ ان کی نیکیاں اور بھلائیاں وہی ہیں جو ان کے دل اور ایمان نے ان میں پیدا کی ہیں اور وہ اس کی خدمت اور توجہ کو ناپسند کرتے ہیں جو خدا کی متلون مخلوق، بڑے لوگوں کے لئے ظاہر کرتی ہے بھلائی کہیں ان دونوں جہانوں کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ اے خدا مجھے معاف کر۔ میں تو ان دونوں کا ساتھ دینے کے لئے اپنی جنس بدلنے کو تیار ہوں۔ پوچھی مس تو ہوں نکلا۔

بلاریوس، (لڑکوں سے کہتا ہے) ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے لڑکوں! اور جو شکار مار کر لاتے ہیں اسے پکائیں بھوک میں بائیں بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ جب پیٹ میں کچھ پڑے گا تو پھر اس مسافر کا قصہ بتاؤ۔ سنا ناپسند کرنا چاہیں گے۔

گدیریوس، آپ ہرمانی کر کے قریب آجائیں۔ ارودییرکس، آؤ گے لئے رات اور چچکاؤں کیلئے صبح کا نغمہ مٹا مبارک خیر ہو جتنا کہ آپ کا یہاں آنا ہمارے لئے مبارک ہوا۔ منظر ساقی، عزم کے اجلاس کا ایوان، مجلس استقامت کے دواکان اور حکام عدالت آتے ہیں۔

پہلا رکن مجلس، قیصر کے فرمان کا مطلب یہی ہے کہ روم کی رعایا چونکہ اس وقت ہاتھوں اور دلوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف ہے اور گایا (فرانس) میں جو رومانی فوجیں ہیں وہ باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی طاقت نہیں رکھتی ہیں۔ پس شہر کا تو کم کو اس جنگ کی طرف متوجہ کرنے میں قیصر نے کاسیس لیوکوس کو اس معرکہ کے لئے سپہ سالاری پر نامزد فرمایا ہے اور فرامی فوج کے لئے اس کی کوکال اختیارات عطا فرمائے ہیں۔ قیصر زندہ باد۔ قیصر زندہ باد۔

پہلا حاکم عدالت، کیا فوجوں کا سپہ سالار کیوں ہے!
 دوسرا رکن مجلس، ہاں۔
 پہلا حاکم عدالت، آج کل وہ فرانس میں ہے؟
 دوسرا رکن مجلس، جن فوجوں کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔
 پہلا حاکم عدالت، ہم اپنے فرائض نبھیں ادا کر چکے۔
 (ہائی آئینڈ) (پچھونچ)

فردوسِ خواب!

نشاط رنگ گمائیں، ٹھیں، فضاؤں میں
 سہرور زائیاں پیدا ہوئیں، ہواؤں میں
 وفور شوق سایا، مری و فداؤں میں
 دلِ خراب اٹھا، حسن کی ضیاءوں میں

ہنگامہ ڈوب گئی، کیفیت کی گمناؤں میں

ہوئے، فشر وہ نظارے مستنیں میں غروب

تفکرات کے تیور بہن رہا تھا، میں
 جگر کی آگ کے شعلے دبا رہا تھا، میں
 جیلِ خواب کی بستی بسا رہا تھا، میں
 تعینات کے جھگڑے مٹا رہا تھا، میں

کسی فریب کے کہنے سے گارہا تھا، میں

تہا رنگِ تصور کی کیف سامانی!

مری بہار مرے قلب کے قریب ہوئی
 مجھے نشاطِ فشاں زندگی نصیب ہوئی
 جنوں کی کیف طرازی گما کچھ عجیب ہوئی
 حیاتِ رنگِ جیسے، مردہ آرزو کے نقوش ہوئی
 حقیقتوں کی فضا وہ دلی طیب ہوئی
 سگوں نواز مری کر بہت بسبب ہوئی
 مرا حبیب ہوا، جلوہ و جمالِ فروش

وہ خوابِ عشق کا رنگیں نال تھا، گویا

خیال تھا، تو حقیقت مثال تھا، گویا

جسمینِ نغمہ

معارف

لب پوش کو نہیں نالہ نہیں فریاد نہیں
مجھ کو معلوم ہے میں دہریہ ہوں آزاد نہیں
بچا ہی گئیں تیری تفسیرِ تنگ حیات
کب یہاں گئے تھے کیوں گئے تھے کچھ یاد نہیں

اتفاقات سے غرض کیا ہے ہم شہود
مگر کیا اس میں کہیں سے پوچھی ہو رنگِ نمود
لیکن اے صاحبِ دراک کہی سوچا بھی؟
باسواگیریِ حضوری میں کیوں موجود

اتفاقات سے ہر پہاڑ اوجھلا نہیں
وہ اندام تو ہیں صورتِ صیبا نہیں
نورِ فراموش نہ ہو مگر نیرِ کاشنا
خود بھی مودہ ہے لیکن یہ تعبیر یاد نہیں

نارودہ نورِ مہی آہ جبکہ طور نہ تھی
ن شعا ازل کی شش تنور نہ تھی
قول ہے اپنی نظم کا کہ کھٹ پک کلیم
نورِ نوریٹ ادا دو تو تھی فائدہ نہ تھی

ایمن حمزہ

جذبہ کور

کالج جاتے ہوئے بازارِ حسن میں سے گزرتا پڑتا تھا۔ دونوں طرف بالاخانوں پر بٹھی ہوئی مختلف قسم کی عورتیں جاذبِ نگاہ کر کے اپنے اپنی دلکش ترانہ کی نمائش کیا کرتی تھیں، اور ان کا سن جس میں مصیبت اور بناوٹی معصومیت کی ملی جلی جھلک ہوتی، فروخت کیلئے برسرِ راہ تھا۔

بی۔ اے کا طالب علم اور انیس بیس سال کا نوجوان، اسلم سعید ابھی سن و عشق کی کشمکش سے ناواقف تھا۔ چند ماہ پہلے دونوں باپ بیٹے کالج ساتھ ساتھ جاتے تھے جہاں اسلم کا باپ اسلم تعلقات کا پروفیسر تھا۔ اس لئے اور بھی اس کی نظریں کسی شاہدِ رعنا پر پڑنے سے پہلے ہی نقائص بٹھک جاتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے دونوں کا ساتھ نہیں ہوتا تھا اور کالج آنے جاتے اسلم کی معیت میں عموماً بے تکلف دوست — کالج کے مغل نوجوان — ہوتے جن کے لئے دوسروں کی نگاہیں بچا کر کسی جوانِ عورت کو ایک نظر دیکھ لینا لازماً شباب تھا۔ تمام راستے دلہن و بیاہتی خن اور لذتِ عشق پر گھست گئی رہتی اور گاہے گاہے کنکھیوں سے بالاخانوں کی زیارت بھی کر لی جاتی تھی۔ کبھی کوئی اپنی جھوٹی آپ بیتی سناتا اور کبھی سستے تاو لوں کے جذبات کو بھڑکانے والے رومان دہرائے جاتے۔ اسلم نے حسبِ عادت پہلے پہل تو ان رنگین باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی لیکن رفتہ رفتہ وہ ان کو مزے لے لے کر سننے لگا اور کبھی کبھار جب طبیعت جھولتی پر ہوتی تو عشق کی کار فرمائی سے متعلق ایک آدھ شعر بھی سناتا۔ پھر بے معنی قہقہے شروع ہوتے اور آپس میں رلے زلی کی جاتی اور بالآخر سب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے۔

پھر ایک دن وہ آیا جس کی واردات یہ افسانہ مرتب ہوا۔ اسلم کی نظریں جن میں جوانی کی لہر اچھی تھی، بالاخانوں پر پڑتے پڑتے ایک کم عمر بیکرِ جمال پر مرکوز ہو گئیں جس کے نقوش، ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے لوچِ قلب پر مرتب ہو جاتے تھے۔ پندرہ سولہ کی عمر، سدھولی جسم، سرخ و سفید رنگ، خوبصورت کمر، چہرے پر شادابی، لبوں پر نزاکت، آنکھوں میں شوخی — گویا جوانیِ حسن میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ مطلع ابر الود تھا اور کیف اور فضا ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اسلم خیالات میں گھویا ہوا کالج جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب کے سمندر میں موجیں اٹھ اٹھ کر اس کو ہلکے ہلکے سے ہلکے رہی ہیں۔ چلتے چلتے وہ یکایک چوٹا وہی جان جہاں بلی و دھانی ساری میں مہوس موڑے اترتی۔ اس پاس کے وہ لوگ بھی جن میں ابھی جوانی سسک رہی تھی، اسے ندیدی نظروں سے گھورنے لگے۔ اس لئے اسلم پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور مسکرا کر فوراً ہی سامنے سے گزرا کہ اپنے بالاخانے پر چلی گئی۔ اسلم صورت بنا سکتا کھڑا رہا۔ اس کے جذبات کا طوفانِ تعلیم اور مذہب کے بند توڑ دینا چاہتا تھا — دفعتاً تھوڑے فاصلے پر ایک بالاخانے سے شور و غل بلند ہوا اور ایک دردناک چیخ فضا کو جیرتی ہوئی اسلم کے کانوں میں گونجی — کسی عورت بازار کے آستانے پر اس کے رقبوں میں لڑائی ہو گئی تھی جس کا ہولناک انجام یہ ہوا کہ ایک شخص نے اپنے رقیب کے چھری بھونچ کر

پہنچا ۲

کالج پہنچ کر اسلم کو معلوم ہوا کہ ہال میں اخلاقی درس سے متعلق اس کے باب کا لکچر ہو رہا ہے۔ پروفیسر سعید کا لکچر اسکی موثر اور دلکش آواز، مناسب اور عمدہ الفاظ، بلند اور فلسفیانہ خیالات اسکی تقریر کے خاص جوہر تھے، جسے سننے کے لئے چھوٹا اور بڑا، متعلم اور معلم، سب ہی عیسائی سے منتظر رہتے تھے۔

لکچر ختم ہونے کے بعد آپس میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ ایک پروفیسر کہنے لگا: آج سعید بڑے جوش میں تھے۔ دوسرے نے جواب دیا: جوش میں ہوتے کب نہیں؟ یوں کہو کہ آج جو انہوں نے اپنے لئے موضوع منتخب کیا وہ نہایت اہم اور حسب حال تھا۔

تیسرے صاحب بولے: اس موضوع پر اس سے بہتر تقریر نہیں ہو سکتی۔ ایک طالب علم نے دوسرے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: دیکھا، ظالم نے کیسی دوشالے میں لپیٹ کر ماری ہیں، تم آج کے لکچر سے عبرت حاصل کرو، تم کو اپنی جوانی پر بہت ٹھنڈ پڑے۔

”جوانی پر ٹھنڈ کرنا تو کوئی عیب نہیں۔“ ایک بے تکلف دوست لاپرواہی سے بولے۔ ہال جیسا کہ پروفیسر صاحب نے کہا نظر بازی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو اتنی زیادتی تھی کہ ایک اور صاحب نے گویا مسکرت جواب دیکر معاملہ ختم کر دیا۔

پہنچا ۳

اسلم عجب خلیان ہیں تھا۔ صبح کو یہ بستی اور اب اپنے یہ درس دیا۔ تمام دن طبیعت پریشان تھی اور کالج کے روکھے پھلکے لکچر کو کسی سے یکسر خالی رہے۔ کبھی جن کی شوخی اس کے نواہز محبت دل میں تڑپ پیدا کرنی اور کسی باب کی تقریر کا خیال اس کے جسم میں ایک تھر تھری سی پیدا کر دیتا۔ ایک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا وہ قعدہ پر یک شہ پر غور کر رہا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے اور باب کے الفاظ اس طرح سنائی دینے لگے گویا سعید اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے: جوانی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے، اس کے کھوجانے کے بعد دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ بچپن اور بڑپا یکساں اور لائین زمانے میں جن میں انسان دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ جب تم بچے تھے تو تمہاری ننگاہیں والدین پر رہتی تھیں کہ ماں تمہارا پیٹ بھرے اور باپ تمہارا تن ڈھک لے۔ جب بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہارے ہاتھ پاؤں جھپٹ کرنے کے بھی قابل نہ رہیں گے اس وقت عجب درد ہوئے کہ تمہاری اولاد اپنے بال بچوں کو دے چکے کے بعد کچھ بھی نہیں کھائے اور پینے کو دیر سے اُسے بصد خوشی قبول کر لو۔ لیکن جوانی وہ عمر ہے جب تم آزاد اور خود مختار ہوتے ہو، جہاں چاہتے ہو، جو چاہا کھایا اور جیسا چاہا پہنا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انسان کی زندگی بستی یا بنگراتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جوانی زندگی کا امتحان ہے، پاس ہوئے تو انسان، اور فیل ہوئے تو شیطان! وہ شیطان جس پر ہر وقت اور ہر طرف لغت و پھلجھڑتی ہو۔ سولہ سے چوبیس سال تک ایہ وہ عمر ہے جب خدا انسان کی طرح طرح سے آزمائش کرتا ہے، ذرا پاؤں دنگ لایا اور چاروں طرف پیسے ہوتے نہ ہریٹے کاٹنوں نے لہو لہان کر دیا۔ اور پھر اس راہ پر جن کی انگوٹھ میں عشق چھلتا نظر آتا ہے۔ جوانی

انسانی نیکو بیچارہ ہوتی ہے اور بھولے بھالے نوجوان صبح راستے سے بھٹک جاتے ہیں..... منزل مقصود خواب کے مندر کی طرح دم بدم اور ہوتی جاتی ہے اور اُس کے بدلے زندگی کے رنگین ٹھکانے نظر آتے ہیں..... رنگین ٹھکانا! اجسے کاشا! الفت سمجھ کر پرسش گاہ کا دروازہ دیا جاتا ہے، جسے قصر محبت سمجھ کر جبر سائی کی جاتی ہے! سمجھے تم؟ اور انجام کیا ہوتا ہے؟ — نئی کے گھر وندے! جنہیں زمانے کے طاقتور پاؤں نے روند کر مہار کر دیا ہو۔ محبت؟ نہیں، نہیں، سراب! دلدل! بلکہ ریگ روال، جہاں قدم رکھا اور انسان زمین میں دفننا شروع ہوا، لاکھ کوشش کرو، ٹھکانا محال ہوگا یا جیتے جی تدفین ہو رہی ہے..... تمہیں ان بد نصیب نوجوانوں کی ناکام زندگی سے سبق لینا چاہیے جو انجان یا تعلیم سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنی بربادی کی ابتدا بازاری محبت میں مبتلا ہو کر کرتے ہیں اور جن کے کان ایک حسن فروش کی ریچ کے کچے ہوئے پھولوں کی داستانِ عبرت سننے کے لئے ہمیشہ کیلے بہرے ہو جاتے ہیں۔ بیشک اس موقع پر اشد ضروری ہے کہ والدین ان کی نئی سے خبر گیری کریں مگر حقیقت سب بڑی خبر گیری خود کی جاتی ہے۔ جس نے اپنے دامن کو اس وقت مصیبت بچا لیا اس کی ہمیشہ فتح رہے گی..... بچو! بچو! سائے ٹک سے ایک حسن فروش محبوبہ کے، جس کا دھپا پانی کے ہوتے پہنچے بھی لے سے پی نہیں سکتا اور پیاسا ہی دم توڑتا ہے؟

—————

اسلم بچپنا، بچپنا، بچپنا! شام کو گھر پہنچی، سال بھر کے بچھڑے سادون بھادوں گلے مل کر رو رہے تھے۔ برکھارت جو بن پڑھی اور کالی کالی گٹھائیں پورب پیچھو سے گھر بھر کر آ رہی تھیں۔ ایسے سے جوانی مہوش ہو کر شراب شہابی جام بھر بھر کر لٹھا رہی تھی اور حسن و عشق بیباکانہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ اسلم نے بے چینی سے گروٹ بدلتے ہوئے مایوسی سے کہا: آخر انجام کیا ہونا ہے؟ دل اور دماغ آمادہ ہیکار تھے۔ کبھی اس کی یکایک جاگی ہوئی محبت اس کے باپ کو اس طرح شکست دیدیتی گویا اُس کے الفاظ کبھی نہ سمجھنے والے گورکھ چندے ہیں اور کبھی باپ کی نصیحت اُس کے جذبات پر اس طرح پالیتی گویا وہ اُس کے سامنے کھڑا ہو اکبر رہا ہے۔ جان پدر!..... یہ محبت نہیں جو شجوا جاتی ہے۔ دودھ کا سا اہل..... عارضی اور فیکل! وقتی اور تنہائی کا نقیب!..... اور پاس ہی آتش دان میں سے سلگتی ہوئی لکڑیوں کے چٹنے کی آوازیں اس طرح اڑ رہی تھیں جیسے کسی احسن کے بے معنی تہقے کھی سمجھ دے گفتگو کے دوران میں بے موقع بلند ہو جائیں۔

آہستہ آہستہ بدل چھٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نیلے آسمان پر رنگ برنگ ستارے جھل جھل کرنے لگے جیسے کسی حسین دوشیزہ کے دست نازک پر زرد ویاقت رقص کر رہے ہوں۔ اسلم کی نیم وال آنکھیں یکبارگی پوری کھل گئیں اور وہ اپنے دل کی دھڑکن کو ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ سامنے آسمان پر شہابِ ثقیب ٹوٹا اور ایک دوسرے ستارے میں جذب ہونے کے لئے اُس میں جا ملا۔

————— اور جب کسی کا دل چل جاتے تو بزرگوں کی یہ نصیحتیں، قانون کی یہ سختیاں، دوزخ کی یہ آتشیں پٹریاں کیا حقیقت رکھتی ہیں؟ باپ کو شکست فاش ہو گئی، اب جوانی کی حکومت تھی اور جب جوانی برسرِ اقتدار ہو، زہد و اتقا بھی

پاس لگتے ہوئے تھکاتے ہیں۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا.... آخر کار اس بازار میں پہنچ گیا جہاں باوجود اسکے کہ بازاری و مشیزاؤں پر فریفتہ ہونے والوں کے حسرتناک واقعات لگتے دن سننے میں لگتے رہتے ہیں، دولت اور سزا کا بیوپار نہایت کاسیانی سے ہوتا ہے۔ جیسے ہو جوانی کی بات۔ جب تک چہرے پر دو جلو خون کی رونق ہے روپے کے بل پر چاہے جتنی محبت خرید لیجئے۔ آج اسلام کی جوانی دنیا اور مذہب کی تمام زنجیریں توڑ کر آزاد ہو چکی تھی۔ چنانچہ بدقسمتی خون خطر کے وہ بالا خانے پر چڑھ کر درانہ ٹیٹر ٹیڈے میں داخل ہو گیا، لیکن اس نے دیکھا کہ وہ نیم مایاں پیکر تال ایک مرد کی آغوش میں چل رہا ہے۔ ایسا کیسی آہٹ سے چونک کر وہ مرو پڑا۔ آنکھیں چار ہوئیں اور اسلام کے نبیوں پر ایک لفظ کا پ کر رہ گیا۔

”آبا اب“

صادق الخیری دہلوی

طلم شوق

شہر راتش دل شمع صمغ نہ بنا
شعلہ طور بنا جلد وہ جان نہ بنا
چھا گیا نور چراغ تہہ و اماں ہر سو
زینت و رونق آبادی و دیوانہ بنا
سو طرح حسن تخیل نے بکھا وارفہ
کہیں سلی کہیں عذرا کہیں تھیانہ بنا
نغمہ شوق میں خود جذبہ زنجیں اپنا
کہیں سپاہ کہیں نگر جس مستانہ بنا
کھو گیا اپنے ہی جلوں میں لٹ حسنیت
آپ ہی شمع بنا آپ ہی پروانہ بنا
ہائے وہ طالب دیار وہ مشتاقی حال
جو حقیقت کعبہ اطمینان ہی دیوانہ بنا
خود فیری کی کوئی حد ہی جو اللہ اللہ
آکھنا ہر گز پر لٹا ہے بیگانہ بنا

مقاصد تمنّا

جس نے دیوانہ بنایا اسے دیوانہ بنا
شعلہ شوق بھڑک! شمع کو پروانہ بنا
دل حسرت زدہ و ویدہ پر غم کینک
مستی عشق! انہیں شیشہ و پیانہ بنا
الہ دوزوقی محبت! اگر پریشاں ہو کر
اس لہم خانہ ہستی کو طرب خانہ بنا
لطف توجہ سے کہ درج ہو راحت ہو
غم دنیا کو بھی لے دل غم خانہ بنا
شاہد اس طرح کچھ احساں دینے کہ ہو
دشمت ہجر! مجھے آپ بیگانہ بنا
کٹ گئی آرزو و شوق قد مہوس میں عمر
تو ہی کچھ کام دل اور غرض مستانہ بنا
چشم ساقی مجھے برکت نہ نظر آتی ہے
بگڑا ہی متعدد پر کو لے جرات زندانہ بنا

سکوب شاہ جہاں پوری

نخِ جگر

زخم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے ✓
 اور چاہیں کہ چھپالیں تو چھپائے نہ بنے
 ہائے بیچارگی عشق کہ اُس مُصل میں
 سر جھکائے نہ بنے آنکھ اٹھائے نہ بنے
 یہ سمجھ لو کہ غمِ عشق کی تکمیل ہوئی
 ہوش میں آئے بھی جب ہوش میں آئے نہ بنے
 کس قدر حُسن بھی مجبورِ کشائش ہے کہ آہ! ✓
 منہ چھپائے نہ بنے سامنے آئے نہ بنے
 ہائے وہ عالمِ پُر شوق کہ جس وقت جگر
 اُس کی تصویر بھی سینے سے لگائے نہ بنے

قطب لی سیر۔

(منظوم مکالمہ۔ دلی کی گھریلو زبان میں)

”ابھی کیا گھر کے کٹھا آئی ہے دیکھا تم نے
ایسا موسم ہو تو جی گھر میں بھلا کیسے لگے
میں تو کہتی ہوں برستنا ہے تو کھل کر برسے
بس کڑھائی چڑھے اور بارغ میں جھولا جھولے

لے لوغ پھوار پڑی ہائے غضب کے دن ہیں

انماں سچ کہتی ہوں یہ دن تو قطب کے دن ہیں“

”مجھ سے کیا کہتی ہو، کہنا ہے تو بھائی سے کہو
خود بھی تیار ہو، بچوں کو بھی تیار کر دو
یا نہیں خود کہہ دوں گی تم ان کو یہاں بلوا لو
اور سناں بھی جو چلنے کا کرنا ہے کر دو
اور کیا کہتی تھی میں؟ لو تو اس بھول گئی!

ہاں سنو اور بھی سب بہنوں کو بھجور ڈولی“

”تم کو چلے گا بھی کچھ ہوش میاں احمد ہے!
لے نصیبین! نو دو پھر اڑ گئی کیسی بد ہے
دیکھنا ڈیوڑھی میں جا کے ذرا اتھو ہے
اس ہرانی وجہ تانی کی بھی کوئی حد ہے

یونہی بد ذات مرا نامک میں دم کرتی ہے

کام کے وقت نچوڑی کہیں جا مرتی ہے“

”بھائی! بچے کو تو میں لیتی ہوں مجھ کو دیے بھج
”بیوی! چھوٹے میاں کہتے ہیں کہ جلدی کیجئے“
آپ جاکر ذرا پردوں کی خب لے لیجئے
”تو بے کہہ دو کہتے ہیں ذرا دم لیجئے“

مجھ کو گھبرانے میں کچھ ان کو مزہ آتا ہے

ریل کا وقت نہیں ہے کہ راہ جاتا ہے“

”کہنا لڑکے سے کہ بچے کو اڑھا کر لائے
”لوج یوں کوئی بُری مثال زبان ہر لائے
دُشمنوں کو کبھی پسلی کا غلل ہو جائے“
بات کہتے کا نہیں دیکھتے کب دھنگ آئے“

”ایسی تم! — لو میں نصیبین کو بڑی بی گھی!“

کچنے رند سے کا تو سناں وہ خود کر لیں گی“

چھپچھپ

”پڑ گیا جھولا چلو آؤ نا لے بی کو شرا!“
”دیر ہوتی ہے بس اب پیٹھ بھی جاؤ اٹھ کر“
”میں ابھی آئی ذرا پیٹیاں ڈالو جا کر“
جلدی جھول آئیں کہ بارش بھی کھڑی پڑ سر پر

ایسی سستی نہیں، کیا کہتی ہوں زینت آؤ!

دیر ہوتی ہے مرا کیا ہے بواست آؤ“

”جھٹلتی ہو تو کوئی گیت بھی آپا گاؤ میں بہت آؤں دے، تسکمی آئے بدرداں گاؤ“
 ”اے نہیں گیت کوئی ڈھنگ کا اچھا گاؤ میں تو کبھی ہوں بڑے بھائی کا جھولا گاؤ“
 سال بھر یاد میں سوکھا کیا لے کل جھولا
 اب نہیں چھوڑے گا برسات کا اچھل جھولا

چٹپٹ

”جو گئی اب تو اندھیرا چلو درگاہ چلیں“ ”دور ہی کیا ہے منٹ بھر میں ابھی جا پہنچیں“
 رات بیٹک ہے مگر اچھا ہے برقع لے لیں ہاں کسے یاد ہے درگاہ کا رستہ تو کبھی
 دیکھتے بھائی میاں آپ نہ بتلائیے گا
 بولتے بھائی دلہن پہلے کہہ جاویں گے
 ”اچھی منڈ ہٹکنے سے ہوتی ہے مجھے تو جھٹ“ ”ایسی شاباش نہیں منڈ تو چھپاؤ زینت!“
 ”مرد سے سامنے آتے ہیں بوا، صدر حمت!“ ”اب تو درگاہ بھی آپہنچی، الہی خلقت!“
 دیکھنا پتھریوں جالی سے نہ آگے بڑھنا
 فائزہ بس یہ ہیں درگاہ کے باہر پڑھنا
 ”اچھا واپس چلیں، جلدی کرو برسات بھی ہو“ ”اور ان کندھروں میں سننے ہیں کہ جنات بھی ہو“
 ”تو بھابھا رہی جاتی ہو کوئی بات بھی ہے!“ ”اے بوا کیا کروں میں تھک گئی اور رات بھی ہو“
 ”لو بہن تھک گئی تھیں خوب خدا رحم کرے“
 نوج اس طرح سے بھی جوں کی کوئی چال کرے

چٹپٹ

”آؤ اب کھانا ہوا جاتا ہے ٹھنڈا“ ”مٹی ختم ہوں گی بھی کبھی باتیں یہ تم بچوں کی!“
 ”بڑی بی بیسنی روٹی تو کچھ اچھی نہ رہی“ ”دیکھتی ہو بوا کیا شکل بنی بھرتے کی!“
 چٹپٹ کچے ہیں البتہ بگھارے بیگن
 یہ مرے ہاتھ کا ہے دیکھئے سا داسالین

چٹپٹ

”کیوں! پہلی مری تو بھینگی بہت آئی بھائی!“ ”اک کہانی تو سنا دیجے ممانی بیوی!“
 ”بیٹھی اب سو بھی رہو، رات زبان آئی“ ”جائیں گے صبح خدا چاہے تو واپس دہلی“
 یونہی رکھنا مرے اللہ یہ سیریاں تھم
 اور اسی طرح سے ہر سال سب آئیں جم جم آئیں

محمد شان محمد حق دھلوی

مجھے جانے دو

”مجھے جانے دو“ اُس نے کہا۔ اور جب تک میں اُسے روکوں ہاتھ جھڑک رہا تھا۔ اندھیرے میں اُس کی آنکھوں کی ایک چمک اور دلیرانہ پانوں کے پھوپھوے کی ایک جھلک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھری میں اکیلا رہ گیا۔ میں وہاں جانا نہ چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گزرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اُسے پھاٹک کے آگے کھڑا پایا تھا۔ جانے کی راتوں میں نیم آستین چہرہ پہنے ہوئے یہ چھوکر یاں راہ چلتوں کو بھانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں کوئی بھی آنکھوں والا، غائے کی سرخی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ ان کے جسم کا ہر رُواں تھرتھرا کر کہہ رہا تھا۔ ہیں لے لو۔ ایک روپے کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کئی رینگیلے کے منہ پر بھونک دیتی تھیں اور کوئی پھلی کسی بدنما ماروٹری کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھلکھلا پڑتی تھیں۔ انہی ہر او زباں حال سے کہتی تھی۔ ہیں لے لو۔ ایک روپے کے بدلے۔

ٹیم پر سرسبز زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھپ کے کھپ گزرا کرتے تھے۔ ان سسنی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ تو یہ استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بد بخت، نسوانیت کی کلنگ، خدا انہیں عارت کرے! چند ٹکوں کے لئے، شراب کی ایک بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیا کیلئے یہ اپنا تن ہر ایرے خبرے کے سپرد کر دیتی ہیں۔ اور ہم؟..... پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کر کے دنگی تھیں۔ بہنوں نے انہیں اپنی حلیاں، ریشمی ساریاں اور چھ چھ پچھے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک جھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کافی مٹھنی اور منگ دھڑنگ دیوی اپنی پھرائی ہوئی آنکھوں سے ہل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی تھی۔ شام کو جب آتی شروع ہوتی، درکسن لڑکیاں اُس کے سامنے ناچنے لگتیں تو منی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی رُوح ایک سیاہ کفن اور ڈھسے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دیگی۔ جو لوگ، دشمن کے لئے آتے، وہ ہاتھ باندھے ہوئے لپٹائی ہوئی نظروں سے ان رقا صاؤں کو تاکا کرتے تھے۔ اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ میاکی سے ان طوائفوں کو گھوڑنے لگتے جو پُجاری کے ڈکے مائے سیریس کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اُس کے دل میں پوجا کی عظمت کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے نہایت اطمینان سے آرتی کا تماشا دیکھتی اور وقت فوقتاً گیرتن کی لے پر سیریں سے ٹپک مینے لگتی۔ جب کوئی بوٹھا اپنی پٹنی ہوئی آواز سے نال کو میتال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پنوٹری کو پکار کر کہتی۔ ”ارے، ذرا سی سُر کی تو بننا۔“

اور کیرتن کا نونکھی جبروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا تھا۔

—————

جب میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ بہت ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگے بھاگے بھی اُس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اُس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک ہسلی سے پوچھنے لگی۔ ”اری، اُس حرامزادے سے کتنے اینٹھے؟“

اب میں ہر شام کو اُس فٹ پاتھ پر سے گزرتے تھا۔ جب وہ اُس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکاکر اپنی ہم جنسوں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی۔ اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چڑی سی لگتی، خون کی روانہ تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ جاتیں۔ دُور ہٹ کر لیپ کے کنبے کا سہارا لے میں گھٹنوں کھڑا رہتا تھا حتیٰ کہ ہیشل ہو جاتے تھے۔ میں یوں ہی مشکلی باندھے اس چھاگ کو مانگا رہتا تھا۔ بہتیرے شریف اُس کے اندر سے نکلتے اور دانتیں بائیں ویکھ کر لپکتے ہوتے پھڑپھڑیں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چٹیوں اور گھنیری ڈاڑھیوں والے بیسیوں بد معاش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی لمبوں کی طرح پیچے وہاں سے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے کونکر اس سے ہمکلام ہونے کی جرات کی تھی۔

اُس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دُنیا میں میرا کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا جب وہ مر گیا تو ہم نے اُسے مٹی کے تو دوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سُلا دیا گیا تو میں نے کیچہ تمام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان ساج کی قبر پر چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا۔ اور اُس نے مرتے مرتے کہا۔ ”میری پیپ تمہارے جسم کو مڑائیگی، میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا۔ میرے آسوت تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔“

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی، ایک خلا جبریر کا ہش کے سوا کچھ نہ تھا۔

شام کے وقت بلا ارادہ میں اُسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر گھسیٹ لیا۔

—————

اُس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا: ”اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے، وہاں سے ایک اٹھا حشرید لاؤ۔“

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دُنیا بُرا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے ٹکے جس پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے، جیسے مینس کے تن سے دودھ ٹپک رہا ہو۔ ان میں

ان بھٹی طوافِ نعون کو عصمتِ باعزت کا ذرا پاس نہیں۔ انہیں شہر سے نکال دینا چاہیے۔“

مگر گارت کے اندھیرے میں تم کٹ کٹاں آتے ہو اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا منہ کالا کر کے اپنی حرام کی کمائی کے چند درم ہیں دیتے ہو اور پھر اس تجسّس میں اپنی حرم سر کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیر بیگ بڑی۔“
وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اُس کا سانس پھول گیا اور وہ چار پانی پر گر پڑی۔ اُس نے درد و دیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی۔ ”زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد تم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔“

جب میں مرجاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گری کے مولانا نور الاسلام سے ملنا۔ اُس وقت اُن کے پاس جانا تب وہ منبر پر بیٹھے جوع کا خطبہ سنارہے ہوں۔ اور تمہیں شرافت کی قسم کہ جب وہ خطان کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنا صفت سے نکل کر کہنا۔ مولانا میں ایک پروردگی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنائے کیلئے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بد اخلاقی اس دُنیا سے جل بسی اب اسے ناحق نہ چسویئے۔“

اور جب سب بڑے اپنی عینیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بچتا ہے تو تم کہنا: میں آپ کی بیٹی کے جنازے کا تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھرتے نکال دیا تھا۔ اُسے ایک مرد مومن نے کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر لایا۔ اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوافِ کعبہ کرنے لگی۔ آپ کے ہجرتوں نے اُسے تھوڑے گھنٹوں میں بہاریاں دیں اور جب وہ مر گئی تو ایک حافظ نے اُس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی، جب تم یہ کہہ چکے تو لوگ تمہیں بہت پیش گئے، لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا۔“

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی تھی۔
دن پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سمجھتا تو میں نے دیکھا کہ وہ پچکے پچکے رو رہی ہے۔ تم لوگ جاوڑوں پر رحم کھاتے ہو۔ اُن پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سوزنا ہی دیتے ہو۔ میں نے میٹھوں کو دیکھا ہے کہ جین میٹھوں کو شکرا اور ساندوں کو پوریاں بھٹکا ہیں۔ مگر عورت آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو۔

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوافِ نعون سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود انکے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم انہیں زنا بالجبر، اغوا اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔
اور خدا! — وہ ہماری کیوں نہیں سُننا؟ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لئے جگہ ہے تو دُنیا کا ایک کونا ہیر کیوں نہیں مل سکتا؟۔“

اب ہوا چل رہی تھی اور ٹاٹ کے پتے غمناک آواز میں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریوں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ آگے دیکھ کر کشاکش کی گھنٹی بج اُٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا۔ اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی۔ میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے اور اب بھی اس فریب میں مُبتلا ہوں کہ وہ تجھی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹے گا کیونکہ قبل انکے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصور مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایہ حیات اُسے سونپ دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے، وہ بلیک میں مر گیا۔ اُس نے مجھے جو بچتہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبت کو اخلاق کی قہرل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا۔
 ان بھولی بھولی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں جس ماں کے آگے اُسکے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو اور جس عورت کے آگے اُسے محبوب کا جنازہ ملے کسلی بے کا اسلوب کو فی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہا ہو۔ میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اُس بچے کی لاش نگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر چچ کمر پہوش ہو گئی۔
 دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔

الہ آباد..... میرے نسبتی خالو کا مکان..... میری مرضی کے خلاف عصمت دہی..... بدنامی کا دور.....
 کلکتہ..... یہ جھگڑا گھر.....
 زیر لب وہ یہ ٹوٹے پھوٹے جملے دہراتی رہی، اور چند لمحوں کے لئے اُنکی آنکھ لگ گئی۔
 میں دبے پاؤں اٹھا اور محل سمجھا گئے کی نیت سے جوتے پہنے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ کیا تم جارہے ہو؟
 اُسے اُداسی سے پوچھا۔ اب اُنکی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔
 میں کھڑا کا ٹکڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

”اچھا تو جاؤ۔ خدا حافظ۔ اب نہ آنا۔ تم مِس سے انتہام نہیں لینا پاتا ہی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزا کہ اور آتشک کے چند جرائمِ مذکور کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا اور یہ اُس کے چپا کوورٹے میں ملتے غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکہ داروں کو چوڑا آنا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔
 مگر کبھی کبھی اگر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کا توں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ نہیں۔
 کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں۔ ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جتنے آقا ہر روز بدلتے ہیں۔ کیوں کس خیال میں تم ہو گئے۔ جاؤ خدا کیلئے چلے جاؤ۔ لیکن میں اذ جا سکا۔
 مجھ سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر بھی میں گرفتارِ نظرِ بزدل کی طرح اپنی جگہ سے لی نہ سکا۔

میں نہیں جاؤں گا۔ یہ لہکے میں نے اپنا سر اُسکے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بیجان لاش کی طرح یوں ہی پڑی رہی اس کے دل کا دھڑکن کو میں صاف مِس سکتا تھا۔ اُنکی رُوں کا نوہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔
 ”تو مجھے جانے دو۔“ اُس نے کہا۔ اور وہ چلی گئی۔
 اختتامِ سیر

پتنگ

چینی افسانہ

یہ میرے لئے ایک حد تک حیرتناک اور طال انگیز ہے کہ بہار میں جبکہ پتنگ کی زمین پر اب تک بہت بڑی ہوا درمیان ہوتی ہے سیاہ شاخیں آسمان کو نقش کر رہی ہوں، اسوقت جو میں نئی پتنگیں ادھر ادھر اڑ رہی ہیں۔ میرے وطنی قصبہ میں پتنگ اڑانے کا زمانہ عموماً بہار کا دوسرا ہفتہ ہے۔ جب سہ سہراہٹ کی آواز سنو اور گردن اٹھا کر ادھر دیکھو تو یقینی کنکجھورے یا کیکرے کی شکل کی سبز پتنگ نظر آجائے گی۔ قصبہ کی بغیر لمبی دم کی چو کو رسادی پریشان حال بچی اڑتی ہوئی پتنگ بھی نظر آجائے گی جس وقت بید کی نئی کپٹیں پھوٹی ہیں اور شقا کو کے درخت میں سے پھول آتے ہیں اس وقت بچوں کی یہ آسانی آرائش بھی اسی مناسبت سے پہلی معلوم ہوتی۔ یہ سب ملکہ بہار کا گرم، دلنوازی پیغام لاتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں کہاں ہوں؟ میرے ہر طرف جالوں کی تباہ کاریاں ہیں۔ مگر پھر بھی گزری ہوئی جوانی اور وطن کی بہار اس وقت فضا میں سانس لے رہی ہے۔

میں پتنگ کا دلدادہ نہیں تھا بلکہ ایک حد تک میں اس سے گھبراتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ناکارہ لڑکوں کے کھیلنے کی چیز ہے۔ لیکن اس کے برعکس میرا کمزور چھوٹا بھائی جس کی عمر اس وقت دس سال کی تھی۔ پتنگ کا اس قدر دلدادہ تھا کہ اگر کوئی پاس خریدنے کو پہنچے نہیں ہوتے تو اور کوئی ساتھ کھیلنے والا نہ ہوتا تو ادھے آدھے دن تک مسلسل منہ کھولے بڑے شوق سے آسمان کی طرف بغور دیکھتا رہتا۔ اگر کوئی پتنگ کٹ کر گرتی تو وہ خوشی سے چیخا اور تالیاں بجا بجا کر ناچتا۔ میں اس کو احمق اور ناکارہ سمجھتا تھا۔

ایک روز دفعتاً یہ خیال آیا کہ میں نے اس کو کافی دیر سے نہیں دیکھا ہے۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ پائیس باغ میں نے اس کو بائیس کے پوسیدہ کمرٹوں کو چھپے دیکھا تھا۔ میں مجھ گیا۔ جلدی سے ویران انبار خانہ کی طرف بڑھا۔ کو اڑ کھولتے ہی میں اس کو گردن اٹھو دسان کے انبار میں ایک بڑے اسٹول کے سامنے ایک چھوٹے اسٹول پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس کے سامنے والے بڑے اسٹول پر ایک تتلی کی شکل کے پتنگ کا ڈھانچہ رکھا ہوا تھا جس پر اس وقت تک کا فم نہ جانے کیا تھا۔ میں اس کو ڈھونڈنے کا لئے بہت خوش ہوا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس کا اس طرح مجھے چپکا کر پتنگ بنانا دیکھ کر مجھے بے انتہا غصہ آیا۔ مجھ ایک لٹو کھولنے کیلئے وہ اس قدر محنت کر رہا تھا۔ پتنگ چھین کر میں نے اس کا ایک کٹا توڑ دیا اور اس کی لمبی سرخ دم کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔ میں عمر میں اور طاقت میں بڑا تھا اس لئے فیمیری تھی۔ اس کو دل شکستہ چھوڑ کر بڑے غور و افکار سے اپنے کمرے سے چلا آیا۔ اس کے بعد اس کی کیا حالت ہوتی مجھے خبر نہیں اور نہ میں نے اس پر داک۔

بہرین میری پریشانی اور انھن کا زمانہ آخر آ ہی گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ میری عمر کافی ہو گئی تھی۔ بد قسمتی سے مجھے بچوں کے متعلق ایک غیر زبان کی کتاب پڑھے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت میں نے جانا کہ کھیل بچوں کی تربیت

کا ایک اہم جزو ہے اور ان کے کھلونے ان کے فرشتے ہیں پچھین کا وہ نگین واقعہ جس کی طرف میں نے میں سال تک توجہ نہ کی تھی اس کا منظر یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرا دل ایک سیسہ کا ٹکڑا ہے جو بیٹھتا جا رہا ہے۔ گو اس قدر بھاری نہیں ہو گیا ہے کہ باطل نہ میں ڈوب کر غائب ہو جائے۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا جا رہا ہے، بیٹھتا جا رہا ہے۔ نیچے، نیچے۔

میں جانتا تھا کہ میں اپنی اس غلطی کا ازالہ کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں اس کو ایک پتنگ بیچ سکتا تھا بلکہ اس کے اڑانے میں اس کی مدد اور بہت افزائی کرتا۔ سب سے بڑھکر یہ میں خود اس کے ساتھ کھیلتا جس کا وہ ہمیشہ متنی رہتا تھا۔ ہم لوگ ساتھ مل کر دوڑتے شور کرتے، ہنستے۔ لیکن افسوس! اس کی بھی میری طرح سے دار یعنی کل آتی تھی۔ اب وقت بکل چکا فرض کرو کہ میں اس سے معافی مانگتا۔ یہاں تک کہ وہ کہتا۔ اس کا خیال نہ کیجئے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرے دماغ کو سکون حاصل ہو جاتا۔ صرف یہ ہی ایک تدبیر تھی۔

جب میں اس سے دوسری بار ملا تو ہم دونوں میں کافی تبدیلی ہو چکی تھی۔ چہرہ پر مصائب زندگی کے آثار نمایاں تھے۔ میرا دل پھر ڈوب گیا۔ رفتہ رفتہ ہم لوگوں کی گفتگو کا رخ گزشتہ ہونے پچھین کے زمانہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے بہت کر کے اس کو پتنگ والا واقعہ یاد دلایا اور اس کا بھی اقرار کیا کہ یہ جوانی کی نادانی تھی۔ میں امید کر رہا تھا کہ وہ اس کا خیال نہ کرے۔

کہکھ معاف کر دیجئے اور اس کے بعد سے میرا دل ہلکا ہو جائیگا۔ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا تھا؟ اس نے منکرانے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ اس نے اس طرح سے اس واقعہ کو سنا گویا یہ کسی اور کا قصہ ہے۔ اس کو اس کے متعلق ایک لفظ بھی یاد نہ تھا۔

وہ قلعی بھول گیا تھا۔ اس لئے اس کو مجھ سے کوئی نفرت نہ تھی۔ جب نفرت نہ تھی تو پھر معافی کا سوال۔ میں کس طرح اس سے معافی مانگوں؟ کل واقعات صرف میرے ہی دماغ میں محفوظ تھے۔ میں اس سے زیادہ یاد کیا کر سکتا تھا کہ اس بار مجھ کو اپنے ضمیر کو دبا سے رہوں۔

وطن سے دور اس سرزمین حیرت و استعجاب میں ایک بار پھر قافہ بہ پہاڑ پتنگ آسمان پر پرواز کرتا نظر آ رہا ہے۔ اور مجھ کو بھولے ہوئے پچھین کی یاد دار رہا ہے۔ جس بے انتہا طول ہو جاتا ہوں۔ او۔ میرے لئے بہتر ہے کہ میں اس خزاں سیدہ بخت بستہ زمین میں دوبارہ واپس چلا جاؤں۔

ترجمہ قلمی

بہار

(لوٹن)

یاد رکھئے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ کے قلم سے ترجمہ۔ یہ انیسویں مصنف اناطول نامیس "فرانس کا شہ پارہ جو۔ اس میں جسم و روح کے تصادم کے مسئلہ کو معرکہ قیام کی ایک عورتوں بازاری کی داستان کے طور پر نہایت لطیفی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تمام دنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادرانہ لکھائی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنادیا ہے۔ قیمت دو روپے۔

ساقی بک ڈپو، دہلی

رنج بقیاس

اُداس آسمان پر ہجوم ابر تار ہے
کسی کو آہ کیا خبر کہ کوئی بیقرار ہے

نہیں ہے کوئی راز داں

نہیں ہے کوئی ہمنفس

غریب کا غم نہاں

خدا ہی جانتا ہے بس،

بھری ہو دل لیل سی لبوں پہ آہ سرد ہے

تڑپ بھی ہو رُوح بھی کچھ اس بلا کا درد ہے

مگر یہ انتہا نہیں

ابھی غم اور آئے گا

نشانِ نذل کے کہیں

کچھ اس طرح مٹا بیگا

اُمڈ رہی ہیں اور بھی غم و اکم کی بدلیاں

کرک رہی ہیں پاس ہی تباہیوں کی بجلیاں

میں اپنے دل کو پوچھوں

اگر مٹ کون ہو ذرا

یہ رنج بقیاس کیوں

یہ درد بے حساب کیا

نہیں غم

طُلوُع و غروب

نہیں دیتا چنانچہ میں نے دردِ اے کے پیچھے کھڑے ہو کر لوچھا

”کون ہیں آپ؟“

”مشہدی“

”مشہدی؟!“

میں نے یہ نام پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اور تعجب ہے کہ کیوں نہ سنا تھا۔ حیران کھڑی اپنے حافظہ پر زور دیتی رہی۔

پھر باہر سے آواز آئی: ”کیا خاتون زہرہ یہیں رہتی ہیں؟“ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

یہ سنکر میں بھاگی بھاگی وادی زہرہ کی خواجگاہ میں گئی۔ وہ ابھی ابھی جاگتی تھیں اور ان کا بخار اترا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

مجھے گھبراہٹ ہوئی اور کھل کر انہوں نے پوچھا: ”کیا بات ہو رہی ہے؟“ باہر کیا اتفاق ہو رہا ہے؟“

میں نے کہا: ”آج ملے مشہدی نام ایک شخص آیا جو“
خود سننے ہی وادی آماں کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”مشہدی؟“
وہ آیا ہے، اُسے تم نے کہاں ٹھہرایا؟“

”باہر کھڑے ہیں۔“

”جلدی سے اندر ملاؤ بیٹی۔ جانتی نہیں یہ سابق سلطان عبدالجمال کے حقیقی بھائی ہیں۔ شہزادے کو اور اس کے تمام بہن بھائیوں کو کتاب مقدس میں نے پڑھائی تھی۔ اسی سلسلے میں سلطان کا تمام خاندان مجھ پر جبر مان رہا۔ یقیناً ان جوان شہزادہ کو میری عزالت کی خبر ہو گئی ہوگی۔ جلدی بھاگو۔ انہیں اندر لے آؤ۔“

میں نے سیاہ ریشمیں جالی کا وہ خوبصورت ردائی اٹھایا جو ہم مشرقی لوگیاں اچھی سے بات کرتے ہوئے پہنے چہرے پر

بچھاؤ

زندگی کی ایک دوپہر!

میں آج تک سوچتی ہوں کہ کاش! وہ دوپہر میری زندگی میں نہ آئی ہوتی!۔

اپنی زندگی کی وہ دوپہر میں کبھی نہ بھول سکتی۔ اسے وادی آماں پر تھیں اور اپنی خواجگاہ میں بیٹھی نیندیں کراہ رہی تھیں۔ آسمان کے کناروں پر نئی گھٹائیں متحرک پہاڑوں کی طرح دم بدم اڑتی ہوئی جاری تھیں۔ کوئل زور زور سے ٹوک رہی تھی۔ گھاس پر ہڈ ہڈ اُدھر سے اُدھر پناج ہے تھے۔ چاروں طرف ایک ستانا سا طاری تھا۔ دوپہر نہایت سُنسان ہو چلی تھی۔ ابھی دوپہر بجے تھے مگر بادل اتنے گہرے تھے کہ باغیچہ اندھیرا ہو رہا تھا۔ شہباز اور جنگلی بادام کے پتے سیاہ آسمان کے نیچے جاوے کے مسور غلاموں کی طرح چپ چاپ دم بخود کھڑے تھے۔ آنے والی آندھی کے خوف سے سڑک پر کسی راہ گیر کا پتہ نہ تھا۔

میں باغ کے زینے پر چپ چاپ کھڑی اپنی بیٹی کی ٹوکری بن رہی تھی۔ ایسے وقت میں اچانک باہر کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اس زمانے میں میں گھنٹی کے بجتے ہی اس خوف سے اس کی طرف بھاگ کر پھرتی تھی کہ بیمار وادی آماں کی نیند خراب ہو۔ چنانچہ میں دردِ اے کی طرف لپکی۔ اس وقت دوپہر آدھی آگئے تھے۔ ڈاکہ! پاؤں کٹر۔ مگر جھانک کر دیکھا تو ایک اجنبی کو کھڑا پایا۔ ہم مشرقی لوگیاں اجنبیوں کے آگے بے محجک جاتے ہوئے تو بہن محسوس کرتی ہیں۔ ہمارا وقار یہیں اس کی اجازت

ہے تھے۔ مانی۔ دیکھ لو تہااری علالت کی خبر سننے ہی میں تین سو میل سے چلا آیا پھر تم کہتی ہو کہ محبت نہیں رہی؟ تعصبات کا زمانہ ہے۔ ہماری شکار پارٹی "گو جران" کے آبشار کے پاس آئی ہوئی تھی۔

دادی اماں کہنے لگیں۔ یہ تو خدا کی مرضی تھی کہ تم عین وقت پر آ گئے۔ میں بہت بیمار ہوں پیارے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ خیر خدا کی مرضی۔ قہرہ۔ یہو۔ ابھی تیار ہو جائیگا۔

"نہیں اسکی ضرورت نہیں"

"واہ ضرورت کیوں نہیں؟ دیکھو گھٹائیں ٹھہ رہی ہیں قہرہ کا لٹن آجائیگا۔ زینبا۔ بیٹی قہرہ۔"

مشہدی کی نظریں مجھ پر تھیں۔ میں نظریں جھکا کر پرے کے پاس چپ چاپ کھڑی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ بغور میری طرف دیکھ رہے ہیں تو اسے حجاب کے میرا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہو گیا۔ آنکھیں جبرے پر ہلکی مسکراہٹ تھیں۔ انھیں نہایت شوخ ہو گئی تھیں۔

اُدھر دادی اماں اپنی کہانی سناتے جا رہی تھیں۔ "زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کچے پتے تک حکم آجائے۔ بس ایک ہی لکڑی بیٹا۔ وہ اس لڑکی کی ہے۔"

"یہ کون لڑکی ہے مانی؟" انہوں نے جھٹ پوچھا۔ جیسے وہ منتظر رہا تھے۔

"زینبا۔ ادھر آؤ بیاری" دادی اماں نے آواز دی۔ میں قہرہ وان انھیں سنے ایک ہلکی آسانی رنگ کی ریشمی چادر میں بیٹی پٹائی شہزادے کے قریب گئی۔ اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

شہزادہ مشہدی پہلے تو کچھ دیر مسکرا کر بغور مجھے دیکھتے رہے پھر نہایت بڑے انداز میں مجھے اپنی طرف کھینچ کر میرے سر پر بالوں پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔

ڈال پتی ہیں۔ مجھ دادی اماں نے کہا۔ شہزادہ مشہدی سے چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔

— ۲ —

دروانے کے گھسنے کے بعد

دروانے کے کھٹے ہی شہزادہ مشہدی اندر داخل ہوئے، میں نے نظریں اگرتے والے کو دیکھا۔ نہایت شکیل اور عجیب نوجوان تھا۔ دراز قد۔ وجہ چہرہ۔ مسکراتی ہوئی نیلی آنکھیں۔ خمدار سنہرے ابرو۔ نارنجی رنگت کے چمکدار بال۔ ہونٹوں پر بے پروایانہ اور شانہ انداز کی ہلکی مسکراہٹ۔ نظریں ایسی تیز جیسے تمام پوشیدہ رازوں کو کھول کر رکھ دیں گی۔ حسن خلقت کا ایسا مجسمہ میں نے کبھی کاہیکو دیکھا تھا۔ انداز ایسی خوبصورتی میری نظر سے گزری تھی۔ نہ ایسا وقار اجی چاہتا تھا کہ محسوس باندھک یا لگوں کی طرح انہیں تنکے جاؤں۔ مگر نامناسب سمجھ کر بڑی کوشش سے نظریں جھکالیں اور شہزادے کو اندر لے چلی۔

دادی اماں اپنے تئیں کے سہانے میچ کی تھیں۔ "میری پیاری مانی — زہرہ۔ پر سن مشہدی کے منہ سے نکلا۔"

دادی اماں نے گردن اونچی کر کے ان کے بالوں کو بوسہ دیا۔ تم سب پیاریوں کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہی بیٹیا۔ تم لوگوں کی ہر باتوں — تمہارا اور خصوصاً تمہاری شہزادی عاقبتہ کا بچپن مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔

میں دروازے کی اوٹ سے خوبصورت شہزادے کے چہرے اور محبوب انداز کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اس وقت مانی پر کئی قدر جھکے ہوئے تھے اور کہہ

”خدا ایسا ہی کرے پیارے، نانی زہرہ نے کہا پھر ذرا دیر سے بے میں بولیں، جمعرات کی شام ٹھنڈی فیروز کی ماں بھڑکے لٹے آئی تھیں۔ وہ زہرا کو پند کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے ٹھنڈی فیروز بہت ہی معصوم لڑکا ہے۔“

میں شعلہ باز نظروں سے دادی زہرہ کو دیکھنے لگی۔

”میں نے اس لڑکے کو ایک دفعہ دیکھا ضرور ہے۔ خاصا بڑا مگر میری رائے پوچھتی ہو تو میں اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کرتا۔“

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

”کیوں بیٹا، کیا بات ہے؟“ دادی زہرہ نے نیکیے پر

سنبھل کر پڑتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ نہایت علم الطبع۔

مگر ضرورت سے زیادہ نیک۔ اور تم جانتی ہو میں اعلیٰ کی

قدر کرتا ہوں اس کی نیکی نے اسے اٹو بنا رکھا ہے۔ نیک

لوگوں کے چہرے آنکھوں کو کچھ عجیب لگتے ہیں؟“

کیسے پاکیزہ خیالات تھے! میں ایک مدت دادی اماں

کی بڑھی باتیں سنتے سنتے بیزار سی رہنے لگی تھی۔ اہل ان فوجان

خیالات کو نہ کہ دل میں ایک ہرک تھی ابھی میں نے قدر و محبت

کی ایک تھوڑی شہزادہ پر ڈالی۔

دادی اماں کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی کہنے لگیں۔ تب مجھے

تو اس علاقے کے تمام لڑکوں میں ہی ایک معلوم ہوتا ہوا؟

کچھ دیر گئیے میں کمرے سے باہر چلی گئی۔ تاکہ پکھلیتہ

ذکر ختم ہو جائے جب دوسری بارانی تو دادی اماں کہہ رہی

تھیں۔ یہ تو کچھ شہزادی زہرا کا کسی ہیں؟“

”اے جان اچھی نہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے انہیں مسٹر پل

کی دقت ہو گئی ہے۔ سو مسٹر پلینڈ گئی ہیں۔ ابھی ایک ہی مٹا ہے

اور وہ یہ کہ ان کی زندگی میں میری شادی ہو جائے یہ کہہ کر

دادی زہرہ کی طرف آئے پٹ کر بولے۔ لنگر کی کوئی

بات نہیں نانی۔ زہرا بہت ہی پیاری لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیوں

کیلئے لنگر کا کیا موقع؟“

شرم و حیا نے میری پلکوں کو اور پھل بنا دیا۔

ابھی تک ان کا ہاتھ میرے سر پر تھا اور ان کی نظریں

میرے چہرے پر۔ خون میری رگوں میں تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

اور سانس بھی زور زور سے چل رہا تھا۔

”لنگر کیسے نہ ہو بیٹا، میری زندگی میں زہرا اپنے گھر کی ہجرت

تو میری روح مُسکراتی ہوئی اس جہاں سے رخصت ہو جاتی؟“

دادی اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہو گئیں۔

مجھے دادی اماں کے اس انداز پر بید غصہ آ رہا تھا۔

بھلا شہزادہ شہد ہی کے لگے اس تذکرے کی کیا ضرورت تھی؟

میں مجروح نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

شہزادے نے شاید میری ولی کیفیات کو تاڑ لیا، مسکرا کر

بولے۔ ”کیوں زہرا؟ تم بھی اس سلسلے میں پریشان ہو؟ کہ تمہاری

شادی۔۔۔۔۔؟“

میں نہایت سنجیدگی سے بولی۔ بالکل نہیں شہزادہ

شہد ہی۔ بالکل نہیں۔“

وہ ہنس پڑے۔ نہایت دلخوشی کے ساتھ ہنسے۔ اس

طرح۔ کہ ان کا چہرہ دمک اٹھا۔

میں آہستہ سے اُنکے ہاتھ کے نیچے سے کل آئی۔ اور درجی

کے پاس چپ چاپ ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔

بادل گھرے ہوتے جا رہے تھے اور ہوائیں وحشی راگ

الاپ رہی تھیں۔ سمندر غصے سے بچ رہا تھا۔

شہزادہ شہد ہی نے ایک سرگرجے سڑک لگا رکھا تھا۔ آہستہ

حسین لڑکیوں کیلئے لنگر کرنے کی کو، وجہ نہیں۔ ان کی تقدیر

بھی حسین ہوتی ہے۔“

نہ ہنسنے لگے۔

نہایت طامعت کے ساتھ کہا۔

بے اختیار میرا دل چاہتا تھا اگلے کوٹ کا دائن پکڑ لوں
اور انہیں ہرگز نہ جانے دوں۔ نہ جانے کیوں؟
میں نے مشکل کہا: مگر اندھی چل رہی ہے۔
”بہت اچھا زینا۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہو تو میں نہیں
جانا۔ تم کس قدر بہران ہو!“

ابنا مطلب اُن کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہوئے
دیکھ کر میں شرمائی گئی۔ بولی: ”میرا مطلب تھا ایسے موسم میں باہر جا
سے آپ کو تکلیف ہوتی۔“

وہ مسکراتے: ”میں جانتا ہوں موسم برا ہے۔
چلو کچھ دیر اس سانسے کے درہچے میں کھڑے ہو کر اندھی کا
منظر دیکھیں۔“

سانسے زینے کے پاس ایک لمبی سی حسین درہچہ کھلی ہوئی
تھی جس میں سے سمندر کا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔
میں جا دو کی پتلی کی طرح ان کے ساتھ درہچے تک
گئی۔ دونوں چپ چاپ درہچے میں کھڑے باہر کا نظارہ
کرتے لگے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ یکجہت میری طرف ہلٹ
گئے۔ مجھے ہنور دیکھتے ہوئے بولے: ”زینا؟ تمہیں معلوم ہے؟
تم مجھ کو خوبصورت ہو؟ نہ جانے تمہاری دادی تمہارے لئے
پریشان کیوں ہیں؟“ پھر میری ٹھوڑی پر ہلکے اور پرکھڑے
ہوئے ہنسکر کہنے لگے: ”دیکھو! کیا چاندی شکل ہے! ایسا حسن
عموماً دیکھنے میں نہیں آتا۔“

اس وقت میرے دل میں ایک درد سا اٹھا۔ کچھ دیر بعد
ہمت کر کے بولی: ”وہاں جس کی کہ نہیں؟“

”مثلاً؟“ ”شہزادے شہزادی نے شوخی سے پوچھا۔
بے اختیار میری زبان سے نکل گیا: ”مثلاً نواب نصیر

دادی زہرہ شہزادے کی طرف دیکھ کر بولیں۔“ ”ٹھیک
تو ہے۔ اُن کی یہی خواہش ہونی چاہیے۔ بچاری شہزادی زینیدہ
ایسے موڈی۔ جس کا شکار ہو گئیں! تو پھر تم نے کیا تجویز کیا؟“
کب کرو گے شادی؟

بے فکری کے انداز میں سگڑ کی راگ بھاٹے ہوئے
شہزادے نے کہا: ”شادی تو جب ہوگی۔ ہوگی۔ فی الحال مگنی
ہو گئی ہے۔ اُمی جان نے میرے لئے نواب نصیر کی لڑکی پسند
کی ہو۔ گزشتہ بیٹے میں نے انگریزی ہی انہیں بھیج دی۔“
دادی اُمی خوش ہو گئیں: ”خدا مبارک کرے۔ بس
مثلاً اب شادی میں دیر نہ کرو۔ شادی وہی جو جوانی میں
ہو جائے۔ تیس تیس۔ چالیس چالیس سال میں شادی! یہ
بھی بھلا کیا شادی ہوئی! ابھی بہت رہیں کر ڈالو۔“
اس ذکر سے میرے دل پر اچانک ایک بجلی سی لگ گئی۔
ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میری عمارت ارزو کی بنیادیں
ہلا دیں۔ مگر آخر کیوں؟ یہ میں کبھی نہیں
سمجھ سکی۔

۳۳۳

ایک غلطی کا احساس

جب شہزادہ شہزادی رخصت ہونے کو اٹھ کھڑے ہوئے
تو دادی زہرہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا: ”زینا! شہزادے کو
دروازے تک پہنچاؤ و بیٹی۔“

شہزادے نے مجھ کو دادی اُمی کے رخسار کو پیار
کیا۔ پھر ہم دونوں دروازے کی طرف چلے۔ وہاں پہونچ کر
ہم دونوں تم گئے۔

”زینا! خدا حافظ۔“ شہزادے نے میری طرف دیکھ کر

جب میں واپس گھر میں آئی تو اس تھی۔ بچانے کیسا سوچ رہی تھی۔ بچانے میں رول کیوں دھڑک رہا تھا۔ آپس آپ کبھی آنکھوں میں آنسو اُٹھاتے کبھی لبوں پر ہلکی مسکراہٹ آجاتی۔

پہنچنا ۴۲

کشیدگی

ایسی شام کا ذکر ہے کہ بادل اور بھی زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ ہواؤں کا شور کان کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔ میں باورچی خانے میں وادی زہرہ کے لئے شور بگرم کر رہی تھی۔ کہ اسی وقت شاہ بلوط کے پٹر کے قریب ایک سایہ سا گدڑا دکھائی دیا۔ ایسے موسم میں کون طاقائی آسکتا تھا؟ میں نے دیوچی سے حاکم کر دیکھا تو لفٹ فیروز کا سر نظر آیا۔ میرے دل سے ایک آہ نکل گئی۔

مجھے آج پہلی بار محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے اس شخص سے محبت نہیں۔ میں اس سے محبت کر ہی نہیں سکتی۔ کیوں؟ کیوں نہیں کر سکتی؟۔۔۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ میں بنے بادلوں کو دیکھا جن کے سیاہ سائے میں میرا کتنی لباس یادہ گہرا معلوم ہو رہا تھا۔

میں شور پکے کی پیالی ہاتھ میں لئے وادی زہرہ کی خواہگاہ میں داخل ہو گئی۔

لفٹ فیروز مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ سے بولا: "آپ کی وادی سو رہی ہیں۔ شور بکی پیالی تپائی پر رکھ دیجئے اور باہر چلئے۔"

میں نے کہا: "کہاں؟"

"باغچے میں چلئے۔ آندھی کا زور دیکھیں۔ یہاں باتوں کی

کی صاحبزادی" اور پھر کھلتی اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ "ایں؟ کیا نواب نصیر کی صاحبزادی کو تم جانتی ہو؟ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی نہیں۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن قیاس کہتا ہوں کہ وہ بچہ حسین ہوگی۔"

شہزادے نے سنجیدگی سے کہا: "زیبا کیا یہ عجب نہیں میں نے اس لڑکی کو دیکھا ملک نہیں جو میری شریک زندگی بننے والی ہے۔ اور جس پر میری حیات کا دار و مدار ہوگا؟" پھر ایک ہلکی ہنسی ہنس کر کہنے لگے: "زیبا اس وقت تم اپنے دل میں مجھے بیوقوف تو نہیں سمجھ رہے؟"

وہ مجھ سے اس بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے جیسے ساتھ کے کھلے ہوئے آپس میں تبادلہ خیال کر رہے ہوں۔ میں کچھ متاثر ہو گئی، بولی: "میں آپ کے متعلق کبھی ایسا خیال نہیں کر سکتی۔"

"کیسا خیال؟۔۔۔ یہ کہ میں بیوقوف ہوں؟ میں زہرہ یقین دلاتا ہوں زہرا میں حقیقت بیوقوف ہوں۔ میری ماں نے مجھے اک ایسی لڑکی سے منسوب کر دیا ہے جسے میں نے خوب سے میں کبھی نہیں دیکھا۔ مگر تعجب تو مجھے اس بات کا ہے کہ آج سے پہلے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس کیوں نہیں ہوا؟"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ میرے دل میں ایک نامعلوم خوف کا احساس تھا۔ مستقبل پر ایک بھاری پردہ پڑا تھا۔ اور پس پردہ اسرار نے میرے دل کو طرح طرح کے اندیشوں سے بھر رکھا تھا۔

بڑی دیر تک ہم دونوں ساکت کھڑے رہے۔ باہر آندھی پڑنے پڑوں کو اکھٹے کرنے لگی تھی۔ سیاہ بادل تمام آسمان پر مسلط ہو چکے تھے۔ سمندر درندے کی طرح گرج رہا تھا۔

آواز سے وہ کہیں جاگ نہ جائیں۔
میں نے کسی قدر رکھائی سے کہا: یہ کیا ضرور ہے کہ ہم
یہاں بیٹھ کر باتیں ہی کریں؟

میرے اس لیے بہتر ان ہو کر وہ مجھے دیکھنے لگا۔ کچھ
عرصے سے ایک نامعلوم طریق پر سب کے دلوں پر یہ خیال
مسلط تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے منسوب ہیں۔ حالانکہ
ہماری کوئی باقاعدہ منگنی نہ ہوتی تھی مگر اس علاقے کے سب
لوگ جانتے تھے کہ عنقریب ہم دونوں شادی کی ذریعہ دل میں
اچانک جھڑپ دے جائیں گے۔ خیر و زرا سی غلط فہمی کا شکار
تھا۔ چنانچہ جب اُس نے مجھے خلاف معمول کسی قدر بدلا ہوا
پایا تو آہستہ سے مجھے بارنگ کے زیہ پر لاکر پوچھا: ”زیہ کیا
بات ہے؟“

میں زرد گلاب کی ایک پتی بے پروائی سے مسل رہی تھی
بولی: کوئی بات نہیں۔

لفٹنٹ فیروز کہنے لگا: ”کیوں زیہ! تم اپنی دادی کی
علاقت سے پریشان ہو؟ اگر یہی وجہ ہے تو پیاری اپنے
دل کو مضبوط رکھو۔ خدا نے جا تو ہفتے بھر میں وہ تندرست
ہو جائیں گی۔ اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔ ہم لوگ۔“

”خدا کیلئے۔۔۔“ میری زبان سے نکلا: ”چپ رہو۔“
یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔

”کیا ایامِ غری کی کا بھی ذکر اچھا نہیں لگتا؟“

”زیرِ کتاب ہے۔“

”زیرِ کتاب ہے؟“ لفٹنٹ فیروز حیران ہو کر مجھے دیکھنے

لگا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد بولا: ”میں رخصت ہوتا ہوں۔ آدمی
بڑھتی جاتی ہے۔ تم بھی آج پریشان ہو۔ کیل آؤ گے۔“

یہ کچھ وہ چلا گیا۔

میں کچھ دیر خاموش کھڑی اس شمشاد کے پتوں کو دیکھتی

رہی جو آدمی کے زور سے جھک جھک کر زمین بوس ہو رہا تھا۔
پھر آہستہ آہستہ دادی اماں کی خواجہ ہو گئی۔ وہ ابھی تک سو
رہی تھیں۔ میں چپ چاپ ان کے سر ہاتھ بیٹھ گئی۔
میرے خیالات مبعود جانے کہاں کہاں آوارہ تھے۔
کرہ خاموش تھا۔ کبھی کبھی دُور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز
آجاتی۔ یا دادی زہرہ کے سانس کی آواز تھی۔

شہزادے شہدائی کا حسین اور دراز عرصہ میری آنکھوں
میں موج و تھا۔ بے پروایا نہ انداز۔ دلاویز مسکراہٹ۔ حسین چہرہ۔
شوخ گفتگو۔ پھر ان کا وہ فقرہ۔۔۔ جس نے میری دنیا کا
خیال میں ہلچل مچا دی۔ ”آج سے پہلے مجھے اس غلطی کا
احساس کیوں نہیں ہوا؟“

اللہ۔۔۔ میرے مبعود! اس سے ان کا کیا مطلب تھا؟
آج سے پہلے۔۔۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟۔۔۔
مگر میں تو اپنا دل۔ اپنے دل کا ایک ایک گوشہ ان کی ضیاء
محبت سے منور پاتی تھی!۔

—————

شہتوت کے سائے تلے

اُس دن کے بعد مجھے ہر روز شہزادہ شہدائی کا انتظار
رہا۔ اکثر سمندر کی طرف اس امید میں نگاہیں دوڑاتی کہ شاید وہ
آ رہے ہوں۔ مگر اُس دن کے بعد وہ ہفتوں نہیں آئے۔

ایک دن جبکہ میں باہل مایوس پہنچی تھی، دوپہر کے
کھانے سے ذرا پہلے کچھ زیر لب لگناتی ہوئی باغ میں شہتوت
کے پیر کے پاس گئی اور نانی زہرہ کیلئے شہتوت توڑنے لگی کہ
مصنوعی حرارت سے بکاؤں۔

موسم بہت ہی دلغریب تھا۔ ہلکی گرمی نہایت دل پسند
تھی۔ بادل بھٹ گئے تھے۔ سمندر نہایت نیلا بنفشہ کے پھول

رنگ کا جو رہا تھا سبز پتوں پر سنہری دھوپ جھلک رہی تھی ایشیا
کا گستاخ آفتاب اپنے پورے آب و تاب سے جھلکا رہا تھا۔

اسی وقت باغ کے زینے پر کسی کے قدموں کی آواز آئی
اور میں ایسا اچکی اُٹھا جانے کیوں لرز گئی۔

”پیاری زیبا! مشہدی کی موٹی آواز سنائی دی۔ میں
نام گھر میں نہیں ڈھونڈ دلا۔“

میرا چہرہ کچھ اٹھا میری امیدوں کا چاند کسی آنسو پر
بھرا آیا۔

میں اپنی مسرت چھپانے کی مشہدی قریب آگئے۔ کہنے
لگے ”بھدا تم تو شعلہ کی طرح سوجھ ہو رہی ہو کیا بات؟“

میں اپنی مسرت کو ضبط کر کے بولی ”دوپہر کے
لحاضے کے لئے شہتوت توڑ رہی تھی کہ مصنوعی حرارت سے

ہاؤں۔ آپ تو دونوں بعد تشریف لائے“ آخری الفاظ صلیق
بن اہلک کر رہ گئے۔

وہ اک ٹہنی پر نظر جاکر بولے ”یہاں آنا شاید نہ لگنے
سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔“ کیونکہ؟

میرا دل دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تہید ہے وہ
نذی مشوں بعد کچھ اس سے زیادہ واضح بات کہیں گے۔

مگر انہوں نے شہتوت کی ایک ٹہنی جھکا کر گفتگو کا
نچ باطل جلد دیا۔ ”دوپہر کسی گرم ہے۔“

میرا دل بیٹھ گیا جی چاہتا تھا وہ اپنے انسانی نامکمل
قرے کو زیادہ واضح کرتے۔

میں نے پوچھا ”یہاں آنا نہ آنے سے زیادہ تکلیف
ہ کیوں ہوتا.....؟“

اس سوال کے بعد مجھے یقین تھا کہ ایک طویل استراحت
نتِ سنوٹی۔

وہ ایک مٹی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر

بولے ”زیبا اتنی بھولی نہ بنو۔ ایسے سوال جس آسانی سے کئے جاتے
ہیں اس آسانی سے ان کے جواب نہیں دئے جاسکتے۔“ یہ کہہ کر کسی
خیال میں بیٹھی بچانے لگے۔

مجھے غصہ آگیا۔ آخر کب وہ صاف صاف لفظوں میں
مجھ سے کہیں گے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟ یہ پس و پیش

کیوں؟ میں اس سے تھک گئی تھی۔ میں چاہتی تھی جو بے چینیل
میری رات کی نیند اور دن کے آرام کی دشمن بنی رہی ہیں وہ

اخبار آرزو کے ساتھ انہیں ختم کر ڈالیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ سب
موقع ڈھونڈ رہے ہیں اور ان کی ملاقات میں ضرور اپنی داستان

محبت سنا کر رہیں گے۔
اچانک وہ مڑ کر بولے ”زیبا خدا حافظ!“

میں سراپہ ہو گئی۔ کیوں؟
”ایک کام ہے۔“

میرا دل ٹوٹ گیا۔ آہِ عالم اسگدل۔ شہتوت کے سائے
میں کیا چیز تھے اخبار محبت سے روک رہا ہے؟ موسمِ مغرب

تھا۔ سمن۔ لہریں مار رہا تھا۔ سنہری دھوپ اچھے پھلکار رہی
تھی۔ اسے کون کی چیز اخبار محبت سے روک سکتی

تھی۔۔۔؟
ان ہی خیالات میں غم تھی کہ وہ جانے کے لئے آمادہ

ہو گئے۔
میں گھبرا کر بولی۔ ”آپ کو سمندری پھل کا شوق نہیں

ہے؟ تو آپ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے؟“ میں نے یہ
اس لئے کہا کہ پرس مشہدی کو کچھ کھنے اور یہاں بسر کر نیکا

موقع مل جائے۔
وہ ہنس کر بولے ”میرے رک جانے سے تمہیں خوشی ملے گی؟“

”بھدا۔ میں نے کہا۔“ کھانا کھل تیار ہے۔
”اجی بات ہے۔“ شہزادہ مشہدی نے کہا۔

میں انہیں کمرہ طعام میں لے آئی۔

کی بلکہ مچھلی پکانے کی بھی ماہر ہیں۔ کیوں نہ یہاں؟ کل نہر شتر پوٹا پر مچھلی کے شکار کو چلو گی؟“

”نہیں۔“ میں نے رکھائی سے جواب دیا پھر گشت پر لمبو چوڑے تہے لٹائی مجھے پھل کے شکار کا اتنا شوق نہیں جتنا تم سمجھتے ہو کہ ہے۔“

”تو کیا اس ہفتے شریوط نہیں چلو گی؟“

• نہیں میرا جی نہیں جانتا۔

واہی اماں متوجہ ہو گئیں۔ زیبا کیا بات؟ ایک مہینے

سے تم کچھ علیل ہی رہتی ہو؟
مجھے یقین تھا کہ اس سوال کا کچھ اثر شہزادہ مشہدی پر ضرور پڑے گا۔ مگر جب اُن کے چہرے کی طرف نظر اٹھائی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے انتاس کا ایک دمکھڑا اپنی پیٹ میں لئے پھلوں کی چھوٹی سی چھری سے کاٹ کر کھاتے ہیں مصروف تھے۔

گھمانے کے بعد میں نے کسی نہ کسی جہانے انہیں روکے رکھا کہ شاید کسی زیادہ مناسب وقت میں وہ عفت کی کوئی بات مجھے کہیں۔ شاید اُس فریٹسی کھر کی میں بیٹھ کر کہیں جو نیلے سمندر کی طرف نکلتی ہے۔ شاید صوبہ کے اُس خوبصورت پٹر کے نیچے، جو بہار کی ہواؤں میں والہانہ جھومتا ہے۔ شاید بانس کے اُس نئے پر، جس پر نارنگی کے درخت کا سایہ دھوپ اور چاندنی میں کانپتا ہے۔ یا شاید رات کی خاموشی میں — جب ماہِ مئی کا کاریگر اور روشن چاند میں کو خود بنا دیتا جو اس خیالی سے میں نے رات تک انہیں روکے رکھا۔

آخر وہ چاند بھی نکلا۔ جس کی روشنی میں مجھے امید تھی کہ میری تنہاؤں کی کلی کھلے گی۔

وہ ایک نہایت ہی رومانوی رات تھی۔ گرم ایٹمیائی
ایک فسوں انگیز رات۔ نیلے آسمان پر ماہی کا چاند دم بخود تھا۔

وہ چاندنی رات!

اُس دوپہر رادوی زہرہ کی طبیعت کچھ بجال تھی۔ وہ بھی میز پر کھانے میں شریک تھیں۔

اتفاق کیجئے یا بد قسمتی کہ ہم کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر
اطلاعی گھنٹی بجی۔

دادی زہرہ منسک کر بولیں: کیا اچھا ہو گھٹی بجائے
والا فیروز نکلے۔ کیونکہ منہدی، میں چاہتی ہوں تم ایک نظر
اس لڑکے کو دیکھ لو۔

داوی انماں پر مجھے اتنا عقیدہ یا جس کی انتہا نہیں بڑھ
گھبراہٹ کی مشقہدی ایک لڑکھڑاچھری سے کاٹ کر کھا ہے
تھے کہ لتے میں کیا بچتی ہوں داوی انماں کی امید کے مطابق
فلنٹ فیروزہ اندر چلے آ رہے ہیں۔

”بڑی عمر ہے تہااری، اتنی تہااری ذکر تہااری یلٹا
فیروزینا۔ اور یہ پرس مشہدی سلطان کے سب سے چوٹے
صاحبزادے“

دونوں بولے :- ہم پہلے مل چکے ہیں۔

وادی آماں کا جہرہ خوشی سے چمک اٹھا تھا۔
 میں بت کی طرح چپ چاپ تھی اور اپنی بیٹ پر جھکی
 غیر معمولی انہماک کا اظہار کر رہی تھی۔

فیروز اگر میرے باتیں اتنے بٹھ گیا۔ کیونکہ یہی ایک
نشت خالی تھی۔

”سمندر کی مچھلی نہایت عُدگی سے تلی گئی ہو۔ شہزادہ
مشہدی نے کہا۔“

نفسٹ فیروز بالا خاتون زیبانہ صرف محلی کے سکا

چاہتی ہے؟

”لیکن۔۔۔ آخر اسکی وجہ کیا ہے؟“

”آہ۔۔۔ وہ کس قدر بھولے تھے۔ میں اس کی وجہ انہیں
کیونکر سمجھاؤں گی کہ میں فیروز سے کیوں ایسا کی نفرت کرنے لگی
تھی۔ ان سے کیونکر کہتی کہ اسے شخص میں مجھ سے محبت کرتی
ہوں! آہ ایک لڑکی اپنا دل چیر کر نہیں دکھاسکتی۔ میری
حیا مجھے کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتی۔ یہ تو انہیں خود سمجھ
لینا چاہئے تھا۔ کہ اچانک نفرت کا سبب کیا ہے۔ اگر میں
انکی جگہ ہوتی تو پوچھان نہ جاتی! انھوں میں تاثر جاتی۔

وہ مجھے سوال بنکر میری آنکھوں کو تک سے تھے۔
کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتے تھے؟ آہ اسی شبہ نے تو میری
زندگی تہہ وبالا کر رکھی تھی۔ وہ ضرور مجھ سے محبت کرتے ہیں
خواہ وہ اس کا اظہار نہ بھی کریں میں مجھ سکتی ہوں کہ ابھی اسکا
موقع نہیں آیا۔ ان کی دل کی گہرائیوں میں ایک ہی چیز باقی
جاسکتی ہے اور وہ میری محبت ہے۔!۔۔۔ مگر کیا پتا۔۔۔ یہ
سب کچھ دھوکا ہو۔ محض دھوکا! وہ مجھ سے محبت ہی نہ کرتے
ہوں۔ لیکن۔۔۔ اگر وہ مجھ سے محبت نہ کرتے تو ایسی چاندنی
رات زندگی میں آتی ہی کیوں؟۔۔۔ وہ داوی زہرہ کی طرح چہرے
کے بہانے دوبارہ یہاں کیوں آتے۔
میری خاموشی حد کو پہنچ گئی تھی۔

وہ بیزار ہو کر بولے: ”زیبا اگر میرا بوجھنا ناگوار گذرنا
ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔“

”آپ کا بوجھنا ہرگز ناگوار نہیں گزر سکتا۔“

”تو پھر تم چپ کیوں ہو؟“

”کیا بتاؤں؟ شہدائی۔ میں کیوں فیروز سے نفرت کرنے
لگی ہوں؟“

وہ بچوں کے سے لہجے میں بولے: ”اچھا تم ممتوں ہی

ہو کہ میری فوت برداشت سے باہر تھا۔

”آہ چاندنی روشنی میں تمہارا فقری آنسو میرے درد
دل کی تفسیر کر رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا ایک
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جھک کر راز داری کے انداز میں
پوچھنے لگے: ”فری! کہو۔ اس رات سے پہلے کبھی ایسی دلچسپ
رات زندگی میں آئی تھی؟ ایسی طرب انگیز؟ ایسی بخت بیز؟“
”کبھی نہیں۔“ ایک سسکی بھر کر میں نے کہا: ”نہ پھر۔۔۔
نہ پھر کبھی آئے گی۔“ میں نے جملہ خم کیا۔

”تم اپنے مستقبل سے اس وجہ بدگمان ہو؟ مجھے معلوم
نہ تھا۔“ پھر انہوں نے محبت سے میرا چہرہ اٹھا کر کہا: ”کیا تم
اپنے نسب سے مطمئن نہیں ہو؟“ ”فری! کیا تم دونوں میں
محبت نہیں ہے؟“

”محبت؟ شہدائی۔ مجھے فیروز سے نفرت ہی۔“ میں نے
پہلی دفعہ لڑنے سے لہجے میں ان کا نام لیا۔ کیونکہ کبھی ابھی
انہوں نے مجھے ”فری“ کہا تھا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے: ”میں تو اب تک
سمجھتا تھا کہ تم مستقبل کے متعلق حسین خواب دیکھ رہی ہوگی۔
میرا خیال تھا کہ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے شدید
یا کم از کم نفرت تو نہیں کرتے۔ تمہاری داوی نے مجھ سے یہی
کہا تھا۔ کہ تم دونوں اس رشتے سے ناخوش نہیں ہو؟“

میں پانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: ”اں میں ناخوش
نہیں تھی۔ مگر میں نے فیروز سے محبت بھی کبھی نہیں کی۔“

”مگر اب تو تم اس سے ناخوش معلوم ہوتی ہو۔ بلکہ
بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خلاف ہمارے
دل میں نفرت بھری ہوئی ہے۔“

میں پانی میں چاند کے دلفریب عکس پر نظر جا کر بولی
”بلاتشبہ۔ اب تو میری روح اس شخص سے الگ ہٹ جاتا۔“

میں بتا دو میں بوجھ لوں گا۔

”یہ میری زندگی کا عظیم ترین راز ہے“ میں نے کہا پختہ ہوئے کہا۔

یہ سنکر انہوں نے اپنا خوبصورت مضبوط ہاتھ میرے شاسے پر رکھ کر کہا: ”خدا کی قسم زہرا، پھر تو ایسی شادی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تم فیروز کی بیوی بن گئیں تو ان نیکی آنکھوں کا کیا حشر ہو گا؟ یہ ننھا سا کاہیدہ جسم نفرت کی آگ میں جل جل کر پھینک جاسے گا۔ جہاں محبت نہ ہو وہاں زندگی ویران ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ تم۔ تم دونوں کا رشتہ ٹوٹ جائے؟“

”یہ سب کچھ تم پر منحصر ہے۔ ایک جج کی طرف میرے منہ سے نکل گیا۔“ شہدائی۔ تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو۔“ ان کی آنکھوں میں استعجال چمکنے لگا۔ میں اپنی پوری کوشش صرف کر دوں گا کہ رشتہ منقطع ہو جائے۔ تیار رہی واوی سے بھی کہو نیگا اور اس بھلے آدمی کو بھی سمجھا دوں گا۔ اچھا زہرا! اب سب کچھ بھول جاؤ۔ زندگی کی تلخیوں کو حزن غلط بھجو چاند کو دیکھو۔ اس گر جنے والے سمندر کو دیکھو۔ آفاق میں اپنی دھندلے پہاڑوں کو دیکھو۔ زہرا! ایسی خوشگوار رات میں زندگی کی تلخیوں کو یاد نہ کرنا چاہیے۔“ ہم لوگ چاند کی روشنی میں گم ہو گئے۔

آرزو میں غروب ہو گئیں

دوسرے بنتے شہر میں گھر گھر یہ خبر لگ کی طرح پھیل گئی میری اور فیروز کی منگنی کی جو افواہیں تھیں ان کا انجام بڑا ہوا۔ یعنی ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ خواتین میں چھ میگو تیاں ہونے لگیں کسی نے یہ افواہ

اڑائی کہ آئندہ جمعرات کی شام کو شہزادہ شہدائی مجھ سے شادی کرینگے کسی نے کہا کہ فیروز نے خود یہ رشتہ منسوخ کیا۔ منسوخ جو تھا اپنی بات الگ کے مطابق خیال آرا سیاں کر رہا تھا۔ مگر تنہا میں انکی وجہ جانتی تھی۔

واوی زہرہ پر اس واقعہ کا سبب برا اثر پڑا۔ وہ کچھ علیل سی ہو گئیں۔

ایک دن جبکہ میں باغ میں شہتوت توڑ رہی تھی وہ شعل باغ کے زینٹے کے کمرے میرے پاس پہنچیں گئے لگیں: ”زہرا۔ آج تمہارا ارادہ کیا ہے؟ فیروز بہتر شوہر نہیں کہیں ملجائے گا؟ تم بڑی بیوقوف نکلیں۔“

میں انجان کی شہتوت توڑنے میں مصروف تھی۔ وہ سانسے ایک چھوٹے سے تنکوں کے کوچ پر بیٹھ گئیں۔ ”آخر مجھے بتاؤ تو تمہارا ارادہ کیا ہے؟“

میری آنکھوں میں آنسو اٹکے: ”واوی جان۔ مجھ سے بار بار نہ پوچھتے میرا ارادہ کیا ہے؟ میں کیا کر دوں؟ میں مجبور تھی۔“

”ننھا ٹیروز! مجھے ناپسند ہے۔“

”مگر پھر کیوں؟ یہی تو کہی تم نے یہ نہ کہا تھا؟“

”میں پھر خاموش ہو گئی۔“

اس حلقہ کے بعد میں سمجھتی تھی کہ شہزادہ شہدائی بہت زیادہ آجایا کریں گے مگر وہ اگلے چار روز غائب رہے۔

میں انکے اس طرز عمل پر حیران ہو رہی تھی۔

چوتھے دن شام کے وقت میں اوپر کی منزل کو ڈرائیو

روم میں بیٹھی سناں بجاری تھی غم دل پر ایک بوجھ کی طرح رکھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو کے زبان پر ایک نالہ۔

جس سناں کے مرتعش تاروں پر اس طرح ناچ رہا تھا۔

جان تم پر نشا رکرتے ہیں کاش پوچھو کہ دکھا کیا ہے۔

و قریب معلوم ہوتے تھے کہ ایسے کبھی معلوم نہ ہوتے تھے۔
پہلے تو انہوں نے آگے کو جھک کر سر کی بخشش سے
مجھے سلام کیا۔ پھر میرے قریب آکر بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ ”زیبا“
”سناؤ چاروں کیسے گزریے؟ میں تو بہت مصروف رہا۔“
”میں بولی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے بھول چکے۔“

کہنے لگے ”نہیں نہیں۔ یہ بات نہ تھی۔ میں نہیں کبھی
نہیں بھول سکتا۔ زبیدی۔ کبھی نہیں۔ بات یہ تھی کہ وطن سے
ای جان کا ایک طویل خط آیا ہے۔ وہ سوسائز لیدن سے واپس
آگئی ہیں۔ اور ان کی صحت اطمینان بخش نہیں۔ مجھے فوراً بلایا
ہے۔“

”میں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ مجھے نہایت افسوس
ہو۔“ پھر کچھ وقفہ کے بعد بولی: ”اچھا تو پھر۔“
”پھر کیا۔ پرسوں شام کے بوٹ سے مجھے چلا جانا
چاہیے۔“

”میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔“ پرسوں۔ شام۔
”ماں بیماری پر سوں شام۔ میری جدائی کا نہیں بچ
ہوگا زبیدی؟“

”آہ خاتم آدمی! میرے نیک آرزو کی جرٹ گئی اور تو مجھے
پوچھ رہا ہے کہ مجھے جدائی کا صدمہ ہو گیا یا نہیں!۔
”تم فہم آدمی۔“

”میری خاموشی پر وہ کچھ حیران ہو کر بولے۔ زبیدی تم
مجھے بھول جاؤ گی؟“

”میں جلدی۔ یہ کوشش کرو گی؟ میرے منہ سے نکلا۔ اور
پھر میں نے اپنی آنکھوں پر رومال دکھایا۔

”وہ متحجب ہو کر بولے: ”کوشش! کس بات کی کوشش؟“
”میں مسکایا لیکر بولی: ”تمہیں بھولنے کی۔“

”وہ اور زیادہ حیران ہوئے: ”ایں رو رہی ہو زبیدی؟“

اسی وقت بین دیرپگی کے نیچے بائیں میں کسی کی گفتگو کی آواز
آئی۔ میں نے سنا قائلین پر رکھ دیا۔ دیرپگی سے نیچے جھانک کر دیکھا
تو داوی اماں اور شہزادہ مشہدی نظر آئے۔ چاروں کے بعد
مشہدی کو دیکھ کر قلب کی عجب کیفیت ہوئی۔ ادھر انہیں دیکھنے
کی خوشی، ادھر چاروں نہ آنے کی شکایت اور بے پروائی
کا صدمہ۔

وہ اس وقت نہایت وجہ نظر آ رہے تھے۔ شام
کی سفید بھائی میں ان کا چہرہ اس قدر بھولا بھالا معلوم ہوتا
تھا جیسے کسی بچے کا۔

”آخر ہائیں کیا کروں بیٹا مشہدی؟ تم ہی رہے دو۔
آخر آئندہ وہ کیا کرے گی؟ اس نے سوچا نہ سمجھا۔ جھٹ اسے
نا پسند کر دیا۔ آخر فیروز سے بہتر شوہر اسے کہاں مل جائیگا؟“
مشہدی اطمینان کے لہجے میں بولے: ”دنیا نہایت
وسیع ہے داوی زہرہ۔ آخر زبیدی نے کچھ سوچ کر ہی اسے ناپسند
کیا ہوگا۔“

داوی اماں غم و غصے سے بے چین ہو کر بولیں: خاک
سوچا ہوگا۔ بیوقوفی اور نادانی کے باعث فیروز کو ہاتھ سے
گنوا بیسی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب آئندہ وہ کرے گی
کیا۔؟“

”تجے کہاں؟“ مشہدی نے پوچھا۔

”اوپر ڈرائیگ روم میں تھی۔“ چاروں سے تم
نہیں آئے؟“

”ہاں بغیر معمولی کام تھا۔“

تھوڑی دیر میں زبیدی پرکھی کے قدموں کی آہٹ سنائی
دی۔ پھر وہ نیلا پردہ سر کا جس پر جگمگ چمکی کی تصویر تھی۔

شہزادہ مشہدی حسب معمول مسکراتے ہوئے میرے
ماٹھے آکھڑے ہوئے۔ وہ اس وقت اتنے خوبصورت اور

کی کیفیت میں مسک رہی تھیں۔

اندھیکرا

آج ان واقعات کو پانچ برس گزر گئے۔
 دادی جان کا انتقال ہو گیا۔ فیروز کی شادی ہوئی۔
 شہزادہ مشہدی کا بیاہ ہو گیا۔ دنیا تہہ دبانا ہو گئی۔ مگر میں
 — زندگی کے راستے پر جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی
 رہ گئی۔

آہ محبت، ایک عورت اور ایک مرد کی زندگی پر کتنا
 غفلت اثر کرتی ہے۔ اس نے عورت ہی کو بدسلوکی کیلئے
 کیوں منتخب کیا؟
 زندگی — جس میں نہ کمی قسم کی کشش تھی نہ دلاوڑی
 — آہستہ آہستہ گزرتی چلی جا رہی تھی۔

میں باغ کے ان راستوں پر حسرت سے غفلت ڈالنا
 کرتی تھی جن راتوں پر سب پہلے میری امداد مشہدی کی باتیں
 ہوتی تھیں۔ دن کا اکثر حصہ زندگی اس دو پہر کی یا میں کٹ
 جاتا جب شہزادہ مشہدی دادی اماں کی مزاح پسند کو لگتے
 تھے۔ آہ وہ باؤں کی سیاتھا۔ وہ مسٹر ان دو پہر۔ وہ دادی
 اماں کی خواب گاہ! ان کا آنا — باطل کل کا واقعہ معلوم
 ہوتا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ ماہ مارچ کی درد انگیز چھوٹی چل
 رہی تھیں۔ میں مکان میں تنہا تھی۔ بچوں کے باغچے میں بھی
 زندگی کی گئی گدڑی یادوں سے اپنی ویران تنہائی کو روشن
 بناتی تھی کہ یکایک کسی نے مشرقی رواج کے مطابق، دروازہ
 پر دستک دی۔

آہ — ایک گئی گدڑی دو پہر بھی کسی نے اسی طرح

کیا واقعی نہیں میرا جانا منہ موم کر رہا ہے؟ پر اس کے ساتھ ہی تم
 یہ بھی تو کہہ رہی ہو کہ تم مجھے بھول جاؤ گی؟ — مگر زبانی
 نہیں نہیں بھولوں گا۔ میں زندگی کے ان ایام کو ہمیشہ یاد رکھوں گا
 جب پہلے پہل تم سے ملاقات ہوئی تھی۔

— اور میں — اور میں — ان ایام کو بھولنے کی کوشش
 کر دوں گی۔ میں ہرگز یاد نہ رکھوں گی۔

”تمہارے یہ الفاظ میرا دل توڑ رہے ہیں زبیا۔
 میری تنہا تھی کہ جس طرح میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا تم بھی
 مجھے یاد رکھو۔“

میں مشکل بولی۔ ویسے میں کب کہتی ہوں کہ تمہیں
 ضرور ہی بھول جاؤں گی۔ میں کب کہتی ہوں کہ کوشش کر دوں گی
 اگر مجھے یقین نہیں کہ تمہیں بھول سکوں۔ مشہدی میں تبیر
 نہیں بھول سکتی۔

انہوں نے میری آنکھوں کو غور سے دیکھ کر کہا: کیا
 واقعی نہیں بھولوں گی؟

”نہیں۔“

وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ اچھا زبیا! خدا حافظ
 ”ہاں“ پھر ایک گھبراہٹ سا لے کر بولے۔ ”میں اب جا رہا ہوں۔
 پھر تمہیں خدا حافظ کہنے کا موقع نہ ملے گا۔ اس لئے مجھے ابھی
 خدا حافظ کہہ لینے دو۔“ کسے بہتہ زندگی میں پھر بھی مل بھی سکوں
 یا نہ مل سکوں۔ وطن پہونچ کر کسے پتہ کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں؟
 اُمی جان کی سب سے بڑی تنہائی یہ ہے کہ — ان کی
 زندگی میں — میری شادی ہو جائے۔ زبیری نو خدا حافظ
 یہ کہہ کر وہ بکھٹ مڑ گئے۔ ان کے قدموں کی آواز
 زینے پر تدم پڑتی جا رہی تھی۔ اوپر میں صوفے پر آنکھیں کھولے
 مردے کی طرح چپ چاپ پڑی تھی۔ سامنے سویر دم توڑ
 رہا تھا۔ ادھر میرے دل کے اندر میری آرزو میں بھی نزع

اچانک دروازے کو کھٹکھٹایا تھا۔

میں ایک آنہ بچہ کراٹھی اور دروازہ کھول دیا۔

دروازے کا کھٹکھٹا کر میں ضعف سے گرتے گرتے بچی میری آنکھیں چند سیانسی گئیں کچھ سمجھ کر نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ وہاں شہزادہ مشہدی کھڑے تھے۔ باطل اسی طرح جس طرح آج سے پانچ سال پہلے آئے تھے۔ صرت اتنا فرق تھا کہ ان کے چہرے پر کہیں کہیں زندگی کی بدسلوکیوں کے نشان پائے جاتے تھے۔

وہ بیتاب ہو کر بولے: "زیبا؟ کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟ ایک مدت کے بعد نہیں دیکھنا کس قدر مسرت انگیز ہے آج اتفاق سے میں ادھر سے گزر رہا تھا خیال ہوا ایک رات کیلئے یہاں ٹھہراؤں اور تمہیں دیکھتا جاؤں؟" میں کھٹکی باندھ کر انہیں دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔ گئے گزرنے ماضی میں سے ایک دور بھری چچا اٹھ کر میرے کانوں میں آ رہی اور دم بدم زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے جنوں انگیز شور سے گھر اگر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کھڑی کھڑی لڑکھڑاسی گئی۔

مشہدی نے بڑھکے مجھے سنبھال لیا۔ مجھے دیکھ کر نہیں خوشی نہیں ہوئی زیبا؟

فوراے تال کے بعد میں نے سنبھل کر کہا: "دلی خوشی ہوئی۔ آپ کی بڑی نوازش۔ پھر ان سے الگ ہو کر بولی۔"

"اندر آجائیے۔" ہم دونوں ایک کوچ پر اندر جا کر بیٹھ گئے۔ وہی پرانا گھر تھا۔ وہی قدیم دریچے اور وہی منظر!

انہوں نے ایک سرسری نظر ادھر ادھر ڈال کر کہا۔ "ابیں زیبا! اس ویران مکان میں زندگی کے دن کم کس طرح گزرتی ہو؟ تمہاری دادی مر گئیں تم نے شادی سے انکار کر دیا۔"

آخر کر کیا رہی ہو؟ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ اس ویران زندگی سے تمہارا دل نہیں گھبراتا؟ آخر تم نے اپنے مستقبل کے متعلق سوچ کیا رکھا ہے؟

غصے کے ایک پلٹیں کھاتے ہوئے شعلے نے میرے تن بدن کو چھوٹا ڈالا۔ میں جج کر بولی: "جی چاہتا ہے تمہارے منہ پر ایک تھپیڑ ماروں۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی۔ میری متاؤں کا خون کر ڈالا۔ میرا سب کچھ اُجاڑ دیا۔ اور اب مجھے سوچتے ہو ہیں نے اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رکھا ہے؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ آج سے چھ سال پہلے جو جان لیوا اکیل تم نے شروع کیا تھا اسے نامکمل چھوڑ کر تم کیوں چلے گئے تھے؟ تمہارے لئے زندگی کی بازی لگانا کوئی بات نہ تھی۔ مگر میرا سب کچھ اسی پر منحصر تھا۔ تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جس سے مجھے یہ دھوکا ہوا کہ تم مجھے چاہتے ہو؟ تمہارے لئے یہ ایک مذاق تھا؟ ایک ہنگامی تفریح تھی؟ لیکن میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔"

مشہدی کا چہرہ ہر فن کی طرح سفید پڑ گیا۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے: "زیبا! زیبا! تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم — تم کو مجھ سے محبت تھی؟ کیا تم نے میری ہی خاطر فیروز کو چھوڑا تھا؟ آہ تقدیر — یہ بات کبھی تو تم نے مجھ سے کہہ کیوں نہ دیا؟ اس رائی کیوں نہ کہا؟ مجھے کیا پتہ تھا تم مجھ پر جان دیتی ہو؟ میں آخری وقت تک منتظر رہا شاید تم کوئی ایسا لفظ کہو جسے سن کر میں اپنی داستانِ محبت تمہیں سناتے کی جرأت کر سکوں گا۔ اس آخری شام بھی جبکہ ہم جدا ہو رہے تھے تم ستمارے بیٹھی تھیں میں نے بڑی دیر تک انتظار کیا۔ شاید تم مجھے وطن واپس جانے سے روک لو۔ اور کہو کہ مشہدی! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تو میں پہچان جاتا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہ کر سکتی! پرآہ۔ میری

دیوار کے پیچھے سورج دم بدم نیچے جا رہا تھا۔
مجھے صرف اندھیرے کا احساس تھا جو مجھے گل لینے
کے لئے آسمان سے اتر رہا تھا یا میرے دل کی خاک تر سے
اٹھ رہا تھا۔

آخر شب دید کے قابل تھی بل کی ٹرپ
صبح دم کوئی انگر بالا سے بام آیا تو کیا؟
حجاب امتیاز علی

امیدوں کے خلاف تم نے کہا کہ تم مجھے بھولنے کی کوشش کر گئی
میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری حسرتیں مسک مسک کر بے دم
ہو گئیں۔ میں ناکام اپنے وطن لوٹ گیا۔ اب گورماں کے اصرار
پر میری شادی نواب نصیر کی صاحبزادی سے ہو گئی۔
باہر کائنات پر اور اندھیرے دل پر موت کی سی
گہری اور بھاری خاموشی مسلط تھی۔ دور باغیچے کی ٹوٹی ہوئی

ایک تقلیدی سوال

وہ برکتیں جو نئی روشنی میں آئیں منظر
میں اُن کی چال سمجھنے لگا ہوں اب اے دوست
کچھ اہل علم یہاں مادہ پرست بھی ہیں،
تو یا رسوز ابھی ویراں ہوا نہیں بالکل
ہے ان کی "شعلہ فشنی" میں سلج کا پیغام
نہ کوٹ سے غرض اُن کو نہ شیروانی سے
مُفید قوم ہے تقلید رنگاں بیشک
مگر یہ شرط نہیں ہو کہ دھوئیاں ہوں وہی
ہے اتساعِ سلف ہی اگر مدارِ حیات
وہ اگر دپوش سلف تھے جو زیبِ عہدِ عتیق
مہاتما کو ہے کیوں ان سے کہ، خدا جانے
مذہبِ آج وہی ہے جو اُن کو پھپھانے
روایتِ شاعِ عرفان کے بھی میں متانے
کہ شمعِ فردہ کے زندہ ہیں اب بھی پروانے
عیب چیز ہیں یہ ہوشیار دیوانے
لباس کے نئے درکار نہیں ہیں چند آنے
بر اوہ خود ہے جو تقلید کو بُرا جانے
نویں صدی میں جو باندھی تھی، نئے دادانے
تو بے نیازِ حیا کیوں نہیں یہ فرزانے
بھلا دیا انہیں کیوں میرے ان احباب نے
علی منظور حبیب آبادی

جمودِ چین

شبنم میں بہت ہی نہیں ہے ہر درختاں ہونے کی
 کاسہ گل لبریزے زر سے دولتِ گنجت پاتی ہے
 اکثر موجِ بادِ بحرِ گلشن میں گئی بھی آتی بھی
 اشک بہاتی ہے شبنم کلیوں کو ہنسی آتی ہی نہیں
 آہِ مالِ موسمِ گل پر بلبلِ نالاں ہوتی ہے
 رنجِ چین میں شامِ وحسہ گو وامِ فغن صیتا نہیں
 بادِ صبا دم توڑ رہی ہے ہر اک پھول سسکتا ہے
 طائرِ چپ ہیں اور نہیں ہے جلوہ گل کی ارزانی
 لیکن اک دن یہ حالت گلشن کی بدلنے والی ہے
 قطرِ شبنم پر تو نور سے نور فغن ہو جائے گا
 پتی پتی ہر اک گل کی دولتِ گنجت پائے گی
 موجِ صبا گو آئے چین میں نے نہ چین کو رعنائی
 اشک بہائے گی شبنم کلیوں کو ہنسی بھی آئیگی
 نغمہ سرا ہو جائے گی بلبلِ نام نہ ہوگا شیون کا
 وامِ فغن صیتا در ہے گا ہوگی چین میں آبادی
 دے گی نویدِ زیتِ صبا گل، بند زبان کو کھولے گا
 ارزاں ہوگا جلوہ گل ہر شاخ سے طائر گائیں گے

حصہ رستی بلندی ہے قائم ہے بلندی پستی سے

یہ ایشیائی دلجو

عیشِ دوام ہستی ہے تغیرِ نظامِ ہستی سے

بیگانگی

رشید نے اٹھ کر انھیں ملیں، دو ایک انگڑائیاں لیں۔ اور ایک کھوتے ہوئے سے انداز میں سیڑھیوں کے قریب جا بیٹھا۔ اس نے کوٹھے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ تمام چار بایاں خالی پڑی تھیں۔ سب لوگ نیچے جا چکے تھے۔ جہاں تک بجاکہ کام کرنی تھی۔ اس نے اونچے نیچے مکانوں کا ایک انبار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لئے دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔ اچھا تو اب صبح ہو چکی ہے! اس نے ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے محسوس کیا جیسے وہ نہ ختم ہونے والے دن کی کوفت کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔ اس کے لئے دن ایک مسلسل کوفت تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ اس کے نزدیک چھٹی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہ تھا۔ وہ یوں محسوس کرتا تھا کہ گھر کے تمام لوگ اس کے وجود سے ہی منکر تھے۔ اس لئے انہیں اپنے وجود اور شاید عظمت کا احساس کرنے کیلئے اس پر لازم ہو جانا کہ وہ آپا کے چٹکی لے یا غمزدہ کو منہ چڑھائے یا غمزدہ کے پانٹو طے کی دم کھینچے اور نہیں تو چیریں اور دھرا دھرا کر دے۔

رشید نے ایک اور انگڑائی لی "اب میں کیا کروں؟" وہ بہم طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تمام گھر میں اسے کوئی ایسا کام نہ ملتا نظر نہ آتا تھا جسے وہ اپنا سکنا جہاں اس کی موجودگی سے بیگانگی نہ برسی۔ اس نے ایک اکتا سے ہوئے انداز سے قیص کے واس سے اپنی آنکھیں پونچھیں شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگالیا۔ زندگی اس کے لئے ایک ناقابل فہم بیگانگی سے بھری تھی۔ وہ صرف یہ سمجھ سکتا تھا کہ دنیا میں یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا کریں تو کیا ہو جائیگا۔ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیوں نشید ہو اور غمزدہ کیوں غمزدہ ہے۔ اور گھر والے اسے رشید سمجھنے پر کیوں مصرعے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ غمزدہ کو سا بڑا دھوکے کے آزمایا تھا۔ مگر اس کے باوجود گھر والے اس پر رشید ہی سمجھتے تھے۔

اس کی جگہ پر اکتا سے ہوئے انداز میں یہاں سے وہاں سے وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے غمزدہ کا طوطا بھرے میں بیٹھا پر بچہ پکڑا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ غمزدہ کا طوطا اتنے پر طوطا۔ اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا جیسے اسے چھیڑ رہا ہو۔ بھر اس کی نظر اس کے کھڑکی پر جا پڑی جو گلی میں کھلتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی۔ اس کی صبح و شام کی مسلسل کوفت میں صرف وہ کھڑکی ہی خوشی کی ایک امید گاہ تھی۔ مگر وہ بوڑھا فقیر جس پر رشید اس کھڑکی میں سے روڑا پھینکا کرتا تھا، دور و زما نہیں گزرا تھا۔ دور و زما اس نے بوڑھے فقیر کے انتظار میں گزارے تھے۔ پچھلے ایک جھجھری لی اور لاشعوری طور پر پاس سے ایک روڑا اٹھا کر زو سے کسی طرف پھینک دیا۔

رشید ابھی چھ ماہ کا نہ ہوا تھا اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑی بہن کا بھائی ہے۔ اور ماں اپنے اسے سسک سسک کر بایا ہو چکی کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بذات خود کیا ہے۔ اور آیا وہ باپ کا نام قائم کرنے یا ماں کا سہاگ شکم کرنے کیلئے ہے یا ماں باپ کے کسی خاص مقصد کیلئے ہے، یا دیلے ہی ہے۔ وہ صرف یہی جانتا تھا کہ اول تو وہ ہے ضرور اور دوسرے وہ کوئی بڑی اہم ہستی ہے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہے۔ گوہستی اور نور کے متعلق اس کے احساسات واضح نہ تھے۔ وہ جانتا تھا بارہا "گوہ

کہہ کر وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے اور ذرا سے بسور نے سے وہ ماں باپ اور کئی ایک اور شکلوں کو اپنے ارد گرد وفاقِ نچو سکتا ہے۔ یعنی اپنی کوئی خواہش پوری کر کے کیلئے اسے صرف ہونٹ بھانکنے کی ضرورت تھی۔ اور یہ بات بھی درست تھی جب چھ سال کی مسلسل سنوں کے بعد میٹا پیدا ہو تو ماں باپ کیلئے اسے نظر انداز کرنا دشوار مشکل ہو جاتا ہے۔

جب رشید کو پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو گیا تو اسے دو دھ پیسا سونا اور باقی وقت بچتے پڑے رہنے یا فضول اپنا انگوٹھا تلاش کرنے یا دور پڑی ہوئی چیزوں کو کپڑے کی کوشش میں چنداں نہ بچے نہ رہی۔ البتہ لوگوں کو بچا نا ضرور باعثِ فرحت تھا۔ اس وجہ سے شغل میں اس نے دو سال بسر کئے۔ اس عرصے میں ہزاروں انکشافات کے علاوہ اس پر یہ بھی آشکار ہوا کہ وہ بد صورت ہے۔ ابتدا میں تو اسے بد صورتی کے متعلق اور اپنی بد صورتی کی تفصیلات کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہوئی۔ پھر رفتہ بہ رفتہ اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی ناک چلی ہے، پیشانی چھوٹی اور ہونٹ موٹے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ چوٹی عیب بھی جاتی ہے یا وصف۔ وہ صرف یہی جان سکا کہ ماں باپ اسے بد صورت کہہ کر اس کے ناک ہونٹ اور پیشانی کے متعلق کچھ گھبر فرما بسا طے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے۔ اس لحاظ سے تو بد صورتی ایک بہت پیاری خصوصیت تھی۔

اس زمانے میں دنیاویوں سے معنی نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص اصولوں پر چلتی تھی۔ اس کا ہنسنا رونا اور ٹھٹھائی سناج پیدا کر سکتا تھا۔ وہ دو سال اس کی زندگی میں ایک گزشتہ مگر قابلِ حصول رنگینی سے سرشار تھے۔ ان دنوں زندگی اس قدر پیچیدہ اور لوگ باگ اس قدر ضدی اور اندھے نہ تھے۔ ان دنوں اپنے دھوکا احساس دلانے کیلئے اسے کسی دقیق عمل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جلد ہی وہ دن آگیا جب وہ بات نہ رہی۔

اس روز وہ اپنی بہن کی گود میں بیٹھ کر حسبِ معمول اسے خواہ کر دیا تھا کہ ان کی ملازمہ رضیہ وڈی وڈی آئی اور کہنے لگی: بی بی نہیں مبارک ہو۔ خدانے تمہارے گھر ایک اور ننھا بھائی دیا ہے۔" سلمیٰ نے یہ سنا اور رشید کیوں پٹک کر کھجکائی گئی جس طرح وہ خود سے کھلنے کی آواز پر چلنے لگے کھلنے پھینک دیا کہ تا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب رشید کا بون اہان کیا گیا تھا۔ اور پھر ایک ایسی اہم ہستی کا اہان۔ سلمیٰ کی اتنی جرات! اے پٹے تو وہ کچھ دیر تک حیران چپ چاپ زمین پر بیٹھا رہا۔ پھر ان سب باتوں کو سوچ کر اس نے بھلکتی رونام شروع کر دیا۔ اس کی دانست میں رونے سے بڑھ کر کوئی قوت نہ تھی مگر خدا جانے اس روز اس کے رونے میں کیوں اثر نہ تھا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں والا رونام بھی کام نہ آیا۔ پھر اسے تازہ دم ہو کر رونام پڑا اور وہ بار بار تازہ دم ہو کر رویا۔

آخر رضیہ آئی۔ اس نے رشید کو گھورا اور جھنجھوڑ کر اٹھا لیا تو رضیہ اسے منانے کو لے۔ رضیہ ایک دینی ملازمہ کس قدر بے غوثی کی بات تھی۔ اور پھر وہ بھی اسے جھنجھوڑ کر اٹھاتے۔ اس روز اس کے خیال میں دنیا کے اصول ہی بدلے ہوئے تھے۔ ماں کے سامنے جا کر اس نے دو تین جینوں سے آپا رضیہ اور دنیا بھر کے خلاف اظہار کیا۔ مگر ماں اسے گود میں اٹھانے اور منہل لوگوں کو برا بھلا کہنے اور گھورنے کی بجائے خفیف سی آواز میں کہنے لگی: یہ کیا سر کھا رہا ہے۔ اسے یہاں سے لے جا۔ اور جو لغت خانے میں مٹھائی پڑی ہے وہ لے دے۔ یہ بھی اس کی ماں۔ اس کی اپنی ماں، جس کی آنکھوں کو اس نے نور بخشا تھا۔ وہ ماں۔ اگر اس کی قوتِ اظہار اپنے باپ کی طرح وسیع ہوتی تو وہ کہہ اٹھتا۔ بس چودھویں صدی آگئی ہے جبکہ

ماں کو اپنے گئے بیٹے سے بھی محبت نہیں رہی۔ ماں کا خون سفید ہو گیا۔ رضیہ اُسے باورچی خانے میں تین تہا چھوڑ جائے اپنے ہاتھ سے ٹٹھائی کھانے کیلئے ماں سے دُور ماں کی داری صدقہ کے بغیر سوکھی ٹٹھائی !!! اور ماں اُس گنہگار کے نوٹھڑے کے پاس لیٹی رہے۔ کیسی ہیروہ شکل تھی، نہ سر نہ منہ یقینی طور پر چوہوں صدی آج بھی تھی جس کے متعلق اُس کے آباؤ اجداد کو کیا کرتے تھے۔

پھر اُسے یہ معلوم ہوا کہ ماں بیمار ہے اور اُس نے اخذ کیا کہ بیمار اُسے کہتے ہیں جس کے ارد گرد ایک بھیڑ لگی ہے۔ جس کیلئے ٹٹھائیاں منگوائی جاتیں۔ اور جس کی اتنی ہی دیکھ بھال ہو جتنی کسی زمانے میں اُس کی اپنی ہوا کرتی تھی یعنی بیماری میں بھی اتنی تاثیر تھی جو کسی زمانے میں اُس کے رونے میں تھی۔ اور اب دن دن زائل ہو رہی تھی۔ بیمار بن کر اُس کی حکومت شاید پھر لوٹ گئے۔ مگر اُسے یہ معلوم ہو سکا کہ کس طرح وہ بیمار ہو جائے۔ اُس نے دو ایک مرتبہ اپنی بیمار ماں کو اُس امید پر لپٹ کر چرماکہ شاید اس طرح ماں کی بیماری اُسے لگ جائے۔ مگر اُس کے باوجود گھر والے اُسے بیمار سمجھنے سے منکر رہے۔ بیمار حال ان دنوں اپنی مٹی ہوئی امانیت حاصل کرنے کے لئے رونے روٹنے اور ضد کرنے کے علاوہ اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور اُس کے استعمال میں اُس نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ مگر اُس کے استعمال سے مزید مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

مانا کہ وہ ماں کے دودھ کے علاوہ ٹٹھائی روٹی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھانے کا عادی تھا۔ مگر ماں کے دودھ سے بالکل عہد کر دینا کھیلے کو بھی نہ دینا، کھنڈر کی نہ بن تھا۔ اس سے پہلے تو اُسے بے روک ٹوک کھیلنے کی اجازت تھی۔ پہلے پہل تو اُسے یہ آس رہی کہ صحت ہوئے پر ماں دیکھی پہلی ہی ماں ہو جائیگی۔ مگر ماں نے بہت جھوڑ دیا، چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ مگر اُسے وہ محبت نصیب نہ ہوئی۔ پیار تو وہ کرتی تھی مگر وہ بیمار مقابلہ ظاہری اور پھر با محسوس ہوتا۔ مال کا دھیان تو ہر وقت اُس کی طرف لگا رہتا تھا۔ اُسی کو ساتھ لٹائی اور رشید جب رات کو جاگتا تو وہ دیکھتا کہ وہ تین تہا کھولے پر بڑا ہے۔ وہ بیمار اس اندھیر پر رو پڑتا۔ اور چاہتا کہ ماں اُسے پاس لائے۔ مگر ماں کس بیگانگی سے ہاتھ پرٹھا کر اُسے تھپک دیتی جس طرح دُور سے کئے کو روٹی کا ٹکڑہ پھینکتے ہیں۔

آخر رشید لوگوں کی عدم توجہی سے تنگ آکر احتجاجی حرکات جانزدار دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی حرکات متاثر ہونا تو کیا ماں باپ نے نہیں سمجھے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ درو دل کا اظہار لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ بغیر جانتے تھے کہ ہر حرکت سراپا اظہار ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے رہے کہ رشید کو لیٹر پر پیشاب کرنے کی قلعہ عادت پڑ گئی ہے۔ اور وہ رات کو ڈر کر بیدار ہوتا ہے۔ اور اُسے اس بات کی شکایت ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جب کالوں بد و عا دل لفظوں سے اپنے غصے، جگے اور دنیا کی بیوقوفی کا اظہار نہیں کر سکتے وہ درو دل کا اظہار مٹانے اور معاف سے کر سکتے ہیں۔

ماں سے مایوس ہو کر رشید نے اپنے آپ سے زبردور ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل مجبور تھے۔ چونکہ وہ ہر وقت سستے تھے کہ محمود کی شکل ان پر تھی اور بد صورتی تو بغیر رشید کی شکل بالکل اُن پر نہ تھی۔ ایک باپ کیلئے اس قسم تفصیل کو نظر انداز کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح محمود سے غداری کر سکتے تھے۔

آخر آہستہ آہستہ رشید پر یہ اطمینان ہو گیا کہ بی بی کی دُم کھینچنے اور مرغی کے پر نوچنے میں بھی راحت ہوتی ہے۔ گویہ راحت

ماں باپ کا نو ذریعہ اور گھر کا چراغ ہونے کے مقابلے میں بچہ تھی۔ مگر راحت ضرور تھی۔ ماں باپ تو اس کو شک کو تھکے میں بٹھنے وہ محمود کہہ کر بکارتے تھے اپنا وجود کھوپکے تھے۔ صبح سے شام تک محمود کا ذکر۔ محمود کی آنکھوں، پیشانی اور ہونٹوں کے قصے۔ محمود کی صورت، مسکراہٹ، اور کھیل کا رونما۔ اور محمود کی وہ جیسے روئے نمک کی تیز نہ تھی۔ کیسی بے سہری لاپتا تھا..... رشید نے کسی مرتبہ محمود، کا مرنے تک چرمانا کو ارا کیا کہ ماں کا قرب حاصل ہو یا اس کا مرنے چوئے سے وہ خود محمود بن جائے۔ مگر والدین بھی پھر کے ہی ہوتے ہیں۔ ان پر ان باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک روز جب رشید اپنی بکڑی کا گھوڑا بنا کر سواری کر رہا تھا، اور لکھے کاغذات کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو انہوں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب رشید نے جواب میں تجھوں سے درود دل کا اظہار کیا تو انہوں نے دو ایک تھپڑ چڑھنے اور جلال میں کہنے لگے بہت بد معاش ہو جا چکا ہے۔ کبھی آپا کو مار کبھی ماں سے لڑا..... گھر میں بکھرا ہوا رہا ہے..... پاجی..... اس سہزنش کے دوران میں ماں محمود کا پوتہ اٹھیک کرس میں شدت سے مصروف رہی۔ اُدھر سے گویا رگ کوئی امید نظر نہ آئی۔ مگر اُسے مجبوراً فریاد لیکر ماں کے پاس جانا ہی پڑا۔ لیکن ماں نے بھی ہر وقت سر کھاتا رہتا ہے: "کہہ کر ایک تھپڑ مار دیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ماں نے یہاں مر" کہہ کر چھڑ کر لے اٹھا لیا اور پاس لٹا دیا۔ یہی تو اس کی خواہش تھی کہ وہاں مرے کسی کو تھپڑ کھا کر لے لے ہاں مرنا نصیب تو ہوا..... اسکی معلومات میں یہ ایک اضافہ تھا۔

اب رشید تیسری جماعت میں تھا جو کچھ پہلے سال وہ قیل ہو گیا تھا۔ رشید کے والد کا ایمان تھا کہ رشید فطری طور پر بکند ذہن ہے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ اس کے دماغ میں عقل سلیم کا خانہ خالی ہے۔ اس کا سبب بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ تیسری جماعت میں قیل ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ اپنے اس ایمان کے متعلق اکثر بات کرنے کے عادی تھے۔ یا محمود کی ایسے اذام میں تعریف کرتے جس سے رشید کی نااہلیت اخذ ہو۔

"محمود سوا لوں میں طاق ہے۔ اگر رشید کا ذہن اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات ہوتی.... مگر یہ رشید کا قصور نہیں..... اسکی یادداشت ٹھیک نہیں.... بچائے کو باتیں یاد نہیں رہتیں.... اور.... محمود کی ماں۔ محمود کی ماں.... تم نے سنا.... ادھر آنا.... باہر محمود کا اُستاد آیا ہوا تھا کہتا تھا محمود تو فریق سنا دیتا ہے"

کسی وقت جب دونوں بچوں کے مستقبل کے متعلق ذکر چھڑ جاتا، تو وہ اکثر کہا کرتے: "محمود.... محمود کو تو انجینئر بنائیں گے.... ایسے رڑکی بھیجیں گے.... رڑکی رڑکی سے بڑھ کر ہندوستان بھر میں کوئی انجینئرنگ کالج نہیں.... سنا تم نے محمود کی ماں.... رڑکی میں بہت بڑا کالج ہے۔ شاندار.... اور اس دوران میں وہ محمود کی طرف اس انداز سے دیکھتے جیسے کوئی مصدّر اپنے شاہکار کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ چونک کر اور ایک مہموم سی آہ بھر رشید کی طرف دیکھتے: "رشید محمود کے طے کو قی نہ کرو.... نہیں تو ہر وقت شرارت سوچتی ہے.... محمود کی ماں.... دیکھا تم نے.... پچھڑے کو بل سے رہا تھا شیطاں.... محمود کی ماں اگر رشید بھی ذہین ہوتا تو سبھی رڑکی بھیجتے.... مگر کوئی بات نہیں.... کوئی بات نہیں.... یہ تو قدرتی باتیں ہیں۔ انسان کو ان باتوں میں دخل نہیں۔ ہیں۔ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے.... کیوں محمود کی ماں، یہ محکم کیا دھور ہی ہو.... نہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ ہاں وہ رضیہ کہاں ہے.... رشید میں کہتا ہوں اس انجینئر سے کوئی چھپڑ سنا نہیں"

رشدید باب کی ان پیچیدہ باتوں کے دوران میں جنہیں لے لیکر تمک جاتا پھر دفترا اس کا جی چاہتا کہ زدو سے مُرخنی کی دُم کھینچے یا آپا کی ٹانگ میں جکے لے۔ یا کسی رنگی ہوئی چوٹی کو پاؤں سے مسلے۔ دنیا میں سب زیادہ بدلتا چیز اُس کے نزدیک محمود کا طوطا تھا۔



رشدید اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ایک اور انگریزی لی... اچھا تو اب کیا کروں؟ اُس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر کوئی چیز اُس کے لئے باعثِ دلچسپی نہ تھی... سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اُس نے دیکھا کہ ماں، آپا اور رضیہ باورچی خانے میں ہیں... اُٹا اور محمود کی آوازیں بھینک میں سے اُترتی تھیں... شاید کوئی ملے آیا ہو اُٹا تھا... تمام گھر پر خاموشی سی طاری تھی اور ہر چیز اُسی طرح بیگانہ وار پڑی تھی... باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "اماں! اُس نے ایک اُکھٹے سے انداز میں کہا۔ "اماں، بھوک لگ رہی ہے۔"

اماں نے آگئے، کچھ کھل گئی۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ صبح اُٹھ کر اسکول کا کام کیا کرو۔ آپا! اماں، محمود نے آج صبح صبح ہی دس سوال پچھال لئے ہیں۔

رشدید نے ان باتوں پر وہیں نہ دیا۔ اُسے چاروں طرف سرسری نگاہ ڈالی اور پھر ماں سے لتی کا گلاس لے لیا۔

ماں نے منہ ہاتھ تو دھو لیا کہ کتنا گندہ ہے! مگر رشدید لسی پانی چکا تھا۔ وہ اپنی قیاس سے منہ پونچھ کر گلاس صندوق پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ کمرے میں سامنے چاقو پڑا تھا۔ اُس نے چاقو اٹھا لیا۔ اور سرسری طور پر میز کا کونا گھر چنا شروع کر دیا۔ باہر بھینک سے اُٹا اور کسی جہان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

یہ بھی کیا عمر ہے... بادشاہی عمر... بچپن سے بڑھ کر زندگی میں کوئی خوشی نہیں!

رشدید سوچ رہا تھا۔ بچپن سے بڑھ کر کوئی عمر نہیں۔ یہی بچپن... آخر وہ کیا بات تھی، جی بنا پر لوگ بچپن کو اس قدر سراہتے ہیں... کیا باقی عمر اس بچپن سے بھی زیادہ اُکھا دیتی والی ہے۔ اُس نے ایک جھجھری لی... باہر آتا کہہ رہے تھے۔

"محمود! محمود! تو سوالوں میں بیدِ طاق ہے... رڑکی! رڑکی! رڑکی سے بڑی کوئی درسگاہ نہیں۔ سو روپیہ ماہوار خرچ... نصیب کی باتیں ہیں۔ وہ ہمارا رشدید... دو سال اس سے بڑا ہے، بالکل گندہ ذہن، کام چور، بھکتا... اللہ کا ہر حال میں شکریہ ادا کرنا چاہیے!"

رشدید اٹھ بیٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ شاید اس لئے کہ وہاں آبا کی آواز نہ پہنچتی تھی یا اس لئے کہ سامنے پڑی ہوئی چٹائی سے تنکے کھینچنے کی خواہش مجبور کر رہی تھی۔

باورچی خانے میں ماں کہہ رہی تھی: رضیہ، وہ کہاں غائب ہو گیا... جا دیکھ تو کہیں میرے صندوق میں کو کپڑے نکال نکال کر بچھا ڈ تو نہیں رہا۔ میں بھی کتنی بھول کرتی ہوں۔ صبح صندوق کھولا تو اُسے بند تک نہیں کیا۔ جا دیکھ تو... تو بے میں تو اس لڑکے سے عاجز ہو چکی ہوں۔

رضیہ کی آہٹ سنکر رشید جٹائی کو چھوڑ کر پرے جا بیٹھا اور ایک لمبے سے ٹکڑے کو جو وہاں پڑا تھا، ناخن سے کمر بستہ میز مشغول ہو گیا۔ رضیہ اندرائی۔ اُس نے ایک نفرت سے کھولتی ہوئی نگاہ رشید پر ڈالی مگر رشید بظاہر اپنے کام میں ہمیشہ مشغول تھا۔ پھر جب رضیہ صندوی کو تالا لگا رہی تھی، خدا جانے رشید کو کیا ہوا۔ اُس نے اپنے بازو میں ایک اکرلٹی محسوس کی.... اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر لپکا اور اُس کی دو انگلیوں نے بڑھکر رضیہ کی کمر میں پکڑ لی۔ اُس نے بھاگتے ہوئے "اوتی" سنا اور پھر رضیہ خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ سگڑوہ غلغلے میں پہونچکر باٹی میں ہاتھ ڈال رہا تھا اور گرتے ہوئے قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا.... قطروں کو گرتے ہوئے دیکھ کر اُسے بوڑھا فقیر یاد آگیا جس پر وہ چوباسے کی کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا۔ اُس بوڑھے کی عاجزانہ نگاہ.... لے بسی.... اور بچاری آتے یاد آگئی.... اُس روز جب اُس کی آنکھ سے پانی ان قطروں کی طرح گری رہا تھا.... کس قدر مضحکہ خیز شکل تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ باہر ماں نہایت غصے سے پوچھ رہی تھی۔

"رضیہ، یہ محمود کے طوطے کا بچہ یہاں دھوپ میں کس نے رکھا ہے؟"

رضیہ:- "تو بی بی، میں نے تو ابھی اسے چوباسے میں رکھا دیکھا تھا۔ میں تو کبھی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ میری تو بی بی یہ عادت ہی نہیں!"

ماں:- "بس یہ اُسی شیطان کی کارستانی ہے۔ خدا جانے محمود کے طوطے سے اُسے کیوں بیرہ ہے۔ اور بھائی ہوتے ہیں آپس میں پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ اس لڑکے پر تو محمود کو دیکھ کجن سوار ہو جاتا ہے.... رضیہ! رضیہ! لے اسے اٹھا کر چوباسے میں رکھ آ۔ اور اس کی کٹوری میں پانی ڈال دے۔"

رشید دروازے کی دراز سے جھانک رہا تھا۔ محمود کا طوطا اُسکے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا، کیا ہوا محمود کے طوطے کو؟" ابا اندر آکر کہہ رہے تھے۔ ہاں بس ایسا کام اور کون کرے گا۔ اس لڑکے میں تو ذرہ بھر رحم نہیں، قصائی ہے قصائی۔ صبح و شام پیرسٹ الٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں۔ گل میرے دفتر کے کاغذات کی بیڑیاں بنا رہا تھا.... نا معقول.... لے جا رضیہ اسے چوباسے میں لے جا۔ محمود تو اس طوطے پر جان چھڑکتا ہے۔ جب تک سے بھلانے خود نہیں کھاتا.... اسے جانوروں سے کس قدر محبت ہے.... محمود کی ماں! محمود کی ماں!.... محمود ہنسا ہے؟...."

"کیوں اباجی؟" محمود نے اندر آتے ہوئے کہا۔

ابو:- "کچھ نہیں بیٹا۔ رشید نے تمہارا طوطا دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ بچائے گا گرمی کے ماسے برا حال ہو رہا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟ دو۔ نہیں اباجی، میں نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ اُس نے اپنی پانی کی کٹوری الٹ دی تھی۔ اور وہ پانی میں نہر ہوا تھا۔ میں نے اسے سنبھالنے کیلئے دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ پھر اسے اٹھانا مجھے یاد نہ رہا۔"

"محمود کی ماں! محمود کی ماں! اس کا باب کہہ رہا تھا۔ تم نے سنا؟" محمود نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ محمود کی نا اچھی عادت۔ دیکھو۔ پانچ بج کھدینے سے پہلے نہیں گھبرانا۔ لو اگر رشید طوطے کو دھوپ میں رکھتا تو چاہے کچھ ہی ہو جاتا

دع کہی بھی اقرار نہ کرتا۔ رضیہ۔ کہاں پر رشید۔ رضیہ!۔
 مال۔ ابھی نہیں تھا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا۔ بگلی میں ہو گا۔ میں تو اس لڑکے سے تنگ آچکی ہوں۔
 ابا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم تو جلد گھبرا جاتی ہو۔ یہیں کہیں ہو گا۔

رشید دبے پاؤں علیٰ نے سے نکل کر چوبارے میں چلا گیا۔ بوڑھے فقیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ مگر وہ بوڑھا دودن
 سے نہیں آیا تھا۔ رشید کے بدن میں نا اُمیدی سے شستی سی محسوس ہو رہی تھی جب وہ اُس بوڑھے فقیر پر ہتھ بھینکا کرتا تھا تو
 اُس کی آنکھیں کیف سے چمک جاتیں اور اس کے جسم کا ذرہ ذرہ اضطراب سے جھوم جاتا۔ بس اُس کے پیچھے اور بے
 صبح و شام میں ہی ایک عشرت تھی جس سے وہ گذشتہ دودن تک محروم رہا تھا۔ اُس نے چھ سات موٹے موٹے ٹنگا چرنے اور
 کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ سانسے کوچے کے پرے مکانوں کا دھیر سا نظارہ تھا۔ کوچے میں خاک اڑ رہی تھی۔ دھوپ آنکھیں چنڈھیا
 جاتی تھیں۔ مکانوں سے پرے ریت کے ٹیلے کھڑے تھے جہاں کہیں کہیں بگولے ناچ رہے تھے۔ وہ ان بگولوں کو حسرت
 بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ آخر وہ فقیر کا انتظار کرتے کرتے ٹھنک گیا۔ اُس نے جھربھری لی۔ اور دونوں ہاتھوں کا
 پیالہ بنا کر اپنی ٹھوڑی اس پر بٹکادی۔ اور ایک معصومیت بھرے انداز میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کسی مزدور
 کی مشقت کو دیکھ کر وہ خدا سے اس کی نجات کہنے لگا رہا ہو۔

انتظار سے یابوس ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس کی نگاہ سانسے والے مکان کے روشندان پر پڑی۔ روشندان
 میں سرخ شیشے دیکھ کر ایک بیگانہ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آگئی۔ اُس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اُس سے کھینے لگا۔ پھر
 اسے خدا جانے کیا سوچی۔۔۔۔۔ اُس کے بازو نے زور سے جھٹکا کھایا۔۔۔۔۔ چمن۔۔۔۔۔ پتھر سے سرخ شیشہ ٹوٹنے کی آواز
 آئی اور وہ مٹا کھڑکی سے ہٹ کر چوکی پر آ بیٹھا۔۔۔۔۔ سانسے محمود کا طوطا پر پھر پھر اڑا تھا۔ محمود کا طوطا! اس کے دل سے
 آواز آئی جیسے کوئی اسے چھیڑ رہا ہو۔ محمود! محمود! محمود! محمود! تمام فضا ان آوازوں سے بھری ہوئی محسوس
 ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اس نے لبک کر بجزہ اتار لیا اور اسے دھوپ میں رکھ دیا۔ اُس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ آگئی۔ چوکی پر آتا
 کا استرا دیکھ کر رشید ٹھٹھک گیا۔ اُس نے استرا اٹھا لیا۔ خدا جانے اُس کے دماغ میں کیا خیال آیا۔ اُس کا منہ سرخ ہو گیا۔
 آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ محمود کا طوطا! اُس نے دانت پٹیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ وہ بجزے کے قریب ہو بیٹھا۔۔۔۔۔
 بجزے کا دروازہ کھل گیا۔۔۔۔۔ دنیا سے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ جتنی کہ اُسے بوڑھا فقیر بھی یاد نہ رہا۔۔۔۔۔
 جیج جیج ہج۔۔۔۔۔ بھوکی لونڈی اُس کے ہاتھوں پر گر رہی تھیں۔۔۔۔۔ سرخ رنگین مغل سالہو۔۔۔۔۔
 کھڑکی سے باہر ایک رنگین سنہری سمرخی سی نظر آرہی تھی۔ دُور بگولے آسمان پر مغل بن کر جھوم رہے تھے۔
 "محمود کا طوطا! اُس کے دل کا کوئی کونہ تسخر سے کہہ رہا تھا۔ محمود! محمود! محمود!"

مستطاب

مستطاب کو کون نہیں جانتا۔ سارا شہر جانتا ہے۔ جب تک یہ زندہ رہا کہا یوں کہ دنیا میں اس سے زیادہ دھچپ کوئی کہا نہیں تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لیکر ہر دلی وروائے ٹمک اور ادھر جس خاں کے پھاٹک اور صدر بازار تک اس کے کباب چٹائے لے لیکر کھاتے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے غریب امیر سب ہی پر میاں مستطاب کے کبابوں نے سکہ بٹھا رکھا تھا۔ دوکان تو آج بھی ہے اور کباب ہی اس پر بکتے ہیں لیکن ”وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی“ نہ وہ مستطاب کی سی مزیدار تھیں ہیں نہ وہ مستطاب کا سا کباب بیچنے کا ڈھنگ۔ نہ وہ خریداروں کی بھڑکے نہ وہ چٹ پٹا ہیں۔

میاں مستطاب کی صورت بھی ایسی گول مٹول تھی کہ گولے کا کباب معلوم ہوتے تھے۔ شام کو پانچ بجے کے بعد جاڑوں میں اور مغرب کی اذانوں کے قریب گرمیوں میں ان کی دوکان حتیٰ تھی۔ سہری پائے گھر سے بکا کر لاتے تھے۔ کبھی، گروے اور بکری کے بیچے تلے ہوتے الگ اور بھنے ہوئے علیحدہ سینیل اور پیٹیلے میں رکھے ہوتے تھے۔ کبابوں سے نہیں بھرتے جاتے تھے اور آپ ہی آپ بڑ بڑاتے رہتے تھے۔ ایک نو دس برس کی لڑکی میاں مستطاب کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی اور میاں مستطاب اس لڑکی کو فراوانی بات پر گالیاں دیا کرتے تھے اور وہ لڑکی بھی ہاتھ ٹکا ٹکا کر برابر کا جواب دیتی تھی۔ لوگ عموماً مستطاب کی اس گلیاں عادت سے بیزار تھے۔ اکثر بھیلے مانسوں نے بھایا بھی کہ ”میاں مستطاب لڑکی ذات کو ایسی کھلی ہوئی گندی گالیاں نہ دیا کرو اور اگر ذہن کند ہوئے گا انہی ہو تو کوئی جھوکر کہہ لوں گا“ میاں مستطاب نے توجہ نہ دیا وہ گالیاں کے دینے اور گالیاں کھانیکو برا سمجھتے یا ان کو اپنی زبان پر اختیار ہوتا۔ ان کا تو بھیکو کام گالیاں تھیں۔ سچ پر کباب چڑھائی تو گالی کے ساتھ بٹھا چلا تھے تو چرخ چول میں گالیاں بھی شربک ہوتیں۔ دونا بناتے تو گالیاں لے کر غرضک کا بی بیڑ کوئی حرکت کوئی بات ہی نہ ہوتی۔

باوجود میاں مستطاب کے چلنے نہیں اور گالیوں کے بکنت کے ہاتھ میں کچھ ایسا مزہ تھا کہ شام سے رات کے بارہ بجے تک بھیر لگی رہتی تھی۔ دور دور سے شوقین آتے تھے۔ دولے بھر بھر کے کباب لے جاتے تھے یا وہیں اکڑوں بیٹھ کر دو دو چار چار سخیں کھا جاتے تھے۔ اتنا بڑا دلی شہر ہے اور ہزاروں کبابی لیکن خدا کی قدرت ہے وہ آب و نمک، وہ خوشبو اور لذت منسوب نہیں۔ مستطاب کا ہر اہم تو کھتے ہیں کہ دلی کے کباب مر گئے۔ کبابیت مری گئی اور ایک کبابی شخصیت مر گئی۔

مجھے بازار میں کسی دوکان پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر کچھ کھانے پینے سے ہمیشہ نفرت تھی، ہے اور مرتے دم تک رہی بھر کباب میسی شے جس کو روکھا کھا کر کھیں بیڑ نہو بہا ہے۔ ناک بغیر ٹر ٹر کرے اور زبان بغیر چٹائے لے نہ رہی لیکن میاں مستطاب کے کبابوں کی چٹائے ان سب باتوں پر پانی پھیر دیا تھا اور دوسرے تیسرے دن زبان کا ذائقہ درست کر لے کیلئے مستطاب کی دوکان پر جانا ہی پڑتا تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ ایسا کبھی نہیں گیا۔ ایک دو بے چارے دوست ساتھ ہوتے تھے۔

دلی کے اکثر دوکانداروں میں یہ بات پہلے ہی تھی اور اب بھی ہے کہ وہ گاہکوں کے نمبر کا خیال رکھتے ہیں۔ دار سے سودا دیتے ہیں لیکن خریدار کی وجاہت اور خریداری کی نوعیت سے ان کا یہ قاعدہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ مستطاب اس اصول کا

بڑی مضبوطی سے پابند تھا۔ اُس کی نگاہ میں ایک پیسے اور ایک روپے کے کباب لینے والا برابر تھا۔ اب اس کو کوئی بُرا کپے یا اچھا اُسکے اس طریق کی کوئی مذمت کرے یا تعریف۔ وہ بڑے سے بڑے موٹریں بیچکر آنے والے کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا کہ میاں الہی جلدی ہے تو کہیں اور سے لے لوں میں تو متبر سے دو گنا باوجود اس کے کہ میں اس کا لگا بندھا لگا کپ تھا۔ اس کو میری خاطر بھی منظور تھی۔ مجھے وہ خاص طور پر زیادہ دہی لگا کر دمی آگ پر سکے ہوتے کباب دیا کرتا تھا لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ نمبر کے خلاف دے ہوں۔ ذرا جلدی کی اور اُس نے تیوری چڑھا کر کہہ دیا: حضرت مسیتا کو اپنی جھڑپ سے نہ دبا ہے۔ آپ سے پہلے کا یہ لوند اُکھڑا ہے۔ اس کی بجائے سینک دوں پھر آپ کا وار پڑے۔ دیکھئے یہ آپ کے واسطے لگا رکھی ہے؟

مسیتا کی اس مستقل عادت سے دوچار دفعہ میں تکلیف بھی ہوتی اور بُرا بھی معلوم ہوا لیکن ایمان کی بات ہے اس جاہل کبابی میں یہ خصالت ایسی تھی کہ ہزاروں پڑے لکھوں میں نہیں ہوتی۔ مساوات کا سبق میں نے اسی دکان پر پڑھا حالانکہ ان حضرت کی اس حق شناسی کی بدولت جس میں کوئی استثنای نہ تھا۔ ایک مرتبہ مجھ کو سخت سخت، پریشانی اور بے حد ذلت اُٹھانی پڑی۔ اُس واقعہ کے بعد وہ مر گیا اور مجھے مرنا ہے۔ آج تک میں سمجھتا ہوں اور اپنی اجتہادی حاکم اور مسیتا کی جہاں انیزل خبری بر ماتم کرتا ہوں۔

علیگڑھ سے کرکٹ کی ٹیم آئی ہوتی تھی۔ میرے چند کھلاڑی دوستوں نے اس کی دعوت کر دی۔ اس دعوت کی انتظامی جلس کا میں بھی ایک رکن تھا۔ کھانوں کی فہرست تیار ہوئی۔ شامت اعمال میرے منہ سے نکل گیا کہ مسیتا کے کباب بھی ہونے چاہئیں۔ تھوڑے بحث و مباحثہ کے بعد میری رائے پاس ہو گئی مگر ساتھ ہی اس پر زور دیا گیا کہ جہاں کھلایا جائے وہیں میاں مسیتا کباب لگائیں لگا کر گرم ہوں۔ دوسرے تریں دوسرے خزان پر امیں۔ اور اس کا انتظام مجھ پر نصیب کو سونپا گیا۔ میں خوش تھا کہ مفت میں مسیتا پر احسان ہوگا اور علیگڑھ والے بھی کیا یاد کریں گے کہ دق کی وہ نعمت کھائی جو کھانے والے کو ستر پاؤں تک بھتی بنا دی ہے اور جسے پہلے ہی نولے میں خضوع و خشوع شروع ہو جاتا ہے۔

خوشی خوشی میاں مسیتا کی دکان پر پہنچا۔ وہ ابھی آئے نہ تھے۔ لوند یا جھاڑو بہاڑو کر رہی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ یگانوں کا گنبد مسیتا کی بیٹی ہے۔ اتنے میں میاں مسیتا ایک کچی ہوئی ٹنگی ہانڈے۔ ٹوندے اوچا بنیان پہنے، بڑے ٹٹے سے بھر چکا، لائے۔ سر پر قبیلہ، نبل میں روٹیاں۔ دونوں ہاتھوں میں دو پلوٹ۔ سامان رکھتے رکھتے بیسیوں گالیاں تھینک کر ڈالیں۔ جب ذرا گلے ہوتے تو مجھ سے پوچھا۔

”میاں آج اس وقت کہاں۔“ میں نے تو گھنڈہ بھر میں تیار ہوں گی۔ مگر وار پہلا تھا ہوا گا۔ میں نے کہا: اس وقت تو میں کباب کھانے نہیں آیا ہوں۔ تہا سے لے ایک کام لایا ہوں۔ بولے: ”میاں۔“ میں کس کام کا ہوں۔ کباب بچا ہوں اور بیٹ بھر ہوں۔ اور یہ فقرہ کہہ ایسے انداز سے کہہا کہ مجھ کو خیال آیا کہ کہیں کھنٹ انکار کرنے تو ضرور ہی کر کر ا ہو جائے۔ ڈرتے ڈرتے کہا کہ مسیتا ایک دعوت ہوا اور اس میں تہا کے کبابوں کی ضرورت ہے۔ چل کر گھر تک نام ہو جائے گا۔ جواب دیا کہ کباب جتنے چاہئے لیجئے اور ایسے مڑ کے لیجئے کہ کھانے والے انکھیاں چاٹتے رہ جائیں۔ میں نے کہا: ”مگر ایک شرط ہے۔ دعوت کی جگہ چلکر تم کو تیار کرنے پڑیگے۔“

کہنے لگے: "میاں یہ جھگڑے کی بات ہے، مسیتا سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کے دروازے پر جائے یہیں سے لے جائے گا؟" اس جملہ میں ایسی کڑک تھی کہ میں گھر آگیا۔ اور زور دیتے ہوئے کہا: "مسیتا یہ کوئی بے عزتی کی بات ہے۔ وہاں تو سب تمہارے قدرواں ہونگے۔ میں اپنے دوستوں سے وعدہ کرتا ہوں۔ میری نجی کمری نہ کرو؟" یہ سنکر مسیتا کچھ بچھے۔ اب دوکان پر چند کبابوں کے رسا بھی آگئے تھے کہنے لگے: "تم مسیتا کی آن توڑتے ہو۔ خیر، مسیتا نے تو آج تک بازار مصطفیٰ میں خدائی کو خریدار بھرا ہے۔ کبھی کسی کے گھر پر ہاتھ پھیلا کر نہیں گیا۔ تم سر جوتے ہو تو اچھا.... مگر یہ بیچارے کس کی جان کو روئیں گے۔ یہ غریب جو کباب لینے کو آئے ہیں تو کیا لینے.... وقت کو نہ ہو گا؟"

دعوت رات کی تھی۔ میں نے کہا: "رات کا وقت ہو گا لیکن تم کو دن سے آنا پڑیگا۔ یہ سنکر میاں مسیتا کو بھر جلال لگیا۔ بولے: "حضرت اگر مسیتا پر ایسا ہی قائم کرنا ہے تو دوسرے کا وقت مقرر کرو۔ وہاں سے فراغت پا کر میں دوکان تو لٹا سکوں نہیں تو میرا سلام ہے۔ اس سے زیادہ میں آپ کی مروت نہیں کر سکتا۔"

دستر خوان پر مسیتا کے کباب ہوں اور میری بات میں فرق گئے۔ اس کی بے آسان تھا کہ دعوت کا وقت بدل دیا جائے چنانچہ اپنی ترکیب سے یاروں کو سمجھا دیا۔ اگرچہ نفسیات اور فلسفہ کا سارا زور لگانا پڑا۔ چنانچہ دعوت دن کے گیارہ بجے قرار پائی تاہم اسکی میاں مسیتا کو بھی اطلاع کر دی۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اتنے آدمی کھانا کھائیں گے۔ جسے جواب میں مسیتا نے عارفانہ لہجہ میں صرف یہ کہا: "اللہ مالک ہے۔ اسی نے اب تک مسیتا کی آبرورکھی ہے وہی سبکی لاج رکھنے والا ہے۔"

دعوت ایک قدیم وضع کے مکان میں ہے۔ صدر والاں میں دسترخوان بچھانے کا انتظام ہے۔ صحن چوبترے سے نیچے ایک سردی میں میاں مسیتا ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر بچھ کڑا اے تشریف فرما ہیں۔ تلے میں سالہا ہوا قیر۔ زالو کے قریب متعدد سیٹیں۔ مٹی کی کوٹڑی میں کپے تاکوں کے کئی گولے۔ ایک بڑے کونڈے میں پیاز کا بچھا۔ باریک کتری ہوتی اورک۔ ہری مرچیں اور ہلدی نہ رکھا ہوا ہے۔ کونڈے ملگ ہے ہیں بچھا چل رہا ہے۔ ہیں صحن سے موجود تھا اور ہر دس منٹ بعد میاں مسیتا کو جھانک آنا تھا۔ نوبت کے بعد جب دعوت کے دوسرے شریک گئے اور انہوں نے کہا کہ سائے کھڑے تیار ہیں تو مجھے بھی کبابوں کی تیاری کا فکر ہوا۔ جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ابھی نہ پورے کونڈے دھکے ہیں نہ فیصے کبابوں کی شکل اختیار کی ہے۔ میاں مسیتا بڑے آرام سے بیٹھے گیسے کو دہی ڈال ڈالکر متھ رہے ہیں۔ دو چار منٹ تو میں سیر دیکھتا رہا۔ آخر آٹا کر پوچھا: "میاں مسیتا! یہ کیا کر رہے ہو۔ ابھی تو تم نے پیوں پر گوشت بھی نہیں چڑھایا ہے۔ کباب کب تک تیار ہونگے۔ دیکھو دس بجے کو میرا درٹھیک گیارہ بجے دسترخوان بچھا جانا ہے؟"

مسیتا۔ میاں میں نہ خالی بیٹھا ہوا ہوں نہ مکمل رہا ہوں۔ کام اپنے رستے سے ہوا کرتا ہے۔ قیہ کو ذرا درست کر لوں تو سیخوں کو لولہ۔ اتنے میں کوئلوں کا تاؤ بھی ٹھیک ہو جائیگا۔

میں۔ لیکن ہمارے پاس تو صرف چالیس پچاس ہی منٹ ہیں اور تمہارے کام میں ابھی بہت دیر معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے کھانے کبھی کے تیار ہو چکے ہیں۔

مسیتا۔ میاں آٹا کا اور کام ہے اور میرا اور کام۔ یہ مسیتا کے کباب ہیں۔ آخر جب سے آیا ہوں اسی میں لگا ہوا ہوں۔ آپ گھر میں

نہیں۔ اللہ مالک ہے۔

میں۔ اللہ تو مالک ہے مگر خدا کے بندے تم نے یہ اُدب کا کام بھی پہلے نہ کر لیا۔ اب کوئی دم میں جہان لئے شروع ہو جائیں گے۔ وقت کی پابندی بہت ضروری ہے۔

مسیحا۔ آپ میرے ہاتھ پاؤں نہ بچھلایے۔ میں وقت کو دیکھوں یا اپنے کام کو دیکھوں۔ یہ تو مجھ سے کبھی ہو گا نہیں کہ آپ کے ٹیم کی وجہ سے کہا بوں کو خراب کر دوں۔

میں۔ مسیتا تم آج مجھ کو بغیر ذلیل کے نہیں رہو گے۔ خدا کے واسطے کچھ تو پھرتی کرو۔ لو بس قیسے سے کشتی لڑ پکے۔ آگ بھی خوب دھمکی ہے۔ ریخیں لگا کر شروع کر دو۔

مسیحا۔ اسی لئے تو میں پرانی تابعداری نہیں کرتا۔ بڑے بڑے نوابوں نے بڑایا، نہیں کیا۔ سینکڑوں روپے کے انعام کا لالچ دیا لیکن میں نے دوسروں کی حکومت اٹھانے سے اپنی ایسی حالت کو اچھا سمجھا۔ پختے حالوں رہتا ہوں۔ آدھا پیٹ ملتے، بلا سے، کسی کا نوکر تو نہیں۔ غلامی تو نہیں کرنی پڑتی۔

میں۔ تم کس کے نوکر ہو۔ اس وقت تو تم تہاے نوکر ہیں، صرف یہ عرض ہو کہ ہماری دعوت چمکی نہ رہ جائے۔ مسیتا۔ اللہ نہ کرے پھل کیسی، اتنی چٹنی ہو کہ مگر بھر با در ہے۔ اچھا آپ تشریف لے جائیں اور پورے آدھ گھنٹہ بعد کہاں لینے شروع کر دیں۔

یہ ہمکرمیاں مسیتا نے ہاتھ کسی قدر تیزی سے چلائے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری سچوں پر قبضہ چڑھا کر تانے لگا۔ پیٹ دلے ایک رخ سے کونوں کی سطح کو برا بکریا۔ اینٹیں جو کونوں کے دونوں طرف سے لگائے کیلئے رکھی تھیں ان کو دیکھا اور برابر تمام یخیں لگا دیں۔ پتھرا چلانے والے چھوکرے کو حکم دیا اب ہاتھ چلا۔ زور سے نہیں چلاتا۔

گیارہ بجے میں دس منٹ تھے کہ جہان آج ہو بچے۔ کالج کے طلباء عموماً آزاد اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے کھانا مانگا۔ جہان، میزبان اور طفیلی سب ملا کر کوئی پچاس آدمی تھے۔ دسترخوان بچھا، خالی رکابیاں چمکیں۔ قابوں میں کھانا غل غل کر آئے لگا۔ نان بائی نے باقر خوانیاں لگائی شروع کر دیں۔ مجھ کو اپنے کہا بوں کا اندیشہ تھا۔ پکا ہوا میاں مسیتا کے پاس پہنچا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا "حضرت یہ چالیس یخیں تو تیار ہیں۔ کھانا شروع کر دیجئے۔ خدا سے چاہا کہ اب تار نہیں ٹوٹنے پائے گا۔"

یہ سنکر میں نے دیکھا تو حقیقت میں آٹھ نوکر کابیاں کہا بوں سے بھری رکھی تھیں اور ان پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ اورک بیاز کا بچھا، ہری مرچیں اور کترا ہوا پودینہ چھڑکا ہوا تھا۔ خوشی کی گھبراہٹ میں کہیں میں یہ پوچھ بیٹھا کہ کبھی کہا بوں کے تانے بھی کمال دتے ہیں۔ یہ کہنا تھا کہ میاں مسیتا آئیں تو جاتیں کہاں، جان کو آگئے۔ میاں تم نے مجھے کیا کوئی گناوار سمجھا ہے۔ میں نے کوئی گناہ صرف میں نے گزاری ہے۔ واہ صاحب واہ اچھی قدر دانی کی۔ کیا کہتے آپ کی سمجھ کے۔ میاں کی میں رہ کر بھارت نہیں جھونکا ہے۔ کہا بچے میں کباب اور وہ بھی جامع مسجد تلے جہاں ایک سے ایک تانا شاہی مزاج کا آدمی آتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو جھگٹنا پڑتا ہے۔ خوب حضرت خوب۔ کیا بغیر تانے کھالے رکابیوں میں لگا دیتا۔ بہت

تیری قسمت کی ایسی تھی۔ نہیں میاں یہ وقت کی خوبی ہے۔ میتا چالیس برس کا کبابی اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کبابوں میں
میں سے تگے نکال دے۔ اچھا میاں اچھا

میتا بڑا بڑا رہتا اور میں نے اگر دیکھوں تو سمجھ دیا کہ کبابوں کی رکابیاں اٹھا لائیں اور دسٹر خوان پر چڑھ دیں۔ کھانا ستر
ہوا۔ کتنی جوتی میں نے میاں میتا کی تعریف کی اور کھانوں میں سب سے پہلے کباب پیش کئے۔ کچھ تو کبابوں کے ذائقے سے
کھانوں کا مٹھ مار دیا جس نے اُن کا ایک لقمہ کھالیا اُس نے دوستہ کھی کھالے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چند منٹ نہ گزرے تھے
کہ کبابوں کی ساری پلیٹیں صاف۔ لتے میں پھینک دیں اور تیار ہو گئی تھیں۔ وہ آئیں اور بتا بونی ہو گئیں۔ اب تو یہ عالم
ہو گیا کہ دھ کباب لائے اور ادھر غائب۔ آئے میں دیر ہوئی تو پھینکیاں کسی جاتیں۔ یہ مہذب شہدے متعلم یافتہ لنگھارے
کسی کے روکے کب رکتے تھے۔ اٹھ اٹھ کر دوڑنے لگے۔ جو جاتا تھا میاں میتا سے کباب لے آتا تھا۔ اور دسٹر خوان پر
چھینا جھٹھتی ہوئی تھی۔ جب معاملہ اس سے بھی گزر گیا اور کباب تیار نہ لے۔ جو جاتا میاں میتا اس سے کہہ دیتے۔ حضرت
رکابی چھوڑ جائیے۔ کباب سبک جائیں تو اگر لے جائیے گا۔ رکابیاں چھوڑ دی گئیں اور انتظار ہونے لگا۔ اب ایک حاتا ہے
"میاں میتا کباب لاؤ" جواب ملتا ہے آپ کا بھی نمبر نہیں۔ وہ جو بے سے دھنک لگتے کھڑے ہیں پہلے پلیٹ اُن کی آئی
ہے۔ دوسرا آتا ہے "لاؤ بھی ہمیں تو دیدو" اسے میاں دار سے دو لگتا

نمبر دار وار سننے سننے آخر بل گئے۔ سید صاحب جو اس ساری پارٹی کے سرغنہ اور پورے جلاق تھے بگڑ گئے۔ جو
کہنے لگے۔ "اس طرف! یہ تمہارا رکابی آدمی ہے یا پیسے والا ٹروڈ۔ نمبر دار دو لگا، نمبر دار دو لگا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کہیں میں چائنا نہ
مار بیٹھوں" یہ سنا تھا کہ میتا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غلڈی آنکھیں نکال کر بولے۔ میتا کو چائنا مارنے والا آج تک
پیدا ہوا ہی نہیں۔ یہ سچ بھی دیکھا ہے۔ آدمی کا پیٹ بھاڑ دیتا ہوں۔ تم جیسے انگریزوں کی سیٹ چائے والے ہزاروں دیکھ
ڈالے ہوں گے۔ ولایت والوں کی انٹرنیٹ کیا پہنے کو لگتیں کہ اترا ہی گئے۔ اسے ذرا اِن کھٹکوں کی صورت تو دیکھ کوئی
پھر عقدہ سے میری طرف مخاطب ہوتے۔ آپسے یہ بہرہ دے کہاں سے کپڑا لائے ہیں۔ ایسے لیٹر سے جہاں تو ہم نے نہیں دیکھے نہ سنے۔
کیوں جی ایسے ہی جسرین سوتے ہیں"

ادھر میاں میتا پر کجاس کا دورا پڑا ہوا تھا ادھر بعض نوجوان بھی بگڑ چلے تھے۔ علی گڑھ کالج کے طلباء۔ شریل زافے۔
امبروں کے بچے۔ وہ ایک کبابی کی یہ ہنگ آمیز گفتگو کس طرح برداشت کرتے۔ میں ڈرا کہ کہیں میتا ہر جملہ نہ ہو جائے۔ اور
وہ اپنی چھوڑ زمان کی پاداش میں واقعی بٹے نہ لگے۔ ہوتا ہوا چہرہ بنا کر ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور میتا سے کہا: "لو بھی اپنی
باتی ختم کر دو۔ کب تک میسوار رہے گا۔ جن جن صاحبوں کی رکابیاں رکھی ہیں انہیں کباب دو۔ تم نے کباب ہی ایسے بنا سے
ہیں کہ منہ سے لگ کر چھوٹے ہی نہیں۔" میری اس تقریر کا بھی میاں میتا پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اوپر زیادہ سخت لہجے میں بولے
کس نے منع کیا ہے۔ نمبر دار آئیں اور لے جائیں۔ بے نمبر تو میں لاٹھ صاحب کو بھی دینے والا نہیں۔ یہ تمس کھیت کی مولیٰ بڑ۔
دفعہ شریل غرض سے میں نے کئی قدر بجا جت سے کہا: "میاں میتا۔ یہ تمہاری دوکان تو نہیں ہے جہاں تم نے نمبر کی شرط
لگا رکھی ہے۔ یہ تو ہمارا مکان ہے۔ یہاں پہلے اور پیچھے آئے والے کا کیا سوال۔ یہ گاہک تو نہیں کہ بُرا مانیں گے۔ اور عقدہ

کو تھوک دو اور کباب دو۔ مہانوں پر ایسا نہیں بگڑا کرتے۔ لیکن سیتا میں کہ اپنی ضد سے ایک انج ہٹنا نہیں چاہتے۔ جواب دیا یہ مکان ہو، وکان ہو یا آسمان ہو میں اپنی عادت کیوں بگاڑوں۔ پہلے ٹنگون کھیلے ناک کٹوانا مجھے نہیں آتا۔ اگر آپ کو انکی ایسی ہی خاطر منظور ہے تو آئیے، بسم اللہ کباب لٹکائیے اور جس طرح جی چاہے دیجئے۔ سیتا تو پہلے ہاتھ سے دے گا تو نمبر واپس ہی دے گا۔ یہ کہتے کہتے میاں سیتا کھڑے ہو گئے اور اپنا تولیہ کندھے پر ڈال چلے۔ میں نے ہر چند سمجھایا۔ پھسلا یا۔ ٹھوڑیوں میں ہاتھ دے۔ لیکن سیتا پر محبت سوار ہو گیا تھا۔ ادھر یہ خیال کہ دعوت میں تو کھنڈر پڑ چکی ہے۔ خدا نخواستہ کوئی اور حرکت نہ ہو جائے۔ حماقت کی شرارت سے ٹکڑ ہو گئی تو غضب ہی ہو جائے گا۔ اس لئے سیتا کو جانے دیا۔ لوگوں نے دودھک سیتا کو شور مچاتے سنا۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے اوپر ملامت کرتا رہا۔ آج بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اپنی پرتوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اشرف صوبوی دہلوی

مجموعہ

اے موت

ابھی تو کینٹ کی ندی بہاتی ہے میں نے
ابھی تو ایک جگر دوزخ انتظار کے بند
ابھی تو سبز جوانی کو میں نے چھوڑا ہے
ابھی تو حشون کی بستی بسائی ہے میں نے
ابھی تو حکم دیا ہے فلک کو سجدے کا
ابھی تو کالی گھٹاؤں کی دیکھ کر مستی
ابھی تو حسن کی امین نواز کمرنوں سے
ابھی تو کھینٹا سیکھا ہوں نرم پھولوں سے
ابھی تو حسن کی غمخوار سی غلغلوں پر
ابھی تو کامل عنبر فاق کی لپٹوں سے
ابھی تو شمس کی دنیا کو زندگی دی ہے
ابھی تو میری جوانی نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو نیند کے ماتوں کو میں نے چھوڑا ہے

خدا را بیخه دے لے موت جھک جیئے

شراب زبست کے پرکٹ جام پیئے

الطاف مشہدی

مجموعہ

بھوک

میر صاحب کے والد زندہ ہے بہو کی دوا دارو کرتے ہے
لیکن انکی موت کے بعد اس گھر میں کوئی اتنا بھی نہ رہا جو مرلیہ
کی تیار داری کرتا۔ میر صاحب بیماری و بیماری کے جھیلوں
میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے بہو کی کوٹیکے پہنچا
آئے، جہاں کچھ دنوں کے بعد وہ بھی چل بسا۔

جب گھر میں کوئی عورت نہ رہی تو میر صاحب نے
سوچا کہ نصیبن کو بلا لیں، جس نے بچپن میں انہیں دودھ پلایا
تھا اور جو اس گھر کی پرانی خادمہ تھی، لیکن وہ اتنی بوڑھی
ہو چکی تھی کہ زیادہ چلنے پھرنے اور کام کرنے سے معذور
تھی، پھر اسے وعدہ کر لیا کہ اپنی بیٹی سے دونوں وقت کا
کھانا پکا کر بھیج دینگے۔

چھپچھپ

گرہیوں کی ایک سُنسان دوپہر تھی اور ٹوٹل رہی تھی،
میر صاحب پانی سے بھیگے ہوئے پٹنگ بریک لٹی باندھے
لیٹے اپنی نوذیر ہاتھ پھیر رہے تھے جو ٹرکے ساتھ نہایت
سرعت سے ترقی کر رہی تھی، اتنے میں کوٹیکے اور نصیبن
کی لڑکی جس کی عمر چودہ-پندرہ برس کی ہوئی کھانا لائے
ہوئے داخل ہوئی۔

کھانے کے بعد جب وہ برتن کپڑے میں باندھنے
لگی تو میر صاحب نے آواز دی۔

”اجی فاطمہ، ذرا سنبھلو“

فاطمہ نے برتن باندھتے ہوئے جواب دیا۔

”جی، کیا ہے؟“

”ہاں، ہاں، ہوں۔ میں کہہ رہا۔ میں کہہ رہا۔“

میر صاحب نے اپنے محلے کے سب زیادہ دوستانہ، باغیٹ
اور بار سون آؤی تھے، کھانے پینے کے لیے پیسے کی کمی نہ تھی،
اس کے علاوہ غدر کے زمانے میں میر صاحب کے دادا نے
کچھ انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپالیا تھا، جس کے صلے میں آج
مک میر صاحب کے خاندان کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار بطور
وثیقہ مل رہا تھا۔ میر صاحب کی بڑے مزے میں گزر رہی تھی
تھی، میر صاحب آدمی وضعدار تھا، تھے، جس کو ایک
بار دوستی ہو گئی آخر وقت تک نبھاتے رہے، دن بھر
بیٹھک میں یا دوستوں کا مجمع رہتا تھا اور شرط خجرتی تھی،
سورج ڈوبتے ڈوبتے میر صاحب تفریح کو مکمل جاتے،
فیجوری ہوتے ہوئے دریاہ میں سے مکمل کر جامع مسجد آتے،
جہاں شہر آتی پناہی کے یہاں سے ڈیڑھ میں پان بھر دلتے
اور چاندی کی طرف چل دیتے۔ نو دس بجے تک کوٹیکوں
پر رہتے۔ اس کے بعد گھر واپس آجاتے، رات کو ٹھوڑی سی
پیکر فصل بچھوڑا۔ لاہور کے یہاں کا کوئی ناول پڑھتے اور
پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔ میر صاحب کا یہی معمول تھا۔

میر صاحب کی والدہ اس وقت انتقال کر گئی تھی
جب یہ وہ دھپتے بچے تھے۔ والد کو مرے ہوئے بھی کئی ہر
ہو گئے تھے، میر صاحب کی طبیعت کے میلان کو دیکھتے
ہوئے والد نے کم عمری ہی میں ان کی شادی کر دی
تھی، کچھ دن کیلئے میر صاحب کی باہر کی دیکھ پیاں تم ہو گئیں،
لیکن بد قسمتی سے بیگم صاحبہ کچھ دنوں کے بعد اسے دن کی
بیمار رہنے لگیں اور جلد ہی میر صاحب کی طبیعت بیوی کی طرف
ہٹ گئی۔ وہ پھر اپنی پرانی دیکھ پیاں میں پڑ گئے، دیکھ

صورت ظاہر ہو رہے تھے، اس کے علاوہ ابھی ابھی جنتی ہوئی تھی اس کی وجہ سے ابھی تک اُن کی سانس ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔

باقر علی نے میر صاحب کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: کیوں کیا بات؟ کچھ گدڑے معلوم ہوئے ہوں؟ میر صاحب جواب دیا۔

”کچھ نہیں یہی گرمی نے پریشان کر رکھا ہو“
”نہیں دوست کچھ اور ہی بات معلوم ہوئی؟ یہ ہانپ کیوں رہے ہو، کیا کسی سے شستی لڑی ہے؟“

میر صاحب کا دل سینے میں جھلنے لگا، سمجھے کہ باقر علی کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ سب کچھ چپ چاپ بتا دیں، اسکے علاوہ باقر علی سے کیا پردہ وہ لٹکے یا رخسار اور ٹھیک کار ہیں۔

”وہ ہے نا۔“ نصیحتیں۔ اس کی لڑکی۔ وہی لونڈیا۔ ابھی کہا نا لیکر آئی تھی۔ مگر سبوں کے دل میں سمجھے ذرا ابھی معلوم ہوئی، میں نے کہہ دیا، فاطمہ آج تو تم بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو، سب کیا تھا، بگڑ بیٹھیں اور لڑکی اناب شناب سناٹے۔ خیریت ہوئی کسی اور نے سنا نہیں، نہیں تو اور مصیبت ہوئی۔ اوبار ہے بھائی اوبار۔ چارٹے کی لونڈیا ابھی اب تو ہمیں اناب شناب سناٹے لگی۔ بڑی آبرو والی آئی کہیں کی!!!“

”اور اگر لڑکے کہیں اپنی ماں سے جا کر کہہ دیا تو....“
”یہی تو اندیشہ مجھے؟“ وہ بڑی منہ چڑھی بڑھیا ہوئی۔
”اماں، جب کہا تو دُور سے کہیں ہو، وہ لونڈی گھوڑی کرہی کیا سکتی ہو، کہہ دیا کہ وہ جھوٹ کہتی ہے، صبح سے باقر علی میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔“

”لیکن یہ بات اس بڑھیا سے چھپی تو رہ نہیں سکتی، شام

تھا۔ کراچ تو تم بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔“
فاطمہ خاموش رہی، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
”میکوں۔ ہیں، ہیں۔ کیا ناراض ہوئیں تم۔“

”ج جانو، آج تو تم بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔“
فاطمہ کی پیشانی پر ہل لگنے۔ اس کا چہرہ عقدہ توٹا اٹھا۔
”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ جو کیا گیا ہے آپ کو آج اپنی دوج بہن سے ایسی باتیں کہتے شرم تو نہیں آتی؟ یہ کہہ کر وہ جلدی۔“

میر صاحب کی طرف لپکے اور اسکو دوج لیا۔
فاطمہ نے ایک دو ہتھ پڑس دیا، اور پچھنے لگی۔
”موتے لٹے جوتے لٹو اونگی کہ سب میر صاحبی رکھتی رہ جائیگی۔ بڑے شریف لڑکے کہیں کے!!!“

میر صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں کوئی اسے چیتا ہوا نہ سن لے، اسلئے جلدی لے چھوڑ دیا، جب وہ چلی گئی تو میر صاحب چٹکے سے دروازے کے باہر جھانک کر دیکھا۔ لگی سنسان پڑی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میر صاحب کو ذرا اطمینان ہوا۔
وہ چار پانی پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ گوار کھٹنے کی آواز ہوئی میر صاحب کا دل دھک سے ہو گیا۔ گھبراہٹ میں در تو کچھ نہ سوجھی، جھٹک آنکھیں بند کر لیں۔

”میر صاحب، اماں میر صاحب، اماں غضب کرتے ہو یا رہے؟ ایسا گرمی میں سو رہے ہو، غضب خدا کا آج تو لگ برس رہی ہے، کبھی شاہاش کی تمہاری ہمت پر۔“
میر صاحب جو خلاف توقع اپنے دوست باقر علی کی آواز سنی تو فوراً اٹھ بیٹھے، بولے: ”ابھی کھانا کھا یا ہے، ذرا قیلولہ کر رہا تھا۔“ آؤ بیٹھو۔“

باقر علی پلنگ پر میر صاحب کے قریب بیٹھ گئے، میر صاحب کے حواس ابھی نہ ست نہ جھٹنے تھے، پریشانی کے آثار

فرصت کی باتیں

”چلو بھئی دادہ! — غجب آدمی جو تم بھی تلاش کرتے کرتے تیراں ہو گیا اور ٹہ کہاں؟“ زیدی صاحب نے سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ میں گردن پھیر کر مسکرایا اور وکیل صاحب کو غصہ آیا۔

افضل اور میں سڑک کے کنارے کھائے چوتھے پر بیٹھے اپنی اپنی ضد براڑے ہونے تھے۔ وہ مجھے ”بین حزیں کے حزن و ملال پر“ سو بہانے کی دعوت دے رہے تھے اور میں انہیں چین کے سوشلسٹ نو جوانوں کی سیاسی سرگرمیوں کی داستان سنانا چاہتا تھا۔ وہ ”آئینہ بنے بیٹھے تھے اور میں سینٹی“ وہ ترنم ریز ہونا چاہتے تو میں جو ہر انداز میں جاتا۔ آخر وہ چپ ہوتے اور اپنی نظروں کو توڑ توڑ کر میری آنکھوں میں محکوس کرنا چاہا۔ میری زبان نے اشتہار کی ظلم بن کر ہرانا شروع کیا اور انہیں ان کی حسیات شعری کو اطاعت کرنے پر مجبور کرنے کے درپے ہوئیں۔ وہ قطع کلائی کر کے میرے بعض الفاظ کو یوں دوہراتے کہ گویا اپنے غیر واضح استدلالی رعب سے دبا کر مات بھر پور سے پر میٹھ رہنے کی سزا دیکر رہیں۔ میں قدرے ڈرا اور اپنے وقار کو قائم رکھتے انہیں خوش کرنا چاہا۔ ”افضل میاں! یہ شاعر بھی کس قدر عجیب لوگ ہیں کہ بزم رزم کے ٹھکے باز سے سپاہی کے لئے ان کا لیک، ایک لفظ فہمید سے زیادہ راحت آویز ہوتا ہے اور وہ مات کو سونے کی بجائے گے نا شروع کر دیتا ہے“

”اگر ان میں یہ ”عجیبیت“ نہ ہو تو ہمارا معمولی حیات ہی ہمیں زندہ درگور کر دے“ انہوں نے فرمایا۔

”اور سونو تو؟“ میں نے کہا۔ ”چونکہ لکھتا ہے کہ ایک شاعر نے ان کی سرگرمیوں کو شیش رنگیں“ کہہ کر بھارا ہے۔“

”تب تو میں.....“ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ زیدی صاحب آدھے ٹھکے اور سپاہی و شاعر کا دو چسپ موضوع انکی

”چلو بھائی“ کے ساتھ ہی چلے دیا۔

”کہاں چلے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میاں نہ پور تک..... کام ہے کچھ۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”ایک ہی سائیکل پر؟“ میں نے دریافت کیا۔

”تو اور کیا؟ وہ بولے۔

”کہیں جالان ہو جائیگا؟“ افضل میاں نے پیشانی چڑھائی۔ اور میں نے زیدی کو چوتھے پر گڑھی کا اشارہ کیا۔ ”حقاً جو میری ناشنوری کی وجہ سے دایوس ہو چکا تھا، دوبارہ حق حق کرنے لگا۔ ”ہو آئیے نا آج وہاں سے بھی“ میں نے زیدی سے کہا اور افضل کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائے اور کہاں سے؟“ زیدی نے پوچھا۔

”وہاں سے“ افضل نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور ہم تینوں ہنسنے۔

زیدی میری طرح ایک پڑھا لکھا نو جوان اور ادھی کبھی ٹیوشن تلاش کر کے اس آوارگی سے بچے جاتا ہے جو میرے لئے کلچر کی کمی تھی۔ چوتھے کے نزدیک ہی ایک صاحبک ہاں زیدی ان کی دھڑک پڑھانے جاتا تھا اور اس شوق سے کہ اپنے آرام کا

وقت ہی قربان کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ یہاں تک کہ اس کی شان شوق نے داد و جمل کی اور منظم طور پر دوس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جانے کیا بنگاڑ پیدا ہوا کہ زیدی نے وہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ اور اُس نے حسرت پر در انداز سے کچھ ایسا ہی جواب دیا۔

”تجدید مراسم ہی سہی؟“ افضل نے ٹکپاشی کی۔ ”اوہ“ زیدی کے منہ سے نکلا اور ہم جو گئے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

”ماراض ہو گئے آپ؟“ افضل نے پوچھا۔

”ہنیں جی۔ میں لطفِ بھرت اٹھا رہا ہوں“ اُس نے جواب دیا۔

”تو آپ ہمارے مسمون میں نا؟“ میں بولا۔

”کیوں نہیں؟“ زیدی نے عینک ذرا اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

”تو ہم اس کا عملی ثبوت چاہتے ہیں — کیوں بھائی افضل؟“ میں نے کہا۔

”اور اس پر انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ افضل نے جواب دیا۔

”فرمائیے؟“ زیدی نے پوچھا۔

”آپ کی کہانی اب کی زبانی سننے کو جی چاہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور فائدہ یہ ہو گا کہ آپ کے متعلق ہمارے جی میں جو شک پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو جائیگا“ افضل نے کہا۔

زیدی خاموش رہا۔ میں نے افضل کی طرف اشارہ کیا اور ہم جبوترے سے اٹھ کر پارک میں چلے آئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی زندگی کا ایک ایسا واقعہ سنائے۔ جسے وہ زندگی بھر بھول نہ سکتا ہو۔ اور پہلی باری میری تھی۔ میری زندگی کا کوئی ایسا واقعہ تھا نہیں اور عورتوں کے متعلق افسانے گھڑنا میرے بسکل نہ تھا۔ آخر میں نے بات بنانی شروع کی۔

آحراری جتنے جب ریاست کشمیر چلے اور ہر رہے تھے تو میں بھی بلائے گرفتاری کا تجربہ کرنے تین ماہ کے لئے جیل پہنچ گیا۔ پہلے روز کسی نے کام کے متعلق کچھ نہ پوچھا اور سب بڑی سزا جو اپنے نے میں نے خیال کی، وہ جیل کی خوراک تھی۔ کیونکہ کئی روز تک تو بانی اور جنوں کے سوا زبان نے کچھ نہ قبول کیا۔ اُسے ہوئے سبر لوں اور درختوں کے پتے، کنکار اور گندم کا ٹاٹا جو آٹا قیدی کی قسمت ہوتی ہے، لیکن ہم لوگ اس کے عادی نہ تھے، اس لئے منہ لگانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تیسرے روز جب شفتوں کو ہم پر تقسیم کیا گیا تو آخر کھانا ہی پڑا۔ مجھے چودہ روز نو جوانوں کے ہمراہ چلتیوں پر لے جایا گیا اور اٹھارہ سیر گندم پیسنے کو لی۔ اس وقت کو ٹھہری میں میرے قریب صرف جیل وارڈ ہی تھا، جس کی مدد سے ایک روز پہلے میں جیل مینوئل کا مطالعہ کر چکا تھا۔ یہ کام کس طرح کرتے ہیں۔ میرے بھائی؟“ میں نے مایوس لہجہ میں وارڈ سے کہا۔ اُس نے بھی بھروانے لے اور جی میں ڈانک ایک لمحہ کے لئے دستہ گھمایا۔ ”بس لوں کے جاؤ“ کہا اور دروازہ مقفل کر کے چل دیا۔ اب اگر کام نہ کروں تو سزا بڑھ جانے کا اندیشہ اور اگر کرنے کی کوشش کروں تو کتے نہیں بنتا۔ میں عجیب کشمکش میں آہستہ آہستہ دستہ گھما رہا تھا، اور جسم کو تکیا روح کے بازو کی پھوسے جا رہے تھے۔ آخر جیل مینوئل کا مطالعہ کام آیا اور میں نے نہایت اطمینان سے کھڑے ہو کر جی پھیرنے کی ٹھان لی۔ اور پھیرتا رہا یہاں تک کہ چار بج گئے اور قیدیوں کو جٹی ہوئی۔ وارڈ نے میری کو ٹھہری کا دروازہ بھی کھولا اور جی کے رگڑے ہوئے پتھر اور جیل کی امانت محفوظ دیکھ کر حیران سا ہوا۔

”اب میں کیا کروں؟“ اُس نے پوچھا۔

”اوپر اطلاع“ میں نے جواب دیا۔ اور وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلی آمد ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی کالیوں کی بوچھاڑ۔ اگر سر کندہ دہنی سے آگے بڑھے تو انجام اچھا نہ ہوگا۔ دروازہ صاحب! میں نے کہا۔ کالیاں بکنا آپ کے ڈرائیو میں نہیں! وہ ٹھہر گیا اور میری طرف ایک نظر دیکھ کر واپس چلا گیا۔ اور میں انجام کا منتظر وہیں بیٹھا رہا۔ آخر چار باغی خانہ آئے اور پکی اکیڑ کر باقی سامان ساتھ لئے مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ اس پیشی کا انجام ہمیشہ سزا میں ظاہر ہوا کرتا ہے، مگر مجھے اطمینان تھا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب میز عدالت لگانے کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ہلکے سے پتھروں اور گندم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ”یہ تم نے کیا کیا ہے؟“ جواب میں میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے لبوں کو جنبش دی اور بس۔

”سنا نہیں؟“ وہ غصہ میں نصف ایستادہ ہو کر بولے۔ اور میرا جواب ایک شوخ مسکراہٹ تھا۔

”بد معاش کہیں کا۔۔۔ لے جا۔۔۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب! میں نے بات کاٹی۔ ”جو کچھ میں نے کیا ہے وہ تو آپ کے سامنے ہے اور میرے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ کا مطلب اس کی کیوں سے ہے تو جواب دینے میں مجھے عذر نہیں“

”ہاں۔ ہاں۔ ہی مطلب ہمارا“ وہ بولے۔

”جیل مینیوئل میں لکھا ہے کہ قیدیوں کو ان کی جسمانی طاقت کے مطابق کام دیا جائے“ میں نے کہنا شروع کیا۔ یہ کام میری طاقت سے باہر تھا۔ دیکھ لکھا ہے کہ ایک آدمی کو ایک وقت میں ایک کام کرنے کو دیا جائے۔ اسے ڈالنا علیحدہ کام ہے اور سچی پھیرنا الگ۔ اگر میں اسے ڈالتا تو ایک مٹھی کے بعد میرا کام ختم تھا، میں نے مشکل کام کا انتخاب کیا اور میرے دست و بازو اس کے گواہ ہیں“ میں نے اپنے زخمی ہاتھ اُن کے سامنے کھول دیئے انہوں نے دیکھا اور کل سے اسے کوٹھوپڑے لے جاؤ؟ کا فیصلہ صادر فرما کر چلے گئے۔ مجھے بھی اپنے ساتھیوں میں بھیج دیا گیا۔ میں رات بھر سردی اور کوٹھوس کے خوف سے کانپتا رہا۔

”مگر۔۔۔“ انھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ ختم تو کر لینے دو یا۔ میں نے کہا اور دوسرے دن چند پہلوان نا قیدیوں کے ہمراہ مجھے کوٹھوپڑا پر لے گئے۔ میرے ساتھی بہت خوش تھے۔ اکاون سیرسروں کا یل نکالتے اُن کی ورزش ہو جاتی اور مالش بھی۔ پہلے دن اُن کے ساتھ مجھے پورا کام کرنا پڑا اور شام کو جب اپنے خیم میں پہنچا ذبے اخبار رو دینے کو بھی چاہا۔ اور رات سردی اور زکمان سے میرا جسم اگڑ گیا۔

”مگر سردی روکنے کے لئے کپل نہیں لے“ وکیل صاحب نے جرح کی زبیدی میری ن حیرت سے تک رہا تھا۔

”چار بورے ملتے ہیں“ میں نے جواب دیا۔ دو اور ملنے کیلئے اور دو بچانے کیلئے۔ اور اُن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر انہیں پھیلا کر صاف کیا جائے تو آپ اُس کے دوسری طرف ہر چیز دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ ہم لوگ اُن کو گرد آلود اور جوں پرورد ہی رہتے دہن دیتے، پھر بھی سردی سے محفوظ نہ رہتے“

”جوں پرورد؟“ زبیدی بولا۔ ”ہاں ہاں“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر جوں ہتی رہیں اور رات کو جوں چوسیں تو ان کی رافعت

کی کوشش میں جسم کو کسی حد تک گرم رکھا جاسکتا ہے۔“

دونوں ہنسنے لگے۔ ”اچھا تو دوسرے روز کیا ہوا؟“

اب دوسرے روز کا کیا کرتا۔ ان کی باتوں نے خیال کی روانی روک دی تھی اور میں فضول کوشش میں مفت کی خفت نہ لینا چاہتا تھا۔ ”بات دراصل یہ ہے“ قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”تین ماہ کی داستان سنانے کیلئے کم از کم تین دن درکار ہیں۔ بھائی اب تو میرا حق خشک ہو گیا ہے اور نیتھن پھول رہے ہیں۔ فی الحال آپ یہ سمجھ لیں کہ قید تہائی میں بھوک ہڑتال بھی کی اور ایسی مشکلات میں تین ماہ گزار دئے۔“

”اب آپ کی باری ہے۔ وکیل صاحب!“ زیدی نے کہا۔

”اور میری نہ بھول سکنے والی کہانی یہ ہے کہ انقل بولا۔ ”میری زندگی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جو عمر بھر یاد رہ سکے۔“

”واہ۔ واہ!“ میں ڈاؤدی۔ اور زیدی ہنسنے ہوئے بولا۔ ”اب بیٹے میری۔۔۔“

”دل تھام کر“ زیدی نے قطع کلائی کی۔

”اچھی بیٹے تو وہ سگریٹ کا کش لٹکاے ہوئے بولا۔ ”وہ لوگ ہماری برادری سے ہیں۔ ایک دن مجھے نئی کوڑہانے کے لئے کہا گیا اور پانچ روپے ماہوار معاوضہ پر میں نے منظور کر لیا۔ یوں تو ان لوگوں کو میری شرافت کا پہلے ہی یقین تھا لیکن ایک دو روز کے بعد جب انہوں نے میرے بالکل ہی حسابی طریق کار کو دیکھا تو پاسبانی کی ضرورت نہ بھی ادراہم دونوں کو تنہا ہی چھوڑ دیا جاتا۔“

”ڈانا ٹھہرے نا“ زیدی نے کہا۔ ”بھلا تیسرے آدمی کی موجودگی میں کیسے پڑھائی ہو سکتی تھی؟“

”اور میں ایک گھنٹہ کی بجائے چار چار گھنٹے وہیں بیٹھا رہتا۔ جب وہ حساب الجرا کے سوال حل کر رہی ہوتی تو میں

اُس کے چہرہ پر نظر جمائے رہتا۔“

”اُس کے چہرے میں کوئی خاص جاذبیت تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک نظر دیکھنے سے تو آپ اُس کے چہرے کو نصف مردانہ نہیں گے؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”لیکن اگر آنکھیں انجور دیکھنے کا موقع ملے تو نہایت کوہ پوری جھٹک نظر آتی۔“

”نصف مردانہ چہرے سے آپ کا مطلب؟“ انقل نے کہا۔

”اُس کے چہرے پر مونچھوں کے بال نمایاں ہیں اور رنگت سیاہی مائل سرخ۔۔۔ جیسے دھوپ میں پھرے کیچر

سے مرد کے چہرے کا رنگ اکثر ہوجاتا ہے؟“ اُس نے جواب دیا۔

”تو یوں کہیں کہ اُس کا چہرہ حسین سی کو شرماتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”سنو تو یار! پہلے سقدربے تاب تھے۔ اور اب بات بات پر لڑکتے ہو میرے! اس طرح دیکھنے کو اُس نے ایک دن

ناڑ لیا اور کہنے لگی۔ ”میرے چہرے میں کیا رکھا ہے؟“ — ”دلکشی“ میں نے جواب دیا۔ اور یکایک آسمان پر ابر چھا کر برستا شریع ہوا۔ جب اُس نے لگا تو بولی۔ ”بھیک جائیگے آپ“

”بھوک لگ رہی ہے“ میں نے کہا۔

”کھڑی پکی ہے، کھا لیجئے“ اُس نے جواب دیا۔ ”شکریہ — اگر چھتری ہو تو عنایت کریں“ میں نے عرض کی، لیکن بے سود۔

اس روز ایک مہینہ ختم ہو گیا تھا، لیکن جانے کیوں میں اپنا معاوضہ طلب نہ کر سکا اور بیگانہ ہی واپس چلا آیا۔

اس کے بعد ہمارا وقت باتوں میں گزرنے لگا۔ گفتگو کا موضوع اکثر مرد و عورت کے باہمی تعلقات ہوا کرتا۔ اور ایک روز باتوں باتوں میں میں نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہہ دیا۔ ”یو ڈارنگ ٹک ٹل بلیک کیٹ“؛ شاید اس کے غرور نسوانی کو صدمہ پہنچا۔ جو غصہ دہاتے ہوئے بولی۔ ”احمق!“

”مسٹر احمق“ میں نے ترمیم کی۔ ”اور بس بلیک کیٹ“ وہ ہنسی۔ اس کے بعد ہمارے تعلق غلط افواہیں گرم ہوئیں اور میں دو ماہ کا معاوضہ لیکر ہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ بس۔ اب میں اپنی عزت کو الگ دوتا ہوں اور وہ اپنی شرافت پر غلیبیہ“

”بل جاپیے ایک بار پھر“ میں نے کہا۔

”خوب گزریگی جو بل نہیں گئے دیروئے دو“ انفل نے کہا اور ہم ہنستے ہوئے پارک سے نکل آئے۔

منظور ملک، بی۔ اے

اے خدائے گردش!

(سائینٹ)

جلوسِ فتنہ محشر لے پھر کون آتا ہے

دہے پاؤں۔ جھکتے۔ ناز سے آہستہ آہستہ

نقاب لٹے ہوئے انداز سے آہستہ آہستہ

بتسم زیر لب۔ لہجہ میں جاو گنگنا تا ہے

متانت سوتے سوتے جاگ اُٹھی اے کے انگریزی

وہ شاہد میری دنیائے محبت کا فائدہ ہو

وہ شاہد بھولے ہسرے عہد کا رنگیں ترانہ ہو

شوق لے کر وٹیں بدلیں برنگ زلفِ مینائی

چمن زاروں میں اُدھے، اُڑھائی بھول ہیں قضا

وہی ساگر میں موجیں ہیں، وہی جو چاند میں رونق

کئی گزری وہ نکبت، پیرا تیں پھر نہ بتنگی

دہیں بے چل! دہیں! پھر لے خدائے گردش دوراں

جہاں وہ مری غذا۔ سکون جذبہ واسق

مجھے ظالم نلنے کی تمنا میں ستائیں گی۔

کاشف
چند آبادی

عورت کی تعلیم و تربیت

عورت کی تعلیم و تربیت پر ہم نے بہت کم غور کیا ہو۔ ہماری موجودہ زندگی میں یہ مسئلہ نہایت اہم اور کافی غور و فکر کا محتاج ہو۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو بہت کم پڑھانا چاہیے۔ صرف امور خانہ داری میں مہارت اور مذہبی معلومات حاصل ہو جائیں تو کافی ہے مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔ ہماری وہ لڑکیاں جو مستقبل قریب میں ”بیوی“ اور ”ماں“ بننے والی ہیں اگر زیورِ علم سے آراستہ اور کافی تربیت یافتہ نہ ہوں تو ان میں اپنے ماحول کی ضروریات کو سمجھنے کی قابلیت و صلاحیت نہیں ہوگی اور نہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے شوہر کی رفیق زندگی اور اپنی اولاد کی ماں بن سکیں گی۔ یہ سوال لڑکیوں کی تعلیم کا نہیں بلکہ بیویوں اور ماؤں کی تعلیم و تربیت کا ہو۔

تعلیم نسوان کے مسئلہ کو ہر ملک اور ہر قوم کی نظریں نہایت غور و خوض سے دیکھ رہی ہیں مگر ہم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اب ہم کچھ پیادہ ہوئے ہیں اور ہماری نیند کا شمار کچھ کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ مگر یہ کب؟ جبکہ آفتاب لبِ بام ہے اور دنیا کی ہر قوم اپنی منزل پر پہنچنے لگی ہے۔

ہر قوم کی ترقی اور نشوونما کا اہلی اور حقیقی سبب اس کے افراد کا دماغی ارتقاء ہے۔ اسی پر قوم کے عروج اور ترقی کا انحصار ہے۔ ہماری قوم میں جو ہر قابلیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہر فرد کی خواہ وہ مرد ہو کہ عورت باقاعدہ سمجھا، مصلیٰ پر تعلیم ہو اور اس کے اخلاق کی صحیح تربیت ہو۔

ہر قوم کی زندگی کا راز اس کی دماغی ترقی اور نشوونما میں مستور ہے۔ تعلیم دماغی زندگی کی مدح رواں ہے۔ اس سے دماغ کو غور و خوض کرنے کی عادت اور مشق ہوتی ہے۔ یہی اختراعات و ایجادات کی بنیاد ہے۔ اسی سے دماغ میں سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی سرچشمہ ہے ساری کامرانیوں اور مقصد برآریوں کا۔ اگر تعلیم نہ ہو تو صحیح دماغ بھی معطل اور ناکارہ بن جاتا ہے۔

علم انسان کو صحیح معنوں میں ”انسان“ بناتا ہے اور حسن و قبح کا امتیاز سکھاتا ہے۔ جہالت کی تاریکی کو دور کرتا ہو۔ اخلاق و عادات کو سنوارتا ہے۔ ہماری اخلاقی قوتوں کو ابھارتا ہے اور ہم کو فرض شناس بناتا ہو۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم دنیا میں علم، تہذیب اور تمدن کے علم بردار تھے۔ آج ہماری حالت دیگر گروں ہے۔ آج ہم دنیا میں سب سے زیادہ پست، سب سے زیادہ کمزور، سب سے زیادہ ذلیل و خوار، سب سے زیادہ بد معاملہ و ناقابلِ اعتماد اور سب سے زیادہ علم و ہنر کے محتاج ہیں۔ جو قوم کل ساری دنیا کو درسِ اصلاح دیتی تھی وہی آج اصلاح طلب ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اب ہماری حالت وہ نہیں رہی جو چند سال پہلے تھی مگر پھر بھی ہم دوسری اقوام کے مقابلہ میں علمی و عملی میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو ہماری علم فہم نہ رہنے سے ہے اختلائی اور غفلت ہو اور کچھ ہمارا افلاس و نکبت۔

دنیا میں جن قوموں کی تعمیر یا تخریب ہوتی ہے ان میں انکی صحیح یا غلط تہذیب، تمدن اور طرزِ معاشرت کا رفرما ہوتی ہے۔ ہر قوم اپنی تہذیب اور معاشرت کے ہاتھوں اپنی تعمیر یا تخریب کا باعث ہوتی ہے اور ہر ملک اپنے تمدن کی بدولت ترقی یا تنزل کا

سبب ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کا تمدن و معاشرت اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتا تو اس قوم کی پستی اور تنزل کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

دورِ موسائیت یا عیسائیت کے بلنبست اسلام کی تاریخی روایات اپنے اندر زیادہ دنیائی نتائج رکھتی ہیں۔ اُن کے عروج و پستی کے خارجی اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی تحریک کے اصلی اسباب اُن کا تمدن اور معاشرت تھے۔ تہذیب و تمدن صرف قوم ہی کا نہیں بلکہ انسانیت کی عمدہ تکمیل کا جزو اولین ہے۔ اسی کے ذریعہ سماج کا نظام قائم رہتا ہے اور اسی کے سبب سوسائٹی کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔

ہم نے جہاں اپنی قدیم روایات کو بھلا دیا۔ وہاں اپنی تہذیب و معاشرت سے بھی دست بردار ہو گئے اور اپنے تمدن کو بھی خیر باد کہہ دیا یہی اسباب ہیں جو ہمارے دن کی تخریب و بربادی کا باعث ہو رہے ہیں۔ آج ہماری قومی حیثیت ہر پہلو سے گری ہوئی ہے اور ہم ہر جانب سے دوبارہ فلاکت کی خاورِ وادیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

جو قوم اپنے عمل میں راسخ نہیں ہو اور اپنے ہر کام اور ہر ارادے کو نامکمل و ناقام چھوڑ جاتی ہو یا ابتدائی مراحل طے کئے بغیر منزل مقصود پہنچنا چاہتی ہے وہ کس حد تک اپنے عمل میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ اور کس قدر حق رکھتی ہو کہ دنیا کی دوسری زندہ قوموں کے دوش بدوش چلے؟

تعلیم نسواں کی درسگاہوں کے قیام سے پہلے اُن کے مخصوص نصاب کی ترتیب و تکمیل بے ضروری تھی جس بنیاد پر ہمارے قائم ہوئی تھی اُس کا مضبوط اور مستحکم ہونا لازمی تھا۔ مگر اس مرحلے کے طے کرنے سے پہلے عمارت کی تعمیر آغاز کر دی گئی۔ مردوں اور عورتوں کی تعلیم کا تقریباً ایک ہی نصاب قرار پایا اور عورتوں کے نصابِ تعلیم پر کچھ بھی غور و خوض نہیں کیا گیا اور نہ اُن کے لئے اُن کی مخصوص ضروریات و فرائض کے ہر نظر ایک علیحدہ نصاب بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی یہی سبب ہے کہ موجودہ نصاب کے ذریعہ تعلیم نسواں کا خاطر خواہ نتیجہ یا مقصد برآمد نہیں ہو رہا ہے۔

موجودہ نصاب پر جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ نہ ہماری لڑکیوں کی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے نہ ہمارے حالات و طبائع کے موافق اور نہ ہماری اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی ترقی کا باعث ہو سکتی ہو۔ باوجود ان کمزوریوں اور استقامت کے وہ استعداد رکھتا ہے کہ ہندوستان جیسے مفلوک الحال ملک کے باشندے اپنی لڑکیوں کو اس سے بہرہ اندوز نہیں کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے لڑکیوں کے نصابِ تعلیم کے تعین میں کبھی دیکھی نہیں لی اور نہ ہم نے کبھی اُس کی اہمیت کو قرار واقعی محسوس کیا۔ ورنہ اس وقت جو مشکلات اس راستہ میں حائل ہیں کبھی نہ ہوتیں۔ اب اس امر کی شدید ضرورت ہو کہ ماہرینِ تعلیم و حامیانِ تعلیم نسواں نہایت پسندیدہ اور محوزوں اسلوب پر تعلیم نسواں کا جدید نصاب تیار کریں۔ مردوں کے نصاب پر عورتوں کو تعلیم دینا کسی صورت مفید اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ لڑکیوں کیلئے جداگانہ نصاب کی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ موجودہ طریقہ تعلیم سے سو و پیرود کی امید بہت کم نظر آتی ہے۔

تعلیم نسواں کے نصاب کی ترتیب کے لئے ضروری ہے کہ ماہرینِ تعلیم، مجتہدینِ قوم اور پیشوایانِ دین کے خیالات و آراء معلوم کئے جائیں۔ اُن سبکی ستم و مشہد و کوششوں سے جب تعلیم نسواں کا نصاب تیار ہوگا تو یقین ہے کہ ہماری لڑکیوں کے لئے

نہایت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہو گا۔

ترتیب انصاف کے بعد طرز تعلیم کا خوش اسلوبی سے قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ تعلیم کا طرز ایک طالب علم کے حتیٰ میں امرت بھی ہے اور زہر بھی۔ اسی سے اس کی تعلیمی حیثیت اور قابلیت نشوونما پائی جاتی ہے اور پستی کی طرف بھی مائل ہوتی ہے۔ تعلیم نسوان کی مخالفت اب بہت کم کی جاتی ہے مگر طرز تعلیم کے خاطر خواہ نہ ہونے سے پسند نہیں کیا جاتا ہے۔

طرز تعلیم میں قومی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ قومی ترقی کا دار و مدار طرز تعلیم پر ہے۔ طرز تعلیم کا اثر اخلاق، تمدن اور معاشرت پر بہت گہرا اثر ہے۔ تعلیم نسوان کے انصاف کے تعین کے ساتھ ساتھ طرز تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ کرنی ضرورت ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے اہم مقصد کے مد نظر اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا انصاف تعلیم ایسا کا رہے اور اتنا مکمل ہو کہ ان کو اپنے نسوانی فرائض و ضروریات کا اہل بنائے علاوہ ان میں مذہبی اور قومی خصوصیات بھی پیدا کرے تاکہ وہ اپنی۔ اپنے شریک زندگی اپنی اولاد اور اپنی سماج کی زندگی کو خوش گوار اور کامیاب بنا سکیں۔

جس قوم سے جسکی قومیت اور اس کا تمدن نکل گیا ہو اور اس کی خصوصیات سلب ہو گئی ہوں وہ گویا دنیا سے نیست نابود ہو گئی اس کا عدم وجود و وجود یکساں ہے۔ ہر قوم اپنی خصوصیات کی وجہ اقوام عالم سے اپنا فرق منواتی ہے۔ یہ خصوصیت ایسی ہے جسکو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

موجودہ انصاف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس حد تک ہماری قومی روایات و خصوصیات کو انصاف میں جگہ دینی ہے۔ اور ہماری تاریخ کو کہاں تک طاقی بیان پر رکھ دینا ہے۔ بجائے اپنی تاریخ اور قومی روایات سے فائدہ اٹھانے کے دوسری کی تاریخ اور روایات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے مشاہیر اور اساتذہ کے تذکروں سے انصاف کو محروم کر دیا گیا مگر دوسری اقوام کے اکابر و مشاہیر کے تذکروں سے ہماری دوسری کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ضروری اجزائے تعلیم کو ترک کر کے بہت سی ایسی غیر ضروری باتیں انصاف میں شامل کر دی گئیں جن سے ہجر اس کے کہ جس لطیفے کے نازک اور کمزور دماغوں پر خواہ مخواہ بار پڑے کوئی فائدہ کی امید نظر نہیں آتی۔

جس قوم کے تشکیل میں دوسروں کی دی ہوئی تھیک ہو جو غیروں کے ٹکڑے کھانسی خور گئی ہو اور جسکو پرایا مال کہا جائے گا جسکا پڑ گیا ہو وہ تو کم کہاں تک اپنے قوت و بازو سے کچھ پیدا کر سکتی ہے۔ وہ اپنی ساری کوششیں اور قوتیں غیروں کی بھونڈی لغائی میں صرف کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ جس قوم نے اپنی جیبوں میں ایسے گھوٹے سٹکے بھر لئے ہیں وہ بازار عالم میں اپنے لئے کیا سودا کر سکتی ہے ایسی قوم کا مستقبل ظاہر ہے کہ کس قدر شاندار اور روشن ہو گا۔ ۷

جس کی بہار یہ ہے پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

ہماری آئینہ دل نسلوں کے نشوونما کا دار و مدار اور ان کے ارتقا کا راز یہی ہے اور با اصول تعلیم نسوان اور انکی اخلاقی اور اقتصادی آزادی میں مضمر ہے۔ یہ وہ بنیادی حق ہے جسکو اسلام نے تصنف نازک کو عطا کیا تاکہ وہ اپنی قومی اور مذہبی خودم داریوں کو کسی طرح محسوس کر سکیں۔ ہماری بہنوں کا یہ نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ عہد ہاضی کی خواتین کی روحانی صفات اور دہرہ حاضر کے قابل تقلید خیالات اور جذبات کے اتصال کی ایک زندہ مثال بنیں۔ اپنی نفس بلکہ اپنی ہر حرکت و جنبش میں

اپنی مشرقی شرم و حیا۔ ایثار و وفا اور خود داری و ہمدردی کا لحاظ رکھیں۔ مشرق کی عورت کو قدیم حسن و خوبی کا خزانہ اور جدید تعلیم و تہذیب کے بہترین جوہروں کا آئینہ ہونا چاہیے۔

جو لوگ مغرب کی تہذیب اور وہابی عورتوں کی آزادی کے دلدادہ ہیں وہ اس تہذیب کی تصویر کا دوسرا رخ یا خطہ نہیں اور نظر غور سے دیکھیں کہ اس نام نہاد تہذیب کے پردے میں ان کی اخلاقی زندگی کہاں تک قابل تقلید ہے مغربی تہذیب کی ایک حد تک ضرور تقلید کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہمارے موجودہ تمدن اور معاشرت میں مغرب کی تہذیب کا بڑا عنصر شامل ہو چکا ہے۔ مگر مغرب کی ہر ادا اور ہر حرکت پر بغیر غور کے آئین کہنا اور اسکو بمنزلہ "خدا کی فرمان" تصور کرنا کسی صورت جائز نہیں۔ مغرب کی تقلید اس حد تک کرنی چاہیے کہ ہماری اخلاقی حالت اور معاشرت میں کوئی فرق نہ آئے۔ ہماری معاشرت اور گھریلو زندگی بد اخلاقی یا گندم ناخو فردوشی کی مثال نہ بن جائے اور ہماری قومی و مذہبی خصوصیات ہم پر بیست و نابود نہ ہونے پائیں۔ مغربی تہذیب کی حسین اور نظر فریب صورتوں کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ ان میں سے کون ہماری صحبت کے قابل ہے اور کس سے کنارہ واجب۔

مغربی تہذیب و معاشرت کی نظر فرمیاں اور دورِ حاضر کی سحر کاریاں خواہ اپنے اندر کتنی ہی دلکشی اور جاذبیت رکھتی ہوں مگر دیدہ بینا کے لئے یہ ہماری قوم کی بقا اور تحفظ کا ذریعہ نہیں بلکہ ہمارے اخلاق کی بربادیوں اور تمدن کی تباہ کاریوں کے اسباب بننے اندر نہیں رکھتی ہیں۔ باوجود یہ سب کچھ سمجھنے کے ہم خود کو مغربی رنگ میں از سر تا پا بہت سرعت سے رنگ رہے ہیں۔ مغرب کی ساری عیش پرستیاں اور سوسائٹی کی جُلہ خرابیاں ہماری سماج میں رواج پارہی ہیں اور ہم میں وہ ساری بُرائیاں راسخ ہو چکی ہیں جن کے رواج پر خود مغربی مصلحین معاشرت ہدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

مغرب کی صحیح تقلید کا سب سے پہلا اثر ہماری ہمنوی میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ صاف ستھرا بننا سیکھیں گھر کے گوشہ گوشے کی صفائی کا خیال رکھیں۔ گھر کی ہر چیز کو سلیقہ اور ترتیب سے سنواریں معاشرت میں صفائی اور پاکیزگی پسند کریں۔ وقت کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں۔ وعدہ کے ایفا کا خیال رکھیں۔ اس طرح کی تقلید ان کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور سماج میں ان کا مرتبہ بلند ہوگا۔ جو بچے اس فضا اور ماحول میں پرورش اور تربیت پائیں گے ان کے خیالات اور احساسات بھی انہی ماؤں کی طرح بلند ہوں گے۔

مغرب کے پہنے والوں کا ہر گھر فردوس کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ ان کی مالی حالت ہم سے اچھی ہے اس نے وہ ایسی معاشرت کے پابند ہو سکے ہیں۔ اگر ہم غریب عیسائیوں کا مقابلہ اپنے امراء کی معاشرت سے کریں تو بھی یہی فرق نظر آئے گا۔ سلیقہ اور صفائی کیلئے زیادہ تدبیر کی ضرورت نہیں ہو بلکہ تیز اور احساس کی ضرورت ہو اور اسی کا ہماری ہمنوی میں فقدان ہے۔

ہماری خواتین میں ایک یہ عیب بھی ہو کہ ان کا وقت اکثر بیکاری۔ فضول گپ شپ اور دوسروں کی عیب جوئی اور مکہ مہینی میں گذرنا ہے۔ اس کا سبب یہ ہو کہ ان کی زندگی کا کوئی نظام نہیں اور نہ کام کر کے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم تربیت کی ان میں صلاحیت ہو۔ امور خانہ داری میں ان کو ترتیب اور تہذیب پیدا کر نیکی فکر ہو گھر کی صفائی اور ستھرائی کا خیال ہو۔ نہانہ

دستکار یاں سیکنے کی طرف اُن کی توجہ ہو اور مطالعہ کتب و اخبار دینی کا حقوق ہو تو اُن کا ایک لمحہ بھی راہِ ننگاں نہیں جاسکتا۔
تعلیم کا اثر کسی صورت بھی خراب نہیں ہو سکتا۔ اہل چیزِ جو زندگی کو تباہ و برباد کر رہی ہو ہے وہ ناقص تربیت ہے جس کی سب سے پہلی ذمہ دار ماں ہی اور وہ اُسی وقت اچھی تربیت کر رہی ہو گی جب وہ خود عمدہ تربیت یافتہ ہو۔ اُس کے اخلاق اور خصال بلند ہوں، صفاتِ ستھری معاشرت رکھتی ہو۔ وقت کی قدر شناس ہو۔ اصولِ حفظانِ صحت سے واقف ہو۔ تو بہات اور فصولِ رسم و رواج کی پابند نہ ہو۔

غرضیکہ ہماری بہنوں کو ایسی تعلیم و تربیت دینی چاہیے کہ وہ اُن میں خود اری، محنت، فرض شناسی، والدین کی اطاعت، پاکدامنی، اور وطن پرستی کی روح پھونکے۔ تاکہ وہ مغرب کی کارآمد و مفید معلومات حاصل کر سکیں جو دوسری روایات اور طریق معاشرت کا کافی احترام کرنا سیکھیں۔ اُن کو محکمِ پور دین نہ بن جانا چاہیے مگر اُن کے عمدہ خصال اور قابلِ تقلید صفاتِ مطہرہ اختیار کرنی چاہئیں۔

مرزا سیف علی خاں؛

ساتی بک ڈپو۔ دہلی کی کتابیں

خانم۔ دیورانی جٹھانی کی پُر لطف نوکِ جھونک چغتائی صاحب کے بچپن و گلشِ مضامین کا مجموعہ جلدِ ستھری طبعہ قیمت ۱۰۰۰
کولتار۔ سنی نوچاری سالوئی منگر شر پڑکوں کے نام کو تار صاحب رکھ دیا پھر کیلے مرنے کے واقعات لکھا ہونے کہ۔۔۔ ۱۰۰
وہیسا۔ زانی مرد خو خور اور نہرے کی طرح ایک بیکس عصمت ماب خاتون پر جھینٹا ہوا اسکی زندگی برباد کرتا ہے مگر۔۔۔ ۱۰۰
شر پور پوری۔ اس قدر شر پور عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی، کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہوا اس شر پور عورت نے! ۱۰۰
روحِ طرافت۔ انگوٹھی کی معیبت اس کتاب کے اٹھ اداؤں میں سے ایک ہے جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھائے اپنے اوپر ظلم کیا۔ ۱۰۰
فل بوٹ۔ لڑکی کے باؤں میں بخت ایسا پھنسا کہ غریب کی دنیا ہی دل گئی، شادی ٹھہری کس تہی اور ہوئی کس سے! ۱۰۰
کمزوری۔ عورت کی کمزور نظرت سے شہر و مردے نچا کر فائدہ اٹھایا اور اُس کی زندگی برباد کر دی۔ ۱۰۰
روحِ لطافت۔ نہ ہمارائی کا خوب اسکا پہلا فساد ہو، ایسا حیرتناک فساد اپنے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیا ایک نگر و گلش۔۔۔ ۱۰۰
جنت کا بھوت۔ بہلی جنت میں شہرارت کی پتی تھیں، بھوت صاحب ناک میں دم کر دیا پھر کھڑکی سی صورت پیدا ہوئی مگر۔ ۱۰۰
دیکھ جا ایک گا۔ ایک لڑکی برتن مردوے عاشق ہو گئے تو دیکھا جائیگا صاحب کچھ فیصلہ ہی نہیں کر سکے، بالآخر یہ لے پایا کہ۔ ۱۰۰
ملفوظاتِ ثانی۔ گئے مرنے مرنے غریباں اور کمر بلیو جا اور انسانی زبان بولنے لگے، کیسی عجیب عجیب باتیں کہیں انہوں نے! ۱۰۰
تھو بیض۔ بی۔ اے پاس لڑکی کی شادی مسجد کے طاس ہو گئی یہ سمجھ کر زمین آسمان ایک جگہ ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ۔ ۱۰۰
قرض۔ بخت کو کاٹنے والی قیمتی کا نام قرض ہے، آپ نے بہت کہانیاں پڑھی ہوں گی ذرا اسکو بھی پڑھ کر دیکھئے۔ ۱۰۰
فرزندِ سرحد۔ سرحد کے باشندے عورت کی خاطر موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں، اُن ہی غیر تندرگوں میں سے چند کا ذکر ہو کہ۔ ۱۰۰
قدرِ وال۔ ہر مرنے والے ایک بہنوں اور ان کے خطرناک سالوں نے وہ وہ حرکتیں کی ہیں کہ بس حیرت ہے۔ ۱۰۰

دلی سے واپسی

رخصت لے دلی تری محفل سے اب جانا ہوں میں
یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسمان
تیرا دل و طہر کا چمچ ہیں میرے احساسات بھی
ریشم شیرازہ کہن ہندوستان کی آبرو
ذکر یوسف کا تو کیا کیجئے تری سرکار میں
معبود حسن و محبت بارگاہ سوز و ساز
جنتیں آبا و ہیں تیرے در و دیوار میں
محفل ساقی سلامت بزم انجم برقرار
یاد آئیگی مجھے بے طرح یاد آئیگی تو
کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
کتنے رنگیں عہد و پیمان توڑ کر آیا تھا میں
اک نشہ بن میں نے چھوڑا اک نشہ بن چھٹ گیا
دل میں سوزِ عزم کی اک دُنیا لے جاتا ہوں میں
جاتے جاتے لیکن اک پیمان کئے جاتا ہوں میں
پھر تری بزمِ حسین میں لوٹ کر آؤنگا میں
آہ وہ چکر دئے ہیں مگردشِ ایام نے
فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہوا ب

نوحہ مگر جانا ہوں میں نالہ بہ لب جانا ہوں میں
رہ چکے ہیں میری جولا نکا تیرے بوستاں
تیرے یوانوں میں گونجے ہیں مرے نغمات بھی
سرزمینِ حسن و موسیقی بہشتِ رنگ و بو
خود زلیخا آکے بکنتی ہے ترے بازار میں
تیرے تیخانے ہیں تیرے کلیسا و لنوار
اور تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں
نازنینانِ حرم پر رحمتِ پروردگار
عینِ وقتِ میکشی آنکھوں میں پھر جائیگی تو
چھوڑ کر غلہ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں
دلو از ان حین کو چھوڑ کر آیا تھا میں
ساز بس جھپٹا رہی تھا میں نے کہ گلشن چھٹ گیا
آہ تیرے میکدے سے بے یئے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
آؤنگا میں اور بہ اندازِ دگر آؤں گا میں
کھول کر رکھ دی ہیں آنکھیں تنہیِ آلام نے
زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہوا ب

اسرار الحق مجاز
بی۔ اے (علیگ)

سرسے باتک ایک خونیں راگ بن کر آؤنگا
لالہ زارِ رنگے بویں آگ بن کر آؤنگا

خیالات کی ہر تال

عزت نگر ایک چھوٹی سی محکومہ تھی۔ دلی ریاست تھی۔ اس کے حکمران راجہ صاحب کی سادہ زندگی اور عایا پردہ کی شنائی تھا۔ عوام اس کے جمہوری طرز نظام سے بہت خوش تھے۔ درہم میں سولے ایک نامزدہ کے باقی اپنی کی طرف سے باقاعدہ چنار کے ذریعہ نمایندہ ہو کر آتے۔ ریاست کی داخلی اور خارجی حکمت عملی اپنی کے ہاتھ میں تھی۔ انسانوں کا ایک بڑا گروہ اس دُنیا کے چھوٹے سے ٹکڑے میں خیالی زندگی بسر کر رہا تھا۔

راجگری کی ہوس انسانی دل میں خواہ مخواہ بغض اور حسد پیدا کر دیتی ہے۔ ایک قریبی ریاست کے مہاراجہ کے کانوں تک عزت نگر کی دولت اور زمینوں کی خبر گئی۔ اس کی نیت میں فرق آ گیا۔ ایک بڑی پھلی کی طرح اُس نے اسے ایک چھوٹی سی پھلی سمجھ کر ہرپ کر جانا چاہا۔ اپنی امارت اور عسکری طاقت کے بل بوتے پر اپنی اس بواہوسی کی تکمیل کے لئے اسے عزت نگر کے بے گناہ انسانوں پر غلبہ ٹھون مارا۔ ریاست میں خون کی ندیاں بہ گئیں۔ بوڑھے راجہ اور ریاست کی عزت کی خاطر جو انسانوں سے پہلے کٹ مرے۔ نوجوانوں کے گلے بھی خود داری کے جوش میں تیغ کی خونی دھار سے جا بیٹے۔ مہاراجہ کی بواہوسی نے بچے یتیم کر دیئے۔ مائیں بیوہ ہو گئیں اور کئی جوان لڑکے کاسہاگ لٹ گیا۔ راجہ رانی کے ناکہاں قتل سے ریاست میں اور ابتری پھیل گئی۔ چند خود غرض وزیروں نے نئے راجہ کی اطاعت قبول کر لی۔ مہاراجہ نے ان پر ریاست کے خزانوں کے منہ کھول دئے لیکن عوام پر بغاوت کا الزام دے کر استبداد کے آخری ترکش ختم کر دیئے انہوں نے مجبوراً پیٹ پالنے اور فائدہ کش جہوں کو زخموں سے بچانے کے لئے جبری اطاعت قبول کر لی۔

دن گزرتے گئے۔ عزت نگر پر مہاراجہ کا فرضی تسلط قائم ہو گیا۔ مطلق العنان مہاراجہ اور اُس کے حواری مغت ہاتھ آتی دولت اور عیش کے نشہ میں غمور تھے۔ امراء کو ہاتھ میں رکھنے کے لئے اپنی ہر قسم کی مراعات دی گئیں تھیں۔ کارخانوں کی ملکیت کی وجہ سے وہ ریاستی تجارت کے اجارہ دار تھے۔ ذاتی رُسوخ کی وجہ سے اعلیٰ عہدے اور ریاستی وظائف انہوں نے اپنی ذات اور اولاد کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ اس طرز نظام کا اثر یہ ہوا کہ چند ہی سال میں اوسط طبقہ کے لوگ مفقود ہو گئے اور عزت نگر مطلق العنان امراء اور غریب عوام سے بھر گیا۔ نوکری مزدوری، معمولی کاشتکاری بس ہی کچھ ان کی زندگی کا ذریعہ معاش تھی۔ وہ اپنے شہر میں خود کو غریب الوطن تصور کرنے لگے۔ امراء کے ظالم ہاتھوں نے ان پر رفتہ رفتہ زندگی کے دروازے بند کر دیئے۔ اپنی زندگی ایک بار معلوم ہونے لگی۔

عوام غمگین گری ہوئی حالت پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے کہ ان کے مقبوم میں ہی الگ ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی نہیں کر سکتے۔ غلامی اب ان کا پیشہ ہو چکا ہے۔ امراء الگ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھے انہیں صورتِ حال کو خیال میں لانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ سرمایہ داری انسانی ذہن سے غور و فکر کا مادہ چوس لیتی ہے۔

خیالات پریشان عزت نگر کی بالائی فضا میں چکر لگا رہے تھے۔ ترقی پسند خیالات کی پرواز اور بلند تھی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اُمراء اپنی انتہائی تعیش پسندی اور عوام اپنی انتہائی بے چارگی کی وجہ سے اپنی حالت سے بے خبر ہو چکے ہیں جیسے انہیں ہماری ضرورت ہی نہیں رہی۔ اُمراء تو آسودہ حالی اور عشرت کی وجہ سے بے خبری میں ہیں لیکن عوام کے دل میں احساس کیوں مُردہ ہو چکا! ہمارا فرض ہے کہ ان کے دل میں احساس کی چٹکاری پیدا کر کے دامن عشرت کو جلا دیں۔ فیصلہ ہوا کہ چند منٹ کے لئے ایک ہڑتال کی جائے کوئی معمولی سے معمولی خیال بھی کسی ذہن میں داخل نہ ہو اور اربان کو بالکل ایک کاغذ کی طرح کو را کر دیں۔ ایک بڑا اجتماع ہوا اور فضا میں ہر نوع کے ترقی پسند خیالات جمع ہو کر اپنا رُوح پرور پیغام عوام کے عاقبت اندیش کاؤں تک پہنچا دیں۔ ان کا یہ مظاہرہ نئی نوع انسانوں کے ایک مفلس طبقہ کو سر پایہ داری کی قید سے نجات لایا۔

چونچہ

— آن کی آن میں خیالات جمع ہوئے شروع ہو گئے۔ باہمی مشورہ نے فضا میں ایک ہتھیاریت پیدا کر دی۔ آزادی خود داری اور مختلف نوعیت کے ترقی پسند خیالات نے بیک آواز فضا میں گونجنا شروع کر دیا۔ ”ہمیں ملے لو! انسانوں میں لے لو۔ ہم مظلوم انسانوں پر زندگی کے دروازے داکر دینگے۔“ آزادی، اولاد آدم کا پیدائشی حق ہے اسے مت رچھن چلے دو۔ تم اپنے سینوں کو اپنی آرزوں کا دفن کیوں بنے دیتے ہو۔ سینے تان لو اور خود ہی تمہارے اندر زندگی کی رُوح پھونک دی جائے گی۔ ہمیں ملے لو اور رُوح آزادی تمہاری غلام ہے۔“

اس قسم کی گونج نے فضا میں ایک کھلبلی مچا دی۔ خیالات کی ہڑتال کی وجہ سے لوگ جو چند منٹ تک بالکل چلتے پھرتے پتلیوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے اب اس گونجی ہوئی آواز کو سن کر ٹھٹھک گئے، مظلوم انسانوں نے اسے پیغام رحمت سمجھا اور اُمراء نے بدشگونی سے تعبیر کیا۔

مظلوم عوام کو اپنی ذات کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے منظم ہو کر اپنی قیمت بدل دینے کا تہیہ کر لیا۔ اُمراء — یہ خود بخود بھڑپنے عوام کو بھڑپوں کا گلہ سمجھے بیٹھے تھے۔ اس لئے ہتھام میں غل پیدا ہوتا نہ دیکھ سکے۔ امیر و عزیز کی خواہو کہدورت کا چہرہ رخ روشن ہو گیا۔ عوام نے جائز حقوق کا مطالبہ کیا۔ اُمراء کی آہنی گرفت انہیں کھینچنے کے لئے تیار ہو گئی۔ سنگے پاؤں اور سینے ننگے کئے عوام سخت دل اُمراء کے عیش و عشرت کے راستے میں دیوار کی طرح حائل ہو گئے۔ وہ اب زندگی کی تنگ شاہراہ سے ہٹ کر کھلار راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اُمراء نے روکا اور ان کے ٹخنوں سے ہولی کھیلی۔ عزت نگر میں موسم گل لالہ سمیٹا ہو گیا۔

ایام نے پٹا کھایا۔ عوام کے خون ناحق کو رنگ لانا ہی تھا۔ بے سرو سامان انسان اپنے نیک ارادے میں کامیاب ہو گئے۔ انکی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور انہوں نے اُمراء کو جو چونک کی طرح جھٹ کر ان کا خون چوس رہے تھے دُور اٹھا پھینکا۔ اُمراء کا رکھنا تھا کہ عزت نگر کی باگ دہستی انسانوں کے ہاتھ میں آگئی اور اب اس زرخیز ریاست کی آمدنی سے سُن غریبوں کی دال روٹی کا سامان ہونے لگا جو فتنے کاٹ کاٹ کر اس طرح مڑجھاتے تھے جیسے زندگی نے انہیں اپنے سے کوسوں دُور پھینک دیا ہو۔ عزت نگر ایک بار پھر اہلہا نے لگا۔ ترقی پسند خیالات نے ایک راضی جہنم کو جنت سے بدل دیا۔ (خواجہ حسن عباس اُبی نے)

چونچہ

تعارف

میں ایک گل صحرائی ہوں، میں سبزہ بیگانہ ہوں
شیدا ہوں خود اپنا ہی میں، اپنا ہی میں پوانہ ہوں
دنیا مجھے سمجھے گی کیا، میں خوابوں فسانہ ہوں
میرا وجود آئینہ دارِ جلوہ صبح و مسا

————— ❦ —————

گر ویدہ جوشِ گل ہوں، قالبِ جانِ عمل
شہرت کی قلت ہو مگر تشہیر میں وقت نہیں
شہرتِ نفرت ہے مجھے شہرتِ مری دولت نہیں
مجھ میں ہے شانِ زندگی، مجھ میں ہو امکانِ عمل

————— ❦ —————

میں سبزہ بیگانہ ہوں، برگِ گل آزاد رو
میں گل کا ایسا جزو ہوں، ہیں خود چوکنا زئیر
مجھ میں فروغِ کھفت ہو، قائم ہیں مجھ میں شورشیں
قائم ہیں مجھ میں شورشیں، قائم ہیں مجھ میں سازشیں
پنہاں میں کچھ حسنِ ازل کی مجھ میں ایسی تائشیں
سرگرمیاں میری نہیں گی نازشیں تہذیبِ نو

————— ❦ —————

فرحت کا پوری

————— ❦ —————

تعریفِ میری کچھ نہیں میرا تعارف کچھ نہیں
کچھ جدوجہد کی بنا پر ناز میں کرتا نہیں
کچھ شان و سطوت کا بُزرگوئی مجھے غرا نہیں
اپنے سلف پر فخر یا وجہِ تافت کچھ نہیں

————— ❦ —————

رنگیں لطافت سے مری گلِ زندگی مہر ہے
آزادیوں کے جنگلوں کی مجھ کو رغبت بہت
فطرتِ میری فطرتِ عالم کو نسبت بہت
ہمیشیوں سے خود مری ہر شے یہاں مغمور ہے

————— ❦ —————

ذکرِ سلف و دنیا میں دنیا کا تعارف سادہ ہے
گو میں نے یہ مانا کہ ہوں چشم و چراغِ خاندان
گو میں نے یہ مانا کہ ہوں میں اقتدار و دواں
لیکن مجھے کب خاندانی سطوتوں پر ناز ہے

————— ❦ —————

خوشبو مری ہر سوداں، مثلِ شبنم جانِ فدا

مزدور کا بیسٹا

جتن : باقری! آج مجھے بہت جاں لگ رہا ہے تھوڑی دیر کے لئے رضائی مجھے دید و دم لوگ یہ ٹاٹ اڑھ لو؟
 بدھنی : تمہیں جا رہا لگ رہا ہے تو میں کیا گھر کی لگ رہی ہے کہ رضائی تمہیں دوسرے ٹاٹ کو دہرا کر لو اور دونوں گھٹے ہیٹ سے لٹکھو جاؤ گا کہ ہو جائے گا؟

جتن : پیر کا سید سے کسے پڑا ہوں کہ موٹوں! اکبر سے ٹاٹ سے تو دن کھلا رہ جاتا ہے۔ دہرا کر دو گھا تو پھر ساری جان سکڑ جائیگی۔
 بدھنی : اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اس کو ٹھکڑی دو کھڑکی کے کوڑا خازنہ۔ ہوا آتی رہتی ہے جا رہا نہ لگے تو کیا ہو؟
 جتن : پھر دوں تو پھر جاؤں کہاں۔ ایک روپیہ مہینہ بڑھ کر ٹھکڑی کہاں لے گی۔ اور پھر اتنا سیدھا مالک۔ مہینے کی جس تاریخ جی چاہا دے۔ دوسرے تو ہر مہینے دینگی وصول کر لیتے ہیں؟
 بدھنی : سہنی ہی تو ٹھکڑی ہے تب ہی تو مالک کی یہ مہرانی ہے۔ ہم مجھے جاؤں گے تو پھر اس میں کون رہیگا۔ بڑا سیدھا مالک ہے تو کیوں نہیں جا کر کہنے کے کہہ کر کے کوڑا غائب ہیں؟ انہیں لگو اور۔
 لگاؤ سے تو جاؤں کہ بڑا سیدھا مالک ہے۔ ہوا خور مل میں ٹنگ پڑا کر سوتا ہے۔ لئے کیا معلوم کہ ہم پر اس جاڑے میں کیا لگدڑی ہے اس ہینے جب باقری پڑا تھا اور سارا یہ دو اور دن میں لگ گیا تھا اور تم مہینہ بھر کرایہ نہ دے سکتے تھے اس وقت گھر سے کوڑم نہ آیا۔ اگر تم دھاک لیکر کرایہ نہ چکاتے تو شاید گھر سے نکال دیا جوتا میرا میں پلے تو مرنے کا نہ بیچ لوں؟

جتن : باقری! تم سچ بڑی نیریز مزاج ہو تم غریب ہیں ہمیں امیروں کی شان میں اس طرح نہ بولنا چاہیے۔ امیروں کی بدولت تو ہماری روزی ہے۔ اگر امیر نہ ہوں تو پھر میں کام کہاں سے لگاؤ رہتی کیڑہ لے۔ خالص صاحب کے ہی تو آخر ہزاروں خرچ ہیں۔ ان کو ٹھکڑیوں کے کرایہ کی کمی تو ان کی اصلی آمدنی ہے۔ کرایہ نہ ملا کر سے تو پھر ان کا خرچ کیونکر چلے۔
 بدھنی : اچھا تمہیں امیروں سے بڑی آس ہے تو اچھی شادی کیا کر دے ان کی بیٹی سے چلا کر دو تمہارا ہی اہل ہوتا نہیں مانتی میرا سے اب لوہے کے کہاں بہتر ہو گا۔ دوسرے کہنے میں وہ نہیں

بچہ بچا رہا تھا۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ موسے کو ترس نہ آیا اور کرایہ لیکر چھوڑا ایک روپیہ کے لئے کوٹا اس کا کام اکٹھا رہا تھا۔ بیٹے کے بیاد میں سینکڑوں روپے خرچ کر چکے تھے اور ہم کو ایک روپیہ معاف کر دیے ہیں اس کی جان چلی جاتی ہے۔
 جتن : تم بات سمجھتی نہیں۔ اپنی ہی کہے جاتی ہو۔ بیٹے کے بیاہ میں خالص صاحب اگر پورا نہ خرچ کرنے تو لوگ انہیں کیا کہتے؟ سب جانتے ہیں کہ خالص صاحب بڑے آدمی ہیں۔ روپے والے ہیں۔ بڑے آدمی کی ایک عزت ہوتی ہے جسے نبھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا ضروری ہے۔
 ورنہ ان کی بڑی دنیاوی ہجوم اگر ٹاٹ بیاہ میں کسی کو نہ ملتا تو کوئی الزام نہ دے گا۔ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنا پیسہ ہی نہیں ہے۔ لیکن خالص صاحب اگر کسی کو نہ ملتا تو لوگ انہیں ملنے دے دے دیکر ان کو کہتے سمجھیں اصل بات یہ ہے۔
 بدھنی : سہنی! کیا آج سوؤ گے نہیں۔ ابھی تو سردی لگ رہی تھی اب خالص صاحب کی تعریف میں یہ باتیں کیسے بکھنے لگیں؟
 یہ خوب سیاں ہوئی اسی طرح کی باتیں کہنے کرتے سونگے جتن اور حیدر علی کا ایک مزدور تھا۔ دن بھر محنت کرتا تو پانچ آنے پہنچے ملے تو وہ بھی کام نہیں لے، ورنہ دو دو دن ایک مہینہ نہ حیدر ہوتا۔ دو میاں پوری اور تین بچوں کی پرورش۔ اس پر ہر ماہ ایک روپیہ کو ٹھکڑی کا کرایہ۔ مشکل سے یہ بیچاے جسم و جان کا رابطہ قائم رکھ سکتے تھے۔
 سردی لگنے کے کی بھی لیکن دو ہزارے ٹاٹ اور ایک برسیدہ گہنے رضائی کے سوا جس میں خلعت رنگوں کے بڑے زاشام کے گہنے انسان پر شفق کی رنگا رنگی کی مضحکہ خیز نقالی کر رہے تھے، ان کے پاس کوئی دوسرا اور حنا نہ تھا۔ کو ٹھکڑی دس فٹ مربع سے زیادہ نہ ہوگی۔ اسی میں ایک طرف ایک گرو سے آئی ہوئی چٹائی پڑی تھی جس پر سارا خاندان سو یا کرتا تھا۔ دوسری طرف ایک چوہا بننا ہوا تھا جس کے دھوویں نے ماسے کی دیوار اور چھت پر آجوس کا ٹوٹا ہوا رنگ تھا جس کا ڈھکانا قبضوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اسی پر کچھ جٹ کھڑی تاجپتی کی رکابیاں اور چند پیالے رکھے تھے جنہیں بچے کھڑے تھے۔
 سے اب لوہے کے کہاں بہتر ہو گا۔ دوسرے کہنے میں وہ نہیں

میں نے دیکھا کہ وہاں پر ایک بڑا بڑا گھر تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک
کچن کی گودن کی صورت دیکھ کر گویا مجھ سے تعلق نہ رہا۔
میں نے سوچا کہ اس گھر میں ایک ہی ساتھ کون سی کچن تھا اور چوڑا
کچن کھانے کے کلاسوں کی تنہائی پوری کر رہا تھا۔
میں نے سوچا کہ یہ کائنات۔

ایک جہنے سے مرزا صاحب مصور کے مکان میں کام
 لے کر دوزن اس کے ساتھ آ کر تہا۔ مرزا صاحب سالانہ
 تصویر بنانے کو بھیجی تھی۔ وہ ہر غائب میں تصویر بنا کر کچھا
 تاکہ ان کی تصویریں انعام نہ حاصل کر سکیں۔ وہ
 یہی دعوہ میں تھے کہ اس دفتر تصویر کے لئے

یہ جیسا ہے غریب سے پہلے کام ہو گیا
 حق کے لئے مرزا صاحب کی یہ ہمدانہ شہنشاہی
 تھی۔ اُس کی انھیں تکڑے بچے کی طرف متوجہ تھیں۔
 نرم بگلز برون کے لئے نکلن و مرت کا ایک دفتر ہے۔
 وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ غریبوں کو جو رکھیاں دینی اور
 سائیاں ہے اور اگر کوئی امیر اپنے اس حاسن حق کی تحسین میں
 ہے تو غریبوں کے نزدیک وہ نہایت انحصار و حرقت سے کام
 لیتا ہے۔ ایسے ہی احساندہ کی عذوبہ سے متاثر ہونا تھا۔

مخصوصہ کی ہیراتی۔ لیکن اس سے اس کی عادت بگڑے گی۔
جتنے نے کہا۔

باقر مرد و زو اب کے ساتھ مرزا صاحب کے گھر پہنچے
 صاحب کے اپنے سامنے کمر لگاتے گھنٹوں میں وہ گھنٹا
 بناتے رہتے اور پھر اسے چھٹی دیدیتے۔ لیکن مرزا صاحب
 باپ کا کم کوڑا ہوتا۔ باقر اس کو اس سے اپنے ہاتھ سے
 قلم اور پکے کچے رنگوں سے کاغذ پر نقاشی کرتے
 جن وقت مرزا اپنے سامنے کمر لگاتے کہ مرزا صاحب
 سہ پہر باقر رحمتی لگا کر مرزا صاحب کے سامنے
 رہتے تھے اس سے پہلے مرزا صاحب کے سامنے

نہ رہی۔ ایک فطری نظام تعلیم و تربیت کا متبع نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت صرف ایک ایسے ماحول کی ہے جو اس کی صلاحیتوں کو محرک کرے کہ ان کے اظہار میں معاون ہو۔ دنیا کا کوئی مائے نازار کشت کسی فنی ادارہ یا تعلیم گاہ نے پیدا نہیں کیا بلکہ عموماً اس کی فطاری سے دُعا و فضا آٹھ جیا ہوتی۔ مرزا خود کو فنی باکمال مصور نہ تھا لیکن آٹھ کی تیر ضرورت تھی۔ باقر کی غیر معمولی صلاحیت اس کی مرکز توجہ بن گئی اور اس نے ایک خاص مقصد کے تحت باقر کو اسکی صلاحیتوں کی نشو و نما میں پوری امداد پہنچانی شروع کر دی۔ اس نے اپنے برٹش اور رنگ باقر پر بھی ہونے نہ دیا۔ باقر کی بنائی ہوئی تصویریں پر اس کے سامنے وہ صرف مسکرا دیا کرتا جس طرح بچے جب اپنے سے بڑوں کی حرکات و سکنات کی ناکام نقلی کرتے ہیں تو بچے ان پر ہنس دیا کرتے ہیں۔ لیکن باقر کی صدمہ موجودگی پر وہ ان پر عمل غش کرتا اور اس خیال کے تصور سے خوش ہوتا کہ باقر کے کمال سے وہ ایک دن فائدہ اٹھا سکے گا۔

مرزا کی تصویر مکمل ہو گئی اور اب اُسے باقر کی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے اس نے باقر کو ایک دن نہایت ہمدردانہ مشورہ دیا کہ اُسے اپنے باپ کے روزگار میں لگ جانا چاہیے تاکہ وہ مزدوری کے کاموں میں پورا مشاق ہو سکے اور جوان ہو کر کتے بے روزگاری کا مزہ نہ دیکھنا پڑے۔ اس مشفقانہ تہدیب کیساتھ انہوں نے باقر کو اپنی طاعت و عبادت سے علیحدہ کر دیا لیکن ساتھ ہی اُسے اجازت دیدی کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں ان کے یہاں پرانے گا کہ مرے اور ان کے مصور بننے کے سامان سے دل پہلایا کرے۔ باقر اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتا تھا۔ تصویر بنانے سے اُسے کوئی فائدہ تھا نہیں، باقر کو سناں کا طمہ تھا اس کی پروا۔ وہ تصویر صرف اس لئے بناتا تھا کہ تصویر بنانے میں اس کا فنی ہر دھڑکے کام سے کہیں زیادہ لگن تھا اور اس دوران میں جو لطافت و انبساط اُسے حاصل ہوتا تھی وہ مسکراہٹ کام میں اُسے مستغرق ہوتا تھا۔ یہ سہرور ہی اس کا نظام تھا اور ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح وہ اس کو زیادہ سے بے شمار تھا۔ تصویر بنانا کہ وہ انہیں مرزا کے اسٹوڈیو میں لے جاتا اور وہاں انہیں کٹ کر بھی نہ دیکھتا اس لئے کہ اس کا چہرہ کھنکھرتا ہوا ہوتا تھا۔ اُسے اپنے لئے بے چینی دیکھتا تھا۔

نہیں ہوتی۔ اس کا آٹھ اُس کی تخلیقی فطرت کا اظہار ہو کر تاسا ہے جو ہمیشہ مشتعل و فتنہ انگیز رہتی ہے، اس نے اگر وہ اپنی آٹھ کی تکمیل کے بعد اس سے خطا اٹھائے میں اپنا وقت گنوائے گا تو اس کی اس فطرت سیال کا عمل رُک رُک کر ہرے لگے، جو قطعاً ناممکن ہے۔ یا اگر وہ اپنے آٹھ کو اپنا کمال فن تصور کرے تو اس کی اس فطرت کی نمود کی کوشش یا یہ تکمیل کو پہنچ جاتے اور اس کی تکمیل اس کی آٹھ کی زندگی کا خاتمہ کر مے۔ اپنے آٹھ کی قدر شناسی صرف ایک دنی اور بے کار آرٹسٹ کر سکتا ہے جبکی فنی صلاحیت فطری نہیں بلکہ صرف انکسائی ہوا کرتی ہو۔

مرزا نے باقر کو اپنی طاعت سے صرف اس لئے بطون کیا تھا کہ وہ اپنی سوسائٹی سے علیحدہ نہ ہو جائے اور اس کی سامانی دینے سے چھوٹ کر کم لگجی کے دھتور سے پاک ہو کر مرزا کا حریف نہ بن سکے اور اسے اس طرح اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامیابی نہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ باقر اسی تاریکی و محرومی کا شکار نہ ہو جو اس طبقہ کا فقر امتیاز ہے جس میں وہ پرورش پایا تھا وہ بھی اس طبقہ اعلیٰ کا آلہ کار بنائے۔ باقر فرصت کے اوقات مرزا کے اسٹوڈیو میں گزارا کرتا۔ اس کی تصویریں کے موضوع عموماً اس کے اپنے ماحول سے منتخب کردہ ہوتے۔ وہ ایک فقیر کی تصویر بنانا تھا ہر روز شام کو مرزا کی دوکان کے سامنے سے گزرا کرتا تھا۔ مرزا عجیب سی سے تصویر کی تکمیل کا نظر تھا۔ یہاں تک کہ تصویر مکمل ہو گئی۔

”یہ کیا کرتے اس بڑے کی تصویر بناتی ہے! اسی سے فنی ہوتی معلوم ہوتی ہے؟“
تصویر کو دیکھتے ہوئے مرزا نے بیادنی الفاظ میں باقر سے یہ سوال کیا۔ باقر کو انکی فیر کہاں تھی کہ مرزا کی شکل کا تصور کھلا بن اس پر ظاہر ہو سکتا۔

”جی ہاں، اس نے بے اثری سے جواب دیا۔ اور تصویر پر آخری برش پھیرنے لگا۔ مرزا تصویر کے فنی کمال سے خود تصویر چیرت بن رہا تھا۔ تصویر میں زندگی کی جھلک تھی۔ حیات کی حقیقتیں مجھٹھا فقیر دست سوال بڑھاتے اپنے بوں کو تصویر میں لگاتار دیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مرزا کی اپنی بنائی ہوئی تصویر خود اس کی نظر میں اودنی معلوم ہوتے تھے۔ یہ میری تصویر کیا خاک کا لٹا ہوا حاصل کر سکے گی، تصویر بننے کے لیے ہی۔ اس نے اپنے فنی کی قدر

جانتے اپنی تصویر کے باقر کی بنائی ہوئی تصویر کو نماش میں بھیجے گا فیصلہ کر لیتا۔

اُس نے بے ٹکٹ لگتے پہونچے کا فیصلہ کر لیا اور اسٹیشن پہونچ کر پٹکے سے ریل کے ڈبے میں کھس گیا۔

گارشی انسٹول سے روانہ ہوئی کہ ایک ٹکٹ الٹ پکڑ دے یہیں داخل ہوا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی باقر کا خون خشک ہو گیا۔ اس کے پٹکے ٹکٹ چاہتا اُس سے قریب بھی پہونچا اور اس نے ٹکٹ طلب کیا۔ اس نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا "میرے پاس ٹکٹ کو مجھ نہ تھا" وہ خوف سے ہٹا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ طریم قرار دیا جا رہا تھا۔

تو پھر گاڑی کی کیا تھا ہے باوا کی ہے جب بے ٹکٹ چڑھ گئے۔

آٹو کا پھانچا ہوا ہے ساتھ چلوئے ٹکٹ اب پکڑنے دانت پیتے ہوئے

کہا۔ بلاشبہ اس کے غضب و خضب کے اظہار کا یہ نہایت مناسب

موقع تھا! اس ننگے بدن والے کینڈا انسان نے حرکت ہی ایسی کی

تھی! خواہ واقعات نے اسے جو روپ ہی کیوں نہ کر دیا تھا۔ اور پھر جرم

و گناہ تو اس طبقہ کا پیشہ ہے۔ انہیں قرار واجب مزا دینی طبقہ اعلیٰ

کا کام ہے ورنہ عائد اس کے امن و امان میں خلل پڑ جائے طبقہ

اعلیٰ کا یہ احسان ہے کہ اُس نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے رکھی ہے۔

بلاشبہ ہنر میں طبقہ اعلیٰ کے افراد سے بھی ہوتی ہیں لیکن اُن کی

نظر میں جرم نہیں کبھی جا سکتا اور نہ قانون و انصاف کا ان پر اطلاق

ہو سکتا ہے۔ اس نے کہ اگر انہیں اپنے عمل و کردار میں اترا دی تو پھر

تو وہ طبقہ ذاتی میں آجے ہو جائیں اور پھر ان کی گرفت کرے والا کوئی

نہ رہے۔ غالباً ای نظریہ کے تحت اس کے پٹکے غریب مسافروں سے نہایت

سستی سے پیش آتا اور ان کے محلے میں ریلوے ایکٹ کے دفعات کی

حرف بھرت ہر دی کرتا۔ ان کو ایسے کردار کی مزاحمت دیکھتی چاہیے!

لیکن وہ خود کو کبھی اخلاقی پابندی سے آزاد سمجھتا تھا۔ اس سے

باجر وں سے رشمت اور ریلوے باؤس کے سامان کی چوری میں

لے کبھی کوئی تامل نہ ہوتا۔

باقر نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اس کے پٹکے ساتھ ریل کے

ڈبے سے اتر گیا۔ وہ ریلوے پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ انہیں نے

اسے حالات میں بند کر دیا۔ پچھلے اس نے بے ٹکٹ ریل میں چڑھ

جائے تھا ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن کیا اسے اپنے جرم

سے مجبور ہو کر اس پر کیا تھا؟ کیا اُس نے یہ حرکت فائدہ کشی و فحاش

پانے کے لئے نہ کی تھی؟ پھر اس پر جرم کیوں نہ کیا گیا؟ وہ کچھ کہہ

نہ سکا۔

مرزا کی تصویر "بھانفیر" نمائش کے مقابلے میں اول قرار دی گئی

مرزا کو باغی ہزار روپے انعام میں ملے لیکن ان میں سے ایک میرے بھی باقر

کا حق ہے تھا۔ مرزا کا نام سارے ہندوستان میں ایک بالکل مصدقہ

کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ آرٹ کے رستوں نے اس کی تعریف

میں ہی ملی تھی عربی شائے نہیں لیکن ان میں کا ایک لفظ بھی باقر کیلئے

نہ تھا۔ کیوں ہوتا؟ باقر ایک ادنیٰ طبقے کا فرد ہو کر اس حسین و ستاکر

بال کیوں نہ ہو سکتا تھا! ایک عجیب تھا کہ یہ تصویر اگر نماش میں

باقر کے نام سے جاتی تو بھل اس کے کہ مجھ تنقیدی نگاہ ہیں اس پر

چڑھ سکتیں یہ نماش میں رکھے جانے کے قابل ہی نہ قرار دی جاتی۔

ایک بچہ طبقے کے انسان کو آرٹ سے کیا واسطہ۔ اس کا کام تو اعلیٰ

طبقہ والوں کی ادنیٰ ضروریات ہم پہونچانا ہے۔ اپنی بلند ضروریاتوں

کے سامان وہ خود دیتا کر لیں گے۔

مرزا ای طرح باقر کی بنائی ہوئی تصویریں نماشوں میں بھیج

دیکھ کر دولت و شہرت کے انبار جمع کر رہا تھا اور باقر ایک غریب مزدور

کی حیثیت سے تنگ حالی و محنت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا باپ غنا

میں سے مر گیا اور غنا خان کا سا مال بوجہ باقر کے مر چکا۔ زندگی کا بوجہ

اس کی پڑھتی ہوئی جوانی کو دبا دے جا رہا تھا۔ اُس کی بڑھتی مایں زیادہ

پرانی ملک اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا خاندان

تشت ہو گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی روزگار کی تلاش میں اور ہر ادھر

کے لئے کام کی دہرا دہرائی سے سارے روزگار باندھ کر دے گئے۔

اسے پتہ نہ تھا کہ کوئی کام نہ ملنا۔ خالصتاً صاحب کار کی یہ بات کا دینا تھا۔ وہ

بے پرواہ طور پر خالی کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ آخر ایک دن

انہوں نے اسے کوٹھڑی سے بھجوا دیا۔ باقر نے پچھن سے زندگی

اس کوٹھڑی میں گزار دی تھی۔ کوٹھڑی کی حفاظت سے بہت شاق

تھی لیکن مجبور تھا۔ بے یار و مددگار کوٹھڑی سے نکل گیا۔ سامان جو کچھ

خاندان صاحب کے آدمیوں نے اس پر جمع کر لیا۔ باقر مینوں سے

بے پرواہ گدی سے گھبراہوا تھا اور باقر شہر چھوڑ کر نکلتے جا چکے

تھے۔ اس وقت وہ قطعاً آزاد تھا۔ لیکن اس کے پاس ٹکٹ

کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ مرزا سے سوال کرے لیکن وہ جانتا

تھا کہ مرزا اسے اسٹے روپے نوٹ دینا کہ ٹکٹ کو کافی ہوں۔ اس نے

رہے قانون کے مطابق باقر کو چھ ماہ کی سزا ہوگئی قیدیوں کے ساتھ کی زندگی میں شروع شروع میں کچھ کچھ معلوم ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا۔ اس کے گرد وہاں مختلف طور کے انسان تھے لیکن زیادہ تر ایسے جن کا تعلق اس کے طبقہ سے تھا۔ یہ سب زندگی تو رکھتے تھے لیکن ان میں زندگی کی کوئی علامت نہ تھی۔ ان پر عجیب بے بسی و جبر و کمی کیفیت تھی۔ اس طرح کی بے بسی ہی اس پر تک کو ہوتی ہے جو مروجوں سے جھک کر ٹھک جاتا ہے اور بیہوش و ساکت کنارہ پر لایا جاتا ہے جس کا دماغ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے حواس مردہ نہ لے اپنی اس حالت کا کوئی احساس نہ رہتا ہے۔ اس کشاکش کی یاد جس میں وہ مبتلا تھا۔ صرف سانس کی آمد و رفت اور قلب کی حرکت سے اس کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی نہ کچھ سوچ سکتے تھے نہ کچھ سمجھ سکتے۔ نہ یہ بھی اس پر غور کرتے کہ وہ کیوں جرائم کے مرتکب ہوتے۔ نہ اس پر کہ ان کی سزا پائی کسی حد تک حق بجانب تھی۔ قید خانہ کی زندگی میں ان کے لئے کوئی نئی نہ تھی۔ وہ یہاں بھی وہی کیسی سیکھ کر کی نیند سوتے یہی نہیں تبدیلیاں سے باہر میسر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی زندگی کے دو لاڑ ایسے تھے ہیں۔ ایک وہ میں میں وہ جرائم کرتے اور دوسرا وہ جس میں وہ سزا بھگتتے۔ ان کی زندگی کا نہ کوئی نصب العین تھا نہ کوئی مقصود۔ وہ جرائم کے حربہ اس لئے نہیں ہوتے تھے کہ انے ذریعہ مال و دولت جمع کریں بلکہ اس لئے کہ ان کے جرائم ہی انہیں مصروفیت مل سکے تھے۔ ان کے سامنے کبھی بھی ایسی خاص لاشعور عمل تھا جس کے حصول کی ناکام کوششوں نے انہیں تھکا کر جوڑ کر دیا تھا۔ وہ بھی اپنی زندگی کے سیلابات ابھر کر ہر پہلے کی کوششوں میں سرگرم تھے۔ ان کی کاوشیں بار بار کامیاب ہوتی نظر آتیں۔ ان کے ہاتھ کھانے کو کی بار بار چھوٹے تھے لیکن وہ بھٹکانی چاہتے تھے کہ ان کے دل بھرتے ان کا ہاتھ بھرتے کہ انہیں دے دے کہ کچھ مروجوں کے منہ میں گرا دیے۔ یہاں تک کہ ان کی مقابلے کی ساری طاقتیں نال ہو گئیں۔ ان کے دل و دماغ قطعاً معطل ہو گئے۔ وہ یہاں تک ہی زندگی گزارتے تھے۔ نیک و بد کی تیز کی لان میں صلاحیت نہ رہی بلکہ وہی کا ان پر تسلط قائم ہو گیا اور ان کے ذوق عمل کی تسکین و جذبہ و تعلق کی بنا کر وہ اصولوں کی توہین سے ہونے لگی۔ انکی گفتگو کا مرکز تو ان کے اپنے جرائم کے کارنامے سے ہوا کرتے تھے۔ ان کی زبان کو تو انہیں یہ تصور نہیں کیا کہ اس کے جرائم کا اثر بار بار ان کے سامنے آتا ہے۔ وہ ایسے بے احتیاط ہیں

آئندہ متبادل ہونے کا جھوکرتے۔ تو انہیں مروج و دوسرے کہہ مشق حاصل پیشہ آستانوں کے شاہکاران کی زبانی سنا کر ان سے استفادہ حاصل کرتے۔ باقر کو ان کی سستی خیر دانتا میں وجہ ضرور معلوم ہوئی لیکن اس کی تشو و نا ایک ایسے معصوم حامل میں ہوتی تھی کہ ان کے ہمیشہ ہونے کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں جگہ نہ پاتا تھا۔ وہ دہلے طرح طرح سے اس کی ترغیب دیا کرتے۔ اکثر جب وہ ان کی بے ربط گفتگو سے ٹھک جاتا تو ان سے علیحدہ ہو کر ایک تنگنا میں انھیں لیتا اور زمین پر مختلف نقش و نگار بناتے تھا۔ اس وقت وہ اپنے حائل کو قطعاً بھول جاتا اور ذہنی طور پر زم کے اسٹوڈیو میں منتقل ہو جاتا۔ زمین پر وہ اسی سرگرمی و انہماک کی تصویریں بناتے تھا جس طرح وہ اسٹوڈیو میں بنایا کرتا تھا۔ رنگ اور کینوس سے محروم وہ اسے احساس تک نہ ہوتا۔ اس کا تخیل طرح طرح کے رنگ اس کے سامنے پیش کرتا۔ اسٹوڈیو کے رنگوں سے کہیں زیادہ انعام کے۔ اور وہ زمین کے پھیلے ہوئے کینوس پر اپنے جذبات تخلیق کی پوری تسکین کرتا رہتا۔ ایک فطری فنکار کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار میں کامل آزادی حاصل ہے اس لئے کہ وہ اپنے کرد و نواح سے بے نیاز ہو کر کبھی انہیں بروئے کار لا سکتا ہے۔ اس کی فنکاری اس کی اپنی تسکین کے لئے ہوتی ہے نہ کہ دوسروں سے دامن طلب کرنے کے لئے۔ پھر اسے کوئی حاجت نہیں کہ اپنی فنکاری کا اظہار مادی طور پر کرے۔ دوسرے قیدی زمین پر لکھیں پھینکتے دیکھ کر اسے کچھ حلیا بھیجے گئے تھے۔ وہ اکثر اس کی مطویت میں مل جھولتے۔ کبھی اسے لکھ کر اپنے جرم میں لے آتے اس وقت اس کی روح کو سخت اذیت ہوتی اور اس کا بے رنگ اور اداں پھر وہ اس کیفیت کی ترجمانی کرتے لگتا تھا۔ قیدیوں کو اس کی تیز کہاں ہوتی۔ وہ طرح طرح سے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور باقر اپنی محسوس ہی اپنے دل میں چھپاتے رہتا۔ قیدیوں میں ایک سے باقر کی دوستی ہو گئی تھی۔ یہ ایک اداں جو کما آدی تھا جو حالت نشہ میں جرم کا مرتکب ہو کر ایک مسائل سے تیز بھگت رہتا تھا۔ وہ بہت زیادہ فحش و ہتکارا اور عورتاں جس تسکین پشاد رہتا جیسے اس کی روح اس سے چین لے لی ہو۔ وہ اکثر کھانسی بہین ہو جاتا جب فحش کی پری لے دے اسے اپنی طرف ہلاتی ہوتی اور پھر دفعتاً اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ وہ کچھ بڑبڑاتے تھے اور دانت دینا ہوا لہجہ کی گردن کو زور سے جھینس دیتا جیسے وہ کہتا تھا مارج کر رہا ہو۔ باقر جب دوسرے قیدیوں کی ہتکارا اور عورتاں سے

بھروسے ہو کر اب تک وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ وہ اپنی اس کے واسطے کرم کے متعلق ہیں۔ لیکن یہ نظریہ کتاب سے سنی اور کھوکھلا ہے۔ طبقہ اعلیٰ کا سارا اقتدار بلکہ اس کی زندگی طبقہ ادنیٰ کی کاوشوں پر منحصر ہے۔ آج وہ اگر اپنی نظریں پھیریں اور اپنے جسم و جان طبقہ اعلیٰ کی نفسیت کی پرورش کے لئے وقف نہ کر دیں تو طبقہ اعلیٰ کی اونچی اوچی منزل تک عاجز خاک میں مل جائیں گے۔

مرزا کی نظروں کے سامنے وہ ہمہ جا زمانہ پھرنے لگا۔ غریب امیر سے باغی ہو کر انہیں ذلیل کتوں کی طرح ٹھکرانے پھینچے اور امیروں کو دنیا کے کسی کونے میں بنیاد نہ مل سکے گی۔ اس کا سارا بدن کانپ اٹھا۔ آٹن اس کے طبقہ کا مستقبل کتنا خوفناک ہے۔ اسے باقر سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اس کا ضمیر اس کی گزشتہ بے اعتنائیوں کی مکافات کر رہا تھا۔

باقر کو صرف تصویر کی خاطر تلاش نہیں کر دیتا بلکہ اس کی حالت سدھارنے کی غرض سے بھی اس خیل سے اپنے اس ارادے میں ایک نیا استحکام محسوس کیا۔ یہی کے خیال میں ایک زبردست اندوختی ہے جو ہر لبر و لی طاقت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ بدی کا احساس ہی انسان کی روح کو کمر و در کمرہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو ہر طرح کی آفات میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور انہیں کے ناکام مقابلے میں اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔

باقر کی تھک مچا دو ختم ہوئی۔ اس کا شرابی دوست بھی کسی کے ساتھ رہا ہوا۔ تھکا ہوا سے نکل کر وہ دونوں کاٹش معاش میں مگر گھلا اور اُدھر کی خاک چھانٹتے پھرتے۔ کچھ محنت مزدوری کر کے یہ کسی طرح اپنا پیٹ پال لیتے تھے۔ جب سے قید سے انہیں آزادی نصیب ہوئی تھی وہ دونوں ملگتے جانے کی فکر میں تھے لیکن یہی بات کے بار لٹنے سے نہ ہوئے کہ ریل سے جا سکیں۔ چنانچہ خانہ بدوشوں کی طرح یہ کسی طرح محنت مزدوری کرتے مہینوں میں ملگتے پھرتے تھے۔ اس کے شرابی دوست نے پھر آہستہ آہستہ شراب شرب شروع کر دی۔ اپنی کمائی کا حصہ وہ شراب کی قدر کو دیتا۔ باقر بھی اس تہاؤ دنیا میں اس کی رفاقت کی قدر کرتا اور اپنے پیٹ سے اسے بھی کھاتا۔ اس کا دوست نے کسی شراب کا عادی بنا ہوا تھا۔ شرابی نظریات نہایت فیاض ہوتا ہے۔ وہ بھی تہاؤ دنیا میں نہیں کرتا۔ باقر نے جب بھی دو ایک جام کی خاطر کسی سے تھوڑا سا کلام کیا تو

انکھٹا تو اس کے پاس آکر بیٹھ جاتا اور اسی سے باتیں کرتے لگتا۔ اس کی فکر اس کے لئے غائی واقعات اور تعلقات کے بارے میں ہوا کرتی۔ باقر کیلئے اس میں زیادہ دلچسپی کا سامان تھا اس لئے کہ اس کے ماں باپ بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ بچوں کی طرح خود سے اس کی باتیں سنا کر تھپتھپا کر اس کا باپ اس سے بولی رہا ہو اور دوسرے قیدیوں کو زیادہ اس سے انس و محبت رکھتا۔

بچہ

مرزا کے پاس بین الاقوامی ناٹش کا اعلان آیا ہے۔ اور ساتھ ہی ہندوستانی آرٹ میٹھی کی طرف سے ایکسپو جی۔ کیٹی گوریشن کا دل تھا کہ بین الاقوامی ناٹش میں مرزا ہندوستان کا سکہ چاویٹے ناٹش میں اسی ایک سال باقی تھا۔ مرزا اعلان پر حاکمیت خوش خواہہ بہت جلد بین الاقوامی مصروفیت کی حیثیت حاصل کرے گا۔ باقر کی تصویریں نہیں بھیجی دیا نہیں تھیں۔ وہ اس خیال کے تصور سے غایت دوجہ مسرور تھا۔ ناٹش میں اس کے دلبر کی پہلی ہوتی روشنی میں جسے آئندہ کے سب سے خوب بڑے چکا دیتا تھا ایک وحشی سیاحی کی تصویر بھی تھی۔ اس کی کامیابی کا انحصار اس کے اپنے کمال پر نہ تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی تابانی کے ساتھ اپنے بے باکی کا کھیل باندھنا بھی شامل ہو رہا تھا۔ آج وہ باقر کا بے پنی سے منتظر تھا۔ باقر ایک ہفتہ پہلے اس کے یہاں تھا۔ یہ ایک غیر معمولی طویل وقفہ تھا۔ شام تک مرزا اس کی راہ دیکھتا رہا۔ اسے کچھ تشویش سی پیدا ہونے لگی۔ رات کو اسے کچھ گھینٹہ دانی سے رات کو رات معلوم ہوتا کہ اس کی شہرت کا وہ دور ہوگا۔ الگ کر دیا جانے والا ہے۔ صبح سویرے اس نے ایک بڑی باقر کا پتہ لگائے۔ خلف صاحب کے کٹرہ بیجا۔ لیکن اسے یہ خبر کوئی نشان نہ مل سکا۔ اس کی رپورٹ نے مرزا کے حواس مگر نہ گئے۔ کیا اس کی مصروفیت کی شکار زندگی تمام برہنہ ہو چکی ہے؟ انہیں اس کے باقر کو دھندلے ہوئے ہوئے۔ لیکن وہ حکم خطا اس کی طرف سے کیا ہو کر رہ گیا ہے؟ اس کا گھبراہٹ سے ڈر لگتا ہے۔ کون سا ملک نہ پیدا ہو جائے گا؟ پھر وہ اپنی سرگرمی تلاش کی وجہ کیا لے گا؟ پھر باقر کا تعلق اس سے نہایت ادنیٰ ہے۔ ایک بڑا بڑا کرم و مہم کے لئے اتنی تشویش کی کاشت تہہ بجا ہوں سے بڑی ہے؟ اس کے خیال میں ہر طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ کیا یہ مرزا کا احساس اس کے لئے لگتا۔ دوسروں کی کوششوں سے قدرہ ٹھکانے کا انجام کا رات سے نظر آئے لگا۔ اس کا طبقہ کس دوجہ

کیفیت معلوم ہوئی۔ ایک عالم کویت جس نے اسے تھوڑی دیر کے لئے نکلنے سے قطعاً بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول جاتا اپنی بدعالی، اپنے غریزوں کا غم، اپنی وطن کی مفارقت۔ وہ اس سرشاری کے عالم میں اپنی انہی کے فلم سے خفا کے پھیلے ہوئے کینوس پر تصویر بنائے لگا۔ اپنی کشماری کے شاہکار۔ اور جو تیار ہوتا۔ وہ رفتہ رفتہ بہت زیادہ ہنس پٹنے لگا۔ نشہ کی کیفیت اس کی روح کی جھپٹی کو دور کر دیتی۔ کوئی کامیادہ و زیادہ تر شراب پیئے ہیں اور اوتار پٹ بھر کھانا ملنے کی وجہ سے وہ دن بدن سوکھا جا رہا تھا۔ لیکن شراب اس سے بڑھوت ملکتی تھی۔ کیسے جھوٹ سکتی؟ کون ان لحات سے محروم ہونا پسند کرتا ہے جن میں وہ زندگی کے شیریں خواب کچھ رہا ہو۔ کیا ہم اسی عالم سرشاری کے متلاشی نہیں جو ہمیں زندگی کی ادھیر ٹہن سے بے نیاز کر کے ہمارے دماغ کی ساری الجھنیں تو کر دے۔ کیا وہ عالم طانیت اور روانی انسانا جس کے کھلے کا زہب و اخلاق درس دے رہے ہیں۔ اسی فلم کی ٹمٹمی و خود فروشی نہیں ہے جسے ہم نشہ کہتے ہیں؟ یہ بھی پہلی اپنی ماحول سے مستغنی بنانے کا بیانیہ دیتے ہیں۔ ورنہ زندگی کی کشاکش کا سلسلہ تو لامتناہی ہے۔ پھر طانیت اور انبساط اسی طرح کی محویت و مغالطہ نہیں جو شہ میں چھائی ہوئی ہے تو اور کیا ہے۔

باقی فرسٹ میجر بہو بازار سے گزرتا تھا۔ اس کا دانا ہاتھ کھینے سے اوپر تک ہوا میں جھومتا معلوم ہوتا تھا۔ سوتے شہادت کی انہی کے جو سیدی سپورٹی بھی بانی انگلیوں کی شمی بندی ہوئی تھی اس کی یہ اٹھی ہوئی انہی سبھی ہاتھ کی جنبش کے ساتھ حرکت کر رہی تھی اس کی انہیں بہت زیادہ پسند تھی تھیں جیسے کبھی اپنے کو خود سے دیکھ رہا ہو اور چہرے پر غرضی و طانیت کی جھلک تھی جو کسی طرح اس کے چہرے ہوتے گاؤں کو زیب نہیں دیتی تھی۔ وہ اسی عویت کے عالم میں فٹ ہاتھ سے آکر کرکٹ پر کھڑا ہو گیا۔ سائے سواک موٹر تیزی سے اس کی طرف ہارن کی آواز دیتی ہوئی آئی لیکن وہ گنا جوڑی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ موٹر کے ایک دھکے سے اسے فٹ ہاتھ پر پھینک دیا۔ موٹر کی گنا شاہیوں کا جوم ہو گیا۔ موٹر کا سوار باقر کے قریب رہی جھڑ دی کی خاطر آیا۔ باقر کا جسم لہو لہاں ہو رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ چند منٹ کا جہان تھا مڑلے باقر کے نیچے جسم کو پہاں لیا۔ ان کی جوتیں وہ استعد رہ کر رہیں تھیں ان کی موٹر کا دھکا آکر اس کی تلاش کی سرگرمی پیش ہوئی کیلئے ہم کرچکا تھا کہ لا سر جکر انہی انہی انہوں کے سائے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ہل ہل کر نہ سکا موٹر میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اور اس طرح دنیا کا ایک سید محمد حسن۔ ایم۔ اے۔

پورڈ، کریم، غازی، لوشن وغیرہ سے کسی کا رنگ آج نہیں ہو سکا۔ جس ایک خور بڑی تحقیق سے طاہرے جس سے رنگت یقیناً مستقل طور پر بکھر جاتی ہے۔ یہ کھانے کی ایک مقدی دوا ہے جو صحت کو اتنا اچھا کر دیتی ہے کہ جلد کی سیاہی کا رنگ صحت سے اور خرم صالح کی تولد کی کہ سے رنگ سیدہ و شباب ہو جاتا ہے۔ آجے اب تک اگر ان میں سے کسی نے بہت کچھ صرف کیا ہوگا۔ پوری حرکت کی قیمت بھر دے۔ ادنیٰ خوراک سمیٹا روئے آٹھ گئے۔

کیفیت معلوم ہوئی۔ ایک عالم کویت جس نے اسے تھوڑی دیر کے لئے نکلنے سے قطعاً بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول جاتا اپنی بدعالی، اپنے غریزوں کا غم، اپنی وطن کی مفارقت۔ وہ اس سرشاری کے عالم میں اپنی انہی کے فلم سے خفا کے پھیلے ہوئے کینوس پر تصویر بنائے لگا۔ اپنی کشماری کے شاہکار۔ اور جو تیار ہوتا۔ وہ رفتہ رفتہ بہت زیادہ ہنس پٹنے لگا۔ نشہ کی کیفیت اس کی روح کی جھپٹی کو دور کر دیتی۔ کوئی کامیادہ و زیادہ تر شراب پیئے ہیں اور اوتار پٹ بھر کھانا ملنے کی وجہ سے وہ دن بدن سوکھا جا رہا تھا۔ لیکن شراب اس سے بڑھوت ملکتی تھی۔ کیسے جھوٹ سکتی؟ کون ان لحات سے محروم ہونا پسند کرتا ہے جن میں وہ زندگی کے شیریں خواب کچھ رہا ہو۔ کیا ہم اسی عالم سرشاری کے متلاشی نہیں جو ہمیں زندگی کی ادھیر ٹہن سے بے نیاز کر کے ہمارے دماغ کی ساری الجھنیں تو کر دے۔ کیا وہ عالم طانیت اور روانی انسانا جس کے کھلے کا زہب و اخلاق درس دے رہے ہیں۔ اسی فلم کی ٹمٹمی و خود فروشی نہیں ہے جسے ہم نشہ کہتے ہیں؟ یہ بھی پہلی اپنی ماحول سے مستغنی بنانے کا بیانیہ دیتے ہیں۔ ورنہ زندگی کی کشاکش کا سلسلہ تو لامتناہی ہے۔ پھر طانیت اور انبساط اسی طرح کی محویت و مغالطہ نہیں جو شہ میں چھائی ہوئی ہے تو اور کیا ہے۔

مرزا کو خالص صاحب کے کٹے کے گرایہ داروں سے اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ باقر کی طبیعت کچھ دنوں سے وہاں آجھاٹ ہو رہی تھی اور وہ اکثر ان سے گلے پلے جانے کے قصد کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ ضرور گلے ہی ہو گا۔ اسے یہ بات گنتی ہی معلوم ہوئی اس لئے کہ ہر فرد و رہا مستقبل مسخار

آپ گوتے ہو سکتے ہیں۔

سید محمد حسن۔ ایم۔ اے۔

نقد و تبصہ

دلی کی آخری بہار

یہ مصنف غلام راشد انجیری دہلی
مردم کی تعریف ہے۔ ان کی ت

اکبر و بہار ہے جس میں پندرہ دلی سے یہ کتاب ملی تھی۔
غلام راشد انجیری مرحوم اردو کے مشہور دانشور و افسانہ نویس اور
ان کی کم و بیش سو کتابیں ان کا نام اس وقت تک زندہ رکھیں گی جب
تک اردو زبان زندہ رہے گی۔ غلام مرحوم ایک نہایت دیکھ بھال
کے مالک تھے جو صرف انہی کے لئے مخصوص تھا اور انہی کے ساتھ
ختم بھی ہوا۔ مولانا کی طرز نگارش میں ادب و اشفاق وہ تمام خوبیاں
یکجا ہوئی ہیں جو اردو کے کسی افسانہ نگاروں میں علیحدہ علیحدہ نظر
آتی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا آزاد، ان سب کا لکھنے
کا ڈھنگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ غلام راشد انجیری کے طرز
تحریر میں ان تینوں استادوں کا عکس تحریر موجود ہے۔ اس کی وجہ
یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی غلام مرحوم کے
استاد تھے، اور مولانا آزاد کی صحبت سے مستفیض ہونے کے
مردم کو اکثر مواد ملے۔ اس انہی کا حال لکھنے والوں کے خصائص
ظنی غلام کی تحریر میں بس بس گئے اور اس طرح وہ اسٹائل وجود
میں آج جو غلام مرحوم کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے گا۔ دلی کی
آخری بہار مولانا کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب
میں ۲۵ مضمون ہیں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان مضمون
میں دلی کی وہ تہذیب پیش کی گئی ہے جو ہنگامہ سہ کے بعد تھی۔
وہ زمانہ تھا کہ دلی کا شہنشاہ نہ تھا۔ تعلقات کا ہر پہلو باغ
اپنی آخری بہار دکھلایا تھا۔ اگرچہ دیار کے بس آخری دور میں
بھی وہ قدر داری کی نہیں لہر لے رہی تھیں، اور صداقت کے چنے
پھوٹ رہے تھے۔ دلی کی حکومت دہلی، تہذیب دہلی، زبان دہلی،
معاشرت دہلی، غرض آسان دہلی، زمین دہلی۔ غلام مرحوم کی طبیعت
پایاس انقلاب کا بہت گہرا اثر تھا۔ اور انہوں نے جہاں آباد کے
دور گزشتہ کی بہار دکھا کر اپنے ساتھ ہزاروں درد مندوں کو
لے لیا۔ انہی عزیزانک مضمون کا یہ مجموعہ ہے۔ وقت سدا اکھٹا سا
ہو رہا۔ حال ماضی کو دہن کر دیتا ہے اور مستقبل حال کو بھی نئی
کروڑ لگائی زمانے کی ریت ہے، بس یہی حال ہے ہمیشہ ہے نام اللہ کا۔

محمدی ہوا

یہ مرزا فہم بیگ جتوئی کی تصنیف ہے
اور انہی کی حکایت زندگی بھی ہے۔ یہ
مختصر کتاب باطل کی طرزیں بھی لگتی ہے۔ چار سال کا بچہ جب
ہوئی سمجھا تا ہے تو کس نظر سے ہر ہونے والی بات کو دیکھتا ہے
اور اس کے نئے سے دل و دماغ میں اثر و تاثر کی کیا کیفیات
پیدا ہوتی ہیں۔ پھر جب ذرا اور بڑھ جاتا ہے تو اس کے کوائف ذہنی کی
کیا حالت ہوتی ہے؟ بچے ہی کی زبانی ان سب باتوں کو لکھوا دیا گیا ہے
جس کی وجہ سے ہر ایسا بیان اچھا اور دلکش ہو گیا ہے۔ ایسے بیان
کیتے بچوں کی نفسیات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، مثلاً۔
”جنگ جنگ جنگ آفتاب نکلا۔ اس کی آہلی
آہلی کر رہی تھی کہ دلیوں میں سے چمن چمن کر گئی
میں بکھر گئیں۔ وہ یہی آفتاب تھا جو اب بھی روزانہ
نکلا کرتا ہے۔ اب نہ جانے کیا ہو گیا۔ جب تو اسکی
نورانی صورت مجھے بیٹی سیاری پیاری لگتی تھی۔
جی چاہتا تھا کہ لے کسی طرح کپڑوں اور پانی کے
گھرے میں بند کر کے اوپر سے پھینک دوں۔“
یہ کتاب ہر میں ہندوستانی مکتب خانہ، اردو بازار دہلی سے
طلب کی جا سکتی ہے۔

دیوان غالب (ظاہر و دہش)

غالب کا نام آج بچے بچے
مقبولیت کا سبب بیان کرنا گویا کسی سنا کی بات کو دہرانا ہے۔ ڈاکٹر
عبدالرحمن بخاری نے اپنے غیر فانی مضمون کی ابتدا اس فقرے سے کی
ہے کہ ”ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ وہ مقدس اور دیوان
غالب۔“ لیکن اگر ہم مبالغہ نہیں تو کم از کم یہ ضرور دانشور کے گرد آرد
کے اور کسی شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی جو غالب کو حاصل ہے۔
تجربہ کی بات یہ ہے کہ غالب اپنی شاعری کو خود کوئی وقت نہ دیتے
تھے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ
سو نیت سے ہے ہشتہ آباہ سہ گری
کچھ شاعری ذریعہ نعت نہیں سہی
اور اگر تو تورا بہت خیال آئیں تجا بھی تو اپنے طرز کا کام۔

اُردو کو وہ سونے سے لپٹے رنگ کی چیریا نہیں سمجھتے تھے۔
فارسی میں تاہم سنی نقش ہائے رنگ
مجذرا مجموعہ اُردو کہ بے رنگ میں است

مگر یہی بے رنگ مجموعہ بعد میں اُن کی شہرت عام اور بڑے
دوام کا باعث ہوا۔ اور اتنا مقبول ہوا کہ ہزاروں تہذیبی سیکڑوں کی
نئے نسخے کے بے رنگ شائع ہو چکے ہیں۔ دیوان غالب کی جو ایک دم سے
ہلک ہوئی تو چاہے پبلشرز نے بغیر تصحیح کے ہوتے نئے چھاپ چھاپ کر
چلے گئے جو غلط سے غلط تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض تو
لئے غلط سلسلہ چھپے ہیں کہ انہیں دیوان غالب کی بجائے دیوان کا تب
کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ مگر یہ بہتری اور نفسی زیادہ عرصے تک
جاری نہیں رہی۔ اس کا رد عمل ہوا اور بڑی تلاش و جستج سے صحیح
نئے نسخے لائے گئے اور ان سے ملاکر صحیح کی کئی کتب دیوان غالب کے
علاوہ مکمل دیوان غالب نسخہ جدید کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے
بعد رانچی اور مین مرچ چنتائی اور نقوش چنتائی شائع ہوئے جن میں
کئی حد تک شاعری اور مصوری کا سنجوگ ہوا۔ مگر انہیں صرف معتد
حضرات ہی خرید سکتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ کوئی نسخہ ایسا شائع
ہو جو باطل جہم ہونا خوشامود اور سناہمی ہو۔ اس کی کوئی خاطر و نظر
نے پورا کر دیا۔ آغا محمد طاہر صاحب نیوہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم
اس خوبصورت ادب کے پہلے لفظ میں لکھتے ہیں:-

”مدت سے اُردو ادبی کہ دیوان غالب کا
اُردو دیوان شائع نہ کر دیں، مگر ایسا کہ سند ہو
اور سب قسم کے عیب سے پاک ہو خوش قسمتی
دیکھئے کہ اپنے ہی گھر میں ایک مسند علمی نسخہ
مکمل کیا، یعنی میرے پرانا جو کتاب حسین مرزا صاحب
اعلیٰ اللہ مقامہ ثواب ناظر قلمی مکتبہ دہلی علم،
صاحب ذوق و صاحب سخن، مرزا کے دوست
بلکہ عاشقِ ناز تھے۔ وہ انتخاب میں بھی شائع ہو۔
انہوں نے منتخب کلام کا ایک نسخہ اپنے قسم
سے لکھ کر مرزا کو دیا۔ مرزا نے پڑھ کر دستخط اور
مہر سے مرقن کر کے بطور یادگار واپس کر دیا
جو اب بھی میری تحفیل میں مرزا کے تحت جبر
تعلیق کو زندہ کرتا ہے۔ میں نے یہ دیوان ان کی
نئے سے درست کیا ہے۔“

طاہر ایڈیشن میں مرزا غالب، اُن کے مرزا اور اُن کی تحریر کی تصاویر
بھی شامل ہیں۔ سارا دیوان مکتبی ملاکوں سے چھاپا گیا ہے۔ کاغذ عمدہ اور
دیر پا ہے۔ یہ دیوان مجدد و نقوش ہے اور اس لائق ہے کہ ہر لائق ذوق
کے پاس ہے۔ قیمت بھی مناسب رکھی گئی ہے۔ یعنی چلے
کتاب خانہ علم و ادب دہلی یا سانی بنگلہ سے ملا جا سکتا ہے۔

طنزیات پانپوری - اردو میں بہت کم مزاح نگار ہیں
سچا حسین مرحوم اور دھنچ کے ادب نے طنز و مزاح میں نئی نئی باتیں پیدا
کیں۔ ان کے بعد کسی اور کو وہ درجہ کمال حاصل نہیں ہوا۔ اگر لالہ بابا
سے شعر و شاعری میں طراوت کے جوہر دکھائے اور طنز میں تو آج تک
اُن کا جواب نہ ہو سکا۔ رشید صدیقی، آکا فرحت، بطرس اور چنتائی
نے اپنے اپنے وقت میں خوب لکھا اور تھک کر چپ ہو رہے۔ لکھنے بعد
مزاح نگاروں کی ایک اور کھپ آئی جن میں سے چند نے نہایت
استقلال سے معقول مضامین لکھے۔ سناکی میں علامہ مصباح اور نجم
میں پانپوری نے وا و ظرافت دی۔ پانپوری کے پندرہ مضامین کا مجموعہ
”طنزیات پانپوری“ کے نام سے دفتر توقیر، لکھا۔ سے شائع ہو رہا ہے۔
اس کا ہر معقول نہایت دلچسپ ہے اور طرزِ تحریر بہت بے ساختہ
اور خوش ہے۔ پانپوری کی عبارت کی خصوصیت یہی کیا کہ ہے کہ گہر
محسوس نہیں ہوتا کہ لکھنے والا نہیں مہنائے کی کو شش کر رہا ہے۔
ہماری کمزوری کو ہم پر کچھ ایسے شاعر انداز میں لکھا کہ اگر تازہ کہ او
کے ساتھ داہ بھی سنائی دیتی ہے۔ کتاب کا طویل مقدمہ میری اپنی نوعیت
کی انوکھی چیز ہے خصوصاً ”گلستان پانپوری“ آخر میں پانپوری کے چند
اشعار بھی شامل ہیں۔ کتابت و طباعت پاکیزہ کاغذ عمدہ سفید شہمت
۳۸۰ صفحات۔ جلد خوبصورت۔ قیمت چلے۔ جلد چلے۔
لئے کا پتہ: دفتر رسالہ نجم، لکھا۔

مومن کے سوشل شعری - مکتبہ جامعہ دہلی نے سوشل شعری کے سب شائع
ہے واقف ہو چکا کہ سبیل طریقہ بتا دیا، ایک جگہ، اصغر، حسرت، فانی،
جوش، تیو، درد اور غالب کے سوشل بہترین شعر چھپائی جو فی الواقع
کئی بوجی صورت میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ ہر کئی سوشل شعری اس شاعر
کی مختصر داستان زندگی اور کلام کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ بھی شامل ہو
حال میں جن کے سوشل شاعر ہوتے ہیں جو ای سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔
ٹائٹل پر مومن خاں کی تصویر بھی دی گئی ہے اور مجموعہ کی طرح اس کے

نئی روح

قائم شدہ

۱۹۰۳ء

نئی طاقت

تاکلا پتلا - میڈیکل
۵۵۶۶



ہندوستانی درخانہ دلی کا تمام نسخہ
میں موجود ہے اور اس کے ہستال پر صورت ہے

سیاح الملک شہنشاہ طب حکیم اجل خان صاحب کی بیاض خاص کا نسخہ

سیاح الملک حکیم جیل خان صاحب ام اقبالہ کا نیا عطیہ!

یہ کیمیائی دوا مانگا کر اپنی کھوتی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کیجئے اور ایک دفعہ پھر جوان بگڑے زندگی کا میم لطف اٹھائیے۔
نوجیون - تمام اعضا سے رسیہ کو قوت دے کر کثیر مقدار میں خون صالح اور مادہ تولید پیدا کرتی ہے۔ قوت مردانہ کو غیر معمولی ترقی دیتی ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو بالکل ازکار رفتہ سمجھ چکے تھے ان کو بھی نوجیون نے جوانوں کی صف میں لا بٹھایا۔ انکی رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا اور ان کے دل میں شہادت دوسلے پیدا ہونے لگے۔ درحقیقت قوت مردانہ کی یہ وہ کیمیائی دوا ہے جس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جو لوگ زندگی کا لطف اٹھا نا چاہتے ہیں اور مردانہ قوتوں کے ساتھ اولاد کے بھی منتہی ہیں انہیں فوراً مانگا لینا چاہیے۔
نوجیون - یورپ کی دواؤں کی طرح فوری اثر دکھانے والی اور جلد اثر نازل ہوجانے والی دوا نہیں ہے۔ (۱) کے ساتھ طلعت موسیائی بھی استعمال کریں تو طاقت اور صحت کیلئے بے نظیر اور بے ضرر چیز ہے۔ ۳۰ ماشہ طلا کی قیمت دو روپے چار کئے،
نوجیون کی ترکیب استعمال - ایک ایک قرص صبح وشام دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔

قیمت - چالیس خوراک سات روپے آٹھ کئے دینی ہے
نوٹ - نوجیون ہی طاقت کی ایسی دوا ہے جسے آپ بے خطر چھو کر بھی
موت میں استعمال کر سکتے ہیں

قرص صدر

ہٹے کا پتہ

ہندوستانی درخانہ - پوسٹ بکس ۲۲ دہلی ۳

جرمات

ساتی کا سالانہ چندہ پانچ سو روپے
اور ششماہی تین سو روپے ہے
حاکم بیرون ہند سے بارہ لاکھ
قیمت فی ربح حیدرآباد

جلد ۱۶

ساقی دہلی۔ بابیت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء

فمخير

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اولین	شاہد	(۲)
(۲)	سبیلین	جناب مولوی عنایت اللہ دہلوی	(۳)
(۳)	بلندی نگاہ	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۲۰)
(۴)	خط	جناب ایم۔ اسلم	(۲۱)
(۵)	واہِ تنام	نیلوفر	(۲۶)
(۶)	مرکھٹ	جناب اختر حسین رابپوری بی۔ اے۔ (علیگ)	(۲۸)
(۷)	ثمراتِ تخمیل	جناب ہنابل سیوہاروی	(۳۳)
(۸)	دورِ حاضر اور ادوارِ غزل گوئی	ڈاکٹر عبدالکبیر شادانی ایم۔ اے۔ بی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)	(۳۳)
(۹)	رباعیاتِ فرحت	جناب گنگا دھر ناتھ فرحت کا پوری بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔	(۳۹)
(۱۰)	زارینہ کا پھول	جناب شمس کا کوئی	(۵۰)
(۱۱)	طفلی کے خواب	جناب حجاز بی۔ اے۔ (علیگ)	(۵۵)
(۱۲)	باغی اٹلی	جناب جان نثار حسین اختر	(۵۶)
(۱۳)	ایک لڑکی	جناب خواجہ محمد عباس	(۵۷)
(۱۴)	آدب اور زندگی	محمد جمشیدہ شمیم قریشی (ادیب فاضل)	(۶۶)
(۱۵)	پریم کہانی	جناب ساعر جعفری بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔	(۶۸)
(۱۶)	دجوانیات	جناب سکندر علی وجہ بی۔ اے۔ ایچ سی ایس	(۶۲)
(۱۷)	فلسفی اور موت	جناب حسن عباس بی۔ اے۔	(۶۳)
(۱۸)	سنانی کی نگاہ اور شرب	جناب الطاف شہیدی	(۷۵)
(۱۹)	تعمیح خیالی خام	جناب سید علی منظور حیدر آبادی	(۷۶)
(۲۰)	شادی سکورا پارٹی	پروفیسر نور الحسن برلاس (راجپان)	(۷۷)
(۲۱)	ایک حسینہ سے	جناب طاہر القادری	(۸۱)
(۲۲)	عورت کی غلامی	جناب میرزا سیف علی خاں	(۸۲)
(۲۳)	عشق اور موت	جناب بکیم سین ظفر	(۸۶)
(۲۴)	افسانہ نگاری	جناب علیم الدین خاں صاحب	۸۷
(۲۵)	فطرت ایک مفلس کی نظر میں	جناب معین احسن جدی	(۹۲)
(۲۶)	اشتہارات		(۹۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہنگامہ اولین

سنائی کیلئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں ان میں سے زیادہ سے زیادہ کو سنائی میں جگہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے جو مضمون ہنگامہ حضرات کی تعداد ماشاء اللہ اتنی زیادہ ہے کہ سنائی کے محدود صفحات ان کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ گنجائش کی اس قلت کی وجہ سے اکثر اچھے خاصے مضامین معذرت کے ساتھ نہیں واپس کرنے پڑتے ہیں، مگر یہ معذرت بعض دفعہ ہمارے لئے عذر گناہ بن جاتی ہے۔ اور پھر جو کچھ اس گناہ کی پاداش میں ہمیں سنا پڑتا ہے اُس کی تفصیل اگر پیش کی جائے تو یقین جانئے آپ کانوں میں انگلیاں دے لیں گے جس اخلاق کے اس مظاہرے پر سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ چنانچہ بہ طبیعت اس سلوک کی اتنی عادی ہو گئی ہے کہ مذمت سے ملکر ہونا تو کچا تعریف و توصیف سے خوشی بھی نہیں ہوتی۔

مضمون نگاروں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کتنا م رہنا چاہتی ہے یعنی اپنا اصلی نام چھپاتا چاہتی ہے اور کسی فرضی نام سے مضامین شائع کرنا چاہتی ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟ یہ راز صرف مضمون نگار کو معلوم ہے۔ مگر بعض گناہم حضرات تو کمال ہی کرتے ہیں کہ ایڈیٹروں سے بھی اپنی اصلی شخصیت پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے ہمیں لکھنا پڑتا ہے کہ ایڈیٹر کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے اس لئے اس پر اعتبار کیجئے۔ جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ دراصل آپ ہیں کون مشکل ہے کہ آپ کا مضمون شائع ہو جائے۔ ہر مضمون جو شائع ہوتا ہے اس کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری مضمون نگار کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ایڈیٹر آپ کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے آپ کا مضمون شائع کرنے سے معذور رہے گا۔ اگر صاحب مضمون کو اپنا نام بتانا کسی عنوان گوارا ہی نہ ہو تو سنائی میں چھپنے کیلئے مضمون بھیجئے کی رحمت بھی گوارا نہ فرمائیں۔

ہمارے بعض نئے مضمون نگار حضرات کو شکایت ہے کہ باوجود تاکید کے اُن کے مضمون یا غزل کی اشاعت یا عدم اشاعت کے متعلق انہیں ”واپسی ڈاک“ اطلاع نہیں دی جاتی۔ اس پر بعض حضرات کو سخت افسوس ہوتا ہے اور بعض کو تحیر تک ہوتی ہے۔ اور غریب ایڈیٹر کو سکتہ ہو جاتا ہے جب وہ اُس ڈھیر کی طرف دیکھتا ہے جو روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اور اسی عالم یاس میں وہ اپنی شوقی قیمت کو گرنے لگتا ہے کہ آج کو اُسے دست غیب کیوں نہ ہوا۔

سنائی کا سالنامہ حسب معمول جنوری ۱۳۸۶ء میں شائع ہوگا۔ اس کے لئے چند بہت اچھے مضامین آچکے ہیں۔ ۱۳۸۶ء کے سالنامہ میں مولانا عبا ت اللہ دہلوی کا بے مثل ترجمہ ”ہیکٹ“ مکمل شائع ہوا تھا۔ ۱۳۸۶ء کے سالنامہ کے لئے مولانا نے شکیل بکسر کے شہرہ آفاق ڈرامہ ”سیکھتہ“ کا ترجمہ عنایت کیا ہے جو سالنامہ میں یہ شہ پارہ تمام دکال شامل ہوگا۔ امید ہے کہ بقیہ مضامین ۱۵ اکتوبر تک آجائیں گے اور نومبر اور دسمبر کے پرچوں میں ہم مقفل اعلان شائع کر سکیں گے۔

شاہد

چینچینہ

(سلسلہ گذشتہ)



سمبلین

جزو رابع

پہلا منظر۔ دلیز کا علاقہ۔ بلاریوس کے کہن کے قریب کھڑی ہے۔

پر لگا اکڑتا ہے ایک گھنٹہ کے اندر کٹ کر دو در جا پڑ گیا اور میری عورت پر زبردستی ہمارا قبضہ ہوگا اور پھر اسکی آنکھوں کے سامنے ان کپڑوں کو دھجیاں نہ کروا ہو تو نام نہیں۔ اور جب یہ سب کچھ ہو چکے تو پھر اس عورت کو گھسیٹتا ہوا بادشاہ کے دربار میں لے جا دے گا۔ لیکن ہے کہ میری اس سختی سے بادشاہ کے دل پر کچھ میل آئے۔ لیکن میری ماں جسے بادشاہ کے مزاج پر بڑا قابو ہے میری سفارش کر کے سب رفع دفع کر دیگی۔ گھوڑا میرا تو ٹھیک بندھا ہے۔ بس اب میری تلوار تو ذرا باہر نکل۔ آج مجھے بڑا سخت کام لینا ہے۔ اور اب لے تقدیر تو ان دونوں کو میرے حوالے کر دے۔ جگہ کے دیکھنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں خیال ہے کہ ان سے ملاقات ہوگی۔ ہنسیوں کی اتنی جال کہاں کہ مجھے دھوکہ دے۔

دوسرا منظر۔ بلاریوس کی کہن کے سامنے

بلاریوس، گداریوس اور اریو جین اور ایو جین آتے ہیں۔

بلاریوس: (ایو جین سے مخاطب ہو کر) آپ کا مزاج نا ساز معلوم ہوتا ہے بہتر ہے کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں، شکا کھینکر ہم سب آپکے پاس آئے جاتے ہیں۔

اریو جین: (ایو جین سے ہنستا ہے، بھائی! تم یہیں ہو۔ کیا ہم تم بھائی نہیں ہیں۔

ایو جین: (مرد مرد سب آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں ایک

کلوٹن: اگر ہنسیاں بولنے پر تھک بنا یا ہے تو میں اب اس جگہ کے نزدیک ہوں جہاں ان سے ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ پوتی مر کے یہ کپڑے تو میرے بہت تھک آئے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسکی عورت بھی میرے لئے تھک نہ ہو۔ کیونکہ وہ عورت بھی اپنی اناہوں کی بنائی ہوئی ہے جس نے درزی کو بنایا تھا۔ اور اس درزی کی کاریگری یہ کپڑے ہیں۔ مجھے معاف کیجئے گا مشہور ہے کہ عورت کبھی کبھی اتفاق سے تھک رہتی ہے۔ غرض کہ اب اس عورت کو تھک رکھنے میں میری کاریگری درکار ہوگی۔ تنہا آئینہ میں مشورہ کرنا خلاف شان بات نہیں ہے۔ مجھے یلجے کہ میرے جسم کے خطوط ایسے ہی اچھے ہیں جیسے کہ پوستی اس کے ہیں اس سے جوانی میں کم نہیں، کس بل میں اس سے بڑھا ہوا ہوں۔ قیمت میں بھی اس سے ہینا نہیں۔ زمانہ کی مساعادت کے لحاظ سے بھی اس کو زیادہ ہوں۔ میں ملکہ کا فرزند ہوں۔ فوجی خدمات میں جو سب کیلئے یحساں ہیں اس سے زیادہ جرات اور شوق رکھتا ہوں۔ اور تنہا لڑنے میں تو مجھ سے کون باڑی لے جا سکتا ہے۔ مگر اگر حق جو قوت ایو جین کو کیا کروں کہ باوجود میری ان تمام خوبیوں کے وہ پوستی مس سے عشق رکھتی ہے۔ انسان کی فطرت ایسی عجیب چیز ہے۔ مگر پوستی مس مجھ سے کہ تیرا یہ سر جو شانوں

صلاحیت، ذاتی بزرگی کا نسلی احساس ارجح ہے بڑوں کے باب بڑوں ہوتے ہیں کیسوں سے کہنے پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت میں امانج بھی ہے اور بخوبی بھی یعنی وہ چیزیں بھی جو قابل قدر ہیں اور وہ بھی جو قابل نفیر ہیں میں ان لڑکوں کا باپ نہیں ہوں حیرت یہ ہے کہ یہ لڑکا کون ہے جس سے ان لڑکوں کو مجھ سے بھی زیادہ محبت ہے۔ اب تو صبح کے نو بج چکے ہیں۔

اروید گیس۔ بھائی! تجھے خدا کو سونپا۔

ایموجن۔ خدا کے شکار خوب ملے۔

اروید گیس۔ خدا کسے تم اچھے ہو جاؤ افسوس رہو۔

ایموجن۔ (علیحدہ کہتی ہے) یہ کیسے ہرمان اور محبت ملے لوگ ہیں۔ خدا! میں نے بھی کسی کسی جھوٹی باتیں سنی ہیں۔ ہمارے درباری کہا کرتے ہیں کہ شاہی دربار کے سوا جہاں جاؤ گے بجز وحشت اور وحشیوں کے اور کچھ نہ دیکھو گے مگر یہ جو کچھ سننا سنا ہے اُسے غلط بتا رہا ہے۔ بڑے بڑے سمندر دوں پر تو ہیمنٹاک اور خونخوار جانور پیدا ہوتے ہیں لیکن سمندر کے معاون اور مددگار ویاؤں میں خوش و آلف پھلیاں و ستر خوان کے لئے پیدا ہوتی ہیں میری طبیعت ابھی تک درست نہیں ہوئی۔ ہائے اس عشق نے ہمارا دل الہے۔ پتائیوں نے جو دوا دی تھی اسے کھاتی ہوں۔ (دوا کھاتی ہے۔)

گد ریوس۔ میں نے بہت کہا مگر وہ نہ مانا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ شریف ہے مگر بد نصیب ہے۔ کسی نے دُعا کر کے اسے آزار پہنچایا ہے خود وہ با وفا اور امانت دار ہے۔

اروید گیس۔ یہی بات اس نے مجھ سے کہی تھی اور اتنا اور کہا تھا کہ اب جو کچھ ہمیں اللہ وہ آپ کو معلوم ہو جائیگا۔

بلار یوس۔ چلو چل تھکا کر کیلتے آج تو ہم نہیں یہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ جاؤ گھر میں جا کر آرام کرو۔

مٹی کا پتلا دوسرے خاک کے پتیلے سے درجے میں البتہ فرق رکھتا ہے گو دونوں کی مٹی ایک ہی ہوتی ہے۔ میری طبیعت اس وقت بہت خراب ہے۔

گد ریوس۔ تم تھکا کر جاؤ۔ اروید گیس! میں مریض کے پاس ٹھہرتا ہوں۔

ایموجن۔ نہیں، میں اتنا بیمار نہیں ہوں کہ کوئی میرے پاس ہے۔ جی اچھا نہیں ہے۔ میں ایسے ناز و نعمت کا پروردہ نہیں ہوں کہ مرض الموت پہلے و جاؤں۔ بس آپ مجھے تنہا چھوڑ جائیں۔

آپ حسب معمول اپنے سب کام کرتے رہیں۔ جب کوئی خلاف معمول کام پیش آجائے تو پھر سب کاموں میں خلل پڑتا ہے۔ میں بیمار ہوں۔ آپ کے یہاں رہنے سے اچھا نہیں ہو جاؤ گیگا۔ جو خود ملنا چھٹنا چاہے اس کے لئے کوئی محبت بھی کھلی نہیں۔

بس اتنا ہے کہ آپ مجھے یہیں رہنے دیں۔ میں سولے اسکے کہ اپنی عزت کا جو رہوں اور کسی کی چوری نہ کرونگا اور میری یہ چوری اتنی کم قیمت کی ہوگی کہ میں مجھے تنہا مرنے دیجئے۔

گد ریوس۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے اور یہ محبت وزن میں اتنی ہی ہے جتنی کہ مجھے اپنی ذات سے محبت ہے۔

بلار یوس۔ بھلا یہ کیسے؟

اروید گیس۔ اگر کوئی تصور نہ سمجھا جائے تو میں اس خیال پر اپنے بھائی کے ساتھ متفق ہوں گو وہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی مگر مجھے اس جوان سے بہت ہی محبت معلوم ہوتی ہے اور آپ کو کہتے سنا ہے کہ محبت کی دلیل بلا دلیل ہوتی ہے، اگر تاہم بات رکھنے کے لئے گاڑی دروازے پر کھڑی ہو اور کوئی پوچھے کہ گھر میں کس کا مرنا چاہتے ہو تو میں کہہ دوں گا کہ اس جوان کی جگہ میں اچھا باپ کا مرنا گوارا کرونگا۔

بلار یوس۔ (علیحدہ کہتا ہے) اے مورثی شرافت، فطرت کی

کون ہے؟

(کلون آتا ہے)

کلون :- ان فراریوں کا تو کہیں پتہ چلتا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حیثیت پرپانیوں نے مجھے دھوکا دیا۔ تمہارے مائے میں تو غش کھائے کو ہوں۔

بلا ریوس :- کیا فراریوں سے اس کا مطلب ہم سے تو نہیں ہو۔ یہ شخص کچھ مجھے یاد آتا ہے۔ یہ تو ملک کا بے گناہ کلون معلوم ہوتا ہے۔ خون ہے کہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہونگے اور وہ جنگل میں چھپے بیٹھے ہونگے۔ گو آج برسوں کے بعد اسے دیکھا ہے۔ پھر بھی جانتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔ ساہا سال ہوتے کہ ہم پر سے فانون کی پناہ اٹھ چکی ہے۔ لوگو! یہاں سے چلو!

گد ریوس :- یہ تو ایک آدمی ہے میں اور میرا بھائی ابھی تیار کئے لیے ہیں کہ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ تو جنگل میں چھپے نہیں بیٹھے ہیں۔ آپ جائیں میں اس سے محبت لوں گا۔

کلون :- ٹھیکہ تو کون لوگ ہو جو مجھ سے بھاگ رہے ہو۔ کیا تم ہٹاری ٹیپر ہو میں سن چکا ہوں کہ یہاں رہن اور فراق رہتے ہیں جیسا تو اتم کس کے غلام ہو۔

گد ریوس :- تجھ سے بڑھ کر تو کوئی غلام میری نظر سے ایسا نہیں گذرا ہے جو اب دینے میں اس کا سر نہ ٹوڑ دیا ہو۔

کلون :- تو ٹیپر ایک قانون توڑنے والا بد معاش۔ اسے فراق اپنے ہتھیار ابھی ہائے سامنے ڈالے۔

گد ریوس :- کس کے سامنے۔ کیا تیرے سامنے۔ تو ہے کون۔

کیا میرا ہاتھ تیرے بازو سے کم ہے اور تو مجھ سے بھی زیادہ ہواؤ دل رکھتا ہے۔ تیری بجواس البتہ تیرے ہاتھ اور دل تو زیادہ

سخت معلوم ہوتی ہے کیونکہ تیری طرح میری زبان خنجر نہیں ہو۔

بتا تو کون ہے۔ اور کیوں میں تیرے سامنے اپنے ہتھیار

ارویر گیس :- ہم دور نہیں جاسکے۔ ابھی واپس جائیں گے۔

بلا ریوس :- خدا کے لئے بیار نہ پڑنا۔ تمہیں تو ہمارے گھر کا انتظام کرنا ہے۔

ایموجن :- تندرست ہوں یا بیمار، میں تو ہر حال میں اپکا زیر بار احسان ہوں۔

بلا ریوس :- اور ہم بھی آپ کا احسان مانیں گے۔

(ایموجن گھٹن جلی جاتی ہے)

یہ جوان گواہت تکلیف اور عیدیت میں پر مگر شریف ماں باپ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔

ارویر گیس :- گائے میں ایک فرشتہ کی طرح خوش گوی۔

گد ریوس :- اور کھانا بھی کیسا خوش ذائقہ پکاتا ہے۔ قابول میں ترکاریاں کاٹ کر اس طرح لگاتا ہے کہ خوش نویں کے

لکھے ہوئے ورق معلوم ہوتے ہیں اور شوربے میں کچھ اس انداز سے چاشنی دیتا ہے گویا وہی جو تومیرا پڑی ہے اور خدا کا انتظام اس کے سپرد ہے۔ کس شرافت کے ساتھ زبان پر

آہیں اور لبوں پر تہمت ہے آہوں کو اس کا افسوس کہ ہمدرد کیوں بنے، تہمت کیوں نہ ہوئے اور تہمت کو آہوں پر یہ اعتراض ہے کہ تم اس ہٹلکہ حسن وسعدت کے محل کرتیز و تہمت

طوفانی ہواؤں میں جن سے طالع بھی پناہ مانگتے ہیں کیوں مل جل گئے۔

گد ریوس :- مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبر اور غم دونوں جڑ کچل کر اس میں سے پھوٹ نکلے ہیں اور دونوں نے اپنی نشانہ

انجھا دی ہیں۔

ارویر گیس :- خدا کرے کہ شجر صبر کی شاخیں بلند ہو کر غم کی جڑوں کو جو ایک بدبودار درخت ہے اتنا لگاؤں کہ اس کی

شاخیں اس نازک درخت رز پر جو پھیل گئی ہیں خشک ہو جائیں۔

بلا ریوس :- اب تو خاصا دن نکل آیا ہے۔ لوگو چلو۔ ہائیں یہ

اور جب تیرا کام تمام کر چکوں گا تو پھر ان کو قتل کر دوں گا جو مجھے دیکھ کر سانسے سے بھاگے ہیں اور پھر ان کے سر کاٹ کر لندن کی فہیل پر چڑھ دوں گا۔ اسے گنوار پہاڑ کے قزاق آء اور میرے سانسے گردن جھکا دے۔

(دونوں لڑنے چوتے ایلیج سے باہر بھاگتے ہیں)

(بلا ریوس اور اریو ریگس واپس آتے ہیں)

بلا ریوس: سپاہیوں کی کوئی جماعت ہماری ناک میں بیٹھی نہیں لی۔

اریو ریگس: دنیا میں کون چوہا ہمارا مقابلہ کر سکے یہ یقینی آپنے اسے پہچانتے ہیں غلطی کی ہے

بلا ریوس: میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مدت کے بعد اُسے دیکھا تھا۔ مگر اسنادت کو گزرنے کے بعد بھی صورت نہیں بدلی۔ چہرے کا نقشہ وہی ہے جو پہلے تھا اور میں جھٹکے اور وقتاً فوقتاً جلد جلد باتیں کرنے کی عادت پہلے ہی جیسی ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ کلون ہی تھا۔

اریو ریگس: یہ ہیں تو ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔ اُمید ہے کہ بھائی بولیدور نے اسکی اچھی طرح خبر لی ہوگی آپ تو فرماتے تھے کہ کلون ہزار بروست اور ظالم ہے۔

بلا ریوس: چونکہ ابھی تک پوری جوانی کو نہیں پہنچا ہے اس لئے خوف و خطر سے نا آشنا ہے۔ سمجھ کا قصور اکثر خوف دل سے نکال دیتا ہے۔ لیکن دیکھو وہ تمہارا بھائی آ رہا ہے۔

(کلون ریوس، کلون کا سر ہاتھ میں لے آتا ہے)

کلون ریوس: یہ کلون تو کوئی بڑا ہی احمق تھا۔ روپیوں کی تخیل تھا مگر اندر سے خالی۔ رستم بھی ہوتا تو اس کے سر سے بھیجا نہ نکال سکتا۔ کیونکہ یہ چیز اس کے سر میں تھی ہی نہیں۔ لیکن انگریزوں کے قتل نہ کرویتا تو جس طرح اس وقت اس کا

ڈال دوں۔

کلون: اسے نجیٹ کیلئے کیا ہمارے ہاں سے تجھے نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کون ہیں۔

کلون ریوس: نہ تیرے کپڑوں سے اور اس سے جس نے انہیں پہن رکھا ہے۔ بتا کیلئے تیرا دوا کون تھا جس نے تیرے یہ کپڑے تیار کئے تھے جن سے تو آدمی معلوم ہو رہا ہے۔

کلون: اسے ذلیل کیلئے، میرے دوزی کے ہاتھ کے یہ کپڑے نہیں ہیں۔

کلون ریوس: تو پھر یہاں سے دور ہو اور اس کا احسان ماننا رہ جس نے تجھے یہ کپڑے دئے ہیں تو تو کہیں کا احمق بیوقوف چوہا سمجھے پھٹ کر یہاں سے نکالنا نہیں چاہتا۔

کلون: اسے بد ذات لے میرا نام سن اور سر پاؤں تک لرز جا۔

کلون ریوس: آخر تیرا نام کیا ہے۔

کلون: میرا نام کلون ہے۔ سننا تو نے شدید طان! کلون ریوس: کلون یا اس سے بھی بڑھ کر بد معاش تیرا نام ہو۔ میں اس سے ڈرتا نہیں۔ بندر۔ سانپ۔ مگڑی تیرا نام ہوتا تو ڈرتا بھی۔

کلون: اچھا اور سن۔ اب تو تیرا دم نکالے گا۔ سن میں ملکہ کا فرزند ہوں۔

کلون ریوس: یہ سنکر افسوس ہوا کیونکہ تو ہرگز اس نسب کے لائق نہیں۔

کلون: کیا اب بھی تو مجھ سے نہیں ڈرتا۔

کلون ریوس: میں تو صرف اس سے ڈرتا ہوں جو عقل رکھتے ہیں اور انہی کا میں ادب بھی کرتا ہوں۔ مجھ جیسے احمق پر تو میں ہنستا ہوں۔ ڈرنا کئے کہتے ہیں۔

کلون: اچھا تو ادھر آؤ۔ میں تجھے موت کے گھاٹ اتار دوں۔

میرے ہاتھ میں ہے اسی طرح میرا سر اُس کے ہاتھ میں ہوتا۔

بلاریوس اور یہ تم نے کیا غضب کیا۔

گداریوس بہ جو کچھ کیا باطل سچا اور درست کیا۔ ایک آدمی کلون نامی کو مار کر اُس کا سر کاٹ لیا۔ اور یہ کلون بقول خود کئی ملک کا بیٹا تھا۔ اُس نے مجھے کہیں نہ باغی اور پہاڑی رہنم کہا تھا اور قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ ہم جینیوں کا سر اُٹا کر نہیں لندن کی فسیل پر پٹھانے گا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہاتھ میری جہاں سے وہیں ہیں۔

بلاریوس۔ بس سمجھ لو کہ اب ہماری خیر نہیں۔

گداریوس۔ کیوں باباجان؟ کیوں خیر نہیں؟ ہمیں کیا نقص پہونچ سکتا ہے اُس نے تو قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ جینیوں کو مار ڈالے گا جب قانون ہمیں پناہ نہ دے گا تو پھر ہمیں رحل بنڈ کی کیا ضرورت تھی۔ جب ایک آدمی مغرور اور گستاخ بن کر ہمیں دھمکیاں اور ڈراوے دے، خود ہی میری عدالت اور خود ہی جلا دینے تو پھر ہمیں ترس کیوں آتا۔ قانون سے تو ہم ہر وقت ڈرتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہوا کوئی اور بھی ایسے ساتھ ہے۔

بلاریوس۔ ہمیں تو چڑیا تک نظر نہیں آتی۔ مگر احتیاط شرط تھی۔ خیال یہی ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نوکر یا ملازم ساتھ ہوگا۔ گو اُس کی کیفیت پر تھی کہ ہر دم مزاج بدلتا رہتا تھا اور وہ بھی بد سے بدتر کی طرف اُس کے یہاں تک تنہا چلے آئے کہ سو سن جنوں یا دیوانگی اور کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ دربار میں ہرچیز دوڑایا جاتا کہ ہم جو اس غار میں رہ کر شکار کھیل کر رہے ہیں قانون کی پناہ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ کوئی قبی ایٹ لٹے کہ ہم زیادہ زور پکڑ جائیں۔ بادشاہ اتنی خبر سننے ہی حسب عادت غضبناک ہو جاتا۔ اور حکم دیتا کہ فوراً گرفتار کر کے ہمیں حاضر کیا جائے۔ میرا تو اب تک یہی خیال ہے کہ وہ ہمارا تک

تنہا نہ آیا ہوگا۔ نہ تو خود اس کی اتنی ہمت ہو سکتی ہے اور نہ اسے اس کی اجازت ملتی۔ بس میرے خون کی وجہ مقتول تھی ہر شخص کا سر اتنا خوفناک نہ سمجھو جس قدر کہ اس کی دم خوفناک ہے۔

اردویرنگیں۔ جو کچھ شہیت میں تھا اُس کا پیش آنا ضروری تھا۔ بھائی پولیدور نے جو کچھ کیا وہ اچھا کیا۔

بلاریوس۔ میرا تو آج شکار کیلئے کوچی نہیں چاہتا۔ اس لڑکے فیدلی کی علالت نے تو میرا راستہ اتنا طو لانی کر دیا ہے کہ کالے نہیں کٹتا ہے۔

گداریوس۔ خود کلون کی تلوار سے جو وہ میرے گلے پر چلائی چاہتا تھا۔ میں نے اس کا سر قلم کر دیا۔ اور اب سر کو ٹپان کی پشت پر جو رنج ہے اس میں ڈال دینگا تاکہ وہ بہتا ہوا سمندر میں بہوئے اور وہاں مچھلیوں کو بتائے کہ ملکہ کے فرزند کلون کا سر ہوں۔ یہی میرا ارادہ ہے۔

بلاریوس۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انتقام ہم سے ضرور لیا جائیگا۔ کاش پولیدور تو ایسا نہ کرتا۔ مگر مقتضائے جوائنمردی یہی تھا۔

اردویرنگیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ کام میں نہ کرتا اور کچھ اس کا بدلہ لیا جاتا مجھ ہی سے لیا جاتا۔ پولیدور میں تجھے بھائیوں کی طرح چاہتا ہوں۔ مگر اس بات کا ضرور شک ہے کہ ٹوٹے کلون کا سر کاٹنے کا موقع مجھے نہ دیا۔ کاش میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا یہیں موقع مل جاتا۔ تاکہ ہم اپنی حفاظت کیلئے دشمن کی مدافعت پوری طاقت سے کرتے۔

بلاریوس۔ خیر جو کچھ ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہم شکار نہ کھیل گئے اور کوئی ایسا خطرہ جس میں ہمارا نفع نہ ہو۔ خود تلاش نہ کریں گے۔ بس لڑکو آؤ۔ اپنے چٹان کو چلیں۔ تم اور فیدلی کھانا تیار کرو۔ میں اور پولیدور یہیں ٹہرے ہیں۔ کھانے کے وقت تک پولیدور

کاسر ایک بہتے دریا میں ڈال دیا ہے کہ ماں کو فرزند کے ماتے جانے کی خبر دے۔ اور اس بات کی ضمانت میں اس کا دھڑ یہاں رکھ لیا ہے۔

(دوستی کی دردناک آواز کان میں آتی ہے۔)

بلاریوس :- میرا یہ باج ابھی عجیب ہے۔ پولیدر سُنو تو وہ بچ رہا ہے۔

گدریوس :- کیا کاڈول گھر میں ہے؟

بلاریوس :- ابھی تو گیا ہے۔

گدریوس :- باجا جانے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب سے ہماری ماں دایہ کا انتقال ہوا ہے۔ کسی نے اب تک باجے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ دردناک گتیں تو دردناک موقعوں پر بجانی جاتی ہیں۔ یہ بات کیا ہے۔ بے حقیقت باتوں پر جوش آنا یا فدا ذرا سی بات پر گرہ دینا تو بندروں کی جست و خیز یا بچوں کا ردنا ہوتا ہے۔

بلاریوس :- تو، وہ کاڈول خود آ رہا ہے۔ اور وہ چیز بھی اٹھاتے لارہا ہے۔ جبکی وجہ سے ہم اسے الزام دیتے تھے۔

(اردیر بھی پھرتا ہے اور ایمین کو جو مردہ معلوم ہوئی پوچھ دیتا اٹھاتے ہے۔)

اردیر گیس :- لیجئے وہ طائر خوش نوا جس کی ہم کبھی کبھ فدا کرتے تھے، آج اڑ گیا۔ مجھے تو منظور تھا کہ میری عمر بچا ہے سولہ سال کے ساٹھ برس کی ہو جاتی۔ بچا ہے جوانی کی تپتی چالاکی کے بڑے چاہے کی ٹشیا بغل میں ہوتی مگر یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

گدریوس :- لے لے تازک اور حسین پھول، میرے بھائی کے اٹھوں میں اٹھا ہوا اتنا حسین نہیں معلوم ہوتا جیسے کہ انڈیا پاول پر چلتا ہوا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

بلاریوس :- لے بچ و من کون ہے جس نے تمہاری تھا پکا کوڑ

کو ساتھ لے آتا ہوں۔

اردیر گیس :- غریب فیدی بار ہے میں تو اس کے پاس بیٹھتا ہوں۔ خدا کرے کہ لے اپنا پہلا سازنگ روپ مل جائے۔ اگر ایسا ہو تو کلون تو ایک ٹھکانا، گلوٹنوں کے ایک پورے محلے کا خون کرنے کو بھی بھی سمجھوں کہ میں نے بڑی رحمی سی کام لیا ہے۔

بلاریوس :- لے دی۔ لے پاک فطرت تو اپنا نوران شہزادوں پر غلبہ چھو۔ یوں تو یہ دونوں ایسے نیک دل اور پاک نفس ہیں جیسے باد صبح نرگس کے پھولوں میں چلتی ہو اور پھولوں کے طوقوں کو بخشش تک نہ ہو لیکن جب بادشاہوں کا خون ان کی رگوں میں جوش مارتا ہے تو وہ ایسے تیز و تند ہو جاتے ہیں جیسے طوفان میں ہوا کے سخت سے سخت جھونکے ہوں۔ چوہاڑ پر چار کے اونچے سے اونچے درخت کی چوٹی کو گھاٹی کی طرف مچھکا دیتے ہیں۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ منیر اس بات کا علم رکھے کہ وہ ایک بادشاہ کے فرزند ہیں۔

محض عقل حیوانی ان میں یہ شان و عظمت پیدا کرتی ہے جو کسی سے انہوں نے سیکھی نہیں۔ اور وہ اخلاق ان میں نظر آتا ہے جو کسی نے ان کے ساتھ ظاہر نہیں کیا ہے۔ فطرت اعلان کرتی ہے کہ وہ نسب شاہی رکھتے ہیں۔ بہت شگفتہ خود در درخت کی طرح ان میں پھولتی پھلتی ہے اور وہ میوے ان میں پیدا کرتی ہے کہ گویا میوے ہی کے لئے یہ درخت لگائے گئے تھے۔ لیکن مجھے ابھی تک یہی خوف ہے کہ کلون کا یہاں آکر مارا جانا ہمارے حق میں کسی خرابی کی تشہید نہ ہو جائے خدا کو خبر ہے کہ اس کے مارے جانے کا نتیجہ ہمارے لئے کیا ہے۔

(گدریوس پھرتا ہے۔)

گدریوس :- میرا بھائی کا ڈول کہاں ہے، میں نے تو کلون

چہرے کو ٹھک لے۔ اس کی منتہا کی اس خدمت و خیر گیری پر اُن دولت رسیدہ و رنکا کو شرمندہ ہونا چاہیے جو اپنے باپ کی قبر کو بغیر کسی یادگار کے بوہی پڑا رہے دیتے ہیں۔ جاڑے میں جب پھول نہیں رہیں گے تو یہی چیزیں تیری قبر پوش اور تیرے مزار کی زائیر ہو جائیں گی۔

گد ریوس۔ جہاں کی گھر کے یہ شاہواز گفتگو بند کر دو۔ یہ موقع بہت رنج و صدمے کا ہے قہر مہوں میں وقت گزار کر اس فرض کو ادا کرنے میں تاخیر نہ کرو۔ جو سب زیادہ ضروری ہو۔ اس وقت جو سب پہلا کام کرنے کا ہے وہ اسے دفن کرنا ہے۔ جلد قبر کی تیاری کریں۔

ارویر نیگیس۔ بتائیے اسے کہاں دفن کریں؟

گد ریوس۔ جہاں ہماری اماں واپہ یو ریگی رہی ہو۔

ارویر نیگیس۔ باطل دُست ہے۔ اور بھائی پولیدور گراب ہماری آوازیں اب جان ہو جانے سے ہماری پڑ گئی ہیں، لیکن جس طرح ہم نے اپنی ماں یو ریگی کو نوہ گا کر سپرد خاک کیا تھا اسی طرح اس فیدنی کو بھی دفن کر بیٹھے۔

گد ریوس کا دول مجھ سے گایا نہ جاتے گا۔ میں صرف روتا رہوں گا۔ اور اس گریبے میں تعریف و توصیف کے جلوں میں میں مجھ سے بڑھ جاؤ گا کیونکہ نوہ غم کے المائے بن سزا ہو جانا پادریوں کے جھوٹے مرثیوں اور ان جھوٹی عبارتوں سے بدتر ہوتا ہے جو بطور یادگار قبروں پر کندہ کی جاتی ہیں۔

ارویر نیگیس۔ اچھا کچھ گائیں گے نہیں۔ گائے کی جگہ قہض اس کی تعریف و توصیف کر بیٹھیں۔

بلار یوس۔ غم جتنا ہی زیادہ ہو اتنا ہی اُس کا علاج کم ہونا چاہیے۔ لڑکوں کو تو باطل ہی بھول گئے۔ خیال کرو کہ وہ ایک ملک کا فرزند تھا۔ گو یہ سچ ہے کہ ہمارا دشمن بلگر یہاں آیا تھا مگر اس دشمن کی سزا کو وہ پہنچ چکا ہے۔ مگر وہ جو یا

گیلی مٹی کا پتلا جلایا ہو جہاں تمہارا سست رومغین آسانی سے قیام کر سکے۔ پیاری جان اُخدا ہی کو طعنے ہے کہ تو بڑھکر کیسا خوب رو بھولا جان نکلتا مگر رنج و غم نے تو مجھے لڑکپن ہی میں گھٹا گھٹا کر ختم کر دیا۔ کا دول جب تم گھر گئے تھے تو اسے کس حال میں پایا تھا۔

ارویر نیگیس۔ بالکل اکڑا ہوا پڑا تھا۔ جیسے کہ آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ کسی مٹکی کے بیٹھے سے گد گدی ہوئی ہو۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ موت کے تیرے گھائل ہو اسے۔ وایاں رُخسار کیجیے پڑ بھا ہوا تھا۔

بلار یوس۔ لیٹا کہاں تھا؟

ارویر نیگیس۔ زمین پر لیٹا تھا۔ دونوں ہاتھ اس طرح سینے پر رکھے تھے۔ میں سمجھا کہ سوتا ہے۔ میں نے اسے بے ہماری جوتے اس خیال سے اُتار دئے تھے کہ کہیں اُن کی آواز سے جاگ نہ جائے۔

گد ریوس۔ وہ تو ابھی تک سوتا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر حقیقت میں گد گیا ہے تو اُس کی قبر سونے کی سیج ہو گئی اور یہاں اُس سے اس کی قبر پر اترتی ہو گئی۔ کیڑے مکوڑے اس کے پاس ہرگز نہ آئیں گے۔

ارویر نیگیس۔ پیائے فیدنی جب تک بہار کا موسم ہے اور میں یہاں رہتا ہوں اور تیری اس پُرجن و مال پر حسین و حسین بھول بچھا کر دوں گا۔ ان پھولوں میں زرد گلاب جو تیری جلد سے ہر رنگ ہو گا۔ اور ہلکے نیلگوں پھول جو تیرے لبوں کے رنگ سے مشابہ ہونگے تیری قبر پر بکھیر دوں گا۔ اور ان میں ہر گ نسریں بھی جو نئے جس کی خوشبو کچھ کم نہیں لیکن تیرے شمیم نفس کو وہ کہاں پہنچتی ہے پھر تیری قبر پر وہ سینہ سرخ طاہر خوش رنگ منقار میں کافی کے ٹکڑے لئے آئے گا کہ تیرے

بادشاہ ہو، یا عالم ہو، یا پہلوان سب ہی کو یہی دن دیکھنا ہے اور خاک میں مگر خاک ہونا ہے۔
اب بجلی کی جھک اور کرلک کا تھجے در نہیں۔ اور نہ مینہ ہرستے وقت اولوں کا۔

اب تھجے لوگوں کے اعتراضوں کا خوف اور نہ نغمہ چینیلوں کا ڈہری۔ ٹورنج خوشی و دولوں کو ختم کر چکا۔

تمام چاہنے والے اور نوجوان عشاق تیرے ہی پاس آکر خاک ہونے والے ہیں۔

اب نہ تو کوئی مٹا سنا تھجے نقصان پہونچا سکتا، اور نہ کوئی ساحلے محرت تھجے ستا سکتا ہے۔

وہ روعیں جن پر مرتے وقت دعائیں نہیں پڑھی گئی ہیں اور جو دنیا میں آوارہ پھرتے ہیں تھجے پریشان نہ کر سکیں۔

کوئی خرابی اب تیرے نزدیک نہ آسکی چپ چاپ مٹی میں لکڑی ہو تارہ۔ خدا تیرے مزار کو شہرت بخشے۔

(بلاریوس کلون کی لاش کو لئے آئے)

گدریوس، ہم نے موت کی کل رسیں ختم کر لیں۔ آؤ، اب اس لاش کو بھی کہیں پر رکھ دینا۔

بلاریوس، پھول تھوڑے رہ گئے ہیں۔ آؤ، رات کے قریب اور پھول لائیں گے۔ قبروں پر ڈالنے کیلئے تو وہ پھول اچھے ہوتے ہیں۔ جن پر رات کی ٹھنڈی شبنم پڑ چکی ہو۔ لائر کو چت نہ ہو۔ تم بھی کبھی پھول تھے۔ مگر اب مٹا گئے ہو۔

اور یہی حال ان پھولوں کا ہو گا جو اس وقت تم پر پڑا ہے۔ لے رہے ہیں۔ لے کر ادھر آؤ۔ جدا جدا کھڑے ہو کر کھلنے زمین پر ٹیک دو۔ وہی چیدہ خاک لے رہے ہیں وہی صی اب خاک والیں لے رہی ہے تمہاری خوشیوں کے ساتھ تمہاری تخلفیں بھی ختم ہوئیں۔

(بلاریوس، گدریوس، اور اندر بچس پہلے جاتے ہیں)

زبردست قبریں دونوں ایک ہی طرح لگتے مڑتے ہیں۔ مٹی ان دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن احترام اور وقار جو دنیا کے فرشتے ہیں، اعلیٰ و ادنیٰ میں فرق مراتب کا لحاظ کرتے ہیں۔ ہمارا دشمن ایک شہزادہ تھا۔ اور گو تم نے اسے اپنا دشمن سمجھ کر مار ڈالا مگر اس کو ایک شہزادے کی حیثیت کہیں دفن کرنا ضروری ہے۔

گدریوس، مہربانی کر کے اس کی لاش ادھر اٹھا لائیے۔ ایک بیوقوف سزا بھی ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک بہادر اور جفاکرو جبکہ دونوں مر چکے ہوں۔

اروریرگیس، اگر یہی مرضی ہے تو اسے اٹھا لیتے اور جیتنا ہ لے ہم نوہ پڑتے ہیں۔ بجائی شروع کیجئے۔

گدریوس، نہیں، پہلے اس کا منہ مشرق کی طرف کر دو۔ ہمارے باپ اس میں مصطوت سمجھتے ہیں۔

اروریرگیس، درست ہے۔

گدریوس، اچھا آؤ ادھر سے اٹھاؤ۔

اروریرگیس، اب نوہ شروع کرو۔

نوہ

”اب تھجے نہ سورج کی گرمی کا ڈر ہے اور نہ جاڑے کی تیزی کا۔ دنیا میں جو کچھ تھجے کرنا تھا وہ تم ہوا۔ اور جہاں کا تو تھا وہیں چلا گیا۔ اپنی محنت کی مزدور چکا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں چاہے سونے کے بنے ہوں مگر سب کو ایک خراب کوسلے والے کے لڑکے کی طرح ایک دن مگر خاک ہونا ہے۔

اب تو بڑے لوگوں کے عتاب اور غصے سے خوف نہ کر اور عالموں و فاضلوں کی زرد سے بھی اب تو ڈرو۔ اب تھجے کھو

فکر نہ ہو گا اور نہ پیسے کا۔

اب تیرے نزدیک ایک کمزور نرسل بھی ایسا ہی ہے جیسے مضبوط بلوط۔

اے پستانبو! بلکہ کہتے ہیں غم سے دیوانی ہو کر یونانیوں کو جتنے کوٹنے وٹے تھے اب میں اپنی طرف سے کوٹنے اور شال کیسے تجھے دیتی ہوں۔ تو نے اس موذی شیطان کلون کے سازش کی اور میرے آقا کا سر کٹوا دیا۔ آج سے سب لکھنا پڑھنا۔ دغا اور فریب بھجا جائے۔ ارے ملعون پستانبو! تو نے حملی خط بنا کر دنیا کے سب عظیم الشان بہاؤ کو غارت کیا۔ اُس کے سب اُونچے مسئول کو تو رو دیا۔ ہاتے پو سکی تیرا سر کہاں ہے؟ پستانبو! چاہے تو اُس کے دل میں تلوار بھونک کر کُٹے مارتا۔ مگر اس کا سر چھوڑ دیتا۔ یہ کہاں ہوا۔ کیونکر ہوا۔ پستانبو تو ہی بتا۔ پستانبو! در کلون کے سوا کبھی دوسرے کا کام نہیں۔ ایک طرف غیظ، بغض و عداوت دوسری طرف روپے کی طبع، ہونٹوں نے یہ دردناک صورت پیش کی ہے۔ ظاہر ہے۔ کیا کلام ہے۔ جب دعا اُس نے مجھے دی تھی تو کہا تھا کہ یہ بڑی اکیس ہے۔ کیا میں نے نہیں دیکھا کہ حواس پر اس کا اثر قاتل ہے۔ اس پستانبو کی یہ حرکت ثابت ہے۔ یہ کام پستانبو اور کلون کا ہے۔ لے خون اپنے رنگ سے میرے رخسارے سرخ کر دے۔ تاکہ جو کوئی ادھر سے گزرے اس کا خوف اور بڑھ جائے۔ لے خدایا۔ میرے خدا۔

(ایجوین لاش پر گرتی ہے۔)

(رومانی سپر سالاریہ کوس، ایک کپتان اور

دیگر افسران فوج معاہدہ ایک بومی کے آتے ہیں۔)

کپتان۔ حضور کے حکم کے مطابق گایا۔ (افراس) میں جس قدر فوجیں بڑی تھیں ان سب سمندر عبور کر لیا ہے اور اس وقت وہ ملغور دیہون میں اپنے جہازوں سمیت لڑائی کیلئے باہل تیار ہیں۔

لیو کوس۔ لیکن روک سے بھی کوئی فوج آئی؟

کپتان۔ ارکان مجلس انتظامی نے اعلیٰ کے شرفا اور سرحد

ایجوین۔ (جھاگ کر) جی ہاں۔ ملغور دیہون۔ اُس کا راستہ کدھر ہے۔ شکریہ۔ اچھا جھالڑی سے راستہ جانا ہو گا۔ یہ پانی کر کے اتنا اور تباہی کے وہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ اُسے غضب۔ کیا ابھی چھ میل اور چلنا ہے۔ آدھی رات تو پھلتے چلتے ہو گئی۔ جو کچھ ہو میں تو اب پڑ کر سو جاتی ہوں کبھی ساتھ دلے کی ضرورت نہیں۔ اُسے دیوتا و دیویو۔

(کلون کی لاش دیکھتی ہے۔)

یہ پھول تو دنیا کی راحتوں کی مثل ہیں۔ اور یہ خون آلودہ لاش اپنی تخلیق خود میان کر رہی ہے۔ خدا کرے کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یاد آتا ہے کہ ابھی ابھی ایک غاریں گھر والی بی چنڈا پھاندار دیویوں کے لئے کھانا تیار کر رہی تھی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو جب بخارات دماغ سے اُٹھتے ہیں تو وہ خالی خالی تیر جگہ کسی کو اپنا نشانہ نہیں بناتے۔ ہمارے خیالات اور ہماری تجویزوں ہی کی طرح ہماری یہ آنکھیں بھی اندھی ہوتی ہیں۔ خدایا! میں تو خوش اب تک لڑ رہی ہوں۔ مگر لے خدا اگر عرش پر ایک قطرہ بھی رحم کا ہو۔ خواہ وہ ایک چھوٹے سے چھوٹے پتھر کی چشم معصوم ہی کے برابر نہ کیوں نہ ہو۔ مگر اس کا تھوڑا سا حصہ بچے دے۔ خدا کا خوف میرے دل میں ہے اور وہ خواب ابھی تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ گوجاگ رہی ہوں۔ اس کی باتیں ظاہر ہیں بھی اتنی ہی سانسے ہیں جیسے کہ باطن میں وہ موجود ہیں۔ صرف خیال ہی میں نہیں بلکہ غارت میں بھی وہ محسوس ہو رہی ہیں۔ ایک سر کٹاؤنی پڑا ہے۔ سر ندارد و کچھ اسے تن پر پو سکی مس کے ہیں۔ اس کے پاؤں کی نعلیں مجھے خوب یاد ہے۔ پورا تھم بھی اسی کے ہیں، قدم مچھوڑی کی شکل کے ہیں۔ ران خدا سے مارنے کی ران سے مشابہ ہے اور ہر قل کے مثل بازو مضبوط ہیں۔ لیکن ہاتے وہ چہرہ کا سا چہرہ اور سر کہاں ہے۔ اُسے کیا عرش پر خون ہوا ہے کہ سر غائب ہے۔

ہے۔ لڑکے تو اپنا حال بتا۔ کیونکہ تیرا حال معلوم کرنا ضروری ہو۔ یہ کون ہے جسے تو نے اپنا خون آلود ٹکچہ بنایا ہے۔ اور وہ کون تھا جس نے فطرت کی اس تصویر کو اس طرح بگاڑ کر اُس کو بدل دیا۔ اور اس خرابے و دیر لے سے تیرا کیا تعلق ہو۔ یہ واقعہ کیونکر پیش آیا۔ یہ کون تھا اور تم کون ہو۔

ایو جین۔ میں تو کچھ نہیں ہوں۔ یا جو کچھ ہوں اس سے کچھ نہ ہوتا۔ میرے حق میں بہتر موتا۔ یہ میرا آقا تھا۔ یہ بڑا جری و بہادر برطانوی تھا اور بڑا نیک شخص تھا۔ پہاڑ کے دشمنوں سے مار ڈالا۔ افسوس اب ایسے آقا کہاں ملتے ہیں۔ مشرق و مغرب تک بھی لو کر ہی کیلئے کوئی دھوئندہ نا پھرے۔ بہت سے آقاؤں کی آزمائش کرے۔ اسچے بھی ملیں گے۔ خدمت بھی ایمان داری سے کی جائے گی۔ یہ سب کچھ درست مگر ایسا آقا اب نصیب نہ ہوگا۔

لیو کوس۔ افسوس لڑکے تیرا بیان سنکر دل پر وہ اثر ہوتا ہے کہ اس خون کو دیکھ کر نہیں ہوتا۔ اچھا بتا اسکا نام کیا تھا۔

ایو جین۔ ”جرود و کمپ“ (علیحدہ کہتی ہے) میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ مگر اس میں کمی کا نقصان نہیں کرتی۔ مگر خدا سن رہا ہے امید ہے کہ وہ میرا قصور معاف کر دے گا۔ آپ نے کیا فرمایا؟

لیو کوس۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟

ایو جین۔ حضور مجھے قیدی کہتے ہیں۔

لیو کوس۔ تو اسم با سنی ہے۔ تیری وفاداری پر یہ نام خوب چھبتا ہے۔ تیری وفاداری ہی تیرا نام ہے۔ کیا تو میری ملازمت قبول کریگا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جیسا تیرا پہلا آقا تھا وہ اب اسی آقا میں ثابت ہوگا۔ لیکن یقین رکھ کہ میری محبت بھی اس سے کم نہ ہوگی۔ اگر روم کے قیصر کے سفارتی

اکمل کے قبائل میں جوش پیدا کیا ہے اور وہ سب بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو گئے ہیں اور امپد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی پیش قدمیات اس جنگ میں پیش کر چکے۔ یہ کل مشرفا اور سرحدی قوین جمع ہو گئی ہیں اور یا چھو برا اور سینا کی سرکردگی میں ہیں۔ جرود کا مشہور مشرین زادہ ہے۔ لیو کوس۔ کینک انکے یہاں پہنچنے کی توقع ہے۔

کیتان۔ سمندر پر بادِ موافق چلتے ہی انہیں یہاں پہنچا دیئے۔ لیو کوس۔ اس خبر سے ساری امیدیں قوی ہوئیں۔ کپتانوں کو حکم دو کہ جس قدر فوجیں آگئی ہیں ان سب کو یکجا ہونے کا انتظام کریں۔ اچھا۔ اب لے جوی بناؤ کہ تم نے اس لڑائی کا کیا انجام دریافت کیا۔

نجومی۔ کئی روز تک خداؤں سے مسلسل دعا میں مانگنے کے بعد کہ کچھ خبر دی جائے کل شب کو انہوں نے مجھے ایک رویا دکھایا ہے۔ اس میں کیا دیکھتا ہوں کہ خدائے جوتہ پٹر کا خاتر یعنی روم کا عقاب سمت جنوب اڑتا ہوا مغرب کے اس حصہ میں آیا ہے اور یہاں آتے ہی سوچ کی چمکتی کرنوں میں غائب ہو گیا ہے۔ اگر میرے گناہ اس خبر کو غلط نہ کر دیں تو یہی بہشت چاہیے کہ روم کی فتح ہوگی۔

لیو کوس۔ خدا تمہیں ہمیشہ ایسے ہی سچے خواب دکھائے اور کبھی وہ غلط نہ ہوں۔ ہائیں۔ ٹھہرو۔ دیکھو یہ ناش کسی ہے جس کا سر غائب ہے۔ شک تہ آثار بتا رہے ہیں کہ سمار ہونے سے پہلے یہ عمارت بڑی شاندار ہوگی۔ اور یہ غلام کیسا ہے جو لاش پر بڑا سوتا ہے۔ غالباً یہ بھی مر گیا ہے کیونکہ فطرت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی زندہ مردہ کو اپنا بستر بنائے۔ یا مرنے پر پڑ کر سو رہے۔ خدا اس لڑکے کی صورت دیکھنے دو۔

کیتان۔ حضور لڑکا زندہ ہے۔

لیو کوس۔ اُس سے پوچھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لاش کیسی

خطوط بھی کسی قنصل کے ذریعے میرے پاس لگتے خود تیرا حال جتنا تیرا سفر ناشی بنتا ہے وہ نہ ہوتے۔ آؤ ہاے ہمراہ چلو۔

ایکوجن۔ میں حضور کے ساتھ ہوں۔ لیکن ہمراہ چلنے سے پہلے اپنے آفاقی لاش کو کتھیں سے بچانے کیلئے اپنی انگلیوں سے گرٹھا کھودوں اور اس گرٹھے میں لے دفن کر کے اس پر جھگل کے کچھ پھول ڈال دوں اور جو دعائیں مجھے یاد ہیں وہ اس پر پڑھ لوں اور جی کھول کر اس کے لئے روہوں تو پھر آفاقی اس خدمت فارغ ہو کر میں حضور کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں۔ اور پھر حضور مجھے اپنا ملازم سمجھیں۔

ایو کو کس۔ لے لے لڑکے آقا نہیں ہیں تو باپ بن کر تیری پروردگر کر دینگا۔ دوستو! دیکھو یہ لڑکا ہم کو کیسی مروانہ باتیں سکھاتا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی بہت ہی خوبصورت جگہ جہاں پھول مل سہے ہوں تلاش کریں اور وہاں اپنے ہتھیاروں سے قبضہ کر لیں اور اس لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر دفن کر دیں لڑکے اب تیرا یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے اور یہ لاش ایک سپاہی کی لاش کی طرح جگہ فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کی جائے گی اب تو خوش ہو۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ لیضر بستیاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ وہی زیادہ بلندیوں پہ پہنچنے کا باعث ہو جاتی ہیں۔

تیسرا منظر۔ نصر شاہی کا ایک کمرہ۔ بادشاہ سمبلین۔ امراء پسانیاو اور غلام شاہی داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین۔ خادم، پھر جا کر خبر لا کہ ملکہ کا مزاج اب کیسا ہے۔ اور وہ کہاں ہیں۔

(ایک خادم جاتا ہے)

ملکہ اپنے فرزند کے کہیں نکل جانے سے بہار پر گئی ہے اور حرمینوں کا سا معلوم ہوتا ہے۔ جان کو خطرہ ہے۔ فدایا

اس حال کو دیکھ کر میرا دل کیسا بڑا جاتا ہے۔ ایکوجن جو میرے دل کی چین و راحت کا بڑا ذمہ دہ تھا کہیں چلی گئی۔ ملکہ بیمار ہو کر بستر پر پڑی ہیں۔ اور تھوڑی ہی زمانہ باقی ہے کہ ایک سخت جنگ بپڑ آئے گی۔ ملکہ کا فرزند بھی کہیں نکل گیا جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اب چین و آرام مجھے کسی نصیب نہ ہو گا۔ (پسانیاو سے کہتا ہے) مگر تجھے لے انصاف ضرور ملے گا کہ ایکوجن کہاں گئی ہے۔ تو انجان بیتا ہے مگر یاد رہے کہ مجھے سخت سے سخت اذیتیں پہونچا کر ہم نکل حال معلوم کر لیجئے۔ پسانیاو۔ عالی جا یا یہ جان حضور ہی کی دی ہوئی ہے اور حضور ہی کے لئے حاضر ہے۔ مجھے مطلق علم نہیں کہ شہزادی صاحبہ کہاں تشریف رکھتی ہیں۔ اور کیوں یہاں سے تشریف لے گئی ہیں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ کب تک واپس آئیگی یا دشاہ سلامت! میری درخواست ہے کہ حضور مجھے اپنا خادم جاننا سمجھیں۔

پہلا امیر۔ خداوند غنوت! گذارش ہے کہ جس دن سے شہزادی صاحبہ تشریف لے گئی ہیں، یہ شخص برابر یہیں موجود رہتا ہے۔ میں ضمانت لیتا ہوں کہ یہ آدمی چلے۔ حضور جو حکم اسے دینگے وہ سچی نیت اور خیر خرامی سے انجام دے گا۔ رہا ملکہ سلامت کا فرزند کلونٹن تو انہیں کی تلاش میں زیادہ تر دو کی ضرورت نہیں، وہ تو یقینی مل جائے گا۔

سمبلین۔ وقت بڑا آیا ہے۔ (پسانیاو سے کہتا ہے) ہم تمہیں ایک خاص مدت کیلئے رہا کرتے ہیں۔ ہمارا شبہ ابھی تک کم ہے۔ پہلا امیر۔ اب یہ گذارش اور ہے کہ رومانی فوجیں گائیا (فرانس) سے جمع ہو کر ہمارے ساحل پر آ کر ترائی ہیں اور انکے علاوہ رومانی مجلس نے وہاں کے شرفا کی بڑی بڑی جماعتیں لڑنے کیلئے کثرت روانہ کی ہیں۔

سمبلین۔ اب ضرورت تھی کہ ملکہ اور اس کے فرزند سے مشورہ کرنا۔ ان کو ہر طرح معاملات کو مجھے ہر پٹان کر دیا ہے۔

گدریوس :- یہ چاروں طرف کیسا شور ہے۔

بلاریوس :- ہیں اب یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہیے۔

ارویگنس :- اگر ہر کام سے یہاں اکتھ پر ہاتھ دھریے بیٹھے ہا تو بتائیے کہ اس میں زندگی کا کیا خاک لطف ہوگا۔

گدریوس :- واقعی اگر کہیں ٹھہر کر بیٹھ گئے تو پھر کیا امید ہو سکتی ہے۔ اگر یہی طریقہ رکھا تو ایک طرف رسک رومانی اور دوسری طرف سے برطانیہ والے اگر ہمارا کام تمام کر دیں گے۔ یا شروع میں وحشی سمجھ کر کچھ دنوں اپنا کام نکالیں گے اور اس کے بعد قتل کروں گے۔

بلاریوس :- لڑکو! ہم پہاڑوں میں اُدھر چڑھتے ہوئے بلند مقاموں میں پہنچ جائیں گے اور وہاں تمام افات محفوظ رہیں گے۔ شاہی فوجوں میں ہماری شرکت کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ کلون کو ہم نے ابھی قتل کر دیا ہے۔ ہمیں کوئی جانتا نہیں اور نہ ہم کسی لڑنے والے فریق میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہماری گرفتاری کی ہو جائے گی۔ جواب طلب کیا جائے گا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور ہم سے وہ جرم قبول کر لیا جائے گا جس کے ہم مجب مجھے ہیں۔ پھر ہمارے جرم کی سزا سوائے اسکے کچھ نہ ہوگی کہ اذیتیں تحفیل کشا کر ہم جان سے مائے جائیں۔

گدریوس :- آپ کی یہ باتیں نرے و ہم ہی وہم ہیں۔ اس کو ہمارا اطمینان نہیں ہوگا کہ ہم اونچے پہاڑوں پر کہیں جا کر ٹھہر جائیں اور نہ لڑکو ایسا مشورہ دینا زیب دیتا ہے۔

ارویگنس :- بھلا غور کیجئے کہ جب رومانی مرکب سواہیوں کے گھوڑے ہر طرف ہنہناتے ہوئے لڑکوں میں جا بجا لگ رہی ہوگی اور سب کے گوش و چشم نہایت اہم امور کے خیال میں مصروف ہونگے جیسا کہ اس وقت حال ہو رہا ہے تو اس وقت ہماری طرف کون متوجہ ہوگا اس امر کی تحقیق میں وقت ضائع کرنا کہ ہم کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔

پہلا امیر :- دلچاہہ دشمن کے مقابلے کیلئے بھی کچھ سی اس کی توتھنے میں آئی ہے جنگی تیاریاں حضور کی کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر دشمن فوجیں اور زیادہ بھیجے تو حضور ان کے مقابلے کے لئے بھی تیار رہیں۔ جو کچھ کی ہے وہ یہ کہ اپنی فوجوں کو نقل و حرکت کی کچھ لگایا جائے۔ حالیکہ وہ کئے بڑے نیلے بہتر قرار ہیں۔

سمبلین :- ہم تمہارے شکر گزار ہوتے۔ اب ہم جانا چاہتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ وقت پر حسب ضرورت تمام مشکلات کو رفع کرنے کے لئے ہم آمادہ اور تیار رہوں گے۔ ہمیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ اہلی ہماری پریشانی کیلئے کیا کچھ کرے گی۔ لیکن جو اتفاقات پیش آ رہے ہیں ان سے اللہ خائف ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

پسمانیو :- جس خط میں میں نے آقا کو اطلاع دی تھی کہ اب ہر قتل کر دی گئی ہے اس خط کا آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ بخت حیرت میں ہوں۔ اور نہ شہزادی صاحبہ کا کچھ حال معلوم ہوا حالانکہ نہ بولنے وعدہ کیا تھا کہ اپنی خیر خبر برابر دیتی رہیں گی۔ اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کلون پر کون گزری۔ غرض کہ سب طریقے سوائے فکرو پریشانی کے اور کچھ نہیں جس بات میں میں ہی سب سے بڑھکر سچا اور ایماندار ثابت ہو سکا۔ اس وقت جو لڑائیاں ہونے والی ہیں ان سے ہتہ چلے گا کہ مجھے اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہو اور جب وقت لگے گا تو بادشاہ بھی میرے حب وطن کے قائل ہو جائیں گے میں ان لڑائیوں میں لڑ کر اپنی جان دوں گا۔ پھر جو کچھ شکوک میری نسبت ہونگے وہ بھی صاف کر دوں گا۔ تقدیر تو وہ چیز ہے جو ایسی کشتیوں کو بھی جن کا کوئی ناخدا نہیں ہوتا امن و عافیت کی جگہ پہنچا دیتی ہے۔

چوتھا منظر :- دیکھو علاقہ۔ بلاریوس کے خار۔

کے سامنے بلاریوس :- گدریوس اور ارویگنس اہل

ہوتے ہیں۔

ایک گھوڑے کے جس کا سوار بھی میری طرح تھا کہ جس کے مونہ پر مہر بنک نہ تھی مجھے تو اس پاک چمکتے سورج کی طرف دیکھنے سے بھی شرم آتی ہے کہ اس کی روشنی سے نفع اٹھاؤں اور ایسا گناہ رہوں کہ کوئی نہ جانے کہ کون ہوں۔

گدریوس - واللہ میں ضرور رجاؤں گا۔ اگر چلتے وقت آپ نے دعائیں دیکر رخصت کیا تو میں لڑائی میں اپنی جان کی احتیاط کر کے لڑوں گا اور اگر آپ نے دعا نہ دی تو پھر رومانوں کے مقابلے میں جو خطرہ پیش آئے گا اس کی مطلق پرواہ نہ کروں گا۔

ارومیکس - میں بھی اس پر آمین کہتا ہوں۔

بلا ریوس - جب تم نوجوان ہو کر اپنی جانوں کو اتنا ارزاں سمجھتے ہو تو کچھ کراہ کر کہیں اپنی اس ٹوٹی بھوٹی پرائی پن چوری ناؤ کی عیسیٰ اپنی جان کی حفاظت کروں۔ لڑکو، میں بھی تمہارا ساتھ ہوں۔ اگر اپنے وطن اور ملک کی لڑائیوں میں اتفاق ہو تم نے جان دی تو جہاں تم مرد گئے وہیں موت میں میرا بھرتا بھی ہو گا۔ چلو آگے بڑھو!

(علحدہ کہتا ہے۔)

ان کی فطرت عالی اس وقت تک مضطرب و بیتاب رہی جب تک کہ وہ اپنا نسل شاہی سے ہونا ظاہر نہ کریں گے۔
(سب چلے جاتے ہیں)

بلا ریوس - فوج میں بہت لوگ ایسے ہیں جو مجھ سے واقف ہیں۔ برسوں کی بات ہے مگر خیال کرو کہ کلون اس وقت بہت کمزور تھا مگر اس کی صورت اب تک یاد رہی۔ علاوہ اس کے بادشاہ کو میری خدمت پسند نہیں آتی اور تم سے محبت و الفت کر نیکا موقع بھی اسے نہ ملا۔ پھر میری جلاوطنی کی وجہ تم دونوں کی غیرت پرست بھی بخوبی نہ ہو سکی، اس صحرائی زندگی میں طرح طرح کی سختیاں اٹھانی پڑیں۔ اس حالت میں یہ امید بٹ ہی گئی کہ تمہارے شاہی حسب نسب کا خیال کر کے تمہارے ساتھ مل کر آگیا جائے۔ بلکہ انہی پہاڑوں میں رہنا ہو گا۔ گرمی سے رنگت سیاہ ہے گی اور جاڑے میں سردی سے ہمیشہ کانپو لڑتے رہیں گے۔

گدریوس - یہ جو کچھ بھی ہو۔ اب اجازت دیجئے کہ ہم لڑکے میں جائیں۔ مجھے اور میرے بھائی کو تو کوئی نہیں پہچانتا اور اب تو آپ کو بھی لوگ بھول گئے ہونگے۔ یہاں برسوں سے رہتے رہتے آپ اتنے تبدیل ہو گئے اور آپ کی ڈاڑھی بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی نہ پہچنے گا کہ آپ کون ہیں بھلا خیال تو مجھے میرے لئے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ میں نے اب تک کسی آدمی کو مرتے نہیں دیکھا اور نہ سولے جنگی بکریوں، بڑوں، خروگوشوں یا صحرائے ہرنوں کے کسی کا خون دیکھا۔ جو نہ بھی گھوڑے پر سوار ہوا ہو سکا

جزو خاص

پہلا منظر - برطانیہ - رومانی لشکر کا وہ پتلی مس
باتھ میں ایک خون آلودہ رومال لئے آتا ہے۔

پوسٹی اس - لے خون آلودہ کپڑے میں تجھے ہمیشہ اپنے دم کے ساتھ رکھوں گا۔ کیونکہ اس رنگ میں میں نے ہی تجھے رنگایا ہے۔
لوگو! جن کی شادیاں ہو چکی ہیں اگر تم میں سے شخص یہی طریقہ اختیار کرے جو میں نے کیا ہے تو تم میں سے کتنے لوگ ہو گئے جو

ذرا ذرا سی بدگمانی پر اپنی بی بیوں کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہونگے۔ حالانکہ یہ بی بیائیں تم سے کہیں بہتر ہونگی۔ لے پستانو، ہرنیک ملازم اپنے آقا کے ہر حکم کو بجا نہیں لایا کرتا۔ سولے اچھے کاموں کے کسی قبیح فعل کے کرنے کی اسے پابندی نہیں ہو کر تھی۔ لے خدا! اگر تو میری سب خطاؤں کی سزا مجھے دیتا تو اب تک اس خطا کیلئے میں کیوں زندہ رہتا جو مجھ سے مرزا

ہوئی ہے۔ پھر ایجوہن کی جان بچ جاتی کہ باقی غورہ پشتیانی اور
ندامت میں گذارتی۔ میں بد بخت تو وہ ہوں کہ تو مجھ سے بد لگاتی
لیکن افسوس۔ اے خدا! تو تو تھوڑے سے قصور پر دینا سے
اٹھا لیتا ہے۔ یہ بھی تیری محبت اور تیرا ہی احسان ہے تاکہ وہ
جسے اٹھا لیا جاتا ہے زیادہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو۔ خداؤ! بعضوں
کو تم موقع دیتے ہو کہ وہ گناہوں میں مبتلا ہوں۔ جب ان کے
گناہوں کا طومار ہو جاتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں اور ڈر کر پشیمان
اور نادم رہتے ہیں۔ اور اس سے بھی انہیں نفع بخشنا پونیکو
ایجوہن تو تہاری ہی چیز تھی۔ اس کی جان بچا کر تم مجھے سزا دے
سکتے تھے۔ میں یہاں اتنی کے شریفوں کے ہمراہ لایا گیا ہوں تاکہ
اپنی محبوبہ کی سلطنت کے مقابلے میں لڑوں۔ اے برطانیہ! کیا
یہ کافی نہ تھا کہ میں نے تیری وارثہ کو ہلاک کر دیا۔ اس سے
بڑھ کر تو تم میں اب مجھے کیا پہونچا سکتا ہوں۔ اے خدا صبر کے
ساتھ اب میری یہ التجاسن لے، اب میں اٹلی کی یہ پوشاک جو
میرے تن پر ہے اتار چھینتا ہوں اور اس کی جگہ برطانیہ کے
ایک غریب کسان کے کپڑے پہنتا ہوں۔ اور بس جس فریق
کے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اس کے خلاف لڑو لگا۔ اور یوں
اپنی ایجوہن کے لئے جان دو لگا۔ میری زندگی کا ہر نفس اس وقت
موت سے لبریز ہو رہا ہے۔ اور اب میں اس طرح مردگیا کہ کسی
کو خیر تک نہ ہوگی۔ نہ کسی کو مجھ پر ترس لگے گا۔ اور نہ کوئی مجھے
اب دشمن نہ کرے گا۔ غرض کہ اب خطروں میں پڑ کر اپنی جان
تلف کر دوں گا۔ اور باور کرواؤں گا کہ مجھ میں کتنی محبت اور دلیری
ہے گو یہ باتیں اب تک میری عادت کے خلاف ہوتی ہیں۔

(چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر۔۔۔ رومانی اور برطانوی لشکروں
کے درمیان میدان جنگ کا ایک موقع۔ ایک طرف
سے یوگوس، یاچیو اور رومانی فوجیں داخل ہوتی

یاچیو۔ میرے قلب پر گناہوں کا جو بھاری پتھر رکھا ہے وہ
میری جانور دی کو غارت کئے ڈالتا ہے میں نے ایک معزز خاتون
کو غلامی ہے جو اس ملک کی شہزادی ہے۔ یہاں کی ہوائیں
انتقام کش ہیں وہ جو مجھے کمزور کئے دیتی ہیں درہمکن تھا کہ یہ
ذلیل آدمی سے فطرت کا درد تو چھٹ مچھنا چاہیے لڑائی میں
مجھے مغلوب کر لیتا۔ میرے اعزاز و خطابات جس قدر میں رکھتا
ہوں وہ سب ذلت و نفرت کے نشان ہیں۔ برطانیہ! اگر
تیرے شرفا اس ذلیل کیلئے سپاہی سے جو ہمارے سرداروں کو
بھی لڑائی میں مات کرتا ہے بڑھکر ہیں تو پھر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ
تم اتنے انسان نہیں ہو جس قدر کہ دیوتاؤں کا درجہ رکھتے ہو۔

چلا جاتا ہے)

لڑائی شروع ہوتی ہے برطانیہ کی فوجیں فرار ہوتی
ہیں۔ بادشاہ بمبلیکون کو رومانی گرفتار کر لیتے ہیں۔
اس کے چھڑانے کیلئے بلاریوس، مگر دیوس اور
ارویرگیس داخل ہوتے ہیں۔

بلاریوس:-۔۔۔ برطانیہ! خوب جم کر لڑو۔ ہمت نہ ہارو۔ لڑنے
کیلئے ہمارے پاس زمین اچھی ہے۔ دونوں صفوں کے درمیان
جتنی جگہ ہے وہ خوب محفوظ ہے۔ سولتے ہمارے اپنی فوج کے
دوسری کوئی چیز نہیں جو لڑائی کے لئے ہمیں منہ موٹنے
دے۔۔۔

گدر پوس } ہاں جو انوارِ جم کر لڑا اور خوب لڑو۔
ارویر تھیں

پوسٹی میں بھرا کر برطانوی سپاہ کو دھوکہ دیا ہے۔
بادشاہِ سہیلین کی سپاہ دشمن کے ہاتھ سے لے کر بھڑا
لیتی ہے۔ پھر سپاہ چلی جاتی ہے۔ یہ کونسی رومانی
سہ سالہ لڑائی ہے اس کے ہمراہ امیر جن اور چچو

ہیں۔

لیو کوس۔ لڑنے لڑنے کی فوج میں سے بھاگ کر اپنی جان بچا۔
اہتری سخت ہے۔ فداے جنگ کی آنکھوں پر معلوم ہوتا ہے
کہ کسی نے ہٹی باندھ دی ہے۔ دوست دوست کو قتل کر رہا
ہے۔

یا چیمو۔ برطانیہ والوں کو ملک پہنچ گئی ہے۔ طالعِ شوم
لے آج کا دن ہمارے لئے شکست کا لکھ دیے اب خیر اسی
میں ہے کہ یا تو ملک آئے ورنہ میدان سے فرار ہونا ضروری ہوگا۔
تیسرا منظر۔ میدانِ جنگ کا دوسرا حصہ۔

پوسٹی میں اور ایک بڑا لڑائی امیر آتا ہے۔

امیر، کیا تم وہاں سے آ رہے ہو جہاں لڑائی زور کی ہو رہی ہے؟
پوسٹی میں۔ ہاں وہاں سے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ
اُن میں سے ہیں جو لڑائی سے بھاگے ہیں۔

امیر۔ ہاں واقعہ یہی ہے۔

پوسٹی میں۔ اس میں آپ کا کچھ تصور نہیں، شکست میں کچھ باقی
نہ رہا تھا۔ یہ تو تاریخی غلطی تھی کہ ہرٹی لڑائی جیت گئے۔ بادشاہ
مگر فدا اور اس کی فوجیں ہرگز نہ چھوڑیں تھیں۔ شاہی فوجیں
پشت دکھا کر بھاگنے کو تھیں بلکہ ایک تنگ مقام ایسا تھا جہاں
سے وہ فرار ہوتی نظر آئے تھے تھیں۔ رومانی اُن کے پیچھے تھے
اور شاہی فوجوں کو مارتے مارتے کشتوں کی طرح انہی زبانیں
باہر نکل پڑی تھیں ہلاک کر کے پھینکے اتنے آدمی تھے کہ روایہ

کے پاس اس کام کیسے ہتھیار کافی نہ تھے۔ کسی کو مار کر گرایا۔ کسی
کا خون کیا۔ کسی کو ہلاک کر دیا۔ بعض خود خوف سے گرے۔
غصہ کہ وہ تنگ درہ برطانیہ کے مردوں سے پٹ گیا۔ مردوں
میں سب کی پیٹھ پر زخم لگے تھے اور بزدل وہ نئے جنہوں نے
جان اس طرح بچائی کہ باقی عمر زندگی سے گھل گھل کر مر رہے۔
امیر۔ یہ تنگ درہ کہاں تھا۔

پوسٹی میں۔ جہاں لڑائی ہو رہی تھی اُس کے نزدیک ایک ٹپڑا
مستحکم مقام تھا دونوں طرف صفت بندی تھی اور پھوس اور ریشل
کے پٹے بنا کر اس کے پشت پر خندقیں کھودی تھیں۔ یہی وجہ
ہوئی کہ ایک بڑے لڑنے والے کو جوا یا نڈارا دی معلوم ہوتا
تھا دشمن کے مقابلے کا اچھا موقع مل گیا۔ یہ بڑھا اسی لائق تھا
کہ ملک اس کی خدمت لائے دن تک کرنا کہ اس کی لڑائی سپید
ہو جاتی۔ وہ اس تنگ درہ پر جمع دو جوانوں کے اُن ڈٹا۔
یہ دونوں جوان نو عمر لڑکے تھے جن کے دن کھیل کود میں بھاگنے
دوڑنے کے تھے نہ کہ ایسی خون لڑائی میں کشت و خون میں
معروف ہونے کے۔ وہ بڑے خوش درد جوان تھے بلکہ اُن
حسینوں سے بھی اُن کا حسن و جمال بڑھا ہوا تھا جو منہ پر نقاب
اس غرض سے ڈالتے ہیں کہ رنگ میلان ہو یا اس لئے کہ کوئی
انہیں پہچانے نہیں۔ اس درے پر قبضہ کر کے انہوں نے
بھاگتے ہوئے برطانویوں کو لٹکا کر اور کہا کہ برطانیہ کے چلی
ہر لون کو تو بھاگتے دیکھا ہے لیکن مردوں کو فرار ہونے کبھی
نہ دیکھا تھا۔ اگر تم پھر لڑائی کی طرف نہ پلے تو مجھ کو بھی بڑھائی
کی طرح تھکائے دشمن ہو جائیں گے اور پھر ان جانوروں کی
طرح نہیں جان سے ماریں گے جن کے مثل تم اس وقت
بھاگ رہے ہو۔ یہاں تمہاری خیر اسی میں ہے کہ بٹ کر اپنے
ملک کو دشمن سے بچانے کی کوشش کرو۔ غصہ کہ یہ تینوں
جاننا تین ہزار آدمیوں سے ہمت و دلیری میں کم نہ تھے بلکہ

بیں میں کو ہلاک کیا۔ اور وہ بھی جو معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر مرے بڑے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے اس وقت میدان جنگ کے ثبوت اور سوراہن گئے۔

امیر: یہ بھی کچھ عجیب اتفاق تھا کہ ایک تنگ درہ بجائے اور ایک بوڑھا اور دو لڑکے یہ عجیب غریب کام دکھائیں۔ پوستی مس: نہیں تعجب نہ کیجئے۔ گو آپ لوگ تعجب کر نیکے لئے ہیں، کچھ کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے۔ بس بہتر ہوگا کہ اب ان واقعات کو نظم کر کے بطور ایک لطیفہ کے شائع فرما کر مضمون صرف اتنا ہو کہ دو لڑکوں اور ایک بڑے نے، اور بڑھا بھی ایسا جس کے بڑھاپے کو دوسرا لڑکھن کیسے اور ایک اور آدمی نے برطانیہ والوں کی جان بچا دی اور روہانیوں کو غارت کر دیا۔

امیر: مگر آپ اتنا خفا کیوں ہوتے ہیں۔

پوستی مس: افسوس خفا ہونے سے حاصل ہی کیا۔ جو دشمن کے مقابلے پر نہ ٹھہرے۔ میں تو اسے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ جب کسی کو بھاگنا ہی مقصود ہو تو کیوں نہ بھاگے مگر اس کے ساتھ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی میری دوستی سے بھی جلد بھاگ نکلے گا۔ آپ نے تو فاقی مجھے شاعر بنا دیا۔

امیر: آپ تو درحقیقت خفا ہو گئے۔ لیجئے خدا حافظ۔

پوستی مس: کیا آپ ابھی تک بھاگ رہے ہیں (علحدہ کہتا ہے)۔ آپ دربار کے امیر یا شریفوں میں روئیل ہیں اس سے بدتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ میدان جنگ میں بغیر نفس نفیس موجود ہیں اور مجھ جیسے آدمی سے دریافت کرتے ہیں کہ لڑائی کا کیا حال ہے۔ آج کتنے ہو گئے جنہوں نے جان بچانے کو بھاگے بھی مگر جان نہ بچی۔ ری میری جان تو وہ تو مصیبت اور ذلت کا ایک ظلم ہے موت کی تلاش میں نکلا۔ مگر موت مجھے وہاں بھی ڈالتی۔ جہاں جان توڑنے سے پاہی کرب و تحلیف میں ٹپٹے ہو

لئے ہی آدمیوں کے برابر میدان جنگ میں کام کر سکتے تھے۔ باقی فوج کھلائی تھی اس لئے بھنا چاہئے کہ کل فوج سے مراد یہی تین آدمی تھے کچھ تو لڑائی کے موقع کی عذگی نے مگر زیادہ تر ان تینوں کی شرافت و شجاعت تھی جو ایک بزدل عورت کو بھی بہادری اور جری بنا دے کہ خوفزدہ فراریوں میں ہمت و جرات پیدا ہوئی اور ان میں بعض تو شرمندگی مٹانے اور بعض واقعی ہمت و دلیری کے آجائے سے ایسے عالی ہمت اور جرات مند ہو گئے جیسے کہ امیری اور بھاگنے سے پیشتر تھے۔ بعض شرمندگی و دور کرنے کو اور بعض جو دوسروں کو بھگائے دیکھ کر بھاگے تھے، اور لڑائی میں اس قسم کی شال پیش کرنے کو بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ پٹے اور یہی اس بڑے اور دو لڑکوں کی طرح قہر و غضب بنگرا اس طرح دشمن کے مقابلے پر کسے جیسے جنگ کے مشیر بر جھوں سے زخمی ہو کر شکاریوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اب لڑائی میں ایک آن کو کچھ سکوت سا پیدا ہوا۔ رومانی جو فراریوں کے تعاقب میں تھے کچھ رُکے اور پھر ان میں امیری پڑنے ہی بھاگ پڑی اور اب یہ حال ہے کہ جو پہلے شاہیں اور عقاب کی طرح جھپٹے مارنے تھے اب وہ مرغی کے بچوں کی طرح جان بچانے کو زمین پر دبے گئے اور کچھ دیر پہلے جو فلاح بن کر آگے بڑھے چلے جاتے تھے اب وہ غلاموں کی طرح پسپا ہونے لگے اور ہمارے وہی آدمی جو پہلے بزدل ثابت ہوئے تھے انہوں نے اس سرے سے ایسے کھانے کی طرح جو دور دراز کے جہازی سفر میں زندگی بخشتا ہے دیکھا کہ دشمن بھاگ رہا ہے یہ دیکھا کہ انہوں نے بھاگتوں کو بری طرح زخمی کیا بعض نے ان پر جرمے پڑے تھے اور بعض نے ان زخمیوں پر جو پہلے حملے میں جاں بلب ہو کر زمین پر پڑے تھے ہاتھ صاف کیا اور بعض نے اپنے ہی دوستوں پر انہیں دشمن سمجھ کر وار کیا۔ ایک ایک نے دین دین کا چھاکر کے

لڑکے دراصل فرشتے تھے۔

دوسرا کپتان۔ ایک چوتھا آدمی بھی ذیل سے کپڑے پہن کر ساتھ تھا۔ وہ بھی اس بڈے اور دونوں لڑکوں کے ساتھ رومانیوں کو خوب خوب لڑاؤ۔

پہلا کپتان۔ ہاں بیان تو یہی کیا جاتا ہے مگر ان چاروں میں اب تک کسی کا پتہ نہیں چلا ہے۔۔۔۔۔ کھڑے رہو تم کون ہو۔

پوسٹی مس۔ میں ایک رومانی ہوں۔ میرے ساتھی اگر مجھے بول نہ چھوڑ جاتے تو میں کاہیکو یہاں ہوتا۔

دوسرا کپتان۔ اس رومانی کتے کو گرفتار کر لو۔ رومانی کی ٹانگ تک یہاں کا قصبہ سنانے کو اپنے ملک کو واپس نہ جانے پائے گی یعنی یہ بتائے کہ کیا یہاں جیل کوڑوں نے ان کی لاشوں کو کھسا کھا یا ہے۔ یہ ذیل رومانی تو اپنے کام ایسے بیان کرتا ہے کہ گویا کوئی بڑا افسر تھا۔ اسے ہم اپنے بادشاہ کے ساڈ لے جائیں گے۔

مہملین۔ بلاریوس۔ گندووس۔ اور دیگر۔ ہسائیون

چند خدام شاہی اور رومانی اسیران جنگ کے آتے

ہیں۔ دو کپتان پوسٹی مس کو بادشاہ کے حضور

میل پیش کرتے ہیں۔ بادشاہ اُسے وار وادہ جیل کے

سپر دکر تا ہے۔

عنایت اللہ۔ دہلوی

پچھچھ

(باقی آئندہ)

یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف اناطول فرانس کا شہر بارہ ہے۔ اس میں جم و روح کے تصادم کے مسئلہ کو مصر قدیم کی ایک عروس بازار کی داستان کے طور پر نہایت دلچسپی سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ ناول تمام دنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر اعلیٰ اور عجیب زبانی سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنادیا ہے۔ قیمت دو روپے علاوہ محصول ڈاک +

لکھنؤ کاہنگر سانی بک ڈپو۔ دہلی +

بلندی نگاہ

نگاہ کی بلندیوں کا نام جانِ پاک ہے
جگہ کی اوجہ دیوں کا نام جانِ پاک ہے
ملا ہوا ہے شستِ خاک کو جو وقفِ سوزِ دل
اسی کی درد مند یوں کا نام جانِ پاک ہے

نگاہ کی بلندیاں ہی عرش ہیں شعور کا
نگاہ کی بلندیاں ہی غم مٹے چہرہ کا
لطیف سی جھلک تھی ایک بلندیِ نگاہ کی
کلیم کو گمان ہوا تھا جس پر شمعِ طور کا

نگاہ کی بلندیاں بلندیِ حیات ہیں
نگاہ کی بلندیاں عیاںِ کائنات ہیں
نگاہ کی بلندیوں کی انتہا نہیں کوئی
نگاہ کی بلندیاں جہانِ بے چات ہیں

نگاہ کی بلندیوں کی زد میں ماورائے عرش
نگاہ کی بلندیوں کا منتہا خدائے عرش
نگاہ کی بلندیاں ہیں وہ بلندیاں کہ جو
نگاہ اپنی فکریں ہیں لے آہیں بنائے عرش

امین حمزہ (سیالکوٹی)

خط

پرسور ہی تھی۔ اکبر کی چار پائی باہر والاں میں تھی۔ رخصتہ کی جو آنکھ کھلی تو شوہر کو بیدار پا کر بولی: ”تم جاگ رہے ہو؟“
 ”نیند نہیں آتی“ منور نے جواب دیا۔
 ”جائے کیا وقت ہو گا؟“ رخصتہ نے ایک جانی لیکر کہا۔

”صبح ہونے کو ہے!“ منور نے جواب دیا
 ”مجھے بھی جگا لیا ہوتا!“ رخصتہ بولی۔
 ”میں تو پریشان ہوں“ منور کہنے لگا۔ ”تہیں بھی پریشان کرتا؟“

دو دنوں خاموشی ہو گئے۔ کچھ دیر بعد محلے کی مسجد سے غعر بچہ بلند ہوئے: ”اللہ اکبر! اللہ اکبر!“
 کتنی پرسطوت آواز تھی اور کیسی سکوت آمیز فضا۔ آسمان کی طرف دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کا قافلہ بھی رگ گیا ہے۔ جب اذان ہو چکی تو منور کہنے لگا: ”ج ہے! خدا عظیمت میں ہی یاد آتا ہے“

”اٹھو نا پھر!“ رخصتہ بولی۔ ”نماز ہی پڑھ لو“
 ”ہاں!“ منور کہنے لگا: ”اب نماز ہی تو پڑھنی ہیں اور کام ہی کیا ہے!“

”تو گویا!“ رخصتہ بولی۔ ”نماز تھارے لئے مشغل بیکار ٹھہرا۔ تو بے کرد تو بے اٹھو وضو کرو۔ سنا نہیں کہ صبح کی نماز ضرور قبول ہوتی ہے“

”تمہاری تو کبھی قبول نہ ہوتی“ منور نے طنزنا کہا۔ ”وہاں میں اثر ہوتا تو آج بیکار کیوں بیٹھا ہوتا“
 ”اے کہتے ہیں کفرانِ نعمت!“ رخصتہ نے جواب دیا۔

منور خاں کا رخانے میں ملازم تھا۔ چالیس روپے ماہوار ملے تھے۔ ایک بیوی تھی اور ایک لڑکا اکبر۔ لیکن اکبر کچھ ادارہ مزاج تھا۔ گھر سے تو دھرم سے آتا۔ لیکن یہاں دو ایک گھنٹے بیٹھ کر باقی وقت گھوم گھام کر گزار دیتا۔ عمر کے ساتھ ساتھ آشفتمہ مزاجی بھی زور پکڑ رہی تھی۔ مانتا کی ماری مال منور سے کبھی شکایت نہ کرتی۔ اور جو وہ کہیں ادھر ادھر سے کچھ سن بھی پاتا تو چشم پوشی سے کام لیتا کیونکہ زندگی کا حاصل بھی تو یہی ایک تپ تھا۔

منور خاں جو چالیس روپے لانا اس میں سے پانچ روپے تو مکان کے کرایہ کے ہی اٹھ جاتے۔ پانی نل سے وہ خود بھر لانا۔ ایک روپیہ ماہوار ہنتر لے جاتی۔ کوئی روپیہ ڈیڑھ روپیہ وصول کا اٹھتا اور چار روپے ماہوار اکبر کی تعلیم کراچ تھا۔ کپڑا لٹا اور کھانا پینا اس کے علاوہ تھا۔ منور کی بیوی رخصتہ ایک بہت مسجد دار اور دور اندیش عورت تھی۔ ہر مہینے دو ایک روپے ضرور پس انداز کر لیتی۔ لیکن اس پر بھی اکبر کا جو دائر لگ جاتا تو کچھ نہ کچھ اڑا لے جاتا۔ لیکن رخصتہ نہ نوبت بچر سے کچھ کہتی نہ شوہر سے شکایت کرتی۔

مکمل کی اقتصاد کی حالت خراب ہونے سے جب ملازموں پر تخفیف کا کھڑا ہونے لگا تو ان کی زور سے منور بھی نہ بچا اور لگ لگایا روزگار سر مایہ دار کی ایک جنبش فلم سے ہاتھ نہ نکل گیا۔

ملازمت سے ہر طرف ہونے کی پہلی رات تھی۔ منور کھاٹ پر لیٹا کر دھیں بدل رہا تھا۔ رخصتہ ایک دوسری کھاٹ

”کیوں بار بار کھڑکی کھولتی ہو؟“ متور نے بولا وہ بارش تو ہو رہی ہے۔“

”ہاں! رخصت ہوئی۔ بارش تو ہو رہی ہے۔ لیکن میں تو اکبر کی راہ دیکھتی ہوں۔ کہیں بھیگ رہا ہو گا غریب۔ جاے کیا بچا ہے؟“

”گیارہ بج چکے!“ متور نے جواب دیا۔

”گیارہ؟“ رخصت نے تعجب سے کہا۔ ”میرے اکبر نے تو ابھی روٹی بھی نہیں کھائی؟“

”پھر منڈیا کو ہاتھ سے چھو کر نہ سالن تو ابھی گرم ہی ہو۔ چپاتیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔“

”یہ سب تمہاری کرامت ہو؟“ متور بولا۔

”میری کرامت؟“ رخصت نے پوچھا۔

”یہی جو اس بخت کے گھٹن میں؟“ متور نے جواب دیا۔ ”پتا شہنا ہو گیا ہے۔ نہ شرم نہ حیا!“

”تو یہ ہے؟“ رخصت نے کہا۔ ”ابھی اسی گھر ہی کیا پرسیانا ہو گا تو خود ہی بچھ جائیگا۔“

”سبحان اللہ!“ متور نے طنز نہ کیا: ”سولہ برس کا تو ہو گیا اور رسیانا ہونا ابھی باقی ہے۔ تمہارے اس لاڈ پیارے نے تو اسے تباہ کیا ہے۔ کھانے پلانے کا شوق تو تم نے نہ کر لیا لیکن اس قدر تربیت کی فکر نہ کی۔ آج اگر کوئی ہنر ہاتھ میں ہوتا تو چار پیسے کی امید ہوتی میرے پاس ہی سر سچا پاس ہوتے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان ہی کر لیتا۔ گذران تو ہو جاتی۔“

”ہاں!“ رخصت نے کہا۔ ”کچھ کام کاج تو ضرور کرنا چاہیے۔ بیکار بیٹھے کیسے کیے گی؟“

”تو تو کمری اٹھاؤ۔“ متور نے جواب دیا۔ ”تمہارا بہن کما چکا اور تم کھا چکے۔“

”تو کمری کیوں اٹھاؤ؟“ رخصت کہنے لگی۔ ”دو پونے دو“

”جرا بھی اور فائدے کی بات ہوئی اسے اپنی محنت اور کرامت سمجھ لیا اور جو کہیں شامت اعمال سے کچھ کھو گیا تو اسے اللہ میاں کے سر سے چھوٹ دیا۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ ہماری روزی کے ٹکڑے بھی غافل نہیں۔“

”ہاں بچہ ہے!“ کہتے ہوئے متور اٹھا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔

”آسو گئی اور آرام کے بعد مفلسی اور تنگ دستی جیسی کچھ روح فرسا ہو کر قی سے ظاہر ہے۔ بیشتر آدمی اس امتحان میں شل سے ہی پورے اترتے ہیں۔ اور کہیں بال بچوں والا گھر تو بڑے بڑے حوصلے والوں کے بھی چھٹے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور زمانہ تو رنگ برنگ ہی رہتا ہے۔ امروز فردا کی جی ایک ہی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ اپنی اپنی قسمت ہے کسی کی آرام سے کٹ گئی اور کسی کی ٹھوکریں کھانے بھر ہو گئی۔ بہر حال قسمت کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ ہونی کی روک نہ عقل سے ہو سکتی ہے نہ تدبیر سے۔ بس وہی ص۔“

ساتھ تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

متور خاں کو بیکار بیٹھے بہت دن ہو چکے تھے۔ صبح سے شام تک تفکرات کی دنیا میں کھویا رہتا مفلسی اور بیکاری تو ہی لیکن اکبر کی آواز کی سب سے زیادہ سوناں روح ہو رہی تھی۔ صبح بخلا تو شام کو آیا اور کبھی دو دو روز غائب!

رات کا وقت تھا بار کھا ہو رہی تھی۔ متور کھاٹ پر بیٹا کچھ منگنا رہا تھا۔ رخصت نے چلے کے پاس۔ ”ابھی اکبر کی راہ دیکھتی تھی۔ کبھی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوتی اور گواڑ کھول کر گئی میں ادھر ادھر جھانکتی کبھی کھڑکی کے راستے جب ہوا کھڑکی آتا تو لاشیں کی جی جھلکے لگتی۔“

تھا۔ وہ اپنی چڑچوں سے سونے والوں کو پیغام بنگار کر رانی
سے رہا تھا۔ رخصتہ جاگی۔ لالٹیں ابھی تک جل رہی تھیں۔ ہنڈیا
بھی چلنے پر تھی تھی۔ چاچا تیاں بھی جوں کی توں پڑی تھیں۔
دواڑہ بھی کھلا تھا اور اکبر کی کھاٹ بھی خالی تھی۔

"خدا خیر کرے! آج میرا لال آیا نہیں۔" رخصتہ نے
ایک جانی لیکر کہا۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو کر نماز کیلئے
کھڑی ہو گئی۔ منور ابھی لمبی تانے مرنے سے سوتا تھا۔
رخصتہ جب نماز سے فارغ ہوئی تو شوہر کو آواز دی۔
"اب اٹھو گے بھی!"

منور نے کروٹ بدلی اور دو ایک بار "ہوں۔" "اچھا"
کہہ کر پھر سو گئی۔

رخصتہ نے پھر آواز دی۔ "اٹھو! نماز کا وقت جاتا ہے۔"
"ہاں اٹھتا ہوں۔" منور نے بیٹے بیٹے جوا بدیا۔
"اٹھو پھر!"

"کہہ تو رہا ہوں! منور نے ایک جانی لیکر کہا۔
"اٹھتے ہوں!"

رخصتہ کسی کام کو اسباب والی کو ٹھہری میں گئی۔ لیکن
ٹرنک کھلا دیکھ کر یہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔
کانپنے کانپنے کپڑے اٹھا کر دیکھنے لگی وہاں نہ زور تھا نہ رہبر۔
غریب سر تھا مگر پیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔
"کون آیا؟ کون نکالے گیا؟ اکبر کے سوا تو چابی کا کسی
اور کو علم نہ تھا۔"

اتنے میں منور اٹھا اور بیٹے کی کھاٹ خالی دیکھ کر بولا۔
"کہنت آج بھی نہیں آیا۔ کہا ہے گا اس کا۔ خدا اہلاد دوسے تو
نیک ہے۔"

پھر بیوی سے کہنے لگا۔ "تم اندر بھی کیا کر رہی ہو؟"

سو کا زور موجود ہے۔ کوئی دواڑھا کی سورت پہنچی ہیں۔ لواور
دکان کرو۔ اللہ کا راز ہے!"

"اوہو! منور خوش ہو کر بولا۔ یہ روپے کہاں سے
آئے؟"

"آئے کہاں سے ہیں۔" رخصتہ بولی۔ "تہاے ہی تو ہیں!
پس انداز کرتے کرتے رقم ہو گئی! میرے خیال میں تو کم لگے
وال کی دکان کرو۔ اکبر بھی تمہارے ساتھ ملکر کام کرنے
لگے گا۔"

اکبر کو اسے لگا یہ باتیں سن رہا تھا۔ کچھ دیر میاں
بیوی میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر منور سورا۔ اور رخصتہ
پھر اٹھ کر کھڑکی کے پاس اکھڑی ہوئی۔ اور کہا کہ کھول کر ادھر
ادھر جھانک لے۔ بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کو ندی اور بادل جتے
تھے کچھ جھانک بھی چل رہا تھا۔ اللہ میرے بچے تو خیر سے گھر
لائے۔ کہتی ہوئی کھڑکی بند کر کے کھاٹ پر لٹٹی گھر کا دروازہ
اکبر کے لئے کھلا رہتا تھا۔ آج بھی کھلا رہا۔ آخر
رخصتہ کو بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اب اکبر دے
پاؤں اندر آیا۔ والاں میں لالٹیں رکھی تھی۔ ہنڈیا چولے پر تھی۔
اکبر کچھ سے اسباب والی کو ٹھہری میں گھس گیا۔ دیوار کے
پاس ٹرنک رکھا تھا۔ ایک کونے میں سی کے دو تین گھڑ
ایک دوسرے کے اوپر رکے تھے۔ کسی میں چھان بورا تھا،
کسی میں آبا۔ رخصتہ چاہا نہیں بھی اسی چھان بوسے میں چھپا کر
رکھا کرتی تھی۔ اکبر نے چاہاں نکال کر ٹرنک کھولا اور زور پڑا
اور نقدی لیکر دے پاؤں گھر سے نکل گیا۔

بارش تھم چکی تھی اور نو سحر کی برکت سے رات کی ظلمت
سیاہ چا سو رہی تھی۔ والاں کی چھت میں چڑیا کا ایک جودا رہتا

چھوڑ کر روپے ڈیڑھ روپے ماہوار کی کوٹھڑی میں اٹھ گئے۔
دس پانچ برتن جو گھر میں تھے وہ بھی بیچ ڈالے لیکن رخصتی پر
ایک دھن تھا ہر حال میں راضی برضا رہتی۔ دونوں وقت
کھانے کوئے یا ایک وقت کیا مجال جو حرف شکایت زبان پر
آئے۔ منور جب دن بھر گھوم گھام کر اور مایوس ہو کر گھر آتا تو
وہ لے بھی نہ لیتی۔

ایک روز لے بہت متفکر دیکھ کر کہنے لگی: کبھی تو ہمارے
دن بھی پھر گئے کیوں پریشان ہو رہے ہو؟
"ہاں! منور نے کہا: جب ہم قبر میں ہونگے؟"
"تم کہہ تو میں کسی گھر اسے میں تو کڑی کر لوں؟" رخصت
کہنے لگی۔

"تم تو کڑی کر دو گی؟ منور بولا: نہیں رخصت! اب میں محنت
مزدوری کر دوں گی۔"

"وہ کیوں؟" رخصت نے کہا: سینا ہونا میں جانتی ہوں۔
کھانا نہیں بچا سکتی ہوں۔ کیا ہرج سے جو میں کہیں تو کڑی کر لوں؟
"رخصت! منور بولا: میری تو صلاح ہے کہ کسی اور شہر
میں چل رہیں۔ یہاں تو تو کڑی بھی مجھ سے نہ لگے گی۔"
"اپنی ہی ہانکے جاؤ گے؟" رخصت بولی: "پاکسی اور کی بھی
سنو گئے؟"

"کیا؟"

"جب محنت مزدوری کرتی ہے تو پھر عار کیسی؟"
"ہاں یہ تو سچ ہے؟" منور نے جواب دیا۔

رخصت بولی: "میں نے دو ایک عرصے میں ماما کا کام کرتی
ہیں تم کہہ تو میں ان سے کہوں؟"

"نہیں! منور نے جواب دیا: پہلے مجھے قسمت آزما
لینے دو۔ میں کل صبح منڈی جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ چاہا تو چار پیسے
لیکر ہی آؤں گا۔"

پھر روز اس کے پاس کھڑے ہو کر اور ہنسنے لگے۔
گن رہی ہو کیا؟

لیکن جب کچھ جواب نہ ملا تو اندر چلا گیا۔

"اسے اپنی تم کو کیوں رہی ہو؟"

رخصت نے شوہر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز
سے کہا: "یہاں تو خاک بھی نہیں؟"

"کیا؟" منور نے تعجب پوچھا: کیا کچھ رہی ہو؟

"صندوق کھلا پڑا ہے؟" رخصت بولی۔

"روپے لے گیا کوئی؟" بیاض منور کے منہ سے

نکلا اور زبرد؟

"گیا؟" رخصت نے جواب دیا۔

منور ایک آہ بھر کر پیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور ٹنک
میں سے جلدی جلدی کپڑے نکال نکال کر ایک طرف رکھنے لگا۔

نلے کون گیا؟

"اللہ ہی جانتے!"

"چائی کہاں تھی؟"

"جہاں تو یہاں چھان دلے ٹکے میں رکھی تھی؟" رخصت
روتے ہوئے بولی۔

"صبر کرو؟"

"اب ہو گا کیا؟"

"صبر! منور نے جواب دیا: آگبر کے بچن تو ایک نیا کو
معلوم ہی کسی سے کچھ کہہ سونگی تو اپنی ہی بدنامی ہو گی؟
دونوں کو ٹھٹھری سے نکل کر دالان میں آ بیٹھے۔

۰۰۰۰۰

اس واقعہ کو کئی روز ہو چکے تھے۔ اور آگبر اس روز سے
گھر نہیں آیا تھا۔ منور نے سارا شہر چھان مارا لیکن بیٹے کا کبیر
مردانہ نہ ملا۔ یہ آخری سہارا بھی جاتے رہنے سے دونوں مکان

اتنا کہہ کر منظور خاموش ہو گیا۔

اس کا جواب غریب رخصیہ کے آنسو تھے۔

چند

منور اب صبح ہوتے ہی مندی چلا جاتا اور شام تک سناٹے کے نکالنا کبھی زیادہ بھی مل جاتے۔ ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا۔ رخصیہ شاکر بھی تھی اور صابر بھی۔ لیکن ایک پھانس تھی جو کلیجے میں لگی تھی۔ یعنی بیٹے کی یاد۔ اگر جس روز سے گچھا تھا آج تک اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ رخصیہ اور منظور دونوں کے بال سپید ہونے لگے تھے۔ اور یہ ایک نیاں کہ تھا جو منظور کو دامن گیر ہو رہا تھا۔

رمضان کی سائیسویں تھی۔ ڈاکیر منور کا پتر پوچھا مٹھے میں آٹھا۔ اتفاق سے اس وقت منظور گلی سے گزر رہا تھا۔ ”کچا ہے بھائی؟“ منظور نے پوچھا۔ ”میرا بی نام منظور؟“ یہ ایک رجب شرف خط ہے“ ڈاکیر نے تحفیل سے ایک خط نکال کر کہا۔

”اگر بے بیچا ہے؟“ بیباخانہ منظور کے منہ سے نکلا۔ ڈاکیر نے لغافہ پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا: ہاں بیجیہ والے کا نام اگر بے بی ہے۔

”لاؤ! منظور نے ہاتھ بڑھا کر کہا: میرے بیٹے کا خط ہے۔ کہاں سے آیا؟“

”افریقہ سے“ ڈاکیر نے جواب دیا۔

منور خط لیکر جلدی جلدی گھر آیا۔ رخصیہ نے جو ہاتھیں ایک لغافہ دیکھا تو بولی: ”میرے اکبر کا خط ہے نا۔ کچا کہتا ہے؟“ اکبر کا ہی؟

”ہاں!“ منظور بولا: ”ہے تو اکبر کا ہی۔“

رخصیہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا: لاؤ مجھے دو۔ پلے لال کا خط میں کپ کھولوں گی۔

”تو تم ہی کھولو“ کہتے ہوئے منظور نے خط بھری کو دیدیا۔

رخصیہ نے خط کو پہلے چوما۔ پھر سینے سے لگایا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لغافہ کھولا۔ خط کے علاوہ اس میں سو سو روپے کے دو نوٹ بھی ملے تھے۔

بیٹے کا خط اور نوٹ دیکھ کر دونوں کی آنکھوں سے شبنم کے قطر کی طرح آنسو گرنے لگے۔

”لو پڑھو ذرا“ رخصیہ نے خاندانہ کو خط دیتے ہوئے کہا۔ منظور خط پڑھنے لگا۔

ایک طویل داستان کے بعد لکھا تھا۔

”..... اب خدا کے فضل سے میں ہر سر روزگار

ہوں۔ اور اناں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔

امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ انشا اللہ

فی الحال ہر دوسرے بیٹے سو روپے آپ کو اسی

طرح بھیج رہا کروں گا۔ خدا کو منظور جو اناں

کی قدمبوسی کو بھی کسی روز حاضر ہو جاؤ گا۔

آپ کا اکبر

چند

منور خط پڑھ رہا تھا۔ رخصیہ کے آنسو گر رہے تھے منظور

کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔

”کہاں ہے میرا اکبر؟“ رخصیہ نے پوچھا۔

”افریقہ میں“

”دیکھا میرا لال!“ رخصیہ نے مسترک لہجہ میں کہا۔

”اور میرا اکبر نہیں!“ منظور نے ہنس کر کہا۔

”کیوں نہیں! تمہارا ہی تو ہے!“ رخصیہ نے شوہر کی

طرف دیکھ کر کہا۔ پھر نوٹ الٹ پلٹ کر: ”تو دو سو روپے

بھیجے ہیں؟“

”ہاں دو سو!“ منظور نے کہا: ”اور ہر دوسرے بیٹے

سورہ پہنچے کو لکھا ہے۔

آگیا ہر دسی نے پوچھا: لڑکے کو گئے کے روز ہوتے؟

”تو بس خدا کا شکر کرو! رخصت ہوئی۔ اور آج سے

سال تو یاد نہیں! منور نے کہا: لیکن میرے بال

منڈی جانا چھوڑ دو۔

سفید نہیں ہوتے تھے۔

”اور جاؤں بھی تو کیا ہر ج ہے۔ منور نے کہا۔

”پھر تو کتنی مدت ہو گئی! ہر دسی بولا: خط تو آتا

لیکن فائدہ کیا؟“ رخصت ہوئی۔ اب میرا اکبر کیا

ہو گا؟

اور ہم کھائیں گے۔

”ہاں آتا ہے!“

”جیسے تمہاری مرضی۔ منور نے جواب دیا۔

”یہی ایک لڑکا ہے؟“

”بس ہی ایک!“

”میں جس سلسلے سے ڈاکہ آ نکلا۔ منور نے پوچھا: کوئی

خط ہے بھائی؟“

اب دونوں میاں بیوی آرام سے زندگی بسر کرنے

لگے۔ ڈاکہ ہر دو کے بیچ سورہ پہنچے جاتا۔ ایک مدت

اسی طرح گذری۔ رخصت اب یہ اس لگائے بیٹی تھی کہ اکبر گھر

آئے تو وہ اس کا بیاہ کرے۔ اور اب ہر خط میں اسے داپر

آنے کی تاکید لکھواتی۔ آج پھر وہی رمضان تھا۔ اور عید ہونے

میں تین چار روز باقی تھے۔ دونوں میاں بیوی کو بیٹے کے

خط اور سورہ کا انتظار تھا۔ منور ہر روز ڈاکہ کی راہ دیکھا

کرتا۔ جب وہ آتا تو اس سے پوچھتا: کوئی خط تو نہیں؟

”نہیں!“

”افریقہ سے ڈاک لگنی؟“

”ابھی تو نہیں آئی!“

ایک روز اسی طرح ڈاکہ کے انتظار میں بیٹھا تھا

کہ ایک ہر دسی بھی اس آ بیٹھا۔ باتوں باتوں میں اکبر کا ذکر

کی بجائے اکبر کی موت کی خبر تھی۔

”کیا؟“ رخصت نے پوچھا۔

منور کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ خط اُسے ہاتھ سے چھوٹ

گیا اور وہ ہاتے اکبر کے ہیکر سر تمام کر بیٹھ گیا۔ اس خط میں سورہ

کی بجائے اکبر کی موت کی خبر تھی۔

ایم۔ اسلم۔

حضرت ایم۔ اسلم کی بے پناہ تصنیف

دو زبردست طائفیں جب یہ یکجا ہو جائیں تو مشکل ہے کہ ان کے جلے سے کوئی محفوظ رہ سکے کیا

آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا حالات ہوتے ہیں جب انسان خدا کے خوف اور مذہب کی قیود

سے بے ہمدان ہو کر اپنا جسم اور مذہب گناہ کو سونپ دیتا ہے؟ قیمت غیر

ساقی بلکہ پو۔ دہلی سے طلب کیجئے،

گناہ کی راتیں۔

سے بے ہمدان ہو کر اپنا جسم اور مذہب گناہ کو سونپ دیتا ہے؟ قیمت غیر

ساقی بلکہ پو۔ دہلی سے طلب کیجئے،

ماہِ مَتام

مُنہ پہ لیکر کیسے شب کا نقاب
 مہرِ تاباں سو گیا
 حجلہِ مغرب سے نکلا ماہِ تاب
 نورِ برساتا ہوا
 چرخِ نیلی فِ مِٹام کے اغوش میں
 اک نکارِ فتنہ مگر
 یا فضا سے ساکن و خاموش میں
 ماہِ کابلِ جہلوہ مگر
 روئے پر تنویرِ پڑا لے ہوئے
 ابر کا ہلکا حجاب
 وعدہ گاؤں مِٹام کی سمت ہے
 گا مرنِ با صد شتاب
 کس نے یہ اضطرابِ مُستقل
 یہ ہجومِ آرزو
 کیا کسی بے مہر کو لے سادہ دل
 بادِ فاجحہا ہے تو
 چھپ نہیں سکتا حجابِ ابر سے
 تیرا فطرِ انبساط
 تمہا اٹھا ہے مُنہ اللہ سے
 جوشِ طوفانِ نشاط

تُو نے کہا یا ہے مگر رنگیں فریب
 اے پرستارِ جمال
 خاک ہوئے کو ہے دامنِ شکیب
 دیکھ اپنے کو سنبھال
 وعدہ گاؤں مِٹام "کو آہ" تو
 آج خالی پائیگا
 ٹوٹ جائے گا طلسمِ آرزو
 دل ہو برساتیگا
 اُس وفا بیگانہ کو چشمِ تلاش
 جب نہ پائیگی وہاں
 زرد ہو جائے گا روئے نورِ پاش
 دلی سے اٹھیکادھواں
 اک مگر تو ہی نہیں حرمِ نصیب
 لے جہا مگر دسہا!
 ہے وفا نا آشنا میرا حبیب
 ساری دنیا سے سوا
 وعدہ ہوا آج اُس سے ملنے جاؤ گی
 وہ نہ آئے گا مگر
 اپنی آنکھوں سے ہو برساتیگی
 فطرِ غم سے تاسر

بیخوف

مرگھٹ

مرگھٹ ندی کے کنارے تھا۔ چوٹا سا میدان جس میں کبھی کبھ نہ اگتا تھا۔ اور اُس کی مٹی سیاہ تھی، بجے ہوئے خون کی طرح سیاہ۔

ندی کے کنارے کے پیڑوں پر ہمیشہ پت بھر رہتی تھی، اور اُن کی شاخیں قحط زدہ انسانوں کی طرح ہمیشہ بادلوں کا مُنہ تاناکرتی تھیں۔ ان پر گدوں اور کُودوں کے علاوہ کوئی پرند نہ بیٹھتا تھا۔ دُور تک ہڈیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور یہاں وہاں ایک آدھ کھو ہڑی زندگی کے انجام پر باہچیں چیر کر ہنس پڑتی تھی۔ ندی کا دھارا ہولے ہولے بہتا چلا جاتا تھا۔ کبھی کوئی موج گھاٹ سے ٹکرا کر سر اٹھاتی، مرگھٹ کی آوازی کو دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنی راہ لگ جاتی تھی۔ وہاں اس شام کو شہر والے کسی کی اُتھی لے کر آئے تھے لاش چتا پر رکھ دی گئی۔ ایک بوڑھے نے اس پر گلی چھڑکا ایک کس لڑکے نے آگ دکھائی اور چٹا کسی غریب کی جھوٹری کی طرح چشم زدن میں سلگ اٹھی۔ مرد ایک طرف ٹیگوا بیٹھے رہے۔ عورتیں دوسری طرف زار زار روتی رہیں۔

چتا تیزی سے جلنے لگی سو آدمی بے بے بانسوں سے لاش کو آدھ آدھ ٹوٹانے لگے۔ گوشت کے آدھ بچے ٹکڑے اڑا کر زمین پر گر پڑتے تھے اور شعلے کتوں کی طرح ہڈیوں کو جیڑنے میں دبا کر چخارہ بھرتے اور بے بھر انگھوں سے ہر طرف گھومتے تھے۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ بادلوں کے دو چار رنگا پی ٹکڑے اوپر اڑ رہے تھے اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان میں پیوست تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہڈیوں کی کرکر دھڑک کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی۔

اجی لوہار نے انگو چھے کے کونے سے چلم نکالی اور چٹا کا ایک انگارہ اس پر رکھ کر جمع میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کر نیلگا جو اُس کی طرح بات چیت کرنے کو بیتاب ہو۔ مگر فضا میں بھاری پن سا تھا اور سب لوگ موت کی موجودگی میں کھڑے گومتے۔ اجی لوہار نے دونوں ٹھیبوں میں چلم تمام کر اس زور کا کش کھینچا کہ انگارہ وہک اٹھا اور کئی چنگاریاں اوپر اُچھل پڑیں۔ پھر اُس نے کسی نامعلوم دوست کو مخاطب کرتے کہنا شروع کیا۔ "ہری بول! رام جانے، گولی اس کی چھاتی ہی میں لگی۔ میں موری میں چھپ کر سب دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنڈا لے ہوئے آگے آگے تھا۔ جب جلوس چوک کے پاس پہنچا تو گھر چڑھی پولیس کے جوان راستہ روکے کھڑے تھے۔ کپتان نے ڈانٹ کر کہا، آگے جانا مت ہے، بھیتا، اور سب تو بھلیں جھانکنے لگے لیکن ان چھوڑ کا کلیجہ بڑا ہے۔ انہوں نے کہا، ہم آگے جائیں گے راستہ چھوڑ دیجئے۔۔۔۔۔"

چھوٹو بات کاٹ کر بول اٹھا، کیا کہتے ہو۔ اتنی بات چیت کی مہلت کہاں تھی۔ پولیس آندھی کی طرح ہم پر چھٹی بھلے گئے۔ یہ موقع کیا ملا۔ جیسے بے گڑھے بجلی گر پڑے۔ کئی بھاگے بھاگے کر گھر ڈوں کی ٹاپ کے نیچے آ گئے۔ کسی ریپٹ کر منہ کے بل کچھ کوئی نالی میں، کوئی سڑک پر۔ لاشیوں سے جن کے ہاتھ پاؤں لٹے انکی بات ہی الگ ہے۔

اجی!۔ اچھا یہی سہی۔۔۔ جو بھی جو وہ تھا بہادر۔ جھنڈا لئے ہوئے اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ اتنے میں کوٹھوں سے پھر برسنے لگے اور ادھر بندو قوں کی گولیاں۔ بھتیہ جیسے آندھی میں آم کا ہر بھلا پیر گر پڑے۔ بس ویسے ہی پل بھر میں ایسا ہاڑ سا جوان چھلنی ہو کر گر پڑا۔ سب خاموشی سے اُگ میں کسی نقطہ کو گھور رہے تھے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ چٹا ایسی لگتی تھی جیسے زمین پر پڑی چمک رہی ہو۔

ناجک نے زور سے کہا: رام نام سنت ہے اگل سر پر کھڑا ہو تو کس کا بس چلتا ہے۔ اگر یہ ماں کا پوت وہاں سے بھاگ جاتا تو کیا تھا۔ پردہ تو کبھی بھاگ کا بڑا ملتا نہیں؟

لکھو مستری نے انھیں ترمیم کر کہا: کیا کہا بھاگ جانا؟ ارے میرا بیٹا اور بھاگ جانا۔۔۔۔۔ اُس نے بے بس بچے ہوں سے سب کی طرف دیکھا: ایسی بات نہ کہو۔ اُس کی آنکھوں کو دکھ ہو گا۔ وہ نادان سہی مگر دوسروں کی طرح ہیٹا نہ تھا۔ اُسے اپنے دس کے جھنڈے کی لاج تھی:

”اُونہ۔ اجی! تین بالشت کپڑے سے کہیں دس کی لاج آتی جاتی ہے۔ کیا بات کرتے ہو۔ میں تو تمہارا بھلا سوچ کر کہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کے مرنے کا دکھ نہیں، اے، میں تو اس لئے کہتا ہوں کہ اس بڑے بچے میں نہیں کون پالیکا جوان بیٹا، گھر کا سرتاج۔ اسے چھوٹے چھوٹے بچے۔ بوڑھے ماں باپ۔ یہ سب کہاں جائیں گے۔ کیا دیں ہمیں روٹیاں دیگا؟“ لکھو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کا پڑوسی جج کہتا تھا: اب وہ کیا کرے گا۔ دس تو امیروں کے لئے تھا۔ غریبوں کا دس کہاں ہے۔ زمین کا کرایہ، پانی کا ٹیکس، روشنی کا محصول۔ اور جب مرچاؤں تو مرچٹ کے چودھری کا نذرانہ۔ ان سب سے زیادہ دیوتا کا بھوک۔ وہ کا نا دیوتا جاپھر اسے ہوتے میڈک کی طرح شہ نشین پر بیٹھا اپنی دم ہلایا کرتا ہے۔ کہاں تھا وہ جوان بیٹے کی موت کے وقت۔

لیکن نہیں۔ اس کا بیٹا کیا ایسا بوجھ تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر اپنی جان دی تھی۔ لکھو کے دماغ میں اسی قسم کے خیالات کا تار سا بندھ گیا۔

شعبو نے سر ہلا کر کہا: آج صبح تک وہ بھلا چنگا تھا۔ وہ ہتھوڑے کی ایک ٹیک مار سے لوسے کو پانی کر رہا تھا۔ لیکن اب دیکھو۔ سیسے کی ایک چھوٹی سی گولی ہو اس سنسنائی ہوئی آئی اور ہٹا کچھ کے اس کی چھاتی میں گھس گئی۔ ہڈی کو توڑ کر، گوشت کو چیر کر وہ دل کے اندر بیٹھ گئی۔ اور وہ مر گیا۔ ہاتے رام، جینا کتنا کٹھن بوا اور مرنا کتنا آسان؟

اجی! لوہار نے دھنوں کو منہ کے آگے سے ہٹا کر کہا: اور جب آدمی مر جاتا ہے تو کیا چھوڑ جاتا ہے۔ نام تو بڑے آدمیوں کا رہتا ہے۔ غریبوں کا نام وہام کیا۔ وہ تو بھائی بندوں کے لئے اپنی یاد چھوڑ جاتے ہیں اور یہ یاد زندگی بھر کٹنے کی طرح جھپتی ہے۔ دنوں کی دُوری گھاؤ پر مرحم کا کام کرتی ہے سب اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں اور کبھی سوچو تو ایسا لگتا ہے کہ پچھلے جنم کی کہانی ہے۔

لکھو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جن لوگوں نے اُس کے بیٹے کے ہاتھ میں جھنڈا تھمایا تھا، وہ کہاں تھے۔ وہ تو اس مرچٹ میں نہیں تھے۔ وہ سب بچے لوگ تھے۔ وہ شودروں کے مرچٹ میں کیے آتے۔

نیکن کیا اُس کے بیٹے نے غلطی کی تھی۔ کیا بھکرا اُس نے وہ جھنڈا لپٹا تھا میں لیا اور وہ گولیوں کے سامنے کیوں سیدھا کھڑا رہا۔ کیا اُسے کسی کا دھیان نہیں آیا۔

عورتوں کی فریاد دہری چڑھی تھی۔ وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے چپت کو تاک رہی تھیں جس پر اب لاش کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

گھنٹو کا تن بدن کانپنے لگا۔ دنیا اتنی احسان فراموش کیوں ہے۔ اُس کے بیٹے نے دوسروں کے لئے جان دی تھی اپنیوں کو بھلا کر وہ دوسروں کے لئے مر رہا تھا۔ اور یہ لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے تھے۔

نایک نے آہستہ سے کہا: ”آجی، دیکھو اور کتنی دیر ہے۔ ٹھوک کے ماتے پران منہ کو آئے ہیں۔“
لٹے میں چھوٹے آنکھیں پھاڑ کر سب کو اس انداز سے دیکھا جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔

”کریم خاں حولد ار کھتا تھا کہ جو لوگ اترتی کے ساتھ مر گھٹ جائیں گے، سرکار میں انکی رپٹ کی جائے گی۔“
”ایں، یہ کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ سرکار کا سیری تھا۔ بھائی، سمجھتے نہیں۔ اُس نے گولی نہیں چلائی تو کیا، گولی کھائی تو۔ پھر وہ سیری ہوا یا نہیں۔“

”ہوں۔“ نایک نے کپڑے جھارنا شروع کیا۔ ”ٹھیک کہتے ہو۔ وہ کسی ایسے ویسے کی گولی سے نہیں سرکار کی گولی سے مر۔ پکٹ معاملہ ہے۔ کیوں جی آجی؟“

آجی اپنی بھولی سنہالنے لگا۔ ”طیر علی بات ہے۔ اور کریم خاں حولد ار کوئی معمولی آدمی ہے۔ آجی بڑے بڑے ہاجن اُسے نام سے کانپتے ہیں۔ جس کے گھر چاہے ڈاکہ ڈلوادے۔ اور بچے چاہے چوری کے الزام میں بندھوادے۔ آج شہر میں اسی کا راجہ ہے۔“

سب لوگ ڈر کر دائیں بائیں یوں دیکھنے لگے گویا کریم خاں کا مہوت منہ پھاٹے ہوئے انہیں ہلکے کو آ رہا ہو۔ تاروں کی چھاؤں میں پیڑوں کے ڈنڈے ٹھیک ہاتھ پھیلاتے ہوئے اندھیری رات کسی چیز کی بھیج مانگ رہے تھے۔

گھنٹو گھنٹوں پر سر رکھے نیم بہوشی کی حالت میں بیٹھا رہا۔ بہت سے لوگ ایک ایک کر کے سر ہل گئے اور جب آگ تدم چڑی تو صرف چار پانچ آدمی رہ گئے۔

گھنٹو کا دل اندر سے روٹنے لگا۔ دیں اور دیں دلے! انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ موت کے آگے تو سب برابر ہیں۔

سب کو ایک دن اسی آگ میں جانا ہے۔ اسی بانی میں سب کی راکھ کو بہہ جانا ہے۔ پھر وہ اسکے بھی منتقل نہیں کہ ایک آن کے لئے آئیں اور مرنے والے کی ہوا کے آنسو پوچھ جائیں۔ اُس کی ماں کے ٹوٹے ہوئے دل پر بھرپور دی کا ایک پھاہا کہ جائیں۔

میدانہ چھوڑ، کانگریس کمیٹی کے صدر سے کیا وہ جوان بیٹے کی جان لینے کے بعد بھی اس کا قرض معاف نہ کریں گے۔
کھنڈ پتلا ب سنگ، بٹھے دیں میوگ۔ کیا کریم خاں حولد ار کے دست برد سے وہ لے نہ پکائیں گے۔
برسات آ رہی ہے، گھر کا چھتر چھانا ہے، دیوار کو ٹھم گنا پڑ بھی تو ٹھیک کرنا ہے۔ مگر اس کے بازوؤں میں وہ پہلے کی ہی

۷۔ مزدور کا بیٹا، ایک ذرا سی گولی سے چھد کر — وہ بھی کسی لوہار کی بنائی ہوئی — مر گیا اور اگلے سر لے گئی۔
 بتا ٹھنڈی پڑنے لگی۔ عورتوں نے اس میں پانی کا چھینٹا دیا۔ مردوں نے اس میں لپٹے آنسو جھپکے۔ رام نام ست ہے یہ کی
 میدان گوجا اٹھا۔ دُور سے گیدڑوں نے جواب دیا۔ "ہوا، ہوا، ہوا"۔
 بپ سب چلنے لگے تو لکھنے دیکھا کہ اس کے پیروں کے پاس ایک کپڑا پڑا ہوا ہے۔ یہ وہی پٹنا ہوا تر ہٹا جھنڈا تھا۔
 ۸۔ لگے سے ہوتے اس کا بیٹا مر رہا تھا۔ لیکن یہ جھنڈا دیکھنے میں کتنا مکروہ تھا! گھاس پھوس کی طرح سبز بڑھا پے کی
 بد بیماری کی طرح زرد۔

لیکن اب خون میں رنگ کر وہ لال ہو گیا تھا۔ لال — زندگی اور موت کا رنگ۔
 اٹھوئے اُسے اٹھا لیا۔ اس میں ایسا کونسا جاو تھا جس سے سحر ہو کر لوگ اس کے لئے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ معمولی
 مادی جو ایک ٹوٹے ہوئے کر گئے پر بنی گئی۔ اور ایک رنگ پر بنے اس پر کچے رنگ کے چھینٹے دے دتے۔ اس میں
 تھا۔

دبھی ہوں اب ایک انسان کے خون میں رنگ چکا تھا اور یہ خون تازہ تھا تو بہار بھول کی طرح، گرم تھا۔ جلتی ہوئی
 حرج۔
 سبک لکھو کے دل میں یہ خیال اٹھا کہ اب وہ طاق سے اُس پتھر کے ٹکڑے کو پھینک دیکھا اور اُسکی جگہ اس کپڑے کو دیکھا
 بج بیٹے کے خون کی پٹی کی جی ہوئی ہے —!
 ورتیں قطار باندھے، ٹوٹی ہوئی آواز میں سسپاٹاتی ہوئی گھر کی طرف جارہی تھیں۔ جواہر لکھی اور رات کا دامن شبنم
 دا۔ دُور سے ندی کا دھارا گھاٹ پر بندے کی طرح کراہ رہا تھا۔
 بین کی آنکھ کچھ بھی تھی لیکن آسمان کے ستارے جھگا رہے تھے۔

اختر حسین رائے پوری

محبت اور نفرت

ندوستان کے سب سے بڑے جدت طراز ادیب اختر حسین رائے پوری کے سٹولہ لاجواب افسانوں کا مجموعہ
 بچوں کے اہتمام سے عمقریب شائع ہونے والا ہے۔

قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ شائقین اپنا نام خسریداروں میں درج کرالیں۔

ثمراتِ تحسین

واہ فسونِ آب و گل دہر ہے اک رنگیں محفل
 رزمِ گنان رہ طوفان سے دل ہی جائے گا ساحل
 تیری نگہ سفاک نہیں اور کسے کہیے قاتل
 عشق کی پایاں بے پایاں منزل کے آگے منزل
 کس کی محفل کو دیکھیں ہم تم میں خود اک محفل
 دورِ فلک کا شکوہ کیا وہ بھی غلط یہ بھی باطل
 خیر ہو تیرے جلوے کی دل والے ہیں سب بیدل
 جوشِ عمل کی خامی کا نام جہاں میں ہے مشکل
 پیرِ مغاں کہتے ہیں جسے ہے وہ انسان کا دل
 یوں بھی سحر ہوتی ہے کہیں مگر یہ شب سے کیا حاصل
 دل کی بستی دیران ہو آ جا اے جانِ محفل
 سرخ ہوں کیوں اشکِ غم خونِ جگر بھی ہے شامل
 یوں نہ فسردہ خاطر رہ غنچہ و گل کی صورت کھل

دیکھ طلسمِ فکرِ نہال

سحرِ بیاں شاعر سے مل

نہال سیواری

”دور حاضر اور اردو غزل گوئی“

رسالہ جامعہ (دہلی) بابت جنوری سہ ماہی میں جناب حکیم آزاد و انصاری کا ایک مضمون ”غزل کی حیثیت میں شائع ہوا جس میں مضمون نے ان تمام جائزہ دہندگان اعتراضات کا جواب دینے کی ناکام کوشش کی، جو صنف غزل پر عموماً اردو سنی (conventional) غزل پر خصوصاً ہوتے ہیں۔ چونکہ حکیم صاحب خود بھی غزل گو ہیں اور ہندوستانی سے ”دہلی نکلے برس کی تیلیاں“ والی غزل کہتے ہیں ایسے قدرتی طور پر انہیں تمام اعتراضات کا نشانہ خود اپنی ذات نظر آئی۔ ایسی حالت میں ان کا برہم ہونا اور مہتر صنفین پر تہہ کرنا انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

رسالہ حکیم (دہلی) بابت مئی سہ ماہی میں نقاد صاحب نے اس مضمون پر غزل گوئی کے عنوان سے ایک کامیاب تنقید لکھی، مگر افسوس ہو کہ جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے، حکیم آزاد صاحب ہی کے رنگ میں لکھی، اسکے علاوہ غزل پر بعض اعتراضات ایسے بھی کئے جو کچھ بھی وزن نہیں رکھتے، معلوم ہوتا ہے کہ نقاد صاحب کے اس تنقیدی مقالے نے حامیان غزل کے کیس میں ایک اہل طال دی جس کا نتیجہ رگھوپتی سہلے صاحب فراق کا ایک طویل مضمون ”دور حاضر اور اردو غزل گوئی“ کے عنوان سے جولائی سہ ماہی کے رسالہ تنکا (رگھون) میں ہمارے پیش نظر ہے۔

فراق صاحب ایک خوش گو شاعر، ایک اچھے ادیب، اور ایک سمجھدار نقاد ہیں لیکن جوان خون کی حرارت جب متعل ہوئی تو جواہر اعتدال اکثر انسان سے چھوٹ جاتا ہے اور اپنے مسلک اور عقیدہ کے خلاف اس کی روش انتہا پسندانہ ہو جاتی ہے۔ فراق صاحب نے اپنے مضمون کے آغاز میں جناب نقاد کی تیز زبانی کا شکوہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے خود جو الفاظ براہ راست یا بالواسطہ جناب نقاد کے لئے استعمال کئے ہیں وہ نقاد صاحب کی جلی کی ٹیٹے کہیں زیادہ غیر منجیدہ ہیں۔

اس مقالہ کے سپر ور فلم کرنے سے میر مقصد نہ نقاد صاحب کی حمایت ہو، نہ فراق صاحب کی مخالفت، کیونکہ دونوں حضرات کی بعض رائیوں سے مجھے اتفاق ہے اور بعض سے اختلاف۔ چنانچہ مجھے خود اس موضوع سے کچھ پسند ہے اور اس کے اکثر پہلوؤں پر میں بار بار غور کیا ہے، ایسے جن نتائج پر میں پہنچا ہوں انہیں قارئین سنائی سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ اسکے علاوہ میں نے جو سنی سہ ماہی کے سنائی میں اپنے مضمون ”ایمان کی اہم رد پستی کا اثر اردو شاعری پر“ میں عشقیہ شاعری کے نمونے پیش کرنے کا جرم مل کر کیا تھا ضمناً آج وہ بھی پورا ہو جائیگا۔

جناب نقاد نے غزل پر جو اعتراضات کئے ہیں انہیں بد نظر رکھتے ہوئے فرق صاحب نے ایک سوال کیا ہو کہ: ”صاحب مضمون کا مطلب غزل سے کیا ہے؟ کیا ان کا مطلب صرف حضرت آزاد کی غزلوں سے ہے؟ یا اردو غزل گوئی کی ابتدا اب تک ہزاروں بلکہ لاکھوں گمز اور نا کامیاب غزل گوئیوں سے ہو، یا کئی سو شخص وقتی اور مقامی اُستادوں اور گہنہ مشقوں سے ہے؟ یا اردو کے محدودے چند جٹی کے متغیر لہجے سے ہے۔ یا سعدی اور حافظ شیرازی وغیرہ کو بھی وہ قابلِ عتاب ٹھہرتے ہیں؟“ سوال اپنی جگہ پر نہایت معقول ہے اور اگر نقاد صاحب کے مضمون سے اس کا کوئی جواب نہ مل سکے تو یقیناً ہم یہ کہنے پر مجبور

ہونگے کہ نقاد صاحب عجیب غلط بحث کیا ہو۔ لیکن جب نقاد صاحب کے ان الفاظ پر پہلی نظر پڑتی ہے کہ:-

(۱) ”غزل و تغزل کو مٹانا یا اس کو حلال و حرام کر ڈالنا کون چاہتا ہے، اس کی فوج و حسن کو تو متعارف عجیب اختلافات غزلگو شعرا ہی مسخ کر رہے ہیں۔ ہیروین کے پیکر سے جو کہ ”کاباس اتر دیا کر اسے ایک عروس جمیل و لباس حریر کی ہیئت میں بدل دینا کوئی ضروری اور اہم اصلاح ادب نہیں؟“

(۲) ”مروجہ اس غزل سے آپ اس وقت تک نفور نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کی یہ نخل و مضحکہ خیز فطرت آپ کے شامل حال ہے۔“

(۳) ”بلاشبہ مروجہ غزل و تغزل ماتم کرنے کی چیز ہے۔“

(۴) ”متعارف غزل ہی حقیقتاً ایک ”باد ہوائی تیراندازی“ ہے۔“

تو فراق صاحب کا سوال بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ صرف ناسی قد نہیں بلکہ مضمون کے آخری حصہ میں ”نقاد صاحب نے مفصل طور پر اس سوال کا جواب دیا ہے حکیم آزاد صاحب کے اس بیان کے سلسلہ میں کہ:-

”ایک انظر اس غزل پر یہ ہے کہ غزل کا وجود فارسی و اردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا، چنانچہ ”کہتے ہیں کہ:-

”بلاشبہ یہ اعتراض ہے۔ لیکن مطلقاً غزل پر اپنے وسیع ترین تصور میں، انہیں۔ بلکہ متعارف و متداول غزل پر۔

بے ربط و بے آہنگ غزل پر۔ متضاد و باہم متضاد غزل پر۔ موسے کرد کو و سرین والی غزل پر۔ اپنے ہجر و دام اور قیسم و وسیع کے غلبہ و دام والی غزل پر۔ قاتل شیوہ و قصاص پیشہ محبوب والی غزل پر۔ نہ کہ اس پر جو ہر عارفانہ آئن ہے کہ بایں کثرت

اس عبارت کا مطلب بالکل صاف ہے کہ فراق صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ان کے نزدیک ان الفاظ سے واضح ہے کہ نقاد صاحب ہر غزلگو کے نفس ”غزل و غزلیت“ سے سب سے بیزار ہیں۔ اگر یہ ممکن ہو کہ کوئی دن کہے اور آپ رات سمجھیں۔ اور ایک ”صوفی“ کی لمبی داڑھی آپ کو محبوب کی زلف و دراز نظر آئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نقاد کو ہر غزلگو اور نفس غزل سے بیزار سمجھیں ورنہ نقاد نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ہم غزل و تغزل کے دشمن نہیں، بلکہ ہم مروجہ، مسخ اور متعارف غزل کے مخالف ہیں جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی اس غزل سے ہرگز بیزار نہیں جو عارفانہ آئن ہے کہ بایں کثرت کی مصداق ہے۔

تھوڑی دیر پہلے یہ فرض کرتے ہوئے کہ نقاد صاحب نے نفس غزل کو مورد طعن نہیں بنایا، فراق صاحب ایک سوال اور پوچھتے ہیں کہ:-

”نقاد صاحب نے حکیم آزاد کو اس غلط اور بوجہ قسم کی غزلگوئی کا حامی کیونکر مان لیا؟“

اس سوال کا جواب بھی نقاد صاحب کے مضمون میں موجود ہے مگر خدا جانے کیوں فراق صاحب کی نظر اس طرف نہیں گئی۔

بات یہ ہے کہ حکیم آزاد اپنے مضمون میں عصر حاضر کے بلند فطرتا و بلند خیال شعرا کی جو فہرست پیش کی ہے نقاد کے نزدیک وہ سب کے سب بُرائی لکیر کے فقیر ہیں اور ان کے کلام میں وہ تمام عناصر کثرت کے ساتھ موجود ہیں جو نقاد کے خیال میں ناخوڑہ غزل کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیٹکا ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان لوگوں کو جوئی کا (غزلگو) شاعر سمجھتا ہو اس کے نزدیک غزل کا معیار

کیا ہوگا۔ غالباً بے فراق صاحب کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نقاد نے حکیم آزاد کو غلط اور پوچھ قسم کی غر لگوئی کا حامی کیونکر مان لیا؟ اس پر میں اتنا اور صاف نہ کرنا چاہتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً اردو رسائل میں حکیم آزاد صاحب کا جو کلام شائع ہوا ہے وہ اسی قسم کا ہے جو نقاد کے نزدیک سوختنی ہو اسلئے ”نقاد“ کا یہ سمجھنا کچھ بیجا نہیں کہ حکیم آزاد صاحب ”غلط“ اور پوچھ قسم کی غر لگوئی کے حامی ہیں۔

اس محل پر یہ بتادینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نقاد کا موضوع بحث ”غرل“ ہے۔ ”نظم“ کا اگر کہیں ذکر آ گیا ہے تو محض ضمنی اور استطرادی طور پر لیکن فراق صاحب نے خواہ مخواہ ”نظم“ کو بھی اس بحث میں گھسیٹ لیا ہے اور غرل کو نظم کا یا نظم کو غرل کا جریف قرار دیکر اصل موضوع کو غیر ضروری الجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ بہر حال ”نظم“ پر فراق صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں ہم اسکا جواب اصل بحث ختم کرنے کے بعد دیں گے۔

جس طرح ایک چاہنے والے کو اپنا محبوب ”مجموعہ خوبی“ نظر آتا ہے اور اس کے صریح و نہائیاں عیوب بھی اُسے دکھائی نہیں دیتے اُسی طرح فراق صاحب بھی جو غرل کے چاہنے والوں میں سے ہیں، غرل کے کسی عیب کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں آئے نزدیک اصناف سخن میں غرل کا رتبہ سب سے بلند ہے، اس میں فقط خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اور بے آن کی اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ یقیناً مذاق سلیم سے یکسر بے بہرہ ہے۔ فراق صاحب کے نزدیک۔

”یہ سمجھنا سخت گمراہی ہے کہ دورِ حاضر میں ”اردو نظم“ نے تو ترقی کی لیکن اردو غرل محض جھک مار رہی ہے اور توجہ چوں پر نشو و پیش نہ دلائی۔ کی مصداق بن رہی ہے“..... ”آج سے نصف صدی پہلے مولانا حالی نے غرل کے خلاف جو آواز بلند کی تھی اور ڈاکٹر نذیر احمد اور دیگر مصلحانِ ادب و قوم نے جو غرل سے اظہارِ نفرت کیا تھا اس میں یہ بزرگ ممکن ہے اپنی حد سے آگے بڑھ گئے ہوں لیکن اس کی وجہ بزرگم غور کیا جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ ان بزرگوں نے اردو غرل کوئی پر اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اپنے وقت کی رائج اور مقبول عام غر لگوئی سے اظہارِ برہمی کیا ہے اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ امیر و ادب کی عربیائی و دشمنی میں زندہ دلی ضرور تھی مگر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غرل کوئی ”اُٹھل“ اور ”مسم“ کے لئے وقف ہو جائے..... فطری اور حقیقی غر لگوئی کی طرف دوچار کو چھوڑ کر کسی کی نظر ہی نہ تھی۔ یہ باتیں محرم ہوئیں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں غرل کے خلاف اس اعلانِ جہاد کی جس کو آج نصف صدی کے بعد دُورِ اُٹھانہز ماسٹرس وائس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا“

اس امر کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے کہ دورِ حاضر میں اردو غرل واقعی جھک مار رہی ہے یا نہیں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ فراق صاحب کے پیش کئے ہوئے معیار پر دورِ حاضر کی غرل کو جانچا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ حالی نے اپنے وقت کی رائج اور مقبول عام غر لگوئی سے جن خصوصیات کی بنا پر اظہارِ برہمی کیا تھا وہ عصرِ حاضر کی غرل کوئی میں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آج بھی غرل انہیں خیالات کا مجموعہ ہے جن سے حالی نے اظہارِ بیزاری کیا تھا۔ تو مجھے امید ہے کہ فراق صاحب بھی اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ اردو غرل واقعی جھک مار رہی ہے اور اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر شخص کو فراق صاحب کا یہ قول ماننا ہی پڑیگا کہ حالی کے اعتراضات کو آج نصف صدی بعد ہرانا

”ہر ماسٹرس رائس“ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

جن وجہ سے حالی نے غزل کو موردِ وطن بنایا وہ فرق صاحب کے مذکور بالا بیان کے مطابق امیر و داغ کی عربی و شغلی تھی ایسے کہ جہاں یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غزل گوئی اپنی ”اور محرم“ کیلئے وقف ہو جائے۔ فرق صاحب کا یہ بیان حد درجہ مغالطہ انگیز ہے معلوم نہیں کہ انھوں نے کسی مصلحت کی بنا پر غزل سے حالی کی بیزاری کا سبب فقط امیر و داغ کی عربی و شغلی کو ٹھہرایا یا مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کے بغیر ہی لائے قائم کر لی۔ ایسے کہ حالی نے غزل گوئیوں کی جو ”فرد جرم“ پیش کی ہے وہ بہت طویل ہے۔ اور جسکے بعض حصے یہاں نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ وہ ہذا:-

”رہا وہ کلام جس میں نہ سادگی، نہ جوش، نہ اصیلت، تینوں چیزیں نہ پائی جائیں۔ سو ایسے کلام سے ہمارے شعر کے دیوان بھرے پڑے ہیں کیونکہ ہماری شاعری زیادہ تر اب دو قسم کے مضامین میں منحصر ہے عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل، مثنوی اور قصائد کی تشبیہ میں باندھے جاتے ہیں اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سوانہ تینوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلہ اصول مسئلہ کے ہو گئے ہیں۔ انہیں کہ ہمیشہ باقی تغیر باندھتا ہے اور ان سے ہر موجد و نڈر کرے، مثلاً

غزل میں ہمیشہ معشوق کہے و فدا ہے محبت، بے جہر ہے رحم، ظالم، قاتل، صیاد، جلاد، ہر جانی، لپٹے سے نفرت کرنے والا، اور دل سے ملنے والا، سچی محبت پر یقین نہ لانے والا، اہل ہوس کو عاشق صادق جاننے والا، ہدنگمان، بدخو، بد زبان، بد چلن، غرضیکہ ایک حسن و جمال یا ناز و داد اور دیگر حرکاتِ مہر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اسکو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا ہو اور اپنے تئیں غمزہ، معصیت زدہ، فلک زدہ، ضعیف، بیمار، بد بخت، آدرہ، ہندانم، مردود و خلاق، آدرہ کی پسند، بدنامی کا خواہاں، حسن قبول سے نفور، خوشی اور غایت سے کنارہ گر، غموالا، میخوار، بدست، بد ہوش، خود فراموش، وفادار، جفاکش، کہیں آزاد و طبع اور کہیں گرفتاری کا آرزو مند، کہیں صابر اور کہیں بیقرار، کہیں دیوانہ کہیں ہوشیار، کہیں غیور اور کہیں چکنا چکڑا، رشک کا پتلا، رقیبوں کا دشمن، سارے جہاں سے بدگمان، آسمان کا شکی، زمین سے نالاں، زمانہ کے ہاتھ سے تنگ، غرضیکہ ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں ان تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کیلئے قابلِ افسوس خیال کی جاتی ہیں یا مثلاً

آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا، یا زاہد و واعظ و صوفی کو لتاڑنا اور بادہ کش بدعہ فروش اور ساقی و خمار کی تعریف کرنی اور ان سے حسن عقیدت ظاہر کرنا، ایمان و اسلام و مذہب و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معصیت سے رغبت ظاہر کرنی۔ کبھی کبھی ملامت و جہاد و منصب دنیوی کو حقیر ٹھہرانا اور فقر و عشق و آزادی وغیرہ کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ اسی طرح کے اور چند مضامین ہیں جو غزل کیلئے بمنزلہ ارکان و عناصر کے ہیں۔“

یہ ”فرد جرم“ طویل ہونے کے باوجود بھی مکمل نہیں۔ کیونکہ مولانا حالی نے یہاں خصوصیت کے ساتھ ان مضامین کا ذکر کیا ہے جو عشقیہ کے تحت میں آتے ہیں۔ ابھی فلسفہ ”اور تصوف“ کا ایک درہلے ناپید اکنار باقی ہے جو ایک ”طوفانِ بے تمیزی“ کی طرح غزل پر چھایا ہوا ہے۔

غزل پر اعتراضات حالی کے ضمن میں فراق صاحب نے اپنے بیان کی مزید توضیح اس طرح کی ہے کہ :-

”حالی کے وہ اعتراض جو انہوں نے نصف صدی پہلے غزل پر کئے تھے آج اُن کا دہرانا ایسے غلط نہیں کہ بات پہلانی ہوگی بلکہ حالی کے اعتراض آج اس لئے غلط ہیں کہ امیر و داغ کے بعد اردو غزل گوئی کے کئی دور ختم ہو چکے اور اس میں حیرت انگیز انقلابات پیدا ہو گئے ہیں“

فراق صاحب کے بیان کے مطابق ایک دور تو ”خدا ننگ نظر“ کے مشاعروں کو سمجھنا چاہیے اور دوسرا جذباتی سکول کا دور ہے۔ ”اُس کے بعد وہ دور آتا جو جس میں اردو غزل گوئی..... نئی آوازوں سے نغمہ سزا ہوتی ہے.....“ (اس دور میں) چوٹی کے غزل گو حسرت موہانی، اصفہر گوٹڈوی، یاس عظیم آبادی، جگر مراد آبادی اور فانی بدایونی کہلائے۔“

امیر و داغ کے بعد سے یہ کہ آج تک اردو شاعری کے جتنے دور آپ کا جی چاہے تسلیم کر لیجئے مگر یہ حقیقت ہر حال اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ حالی کے زمانہ سے اس وقت تک ہر دور کے غزل گو شعرا نے اپنے پیشروؤں کی اکثر کمزوریوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ اس دعوے کے اثبات کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اول اُن تمام مخصوص مضامین کی ایک فہرست پیش کی جائے جو حالی کے زمانہ تک غزل گو شعرا کا موضوع بحث ہے ہیں اور جسے ہم نقالی، سنت شعرا کی پیروی اور رسم و رواج، ”کی تقلید محض سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد گذشتہ پچاس سال خصوصاً عصر حاضر کے چوٹی کے غزل گو شعرا کے کلام سے کثیر تعداد میں ایسے نمونے پیش کریں جن میں انہیں خیالات پر طبع آزمائی کی کمی ہے۔ زیر بحث شعرا کی تعداد اتنی کثیر اور اُن کی غزلیات کا مجموعہ اس قدر زیادہ ہو کہ اس ایک مضمون میں سب پر فروغاً، فروغاً تنقید کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ ایسے مجموعہ صرف چند شعرا کو منتخب کرنا پڑیگا اور اُن کے متعلق بھی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ایسے کئی مثلاً اگر گھنہ و فرسودہ خیالات، کم سے کم پندرہ عنایوں میں تقسیم کئے جائیں اور صرف پانچ شاعروں کے کلام سے ہر عنوان کے ماتحت فقط پانچ شعر نقل کئے جائیں تو ان اشعار کی مجموعی تعداد پونے چار سو ہوگی۔“

فراق صاحب کی زبانی دورِ حاضر کے چوٹی کے غزل گو شعرا کے نام آپ سُن چکے یعنی حسرت موہانی، اصفہر، یاس، جگر اور فانی۔ ان پانچوں میں فراق صاحب نے حسرت موہانی کو سب سے افضل مانا، ”اور انہیں ”بادشاہ متغزلین“ کا لقب دیا ہے۔ اب اگر ہم عصر حاضر کے بہترین نمائندوں کے ”بادشاہ“ کے کلام سے اپنے دعوے کو ثابت کر دیں تو غالباً کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور دوسروں کے متعلق بھی وہی رائے قائم کر لینا اصولاً بیجا نہ ہوگا۔“

اس محل پر ایک نکتہ اور بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ فراق صاحب نے اِن شعرا نے بچکانہ کے درمیان جو فرقی طلب قائم کیا ہے وہ مستند اہل الرائے کے نزدیک متعین نہیں۔ فراق صاحب کے نزدیک اصفہر گوٹڈوی کا مرتبہ حسرت موہانی سے فروتر ہے۔ لیکن نشاط روح کے مقدمہ نگار جناب سہیل کی سب باتوں کو اگر باور کر لیا جائے تو اصفہر گوٹڈوی کا ہر تہہ کوئی شاعر نہ اس وقت موجود ہے، نہ کبھی تھا اور نہ شاید آئندہ ہوگا۔ سہیل صاحب کے اس خیال کی تائید ڈاکٹر بطریق کے دوسرے مقدمہ نگار احسان احمد صاحب نے بھی کی ہے مگر خدا کرے کہ وہ نکتہ اور فراق صاحب کے نزدیک اپنے مقابلہ میں غالب کی کئی ہستی

جناب یاس عظیم آبادی نے تو بزعم خود غالب کو بھی چچا بنائے حضور! جب تک کے نزدیک اپنے مقابلہ میں غالب کی کئی ہستی

نہیں تو بچائے حسرت موبائی، افسر، جگر اور فانی کس شمار میں ہیں۔

شعرائے معاصر میں جگر مراد آبادی کا درجہ اگر آپ جانتا چاہتے ہیں تو سید سلیمان ندوی صاحب کا مقدمہ پڑھیے جو انہوں جگر کے دیوان شعلہ طور پر لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ فراق، سہیل، اور یاس سب کے سب ایک شدید قسم کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ شاعر تو صرف ایک ہو اور وہ جگر مراد آبادی ہے۔

فراق صاحب کی فہرست میں سب سے آخری نمبر فانی بدایونی کا ہے۔ اور اس ترتیب کو انہوں نے برابر قائم رکھا ہے مگر میرے محترم دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی جنہوں نے دیوان فانی پر ایک مسوطہ مقدمہ لکھا ہے۔ علی الاطلاق کہتے ہیں کہ "فانی کو غالب کے مقابلہ میں ایک امتیاز حیثیت دی جا سکتی ہے" لیکن غالب اس مصلحت سے کہیں پرستار بن غالب بُراندانِ جاہیں اپنے بیان میں "مگر بہر حال افضل للقدم" کا دم چھٹا لگا دیا ہے اور میر و فانی کا موازنہ کرتے ہوئے بھی اسی استادانہ پختہ سے کام لیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

"حقیقت یہ ہے کہ میر کا سوز و گداز ان کی لطافتِ زبان، اور نزاکتِ ادا فانی کی شاعری کا اصلی جوہر ہے البتہ متقدم و متاخر کا فرق ہے"

مقدمہ نگار حضرات کے بیانات کی رُو سے ان پانچوں شاعروں میں ہر شخص سب سے افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنی بات ہے۔ حقیقت یہ مقدمہ نگاروں نے اپنے مقدمات میں تنقید کا حق نہیں بلکہ دوستی کا حق ادا کیا ہے اور ساتھ ہی خود اپنی عظمت و بُزرگی کا اظہار و اثبات بھی بد نظر رکھا ہے۔ ان شعرا کے ہر تبیسی کے متعلق میں اپنی برائے کا اظہار کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ ہاں قارئین سبائی اگر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے خواہشمند ہوں تو انہیں چاہیے کہ ان شعرا کے کلام کا براہِ راست مطالعہ کریں اور ان مقدمات کو ہرگز ہرگز نہ پڑھیں کیونکہ ان میں "یارِ فروشی" اور "خود فروشی" کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ اب ہم ان معانی کی ایک مختصر فہرست پیش کرتے ہیں جو ابتداء سے اس وقت تک ہر دور کے شعرا میں مقبول ہے ہیں اور جن کی بنا پر ہم عصر حاضر کے چوٹی کے غزل گو شعرا کو بھی نفاق اور کہنہ پرست کہنے پر مجبور ہیں:-

(۱) پیکانِ و تیر، خنجر و مشیر، قتل و خون۔

(۲) نزع، مرگ، قبر، حشر۔

(۳) میکشی۔

(۴) زہا، دماغ، محتسب، ناصح۔

(۵) جفا، محبوب۔

(۶) تصوف و فلسفہ۔

(۷) رشکِ خونین۔

(۸) جنون۔

(۹) آفتاب و فتنہ، دیباہ و قطرہ، دل و جگر، شمع و ہمدانہ، لیلیٰ مجنوں۔

(۱۰) بی. ٹی. محل۔

جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں ان تمام عنوانات کے ماتحت شعرائے پنجگانہ کا کلام کثیر مقدار میں نقل کرنا ممکن نہیں
 ایسے ہم اپنی بحث کو زیادہ تر ”بادشاہ متغزلین“ یعنی حسرت موہانی تک محدود رکھیں گے اور بقدر گنجائش اصغر، جگر، اور
 قانی کے اشعار بھی بطور نمونہ پیش کرینگے۔ جناب یاس عظیم آبادی یعنی میرزا یگانہ جنگیزی کا دیوان کوئٹہ کے باوجود
 اس وقت تک ہمیں دستیاب نہ ہو سکا ایسے ناچار ان کے کلام کے متعلق اظہار خیال سے صرف نظر کرنا پڑا۔ عنوانات بالا
 کی تشریح اور ہر عنوان کے ماتحت حسرت کے اشعار پیش کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فراق صاحب نے حسرت اور
 کلام حسرت کے متعلق جو بلند بانگ دعوے کیے ہیں انہیں اختصار کے ساتھ یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ قارئین پر کلام حسرت
 کے مطالعہ کے بعد فراق صاحب کے دعوؤں کی حقیقت واضح ہو جائے۔ فراق صاحب فرماتے ہیں کہ ”نقاد نے محسوس ہی
 نہیں کیا کہ

(دفعہ ۱) حسرت کے سوانح حیات، طرز زندگی اور حسرت کی غزل گوئی میں کس قدر لطیف ہم آہنگی پائی جاتی ہے
 اور محسوس کرنا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ

(دفعہ ۲) حسرت کا احساس عشق اور نظریہ حسن و عشق ایک ”بیجا تخیل“ کے پس کی بات نہیں۔

(دفعہ ۳) فراق یار میں گھل گھل کر، بستر مرگ اور گور غریباں کے ذکر سے معشوق کو متاثر کر کے حسرت شعر نہیں کہتا۔

(دفعہ ۴) اُس کی غزل گوئی بیٹھ عمل کی زندگی ہے۔

(دفعہ ۵) دنیا میں کارزار عمل کے جتنے سودا ہوئے ہیں۔ نیپولین، سکندر، تیمور، سینر، اینٹونی، غزنوی، رام
 کرشن، اور ارجن، یہ تمام ہستیاں شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے کیلئے حسرت موہانی کا دیوان تعجب کر گئی۔“
 اس بیان کو پانچ دفعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ترتیب بالا سے ظاہر ہے۔ پہلے ہم آخری دو دفعات کو لیتے ہیں۔
 نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سلطان محمود غزنوی ایک مرتبہ جب ہندوستان
 سے غزنین واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ایک باغی سردار کے علاقہ میں سے گذر رہا۔ ایک نہایت مستحکم قلعہ اُس سردار
 کے قبضہ میں تھا۔ دوسرے دن سلطان نے اس قلعہ کے دروازہ پر بڑا دگیا اور سردار کے پاس پیغام بھیجا کہ کل صبح ہماری
 درگاہ میں حاضر ہو، نذر عقیدت پیش کرو اور سلطانی خلعت پہن کر واپس جاؤ۔ دوسرے دن سلطان اور خواجہ بزرگ
 حسن مہندی گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلے۔ دیکھا کہ سامنے سے قاصد چلا آتا ہے۔ سلطان نے خواجہ سے پوچھا کہ بھلا سردار
 نے کیا جواب دیا ہوگا؟ خواجہ نے فردوسی کا یہ شعر پڑھا ہے

اگر جز بکام من آید جواب : من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان نے پوچھا کہ ”یہ شعر کس کا ہے؟“ اس سے مردانگی کی بڑا آتی ہے۔“

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ مردانہ جنگ کو زیادہ تر ایسے اشعار پسند ہونگے جن میں مجتہد و
 مردانگی کا ذکر ہو، جہاں کامین کرکس، تلواروں کی جھلیاں چمکیں، تیروں کا میہنہ برے اور حریفوں کے خون سے ہولی کھلی

جائے۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ جنگی سوراخوں کو چکا نام فراق صاحب کیا، اور غالباً حسرت کے وہ اشعار پسند آئیں گے جن میں تیغ و خنجر، اور قتل و خون کا ذکر ہے۔

فردوسہ مضامین کے جوہر عنوان ہم نے قائم کیے ہیں ان میں پہلا نمبر، پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، اور قتل و خون کا ہے۔

یہ ایک سلمہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے مضامین ہمارے یہاں فارسی کے متبع ہیں آئے۔ فارسی شاعری میں اس قسم کے خیالات ابتداً شعر کے حالات گرد و پیش کا نتیجہ تھے، رفتہ رفتہ بمنزل اہول سلمہ کے ہو گئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے ان کی تقلید ناگزیر ٹھہری۔ اردو شعرا نے بھی اپنے فارسی پیشرووں کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھا اور نہ ظاہر ہے کہ اردو کے ہزاروں شعرا میں سے جنہوں نے ان مضامین پر طبع آزمائی کی ہے دو چار بھی ایسے دہلیں گے جنہیں اپنے محبوب کے ہاتھوں اغراض شہادت، نہیب ہوا ہو۔ اور بالعرض ایسی چند مثالیں مل بھی جاتی ہیں تو کم از کم اس قدر یقینی ہے کہ حسرت اصغر، جگر، اور قاتی ہرگز ان خوش نصیبوں میں سے نہیں ہیں جنہیں سفاک محبوب نے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ہو۔ جب یہ صورت ہے تو ہم کس طرح مان لیں کہ حسرت کا یہ قول ہے

کیا ہمیں شوق شہادت کو یہ کافی اغراض ؟ کمر اسر ہے ترے نوک سناں کی رونق

کسی امر واقع کا بیان ہوا اور سچ سچ قاتل محبوب حسرت صاحب کا سر کاٹ کر نیزہ پر لے پھرتا تھا۔ یا اصغر صاحب کی یہ بیان ہے کہ شے حسن کے یہاں تھے شاید نہیں مل میں ؟ بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغ خویشاں رکھ دی کسی حقیقت کا حامل ہے۔ یا جگر صاحب کا یہ کوئی ذاتی تجربہ ہو جس کا ذکر اس شعر میں کیا گیا ہو ہے صدقہاں ہاتھوں کے جھکے گی خبر تک ہوئی ؟ اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی یا قاتی صاحب یہ آپ جتنی بیان کی ہے ؟

لازم ہوا استیلا طاعت نہیں ضرور ؟ اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

کاش فراق صاحب اس پر غور کریں کہ یہ کیس کے قتل کے واقعات ہیں؟ کب پیش آنے اور ان کی کیا اصلیت ہے؟ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس موضوع پر پہلے چوٹی کے شعرا نے صرف یہی چار شعر تصنیف فرمائے ہیں۔ نہیں اس قسم کے لایعنی ابے بنیاد اور محض رسمی اشعار سے ان بزرگوں کے دلوں میں بھرے پڑے ہیں جس کا تصور اس نمودار بھی ہم پیش کر چکے۔ معشوق کے ہاتھوں قتل کی اس مفروضہ واردات کے مختلف مدایح ہیں۔ پہلے مختلف پیرایوں میں عاشق صاحب کی طرف سے شوق شہادت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد قاتل کی آمادگی دکھائی جاتی ہے۔ پھر واقعہ قتل کا بیان ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کبھی اپنی سخت جانی کی شکایت کی جاتی ہے کبھی رقص سبیل کا تماشا دکھایا جاتا ہے کبھی قاتل کے دامن بچانے کا ذکر ہوتا ہے۔ قتل ہو جانے کے بعد عاشق صاحب کی طرف سے ہدیہ تشریف معشوق صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ پھر معشوق، بیگناہ عاشق کے قتل پر نادم ہوتا ہے۔ کبھی اپنے دامن سے خون کے دھبے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ کبھی دیدہ دلیری سے مقتول عاشق کا سر نیزہ پر یا اس کا دل تیر کی نوک میں چھبھو کر لے پھرتا ہے۔ یہ اور ایسی قسم کے چند اور

لایعنی مضامین ہیں جن پر ہمارے چوٹی کے شعرا نے اپنا عزیز وقت برباد کیا ہے اور اردو کی عشق پر شاعری کو ایک اُٹھو کہ بنا دیا ہے۔ ایسے
شاہد شاہ متغزلین کی زبانی آپ کو یہ خوئیں داستان سُنوائیں۔ آپ کو اختیار ہو کہ اسے سُنا کر قہقہے لگاتے یا سینہ کو پی کیجئے۔
شوقی شہادت سے

ہم بھی مُشتاق ہیں شہادت کے : لے تجھے خونِ اہل شوقِ مباح
اس دہرہ نہ بیتاب ہوئے شوقِ شہادت : ہے میان میں اُس شوخ کے شمشیرِ اہی تک
پہلے خُدا سے کہیں شوقِ شکارِ دے : پھر یہ کہ وہ ہمیں کو نشانہ اُتار دے
کاٹ لوں اپنا گلا آپ کہ جھکا ہو تمام : کا ش بل جائے کہیں آپ کی شمشیر مجھے
دل خُون ہو چکا ہے جھک رہا چکا ہو خاک : باقی ہوں میں مجھے بھی کرے تیغِ نِدامت
قاتل کی آمد آمد سے

بے نقاب ہو نیکو ہیں مفضل میں وہ بیشک مگر : دیکھنے کا بے کو دیگی میری حیرانی مجھے
قتل سے پہلے سے

کیا تامل ہو مرے قتل میں ای بازو بیاہ : ایک ہی در پر سرتن سے جُدا رکھا ہے
دیکھتے شوقِ شہادت میں جھکی ہو گردن : آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں
ہم سر جھکا چکے تھے علم ہو چکی تھی تیغ : پھر کیا کیا خیال جو قاتل ٹھہر گیا
سخت جانی سے

سخت جانوں پر اٹھنے والی ہو : تیری تلوار کا خدا حافظ
ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پر دہکتے ہیں : ابھی دیکھی نہیں ہو آپ نے تیغِ نِدامت میری
دامن کشی سے

اس سلیقے سے کیا فرج کہ دامن اُن کا : خُونِ عشاق سے گلزارِ رحہ جوئے پایا
دامن کو بچاتا ہے وہ کافر کہ مُبادا : چھو جائے کہیں پاکی خُونِ شہادت سے
اظہارِ تشکر سے

اک ہا تھا سرِ گردنِ حسرت پہ پہنکے : قاتل تیری شمشیر کے احسان ہزاروں
ندامتِ قاتل سے

خُونِ بھیری سے اپنی دیکھ کر تلوارِ مُسرخ : ہوئی مائے ندامت کے جہیز پر مُسرخ
جفائے یار پر چھایا ہو اک عالمِ ندامت کا : ہی تھا مدام میری مُتلا شہادت کا
خونِ حسرت جھکا ہو تو وہ نادھ میں بہت : کچھ نہ ہندی کی خبر ہوئی نہ نہیں ہانک ہو ش
پہلے تو میرا خُونِ بہایا خوشی خوشی : پھر کیا وہ خود ہی سوچے کہ شرمِ لکے رہ گئے

بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتلِ ناحق پر : ہوئی قدرِ وفا جب آشکارا ہستہ ہستہ
خون کے دھبے ۛ

قاتلِ ترے دہن پر مرے خون کے دھبے : کچھ اور بھی خنجر سے چھانے میں لگے ہیں
قاتل کی دیدہ دلیری ۛ

ٹھکڑے ہیں یہ کس کے دلِ محروم کے ظالم : ایک جوتے تیرے پیکل میں لگے ہیں
قتل کر کے جھکوتے ہیں وہ کس ناز سے : یہ تو ہم نے صرف چاہت آزمائی آپ کی
لگے ہاتھوں تلوار کے دھچکار ہاتھ اور بھی دیکھ لیجئے ۛ

تم لگاتے جو سنے ہاتھ سے تیغ : سب مرے زخمِ دلکش ہوتے
کون یہ دستِ بزمِ شمشیرِ نظر آتا ہے : جھکواک عالمِ تصورِ نظر آتا ہے
تری تلوار سے اے شاہِ خواں : محبت ہو گئی ہے ہر گلوگر
رجش بازوِ نازک کی ضرورت کیا تھی : جھکواک جنبشِ ابرو سے ہٹا دینا تھا

یہ ہیں وہ اشعارِ آبدار جن کی بنا پر بقولِ فراق کارزارِ عمل کے سورا سورا سیر، تیمور، پولین، ایٹوئی، مغربی
رام، کرشن اور ارجن وغیرہ شعرو شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے حسرتِ موبانی کا دیوانِ منتخب کر بیٹھے۔ لیکن فراق
صاحب کا یہ نظریہ تسلیم کرنے کے لئے ان سورا ماذل کو سلیبِ الحواس اور فاقہِ العقل فرض کرنا بھی ضروری ہو گا کیونکہ نبات
عقل و حواس کی حالت میں دنیا کا کوئی انسان بھی ایسے اشعار سے متاثر اور لطف اندوز نہیں ہو سکتا جنکو اصلیت و حقیقت
سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ ہو اور جن کی بنیاد محض چند لائینی مفروضات پر ہو۔

ہاں یہ بھی ممکن ہو کہ فراق صاحب نے (دفعہ ۴) میں جس ٹیٹھ عمل "کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی مراد وہ عمل ہو جسکے
مختلف پہلوؤں پر "بادشاہِ متفرلین" نے مندرجہ ذیل اشعار میں روشنی ڈالی ہے۔ سنیئے ۛ

انہ میرے میں وہ آپٹے تھے پہلے کسے دہرے میں : کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرمِ اکراہا تم ہو
خروجِ یارِ مکدرِ حدو سے کیوں ہوتا : ضرور کوئی نہ کوئی ہوئی فتور کی بات
دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ جھکواک ہم سے : رسمِ پابندی اوقات چلی جاتی ہے

حاصلِ نتیجہ میں جو رضائی تمام شب : اس غم سے ہلکونیندہ آئی تمام شب
رفک سے بیٹھ بیٹھ گئے ہم دیکھا کہ گرمِ نظر : غیر نے محفل میں جب انگلی دہائی آپ کی

ہم حال نہیں ہیں دل کا سنانے میں لگے ہیں : کچھ کہتے نہیں پاؤں دہانے میں لگے ہیں
دو پہر کی دھوپ میں میرے بٹانے کے لئے : دہتر کوٹھے پہنکے پاؤں آنا یاد ہے

سانے سبکے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ۛ سر سے ڈھلجائے نہ غصہ میں دوپٹا دیکھو
 سب کی خاطر کا ہو خیال نہیں ۛ کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
 ہم نے کس دن ترے کوچے میں گڈاؤ نہ کیا ۛ تو نے اسے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

—————

اس قسم کے پست، سو قیانا، اور مبتذل اشعار بادشاہ متغزلین کے یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ہم نے تو صرف نمونہ پیش کیا ہے۔
 (دفعہ ۲) میں فراق صاحب فرماتے ہیں کہ "فراق یار میں گھل گھل کر، بستر مرگ اور گور غریباں کے ذکر سے معشوق کو تائثر کر کے حسرت شعر نہیں کہتا؟ آئیے ذرا بادشاہ متغزلین کے کلام کا جائزہ لیں اور یہ کہیں کہ فراق صاحب کا یہ دعویٰ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے۔

فردوسہ مضامین کی جو فہرست ہم نے پیش کی ہے اس میں دوسرا نمبر نزع۔ مرگ۔ قبر۔ حشر کا ہے۔ جس طرح قتل کی واردات کے مختلف مدارج تھے اسی طرح اس موضوع کے بھی کئی درجے ہیں۔ پہلے عاشق صاحب پر فراق یار میں نزع کا عالم طاری ہوتا ہو سنگدل محبوب کبھی تو اسی حالت میں آ پہنچتا ہو اور کبھی عاشق صاحب کے راہی عدم ہونے کے بعد آتا ہے۔ کبھی جنازے میں شریک ہوتا ہے اور کبھی صرف قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ آتا ہو۔ کبھی مزار عاشق پر پھول بھی چڑھاتا ہے اور کبھی قبر کی زیارت کو بھی نہیں جاتا۔ مرنے کے بعد جب عاشق صاحب خاک میں ملکر خاک ہو جاتے ہیں تو ان کا غبار دامن محبوبے پیٹ جاتا ہے۔ آخری منزل حشر کی ملاقات ہے۔ عاشق صاحب اس بھیڑ میں بھی اپنے محبوب کو پہچان لیتے ہیں اور طرح طرح سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔

"بادشاہ متغزلین" کا عالم نزع دیکھتے

ابھی کچھ اور دم واپس ٹھہر جاتا ۛ کچھ اور بھی جو ترا انتظار ہم کرتے
 دم آخر گئے دیکھا تو نادم ہو کے فرمایا ۛ کسے معلوم تھا تیری یہ حالت ہو نہولی ہے
 دم واپس گئے پرسش کو ناحق ۛ بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم
 بعد مرگ سے

موت سے پوری ہوتی شمر طوفا ۛ پر نہ کہا تم نے کہ ہاں ہو گئی
 حال مرا تھا جبہ تشراب تو ہو نہ تم خبر ۛ بعد مرے ہوا اثر، اب میں فراق کیا کروں
 درمیان ہجوم حسرت و یاس ۛ میں بھی اک گوشہ مزار میں تھا
 ہو فامحبوب تعزیت کو نہیں آتا سے

بل گئی خاک میں سب برو ناز و نسا ۛ تعزیت کو بھی نہ وہ شوخ جفا جو آیا
 نہ صرف اتنا بلکہ عاشق صاحب کے مزار پر بھی نہیں جاتا سے

ہے جہاں دفن شہید وفا : واں کبھی آپ کا گد نہ ہوا
 حسرت صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے
 فاتحہ پڑھتے چلے مرقہ حسرت پر جو وہ : پہلے کس ناز سے رُود کے منوار و گلیسو
 قبر عاشق پر پھول چڑھائے بلتے ہیں سے
 مرقہ عاشقوں پر آخر کار : گلشنانی تجھے مبارک ہو
 خاک عاشق سے

خاک ہو کر تلایہ خمر کہ ہیں : تیرے توں کا ہمار کا پ ہوا
 پٹے اس ڈھب کے پھر جو نہ بعد خاک مری : کہیں پوچھے بھی تو اُس کو فہ داماں کے قبر
 حسرت صاحب حشر میں پوچھے ہیں اور وہاں اس جفا کا رُس ملاقات ہوتی ہے سے
 ہم عرصہ حشر میں بھی حسرت : پہچان گئے انہیں نے ہوش
 شکوہ عشق جو ہم سے کسی عنوان ہوا : حشر میں بھی وہ جفا کا لہشیاں نہ ہوا
 جنت میں پہونچنے کے بعد یا محبوب میں عاشق صاحب حوروں کی طرف ملتفت نہیں ہوتے سے
 یاد میں تیری نہ دُنیا ہی سے نیز احوال : خلد میں بھی تو نمی طہ ہوتے حور سے ہم
 کیا ان اشعار کی موجودگی میں اور انہیں جیسے دوسرے اشعار کے ہوتے ہوئے جو دیوان حسرت میں آچکے ہیں گے
 فراق صاحب کا وہ دعویٰ جو انہوں نے (دفعہ ۳) میں پیش کیا ہے کسی طرح قابل قبول ہے ؟
 ممکن ہے، بعض حضرات یہ سوال کریں کہ پہلے عنوان کے ماتحت جو اشعار نقل کئے گئے ان سے حسرت صاحب
 کا قتل ہونا ثابت اور اب یہ بتایا جاتا ہے کہ محبوب کی بے اعتنائی اُن کی موت کا باعث ہوئی اور کہیں ان کا مزار بھی پڑ
 ان دو مختلف بیابانوں میں سے کوئی بیان سچا ہے۔ اس کے علاوہ واقعات بعد از مرگ کا جن اشعار میں ذکر ہے وہ مرنے کے
 بعد کس طرح کہے گئے اور ہم تک کیونکہ پہونچے ؟ دراصل ان سوالات کا صحیح جواب دینا میری طاقت سے باہر ہے۔ اگر میں
 کچھ کہوں گا بھی تو وہ محض ایک لٹری اور قیاسی بات ہوگی اس لئے بہتر یہ ہے کہ طالبان تحقیق مولانا حسرت کو کافی دور کے
 پتہ پر خط لکھ کر اُن سے حقیقت حال دریافت کر لیں یا پھر فراق صاحب رجوع کریں ممکن ہے کہ وہ ان مسائل پر کچھ
 روشنی ڈال سکیں کیونکہ ”بادشاہ متغزلین“ کے کلام کے اسرار و رموز کو جیسا کہ سمجھتے ہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔
 اپنے بیان کی (دفعہ ۲) میں فراق صاحب نے حسرت کے نظریہ حسن و عشق کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ہماری فہم و جست
 معاین فرمودہ ”میں اس قسم کا کوئی عنوان نہیں ہے لہذا اس موضوع پر ہم تفصیلی بحث نہیں کر سکتے۔ البتہ قارئین کی
 دلچسپی کیلئے اختصار کے ساتھ حسرت صاحب کا نظریہ حسن و عشق“ پیش کر دیتے۔

عام طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کسی پر دل آتا ہے تو بے اختیار آتا ہے۔ ارادہ، خواہش، اور دلکش
 سے انسان کسی پر عاشق نہیں ہوا کرتا۔ لیکن حسرت صاحب کے قائل نہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی اور ایک چھوٹے لڑکے

کو جس میں جوان ہو کر معشوق بننے کی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اپنے لئے انتخاب کر لیتے ہیں اور اس اُمید پر جیتے ہیں کہ جب وقت کا مقدر حسن کی تصویر میں شباب کا رنگ بھرے گا تو اس پیکر جمال کی خدمت میں عاشقی کی درخواست پیش کر دیئے اور برسوں کی اُمید داری سے حق محبت ثابت کر دیا جائیگا۔ اس خیال کو نہایت جامعت کے ساتھ انہوں نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے

عمر ہی کیا ہے وہ کس ہیں ابھی نام خدا ۛ اُنہی مہرنا ہو تو کچھ دن ہمیں جینا ہو ضرور

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مولانا کی نظر دور بین نے اس تسکس کو اپنا معشوق بنانے کے لئے انتخاب کیا تھا، اُس وقت وہ خود ماشا اللہ کافی سن رسیدہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت وہ کافر جوان ہوا، یہ بوڑھے ہو گئے مگر محمد اللہ اُس پیکر شباب سے حصول آرزو کا جوش سرد نہیں ہوا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں

پیرانہ سر بھی شوق کی ہمت بلند ہو ۛ خواہاں کام جاں ہیں جو اس لہجہ اہم

سطور بالا میں ہم بیان کرتے ہیں کہ مولانا ایک معمولی سی لڑکی اور ایک چھوٹا سا لڑکا جس میں جوان ہو کر معشوق بننے کی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اپنے لئے انتخاب کر لیتے ہیں، تسکس کا لڑکی یا لڑکا ہونا ثابت ہو۔ جہاں تسکس شعر کا تعلق ہے، یہ اعتراض یقیناً درست ہو لیکن ہمارے پیش نظر مولانا کے دوسرے اشعار بھی ہیں جن سے یہ امر متعین ہو جاتا ہے۔ اس سے تو غالباً فراق صاحب کو بھی انکار نہ ہو گا کہ دو پٹا لڑکیوں اور عورتوں کیلئے مخصوص ہوا اور شعر سے سامنے کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ۛ سر سے ڈھل جائے نہ غصہ میں دو پٹا دیکھو

یہ نتیجہ نکالنا کہ محبوب مخاطب صنعت نازک کا ایک فرد ہو، غالباً یحیٰ نہ ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی جب ہم اس شعر پر پہنچتے ہیں

سر تا سر اک لطیفہ خوبی ہو وہ نگار ۛ زلف آئیں حشر میں ہو تو ہوشیار خط

تو یہ لئے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مولانا صاحب کا محبوب کوئی چمکیا، بھانڈا کا لڑکا ہے جس کے داڑھی بھی ہے اور زلفیں بھی۔

یہ ہے بادشاہ متغزلین کا نظریہ حسن و عشق جس کا سمجھنا قبول فراق نقاد کے بس کی بات نہیں یہیں فراق صاحب کی اس بحث سے کا بل اتفاق ہے۔

اب ہم فراق صاحب کے بیان کی (دفعہ اول) کو لیتے ہیں جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حسرت کے سوانح حیات، طرز زندگی اور حسرت کی غزل گوئی میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہم نے اپنی تقریباً مضاہین فرسودہ کے پہلے اور دوسرے عنوان کے ماتحت جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد ایک معمولی کچھ کا انسان بھی فراق صاحب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ان اشعار میں اور حسرت کے سوانح زندگی میں ہم آہنگی تو کچھ کوئی قدر کا بھی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا حسرت زید عمرہ ماشا اللہ تندرست و توانا کا سپر میں بلج رہے ہیں پھر کوئی کس طرح یہ کہے کہ ان اشعار میں جو واقعات مذکور ہیں مثلاً مولانا کا قتل، یا عالم نزع اور وفات وغیرہ ان کی

کوئی اصلیت ہے۔ رسم پرستی کا بڑا ہو جسکی بدولت ہمارے ادب میں یہ سرمایہ خرافات ہر روز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔
ہماری فہرست مضامین فرسودہ کا تیسرا عنوان میکشی ہے۔

شراب خواری ہمیشہ ایرانیوں کا نہایت محبوب مشغلہ ورنہ کی سماجی زندگی کا ایک جزو لازمی نہ ہی ہو۔ زردشتی مذہب میں تو شراب جائز ہی تھی لیکن اسلام لانے کے بعد بھی ایران کی میکشی میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ دراصل روایات کہن کا اثر طابع کا فطری میدان اور ملک کی آب و ہوا ان سب چیزوں نے ملکر شراب خواری کو ایک ایرانی کی زندگی کا جزو لازمی بنا دیا اور آج بھی جس عمومیت کے ساتھ ایران میں شراب پی جاتی ہے اسکی مثال کسی ایشیائی ملک میں تو کیا یورپ میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ سنہ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے۔ طہران میں میں اپنے ایک دوست کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پیاس لگی میں نے پانی مانگا لیکن آب سادہ کے بجائے ترش سیال پیش کی گئی۔ مجب میں نے اسکے پینے سے انکار کیا تو میرے دوست نے حیران ہو کر پوچھا کیا آپ نہیں پیتے، میں نے کہا نہیں۔ اسپر انہوں نے جو الفاظ کہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہینگے اور وہ ایران کے میلانا تو امر وہ کہ ایک سچا نمونہ ہیں۔ انہوں نے کہا۔ بڑا آدم کر عرق نخورد، چہ طور ممکن است زندگانی کند؟ بھائی، آدمی شراب نہ پئے تو کیکر کچے غرض منجھواری کے اس عام مدوح کا نتیجہ یہ ہوا کہ شراب ایرانی شاعری کا ایک مخصوص موضوع بن گئی اور ایران کے لاکھوں شعرا میں شاید دس پانچ بھی ایسے نہ ملیں گے جنہوں نے شراب کے متعلق کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ جو پیتے تھے انہوں نے بیانیہ واقع کے طور پر اور جو نہیں پیتے تھے انہوں نے اکثریت کی تقلید میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شاعری تو ایرانی شاعری کا منقہ ہے جو کچھ وہاں ہے، یہاں بھی ہے۔ اصلیت نہ سی نقالی ہی سی۔ میر و سودا کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک شاعری (جہاں تک معنی پرچہ پینے کا تعلق ہے) ہمارے شعرا کی ایک نہایت قلیل جماعت تک محدود رہی ہو لیکن اس کے باوجود شراب کے متعلق قریب قریب ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے اور بعض نے تو اس موضوع کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہو حالانکہ ان میں سے بعض کے متعلق تحقیق طور پر معلوم ہو کہ انہوں نے پینا تو کچھ شراب بھی چھوٹی بھی نہیں اور چھوٹا کیسا کبھی دیکھی بھی نہیں۔ لیکن ان کے دیوان اٹھا کر دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے شراب کی بھٹی ہے کہ بڑی بھبک رہی ہو، بے معنی نقالی کی اس سے زیادہ فوسناک مثال ادرہ کیا ہو سکتی ہو۔ وہ بد نصیب شاعر جس نے پینا تو کچھ شراب کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی اور جس کے اشعار کی بنیاد ذاتی تجربات کے بجائے محض روایت پر ہے، اس کے کلام میں کیا لطف ہو سکتا ہے۔ وہ کیا جائے کہ حقیقی کیف و مستی کے کہتے ہیں، زاهد و عارف کو ہمیشہ یہ کہہ کر تاراجا تا ہو کہ ہائے کجخت تو نے پی ہی نہیں، لیکن اس قسم کے نقال شاعر کیا زہد و عطا سے کم نفع کو کچھ جانے چاہئیں۔ ان لوگوں کا شراب کے متعلق اشعار لکھنا ٹھیک کیسا ہی ہے جیسے ایک چھوٹی کنیا کو لڑکھائے لکھے یا اچھا تاکہ مذہبی شعر عرب پر تبصرہ فرمائیں۔

مولانا حسرت موہانی کے سوانح زندگی کا جہاں تک ہمیں علم ہو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے دُختِ رند سے کسی دل نہیں لگایا۔ ہاں، کبھی بھولے بیٹھے اندھیرے آجائے کوئی بات ہو گئی ہو تو وہ چنداں قابلِ کھا تا نہیں۔ لیکن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ماشا اللہ بڑے دعاوت شری ہیں پیتے ہیں اور روز پیتے ہیں، ساغر و مینا پر بس کر نولے نہیں بلکہ غم کے غم نہٹھالے ہیں اور پی پی کر دونوں جہان سے نیچر ہو جاتے ہیں بلکہ فنا ہو کر بھی خاکِ رومیخانہ بنتے ہیں بعض بعض غریب تو

مطلع سے لیکر مقطع تک شراب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ آئیے آپ بھی میخواری میں بادشاہ متغزلین کے فسر یک ہو جائیے اور بیدھرک ہو کر پہنچے اس لئے کہ ہے

حسرت ہے پرست کو، بلکہ ہر ایک ست کو : پیرِ مِغیاں کے دور میں خوفِ خطا سے کیا غرض
اب دیکھئے کہ حسرت ہے پرست، کس کس انداز سے پیرِ مِغیاں کی خدمت میں عرضِ نیاز کرتے ہیں :
میری طینت میں جو دھل ہو جس جامِ شراب : بندہ پیرِ مِغیاں ہوں میں جس جامِ شراب
مجھے طوفِ حرم کی آرزو کیوں ہو گذر میرا : میر کوئے بٹاں تک ہے در پیرِ مِغیاں تک ہے
میو شیدو نہیں، بخیر دو جہاں ہے : ہم خوش ہے کہ بندہ پیرِ مِغیاں ہے
چلتا ہو روز و رات ارغواں ہنوز : جاری ہو فیضِ محفل پیرِ مِغیاں ہنوز
پیرِ مِغیاں تھا میں یہاں تک حسرت : کہ فنا ہو کے بھی خاکِ رو میخانہ ہوا
(فرق لائے نہ جگر سوزی صہبائیں گلاب : مٹی جو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کر دو)

ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک عرب ہندوستان آیا۔ اتفاق سے "حرم" کے زمانہ میں اُسے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں جا کر یہ ماتم۔ جدر دیکھتا ہوشیوں و دشمن۔ حیران ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ کون مر گیا جس کے لئے سارا شہر عزافانہ بنا ہوا ہے۔ جواب ملا کہ "اُسے نادان، تجھے معلوم نہیں کہ یہ ماتم حسین ہے" عرب نے بڑے تعجب سے کہا کہ "اچھا! یہاں اب خبر آئی ہو۔ حسین کی وفات کو تیرہ سو برس گزرے، وہ بیچارہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس شخص کی وفات کو تیرہ سو برس گزر چکے آج اُسکی مجلس عزاکیوں برپا ہے۔ لہذا اُس نے یہی قیاس قائم کیا کہ غالباً ہندوستان کے لوگ واقعہ کے بلا سے اب تک بے خبر تھے۔ اب خبر آئی ہے تو مصروف ماتم ہیں۔" اردو شاعری میں پیرِ مِغیاں اور مٹیوں کا ذکر بھی ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا اُس عریکے نزدیک امام حسین کی وفات کے تیرہ سو برس بعد لکھنؤ میں اُن کا ماتم تھا اس لئے کہ قبولِ سلام کے بعد خود ابراہیم علی پیرِ مِغیاں اور مٹیوں کا وجود برائے نام رہ گیا تھا چہ جائیکہ ہندوستان جہاں یہ گروہ نہ کبھی پہلے تھا نہ آج ہے۔ ہاں کوئی صاحبِ محض مباحثہ کی خاطر نو ساری کے پار میوں کی مثال پیش کرنے لگیں تو اودہات ہے مگر یاد رہے کہ ہماری اردو شاعری میں جس پیرِ مِغیاں اور مٹیوں کا ذکر ہے وہ نو ساری سے ہرگز نہیں آیا۔

میخواری کے تمام مذاہج پر مولانا نے سیرِ محالِ بحث کی ہو۔ اشعار ذیل نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں :

ابنی خیر میرے عہدِ ترکِ بیگساری کی : ہجومِ شوق میں شگامہٴ قفلِ بہاراں میں
برسات کے تے ہی، توبہ نہ رہی باقی : بادل جو نظر تے بدلی مری تیت بھی ملے

نغم لگا دے ہم بلا نوشوں کے لپے ساقیا : کام آئیگانہ ساغر آج نے بیانہ آج
اسقندیں مستیاں ہم بادہ خواروں کے کراچ : ہو گیا سب رنگ سے خانہٴ خارِ شمع

ملے میں تو یہ کچھ اٹھا مگر کیا کر دلِ خلیل : کالی گٹھا کو دیکھ کے نیت بدل گئی۔ دونوں شعروں میں کس قدر مشابہت ہے۔

رندوں پر یہ کیا ستم ہے سنائی : ساغر خالی ہیں پُرسبو ہیں
ابھولتی ہو تو چٹوہی سے لیں نوش : انتظار طلب جام ہے بجانہ کریں

دیکھ کر غیر کی محفل میں نہیں مست شراب : نہ ہوا ضبط ہمارے بیکل آنے آنسو
رشک سے بھٹکتے ہم نشہ کا مائل حال : جب ملا لبھائے سنائی سے لب پکانہ آج

اشعار بالا سے قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مولانا نے جس سوسائٹی کی تصویر کھینچی ہو وہ گل کی گل شرابی ہو۔
رقیب تودہ شرابی۔ محبوب ہی تودہ شرابی۔ احباب ہیں تودہ شرابی۔ اور خود اپنا اور ساقی کا تو پوچھنا ہی کیا کہ یہ تو
شراب ہی سے بنے ہیں۔ رندوں کی ہستیوں کا یہ عالم ہو کہ بچائے زاہد اور داعط کو بھی زبردستی پلا دیتے ہیں سے
رندوں نے پکھا کر پلا دی : داعط کے نہ چل سکے بہانے
اور پھر اسی پر بس نہیں۔ مولانا کا تو یہ ارادہ ہے کہ ہر ولی کو میخوار بنا دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے
کرد و نگاہیں ہر ولی کو میخوار : توفیق جو پہکودی خذلے

اس قسم کی رسمی شاعری پر اب جو ہر طرف سے دس شروع ہوئی ہے تو یاروں نے تصوف کے دامن میں پناہ
لی ہے۔ اور معترفین کو حقیقت و مجاز کے فریب میں مبتلا کرنا چاہا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ شاعری میں استعارات
سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی کبھی نظر کو تیرا اور آنکھ کو ساغر سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اشعار بالا میں جس شراب کا
ذکر ہے، جو داعط بچارے کو پکھا کر پلائی گئی ہے، اُسے ”شراب معرفت“ ٹھہرانا، مذاق سلیم کے گلے پر کند
چھری چلانا ہے۔

چونکہ ملت سے راقم السطور کا سنسن کا پور ہے اور مولانا حسرت بھی ایک زمانہ سے کانپور ہی میں قیام
پذیر ہیں اس لئے موصوف کے ذاتی حالات سے ایک حد تک آگاہی ہے۔ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ مولانا حسرت کسی زمانہ
میں بھی بھنگ پیا کرتے تھے یا بجل پیتے ہیں تو ہم بہر قسم کا تاوان ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن رسم کی پابندی اور
ثقافت کی مجبوری نے مولانا کی زبان سے یہ شعر نکلوا دیا ہے

مہم ہستی کے اب کہاں وہ بنگ : ساغر بادہ ہونہ کا سہ بنگ

یہی ہے وہ ہم آہنگی جو فراق صاحب کے نزدیک حسرت کے سوانح حیات اور حسرت کی غزلگوئی میں پائی جاتی ہے۔ فراق
صاحب نے حسرت کے سوانح زندگی اور حسرت کی غزلگوئی میں ہم آہنگی کا دعویٰ کرتے وقت غالباً اس امر پر غور نہیں کیا
کہ اگر واقعی یہ دعویٰ ثابت ہو جائے تو بچائے مولانا حسرت کو ایک دھواوت شرابی اور ایک بنگ نوش ماننا پڑے گا۔
حالانکہ یہ دونوں باتیں مولانا کو قہر کی ذات پر صریح اتہام اور قطعی بہتان ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر جو کچھ
لکھا ہے وہ محض نقالی ہے حقیقت سے اُسے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ (باقی آئندہ)

عنایت اللہ

رُبَاعِیَاتِ فَرَحَت

بزمِ رنداں کو جگمگا دے ساقی : اپنے نشیوں کی سب لہ دے ساقی
بدستِ شراب کر کے دُنیا بھر کو : تفریقِ مَن و تُو بھی مٹا دے ساقی

دل کو مستِ نگاہ کر دے ساقی : کر دے ہاں بہاں بہا کر دے ساقی
میری بخشش کو خود ہی رحمت دے : اتنا غرقِ گناہ کر دے ساقی

آنکھیں محوِ نگار کر دے ساقی : انہیں کیفِ بہار بھر دے ساقی
میرے جذباتِ عشق بے معنی کو : زینتِ دہِ حُسنِ یار کر دے ساقی

مینا میں ہو پھر شرابِ رقصاں ساقی : پھر جام سے ہو دواغِ ایماں ساقی
کوئینِ غرقِ جام و صہبا ہو جائے : کر دے سستی کا اتنا سا ماں ساقی

ایمانِ شرابِ اجانِ راحت ساقی : کوئین کی ہو یہی حقیقت ساقی
جامِ ہستی نے کھڑا ہے فرحت : بھر دے بھر دے بے محبت ساقی

فرحت کا نور می

زارینہ کا گل بنفشہ

کسی زمانے میں ایک جرسن شہنشاہ کی یہ خواہش چوتی کہ زار روس سے صلح کرے حقیقت میں صلح تو تھی ہی لیکن اس کی خواہش یہ تھی کہ دونوں ممالک میں اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ بوٹے آدمی فطرتاً صلح پسند ہوا کرتے ہیں۔ صلح ان کے دنیاوی تعلقات میں آسانی بہم پہنچاتی ہے اور جب وہ مر جاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں — ”اے آج دنیا سے وہ واحد شخص اٹھ گیا جس نے جنگ کے اجتماع پہلو کو اچھی طرح سمجھا تھا“

لیکن بد قسمتی سے وہ اتنا ضعیف تھا کہ اُسے خود دار السلطنت روس تک جانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لئے اُس نے ایک معذرت نامے کے ساتھ اپنے چانسلر کو اس اہم مہم پر روانہ کیا۔ ہاں وہ چانسلر جرمنی کا مشہور سیاست پرش فلیرنگ تھا۔ پرش فلیرنگ نے سینٹ پیٹرسبرگ رات کے وقت پہنچا۔ زار بستر پر جا چکا تھا۔ لیکن اس کا لارڈ چانسلر موجود تھا۔ لٹا کے بعد فلیرنگ کو ایک خوبصورت خرابچہ آرام کیلئے دی گئی جہاں ایک بہت ہی لطیف ٹیبلٹ روشن تھی۔ روس سرور ملک ہے۔

دوسرے دن جب وہ اٹھا تو آفتاب نہ نکلا تھا۔ وہ سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ اس کی نصیحت شہرت اسی عادت کی مرہون بنتی تھی۔ اُس نے بڑے بڑے اور ایک ملکی سی چہل قدمی کیلئے روانہ ہو گیا۔

لیکن زار کے سپاہی شاید فلیرنگ سے بھی زیادہ سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ اس عظیم الشان محل کے ہر کونے پر، ہر دور پہ پر ایک دروازہ سپاہی متعین تھا۔ جیسے وہ گزرتا سپاہی اپنی بندوق اٹھا کر سلام کرتے جاتے۔ فلیرنگ ان غیر معمولی سلاموں سے تنگ آ گیا تھا کیونکہ خوش الحان پرندے بول رہے تھے اور شہنشاہ کے قطرے ابھی تک سبز گھاس پر پھرنے کے مانند چمک رہے تھے۔ وہ اس وقت کچھ سوچنے کیلئے تنہائی چاہ رہا تھا کیونکہ یقینی امر تھا کہ زار کا شہادت کے بعد فوراً اسے طلب کر لیا اور اُسے اہم صلح نامہ کے چند عجیبہ نکات طے کرنے ہونگے۔

”یہ حافظ نہایت ہی نامتو ہیں۔ فلیرنگ نے دل ہی دل میں کہا۔ انکی شوخ و رویا آنکھوں پر کھنجر جبر معلوم ہوتی ہے۔ خدا نے اس ملک کو ذوق سلیم سے زیادہ دولت عطا فرمائی ہے۔“

وہ چلتا ہی گیا یہاں تک کہ اُس نے محسوس کیا کہ محافظوں کا یہ لائحہ وود مسلسل ختم ہوا چاہتا ہے کیونکہ درختوں کے اس گئے جھنڈ میں دور تک کسی حافظ کی شوخ و روی نظر آرہی تھی۔ راستہ سبز گھاس کے ایک بڑے خطہ پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ ویسی نفیس جی ہوتی گھاس اُسے کم دیکھی تھی۔

”کیا ہی اچھی جگہ ہے!“ اُس نے کہا۔ ”لعنت ہو تم پر!“ اسکی نظریک بیک ایک وورایہ تادہ حافظ پر پڑی۔ جو اس سرسبز خطہ کے شیک بچوں بچ کھڑا تھا۔ اُسے یہ ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ ایک حافظ ایسی سنسان جگہ میں کیوں متعین کیا گیا ہے؟ وہ تنہائی چاہ رہا تھا۔ اُسے کچھ سوچنا تھا۔ زار روس سے شرف ملاقات کوئی معمولی سی بات تو تھی نہیں۔ لیکن آج تک اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا تھا جسے اُس نے نہ سمجھا ہو۔ یہ فلیرنگ کی کامیابی کی

دوسری وجہ ہے۔

وہ حفاظت کے پاس پہنچ گیا۔ معاف کرنا بھی! لیکن تم یہاں کس چیز کی حفاظت کر رہے ہو؟ اس نے پوچھا۔
 میں کس طرح جان سکتا ہوں؟ سپاہی نے کہا جو اتفاق سے درباری گنگو سے قطعاً واقف تھا۔
 لیکن یہ عجیب بات ہے! فلینزنگ نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا: آخر اس کھلے ہوئے میدان میں کس چیز کی حفاظت کی جا رہی ہے؟

مجھے یہاں کھڑے رہنے کا حکم ملا ہے۔ سپاہی نے اس تنقید سے عاجز آکر سخت لہجے میں کہا۔
 لیکن ہمیں یہاں کھڑے رہنے کا حکم کس نے دیا ہے؟ فلینزنگ نے پوچھا۔
 کیدوں؟ سرجنٹ! اور کون حکم دے سکتا ہے؟

پرٹنس فلینزنگ اس سے زیادہ واقفیت حاصل نہ کر سکا۔ وہ گنگے چلا۔ لیکن واپسی میں بھی بن بند و بالا سپاہی اسی طرح ایستا وہ تھا۔ جیسے اسی طرح صابر کی غیر مرئی چیز کی حفاظت کرتا ہوا۔
 چاشت کے بعد فلینزنگ کی دربار گزار میں ملتی ہوئی اور اسی اہم صلح نامہ کی گنگو چھپڑی گئی۔ تھوڑی دیر کی گنگو کے بعد
 گزار سخت متعجب تھا کہ ایسا اس باختر شخص جس کا دماغ ہر وقت کسی دوسرے خیال میں غور کرتا ہو کس طرح یورپ میں اتنی
 شہرت حاصل کر سکا؟

مجھے افسوس ہے، گزار نے ایک طویل تقریر کے بعد کہا: کہ میں آپ کو اپنا نظریہ نہ سمجھا سکا۔ اگر یہ سوال ہو کہ میں اپن
 سپاہی کس طرح پولینڈ میں متعین کرتا ہوں۔
 سرسبز خطہ کے بیچ میں! فلینزنگ یکایک بول اٹھا۔

گزار نے غصہ سے اس کی طرف دیکھا۔
 میں... میں معافی کا خواستگار ہوں! اس نے گھبراتے ہوئے کہا: اعلیٰ جاہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے آج ایک ایسی
 بات دیکھی ہے کہ اب تک ضبط ہوں اور ابھی تک میرا خیال اسی طرف ہے؟
 خوب! گزار نے کہا: کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ وہ کون سی بات ہے؟ کیونکہ ہم اپنے جہان کی خاطر واری
 کے بارے میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں!

فلینزنگ نے سارا قصہ کہہ سنا دیا۔

گزار کی جبین پر شیخین نمودار ہوئیں۔ وہ سوچ رہا تھا: درختوں کے اس سرے..... تم کہتے ہو؟..... او! چاند مار
 کا یہ نام میدان شاید؟..... میں اب سمجھا ہاں ہاں ٹھیک بیچ میں ایک سپاہی متعین ہے۔ میں سینکڑوں بار اس کے پاس
 سے گزرا ہوں۔ لیکن مجھے یہ کبھی خیال نہیں ہوا کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ اچھا چلیں ہم اس سے پوچھیں۔ صلح نامہ کی گنگو کل پر
 تھری رکھی جاسکتی ہے؟

وہ چاند ماری کے میدان تک ٹہکتے ہوئے پہنچے۔ محافظوں کی تبدیلی عمل میں آئی تھی، لیکن اسی جگہ ایک دوسرا سپاہی

ایسا نہ تھا۔ اُس نے بھی اسی انداز سے سلام کیا۔ ”تم یہاں کیوں متعین ہو؟“ زار نے نرمی سے پوچھا۔

سپاہی پر لرزہ کا ایک خاصا دورہ بڑھ گیا۔ لیکن اُس نے بھی اقرار کیا کہ وہ بھی اس بارے میں قطعاً ناواقف ہے۔ سر جٹ طلب کیا گیا۔ اسی معلومات بھی سپاہی سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ اس کے بعد کینٹن بھی بس اتنا کہہ سکا کہ کرنل کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ کرنل صاحب طلب کئے جائیں۔

کرنل صاحب بس اتنی صفائی دے سکے کہ محافظوں کے تعین میں وہ گزشتہ کرنل کی پیروی کرتے ہیں اور محافظوں کی قیام کا نقشہ وزارت جنگ اور وزارت امور داخلہ کی رضامندی سے تیار ہوا ہے۔

”کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم نے اس میں ذرا بھی ترمیم نہیں کی ہے؟“ زار نے پوچھا۔

”اعلیٰ جاہ! میں نے گزشتہ بارہ سال کی خدمت میں ٹھک حلالی اور وفاداری کو اپنا رہبر بنایا ہے۔“ محافظ دستے کے کرنل نے غور سے جواب دیا۔ وہ اپنی خدمت کی طوالت پر خاص زور دے رہا تھا کیونکہ ترقی کی فہرست دستے کے اُس کے لئے ہٹ تخلیق ثابت ہو رہی تھی اور اب اُسے خود بھی اپنی صلاحیت پر دھوکا ہونے لگا تھا۔

”کوئی شخص بھی نہیں حضور! ایک فٹ بھی نہیں حضور! کرنل صاحب اپنا مطلب صاف کرنا چاہ رہے تھے۔

”ہم دوپہر کے کھانے کے بعد اُس کی تحقیقات کرینگے۔“ زار نے جلدی سے کہا کیونکہ وہ اپنی فوج کو فلیرنگ کی نظر میں نااہل ثابت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس عرصہ میں وزارت جنگ کو اس کی خبر کر دینی چاہیے۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ یہ شخص یہاں کیوں متعین کیا گیا؟“

اس خبر کے سنے ہی دفتر وزارت میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ وزیر جنگ خود دو گھنٹہ تک چند بوڑھے فیلڈ مارشلوں کے ساتھ تحقیقات میں مصروف رہے۔ غریب نامیہ اور ملازمین دفتر کا کیا کہنا؟ بکسوں، الماریوں، روتی کی ٹوکریوں کے الٹ پھیر میں کتنی بار ایک دوسرے سے ٹکرائے اس کا تذکرہ ہی فضول ہے۔ مگر دو کوڑے پوچھئے۔ چھینکوں سے گھنٹوں پریشان رہے ہونگے۔ لیکن اس سخت عقدہ کو نہ حل ہونا تھا نہ ہوا۔

سلطنت روس کے سب سے بڑے فیلڈ مارشل صاحب کی جانب رجوع کیا گیا۔ وہ لیٹر چھوڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور اس پر قوت سے جواب دے چکی تھی۔ وزیر جنگ صاحب ان کے پاس حاضر ہوئے۔

”ہاں۔ ہاں۔“ بوڑھے فیلڈ مارشل نے قلم بچھے ہوئے کہا: ”شہنشاہ جانا چاہتے ہیں کہ کچھ برس ہوئے ہیں نے ترکو کو کس طرح شکست دی تھی؟“ خوب یہ اچھی بات ہو کیونکہ کوئی نواسط بھی اس کا صحیح واقعہ نہیں بیان کرتی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بھی کوئی تحقیق شدہ امر نہ تھا کہ یہ فیلڈ مارشل صاحب نے جج ترکوں کو شکست دی تھی، مگر موزخ یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ فیلڈ مارشل صاحب نے نہایت ہی شرمناک شکست حاصل کی تھی لیکن فیلڈ مارشل صاحب نے جنگ کی ایک طویل داستان شریف کی۔ فوجوں کے قیام کا ایک زندہ مرقع.....

”لیکن“ وزیر جنگ احتجاجاً نہ انداز سے چپچپ: ”شہنشاہ ترکوں کے بارے میں جانتا نہیں چاہتے۔ وہ جانا چاہتے ہیں کہ وہ سپاہی خاص طور پر کیوں اس جگہ متعین کیا گیا ہے؟“

”آہ: بوڑھے فیلڈ مارشل نے اپنی ناامیدی کا ایک سائنہ اظہار کرتے ہوئے کہا: اب داغ دیا کام نہیں کرتا۔ شاید وہ کسی جرم کی پاداش میں کھڑا کیا گیا تھا۔“

”لیکن ستر کی طوالت پر تو غور کیجئے؟ وزیر جنگ نے اپنے پیچھے پٹے کی ساری قوت صرف کرتے ہوئے کہا۔“

”ہاں بات تو معقول ہے لیکن ہم لوگ تاویکے معاملہ میں بہت سخت تھے؟ جواب ملا۔“

”لیکن سپاہی تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔“

”ضرور؟ بوڑھے فیلڈ مارشل نے زور دیتے ہوئے کہا: یہ ہمارے لئے ایک درنی وقت ہے جو میں جو کہے؟۔“

”اٹھ نہیں نہیں چھ بار تین سو اوپر سینٹھ.....“

وزیر جنگ مایوسانہ نہیں اس حوالی سر سام میں چھوڑ کر دفتر وزارت جنگ کو روانہ ہو گئے۔

دن کے اختتام پر انہوں نے دربار عالی میں آٹھکے میں آنسو لاکر اس امر کا اقرار کیا کہ انکی ساری محنت قلعی رائیگاں ٹل بہت ہوئی۔ فوج کا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی ایسا کاغذی ثبوت ہی موجود ہے۔

اس موقع میں انجنیروں کے ایک جم غفیر نے اس خطہ کا کونہ کونہ ٹاپ ڈالا لیکن اسے نہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔

زار کی اس سرگرمی کے حل کیجئے یہ بھی بیان کرنی مشکل ہے۔ صلح نامہ تو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ دو کھردل بھی وہی حال رہا۔

خاندان کے محل کے سامنے ملازمین سے باری باری گفتگو کی لیکن سب لاعا صل۔ ملازم سا بان سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے:

”آخر سپاہی وہاں کیوں تعینات کیا گیا ہے؟“

تیسرے دن زار نے ہر صوبہ میں ایک اعلان بھجوا یا کہ ایک ہزار روپے انعام اس شخص کو دیا جائیگا جو اس سرگرمی کا صلہ مل جائے۔

جمہور کے اد پر ایک بوڑھی عورت شاہی میز پر نش کیلئے کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ اس ہنگامہ میں سولے ایک جوان وائی کے جو اس کا کھانا پہنچانے پر مقرر تھے اسے سب بھول بیٹھے تھے۔ انکی پیٹھ مسلسل کام کرنے سے کمان ہو گئی تھی۔ اپنی جوانی میں وہ کڈشتہ زارینہ یعنی موجودہ زار کے دادی کی داہرہ رہ چکی تھی۔

”خدا خیر کرے وہ قاصد کیسا اعلان کر رہے ہیں؟“ بوڑھی داہرہ نے کہا: کوئی جنگ تو نہیں ہونے والی ہے؟

”کیوں تمہیں نہیں سننا؟“ جوان چوکری چمک کر بولی: اسی انگوڑے سپاہی کے بارے میں؟

”کون سپاہی؟“

”گھانٹس کے میدان والا؟“

”کونسا گھانٹس کا میدان؟“

”وہی جہاں لوگ تیر اندازی کی مشق کرتے ہیں۔ اسے ٹھیک بچوں بچ ایک سپاہی تعینات ہے۔ یہ جاننے کیلئے کہ وہ کچھ ہزار کی حفاظت کر رہا ہے سب دیوانے ہو رہے ہیں۔“

”اے تو سبکو جانتا چاہیے، بوڑھی دایہ نے کہا: تم لوگوں پر خدا کا رحم! اللہ نے تم لوگوں کو کتنا کمزور و ماخوذ دیا ہے؟“

”لیکن جانتا کوئی نہیں“ جوان چھو کر مئی بولی: ”اس سترہ کے محل کے لئے ایک ہزار کا انعام مقرر ہوا ہے۔“

”میری بچی! بوڑھی دایہ نے مسکراتے ہوئے کہا: تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ چل میرا ہاتھ پکڑ کر شہنشاہ کے پاس لے چل۔“

غرض جوان دایہ اُسے نیچے لے گئی اور جب وہ زار کے سامنے پہنچے تو بوڑھی دایہ نے مورخہ کے بعد عرض کیا: ”اگر حضور کا حکم ہو تو میں اس کا محل عرض کروں۔ سالہا سال گزر گئے جب زار مینہ یعنی حضور کی وادی صاحبہ دلہن تھیں انہوں نے تیر اندازی کا ایک مقابلہ کر دیا تھا کیونکہ دربار کی بیگمات اس زمانہ میں اس فن کی بڑی ماہر ہو کر تھیں اور چ تو یہ ہے کہ حضور عالیہ کا نشانہ سب اچھا تھا تیر اندازی سے بہتر خوبصورت ہاتھوں اور سینہ کی نائش کا کوئی بھی طریقہ نہیں۔“

غرض ساری بیگمات جمع ہوئیں اور پہلی باڑھ کے بعد سب اپنے اپنے تیر کو دیکھنے کے لئے دوڑیں۔ لیکن حضور عالیہ پچایک ٹہر گئیں اور سب کو ٹہرنے کو کہا۔ وہ دیکھنے کے بل جھک گئیں اور ساری بیگمات اُنکے گرد جمع ہو گئیں۔ ٹھیک میدان کے بیچ اچھی نظر سال کے پہلے گل بنفشہ سے دو چار ہو رہی تھی۔

زار، آپ کے چچا امجد صاحب بھی اس حقیر بنفشہ کے مداحوں کے پاس آن پہنچے کسی نے کہا کہ یہ اچھا لگن ہے کیونکہ حضور عالیہ امید سے تھیں، خدا کی شان دیکھتے کہ ولادت ہوئی اور آپ کے والد محترم پیدا ہوئے حضور نے فوراً ایک سپاہی طلب کیا اور اُسے اس بھول کے پاس تعینات کر کہا کہ اس کو بیگمات کے دستبر دے بچائے۔ اس غیب سپاہی کے لئے یہ ذرا بھی آرام وہ جگہ نہ تھی۔ تیر اکثر اس کے قریب سے ہو کر گذرتے۔ تیر اندازی کا مقابلہ تمام ہو گیا لیکن لوگوں کی حفاظت کی غرض سے وہ وہیں تعینات رہا اور اس وقت تک ہے۔

”لیکن بنفشہ کا بھول؟“ زار نے پوچھا۔

وہ وہاں گئے اور دھو دھنشا شروع کیا۔ بنفشہ کے بھول کا پتہ بھی نہ تھا۔ مدت ہوئی کہ وہ نا پید ہو چکا تھا۔

لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ سپاہی وہاں سے ہٹا لیا گیا اور کچھ مدت کے بعد لوگ اُس کو اور اُس جگہ کو بھی بھول بیٹھے۔

ایک دن مالی کی پنج سالہ بچی ماں کے پاس دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک بھول اس کے ہاتھ میں تھا جو کھیلے ہوئے اُس نے تیر اندازی کے میدان میں پایا تھا۔

”ویکھو ماں! سال کا پہلا گل بنفشہ۔“

غرض بنفشہ کا بھول پھر زندہ ہو گیا۔ جب سپاہی کا سخت جوتہ اس کو کچلنے کے لئے موجود نہ تھا۔ واسٹان کا یہ حصہ کبھی محل تک نہ پہنچ سکا۔

شہسی کا کوئی

چھپو

(دیکھو)

چغتائی نمبر جس میں مرزا غلام بیگ چغتائی کے کم و بیش تین نہایت پاکیزہ مضامین شامل ہیں۔ مزاحیہ افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ اس میں بیش بہا کتابیں ”شہزادی“ اور ”سوانح کی رو میں“ شامل ہیں۔ تقریباً دو سو صفحے کا نہایت قیمتی مجموعہ مضامین ہے۔ ایک روپیہ مع محصول ڈاک۔

طے پتہ سنائی بکف پو۔ دہلی۔

بارغی لڑکی

(اپنی سبجوگتا کے نام)

نہ پوچھ لے دوست ہر پائس نے کسی قیامت کی
اُسے فطرت نے اب تک دامن مریم میں پالا ہو
منقش ہو گیا ہے دست فطرت کا کمال اُس میں
وہ حُسن و عشق کی دُویا میں رومانا ہو گئی دلی ہے
دہی ذی قدر نوشاہ کا پر نگین جمال اُس میں
چریغ محفل فطرت وہ شمع بزم امکاں ہے
جیس میں اُمکی بیج عہد آزادی جہلوتی ہے
محبت کی چمک غلطاں اُس کے زرم سینے میں
ادائے ناز میں مڑتے ہوئے سیلاب کی اک رو
حقیقت سے بدل ڈالا فداؤں کے فسانے کو
وفا کا راز کھولا اُسے دُنیا کی نگاہوں پر
جلا ڈالے رواج و رسم کے چھوٹے نقاب اُسے
بہت اپنے سرور میں اُسے دل کے ساز کو چھڑا
وہ مشعل کیے بجلی عشق کی تاریک اہوں پر
بہت مسموم کانٹے تھے مگر کلیوں کا دامن میں
وفائے اسکی واضح کر دیا الفت کے معنوں کو
نہ چھوڑیں اعتبار عشق کی خود ایساں اُس نے
کلی بارش کی طغیانی میں جیسے شکرانی ہو
شگفتہ ہو کنول کا پھول جیسے تیز دھامے پر
خلاف قوتوں کو دل کی نرمی سے جمل ڈالا
بدل ڈالی فضا اُس نے، بدل ڈالا جہاں اُس نے

خدا رکھے وہ لڑکی ناز بہ رومہ ہو فطرت کی
سحر کی مسکراہٹ کو شبک سا بچے میں ڈھالا ہو
شفق کا رنگ اُس میں، موج باد شمال نہیں!!
وہ ملکہ ہے جوانی کی، وہ طوفان ہو گئی دیوی ہے
وہی بلقیس کی سطوت، زبیرہ کا جلال اُس میں
وفا اُسکی شریعت ہو محبت اُس کا ایمان ہے
بغاوت حُسن بند اُسکی آنکھوں سے ٹپکتی ہے
سمندر کیلیوں کا موجزن ہے آگینے میں
طایم بازوں میں شہپر جبریل کا پر تو
محبت کیلئے شکر ادا کیا اُس نے زمانے کو
وہ بجلی بن کے ٹوٹی رسم کی قربان گاہوں پر
نظر سے توڑ ڈالے جگمگاتے آفتاب اُس نے
لرز اٹھی فضا، تھر گئے دل، ہل گئی دُنیا
چریغ طور چمکایا محبت کے گناہوں پر
نگاہی اس سر سے اُس سر تک آگ گلشن میں
ہنسی نے اُسکی پھیکا کر دیا دنیا کے طعنوں کو
گوارا کیس محبت کے لئے رسوائیاں اُس نے
ہوا کے تند جھوکوں میں کوئی لو جگمگاتی ہو
بھرے طوفان میں کشتی اگلے جیسے کنارے پر
شبک کشتی نے طوفانی ہوا کا رنج بدل ڈالا
سنے سر سے اُسی سبجوگتا کی داستان اُس نے

ایک لڑکی

(اس کہانی میں کوئی کٹر قطعی قرضی نہیں ہے)

پہلا باب

اٹلی گڈہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ۱۹۳۷ء عیادگار رہی کیونکہ اس سال ہندوستانی مسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں سرکاری طور پر مخلوط تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ قصہ بھی دلچسپ ہے کہ کس طرح یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد اس شنی خیر تبدیلی کے لئے قانوناً مجبور کئے گئے۔ ننانوے سال پہلے ہندوستان کے مشہور قوم پرست جرنلسٹ اور سماجی کارکن سلیم الزماں صحافی نے مسلم یونیورسٹی کے مہبران کورٹ وائر کونٹو کونسل کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس میں ان ہندوگان قوم پر قوی امانت کے ناجائز مصرف الزامات عائد کئے گئے تھے۔

سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جتنا روپیہ جمع کیا گیا تھا وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے تھا نہ کہ فقط مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لئے اور حکومت نے جیسا یونیورسٹی کا چارٹر منظور کیا تھا تو اس میں بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ یونیورسٹی تمام مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ یہ کہیں تخصیص نہ کی گئی تھی کہ مسلمانوں سے مراد فقط مسلمان مرد ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں سلیم الزماں صحافی نے مشہور زبان دانوں کا فیصلہ پیش کیا تھا کہ لفظ "مسلمان" عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے یکساں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس نے مقتدر علماء دین سے بھی ایک فتویٰ حاصل کیا تھا جس میں انہوں نے متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ گو اکثر مسلمان مردوں پر کسی نہ کسی مولوی نے کبھی نہ کبھی کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ لیکن عورتوں کو ایک جماعت کی حیثیت سے اس وقت تک اسلام سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ اتنے عرصے تک یونیورسٹی کے دروائے لڑکیوں کے لئے بند رکھ کر مہبران کورٹ وائر کونٹو کونسل قومی روپے کے ناجائز استعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ مقدمہ جب یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پہلی بار اٹلی گڈہ کے کلکٹری عدالت میں پیش ہوا تو تمام ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ مسٹر جناح کی مسلم لیگ، ہنز آئینس، آغاخان کی مسلم کانفرنس، مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی، مولوی مظہر الدین کی جمعیتہ العلماء، صدر یار جنگ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر خالص اسلامی انجمنوں نے تیرہ ہزار دو سو سٹاؤں جیلے کئے جن سب میں کل تعداد حاضرین کی تیرہ ہزار ایک سو پچاس نفوس تھی۔ اس کے علاوہ سلیم الزماں صحافی پر ستائیس مقبیلوں نے کفر کے فتوے لگائے اور اکثر اخباروں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے روپیہ لیکر کھا گیا ہے۔ مسٹر جناح سے درخواست کی گئی وہ اپنے چودہ نکات میں ایک بندہ صوبے سمیٹے کو اور شمال کرلیں کہ ازل سے لیکر اب تک مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی جاری نہ کی جائیگی۔ سیدہ اللہ دیا کی صدارت میں مسٹر علی محمد خاں نے بھنڈی بازار بمبئی کے مسلمانوں کو خالص انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "گو تمہیں ایک علامہ نہیں ہوں مگر سلیم الزماں صحافی کی ہندو پرست حرکت کی سخت مذمت کرتا ہوں"

آپ نے بھی نہ پایا کہ مسلمان کی حیثیت سے وہ مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کے اجراء کے سخت خلاف ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنی صاحبزادی کو کبھی علی گڑھ بھیجے کا خیال ہی نہ کیا اور پورے مخلوط اداروں میں تعلیم دلوائی۔ آخر میں آپ نے پانچ ہزار روپے روز ہر اپنی قانونی خدمات پر مقدمہ لڑنے کیلئے مسلم یونیورسٹی کو پیش کیں جس پر بجٹڈی بازار کے مسلمانوں نے "الذکر" کے نعرے بلند کئے کیونکہ انگریزی سے ناواقف ہونے کے باعث وہ سبھے تھے کہ سٹر خٹا نے بیکار روپے روز گار مسلمانوں کو فائدے سے بچانے کے لئے پانچ ہزار روپے چندے کا اعلان کیا ہے۔ اس جلسہ کے بعد سٹر خٹا نے ایک بیان شائع کیا کہ جب تک حکومت اپنے گروہوں سے ایسے مقدمے دائر نہ کرانی۔ یہی گروہ کسی لیڈروں سے فرقہ وارانہ مصالحت کی گفتگو نہ کریں گے۔ اور یہ بھی کہا کہ بجٹڈی بازار کے جلسے نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلم عوام بھی اس راستے میں سٹر خٹا کے ہم خیال ہیں۔ اس بیان کی تائید سرالوالبقا اور سرسرتین خاں نے کی۔ جنہوں نے کہا کہ نہرو رپورٹ کے بعد یہ مقدمہ مسلمانوں کی فوری زندگی پر کاغذ گریس کا دوسرا حملہ ہے۔

یہ بھی زبردست ابتدا اس مقدمے کی جو ننانوے برس تک مختلف عدالتوں میں چلتا رہا اور اس عرصے میں تیرہ مرتبہ پریوی کونسل میں پیش ہوا۔ سلیم الزماں صحافی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے رحیم الزماں صحافی نے اس مقدمے کو جاری رکھا۔ اور اس کے بعد اس کے لڑکے کلیم الزماں صحافی نے۔ اس عرصے میں ہندوستان میں کئی انقلابات ہوئے اور حکومتیں تبدیل ہوتیں لیکن مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا۔ مسئلہ وہ میں جب کلیم الزماں صحافی کا انتقال ہوا تو یہ مقدمہ ورڈے میں اس کی اکنوٹی بیٹی سلمہ صحافی کو ملا۔ اگلے ہی سال جب تیسری سوراخ حکومت قائم ہوئی تو اس نے فوراً طے کر دیا کہ مسلم یونیورسٹی کے افسران کو دیکھوں کا داخلہ رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر انہوں نے اپنا یہی طرز عمل جاری رکھا تو حکومت یونیورسٹی کی عمارتیں ضبط کر کے انہیں ایک چڑیا گھر قائم کر دے گی۔

اس فیصلہ پر مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی یونین نے مبارکباد کا ریزولوشن پاس کیا۔ ہارون ناصر کی تجویز اور عائد عباسی کی تائید پر بحث میں دوسو روپے خواتین طالب علموں کے بیٹھنے کے لئے علی صوفوں کے واسطے منظور کئے لیکن ایک سال تک وہ علی صوفے بیکار بیٹھے رہے کیونکہ کوئی لڑکی داخل نہ ہوئی۔ علمائے فتویٰ و دیبا تھاکہ مخلوط تعلیم حرام ہے۔ اور مشکل یہ تھی کہ قدامت پسند گھرانوں نے ان فتوؤں کے درے اپنی لڑکیاں نہ بھیجیں اور جو آزاد خیال گھرانوں کی لڑکیاں تھیں وہ علی گڑھ جیسی فرقہ پرور باور پر مبنی خیال کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے خلاف تھیں۔ آخر کار گو وہ بھی اس وقت اس تعلیم کے خلاف تھی جو علی گڑھ میں دی جاتی تھی۔ اگلے سال خود سلمہ صحافی کو درودھا کی یونیورسٹی چھوڑ کر علی گڑھ میں داخلہ لینا پڑا۔ تاکہ اپنی صنف کا حق قائم کرے۔

جسوقت سلمہ صحافی کے داخلہ کا فارم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر چائلڈ مولوی ابوالعلم کے پاس پہنچا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور ورڈے ڈاکٹر چائلڈ شیخ رحیم الدین کے پاس گئے۔ وہ دونوں مخلوط تعلیم کے سخت خلاف تھے لیکن سلمہ صحافی کا داخلہ کرنے سے انکار کرنا حکومت کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔ اس کجنت لڑکی کو داخل تو کرنا ہی پڑیگا، مولوی ابوالعلم بولے "لیکن طالب علم لڑکیوں کے لئے کچھ ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے گھبر کر وہ یونیورسٹی میں داخلے کا خیال ہی چھوڑ دے۔"

لگے روز نیورسٹی کی انگریز کونسل کا جلسہ منعقد ہوا تاکہ صورت حال پر غور کیا جاسے۔

نواب خاڑس یار جنگ اچکانے نے تجویز پیش کی کہ طالب علم لڑکیوں کے لئے ایک خاص بورڈنگ ہاؤس تعمیر کیا جائے جسکی دیواریں دو سو بیس گز اونچی ہوں اور اس بورڈنگ سے لیکر کچھر کے کمروں تک ایک سڑنگ بنائی جائے جس کے ذریعے سڑک صفائی کچھر سننے جایا کرے۔ اسکے علاوہ ہر کچھر روم میں چاروں طرف سے بند ایک کونٹھری بنائی جائے جس میں سڑنگ کا راستہ نہ نکلتا ہو اور اس کونٹھری میں بجائے دروازے یا کھڑکی کے چار باریک سوراخ ہوں جن میں سے پردہ فیسر کی آواز پہنچ سکے۔ اس تجویز کی زبردست حوافقت مولانا نعمان نے کی اور بالاتفاق رائے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالصمد بقی رشیدی نے تجویز پیش کی کہ جس طرح طالب علم لڑکیوں کے لئے سیاہ ہند گئے کا کوٹ اور اٹھارویں صدی ٹرٹی کی ٹوپی پہننا لازمی تھا۔ اسی طرح طالب علم لڑکیوں کے لئے نیزہ پہننا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی بلکہ خداوندان یونیورسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب ان کو یقین تھا کہ سڑک صفائی کچی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے گی۔

سڑک کو جب ان قوانین کا علم ہوا تو وہ بڑی گھبرائی، لیکن کچھ سوچ کر اس نے حکمران تعلیم و حفظان صحت کو ایک خط لکھا اور ان قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر تعلیم نے ٹانٹ کر دیا اس چانسلر کو ایک خط لکھا کہ ایسے قوانین بنا کر حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر آمندہ سخت سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ حکمران حفظان صحت کے ایک چیکٹر نے یونیورسٹی کا معائنہ کرتے ہوئے لڑکیوں کے بورڈنگ اور سڑنگ دونوں کو خلاف قانون قرار دیکر سزا کر دیا۔ انگریز کونسل کا ایک جلسہ فوراً صورت حال پر غور کرنے کے لئے منعقد کیا گیا۔ مولوی ابوالعلم نے فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا شلنگ ہمیشہ حکومت کی اطاعت رہا ہے۔ اس کے لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سڑک صفائی کو بے پردہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیدیں۔ وائس چانسلر نے بھی کہا کہ بحالت مجبوری انکو ایسا ہی کرنا ہو گا۔ باقی اٹھ ممبران کونسل نے کہا جیسا آپ کا حکم سرکار اور جلسہ درخواست ہو گیا۔

۱۹۷۷ء

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب کبھی نہ ہوا تھا جتنا ایک لڑکی سڑک صفائی کے داخل ہونے پر ہوا۔ وہ شہر کی مزدور لڑکیوں کے ہوش میں رہتی تھی جو بیسویں صدی کے ایک نواب مصلح اللہ کے شاندار عمل میں قائم کیا گیا تھا جب صبح کو وہ کالج جاتی تو ہر شخص کی نظر اس کی طرف اٹھتی۔ وہ حسین نہ تھی لیکن نوجوان عورت علی گڑھ میں ہمیشہ سے ایک نایاب شے رہی ہے۔ یہ پہلی بار تھی کہ یونیورسٹی کے چند ہزار طالب علموں نے ایک لڑکی کو طالب علم کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ سڑک نے بیسویں صدی علی گڑھ کے شعلی عجیب و غریب نقشے سے کہ اس زمانے میں انگریزیشن پر سے کسی ریل میں کوئی حسین لڑکی گزر رہی تھی تو تمام یونیورسٹی میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔

پہلے پہل سڑک کو اس قدر عالمگیر توجہ کا مرکز بننا برا معلوم ہوا لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس کی عادی ہو گئی۔ سب بڑا انقلاب اس کی کلاس یعنی ایل ایل۔ بی۔ پریویس میں ہوا تھا۔ ایک سو اکیاون طالب علموں میں وہ اکیلی لڑکی تھی۔ ان سب کی توجہ کی وہ واحد مرکز تھی۔ جب سے اس نے داخلہ لیا تھا ان تمام لڑکوں میں تین تبدیلی نظر آتی تھی۔ جو تیسرے دن داخلہ

موندتے تھے وہ اب روزِ شیدو کرنے لگے۔ جو ہمیشہ میلے کپڑے پہن کر کرتے تھے، وہ اب صاف کپڑے پہن کر گئے۔ جن کے کوٹوں پر سٹائل سے کبھی برش نہ ہوا تھا ان کے کوٹ اب چمکنے لگے۔ جن کے بالوں میں ہفتوں کبھی کنگھانہ ہوتا تھا انہوں نے کلاس میں آنے وقت بھی جیب میں شیشہ کنگھا رکھنا شروع کر دیا۔ سب بڑا کمال یہ ہوا کہ تقریباً تمام طالب علم اب کچھ کے وقت حاضر رہنے لگے۔ ورنہ ایل، ایل۔ بی۔ پریو میں کبھی ۲۵ فی صدی سے زیادہ لڑکے حاضر نہ ہوتے تھے۔ باقی سب دوستوں سے بڑا کسی بلوا کر کام چلاتے تھے۔ جس دن سے سکر صحافی نے داخلہ لیا کچھ روم بھرا رہنے لگا۔ فائنل کلاس کے طلباء بھی کسی نہ کسی پہلے سے آکر بیٹھنے لگے۔ پروفیسر کی زندگی میں بھی سکر صحافی کی موجودگی نے کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ بھی اچھے کپڑے پہن کر گئے۔ جن کے کوٹ پر ہمیشہ چاک کی سفیدی پڑی رہتی تھی وہ کلاس میں آنے سے قبل نہایت احتیاط سے کوٹ کو برش کرنے لگے، شاف روم میں ایک آئینہ لٹکا رکھا، کپڑوں اور بالوں کے برش رکھے گئے۔

کلاس کے تمام لڑکوں میں سلیم اور انور سلیم میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دونوں یونیورسٹی کے باشر اور مشہور طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ سلیم ٹینس کلب کا سکرٹری اور بڑا چمکا لڑی تھا۔ سونگ تھم میں چھل کی طرح تیرتا تھا اور یو۔ بی۔ ٹی۔ کجا سار جٹ تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک قابل رشک صحت اور سانچے میں ڈھلے ہوتے جسم کا مالک تھا۔ اس کو اپنے مردانہ حسن پر کافی مانا بھی تھا اور جب اس نے سکر صحافی میں دلچسپی لینی شروع کی تو سولے انور کے اس کی رقابت مول لینے کی کسی نے ہمت نہ کی۔ انور تماشین نہ تھا جتنا سلیم۔ وہ کھلاڑی بھی نہ تھا بلکہ بڑے بھنے لکھنے میں وہ سب تیز تھا۔ اس نے اول درجے میں انگریزی ادب کا ایم۔ اے کیا تھا۔ یونین کا بہترین مقرر اور میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے انسا نے انور ظہیر ملک کے اکثر قدمات پسند رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ بھی سکر صحافی میں دلچسپی لیتا تھا۔ اور کلاس میں جب ملن ہوتا تو ان کی ادنیٰ یا قانونی بحث چھیڑ کر اس سے بات کرنے کا موقع نکال لیتا۔ انور اور سلیم قدامت پسند خاندانوں کے لڑکے تھے۔ ان دونوں کے بڑے عورت ایک نامعلوم جس تھی اسی لئے وہ میسریں صدی کے شاعر مزاج طالب علموں کی طرح ہر اس لڑکی میں جس کو کسی طرح انکی ملاقات ہو جاتے اس قدر دلچسپی لیتے تھے۔

ان کی کلاس میں ایک لڑکا احسان اللہ پڑھتا تھا۔ جس کی بدقسمتی سے سات بہنیں تھیں۔ یہ سب لڑکیاں دہلی کی قومی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ لیکن چھٹیوں میں اکثر علی گڑھ پہنچ جاتی تھیں۔ اس لئے کلاس کے تقریباً تمام لڑکے احسان اللہ سے دوستی کا بیج لگاتے تھے۔ ہر موقع پر اس کی آؤ بھگت ہوتی اور نوجوان پروفیسر بھی اس کا خیال رکھتے۔ سلیم اور انور نے خاص طور سے احسان میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سلیم اس کو روز ٹینس کھیلنے بلاتا اور کلب کی فیس اس کے بھاتے خود دیدیتا۔ انور اصرار کرتا کہ احسان اس کے ساتھ ملکر امتحان کے لئے بڑھے۔ دونوں اس کی دعوتیں بھی خوب کرتے۔ شروع شروع میں تو احسان ان سب عنایات کو دوستی پر محمول کرتا رہا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں اس سے زیادہ اس کی بہنوں میں دلچسپی رکھتے تھے جس دن اس کی بہنیں دہلی سے آئیں سلیم اور انور اس کے ساتھ ساتھ لگے بیٹھے اور اس کی بہنوں کی خاطر ملازمت میں ضرورت سے زیادہ انہماک دکھانے لگا۔ لاکھ وہ سب ملکر ان دونوں کو یہ توقع بناتی تھیں۔ احسان ہمیشہ سے منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ ایک دن جب اس کو انور اور سلیم کی حرکتوں کو سخت کوفت ہوئی تو اس نے

”کہاں جائے ہو؟ گھنٹہ تو خالی ہے“ اسے کہا۔

”اور میں تو ایسے ہی جا رہا ہوں“ انور نے جواب دیا۔ ”ذرا لاتبریری سے چند کتابیں لانی ہیں“

مگر ہوسٹل سے نکلنے ہی بجائے لاتبریری کے انور نے کچھ روم کا رُخ کیا۔ سکہ اب تک برآمدہ میں کھڑی تھی۔ قدم بڑھاتے ہوئے اس کے پاس پہنچ کر اس عاشق جانناز نے بھی تنہائی میں گھٹنگو کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً تقریر شروع کر دی۔

”مس سکر صوفی! آداب عرض رنگ سناخی معاف کیجئے گا مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کورس کی کتابوں کے علاوہ عام لٹریچر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتیں۔“ آخر کیا وجہ ہے؟ آپ کو لاتبریری میں بھی کسی آتے نہیں دیکھا۔ اس طرح لاہور اہلی سے تو آپ کی واقفیت عامہ صفر ہو کر رہ جائیگی“

سکہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا: ”تازہ کتابیں تو میرے پاس برابر آتی رہتی ہیں۔ مگر میرا خیال تھا کہ یونیورسٹی لاتبریری میں شاید میرے کام کی کتابیں نہ ملیں۔ میں نے سنا ہو کہ یہاں اشتراکی لٹریچر کی حالت“

”اب تو آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں“ انور نے جلدی سے کہا۔ ”اب تو جب قومی حکومت قائم ہوئی تو ہمارے پروانس چانل صاحب نے حکم دیا ہے کہ لاتبریری میں انقلابی کتابوں پر سے ممانعت اٹھائی جائے۔ ہاں تو آپ میرے ساتھ لاتبریری تشریف لے چلے۔ گھنٹہ بھی خالی ہے“

”معاف کیجئے گا۔ اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے لیکن اگر آپ شام کو پانچ بجے مجھے اسی جگہ ملیں تو ہم اکٹھے لاتبریری چلے چلیں گے“

انور نے سوچا یہ بھی اچھا ہے گا۔ شام کو جب سب کیمیل کے لئے چلے جاتے ہیں لاتبریری تقریباً مسلمان ہوتی ہے سکر صوفی سے اکیلے میں خوب باتیں ہو سکیں گی۔

۴۴۴۳۳۳۳۳

انور خوش خوش ”آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا“ گھاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سلیم کو ”پریم“ گھر میں بناؤں گی گھر میں“ گھاتا ہوا پایا۔ ان کے کمرے کا تیسرا شریک آزاد حسب معمول پٹنگ پر لیٹا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ جاسوسی ناول پڑھنا اور سونا بہ آزاد کے محبوب شغل تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو کسی شعبہ حیات میں بھی امتیاز نہیں حاصل کر سکتے۔ نہ پڑھنا نہ ہیشیار تھا۔ (ہر بار تیسرے درجہ میں پاس ہوتا تھا) نہ وہ کھلاڑی ہی اچھا تھا۔ لیڈن میں کسی نے تین تک اس کو بولے نہ سنا تھا۔ اور نہ اس نے میگزین میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ لڑا جلتا بھی نہ کم تھا۔ اور اپنے کمرے کے رفیقوں سے بھی مدد بوقت ضرورت ہی بات کرتا تھا۔ وہ خوبصورت بھی نہ تھا۔ چہرے پر موٹر سائیکل سے گرنے کے کئی نشانات موجود تھے۔ ساؤلارنگ تھا، معمولی قد، خشک اور رخت بال، جن میں شاید دن میں ایک بار بھی کٹا گھاتا نہ ہوتا تھا۔ غرض اس میں کوئی ایسی صفت نہ تھی کہ وہ عام طالب علموں یا صنف نازک میں مقبول ہو سکتا۔ اور نہ وہ لڑکیوں میں غیر ضرورت دلچسپی کا اظہار ہی کرتا تھا۔ انور اور سلیم کے درمیان شغلوں کو وہ غیر متعلق دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ نہ وہ اس کو اپنے مازوں میں شریک کرتے اور نہ وہ کسی کی کوٹیشن کرتا۔ کچھ سلیم اور انور کی غیر معمولی بشاشت معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو پھر رومانی کیڑے نے کاٹا ہے مگر آئے ان سے سوائے ایک نیک

کے کوئی بات نہ کی اور اپنا جامہ سوسے ناول پر ہتھ دیا۔

”تم اتنے خوش کیوں نظر آتے ہو؟“ انور نے تسلیم کے کانے سے تنگ آکر کہا۔

”تہیں کیوں بتاؤں؟“ تسلیم نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”مگر میں کہتا ہوں کہ تمہیں آج کون اخزانہ پڑا پایگا ہے کہ خوشی سے

بٹھے جا رہے ہو؟“

”تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ انور اور تسلیم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس میں کپڑے تلاش کر رہے تھے۔

”اے جھڈو۔ اے جھڈو۔ انور نے نوکر کو پکارا۔ وہ درزی میرا سوٹ لایا یا نہیں؟“

”اور وہ میرا بلیرز جس کی اسٹین کھولنے کے لئے دیا تھا وہ آیا یا نہیں؟“ انور نے سوال کیا۔

جب معلوم ہوا کہ درزی حسب معمول وعدے کے مطابق کپڑے نہیں لایا تھا تو دونوں نے ملکر اس کو برا بھلا کہا۔ اس کے بعد آزاد کا ٹریک ٹو لایا کہ شاید اس میں کچھ پہننے کے قابل کپڑے نکلیں۔ مگر وہاں کیا ملا۔ وہ تو جائے کا موسم ایک گرسے ہنگو اور گرمی سفید قمیص اور خاکی ٹیکر بہن کر گزاردیتا تھا۔

”کھانا کھا کر تسلیم نے سائیکل سنبھالی تو انور نے پوچھا۔ اس نو اور گرمی میں کہاں چلے؟“

”تہیں کیوں بتاؤں کہ درزی کے یہاں جا رہا ہوں۔“ تسلیم نے کہا اور سائیکل پر بیٹھ روانہ ہو گیا۔ اس کے چند منٹ بعد

انور نے آزاد کی سائیکل سنبھالی۔

”میں نے کہا کہ شاعر صاحب۔“ آزاد نے ہنستے ہوئے فقرہ کہی۔ کسی کے تیر نظر سے میری سائیکل میں ہنکھرنے لگا۔

درزی کے یہاں سے کپڑے لیکر چلے تو انور کو خیال ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ نیا جوتا بھی تو ہونا چاہیے۔ اور تسلیم کو یاد

آیا کہ اس کا ٹینس کھانا چھوڑنا ہو چلا تھا۔ جوتوں والے کے برابر میں ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان تھی۔ انور نے ایک نئی

جوتی بھی خریدی۔ تسلیم نے ایک ریشمی مغلہ لیا۔ انور نے نئے بلیرز کا ایک پیکٹ لیا تو تسلیم کو یاد آیا کہ اس کی Jane Green

تم ہو گی۔ تسلیم نے ریشمی رومال خرید لیا۔ انور نے سینٹ کی شیشی۔

غرض تین بجے کے قریب دونوں دوست لہے بھندے واپس کمرے پہنچے۔ آزاد سو رہا تھا۔ مگر درزیک نہ سو سکا۔

اس کو اب معلوم ہوا کہ بھر نچال آگیا۔ انھیں کھول کر دیکھا تو انور اور تسلیم کمرے کے واحد آئینے میں بیک وقت ڈاٹھی مونڈ

نے کام کو مشغول کر رہے ہیں اور خوب گالم گلوچ اور چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ اسی جھگڑے میں انور نے اپنا گال کاٹ لیا۔

وہ آزاد نے اٹھ کر خون روکنے کے لئے پمٹ کر لکڑی کا دی تو اتنے زور سے چلایا کہ اس پاس کے کمرے والے بچے کوئی

نہ ہونگے۔

غرض بڑی مشکل سے تقریباً ساڑھے چار بجے دونوں دوست صبح دھج کر تیار ہوئے۔ بالوں میں جو جو

لاگیا۔ ہانگ پٹی کی گئی۔ چہرے پر کوئلہ کرم کی مالش ہوئی۔ مگر حالت قابلِ رحم تھی۔ اتنی سخت گرمی کے باوجود انور نے

سب دیا ہوا سخت کالر لٹکایا تھا۔ جس نے اس کی گردن کو طوق کی طرح جکڑ دیا تھا۔ اس پر غضب یہ کیا کہ نہ صرف کوٹ

پہنا بلکہ واسکٹ بھی۔ تسلیم نے بھی اپنی شان جانے کے لئے یونیورسٹی کے رنگوں کا اوئی بلیرز پہنا تھا۔ غرض دونوں کا

پسینہ کے مارے برا حال تھا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ انور نے تسلیم سے پوچھا۔

”تم کوئی ٹھیکہ دار ہو؟“ تسلیم نے کٹ کر جواب دیا۔ ”اور دیکھتے نہیں ہو کہ ٹینس کھیلنے جا رہا ہوں۔ مگر تم بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟“

تسلیم نے میز پر سے دو کتابیں اٹھا کر نفل میں دباتے ہوئے جواب دیا۔ ”دیکھتے نہیں ہو لائبریری جا رہا ہوں“

خدا خدا کر کے پونے پانچ بجے یہ دونوں روانہ ہوئے تو آزاد کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس نے سمجھ کے پیچھے سے اپنا جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

چند روز بعد

یونیورسٹی کے کلاک ٹاور نے چھ بجائے تو انور نے تسلیم سے کہا: ”بس بھائی اب چلو۔ انتظار کی حد ہو گئی۔ اس لڑکی نے آج ہم دونوں کو یہ قوف بنا دیا“

دونوں دوست ایک کھٹے سے ٹہلے تھے ایک دوسرے کو ایک ہی مقام پر دیکھ کر تعجب ضرور ہوا تھا اور آپس میں نقرے بازی بھی ہوتی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد دونوں نے قبل دیا کہ اصل مقصد ان کے آئے کا کیا تھا جب چند بج گئے اور سکریم صائی نہ آئی تو انہوں نے اس کو برا بھلا کہنے کے بعد سڑک کیا کہ اب کہیں ٹھپٹے چلا جائے۔

سونگ بائو و سٹران میں شریعت پینے کے بعد انہوں نے باتفاق رستے ٹھپٹوں کا رخ کیا۔ ریڈیو سے لائن کو پار کر کے پچھنڈی بلڈنڈی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کچھ فاصلے پر دو سائیکلیں بڑی دیکھیں۔ ان دونوں سائیکلوں کو وہ پہچانتے تھے۔ فوراً جھپک گئے اور کھیت کی اڑنے کو ادھر ادھر ہٹ سہاری سے نگاہ کی تو برابر کے کونوں کی منڈیر پر آزاد اور سکریم صائی کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس ایک نگاہ میں تعجب، غصہ اور انتقام کی خواہش تمام جذبات موجود تھے۔ غرض صورت حال پر مفصل تبصرہ تھا۔ آزاد اور سکریم باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر سنا تو انور اور تسلیم دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ کیونکہ ذکر خیر ان کا ہی تھا۔

”کاش تم ان کو دیکھتے۔ انور نے مغرور انداز میں پرگرم کوٹ پہنا۔ اور تسلیم نے نہ صرف محنت کا لڑ لگا بلکہ واسکٹ بھی پہنی۔ پسینہ کا یہ حال تھا کہ خدا کی پناہ“ اور دونوں نے اتنے زور سے ہنسنا شروع کیا کہ انور اور تسلیم سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور وہاں سے قدم واپس لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ خاموش چلتے رہے۔ پھر دونوں بیک وقت بولے۔

”بلہ لیں گے“

”بدنام کریں گے“

کچھ دور واپس گئے تھے کہ ان کا ایک کلاس فیلو فضل الدین مل گیا۔ یہ بھی یونیورسٹی کے عاشق مزاجوں میں سے تھے۔ مگر حالی ہی میں شہر کے اسکول کی اپنے سے عمر میں دس برس بڑی ایک دیہی عیسائی ہیڈ ماسٹرس کے عشق میں زک اٹھا چکے تھے۔ اس نے فی الحال عورتوں کی قوم سے بغض رکھتے تھے۔ انور اور تسلیم نے نہایت راز دارانہ طریقے پر فضل الدین کو آزاد اور

سکر کے "پڑے جانے" کا واقعہ سنایا۔ اور ساتھ میں یہ بھی کہا "بھائی کسی سے کہنا مت۔ کسی کو بدنام کرنے سے ہمیں کیا فائدہ؟"

ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ واقعہ "یونیورسٹی کے نچے نچے کی زبان پر تھا۔"

پہلے ۵ منٹ

اور پھر وہ دن آیا جب مسلم یونیورسٹی میں ایک لڑکی بھی نہ رہی۔ زبان خلق سے تنگ آکر سکر اور آزاد دونوں نے نام لیا۔ سکر وردھا واپس چلی گئی اور آزاد اپنے جاسوسی نادولوں کا پنڈہ اٹھا اپنے وطن چلا گیا۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ نے "بورڈنگ ہاؤس" کے زمیندار کی سالگرہ کی خوشی میں ایک کالم سیاہ کرنے کے بعد چند لائنیں اس واقعہ پر بھی لکھیں اور لکھا کہ "یہ خوشی کی بات ہے کہ کس سکر صحافی کے جانے کے بعد یونیورسٹی ایک خطرناک عنصر سے پاک ہو گئی۔"

حامد عباسی کی تجویز اور ناصر رونی کی تائید پر یونین نے سکر صحافی کی جرات کو سراہتے ہوئے ریزولوشن پاس کیا۔ ایک دو سکر ریزولوشن سے یہ سٹاپا کہ جو محلی صوفے لڑکیوں کے لئے بنائے گئے تھے ان کو فروخت کر کے اس روپے کو سکر صحافی کا ایک مجسمہ یونین ہال کے سامنے لالان میں نصب کیا جائے تاکہ اُس زمانے کی یادگار رہے جب یونیورسٹی میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔

حکومت کے قوانین کی رو سے طالب علموں کی انجمن خود مختار جماعت تھی۔ اس لئے یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل اس ریزولوشن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی۔ اور بہت جلد مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ اسی سال یونیورسٹی کے بھٹ میں ایگزیکٹو کونسل نے دس روپے کی رقم طالب علموں کے اخلاق کی حفاظت کی تدابیر کے لئے منظور کی۔ اس رقم سے ایک برقع سلوا یا گیا اور وہ سکر صحافی کے مجسمہ کو اڑھا دیا گیا۔

اور دس سال تک یہ برقعہ سکر صحافی کے مجسمہ پر ڈھکا رہا اور وہاں پھر پھرا کر قریب سے گزرنے والوں کو عبرت

دلاتا رہا۔

مگر پندرہویں سال ہندوستان میں پہلی بار اشتراکی حکومت قائم ہوئی ایک خوفناک زلزلہ آجاس میں بنارس اور علیگڑھ یونیورسٹیوں کی تمام عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ مگر سکر صحافی کا مجسمہ اسی طرح قائم رہا۔ زلزلہ کے ساتھ ہی ایک زبردست آندھی چلی جو اس تاریخی برقع کو اڑا کر لے گئی۔

خواجہ احمد عباس

مفتویٰ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی زبردست تصنیف
جس میں دکھایا گیا کہ کہہ

”چمکی“

آئے عورت تیرا نام خود داری اتنی بہانہ ساقی بکڈلو۔ دھلی، قیمت

ادب اور زندگی

ادب اور زندگی کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اور ان دونوں میں بڑا مضبوط ارتباط ہے۔ جگہ یوں کہیے کہ ادب زندگی کا شہینہ اور اس کا ترجمان ہے۔ اور زندگی ادب کا ایک آئینہ ہے جس میں اُس کے تمام خدو خال نظر آتے ہیں۔

زندگی عبارت ہے مختلف عناصر کی ترکیب و اجتماع سے اگر ان میں انتشار پیدا ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

زندگی کیا ہے عین صبر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا پھر زندگی میں انسان کو طرح پر طرح کے حوادث اور واقعات سے گزرا پڑتا ہے۔ جن کے زیر اثر اُس کی نفسانی زندگی اور اُس کی کیفیات عجیب گونا گوں اور تغیر پذیر ہوتی ہیں کبھی اُس پر خوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ ہنس پڑتا ہے پھر کبھی اُس پر حزن و دیاں کی آوازی طاری ہوتی ہے اور وہ غلین و طول ہو جاتا ہے عشق و محبت کی شاد کامیابی اور دشمنوں سے رنجشیں، محرومیش لیل و نہار کی آفتیں، حوادث روزگار کی مصیبتیں، عروج و ترقی و منزل و انحطاط، مسرت و غم، خندہ و گریہ الغرض یہ سب کچھ زندگی میں پیش آتا ہے۔ اور انسان کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ادب ان تمام جذبات و کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور ادب کے حسن و ج کے مطابق اس ترجمانی میں لطافت و کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر نہ صرف یہ کہ ادب اس کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ وہ ہم کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہم کو حادث کا مقابلہ کس طرح کریں، رنج و غم کا استقبال کیونکر کریں۔ دنیا کی مسرتوں اور خوشیوں کو کس نظر سے دیکھیں، میدانِ ترقی میں کس بلند ہمتی و عالیٰوصلگی کے ساتھ قدم اٹھائیں۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہونا چاہیے۔ بچاؤں اور بیگانوں کی پہچان کیا ہے۔ دوست کون ہوتا ہے اور دشمن کسے کہتے ہیں۔ محبت کیوں ہوتی ہے اور کس سے ہوتی ہے۔ محبت کے آداب کیا ہیں؟ مناظرِ فطرت سے ہمیں کس قدر کچھ سیکھنی چاہیے۔ وہ ہمیں کیا اسباق سکھاتے ہیں۔ دریا کی روانی، آبشاروں کا شور طوفانی موجیں، ہوا کا بہنا، غرغریک یہ سب اپنے اندر ہمارے لئے کیا پیغام رکھتے ہیں۔

الغرض ادب زندگی کی ہر کیفیت میں ہمارے لئے بہترین رہنما ہے۔ وہ مجلسِ طرب و نشاط میں بہترین جلسیں و ندیم ہے۔ اور محفلِ عزائم میں مونس و غمخوار، وہ تنہائی میں شریکِ غم ہوتا ہے۔ اور دشوار گزار زندگی کے سفر میں ہمارا رفیق و دروازہ۔ ادب ہماری زندگی کو سنوارتا ہے۔ خیالات و احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ قوتِ ارادی کو مستحکم کرتا ہے۔ اخلاقی پاکیزگی و طہارت سکھاتا ہے۔ دنیا میں رہنا اور زندگی بسر کرنا بتاتا ہے۔ ادب زندگی کے ہر خطر راستوں میں مشعلِ راہ اور چراغِ ہدایت ثابت ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ غم و اندوہ کی فراوانی سے زار و نزار ہو رہے ہیں۔ آپ کی زندگی اجیرن ہوئی ہو اور ایک ایک پل برس ہو کر گزر رہا ہے، اس حالت میں اگر آپ کو غالب کا یہ شعر یاد آجائے

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
تبدیلیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
یا فوق کا یہ شعروہ و زبان ہو جائے

لے شمع تیری عطر طبعی ہوا ایک رات رو کر گزارا یا اسے ہنس کر گزارے

یا کبر الہ آبادی کا یہ شعر نظر سے گزر جاتے ہے

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر قید ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

تو ان اشعار کا لازمی اثر یہ ہو گا کہ آپ کا غم و الم سکون پذیر ہو جائے گا۔ اور یہ اشعار دل کے زخموں پر مرہم کا کام دے جائیں گے۔

اسی طرح فرض کیجئے ایک شخص دنیوی اٹھارہ واکلام میں گرفتار ہے۔ اُسے کسی طرح کشمکش روزگار سے نجات نہیں ملتی۔ زندگی اُس کے لئے وبالِ جان ہو چکی ہے اور بارہستی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ زندگی کی بے ثباتی کا تصور کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے حالات آتے ہیں اور یونہی گزر جاتے ہیں۔ تصورات کے اسی سلسلہ میں اُسکو حالی کے یہ شعر یاد آتے ہیں

بُری اور بھلی سب گزر جاتے گی یہ کشتی یونہی پار اُتر جاتے گی

وہیں گئے نہ ملاج یہ دن سدا کوئی دن میں گنگا اُتر جاتے گی

تو یقینی بات ہے ان اشعار کو گنگا نے اسے اس بچان غم و اضطراب کو سکون ہو جائے گا۔ اور پھر وہ ایک ٹھنڈا سانس بھر کے خاموش ہو جائے گا۔

فرض کیجئے ایک شخص کسی کام کیلئے اٹھک کوششیں کر رہا ہے لیکن بد قسمتی اس غیب کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ وہ بار بار اٹھتا ہے مگر ناکامیابی کا تصور اس کو بٹھا دیتا ہے۔ اب وہ اُمید و خوں کی عجیب کشاکش میں مبتلا ہے۔ کہ لٹتے ہیں اس کو یہ شعر یاد آ جاتا ہے

رہو رواہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں لذتِ صحرانوردی دوری منزل میں ہے

یا مولانا حالی کا یہ شعر اُس کی زبان پر آ جاتا ہے

رہو رقتِ لب نہ گھبرا نا اب لیا چشمہ بقا تو نے

تو لازمی طور پر ان اشعار سے متاثر ہو کر اس میں پھر ایک بار جوشِ غل، دلولہ کار، اور امنگِ حوصلہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس میں غل کرنے کی قوت و حرارت نمایاں ہو پیدا ہو جائیگی غرض کہ ادب زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہوا دریا ہے۔ وہ ہمارے جذبات کا ترجمان اور احساسات کا شارح و مفسر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کا ادب اسکی تمدنی و معاشی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور کوئی قوم اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس کا ادب ترقی یافتہ نہ ہو۔ بلکہ یوں کہئے کہ ادب ترقی پذیر ہوتا ہے تو قوم خود ترقی حاصل کر لیتی ہے۔ اور قوم ترقی کرتی ہے تو اُسکے سبب سے اس قوم کا ادب خود بخود ترقی پاتا اور عروج و برتری حاصل کرتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ ہم آجکل بہت اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ یورپین اقوام ترقی یافتہ ہیں تو انکا لٹریچر بھی اعلیٰ اور برتر ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کا تنزل و انحطاط ہوا اسی لئے اسکا ادب بھی اسی حال میں ہے غرض یہ ہے کہ ادب اور زندگی کا جوئی و امن کا ساتھ ہے۔ اسکی بقا و اسکی عروج و زوال سے اسکا عروج و زوال لازم آتا ہے۔

پریم کہانی

ان دنوں ہمارے گاؤں میں ایک ایسی سا دھوا آتا ہوا تھا۔ اس کی عمر قریباً تیس بتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ محو شکل و صورت وہ کافی مقرر معلوم ہوتا تھا۔ زمانے کی دستبرد اس کے چہرے پر اپنے اثرات چھوڑ چکی تھی۔ برگد کے ایک پرانے دخت کے نیچے اس نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ تمام دن وہ جھونپڑی میں دروازہ بند کئے پڑا رہتا اور شام کے وقت دروازہ کے قریب پیال بچھا کر باہر آ بیٹھا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم اس کے گرد جمع ہو جلتے اور وہ ہمیں ہر روز دُر دراز مالک کی دھسپ حکایات سنایا کرتا۔

آج اس نے اپنی پریم کہانی سنائی شروع کی۔

”میں موضع بٹی پور میں پیدا ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو میدان کی پُرسور آبادی سے دُور کوہستانی علاقہ میں واقع تھا۔ ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور گاؤں میں داخل ہونے کیلئے پیچ در پیچ گھاٹیوں میں سے گزرنے پڑتا تھا جو تھوڑی بہت کاشت کے قابل زمین گاؤں والوں کے قبضہ میں تھی وہ نہایت جانفشانی سے اس میں کھیتی باڑی کرتے۔ کیونکہ انکی گزران زیادہ تر اسی زمینداری پر موقوف تھی۔ گاؤں کے قریب ہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہونی ایک پہاڑی ندی بہتی تھی۔ جس کا شغاف پانی بستی پور کے ہلہاتے کھیتوں کو شاداب کیا کرتا تھا۔

بستی پور کے کسانوں کے ہاں غلہ افراسے پیدا نہیں ہوتا تھا اور کچھ بھی ہوتا وہ نہایت محنت شاقہ کے بعد۔ تاہم اسکی زندگی خوب مزے میں بسر ہوتی تھی۔ گاؤں کے باہر گیارہ اور نوجوان بو بھٹے ہی اپنے اپنے جال کندھوں پر رکے دو پہر کا کھانا تھیلوں میں بھر کر ندی کے کنارے پہنچ جاتے اور دن بھر بھیلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے۔ عورتیں بچوں کی دیکھ بھال کرتیں۔ گاؤں کی دوسری جانب ایک مقام پر شیریں پانی کا دھارا بہتا تھا جو شاید کسی ہرفانی چشمہ سے نکل کر آتا تھا۔ اس دھارے کا نام بستی دھارا تھا۔ شام کے وقت جبکہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طلانی کرنیں پہاڑوں کی سفید پوش چوٹیوں کو شفق آلود بنا دیتی تھیں بستی پور کی کمنداری لڑکیاں اس دھارے کے قریب جمع ہو کر چل، گانے اور ترغیر میں تھوڑا وقت گزارتیں اور جب وہ پانی بھر کر گاؤں کو واپس ہونے لگتیں تو مجھیرے دن بھر کے شکار سے واپس ہوتے ہوئے کھوڑوں کے حق میں گھاٹیوں کے درمیان پیچ در پیچ راستہ طے کرتے ہوئے شام کی تاریکی میں سایہ کی مانند اوپر چڑھتے ہوئے نظر نہ لگتے۔ اور کوہسار کے سکوت میں ایسی سیٹیوں اور بانسریوں کی دگدگ آوازوں سے گونج سی پیدا ہو جاتی۔



میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرا باپ گاؤں کا پدھان یعنی چودھری تھا۔ ابھی میں دو برس کا تھا کہ میری ماں مر گئی اور میری پرورش کا سارا بوجھ میرے والد کے سران پڑا۔ اس کے حصہ کی تھوڑی سی زمین تھی جسے وہ نہایت جانفشانی سے کاشت کرتے اور غلہ کی آمدنی پر ہم گند اوقات کرتے۔ بچپن کا زمانہ میرے لئے نہایت بے فکری ولاہرواہی کا زمانہ تھا۔ سارا سارا دن میل

کو میں مصروف رہتے ہوئے دنیاوی کاموں کا علم ہی نہ ہوتا۔ تمام بچوں میں سب سے خوبصورت گاؤں کے جوشی پانڈے کی معصوم لڑکی جتنا تھی۔ جتنا کا باپ خاصی ہندی جانتا تھا اور وہ گاؤں کے بچوں کو ہندی کی ابتدائی تعلیم دیا کرتا۔ جتنا اور میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے باعث ایک دوسرے سے حد درجہ مانوس ہو چکے تھے۔ میں عمر میں جتنا سے کوئی دو برس بڑا تھا مگر دونوں میں بچہ محبت تھی اور ہمارے والدین ہماری معصوم محبت باخ باخ تھے۔ ہم اکثر مٹی کے گھر وندے بنا کر کھیلتے۔ یا گڑیوں کو دل بہلاتے۔ بعض اوقات ایک بڑھیا کے پاس جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی جا کر پرانی کہانیاں سننے۔ پہیلیاں بوجھنے یا کوئی اور تفریق کھیل کھیلتے۔ اکثر وہ ایسا ہوتا کہ گاؤں کے سب لڑکے اور لڑکیاں کھیل میں شریک ہوتے۔ جتنا کسی فرضی ملک کی شہزادی بنائی جاتی۔ میں خود کسی دوسرے ملک کا شہزادہ بنتا۔ دیگر لڑکے لڑکیاں ہماری فوج کے سپاہی بنتے ہم دونوں میں جنگ ہوتی۔ جتنا کو شکست ہوتی اور میں اسے اپنی ملکہ بنا کر اپنے ملک کو لے جاتا۔ یہ کھیل نہایت دلچسپ ہوتا۔

سادن کا ہمیں ہمارے لئے سب سے زیادہ خوشگوار ہوتا۔ اودی اودی گھٹیاں سر پر تلگ پہاڑوں سے باتیں کرتی مساند وارتیں۔ سارا سارا دن بادل گر جتے۔ بچلیاں کو بند تیں۔ اور بوندیاں پڑنے لگتیں۔ نیلگوں آسمان پر جب سارس میداؤں کی طرح پرواز کرتے نظر آتے تو سب بچے انہیں دیکھ کر شور مچا کر چلے گئے۔ ندی کا پانی اچھل اچھل کر کناروں سے باہر بہنے لگتا۔ میں اور جتنا دیر تک ام کے درختوں میں پڑے ہوئے جھولے جھولتے ہیں مگر ہرے خوشک ہمارا جھولنا انہی پر کیف مصروفیتوں میں بسر ہوتا رہا۔

بچپن

زندگی کے نشیب و فراز پہاڑی خطے کی اونچ نیچ میں گزرتے گئے۔ زمانے کی گردش کے ساتھ دن اور رات بھی گزرتے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے بچپن سے نکل کر عہد شباب میں قدم رکھا۔ اب جتنا کا وہ زمانہ تھا جب ایک لڑکی میں شباب کی رعنائیاں اپنی تمکنت زاداؤں اور مسوکن انداز کے ساتھ جذب ہونے لگی ہیں اور وہ ریاض حسن کا ایک غیر نوشگفتہ نظر آنے لگتی ہے۔ ایک ایسا غچہ ہے ہر دیکھنے والا فوراً حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے توڑنے کی بے ساختہ کوشش کرتا ہے۔ گو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ توڑ لینے کے بعد اس کا حسن زائل ہو جاتا ہے گا۔ واقعی جتنا نہایت حسین و جمیل و دھندلہ بن چکی تھی۔ اس کی غور و سیاہ ملکوتی آنکھوں میں ہلاکی کشش تھی۔ اس کے گلابی رخساروں میں دلربائی اور مورتی جیسو دانہوں میں چمکی کی سی چمک دمک تھی۔ اس کے سڈول اور خوبصورت اعضا میں جھگی ہرنی کا سنا سب اور مورنی کی سی نزاکت تھی مگر چہ ہماری طافاؤں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا تاہم اب وہ بچپن کی سی بے تکلف نہ تھی۔ فطرتاً ہمارے درمیان حجاب رونما ہو چکا تھا۔ اب میں زیادہ دیگر جتنا سے باتیں نہ کر سکتا تھا کیونکہ میں دیکھتا کہ اس کی آنکھوں میں حیا جلوه مکن ہونے لگتی۔ لہذا ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھنے پر ہی اکتفا کرتے۔

شام کے وقت میں بانسری لے ہوئے مٹی دھارے کی طرف نکل جاتا مگر کسی اونچی چٹان پر بیٹھ کر بانسری بجائے لگتا۔ میرے ارد گرد اکثر سماں نہایت دلا دیز ہوتا۔ پہاڑی خورد و پھولوں کی خوشبو میں بے ہوش سرد جھونکے اس طرح آتے جیسے کسی شاعر کی خیالی جنت کے دروازے کھول دے گئے ہوں۔ سیاہ بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان پر مفید سفید بگلوں کی

قطارین۔ قریب کے پہاڑی جنگل سے مست طاؤس کی چٹائیں ایک بحر ہوتا جس سے مرنے زندہ ہو سکتے تھے۔ دھاکے کی طرح جب گاؤں کی ہری چال لڑکیاں سروں اور کولہوں پر پانی سے بھرے ہوئے ٹکے اٹھاتے عشق پیموں کی بیل کی طرح بل کھاتی اور ہر نیوں کی طرح رقص کرتی، آپس میں ایک دوسری کو جھپٹتی۔ پہاڑی گیت عجیب و غریب ترقم کے ساتھ گاتی گاؤں کی طرف آتی دکھائی دیا کرتیں تو میں جھوم جھوم کر بانسری بجانے لگتا۔ جتنا پانی کا مشکا سر پر اٹھاتے سب سے پیچھے ہوتی اور خاموشی سے نیچی نظریں کچے چلی جاتی۔ میری بانسری کی آواز پر خجالت سے اُس کے گال سُرخ ہو جاتے اور وہ مجھے ککھکیوں سے دیکھ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگتی۔ یوں تو جیسی پورے لڑکوں کی مشتاقانہ نگاہیں بے اختیار جتنا پر ہڑا کرتیں اور ہر دلی پھینک لڑکوں ہی چاہتے کہ جتنا اسی کی آغوشِ ممتا کی زینت بنے۔ مگر سب زیادہ جتنا کاشیائی ایک ماہی گیر کا لڑکا رتن تھا۔ اسی انتہائی خواہش تھی کہ کئی طرح جتنا سے اس کا بیاہ ہو جائے۔



چونکہ میرا اپ گاؤں کا پڑھان تھا اس لئے میری خواہش معلوم کر کے وہ جتنا کو اپنی بہو بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کے ایک خوش گارون کو میرا اور جتنا کا بیاہ ہو گیا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور جتنا سولہ سال کی تھی۔ اب ہمارے دن نہایت مٹاواپی و مسرت میں گزرنے لگے۔ میں والد کے ساتھ کاشت کرتا کیونکہ فصل ہی ہم غریبوں کی زندگی کا سہارا تھا۔

میری شادی کو ٹھیک ایک برس گزرا ہو گا کہ ایک عجیب مصیبت ٹوٹ پڑی۔ چند دنوں سے سننے میں آ رہا تھا کہ قریب جوا کے دیہات میں طاعون کی ہلک بیماری بیدار ہوئی ہے۔ لوگوں کو شکار کر رہی ہے۔ ان خبروں سے گاؤں کے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور ہر شخص خوفزدہ اور متحش نظر آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک وبا کا دیوتا جیسی پور پر بھی مسلط ہو گیا۔ ایک ہی دن میں کئی کئی موتیں واقع ہونے لگیں۔ مگر گھر صرف ماتم بچ گئی۔ رات کے سکوت میں شور و شین کی آوازیں جنگلی درندوں کی کچھلاؤں سے بھی زیادہ ہیبتناک معلوم ہوتی تھیں۔ چند روز میں پورے خاندانوں کا صفایا ہو گیا۔ مردہ جسم کئی روز تک بے کفن پٹے پر ہے۔ ایک بوڑھے ماہی گیر کے پانچ جوان بیٹے کے بعد دیگرے ایک ہی دن میں نذرِ اعلیٰ ہو گئے۔ بچے یتیم، سہانہ بیوہ اور ماں باپ بے سہارا ہو گئے۔ کوہستانی علاقہ کے خاندانوں کو لوگ جو پہاڑی گھاؤں یا دھتوں کے پتوں سے بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اس طرح خوفزدہ ہوئے کہ اپنے اکثر افراد کو حالتِ نزاع ہی میں چوٹی پر سے کسی گہری کھڈ میں لٹھکارتے۔ کئی پسماندگان بیماری سے بچ کر بھاگنے کی ناکام کوشش میں راستوں پر بے جاں پائے گئے۔ الغرض تمام کوہستانی خطہ میں ایک قیامت برپا تھی۔ جس نے اتنا فانا گاؤں کے گاؤں صاف کر دیے۔ میرے والد اور جتنا کے والدین بھی طاعون کے شکار ہو گئے۔ ہم دونوں کو اس صدمہ سے سخت رنج ہوا تاہم جب خدا خدا کر کے باقی رہ گئی تو گاؤں کے دیگر بچے کچھ لوگوں کی طرح ہم بھی زندگی کی لگ و دو میں محو ہو گئے۔



میں اب تنہا نہایت محنت کھیتی باری کرنے لگا کیونکہ اسی پر ہمارا دار و مدار تھا۔ مگر بد قسمتی سے اگلے برس تندی میں اس قدر

طغیانی آئی کہ بہت کچھ ہوتے کھیت تباہ ہو گئے۔ اور غلہ کا سخت قحط ہو گیا۔ ایک ماہ اسی پریشانی و سرنگی میں بسر ہوا۔ چند روز بعد میں نے جنگ کی افواہ سنی۔ غریب اور بیکار نوجوان لڑائی میں جانے کیلئے دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کیلئے فوجی ملازمت کا ارادہ کیا۔ اور ایک دوست کی وساطت سے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جب میں جنگ کو جانے کے لئے گاؤں سے رخصت ہوا تو جتنا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور خدا کے بھر دے پر چل کھڑا ہوا۔ جنگ کی تباہی و بربادی کا خوفناک نقشہ جویں نے دیکھا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیں کو تہاگ کر متواتر کئی برس تک میں بدلیں کی صفوں میں اٹھتا رہا۔ اور پورے دس برس بعد جب ملازمت سے فارغ ہو کر میں وطن کو واپس لوٹا تو میرا دل نہایت مطمئن اور طبیعت از حد مسرور تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ دس برس کی طویل مدت کے بعد جب تیرا پنی بیماری بیوی کو شکل دکھاؤ گا تو وہ کھنکھارے مسرور ہوگی اور ہماری آئندہ زندگی نہایت فانی و اقبال سے بسر ہوگی۔

بچہ پنچہ

اپنی خیالات کو دل میں لئے میں گاؤں میں وارد ہوا۔ سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف سکوت شہاں ہوا۔ دامن پھیلائے ہوئے تھی۔ گاؤں والے دن بھر کی تھکان کے بعد غافل پڑے تھے۔ چاندنی رات تھی اور دھو دھو میں کاجا بند پھاڑیوں پر چمک رہا تھا۔ تنویر ریزہ فضا میں چمک رہا تھا۔ دُور شمال کی طرف ہر طرف پوشا بند چٹیاں چاندنی میں چمکتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سیاب کی ایک پتی سی نہ رہی ہو۔ جب میں اپنے مکان کے قریب پہنچا تو دروازے سے اندر داخل ہونے کے بجائے میں پشت پر سے کونٹے پر چڑھ گیا۔ تاکہ اپنی بیوی کی بچہری میں اس کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر سکوں۔ جب میں نے کونٹے پر سے نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا تو میری آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ میری بیوی جتنا ایک چار پانی پر رتن باہی گہرے پہلو میں بیٹھی ہوئی مرنے سے ہمارا وجہ کی باتیں کر رہی تھی۔ پاس ہی چار پانی پر دو خور و سال پتے سوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل پر ایک کالی سی گہری جس بیوی کی خاطر دیں تیاگ دیا تھا اسی نے مجھے بل دیا۔ میں تیر ہو کر لٹے پاؤں کوٹھے سے نیچے اُترا۔ میرا ضمیر مجھے اپنی بد قسمتی پر ملامت کر رہا تھا۔

گاؤں میں ٹہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ ندی کے اُس پار پر اسنے وقتوں کا ایک چھوٹا سا متمدن رہنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بڑھا بچاری رہا کرتا تھا۔ وہ مجھے بچپن سے جانتا تھا لہذا میں نے رات اُسی کے ہاں گزارنی چاہی۔ جب میں ندی کو پار کر کے مندر میں داخل ہوا تو بوڑھا بچاری رات کے وقت میرے خلاف توقع وارد ہونے پر پہلے تو سخت متعجب ہوا لیکن بعد میں مجھے شناخت کر کے پہلے پاس بٹھالیا۔ میں نے اسے اپنی داستان سنائی۔ میری بیوی کی بیوفانی کا ذکر سن کر اُس نے مجھے اصل حالات سے آگاہ کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جو نکلہ پر دیں سے مدت تک میری کوئی خبر نہیں آئی تھی اس لئے تین سال بعد رتن نے کسی طرح گاؤں میں یہ خبر شہرہ کر دی کہ میں لڑائی میں مارا گیا ہوں۔ اس خبر سے جتنا بہت روتی مگر بالآخر رتن کے بھانے بھانے سے اُس نے صبر کیا۔ اور چند ماہ بعد ان دونوں کی باہم شادی ہو گئی۔

میں اپنی بیوی کی سر دھری کا قلم کرتے ہوئے اسی مندر میں بٹھا رہا مگر غیبت مطلق نہ آئی۔ بھلیخت آسان پر سیاہ بادل منڈلائے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مطلع ابر اکو دھو گیا۔ چند منٹ بعد اس زور کی بارش شروع ہوئی کہ الامان طوفان

باد و باران کا وہ شور تھا کہ کان پڑتی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بادل کی خوفناک گرج بجلی کی لرزہ خیز چمک۔ بارش کا ہر ایک شور و غل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا سے بی بیوں دیوتاؤں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور آوازوں و احوال کا نبات کے تمام عناصر ترکیبی آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ تمام شب اسی زور سے مینہ برستا رہا۔ علی الصبح جب ذرا بارش تھمی تو میں مندر سے باہر نکلا۔ گاؤں کی طرف نظر کی تو عجیب عبرت انگیز سماں نظر آیا۔ ندی میں اس زور کی طغیانی آئی تھی کہ دوڑتے پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ سارا گاؤں سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کبھی کوئی آبادی تھی ہی نہیں۔

میرادل بیوی کے واضح مفارقت سے پہلے ہی بھڑا پڑا تھا۔ اب گاؤں کی تباہی کا منظر دیکھ کر اور بھی لمباٹ ہو گیا۔ دُشیا کی لذتوں سے میں بیزار ہو چکا تھا۔ لہذا میں نے جگ لے لیا اور اب زندگی کے باقی ایام ویسے بدیں پھرنے میں گزار رہا ہوں۔

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اسکی در و بھری کہانی سنکر ہماری آنکھوں میں آنسو اتر گئے تھے۔

چند روز

دوسرے دن صبح سویرے ہی جب گاؤں کی عورتیں پانی لینے جا رہی تھیں تو انہوں نے سادھو کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا پایا۔ زمین پر خالی گھڑا پڑا تھا اور ایک کونے میں مٹی کا دیا بجھا دھرا تھا۔ ہم میں سے کوئی نہ جان سکا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کہاں چلا گیا۔

ساتر جعفری

وجدانیات

نرے آتے ترے آتے ہی سب دنیا جوں معلوم ہوتی ہے
خزاں رشک بہار جاوداں معلوم ہوتی ہے
جنوں سجدہ ریزی کا یہ عالم ہی معاذ اللہ
ہر اک چوکھٹ تڑپا آستان معلوم ہوتی ہے
اسے ہر اہل دل ہر نرے کے مستند ہے
مری بیستادہ بیستادہ دلبران معلوم ہوتی ہے
کٹے ہیں دن بیاؤں کے سہاے جن اسیر و بکے
اسخیں بجلی بھی شلخ اشیاں معلوم ہوتی ہے
مال زندگانی کی حقیقت کھل گئی جب
کسک دل کی متاع دو جہاں معلوم ہوتی ہے
خیال عیش کی پہچان سے بھی دل لرزتا ہے
نگاہ حسن اب کیوں جہاں معلوم ہوتی ہے
خدا شاہد ہے میرے بھونے والے بکج تیرے
مجھے تخلیق عالم راہیگاں معلوم ہوتی ہے

کسی کی جستجو میں وجد اس منزل پہنچا ہوں

جہاں منزل بھی گرد کاروں معلوم ہوتی ہے

سکندر علی وجد

(ایک مکالمہ)

فلسفی اور موت

مقام: تنگ و تاریک، ایک بھٹی ہوئی رات کا بچھلا پہرہ، سنناٹا، ایک قنطیٹ پسند پڑھا فلسفی تنہا بستر مرگ پر لیٹا زندگی کے آخری سانس میں رہا ہے، اُسکے پیش نظر زندگی کی بے روح کیفیتیں ہیں، ایک ایک موت سیاہ سائے کی صورت میں سر اُن کھڑی ہوتی ہے۔ برہمن کو شاد سے ہلاقی ہے، فلسفی نے اوپر کو اٹھتا ہے۔ سیاہ سائے سر اسے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔

فلسفی: (راٹھیں ملے جوتے، سیاہ سائے! میرے اللہ تم کیا ہوا
سیاہ سے بدستور ناچتا ہے۔ فلسفی اٹھنے کی سی کرتا ہے
سیاہ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیتا ہے۔ فلسفی
اس وزنی گرفت کی تاب نہیں لاسکتا۔
فلسفی: (باہر بیٹھتے ہوئے اچھے تاریکی دھوکے رہی ہے۔
بدحواس بھجاتا ہے، سیاہ اُسکے اوپر جھک جاتا ہے۔

سیاہ: ہمیں موت ہوں۔ لیکن آخری نہیں۔ میری گود میں زندگی کا دور ثنائی لوری لے رہا ہے۔ میں ایک کمال ہوں، کمال جو پہلی ہی کوشش میں زمین حیات کو کھود کر پانی کی سطح پہنچ جاتا ہے۔ جانتے ہو کہ پانی کے نیچے بھی زمین ہی ہوتی ہے۔ لہذا وہ زندگی کے بعد موت اور پھر زندگی ہی زندگی ہے۔ حیات انسانی مختصر سا خطا ہے جس کے منتہی جوتے ہیں موت، اُس پر بطور ایک ہر کے مثبت جوجا ہے جس طرح ایک خطا پہنچتے ہیں ہر پہر چکر دوبارہ کھلتا ہے کہ اس کے نفس مضمون کا پتہ چل سکے۔ بعینہٰ مندرجہ مقصود ہر چکر میری قبر کو توڑ کر نامہ زندگی کا نامہ کھولاجاتے گا تاکہ وہ اور عشرت فانی اعمال کا جائزہ لے سکے نیچی اور بدی میزان انصاف میں مل جائے گی۔ خیر و شر کی صدا آئیں بلند ہوگی۔ ان ان اپنے کئے کا پل پاتے گا۔

فلسفی: (دکھتے جوتے، نہیں، اے موت! اس کے بھانک سنا! قبل اس کے کہ وہ اس جہاں سے میری جیسی کا داغ وصل جائے میری یہ بات ضرور پوری ہو جائے۔ بتا، ضرور بتا کہ تو خود انسانی زندگی کا تعاقب کرتا ہے یا بچہ پیدا ہوتے ہی فطرتاً تیری طرف بھاگتا شر دھکا دیتا ہے۔

سیاہ: میں زندگی کا بچہ نہیں کروں جبکہ بچہ اس جہاں میں

سکتا ہے۔

سایہ۔ دوبارہ جسم محض ایک خیالی بات ہے۔ جبکہ خدا خود انسانوں کی تخلیق پر قادر ہے۔ روح ایک بار آزاد ہو کر ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے پرواز کر جاتی ہے۔ ہر نئے جسم کی پیدائش اس بات کا پیغام ہے کہ انسانوں کو کہ ان کا خالق ابھی کا تخلیق سے گھبرا رہا نہیں۔ وہ نئے انسان پیدا کر سکتا ہے۔ روح ایک آسانی شے ہے۔

فلسفی۔ اگر روح آسانی ہے تو خاکی جسم سے اس کا ملاپ کیسے ہوگا؟

سایہ۔ ان دونوں کی تخلیق سے مدعا ملاپ تھا۔ اس ملاپ ہی سے تو زندگی کی تخلیق ہوتی ہے۔

فلسفی۔ صرف ایک بات اور۔ کیا تم انسان کے پاس اسے آخری وقت میں جہان بند کرتے ہو یا میزبان؟

سایہ۔ میں زندگی کا جہان ہوں۔ روح کو زندگی سے کھینچ کر میں جسم کو جس کر سکتا ہوں۔ میں تقدیر کا وہ منہ زور گھوڑا ہوں جس کی جھٹ سے زندگی کسی کچھ کر نہیں مل سکی۔ رقاصہ حیات کی ولادیز ادا میں یا ترقم بھیڑ کھا ہیں مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکیں۔ مجھے خود اپنے رقص پر ناز ہے خواہ تم اسے بھانک ہی کہو۔ اتیری سے تاجنہ شروع کر دیتا ہے،

فلسفی۔ (دراوجوش سے) کیا زندگی کے حق میں زبانی کا یہی صلہ ہے کہ تم اسے اپنے میں جذب کر لو؟

سایہ۔ صلہ زندگی دوبارہ احسان سے میری طرف ٹھیک جاتی ہے۔ میں زندگی کی تکمیل کرنے آتا ہوں۔ دنیا میں سولے اس کے کسی اور چیز کی تکمیل ممکن نہیں۔ موت اپنے میزبان کے ساتھ کبھی بے وفائی نہ کرے گی۔ اگرچہ جہان لاکھ پلہ چھڑا ہے کی کو بخش کر ہے۔

فلسفی۔ درمجموع میں تو کیا تم زندگی کے چاندیہ دلچسپی طرح پرست جہان سے ہو جی تو جسم بے روح ہو کر زرد و نظر آتا ہے۔

فلسفی۔ لے رقصاں سائے تیری باتیں حقیقت ہیں۔ ان کے سائے کوئی بڑے سے بڑا فلسفہ یا دقیق منطق نہیں ٹھہر سکتی، تیری باتوں کے مجھے تسکین ہوتی ہے۔ مجھے یہ تو بتا کر زندگی خواہ کتنی بھائی ہو چند روزہ کیوں دکھائی دیتی ہے۔

سایہ۔ (بھاری آواز میں) حادثہ زمانہ اور اپنی ٹنگشوں میں اُچھ کر انسان وقت کی اڑان سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کا کلی اگرچہ موت کے مفہوم سے نا آشنا نہیں ہوتا لیکن یہ غفلت اُسے بے بس کر دیتی ہے۔ انہی مفصوں میں گزرتا پڑتا وہ اپنے اعجاب کی طرف لڑھک آتا ہے۔ لے گذشتہ زندگی موجود نم نظر آتی ہے۔

فلسفی۔ بالکل ایک خواب ایک نئی جس کا منبع معلوم نہ ہو۔

سایہ۔ زندگی خواب نہیں بلکہ بذات خود تعبیر ہے اس بیدار خواب کی جو قدرت کے بڑے کا رخانہ میں آسمان پر ڈھالا جاتا ہے۔ آخری مرحلے پر پہونچ کر ہی خواب موت میں بدل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نقوش ایک بار پھر آسمان پہ جا کر ابھریں گے۔ روح ایک غیر فانی شے ہے۔

فلسفی۔ روح زندگی بھر میرے لئے یہ ایک منہ بنی رہی۔ میں تو نلے ایک ناطق شے سمجھتا ہوں جس کا تعلق مجھ سے عارضی ہوتا ہے۔ دوسرے منوں میں اتنی جسم کے اندر یعنی طاقت گویائی پڑے لے سائے مجھے تم ہے اس بڑے دائر کی مجھے اس کی حقیقت سے آگاہ کر دے۔

سایہ۔ روح! روح! روح! جسم کی طرح فانی نہیں۔ جب جسم سوتا ہے روح بیدار ہوتی ہے۔ میں خالق کے حکم سے لے جسم سے جدا کر کے اپنی زندگی سلا دیتا ہوں۔ روح اور جسم میں جدائی عارضی ہوتی ہے۔ حیات ثانی ایک خدائی حکم ہے اس میں تعویذی نیز

پوسکتی۔ لیکن کیا انسان اس جہان میں دوبارہ جسم لے سکتا ہے؟

جہاں تھا کہ میں چند منٹ پہلے تیرے پاس آ کر تیری زندگی کی آخری
آرزو پوری کروں۔ اب بس۔

فلسفی۔ اک ذرا سی جھلت میں پاک دامن ہوں۔

(سایہ بدستور خاموشی سے اوپر کو جھک رہا ہے۔ فلسفی اٹھنے
کیلئے باہر چلتا ہے لیکن ایک گروٹ لیتے ہی زندگی کی گرفت
سے نکل جاتا ہے۔ تاریکی میں اس کی خاموش آنکھیں چمت کی طرف
ٹھٹکی ٹھٹکتے ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے راز
حیات کو پایا۔)

سایہ۔ میں داغ نہیں۔ مجھے ایک بادل کہہ دو جو آسمان حیات پر
ایک دم چھا جائے۔ لیکن میرا تسلط عارضی ہوتا ہے۔ میرے ٹوٹتے
ہی زندگی دوبارہ نیلگوئی رنگتوں کے ساتھ چمک اٹھے گی۔
فلسفی۔ لیکن کیا یہ بالکل سچ ہے۔

(سایہ زہر کے خاموشی سے بڑھ کر فلسفی کے اوپر
جھکتا ہے۔)
فلسفی۔ (گہرا کر) یہ کیا؟

سایہ۔ تمہارا وقت معینہ آپہونچا۔ داور کی طرف مجھے یہ حکم

(خواجہ حسن عباس بنی لے

ساقی کی نگاہیں اور شراب

اور دیکھنے والے بیداری میں نیند کا جو ن لوٹتے ہیں
ہر سمت سے ظلم تو بہ شکن، غمور صدائیں آتی ہیں
اور شام سے لیکر صبح تک اس جگہ سے نکھلتی ہے
غنجوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے ششم بٹا ہے
احساس کی تصویر دکھو جب قرطاس کی زینت کرتا ہو
الطاف مرے پہلو میں جب کچھ سخن کی نظریں ڈھونڈتی ہیں
اور درد کے طالعے اس کی کچھ دیر کو اس کی رکتی ہیں
غنجوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے ششم بٹا ہے
جب تالیف کے پہلو میں نمود کی گھٹا میں جھومتی ہیں

اُن بیت لو اسی آنکھوں سے جب کینکے چشمے چھوٹی ہیں
پلوں پر لے جیخانہ جب سادوں کی گھٹائیں آتی ہیں
جب رات کی دیو کی چھکے سے آنکھوں میں نیند اُندھتی ہے
جب صبحِ چمن سے وقتِ سحرِ آلام کا بادل چھٹتا ہے
جب درد کے مرہم سے شاعر زخموں کے دہن کو بھرتا ہو
جب درد کی لہر میں سینے کو ساحل پر دم بھر دوگتی ہیں
جب یلی اغفر کے در پر سوج کی نگاہیں جھکتی ہیں
جب صبحِ چمن سے وقتِ سحرِ آلام کا بادل چھٹتا ہے
جب دل کے ساز کو ہلا کی ند ہوش نگاہیں جھومتی ہیں

اُس وقت ڈاکر صہبائیں ساقی کی نگاہیں پیتا ہوں

اور سخن کی، بخود گزروں سے زخموں کی کچھ کھیتا ہوں

الطاف شہدی

تصحیح خیال خام

پندرہ (۱۵)

میری نظر سے یہاں کب ہیں ”وہ سخن آرا“ جو شاعروں یہ کہتے جا رہے ہیں ظلم صریح ہے ان کا علم بس اتنا کہ نقل جب نہ کریں بلا مبالغہ لکھیں ”گریہ“ کو بھی ”گریح“

چھتر (۱۶)

نہیں ہیں ان کی ترکیب ہی لطیف لطیف ہیں ان کے بعض اسالیب بھی صبح صبح مگر جو یاد نہیں ہے محال استعمال خود اپنے جہل کی کرتے ہیں ہر جگہ تصریح

چھتر (۱۷)

یہی رہا اگر ان کی نمود کا عالم مجھے یہ ڈر ہے کہ روپوش ہونہ جائیں فصیح یقیں کے رنگ میں کہتے غزل — تو کہہ لیتے مگر — یہ کرتے ہیں غالب کے طرز کی تشریح وہی لغات وہی اوصاف توں کی لپیٹ وہی نکات وہی فاضلانہ ہے تصحیح

چھتر (۱۸)

سخنوراں گراں گراں یہ کیوں نہ ہوں حیراں جب ان کے علم کی ہوائے جہل سے توضیح وہ شعر ساز ”بھی لکھو“ میں شاعر نہیں نام جو نقل ٹھیک اتاریں تو پڑھ سکیں نہ صبح بنا نہیں کوئی لفظوں کو جوڑ کر شاعر کریں یہ لوگ اب اپنے خیال کی تصحیح

علی شکر علی

تم اُن سے کس نے غافل ہوا علی منظور
ہر اک پہ فرض ہو جن کے کلام کی تصحیح

شاہی سکور پارٹی

صدیوں سے جاپان میں سیرنگل کا دستور چلا آتا ہے۔ لوگ پھولوں کی سیر دیکھنے جاتے ہیں۔ احباب کو اپنے باغ میں ہلاتے ہیں اور کھانے پینے کے علاوہ نظارہ نگل کی دعوت کرتے ہیں۔ یوں سیرنگل کا کوئی تہوار مقرر نہیں۔ نہ اس کے لئے کوئی موسم مقرر ہے۔ بلکہ جاپان میں ہر مہینہ کسی نہ کسی پھول کی بہار کے لئے مخصوص ہے۔ لوگ بارہ مہینے سیرنگل کا لطف اٹھاتے ہیں۔ پھر بھی ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ پھولوں کی سیر دیکھنے لوگ برساتی سیر پھٹیوں کی طرح گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ اپریل میں بہار شہاب پر ہوتی ہے۔ زمین ہر طرف سبزہ انگشتی ہے۔ درختوں پر پرنی کو پھلیں پھلنے لگی ہیں۔ سکورا کے درخت جو شہر میں آکر پھٹ پڑتے ہیں۔ دو چار پھول نہیں بادل کے بادل پھل جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے، پہاڑیوں کی ڈھلان پر، باغ کے میدان میں، پیازی اور پتے گلابی رنگ کے بادل چھانے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جاپانی اس منظر کو دیکھ کر وجد کریں تو کوئی تعجب نہیں۔ ایک ساحرانہ کیفیت ہوتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی رہ نہیں سکتا۔ خوب جشن منانے جاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں شہنشاہ جاپان کی جانب سے عائدین ملک کو سکورا پارٹی میں مدعو کیا جاتا ہے۔

شاہی پارٹی میں اراکین خاندان شاہی کے علاوہ وزراء نے سلطنت، اعلیٰ عہدیداران فوج بری و بحری، علمائین ملک، سفرائے دول اور ان کے سکریٹری ہلاتے جاتے ہیں۔ سفرانے دول اپنی حکومتوں کے نائب کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں اور اپنی ملک اُس منصب کی رتبہ سے جو انہیں جاپانی دربار میں حاصل ہے منصب داروں کے آٹھ درجے ہیں۔ ان میں سے صرف پہلے تین درجے والوں کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔ اول درجے میں اراکین خاندان شاہی ہیں۔ دوسرے درجے میں وزراء نے سلطنت، محکموں اور کالجوں کے ڈائریکٹر اور منتخب علمائین ملک ہیں۔ تیسرے درجے میں اعلیٰ عہدیداران اور دیگر عائدین ملک ہیں۔

غیر ملکی عہدیداروں کو بھی شاہی پارٹی میں شرکت کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر انہیں کو یہ اعزاز نصیب ہوتا ہے جن کو جاپانی دربار کا منصب مل جاتے۔ ملازمین سرکار کو تین سال کی ملازمت سے پہلے یہ منصب نہیں ملتا۔ غیر ملازمین کو تو مدتیں گزر جاتی ہیں۔ مثلاً غیر ملازمین کے کالجوں میں اب تک پندرہ ہندوستانی پروفیسر رہ چکے ہیں۔ سب اس شرف سے محروم رہے کیونکہ کوئی دو تین سال سے زیادہ یہاں نہیں رہا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں پہلا ہندوستانی ہوں جسے دوبار جاپان کا منصب عطا ہوا ہے اور مسٹر برلاس کو ملا کر ہمارا پہلا ہندوستانی جوڑا ہے جسے شہنشاہ جاپان کی جانب سے شاہی پارٹی میں مدعو کیا گیا ہے۔

جیسی پارٹی ویسی ہی شان۔ پیرل سسٹم میں سکورا پارٹی ہونے والی تھی۔ اس کی شرکت کی اطلاع ہمیں جنوری ۱۹۳۷ء میں سوا سال پہلے دی گئی تھی بلکہ آئندہ چھ سال تک کا پروگرام بنا دیا گیا تھا۔ شکر اس قدر خیر تعداد

ہیں کہ دو گروہ بنادئے گئے ہیں۔ ایک گروہ کو ایک مرتبہ بلایا جاتا ہے اور دوسرے کو دوسرے سال۔ اپریل کے علاوہ ایک پارٹی نومبر میں بھی ہوتی ہے۔ اُس وقت گل وادوی کی بہار ہوتی ہے۔ نومبر کی پارٹی میں بھی گروہوں کی تقسیم ہوتی ہو۔ دونوں پارٹیوں میں جو گروہ ہیں نامی شاہی باغ میں کھلے میدان میں ہوتی ہیں۔ ہارٹس ہوٹو ملٹوی کر دی جاتی ہیں۔ جس گروہ کی باری ہوتی ہے وہ خوب دُعا نہیں مانگتا ہے کہ اللہ میاں دھوپ نکال دے۔ ہم بھی دست بدعا تھے کیونکہ دو سال سے سکورا پارٹی ملٹوی ہو رہی تھی۔

چند روز قبل دعوتی رقعہ وصول ہوا۔ یہ ایک پکندہ تھا جس میں رقبے کے علاوہ کئی کاغذات ملحوظ تھے۔ ان میں باغ کے اندر اور باہر کے دو نقشے تھے۔ ایک موٹر پر لگانے کا نشان تھا۔ ایک داخلے کا کارڈ تھا جس میں لباس کے متعلق ہدایات تھیں۔ ہمالوں کو بارہ اور دو بجے کے درمیان پہنچنے کی ہدایت تھی۔ چلنے نوشی کے لئے چودہ بڑے بڑے احاطے گہرے جاتے ہیں۔ سفر لے دول کے لئے علیحدہ احاطہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دوسرے احاطے کے ٹکٹ مل گئے۔ یہ احاطہ شامیانے کے بالکل سامنے اور متصل تھا۔

باغ نہایت وسیع ہے جس کا رقبہ ایک سو ساٹھ ایکڑ سے زیادہ ہے۔ سابق میں ایک نواب کی ملکیت تھا۔ شاہی اختیارات کی بحالی پر حکومت کے قبضے میں آیا اور عرصہ تک محکمہ زراعت کے ماتحت شجرہ بہ گاہ کا کام دیتا رہا۔ بعد ازاں محکمہ محلات شاہی کے تفویض ہوا۔ سولہ عرصے میں بڑے دروازے کے متصل باضابطہ باغ لگایا گیا۔ شاہی پارٹیوں کے لئے یہی حصہ کام آتا ہے۔ باقی حصے میں کہیں شیشے کے گرم مکانات ہیں جن میں گرم مالک کے پھلدار اور نایاب پودے لگائے جاتے ہیں۔ کہیں محلات ہیں جو رہائش کے کام نہیں آتے بلکہ دھڑوں اور پارٹیوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ کہیں گالف کے لئے میدان ہیں جہاں اراکین خاندان شاہی مشق کیا کرتے ہیں۔

پارٹی کے لئے جو حصہ کام میں آتا ہے اُسے دو قطعوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بڑے دروازے کے اندر کھیتے ہی وسیع میدان ہے۔ یہاں مغربی وضع کا باغ لگایا ہوا ہے جس میں جاسجا پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ آگے چل کر چائے نوشی کے احاطے ہیں۔ آخر میں شاہی شامیانہ نصب ہے۔ اس میدان کی بغل میں اور عقب میں جاپانی وضع کا باغ ہے۔ جاسجا جھیلیں بنی ہیں جن کی شکل ایسی ہی ہے قاعدہ ہے جیسے کسی پہاڑی میدان کی جھیلیں کی ہوتی ہیں جھیلوں کے کنارے ڈھلوان ہیں۔ یہی نشیبی نما منظر کو دل فریب بناتا ہے۔ ڈھالوں پر اور روشوں کے کنارے پرسکورا کے درخت ہیں جو اس موسم میں پوری بہار پر ہیں۔ اس باغ میں یاںے زکورا کے درخت لگے ہوئے ہیں جنہیں ہزارا سکورا کہنا چاہیے۔ ان کی بہار وسط اپریل کے بعد آتی ہے جب بازار کورا اور بوسینو زکورا کے پھول گر چکے ہیں سکورا سے بہت وسیع علاقہ گھرا ہوا ہے۔ آدنی پھرتے پھرتے ٹھک جاتا ہے۔ یہ سیر کرنے کے لئے ایک وسیع میدان میں پہنچتے ہیں جہاں گھاس کے غلی فرش پر کرسیاں بچی ہوئی ہیں۔ لوگ یہاں آرام کرتے ہیں جو دیر میں آتے ہیں وہ گھاس پر دیر نہ جاتے ہیں۔ بکری فوج کا مینڈ سامعہ نوازی کرتا ہے۔

یہ مقام شاہی شامیانے کے عقب میں واقع ہے۔ دو رنگ قناتیں تہی ہوئی ہیں۔ مدوجے دروازہ کھلتا ہے اور لوگ

اپنے اپنے احاطوں کی طرف بے تحاشا بھاگتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ عام لوگوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ عائدین ملک کی پارٹی ہے۔ جس میں کرنل سے پہنچے درجے کا کوئی فوجی یا بحری عہدیدار شریک نہیں ہو سکتا۔ کرنیلوں اور جرنیلوں کا آگے کی نشست کے لیے بھاگنا کچھ مضحکہ خیز منظر معلوم ہوتا ہے۔ عموماً جاپانی نہایت سنجیدہ اور متین ہوتے ہیں مگر پھیڑ میں ان کی حالت بالکل بدل جاتی ہے۔ سب اپنی متانت کو بالائے طاق رکھ کر پھیڑوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ جب ہلڑ ختم ہو گیا تو پیچھے آنے والے ویسے ہی سنجیدہ اور متین تھے جیسے عموماً نظر آتے ہیں۔

جب سب لوگ گرسیوں پر بیٹھ گئے تو میجر العوت نے اعلان کیا کہ حضور ملک معظم کی تشریف آوری میں دلچسپہ گھنٹہ حاضرین اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ دوسرا اعلان ایک گھنٹے بعد ہوا اور تیسرا پانچ گھنٹے بعد۔ آخری اعلان میں بتایا گیا کہ جب حضور ملک معظم تشریف لائیں گے تو قومی ترانے سے استقبال کیا جائیگا۔ اُس وقت تمام حضرات مودب کھڑے ہو جائیں اور جب تک جہاں پناہ شاہی شامیلے میں پہنچ کر آرام نہ فرمائیں سب اس ہی طرح کھڑے رہیں۔

حضور ملک معظم کی سواری بارغ کے دروازے پر پہنچی تو سفر لے دول و دوزلے سلطنت نے استقبال کیا۔ جب تمام عائدین آداب کجا لہنگے تو مس میلن کیلبر مشہور اندمی اور گونگی خاتون کو جو امریکہ سے جاپان کے اندھوں کی معاونت کے لئے آئی ہوئی تھیں بارگاہ خسروئی میں پیش کیا گیا۔ شہنشاہ جاپان نے ہر اہم خسروانہ مس موصوف کو شرف باریابی عطا فرمایا۔ یہاں سے شاہی جلوس مرتب ہوا۔ آگے آگے گرینڈ چیمبر لین ایڈمرل ہیا کوتا کے تھے۔ کوئی پندرہ قدم پیچھے ملک معظم فوجی وردی میں تشریف لائے۔ جہاں پناہ کے چار پانچ قدم پیچھے ملک معظم تشریف لائیں۔ اس حضور کے پیچھے خواص خاصہ اور شہزادگان و شہزادیان والا تبار تھیں۔ سفر لے دول اور دیگر حضرات جو استقبال کے لئے حاضر ہوئے تھے عقب کے ملے سے اپنے اپنے احاطوں میں شہنشاہ کی آمد کے قبل پہنچ گئے تھے۔ جلد حاضرین پہلے ہی سے سڑک کے دونوں جانب قطار در قطار کھڑے تھے۔ قومی ترانے کے سُردوں میں ملک معظم و ملک معظمہ خراماں خراماں تشریف لائے۔ جلد حاضرین ٹوپیاں اُتارے کھڑے تھے۔ صبح گارڈن کو خم دے دے کر سلام کیا۔ فوجی اور بحری عہدیدار سیلیوٹ کی حالت میں کھڑے تھے۔ ملک معظم بھی ان کے جواب میں فوجی سلام کرتے تھے۔ ملک معظمہ دونوں جانب گارڈن کو خم کرتی مسکراتی ہوئی گزرتی تھیں۔ اس پارٹی میں شہنشاہ و ملک معظمہ کو جس طرح دہیڑ دیکھا اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ سڑکوں پر جب کبھی شاہی سولاری گزرتی ہے تو جاپانی سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں بادشاہ کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے۔ یہاں وہ بات نہ سنی۔ لوگ نظر بجا کر دیکھ رہے تھے۔

بلکہ معظمہ انگوری رنگ کا آفر لون گون زریبون فرمے ہوئے تھیں جب لے اتہا پھب رہا تھا۔ تمام شہزادیاں مضابطہ کے مغربی لباس میں ملبوس تھیں۔ عام جاپانی خواتین ضابطے کا کوٹ پہنے ہوئے تھیں جو عموماً سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں فاختہ یا بادیکمرہ رنگ کے کوٹوں کی نظر آئے مگر خال خال۔ مردوں کا لباس تو سیاہ تھا ہی۔ عورتوں کے لباس پر بھی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ ادبیاں بڑی خوبصورت وضع دار بندی ہوئی تھیں۔ رنگینی صرف مغربی خواتین کے لباس میں نظر آتی تھی۔ مسٹر بلاس ساڑھی میں ملبوس تھیں جو جاپانیوں کی نظریں اپنی جانب مہینچ رہی

تھیں۔ مرد درباری لباس یعنی مارتنگ سوٹ میں تھے اور سر پر سرنگ بیٹ تھی۔

لباس کے بارے میں بعض مغربی خواتین نے بڑی بدتمیزی کا اظہار کیا۔ بجائے سہ پہر کے مقررہ لباس کے معمولی کپڑے پہن آئیں جن میں وہ بازار آتی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض مغربی مردوں نے بڑا گستاخانہ رویہ اختیار کیا کہ کسی جیسے میں ملک معظم تشریف فرما ہوں تو درباری ضوابط کے بموجب کوئی شخص درباری لباس پر اور در کوٹ نہیں پہن سکتا۔ مگر یہ صاحبان برابر لبادہ پہنے رہے۔ اپنی مغربی خواتین اور مردوں کی بدتمیزی پر محکمہ محلات شاہی کو اعلان کرنا پڑا ہے کہ آئندہ مغربی حضرات کو رخصت بھیجنے میں احتیاط برتی جائے گی۔

ملک معظم کے شاہی شامیہ میں رسدنی افراد ہونے پر لوگوں کو کھانے پینے کی سوجھی۔ ہر احاطہ میں میزب آراستہ تھیں اور کمرہ بھی ہوتی تھیں۔ ان کی تعداد کے مطابق کھانے پینے کا سامان چٹنا ہوا تھا۔ میزوں پر غلاف پڑے ہوئے تھے جو شہنشاہ کی آمد سے کچھ پہلے طاز میں لے آئے اور دئے تھے۔ کھانے کے لئے سینڈویچ، کیک اور بسکٹ تھے۔ پینے کے لئے ساک، بیئر اور وٹ وائن، الیمینٹ اور چائے تھے۔ ہر ایک کے آگے ایک کس میں شاہی تحفہ بندھا رکھا تھا جسے گھرے جانے کی اجازت تھی۔ اس میں کچھ لیک تھے۔ لوگ اسے بڑے شوق سے لے جاتے ہیں اور اعزاز و اجاب میں ٹکڑا ٹکڑا سوغات کے طور پر تقسیم کرتے ہیں۔ وہ اسے سرسرا لکھوں پر رکھتے ہیں۔

ابھی چار بجے میں پانچ منٹ تھے کہ حضور ملک معظم و ملکہ معظمہ درباری اعراد کی معیت میں پارٹی سے رخصت ہو کر باغ میں داخل ہو گئے اور دوسرے دروازے سے سواری محل کو روانہ ہو گئی۔ بادشاہ سلامت کی روانگی کے وقت بھی کمیکیگا اور سجایا گیا اور جملہ حاضرین مودب کھڑے ہو گئے۔ شاہی سواری کے رخصت ہونے پر مہمان بھی اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوئے۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ عمائدین ملک کے اس مجمع میں سے بمشکل پانچ فیصدی ٹیکسیوں میں گئے ہوئے درندہ باقی سب ریلوں ٹریموں اور بسوں میں چلے گئے۔

آخر میں کمیکیگا کا مختصر حال بے عمل نہ ہو گا۔ انیسویں صدی کے آخر تک سلطنت جاپان کا کوئی قومی ترانہ مقرر نہ ہوا تھا۔ اسی زمانے میں مسٹر میکرت ایک جرمن ماہر موسیقی جاپان میں مقیم تھا۔ اس نے یہاں کے بعض مدارس میں اور بعض یونیورسٹیوں میں فوجی بینڈ جاری کیا تھا۔ وزارت محکمہ بحریہ اس سے خواہش کی کہ جاپان کا قومی ترانہ مرتب کرے۔ چنانچہ اس نے پرانی لکھنوں میں سے ایک نظم انتخاب کی جو کسی شاعر نے ایک ہزار برس پہلے بھی لکھی تھی۔ اس کے لئے مغربی موسیقی بنائی یعنی راگ اور مسر توجیز کے۔ اس طرح جاپان کا قومی ترانہ ظہور میں آیا۔ یہ ان ترانوں میں شمار ہوتا ہے جو اقوام عالم کے قومی ترانوں میں نہایت موثر مانے جاتے ہیں۔ اس کا لفظی ترجمہ بمشکل ہے۔ شاعر بادشاہ سے مخاطب ہو کر یوں دعا کرتا ہے :-

”تیری سلطنت تا ابد قائم رہے یہاں تک کہ کسکد برٹھکر چٹان بن جائے اور اس پر کافی حجم کمر چڑھتی ہو جائے“

نور الحسن برلاس !

ایک حسینہ سے

(اُس کی شادی کے بعد)

وہ ترے جذبات کی آتش فشاں کیا ہوئی
کیوں نہیں ہونٹو نہ تیرے اب وہ طوفانِ طُحّات
کیوں نظر آتا ہے اب تیرا تبسم سو گوار
اب تری باتیں ہیں گویا فلسفہ کے مسئلے
اب کہاں ہیں وہ تری آنکھوں کے دوسے سرخ سرخ
اب ترے دل کا سفینہ ہر طرح پابند ہے
کیا ہوئیں وہ تیری طوفانی امنگیں کیا ہوئیں
ہیں تے جذبات کیوں پھول مڑ جیتے ہوئے

جس سے دُنیا کا پتی تھی وِ جِواں کیا ہوئی
وہ تبسم کیا ہوا وہ گلُ فشاں کیا ہوئی
وہ فضا ہے دل، وہ صبح شادمانی کیا ہوئی
وہ تکلم کیا ہوا، زنجیں بستی کیا ہوئی
جذبہ معصوم کی وِ تیر جانی کیا ہوئی
بھر آزادی میں موجوں کی ردا کی کیا ہوئی
زندگانی کیا ہوئی، وہ نوجوانی کیا ہوئی
غنجہ ہائے ناشگفتہ کی کہانی کیا ہوئی

یاد ہو گا تجھ کو میرا شعلہ تھکا وِ دریاں

کیا ہوئی ظالم مری زنجیں فشاں کیا ہوئی

چھین لی کس نے ترے عارض کی سُرخی چھین لی
ہرِ نظر میں آنکھ پھولوں کی ڈالی کا سماں
پہ زمانہ اور یہ سنجیدگی کی قید و بند
گفتگو جھگی ہوئی سی ہر قدم پر احتیاط
کچھ تری باتوں میں وہ پہلی سی دُپٹی نہیں
لوٹ لیں کس نے مسرت کی بہاریں لوٹ لیں

چار بیکان میں تے بھولوں کی زنجیت کیا ہوئی
چال کی شوخی، تبسم کی صباحت کیا ہوئی
کیا ہوئی وہ مسکرا دینے کی عادت کیا ہوئی
وہ شرارت کیا ہوئی، مہیاک جرات کیا ہوئی
وہ طبیعت کیا ہوئی، آزاد فطرت کیا ہوئی
شامِ عشرت کیا ہوئی، صبحِ مسرت کیا ہوئی

آرزو کی سادگی، دل کی لطافت کیا ہوئی

وہ مقدس اور وہ معصوم اُلفت کیا ہوئی

حاجہ تقاری

تہنک، دل معصوم، ظہرت کس قدر سادہ
محبت سادگی ہی سادگی معلوم ہوتی ہے (دہلی)

عورت کی غلامی

حقوق نسواں اور آزادی نسواں کا شعور تقریباً نصف صدی سے بہت بلند ہو رہا ہے، اگرچہ نفس موضوع سے سبکد افغانی ہو مگر صحیح راہ عمل معدوم، اس دور جدید میں بھی بہت قلعیمیا فہم حضرات ایسے موجود ہیں جنہوں نے باوجود روشن خیالی اور تہذیب جدید کے پر زور و عودوں کے عورت کو غلامی کی قید و بند میں اس طرح جکڑ بند کر رکھا ہے کہ ان کی انسانیت کے لئے باعث تنگ و غار ہے۔

بعض حضرات یہ زعم باطل عورت کو مظلوم اور بے دست و پا خیال کر کے اُسے بے پردہ سینہ، تمغیر، کلب اور پارٹیوں میں ایجاں ڈالیں کر لے، نئے نئے فیشن سکھائے اور طرز معاشرت میں یورپ کی تقلید ہی کو اس کے حقوق کی روانی سمجھتے ہیں، حالانکہ اُسے حقوق اور آزادی کا راز گھر کی عملی زندگی، حسن معاشرت اور بہتر سلوک میں مضمر ہے۔

آج کل کے مغرب زدہ نوجوان جو یورپ کی ہر رسم و وضع کی کورانہ تقلید کو اپنا دین و ایمان سمجھ کر ہندوستان بلکہ تمام مشرق کو اس کی قدیم معاشرت جس کو یہ اپنی جہالت سے ”جہالت“ سمجھ رہے ہیں، نجات دلانے کے مضحکہ خیز زہم میں مبتلا ہیں، لفظ ”آزادی“ کے بولنے اور لکھنے سے تو واقف ہو گئے ہیں مگر اس کے حقیقی مفہوم سے بالکل نا آشنا ہیں، ان حضرات کے خیال فاسد میں مغربی سوسائٹی کی چند اصطلاحات کا رٹ لینا اور سماج کے چند سطحی طریقوں کو نہایت جدوجہد سے ہر موقع پر نمایاں کرتے رہنا یہی تمدنی اور معاشرتی ترقی کی مسخرچ ہے حالانکہ ان تہذیبستان علم و عمل کا سوٹ جس قدر خوش رنگ اور شوخ جتنا چمکیلا ہے افسوس کہ اسی قدر اُن کی فکر و عمل پاک صاف نہیں، انہوں نے یورپ کو دیکھا ہے مگر پڑھا نہیں اور نہ غور کیا ہے، پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو صحیح نتائج اخذ کر سکتا ہو نہ کہ اُن آنکھوں کی جو لندن کی شاہراہوں کی سحر انگیز چل پہل، بازاروں کی نظر فریب زیب و زینت، اسٹینڈ باؤک کی دلفریبی، پچاڈلی کی عیش پرستیوں اور رقص گاہوں کی چمکا چمکا کرے والی حسین روشنیوں اور عریانیوں میں کھرجالی ہوں۔

یورپ میں ایک دور جہالت کی تاریکی کا گزرا ہے جس کو تاریخ میں تاریک صدیوں سے یاد کیا جاتا ہے، عورت کا وجود آدم کے گناہ کا پھل سمجھا جاتا تھا، اور بچے اپنے سوسائٹی اور عیسائی دور میں عورت کو بڑی شدید غلامی کی حالت میں رکھتا تھا، عیسائیت نے عورت کے وجود کو الگ مستقل وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دین مسیح کے پرستاروں کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت کے جسم میں وہ مروجہ ہمای نہیں ہے جو مرد کے اندر ہے، قانون اس کے وجود شخصی کو تسلیم نہیں کرتا، وہ کوئی جائیداد اپنے نام سے الگ نہیں رکھ سکتی اور نہ کوئی معاملہ شہر کی موجودگی میں اپنے نام سے کر سکتی ہے۔

گزشتہ تین چار صدیوں میں یورپ میں تمدنی و اجتماعی انقلاب ہوا، عیسائیت کے ان غیر فطری قیود و شرائط سے تعلیم نے نجات دلائی۔ اب عورت کی حالت پر توجہ ہونے لگی اور رفتہ رفتہ اس کے احکام کا اعتقاد رائج ہوا، تاہم اس کی گردن میں اب بھی غلامی کے بہت سے طوق باقی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس کی حسین گردن میں انہیں سنہری اور مریض زیور بنا کر خوشحال بنا دیا گیا ہو۔

شے نمود از خود ارے اس قسم جنس کی غلامی کا ایک نفرت انگیز طوطی یہ بھی ہے کہ باوجود آزادی نسواں کے سینکڑوں دعووں کے سوسائٹی اس کی یہ حق دینے سے انکار کرتی ہے کہ وہ اپنا نام ظاہر کرے، جب تک وہ لڑکی ہو اس کا وجود باکے نام کا حامل ہو اور عورت ہو کہ شوہر کے نام کا تابع، گویا اس کا عیلمہ اور مستقل وجود ہی نہیں، وہ مرد کی موجودگی میں کوئی قابل اعتناء ہستی نہیں تصور کی جاتی۔

یورپ عورت کو اس کے فطری حقوق، جنگ نہ دے سکا، اسلام دنیا میں آیا کہ ہر طرح کی ذہنی، خیالی اور جسمانی غلامی کو مٹائے، عورت کی غلامی بھی ایک بہت بڑی غلامی تھی، اس نے عورت کے وجود کو ایک مستقل وجود تسلیم کیا اور مرد و عورت کے حقوق کو بحسن و خوبی واضح کر دیا۔

اسلام نے اس کو حق دیا کہ باپ اور شوہر سے علیحدہ اپنی شخصیت قائم کرے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد حاصل ہو نام سے رکھ سکتی اور اپنے نام سے ہر طرح کا قانونی معاملہ کر سکتی ہے۔ وہ یورپ کی عورت کی طرح نہ تو اپنے ہاتھ نام سے موسوم ہوتی ہے اور نہ شوہر کے۔

یورپ نے عورت کو سوسائٹی میں برا ظاہر جو رد دیا ہے وہ اس سے بہت گرا ہوا ہے جو اسلام نے اس کو عطا کر رکھا، مغرب نے خوش آمدت لفظوں میں خوشاد کہہ کر اس کی اصل آزادی چھین لی ہے، وہ اپنی فخر اور نازک صفت کے ساتھ پیار کی بہت کچھ باتیں کرتا ہو، اسکو محترم، لطیف اور نازک جنس کہتا ہے، اسکو اپنا نصف بہتر قرار دیتا ہے، اسکی عزت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس نے حقیقی آزادی کی آزادی کس حد تک دی ہو۔ اس آزادی کے متعلق اگر سوال کیا جائے تو وہ کچھ جواب نہیں دے سکتا۔

یورپ کی عورت حقیقت میں اپنے شوہر کی غلام ہے، وہ اپنی ملکیت کا حق کسی چیز پر بھی بہ حیثیت بیوی ہونے کے نہیں رکھتی، شریک زندگی تو کھاتی ہے مگر زندگی کی ملکیت میں اسکی کوئی حقیقی شرکت نہیں پائی جاتی، برخلاف اسے مسلم عورت اپنے والدین، اپنے شوہر، اپنی اولاد اور بعض صورتوں میں اپنے دوست و اقارب کی جائیداد میں بھی حصہ پاتی ہے، اپنے شوہر سے ہر کام مطالبہ کر سکتی ہو اس لئے اسکو بہت زیادہ اقتصادی آزادی حاصل ہو۔

دنیا میں اصلی آزادی اقتصادی آزادی ہے کہ انسان اپنی گزر بسر کا کوئی ذریعہ پیدا کرے، دوسرے جو کچھ حقوق اور مطالبات ہیں وہ اسکے تابع ہیں۔ اگر یہ آزادی انسان سے چھین لی جائے اور دنیا بھر کے سائے حقوق دینے جائیں تو سب مچ ہیں، آخر وہ غلام کا غلام ہی رہے گا اسلئے کہ مفلس کا وجود وجود ہی نہیں ہو سکتا۔

ہائے اکثر نے تعلیم یافتہ حضرات مذہب معاشرت میں آزادی کے بڑے دلدادہ میں اور جدوجہد کر رہے ہیں کہ خود کو آزاد خیال کہلائیں، عورت کی آزادی اور حقوق کا بھی اس ضمن میں مطالبہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں نے عورت کو غلام بننا رکھا ہے۔ بعض یورپ کے بعض علمی و صحیح مناظر کی نقالی کا شوق اور اس کی ہر بات کی غلامانہ تقلید کا دلولہ ہے، اس میں بھی عقل و فہم کو مطلق دخل نہیں، یہ لوگ عورت کو نام نہاد آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ آزادی انسان کا راگ یورپ سے سن لیا ہے اور اس پر سروصن کیے ہیں۔ لیکن نہ تو اس کا مطلب سمجھا ہے اور نہ اس کے زبردوم سے واقف جتنے ہیں۔ محض تقلید سے قوم نہیں بنی، سب سے پہلے دماغ کو اندھی تقلید سے آزادی ملنی چاہیے، پھر رجم و رواج کو، یہ لوگ صرف رجم و رواج کی اتباع سے قوم کو نجات دلانا چاہتے ہیں مگر انہوں نے اپنے دماغ کو یوزپ کا غلام بنا رکھا ہے۔

حقوق نسوان پر زمانہ وراز سے ایک ہنگامہ زبان و قلم پر ہے، اصلاح و ترقی اور عمل سب کی زبانوں پر ہے، تعلیم کی ضرورت سب پر روشن ہے، تاہم جو جہالت اور غفلت میں گرفت رہیں ان کی سرشاری اور مدد دہشی بدستور، جو مبتلائے معصیت ہیں ان کی جسارت و جرات اسی طرح قائم، جو بد عملیوں اور کمزوریات و نیامیں گھرے تھے ہیں ان کی حالت بدتر سے بدتر، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم پر اخلاقی قوت ناپید ہو، کوئی قوت یا نظام ایسا نہیں جو ہمیں قول و فعل کی مطابقت پر مجبور کرے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا نظام پیدا کیا جائے جو ہر حسن عمل کا مظہر ہو اور ہر فعل بد کیلئے اپنے اندر ایک سخت معاشرتی آفتاب رکھتا ہو، جب تک ہماری سماج ایک ایسا اخلاقی نظام پیدا نہ کرے اس وقت تک حقوق نسوان و انسانی سوال کی جتنی چکارہ صلئے بے بہرہ گام ہے۔

ایک شخص جو اپنی نیک کردار، خوش خصل، معصوم رفیق حیات کے لئے خوشخوار و درندہ ہے، ایک ناقابلِ اندیش جوابنے ذاتی فوائد و مصلحت کی بنا پر اپنی بہنوں اور لڑکیوں کو غیر موزوں ازدواج کی قربان گاہ پر بیٹھ چڑھا رہا ہے، ایک نفس پرست جو گھر سے باہر کی زندگی میں حسن و جمال کی نمائشیں تصویریں دیکھنا مادمہ ہو گیا ہے کہ اپنی رفیق زندگی کی رفاقت سے کنارہ کش ہو جائے۔ ایک اندھا جارجی جو حصول دولت کے لالچ اور ہوس میں مبتلا ہو کر اپنی شریک زندگی کے تن کا لباس تک جوئے کی نذر کر چکا ہے اور اب تیار ہے کہ اس کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہے، اس کے نفس بد کو کیا مجبوری ہے کہ ایسا نہ کرے جبکہ سوسائٹی ہر حال میں اس کی پذیرائی کیلئے آمادہ ہے اور اس کی اس طرح آؤ بھگت کر رہی ہے گو یا کہ اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔

یہی حالت اس عورت کی بھی ہے جو ایسے ہی افعال بے ہودہ اور حرکات ناشائستہ میں مبتلا ہے مگر کسی احتساب کی غیر موجودگی کی وجہ سے بالکل آنا دہ ہے کہ نام نہاد سوسائٹی کے سارے خرافات اور پیش پرستیوں میں جی کھول کر حصہ لے لگے کوئی اس کی نسائیت اور مشرقیت کا واسطہ دے کر اس میں کچھ احساس پیدا کرنا چاہے تو اپنی پوری توجہ ٹھکرائے۔

عام طور پر عورت جو فاشیو رہے، حالانکہ اس کی دفا شعاری کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے سینکڑوں برس سے ایک وفادار کنیز کی طرح انواع و اقسام کے مظالم سہے۔ مگر کبھی اس نے مردوں کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا، اس کو ہم نے چڑیوں کی طرح بچرے میں بند کر دیا، وہ خوش رہی، اس کو ہم نے تعلیم و تربیت سے بیگانہ اور جاہل رکھا، اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کو ہم نے اپنے جذبات کی تکمیل کا ذیل ترین ذریعہ بنایا، وہ خاموش رہی۔ اس کو ہم نے ہر قسم کی سزاوی جگہ قتل تک کر دیا، اس کی زبان پر ہر خوشی لگی رہی۔ اس کو ہم نے آگ میں جلنے کا حکم دیا۔ وہ بغیر کسی ہذرے کے خوشی خوشی اپنے بے بسی کے ساتھ سستی نہ گئی۔ مگر اس روح قمر سافل کے خلاف اسے کبھی آؤ بھگ نہ کی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ باوجود اس دفا شعاری اور اطاعت گزاری کے ہم اسے جو فادہ سرکش کہیں؟

انفرادی طور پر اگر عورت کی کچھ بیوفائی کی مثالیں ملیں گی بھی تو ان سے ساری جنس بطین یکدھوں مطلوبوں کی جاتے و ذہاب خود اپنے ضمیر کو ٹٹول کر دیکھیں کہ ہم میں کس حد تک فدا دہی کی صفت موجود ہے، ہم عورت کی دفا شعاری، جان شکاری، اطاعت گزار، فرمان برداری و ایثار اور اس کی بے پامان محبت کو صرف ایک قصور میں ٹھکراتے ہیں کہ اس نے ہم کو ولاد نہیں دی۔ قصور بھی ایسا کہ جس پر کوئی توبہ نہیں اور پھر سزا بھی ایسی دی جاتی کہ جس سے زیادہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت سزا عورت

کیئے نہیں بھوت، ہم فردا دوسری رشتہ حیات سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور اس بے قصور غریب کو ٹھکرا دیتے ہیں، لطف یہ کہ اس کو طلاق بھی نہیں دیتے۔ اگر دہلی بھی تو کس کام کی جب کہ وہ رسم و رواج کے قیود میں پھنسکر مرد کی طرح دوسرے کو اپنا شریک زندگی بنانے کے لئے آزاد نہیں!

جس طرح بچوں کو کھلونے دیکر بھلاتے ہیں اسی طرح مرد نے عورت کو زیور دیکر بھلا رکھا ہے، سب سے پہلے عورت کو کانوں میں زیور پہنایا گیا اور یہی زیور غلاموں کو بھی پہنایا جاتا تھا، چنانچہ نادری میں "علقہ گبوش شدن" کے معنی ہیں غلام یا کنیز ہونا، بیلوں کی طرح تختوں میں سوراخ کر کے ایک بڑا سعلقہ "نقہ" کے نام سے ڈال دیا گیا، غلاموں کی طرح گلوں میں "طوق" پہنائے گئے، بھرموں کی طرح ہاتھوں میں "ہنگڑیاں" ڈالی گئیں، قیدیوں کی طرح پاؤں میں "بیڑیاں" پہنائی گئیں اور بھولی بھالی سادہ لوح عورت کو بھلا گیا کہ یہ زیور "ہیں جو اس کے من میں چا چاند لگائیں گے، عورت محمد حسن چو اس کو کبھی زیور کی ضرورت نہیں۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی!

اگر تھوڑی دیر کیلئے ہم اس زیور کو عورت کی زیب و زینت مان بھی لیں تو یہ آرائش و زیبائش کس کے لئے تھی؟ یہ بھی مرد کیلئے! ورنہ اس میں عورت کو کیا فائدہ تھا! اسی طرح معنی تو یہ کہ یہ زیور بھی عورت کی ملکیت نہیں سمجھے جاتے، جب تک چاہا پہنایا اور جب چاہا نکال دیا۔

ہر عورت کی فطرت میں وہ تمام خبریاں موج دہیں جو قدرت کی طرف اسکو عطا ہوئی ہیں یا اس کے اسلاف سے اس کو ورثہ میں ملی ہیں، لیکن اسے جاہل رکھنے، اس میں نیک و بد کا امتیاز پیدا نہ کرنے، اس کی دماغی قوتوں کو صحیح تعلیم و تربیت سے بچاؤ رکھکر ابھرنے نہ دینے اور اس کو اس کے حقوق سے محروم رکھنے کی وجہ سے ہم اس کی سیرت کو رفتہ رفتہ مٹ کر رہے ہیں، ہم کو چاہیے کہ ان سینکڑوں معاشرتی مصائب جو جدید تعلیم و تہذیب کی برکت سے اس پر مسلط ہو رہے ہیں، اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مغرب کی اس نام نہاد آزادی کے خلاف ہلکے پر زور احتجاج کرنا چاہیے جو عورت کی "نسائیت" کو پارہ پارہ کر رہی ہے، مغربی تہذیب تمدن کی اندھی تقلید کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی شدید ضرورت ہے جو مشرقی اقوام کے حق میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ دینے دامن میں کچھ نہیں رکھتا۔

عورت میں جو نقائص ہیں ان کا اگر ہم تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان میں فطرت کو بہت کم دخل ہے، عورت کی ہمہ نوع کمزوریوں کا سبب اس کو عیباط پر قید و بند نہیں رکھتا ہے ورنہ ہم کہیں اس کو اس درجہ مریض، نحیف اور فطری فرائض کی صحیح انجام دہی میں اس قدر ناگاہ نہیں پاتے۔

کسی قوم کی ترقی اور اصلاح کی بنیاد غلط تعلیم اور بل نقالی پر نہیں ہے بلکہ ہم تعلیم اور صحیح عمل پہ ہے، ہماری سماج میں قنونی قوت یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ہر تعلیم صحیح اصول پر ہو اور اچھی نظیر پیش کرے اور ہر دعویٰ صحیح عمل کے بعد کیا جائے جب تک کوئی ایسا ذہنی انقلاب نہ ہو اس وقت تک "آزادی نسواں" کے عنوان پر وہ عنوان و حار تقریروں یا ہنگامہ خیز مباحث سے قابل اعتنائت کچھ برآمد نہیں ہو سکتے۔

میرزا سیف علی خان

۱۹۰۹ء

عشق اور موت

دیر انداز پڑے، تو سیر اندھیاں اٹھیں
کالی گھٹائیں کہتی ہوئی۔ الاماں، اٹھیں
نہسار کپکپاٹھے، گلشن لرز گئے
کچھ یوں اُنق پر شام کے ساتھ نہوئے
صحرا سے اٹھا، ٹھوکریں کھاتا ہوا غبار
ندی کی موج موج تھی، اک جبرے آتشا
کچھ ایسے بڑھتی آتی تھیں، تاریکیاں مگر
سوجانے کو تھے، گویا زمانے کے شور و شر
یہ خامشی خواب نہ لوٹے گی، پھر کبھی
کہتی تھی، دُوبتے ہوئے سوج کی روشنی

ہندوستان

چکار رہی تھی، دو درنا صبر میں کائنات
ہر ذرے میں تھی، تو رفتاں نزع کی حیات
کچھ مردنی سی آتی گئی، لالہ زار پر
جلوے بھی زرد ہوتے گئے، گویا ہمارے
ہر گوشہ نش اط میں ہنگامے چپ ہوئے
صدیاں نہیں کہ سوتے تھے۔ کچھ ایسے سو گئے
قلب و منظر کی گرمیاں افسردہ ہو گئیں
گلزار جلوہ زائیاں پڑمروں ہو گئیں
تاریکیوں میں موت کے کوٹھے چھلک پڑے
خونیں فیق میں بھلیوں کے خم چھلک پڑے

ہندوستان

ہنگامے تھے، خوش فضا زرد زرد تھی
میرے نفس کی آگ بھی کچھ سرد سرد تھی
ایٹھی ہوئی زبان تھی، جذبات مردہ تھے
دنیا میں زندگی کے نشانات مردہ تھے
کچھ بھی نہ دیکھ سکتی تھیں، آنکھیں کھلی ہوئی
جھوکا نہ مار سکتی تھیں، باہیں تلی ہوئی
گیسوئے حسن زرد دین لہما ہوا تھا دل
بے موت اب بھی حسن کو سمجھا ہوا تھا دل

تکمیل جذب عشق سے دل ہو گیا تھا۔ عشق!
یعنی فنا کے خون و خطر کھو گیا تھا، عشق
جسپر

افسانہ نگاری

جو مفہوم لفظ "افسانہ" کا ہماری زبان میں ہے قریب قریب وہی مفہوم انگریزی میں (SHORT STORY) کا ہے۔ اس کی پیدائش انجیل سے شروع ہوتی ہے اور افسانہ کے تمام صفات انجیل کے چھوٹے چھوٹے قصائص میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس صنف ادب کے امتیازی ترقی نہیں کی، صرف دسویں زمانے میں چوتھے چوتھے نظم میں ترتیب دئے گئے۔ جن میں افسانوی خصوصیات کافی طور پر نمایاں ہیں۔ انگریز میں ۱۸۳۰-۱۹۶۰ تک کافی قصبے لکھے گئے لیکن بہت طویل، جن کی وسعت افسانہ کے تنگ میدان میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ افسانہ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر ہو۔

مروجہ افسانہ نگاری کی ابتدا انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے، لیکن عوام نے اس طرف خاص توجہ نہ کی اس لئے ستارہ ادیبوں نے نئی افسانہ نگاری میں دلچسپی نہیں لی۔ اس طرز میں جس نے سب سے پہلے کافی شہرت حاصل کی وہ امریکہ کے ڈوشمپ اور ایڈگر آلن پو اور ہامنڈن تھے۔ جو پہلا ادیب تھا جس نے ۱۸۴۲ء میں افسانہ نویسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں "واحد اثر" ہونا چاہیے۔ ان کے بعد برٹ ہارڈی، آڈرین اور ہنری جیس وغیرہ ممتاز امریکن ادیب نے جنہوں نے اس صنف میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان لوگوں کے کارناموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے زندگی اور اپنے ماحول کا کافی مطالعہ کیا تھا گو کہ زندگی کا مرقع پیش کرنے میں ان لوگوں نے مختلف طرز اختیار کئے لیکن ان کا نصب العین ہمیشہ "انسان" اور "زندگی" ہی رہا۔

اسی دور میں فرانس کے ادیبوں نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ تیرتی اور بالزک جنہیں انسانی جذبات کی تصویر کھینچنے میں یرطولی حاصل تھا قابل ذکر ہیں۔ فرانسیسی افسانہ نگاروں میں صداقت کی جھلک بہت کم تھی۔ اور روزانہ زندگی کے واقعات دور ہٹ کر زندگی کا مرقع بہر طریقے پر پیش کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۵۰ کے بعد جب روسی ادیب کا فرانسیسی ادیبوں پر اثر پڑا تو ان لوگوں نے بھی فطرت کے مطابق لکھنا شروع کیا اور صداقت کا نمایاں پہلو اختیار کیا جس کی نظیر دو دسے اور گے وی موبسائی کے کارناموں سے دی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں نے جس صداقت اور نچرل طور پر افسانہ نگاری کو پیش کیا ہے سب سے یورپ کے لئے نمونہ بن گیا۔

انگریز میں سب سے پہلا اور ممتاز افسانہ نگار آر۔ ایل۔ اسٹیونسن تھا۔ اس کے بعد روڈرک ہکنگ نے کافی شہرت حاصل کی اسٹیونسن مختصر پسند تھا۔ اس کے افسانے اخلاقی شان اور واحد اثر کی جی تصویریں ہیں۔ ہکنگ کے قصوں میں مقامی رنگ کی جھلک زیادہ ہے اور اکثر مبالغہ کے خوبصورت ایران میں ٹھہرتا نظر آتا ہے لیکن صداقت کا دامن ہمیشہ پکڑے رہتا ہے۔ اس کے قصے بہت ہی خوبصورت اور موضوع ہوا کرتے ہیں۔ ان ادیبوں کے پیروکار انگریز میں کافی پیدا ہوئے جن میں ہارڈی، سلیج، جی، ویس، گلس و ددی، والٹر ڈیلا میر، اے۔ ای، ڈیویو، یسن۔ جان بوجن اور جے۔ رکن وغیرہ نے جدید افسانہ نگاروں میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان وقت از ادیبوں کے افکاروں میں جو خاص خصوصیات ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے طوالت میں مطابقت اور سادگی ہوتی ہے، واحد قصبہ اور واحد اثر ہوتا ہے۔ مکالمہ طبعی اور سادہ ہوتا ہے۔ یہی ان کا طرز خاص ہے جس نے ان کو دلی شہرت بخشی۔

عہد حاضر میں افسانہ نگاری ایک خاص فن قرار دیا گیا ہے۔ اس کے خاص اصول اور طرز مقرر کئے گئے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کے ذریعے پر نہیں بنایا جاسکتا کہ ایک ادیب اپنے افسانے کس طرح لکھ سکتا ہے لیکن یہ ضرور مستحکم کیا جاسکتا ہے کہ ایک افسانہ کے لئے کون سے اجزاء ضروری کہے جاسکتے ہیں۔

(۱) **تاثیر میں افسانہ نگاری** — موجودہ افسانہ نگاری میں یہ ضروری ہے کہ افسانہ نگار ہمیشہ اس بات کی کوشش کرے کہ قانون ہے تو وہ اس کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے افسانے کا خمیر تیار کرتا ہے۔ اس لئے اس پر لازم ہے کہ اپنا افسانہ اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ جو اثر اس نے خود دیا ہے وہی اثر اس کے پڑھنے والے پر پڑے۔ اگر پڑھنے والے پر مختلف اثر کام کریں گے تو ایسے قصوں کو افسانہ کے دائرے سے خارج کرنا پڑے گا۔ پتہ چلا افسانہ نگار تھا جس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ افسانے میں سب سے نظیر یا واحد اثر ہونا چاہیے۔

(۲) **واقعات اور پلاٹ** — افسانہ نگار کو چاہیے کہ ہمیشہ ایک واقعہ کو اٹھائے اور اسے صداقت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اگر وہ مختلف واقعات کی مدد سے جوڑ پھیند لگا کر اپنا افسانہ تیار کرتا ہے تو پہلی خصوصیت یعنی تاثیر میں کم ہونے لگتی ہے۔ افسانہ میں مختلف واقعات اسلئے پر میز کیا جاتا ہے کہ اسکی دنیا محدود ہوتی ہے۔ ایک افسانہ نویس اپنے اسباب کو جتنا مختصر کرے گا اس کا افسانہ اتنا ہی خوبصورت اور کامیاب رہے گا۔

پلاٹ میں تین چیزیں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) تہید (۲) منہا، عروج یا تدریج (۳) موثر خاتمہ — تہید بہت ہی صاف یا مختصر دیباچے کے ساتھ شروع کرنی چاہئے۔ منہا کے دائرے میں بہت ہی درمیانی طور پر داخل ہونا چاہئے۔ یعنی واقعات اور ہیر کو اس مہم و حام اور شوکت سے پہلو بہ پہلو دکھاتا ہے کہ کوئی واقعہ ہیر کی فطرت کے خلاف نہ ہو۔ افسانہ کو بھی طول نہیں دینا چاہیے اس لئے بہت سی چیزوں کو چھوڑ دینا پڑتا ہے اور اس موقع پر یہ امر ضروری ہے کہ پڑھنے والے کی قوت تخیل پر زور نہ پڑے بلکہ وہ اپنی تخیل کی مدد سے افسانہ کا تسلسل اور چند واقعات جو افسانہ نویس نے چھوڑ دیے ہیں قائم رکھے۔

خاتمہ عام طور پر جزئیہ یا طبعی ہو کر تا ہے اکثر افسانہ نگار خاتمہ کو فارم پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس کا نتیجہ وہ خود خیال لے خیر ہو یا اہل طرز ہو۔ خاتمہ ہمیشہ موثر ہونا چاہئے کیونکہ یہ وقت ہیر اور افسانہ کو الوداع کہنے کا ہوتا ہے اس لئے جدائی کے وقت افسانہ نگار کچا کچو کہ پڑھنے والے پر ایسا اثر دالے کہ اسے افسانہ کی وقعت اور عزت اس کے دل میں قائم ہے۔

(۳) **اگر وہ لازم ہے کہ وہ جتنے لوگوں کو اپنے افسانہ میں جگہ دے صرف ایک یا دو کو استثنائی خصوصیت بخشنے** — اگر وہ زیادہ لوگوں کو مخصوص کرے گا تو اس کے افسانہ کا اثر تقسیم ہو جائے گا اور اس کے ہیر و دمنیز افسانے کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔

اگر افسانہ نگار دیکھا جاتا ہے کہ اس کے کردار ہمیشہ دھمپ اور موثر ہیں تو اس کو چاہئے کہ اس کا کیریکٹر ہمیشہ ایسا ہو کہ وہ زندگی کی اصلی خصوصیت ہو اگر اس کی فطرت ہماری زندگی سے خلاف ہوگی تو یقیناً نا کامیاب رہے گا اور واقعات کو اس سے جڑا کر دینا چاہئے کہ اس کے کردار کے لئے معلوم ہوں۔ اگر کیریکٹر ہر کام پر اپنی قسمت کے بھروسے پر چھوڑ دیتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی نگاہیں پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہم کو تو یہ دیکھنا ہو کہ ایک انسان معصیت یا خوبی میں ہے۔
 کو کس رنگ میں تصور کرنا اور اس معصیت یا خوبی میں کون کون سی چیزیں گرتا ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔
 اس کا نگار کی سب سے بڑی خصوصیت اور کامیابی اس کے سلوب بیان میں نہماں ہوتی ہے۔ ہر
 مکالمہ اور طرز تحریر جتنا بھی چلتے ہو گا اتنا ہی وہ افسانہ نگاری میں کامیاب رہے گا۔ افسانے کا
 مکالمہ ہمیشہ غیر معمولی (فطری) ہونا چاہیے۔ اس کو ہمیشہ ہمارے روزمرہ کے موافق ہونا ضروری ہے اور اس بات کا ہمیشہ
 خیال رکھے کہ جس کیفیت کا کیریکٹر ہو رہا ہے اس کا مکالمہ ہوتا آقا اور غلام کی گفتگو میں ہیٹھ فرق ہونا چاہیے۔ اگر
 دونوں کی زبان سے ایک ہی قسم کے الفاظ نکلیں گے تو یقیناً کانوں کو بڑا معلوم ہو گا۔ اگر یہ کہ کیریکٹر ایک ہی قسم کی گفتگو
 کرنے لگے تو صداقت میں فرق آجائے گا خطرہ رہتا ہے۔

جہاں تک طرز تحریر کا تعلق ہے عبارت سادہ اور دلکش ہونی چاہیے، الفاظ میں موزونیت اور فقروں میں سہولیت
 ہو۔ بہم اور غیر لائق الفاظ کی جگہ کارآمد اور معنی خیز الفاظ استعمال کرنا چاہیے۔

اب ہم یہ دیکھنا ہے کہ افسانہ اور دوسری کہانیوں میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب کافی مشکل ہے اور جدید
 افسانہ نگاری کو دیکھ کر قارئین سے ملجور کرنا بہت دشوار ہے۔ لفظ قصہ یا کہانی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کی
 چھوٹی چھوٹی شاخوں میں فرق بتانا بہت ہی نازک ہے تاہم جدید افسانہ اور دیگر قصوں میں جو امتیازی فرق ہیں ان
 ہمیں سمجھنی ہی پڑتی ہے۔ قصے میں حسب ذیل اقسام شامل کی جا سکتی ہیں۔ روایت، احکامیت، چٹکلا، داستان
 بیان، مسودہ یا خاکہ کہانی، تمثیل، ناول، وغیرہ۔

جدید افسانے عام طور پر ڈرامائی ہوتے ہیں اور بڑے بڑے فیلے پر ایک خاص اثر طاری کرتے ہیں لیکن حکایت اور روایت
 چٹکے مسودے اور کہانیوں کے لیے ڈرامائی ہونا یا واحد اثر پیدا کرنا کام نہیں آتا۔

جدید افسانہ ناول کا تعلق بہت گہرا ہے اور اکثر کا یہ خیالی ہو کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں لیکن یہ صحیح
 نہیں۔ سچلے تک ان کے تعلق سے بات کیے بغیر مکالمہ اور ماحول کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں، ان دونوں میں امتیازی
 فرق یہ ہے کہ افسانہ میں صرف ایک واقعہ واقعہ ہوتا ہو۔ کیریکٹر بہت کم ہوتے ہیں اور واحد اثر پیدا کرتا ہے۔ برخلاف
 اس کے ناول میں کئی قصے اور کیریکٹر ہوتے ہیں۔ اس کا زمانہ طویل ہوتا ہے اور غیر ضروری الفاظ زیادہ استعمال ہوتے
 ہیں۔ افسانہ نگار کو اپنے قصے میں جو چیزیں چاہیں وہ سب لے سکتے ہیں۔ بہت عظیم کہانیاں ناول میں کم کت کیں اور آسودگی بخشی
 ہے۔ ناول نگار کے لیے یہ کہتا ہے۔ ناول نگاری میں کیریکٹر کے سر پر ہلکا سا کافی روشنی پہنچانی جاتی ہے کیونکہ

اس شخصیت کے بارے میں سب سے زیادہ معلوم کر سکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار کے کون کون سے عناصر
 اس شخصیت کے بارے میں سب سے زیادہ معلوم کر سکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار کے کون کون سے عناصر
 اس شخصیت کے بارے میں سب سے زیادہ معلوم کر سکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار کے کون کون سے عناصر

اور جس قسم کا انسان ہو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے۔
 دوسری چیز جو ایک افسانہ نگار کے لئے ضروری اور صداقت ہے صداقت سے مطلب حقیقی نہیں ہو سکتا
 کہ کسی مسئلہ کو سائنٹفک طرز پر حل کرے بلکہ اس کے واقعات پھل ہوں بہت سے لوگوں کا یہ سوال ہوتا ہے کہ افسانہ
 بالکل تخلیقی پیداوار ہے اس لئے اس میں صداقت کا نام تک نہیں دیتا۔ لیکن یہ اصحاب صداقت کے دامن سے کو خود
 کر دیتے ہیں اور غلط فہمی کے شکار بن جاتے ہیں۔ افسانوی شاعری کے میدان میں صداقت کے معنی صرف یہ نہیں ہوا
 کرتے کہ کوئی سچا واقعہ بیان کیا جائے بلکہ ایسے واقعات بھی صادق مانے جاسکتے ہیں جو ہماری زندگی میں
 پیش آسکتے ہیں۔

عوام کے نزدیک تو یہ ایک ذل پہلانے کی چیز ہے اور جو نکاس میں شمن کی شرح عشق و محبت کی پیش چھاؤں زیادہ
 فوائد افسانہ۔ رہتی ہے اس لئے ہمارے وجود ان کے لئے دیکھ سہی کافی سامان ہوتا رہتا ہو لیکن ایک بڑے افسانہ نگار
 کے نزدیک یہ چیزیں لغو ہیں۔ اس کا مشا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کے گہرے مطالعے کے بعد اس کے دل پر ایک
 اثر پیدا ہوتا ہے اور اس اثر کی ترجمانی افسانہ کے ذریعہ کرتا ہو۔ وہ ہکو ایک خوبصورت دنیا کی سیر کرتا ہو اور میں بتاتا ہو
 کہ ہم بھی اپنی زندگی ایسی بنالیں جس میں سترت کا راز نہنیاں ہے۔ وہ ہمارے اخلاقی کو کاٹ چھانٹ کر درست کرتا چاہتا ہو
 ہمارے سخت دل کو نرم کرتا ہے ہمارے اندر محبت کے پاک جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ ہکو ہمدردی اور رحم کی تعلیم دیتا ہو۔
 وہ ہماری زندگی کے نہنیاں راز کو کشف کرتا ہے اور اپنے پیٹھے لغو سے میں خوش کرتا ہے۔ بن سب کی تعلیم دیتا ہے
 افسانے کے ذریعہ ہم تک پہنچاتا ہے۔ زندگی کا بہترین نمونہ جو وہ تیار کرتا ہے اپنے کیرکٹر کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش
 کرتا ہو اس لئے ایک بڑے افسانہ نگار کی وقعت ہماری سوسائٹی میں بہت زبردست ہو وہ ایسا معلم ہے جو ہم کو زندگی
 کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔

افسانہ اور عجیب و غریب محبت
 آند و افسانوں میں اکثر محبت اور عشق کے ذکر سے عام طور پر زیادہ ہوتے ہیں۔ جس سے بہت سے لوگ پریشان ہو گئے۔ افسانہ نگار اس پر غور کرے کہ محبت
 کوئی چیز عام ہے سامنے پیش کر سکے۔ محبت کا جو معیار اس کی نگاہوں میں ہے افسوس ہے کہ ہمارے نزدیک یہ معیار
 میں سے محبت ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان کیا حیوان سے بھی ہمدردی پیدا کر سکتا ہے۔ محبت کی انوکھی ایک رو
 ہے کہ ہمارے ذہن حالات اور اخلاقی کمزوریاں سب کچھ ہر جاتی ہیں۔ ہمارا فہم کی اس قدر عقل محبت کے ایک
 سے محبت کے نزدیک جب وہ اپنی تعلیم تکمیل کی حد تک پہنچا دیتا ہے تو یہی تصور ہوتا ہے کہ محبت کو کسی اور
 اور اس کی زندگی پر افسوس کیا ہے کہ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ محبت کمزور ہو گئی ہے۔ محبت کے معیار کی کمی
 کی وجہ سے اب وہ محبت کے لئے کچھ نہ کر سکتا ہے۔ محبت کے معیار کی کمی کی وجہ سے اب وہ محبت کے لئے کچھ نہ کر سکتا ہے۔

افسانہ اور عجیب و غریب محبت
 آند و افسانوں میں اکثر محبت اور عشق کے ذکر سے عام طور پر زیادہ ہوتے ہیں۔ جس سے بہت سے لوگ پریشان ہو گئے۔ افسانہ نگار اس پر غور کرے کہ محبت
 کوئی چیز عام ہے سامنے پیش کر سکے۔ محبت کا جو معیار اس کی نگاہوں میں ہے افسوس ہے کہ ہمارے نزدیک یہ معیار
 میں سے محبت ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان کیا حیوان سے بھی ہمدردی پیدا کر سکتا ہے۔ محبت کی انوکھی ایک رو
 ہے کہ ہمارے ذہن حالات اور اخلاقی کمزوریاں سب کچھ ہر جاتی ہیں۔ ہمارا فہم کی اس قدر عقل محبت کے ایک
 سے محبت کے نزدیک جب وہ اپنی تعلیم تکمیل کی حد تک پہنچا دیتا ہے تو یہی تصور ہوتا ہے کہ محبت کو کسی اور
 اور اس کی زندگی پر افسوس کیا ہے کہ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ محبت کمزور ہو گئی ہے۔ محبت کے معیار کی کمی
 کی وجہ سے اب وہ محبت کے لئے کچھ نہ کر سکتا ہے۔ محبت کے معیار کی کمی کی وجہ سے اب وہ محبت کے لئے کچھ نہ کر سکتا ہے۔

ہوتے جائیں گے۔ لیکن ایک افسانہ نگار ایسی حالت میں دوشیزہ کے ہر طرز کو نگاہِ تحقیق سے دیکھے گا اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کاش ایسی ہی بھولی بھالی زندگی جو قصبہ، مکینہ، مکاری و عیاری سے پاک ہو ہر شخص کو نصیب ہو۔ لیکن شاعر اس کے مُشاہدے میں اتنا محو ہو جائے گا کہ اس کو اوروں کی خیر تک نہ لمحہ کی۔ وہ اپنے طوفانِ بے خودی میں گنگنا تا رہے گا اور جذباتِ دائر کی ترجمانی کرتا رہے گا جسے ہم شاعری کہتے ہیں۔

آخر میں صرف اتنا اور لکھنا ہے کہ ہر افسانہ نویس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ واقعات سادے اور فطرت دروزانہ زندگی کے مطابق ہوں۔ کیرکٹر کا انتخاب ایسا ہو جس سے شان اور شرافت چمکتی ہو۔ فطری صداقت کا پہلو ہر جگہ نمایاں رکھے۔ ماحول کا انتخاب ایسا کرے جس سے مبسُتل کیفیت نہ طاری ہو۔ افسانے کو ہمیشہ مختصر کرنے کی کوشش کرے۔

علیم الدین خاں

فطرت ایک مفلس کی نظر میں

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا اکیا حسن ہوں گُزاروں میں
وہ خواہ سکتے ہوں شب بھر، وہ خواہ چمکے ہوں شب بھر
اس چاند کی ٹھنڈی کرنوں سے جھکو تو مسکول ہوتا ہی نہیں
یہ چپ چپ زرخس کی کلیاں کیا جانے کیسی کلیاں ہیں
یہ لال شفق، یہ لالہ دل، اک چٹکاری بھی جن میں نہیں
کیا جھکو نظر آتی ہی نہیں یہ لڑش سی، یہ سوزش سی
اُس وقت کہاں تو ہوتا، جب موسم گرما کا سورج
جاڑے کی بھیاں لگ داتوں میں وہ سرد ہواؤں کی تیزی
دریا کے تلاطم کا منظر ہاں جھکو مہارک جو بسکن
کوئل کے رسیے گیت سنے، لیکن یہ کبھی سچاؤ نے
بادل کی گرج، بجلی کی چمک ہاڑش میں وہ تیزی تیروگی
سب ہوش و خرد کے دشمن ہیں سب قلبِ جگر کے دشمن ہیں
وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسین ایسی زہرہ، ایسی ہدیوں

جب جب میں پیسے نکلتے ہیں جب پیشیں بدلی جاتی ہیں
اُس وقت یہ ذرہ میرا ہے، اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

علیم الدین خاں

سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

کتنی خوش تھیں اپنی بہاریں، کتنی خوش تھی اپنی جوانی
دولوں کا مذہب جو کہ جہاں تھا، وہ تھے غریب اور بے گناہی
کتنے بھلے، کتنے حسین تھے، کتنے شریف اور کتنے مافی
کتنی نرالی چاہ گئی کی، دل میں مودہ اور بات بسنا فی

سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

دن گئے گئے، خود کو جو کوسا، اٹھکا ہوا کوٹھنہ پر رکھا
باپ کا درد تھا، ماں کا خطرہ، بھائی کی شرم اور بہن کا فوج
کوئی نہ سنی، کوئی نہ سنا، کوئی نہ اپنا، کوئی نہ پرایا
سارے دہشتے آپ دھلیں گئے، پیت کی جو بہن بھتی لنگا

سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

ایک مودہ جن کی طبیعت، ایک کرشمہ جن کی فطرت
باطن نرمی، ظاہر گرمی، مدلی میں مروت، منہ پر شقاوت
اک دن باپ سے میرے بھیا، گئے کہ انکو دودھ حکومت
ان کو نہ تھی گواہ کی چاہت، میں نے ہی بھیا کر کے منت

سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

وہ تو گئے دور، اور نظر میں آیا نہی ہی گل سا کھلتا
ماں باپ گھبرا، اچھا پر پانچ لڑکے جہاں کا نقشہ بدلا
کتنی چاہا تھا، کتنی خاطر، بی بی ہوئی تھی پھر سے مگرا
جان بھی لیں گے، ہمارے لیں گے، آخری نا لاڈ سے پالا

سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

بیاہ کا تھا بال ڈنڈا، بچا، ان کی آن میں اسے کمری کیا
جل کر آخر خط لکھ بھیا، آپ ڈانٹیں، مگر میں رادھا
ہاتھ میں خط تھا، منہ پر غصہ، پاس کرشمہ تھے سرخ اٹھلا
کوئی نہ سنا، کوئی نہ سنا، کوئی نہ سنا، کوئی نہ سنا

سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

سہری قسم اور پیت کی سگند، آپ کو بھی جو گئے نہ ابھی!

مُنہ میں ہم اک بیاہ رچا ہے، دھوم ہے سارے گھر میں جسکی
 ہو گیا کہا اپنے آپ کی شادی! کسی کی شادی، رادھا میری
 باپ نے جیج راجہ ڈھوڑا، ایسا بڑا اور ایسی شادی
 سب سے نرالا اپنا فائدہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

اتنا سُکر۔ اُسے کہوں کیا، مَنہ کو کھجور آئے اک دم
 بولے پہا پہا پہا، مور بھی ناچے بن میں جھیم جھیم
 مین کا سگر سوٹھے سگرے، آنسو نہیں، آئیں خشم خشم
 یاد یہ آئی کسی کی دل میں، تیر یہ مائے کس نے دما دم
 سب سے نرالا اپنا فائدہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ہے ہے، شور یہ کیسا اُٹھا! کس کے مکان سے! خیر خدا یا!
 ہاتے لگی وہ دل کی دُنيا! اتنے ناز سے جس کو لب لایا
 ہنس کر بولو تو کیا جائے، کتنا نازک دل ہے میرا
 کتنے پتے قول کے اپنے! وہ بھی کیا اور یہ بھی پورا

سب سے نرالا اپنا فائدہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی
 روٹھ گئے بس! اِدیکھی اُلٹ، آؤ پیت کا راگ سُنائیں!
 نین کی گنگا، من کا مستدر، پریم کا پنڈت، آہ برائیں
 حُسنِ محنت، عشق رہا، موج کے دن اور عیش کی راتیں
 آپ کے دشمن دن پر دیکھیں کس کی شادی، کیسی برائیں

سب سے نرالا اپنا فائدہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی
 من کے راجہ، دل کے باسی، اُداس نہ کیجھ اپنی داسی
 محاف کرو، لو ہاتھ ہیں جوڑے، دیکھو ہنسی سے تو کربلی
 یاد ہے وہ دن! داس ہوں تیرا، حکم ہے تیرا میری مرضی
 بھول نہ جاؤ بات وہ مٹھی، رادھا اچھی، رادھا میری

سب سے نرالا اپنا فائدہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی
 اچھا، آپ اپنے اپنی چلائی، پھر بھی سوت کو بٹھنے نہ دلوں گی
 موت اُٹل ہے، عشق امرت، موت سوت، اور عشق ہوں تیرا
 گھر میں جو شادی یوں ہی رچی، سب کی تان خوب ہو پوری
 اتنے نہ روٹھو، پاس بلا لو دشمن کس سے! آئی، آئی

سب سے نرالا اپنا فائدہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ساقی کے خاص نمبر رعایتی قیمت پر

فاؤسٹ

مترجمہ: سٹیفن احمد، بی۔ اے۔، دانشور، ممبئی

فاؤسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و سحر کن طویل کہانی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ نہرو، آفاق شاعر المانیہ کوٹے نے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساتھ ہمال صرف کئے تھے۔ اس کہانی فلسفہ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آراٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو ایک وقت بھانا ہی اور بھیا لگے گی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کی تخیل کا آخری حد پر پہنچنے والی آئینہ، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی یہ داستان ان گیس کرتا ہی صورت میں شائع ہو گئی، یہ قیمت ایک روپیہ ہے۔

ضرورت

رنگون دہرہا کی ایجنسی میں اگر آپ اپنا اخبار، رسالہ کتابیں، کلنڈر، جنتی، اشتہارات وغیرہ بطوریشن خواہ ریجنس فروخت کرنا چاہیں تو سن ہی معہ نمونہ کے پتہ ذیل پر خط و کتابت کیجئے۔

عبدالرزاق خاں نظامی، فیض آبادی، ایجنٹ

اخبارات پوسٹ کے ذریعہ ۳ مکان نمبر ۱۰۔
رنگون (برما)

خاص نمبر	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
جاپان نمبر جنوری ۱۹۳۶ء	ع ۳۰	ع ۲۰
سالنامہ - جنوری ۱۹۳۵ء	ع ۳۰	ع ۲۰
سالنامہ - جنوری ۱۹۳۴ء	ع ۱۲	ع ۱۲
سالنامہ - جنوری ۱۹۳۱ء	ع ۱۲	ع ۱۲
سالنامہ - جنوری ۱۹۳۰ء	ع ۳۰	ع ۲۰
افسانہ نمبر - جولائی ۱۹۳۶ء	ع ۱۲	ع ۹
افسانہ نمبر - جولائی ۱۹۳۵ء	ع ۱۲	ع ۸
افسانہ نمبر - جولائی ۱۹۳۰ء	ع ۱۰	ع ۸
افسانہ نمبر - جولائی ۱۹۳۱ء	ع ۱۰	ع ۸
ظریف نمبر - اپریل ۱۹۳۶ء	ع ۱۰	ع ۸
ظریف نمبر - اپریل ۱۹۳۵ء	ع ۱۰	ع ۸
ظریف نمبر - اپریل ۱۹۳۴ء	ع ۱۰	ع ۸
ظریف نمبر - اپریل ۱۹۳۳ء	ع ۱۰	ع ۸
دلی نمبر - اکتوبر ۱۹۳۲ء	ع ۱۲	ع ۸
دلی نمبر - اکتوبر ۱۹۳۱ء	ع ۱۰	ع ۸
ڈانٹے کا جہنم - اکتوبر ۱۹۳۶ء	ع ۱۲	ع ۱۲
چغتائی نمبر - اکتوبر ۱۹۳۵ء	ع ۱۲	ع ۱۲

نجم السحر

سازمان

وحشیوں کی لڑائیوں کا بیان جب آپ پڑھیں گے
تو اس ناسی بھی روک کر لیں گے۔ غرض شرم سے آخر تک یہ
کتاب عجیب و غریب چیز ہے۔ صفحات ۵۰۰ صفحات
قیمت تین روپے۔ علاوہ معمولی ڈاک

بیانیہ

یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کی پہلی
مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ یہ فرانسیسی مصنف
اناطولی فرانس کا شہہ یار جو سب سے حسین جسم و نوع کے تعالیم کے
مسئلہ کو مصر قدیم کی ایک عروس بازاری کی دوستان کے طور پر
نہایت دلخیزی سے پیش کرنا گناہ ہے۔

یہ ناول تمام دنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔
عزیزیت اللہ صاحب اس کا ترجمہ اسی قادر المکملی اور مجاز بیانی
سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپے۔ علاوہ محصور لکڑی۔

نقد و تبصرہ

اردو ادب میں سے غالب پر تعلیم یافتہ جماعت کی خاص توجہ ہے اور گذشتہ چند سال کے دوران میں ان کے اردو کلام کے متعلق بحث کی گئی ہے اور تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان تصانیف کا عام میلان غالب کی شاعری کی خصوصیات کی اردو شاعری کی پیدائش و ترقی کی جانب رہا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی ابتدا میرے مرحوم دوست، ڈاکٹر عبدالرحمن، مجھ پر ان کے مقدمہ دیوان غالب سے ہوئی تھی۔ جو انہوں نے دیوان کے نو محمدیہ یعنی بحوالہ ایشین کے لئے لکھا تھا۔ اگرچہ علامہ اقبال کی نظر میں غالب کا مؤثران غالب ہے اور جس کا پہلا شعر ہے کہ ۔

فکر ان اہل ہری ہری سے یہ روشن ہوا ہے پر صوفی تخیل کی رسانی ناکجا

عبدالرحمن مجنوی مرحوم کے مقدمے سے بہت پہلے شائع ہوئی تھی، خود علامہ موصوف نے غالب کے دھج کو جس حد تک پہلے کیا ہے اس کو غالب کی تعریف کا بہترین پیرا یہ خیال کیا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی ہر دھج پر ان کی اس اور مطالب کی مقبولیت کا ایک سبب ہے۔ یہ سوال میرے دل میں گئی بار پیدا ہوا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ غالب کے کلام خصوصاً ان کے اردو کلام کی جو قدر و قیمت اس وقت ہے وہ ان کے اپنے زمانے میں نہ تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں اردو شاعری کا کچھ کم چرچا تھا اور ان کے معاصرین میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن کو اردو شعر کا صحیح وجد ان اور ذوق تھا اور جو اس کی خوبیوں کو چھپانے کے ہر طرح اہل تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب حیات "میں" میں اردو شعر کا سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ عام پسند مذکر ہے، غالب کی اردو شاعری کا ذکر کچھ ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ مرزا غالب کے اپنے معاصرین ان کی اردو شاعری کو نہ صرف ذوق و رغبت کی شاعری سے کمتر ورہے کی خیال کرتے تھے بلکہ ان کو اس کی لطافت و خوبی کا کوئی صحیح اندازہ ہی نہ تھا۔ اس معاملے میں آزاد مرحوم کے بیانات کو کافی اور درست مان لینے کی ضرورت نہیں اور میں اس خیال کے انہار کی جرات کر سکتا ہوں کہ خود غالب کے اپنے زمانے اور اس کے بعد کے زمانے میں ایسے انھماں یقیناً موجود تھے جو ان کے اردو کلام کو اتنا ہی پسند کرتے تھے جتنا کہ اس زمانے کی غالب پر تعلیم یافتہ جماعت۔ البتہ ان انھماں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور عام طور پر غالب کو ان مقبولیت نصیب نہ تھی جو اس وقت ہے۔ ان انھماں میں سے کئی ایسے ہیں جو میرے شاعر مشرق، مسعود، انور، نوحی یا ذوق کو کسی ایک حیثیت سے غالب پر ترجیح دیتے ہیں۔ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انھماں اگرچہ کئی شخص اس قسم کے موازنہ کی جرات کرے تو غالب کا دلدادہ گروہ اس کو پسند کرے گا اور یہ موازنہ قدر و قیمت کا نہیں بلکہ اس کے گہرے ہر سوال بانی رہتا ہے کہ ہماری تعلیم یافتہ جماعت کی غالب کے بارے میں اس شوق کا کیا حال ہے؟ کیا اس کے دل میں یہ ہے کہ وہ میرے شعر کو کم، دیم، سب سے دیم، اور سی، دیم، سی، ایس کی کتاب "غالب" کا ایک کتب خانہ کے کسی غلام کی دہلیز میں پھینک دیا جائے؟ اس کے اوراق کو نہایت شوق سے اس توڑ میں شلوار کا شادریں

نئی بہت خوش ہوا کہ میرے سوال کا جواب ضرور مل جائے گا۔ اگر کام صاحب نے ہی مضمون پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ چھانک بھی لیں ہے میں اُن کے اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں تاکہ آپ خود اندازہ فرمائیں کہ میری توقع کس حد تک پوری ہوئی اور میری خوشی کتنی بڑی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

”ہم نے مرزا کی شاعری کی خصوصیات جس ترتیب سے وہ کسی دور میں زیادہ نمایاں تھیں بیان کر دی ہیں لیکن یہ

مقبولیت پہنچنے کے لئے وہ کافی نہیں۔“

یہاں جگہ مقررہ کے طور پر یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر کام صاحب نے غالب کی شاعری کے چار دور قائم کئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دور کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرتے کے علاوہ اُن کے منتخب اشعار کو زمانہ کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ اس کا ذکر میں پھر کروں کافی الحال آگے سنیے۔

”کلام غالب کی مقبولیت کی سبب بڑی وجہ اس کا جبروت العجیب متوجع ہے..... مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن منطقی آئے تو اس کے لئے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ کچھ لوگوں کے لئے شوقی اور طرافت اور انسانی عظمت کی داستان سننا ہوتا تو یہاں دوسرے کی باتیں ملیں گی جن کا لطف جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جاسے گی بڑھتا جلتا گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔“

یہاں تک مجھے اپنے سوال کا کوئی صحیح جواب نہ ملا کیونکہ متوجع کو پند نہ کرنا ہر اُن کی عظمت ہے اور اگر واقعی غالب میں یہ صفت اور آرزو و شعرا سے زیادہ پائی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی قدردان کے اپنے زمانے میں کیوں اس حد تک نہ کی جاتی جس حد تک کہ اس زمانے میں کی جاتی ہے۔ لیکن ابھی مشر اگر کام کا بیان ختم نہیں ہوا اور وہ کہتے ہیں کہ۔

”مرزا کی مقبولیت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئی طرز کے کوئی تھے اور اُن کے خیالات کا جو اسلوب تھا زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے..... مرزا تقلید کے قائل نہ تھے اپنی کچھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے اُن کی جدت پسندی سے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہیں تھے بلکہ وضع قطع پوشش متن افست فن شعر انشاء خطوط اور دوسری شخصی اور ادبی باتوں میں بھی وہ اپنے عصا و حیل اور شعر و سلا کی بدولت مرزا کو حاضر و ہاں نہ سمجھتے اور انادانہ اُن پر بخیر چینی کرتے..... یہ آرزو خیالی اور تقلید سے نفرت تمام فکر انکی امتیازی خصوصیت رہی اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرز مقبول ہے۔“

اس آخری فقرے کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھا۔ غالب کی جدت طرزی مسلم لیکن کیا یہ صفت جدید تعلیم یافتہ جماعت میں بھی کچھ زیادہ نمایاں ہے؟ میں تو اکثر مفسرین کی زبان سے یہ شکوکہ سنتا ہوں کہ اس زمانے کا تعلیم یافتہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کا شعرا و ادیب غرض زندگی کے ہر ایک اہم پہلو سے تقلید کی انجیر میں گر کر نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ تقلید اپنے اسلاف کی تقلید نہیں بلکہ غرض کی تقلید ہے۔ شاید مشر اگر کام کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ غالب مشرقی شعرا و شعرا کی تمام روش سے محروم تھا اور ہم بھی اس سے محروم ہیں اس لئے ہم غالب کو پند نہ کرتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں ہم مشر اگر کام کے متون پڑھتے ہوئے اگر وہ غالب کے کلام کی ان صفتوں کو ملحوظ خاطر فرما دیتے جن کی بنا پر اس کو اپنے تمام شعر و نثر کی اور قد و خم کے علاوہ انداز خیال کا جائزہ لے سکیں۔ لیکن یہ طرز فکر

اس کے علاوہ زبان اور فہم میں ہر مضمون اور خیالات کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلام غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے متبعین کا اصول بھی اس کے حوالے میں چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے مرزا میں اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پائی ہے۔

۱۔ زبان کا سہارا۔ مسٹر اکرام نے ایک نٹ نوٹ میں یہ اضافہ فرمایا ہے۔

”مرزا کی قدر شاہ دہلی اور گھنٹو سے زیادہ پنجاب میں ہوئی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جرگہ پنجاب میں اردو زبان پہلی اور ثانوی لوگ زبان اور فہم کے تعلیق خوبوں سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہوتے جس قدر خیالات سے۔ اور یہ اتفاق کہ اردو زبان کا استعمال ہلکے اور گھنٹو سے زیادہ پنجاب سے وابستہ ہو گیا ہے، اردن غالب کی مقبولیت میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔“

میرا خیال ہے کہ ایک معاملہ میں تو غالب کی شاعری کو تعلیم یافتہ گروہ کے موجودہ رجحان کے باطنی فحان تصور کیا جاسکتا ہے۔ انہیں حب وطن اور قوم پرستی کے جذبات کی بہت کمی ہے اور اس کی گواہی اس مسٹر اکرام کو بھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ۔

”حال ہی میں مرزا کے چند تراحوں نے ان کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا کہ ان میں حب وطن کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ حقیقت یہ خیال صرف مرزا کے حالات زندگی اور ان کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا بلکہ مرزا کی اکتا و طبیعت کے غلط انداز سے پرستی ہے۔“

اور اس ریلے کے غموت میں مرزا صاحب کی باوثابہت دہلی کی تباہی کی جانب سے لاپرواہی اور انگریز حکام سے ان کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزا انگریزی نظام کو مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے۔

اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا کہ پنجاب کے ایک مشہور ادیب کے اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر مجھ سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ غالب کے کلام کی انفرادی ان کے زمانے کے سیاسی حوادث کا نتیجہ تھی اور انہوں نے استعارے کے پیرائے میں اپنی کئی غزلوں میں ان تنازعات کو ظاہر کیا ہے جو ان حوادث سے ان کے قلب میں پیدا ہوئے لازمی تھے۔ اس ضمن میں ادیب مذکور نے دروغوں کا خاص ذکر کیا تھا جن میں سے ایک وہ مشہور نقار کی غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

۲۔ ہمارے دیوانہ کہ سر مست سخن خواہد شد دن
ایں سے از قضا خریداری کہن خواہد شدن

اور دوسری ایک اور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

۳۔ سب کہاں کہ لالہ و لگی میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں پہنچی کہ نہاں ہو گئیں

مسٹر اکرام کی تفتیش کے مطابق یہ دونوں غزلیں غالب عذر شدہ سے قبل لکھی گئیں اور ان میں کسی خاص تاریخی تعلقات کی تباہی شائبہ کی کوئی فصول معلوم ہوئی ہے۔ بہر حال غالب اور تعلیم یافتہ گروہ کی باہمی آم آہنگی کے اسباب کے متعلق میرے سوال کا اس سے زیادہ کہ اور جواب مجھے مسٹر اکرام کے ”غالب نامہ“ میں نہیں مل سکا اور مجھے اسی جواب پر قناعت کرنی چاہیے۔ کتاب کے چار حصے میں پہلے ایک حصہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ضعف نے سات آٹھ سال غالب کے کلام کے مطالعہ و مستقید اور ان کے سوانح حیات کی کئی خصوصیتوں کے پس منظر کے بعد تقریباً نو تالیفات میں غالب کی زندگی کے واقعات کو ان کی اپنی تصانیف اور خطوط سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے بعد تیس سالہ مسلمات میں ان کے فلسفی اور اردو کلام اردن کی شخصیت کے ہر ایک اہم پہلو پر مستند حوالہ

سے بعضہ کیا گیا ہے۔ آخری حصہ غالب کے اردو اور فارسی اشعار کا ایک نہایت دلچسپ انتخاب ہے۔ جس کے تقریباً دو سو ساڑھے چالیس اشعار ہیں۔
 کا یہ حصہ شاید مصنف کے لئے سب سے زیادہ دشوار ثابت ہوا ہو گا کیونکہ انہوں نے اشعار کے انتخاب کرتے اور موزوں اشعار کی دہلی میں
 ترتیب دینے میں صرف ذوقی تسلیم ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کو سب تصنیف سے منسوب کرتے کے لئے عالمانہ تحقیق کا سب سے بھی
 کام لیا ہے۔ یہ ناگن تھاک ہر ایک غزل اور قصیدے کی تاریخ معلوم کی جائے لیکن مشرکرام نے مولوی طور پر مرزا غالب
 کام کو چند ادوار یعنی زمانوں کے تحت میں تقسیم کر دیا ہے جس سے ان کی شاعری کے ارتقا کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے اور اکثر جگہ کی خاص
 غزل، قصیدہ، نظم کا سب تصنیف بھی درج کر دیا ہے۔ ادبیات غالب میں غالب نامہ ایک نہایت قابل قدر اور بعض لحاظ سے باطل و بعض صحیح ہے۔
 ہے اور امید ہے کہ غالب کے پرستاروں میں یہ ضرور مقبول ہوگی۔

پنجاب کے جن ادیبوں نے غالب کو مقبول بنانے میں خاص سی کی ہے ان میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر میں مولوی ظفر میاں
 صاحب کا بھی نام لے سکتا ہوں اور یہ میں اتفاق ہے کہ دوسری کتاب جو اس وقت میرے پیش نظر ہے ان کا مجموعہ نظم بہارستان
 ہے جس کو اردو لکچر لایا ہوا ہے بڑی نقطہ اور جلیبی کے آٹھ سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل کیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف بیرون
 صدی میسوی کے آغاز سے لیکر اس وقت تک جموں کی محنت جیشیوں سے نمایاں رہے ہیں اور ان میں سے ایک جیشیت
 شاعر بھی ہے۔ ان کی نظمیں اخبار اور رسالوں میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں اور عام طور پر دیکھی سے پڑھی جاتی ہیں۔ میں ابھی انکو غالب
 کے حاشیوں کے ذمہ میں شمار کر چکا ہوں لیکن ان کی اپنی شاعری کا رنگ غالب کے رنگ سے باطل مختلف ہے۔ اگرچہ اس دور کے اور ارد
 شعرا کی مانند وہ بھی غالب کے نمونے کی فارسی ترکیبوں کا کام و بیش استعمال کرتے ہیں لیکن غالب کی شاعری کی نسبت ہا و فطری جذبات اور
 فلسفہ ہیں اور ان کی شاعری کی سیاست اور اخلاق۔ اس ضخیم مجموعے میں شاید یہی کافی نظم جو میں کو خاصی بحال کے واقعات سے باطل غیر
 متعلق قصہ کیا جاسکے۔ ان کی شاعری کا ایک دلکش وصف خلافت ہے جو اگر غرض و ہزل اور طنز و تہلیل سے متبر ہو تو نہایت بھی معلوم ہوتا
 ہے۔ دنیا کے ادبیات کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری اور خطابت کے درمیان ایک حقیقی اصل قائم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔
 یہ دونوں فن جین اور توثر الفاظ سے کام لیتے ہیں اور دونوں اعلیٰ اور ملیح جذبات کو ابھارنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ مولوی ظفر کی غالب
 کی شاعری کے خارج غالباً مجھے سمجھ میں آئے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان پر حاکم اور اکبر کا پرتو پڑا ہے اور ان دونوں شاعروں کے
 کام کا بیشتر حصہ کام موزوں ہونے کی رعایت سے انہی طور پر شعر کہلایا جاسکتا ہے لیکن سنو جیشیت اس کو منظم خطابت خیال کرنا
 چاہیے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولوی ظفر کی غالب صاحب شاعری کا فطری طرز نہیں رکھتے اور ان کی شاعری اس قدر خوب ہے کہ
 شہ دار کو مرقعہ مقصود ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد کیا ہے کیونکہ کسی شاعر کو اپنے کسی بھی شاعر کی طرح جو اس کے مقصد سے
 دور ہو باطل فضول ہے۔ اسی ضخیم کتاب پر مجموعی عمل میں کوئی تہرہ کرنا نہیں میں سے صرف چند نظموں کو تفصیلی طور پر لکھنے کے لئے انتخاب کرنا
 اس کے ساتھ غیر مصنفانہ سلوک ہو گا۔ یہ بہتر ہے کہ اس مختصر تعارف کے بعد یہاں مختصر زبان میں اس کی صفات عام سے بیان کر دیا جائے
 جس کا سامان بہارستان میں نہایت بڑے سے پتہ لگایا گیا ہے۔

(ملے۔ آئی۔ آر۔ جلی)

ضرورت رشتہ

ایک شریف و نجیب تنہا اس کے لئے کہ

رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی سلیقہ شعار، نیک سیرت اور میٹک پاس ہے۔ وہی کے ایک شریف النسب خاندان کی فرد ہے۔ جلد امور تبدیلیہ خط و کتابت ذیل کے پتہ سے ملے گئے جاسکتے ہیں۔

ن معرفت رسالہ ساقی۔ دہلی

امتحان کے بعد بجلی کا کام کیسے

کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب، یوپی و صوبہ سرحد، ہندوستان، پاکستان، بھارت، برصغیر، جاری ہو سکوں اور ایکشن شریز ملک صیاد بہترین درجہ کا ہے جو ریگنڈا نرڈی کو اور ایڈوکی۔ ہر قابلیت اور ہر ذہنیت کے طلباء کیلئے سکول کھلا ہے۔ گورنمنٹ مالی امداد ملے ہر سکول کی ذمہ داری ایک مقامی رعایت کردہ اور ہر اسکول کے پرنسپل مفت

ساقی کے خاص نمبر عیاقی قیمت پر

خاص نمبر	ساقی	قیمت
جاہان نمبر (جنوری ۱۹۷۰ء)	۱۰	۱۰
ظریف نمبر (اپریل ۱۹۷۰ء)	۱۰	۱۰
افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۷۰ء)	۱۰	۱۰
راشدہ الخیری نمبر (ستمبر ۱۹۷۰ء)	۱۰	۱۰
دستے کا جہنم (اکتوبر ۱۹۷۰ء)	۱۰	۱۰
سالانہ نمبر (جنوری ۱۹۷۱ء)	۱۰	۱۰
ظریف نمبر (اپریل ۱۹۷۱ء)	۱۰	۱۰
افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۷۱ء)	۱۰	۱۰
چغتائی نمبر (اکتوبر ۱۹۷۱ء)	۱۰	۱۰
سالانہ نمبر (جنوری ۱۹۷۲ء)	۱۰	۱۰
ظریف نمبر (اپریل ۱۹۷۲ء)	۱۰	۱۰
دلی نمبر (اکتوبر ۱۹۷۲ء)	۱۰	۱۰
ظریف نمبر (اپریل ۱۹۷۳ء)	۱۰	۱۰
افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۷۳ء)	۱۰	۱۰
تاکیر نمبر (ستمبر ۱۹۷۳ء)	۱۰	۱۰
دلی نمبر (اکتوبر ۱۹۷۳ء)	۱۰	۱۰
افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۷۴ء)	۱۰	۱۰
سالانہ نمبر (جنوری ۱۹۷۵ء)	۱۰	۱۰
افسانہ نمبر (جولائی ۱۹۷۵ء)	۱۰	۱۰
مکمل فائل - (۱۹۷۰ء)	۱۰	۱۰
مکمل فائل - (۱۹۷۱ء)	۱۰	۱۰
مکمل فائل - (۱۹۷۲ء)	۱۰	۱۰

منکر طہلے

یعنی

وہ کتاب جو

حضرت ہزارا ایل ہانس دی ڈیوٹ آف ونڈس کے نام کھلا مکتوب!

از

عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے، ایل ایل بی۔ (علیگ چیف جج عدالت عالیہ پورہ)

ایک انتہا سے زیادہ سنجیدہ اور باوقار مگر طویل مکتوب جو کہ ہزارا ایل ہانس کی ارفع و اعلیٰ پوزیشن اور عمدہ وارثہ (۳۴) کی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ذمہ دار مصنف لکھ سکتا ہے اور وہ بھی انتہائی ادب اور لطافت کے ساتھ! افسانہ نگاری اور ناول نویسی کا نرالا انداز اس عجیب و غریب مکتوب نما ناول میں دیکھئے۔ نفس مضمون کی نزاکت مصنف کی سنجیدہ ظرافت اور عشق و محبت کی ایک دلربا اور چمکتی اور چمکتی ہوئی کہانی! دیکھئے کہ مصنف کا یہ عجیب و غریب ناول کس احترام اور لطافت کے ساتھ حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے، اور کی ایسے کہ واقعہ حال کا ذکر کیا اشارہ تک نہیں ہے۔

کتاب پیرس میں دیدی گئی اور تیاری کے بعد انگریزی ترجمے کے حضرت ڈیوٹ موصوف کے پاس بھیج دی جائیگی۔ اس عجیب و غریب ناول کو دیکھنا ہوتا ہے ہی آرڈر جبر کرنا دیکھئے۔ قیمت عام علاوہ محصول ڈاک۔ محدود ایڈیشن۔

نور محمد سہیل پبلیشرز، لاہور

تصانیف مصوّر ظرافت مرزا عظیم بیگ جلالی

<p>روح لطافت</p> <p>ہمارا دل کہ خواہے اور نہ خواہے ہر حال میں ہمارے ہر حال میں ہمیں اپنے ہر حال میں ہمیں اپنے ہر حال میں</p> <p>قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>روی ظرافت</p> <p>ایک نئی کی مصیبت اور دیگر مزاح مضامین کا مجموعہ ہر افسانہ ظرافت کی مضامین کے تعلق میں ہمیں اپنے ہر حال میں</p> <p>قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>شہر پر بیوی</p> <p>ایک خاتون کی مصوّمہ شہر پر بیوی کچھ بہن کے کتب چھوڑے کوئی چیز چاہتا۔ چار تصویریں اور زمین مرقع مضبوط جلد۔ قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>کولتار</p> <p>مضامین اور ہر افسانہ ناول شیخ و سنگ مذہب کی چھ چھوڑ اور ایک عورت ایک دوکان کی عجیب و غریب کتاب قیمت ۱۰ روپے</p>
<p>خانم</p> <p>ہمیں اپنے ہر حال میں اور ہر حال میں مضبوط جلد۔ قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>عورت تیر نام خود داری ہے</p> <p>اس عنوان کی صداقت لک کے سب سے بڑے مزاح نگار مصوّر ظرافت مرزا عظیم بیگ جلالی کی ناز و نری تصنیف اور ظرافت کی پیش تصویر</p>	<p>فردوسی</p> <p>عورت کی کردار و فطرت کس طرح مرد کے بہت سے ہیں آجانی ہے۔ ابتدائی حصہ ہمیں اپنے ہر حال میں قیمت ۱۰ روپے</p>	
<p>جنت کاجوت</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>چمکی</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>دیکھا جائیگا</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>	
<p>مغفلات نامی</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>مرزا جنتی</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>تقصیض</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>	<p>چینی مٹی اگوشی</p> <p>ایک نئی نئی اور اس کی جنت ایک نئی نئی اور اس کی جنت قیمت ۱۰ روپے</p>

۱۔ نہ کاپی پر مفت

جُرْعَات

ساتی کاس لاشہ چندہ پاچھو پے
اور شمشاہی تین روپے ہے
مالک بیرون ہند سے بارہ
شنگ۔

قیمت فی پرچہ چھ آنے

جلد ۱۶ ساقی دہلی بابیت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگارہ اولیں	"مشاہدہ"	(۲)
(۲)	سبیلین	مولانا حفیظ اللہ دہلوی۔ سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد۔ دکن۔	(۳)
(۳)	قوانین حیات	حضرت امین احسن دہلوی	(۳۱)
(۴)	جواب طلب	پروفیسر محمد مسلم ایم۔ اے۔	(۴۱)
(۵)	ثمرات	جناب نھال سید دہلوی	(۴۵)
(۶)	وثنیا کی ساتویں تعلیمی کانفرنس	پروفیسر نور الحسن برلاس (از جاپان)	(۴۶)
(۷)	تالہ دل	"دفکار"	(۴۶)
(۸)	دور حاضر اور اردو غزل گوئی	ڈاکٹر عبد الباقی شادانی ایم۔ اے۔ ڈی۔ ایچ۔ ڈی۔	(۴۵)
(۹)	قاضی فخر الاسلام	"ماض و حاض"	(۴۹)
(۱۰)	مونی	جناب غلام عباس (مولوی)	(۵۲)
(۱۱)	میرے حبیب	جناب الطاف شہیدی	(۵۷)
(۱۲)	عورت کے حقوق	جناب مرزا سیف علی خاں صاحب	(۵۸)
(۱۳)	روایتی شہین پر	جناب محمد کیم (جامعی)	(۶۲)
(۱۴)	شجاعت	جناب نائش دھولوی	(۶۹)
(۱۵)	کوکن کے بونہل	جناب سید ابوظہر بی۔ ایس۔ سی۔	(۷۰)
(۱۶)	تامبا چند جی سے ہندی کی چندی	جناب سید ابوالقاسم	(۷۳)
(۱۷)	غزلیات	جناب کوکب شاہ جہان پوری	(۸۰)
(۱۸)	ہماری تعلیم میں مادری زبان کا درجہ	محترمہ حبشہ سید محمد	(۸۱)
(۱۹)	آرام کھانا	جناب کاظم حیدر آبادی	(۸۳)
(۲۰)	میں اور مجھ	جناب صلاح الدین قریشی دہلوی (فاضل)	(۸۴)
(۲۱)	آپ نے مجھے دیا بدلہ	جناب سید شکر علی ایم۔ اے۔	(۸۷)
(۲۲)	تیرے نبی	جناب گنگا دھرتا قریشی کانپوری بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	(۸۸)
(۲۳)	محبوب کی آمد پر	جناب عظیم سید ظفر	(۸۸)
(۲۴)	الحباب	جناب سید انصار ناصر بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔	(۹۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگاہِ اولین

باقی ہندوستان کے اکثر تعلیمی محکموں میں منظور شدہ ہے۔ بموجب چٹھی، ۱۱۱۱۱ مورخہ ۲۵ اکتوبر پنجاب کے حکم پر تعلیموں بھی برائے مطالعہ منظور ہو گیا ہے۔ اطلاعاً یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

”دورِ حاضرہ اور اردو غزل گوئی“ کی پہلی قسط شائع ہونے کے بعد ہی یہ افسوسناک خبر آئی کہ ڈاکٹر محمد نبی شادانی کی رفیقہ بیچنے سے سترہ دن کی غصہ علالت کے بعد انتقال کیا۔ اس اچانک سانحے نے پردیس میں ڈاکٹر صاحب پر قیامت توڑ دی۔ کچا ساتھ۔ نئے نئے بچے بچوں کو خدا ہی بہتر جانتے کہ کس طرح سنبھالا ہوگا۔ ان کے خیال ہی سے دل کٹتا ہے اب سولے صبر اور دعائے حضرت کے کوئی چارہ نہیں۔ موت کے آگے سب عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کر وٹ کر وٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبرِ رحمت فرمائے۔ احباب فرض کی ایسی مثال ملنی مشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسے جامحہ صدے میں بھی سنا کی کفر و مویش نہیں کیا اور ایسی شدید پریشانیوں کی میں اپنے مضمون کی دوسری قسط لکھ کر نہ بھی۔ ہیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلے میں ناگوار حلیف اٹھانی پڑی ہوگی اس لئے شکر گزار ہوں کہ ساتھ ساتھ ہم معذرت خواہ بھی ہیں۔ بہت اور استقلال کا اتنا اعلیٰ نمونہ کم نظر آتا ہے۔

مرزا بیگم علی خاں صاحب نے عورت کی تعلیم و تربیت اور اس کے حقوق کے سلسلے میں بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں یہ مضامین توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ دسمبر میں ان کا ایک اور مضمون اسی موضوع پر شائع ہونے والا ہے۔ ناظرین منتظر رہیں۔

جناب مرزا عظیم بیگ جنتانی کی علالت ہمزوار رہی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے معالج نے انہیں خطوں کے جواب تک لکھنے سے منع کر دیا ہے، اس لئے سنا کی کے دریغ وہ ان سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اذرا و ہمدردی اظہار خطوط لکھے ہیں۔

سالانہ سنا کی جنوری مستند میں چند بے مثل مضامین شائع ہونے والے ہیں۔ ان کی مفصل فہرست آئندہ پرچے میں پیش کی جائیگی۔ دو تین کے نام سن لیجئے۔

”سیکھتہ“ بحال ترجمہ از مولانا غایت اللہ دہلوی۔ ”فنِ انسانہ نویسی“ از جناب ل۔ احمد۔ اکبر آبادی۔ ”نعرۃ انقلاب“ از قاضی نذر الاسلام۔ مترجم اختر حسین رائے پوری۔ ”خواب گریز یا“ از گائدرودی، مترجم شرمادق الخیری دہلوی۔ ”فردوس گمشدہ“ از طین۔ پہلی دو کتابوں کا ترجمہ۔

ہمیں افسوس ہے کہ نقد و تبصرہ کا حصہ اب کے بھی شامل نہ ہو سکا۔ دسمبر کے پرچے میں امید ہے کہ مطبوعات موصولہ پر ہمارا اظہار خیال کر سکیں گے۔ اس تاخیر پر پلہ زری سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

شاہد



سمبلین

جو تھا منظر۔ برطانیہ کا ایک قید خانہ

پوسٹی مس اور دو جیلز آتے ہیں

بلا جیلر۔ بجلا اب نہیں یہاں سے کون چوری میں بچا
سکتا ہے۔ تم یہ تو قفل جڑوئے گئے ہیں۔ جہاں چارہ لے
رہیں جرتے رہو۔

دوسرا جیلر۔ بٹہ طیکہ بھوک ہو۔

(دو نوں چلے جاتے ہیں)

پوسٹی مس :- اے قید زندان تو میرے لئے مبارک ہو۔
تو ہی آزادی حاصل کر سکا راستہ ہو۔ اے میرے ایمان
اور اے میرے ضمیر تو نے مجھے زنجیروں میں اتنا جکڑا ہو
کہ یہ ہاتھوں کی ہتکڑیاں اور پاؤں کی بیڑیاں بھی
مجھے اتنا جکڑے نہیں ہیں۔ اے آسمان کے خدا تو تم مجھے
توبہ و ندامت کا وہ آلہ دو کہ جس سے میں ان زنجیروں
کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں، کیا یہی کہنا کافی ہو گا کہ جو کچھ
ہوا اُس پر افسوس ہے۔ اور جس طرح دنیا میں ماں باپ
بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ خدا غفور و رحیم ہے، اور دہی
ہمارے گناہوں کو بخشنے والا ہے میں بھی صبر کر کے
بیٹھ جاؤں۔ یا میں توبہ کروں، ندامت و پشیمانی ظاہر
کروں۔ نہیں ان سب باتوں سے تو یہی بہتر ہے کہ زنجیروں
میں گسٹا پڑا ہوں۔ یہ زنجیریں پابند نہیں کرتیں کیونکہ
وہ تو میری خواہش کے مطابق ہیں اگر وہ حالی آزادی
کے لئے ہی جبری ضروری ہیں تو پھر اے خدا اس سے
زیادہ مواخذہ نہ کر کہ جو کچھ میں رکھتا ہوں وہ سب مجھے
لے لے۔ خداؤ! مجھے علم ہے کہ تم ہر انسان سے زیادہ

رحم رکھتا ہو انسان اپنے قرضہ اردوں سے قرضہ کا تہاں یا چٹایا
دسواں حصہ لیکر باقی اُن پر چھوڑ دیتا ہو کہ وہ پھٹے پھوٹے
رہیں۔ میرے لئے یہ بھی کافی نہیں۔ ایمو جن کی جان کے بدلے
میری جان لے لو میری جان اتنی گراں قیمت نہیں ہے جیسے
کہ ایمو جن کی جان تھی، مگر پھر یہی وہ ایک جان ہے، خداؤ!
تمہارے ہی ہاتھوں کی وہ ایک چیز تھی۔ چھوٹے سٹے لینے
میں کون ان کو پرکھتا ہے۔ صرف چہرہ شاہی دیکھ کر انہیں
قبول کر لیتے ہیں۔ پھر اس صورت کو قبول کرو۔ وہ میری نہیں
تمہاری ہی مشیہ ہے۔ بس لے آسمان کی توتو! اگر اس
طرح حساب کرنا ہے تو یہ جان لے لو۔ اور ان سردار بھاری
زنجیروں کو کھول دو۔ ایمو جن میں تجھ سے ہم کلام ہوں گا۔
مگر زبان سے کچھ نہ کہوں گا۔

(موسیٰ کی بیوہ امینہ کی جاتی ہیں) پوسٹی مس کے
باپ اسکیلیوس کیو تو اس کی روح ایک غبار کی شکل میں نظر
آتی ہے یہ روح ایک بڑے مرد و عمر کی ہے اور ہاتھ میں ہاتھ
دئے ایک بڑھیا عورت اس کے ساتھ ہے یہ اسکیلیوس
کی بیوی اور پوسٹی مس کی ماں ہے۔ ان کے آگے آگے موسیٰ
ہے اور ان کے بعد لیوئی تھی یعنی پوسٹی مس کے دونوں بھائی
ہیں اور ان کے جسموں پر زخم ہیں کیونکہ وہ لڑائی میں کام
آئے تھے پوسٹی مس قید خانہ میں زمین پر پڑا سوتا ہے یہ
سب روحیں اس کے گرد حلقہ باندھ کر گھڑی ہو جاتی ہیں!
اسکیلیوس :- اے برق و رعد کے مالک بس کر۔ انسان
غریب جان ہو، وہ تیری نظروں میں اتنا ہی کمزور اور بے حقیقت
ہے جیسے اُس کی نظروں میں کتلیاں ہوں۔ اس غریب کیا ہوگا

گیا۔ اور کیوں اسکو اس چنیرے جو اسکو سب سے زیادہ عزیز تھی حسین ایجو جن سے جھڑا کر دیا۔

اسکیلیوس :- اور تو اُٹلی کے کہنے اور ذلیل آدمی یا جیمو کیا وجہ تھی کہ تو نے یوستی مس کے شریف دل و دماغ میں ایجو جن کی طرف سے ہنگامی پیدا کی جس سے کوئی فائدہ نہ نکلا۔ تو نے اپنی جانت کا اُسے نشانہ بنایا اور بس۔

دوسرا بھائی :- اور اسی لئے ہم یعنی اس کے والدین اور دونوں بھائی اپنے امن و عافیت کا مسکن چھوڑ کر یہاں آئے ہیں اور ہم دونوں بھائی وہ ہیں۔ جو اپنے ملک کی محبت میں دشمن سے جان توڑ کر لڑے تھے اور اسی میں مارے گئے تھے۔ ہم بادشاہ کی ناتوس کے حقوق کے حامی اور اسکی عزت کے ہمیشہ خواہاں رہے تھے۔

پہلا بھائی :- اور اسی طرح ہمارے بھائی یوستی مس نے بادشاہ سمبلیکین کے لئے سخیایاں اٹھائیں تو پھر اسے خداؤں کے خدا جو پیتھ تو نے کیوں اُس کے نیک کاموں اور حقوق کی طرف سے اپنی نظر مہربانی اور اس کی نیکیوں کی جزا میں انوار کر رہا ہے۔

اسکیلیوس :- بس اسے جو پیتھ اپنے قصر بلورس کا دریا کھولوں اور باہر دیکھ اور اتنا سخت نقصان اپنی ایک بہادر قوم کو نہ پہنچا۔

ماں :- جو پیتھ! ہمارا فرزند نیک ہے۔ اس کی مصیبتوں کو دُور کر دے۔

اسکیلیوس :- جو پیتھ! اپنے قصر مریس سے جھانک ہمارے مددگار، ورنہ پھر ہم روجس رُور کو رکھیں اور باب فلک کی گن میں تیری خدائی کے خلاف فریاد کریں گے۔

دونوں بھائی :- جو پیتھ! ہماری مددگار۔ ورنہ ہم تیرے نصفا سے بھاگ کر کسی بڑی عدالت میں تیرے فیصلے کا مراجعہ کریں گے۔

مقابلہ کرنا۔ لڑنا ہے تو نزلے جنگ دَاس سے لڑنا شکایت کرنی ہے تو دیہی جو توستے کر جو تیری ریا کاریوں پر تجھے طاعت کرتی ہے اور تجھ سے انتقام کے درپے رہتی ہو میرے اس عزیز فرزند نے سولے نیکی کے اور کچھ نہیں کیا اور یہ فرزند وہ ہے جس کی صورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی جس وقت یہ رحم مادر میں فطرت کے وقت موعود کا منتظر تھا تو میں مڑچکا تھا اور جس وقت دُنیا میں وہ آیا اُس وقت کوہی اُس کا باپ تھا، دُنیا کہتی ہے کہ تھیموں کا باپ تیرے سوا دوسرے نہیں۔ پس باپ بن کر تو نے اُسے دُنیا کی آفات سے بچایا ہوتا۔

ماں :- کو کینا دیہی جو بچوں کو پیدا کر کے دُنیا کی روشنی انہیں دکھاتی ہے تو نے میری مدد نہ کی اور دروازہ کی حالت میں مجھے دُنیا سے اٹھا لیا اُس حال میں یوستی مس نے میرے بطن سے نکل کر رو کر دُنیا کے دشمنوں میں قدم رکھا۔ یہ سچہ اس وقت واجب الرحم تھا۔

اسکیلیوس :- فطرت نے اس بچے کی صورت شکل اس کے بڑوں کی طرح ایسی اچھی اور پاکیزہ بنائی تھی کہ دُنیا اُس کی تعریف کرتی تھی اور اُسے لیونتی کی نسل سے کہہ کر بکار تھی اور اسے شیریں میوہ سمجھ کر اس کے حاصل کرنے کے درپے رہتی تھی۔ ایجو جن کی نظر میں اس کی قدر و قیمت بہت تھی۔

پہلا بھائی :- جب وہ جوان ہوا تو برطانیہ میں جہاں وہ رہتا تھا دوسرا اس کے مثل نہ تھا اور ایجو جن کا جس سے بڑھ کر کوئی اس کی قدر و قیمت نہ جانتا تھا وہ منظور نظر ہو گیا۔

ماں :- تو پھر شادی کرنے پر کیوں لوگ اُس کے دشمن ہو گئے اور اُسے جلا وطن کر دیا گیا اور لیونتی کے درجے سے گرا دیا

آسمانی نفس میں گندھک

۱۱۱

طرف دیکھتا تھا۔ گویا اپنے پر پر۔

کا اونچا اُڑ کر وہاں جانا جہاں جو پتھر ہوتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جو ہمارے مبارک مسکن سے بھی زیادہ حسین اور برکت والا ہے۔ یہ گل باتیں ہمارے حق میں مُقید ہوئی ہیں اور یہ شاہی برندہ جب منقار سے اپنے لازوال ہرول کو صاف کرتا ہے تو یہ وقت وہ ہوتا ہے جب اُسکا مالک اُس سے خوش ہوتا ہے۔

سب ملکر کہتے ہیں :- جو پتھر اہم سب تیرے مُشکر گذار ہوئے۔

اسکی لیوس :- عرض کا فرش مریں جہاں سے شق ہوا تھا وہیں جو گیا یعنی جو پتھر اپنے نورانی قصر میں پہنچ گیا ہیں اب یہ سختی اُس کے محکم کے مطابق پستی مس کے سینہ پر رکھ دینی چاہیے۔

(روحیں غائب ہو جاتی ہیں)

پستی مس :- (جاگ اٹھتا ہے) یہ نیند تو میرے حق میں میرا دادا بن گئی۔ تو ہی نے میرے باپ کو مجھ پر ظاہر کیا اور تو ہی نے میری ماں اور دونوں بھائیوں کو زندہ کر دکھایا۔ مگر وہ اے بد قسمتی، صورتیں دکھا کر وہ چلے گئے۔ پیدا ہوتے ہی فنا بھی ہو گئے۔ وہ قسمت کے مارے جو بڑے لوگوں کی خوشنودی پر جیتے ہیں اُن کو ایسے ہی خواب نظر آیا کرتے ہیں جیسے کہ مجھے اس وقت نظر آیا تھا۔ یعنی بیدار ہوتے ہی کچھ نہیں رہتا۔ گویا صیبا زدہ کسی لائق نہیں ہوتے پھر بھی اُن پر نوازشاتِ معنا بکثرت ہوتی ہیں اور یہی حال میرے کہ ایسا زیرِ لطف میرے لئے پیدا ہوا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں ایہ ہوا کہ میں ہریوں کا گند تو یہاں نہیں ہے۔ بائیں پیٹھ

(جو پتھر ایک عقاب پر بیٹھا آسمان پر ظاہر ہوتا ہے۔

کرک بھلیوں میں سے ایک خدنگ آتشیں کونشا نہ بنا کر زین پر لگا تا ہے۔ روحیں سب دوزخ ہو کر نئے تعلیم دیتی ہیں) جو پتھر :- بس خاموش۔ اسے طبقہ آسفل کی رُوح! چُب رہو۔ تم کیونکر مجھ کرکٹے کرکٹے والے پر الزام رکھتی ہو میں وہ ہوں جس کا خدنگ آتشیں آسمان سے چھوٹ کر تمام باغی ساحلوں کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ اسے عرش کی پرچھائیں تم پھولیوں کے تنوں کو جہاں پھول کبھی نہیں نکلتے واپس جاؤ۔ اور دُنیا کے مکروہات سے اپنے تئیں پریشان نہ کرو۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ تمکو معلوم ہے

کہ یہ سب کام ہمارے ہیں جن سے ہمیں زیادہ محنت ہوتی ہے اور ہم تم بھلیہیں ڈالتے ہیں اور انکو اُن کے نیک کاموں کا اجر دیتے ہیں تاخیر کرتے ہیں کہ لینے والے کو یہ اجر اور گراں بہا معلوم ہو۔ تمہارا فرزند جو سوقت

مہیبت میں ہے اسکو ہم پھر سرا فرما کر بیٹے۔ راحت آرام پھر اسکو دیا جائیگا اُس کی آزمائش پوری ہو چکی ہے۔ ولادت کے وقت وہ ہمارے ستارے کے عمل میں تھا۔ اور ہمارے ہی ہیکل میں اُس کی شادی رچی تھی۔

بس اٹھو اور غائب ہو جاؤ۔ تمہارا فرزند خاتونِ لیون کا مالک اور شوہر ہو گا اور اس وقت کی مہیبتیں اسکے زیادہ عیش و آرام کا موجب ہو گی، یہ سختی ہم تمیں دیتے ہیں۔ اسے پستی مس کے سینہ پر رکھ دو اس سختی پر ہم

نے اپنے رحم و کرم سے اس کی اچھی قدر لکھ دی جو بس اب جاؤ۔ شکوہ و شکایت کے شور سے اپنی بیخبری ظاہر نہ کرو۔ کیونکہ اس بات سے ہمیں غصہ آتا ہے۔ اسے عقاب

اب اونچا اُڑاؤ اور ہمیں ہمارے قصر بلوریں میں پہنچا دے۔ اسکیلیوس :- وہ کرک بجلی کے ساتھ نمودار ہوا اُس کے

کہتا ہے جو پہلے لٹکا دیا گیا ہو۔

پلوسی مس:- اگر تماشائیوں کے لئے عمدہ غذا ثابت ہو تو پھر کھانے کے دام پورے وصول ہو جائیں گے۔

پہلا جیلر:- مگر آپ کو تو بڑا بھاری حساب چمکانا ہوگا۔ مگر اس میں سہولیت یہی ہوگی کہ آپ کو کچھ دینا نہ پڑے گا۔ اب شراب خانہ کے بلوں کا آپ کو کیا ڈر ہے۔ شراب کے دام دیتے وقت اتنا ہی افسوس ہوتا ہے جتنا کہ اس کے ہتیا کرنے کے وقت مسرت ہوتی ہے۔ پہلے تو آپ فاقوں کے مارے غش پر غش کھاتے آتے ہیں مگر جب واپس جاتے ہیں تو خوشیوں میں جھومتے ہوئے جاتے ہیں، افسوس ہے تو اس کا ہے کہ آپ کو بہت کچھ دینا پڑا اور بہت کچھ لینا بھی پڑا۔ دماغ بھی اندر سے کہو کلا ہوا اور جیب بھی خالی ہوئی۔ سر تو بوجھل اس وجہ سے ہوا کہ عقل ہلکی پڑ گئی تھی اور جیب یوں ہلکی ہوئی کہ سر بوجھل ہو گیا تھا۔ اب ایسی متفاد باتوں سے آپ فانی ہوئے مگر کیا بات اس دھڑکی کی رستی کے ٹکڑے کی کہ آٹا فانا میں ہزاروں کا حساب بیباق کر دیا۔ اس رستی کے ٹکڑے کے برابر کوئی بھی کہتا نہیں قرضہ جو کچھ تھا یا اب ہے یا آئندہ ہوگا اس میں دام و وصول ہو گئے اور جب یہی حساب کتاب آپ کی گردن کے لئے تختہ بنا تو پوری رسید ہی آپ کو مل گئی۔

پلوسی مس:- میں مرے سے اتنا خوش ہوں کہ تو زندہ رہنے سے نہیں ہو سکتا۔

پہلا جیلر:- واقعہ یہی ہے۔ انسان جو سوتا ہوتا ہے اُسے سونے میں ڈاڑھ کا در و کب معلوم ہوتا ہو مگر جو شخص آپ کی نیند سونے کا اور ملازمت میں ایک جلا دہی ہوگا تاکہ آپ کو آپ کے بستر تک پہنچائے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ آپ جلا دے اور جلا دے اپنی جگہ بدلنی چاہیے کیونکہ آپ کو

یہ کسی نادرونا باب شے معلوم ہو رہی ہے لیکن اس خیالی دنیا میں تو کوئی ایسا لباس نہ ثابت ہو جو جو پہننے والے سے بہتر ہو، نیز اضمون اور اس کے اثرات ہمارے درباریوں کی خصلت سے مختلف ہوں اور جن باتوں کا وعدہ اس میں ہو وہ وعدہ ایسا ہو جائے.....
رستمی کا مضمون پڑھتا ہی، جب کوئی شیر ببر کا بچہ، جسے نہیں معلوم کہ فی الواقع وہ بچہ شیر ہے بلا جست و تلاش معلوم کر لیا کہ ہاں وہ ایسا ہی ہے اور وہ امن سلامتی کی فضا میں اپنے ننھے بانیگا۔ اور جبکہ ایک فیض انسان شجر صنوبر کی شاخیں جو کاٹ دی گئی تھیں اور اسبابا سال سے مردہ بڑی تھیں پھر سرسبز ہو کر اپنے اصل درخت میں پھوٹ کر بڑھ گئی۔ اس وقت پلوسی مس کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی اور برطانیہ پھر خوش قسمت بنکر امن اور نعمتہائے فراوان میں پھولے پھلے گا۔ مضمون تو وہ ہے جسے کوئی مجنوں بھی زبان پر لا نیکو دماغ سے نہیں نکال لیتا۔ بایہ محض خواب ہے یا کسی دیوانے کی بڑ ہے۔ یا دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ یا پھر یہ ایک مہل تقریر ہے۔ یا کوئی ایسی بات ہے جس کی شرح عقل نہیں کر سکتی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو۔ میری زندگی کے سرکام اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس لئے محض ہمدردی کے خیال سے اُسے اپنے پاس رکھتا ہوں۔

(دونوں جیلر پھر اندر آتے ہیں)

پہلا جیلر:- اے جناب والا، موت کیلئے تیار ہو جاؤ۔ پلوسی مس:- تیار ہونا کیسا، میں تو انتظار میں ٹھنا جاتا ہوں۔ موت کیلئے تیار تو میں مدت سے ہو چکا ہوں۔

پہلا جیلر:- حکم پھانسی پر چڑھنے کا آیا ہے۔ اگر آپ ایسے لئے تیار ہیں تو خاصے بچے بھناتے ہیں گوشت دی اچھا

یہ معلوم نہ ہوگا کہ آپ کو کس طرف جانا ہے۔

پڑتے ہیں۔

پوستی مس :- نہیں مجھے سب معلوم ہے۔

پہلا جیلر :- تو پھر سمجھنا چاہیے کہ آپ کی موت کے سر میں آنکھیں ہیں۔ میری نظر سے موت کی کوئی تصویر ایسی نہیں گذری تو پھر کوئی ایسا شخص آپ کو راستہ بتا دے گا جو راستہ معلوم کرنا اپنے ذمہ لیکنا یا پھر آپ اپنے ذمہ وہ چیز لیں گے جس کا علم آپ کو نہیں ہے یا پھر اس تحقیقات کو آئندہ پر چھوڑ دیتے۔ اور جو خطرہ پیش آئے اسے برداشت کریں گے۔ یہی یہ بات کہ آپ منزل تک کیونکر پہنچے تو ظاہر کہ منزل تک پہنچنے کا حال آپ کب بتائے آتے ہیں۔

پوستی مس :- جیلر سن۔ کوئی ایسا نہیں ہے جس کے پاس اس رستے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ہوں جس رستے اب میں جانے والا ہوں سوائے اُن کے جو آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دیکھتے نہیں۔

پہلا جیلر :- بھلا اس سے بڑھ کر اور کیا تم سحر ہوگا کہ منہ پر آنکھیں ہوں مگر وہ من ظلمت کا راستہ دیکھنے کے لئے ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ پھانسی پانا ہی آنکھیں بند کر کے راستہ ڈھونڈھنا ہے۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد :- جیلر! قیدی کی ہتکڑیاں فوراً کاٹ دو اور اُسے بادشاہ کے سامنے حاضر کرو۔

پوستی مس :- قاصد تم خراجی لائے میں آزاد کئے جانے کے لئے طلب کیا گیا ہوں گا۔

پہلا جیلر :- تو پھر کیا پھانسی پر میں چڑھایا جاؤنگا۔

پوستی مس :- تو پھر تم بھی جیل کی خدمتوں سے آزاد ہو جاؤ گے۔ مُردوں کو کہاں دروازے بند کرنے قفل لگانے

(سب چلے جاتے ہیں صرف پہلا جیلر رہ جاتا ہے)

پہلا جیلر :- یہ بات تو اور ہے کہ کوئی پھانسی سے بیاہ کر کے چھوٹی چھوٹی پھانسیاں پیدا کرے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی مجرم کو مرنے پر اس درجہ آمادہ نہیں دیکھا تھا۔ ایاں سے کہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر بدعاش ہی نہیں جانتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ ان میں چاہے کوئی رومانی ہی کیوں نہ ہو مگر اُن میں چند ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنی مرضی کے خلاف مرنا پڑتا ہے اور یہی حال میرا ہوگا اگر مجھے پھانسی کا حکم ملے۔ کاش سب کی طبیعت ایک سی ہوتی اور طبیعت ہی اچھی ہوتی تو پھر پھانسیوں کی ضرورت ہوتی نہ پھانسی دینے والوں کی۔ یہ بات میں اپنے پیٹھ کے خلاف کہہ رہا ہوں مگر دل ہی چاہتا ہے کہ پھانسیاں موقوف ہو جائیں۔

پانچواں منظر :- سمبلین کا شاہی خیمہ۔

سمبلین، بلار یوس، گد ریوس، اور بیر یوس۔

پسانیدہ اور اصرار اور بارود حکام سرکاری اور

طائرین کے داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین :- آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔ خداؤں کو یہی منظور تھا کہ تم ہماری جان بچانے والے ثابت ہو مگر اس وقت افسوس ہے کہ وہ غریب مفلس سپاہی جو لڑنے میں جان کھوئے والے تھے اور جس کے عشق کے ساتھ بڑے بڑے چمکتے ہتھیار رکھنے والے شرمندہ اور شغل ہوئے جاتے تھے اور جو اپنا برہنہ سینہ بڑھانے اُن لوگوں کے مقابل آتا تھا جو اس کے

فریق کے آدمی تھے اور جن کے پاس ایسی مضبوط ڈھالیں تھیں کہ کوئی ہتھیار اُن پر اثر نہ کر سکتا تھا وہ کہیں نہیں ملتا تلاش کرنے پر بھی اُس کا ہتہ نہیں چلتا جو شخص اُسے ڈھنڈکا

لائیگا وہ ہلکے انعام کا کرامت مستحق ہوگا۔

بلار یوس :- ایسے ادنیٰ آدمی میں ایسا شریفانہ عقد میری نظر سے کبھی نہ گذرنا تھا ایک ایسے ادنیٰ آدمی سے جس سے سوائے اس کے یہ توقع نہ تھی کہ وہ سوال کرے ہاتھ پھیلانے یا افسردہ نظروں سے خالی بیٹھا ہے۔ ایسے سجاوٹ کے کام ہونے پر حیرت ہوتی ہے۔

سمبلین :- اس کی کچھ خبر نہ آئی ؟

پسائیو :- حضور ! اُسے مردوں اور زندوں دونوں میں تلاش کیا جا رہا ہے مگر ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔

سمبلین :- تو پھر جس انعام کا وہ مستحق ہو اس کا وارث میں خود ہی رہا بلار یوس اور اریویرنگس سے مخاطب ہوتا ہے، اور تم جو برطانیہ کا دل و دماغ، قلب و جگر ہو ہم تمہاری قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ تمہاری ہی وجہ سے اس وقت برطانیہ زندہ بچا اور اب وقت ہے کہ میں دریافت کروں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ ضرور اتنا مجھے بتائیے۔

بلار یوس :- شاہ ! علاؤ الدین ہمارا مولد ہے گھرانے کے ہم شریف ہیں اس کے سوا کسی بات پر فخر کرنا نہ تو درست ہوگا اور نہ شرم و حیا اس کی اجازت دیتی ہو اتنا البتہ کہتا ہوں کہ ہم سب ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔

سمبلین :- زمین پر گھٹنے ٹیکے اور لڑائی کے ناٹھ بن کر اُٹھیں۔ میں آپ کو آج سے اپنی جان اور ذات کا محافظ و نگہبان مقرر کرتا ہوں اور آپ سب کو حسب حیثیت انعام و اکرام سے مالا مال کر دینگا۔

(کوئیلیوس طبیب اور چند خواہیں آتی ہیں)

کوئیلیوس :- زندہ بادشاہ عالیجاہ ! حضور کی خوشی کو سننے کرنے کے لئے یہ عرض کرنا ہے کہ ملکہ گذر گئیں۔

سمبلین :- جب طبیب ایسی خبر دے تو پھر اس سے بدتر خبر کیا ہو سکتی ہے میں سمجھتا تھا کہ علاج اور دوا سے ابھی ملے کچھ اور زندہ رہیں گی۔ مگر موت تو وہ ہے جو ایک دن طبیب کی جان ہی قبض کر لے گی۔ انتقال کس طرح ہوا۔

کوئیلیوس :- حالت جنون میں سخت درد و عذاب کے ساتھ جان دی۔ اور وہ زندگی جو دوسروں کے حق میں جو رد و ظلم کی تھی اب مرنے والی کے حق میں ایسی ہی موزی ثابت ہوئی۔ مرتے وقت جن باتوں کا انہوں نے اقرار کیا اگر حکم اور اجازت ہو تو عرض کروں ؟ ملکہ کی یہ خواہیں حاضر ہیں اگر میرے بیان میں کوئی غلطی ہوگی تو یہ اس کی صحت کر دینی۔ یہ خواہیں رخساروں کو آنسوؤں میں تر کئے اُس وقت موجود تھیں جبکہ ملکہ کا دم نکلا ہے۔

سمبلین :- ہاں مہربانی کر کے ضرور بیان کرو۔

کوئیلیوس :- سچی بات جس کا ملکہ نے مرتے وقت اقرار کیا یہ سچی کہ انہیں آپے مطلق محبت نہ تھی جو کچھ محبت تھی وہ اُس شان اور بزرگی کی تھی جو حضور کی وجہ سے انہیں حاصل تھی۔ آپ کی ذات سے انہیں مطلق الفت نہ تھی شادی انہوں نے آپ سے نہیں بلکہ حضور کی بادشاہی سے کی تھی اور وہ بیوی و راصل آپ کی نہ تھیں بلکہ آپ کے منصب اور درجے کی تھیں اور حضور کی ذات سے انہیں نفرت تھی۔

سمبلین :- اگر یہ باتیں وہ اپنے دل ہی میں رکھتی اور مرتے وقت زبان پر نہ لاتی تو اس کے کہنے پر ہی مجھے یقین نہ آتا۔ اور کیا کہا ؟

کوئیلیوس :- آپ کی بیٹی جس سے جہوئی محبت ظاہر کر کے ہمیشہ بڑی ہوشیاری سے اُسے دھوکے دیتی رہی تھیں اُسے بالحد میں اپنی زبان سے کہا کہ وہ اُنکی نظر میں عقرب کے کم نہ تھی اتفاق سے وہ چلی گئی تھی در نہ زہر دیکھ لے ہلاک کر دیتیں۔

ثابت کر سکتی ہے۔ خدا سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ یہ سب باقیں درست کر دیگا۔

(لیو کوس رومانی سپہ سالار، نجومی اور

رومانی اسپران جنگ جگے گرد پیر الکا ہواندر

آتے ہیں انکے پیچھے پیچھے پستی سس اولیونجن

ہیں۔)

کاسیس لیو کوس :- اس وقت تو تم ہم سے خلیج طلب کرنے نہیں آئے ہو پسے اب برطانیہ والوں نے یخچل منسوخ کر دیا ہے۔ گو اس میں ان کے بڑے بڑے بہادروں کی جانیں تلف ہوئی ہیں جو بہادر اس معرکہ میں کام آئے ہیں انکے عزیزوں اور رشتہ داروں نے درخواست دی ہو کہ انکے مرعوں کی رُوحوں کو آرام دینے کے لئے ہم حکم جواب انکے امیر ہو قتل کر دیں۔ ہم نے انکی درخواست منظور کر لی ہے۔ اب تم اپنی حالت پر غور کرو۔

لیو کوس :- آپ خود غور فرمائیے یہ تو لڑائی کے اتفاقات ہیں۔ یہ اتفاق تھا کہ فتح آپکو ہوئی اگر ہم فحیاب ہوتے تو غفہ ٹھنڈا ہونے پر اپنے قیدیوں پر تلوار ہرگز نہ چلاتے لیکن جب خداؤں کی یہی مرضی ہے کہ تجز ہمار ی جانوں کے اور کوئی چیز نہیں نہ بچانے تو پھر جو مرضی ہے وہی ہونے دیجئے۔ ایک رومانی کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ایک رومانی کی طرح صبر و استعقال سے جان دے۔ فیصلہ غلط زندہ ہو اور وہی اسبات پر غور کریگا کہ ہم پر کیا گذری۔ یہاں تک تو مجھے اپنی ذات کے باسے میں کہنا تھا اب صرف ایک امر میں حضور سے خاص طور پر عرض کرتا ہوں یہ لڑکا جو میرا ملازم ہے برطانوی ہے وہ اسی ملک کی پیدائش ہے۔ اس کے لئے زلفہ یہ لیکر آئے رہا کر دیا جائے۔ دنیا میں کبھی کسی آقا کو ایسی محبت کا آدمی جسے اپنے فرائض منصب کا

سمبلین :- اے نازنین دنازک ترین ڈاٹن۔ عورت کے دل کا حال کسے معلوم ہو سکتا ہے۔ کچھ اور بھی کہا؟

کورنیلیموس :- حضور اور یہی کہا اور کچھ کہا وہ اس سے بھی بدتر تھا مرنے وقت بیان کیا کہ اس کے پاس ایک ایسا زہر تھا جس کے کھانے سے کھانے والے کی زندگی ہر آن اور ہر لحظہ کم ہوتی جاتی ہے۔ موت رفتہ رفتہ آتی ہو اور اس زمانے میں کہ زہر تیریغ حضور پر اثر کرے۔ اسکا مقصد تھا کہ روڈ کر آپ کی تیمارداری میں مصروف ہے کبھی آپکے ہاتھ جوئے اور کبھی پاؤں تاکہ آپکا دل اس کے مصنوعی اور جھوٹی ہمدردی سے متاثر نہ رہے۔ اور جب آپکے مرنے کا وقت آئے۔ تو اپنے پیچھے کو آپکا متینہ قرار دے کر تاج برطانیہ کا وارث بناوے لیکن اپنے بیٹے کے یہاں سے غائب ہو جانے پر اس کا بیچ وغفہ اتنا بڑھا کہ شرم و حیا بالکل جاتی رہی نہ دل میں خدا کا خوف رہا نہ انسان کا اور اپنے سے سب منصوبے زبان پر آئی اور جو جو خرابیاں اس نے سوچ رکھی تھیں جب وہ پوری نہ ہوئیں تو فحیل اور داپس ہو کر مر گئی۔

سمبلین :- خواہوں کیا تم نے بھی یہ سب کچھ سنا۔ سبھی خوش :- حضور! ہم نے اپنے کانوں سے یہ سب کچھ سنا۔ سمبلین :- میری آنکھوں کا قصور نہ تھا کیونکہ وہ واقعی حسین تھی۔ اور نہ میرے کانوں کا قصور ہو کہ اس کی خوشنود اور چالپوسی کی باتیں مستعار ہوجوئی تحقیقت نہایت دلکش اور پرافر تھیں اور نہ دل کی خطا تھی کہ اس کے ظاہر کو اچھا دیکھ کر اس کے باطن کو بھی اچھا سمجھا کیونکہ اس حالت میں اس کا اعتبار نہ کرنا ایک قسم کا گناہ ہوتا لیکن اے میری پیاری بیٹی! تو اپنے دل میں یہی کہتی ہوگی کہ یہ سب میری حماقتیں تھیں جسکا کھافت ہونا تو اپنے تجربے سے

لیو کوس :- افسوس۔ یہ لڑکا اب مجھ سے بے اعتنائی کرنے لگا علیحدہ ہوتے ہی مجھ سے نفرت ظاہر کرنے لگا۔ سچ ہو ان کو مسرتیں باہل عارضی ہوتی ہیں جو لڑکوں یا لڑکیوں کی جتن پر بکھر دسہ کریں مگر معلوم نہیں یہ لڑکا اس وقت کیوں اتنا پریشان ہے۔

سمبلین :- اے لڑکے بتا تو کیا چاہتا ہے۔ مجھے تو تجھے ہر محنت پر ہستی جاتی ہے تیرا خیال بار بار آتا ہے جو کچھ تیرے دل میں اس وقت ہو اسے خوب سچ سمجھ لے جدھر تو دیکھ رہا ہے کیا وہاں کوئی چیز درکار ہے۔ کیا اس آدمی کی جان بچانا چاہتا ہے کیا وہ تیرا کوئی عزیز یا خیر طلب ہے۔

ایموجن :- حضور جس کی طرف میں دیکھ رہا ہوں وہ ایک رومانی ہے اُس سے مجھ سے کوئی قربت نہیں ہو اور اگر ہے تو اتنی ہی ہے جقدر کہ مجھ میں اور حضور میں ایک جگہ میں حضور کی رعیت ہوں اس وجہ سے میں بہ نسبت اسکے حضور سے زیادہ قربت رکھتا ہوں۔

سمبلین :- تو کیوں اُدھر غور سے دیکھ جاتا ہے ؟ ایموجن :- اگر حکم ہو تو حضور سے کچھ علیحدہ عرض کرنے کی اجازت ہو۔

سمبلین :- بڑی خوشی سے جو کچھ تو کہے گا ہم اُسے بغور سنیں گے۔ تیرا نام کیا ہو۔

ایموجن :- حضور! مجھے فیدلی کہتے ہیں۔

سمبلین :- اے نیک لڑکے تو بہارِ غلام ہو اور ہم تیرے آقا ہیں۔ آہا اے ساتھ چل اور جو کچھ تجھے کہنا ہو وہ کہہ۔ (سمبلین اور ایموجن علیحدہ کچھ بات چیت کرتے ہیں)

بلار یوس :- کیا یہ لڑکا مگر کچھ زندہ ہوا ہے۔
ارویر تجس :- ریت کا ایک ذرہ دوسرے ذرہ سے اتنا شگفتا

اسد رجب خیال ہوا اتنا سختی اتنا جفاکش اور اپنے آقا کی رات و آرام کا خیال کرنے والا سچا وفادار! ہمہ وقت خدمت کو حاضر و آمادہ پہنچانے میں ریشل بچے کی دایہ کے ہرگز کبھی کو نہ ملا ہوگا اُس کی ان خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ میری التجا کو بھی شامل سمجھا جائے جو اس وقت میں نے حضور کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہو اور امید کرتا ہوں میری یہ درخواست نامنظور نہ فرمائی جائیگی۔ اُس نے کسی برطانوی کو نقصان نہیں پہنچایا درحالیکہ وہ ایک رومی کا ملازم تھا۔ حضور اس لڑکے کی جان بخشی فرمائیں اور چاہے کسی کا خون معاف نہ کریں۔ سمبلین :- میں نے اسے کہیں دیکھا ہو اُس کی صورت سے آشنایا معلوم ہوتا ہوں۔ لڑکے ہم تجھ پر ہمسایان ہوئے۔ اور آج سے تو ہمارا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا بات ہے ایسا ختمہ مُنہ سے نکلتا ہے کہ اے لڑکے تو زندہ رہ اور جو جان بخشی تیری کرتا ہوں اسکا احسان ماننے کی تو مجھے ضرورت نہیں۔ جو کچھ تو مانگے گا ہماری فیاضی اور اپنی حیثیت کا خیال کر کے دہی تجھے ہم دینے حتیٰ کہ اگر تو کسی رومانی قیدی کی جان بخشی بھی چاہے گا تو ہم منظور کریں گے۔

ایموجن :- میں حضور والا کا نہایت عجز و انکسار اور ادب کے ساتھ شکریہ گزار رہا ہوں۔

لیو کوس :- لڑکے میں نہیں چاہتا کہ تو میری جان بخشی چلے مگر دل ہی کہتا ہے کہ تو ایسا ہی کر لیا۔

ایموجن :- نہیں، ابھی مجھے کچھ اور کام کرنا ہے اسوقت میں ایک ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسکی تلخی موت کی تلخی سے بھی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ میرے آقا کی جان ہے یا جانے یہ بات بعد کو دیکھنے کی ہے۔

یا چیمو :- میں خوش ہوں کہ اسوقت مجھ سے وہ بات کہلوائی جاتی ہے جسے مخفی رکھنے سے میں سخت حالتِ عذاب میں ہوں۔ سُنئے! یہ انگوٹھی دغا اور فریبِ مہل کی ہے اور یہ ہیر اور اصل لیونٹوس کا ہے جسے حضور نے اپنی ملکیت سے خارج کیا ہے اور آپ کو شکر افسوس ہوگا جیسا کہ مجھے افسوس ہے کہ اُس سے زیادہ شریف و نجیب آسمان کے نیچے اس دُنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ حضور بادشاہِ مملکت اگر واقعات سُننا چاہیں تو عرض کروں۔

سمبلین :- جو کچھ اس خاص امر کے متعلق کہو گے تم نہیں گے۔ یا چیمو :- آپ کی وہ عظیم المثالِ دختر جس کے لئے میرا دل خون روتا ہے اور میری گنہگارِ روح واقعات کو یاد کر کے لرز اُٹھتی ہو اگر ان کی اجازت ہو تو عرض کروں۔ مجھے غش آ رہا ہے۔ سمبلین :- میری دختر؟ یہ کیا بات ہوئی۔ یا چیمو! میں چاہتا ہوں کہ جب تک تمہاری زندگی ہے تم زندہ رہو اور اس معاملے میں جو کچھ مجھے سُننا ہو اس سے پہلے تم مرد و بہت نہ ہارو۔ حواس درست کرو۔ اور جو کچھ کہنا ہو کہو۔

یا چیمو :- ایک زمانہ ہوتا ہوا اور خُس تھی وہ گھڑی جو سر پر آئی کہ شہرِ روم میں ایک گھر میں جس پر خدا کی نعمت ہو ایک ضیافت میں ہم شریک تھے۔ کاش اس ضیافت کے کھانوں میں زہر ملا ہوتا! بالخصوص اُس کھانے میں جو میرے سامنے رکھا تھا۔ پوسٹی مس وہاں افسردہ خاطر بیٹھا تھا۔ اچھا ہوتا کہ ایسے بُرے لوگوں کی صحبت میں نہ ہوتا۔ شریفوں اور نیک بختوں میں وہ بہترین شخص تھا ہوتے ہوتے حسینانِ ملی کی تعریفیں ہم کرنے لگے۔ یہ تعریفیں وہ سُننا رہا۔ ہم اُس کے حسن و جمال کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے تھے اور بجاِ نعت بھی اتنا کرتے تھے کہ جس کی کوئی حد نہ رہی تھی ہم ان کی خوشردی اور تناسیبِ اعضاء کی۔

میں جعفر کہ یہ لڑکا اُس حسین لڑکے سے جس کا نام فیدی تھا ہشکل ہو کیوں بھائی گدیوس؟ تمہارا کیا خیال ہے۔ گدیوس :- یہ تو وہی مُردہ پھر جی اُٹھا ہے۔

بلار یوس :- اچھا ذرا اور غور سے دیکھ لو۔ اسوقت وہ ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے کچھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو آدمی ہشکل ہوتے ہیں اگر یہ فیدی ہوتا تو ہمیں دیکھ کر ضرور بات چیت کرتا۔

گدیوس :- مگر تم تو اُسے مُردہ دیکھ چکے ہیں۔

بلار یوس :- چپ رہو۔ اب ذرا غور سے دیکھ لو۔

پسایمو :- (علیحدہ کہتا ہے) یہ تو میری آٹا ہے۔ وہ اپنی جان سے جیتی ہے اب جو کچھ بھی گڈے گڈے رہ جانے دو۔ (سمبلین اور امجوین کچھ بات کر کے پھرتے ہیں)

سمبلین :- لڑکے ادھر آ۔ ہمارے پاس کھڑا ہو اور جو کچھ مانگنا ہے باؤز بلند مانگ۔ یا چیمو تم آگے بڑھو اور جو کچھ یہ لڑکا پوچھے اس کا جواب دو۔ جواب بالکل صحیح اور صاف ہو۔ ورنہ ہم اپنے دہد بہ شای سے جسے ہمیں عزت دشان بخشی ہے واقعات کی چھان بین کر کے سچ کو جھوٹ سے نکال لیں گے۔ لڑکے تجھے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ ۹

امجوین :- میرا سوال صرف اتنا ہے کہ یہ انگوٹھی جو اُنکے ہاتھ میں ہے انہیں کہاں سے ملی۔

پوسٹی مس :- اس لڑکے کو انگوٹھی سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ سمبلین :- یا چیمو! بتاؤ یہ ہیرے کی انگوٹھی تمہاری انگلی میں کیسے آئی۔

یا چیمو :- میں اس بات کے بتانے سے عذاب میں مبتلا ہو گا اور پھر یہ عذاب آپ کے دردِ عالم کا موجب ہو گا۔

سمبلین :- میرے دردِ عالم کا باعث کیوں ہو گا۔

موجود ہیں اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری نہ ہوا تو یہ شرفیاں
 آپکی ہیں ورنہ آپ کی انگلی میری جو جائیگی۔ مگر پستی مس
 بڑا سچا آدمی تھا اور اسکو اپنی بیوی کی پاکدامنی پر پورا
 اعتبار تھا اور اس کی بیوی کی پاکدامنی وہ سچی جسے ارنلڈ
 کے بعد میں نے سچا پایا۔ غرض پستی مس نے اپنی انگلی
 شرط میں لگا دی۔ انگلی میں میرا تھا۔ یہ میرا تو کیا چیز
 ہے اگر یہ ایسا یا تو تہی ہوتا جو سورج دیوتا کے رحم
 میں لگانے کے قابل ہوتا اور اس کی قیمت پورے رحم کی
 قیمت کے برابر ہوتی تو پستی مس کو اسے شرط میں لگا
 دینے میں دریغ نہ ہوتا۔ اس شرط کے بعد میں فوراً برطانیہ
 میں اسی تعداد اور ارادے سے آیا۔ حضور کو میرا دربار
 میں حاضر ہونا یاد ہو گا۔ جب شہزادی صاحبہ سے ملاقات
 ہوئی تو اچھی طرح سبق ملا۔ کہ سچے عشق اور باپ میں کیا
 فرق ہے۔ جب نا اُمید ہوا تو اب میرے دماغ نے خست
 و شیطنت کے ساتھ عمل شروع کیا۔ برطانیہ میں موسم کی
 سختی کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کے دماغ خست و
 ناکارہ ہوتے ہیں میں انکی کارہنے والا تھا یہاں میرے
 دماغ نے خوب کام دیا۔ غرضیکہ مختصر عرض ہو کہ اب جو
 تدبیر میں نے سوچی اس میں بے حد کامیابی ہوئی اور جب
 میں اٹلی واپس گیا تو جو کچھ میں نے اپنی کامیابی کے ثبوت
 میں بیان کیا اس نے شریف لیونٹوس کو دلدادہ کر دیا۔ چند
 نشانیاں اور علامتیں بھی میں نے اُسے بتائیں۔ خلاصہ یہ
 کہ میں نے اس کی بیوی سے اُسے بدگمان کر دیا۔ شہنشاہی
 کی خواہجہ میں جو تصویریں دیواروں پر لگی تھیں ان کا
 حال بیان کیا اور یہ جوش اُسے دکھایا جسے فی الواقع
 دھوکے سے میں نے حاصل کیا تھا بلکہ اس کے جسم کے چند
 خفیہ نشانات بھی بتائے کہ غرضیکہ لیونٹوس کو یقین ہو گیا کہ

مرد سرانی میں اتنا غلو کرتے تھے کہ گویا دنس دیوی اور منیردا
 کے قدیم مجسمے بھی ان کے سج و سج کے سامنے گرو میں گویا وہ
 متاع حسنِ ریزیانی کی ایک دکان ہیں جسے دیکھ کر ہر مرد کو کا
 عشق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ان میں وہ عشق و ناز ہی
 ہے جو مرد کو عورت کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔
 سمبلین۔ میں تو انتظار میں تھا کہ جا رہا ہوں۔ جو بات سننے
 کی ہے وہ جلد بیان کی جائے۔

یا چیمو۔ اگر حضور جلد اذیت اٹھانی چاہتے ہیں تو میں بھی یہ
 قصہ جلد بیان کرتا ہوں۔ پستی مس ایک شریف امیر زادے
 کی مثل ایک خاتون سے عشق رکھتا تھا یہ خاتون شاہی
 خاندان سے تھی۔ اس وجہ سے وہ ہماری باتوں کی طرف متوجہ
 ہوا اور جن کی ہم تعریف کرتے تھے ان کی تعریف میں کسی قسم
 کی کمی کے بغیر اور اس میں واقعی اُس نے اپنی شرافت کا پورا
 ثبوت دیا، اُس نے اپنی بیوی کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا
 جس میں نہ صرف حسن صورت کا ذکر تھا بلکہ جن سیرت ہی
 شاہل تھا تو ہم سب کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ جن عورتوں کی
 ہم تعریف کرتے تھے وہ اُس کی بیوی کے مقابلہ میں باورچی خانہ
 کی میسلی پھلی مائیں ہیں زبان کی لطافت اور شیرینی اور پھر
 دل کا خلوص اس بیان میں کچھ ایسے ہمیز تھے کہ ہم سب
 اس کے سامنے احمق معلوم ہونے لگے۔

سمبلین۔ مطلب کی بات کہو۔

یا چیمو۔ دشمنیں حضور! مطلب یہاں سے شروع ہوتا ہے
 کہ اثنائے گفتگو میں آپکی دختر کی عصمت و عفت کے متعلق
 بحث ہونے لگی۔ پستی مس کہنے لگا کہ و انیا دی کی نسبت
 آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں حدت نہیں ہے مگر میری بیوی کی
 طبیعت پاک صاف اور مرد ہے اس پر بعد بد بخت نے انکی
 تعریف میں شبہ ظاہر کیا اور میں نے کہا کہ لیجئے یہ ان شرفیاں

پسائیو بہ شرفیو! مدد کرو۔ یہ لڑکا نہیں ہے ہماری آقا اور بیگم ہے۔ اسے آقا پوتی مس آپنے ایو جن کو اب قتل کیا ہے اب تک آپ اس کے قاتل نہ تھے۔ لوگو! مدد کرو۔ یہ معزز خاتون ہے۔

سمبلین :- کیا دنیا واقعی جکڑیں آگئی ہے۔ پوتی اس :- یہ واقعات کیسے پیش آرہے ہیں جن سے غش پر غش آتا ہے۔

پسائیو :- میری بیگم، میرے آقا آپ اٹھیں۔ جاگیں! بیدار ہوں۔

سمبلین :- اگر یہی حال ہے تو پھر خداؤں کا قصد یہی ہے کہ مجھے ہدف بنائیں اور خوشی سے میں ہلاک ہو جاؤں۔

پسائیو :- میری بیگم! حضور کا مزاج کیسا ہوا۔ ایو جن :- میری آنکھوں کے سامنے سے دوڑ رہا ہے۔ تو نے مجھے زہر دیا تھا۔ تو خطرناک آدمی ہے یہاں سے دفع ہو۔

سمبلین :- آواز تو ایو جن کی ہی ہے۔ پسائیو :- میری آقا، میری بیگم، خدا مجھ پر اسمان سے جاتی گندھوک کے ٹکڑے برسائے وہ صندوقچی آپ کو کسی اور خیال سے دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں اکسیر ہے صندوقچی مجھے ملکہ نے دی تھی۔

سمبلین :- کیسی نئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ ایو جن :- اس صندوقچی میں زہر تھا اور اس کا اثر مجھ پر ہوا۔

کورنیلوس طبیب :- خدایا! ملکہ نے مرتے وقت جن باتوں کا اقرار کیا تھا ان میں ایک بات کہنے کو میں بھول گیا تھا یہ بات ایسی ہے کہ آپ کو کہنے کا ہوا ثابت کرتی ہے۔ بلکہ نے کہا تھا کہ اگر آپ ایو نے اپنی بیگم کو وہ معجون چسپیز اکسیر تاکر ملکہ کو دیا تھا دیدی تو پھر ایو جن کے ساتھ میرا

اس کی بیوی کی عصمت میں میں واقعی غلط انداز ہوا ہوں۔ اور اس طرح جو شرط بدی تھی تھی وہ میں جیت گیا میں سمجھتا ہوں لیو تو اس یہاں موجود ہے۔

پوتی مس :- لانگے بڑھکے۔ ہاں ادبے ایمان، اٹلی کے شیطان تو نے یہی کیا اور افسوس مجھ بد نصیب زود اعتقاد۔

احق :- اے ورد قاتل اور سارق پرور یا جو لقب دنیا کے ان خبیثوں پر جو گذر گئے ہیں یا اب موجود ہیں یا آئندہ ہوں میوزوں ہو! مجھے دو اور افسوس کرو۔ اسے کوئی رتی کا ٹکڑا یا چاقو یا چھری مجھے دو۔ یا کوئی ایسی چیز دو کہ میں اپنے کے کہہ سکوں۔ اسے بادشاہ جس قدر عذاب دینے کے آئے اور شکنجے تیرے پاس ہوں انہیں طلب کر، میں وہ ہوں۔ جو دنیا کی بدترین مخلوق ہوں بلکہ اس سے ہی بدتر

اپنے کو شہر کرنا ہوں۔ میں پوتی مس ہوں، جس نے حضور کی بیٹی کو قتل کر دیا۔ ایک مرد و شیطان اور خبیث کی طرح اس وقت حضور کے سامنے حاضر ہوں۔ جس نے ایک کم درجہ کے شیطان اور سارق کو ایسا کرنے کا اشارہ کیا۔ آپ کی بیٹی خوبوں اور نیکیوں کا ایک مجسمہ تھی بلکہ وہ مجسمہ نیکی تھی۔ لوگو! مجھ پر رحم کرو، پتھر اور کھچڑی برساؤ

گی کو چوں کے کتوں کو مجھ پر گمشکار دو۔ دنیا کے ہر بد معاش کا نام لیو تو اس پوتی مس رکھ دو جو شیطانی اور خبیث ہو چکی ہے پھر اس کے برابر نہ ہوگی۔ ہائے ایو جن میری ملکہ میری زندگی، میری بیوی، ہائے

ایو جن۔ ایو جن۔ ایو جن۔

ایو جن :- خاموش۔ اسے میرے مالک اور آقا۔

پوتی مس :- اسے شہر بڑھکے کیا تو میری ہنسی اڑاتا ہے۔ کیا میرا کوئی تا شا بنا کر دکھائیے گا! ایو جن کو ہارتا وہ گرتی ہے۔

سلوک وہی ہوگا جو ایک چوپے کو نہرو دیکر ہوتا ہے۔

سمبلین :- کو نیلیوس! یہ کیا بات ہوئی۔

کو نیلیوس طیب :- حضور والا، ملکہ کٹر فرمائش کیا کرتی

تھیں کہ میں طرح طرح کے زہر تیار کر کے پیش کیا کروں تاکہ

وہ ان زہروں سے زہر پیے جا نوروں، کتوں اور بلیوں

کو مارا کریں۔ یا ایسی چیز کو ہلاک کریں جن کی جان کی

کوئی قیمت نہ ہو۔ میں یہ سنکر ڈرا اور مجھے شبہ گذرا

کہ کہیں ملکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں

استعمال نہ کریں چنانچہ میں نے ایک ایسی دوا تیار کر کے

دی تھی جس کے استعمال سے انسان کے حواس کو فعل

معطل ہو جاتے مگر شعوری دیر میں فطرت کی تمام

قوتیں بیدار ہو کر اپنا عمل کرنے لگیں۔ ایموجن سے دنیا

کیا جائے کیا آپ نے اُسے کھایا تھا۔

ایموجن :- ہاں غالباً وہی دوا میں نے کھائی تھی۔ کیونکہ

میں اس کے کھاتے ہی مر گئی تھی۔

بلاریوس :- لڑکوں! دیکھا ہماری غلطی تھی۔

گداریوس :- یہ تو یقیناً فیدائی ہے۔

ایموجن :- (پوستی مس سے کہتی ہوئی) تم نے کیوں اپنی

بیباقتا بیوی کو اپنے سے جدا کر دیا۔ جو عقد ہم میں تم میں

ہو چکا تھا وہی قائم ہے۔ کیا پھر مجھے جدا کر دو گے۔

(پوستی مس کے گلے سے لگ جاتی ہے)

پوستی مس :- جیسے شلخ پر پھیل ہوتا ہے اس طرح مجھے

لگی رہو۔ یہاں تک کہ درخت خشک ہو جائے۔ اسے

میری جان، اسے میری روح۔

سمبلین :- میری بیٹی۔ میری جگر پارہ دہی سے تو کیوں

الگ تھلک ہے۔ کیا میں بات کر نیکی قابل ہیں رہا۔

ایموجن :- (دندناؤں کو کرکیتی ہوئی) میرے حق میں دغا فرمائیں۔

بلاریوس :- (گداریوس اور درجیس سے کہتا ہوئی) گوارس

نوجوان لڑکے سے مجھے محبت تھی مگر اس میں میرا قصور نہ تھا

البتہ تمہاری محبت کی خاص وجہ تھی۔

سمبلین :- (بیٹی سے کہتا ہوئی) میری آنکھوں سے جو آنسو گرتے

ہیں۔ خدا کرے کہ وہ تیرے حق میں آپ مقدس ثابت ہوں۔

ایموجن تمہاری ماں کا انتقال ہو گیا۔

ایموجن :- حضور! مجھے اس کا انوس ہو۔

سمبلین :- وہ مفید اور شریعتی یہ اُسی کی ضرورت تھی کہ

آج اتنی مدت کے بعد ہم دونوں ملتے ہیں اس کا بیٹا بھی

غائب ہے۔ ہمیں معلوم کہ وہ کیونکر چلا گیا اور اب کہاں ہو۔

پانیو :- حضور! اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں، جو کچھ

عرض کر دوں گا۔ سچ عرض کر دوں گا۔ جب میری آقا یعنی شہزادی

صاحبہ کہیں جاتی تھیں تو ملکہ کے فرزند میرے پاس آئے۔

مُنہ میں غصہ سے جھگا بھرے گئے اور قسم کھا کر مجھ سے

کہنے لگے کہ اگر تو نے نہ بتایا کہ شہزادی صاحبہ کہاں گئیں

تو میں فوراً تیری گردن اڑا دوں گا۔ اتفاق سے میری

جیب میں ایک خط اپنے آقا کا پڑا تھا اس خط میں لکھا

تھا کہ میں پوستی مس مجھ سے ملو۔ میں ان کے پہاڑوں کے

قریب ملوں گا۔ اُسے پڑھتے ہی گلوٹن کے سر پر غضب سوار

ہوا اور انھوں نے میرے آقا کے کپڑے مجھ سے جبر طلب

کئے انہیں پہنتے ہی وہ اپنے ناپاک مقصد اور ارادے کو

بلور کرنے کے لئے فوراً روانہ ہو گئے اور قسم کھا کر کہا کہ میں

تیری آقا کی عصمت شکنی کر دوں گا۔ اس کے بعد گلوٹن پر کیا

گذری مجھے اسکا علم نہیں۔

گداریوس :- اجازت ہو کہ میں اس قصہ کو ختم کر دوں۔

میں نے گلوٹن کو دہاں قتل کر دیا۔

سمبلین :- خداؤں سے پناہ مانگتا ہوں اتم نے آج ایسے

غضب نازل کر کے اپنی اُن خدمتوں کو جو تو نے کی ہیں عارت کرنا چاہتا ہے ابھی تو تجھے تیرے کارناموں کا صلہ بھی نہیں ملا ہے تم نے کیسے کہا کہ یہ شخص ایسے ہی باپ کی اولاد ہے جیسے کہ میں ہوں۔

ارویر گیس :- اس میں اس نے حقیقت سے بھی بڑھ کر بات کہی ہے۔

سمبلین :- اور اسی بات کہنے پر وہ قتل کیا جائیگا۔

بلار یوس :- ہم تینوں ساتھ قتل ہونگے لیکن ہم تینوں میں دو ایسے اچھے ہیں جیسے کہ ان میں سے ایک کی نسبت کہہ چکا ہوں۔ میرے پیارے بچو! جب تک میرا تعلق تم سے ہے میں اس وقت ایک ایسی خطرناک تقریر کر رہا ہوں جس میں تمہارا فائدہ ہو۔ ارویر گیس :- آپ کو اگر خطرہ ہے تو ہم کو بھی وہی خطرہ ہے۔

بلار یوس :- جو بات دراصل ہے اجازت ہو تو عرض کروں۔ اے بادشاہ! آپ کی رعایا میں ایک شخص تھا جسے بلار یوس کہتے تھے۔

سمبلین :- اس کا یہاں کیا ذکر ہے وہ تو ایک سرکش باغی تھا جو یہاں سے جلا وطن کر دیا گیا۔

بلار یوس :- وہی شخص اتنا بوڑھا ہو کر آج حضور کے سامنے حاضر ہے۔ وہ جلا وطن ضرور ہوا تھا مگر مجھے اس کا علم نہیں کہ وہ سرکش و باغی بھی تھا۔

سمبلین :- اسے یہاں سے لیجاؤ۔ اگر تمام دنیا اس کی سفارش کرے تب بھی اُس کی جان سلامت نہیں رہ سکتی۔

بلار یوس :- حضور اتنا غصہ نہ کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے ان دونوں فرزندوں کی پرورش میں جو کچھ میرا صرف ہوا ہے وہ ادا کیا ہے اور جو رقم اس طرح آپ اوکریں وہ ادا کرتے ہی ضبط کر لیں۔

سمبلین :- یہ تم نے کیا کہا کہ میرے دو فرزندوں کو تم نے

بہادری اور شجاعت کے کام کئے ہیں کہ دل نہیں چاہتا کہ کوئی سخت حکم تمہارے ہاتھ میں زبان سے نکلے اسے بہادر نوجوان جو کچھ تم کہتے ہو اُس سے انکار کر دو۔

گدہ یوس :- میں تو کہہ چکا کہ میں نے اُسے قتل کر دیا۔ سمبلین :- کلوش شہزادہ تھا؟

گدہ یوس :- مگر گستاخ۔ یہودہ اور ناشائستہ جو جو بدسلوکیاں اس نے میرے ساتھ کیں وہ ہرگز ایک شہزادے کو زیب نہ دیتی تھیں، نہایت سخت اور ناشائستہ الفاظ اتنا شور مچا کر میری نسبت کہے کہ اگر سمندر میں بھی وہ جوش و خروش ہوتا تو میں اُس کی بھی پروا نہ کرتا۔ میں نے اُس کا سر قلم کر دیا اور میں خوش ہوں کہ آج وہ یہاں کھڑا یہ نقشہ بیان نہیں کرتا۔

سمبلین :- مجھے تمہارے حال پر اسوس ہوتا ہے تم خود اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقبال کر رہے ہو۔ ہمارے ملک کے قانون کے مطابق تم سزائے قتل کے مستوجب ہو اور تم قتل کئے جاؤ گے۔

ایموجن :- اس بن سرکی لاش کو تو میں اپنے شوہر کی لاش سمجھتی تھی۔

سمبلین :- قاتل کی مشکیں کس لی جائیں اور اُسے ہمارے سامنے سے ہٹایا جائے۔

بلار یوس :- عالیجاہ! ذرا توقف فرمائیں۔ یہ شخص جس نے کلوش کو مارا ہے کلوش سے بہتر آدمی ہے اور اسیے والدین کا فرزند ہے جیسے والدین کے فرزند آپ ہیں اور آپ سے ایسے انعام کا مستحق ہے جو کلوش کا ایک پورا طبقہ بھی مستحق نہیں ہو سکتا (سب اہمیں سے کہتا ہے) بازوؤں کو ہاتھ نہ لگاؤ یہ ہاتھ مشکیں کسے کیئے نہیں تو ہیں۔ سمبلین :- لے بڑے سپاہی! کیا تو اپنے اوپر ہمارا

بڑے پیارے ساتھی تھے جدا ہوتا ہوں۔ اس سر پر چھائے ہوئے آسمان کی برکتیں ان پر ہمیشہ نازل رہیں اور شل شبنم کے وہ ان پر برستی رہیں کیونکہ وہ اس قابل ہیں کہ آسمان پر ستارے بن کر اُس کی زیب زینت ہوں۔

سمبلین :- تم رُو رُو کر اپنا بیان دے رہے ہو۔ گویا تمہارے آنسو جو کچھ تم کہتے ہو اُس پر گواہی دے رہے ہیں لیکن تم تینوں نے جو خدمت آج کی ہو اُس کا ثبوت باور کرنا اتنا دشوار نہ تھا جس قدر اس قصے کا باور کرنا جو اس وقت کہہ رہے ہو۔ میرے بچے کہوئے ضرور گئے تھے۔ اگر یہی ہیں تو میں نہیں جانتا کہ ان سے بہتر فرزندوں کی تمنا کوئی باپ کیسے کر سکتا ہے۔

بلاریوس :- نھوڑی دیر اور توقف فرمائیں، یہ نوجوان جسے میں پولیدور کہتا ہوں یہ حضور کا گداریوس ہے اور یہ دوسرا نوجوان جس کا نام میں نے کاؤکل رکھا تھا وہ آبکا اردر ہے۔ یہ آپ کا چھوٹا فرزند ہے جس وقت سے چُر پاتا تھا تو وہ ابک عجیب غریب شال میں لپیٹا تھا جو خود اُس کی ماں ملکہ نے اسے ہاتھ سے تیار کیا تھا اور اس کے ثبوت میں وہ شال پیش کر سکتا ہوں۔

سمبلین :- گداریوس کی گردن پر ایک تل تھا جس کی شکل ستارے کی سی تھی اور وہ عجیب قدر قی نشان تھا۔

بلاریوس :- گداریوس موجودی ملاحظہ فرمائیں کہ گردن پر قدرت کا وہ نشان اب تک موجود ہے فطرت کی گویا غرض ہی یہی تھی کہ اس وقت وہ اس کی شناخت کی مکمل شہادت ہو جائے۔

سمبلین :- واہ ایس وقت میری کیفیت کیا عجیب ہے ایک ماں ہوں جس کے تین بچے ہیں کوئی ماں بھی اپنے بطن سے اتنے بچے ہونے پر اتنی خوش نہ ہوگی جیسا کہ میں ہوں۔

بلاریوس :- میں صاف گواہ دریدہ دہن ہوں۔ اور کسی قدر غصے میں بھی ہوں۔ میں حضور کے سامنے دوڑا تو ہوتا ہوں لیکن اُٹھنے سے پہلے اپنے ڈوبیے پیش کرتا ہوں تاکہ اُنکے بڑے باپ کی جان بخشی ہو۔ اسے شاہ ذکیاہ ایہ دونوں شریف جو مجھے باپ کہتے ہیں میرے بچے نہیں ہیں یہ آپکے فرزند ہیں اور آپکے خون سے پیدا ہوئے ہیں۔

سمبلین :- میرے بچے کیسے۔ بلاریوس :- اس بات کا یقین ایسا کیسے جیسے کہ آپ کو اپنے باپ کا بچہ ہونے کا یقین ہو سکتا ہے۔ میں جواب مورگن کا نام رکھتا ہوں دی بلاریوس ہوں جس کو مدت ہوئی کہ آپ نے جلا وطن کیا تھا میرا جرم محض آپ کی خوشی اور اِک خیال تھا۔ میری سزا اور میری شجاعت جس میں نے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائیں وہی نقصان تھا جو میں نے آپ کا کیا تھا۔

یہ شریف فہر دے، جو شریف ہی ہیں اور شہزادے بھی آج بیٹل برس سے میں اُن کی پرورش کرتا رہا ہوں اور اس کل زمانے میں ان کی تعلیم و تربیت کرتا رہا جو علم میں جانتا تھا وہ سب اُنکو سکھائے۔ میری تعلیم و تربیت جیسی کچھ تھی حضور اس سے واقف ہیں اُن کی دایہ یور نیلی تھی جس سے میں نے ان شہزادوں کو چرانے کے لئے عقد کر لیا تھا۔ جو کچھ میرا قصور قرار دیا گیا تھا جب کہ اس کی سزا مجھے مل چکی ہے تو میں نے اُس دایہ شہزادوں کو چرانے کی سخر ہک کی جب خیر خواہی اور وفاداری کے بدلے مجھے جلا وطنی کی سزائی تو پھر واقعی میں حضور سے باغی ہو گیا۔

جس قدر زیادہ ان بچوں کے چوری جانے سے حضور کی تکلیف بڑھتی تھی اُسی قدر میری غرض چرانے کی پوری ہوتی تھی لیکن شاہ! آپکے دونوں فرزند پھر حضور کے سامنے موجود ہیں اور اب میں ان دونوں سے جو دنیا میں میرے

تم یہ خدا کی برکتیں رہیں۔ تم وہ سناے ہو جو اپنے ملک سے جدا ہو کر پھر اسی میں گردش کرنے چلے آئے۔ ایموجن۔ بیٹی تجھے اس واقعہ نے سلطنت سے محروم کر دیا۔

ایموجن :- نہیں حضور۔ مجھے تو دونوں عالموں کی سلطنت مل گئی۔ پیارے بھائی! دیکھو خدا نے ہمیں پھر کس طرح ملایا۔ تم نے مجھے بھائی اس وقت کہا تھا جبکہ حقیقت میں میں تمہاری بہن تھی اور جب میں نے تمکو بھائی کہا تھا۔ تو فی الحقیقت تم میرے بھائی تھے۔

سمبلین :- کیا تم پہلے بھی مل چکے ہو۔
اوریریگس :- حضور! ہم پہلے مل چکے ہیں۔

کدیریوس :- اور پہلی ہی ملاقات میں ہم میں محبت پیدا ہو گئی تھی اور ہماری محبت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ ہم جسے بھائی سمجھ رہے تھے مر نہ گیا۔

کونیلپوس طیب :- اسی ملکہ والی دوا کے کھانے سے۔

سمبلین :- اے عقل حیوانی، تو بھی عجیب قوت رکھو! اس مختصر بیان میں واقعات کی اور شاخیں بھی ہیں جنکا حال

عجیب و غریب سماعت سے بڑے جس کا تفصیلی بیان حقیقت کو واضح کریگا۔ مثلاً یہ کہ تم شہزادے کہاں اور

کس طرح رہتے تھے۔ اور ایموجن تم کس طرح ہمارے سامنے مافی

قیمدی کی ملازم ہوئیں۔ بھائیوں سے کیونکر مفارقت ہوئی ان سے پہلے کس طرح ملنا ہوا۔ اور ایموجن تمہیں یہ حال

بھی کہنا ہے کہ گھر سے کیوں نکلیں، اور جب نکلیں تو کس طرف گئیں اور تم قینوں یعنی بلاریوس اور شہزادے لڑائی میں

تجباے شامل ہونے کی کیا وجہ ہے اور ان کے علاوہ اور امور جو اتفاق سے پیش ہوئے رہے سب معلوم کرنے میں لیکن یہ وقت اور موقع انہیں ہے کہ ہم ان طولانی سوالات کے جوابات دریافت کریں۔ دیکھو پوسٹی مس کس طرح ایموجن کا

سہارا لے کھڑا ہوا اور ایموجن کسی ایک بے ضرورت کجی کی طرح کبھی اپنے شوہر پر کبھی بھائیوں پر اور کبھی باپ پر نگاہ ڈالتی ہے ہر چیز کو مسرت و شادمانی سے متاثر کرتی ہے اور یہی حال خوشی سے اُن کا ہی جو متاثر ہو کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ اور سب جائیں میں جا کر قینوں پر قریب بنائیں چڑھا کر خوش ہو اور دھونپوں سے انہیں بھر دیتا ہوں (بلاریوس سے کہتا ہے) بلاریوس! تم میرے بھائی ہو اور میں ہمیشہ تمہیں بھائی کہوں گا۔

ایموجن :- (بلاریوس سے کہتی ہے) آپ بھی میرے باپ ہیں کیونکہ آپ کے یہاں آرام پانے سے مجھے یہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا۔

سمبلین :- اس وقت سوائے اسیران جنگ کے سب خوش ہیں! ان اسیروں کو بھی خوش کر دیا جائے کہ وہ بھی ہمارے لطف و کرم سے محظوظ ہوں۔

ایموجن :- اب مجھے اپنے رومانی آقا سے کہنا ہے کہ میں اب آپ کی خدمت کے لئے بھی تیار ہوں۔

لیوکوس :- تم خوش رہو۔

سمبلین :- وہ غریب سپاہی جو ہمارے لئے اپنی شرافت اور جوانمردی سے لڑا تھا اسکو بھی اس مبارک وقت میں یہاں

آنا چاہیے تھا اور جس وقت ہم خدا کا شکر ادا کریں تو اسے بھی یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔

پوسٹی مس :- حضور۔ میں وہی سپاہی ہوں جو ان قینوں لڑنے والوں کے ساتھ تھا اور نہایت زدہ حالت میں حضور

کے لئے لڑا تھا میری شکستہ حالی اس وقت اور مقصد کے لئے مناسب تھی۔ یا چیمو۔ بتاؤ کیا میں نے ہی تمہیں مار کر

گرایا تھا اور جیسے تم گئے تھے اگر چاہتا تو وہیں تمہیں ختم بھی کر دیتا۔

مطلب بیان کرنے کے واسطے اس نجومی کو حکم دیں۔

لیو کوکس :- فیلا رمونس۔

نجومی :- حاضر ہوں۔ خداوند!

لیو کوکس :- اس تختی میں جو کچھ لکھا ہوا اس کے معنی بیان کرو۔

نجومی :- تختی کی عبادت پڑھتا ہوں جبکہ ایک سچے شیر کو جو اپنے تئیں نہیں جانتا کہ وہ کون ہو با دیہاری کا ایک ہلکا سا جھونکا اپنے گلے لگائے گا اور جبکہ ایک شاندار درخت

صنوبر کی شاخیں جو برسوں ہوئے درخت سے کاٹ گئیں تھیں اور مردہ و خشک ہو گئیں تھیں پھر سرسبز ہو کر اپنے اصل درخت پر نمودار ہوں گی اُس وقت پوسٹی مس کی مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ برطانیہ خوش قسمت رہے گا۔

اسن اور نعمتوں کی فراوانی میں پھولتا پھلتا رہے گا۔

لیو کوکس آپ وہ سچے شیر ہیں اور یہی مفہوم آپ کے نام کا ہے یعنی لیو نیس (شیر کا بچہ) (سمبلین سے مخاطب ہو کر)

با دیہاری کے نرم جھونکے سے مراد آپ کی نیک نخت ملی ہوئی۔

..... اور وہ اپنے شوہر کی نہایت وفادار بیوی ہے

اور جو اس وقت ہی تختی کے مضمون کے مطابق بلا آپ کے

علم و تلاش کے اپنے شوہر کو نہایت مہر و وفا کے ساتھ

پیشی کھڑی ہے۔

سمبلین :- یہ بات تم نے قرینے کی کہی۔

نجومی :- شاندار درخت صنوبر سے مراد خود بادشاہ

سلامت ہیں اور اس شجر کی پریدہ شاخوں سے مطلب

آپ کے یہ دونوں فرزند ہیں جنہیں بلار یوس چرلے کیا تھا وہ

جن کی نسبت برسوں سے خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں

ہیں اب وہی شاخیں سرسبز ہو کر اس عالیشان درخت

پر نمودار ہوئی ہیں جنکی اولاد سے امید کی جاتی ہے کہ برطانیہ

یا جمہور :- (زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہتا ہوں) اس وقت میرے

گناہوں کا بوجھ مجھ پر اس طرح گرا رہے جیسے کراؤں وقت

زور و قوت نے مجھے کرایا تھا۔ یہ جاں حاضر ہے۔ اے آپ

اے یس اور یہی میری التجا ہو۔ یہ جان بطور قرض کے میرے

پاس ہے۔ لیکن جان سے پہلے یہ انگوٹھی بیچئے اور یہ چون

بھی حاضر ہے جو دنیا کی شہزادیوں میں سب سے پاک نفس

شہزادی کا لہ پور ہے۔ جس نے مہر و وفا کی قسم کھائی تھی

اور اس قسم میں وہ سچی رہی۔

پوسٹی مس :- میرے سامنے مت جھکو جو کچھ زرد طاقت

مجھ میں ہے اس کا یہی حکم ہے کہ تیری جان بچا دوں اور

جو کچھ اذیت و تکلیف تجھ سے پہنچی تھی وہ یہی تھی جو کہ

مجھے معاف کر دوں۔ زندہ رہ اور آئندہ لوگوں کے

ساتھ اپنا برتاؤ بہتر طریقہ کار رکھ۔

سمبلین :- خطا معاف کرنی طبیعت کی فیاضی ہو رہی ہے

اس بات کا سبق اپنے داماد سے لیتے ہیں اور اب ہمارا حکم

یہی ہے کہ ہم نے سب کو معاف کیا۔

اروبرنگس :- آپ نے اس معرکہ میں ہماری اتنی مدد کی تھی

کہ ہمیں بھائی معلوم ہونے لگے مگر اب یہ معلوم کر کے

دل خوش ہوتا ہو کہ واقعی آپ ہمارے بھائی ہیں۔

پوسٹی مس :- شہزادگان عالی وقار میں تو آپکا حاد

ہوں اور اے روماء کے سردار آپ اپنے نجومی کو طلب

فرمائیں کہ چونکہ میں بھی ایک خواب دیکھا تھا اور وہ یہ کہ

خدا نے جوہریر ایک عقاب پر سوار سامنے آیا ہوا اور اس کے

ہمراہ چند اور پاک مقدس روحیں ہیں جو میری ہی

گفت اور خاندان کی معلوم ہو رہی ہیں جب میں بیدار

ہوا تو یہ تختی میں نے اپنے سینہ پر رکھی پائی جو کچھ اس میں تحریر

ہے وہ اتنا مشکل ہے کہ میں اس کے معنی نہ سمجھ سکا اب اسکا

کہ ہمارا شاہی عقاب یعنی قیصر اپنے لطف دکریم اور نوازشات کو
مثلاً آفتاب کے درخشاں کر کے اسکا نور سبیلین پر برسائے گا اور
سبیلین وہ ہے جسکا نور اسوقت مغرب میں چمک رہا ہے۔

سبیلین بہ آؤ سب ملکہ خدا کی تعریف کریں اور اپنے بہت
خانوں کی مقدس قربان گاہوں سے دھوئیں کے دل بادل
اتنے اٹھائیں کہ آسمان پر خداؤں کے شام تک وہ پہنچیں۔ ہم
اپنی گل رعایا میں امن کا اشتہار دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں
کہ رومانی اور یرطائی نشان دوستانہ طریقے پر ساتھ
ساتھ اڑاتے ہوئے بڑے بڑے جلوس بازاروں میں بھلیں
اور جو پتیر اکبر کے سیکل میں اس امن و سلامتی کی تصدیق
کی جائے اور وہاں ضیافت عام کا سالانہ ہوائی ٹنگ کئی
لڑائی اس لڑائی کی مثل نہیں ہوتی ہوگی جس میں بھی ہاتھوں
سے خون کے داغ دھوئے بھی نہیں گئے تھے کہ اس طرح فریقین
میں مصالحت اور امن قائم ہو گیا۔

ختم شد

عنایت اللہ دہلوی

امن و سلامتی میں قائم رہ کر وہ ہر طرح نعمتوں سے مالا مال رہیگا۔
سبیلین ۱۔ اچھا اپنی طرف امن و سلامتی کا دور ہم ابھی سے
شروع کرتے ہیں اور کاسیس لیوکوس سٹوگو ہم فتح ہیں
لیکن ہم قیصر اور رومانی سلطنت کی اطاعت قبول کرتے
ہیں اور بقایا خرچ کے ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں جسے ادا
کرنا اپنی شہر پر ملک کے کہنے میں آ کر ہم نے بند کر دیا تھا۔
اس شہر پر ملک اور اس کی اولاد دونوں کو خدا نے انصاف
کر کے غارت کر دیا ہے۔

بخوجی بہ خدا خود آسمان پر بیٹھا اس امن و سلامتی کے سارے
خوشنویسے سروں کو ہم آہنگ کرتا ہے اور جو خواب میں نے
لیوکوس سے اس لڑائی کے شروع میں جس کی آگ ابھی تک
پوری ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے کہا تھا اسوقت اسکی تعبیر پوری
ہوتی ہے اس خواب میں بیان کیا تھا کہ روم کا عقاب سمت
جنوب مغرب کی طرف اڑتا ہوا آیا ہے اور سورج کی
کمرنوں میں آ کر نظر سے غائب ہو گیا ہے اس سے خبر نکلتی تھی

تائیس

ہرودیس

سنوئی کاخن بدی کالے بنا جس تھا۔ اس کا نایاب قص گناہ تھا۔
اُس کا جذبہ کوجہ تش فشاں کی طرح تند اور اُس کی محبت لاوے کی
طرح جھلس نیوالی تھی۔ اُسکے سانس میں زہر تھا اور بوسہ موت۔
وہ یوحنا کے لبوں کو چومنا چاہتی تھی، مگر یہ خدا رسیدہ بزرگ سے
اور اسکی مان کو برا بھلا کہتا تھا۔ حاکم ربیع انطیس کے حکم سے سنوئی
ایک عظیم نشانِ دعوت میں تاجی اور انعام میں اُسے یوحنا کا سر لگا۔
اس خون آلود سر کو پشت میں اٹھا کر سنوئی نے اُسکے لبوں کو دیا نہ درجہ۔
گناہ خانہ اور موت کی اس روئے کھڑے کو دیوالی کہاں کی طرح یہ تھیستائر

یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین
مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ یہ فرانسیسی مصنف
اناطولی فرانس کا شہ پارہ ہے۔ اس میں جسم و روح کے تضاد پر مسکند
کو مصبر قلم کی ایک عروسِ مانا زاری کی داستان کے طور پر نہایت
دلفربھی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تمام دنیا کی ادبیات میں بہت
بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب اس کا مترجمہ ایسی
قادر لکھائی اور اعجازِ بیانی سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی
ایک غیر فانی یادگار بنادیا ہے جو قیمت و دُرور پہ علاوہ معمولی لاک۔

لئے کا پتہ بہ ساقی بنگلو دہلی

”قوانین حیات“

(۱)
جنگ گیا جو اور بھی اُسکو جھکا یا جائیگا
دیدہ و دانستہ نظروں سے لایا جائیگا
نقش جو کوشاں نہیں خونِ بھرنے کیلئے
آپ مٹ جائیگا یا اُسکو مٹایا جائیگا

(۳)
جنگ گیا جو اور بھی اُسکو جھکا یا جائیگا
دیدہ و دانستہ گرتے کو گرا یا جائیگا
جب کسی سے کھنچ نہیں سکتی ہر نصو و چہات
نقشِ باطل کی طرح اُسکو ٹھایا جائیگا

(۲)
جنگ گیا جو اور بھی اُسکو جھکا یا جائیگا
دیدہ و دانستہ بے بس کو ستایا جائیگا
اک ذرا جسکی حیثیت کی رگ جاں کٹ گئی
نمونِ پانی کی طرح اُس کا بہایا جائیگا

(۴)
جنگ گیا جو اور بھی اُسکو جھکا یا جائیگا
دیدہ و دانستہ خاطر میں نہ لایا جائیگا
جس نے یکے کے ہی نہیں آدابِ مغل کے آئیں
دورِ بزمِ ناز سے اُس کو بٹھایا جائیگا

ایمن خرمیں (سیالکوٹی)

جواب طلب

آکر میدان میں گود پڑے اسی طرح میں تھوڑی دیر کے لئے اس کھیل میں شریک ہو گیا ہوں یا پھنس گیا ہوں۔ مگر شاید یہی تمہارے جیلج کا کافی جواب ہو۔

بلارنگ آمیزی و انشا پردازی مختصراً میرا ذاتی واقعہ سن لو۔ چونکہ واقعہ سچا ہے مجھے صرف نام بدلنا پڑا گفتگو زیادہ تر انگریزی میں ہے۔ اس لئے زبان بھی زیادہ تر میری ہے۔

ایک جہینہ ہوتا ہے جیکم کو ساتواں بچہ تولد ہوا پھر دو بچوں کے درمیان صرف سو ابوس کا فرق ہو۔ ایسی عورت کی صحت کا کیا پوچھنا ہو۔ علاج کے لئے میں نے مسٹر ہاسو کو بلایا۔ عیسائی ہو۔ ہماری اس کی پرانی شناسائی ہے۔ اس کا خاندان کبھی ہمارا ہمسایہ تھا۔ ہم نے اسکو چھو کر ہی دیکھا ہے اور اس کی کافر جوانی بھی۔ میں سمجھ نہیں کھا سکتا کہ اس کے لئے میرے دل کے کسی گوشے میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ سنیہا کی ایک چلتی پھرتی چھاؤں تھی۔ تعلیم کے لئے وہ کلکتہ چلی گئی۔ شادی ہو گئی۔ برسوں باہر رہی اور فراموش۔ اب وہ بھگتلا یہاں رہ رہی ہے۔

بیسکم۔ مسٹر ہاسو۔ آپ اپنی پرانی لٹی کو بھول گئیں؟ میں تو دیو شری لٹی ہوں جو آپ کے باغ سے امرود چرا کر کھا یا کرتی تھی۔

بیسکم۔ ہاں لٹی مجھے یاد ہو۔ کھانے سے زیادہ تم برباد کرتی تھیں۔ تم اب بھی جوان ہی ہو۔ دختوں پر چڑھ سکو تو جواؤ امرود توڑ لاؤ اور کھاؤ۔

پیدا ہونے

عزیز عزیز۔ السلام علیکم۔

تمہیں یاد ہوگا تم نے اپنا ایک افسانہ جو اشاعت کے بعد بہت مقبول ہوا مسودہ کی صورت میں مجھے دکھایا تھا۔ خیالات کے انوکھے پن کے لحاظ سے بے مثل تھا۔ مگر میں نے فوراً گرفت کر لی کہ کالزوری کا مال ہے۔ تم نے انگریز خاص کے نام بدل کر پارسی اور بنگالی ناموں سے اس کی شکل مسخ کرنے کی کوشش کی تھی مگر آنکھ والوں سے اصلیت چھپ نہ سکتی تھی۔ میں نے تم پر اردو کے اور افسانہ نویسوں کے ساتھ ٹیٹ کر بہت لے دے کی تھی اور اس فعل کو "جوزی" سے تعبیر کیا تھا۔ تم اسے استفادہ کہتے تھے۔ اب تمہیں یاد آگیا ہوگا۔ اس بحث کا تکرار کی ضرورت نہ ہوگی۔ میرا یہ دعویٰ نہیں باور نہ آیا تھا کہ تموا کا کال نہیں۔ ہمارے گرد و پیش ہر وقت افسانے کھیلے جا رہے ہیں۔ روزمرہ کی سینکڑوں وارداتیں ایک سے ایک تخیل کی تحریک کرتی ہیں۔ مبصر اہل قلم ان پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ہمارے سامنے کا غذی پیرا ہن میں پیش کر دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں قوت تخیل مفقود ہے۔ طبعاً و افسانے جن میں زندگی کے پیچیدہ مسائل پیش یا حل کے جائیں خود تیار نہیں کر سکتے بلکہ چراتے ہیں۔ یہ دماغی افلاس نہیں تو کیا ہو؟

تم نے اسے بڑا بول کہا تھا اور مجھے جیلج دیا تھا کہ ایسا کوئی چرہ ہی قلبند کر کے دکھا دو تو جانیں۔

افساد میرا میدان نہیں میں اس کھیل یا کرتب کا تماشا میں رہا ہوں مگر جیسے تماشا میں بعض وقت جوش میں

ڈھٹائی سے مقابلہ کرنا بڑا خطرناک ہے۔ اور آپ تو مذہبی بیوی ہیں یہ خدا سے مقابلہ کرنا ہے۔
مجھے دیکھئے۔ اللہ نے سب کچھ دے رکھا، ایک اولاد سے ابھائی ہوں، ۲۲ کمبھوں میں، انسو بھر آئے۔

نسی لکھنؤ، علی اور باہر نکل کر میرے ساتھ چمن میں ٹہلنے لگی۔ پھول، پیڑ، مینیں دیکھیں بھالیں۔ مجھ سے کہا میں نے سبزی اور پھولوں کے امریکی بیج منگو کر گا چھیاں تیار کی ہیں۔ آپ تو کبھی آتے نہیں کسی دن آجائے تو اپنا باغ دکھاؤں گا چھیاں ضرورت سے بہت زائد ہیں جتنی آپ چاہیں منگوالیں۔ کچھ بوسے میرے ہاں سے لیتی تھی اور چلتے چلتے ایک بار اور اپنے ہاں آشی تاکید کرتی تھی۔

میں دو تین مخصوص اجابے، اعتراض کے سوالگوں سے بے ضرورت ملتا کم ہوں۔ علی نے فیس بھی نہیں لی تھی۔ بیگم کی حالت کی رپورٹ بھی کرنا تھی اور جی بھی چاہا۔ جانا پڑا۔ بڑی مسرت سے ملی۔ ہاتھ ملایا تو چھوڑا نہیں، اتنے چوتے اپنے باغ میں پہنچی۔ اپنے پھول پھل سبزیاں دکھائیں کچھ سبزیاں پھل اور گا چھیاں میری گاڑی میں رکھنے کی بہت کر کے مجھے لے ہوئے کمرے میں آ بیٹھی۔ دھڑا دھڑکی باؤں میں آگیا، انصاف، مذہب اور اخلاق پر بحث چھیڑی۔ اور میری دھکتی ہوئی رگ کپڑی۔ تم جانتے ہو یہ میرا خاص میدان ہے۔ مذہبی روحانی اور بلند نظری کے پرچار کے لئے میں کافی بدنام ہوں۔ کہنے لگی میں نے حضرت محمدؐ کے میلاد، سمری کرشن جی کے جنم اور دراجہ رام موہن رائے کی برسی کے جلسوں میں آپ کی تقریریں بڑی دلچسپی سے سنی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ آپ سب مرحلوں اور مذہبوں کو ایک ہی اعلیٰ اور پاک مقصد کے تحت

ملی۔ (ہنسکر) اب وہ مالی تو نہیں؟ اُس کی ڈانٹ اور ڈھیلے اب تنگ یاد ہیں۔ داغ بھی موجود ہے۔ یہ دیکھئے۔ ہماری امرود کی چوری میں اکثر آپ کا بھی حصہ تو ہوتا تھا۔
بیگم۔ مدت کے بعد تم سے ملکر بڑی خوشی ہوئی برابر آیا کرو۔ تمہاری بنیں اور ماں ہم سے کس قدر ملتی تھیں۔ مگر تم تو اب ڈاکٹر ہو۔ اچھا ڈاکٹر علاج و علاج تو ہونا رہے گا کوئی ایسی تدبیر کرو کہ اب بچہ نہ ہو۔ میں آپریشن کے لئے بھی تیار ہوں خواہ میں اس سے جانبر نہ ہوں۔

میں۔ گیارہ برس کے اندر سات بچے ہوئے کمرودوسرے برس عدم آباد سے ایک مسافر موجود۔ ان میں ڈیڑھ برس کا بھی فرق تو نہیں ہوتا۔ ہم ان ناخواندہ بھانوں سے عاجز ہیں۔ یہ بچے نیکلوں کی طرح ماں کو کھائے جاتے ہیں۔
علی۔ (مسکرا کر) قصور کس کا ہے؟

میں۔ جرجے۔
بیگم۔ (جینیکر) شرم تو نہیں آتی۔ یہ ڈھٹائی؟ علی یہ باتیں جانے دو۔ میرے دکھ کا کوئی اور علاج نہیں آپریشن کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟
علی۔ بہن ہندوستانی اور مسلمان بیوی ہو کر بچے روکنے کو کہتی ہو؟ اول تو آپریشن آئندہ صحت کے لئے سخت خطرناک ہے۔ دوسرے کون جانتا ہے زندگی کی کڑی نذر میں طے کرتے کرتے ان مسافروں میں کتنے رہ جاتے۔ تو یہ تو یہ۔ اللہ سب کو رکھے۔ مگر اُس کی مرضی و عاقل سے کہیں پلٹتی ہے؟ اسی طرح مسٹر کرشن نے چھ اولادوں سے تنگ آ کر عمل جراحی کروایا۔ عجب اتفاق۔ دو برس کے اندر وہ چھوٹا سدا ہار گئے۔ آج وہ ایک چوہیا کے بچے کو ترستی ہے۔ اگرچہ آپریشن کے سوا سب تدبیریں ناقابل اعتقاد ہیں جو کر سکیں کیجئے مگر بانجھ تو نہ بیٹے۔ قدرت کے ساتھ زیادہ

ذریعے سمجھتے ہیں۔ یہ راستے اتنے قابل اعتنا نہیں جتنی اصل منزل مقصود ہے۔ آپ کی ایک ہی تپتی اور رنگ رنگ کے گلوب کی مثال مجھے یاد ہے۔ دھرمیوں نے صرف اپنے اپنے مخصوص رنگ کے گلوبوں ہی کو روشنی سمجھ لیا ہے اور اصل روشنی یا مقصد دکھائی نہیں دیتا۔ اسی بھول سے ساری کٹھنیاں ہیں۔ آپ کا یہی عقیدہ اب بھی تو ہے؟

ہیں۔ بے شک۔

ہلی :- صرف عقیدہ ہی یا عمل کی ہمت بھی؟

میں :- تمہارا مطلب؟

ہلی :- مطلب یہ ہو کہ اگر کبھی کسی اعلیٰ مقصد اور اس کے ذرائع میں ٹکرا ہو تو آپ ذریعہ کی پروا کریں گے یا مقصد کی؟

میں :- مقصد کی۔

ہلی :- سمجھ کر جواب دیجئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کسی بلند مقصد کے لئے ضرورت پڑے جھوٹ بولنے کی، چوری کرنے کی، غازی قضا کرنے کی، فرض روزے توڑ دینے کی، حج ملتوی کر دینے کی، تو آپ کریں گے؟

میں :- میرے خیال سے کرنا چاہیے۔ مگر ایسی صورتوں کا پیش آنا صرف قیاسی مفروضہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہلی :- جی نہیں۔ عملی واقعات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں مثلاً ایک خورنیز بلوہ فرد کرنا ہو جس کے لئے آپ جیسی دوسری با اثر شخصیت جس پر فریقین کو اعتماد ہو موجود نہ ہو اور

آپ چلے جائیں جج کو۔ محلے میں آگ لگ جائے یا سیلاب آجائے اور اس کشمکش میں جلتوں اور ڈوبتوں کو چھوڑ کر آپ غازی پڑھنے لگیں یا انظار کرنے لگیں۔ کبھی ہونی تلواروں اور اٹھے ہوئے ڈنڈوں کو گرنے اور خورنیزی کو روک

دینے کے لئے صرف ایک جھوٹ کافی ہو مثلاً یہ کہ گائے کی قربانی روک دی گئی ہے تم اپنے اپنے گھر جاؤ مگر آپ کو اس جھوٹ میں تامل ہو۔ اور تلواریں چل جائیں۔ ٹھہر گئیں۔ آگ لگ جائے۔ ایک یتیم کا ویتھہ اس کے چھانے غضب کر لیا ہو، اور وہ بیچارہ اس کے بغیر اپنی موردنی جائداد سے محروم، نان شبینہ کا محتاج، گدا ہو۔ آپ اس کے چچا کے گھر آتے جلتے ہیں، ویتھہ چرا لاسکتے ہیں، مگر چوری کو حرام سمجھتے ہیں۔

میں :- تم تو بڑی منطقی متقن ہو گئی ہو۔ تم اپنا مدعا صاف بیان کرو۔ چاہتی کیا ہو؟

ہلی :- میں سرمدست آپ صاف صاف سُنا چاہتی ہوں کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے یہی نہیں بلکہ آپ کیا کریں گے؟ حالات کی نزاکت کے لحاظ سے اہم اور اعلیٰ مقصد پر مذہبی احکام اور اخلاقی قانون کو قربان کریں گے یا نہیں؟ میں :- میرا جواب پہلے سے تیار تھا۔ اتنی تقریر کی ضرورت نہ تھی۔ مذہبی احکام ہوں یا اخلاقی یا قانونی میں کسی کو مطلق اور ناطق نہیں سمجھتا۔ سب حالات کے تابع ہیں اور سب کی روح بنی نوع انسان کی بھلائی اور سکھ ہے۔ اس اصول پر ہر اصول قربان کیا جاسکتا ہے اور موقع ہو تو میں خود بھی المقدور تیار ہوں بلکہ ایسی خدمتوں اور قربانیوں کا مستحق، خلق خدا کی خدمت کو میں خدا کی خدمت اور اس کی محبت کا تہذاب وسیلہ سمجھتا ہوں۔

اس ڈھیٹ عورت نے میرا منہ چوم لیا۔ قبل اس کے کہ اس ناگہانی حادثہ کے متعلق میں کچھ سمجھ سکتا اور فیصلہ کر سکتا۔ خیر میں تاثرات کی مقصوری پر زیادہ وقت اور کاغذ صرف نہیں کرنا چاہتا۔ ایک سکند کے اندر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر ہنستی ہوئی بولی۔

کھانے پر مسئلہ کفارہ، شفاعت، محبت، مگنتی، مروان اور
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا کے مسائل پر
خُشک گفتگو رہی۔ بتی نہایت توجہ کے ساتھ اس کی
مخصوص پر میری غصہ اس کے سامنے رکھتی جاتی تھی۔
وہ کھانا نہیں ٹوٹتا جاتا تھا۔ وہ دو ڈھائی تیرے کھا کر
اور زیادہ بول کر جلد تھک گیا۔ ہاپنے لگا۔ اور محذرت
چاہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم کچھ دیر کھاتے رہے۔
فراغت کے بعد بلی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔
بلی :- ”اپنے میرے شوہر کو دیکھا؟ کس قدر قابل رحم
صحت ہے؟“

میں :- ”واقعی؟“

بلی :- ”اور مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ کم قابل رحم؟
میں :- ہرگز نہیں۔ زیادہ۔“

بلی :- ”لطیف صاحب۔ تو ک مجھے بہت مسکھی سمجھتے ہیں۔ کیا
شک یہ ہے؟ جیک آج آٹھ سال سے ایسے ہی ہیں۔ دمہ
کے مائے ہوئے، اکثر خون بھی تنقوکتے ہیں۔ ہاضمہ ردی۔
اگر یہ درست ہوتا تو کھلا ہلا کر میں انہیں کچھ دن سنبھال
لے جاتی۔ جب ان پر دمہ کا دورہ پڑتا ہے تو ساری ساری
رات ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی رہتی ہوں۔ یہ ہے میری
خانگی زندگی۔“

میں :- ”شرائیکے شکار ہیں؟“

بلی :- ”اور کیا؟ خود کردہ تو ہے ہی۔ اعصاب جگر و
سب از کار رفتہ ہیں۔ لا علاج۔ صرف زندگی کے باقی
دن بھرنا ہے۔ جوانی میں چوبیس گھنٹے محمور رہتے تھے۔“

میں :- ”مسیحیت کا پہلا تہذیب کا پہلا سبق!
بلی :- ”لطیف صاحب ایہ طنز کا موقع ہی؟ میں بھی مسلمانوں
سے بے خبر نہیں ہوں۔ چاہوں تو سینکڑوں (بقیہ صفحہ ۸۹)

بلی :- ”میری اضطرابی آزادی کو معاف کیجئے۔ میں اس خوشی
کو ضبط نہ کر سکی کہ ایک آپ ہی میرے ہم مذہب بننے میں
بہتیرے تعلیم یافتہ آزاد خیال، ہندو، آریہ سماجی، برہمو
سماجی، مسلمان عیسائی اور پارسی سے اسی قسم کے سوال
کر چکی ہوں۔ مگر کسی نے ہاں کی جرات نہیں کی۔“

میں نے اپنی بوسہ آؤدہ کچھڑی مونچھوں کو رد مال
سے ہونچھ کر پوچھا :- ”آخر ایسی بخشوں سے تمہارا مطلب
کیا ہے؟ یہ تم نے نہیں بتایا؟“ اُس نے کہا :- ”ابھی رہنے دیجئے
پھر بتا دوں گی مسٹر ہانسو (شوہر) کی دوا کا وقت آ گیا
ہے۔ ابھی پلا کر آئی۔“

پانچ منٹ میں آئی دوسرے کمرے میں لے گئی
جہاں چائے کا سامان کسی قدر تکلف کے ساتھ مہیا تھا۔
زبردستی مجھے سینڈوچ کیک چاکلیٹ انگور سیب
گھسنائے چائے پیکریں رخصت ہوا اور اتوار کو کھانے
میں شرکت کا وعدہ بیکر اُس نے بیچھا چھوڑا۔
باقی آئندہ۔ تمہارا لطیف

————— ❦ —————

عزیز عزیز۔ السلام علیکم
..... تیسرے ہی روز اتوار تھا۔ وعدہ سے زیادہ مجھے
اس کے پھر بتا دوں گی اس کے جواب کی بیٹابی تھی اور سچ
پوچھو تو اس ادھیڑ عمر میں بھی ایک گھڑی کا وہ اختلاط
کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔

صاف مستحضر تو وہ ہمیشہ رہتی ہے۔ آج زدیں
جاریٹ کی ساڑی پہنے اور بانگی وضع سے بال سنوارا
زیادہ دلکش اور جوان نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر مسٹر
ہانسو بھی تھا۔ دمہ سے ٹوٹا ہوا۔ وہ کسی وقت ہڈا مسٹر
اور انسپکٹر مدارس رہ چکا ہے۔ فلسفہ کا ایم۔ اے۔ سے۔

ثمرات

گذرتی ہے جودل پر لے اسیر غم یہاں کرے
 اگر اپنے کو فطرت کا یہ نساں رازواں کرے
 غنیمت ہے جوانی پھر کہاں یہ عہدِ مستی
 امید و وہاں بن جا اسیرِ خار و خس کب تک
 اسی پر دے میں ہو رازِ ظلم کن دکاں مضمحل
 جہاں ظلم جس سے لرزہ بر اندام ہو جائے
 میں جب قائل ہوں تیری ہمت ایذا پسندی کا
 بہارِ جا وداں بگرے جو لوحِ ہستی پر
 بشر کی واسطے عشقِ تمنا ہے شہنشاہی
 خطیبِ گلستاں ہی ہمنوائے گلستاں ہو جا
 محبتِ بچلیوں سے کھیلنا خود سیکھ جائیگی
 سلیقہ کسکوے نوشی کا ہو کسکو نہیں ساقی
 فنا ہو کر جہاں عشق میں ہو جا بقاسماں
 شکستہ خاطر دیکھی تا بمنزلِ دستگیری کر
 ہے روحِ زندگی آزادی انکار سے قائم
 ہر اک ذرے کو کر دے آشنا با مِ ثریا سے
 مرے ہر سانس میں ہیں جلوہ پیرِ اصحیات تو

خوشی پر گمان بے حسی کیوں ہو فغاں کرے
 ہر اک ذرے سے پیدائے تکلف سو جہاں کرے
 جہاں تک ہو سکے سیرِ خراباتِ مِغاں کرے
 نئی صورت سے ترتیب بنائے آشیائیں کرے
 جو تجھ سے ہو سکے تو اپنی ہستی کو عیاں کرے
 فغاں ہی تجھ کو کرنی ہو تو پھر ایسی فغاں کرے
 غم کون دمکان کو اپنے دل میں یہاں کرے
 تو اپنے گریہ خوں کو وہ رنگیں داستاں کرے
 یہ وہ نقشِ گرامی ہو جو تخیلِ جہاں کرے
 سمجھ لیں لالہ و گل جس کو پیدا وہ زباں کرے
 نجاتِ آشیائیں چلے تو قدرِ آشیائیں کرے
 ہر اک کی جانِ فرلے ہر اک کا امتحاں کرے
 اسی عمرِ دور و روزہ کو حیاتِ جا وداں کرے
 جو داماندہ ہیں انکو بھی شریکِ کارواں کرے
 جو اس کو راہیگاں کرے وہ سب کچھ راہیگاں کرے
 زمیں کی جس قدر بستی ہو اوجِ آسماں کرے
 غرض میری بلا کو مانم عمر رواں کرے

نہاں سو پوری

نہاں زارِ تکلیف جہاں گردی سے میں چھوٹوں
 مجھے جذبِ گلستاں کاش خاکِ گلستاں کرے

تمام دُنیا سے نائیدے آرہے تھے، لہذا ان کا استقبال اور ہمداناری ایک قومی فریضہ قرار دی گئی۔ حکومت نے ڈیڑھ لاکھ این کا عطیہ دیا۔ ڈھائی لاکھ این پبلک سے وصول ہوتے۔ اس چندے میں جاپان کا ایک ایک مدرس شریک ہوا ہے۔ مالی امداد کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی تعلیمی اور تمدنی انجمنوں اور اداروں نے بڑی فراخ دلی سے جاپانی تعلیمی انجمن کی امداد کی۔ کسی نے اپنے مقاصد اور کام کی رپورٹ کے پمفلٹ انگریزی میں طبع کرا کے مفت تقسیم کئے۔ کسی نے تحائف پیش کئے کسی نے مختلف ناشوں کا بار اپنے سر لیا کسی نے نائیدوں کی تفریح کا مفت انتظام کیا۔ کسی نے پارٹیاں دیں۔ جہازوں کپنیوں نے اور جاپانی حکومت کی ریلوں نے کرائے میں تخفیف کر دی۔ ہوٹل والوں نے اپنے منج میں رعایت کر دی۔ میونسپلٹی نے اپنی ٹریموں کے مفت پاس دیدئے۔

سب سے زیادہ جہاں نوازی خود کانفرنس نے انجام دی۔ نمائندوں کی روزانہ آمد و رفت کا صرفہ بالکل بچا دیا۔ ہوٹلوں اور کانفرنس ہال کے درمیان بسیں جاری کر دیں۔ صرف اسی پر کتنا نہیں کی بلکہ روزانہ صبح کو ٹوکیو کی سیر کرنے کے لئے مفت بسیں چلتی تھیں۔ سب پر کو تعلیمی اور دیگر ادارے دکھانے لے جاتی تھیں اور شام کو گھر پہنچاتی تھیں۔ رات کو کوئی تفریح ہوتی تھی تو وہاں بھی بسیں موجود تھیں۔ ایک ہفتے تک نمائندوں کی جیب سے آمد و رفت اور سیر تفریح میں ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ بلکہ جس ادارے میں دیکھنے جاتے تھے وہاں چائے اور فواکھات سے بھی خاطر کی جاتی تھی۔ کانفرنس کے ڈائریکٹر صاحبان کو مزید مراعات حاصل تھیں مثلاً جاپانی ریلوں پر سفر کرنے کے لئے مفت پاس ملا ہوا تھا۔

جاپان میں غیر ملکیوں کو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہی۔ ایسے سیاح کم ہوتے ہیں جو دس بارہ این روزانہ دے کر گریڈ سائنڈ رکھ سکیں۔ کانفرنس نے ان دقتوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ نمائندوں کی امداد کے لئے یونیورسٹیوں اور کالجوں سے چار سو رضا کار حاصل کر لئے تھے جو انگریزی اچھی طرح بول سکتے تھے اور سب شریف خاندان تھے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو اپنی مسکراہٹ سے دلوں کی کوفت دور کرنے کا ملکہ رکھتی تھیں۔ یہ رضا کار ہر ہوٹل اور کانفرنس ہال میں متعین تھے اور نمائندوں کی امداد کرنے کے علاوہ قابل دید مقامات و ادارے دکھانے کے لئے ساتھ جاتے تھے۔

خاطر تواضع کی حد ہے کہ نمائندوں کو ایسے ایسے مواقع دکھائے جاتے ہیں جو معمولی سیاحوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ عرصے کے رہنے والے یا اکابر جہاں ہی ان سے استفادہ ہو سکتے ہیں۔ اہل جاپان اپنے ہمالوں کی تفریح کا بہت معقول انتظام کرتے ہیں۔ معلومات میں اصدانے کا انتظام اس سے بھی زیادہ وسیع ہوتا ہو تھوٹے سے عرصے میں اس قدر معلومات فراہم کر دیتے ہیں کہ ہضم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نمائندوں میں سب سے زیادہ خود جاپانی تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔ ان کو غیر ملکی نمائندوں کی سی مراعات حاصل نہ تھیں کیونکہ یہ خود میزبان تھے۔ ان کے مقابلے میں غیر ملکی نمائندے ایک ہزار تھے جن میں سے پانسو ہاک متقدہ امریکہ سے آئے تھے۔ دوسری جماعت کناڈا والوں کی تھی جو انٹرفراڈ مشنل تھی۔ تیسرے نمبر پر ہندوستانی نمائندے تھے جن کی تعداد ستر تھی۔ یہ بڑی خوشی کی بات، جو کہ ایک بین الاقوامی انجمن کے اجلاس میں اہل ہند کی اتنی بڑی جماعت شریک ہوئی۔ اہل ہندو کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ سائٹس سے اوپر اراکین انہی کے فریق سے تعلق رکھتے تھے جن میں ایک درجن سے اوپر خواتین تھیں۔ اہل اسلام کے لئے یہ بات باعث غم ہے کہ کوئی مرد ہندوستان سے نہیں آیا۔ ایک صاحب دہلیا کا دورہ کرتے ہوئے بیشک آچہ۔ دو عورتوں نے مسلمانوں کی لاج رکھی ہے۔ ان میں سے ایک یعنی مسٹر جمال الدین ہندوستانی نمائندوں میں سب سے پہلے جاپان پہنچیں۔ اور دوسری یعنی مسٹر جہاں جعفر علی عین وقت پر جاپان آئیں۔ ان کے علاوہ چار مسلمان نمائندے جاپان میں بنے جن میں سے تین عورتیں تھیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ بیرونی نمائندوں میں عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں۔

ہندوستانی نمائندوں میں دو صحابہ کوورڈ فیڈریشن کے ڈائریکٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اول مسٹر شادوی

پرنسپل گوڈنسٹ کا جج جیمز دویم مسٹر انعام دار ڈاکٹر ٹرافٹ چیلک انسٹرکشن ریاست ایدر راجپوتانہ۔ نمائندگان ہند کے انتخاب صدر کا مسند بڑا پرلطف رہا۔ مسٹر سینٹاوری نے چائے کی پارٹی پر تمام نمائندوں کو بلایا اور چائے نوشی کے دوران میں صدارت کے لئے اپنا نام خود پیش کیا۔ بعض نمائندے مسکرائے مگر ترکیب کار گر نہایت ہوئی اور وہی صدر منتخب ہوئے۔ دیگر قابل اصحاب میں کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر کالیڈاس ناگ، بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر گوڈولے اور بھاونگر کے مسٹر تردیدی تھے۔ موخر الذکر لڑکے لڑکیوں کی باہمی تعلیم کے پر زور حامی ہیں۔

کانفرنس کے اجلاسوں کے لئے امپیریل یونیورسٹی نے اپنی کئی عمارتیں وقف کر دی تھیں۔ آڈیٹوریم میں عام اجلاس ہوتے تھے۔ دوسرے بالوں اور کمروں میں شعبوں کے جلسے کئے جلتے تھے۔ کانفرنس کے دفاتر، دستہ معلومات، ڈاکخانہ وغیرہ کے لئے بہت سے کمرے مخصوص تھے۔ یونیورسٹی میں طبی کالج بھی ہے اس کا شفاخانہ نمائندگان کانفرنس کے لئے کھلا ہوا تھا۔ وہاں ہر وقت فرسٹ ایڈ کارگریڈ موجود رہتا تھا۔ ایک انجمن کی جانب سے عارضی کتب خانہ قائم کر دیا گیا تھا۔ جاپانی اور غیر ملکی کھانوں کے دو رسٹورانٹ کھلے ہوئے تھے۔ چند ڈکانیں بھی تھیں۔ جاپان ٹورسٹ بیورو کا دفتر بھی موجود تھا جس میں ہر مقام کے سفر کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور غیر ملکی سکوں کا تبادلہ بھی ہوسکتا تھا۔ غرضیکہ ہر ضرورت کا لحاظ کر کے اس کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ نمائش گاہوں اور دیگر مقامات پر جہاں نمائندوں کی اکثر آمد و رفت ہوتی تھی سفری ڈاکخانہ کی بس بھی جا پہنچی تھی۔

۲۱ اگست کی صبح کو ایک ٹھیٹھ جاپانی رسم ادا کی گئی۔ ملکی و بیرونی نمائندگان و عہدیداران کانفرنس شہنشاہ یوجی کے مقبرے پر آٹھ بجے جمع ہوئے اور درگاہ پر آداب بجا کر انجمن کے عہد حکومت میں ہی موجودہ نظام تعلیم جاری ہوا تھا۔ شام کو آٹھ بجے یونیورسٹی میں کانفرنس کا رسمی افتتاح ہوا۔ آڈیٹوریم کچھ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد تین ہزار کے اوپر ہوئی۔ اول طلبائے یونیورسٹی کے بینڈ نے قومی ترانہ بجایا۔ جلسہ حاضرین کو دب کھڑے ہوئے۔ بہت سے جاپانی اصحاب نے بینڈ کے ساتھ آواز ملا کر گایا۔ پھر مسٹر کوماسو صدر مجلس استقبالیہ نے انگریزی میں مختصر تقریر کر کے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اب مسٹر نگاتا صدر جاپانی انجمن کی کھڑے ہوئے یہ صاحب سابق میں وزیر محکمہ دارائے بحر و بحار ہیں اور جاپانی انجمن کے رچر داں ہیں۔ بالکل بیمار ہیں اور فطانت میں مقیم ہیں۔ اس جلسے کی خاطر ڈاکٹر سے خاص طور سے اجازت لے کر آئے تھے۔ آپ نے ایک طویل تقریر میں اپنی انجمن کی تعلیمی سرگرمیوں، اہل جاپان کی تعلیمی الواغزمیوں، اور کانفرنس کے اجلاس کی تیاریوں کا ذکر کر کے مہانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان سے انتظامی نقائص پر چشم پوشی کی درخواست کی۔ بعد ازاں ہیراکیلیفسی مسٹر ایچی یاسونی وزیر محکمہ تعلیم نے مختصر تقریر میں مہانوں کا استقبال کیا اور کانفرنس کے مقاصد سے ہمدردی ظاہر کر کے کامیابی کی امید کا اظہار کیا۔ آپ کے بعد سلسلے دار نائب وزیر محکمہ خارجہ، صدر ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی، گورنر ضلع ٹوکیو، میئر شہر ٹوکیو نے اپنے اپنے محکموں کی جانب سے مہانوں کا استقبال کیا۔ تمام اصحاب کی تقریریں جاپانی

زبان میں ہوئیں اور ان کا ترجمہ انگریزی میں منایا گیا۔ ایک امریکہ کے اور ایک انگلستان کے نمائندے نے ہماؤں کی جانب سے پُر تپاک استقبال کا شکریہ ادا کیا۔ سب کے آخر میں ڈاکٹر منرو صدر ورلڈ کانفرنس کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ اگرچہ مجھے خطبہ صدارت پڑھنے کا حق حاصل ہے مگر وہ بہت ہو گئی ہے۔ میں اپنا حق کام میں لانا نہیں چاہتا۔ اس دوران میں مسٹر نکاتا علالت طبع کے باعث اٹھ کر چلے گئے تھے۔ ان کی جانب سے صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کر کے جلسہ ختم کیا۔

جلسہ افتتاحی کے بعد دو عام اجلاس اور ہوئے۔ پہلا دو روز کے بعد ہوا جس میں صدر کانفرنس ڈاکٹر منرو نے فیڈرل کے مقصد اعظم پر یعنی تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے دنیا میں امن قائم کرنے کے موضوع پر تقریر کی۔ آپ کی تائید میں چند ممالک کے نمائندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے میں ہندوستانی نمائندے کو بھی اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ آخری عام اجلاس، رات کی خُب کو ہوا۔ یہ الوداعی جلسہ تھا۔ ڈاکٹر منرو کے بعد مختلف ممالک کے نمائندوں نے اہل جاپان کے پُر جوش استقبال اور شاہانہ ہماؤں نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر بھی ایک ہندوستانی نمائندے کو تقریر کرنے کا موقع ملا۔ جلسہ قوی ترانے پر ختم ہوا جو یونیورسٹی کے بینڈ نے بجا یا تھا۔

تینوں عام اجلاس رات کے وقت ہوئے۔ ان کے علاوہ روز صبح کے نو بجے سے بارہ بجے تک مخصوص مضامین پر مباحث ہوئے تھے۔ کانفرنس کا کام اٹھارہ شعبوں میں منقسم تھا۔

(۱۰) گھر اور مدرسہ۔

(۱) تعلیم بالغان۔

(۱۱) مدرسین تیار کرنا۔

(۲) کالج اور یونیورسٹی۔

(۱۲) ماقبل مدرسہ اور کنڈرگارٹن۔

(۳) براڈ کاسٹنگ۔

(۱۳) دیہاتی زندگی اور دیہاتی تعلیم۔

(۴) تجارتی تعلیم۔

(۱۴) سائنس اور تعلیم سائنس۔

(۵) تعلیمی دستکاری۔

(۱۵) ثانوی تعلیم۔

(۶) ابتدائی تعلیم۔

(۱۶) سوسائٹی کی تنظیم۔

(۷) جغرافیہ۔

(۱۷) مدرسین کی انجمنیں۔

(۸) صحت۔

(۱۸) بصارتی تعلیم۔

(۹) ہرمن جاردن کمیٹی۔

تمام شعبوں میں اسے مقالے وصول ہو چکے تھے کہ ہر شعبے کا اجلاس دو دو تین تین روز تک ہوتا رہا۔ روزانہ آٹھ دس شعبوں کے جلسے ہوتے تھے۔ عام طور سے مقالے انگریزی میں پڑھے جاتے تھے۔ جاپانی حاضرین کی خاطر ان کا ترجمہ جاپانی میں کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کوئی تقریر جاپانی زبان میں ہوتی تو اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا جاتا تھا۔ ہر مقالے پر مباحثہ ہوتا تھا۔ حاضرین کو سوال کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور مقرر کو جواب دینا پڑتا تھا۔ جاپانی نمائندوں کے مقالے انگریزی زبان میں مطلوبہ پمفلٹ کی صورت میں تقسیم کر دے جاتے تھے۔ بیرونی نمائندوں کے مقالے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جو پہنچ گئے وہ

طبع کر کے تقسیم کر دئے گئے۔ بعض شعبوں میں اس قدر مقافے وصول ہو چکے تھے کہ ان کے بڑھنے کے لئے وقت کافی نہ تھا۔ بڑھنے والوں کو قطع ہرید سے کام لینا پڑا۔

کانفرنس کے جلسوں کے علاوہ اس قدر مشاغل فراہم کر دئے گئے تھے کہ کسی نمائندے کے بس میں نہ تھا کہ تمام مشاغل پورے کر سکے۔ پہلا شغل تو کیو کی سیر تھا۔ اس کے لئے صبح کا وقت مقرر تھا۔ جن اصحاب کو شعبہ جات کے جلسوں سے فرصت ملے وہ سیر کو جا سکتے تھے۔ کانفرنس کی بیس تین گھنٹے میں مشہور مقامات دکھلائی تھیں۔

دوسرا شغل۔ مدارس کا معائنہ۔ ماہ اگست میں تمام مدارس تعطیلات گرما کی وجہ سے بند رہتے ہیں بلکہ اداں جولائی سے بند ہونے لگتے ہیں۔ تاہم تو کیو میں چند ابتدائی اور ثانوی مدارس معائنے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں طلباء تو حاضری تھے مگر چند مدرسہ مامور تھے کہ نمائندوں کو پھر کر مدرسہ دکھادیں۔ بعض کنڈرگارٹنوں میں بچوں کو خاص طور سے بلا کر انہیں کھیلتے ہوئے دکھایا گیا۔ نمائندوں کے گروہ روزانہ اسپرل یونیورسٹی کا معائنہ کرتے تھے۔

تیسرا شغل تعلیمی نمائش۔ اس نمائش میں موجودہ تعلیمی نظام کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک دکھایا گیا تھا۔ نیز زمانہ قبل تاریخ سے اب تک کا نظام تعلیم کتابوں اور آلات تعلیم کے ذریعہ سے دکھایا گیا تھا۔ یہ نمائش عورتوں کے نازل کالج میں تین دو منزلہ عمارتوں میں منعقد ہوئی تھی۔ اس پر بڑی محنت صرف کی گئی تھی۔ اب تک جاپان میں اتنے وسیع پیمانے پر تعلیمی نمائش نہیں ہوئی تھی۔

اسی ذیل میں ایک اور نمائش تھی جس میں لڑکیوں کے ایک ثانوی مدرسے کی طالبات کی دستکاری دکھائی گئی تھی۔ اس نمائش میں صرف پرائیویٹ بیکار مشیاسے بنایا ہوا سامان رکھا تھا۔ جو چیزیں ہر گھر میں ردی سمجھ کر بھینک دی جاتی ہیں انہیں سے کارآمد مشیاسے بنائی گئی تھیں۔

چوتھا شغل۔ جاپان آرٹ اور تمدن کی نمائشیں۔ تین نمائشیں قابل ذکر ہیں۔ اول ضلع توکیو کی آرٹ گیلری میں موجودہ آرٹ کی نمائش۔ یہاں جدید مصواری کے شاہکار اکٹھے کئے گئے تھے جو سابقہ نمائشوں میں دکھائے جا چکے تھے۔ اور اب شوقین اصحاب کی ملکیت ہیں۔ دوئم شاہی عجائب خانے میں قدیم آرٹ کی نمائش۔ اس میں محکمہ محلات شاہی کی جانب سے قدیم آرٹ کے نادر نمونے پیش کئے گئے تھے۔

سومیم بشر و کیا ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں جاپانی لباس کی نمائش۔ اس میں ابتدائے تاریخ سے اب تک کے مختلف زمانوں کے لباس دکھائے گئے تھے۔

پانچواں شغل۔ فنون ادب و ہنر کی نمائشیں۔ ان میں سب اہم آرٹس گل کی نمائش تھی کیونکہ مختلف طرزوں کے استاد اس میں شریک تھے۔ اس قسم کی نمائش اب تک جاپان میں نہیں ہوئی تھی۔ اس آرٹ میں جاپان تمام دنیا سے بلند پایہ رکھتا ہے۔ استاد این فن کے نزدیک آرٹس گل کے بہت سے طرز ہیں۔ ہر ایک اپنا ہی طرز رکھتا ہے۔ یہاں مشہور طرزوں کے استاد جمع تھے اور حاضرین کے دہرہ اپنے اپنے طرز پر پھول بجا کر کمال فن کی داد دے رہے تھے۔ یہ نمائش تین روزہ رہی۔

دویم۔ خواتین کی دواجنہوں کی جانب سے نسوانی ہنردوں کی نمائش۔ اس میں دواجنہیں شریک تھیں۔ پہلی جاپانی خواتین کی انجمن ماورائے بحر۔ اور دوسری کلب خواتین جاپان۔ ایک طویل پروگرام میں بہت سی باتیں شامل تھیں۔ اول تو ڈرامہ جو سات اراکین نے کر کے دکھایا۔ دویم عہد میان (سہ ماہی) کا لباس پہن کر اسی زمانے کا ماحول پیش کرنا۔ سویم تقریب چلے نوشی۔ چہارم عہد تو کوگاوا کے لباس میں ناچ۔ پنجم قدیم جاپانی ناچ۔ ششم اراکین گل کر کے دکھانا۔ ہفتم بونکیٹی یعنی کشتی میں ریت اور پتھر کے ذریعہ سے مناظر قدرت کا چربہ اتارنا۔ ہشتم عہد کماگورا کا لکڑی کا کام بنانا۔ نهم جاپانی کشیدہ کاری۔ دهم جاپانی گڑیا سازی۔ یازدہم جاپانی برش سے لکھنا اور تصویر کھینچنا۔ تمام باتیں اراکین انجمن نے خود کر کے دکھائیں۔ یہ پروگرام صرف ایک روز پیش کیا گیا اور آخر میں چائے سے تواضع کی گئی۔

سویم۔ انجمن خواتین قوم پرست کی جانب سے ایک شب کو شادی کا پروگرام پیش کیا گیا۔ اول ناکتہ الملکی اور شادی شدہ عورت کے بال مارو گئے اور شہاد طرز پر بنا کر دکھائے گئے۔ دویم جاپانی آداب کے عین نمونے پیش کئے گئے۔ زمانہ حال میں شاہی فرمان تعلیم کے پڑھنے کا طریقہ۔ زمانہ قدیم میں عورت کے نیرے یا لمبے دستے والی تلوار کے استعمال کرنے کا طریقہ۔ زمانہ قدیم میں مرد کی جانب سے کسی سردار کی خدمت میں تیر و کمان پیش کرنے کا طریقہ۔ آخر میں شادی کی پوری رسم ادا کر کے دکھائی گئی۔

چہارم۔ واسیدا یونیورسٹی میں فوجی کربوں کی نمائش۔ مختلف مدارس کے طلبانے ایک روز جو دو (جیو جیٹسو) کو دو (بھری گنگنا) تیر اندازی، اور لمبے دستے والی تلوار کے فوجی فنون کی نمائش کی۔ لمبے دستے والی تلوار کے کرتب اراکینوں نے دکھائے تھے۔

چھٹا شغل۔ انجمن مادران جاپان کی جانب سے جملہ نمائندگان کو ایک روز ایک ٹھیٹھ جاپانی مکان میں چائے پر مدعو کر کے مکان دکھایا گیا اور گھر اور مدرسے کے تعلیمی تعلقات پر گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا۔ ساتواں شغل۔ جاپان کی میوزیکل اکاڈمی کی جانب سے ایک شب قدیم و جدید جاپانی موسیقی کے نمونے سنائے گئے۔ نیز مغربی موسیقی کے نمونے پیش کئے گئے۔

آٹھواں شغل۔ ایک روز رقص کے ایک ماہر استاد کی جانب سے اسی کے مدرسے میں طلبہ و طالبات نے جاپانی رقص ناچ کر دکھائے

نواں شغل۔ نواب وزیر تعلیم کی جانب سے ایک شب کامیٹی تھیٹر میں کامیٹی ڈرامہ دکھایا گیا۔ دسواں شغل۔ اخبار چچی گچی کی جانب سے ایک روز نکاراز کا تھیٹر میں زمانہ جدید کا ڈرامہ یعنی آپسرا دکھایا گیا۔

گیارہواں شغل۔ بین الاقوامی تمدنی تعلقات کی سوسائٹی کی جانب سے ایک شب کلب نایان کے تھیٹر میں نو ڈرامہ دکھایا گیا۔

بارہواں شغل۔ سوسائٹی مذکورہ صدر کی جانب سے کانفرنس کے چند روز قبل جاپانی تمدن پر لکچروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ موسم گرما کے لحاظ سے موقع بہت موزوں تجویز کیا گیا تھا یعنی دامن کوہ نمبی میں جھیل بمانکا کے کنارے تین روز تک استناداؤن فن نے جاپانی تمدن کے مختلف موضوعوں پر تقریریں کیں۔

تیرہواں شغل۔ ایک ریشم کے کارخانے میں ریشم کی کاشت کا طریقہ یعنی انڈوں میں سے نئے کیڑے بکھلنے کے وقت سے لے کر ریشم کے تانے کے بندل بنانے تک جملہ اعمال دکھائے گئے۔

اسی سلسلے میں گورنمنٹ کی ریلوے ورکشاپ بھی دکھائی گئی۔

چودہواں شغل۔ گارڈن پارٹیاں۔ ایک گارڈن پارٹی صدر توکیو اسپرل یونیورسٹی کی جانب سے یونیورسٹی کے جاپانی وضع کے باغ میں دی گئی۔

دوسری گارڈن پارٹی گورنر ضلع توکیو اور میئر شہر توکیو کی جانب سے مشترکہ طور پر ایک مشہور جاپانی وضع کے باغ میں دی گئی۔ ان دونوں پارٹیوں میں نچ و غیرہ کا بھی انتظام تھا۔

تیسری گارڈن پارٹی ہنر کینسلری مسٹر ہوتا وزیر محکمہ خارجہ کی جانب سے ایک محل میں دی گئی تھی جو شاہی جہازوں کو ٹھیرانے کے کام آتا ہے۔ اس محل میں قدیم جاپانی آرٹ کے نادر نمونے بھی معائنہ کے لئے موجود تھے۔ یہاں ایک یورپین خاتون نے جاپانی مصوری کے ایک شاہکار کے معائنہ کا بالکل اٹوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ اسے ناخن سے کھینچ کر جاسچا اور نقاد کی خوب داد دی۔ نواب وزیر خارجہ کی پارٹی سب سے شاندار اور بڑھکھٹ تھی۔ اس قدر مشاغل سے عہدہ برا ہونا مافوق الفطرت انسان ہی کے بس کی بات ہے۔ اہل جاپان نے اپنی طرف سے مشاغل تفریح و تعلم فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ ان سے استفادہ ہونا نامتناہی گمان کا فعل تھا۔ لوگوں نے اپنے مذاق کے مطابق بعض کو پسند کیا اور بعض کو قربان کیا۔ ان میں تنوع اس قدر تھا کہ کسی کو ترک کرنے کو جی نہ چانتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ذائقہ تو ہر ایک کا چکھ ہی لیا ہوگا۔

کانفرنس کی کامیابی پر کئی پہلوؤں سے تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت ایک بین الاقوامی اجتماع کے نہایت کامیاب رہی۔ آج تک جاپان میں اس پرمانے کی بین الاقوامی کانفرنس نہیں ہوئی تھی۔ چالیس اقوام کے تین ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا اور ہفتے دو ہفتے تک مسلسل ملتے جلتے رہنا ایک معنی رکھتا ہو جو تو میں اپنے مدرسین کی عزت کرتی ہیں وہی اقبال مند ہوتی ہیں کیونکہ مدرسین کے ہاتھ میں قوم کا بنانا بگاڑنا ہوتا ہے۔ اسی قوت کے مالک اصحاب بین الاقوامی دوستی کا بیڑا اٹھا کر تبادلہ خیالات کریں تو امید قوی ہوتی ہے کہ امن عام کا عہد دور نہیں ہے۔ کتنی نئی دوستیاں قائم ہوگی جو آئندہ حصول امن میں مدد ہوگی۔

فنی حیثیت سے کانفرنس کی کامیابی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ توکیو کے اجلاس نے پچھلے چھ اجلاسوں کے بہت سے ریکارڈز مارتے شعبہ جات کے جلسے یا تو ماہرین کے لئے ہوتے ہیں یا ان کی محنت کی داد دینے والوں کے لئے۔ ان میں بھی مخصوص مذاق اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارکنان کانفرنس کے سابقہ تجربے کی بنا پر شعبوں

کے جلسوں کے لئے کافی وسیع کمروں اور بالوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مگر اکثر جملے ایسے ہونے لگے کہ کمرے کچھ کچھ بھر گئے۔ بعض ایسے ہونے کہ شائقین سامنے کے اور اجلاس دوسرے بڑے ہال میں منتقل کرنا پڑا۔ شعبہ ابتدائی تعلیم کے اجلاس میں چھ سو سے اوپر حاضرین موجود تھے۔ مسٹر نیلنگٹن جو دس سال سے اس شعبہ کی صدارت کر رہے ہیں چلاؤ گئے کہ میرے خواب و خیال میں بھی اتنا اجتماع نہیں تھا۔ شعبہ جات کے جلسوں میں حاضرین کا اتنا ازدحام جاپانیوں کے علمی عشق پر دلالت کرتا ہے۔

شرکائے کانفرنس کو جاپان اور جاپانیوں کے مطالعہ کرنے کے جو مواقع ہیتا کئے گئے وہ عام سیاحوں کو ہرگز میسر نہیں آتے۔ اس سے جاپان کے تمدن کی خوب تبلیغ ہوئی۔ جاپان کو اس قلیل عرصے میں بہت سے ننا خواہ دستیاب ہو گئے۔ جاپان، اور دیگر ممالک کے درمیان دوستی کے تعلقات پختہ کر نیوے ذرائع میں معقول اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی کانفرنس کی بڑی کامیابی ہے۔

کانفرنس کو کامیاب بنانے کے ساتھ اس کی ہر یادداشت کو محفوظ رکھنے کا بہت معقول انتظام کیا گیا تھا۔ عام اجلاسوں اور شعبہ جات کے جلسوں کی کارروائی سکریٹریوں نے تو لکھی ہوگی اخبارات کے نمائندے ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ ذرا اسی بات کی خبر اخبارات میں آجاتی تھی۔ تصاویر کی کوئی انتہا نہیں۔ ہزاروں فوٹو لئے گئے۔ خوبی یہ کہ دوسرے روز سے احاطہ کانفرنس میں بچنے بھی لگے۔ روزانہ ہر ہال اور ہر کمرے میں دو دو کارکن آوازوں کو رکارڈ کرنے کے آلات لے موجود رہتے تھے۔ جب فروع ہونے سے ختم ہونے تک جو کارروائی ہوتی تھی ریکارڈ کر لی جاتی تھی۔ اس طرح آئندہ ہندوؤں کے لئے کانفرنس کی پوری کارروائی محفوظ رکھی گئی۔

ہندوستانی نمائندے کانفرنس کی ظاہر و باطنی خوبیوں سے نہایت متعجب ہوئے۔ افسوس ہے کہ بعض ہندوستانی عجیب ذہنیت لے کر جاپان میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ بڑی حقارت سے بیان کرتے ہیں کہ جاپان نے جو کچھ کر دکھایا اور وہ مغرب سے سیکھا ہو۔ گویا سیکھنے کا عمل بڑا ذلیل کام ہے یا مغرب سے سیکھنا مذموم فعل ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کے دماغ میں ایسے جذبات کی موجودگی کیسی حسرتناک ہے۔ اہل ہند کو اہل مغرب سے تعلقات قائم کئے ہوئے دو ڈھائی سو برس ہو گئے۔ اس طویل عرصے میں جدید علوم و فنون پر قادر نہ ہونا تو ہی ظاہر کرتا ہے۔ اہل جاپان کا انہی برس پہلے مغرب سے لیا کھاتے ہی مغربی علوم و فنون کے حصول میں مہمک ہو جانا تو ہی تغلیم اور جاپانیوں کی الو العزیز کی دلیل ہے۔

یہ امر قابل مسرت ہے کہ چند تجارت پیشہ اصحاب نے معلّی کے پیشے کو ایسا معزز سمجھا کہ خود کسی نہ کسی تعلیمی ادارے سے تعلق ظاہر کر کے نمائندگی کا شرف حاصل کر لیا۔ اس فعل میں انسانی کمزوری کو خواہ کتنا ہی دخل ہو یہ ضرور ہے کہ مضابطے میں ہندوستان کا ڈیلیگیشن اس سے ملوث نہ ہوا اور ہندوستان کی ویسی بدنامی نہ ہوئی جیسی تین برس پہلے مس لوز اہل سکریٹری ریڈ کر اس سوسائٹی ہند کے طرز عمل سے ہوئی تھی کہ انہوں نے ریڈ کر اس سوسائٹی میں کار کردہ اصحاب کو تو اپنی ڈیلیگیشن میں شریک کرنے سے انکار کر دیا مگر ایک ایسے شخص کو جو اس سوسائٹی سے بالکل نا بلد تھا اس بنا پر شریک کر لیا کہ مس موصوف کے اسٹنٹ کا رشتہ دار تھا۔

نمائندگان میں مردوں کا لباس تو یکساں تھا مگر عورتیں اپنے اپنے قومی لباس میں لباس پہنتیں۔ جلسوں اور پارٹیوں میں اپنی کے لباس سے رنگینی پیدا ہوتی تھی۔ ہندوستانی سائڑھی بہت پسند کی گئی۔ اس کا گھیرا اور شکتے ہوئے اپنل عجیب کیفیت پیدا کرتے تھے۔ ماتھے پر لال ہندی لطف دو بالا کرتی تھی۔ اہل جاپان اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ اہل ہند کرسی کی نشست میں گھٹنے پر پاؤں رکھ کر سے کیوں سہلایا کرتے ہیں۔ مسٹر سینٹا درمی کوڈ اس پر میٹھے ہوئے اس شغل میں مٹھک دیکھ کر لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

نور الحسن برلاس!

نالہ دل

(نذر دوست)

ہلا کے آہ! مری زندگی کی بنیادیں!

دو چند ہو گئی پابندگی کوئے دوست!!

چینچ

پگھل گیا ہے تپش سے وجود معنی بھی
نثار و کشکش عقل و دل خدا کی پناہ!
فضا قلب پہ مایوسیاں مسلط ہیں
نہ سر دھہر ہے وہ، اور نہ سخت دل ہمارا
وہ خود ہے گردِ درخشاں سے دل بریدہ آہ
ہیں گرچہ تشنہ و ناکام ظاہری آنکھیں
جو دل کہ مرجع صدا بنیسا تھا، ہمارا
مسافت کا ہو احساس کس طرح اُسکو
ہے شعلہ بار کچھ اس درجہ آرزوئے دوست
نہ لے اڑے کہیں جوشِ جنوں بسوئے دوست
سنبھال بہرِ خدا! مجھ کو آرزوئے دوست
عجیب دلکش و وجد آفریں ہوئے دوست
اُسے بھی خون رُلاتی ہے آرزوئے دوست
نفس نفس میں سائی ہوئی ہوئے دوست
بنائے اُسے ناسور آرزوئے دوست
ہر آن جس کے ہو پیش نگاہ روئے دوست

چینچ

تمام صفحہ ہستی کی وسعتیں ہو جائیں
لکھے اسی جائے قلم لفظ آرزوئے دوست

دلفکار

”دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی“ (سلسلہ ماضی)

مضامین فرمودہ کے پہلے تین عنوانوں کے ماتحت اب تک ہم نے صرف کلامِ حسرت سے بحث کی ہو اور اسکی وجہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ آئیے اب اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ اصغر، جگر، اور فانی کے کلام کا بھی جائزہ لے لیں۔

”میکشی“ کے متعلق اصغر و فانی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی مقدار نہایت قلیل ہو اس لئے چند ان قابلِ ملاحظہ نہیں اور تقلید بے معنی سے باز رہنے کی یہ کوشش چاہے ارادی ہو چاہے غیر ارادی بہر حال پسندیدہ ہو۔ جگر نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس لئے قابلِ اعتراض نہیں کہ اکثر ”حال“ ہے۔ محض ”قال“ نہیں۔ اگرچہ اندازِ بیان میں نقالی کا رنگ نمایاں ہے۔ اب رہ گئے تیغ و خنجر و قتل و خون اور نزع و قبر و حشر کے مضامین تو یہ بھی اصغر کے یہاں بہت کم ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں ”نشا و روح“ سے صرف چند شعر نقل کرتے ہیں ۛ

تصویر ہو گئی ہوئی ناز و نیاز کی ۛ میں سر جھکائے اور وہ خنجر تے ہوئے

قاتل نگاہِ یاس کی زوے نہ بچ سکا ۛ خنجر تے ہم بھی اک ۛ خنجر تے ہوئے

کاش اصغر مرحوم زندہ ہوتے تو ہم فراقِ صاحب کی معرفت اُن سے پوچھتے کہ مولانا تیغ تیاغے، کیا واقعی آپکی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ بھی آیا تھا جب ناز و نیاز کی یہ نرالی تصویر گنمی تھی کہ آپ سر جھکائے ہوئے ہیں اور وہ خنجر لے آئے آپ کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہے اور اس کے بعد روہیلہ سرور کی طرح جب وہ آپ کو بچھا کر قتل کی نیت سے آپکی چھاتی پر سوار ہوا اور چھری لگے پر رکھ دی تو آپ نے کبھی ایسی یاس بھری نظروں سے اُسے دیکھا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا؟ تو مولانا ایک راست باز انسان کی طرح یقیناً یہی جواب دیتے کہ نہیں میاں یہ تو محض ”شاعری“ ہے۔ حقیقت سے اسے کیا واسطہ؟ اشدُّ اشدُّ اب ہماری شاعری تقلید بے معنی کے ہاتھوں اس درجہ پر پہنچی ہے کہ ہر بے سرو پا بات، ہر دردِ اذکارِ مبالغہ، ہر دردِ بے فروغ، شاعری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

چند چند

وہ دستِ نازِ چوچر نہائیاں نہ کرے ۛ لحد کا پھول چراغِ سرِ مزار نہ جو

نقشِ قدم ہیں یہ مٹی جانِ بہار کے ۛ اک سیکڑی پڑی ہو کدیرِ کلاب کی

یہ بات مسلم ہے کہ ہر شاعر کا دردِ محبوبِ غم فراق میں کھلا کھلا کے اُسے تمام کرو تیا ہے۔ یہی معاملہ اصغر مرحوم کے ساتھ بھی پیش آیا مگر اسے مولانا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ اُس آدم کش نے مولانا کے مزار پر آئے اور پھول چڑھانے کی تکلیف گوارا کی، بہت سے بدقسمتوں کو تو یہ اعزاز بھی نصیب نہیں ہوتا۔

ہمارے اس بیان سے کہ اصغر و فانی نے ”میکشی“ کے متعلق بہت کم اشعار لکھے ہیں اور اصغر کے یہاں تیغ و خنجر اور قتل و خون نیز مرگ و جد کے مضامین بھی محض خانہ پُری کے لئے ہیں، قارئین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کی شاعری

میسوانہ نقالی سے خالی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ نقالی کا میدان ماشا اللہ بہت وسیع ہو جیسا کہ ہماری فہرست مضامین فرسودہ سے ظاہر ہے۔ اب اپنی اپنی پسند ہے۔ کسی کو کوئی موضوع مرغوب ہو کسی کو کوئی۔ غلطی سے اسی کو بعض حضرات شاعر کے ”انفرادی رنگ“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر یوں ہی تھی۔ ہے بہر حال نقالی۔ الغرض۔ اصرارے اگر تیکیشی ”میں کی“ ہے تو فلسفہ بانی ”سے اس کا بدل کر دیا ہے۔ اور فانی نے اس کے عوض میں نزع و مرگ و قبر و ماتم کا سوانگ بھرا ہے جس کی تفصیل جلد پیش کی جائے گی۔

اصغر کے بعد جگر کا نمبر ہے لیکن قبل اس کے ”شعلہ طور“ سے جگر کی بے کیف نقالی کے نمونے پیش کئے جائیں۔ ”شعلہ طور“ کے مقدمہ نگار سید سلیمان ندوی صاحب کے بعض بیانات کا یہاں نقل کر دینا مناسب ہے تاکہ مقدمہ نگار اور شاعر کے قول کا مقابلہ کرنے کے بعد قارئین کو معلوم ہو جائے کہ مولانا صاحب نے بچاے جگر پر کیسے کیسے ”بہتان“ باندھا ہے۔ ”بہتان“ کے معنی لغت اور اصطلاح عام میں چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ میں اپنے نزدیک اسے بھی ”بہتان“ ہی سمجھتا ہوں کہ ایک ”زند شاہد باز“ کو گولائے پارسا بتایا جائے یا الفاظ دیگر کسی شخص کو ایسے صفات سے موصوف کیا جائے جن سے وہ حقیقتاً بیگناہ ہے یا کسی کے متعلق ایسی باتوں سے انکار کیا جائے جو یقینی طور پر اس میں پائی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب ”اتہام“ و ”بہتان“ کی مختلف صورتیں ہیں۔ سید سلیمان ندوی صاحب جگر کے دیوان ”شعلہ طور“ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

(۱) ”نہ اُس کے کاشانہ خیال میں چشمہائے نسل کی آئینہ بندی ہے نہ اُس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری ہے نہ اُس کے کوچے میں شہد کے دل و جگر کی ٹککاری ہے“

(۲) ”تاثر اور دلفکاری اس کے ہر مصرع کی جان ہو..... وہ..... آجکل کے بعض طالب اثر شاعر و نثر نویس جولاں و مدفن و سورہ یسین و نوحہ و مین و میت و نزع کا ایک تیر کند صفت پھینک کر بالقصد مرغ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں“

(۳) ”جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے.....“

(۴) ”جگر کا طرزِ اِبتائے زمانہ کے طرز سے الگ.....“

مندرج بالا طور میں سید صاحب نے چار دعوے کئے ہیں مگر کلام جگر کے مطالعہ کے بعد انسان یہ رے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہو کہ جگر کے متعلق اس سے زیادہ معصومانہ غلط بیانی آج تک کسی نے نہیں کی۔

پہلے چشمہائے نسل کی آئینہ بندی دیکھتے ہ

دوم نسل اگر تم چھڑ دیتے دل کے زخموں کو ۛ

پھر نسل کی بی بی ایک تنہا مثال نہیں۔ آئینہ اشعار میں اور بھی متعدد ”نسل“ آپ کو ملیں گے سید صاحب کا دعویٰ

ہے کہ جگر کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری نہیں۔ خدا جلے جگر کا یہ شعر سید صاحب کی نظر سے گذرا ہو یا نہیں ہے
مژدہ اسے شوق شہادت اوج بر تقدیر ہے : آج دستِ ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے
شاید بلحاظ نزاکت مولانا نے اس شمشیر کو قصاب کی چھری کہنا مذاقِ سلیم کے خلاف سمجھا۔ اچھا اور سینے سے
صدقے ان ہاتھوں کے جبکہ کبھی خبر تک نہ ہوئی : اس نزاکت سے نکلے برسرے شمشیر چلی
یہاں خود شمشیر تو نازک نہیں لیکن نزاکت سے چلائی گئی ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اسے بھی قصاب کی چھری کہنا
کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بہتر۔ اور سینے سے

کیا کہیں خونِ دو عالم سے بھی اب کبھی ہو بیاس : خونِ بسمل کی حرارت خنجرِ قاتل میں ہے
کیا یہ بھی قصاب کی چھری نہیں؟ اس میں تو ماننا اللہ دو عالم کو ذبح کر ڈالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسے جناب
محبوب جگر کے ہاتھ میں تو قصاب کی چھری ہی نہیں۔ پیکانِ جگر دوز بھی موجود ہے۔ آپ نہ دیکھیں پانہ دیکھنا چاہیں تو اٹھ
کیا علاج۔ ہاتے کسی نے سچ کہا، ہر قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے۔ سید صاحب کو کیا معلوم کہ بیچارے جگر پر کیا گزری۔ کس
بلا کا پیکان تھا کہ سینہ توڑ کر دل میں در آیا اور پار بکھل گیا۔ دیکھئے تو جگر کس طرح تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا ہے
تو کمر سینہ دول یار کا پیکان نکلا : جان نکلی مرے اللہ کر ارمان نکلا

جگر صاحب تو اس دنیا سے فانی سے رخصت ہو گئے، اب حسب دستور قاتل کو اپنی اس حرکت پر مذمت و تاسف ہے
اور جگر صاحب اس تاسف کی وجہ جانتا چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ہے

اب مری لاش پر کیوں سوگ لڑیٹھے ہو : تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی
جگر صاحب کے قتل ہو جانے بعد مقتل میں ایک عجب ہنگامہ برپا ہو گیا ہے
ہرمت سے قتل ہو کیوں ٹوٹ پڑیں نظریں : کیا صورتِ بسمل میں قاتل نظر آتا ہے
مشتاقانِ شہادت ہر طرف سے اُمند آئے کہ اسے تیغ تیز دالے۔ گئے ہاتھوں میں بھی قتل کرتا جا۔ اور تیغ بھی تو
ہے کہ بقولِ جگر ہے

سرداگانِ عشق و محبت کی کیا کمی : قاتل کی تیغ تیز خدا کی زمین رہے
قاتل کے سر پر تو خونِ سوار ہی تھا لبس جو سامنے آیا ایک ہی ہاتھ میں صفایا۔ اس رنگین واقعہ کو جگر صاحب نے بڑی
خوبصورتی سے دھڑکھڑکی میں بیان کیا ہے

قتل گم میں آج ہوئی ہے جگر : چل رہی ہیں خون کی پیکاریاں
اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے۔ جگر کو خدا جانے کیوں یہ خیال آ گیا کہ محبوب کو قاتل و قصاب
بنانا ٹھیک نہیں چنانچہ شعر نظم فرمایا جس میں دوسرے شعر کا ملامت کی گئی ہے

لے جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا۔ فانی بدایونی۔

ان شاعرانِ دہریہ ہو عشق ہی کی مار : ایک پیکر جمیل کو قاتل بنا دیا

دیوانِ جگر کے شروع میں ”چار باکل تازہ غزلیں“ درج ہیں۔ انہیں میں سے دوسری غزل کا یہ شعر ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ غالباً جگر صاحب نے اپنی پرانی رستے میں کچھ ترمیم کر لی ہوگی لیکن فوراً اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ جب ان ”چار باکل تازہ غزلوں“ میں سے تیسری غزل کا یہ مطلع سامنے آتا ہے

اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ : تیری نازک کلائیاں توبہ

معلوم ہوتا ہے کہ قاتل بنا دیا“ والا شعر کسی تبدیلی رستے کی بنا پر بنیں کہا گیا۔ بلکہ قافیہ ”قاتل“ تھا۔ اس کی مناسبت سے جو مضمون بھی اس وقت خیال میں آیا باندھ دیا۔

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد قارئین کو اختیار ہے کہ وہ سیار صاحب کے دعووں کو صحیح مانیں یا جگر صاحب کے بیان کو معتبر جانیں خود ہمارے نزدیک تو جگر ہی کا بیان مرجح و مستند ہے۔

اب ہم سیار صاحب کے دوسرے دعوے کو لیتے ہیں یعنی جگر صاحب ”آجکل کے بعض طالبِ اثر شاعروں کی طرح نہیں جو لاش و مدفن و سورہ یسین و نوحہ و بین و میت و نزع کا ایک تیر کنڈ صفت پھینک کر بالقعہ مرغِ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں“ جس طرح مولانا کا پہلا دعویٰ کلامِ جگر کی روشنی میں غلط ثابت ہوا اسی طرح یہ دوسرا دعویٰ بھی پادور ہوا نظر آتا ہے۔ ہم صرف اشعارِ پیش کئے دیتے ہیں۔ فیصلہ قارئین خود کر لیں۔ اس باب کا آغاز عالمِ نزع سے ہوتا ہے جیسا کہ ہم کلامِ حسرت کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں۔

اب جگر صاحب کا عالمِ نزع ملاحظہ کیجئے

نزع میں ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں : کاش انہیں ایک نظر دیکھوں میں
کیا پوچھتے ہو حالتِ بیمارِ محبت کی : کچھ اور بھی گھڑیاں باقی ہیں محبت کی

مصرور وقتِ نزع جو بیمار ہو گئے : کیا جانے کیا اشاروں میں اقرار ہو گئے
دل میں تم ہو نزع کا ہنگام ہے : کچھ سحر کا وقت ہے کچھ شام ہے

دہم آخر بھی ان کا یہ احترام ہوا : اُسے نہ ہاتھ تو آنکھوں ہی سے سلام ہوا
جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا : تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا !
عالمِ نزع کی مختلف کیفیتیں آپ دیکھ چکے۔ اب دیکھئے کہ شاعر کی وفاتِ حسرتِ آیات کے بعد کیا ہوا ہے
برسنے لگی ہر طرف بیکسی : مری موت میری خبر ہو گئی

لے مطبوعہ دیوان میں اسی طرح تحریر ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہو شاید محبت کی جگہ نصیبت ہو۔ ورد پھر قافیہ کیا ہو گا ؟

مری موت سن کر کیا اُس نے ضبط : مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا
 نہ جانے دل میں وہ کیا سوچتے تھے ہم : مرے جنازے پہ تادیر بڑھکاتے ہوئے
 فطرت کا عام قانون تو یہ ہے کہ جب شمعِ وجود جسم میں جلائی ہو جاتی ہے تو احساس بھی مٹ جاتا ہے لیکن ہمارا شاعر
 اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی بیقرار رہ سکتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اُسے سکون بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ اگر
 آپ کو یقین نہ ہو تو کلامِ جگر سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ سُنئے :
 بعد مرنے کے بھی قرار نہیں : مرگِ ناکام اسکو کہتے ہیں

بن رہی تھی میرے اُنکے درمیان کیا کیا حجاب : موت نے سبے سبکوں کو آخر اسان کر دیا
 نزع و مرگ کا قصہ تمام ہوا اب تربتِ وصال کی باری ہو۔ حسرتِ صاحب کی وفات کے سلسلہ میں ان واقعات
 کی تفصیل آپ سُن چکے ہیں جو ایسے موقع پر پیش آتے ہیں۔ اب جگر صاحب کی زبانی سُنئے کہ اُمیر کیا گذری ہے
 وہ عاشق ہوں کہ میری لاش جب زیرِ مزار آئی : محبتِ نو صحر گر پہونچی تمّتِ سو گوار آئی
 جس پر برس گئی کبھی برقِ جلال یار : ہر ذرہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا
 سستلِ معشوق کی یہ ابلہ فرمیاں تو دیکھئے کہ پہلے تو بچائے عاشق کو کڑھاکڑھاکے مار ڈالا۔ اب قبر پر
 تسوے بہائے آیا ہے

برسانی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے : کیا اُنکے کے کھدیا مری خاکِ مزار نے
 کچھ دلوں کے بعد دوبارہ جگر صاحب کی قبر پر اس کا جانا ہوا تو کچھ اور ہی عالم تھا
 کبکی سائے بدن میں زرد چہرہ اُداس : چُب کھڑے ہیں دُور میری خاکِ تربتِ دیکھ کر
 قیسری مرتبہ جب ادھر سے گذر ہوا تو بیدار تربتِ عاشق پر ٹھوکریں لگاتا ہوا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس بیوفا کے
 اس عمل سے شاعر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی اور قبر کے اندر بے اختیار یہ شعر زبان سے نکل گیا ہوگا
 یہ تربتِ عاشق ہی ٹھکرا کے نہ چل خافل : اس خاک کا ہر ذرہ خورشیدِ بدلاں ہے
 عاشق صاحب جب خاک میں مل کے خاک ہو گئے اور پھر وہ خاک اُدگر محبوب کے دامن پر پیڑھ گئی تو عاشق صاحب نے
 بڑی حسرت سے کہا کہ ہائے ہمیں تو جیتے جی پا بوسی بھی نصیب نہ ہوئی اسی آرزو میں مٹ گئے۔ اب ہماری خاک دامنِ
 محبوب تک پہونچی بھی تو کیا۔

قبر کے بعد دوسری منزلِ حشر کی ہے۔ وہاں جو واقعات حضراتِ شعر کو پیش آتے ہیں انکی تفصیل حسرت کے ذکر میں
 بیان کی جا چکی۔ اب دیکھئے کہ جگر صاحب کیا فرماتے ہیں پاکستان وہی ہے، صرف طرزِ بیان کا تنقید اس فرق
 ہے۔

مچھے شوخِ حشر تو لے کیوں چونکا دیا اٹھ کر : بلائیں ے رہا تھا بخودی میں اپنے قاتل کی
 نگاہِ شوق نے محشر میں صاف تاڑ لیا : کہاں وہ چھپے کہ اکھنوں نے سمائے ہوئے

مشر میں بات بھی نہ زبان سے نکل سکی : کیا جھک کے اُس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

پنچہ پنچہ

کہنا ہو سرِ حشر یہ دیوانہ کسی کا : جنت سے الگ چاہیے دیرِ ادب کی کا
چشمِ دیوانگی شوقِ یہاں بھی نہ کھلی : عرصہ حشر ہے اور دستِ غرِ نواں کوئی
یہ مانا بھیج دیکھا ہم کو حشر سے جہنم میں : مگر جو دلِ گدڑے کی وہ دل ہی جانتا ہوگا
اس آخری شعر میں واقعی جگر صاحب نے کچھ ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے جو آج تک نہ کسی صوفی کی سمجھ میں آئے تھے
نہ کسی فلسفی کی انہر نظر گئی تھی۔ قدرِ ثا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جگر صاحب کو حشر سے جہنم میں کون بھیج دیکھا؟ خدا یا محبوب
اگر مقصود ذاتِ الہی ہے تو یقیناً جگر صاحب کی یہ حدتِ قابلِ داد ہے کہ خدا ہی انسانوں کی طرح جذبات کا پتلا ہے اور
تغیرِ حال بھی اُسے لاحق ہوتا ہے۔ ورنہ پھر مگر جو دلِ گدڑے کی وہ دل ہی جانتا ہوگا؟ کے کوئی معنی نہیں۔ اور اگر
جہنم میں بھیج دینے کا اختیار جگر صاحب کے محبوبِ مجازی کو حاصل ہے تو یہ خود ایک نئی تحقیق ہے اس لئے کہ اب تک
جہنم اور جنت میں بھیجے کا اختیار خدا ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا رہا ہے۔
زلف و شانہ کے مضامین کے متعلق ہماری ذاتی رائے خواہ کچھ بھی ہو لیکن سید سلیمان صاحب کا یہ دعویٰ
کہ جگر کی شاعری میں نہ زلف ہو نہ شانہ، قطعاً غلط ہے۔ مثال کیلئے یہ دو شعر کافی ہیں :
وہ زلفین و دوش پر بکھری ہوئی ہیں : جہاں آرزو تھرا رہا ہے

پنچہ پنچہ

خود شُ و شباب اُنکا کیا کم ہر قریب اپنا : جب دیکھتے اب وہ ہیں، آئینہ ہی شانہ ہی

پنچہ پنچہ

اب تک جگر کے جو اشعار پیش کئے گئے اور جن کی مثل اور بھی بہت سے شعرِ شعلہ طور میں موجود ہیں۔ کیا ان کے
باوجود سید سلیمان ندوی صاحب کا یہ دعویٰ قابلِ تسلیم ہو کہ جگر کا طرزِ بنائے زمانہ کے طرز سے الگ ہوگا؟
کہنہ و فرسودہ مضامین پر طبع آزمائی کے شوق کو اگر ایک عالمِ گروہ سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اردو
شاعری (غزل گوی) کی پوری دنیا اس سے متاثر ہوئی ہے۔ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک جسے دیکھو اس بلا میں مبتلا
نظر آتا ہے۔ پونچ گولوں کا تو ذکر ہی کیا، چوٹی کے غزلگو بھی اسی گروہ میں غوطے کھا رہے ہیں۔ حسرت، افسوس اور
جگر کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب ذرا جناب فانی کی جولانی طبع ملاحظہ فرمائیے۔ آئیے مضامینِ فرسودہ کی پہلی سرخی
یعنی ”پیکان و تیرا خنجر و نمیشیر، اور قتل و خون“ سے ابتدا کریں۔
شوقِ شہادت ہے

لے مشر میں سکر کے گلے سے لگا لیا : کشتوں سے اپنے چالِ قیامت کی چل گئے۔
عالیجاہ دفعا لکھنوی۔

تین قاتل تری دہانی ہے : میری موت اور یہ دستبرد درگ
مراب مجھے بھاری پرماتہ ترے خجکے : یہ بار اتر جاتا، جو دار تھے جل جلتے

آہ قاتل سے

فلانی قاتل میں شیر نظر آئی : لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی
کسی کا ہاتھ وہ قاتل میں اس طرح آتا : نظر پچائے ہوئے آستیں چڑھاؤ ہوتے
اٹھ اسے اڑ میں خجکے منہ چھپاؤ ہوئے : مری قصا کو وہ لائے دہان بنائے ہوئے
اپنی سخت جانی اور قاتل کی نزاکت کا شکوہ سے

مشکل مرے مرنے کی مشکل ہو گا سان ہو : کچھ ناز کی قاتل کچھ میری گراں جانی
قتل کرنے سے پہلے قاتل اپنا خنجر کھینچتا ہو جس طرح قصاب گائے وغیرہ ذبح کرنے سے پیشتر اپنی چھری کی دھار دیکھا کرتا
ہے، فانی صاحب اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں قتل کرنے کے بعد دیکھنا اور اس کی ایک ہنایت معقول وجہ بھی بیان کر دیتے
ہیں سے

دیدنی ہو رنگ دل میں ڈب کچھنے کے بعد : تم ابھی کیا دیکھتے ہو قسم کے خنجر دیکھنا
فانی صاحب ذبح ہوتے ہیں سے

اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اُدھر دیکھو : مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ
اور ذبح ہونے کے بعد احتیاط کی صلاح دیتے ہیں سے

لازم ہو احتیاط اندامت نہیں ضرور : لے اب چھری تو پھینک لو سے بھری ہوئی
معلوم ہوتا ہو کہ چھری سے قتل کر کے پیشتر قصاب محبوب نے ایک تیر بھی فانی صاحب کے دل میں بھونک دیا تھا جکا
پیکان انہوں نے بالقصد دل ہی میں رہنے دیا تاکہ قبر میں ساتھ جائے اور وقت ضرورت کام آئے۔ رسم ہو کہ بعض
خوش عقیدہ لوگ عہد نامہ "کفن" میں رکھ دیتے ہیں اس لئے کفن میں کوئی چیز رکھ دینے کا خیال تو نیا نہیں تاہم پیکان
تیر کی جدت ضرور قابلِ داد ہے سے

پیکان کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانگے : سینہ میں دھواں خیر سے اٹھاؤ کہاں سے
ماتھے جائیگا مری میت کے سامانِ غلش : دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکان میں تیرے تیرے
خون کے دھبے سے

شکر بھی داغ شاہِ خونِ شہید ہے : دھویا ہو او دہن قاتل جگہ جگہ

پہنچتا ہے

لے اس شعر سے یہ امر بھی متفق ہو گیا کہ ایک تیر کے متعدد پیکان ہوتے ہیں۔ فانی صاحب کی یہ ریسرچ بھی قابلِ تحسین ہو۔

حسرت تو بادشاہ تغزلین“ ہی ٹھہرے۔ وہ تو نقالی کے ہر رنگ میں استاد ہیں لیکن دوسرے استاد نے کسی بھی رنگ میں اپنا کمال ضرور دکھایا ہو مثلاً حضرت اصفیٰ نے فلسفہ فانی“ میں جناب جگر نے استخوان بندی میں اور فانی صاحب نے نزع و مرگ، لاش و کفن، میت و جنازہ، ماتم و شیون، تربت و گورغریباں، قبر کے پھول اور چراغ مزار وغیرہ کے بیان میں بقول شمس قلم توڑ دیا ہے، اعتراض اس پر نہیں کہ فانی نے المیہ مضامین پر طبع آزمائی کیوں کی؟ آخر یہ چیزیں بھی ہماری زندگی کے تعلقات سے ہیں۔ نغمہ شادی ہو یا نوحہ غم، ہر ایک بجائے خود ایک اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس اس پر ہے کہ ایک جوہر قابل نے اپنا زور طبع محض بے بنیاد خیالات کے نظم کرنے میں کیوں ضائع کیا۔ ہر زمانہ ہر قوم، اور ہر زبان کے شعرا نے اس قسم کے مضامین کو موضوع سخن بنایا ہو۔ کسی نے قوم کی موجودہ بد حالی پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ کسی نے اپنی عظمت رفتہ پر حسینہ کوئی کی ہو۔ کسی نے شہر شہر شہر لکھا کسی نے اپنے محبوب یا دوست یا کسی عزیز کی موت پر جگر کا دی کی۔ اور یہ سب حالتیں فطری ہیں۔

خاقانی کا وہ قصیدہ دیکھیے جس میں اُس نے ایوان ملائیں“ کو آئینہ عبرت بنایا ہو۔ سعدی کا وہ قصیدہ پڑھیے جسے خلافت بعد ادوی تباہی کا نوحہ کہنا چاہیے ملے ظفر غالب، آرزوہ، داغ، حالی، سالک، افسردہ، شفیقہ، امیر طہیر عیش، مجروح وغیرہم کی اُن نظموں کا مطالعہ کیجئے جو دہلی کی بربادی پر لکھی گئیں۔ مومن کا وہ ترکیب بند ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے معشوقہ حور طلیعت کی وفات پر سپرد قلم کیا ہے۔ مگر خاقانی کے گریہ و ماتم کو ان لوگوں کے نوحہ و شیون سے کیا نسبت؟ فانی کے اس قسم کے کلام کو زیادہ سے زیادہ ایک نہایت رکیک قسم کا سحرین کہہ سکتے ہیں۔ اُن کا درجہ اس میدان میں ایک بہرہ ور سے زیادہ نہیں۔ بھلا ایک بھٹاکٹا انسان اگر درجنوں اشعار اپنی جان بچی، موت اور قبر وغیرہ کے اُن حالات میں لکھ ڈالے جنہیں حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں تو اُسے ایک بہرہ ور کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

”نقاد نے فانی کو ”مرکھٹ کا روئے والا شاعر“ بتایا ہو۔ فراق صاحب فانی کی اس تعریف سے برہم ہو کر فرماتے ہیں کہ ”معلوم نہیں نقاد صاحب اگر — *Houseman* کا *Houseman* اور *St. John* کا *St. John* — *Waste Land* اور *Waste Land* کے *Waste Land* دیکھیں تو کیا کہیں گے؟ بجائے مرکھٹ کے ان شعر کو تو بڑے نظام شمسی کا روئے والا بتائیں گے“

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان شعرا اور فانی کے کلام میں کیا مناسبت ہو جو مثال کے طور پر فراق صاحب نے ان کا حوالہ دیا۔ قیاس مع الفارق کی اس سے بہتر مثال مشکل سے ملے گی۔ فراق صاحب کو اگر اُعلیٰ بے جوڑ ”کا ایسا ہی شوق تھا تو اُس کے لئے شعراے فرنگ کی مثالیں پیش کرنے کی ناحق زحمت گوارا گی۔ انیس و سیر اور دوسرے مرثیہ گوؤں کا ذکر

لے ہاں اے دہلی عبرت میں از دیدہ نظر کن ہاں + ایوان ملائیں را آئینہ عبرت داں۔
لے آسمان راحت بدو گر خون بہا در بر زمیں + بر زوال ملک ستعصم امیر المومنین۔

کیوں نہ کر دیا۔ اس لئے کہ گریہ و بکا اور شیون و ماتم کے مضامین تو اُن کے یہاں بھی بکثرت موجود ہیں۔ ہاں یورپین شعر کی مثال پیش کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ عہد پر پروفیسر صاحب کی ”ہمدانی“ کا رعب جم جائیگا اور بات پردے کی پردے ای میں رہے گی، کیونکہ جو لوگ براہ راست ہاؤس مین، ایلڈ، اور ہارڈی کے کلام کا مطالعہ نہیں کر سکتے انہیں ناچار پروفیسر صاحب ہی کا قول تسلیم کرنا پڑیگا۔

نمونے کے طور پر ہم ان شعر کی چند مختصر نظموں کے ترجمے ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ اُن کے اور قافی کے کلام میں کس حد تک مماثلت ہے۔ ہنر خصوصیت کے ساتھ ایسی ہی نظمیں منتخب کی ہیں جو اختصار کے ساتھ ساتھ کسی غم انگیز موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

A Shropshire Lad by A.E. Housman No 14

جب ہوا چلتی ہے تو بھوکا پودا ہلتا ہے، جھکتا ہے اور سیدھا ہوجاتا ہے۔
وہی بھوکا پودا جوان عشاق کی تبریر کا گاہا ہوا ہے جنہوں نے محبت کی خاطر جان دیدی۔
بھوکا پودا ہلتا ہے اور ہوا اُس پر سے گذرتی ہے۔
لیکن مرنے والا ذرا بھی حرکت نہیں کرتا۔ وہ قبر کا شدید جس نے محبت کی خاطر جان دیدی۔

پہنچنے

L IV.

میرا دل حسرتوں سے معمور ہے۔ اپنے گراں بہا دوستوں کے لئے۔
جنہیں کتنے ہی جوانانِ شبک گام تھے اور کتنی ہی دوشیزگانِ یا قوت لب
وہ جوانانِ شبک گام فراخ چشمہ کے کمنائے۔
اور وہ دوشیزگانِ یا قوت لب اُن میدانوں میں۔
سُورہی ہیں جہاں گلاب کے پھول مڑھ جاتے ہیں۔

پہنچنے

Waste Land by T.S. Eliot No iv.

مرگ بفرق۔

فلپس فنیقی کو مرے ہوئے دو ہفتے گزر چکے۔
بحری مرقاویں کی قافیں قافیں، گہرے سمندر کی موج خیزی۔
اور سودو نہاں سب کچھ اُسے فراموش ہو گیا۔
ایکسٹنٹ البحر موج نے سرگوشیوں کے ساتھ اُس کی ہڈیوں کو جُن لیا۔
جس وقت وہ اچھلا اور ڈوبا، گرداب میں داخل ہوتے ہوئے۔

وہ اپنے شباب اور کہولت کے ادوار سے گزرا۔
 اے مخاطب! تو چاہے یہودی ہو یا غیر یہودی۔
 جسوقت تو جہاز کا (اسیٹرنگ وکیل) پہنیا گھماے اور ہوا کا رخ دیکھے تو
 فلیبس کو یاد کر لیں کہ وہ بھی کبھی تیری طرح خوب روا در کشیدہ قامت تھا۔

پہچہ پنچہ

Wessex Poems by Thomas Hardy "She" عاشق کے جنازے پر

وہ اُسے اُس کی ابدی آرام گاہ کو لئے جا رہے ہیں۔
 جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔
 میں بھی بیگانوں کی طرح پیچھے پیچھے جا رہی ہوں۔
 وہ اُس کے اعتراف ہیں اور میں اُس کی محبوبہ۔
 میں اپنا وہی شوخ رنگ گون پہنے ہوئے ہوں۔
 حالانکہ وہ سب سیاہ مٹی لباس میں ملبوس ہیں۔
 لیکن اُن کی آنکھوں میں غم کا نشان تک نہیں۔
 اور میرا اندوہ مجھے آگ کی طرح بھسم کئے دے رہا ہے۔

پہچہ پنچہ

محبوبہ کا امضائے مختصر

ایک شاعر کے دیوان کے ایک صفحہ پر مدت ہوئی میں نے۔
 اس کے نام کے دو حرف لکھ دیے تھے۔
 (اس وقت) وہ اُس نورانی خیال کا ایک جزو معلوم ہوتی تھی۔
 جو شاعر بلند فکر کے دھندلے سرور کا سرچشمہ تھا۔
 اب جب میں وہ صفحہ کھولتا ہوں تو وہی لافانی نور۔
 اُن اشعار میں جلوہ گر دیکھتا ہوں لیکن اُس (محبوبہ)
 کے نام کے حروف سے وہ درخشانی معدوم ہو چکی ہے۔

پہچہ پنچہ

اگر آپ کا جی چاہے تو آپ بقولِ فراقی "بن شعرا کو پورے نظامِ شمس کا رونے والا" قرار دیجئے۔ لیکن اس حقیقت
 کا رد ممکن نہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ بالکل بخل ہے کہیں شہیدانِ محبت کا ماتم ہے کہیں جوانمرگ دوستوں کی مرگ

بے ہنگام کا رونما ہے۔ کہیں کسی حسرت نصیب کی غرقابی پر بے اختیار ہیں مُنہ سے نکل رہی ہیں۔ کہیں عاشق کے جانے پر بے مثال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ کہیں کسی مرنے والی کی یاد میں کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہو۔

خُدارا انصاف۔ ان شکلیاں خونیں کو فانی کے گریہ و روغین سے کیا نسبت ہے فانی صاحب ماشا اللہ زندہ اور تندرست ہیں۔ مگر خواہ مخواہ بیمار پڑتے ہیں۔ جھوٹ موٹ اپنے اوپر عالم نزع طاری کرتے ہیں۔ مہر جاتے ہیں۔ دفن ہوتے ہیں۔ قبر میں ترپتے ہیں۔ کفن پہاڑ کر پڑتے ہیں۔ خاک میں ملکر خاک ہو جاتے ہیں۔ مگر دل کی میتابی نہیں جاتی۔ بیدار محبوب سے شکوہ و شکایت کا سلسلہ برابر باقی رہتا ہے۔ پھر حشر میں اپنے قاتل سے جاتے ہیں۔ غرض خرافات کا ایک سمندر ہے کہ اُنڈر رہا ہے۔ کاش فراق صاحب سوچتے کہ فانی کی شاعری کوئی حقیقت کی آواز ہے یا ایک دہائی بہرہ دینے کا شور و غوغا؟

”نقاد“ نے اگر فانی کو مرگھٹ کا رونے والا شاعر کہا تو یہ نقاد کی بیجا طرداری ہے۔ اس نے مگر گھٹ کے رونے والے کا رونہ بھی ایک معنی رکھتا ہے مگر فانی کا رونہ محض لایعنی بلکہ اسے رونا کہنا رونے کی توہین کرنا ہے۔ رستم ہند کا پہلا لڑکا کو اسٹیج پر میاں مجنوں کا پارٹ کرتے دیکھ کر اگر تماشائیوں پر اندوہ و طلال کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے تو یقیناً فانی کے وہ اشعار و نمک بھی ہوگی جن میں انہوں نے اپنے عالم نزع، وفات حسرت آیات اور کفن و دفن وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جن حضرات کو کلام فانی کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا ممکن ہے انہیں ہمارے اس قول کے تسلیم کرنے میں کچھ پس و پیش ہو۔ لہذا ہم مثال کے طور پر فانی صاحب کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو مقدمہ نگار کے نزدیک یا سیت کے مرتفع اور ہمارے نزدیک بے بنیاد اور دہائی خیالات کی لوٹ ہیں۔

حضرت فانی پر عالم نزع طاری ہوتا ہے۔ قارئین ذرا اپنا دل سنبھالیں مبادا کو کوئی اندوہناک حادثہ پیش آجائے۔ قدم نکال اتنے گھر سے باہر جو دم بھی سینہ پہل بٹلے ÷ دکھا نہ اب انتظار اپنا یاد کرے انتظار میرا موت آئے نکٹ آئے اب جو تھے ہو تو ہائے ÷ زندگی مشکل ہی تھی مرنے کا بھی مشکل ہو گیا

~~~~~

”اصول شاعرانہ“ کے مطابق حضرت فانی نے عین عالم جاگتی میں اُس ”بانی بیدار“ کو طلب کیا کیونکہ اُس کے لئے بغیر جان نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ آیا۔ اور اب کس طرح حضرت فانی کی روحِ نفسِ عنصری کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتی۔ اللہ اکبر کس قیامت کی کشمکش ہے۔ خدا دوست دشمن سب کو اس بلا سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ لیکن ہمارے پاس اس امر کا کافی ثبوت موجود ہے کہ وہ ”بانی بیدار“ ہرگز ہرگز آخر وقت تک فانی صاحب کو دیکھنے نہیں آیا۔ اگرچہ ایک ضعیف ثبوت یوں بھی ہے کہ جس وقت فانی صاحب کا دم نکل رہا تھا وہ بے وفا کہیں اُور سے گزر رہا تھا مگر غرض نے اُسے اتنی اجازت نہ دی کہ مرنے والے کی آخری حسرت پوری کر دیتا۔ ہر چند فانی صاحب پکارتے رہے کہ

غورِ جن کا صدقہ کوئی جانا ہو نہایت ہے کسی کی خاک میں مٹی جوانی دیکھتے جاؤ

لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا یہ روایت ضعیف ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ فانی صاحب جب

اس دُنیا سے فانی سے رخصت ہو چکے تب کہیں وہ رقیب نواز آیا۔ جب اس کی آمد آمد کی خبر گرم ہوئی تو فانی صاحب سخت بے چین ہو گئے مستقبل کی اذیتوں کا احساس کر کے بلہلا اُسٹے اور عیاضہ یہ شعر فرمایا ہے

موت کی غینہ بھی اب چین کو سونا معلوم ۛ کہ جنازے پر وہ غارت گر خواب آتا ہے

بہر حال وہ آیا مگر ابھی دس بائچ قدم کے فاصلے ہی پر تھا کہ حضرت فانی نے فی البدیہہ یہ شعر کہا اور نہایت دردناک اجڑی بلند آواز سے پڑھا ہے

وہ مرے جنازے پر بعد مرگ آئے ہیں ۛ مدعا ہوا حاصل ترک مدعا کر کے

یہ وہ وقت تھا کہ حضرت فانی کو ہلا دھلا کر کفن پہنا کر جنازہ گورستان کو لیجا یا جانے والا تھا جیسے ہی وہ قریب آیا حضرت فانی اس سے محو طلب ہو کر کفن کے اندر سے چلا کر پوئے ۛ

مُئے جلتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے ۛ کفن سر کاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

چنانچہ اُس نے فانی صاحب کے مُنہ سے کفن سر کیا۔ فانی صاحب گومر جکے تھے مگر ماشاء اللہ طبیعت اس وقت بھی حاضر تھی چنانچہ اُدھر اُس نے ان کے مُنہ سے کفن ہٹایا اور دھرا ہوں نے یہ شعر فرمایا جس میں ایک نہایت دردناک پیرا یہی آخری دیدار سے محروم رہنے کی شکایت کی گئی ہے ۛ

پتھر آگئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی ۛ اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

یہ شعر پڑھ کر حضرت فانی پھر خاموش ہو گئے۔ اس وقت آپ کے چہرہ پر ایک غیر معمولی روشنی آگئی تھی۔ ”وہ ظالم“ یہ کیفیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ حضرت فانی نے پھر شکوہ سخی شروع کیا ۛ

آگئی جو تیرے بیمار کے مُنہ پر روتی ۛ جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

یہ واقعات ایسے ہیں کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جاتے۔ کوئی کہاں تک متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے آخر وہ ”بیدرد“ بھی ٹیپ اٹھا اور موت کو کوٹنے لگا۔ حضرت فانی اُس کی اس سادگی پر مسکرا کر پوئے ۛ

اب میری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں ۛ آپ کو یہ بھی ہوش ہو کر سنے کے مٹا دیا۔

یہ شعر سن کر اس کا دل اور بھی متاثر ہوا اور نہایت محبت بھری نظروں سے فانی صاحب کی لاش کو دیکھنے لگا۔

اب فانی صاحب کے لئے ضبط دشوار تھا مگر بجائے کمزور آدمی تھے پھر مر کر اور بھی نڈھال ہو گئے تھے اسپر طرہ مسلسل شعر خوانی۔ اب ان میں اتنی طاقت بھی باقی نہ تھی کہ شکایت کے چند کلمے زبان سے ادا کر سکتے۔ بہر حال بڑی کوشش اور ہمت کر کے یہ دو مصرعے ارشاد فرمائے ۛ

پھیرے میت کی جانب سے نکلا و القعات ۛ سینکڑوں فنکوں کے نرغیں پر بغاوتیں ہو

انسان کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو آخر انسان ہے مٹی کا بیجان ٹیلا نہیں۔ دل کیسا ہی بے احساس کیوں نہ ہو آخر دل ہے پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اُسی تغافل کش ”نے“ حضرت فانی کی جان لی تھی مگر یہ حالت دیکھ کر اس کا دل بھی خون ہو گیا۔ بے اختیار فانی صاحب کی لاش کو پٹ گیا اور دیوانہ وار فریاد کرنے لگا کہ فانی! فانی! ہائے بولتے

نہیں ہم سے خفا ہو گئے۔ لہذا کچھ کہو تو کیوں خفا ہو گئے۔ تم جو کچھ کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ خدا راضی سے تو ہو۔ کچھ کہو تو آخر کیا چاہتے ہو؟ وہ اس طرح فریاد و زاری میں مصروف تھا اور فانی صاحب بیچائے ٹنگ ٹنگ دیدم، دم نہ کشیدم کے مصداق خاموش پڑے یہ موقع فرسا منظر دیکھ رہے تھے۔

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہاتھ پڑا۔ وہ جنازے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

مری میت پہ ان کا طرز قائم کس بلا کا ہے ؟ دل بے درغاسے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

فانی صاحب کے اقارب نے اجاب سب آخری دیدار کر چکے تھے۔ جنازہ اٹھنے والا تھا۔ گریہ و بکا کا شور آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا۔ فانی صاحب نے آخری کوشش کی اور کسی جیل سے اُسے چند لمحوں کے لئے اور روک لیسا چاہا۔ ایسے شاعر دُنیا میں اب شاید ہی پیدا ہوں جو اپنا جنازہ اٹھتے وقت شعر کہنے کی قدرت رکھتے ہوں۔ آفریں بروح فانی آفریں۔ جب اُس نے پیٹھ پھیری، فانی صاحب نے کفن کے اندر سے چلا کر کہا اسے وہ اٹھا شور قائم آخری دیدار میت پر پڑا۔ اب اٹھا چاہتی ہو لعش فانی دیکھتے جاؤ

مگر تشرکے لمحات گزر چکے تھے، فانی صاحب نے لاکھ بھارا منکر اس دُفانا آستانہ نے پٹ کر بھی نہ دیکھا اور رقیب گھر کی طرف جانے والی سڑک پر تیزی سے روانہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں فانی صاحب کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہوگی اہل دل خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ع۔ قیامت کی تڑپ تھی، انتہا کی بیقراری تھی۔ شاعر کا اضطراب شعر گوئی ہی سے تسکین پاتا ہے۔ چنانچہ فانی صاحب جس وقت چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف تشریف لے جائے تھے انہوں نے آہستہ آہستہ یہ شعر گنگنا نا شروع کیا ہے

سکون موت میری لاش کو نصیب نہیں ہے میرے منکر کوئی اتنا نہ بیقرار ہے

کبھی اس شعر کی تکرار فرماتے تھے۔

ہماری لاش مرقع ہے بیقراری کا ؟ ال اضطراب کی صورت بھی اس قرین ہی

مگر بعض معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ یہ شعر حضرت فانی نے اپنے مرنے کے فوراً ہی بعد کہا تھا گو رستان لیجائے جاتے وقت نہیں پڑھا تھا۔ ان جزئی واقعات کا اختلاف چندان اہمیت نہیں رکھتا۔ قابل لحاظ کوئی اختلاف اگر ہے تو یہ ہے کہ فانی صاحب کے بعض رفیقان خاص نے فانی صاحب کے ارتحال کے بعد خود فانی صاحب کی زبان سے یہ شعر سنا تھا۔

سکون قلب میرے موت ہی سے ہے ؟ غرض کہ خاتمہ رنج اضطراب ہوا

مرنے کے بعد انسان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے جو محکم عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے اس لئے یہ مسئلہ اصرار دیکھنا کہ بعد مرگ انسان کو تسکون قلب حاصل ہو جاتا ہے یا زندوں کی طرح اس وقت بھی اضطراب دامنگیر رہتا ہے۔ لیکن مذکور بالا دو متضاد بیانات کی موجودگی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا اور انفس پر کوئی صاحب کے کلام بعد از مرگ کی روشنی میں بھی یہ مسئلہ اٹھا کا اٹھا ہی رہا۔

جن لوگوں کو حضرت فانی کے مزار پر انوار پہر جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کا بیان ہے کہ اکثر قریب فانی سے یہ آقا نہیں آتی ہیں  
 قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ کم ہوئی : یا وحش! ام ناز نے حشر کا آسرا دیا  
 تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی : ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے تر و جلالت ہوئے

چند بیت

اور فانی بڑھ گئی بیتابی دل بعد مرگ : کیا کہیں مر کر گزرتا رہ بلا کیوں ہو گئے  
 ان اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرے کے بعد عاشق سبقتا رہتا ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ مرنے کے بعد سبقتا رہتا ہے اور  
 بھی بڑھ جاتی ہے لیکن اب یہی مسئلہ زیر بحث حل نہیں ہوا کیونکہ اشعار بالا کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی تربت فانی پر گونجتے ہوئے  
 سنے گئے ہیں :

مر کر تے خیال کوٹا لے ہوؤ تو میں : ہم جان دے کے دل کو نبھالے ہو تو میں  
 کب سے آغوشِ حد میں ہم ہیں سرتاپا قرار : وہ ستم پروردہ اتنا تک بد گمان اضطراب  
 یہ ہے فانی کا غم جو غم جس کے مفکرانہ انداز کی اہمیت کو (بقول فراق) نقاد نے نظر انداز کر دیا۔ یہی ہیں وہ شاعر  
 جو فراق صاحب کو فلسفیانہ احساس سے ملو نظر آتے ہیں۔ اللہ اللہ! کیا فلسفیانہ یاس و غم ہے۔ ہزار آفریں بر شاعر و ہمد  
 ہزار آفریں بر ناقدش۔ یہ چند شعر صرف نمونے کے طور پر ہم نے نقل کئے ہیں ورنہ فانی صاحب کا مختصر دیوان اس قسم کے  
 خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ اپنی مرگ تربت اور واقعات بعد از مرگ کے متعلق مرحوم نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ سب  
 ماشاء اللہ اسی رنگ میں ہے جس کا مکتولہ اسامونہ قارئین نے سطور بالا میں ملاحظہ فرمایا۔

ان لابیعی اشعار کو سنتے سنتے قارئین تنگ آگئے ہونگے لہذا ہم صرف ایک شعر سننا اس باب کو ختم کئے دیتے ہیں۔  
 فانی صاحب جہاں شاعر ہیں وہاں مصوّر بھی ہیں۔ مصوّر اسی معنی میں جس میں ”اوپنے درجہ کے مقدمہ نگار“ شاعر کو مصوّر  
 کہا کرتے ہیں۔ فانی صاحب نے ایک لاجواب تصویر کھینچی ہے۔ تصویر کا حسن صرف یہی نہیں کہ اسے دیکھ کر انسان کے دل  
 میں جذبہ انسا ط پیدا ہو۔ نہیں غم، خوف، نفرت، کراہت، وحشت جو کیفیت بھی طاری ہو صناعت کے کمال کو ظاہر  
 کرتی ہے۔ فانی صاحب شعر کے قاعدہ کلیہ کے مطابق عاشق ہونے کے بعد دیوانے ہو گئے تھے۔ دیوانے کا علاج زنجیر  
 چنانچہ آپ کو بھی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ فراق یار کی اذیت، العظمت اللہ! بڑے ٹھٹھے رہے۔ آخر میاں مجنوں کی  
 طرح صرف پوست و استخوان کا مجموعہ رہ گئے۔ یہاں تک کہ جسم کی کھال بھی گل گل کے گر گئی اور صرف کٹمی بھر پٹیاں  
 زنجیروں میں پٹی ہوئی رہ گئیں۔ یہ تھی آپ کی آخری حالت جب آپ نے وفات پائی۔ زنجیروں میں پٹی ہوئی ہی چند  
 پٹیاں تھیں جنہیں حضرت فانی کا جنازہ کہہ سکتے ہیں۔ انہیں کو لوگ گورستان لے گئے تھے

پٹیاں ہیں کی پٹی ہوئی زنجیروں میں : لے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

اور سپرد خاک کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہائے اب ایسے چوٹے کے غرگلو! کہاں پیدا ہوں گے۔

عند کیب شادوانی

چند بیت

(باقی آئندہ)

# قاضی نذر الاسلام

کو راج کرتی ہیں۔۔۔۔۔ اس کی کیفیت کا کچھ اندازہ اس کی ”فراڈ“ سے ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

”میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں، مستقبل کا  
پیشین گو یا معبر نہیں۔ روٹی ٹھاکر اپنے ابدی  
نفعے سنایا کریں، مگر مجھے تو صرف صبح کی بھیڑیں  
سے سروکار ہے۔ اگر روٹی ٹھاکر دہر زمانہ کے  
شاعر ہیں تو میں بھی کم سے کم اپنی پسندیدہ  
جھک اور اپنے خط ہی کو شعر کا جامہ پہنا دیتا  
ہوں“

مگر ایک شاعر سے ہمیشہ یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی  
شخصیت کو تمام دکال بھجائے، خصوصاً ایسے وقت جب وہ  
معذرت کر رہا ہو جس ٹٹے کو نذرل کسر نفی سے ”ہو جوگ“  
کہتا ہے۔ وہ محض ”بیکاری کا مشغلہ“ نہیں بلکہ ایک آتش فیز  
جذبہ ہے جو صرف اسی کے لئے مخصوص ہے اور اس کی رومانی  
طبیعت کا بہتہ دیتا ہے۔ یہ اس کا ہمیشہ  
آزاد رہنے کا آسنی عزم ہے۔ موجودہ حالات کے خلاف بغاوت  
کا ارادہ ہے، اور حقیقی آزادی اور محبت کی خواہش بے پایاں  
ہے۔

کیا یہی چیزیں نہ عقین جوئے سے جیلتا لے گئیں؟  
اس کا یہ ”بیکاری کا مشغلہ“۔۔۔۔۔ یہ شوقِ فضول  
\_\_\_\_\_ ہی اس کی شخصیت کا غمان ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ  
وہ ”خود“ ہے۔

کیا آپ کسی ایسے شخص کا تصور کر سکتے ہیں جس کو کوئی

”ایک رند خراب حال“۔۔۔۔۔ سوسائٹی کی لعنت ملتا  
اور عوام کی نکتہ چینیوں اور طنز و تشنیع کے باوجود بھی عرفانی  
دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ لوگ اس کی طرف اپنی خیر کنکھیوں  
سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ دزدیدہ نگاہی کبھی کبھی قدر  
دانی اور جذباتِ تحسین کی حامل ہوتی ہے، مگر زیادہ تر اس سے  
نفرت و خفاہت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اور ”نذرل“ بھی ایسا ہی ہے۔۔۔۔۔  
مرد اسے صنفِ نازک کا پرستار سمجھتے ہیں۔ عورتوں کو شہ ہوتا ہے  
کہ وہ ان سے متنفر اور بیزار ہے۔ مولوی اسے ”ہندو“ سمجھ کر  
اس سے ناامید ہو چکے ہیں اور ہندو اس کو ”برہمن“ بتاتے  
ہیں۔ کچھ لوگوں کی آرزو ہے کہ وہ چھ جیلخانہ بھیج دیا جائے۔  
SATURDAY LETTERS سر ہفتہ اس کا کلام خراب  
کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کی ”بیلی“ کو ”جھنگلی“ سے بدلایا جاتا  
ہے اور اسے ایک ایسے ہوس پرست اور بیدھ کر کے جوانوں  
کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس نے اب ٹھک کر حب الوطنی اور  
اصلاح عوام کے مشاغل میں آخری پناہ لی ہے!

ایسے حالات میں یہ امر ایک گوند کیلکین بخش ہی کر ڈیگور  
اسے اپنے سایہِ مہافت میں لیتے ہیں۔ اور اپنے ڈرامہ ”بندت“  
کا انتساب اس کے نام پر کرتے ہیں۔ اور اسے ”جنگل کا فوجیر  
شاعر“ کہہ کر اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

یہ جھنگلی نقیص (Parodies) بھی جو اس کا کلام  
خراب کرتی ہیں اور اس کا مذاق اڑاتی ہیں، صدرِ مدح دلچسپ  
ہیں۔ اس کے کمالات اور شخصیت کو نقصان پہنچانے کے  
بجائے یہ ان پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس کی ابھی ہوتی شخصیت

مشغل نہ ہو؟ اُٹ! کتنا ہیسا تک تصور ہوگا!

اس کی شہنشاہی ”بدروہی“ دبا جی، جس نے جنگل میں ایک طوفان پکا کر دیا تھا، ان جو شیلے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔  
”کہہ، اسے جو اکر دعا دے

کہہ، امیر اسر بلند ہے

جس کو دیکھ کر وہ ہمالیہ کی چوٹی

اپنا سر خرم سے جھکا لیتی ہے!“

جیسے جیسے ہم اس کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

میں ایک بڑھتی ہوئی روحانی سنت اور بلندی کا احساس ہوتا ہے، ہمارے ارادے مضبوط اور تمام بندشوں کو توڑنے

کے قابل ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری روح اپنی حدود اور قیود سے آزاد ہوتی جاتی ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اسرار طاق

دہی ہے، اور اتنی ہی طاقتور ہے جتنی کائنات کی جو شیش نمو اور اس کا اصل اصول۔ یہ طوفان بلا کے گرداب میں بھی سلطاح

جلوہ نہا ہے جیسے نیم سحر کے بلکے اور ڈنک جھونکوں میں۔ سمندر کے تہ جہزیں بھی دہی ہے اور دھڑکتے ہوئے سینہ میں بھی اسکی

کار فرمائی ہے۔ یہ سبکی کی کڑک اور چمک میں اسی حد تک نمایاں ہے، جتنی آنکھ کی ضیاء باریوں، نغمہ کے کی تھر تھر اہٹ، آلام کی

شدت اور درد محبت کے مارے ہوئے دل کی آخری ضربوں میں۔

یہی ثوابت میں ہے، یہی ستیا روں میں ہے اور یہی ”نگاہِ ناد“ کے کرنوں اور عارضِ ہمیں کی چا پروردہ سُرخ

میں!

ہم میں بھی یہی رداں دواں ہے۔ ہم بھی وہی ہیں؟ یہ زندگی جاوید طاقت ہے اس لئے ہم بھی ہر وہ تبدیلی اور حرکت پیدا

کر سکتے ہیں جو ہم چاہیں۔ لیکن یہ طاقت جہاں ہر تحریک تخریب کی بانی ہے۔ دہاں کائنات کو سکون اور ہم آہنگی کی لوری دیکھ

سلا بھی سکتی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے جب

تمام طاقتیں متوازن ہو جائیں، جب ظلم اور نا انصافی کا وجود نہ رہے۔۔۔۔۔۔ اس وقت جا کر کہیں یہ باغی آرام لگا!

مگر اس وقت بغاوت کے اسباب کیا ہیں؟ ایک عام آسودگی، ایک نہ پوری ہونے والی تمنا، ایک کبھی بار نہ ماننے

والی، کبھی نہ ٹھکنے والی اور ہمیشہ جدوجہد کرتے رہنے کی قضا۔ اس کا ناول ”گم کردہ اسیری“ جو خطوط کا مجموعہ ہے

اس حقیقت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ نور الہدیٰ اپنی باغی کو اپنی بغاوت پر طبیعت کا حال لکھ رہا ہے، اور ان الفاظ

میں سب کچھ کہہ ڈالتا ہے۔

”میری یہ رحم نہ آستانا، بہائم صفت بغاوت۔ انسان کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے پیدا کرنے والے کے خلاف ہے!“

دیگر مقامات پر بھی اہم کچھ ایسے ہی خیالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ مثلاً

”اس مصیبت زدہ کائنات کے سینہ پر خداؤ کرکڑاؤں کو ہاتھ ہے

کہ کہیں یہ اپنے پیدا کر نیوالے سے بھی نہ بڑھ جائے اور خود اسی کو لقمہ نہ بنائے!“

یا پھر:۔

”مجھے خدا کی ضرورت نہیں مجھے انسان کی تلاش ہے“

پس یہ ”باغی“ مروجہ بیزار نہیں بلکہ اپنی فطرت کا سچا بھرپور۔ اس کی بغاوت کا سبب وہ فطری، وہ مصائب اور وہ

مظالم ہیں جن کو وہ۔۔۔۔۔ اس محبت خالی دنیا میں۔ اپنے اندر اور چاروں طرف محسوس کرتا ہے۔

یہ باغی آخر چاہتا کیا ہے؟ ایک کامل آزادی کی حالت محبت اور سرور و نشاط۔

ایسی نازک اور سریع الجس نہیں ملتی جو اسے اس زنجیر میں مُقید کر سکے۔ آزادی اس کا منہ چڑاتی ہے۔

"دیکھ تیری آوارہ گردی اور آزاد روی ہی تیرے لئے جفا ہے... ایک زندانِ بلا ہے... کیونکہ یہ تجھ کو سب سے طبعہ — بالکل تنہا — رکھتی ہے!"

آزادی اپنی بقا کیلئے محبت کی طالب ہوئی ہے، اور جس آزادی تو پھر تکمیلِ محبت کا خواب دیکھتی ہے — ایک قصہ سرمدی کی آرزو کرتی ہے (اس کھینچا تائی کی نہیں، جو محبت کو "ایک رستا کشتی کا مقابلہ" بنا دیتی ہے۔ اور نہ اس کا روبرو محبت کی بوسما ہے اس نیم گرم کڑہ پر نظر آتی ہے)۔

اس کی "شریکِ قصہ" کہاں ہے؟

اس کی سرس بھری، روح کو تر پانے والی آواز دور سے سنائی دیتی ہے، شاید مر مر میں فرش پر اس کے قدموں کی جھنکا بھی "فردوسِ گوش" ہوتی ہے، شاید اس کے لمبوس کی سرسرا بھی دل کی حرکت تیز کر دیتی ہے، مگر —

وہ خود کہاں ہے؟

یہ ہے وہ انہی دردِ آزادوں کے حصہ میں آیا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ "ماغی" "اکیلا" اپنے خیالات کی ڈونیا، میں اُدھر اُدھر گھومنا کرتا ہے۔

نڈرل کی شاعری اس کی شخصیت کے ان دو متضاد

عناصر کی آئینہ بردار ہے — ایک تو اس کا جذبہ آزادی

اس کا کبھی شکست نہ ہونیوالا جذبہ آزادی۔ اور دوسری اسکی

روحانی تسنگی، اس کی خواہشِ غلامی — قیدِ محبت کی آرزو

اور یہ ایک دوسری محبت کا پیشِ خیمہ ہے۔ "محبت کا آتنا

زیادہ بھوکا ہونے کے باوجود وہ اپنے عقائد اور نظریات میں اتنا

پوا ہوس اور بندہ نفس کیوں نظر آتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں۔

"ارے وہ تو بچا ادا باش ہے!"

وہ اپنے "آہنگِ فردوس" میں اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

"خواہ جنت میں میرا ہم نفس کوئی بھی ہو —

مگر کیا میرا یہ نصب العین حاصل ہو جائیگا؟"

یا۔

"نہن ہے میں تم سے مل سکوں — دہاں

جہاں آسمان جھک کر جنگل کے سبز کنارے کو بوسہ

دیتا ہے"

یہ وہی تلاش اور جستجو ہے جو یلیسیز (Ulysses)

کو دامگیر مضمون ہے جس نے پرومیتھوس (Prometheus)

کے قلب میں آگ لگائی تھی، جس نے فاسٹ (FAUST)

کو ستایا تھا — "ناممکن انحصار کی تلاش، ہمیشہ لگے

بڑھتے رہنے کی خواہش، انسان کے مقابلے لئے شعلہ آسمانی

کی جستجو.....!"

نصب العین ہمیشہ حصول کی دسترس سے آگے ہی ہینگا

"نہن تک ہم کبھی اپنا ماتہ نہ پہنچا سکیں گے، مگر پھر بھی ہم کو اس

تحقیقِ لامحالہ کی کوشش کو چھوڑنا نہ چاہئے" ہجومِ ناامیدی

کے باوجود بھی یہ "سعیِ باطل" ہم کو جاری رکھنی چاہئے۔

اسے کیا چیز ستاتی ہے، اس آوارہ و بھول باغی کو؟

وہ اپنے آپ کو "گم کرنا اسیری" کہتا ہے، "آزاد اسیری"

نہیں کہتا۔ دردِ آزادی کیسا ہوتا ہے؟ آزادی اس کا شعار ہے۔

وہ بالکل آزاد ہے — بلا دردِ ٹوک —

ایسا آزاد جس کا سنبھانا ناممکن ہے۔ مگر پھر بھی ایک پوشیدہ

درد اس کے اندر رہ کر نہیں لپکتا ہے۔ اس کا خلقِ خلک دیتا

ہے اور اس کی آنکھوں میں وحشت اور حسرت پیدا کر دیتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح کا یہ جذبہ آزادی

ہی — آزادی سے سیر ہو کر — اب بھولوں

سے گزرجی ہوئی زنجیرِ غلامی کیلئے بے چین ہے، مگر آؤ کوئی ہستی





# مہنی

بینی سکول آف آرٹس میں، جو مشرقی فنونِ لطیفہ کا سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے، ایک حسین و شیزہ آرٹ گیلری میں لیکٹ آؤٹ تصویر کے سامنے بہت کھڑی تھی۔ اس نے نہایت سادہ کپڑے پہن رکھے تھے جن سے اس کی خوش مذاقی مترشح تھی۔ بظاہر وہ مضطرب اور نڈھال معلوم ہوتی تھی۔ مگر، غنوانِ شباب اور اس پر لکھنات و نمکان نے اس کے رخساروں کو مسخر و اور آنکھوں کو دکش بنا رکھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کُن زیا بارتش سے میرا ہونے پر زیادہ دل فریب ہوتا ہے۔ اور جب یہ عجزیوں کے حصہ میں آجاتا ہے تو اور بھی نکھر جاتا ہے۔

وہ تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں ایک کم سن و بہقان لڑکا ایک چٹان کے سرے پر منہ سے بائسری لنگے کھڑا تھا۔ چٹان کے نیچے سرسبز وادی ایک ایسے غمیں فرش کی طرح دو رنگ پھیلی ہوئی تھی جس کی دھاتی زمین پر رنگ برنگے پھول نہایت احتیاط سے کارڈے گئے ہوں۔ وامن کو سار میں تناور درختوں کے جھنڈ پھیرموں کے ریوڑ کے مانند کھجے ہوئے نظر آتے تھے، دور پس منظر پر ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری کرنیں غمیں کے نیرودں کی طرح ادبے بادلوں میں پیوست تھیں۔ اور مندر کے طللی کلس کے ماشے ہفت رنگی شاعروں سے جھجکا رہے تھے۔ فضا میں جگلوں کا ایک قافلہ اپنے سیرے کی جانب واپس لوٹ رہا تھا۔ تصویر کے ماسیہ پر اس کی مشرقی سرودشام، اور مصور کا نام جگدیش لکھا ہوا تھا۔ جو نہایت مضبوط جوئی چو کھٹے میں جکلی ہوئی آہنی زنجیریں سے دیوار پر آویزاں تھی۔

دو شیزہ تصویر کے آگے تصویر بنی کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے خیالات میں اس قدر کھوئی ہوئی ہے کہ اُسے تصویر میں کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ دماغِ جب خیالات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے تو دیگر خواہ اس پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایسا عالم میں کھڑی تھی کہ جگدیش ہاتھ میں رنگوں کی پیالیاں اور قلم لئے ہوئے ایک دروازہ سے آرٹ گیلری میں داخل ہوا۔ لوجھ کیلئے اس کو بغور دیکھا اور پیشانی پر بل ڈالے ہوئے دوسرے دروازہ سے باہر نکلا گیا۔ خوابوں کی دنیا میں اپنے والے یہ تخیل پرست مصور بھی کیسی عجیب و غریب طبیعت کے مالک ہوتے ہیں! کون جانتا ہے کہ اس وقت جگدیش کے خیالات کیلئے؟

”ڈاکٹر صاحب! اہم!“ دو شیزہ نے کافی دیر کے بعد ایک چہرہ ای کو اپنی طرف آئے دیکھ کر دریافت کیا۔

”صاحب کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے،“ چہرہ ای نے خیر ارادی طور پر ایک بار انہیں الفاظ کو دہرایا جنہیں وہ برسوں سے دہراتا چلا آیا تھا اور اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

”لیکن میں صرف.....“

”صاحب کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے،“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیشی درست کرتے ہوئے پھر وہی جملہ دہرایا۔

”تم مجھے صرف اندھانے دو، صاحب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے،“ دو شیزہ نے منت آگئیں اجہ میں کہا۔

چہرہ ای نے ایک بار نظر بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اُسے رحم آگیا۔ کیونکہ اس نے اس مرتبہ جب ایک ملاقاتی پرزہ لگا کر

پیش کیا جس نے اس کی خانہ پُری کر دی۔

نام :- میں موہنی .... پیشہ .... ملاقات کا باعث :- .....

چراہی پُرزہ لیکر اندر چلا گیا اور دو منٹ کے بعد لوٹ کر کہا "صاحب کہتے ہیں کہ سہ پہر کو ملو"

جو اس سُن کر موہنی نے ایک معنی خیز انداز میں سُکر دیا: "گو یا وہ کہنا چاہتی ہے کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی یاں انگیز باتوں کو کسی شمار میں نہیں لاتی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سہ پہر کر لگی۔ شاید عزت و عشرت میں خود داری کا احساس لازم نہ لائے ہو جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بجا۔ ڈائریکٹر صاحب اپنی بیٹ لے ہوئے آئیں روم سے باہر نکلے۔ پنج پر بیٹھی ہوئی ہوئی کو دیکھ کر ایک لمحہ کینے رُکے اور وہاں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ حالات خلاف معمول دیکھ کر چراہی بھی پیچھے پیچھے ہو گیا۔

"ہم سے کوئی ملاقات کا منتظر ہے؟"

"نہیں حضور، وہ تو وہی بڑی ہے جسے آپ نے سہ پہر کو بلا یا ہے"

"اچھا، اسے اسی وقت بھیج دو"

(۲)

دوسرے دن آرٹ سکول کے پینٹنگ ہال میں موہنی ایک بند اسٹیج پر ماڈل بنی بیٹھی تھی۔ ہال کے طول و عرض میں طلباء مختلف زاویوں سے اس کی تصویر کھینچ رہے تھے۔ اسٹر صاحب کمرے میں ٹہل ٹہل کر ضروری ہدایات دے رہے تھے۔ ٹہلے ہوئے وہ ہال کے دوسرے سرے پر جگدیش کے قریب آکر رُک گئے۔

"تمہاری آنکھیں لم ہیں جگدیش، کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"کچھ نہیں اسٹر صاحب، زکام ہو گیا ہے اس نے آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں"

"خوب! تم نے اس کے بھی آنسو بہا دیے ہیں!!" اسٹر صاحب نے جگدیش کی بنائی ہوئی تصویر کو بغور دیکھا اور سُکر کہا۔

"یوں تو یہ بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن احوال ...."

"وہ چرچ رور ہے اسٹر صاحب!!"

"ہو گا۔ اچھا جگدیش! آج تمہاری طبیعت ناما معلوم ہوتی ہے۔ اب تم جاؤ اور اپنے کمرے میں آرام کرو۔ شام کو جب

میں بورڈنگ ہاؤس کے قریب گذروں تو مجھے اطلاع دو کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے"

جگدیش تمام دن خیالات میں کھویا رہا۔ موہنی کی یہ حالت کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ چند سال پہلے دونوں بہت روم چکے تھے۔ اور ساتھ ہی ولسن کالج کلکتہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اسے کھاتے پیتے گھرنے کی لڑکی کی حیثیت جانتا تھا۔ جگدیش بھی کچھ گھر سے آسودہ تھا اس لئے بی۔ بی۔ لے کر کرنے کے بعد بی بی اگر محض یہ طور و فضل سکول آف آرٹ میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد کبھی اُسے موہنی کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ بلکہ موہنی کی نظریں تو آج صبح بھی پینٹنگ ہال میں اس پر نہیں پڑیں۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے

اسے دیکھ بھی لیا تو پہچان نہ سکے گی۔ جبکہ اس کا فوریہ حال تھا کہ وہ اپنے کالج کے بینئر ساتھیوں کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اپنے آپ کو کس طرح اس پر ظاہر کرے۔ وہ کسی طرح موتی کی کو ایسی ناگفتہ بہ حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

————— (۳۱) —————

شام کو جگدیش بورڈنگ ہاؤس سے نکل کر ب سڑک کھڑا تھا تاکہ ماسٹر صاحب جب وہاں سے گزریں تو وہ انھیں اپنی صحت سے آگاہ کر دے۔ چوراہے پر سے مڑ کر آتی ہوئی کوٹنر کی ہوا۔ سڑک افق کے اس پار تک چلی گئی تھی۔ راستہ کے دونوں جانب حد نظر تک ٹیلیفون کے اونچے اونچے آہنی ستون برقی تاروں کے جال کو فضا میں پھلے پھلے تھے۔ جگدیش ایک ستون کا سہارا لئے نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ وہ خیالات میں اس قدر محو تھا کہ آرٹ سکول کے گھنٹے کی آواز بھی اسے سنائی نہ دی۔ دفعۃً اس کی نظر موتی پر پڑی جو موٹروں اور گاڑیوں کی آمد و رفت کے درمیان سڑک کو عبور کر تیشی کو شیش کر رہی تھی۔

”موتی! موتی!! کہہ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

”جگدیش!!“ موتی پلٹ کر اس کے آگے کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک موٹر خرابے بھرتا ہوا اس سے ٹکرا کر گزر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوراہے پر آرٹ سکول کے طلبہ اور عوام کا مجمع ہو گیا۔ درمیان میں جگدیش موتی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے گرد دوستوں کو دیکھ کھدکھا:۔

”ٹیکسی بلواؤ شمش! دینو بھائی دیکھ کیا رہے ہو۔ برن سنگوا ڈبرن، چوٹ زیادہ ہے۔ لوگوں کو بھانا ڈر ابھائی آخر!۔“

موتی! موتی!! ہوش میں آؤ!!!“

جگدیش کے ساتھی حیران تھے کہ اُسے اس لوکی کا نام کیوں سمجھ معلوم ہوا۔

ٹیکسی آنے پر جگدیش نے فوراً موتی کو اپنے دوست ڈاکٹر کیشانی کے ہسپتال پہنچایا۔

————— (۳۲) —————

دوروں کی یہ ہوشی کے بعد موتی نے آنکھیں کھولیں اور جگدیش کو اپنے سر پہنے پاکر نہایت نحیف آوازیں کہا ”میں لکھا احسان کہی نہ بھولوں گی، جگدیش بابو، لیکن اگر میں اسی حادثہ میں مر گئی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو موتی! تم جلد اچھی ہو جاؤ گی، ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی کہہ رہے تھے۔ وہ آئے ہی ہوں گے زیادہ گھٹو نہ کرو۔ نقاب بہت بڑھ جائیگی۔“

”میں کچھ کہہ رہی ہوں جگدیش بابو۔ میرے لئے مر جانا ہی بہتر تھا۔ آپ کو میرے متعلق تشویش سی ہو رہی ہو گی، میں طبعی ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں۔ شاید اس کے بعد موقع نہ ملے۔“

جگدیش گویہ نہیں چاہتا تھا کہ موتی اپنے آپ کو لپکان کرے۔ لیکن حالات کو جاننے کے لئے وہ پرحمچ بے چین تھا۔ اسلئے خاموش ہو رہا۔

”دوسال ہوئے پتا چلی کا انتقال ہو گیا۔“ موتی نے کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد میں کیلر رہ گئی، بالکل تنہا۔ رشتہ داروں نے میرے گھر کا صفایا کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ میرے ایک ماموں ہیں۔ میں انھیں کے پاس رہ کر کرتی تھی۔ لیکن جب پتا چلی کی چھوڑ دی

ہوئی تمام رقم ختم ہوگئی تو انھوں نے بھی مجھے دق کرنا شروع کیا۔ آخر ایک دن مجھ سے پھٹکارا حاصل ہی کر لیا اور مجھے بسپتی کے ایک رخصتی مقام کا نام بتلا کر ٹرین پر سوار کر دیا کہ اس جگہ مجھے استانی کی حیثیت سے طلب کیا گیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں کسی نہ کسی طرح دنیا میں اپنی جگہ پیدا کر لوں گی۔ کیونکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کالج کی تعلیماتہ لڑکیاں بڑی ترافد اور زمانہ ساز ہوتی ہیں۔ اور اگر میں ایسی نہ بھی ثابت ہوئی تو ان سے باز پرس کرنا لامیر کون تھا؟ اس کے علاوہ بسپتی میں میرے منگیتر رہتے ہیں۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی تیس سہارے کی امید میں ان کے دروازہ تک پہنچ جاؤں گی اور انھیں موقع ملے گا کہ لگ جائیگا کہ میری فراری کی کوئی وجہ نہیں پھیل کر سماج کے آگے اپنی صفائی پیش کر سکیں۔

موتی نے ایک گہرا سانس لیکر سلسلہ کلام کو جاری رکھا: بسپتی پہنچنے پر مجھے اپنے ماحول کی نزاکت کا احساس ہوا۔ یہ صرف تعلیم کا نفع تھا جو میں ایسی حالت میں بھی اپنے اس قائم کھسکی اور چند روز اسی طرح گزار لئے۔ لیکن بہت جلد زمین مجھ پر تنگ ہوگئی۔ دن تو بھیسے بیت جاتے تھے لیکن راتیں زندگی اور موت کی کش مکش میں کٹنے لگیں۔ یہاں کے کینا آشرم اور دھرم شالے شریف عورتوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہیں۔ ان میں مصیبت کی ماری اور دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو دو روز سے زیادہ مفت سہنے نہیں دیا جاتا بلکہ اکثر صورتوں میں پہلے ہی دن آشرم والوں کے عجیب و غریب مطالبات شروع ہو جاتے ہیں ملاؤ ازیں شہر کے شریف کہلانوالے امیروں کی شرافت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ چند روز کے لئے کسی غیر عورت کو مفت کی روٹیاں توڑنے دیں۔ موتی ایک لٹھ کیلئے رک گئی جگہ نشین جسمہ کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

”میں نے دنیا اور دنیا والوں سے مایوس ہو کر خودکشی کی ٹھان لی۔“ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”لیکن میں نے سوچا کہ رخصتی سے پہلے مجھے اپنے مردہ جسم کی آخری رسومات کا انتظام کر جانا چاہئے۔ شاید کسی کو مرے کے بعد چھ پرچم آجائے۔ حالانکہ میں بھی طرح جانتی تھی کہ فل پاتھ پر پڑی ہوئی میری لاش کو جو سب سے پہلے ٹوٹے گا وہ اس مال غنیمت کو ہتھیار مجھے سڑنے کے لئے دیں چھوڑ جائیگا اور اس وقت تک میری لاش نہیں اٹھائی جائیگی جب تک کہ اس کی عفویت سے راہگیروں کو سانس لینا دشوار ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد اس بوسیدہ لاش کو ہسپتال سے ڈاکٹری کے کسی طالب علم کے ہاتھ فروخت کر دیا جائیگا۔ آہ غریبوں کو مرے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ روپے کے عوض غریبوں کی لاش خرید سکنے والے امیر ان کے مردہ جسم کی بوٹیاں اڑا دیتے ہیں اور ان کے دل و دماغ کو چیر کر اپنی علمی تشنگی کو دور کر دیتا سامان جیسا کرتے ہیں۔ اُت بہند کہلانوالی دنیا کی بربریت، ابہر حال میں نے تسکین طلب کیلئے اس دن اس سکول آف آرٹس میں داخل بنا پسند کر لیا جس کے سامنے آپ بچے دیکھ کر آواز دی تھی،.....“

”آپ زیادہ گفتگو نہ کیجئے۔ آپ کو آرام لینا چاہئے۔“ ڈاکٹر کیشانی یہ کہتے ہوئے روکی بوتلیں لئے کمرے میں داخل ہوئے۔ جگہ نشین پر ایک سکتہ کا عالم طاری تھا۔ یہی کبھی وہ اپنے انسور و مال میں خشک کر لیا کرتا تھا۔ موتی نے ڈاکٹر کیشانی کی نظر میں اٹھا کر پھر کہنا شروع کیا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ نے بڑی مہلیت اٹھائی۔ مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ پیر میں آپ کے خلوص کی منون ہوں مگر آپ نے میری لاش مند زندگی کی روح چھوٹ کر مجھے اور میری ماڈالہ ہے۔ لوگوں کیلئے ڈاکٹر فرشتہ رحمت ہوتا ہے لیکن میرے لئے

ڈاکٹروں کا وجود کس قدر خوفناک ہے۔ معاف فرمائیے میں ہوش میں ہوتے ہوئے بھی ذرا ہیکی ہیکی باتیں کر رہی ہوں۔ آپ نے اس قسم کی گفتگو کا ہے کوئی ہوگی۔ لیکن اگر آپ کان رکھتے ہیں تو سنئے۔ یہ ساز کے ٹوٹنے والے تاروں کی جھنکار ہے۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ساز صرف ایک بار پیش کر سکتا ہے۔ آہ ڈاکٹر صاحب! ایک ڈاکٹر آپ ہیں جنہوں نے مجھے چلا کر موت کی صوبتوں میں بٹھا کر دیا ہے۔ میری زندگی ایک طویل موت بن کر رہ گئی ہے۔ اور ایک ڈاکٹر میرے ہونے والے بچے ہیں جن کے پاس سماج نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ میں جیتے جی جاسکوں! سستی ہوں کہ وہ مہینے کے بہت بڑے اور شہرور ڈاکٹر ہیں۔ لیکن آپ کو میرے سر کی قسم آپ ان سے ہرگز نہ کہنے کا کہ آپ نے ان کی موت ہی کو ایسی حالت میں دیکھا ہے... کیا آپ ڈاکٹر کیشانی کو نہیں جانتے؟.....

"موتی! موتی! موتی!!" ڈاکٹر کیشانی کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا۔

"آپ اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ڈاکٹر صاحب؟ خاندان ہوئے۔ میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجو آپ کتنے رحمدل ہیں!....."

"میں، میں ہی ڈاکٹر کیشانی ہوں موتی! میں ہی کیشانی ہوں!!"

ڈاکٹر کیشانی نے دونوں ہاتھ موتی کی جانب بڑھا دیئے۔

جلد پیش جس کی آنکھیں اب تک لم آلود تھیں، مسکرا دیا۔

غلام عباس (تولکے)

(طبع ارد)

## میرے حلیب

مرے حلیب! مجھے وقفِ اضطراب نہ کر  
جگو کو سوزشِ پیہم سے چمکنا نہ کر  
مرے شباب کی راتوں کو سو گوار نہ کر  
مرے حلیب! مجھے وقفِ اضطراب نہ کر

نرس رہی ہے تری دید کو نظر میری  
شہوں کو خون رُلائی ہے آرزو تری  
مری بہار غدارِ اخنذاں شکرا نہ کر  
مرے حلیب! مجھے وقفِ اضطراب نہ کر

وطن میں جا کے جو عزت زدہ کو بھولنا تھا  
خارجِ قرب میں حسرت زدہ کو بھولنا تھا  
تو کیوں یہ کہہ نہ دیا پہلے، ہم سے پیار نہ کر  
مرے حلیب! مجھے وقفِ اضطراب نہ کر

الطامشہای

ہوئی ہے عمر سرت کی چھیک پانہ سکا  
ہزار جا بھی میں نے تو مسکرا نہ سکا  
خوابِ زیست کو اتنا توبیخہ ار نہ کر

# عورت کے حقوق

عورت کے حقوق کے متعلق دنیا کے مختلف حصوں میں ہزاروں قانون بنے۔ مگر جب تک اسلام دنیا میں نہ آیا "صنف نازک" نے اپنے اصلی اور نظری حقوق حاصل نہیں کئے۔ ظہور اسلام سے پہلے "عورت" جس کو فطرت کے حسین ترین شاہکار و ہونیکا مخدہ حاصل ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ اور ایشیا کے ممالک میں بھی ایک ناقابل اعتنا، سستی سمجھی جاتی تھی، وہ مرد کی غلام اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم ایک نہ لیل و نوار اور حقیر ترین شے خیال کی جاتی تھی، جائداد کی طرح ایک شخص کو دوسرے شخص کے نام منتقل ہو سکتی تھی، قمار بازی میں اس کی بازی لگائی جاتی تھی اور اس کا نام دنیا یا جیت لینا تہذیب اخلاق کے مین شایان شرافت سمجھا جاتا تھا۔

دنیا کے مختلف ممالک کو فطرت نے انفرادی خصوصیتیں عطا کی تھیں، ان میں سے روم کا قانون سے خاص مناسبت تھی، رومن قانون تمام دنیا میں اہلی اور افضل تسلیم کیا جاتا تھا، سارا یورپ اس قانون کو مستند سمجھتا تھا، رومن قوانین آج بھی تمام یورپ کے قوانین کا سنگ مینا ہیں۔ اس مستند ترین قانون میں عورت کے حقوق یہ تھے کہ وہ کسی کے عقد نکاح میں آنے کے بعد اسے شوہر کی ندر خیریت داد ہو جاتی تھی، اس کا تمام ذاتی مال و متاع خود بخود اس کے شوہر کی ملک بن جاتا تھا۔ اور وہ جس طرح مناسب سمجھتا اس کو صرف کرتا تھا۔ وہ جو کچھ دولت اور روپیہ اپنے زور بازو اور محنت سے پیدا کرتی تھی سب شوہر کا ملوکہ سمجھا جاتا تھا، وہ کوئی خدمت حاصل نہیں کر سکتی تھی اور نہ کسی کی ضمان ہو سکتی تھی۔ وہ اسے شہادت کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ کسی سے کوئی معاہدہ کر سکتی تھی، یہ بات تک کہ وہ وصیت کر بھی نہیں جاز نہیں تھی۔

حکومت روم نے جب عیسائی مذہب اختیار کیا تو کچھ اصلاحیں ہوئیں، لیکن یہ اصلاحیں برائے نام اور وقتیہ ہوتی تھیں، کچھ زیادہ وقت گزرنے نہیں پایا تھا کہ پھر وہی قدیم اصول اور قدیم قوانین اسی ان بان سے لوٹ آتے تھے۔

چھٹی صدی عیسوی میں ایک جملہ عظیم اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے منعقد کیا گیا کہ عورت کا جسم "روح" کا حامل ہے یا نہیں، اس اجتماع عظیم نے بڑی فیاضی اور دریادلی سے اس قدر تسلیم کیا کہ "عورت" نوع آدم میں داخل ہو اس لئے وہ ذی روح" بھی جاسکتی ہے مگر اس کی تخلیق کی غرض و غایت صرف مرد کی خدمت کرنا اور اس کے ہر حکم کی بلا تردد و حیلہ تعمیل کرنا ہے۔

یورپ میں ایک عرصہ تک اس قسم کے قوانین جاری رہے، تقریباً ساٹھ سال گزرے کہ قانون نیواں بنا، جس کے بعد ان قوانین اور اصول میں کچھ اصلاح ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت سی خامیاں اب بھی باقی ہیں، مثلاً عورت اپنی ملکیت کا حق کسی چیز پر بھی بحیثیت بیوی ہونے کے نہیں رکھتی، شریک زندگی کو کہلاتی ہے مگر ملکیت میں اس کی حقیقی شرکت نہیں پائی جاتی، باپ یا شوہر سے ہر شے کہ وہ کوئی شخصیت نہیں قائم کر سکتی، اپنی ملکیت اور جائیداد خالص اپنے نام سے نہیں رکھ سکتی۔ اور نہ کسی قسم کا قانونی معاملہ کر سکتی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مغربی اور دوسری اقوام نے عورت کے معاملہ میں ہمیشہ نیچے کا اظہار کیا ہے، یہی سبب ہے

کہ غریب عورت ہر دور اور ہر تہذیب میں مختلف سلوک اور برتاؤ کی آماجگاہ بنی رہی۔ قدیم تاریخی غاروں اور مندروں کے مجسموں اور نقشوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کبھی اس کی پرستش بھی کی جاتی تھی۔ کسی زمانہ میں اس کی تصویریں عبادت گاہوں کی زیب و زینت بھی بن چکی ہیں۔ بعض دور اس پر ایسے بھی گزریے ہیں کہ اس کو بے حد ذلیل و خوار سمجھ کر اس کے ساتھ نہایت ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ کسی زمانہ تک ایسی اس کے ساتھ اچھا سلوک اور شریفانہ برتاؤ نہیں کیا گیا۔

دوسری سابقہ اور موجودہ تہذیب پر غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ غریب عورت کو ایک مقبوضہ جاند ادبھا گیا ہے جس طرح جاند امقوقہ وغیرہ منقولہ کو کوئی انسان اپنی ملک سمجھ کر اس پر قابض رہتا ہے اور اس میں مانے تصرف کر سکتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی منقولہ کیا جاتا تھا، مثل جاند امقوقہ کے وہ اپنے ورثہ میں تقسیم ہو سکتی تھی۔ یا اپنے شوہر کی زندگی میں اس کی نظروں سے گرجا جاتا تھا بعد سر باز فروخت کی جاسکتی تھی، گویا کہ وہ مرد کی ایک جاند امقوقہ ہے جس سے ہر قسم کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

عورت کیلئے جب کبھی قوانین مرتب ہوئے اور اصول قائم کئے گئے ان کا فائدہ صرف یہ ہوتا تھا کہ اس کی حیثیت کو کم کیا جائے۔ اور اس کو وہی اپنی قدیم پست اور ذلیل حالت میں رکھا جائے تاکہ مرد کی ہمسری اور برابری نہ کرنے پائے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکی کہیں قابلیت اور صلاحیت نہ پیدا ہو۔

بدھ مت میں عورت کا جو تصور تھا وہ اس سے یہود اہم ہے کہ اس سے کنارہ کشی اور طہمتی کا حکم دیا گیا تھا گویا کہ وہ ایک ناپاک اور ذلیل ہستی ہے۔

ہندوستان میں عورت کو عالم شیر خوار ہی میں قتل کروا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی عورت کا مرد کے محل میں آنا ایسا تھا کہ ہر فیہ کیلئے اس کی ملک بن جاتی تھی، شوہر کے بعد یا خود وہ ہمیشہ کیلئے بیوہ بنی بیٹی رہے یا اس کی اڑھائی کے ساتھ "ستی" ہو جائے، کہیں کہیں یہ بھی دستور تھا کہ ایک بیوہ دوسرے بھائی کی موروثی جائیداد بھی جاتی تھی اور زرخ بھائی کو مردہ بھائی کی بیوی پر بغیر اس کی رضامندی کے اپنی بیوی بننے کا حق حاصل تھا، بعض دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک بھائی اپنی زندگی میں دوسرے بھائیوں کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق دیدیا کرتا تھا، شوہر کی عبادت اور پرستش عورت کی زندگی کا ایک اہم جز سمجھا جاتا تھا، شوہر کے تیرہ ہو کر پانی پینا عورت کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بہترین اصول سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ گھر کے سامنے مرد اور لڑکے کھانا نہ کھالیں عورت کو غور و خوش کی اجازت نہ تھی۔

ہندوستانی تہذیب پر ایک حقیقی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں عورت کا وہی درجہ ہے جو بیچ اقوام کو عطا کیا گیا ہے عورت کے ساتھ ہندوستان نے جس قسم کی بد سلوکی کی ہے وہی شاید ہی کسی ملک میں کی گئی ہو، جب تک شوہر زرخ ہے اس کی کچھ آؤ بھگت ہوتی ہے، لیکن شوہر کے بعد جو سلوک اس کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ اتنا رنج و فرساور و خراش ہے کہ اس کے تصور ہی سے روئے بھٹکے ہو جاتے ہیں۔

عرب میں عورت کو در اہت کا مطلق کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، باپ کے بعد اس کی بیویاں بیٹے کو ورثہ میں ملتی تھیں اور وہ ان کو بغیر کسی احساس کے اپنی بیویاں بنا لیتا تھا، اکثریت ازدواج کی کوئی حد و انتہا نہیں تھی۔ اکثر قبائل میں شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کر کے بیچنا ظالمانہ اور وحشیانہ رسم جاری تھی۔ لڑکیوں کو بیاہ دینا نہایت مذموم اور ذلیل سمجھا جاتا تھا، آخر یا اسے لایا جاتا تھا یا بیچ دیا جاتا تھا۔ لڑکیاں ترکہ پروری سے محروم رہتی تھیں۔ بعد باپ کے بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو بیوی بنا لیتا تھا، دو عقیق ہونوں سے ایک ساتھ عقد کرنا جاتا تھا، باپ کے بعد اس کی بیویاں

بیٹے کی نظر میں اموال لاوارث بھی جاتی تھیں، مرد کی نظر میں عورت کی مطلق کوئی عزت اور وقعت نہیں تھی۔ دورانِ گفتگو میں یہی اسکا کوئی احترام یا پاس نہیں کیا جاتا تھا، جو تینم و سیر لو کیاں سیاہ کے قابل ہوتی تھیں، ان کے دلی اور سر پرست ان میں سے کئی کئی کو اپنے عقد میں لاتے تھے تاکہ ان کا مال و متاع اپنے تصرف میں لائیں۔ ان سے اور ان کے اموال سے مستفید ہونے کے بعد ان کو بے یار و مددگار در بدر کی ٹھوکریں کھانے یا بازارِ سخن کی جنس بیکر عصمت و عفت کا سودا کرنے پھوڑ دیتے تھے۔

عرب کی مناسبت اور غیر متحد سماج میں طلاق کی سہولت غیر محدود تھی۔ مرد عورت کو کسی دھم یا کسی خیال کی بنا پر جب چاہتا بغیر کسی وجہ اور سبب کے فوراً طلاق دے سکتا تھا۔ بعض اشخاص اس خیال کے تحت کہ اگر ان کی وہ بیویاں جن کو انھوں نے پھوڑ دیا ہے دو ٹول سے عقد کر لیں گے تو ان کی ذلت ہوگی۔ ان سے دست بردار ہونے کے بعد ہی اپنے ہاں نہایت خراب خستہ حالت میں رہنے پر مجبور کرتے تھے، اپنی بے خطا اور بیوقوف بیویوں کے احساسات اور جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔

چین میں عام طور پر عورت کو تندہ، خندہ، ہٹ دم اور سرکش سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ اصول قائم کر لیا گیا تھا کہ اس کو اپنی حد سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ وہ آگے بڑھ کر کچھ بھٹنا نہیں جانتی۔

یونان میں یہ دستور تھا کہ عورت بالکل پردے میں رہے، بچپن ہی میں اس کا سیاہ ہو جاتا تھا۔ چرخہ کا تنا، کپڑے بننا، کپڑے کا ٹھننا اور خانہ داری کا انتظام کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا، وہ مکان کے ایک علیحدہ حصہ میں رکھی جاتی تھی، باہر نکلنے کی اس کو سخت ممانعت تھی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ کسی مرد سے نہیں مل سکتی تھی۔ اور کسی دعوت ہو تو ہانوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

رومن تہذیب میں عورت کا لقب بد تہذیب اور تلون مزاج تھا۔ اس میں کوئی خوبی ایسی نہیں بھی جاتی تھی کہ اس کو منہ دکھایا جائے اور اس کو سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ یونان کے فلاسفوں کی یہ رائے تھی کہ عورت کو کسی صورت اور کسی حیثیت مرد کے برابر نہیں دیا جائے، اگر اس کو متادی حقوق دیدیے جائیں تو وہ قابو سے باہر ہو جائیگی اور مرد پر حکومت کرنا شروع کر دیگی۔ وہ بیباکی جاپنے شوہر کی کنیز بن جاتی تھی۔ اس کی ذاتی ملک اور جائیداد بھی از خود اس کے شوہر کی ملک ہو جاتی تھی۔ غرض کہ ہر طرح وہ شوہر کی دست نگر اور محتاج ہو کر حالت غلامی اور قید میں زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی مقبوضہ شے بھی جاتی تھی جو ضرورت کے وقت فروخت بھی ہو سکتی اور رہن بھی کی جاسکتی ہے، اس کا تبادلاً بھی ہو سکتا اور کسی ایک جام شراب پر شادابی کر دی جاتی ہے، جب عورت ملک ہو جائے تو اس کی اپنی ذاتی مالکانہ حیثیت معرض بحث میں آ ہی نہیں سکتی۔

یہودیوں کے ہاں نکاح درحقیقت عورت کی خرید و فروخت ہے، اس کی قیمت عورت کے باپ کو ملتی ہے، مولوی بنیو اپنی مقدس کتابوں کی شریعت کی رد سے عورت کے ذلیل، حقیر اور کم رتبہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ڈونائس "گناہ" عورت کی بدولت وجود میں آیا۔ اور اس گناہ کا سارا وبال اس کی گردن پر ہے، عورت تمام انسانی گناہوں کا سرچشمہ قرار دی گئی۔ ایک یہودی مصنف لکھتا ہے "مرد کی برائیاں عورت کی نیکیوں سے کہیں بہتر ہیں" اکثر یہودی تصانیف میں مرقوم ہے کہ "عورت دوزخ کا دروازہ اور جہنم انسانی گناہوں کا سرچشمہ ہے، اس کو محض اس خیال ہی سے شرم کرنا چاہیے کہ وہ "عورت" ہے، اس کو ہمیشہ نفس کشی کرنی چاہئے اور امتحانات میں مشغول رہنا چاہئے، اس کو اپنے حسن سے شرمندہ ہونا چاہئے کیونکہ شیطان کا سب سے قوی اور مضبوط حربہ ہے"۔



سنہ جی سے کچھ قبل مسئلہ ازدواج کے متعلق ایک بڑا تغیر رونما ہوا، اس کی وجہ انسانی فطرت کے دماغی اور روحانی حصہ پر خاص اثر پڑا۔ اس زمانہ میں رہبانیت کی رسوم ہوا شروع ہو چکی تھی، ایک فرقہ نے سب سے پہلے ہوا نکاح کے متعلق شہادت ظاہر کئے اس کے بعد ایک اور فرقہ کے خیالات اسی قسم کے ہو گئے۔ ان ہی خیالات کی بنا پر رہبانیت کی صورت قائم ہوئی، رہبانیت کی ایک منفرد تہذیب پیدا ہوا کہ عورت کی حیثیت اور فطرت کو حد سے زیادہ حقیر و ذلیل خیال کیا جانے لگا، کثرت ازدواج کو جائز قرار دیا گیا۔ اور پیشوایان دین و دہویان مذہب نے اس رسم کی پابندی شروع کر دی۔

یورپ کے بعض متعصب اور شریر انہنس اشخاص نے عورت کے حقوق کے مسئلہ میں اسلام کو بدنام کر نیکی سعی لا حاصل کی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کے حقوق دینے میں بہت تنگ نظری اور تنگی سے کام لیا ہے، انواع انسانی کی سب سے پچھلی صف میں اس کو جگہ دی ہے، وہ اس کو بہت حقیر اور ذلیل و خوار خیال کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ عورت کے جسم میں وہ روح ہی نہیں ہے جو مرد کو اندر ہے، اس نے عورت کی کوئی قیمت ہی مقرر نہیں کی ہے، عورت کی حیثیت اسلام کی نظروں میں غلاموں سے بھی بدتر ہے، اس قسم کی لغو اور از سر تا پا غلط فہمہ انگیز افراطی و رازیوں اور شرانگیز بہتانوں کا جو اثر صنف نازک پر ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے، یہی وجہ تھی کہ کولونیوں اور سترھویں صدی میں ان دروغ بیانیوں کی وجہ سے اسلام کے خلاف نفرت و عناد کا اس درجہ ہجوم ہوا کہ ہر قسم کے صحیح خیالات اور احساسات کیلئے راہیں مسدود ہو گئیں، مغرب کی تمام سوسائٹیاں اس شور و غل سے اتنی متاثر ہوئیں کہ اسلام کو ایک ہیوانیت کا جملہ سمجھنے لگیں اور صنف نازک کو اسلام کے نام سے اتنی خوف زدہ ہو گئی کہ اگر کبھی خواب میں بھی اسلام کا نام سن لے تو چونک پڑے۔ مگر آخر کار جھوٹ کی شکست اور سچ کی فتح ہو کر رہی۔ ایک دن ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ اسلام نے عورت کے حقوق دینے میں کتنی ہمدردی، فیاضی اور دروادی سے کام لیا ہے۔

عورت کا مسئلہ ابتدا سے انسانیت کیلئے آج سے کوئی چودہ سو برس قبل تک دنیا کی تمام اقوام کے لئے ایک عقدہ لاغفل تھا۔ مگر اسلام نے کس آسانی سے یہ کہہ کر حل کر دیا کہ ”تم عورتوں کا لباس ہو اور عورتیں تمہارا لباس“ عورت کو حقوق دلانے میں اسلام نے بڑی ہمدردی اور سجدہ داری سے کام لیا ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق کا اس طرح تقیبن ہوا کہ یہ دونوں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں۔ سب سے پہلے یہ واضح کیا گیا کہ عورت و مرد میں کس قسم کا فطری تعلق ہے اور یہ کہ عورت انسانی معاشرت کی جزو و مکمل ہے۔ مختلف پیرایوں میں یہ ظاہر کیا گیا کہ مرد اور عورت ایسے رفیق ہیں کہ جن کو ایک دوسرے کی شدید ضرورت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا نصف بہتر ہیں اور ان دونوں کے تعلقات قریب قریب برابری کے ہیں۔

بہت سی دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورت کی بوجی اصلاح کی اور اس کو فخر و عزت کا بابر نکالا، سب سے پہلے کثرت ازدواج کو قطع قیغ کیا گیا۔ جہاں بچہ و حساب بیویاں ہو کر تین تھیں ان کو چار تک محدود کیا گیا، یہ اجازت بھی اس شرط سے ملی کہ چاروں کو ساتھ یکساں سلوک کرے۔ عورت کی غلامی کے انداد کے بعد شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کیلئے خلافت نہایت سخت اور شدید احکام نافذ ہوئے۔ قانون وراثت بنایا گیا، باپ کے بعد بیوی، ماؤں اور بہن و بھائی کے بعد لڑکی سوتیلی بہنوں سے خفا کر دی گئی، مرد کو تاکید کی گئی کہ عورت کی ساتھ عزت پیش کرے، اس کے احساسات و جذبات کا کافی احترام کرے۔ جو شریر انہنس اشخاص عورتوں پر اہتمام نگاہیں ان کیلئے جہاں سزا مقرر کی گئی۔ ان اصلاحات عورت کو اتنے دینی ذلت و خوار سے نجات دلائی۔

ہرز اسید علی خاں (جدہ آبادی)

# روٹیری مشین پر

کیٹہ باکی آنکھوں کے سامنے تقریباً دو گز چوڑی کاغذ کی پٹی نہایت سرعت سے دوڑ رہی تھی۔ دیکھنے والے کے لئے کیا کلاس کی رفتار کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ایک سوٹے اور وزنی۔ اتنا وزنی کہ اس کو گھمانے کے لئے دومر دوروں کی ضرورت پڑی۔ بیلن پر کئی ہزار گز لمبے کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ بیلن کے چلنے پر وہ پٹی خود بخود کھل کر چھاپے کی مشین میں چلی جاتی تھی۔ مشین فش پر بہت مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔ اس میں دو بیلن لگے ہوئے تھے۔ ایک میں حروف ڈھلے ہوئے تھے اور دوسرے میں کچھ نہیں۔ وہ بالکل صاف تھا۔ ان دونوں بیلنوں کی دابے کاغذ پر حروف اتر آتے تھے۔ لیکن بیلنوں کی داب میں آنے سے پہلے کاغذ کی پٹی کوئی کھلنے کے لئے بھاپ کی ایک لٹکی میں سے گزرا پڑتا تھا۔ اس کے بعد بیلنوں کے ایک ہی گھاڑے اخبار کے آٹھ صفحے کاغذ کے ایک طرف چھپ جاتے تھے۔ دوسری طرف کے صفحوں کے چھپنے کے لئے کاغذ کو اگلے دو بیلنوں کی داب برداشت کرنی پڑتی تھی پہلی اب میں حروف نیچے داب میں ہوتے تھے اور دوسری داب میں اوپر داب میں ہوتے تھے۔ اس طرح سے اخبار کے دو شیٹ چھپ جاتے تھے۔ کاغذ کا پڑھنا چلا جاتا۔ ایک کے بعد دوسرے بیلن کی داب کھاتا جاتا اور اس طرح سے اخبار کے شیٹ چھپتے چلے جاتے۔ راستہ میں کاغذ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے پالا پڑتا جو اخبار کے درقوں کو کاٹ دیتے تھے۔ آگے چل کر لٹی بھی آپ ہی لگاتی اور یہی آپ ہی ہو جاتی تھی۔ ان ہی مرحلوں سے گزرتی ہوئی کاغذ کی ایک پٹی اور آتی تھی جو منیم کی شکل میں اخبار کے ساتھ مل جاتی تھی۔ حیرت انگیز طریقے اخبار کٹ کر چپک کر، تہ ہو کر، غرض یہ کہ ہر طرح سے مکمل ہو کر ایک سکند میں پانچ پرچوں کے حساب سے مشین سے نکلتا جاتا تھا۔ اخبار کو اٹھائیواں لڑکے اخبار کو کہاں سے اٹھا کر برابر دے کرے میں لے جاتے تھے۔

یہ سب کچھ ایک غیر منقطع گھر گھر کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ گھر گھر ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی بہت بڑے اور بڑے ہوئے باجے کے سارے سر ایک ساتھ اپنی ہونڈی آواز کے ساتھ بچ رہے ہوں۔ یا اس اخبار کے سارے پڑھنے والے مطبع کی عمارت میں جمع ہو کر ایک ساتھ بغیر سانس لئے جلدی جلدی اخبار کے کالم پر کالم پڑھ رہے ہوں۔ کان پڑے کچھ شنائی نہیں دیتا تھا۔ پریس کی گھر گھر میں سارے الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ بائیں اشاروں سے یا منہ کو کان سے ملا کر زور سے گلا پھاڑ کر کرنی پڑتی تھیں۔ ضروری گپ شپ اڑانے کیلئے وہاں وقت ہی کس کے پاس تھا!

اتوار کے اخبار کے تاج دو ایڈیٹرن نکلیں گے۔ ایک ایک سکند بہت قیمتی ہو رہا ہے۔ ایک سکند کے خراب ہو نیچے معنی میں پانچ پرچوں کا خراب ہو جانا۔ اور سر کے انڈیکس سے سب بھانے ہی پریس کے تمام کارندے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں ہر ایک آدمی کو ایک مقررہ وقت کیلئے ایک مقررہ کام کرنا۔ مشین کا ایک پڑہ ساہی بن جانا پڑتا ہے۔ رات کے گیارہ بجے سے صبح کے چھ بجے تک مشین چلتی ہے۔ بے انتہا پریشانی اور پہاڑ ایسی گرمیوں کے دن پانچ گھنٹوں میں نڈر اور بھوت کے مانند لوہے کے غلاموں پریس کے کارندوں میں سے کسی کو بھی اپنی مدد بدمدہ نہیں دیتی۔ زیادہ بھی کھا جانے کی وجہ سے کاغذ چھٹ نہ جاتے، یا غلام کب کیا ہو جائے، اس ڈس سے ان کی آنکھیں تیزی سے دوڑتے ہوئے چلنے کاغذ پر اودھتہ وقت ضرورت مشین کو بند کرنے کیلئے

لیور پور لگے رہتے ہیں۔

مشین ٹھیک وقت پر بند ہو جائے اور کاغذ کا پٹہ بغیر کسی گڑبڑ اہٹ کے مشین پر چڑھ جائے۔ ان دو باتوں پر پریسنگ فیکری اوقات کی بچت بہت کچھ منحصر ہے۔

جب تک کاغذ کا ایک پٹہ جو کئی ہزار گز لمبا ہوتا ہے ختم نہ ہو جائے تب تک مشین بند کرنے کی ذمیت نہیں آتی کہ کاغذ ختم ہونے کے بعد دوسرا پٹہ چڑھایا جاتا ہے۔

کاغذ کی پٹی کے گولی پنڈے ترتیب وار رکھے ہوئے صحن والے دروازے میں سے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ سب سچ ہی کام آئیں گے۔

کاغذ چڑھانے کے لئے یا کسی دوسری وجہ سے مشین کو کوئی کارند بھی روک سکتا ہے۔ لیکن چلائیک کام اعلیٰ انجینئر کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کاغذ چڑھانے یا پھٹے ہوئے کاغذ کو ٹھیک کرنے کے لئے مشین میں گھسنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشین جس آسانی سے اخبار چلا سکتی ہے اسی آسانی سے آدمیوں کی ہڈی کا سٹر مسہ بھی بنا سکتی ہے۔

ایک ایک تو ملین پر اور ایک اس جگہ پر جہاں سے اخبار چھپ کر نکلتا ہے مشین کو روکنے کے لئے لیور لگے ہیں۔ کیونکہ یہی تعیناتی انہی میں سے ایک لیور پر ہے۔ کاغذ کے پھٹ جانے یا خراب ہو جانے کی ساری ذمہ داری اسی پر ہے۔ ضرورت کی وقت مشین کو روک دینے کا حق اسی کا ہے۔

اس وقت کیونکہ برف جیسے سفید کاغذ پر آنکھیں گڑا ئے بیٹھا ہے۔ کاغذ کہیں زیادہ نمی یا کھنچاؤ تو نہیں کھا رہا ہے، اس طوف اس کا خاص خیال ہے۔ کبھی اس کا ہاتھ بریک کے پتیل کے دستہ پر پہنچتا ہے۔ تو کسی لیور پر۔ اس کے ذمہ والے میلینوں کے دھڑوں میں ڈگریز (پتیل) ٹھیک طریقہ پر پہنچ رہا ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے وہ تیل لائیو الی کا پینچ کی ٹیلیوں کی طرف بھی دیکھتا جاتا ہے۔ پتیل کے اسی طرح نہ پہنچنے سے اور گری بڑھ جانے سے آگ لگ جانے یا کسی دوسرے حادثہ کے ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور اگر کہیں اس دن اخبار نہ نکل سکا تو نہ معلوم دنیا کے کتنے واقعات یا یوں کہئے کہ ایک طرح دنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

مطبع سے بادلوں کی گڑبڑ اہٹ کی سی آواز آرہی ہے۔ بے شمار میلینوں میں سے چوچو، کرتیل ٹپک رہا ہے۔ رگڑنے کے پیدا کردہ کاغذ کے باریک باریک ذرے بجلی کی روشنی میں تیر رہے ہیں۔ اور کیونکہ آنکھیں کاغذ، دھڑے اور کا پینچ کی ٹیلیوں پر مری چکر لگا رہی ہیں۔

وہ اسی میں محسوس ہے، اس کا لمبا چوڑا بدن نیلی تینیس سے جسے اس نے پا جانے کے اندر کر لیا ہے، دھکا ہوا ہے۔ مشین کی جھٹ میں اس کے کپڑے نہ آجائیں، اسی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے۔ وہ پتھر کے جیسے کی طرح سیدھا کھڑا ہے۔ صرف اس کے پتلے لیکن مضبوط ہاتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ اس کا داہنا ہاتھ لیور پر ہے۔ ہاتھ سیلی اور پتیل میں بھرا ہوا ہے۔ پسینہ اس کی پیشانی سے ندی کی طرح بہہ رہا ہے۔ مٹری مائل ڈاڑھی سے گھرے ہوئے چہرہ سے پسینہ کی بوندیں ٹپک ٹپک کر زمین پر گولی گولی نشان بناتی ہیں۔ ظاہر طور پر وہ اپنے کام میں مشغول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں خیالات بہت تیزی سے۔ لیکن سامنے الٹی

سے زیادہ تیزی سے نہیں۔ چکر لگا رہے ہیں۔ تقریباً دو گھنٹے سے، جبکہ وہ یہاں کھڑا ہے، وہ اپنے خیالات ایک ایک کر کے جمع کوئی کو شش کر رہا ہے۔ ان تمام خیالات کا جو نتیجہ اس نے نکالا ہے وہ اتنا خوفناک ہے کہ وہ کانپ اٹھے لیکن وہ بڑی ہمتیاری سے اپنے خوفناک خیالات کو چھپائے ہوئے ہے۔

آج رات کو وہ کسی کا خاتمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

یہی اس کے تمام خیالات کا خلاصہ ہے۔ سر اٹھانے پر وہ اپنے شمار کو سامنے ہی دیکھ سکتا ہے۔ ریشی چٹ ٹوپی سے ڈھکا ہوا سر بیلن اور مشین کے ڈھانچے کے درمیان سے دکھائی دے رہا ہے۔ کبھی وہ انڈیکس پر جھکتا ہے تو کبھی مطبوعہ تعداد کو درج کرنے کے لئے ٹیبلٹ دقت پر۔ وہ ادور سیر ہے۔ آج رات کو کیونکہ اس کا خاتمہ کر دینا۔ یہ بالکل طے شدہ ہے۔ روزمرہ کو صرفی اور اہم کاموں کی طرح وہ اسے بھی کرے گا۔ ایسا اہل فیصلہ اس نے کر لیا ہے۔

یہی تو وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنے خون میں تر ہو گا۔ یہیں وہ مشین میں کچلا جائیگا۔ بیلنوں کے نیچے ایک آدمی کیلئے کافی جگہ ہو گا۔ فڈ چڑھانے کے لئے انھیں بیلنوں کے نیچے تو جانا پڑتا ہے۔

روٹی کے پیچ میں کام کرتے ہوئے کیونکہ بانی دیکھا تھا کہ ان بیلنوں کی کیا طاقت ہوتی ہے۔ اسے بہت پہلے روٹی کی ٹھیں بھی اسی طرح باندھی جاتی تھیں، اس وقت کون جانتا تھا کہ چھلنے میں بھی اسی قسم کی مشین کام آئیگی۔ اس روٹی کے کارخانہ کے ادور سیر پر ایک کارندے نے بیلن چلا دیا تھا۔ وہ ادور سیر بہت کدینہ تھا۔ اُسے بہت تنگ کرتا تھا۔ ادور سیر بھی روٹی کی طرح دب کر چپٹا ہو گیا تھا۔

کیونکہ تو جب چاہے ایسا کر سکتا ہے۔ ذرا سے اشارہ کا ہی تو کام ہے۔ صبح کے چار بجے تک جب کبھی کاغذ کا نیا پڑ چڑھایا جائے وہ ظالم کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

صرف ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر ایسا ہو گیا ہے۔ کاغذ کے تین پنڈے ختم ہوئے پر چوتھے پر اس کی موت سوار ہو کر آرہی ہے۔ تینوں پنڈے سامنے ہی تو رکھے ہیں۔ باری باری سے تینوں ختم ..... ہاں، ضرور ہی ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر چوتھے کی باری اس کی موت لیکر آئیگی۔

کاغذ کو کم کرنے کے لئے بھاپکے بھپکارے مطیع کی گڑی کو ادور بھی بڑھا رہے ہیں۔ وہ پسینہ میں تر ہو رہا ہے۔ سامنے کی لڑکی سے اکتوبر مہینے کی شہنڈی ہو آ رہی ہے۔ سر ادور پر اٹھتے ہی شہنڈی ہوا کے جوئے اس کی کپٹی میں گھس جاتے ہیں۔ اس کے بڑے میں نہیں۔ درد ہو رہا ہے۔ درد کے مارے اس کا سر چکراتے لگا۔ وہ یکایک جھجلا سا اٹھا۔ اس کا تمام بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔ اُس کجھت درد کی بدولت تو سب کچھ ہوا ہے۔ ہر رات کو میں ڈوبتی پر اکھڑا ہوا نہیں کہ شہنڈی ہوا لگے ہی کسی آفت کی طرح کپٹی اور جڑے میں درد ہونے لگا۔

آج سے پندرہ دن پہلے کسی نے کیونکہ باگوتا تھا کہ برانڈی پیا کر۔ اس کے پینے سے فوراً درد دور ہو جائیگا۔ اب تک کیونکہ باو بنی زندگی میں شراب نہیں لی تھی۔ لیکن اس بار اس نے پی۔ اس کا درد واقعی دور ہو گیا۔ مگر رونا لگاتے وقت ادور سیر اس نے پاس آکھڑا ہوا اور کیونکہ اس کے سانس روک لینے کے باوجود اس نے بھانپ لیا اور کہا "کیا تم نے برانڈی پی ہے۔ اب تمہیں

نہیں رکھ سکتے۔ پندرہ دن کے بعد شی پر حاضر ہونا۔“

اور سیر نے سب کچھ مختصر اور جلدی سے کہہ دیا۔ کیونکہ اس کا یہ معلوم ہوا جیسے کوئی اس پر جلدی جلدی ہنٹر بھڑا ہوا ہو گیا۔ جانتا تھا کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے پندرہ دن تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا وہ کام کی تلاش میں چاروں طرف دوڑتا رہا۔

”تم ہو ہی بہت مغبوط اور تعین کام پر لگائے وہ بیماری کا گھر مولے۔ کیوں ہے ناٹھیک.....“ کیونکہ اب جہاں کہیں جاتا اس کو یہی ہی جواب ملتے۔

کل ہی ایک کہنی کے مینبر پر کیونکہ اس کا معافی کرنیوالے کی اسامی کیلئے درخواست بھیجے کا مشورہ دیا تھا۔ ۴ برس کی عمر میں ایسا کام اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر ٹماچہ مارا ہو۔ کیونکہ اس کی گھائی میں دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد لیون گلوں کے پاس اسے اس کمین کا ہتہ لگا تھا۔ گھر پہنچے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں دو زندہ گیوں کا اور افسانہ ہوا ہے۔ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اسی کے دوڑو داں بچے پیدا ہوئے ہیں۔ چھ سے آٹھ کیونکہ معمولی بات تھی۔

کیونکہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔ ہرج اس کی پریشانی کسی قدر کم ہوئی۔ ممکن ہے خدا نے اس کی مدد کیلئے ہی ان دو فرشتوں کو بھیجا ہو۔ شاید اور سیر کو ان پر کچھ رحم آجائے ضرور رحم آئیگا۔ خواہ اس کا دل پتھری کا کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ ضرور کچھ جائیگا۔ ان دو بچوں کی خاطر اسے درخواست کرنی پڑے گی نہیں تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ ان! ان بچوں..... کے لئے..... اسے..... اچھا ہوتا اگر اس کی زبان کٹ کر گر جاتی۔

دیکھنے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیونکہ باکی دروہری کہانی اور سیر کے دل پر کچھ اثر کر رہی ہے۔ لیکن آخر میں اور سیر نے شانے مار کہا: ”تمہارے دو کیا تین بچے بھی ہو جائیں تو مجھ کو اس سے کیا؟ میں شرابی آدمی کو نہیں رکھ سکتا۔ اگر کچھ نقصان ہو گیا یا کسی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تو؟“ نہیں میں شرابی کو نہیں رکھ سکتا۔“

آج کیونکہ باکی ملازمت کا آخری دن ہے۔ پندرہ دن سے اس کے دماغ میں بل چل رہی ہے۔ اس وقت وہ مشین صاف کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مشین کے پوزے ایسے صاف نظر آنے لگیں جیسے آئینیں شیشے سے دیکھنے سے گھڑی کے پرنڈ کو کہانی دینے لگے ہیں۔ بس آج آخری بار، اب تک وہ تنہا ہی اپنے فخر کو پورا کرتا آیا ہے، لیکن اب نہیں..... آج آخری..... وہ خیالات کے دریا میں ڈوب گیا۔

مشین چلنے لگی۔ پھر ویسے ہی گھر گھر ہٹ کی آواز آنے لگی۔ کاغذ کی بیٹی پھر اسی طرح اس کے سامنے دوڑنے لگی۔ کاغذ کی بیٹی پر بھی کی ترہی روشنی پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی چمک رہی تھی۔ اس وقت اس کی آواز مشین کی گھر گھر ہٹ میں جیسے تم ہو گئی تھی۔ لیکن کاغذ کی بیٹی پر تکتے رہنے سے اس کا دماغ پھر چمک رہا تھا۔ پیشانی پسینہ کے قطرے سے ڈھک گئی۔ سائے کی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آکر اس کی کپٹی سے مچھلنے لگے۔ پہلے کی طرح دروے پھر زور بکڑا۔ اس کے بدن کی ساری طاقت کھنسی گئی۔ اس کا دماغ غصہ سے بھرنے لگا۔ اگر یہ میری آخری ڈیوٹی ہے تو اس کی جی آج آخری رات ہے جسے بنون اس کے دماغ پر پوری طرح سوار ہو گیا۔

ابتدا میں تو اس نے اپنے ان خیالات کو بحث سے دور کر نیکی کو پیش کی۔ لیکن — ”اس کی یہی سزا ہے۔ وہ اسی کو قابل ہے۔“ ایسے خیالات نے بار بار اگر اس کے سر پر بصوت کی طرح سوار ہو کر قبضہ کر لیا۔ یہ خیال کسی طرح بھی اس کے دماغ سے نہیں نکلنا تھا۔ جڑے میں ہونیوالی ہر شے کے ساتھ اس کا ارادہ ادب ہی پختہ ہو جاتا تھا۔

مٹین کی گھر گھر اہٹ پہلے ہی کی طرح جاری ہے۔ طرح طرح کی آوازیں آرہی ہیں۔ مٹین کے اس غور و غل میں سے کیو باکو دو منٹے نئے نئے بچوں کے رونے کی دل شکنگ آواز سنانی پڑنے لگی۔ رونے کی آواز برابر آرہی ہے۔ مٹین بند ہونے پر نہیں آتی۔ اس کا دل بیتاب ہو گیا۔ وہ گھر اٹھا۔ سامنے ہی کاغذ کی سفید پٹی دوڑ رہی ہے۔ وہ اسی پر نگاہ جاکر دیکھنے لگا۔ اسے سفید کیک کا سہارا لائے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے سر نظر آئے۔ ان کے کھلے ہوئے چھوٹے منہ اور پھرتے ہوئے ننھے دیکھ کر وہ گھر گیا۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔ سامنے کوڑوں کے پیچھے اس کو دو آنکھیں نظر آئے لگیں۔ پندرہ دن سے وہ ان آنکھوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ یہ آنکھیں اس کی بیوی کی تھیں۔ مگر سے چلنے سے پہلے اس نے اسے بلایا تھا۔ ”تمہاری ملازمت ختم ہو گئی..... تم اب کیا کرو گے؟“ اس نے اس سے پوچھا تھا ”خدا کے لئے، اے خدا.....“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ چیخ مار کر رونے لگی۔

لیکن تعجب یہ تھا کہ موقع آتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے، مٹین کے بند ہوتے ہی اس کی ہمت بھی ختم ہو جاتی۔ کرنے دھرنے کا موقع آتے ہی اس کا ارادہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اور وہ بحث کرنے لگتا۔ اتنے میں ”اے ایشیک....“ گھمائے چلو..... آہستہ“ پکارنے کے بعد اور سیر کاغذ نکلنے لگتا۔ اور سیر کے ان ٹکڑوں کا ذرا سے اشارہ ہی خاتمہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن کیو باکو نہ معلوم کیا ہو گیا۔ وہ مٹن کی طرح کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ جیسے بدن سے چپک گئے ہوں۔ وہ اور سیر کی طرف دیکھ ہی نہ سکا۔ اور سیر ایک کھلاڑی کی طرح جو شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال ڈال کر اس کو کھلا رہا ہو مٹین میں سر ڈال کر کام کر رہا تھا۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ ابھی تک سمجھنے میں نہ پایا تھا کہ مٹین پر کاغذ چڑھنے کی مکھر مکھر کی آواز ہونے لگی۔ ”شہر و!“ یہ کہہ کر اور سیر مٹین کے باہر نکل آیا۔ کلک، کلک کے کیور اٹھا۔ اور اعلیٰ انجیر کے حکم ”تیار رہو“ کے بعد مٹین چلنے لگی۔ پہلے تو ایک لمحہ تک دھکوں گھوں، ہوتی رہی۔ پھر پانی کے جھرنے کی سی آواز آنے لگی۔ مٹین کے چلنے ہی کیو باکو کے دل میں شیطنت نے سر و ملوہ کر ہونے لگی۔ وہ کیو باکو کی زبانی پرہنے لگا۔ کیو باکو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے دماغ میں چنگاریاں بھردی ہیں۔ اسے پھر اپنے گھر کا خیال آ گیا۔ بچوں کے رونے کی آواز پھرتے لگی۔ اسے اپنے آپ کو روکنا مشکل ہو گیا۔ اور سیر کا خاتمہ کر ڈیکھنے وہ بے چین ہو گیا۔ لیکن موقع آتے ہی اسے نہ معلوم کیا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

اسی طرح کاغذ کا چھوٹا پنڈا جس کے ساتھ اور سیر کی موت آرہی تھی۔ میں پر چڑھ گیا۔ لیکن اور سیر کا بال بھی بچا نہ ہوا۔ اس کے بعد سات پنڈے تک اور بھی ختم ہو گئے۔ اور اب صرف دورہ گئے ہیں۔

”ہو شیار —“

کاغذ کا آٹھواں پنڈا بھی میں پر چڑھ گیا۔ مٹین میں پھر پہلے تو گھوں گھوں اور پھر پانی کے جھرنے کی سی آواز آنے لگی۔

”بس اب آخری موقع ہے۔ اگر اب چوک گئے تو چوک ہی گئے۔ پھر موقع نہیں ملے گا۔“ کیو باکا دماغ ایسے خیالات سے پھر گرم ہو گیا۔

اس کے جڑے میں پھر وہی ناقابلِ برداشت درد ہونے لگا۔ اس نے دماغ پر مداخلت شروع کیا تاکہ درد کم محسوس ہو۔ لیکن اس کے دانت کو کڑانے لگے۔ اسے سانس لینے میں بھی بہت کٹش مکش سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کلپنے لگے جیو اسے ہمارا لگیا ہو۔ مریک کے پاس ہاتھ لیجاتے ہی اس کی انگلیاں بُری طرح کلپنے لگیں۔

ایسا تو اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی ہل چل تو اس کے دل میں پہلی بار ہوئی تھی۔ حالانکہ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا لیکن اس کے لئے تیز ہونے کے باوجود بھی ایک ایک لمحہ بہت آہستہ آہستہ گزرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار :-

کاغذ کا آخری پڑ چڑھا یا جا رہا تھا کیو باکا تمام بدن تھرا رہا تھا۔ اگر وہ کسی چیز کا سہارا لیکر کھڑا نہ ہوتا تو شاید وہ کھڑا نہ رہ سکتا نہ بین پر گر پڑتا۔ اگر اس وقت اسے وہاں سے ہٹ جائیگا حکم دیا جاتا، تو شاید ہی وہ وہاں سے ہٹنے میں کامیاب ہوتا۔ سامنے ہی اس کا شکار تھا۔ اس کا فائدہ کرنے کیلئے دشمن کو چلائیکا کون سا موقع ٹھیک ہوگا۔ یہ سب جاننے کے لئے وہ اپنا شکار کی طرف دیکھ بھی نہیں سکا۔

”آہستہ سے .... ہاں، ٹھیک ....“

اودریر کے یہ الفاظ اس کے کان میں پڑے۔ کیو باچونک اٹھا اس کا دماغ پھر گرم ہونے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کی گردن ترور کر رہا ہے۔ اسے کچھ لمحہ پہلے وہ جس طرف دیکھنے کی ہمت بھی کر سکتا تھا اس طرف اس کی نظر پھری گئی گھومکر دالے بالوں کا سرد اور کاغذ کو مینوں کے درمیان سرکاتی ہوئی انگلیاں اسے نظر آئیں۔ بس یہی ٹھیک موقع ہے۔ اس کا ہاتھ آپ ہی آپ لیور کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اس کے ہاتھ کو کسی نے اس کے جسم سے طعہ کر کے لیور پر پہنچا دیا ہو۔ اتنے ہی میں بجلی کی روشنی کا ایک لال ہو گئی۔ بلکے تار پہلے سے ہو چلے اور پھر سمجھ گئے۔ یہ سب کچھ نصف سکنڈ ہی میں ہو گیا۔ سارے مینے میں اندھیرا چھا گیا۔ کارندوں کی جھینٹا ہٹ اور گالی گلوچ صاف سنا دی دینے لگی۔

کیو باکا دماغ میں ایک خوفناک خیال دوڑ گیا۔ خدا نے اس کی مدد کیلئے ہی یہ تاریکی بھیجی ہے۔ تاریکی میں کسی کو کیا خبر ہوگی کہ کس نے کیا کیا۔ چٹ پٹ اب موقع ہے۔ وہ بھی مشین کے اندر ہی ہوگا۔

اس کا ہاتھ دستہ سے جا لگا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ آگ کی چنگاریوں کا ایک بڑا ہالہ اس کی آنکھوں کے سامنے چکرانے لگا۔ اسے اپنے ہاتھ میں ناقابلِ بیان درد محسوس ہوا۔

لیکن کیو باخوش تھا۔ وہ انتقام لینے میں کامیاب ہو سکا۔ مشین زور شور کے ساتھ باقی کے بھرنے کی سی آواز کرتی ہوئی چلتی شروع ہو گئی تھی۔ اس شور و غل میں کیو باکا اپنے شکار کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ اسے کچھ الفاظ بھی سنا دیئے۔

لیکن کیا ایک سانس سانس اُسے سوا سب گھر گھر بند ہو گئی۔ کیو باکا کو معلوم ہوا کہ وہ تو اس کے کان گونج رہے تھے۔ مشین کا رخن بالکل ہی چپ تھا۔ اودریر بول رہا تھا۔ لیکن اس کی آواز میں تکلیف یا کراہنے کا شائبہ بھی نہ تھا۔

”ارے..... ڈیم..... یہ سب کیا ہے؟ کیا روشنی والا مر گیا۔ کبخت! ریزر دولانٹ بھی نہیں رکھتا۔ اے! کیا کسی کے پاس دیاسلانی کی ایک تیلی بھی نہیں ہے؟“

ایک جلتی ہوئی دیاسلانی گیس لیمپ کے پاس لائی گئی۔ بلمک سے لیمپ جل اٹھا۔ لیمپ کی روشنی میں کیو تانے اور سیر کا پہرہ دیکھا۔ اسی نے لیمپ کو جلایا تھا۔ اسی طرح تین لیمپ اور جلانے گئے اور مطیع روشن ہو گیا۔

اب تک نہ چلتا تھا۔ حکم کے انتظار میں دو کارندے اپنے اپنے لیور پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف خاموشی کی حکومت تھی۔ سب کی آنکھیں جو گیس لیمپ پر لگی ہوئی تھیں پھر اپنے اپنے کام کی طرف اٹ گئیں۔ اخبار اٹھانے والے لڑکے اجڑاؤں کی گڈی بنا رہے تھے۔ ہر طرف سے پہلے کی طرح مختلف آوازیں آرہی تھیں۔

اور سیر نے جو روشنی کے بجتے ہی باہر نکل آیا تھا۔ بلیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ جن کرکھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کیو تانے کی ڈری ہوئی آنکھوں سے لڑ گئیں۔

اس کی آنکھوں نے جیسے بڑی بڑی اور گڑی ہوئی آنکھوں سے کیو باکو پکڑ لیا۔ وہ اپنی نگاہ نہ پھرا سکا۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے سینہ کو چیر کر باہر نکل جائیگی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اور سیر کی آنکھیں یکایک سرورہ تبسم سے چمک اٹھیں۔ ان آنکھوں میں محبت اور مسرت کا ایسا انداز تھا کہ کیو تانے کی اس نے بغیر نہ سکا اور سیر نے اپنی گردن کو اس انداز سے جھکا دیا، جیسے وہ اب بھی کیو تانے پر اعتماد کرنا ہے اور آئندہ کیلئے اسے ہوشیار کر رہا ہے۔ پھر اس نے دوسرے دو کارندوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ”ہوشیار!“

بیلن کا بریک الکلک کر کے ہٹ گیا۔

انجیر نے پکارا: ”ہوشیار!“ مشین بھر پلنے لگی۔ پہلے وہی ”مگھوں گھوں“ اور پھر وہی پانی کے جھرنے کی آواز ہونے لگی۔ اچی دس ہزار کایاں اوجھپتی تھیں۔ کانڈ کو دوڑتے اچی دیر نہ ہوئی تھی کہ کیو تانے کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دابنے ہاتھ کی انگوٹھ کے پوروں کی کمال غائب ہے۔ تاریکی اور دماغی بے چینی کے سبب اسے کچھ خیال نہ رہا۔ دستہ پر پہنچنے کی بجائے کسی دوسری چیز سے جا لکڑا تھا۔ جس کی رگڑ سے اس کے ہاتھ کی کمال اڑ گئی۔ اداب خون نکل رہا تھا۔ اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ خیالات کا خوفناک طوفان اٹھ رہا تھا۔ خون کی گرمی بڑھ جانے کی وجہ سے اس کا دماغ چکر اڑ رہا تھا۔ ان ہی سب وجوہات اس کے دماغی توازن میں بہت ترزلل ہو گیا تھا۔ اور اس کے کانوں میں مشین چلنے کی سی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

اجرا چھپ گیا۔ آخری پاؤں کو کاپیاں دفتر میں پہنچ گئیں۔ پاس والے کمرے سے ڈاک میں پیسے جانے والے اجڑاؤں پر مہر لگنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک دو آدمی بقیہ رات مطیع ہی میں کانٹے کے لئے کاغذ کے ڈھیر پر سونہرا کاغذ کاغذ کر رہے تھے۔ پریس چپ چاپ کھڑا تھا۔ چاروں طرف کاغذ کا بارود، تیل اور سیاسی کے داغ پھیلے ہوئے تھے۔ مطیع کے کارندوں کی طرح گویا پریس بھی آرام لے رہا تھا۔ لیکن کیو تانے پہلے کی طرح ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ بیٹھا بیٹھا سامنے کی طرف تھک رہا تھا۔ اور سیر کوٹ کی آستینوں میں ہاتھ ڈالتا ہوا اس کے پاس آیا۔



"اچھا کیڑا! اگر تمہیں کہیں ملازمت نہیں ملی ہے تو ہم تمہیں رکھ لیں گے۔۔۔۔۔ ارے یہ تمہارے ہاتھ میں ہو گیا گیا! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جب تک تم چوٹ نہیں کھاؤ گے اتنے ہوشیاری سے رہنا نہیں سیکھو گے۔ اور اگر تمہاری جڑے میں درد ہو تا ہے تو تم اپنی جگہ بدل لینا" اور سیر کرنا ہوا دروازہ کی جانب جانے لگا۔

"سہرا! شرم میں ڈوبے ہوئے کیو بلنے لڑکھرائی ہوئی آواز سے کہا: "مرا خدا آپ کا بھلا کرے"۔۔۔۔۔ اسکی آنکھوں میں آنسو اُڑے آرہے تھے۔

"پاگل مت بنو! ہمیں سختی کرتی ہی پڑتی ہے۔ میں نے مینجر سے تمہاری سفارش کر دی ہے۔ آہ! تمہارے دونوں بچے! خبر نہیں کس حال میں ہوں گے؟" یہ کہہ کر دروازہ سے گذرنا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کیڑا بچہ اپنے کسے حروف کے ایک خالی پیسے پر بیٹھ گیا۔ تیل اور سیاہی سے ملبو ہاتھ اس کے منہ کو ڈھکے ہوئے تھے اس وقت وہ بسکیاں بھر رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر آنسو بچے گر رہے تھے۔

ماترچہ محمد شمیم جامعی

## مجلت

سزاوار کرم کیا خاک ہم کو باغباں سمجھے؟ کہ ہم ہر شاخ گل کو اپنی شاخ آئیناں سمجھے!  
 نہ رکھا امتیازِ ناز و فخر طعجمن نے باقی کہ ہم نقشِ جبین کو تیرا نگ آستیاں سمجھے!  
 نشین کی ہوس نے خانماں برباد ہی رکھا وہ بجلی جتنی جسے ہم اپنی شاخ آئیناں سمجھے!  
 ابھی واقف نہیں اہل چین و بروج اسیری سے گلستاں میں کوئی کیا خاک بھی میری فغاں سمجھے!  
 نہ رکھا سادگی نے لذت بیداد سے محرم کسی نامہاں کو ہم ہمیشہ ہمد باں سمجھے!  
 معاذ اللہ کیا اعتماد موسمِ گل ہے؟ اسیرانِ قفس گنجِ قفس کو آئیناں سمجھے!  
 نہ رکھا فرقِ مرگ و زیت قائم رنجِ ہستی نے ہم اپنے ہر نفس کو اپنی مرگ ناگہاں سمجھے!  
 کہیں تابشِ اشرب لذت پنہاں نہ ہو جائے مرارِ عزمِ الفت نہ میرا زرداں سمجھے!

تابشِ صہلوی

# کوئن کے بونبل

ہندوستان کے مغربی ساحل پر مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان "کوئن" کا علاقہ ہے۔ جس کے باشندے "کوئینوں" کے نام سے موسوم ہیں۔ یہاں کے مسلمان ان عربوں کی اولاد سے ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کے مالک تھے۔ اب بھی یہ اپنی ذہانت، خوبصورتی اور آوازِ فطری کیلئے مشہور ہیں۔ ان کے مخصوص پیٹے، جہاز رانی جنگلوں کے پھیلنے اور نمک سلازی ہیں۔ بونبل چھلی کھانسی جی سے کثیر اعیال ہیں۔ انکی مادری زبان کوئی ہے۔ لیکن بڑے حیرت انگیز طریقہ سے اردو اس کی جگہ لے رہی ہے۔

الوہا تھا

ایک بانٹ بھر کا لمبوتر گوشت کا لوقطر جس کے منہ اور دم میں کوئی تیز نہیں کی جاسکتی۔ رنگ سفیدی مائل جس کے اندر سے رگوں میں خون دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ چھوٹے میں بڑی طائف اور کچلی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس پر سنے نہیں ہوتے۔ یہ بے بونبل پھلی کی شکل و صورت جس کو آپ نے بھی تک نہیں دیکھا ہے۔ اس کی تخلیق کے متعلق ایک داستان بھی ہے۔ جب تمام جانوروں کا خمیر تیار ہو رہا تھا اس وقت برہما جی کے دربار میں بونبل کی وجہ سے ٹھوڑی بے لطفی پیدا ہو گئی تھی۔ دراصل یہ میاں بیوی کی لڑائی تھی۔ کیونکہ برہما جی اس کو زہری سانپ بنانا چاہتے تھے۔ اور ان کی بیوی اس کو پھلی بنانے پر مصرت تھیں۔ ان دونوں کی ہمدردی میں درباریوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور ممکن تھا کہ یہ بات طول پڑ جاتی لیکن بونبل نے اس معاملہ کو اس طرح ختم کر دیا کہ وہ موقع پر مغربی ساحل کے سمندر میں غوطہ مار کر غائب ہو گیا۔ اور جبے اب تک اسی ناسک حالت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کو پھلی کہتے ہوئے ہچکچاتا ہوں۔ لیکن عام طور سے یہ پھلی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ عورتوں کی بات کا مان زیادہ ہوتا ہے۔ گو پھلی کا روپ نہیں لیکن چونکہ سمندر میں رہتا ہے اس لئے یہ نام رکھنے میں حرج ہی کیلئے حالانکہ ہم سمندر کے تمام جانوروں کو پھلی کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔

(۲) انگریزوں نے بھی اس کو پھلی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ بلکہ وہ اسے "بمبئی کا مرغاب" (Bombay Duck) کہتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں یہ ایک پرند ہے جس کے پر نہیں ہوتے۔ اس معاملہ کی وجہ دراصل حضرت ڈارون صاحب ہیں جن کے مٹھور نظریہ ارتقا سے کہ تمام جاندار نیچے درجہ سے ترقی کرتے کرتے اونچے درجہ پر پہنچے ہیں۔ آپ بخوبی واقف ہیں۔ اسی اصول پر انسان پہلے بندر تھا، بندر شتر مرغ تھا، شتر مرغ مرغابی تھا اور مرغابی پھلی تھی۔ لیکن بونبل ایسی پھلی ہے جو ارادہ تو مرغابی بننے کا رکھتی تھی اور اس نے اس تیار ی میں اپنے سفنوں کی پھلی انا کر مرغابی کے پردوں کے لئے جگہ بھی پیدا کر لی تھی لیکن اسی اثنا میں کوئینوں کی زبان کو اس کے گوشت کا چسکا لگ گیا۔

اور انہوں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ مرغابیاں مثالی ہند کی طرف نہ اڑ جائیں ان کو پھلی ہی کی شکل میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نظریہ سے اس کے گوشت کے ذائقہ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق بھی ایک حکایت سن لیجئے۔

(۳۳) ایک خدمت گار ہندوستان کے کسی بادشاہ کے ہاتھ دھلا رہا تھا کہ اسی اثنا میں وہ چوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بیان کیا کہ وہ بھی کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا رئیس تھا۔ اور جس طرح وہ بادشاہ کے ہاتھ دھلا رہا تھا اسی طرح خدمت گار اس کے ہاتھ دھلایا کرتے تھے۔ بادشاہ نے یہ سن کر اس سے سوال کیا کہ بتاؤ سب سے لذیذ گوشت کس جانور کا ہوتا ہے؟

اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی ”مرغ کا“ بادشاہ کو اس کے جواب سے اطمینان ہو گیا۔ اور اس نے اس کو انعام و اکرام دیکر آزاد کر دیا۔ لیکن کوئی مورخین کا بیان اس سے محوڑ اعلیٰ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس خدمت گار نے مرغ کے گوشت کی تعریف نہیں کی بلکہ ”بونیل“ کے گوشت کی تعریف کی تھی۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ حکایت صحیح ہے۔ اور جہاں تک ذائقہ کا سوال ہے اس میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ مرغ اور بونیل دراصل ذات واحد ہیں۔ لیکن ظاہر طور سے ایک بانگ دیتا ہے۔ پر پھٹ پھٹاتا ہے اور ٹوٹتے ہیں مارتا ہے۔ لیکن دوسرا اپنی نازک جلد کو بچانے کے لئے پانی میں تیرتا پھرتا ہے۔ (۴) بونیل کو کینیوں کی مشہور ترین غذا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرچشمہ حیات کی تمام تر لطافتیں بچا ہو کر اُسکے رگن پھوپھ میں سرایت کر گئی ہیں۔ اس لئے وہ دستر خوان جس پر اس کی پلیٹ ہے تو کو کینیوں کی نظروں میں بالکل رنگینان ہے۔ مقامی طور پر ایک سودشی شرمیلی اسی کی تائید کرتا ہے کہ ”اگر کوئی رابونیل نہ ملے تو بوم بوم بیٹھو“

تازہ بونیلوں کی بہ نسبت سوکھے بونیل زیادہ لذیذ خیال کئے جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ڈوریوں پر لٹکتے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے دھوپوں نے کپڑوں کی چندیاں لٹکا دی ہوں۔

(۵) ہندوستانیوں کیلئے سوکھا بونیل بڑی زحمت کا باعث ہے۔ اس کے بازار میں گذرتے ہوئے ناک و نونوں ہاتھوں سے ہوا بند کرتے وقت وہی کیفیت ہوجاتی ہے جو سمندر میں ڈوبتے وقت ہوتی ہے۔ یقیناً اس میں کوئی ایسا جزو ضرور معلوم ہوتا ہے جو کلوروفارم سے ملتا جلتا ہے۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو بنگال کھیکل و کس بہت آسانی سے ہندوستانی کلوروفارم تیار کر سکتے ہیں۔ جو سستا بھی پڑیگا اور زود اثر بھی لیکن وقت یہ ہوگی کہ اس کو سونگھنے کے بعد ایک ہندوستانی مریض بیہوش ہو نیچے بعد پھر کبھی ہوش میں نہ آسکے گا۔

(۶) ”جدر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے“ ایشیہ پر بونیلوں کی بوریوں کی قطاریں۔ ریل کے ڈبوں میں پھلوں کی ٹوکریوں کی ساتھ بونیل کے پلندے۔ مسافروں کے اسباب کے ساتھ بونیل کی ٹکڑیاں۔ دوکانوں پر بونیل کے اشاک، اور دبستوں اور طاقاتیوں کے ہاتھ میں بونیل کے ڈونے۔ ایسی حالت میں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی لوٹ پوٹ کر ایک بونیل نہ بن جاؤں۔ ان صورت حالات کے باعث کوکن کے سیاح کیلئے بہترین علاج یہ ہے کہ وہ قوت شامہ کو سن کر لے گا ایک آبجشن لے لے۔

(۷) سوکھا بونیل کو کینیوں کو اس قدر کیوں پسند ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ پھیلی اس تیزی سے انڈے دیتی ہے کہ ریاضی داں اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ اگر ان کو اسی تیزی سے نہ کھایا جائے تو شاید مغربی ساحل پر کسی جاندار کے رہنے کے لئے جگہ ہی نہ رہے گی۔ دوسری وجہ سیاسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلم آبادی

کے تناسب سے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کی اقلیت کا سوال فوری توجہ کا محتاج ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ سوائے اس کے کہ تمام مسلمان، کو کئی مسلمانوں کی تقلید میں سمجھ کر بونیل کھانا شروع کر دیں۔ دس سال کے اندر تمام ظلم آبادی "کنائیون" نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ ثبوت میں اس علاقہ کی مردم شماری کی رپورٹ ملاحظہ ہو۔ اسی سلسلہ میں ہمسہ زد و افغانہ دہلی کے منیجر صاحب بھی "معجون بونیل" کی تیاری پر غور فرمائیں۔

(۸) سوکھا بونیل اقتصادی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ کوئنیوں کی روزی بجہ عرب کی موجوں اور مغربی کھاٹ کے جنگلوں سے وابستہ ہے جہاں تازہ گوشت شکار کی زحمت کے سوا میری نہیں آ سکتا۔ کئی گھنٹوں کی سلسل محنت کے بعد جس وقت چاول کی روٹی میں بٹھے ہوئے بونیل مخلوط ہو کر سامنے آتے ہیں تو تمام جم "آنا پیٹ" (میں پیٹ ہوں) کا نرہ لگا کر صرف جہاد ہو جاتا ہے۔ اور وہ لطف آتا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) میں نے بھی بونیل کھائے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ یہ میری "چڑ" ہو گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کا پرو پاگند اچھ پر اثر کر گیا تھا۔ میرے پاس بونیل کے پارسل آتے تھے۔ میرے نوکر کو رشوت دیکر بونیل میرے دستروان پر رکھوا دیا جاتا تھا۔ میرے دوست اس کی تعریف میں اس قدر قصیدے پڑھتے تھے کہ غالب اور اکبر آلہ آبادی نے آم کیلئے بھی انٹی فیض البیانی سے کام نہ لیا ہوگا۔ جب مجھ پر یہ تمام باتیں بھی کارگر نہ ہوئیں تو دعوتیں شروع ہو گئیں اور دستروان پر بونیل طرح طرح کے روپ میں پیش کیا جانے لگا۔ لیکن میں الف لیلہ کے اُس دیو کی طرح جو انسان کی ہوکوسات پر دوئیں بھی محسوس کر لیتا تھا بونیل کو پہچان لیتا تھا۔ لیکن کہاں تک۔ آخر ایک روز بے تکلف دوستوں کی محفل میں مجھے بونیل کھلانے کی رسم بڑے شاندار طریقہ سے ادا کی گئی اور میں نے سہ

اسے رحمت تمام مری ہر خطا معاف

میں انتہائے ہیرے بونیل کو کھا گیا

کہہ کر پہلا لقمہ اٹھایا۔ آخر میں تمام شکر کائے طعام نے گرجو شفی سے مصافحہ کیا۔ اور اب مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ واقعی بونیل بڑی لذیذ شے ہے۔ میں عمر بھر اس کی طرح دعا کرتا ہوں کہ مجھے تین چیزیں بخش دے۔ سمندر کا کنارہ۔ بٹھے ہوئے بونیل۔ اور چاول کی روٹی۔

سید ابوطاہر

## فاؤسٹ

مترجمہ: شاہد احمد بی ٹاٹہ (آنررہ) جھلوی

فاؤسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و سحر کن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شہرہ آفاق شاعر گوئٹے نے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد پر پہنچی، بدی، جن، عشق، گناہ، غول، عقل اور موت کی یہ داستان زمین کنائی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ قیمت ۷۰ روپے۔ ساتی پبلشرز، جھلوی۔

# تارا چند جی سے ہندی کی چندی

## ٹھٹھ اردو میں

کسی ایسے حیلے میں نہیں گئے ہوں جس سے دو بول ہی نہ لکھے جلیکے اور اس سے ٹھٹھکا راتنے پر لکھنا لکھنا اٹھا رکھا ہو۔ پر اپریل کے ہندوستانی، کو چپ کے پانچ چھ مہینے ہو چکے۔ اس پر کچھ لکھنا ہوتا تو لکھ لکھا کے آپ کا بھیج چکے ہوتے۔ جب دیکھا آپ کی چپ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو نہ رہا گیا اور یہ جی لکھنا بڑی۔ میں نہیں کہتا جو میں کہہ رہا ہوں بے سوچے سمجھے آپ اُسے ان ہی میں نہیں پہلے اسے سمجھ کی کسوٹی پر کسے۔ ٹھٹھ اُترے تو مانے۔ ٹھٹھ نہ دکھائی دے تو مجھے جھٹلایے کیسے؟ کیوں؟ اُدھ کس لئے کو ساتھ لے کر۔

دربار کو جتنا کھینچنے کھینچے گا اور چھوڑے تو شکر و شکر کے رہ جائیگا۔ ایسا ہی کھینچا، بھونکا، منٹا بڑی سے بڑی اور چھوٹی سوچوئی بات میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بات کو جتنا بڑھائیے بڑھے گی اور جتنا کھائے گھٹ گھٹا کرے رجائیگی۔ اگر دیکھو اور چپ پانچ کرنے سے بات بڑھتی ہے اور دھننا ہمت برتنے سے بڑھتی ہوئی بات دب دیا جاتی ہے۔

اسے دیکھ کے آپ کہہ سکتے ہیں:- میرا کہنا بھی تو یہی ہے پر میرے اور آپ کے کہنے میں بہت نیل ہے۔ میں جو کہتا ہوں کیوں اور کس لئے، اُکا پورا دھیان رکھ کر اور آپ اُسے چھوڑ کر۔ کہیں کہیں سے اپنی لکھت کے کچھ ٹھٹھے بھی دیکھ لیجئے ایک جگہ آپ یہ کہتے ہیں:-

”کیا ہندی مجا شمری ہوئی ہے اور کیا اس کے شبدوں کے سونے سے اُردو آدھ کوئی ہو جائے گی“

دیکھئے ہندی اتنی ہی جیتی جاگتی کبھی جاسکتی ہو جیتی یہ اُردو میں گھل مل کے اس کی ہو گئی۔ ہندی کے جتنے بول اُردو میں پورے سما چکے اور اپنی اپنی جگہ نکال کے جر چکے وہ سب بیٹے گاتے ہیں۔ انھیں کوئی خزا ہو انہیں کہہ سکتا۔ ان کو چھوڑ کر ہندی کے اور جتنے

بابری میں نے جو آپ سے باتیں کیں وہ آپ کی سمجھ میں نہ آئیں۔ اچھا مہا ساتی سے جو بات چیت ہوئی کیا اُسے بھی آپ نہ سمجھ سکے۔ اس میں تو کوئی بات اٹھا نہیں رکھی تھی اور سب باتوں کو ایسے ڈھٹکے سے ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا جسے ہندی کی چندی کرنا کہتے ہیں۔

مہا تارا گاندھی سے باتیں کر کے اٹھایا تھا جو آپ کی نکتہ ملی۔ اس پر بھی کچھ لکھ لکھا کے بھیج دینا چاہتا تھا پر یہ دھیان آگیا پہلے جو لکھا جا چکا اس کا کیا ہو جاوے آپ پھر کبھی ہوئی باتوں کو دُہرایا جائے۔ اور کبھی ہوئی باتوں کا دُہرانا ایسا ہی ہے، ایسے چلنے ہوئے نواؤں کا پھر سے چلانا۔

پھر اگاندھی جی سے بات چیت والی لکھت کی ایک کاپی آپ کے ہندوستانی جسے لے بیٹھی ہی جاتیگی۔ جسے جی لگا کے دیکھنے پر نہ بھی ہوئی باتیں آپ چاہیں گے تو سمجھیں گے اور جو اس پر بھی کوئی تفسیر نہ ملے گی تو اسے پوچھا بھیجیے مجھ کو دیا جائیگا۔ پر اس سب کچھ ہونے پر بھی آپ تو ایسے ہو گئے جیسے کوئی بھان بن جاتا ہے۔

اپنے ”رہنما ہی ہندوستانی“ میں اسے آپ نے چھاپا تو پرکار چھاپنا نہ چھاپنا ایک سا ہو کے رہ گیا۔ اچھا، بُرا، بڑا، چھوٹا کوئی فن نوٹ لکھنا کیا آپ اس پر دو ڈھائی بول بھی نہ لکھ سکے۔ اسے چٹھ کے آپ نے کیا کہا، اس کی کتنی باتیں ابھی ملیں، ملنے جی میں آپ نے کیا سمجھو نہ کیا۔ یہ سب باتیں جانتا چاہتا تھا۔ پر آپ کے چپ سادے سے کچھ بھی نہ جان سکا۔

جب تک اپریل کا ”ہندوستانی“ نہیں چھاپا تھا یہ سمجھ ہی تھا۔ مہا تارا سے بات چیت والی لکھت کے چھپنے کی جب گھر کی گئی تو آپ اس پر کچھ نہ لکھ سکیں گے۔ پر جب وہ چپ چپا کے سامنے آئی تو یہ دیکھ کر اچھا ہوا کہ آپ نے تو اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا اور چھپواگے نہیں۔ ساتھ ہی یہ دھیان بھی آگیا کہیں ایسا تو نہیں آپ

بڑی ہی بڑی راجدہانی میں جو جو باتیں ہونا چاہئیں وہ سب آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا آپس میں میل جول کے رہنا، ان کا اشتہا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، بول چال، بات چیت، پہنا دیا ایک ساتھ جو کوئی انھیں دیکھے تو نہ پہچان سکے اور سب کو ایک ہی جیسے۔ پھر، جہاں بھی جائے کیل کا کھنکا کھنکا نہیں۔ سات آٹھ برس کا لاکھ سڑکوں پر سونا چھٹا چلا جاتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اُدھر نہیں دیکھتا۔ بڑے سے بڑا اور چوڑے سے چوڑا سب کو راج ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، گھما گھما، کی دبا سے دن دو دن رات چوگئی ہے۔ جہر منہ کیجئے راج کی دنیا کی بہتی ہوئی گنگا دیکھ لیجئے۔ اور جہر منہ آنکھ اٹھا کے دیکھئے ہن برستا ہوا دکھائی دینگا۔ ایٹور آسے سسنا کی ٹونس اور اس کی اوپنچ سے چمکے اور دکھن کے راج میں اور چسا پانڈ لگائے۔

سترو، اٹھارہ برس سے میں بھی اسی مکھ میں گھٹی چھا ہوا میں بیٹھا ہنس بول رہا ہوں۔ چوتے پانچویں برس اُدھر کا بھی پھر اُدھر جاتا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا چھوڑا ہوا کچھہ بھیتی باڑی کا دھند ابھی ہے جس کی دیکھ بھال کیلئے بھی کسی گاؤں میں گیا آتا جاتا ہو تو بسے اور وہاں کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں جو ان آنکھوں سے چھپی ہوئی ہو تو پھر آپ کا یہ ہماری طرف! کہنا کیسا اور آپ کے اس کہنے کو میں کیسے مان لوں۔ میں نے آجنگ مسلمان تو مسلمان وہاں کے کسی ہندو کو بھی ایسے بول بولتے نہیں سنا۔

یہاں کے رجسٹر آفس میں اپنی جان پہچان کے کچھ لوگ الہ آباد کے بھی ہیں۔ آپ کی کھٹ انھیں بھی دکھائی، سب سے بڑے پیسے سے اسے دیکھا اور یہی کہا۔ برس کے برس اُدھر جانا نارہتائی ہے۔ ہم نے تو اپنے بول کسی ہندو سے بھی نہیں سنے۔ اب کچھ دنوں سے یہ سن رہے ہیں۔ اُدھر ایک بڑھتھایا اسیاٹھاپے جو اردو میں بولے بسرے بولوں کی ٹونس ٹھاس اور اُن کے پرچار کے جتنی کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے جو ڈھائی دن میں بھاشا کی اتنی کاپی ملٹ ہو گئی ہو۔

آپ نے سن لیا الہ آباد والوں نے کیا کہا تو اب بھی اپنی کھٹ کے اس محوے کو۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے

بول ہیں اپنی جگہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اُردو میں تو انھیں کڈھب اور بھولا بسر ای کہا جائے گا گھٹے لے بول چکتی ہوئی کلیاں اور بھکتے ہوئے بھول ہیں۔ ان کا سارڈینچے بولوں میں کہاں آ سکتا ہے۔ بڑانے چالوں جتنا لگی اٹھاتے ہیں نے چالوں اس کا آدھا بھی نہیں اٹھا سکتے۔ تو جو ہندی کے بول اردو میں پورے سا چکے وہ سب اب اُردو ہی کے ہو چکے اور کسی جتن سے بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب رہا ہندی کے نئے نئے بولوں کا اردو میں ملنا تو یہ وہی جگہ ہے جس پر میرے آپ کے لکھا پڑھی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

میں نے ٹھونسنے ہوئے بولوں کو مرا ہوا کہہ رہا ہوں۔ اور آپ جیتا جاتا کیوں اور کس لئے سے میں اس کا مرا ہوا ہونا دکھا رہا ہوں۔ اور آپ کیوں اور کس لئے چھوڑ کر انھیں جیتا جاتا کہتے پراڑے ہوئے ہیں۔

عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہ بلوں بول جیتے اُردو کا کھار اور اُٹھا رہے۔ ان بولوں سے ہٹ کر اُردو کے ملے چلے بولوں کو اُن کی جگہ سے ہٹا کر کسی بھاشا کے نئے بول اس میں بڑھانا اُردو کو اُدھ موانا نا انھیں تو پھر اور کیا ہے۔

اپنی کھٹ کا یہ محو ابھی دیکھئے۔

"اینکٹا، کولاہل، رکشا، سمندھ اور دشا ایسے جن لفظوں کا میں نے استعمال کیا ہے انھیں کون مرا ہوا کہہ سکتا ہے۔ ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں ہر پڑھا لکھا اور اُن پڑھ چاہے ہندو ہو یا مسلمان انھیں سمجھنے کا"

کیا اچھا ہوتا جو اس کے ساتھ ساتھ ان پڑے سے مکھ ملوں اور ہندوؤں کی کھٹوں کے دو دیکھ جھٹکے ہی اپنی بات منوانے کے لئے آپ کھد سچے جو ان بولوں کو لکھتے اور بولتے ہیں۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں لیکن کا یہ ڈھب بتا رہا ہے کہ اپنے جی میں اپنے جیسے ہیں کا سمجھ لیا اُوں آپ کے دھیان میں جب میں ہیں کا ظہر تو پھر وہاں کی باتیں کیسے جان سکتا ہوں۔

سنئے، دتی کب کی ٹٹ کٹا چکی۔ ایسے ہی کھٹو بھی کب کا بڑھ چکا۔ اب دکن میں ایک ایسی جگہ رہ گئی ہے۔ جہاں ہندی باہر اور پورے دیس کی چوٹی کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں

ایسے دُشمن کو جس میں عربی، فارسی کے بول تو بول، اگر، مگر، کہ، چونکہ، بلکہ، چنانچہ، حالانکہ، یا، وگرنہ، لیکن کا بھی کہیں پتہ نہیں، "چوکھا رنگ" کہہ کے سر پہنتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والوں کو تو ایسا نہ چاہئے۔ اُردو میں سے عربی، فارسی کے گھلے بول بکنا نہ چاہیے۔ کہنے کو قویہ کہدیا پر کیا وہی جو جی میں تھا تو پھر اُسے دکھاوانہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان منی لے گُنا جوڑا۔ اس کہادت کو سرچ کرنے کے لئے کہاں کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے کدھب بول کے بول اُردو میں ٹھونے جا رہے ہیں۔ (دھیان پور رات دن کی بول چال سے جو بول کالے کوسوں پر پڑے ہوئے ہوں جن چُننے کا انھیں لک بجھ اکٹھا کرنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔

اوروں کو آپ کیوں دیکھیں اپنے ہی کو دیکھ لیجئے۔ کیا پہلے سے آپ اسی دگر پر چل رہے تھے۔ کیا آپ کے لکھنے کا پہلے ہی ڈھنگ تھا۔ "ہندستانی" کا پورا فائل سامنے نہیں، نہیں تو پکی ایک ایک لکھت کا پورا پورا پتہ دیتا۔ اب اس کے جو دو تین نمبر سامنے ہیں انھیں کو دیکھ لیجئے۔ ان میں آپ کی کتنی لکھتیں ہیں جنہیں سے کسی میں بھی آشاشکشا، دیاکرن، ابھیاس، کلیور، حبیبون ہر دے اور ایسے اور دوسرے بولوں کو آپ کی لکھت ڈالیں مٹہ بھی نہیں لگایا۔

"مسلمانوں کا ہندستان میں آنا" (ہندستانی جوائلی)

"نہصرتے" (ہندستانی جوائلی نمبر ۱)

"مکرہ زمین" (ہندستانی جوائلی نمبر ۲)

یہ تینوں لکھتیں آپ ہی کی ہیں اور جن بولوں کو جیتا جاگتا آپ کہہ رہے ہیں اُن کا ان میں کہیں پتہ بھی نہیں۔ تو اب آپ ہی کہئے ان بولوں کو مراد ہو یا نہیں تو جیتا جاگتا کون کہہ سکتا ہے۔ انھیں جیتا جاگتا کہنے میں آپ کے یو پی سی کچھ چوک ہوئی۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا۔ یہ بول میں تو مرے ہوئے پر اب یہ جلانے جا رہے ہیں۔

آپ کی جن لکھتوں کا اسی آیتہ دیا اب کہیں کہیں سے اُن کے لکھنے کا ڈھنگ بھی دیکھ لیجئے اور جوئے تو اسی جیسی لکھت کی لکھت سے بڑا کے چاہئے۔ جوائلی (۶۳) کے ہندستانی میں آپ کے لکھنے کا یہ ڈھنگ ہے۔

جائیں ہر چڑھا لکھا اور ان پڑھ ہندو جو یا مسلمان انھیں سمجھ لے گا۔

کیا آپ دہرائیں گے۔ اینٹکا، کولاہل، اشکشا، سبندھ، ہتوں، آشا، دشا، ابھیاس، شپے اور ایسے بہت سے اور بولے پسرے بول۔ یو پی، اودھ اور ان جگہوں کے آس پاس کے رہنے والے لوگ آپ کے دھیان میں سب کے سب بولتے اور سمجھتے ہیں اور دوسروں سے بھی آپ ہی منوانا چاہتے ہیں۔ پرن کے سامنے دل کا پورا سماں ہو وہ اسے کیسے ٹھیک مان لیں۔ اور آپ کے دھیان کا ساتھ دینے کی کیسے ہامی ہمیں۔ آج کل کے ہندی پر چارواںوں کو چھوڑ کر نئے اور پرانے اور دیکھنے والے ہندووں ہی کی لکھتوں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ٹھوڑے بہت بول آپ کو دکھانا چاہتے ہیں۔ ہر آپ ایسا کر سکتے۔

یہ بھی ایک نئی بات دیکھی۔ آپ لک جگہ جو لکھتے ہیں اُنکے بڑھکر وہ بات بھول میں پڑ جاتی ہے اور اس کا دھیان نہ رہنے سے آپ ایسی دوسری بات چھڑ دیتے ہیں جس سے پہلی کئی ہوئی بات کھم سے کھم ہو کے رہ جاتی ہے۔ دیکھئے پہلے تو آپ نے یہ لکھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ فارسی، عربی کے وہ بول جواب ہماری بولی میں گھل گئے ہیں نکال ڈالے جائیں۔ انھیں رکھئے اور نہ لکھو" اس لکھت کو پورا کر کے مگر دھیان بٹکانے کے لئے کدھر سے کدھر جلا گیا جو آپ یہ لکھنے لگے۔

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا آپ کیا نام رکھیں گے۔ میں تو اسے اُردو۔ ہندی یا ہندوستانی کی کسی بھی نام سے پکارا نہ تھو تیار ہوں۔ یہی وہ بولی ہے جس کا جو کسا رنگ مولوی تیرد ابو القاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا ہے۔"

بقی لکھت کے ان دونوں نمبروں کو سامنے رکھ دیکھئے اور بتائیے کہ ان میں کوئی ٹکٹ پڑھ اور اُل بُل نہیں کہیں آپ عربی، فارسی کے لئے گھلے بول اُردو میں سے بھکانا نہیں چاہتے۔ اور ان کے نکالنے کی ہامی نہیں بھرتے اور کہیں آپ لکھنے کے

دور دورہ تھا۔ یہ وہ آسان تھا جو اس عالم کے  
نوافلاک پر محیط تھا، ان سب کے الگ اور ہر قدر  
دلی سکون اور امن کا مقام تھا، تبدیلی اور حرکت  
سے ماور تھا۔ عالم کون و خدا دو کروں پر مشتمل تھا۔  
کہہ ارض میں مرکز میں واقع تھا اور اس کو فلک  
پر چاند حکومت کرتا تھا۔

اجما ہوتا ہے جو ایسا لکھ سکتا ہو اور جس کی اُڑان اتنی اونچی  
ہو وہ آسان بیچہ اُڑانے اودیہ لکھنے لگے۔

”اردو کے کلیور کوپا رہیں گے“ ”میر بھی ہی نہیں  
ہے“ ”اس کا بیوہ ایسے“ ”جو کچھ آپس میں سمجھا

ساجید ہے“ ”انتر دو باتوں میں ہے“ ”مولوی  
صاحب کو مہندی کے لفظ لکھتے جان پڑے ہیں“

اجما یہ تو بتا دیا کیا بات ہے، میرے لکھنے کے ڈھنگ کو  
آپ نے ”جو کھا رنگ“ کہا تھا تو اسے برتا بھی ہوتا اور اسی دگر پرک  
بھی چلے ہوئے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ منہ سے تو ”جو کھا رنگ“ کہہ  
دیا پر اپنی لکھت میں اسے نہ برت سکا۔

عربی، فارسی کے بولوں سے آجکل کے ہندوؤں کی چڑ  
اور ان کی جگہ اردو میں گڑبھ بول شونے دیکھ کر میں نے اس  
ڈھبے کو اذکھول دینے تھے اودھیما تھا عربی، فارسی بولوں کے  
نہ ہونے سے آپ لوگ اودھی آجائیں گے۔ اور اودھ آنے  
سے ہو گا کیا۔ اسے دن کی تو تو میں میں اور نبی بھاشا بنانے کی  
دوڑ دھوپ سے ٹھنڈا رہی مل جائیگا اور سننے بولوں کی ڈھونڈ  
ڈھانڈھ کیلئے گھڑی گھڑی سخت کی دشمنی بھی نہیں اٹھانا  
پڑے گی۔ بنی بنائی بھاشا بیٹھے بھائے مل جائے گی۔ اور نبی بھاشا  
بنائیں گی اودھیوں میں جو گھڑیاں کٹ رہی ہیں وہ دیس کے سکھن  
دھندوں میں کٹنے لگیں گی۔

ہمارے سامنے ہندوؤں کے دو جتے ہیں۔ ایک وہ جو عربی  
فارسی نہیں جانتا اس کو تیرامیر اگر نا نہیں آتا۔ اردو میں جوتے  
اور جتے بول بھی ہیں سب کو یہ اپنے ہی یہاں کا بھٹتا ہے۔ رہا  
دوسرا جتہ جو کچھ نہ کچھ عربی، فارسی جانتا ہے وہ بات بات میں تیرا  
میرا کر کے کاراگ الا پتا رہتا ہے اور جب کچھ لکھنے لکھانے کیلئے  
بیٹھتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے عربی، فارسی کے کھٹکے لے بول اردو  
میں سے نکالتا اور کاٹ چھانٹ کے ان کی جگہ نئے نئے کڑبھ

”ان بیافوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان کو  
مغربی کنارے پر سلطان اپنے مذہب کے قائم ہوئے  
کچھ ہی دن بعد آگے اور ان کی تعداد، دولت  
اور طاقت بڑی تیزی سے بڑھی۔ ہندستان کے  
مشرقی کناروں پر بھی عربوں کی پُراٹے زمانے  
میں بہت قدر عزت ہوئی۔ جب دارا نے  
پانچویں صدی قبل مسیح میں دجلہ اور فرات کے  
دہانوں کو نوکروں اور مہر کی تجارت کو فنا کر دیا تو  
یہ تجارت میں سے عربوں کے ہاتھ لگی۔ عربوں اور  
ہندوؤں کی دو اباریاں لہکا اور جنوبی ہند  
میں قائم ہوئیں۔“

جولائی ۳۳ء کے ہندستانی میں بھی اپنے لکھنے کا ڈھنگ

دیکھ لیجئے۔

”غرض کہ مثنوی چونکہ ادب و حکمت اور عقائد  
و معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ اس لئے ہر زمانے  
میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق رہا ہے۔  
اور مختلف طریقوں سے اس کے افادہ کو عام  
بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ طرح طرح کے  
ایڈیشنوں کے علاوہ صرف اس کی شرحوں کا  
نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی  
ہے۔ عام مواظف میں مثنوی کے قصص و حکایات  
اور اس کے نکات و لطائف کا مختلف عنوانوں  
اور تقریروں سے ذکر ہوتا رہا ہے، بہر صورت  
اس سے فیضیاب و امتیج ہوئے کا کوئی دقیقہ  
زد گذاشت نہیں کیا گیا۔ بائیںہام معلق نہیں  
اکتاب و مطالعہ کا جو صحیح حق ہے وہ ناظر خواہ  
اوانہ ہو سکتا۔“

جولائی ۳۳ء کے ہندستانی میں آپ کی لکھت کا یہ

بھی ہے۔

”ایک زمانہ تھا جب انسان کے تصور میں انسان  
ایک الحدود کرہ تھا جو ایک لازوال قوت کا  
مسکن تھا۔ جہاں نور ازلی شوقن تھا عقل کل  
جلوہ افروز یعنی عشق و محبت، سرسری و مستر کا



اور کس نے بنائے جاتے ہیں۔ دیکھئے۔ جب رات دن کی بول چال، بات چیت، سامنے کے بول کسی بات کو جوں کا توں نہ دیکھا سکیں۔ جیسے کسی دوسری بھاشا کی کوئی لکھت آپ اپنی اُردو میں لانا چاہیں اور اس دوسری بھاشا کی وہ لکھت جسے اُردو کے کپڑے پھنائے جا رہے ہوں اس میں کچھ ایسی جگہیں آجائیں جو اُردو کیلئے بھول بھلیاں ہوں اور اس کی بول چال کے گئے پڑے بول اس لکھت کے بھید کو نہ کھول سکیں تو جب اس بھید کو کھولنے اور چھپی ہوئی باتوں کو السا دکھانے کے لئے جیسے ہاتھوں کی لکیریں دکھائی دیتی ہوں سوچ سارح کے نئے نئے بول بنانا اور بڑھانا نہیں گئے۔ اس سے ہٹ کر نئے بولوں کے گھرے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔ جوئے اور چٹنے طواں بول چلے آ رہے ہیں، انھیں بول ہی رکھا جاتا ہے اور ان میں کچھ بھی ٹھٹ بڑھ نہیں کی جاتی۔ نہ جانے بیٹھے بھٹائے یہ کیا غوجھی ہے جو سامنے کے بولوں کو چھوڑ چھاڑ کے کدھب بولوں پر لوگ ریجھے ہوئے ہیں۔

اُردو ہی ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں توڑی بہت سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے نہ آپ کی نیالی اور انوکھی بولی۔ میری پہلی چھی کے اس ٹکڑے کو لکھ کر آپ یہ لکھتے ہیں۔

”اُردو کی جگہ ہندی کا شہد رکھ دیجئے تو

ہندی والوں کا بھی یہی کہنا ہے“

رکھئے کو کیا ہے جو جی پائے اُردو کی جگہ رکھ دیجئے۔ پھر سوچ سچا کی آنکھوں سے دیکھئے تو اُردو کا بول اُل دکھائی دیکھا جو اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ اور کوئی دوسرا بول اس کی جگہ لے نہیں سکتا۔ دیس کی چھٹی بڑی بولیاں جتنی بھی ہیں ان سب کو الگ الگ کچھ لکھنے پر جب آپ اُردو کو پرتالیں گے تو یہ بل کھلاؤں دکھائی دیں گے۔ کسی بھاشا کے پیلاؤ کو کیسے جانپتے ہیں۔ ان پڑھ کاڈاں والوں اور گنواڑوں کی بات چیت کا کیا ڈھنگ ہے۔ عربی فارسی کے جڑے جڑے بولوں کو یہ کس خزانے سے بولتے چالتے ہیں۔ دیس کی بولیوں میں سے مرآئی میں عربی، فارسی کے جڑے ہوئے بولوں کی کیسی مرل پیل ہے۔ گاندھی جی کی پٹی میں یہ سب بایں لکھی جا چکی ہیں۔ اس چھی کو نہ دیکھا ہو تو دیکھئے اور جلد دیکھ لیا ہو تو پھر دیکھئے۔

بولوں کو دیتا ہے۔ دھیان نہ رہنے سے مدیسی بولیوں کو بول لکھت کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ لکھتے پھر اس کی جانچ پرتال کی جاتی ہے اور جانچنے میں جو مدیسی بول لے جاتے ہیں انہیں نال ڈالا جاتا ہے۔ جیسے کسی نے لکھت کی دھن میں یہ لکھ دیا۔ ”ان کا کیا حال ہے؟“ ”آپسے امید ہے؟“ ”جانچ کی کوئی پرکھنے میں۔“ ”حال“ ”لکھا ہوا دیکھو دھیان آیا۔“ ”حال“ ”حوال“ ”یہ بول تو عربی ہیں۔ یہ دھیان آتے ہی اُسے کاٹ کر“ ”دشا“ ”کاٹ دھٹل“ اس کی جگہ بڑیا۔ ”امید کو پڑھا تو یہ بول فارسی دکھائی دیا۔ اس پر بھی ناک نچوں پر چھائی اور جھٹ سے اس جیتے بول کو بھی کاٹ کوٹ کے اس کی جگہ مرا ہو اہول“ ”اشا“ ”کھدیا۔“ ”آجکل پہنی ہنگ چل پڑا ہے اور بہت سے ہندو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں، ”میرا نویدن بھی یہی ہے؟“ نویدن کی کی جگہ ”مقصد، مدعا“ لکھا جاسکتا تھا۔ اور کوٹنے کی جگہ کی بات ہے جو پہلے ہی لکھا ہوا اور پھر نویدن بنایا ہو۔ مقصد، مدعا یہ وہ بول ہیں جنہیں ان پڑھ سے ان پڑھ بھی سمجھتا ہے اور جان بولونکو عربی ہونے سے آپ نہیں لکھنا چاہتے تھے تو ٹیٹ اُردو کا بول ”کہنا“ نویدن کی جگہ لکھا جاسکتا تھا۔ اور میرا بھی یہی کہنا ہو؟“ آپ کی لکھت کا یہ جڑواریوں ٹیک ہو سکتا تھا۔ آپ کو تو ”نویدن“ کیلئے جگہ نکالنا پڑی۔ اور جیسے بھی بنا دہ آپ نے نکال لیا۔ ایسے ہی عربی، فارسی کے گھٹلے بولوں کو اُردو میں نکال کر ”شہزادہ“ ”کلبور“ ”بیون“ ”پورا“ ”ویاکرن“ جیسے نئے نئے بولونکو جگہ دی گئی ہے۔

ہمارا اراج اڑا تھا جس کو پھر وہی بات آندہ کے کی۔

دیکھئے اُردو لکھنے کے دو ہی ڈھب ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ ہے۔ عربی، فارسی، ہندی کے وہ بول جو اُردو میں گھسل لی گئے ہیں ان سب کو ملا جلا کر جو لکھنا لکھنا ہو وہ لکھا جائے۔ دوسرا ڈھنگ وہ ہے جسے ”ٹیٹ اُردو“ کہتے ہیں۔ اور اسی ٹیٹ اُردو میں پہلے آپ کو پھر مہاتما جی اور پنڈت جی ہر لال نہرو کو لکھا جا چکا اور اسی ڈھب پر آپ کو لکھا جا رہا ہے۔ آپ نے ان دونوں کو چھوڑ کے لکھنے کا ایک نیا ڈھب یہ نکالنا چاہا ہے جس میں جگہ جگہ بھولے بھولے بولوں کی بھر مار ہو اور گھٹلے بولوں کی جان بوجھ کے کاٹ کوٹ کی گئی ہو۔

کیا آپ نہیں جانتے کسی بھاشا میں نئے نئے بول کب

اپنی اسی لکھت میں ایک جگہ آجپنے یہ بھی لکھا ہے۔  
جس طرح مولوی صاحب ہندی کے لفظوں  
کو سن کر کان میں اٹھکی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح  
پنڈت جی اردو کے چٹ پٹے بندھن کر آپ  
کا منہ بندھتے ہیں؟

آپ کے پس نے کہہ دیا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں  
بائیں بھی ٹھیک کہیں۔ نہ مولوی صاحب ہندی بولوں کو سن کر  
کانوں میں اٹھکیاں دیتے ہیں اور نہ پنڈت جی اردو کے چٹ پٹے  
بول سن کر کانوں میں بندھتے ہیں۔ ہندی کے وہ بول جنہیں نہ کبھی  
اردو نے سنا اور نہ کبھی دیکھا ایسے ہی بولوں کو  
سن کر مولوی صاحب، کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ بول جو  
اردو میں غلغل مچا دیتے انہیں سن کر کون ناک بھوں چڑھا سکتا  
ہے۔

رہا پنڈت جی کا منہ لکھا اس کیلئے میری پہلی چھیڑوں کو  
دیکھئے جن میں بہت سے پنڈتوں کی لکھتوں کا آئینا بنا دیا جا چکا  
ہے۔ ان پنڈتوں کی لکھتوں کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کے  
لکھنے کا۔ پنڈت جی کڑا کر کہیں سے الگ نہیں ہوتے اور اسی  
ڈھنگ سے بڑے چلے جا رہے ہیں جس پر مسلمان۔ تو پنڈت جی کا مزید منا  
تب آپ کہہ سکتے تھے جب پنڈت جی اپنی لکھت کا ڈھچھر مسلمانوں سے  
بچ بچا کے الگ رکھتے اور لکھت کی پچھڑی پر مسلمانوں کے ساتھ کبھی  
نہ چلتے۔

دیس کی کسی بات کا ٹھیک تصور نہ ہو جو میری ہو آپ بھاشا  
کی دیکھ بھال، جا پہنچ برتاں کیجئے۔ اس کا اٹھا کر لےجئے۔ آپ کو کوئی  
روکنا نہیں۔ پر یہ تو بتا دیجئے کہ یہ سب کھڑا کس لئے۔ ہندی  
پر چار گوبندہ آٹھ دوا بھی تو بھی نہیں ہوتے۔ اس سے پہلے  
کیا ہو رہا تھا۔ دیس کو کئی بولی بول رہا تھا۔ لکھت پر ہمت کیسے  
کی جا رہی تھی۔ دیس واسے کسے برت رہے تھے۔ تو جو ہور ہا تھا اسی  
اسے ہی رہنے دینے میں کونسا گھانا اور ڈھونڈا تھا۔ پڑائی ڈگر چلنا  
کیوں نہ تھی بھانسا لئے۔ کیا پڑانا ہوا کوئی بڑی بات ہے اور جو  
کسی بات سے بچتا اس کے پڑانے بنائی سے ان لیا جائے تو  
اور سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جنہیں ان کے پڑانے پنا پر چھوڑ  
دینا چاہئے۔ پر کیا وہ چھوڑی جا سکتی ہیں۔

مہاراج، دیس کے دو ہاتھ ہیں۔ ایک ہندو اور ایک

مسلمان۔ انہیں دونوں ہاتھوں سے مل کر اردو کی ایسی موتی  
مورت بنائی ہے آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ بھاشا کسی ایک کی  
بنائی ہوئی نہیں۔ تو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے اردو بنی،  
پہلی، دوسری اور تیسری۔ یہ آگے بڑھ رہی رہی تھی جو اس کا ساتھ  
دیے کیلئے دکن کی غلامیوں کو کھڑی ہوئی اور اس کا  
ساتھ دینا اردو کے لئے ایسا ہوا جیسے سونے پہ شہاگا۔ یہاں کے  
راج سے کروڑوں کی لاگت سے اردو کو نوکری اور لکھوں  
کی بچھا دے اس کو نوکری کے لئے ایک بڑی۔ ایک بڑی۔ ایک بڑی  
جس میں یورپ کی کٹھن سے کٹھن کھیتوں پر لکھتیں اردو کے  
اچھے اچھے پڑے پہنٹی چلی جا رہی ہیں۔ اور یہاں کی راجدہانی  
نے سہارا دیکھ کر دو دو کو لپی اوچی بنگلہ پہنچا دیا جہاں بڑی بڑی  
بھاشاؤں کی سمجھائی ہوئی ہے۔ تو ایسی اردو جو سامے دیس  
پر چھاما جاتا جا رہی ہے اسے چھوڑ چھاڑ کے ایک نئی بھاشا بنانے  
میں آپ لگے ہوئے ہیں۔

اچھا اب اردو کو ایک اور ڈھنگ سے جانچ کے دیکھئے۔  
بنگلہ، گجرات، مدراس ان مینوں جگہوں کی بولیاں دیس کی  
بڑی بولیوں میں گنی جاتی ہیں۔ کوئی بنگال کا رہنے والا مدراس  
پہنچ کر پہلی بھاشا میں دواں دواں سے بات چیت کرنے  
لگے تو کیا اس کا ایک بول بھی مدراس والے سمجھ سکیں گے۔  
ایسے ہی مدراس اور گجرات والوں کی بولیاں کیا بنگال کے  
رہنے والوں کی سمجھ میں آسکیں گی؟ ہند کی چھوٹی بڑی بولیوں  
میں سے جو نئی بولی بنی لیجئے وہ پہلے سے جس جگہ بولی جا رہی ہو  
وہیں بھی جائیگی۔ اس محوے سے آگے بڑھنے پر اس کا لوٹنا تو  
بڑی بات ہے کوئی اس بولی کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہاں کی پوری  
بولیوں میں سے انہی اردو ہی ایسی ہے جو پورے دیس میں سنی  
بہت سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اردو بولنے والا دیس کے کسی  
ایسے محوے میں بھی چلا جائے جہاں یہ بھاشا نہ بولی جاتی ہو۔  
پوری دواں واسے کہ نہ کچھ اردو بات چیت سمجھ بھی لیں گے۔  
جو نئی بھاشا بنی ہو پہلے اس کا پھیلاؤ ہی دیکھا جاتا ہے۔  
اور اسی پھیلاؤ سے اس کے بڑے بن کا پتہ لگتا ہے۔ آہنچہ کیا  
جو پھیلاؤ اردو کا وہ ہے یہاں کی کسی اور بولی کا نہیں۔ تو پھر اردو  
ہی دیس کی بھاشا بن رہی ہے۔ اس پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔  
ہندی بھاشا بنی تو ایسی ہی ہے۔ پر آپ کا یہ کہنا تب ٹھیک

کے ماتے میں کبھی ہٹ دھرمی نہ چاہئے۔ اس کا کہنے والا چاہے کوئی کیوں نہ ہو اور جو شیک نہ ہو تو جب بھی جو کچھ کہنا ہو وہ ایسے ڈھب سے کہا جائے جس کا سنا دو سروں کے لئے ڈو بھر نہ ہو جائے یہ سے پہلے اُردو کی جو جو لکھتیں ابھی سے ابھی مانی جا رہی ہیں (جیسے سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد کی لکھتیں) انہیں دے کر ہندوؤں سے کہا جائے :- ان لکھتوں میں سے عربی، فارسی کے جوئے اور جتنے بول آپ لوگوں کو بھولے بسرے دکھائی دے

ان سب کی ایک لیٹ بنائی جائے اور ساتھ ہی عربی، فارسی کے کڈھب بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے اپنی ہندی میں سے ایسے گھلے بول چھانٹ کے کیٹی بوتائے جائیں جنہیں مانا جاسکے۔ ایسے ہی ہندی کے جن کڈھب بولوں پر مسلمان ناک بھوں چڑھتے ہیں ان سب کو ایک جگہ اکٹھے ان کی پوری لیٹ بنالیں۔ اور اسی کے ساتھ بھولے بسرے ہندی بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے بول اکٹھے کر کھینچی کو دکھائیں۔

تو ہندو اپنی جگہ عربی، فارسی کے بھولے بسرے بولوں کی پوری لیٹ بنانے کے ساتھ ان بولوں کی جگہ رکھنے کے لئے ہندی کے بھولے بول لکھ لیں گے اور مسلمان اپنی جگہ ہندی کے کڈھب بولوں کی لیٹ بنا چکے پر ان بولوں کی جگہ برتنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے بول لکھ لکھا کے کہیں کے سامنے رکھ دیں گے اس ڈھنگ سے پھیلا ہوا جھگڑا اسٹ سٹاکے تھوڑی سی جگہ میں آجائینگا اور اب اتنی ہی بات رہ جائیگی جو کہیں پورے سوچ بچار سے ایک ایک بات کی پوری چھان بین کر کے یہ جھگڑا ایسا چھاد کر جس کو ختم نہ کرے دو نوں جتنے دے مان لیں اور اس مانی ہوئی بات میں پھر کوئی گزرتو نہت اور گھٹ بڑھ نہ ہو سکے۔ ہندی مسلمان اپنی اپنی جگہ سچائی کے ساتھ پور پور اسوچ بچار کر چکے پر آئے سامنے جب کہیں میں بیٹھیں گے تو پھر آپس میں ایک کو دوسرے کی کوئی ہی بات نہ ہوگی اور ابھی بات مان لینے تلخ فی جھک اور کچھ ڈرن رہے گا۔

یہ جھگڑا دو تین کمیٹیوں میں نہیں بٹ سکتا۔ اس کیلئے کمیٹیوں کا جال بچا لٹے گا۔ جب تک ہندو اور مسلمانوں مل کے کسی بات کے ماننے کی حامی نہ بھریں تب تک بیچ میں کچھ کچھ دن چھوڑ کے یہ کمیٹیاں بونی ہوئی رہیں۔ ایک کمیٹی سے

بھج جائے گا جب آپ کسی ایسی جگہ کا پتہ دے سکیں جہاں ٹیٹ ہندی بولی جاتی ہو اور جس میں عربی، فارسی کے بولوں میں کو ایک بول بھی نہ ہو اور وہاں کے لوگ خزاٹے سے ٹیٹ ہندی ہی بولتے ہوں۔ سکاؤں دے اپنی بات جیت میں عربی، فارسی کے جو سیکڑوں بھڑے ہوئے بول اٹھتے بیٹھتے بولتے ہیں ان کی یہ بول چال ہندی نہیں کہی جاسکتی اسے بھڑی ہوئی اُردو کہنا جائیگا۔

اس سے یہ باتیں ہوئی رہی تھیں چونڈت جواہر لال نہرو کی بھی ہوئی لکھت پہنچی۔ اسے ادھر ادھر سے اور اُنٹ پلٹ کے دیکھا۔ یوں تو یہ لکھت ابھی اور بہت ابھی ہے۔ پر کہیں کہیں اس میں کچھ باتیں اور صوری رہ گئیں اور کہیں کچھ لکھنے سے چھو گئیں۔ پھر پنڈت جی جو تیسری بنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں :- اردو، ہندی جھگڑا اچکانے کیلئے میرے دھیان میں دو باتیں ہیں جو کچھ ٹھن نہیں۔ سب کا ایک ہوا جائے تو پھر اس جھگڑے میں کاکہیں پتا ہی نہ لگے۔ عربی، فارسی کے متن بھر کر بول ہندوؤں کو اچھے نہیں لگتے۔ اور اسی پر وہ ایٹھتے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ہندی کے کڈھب بولوں کو مسلمان ایک سمجھ نہیں بچھ سکے اور اسی پر ان کی تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ تو جھگڑا اتنا ہی ہے۔ آپس کی اس متن پہن اور اکڑاکڑ کو الگ کر کے آپس میں ملاپ کے چنگ یوں بڑھا سکتے ہیں :-

## پہلی بات

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایسے لوگوں کو چن لیا جائے جو تبت بنے اور جھگڑا اوند ہوں، بات کی پہلے کرنے کو برا نہ جانتے ہوں، دین کا پریم ان کی گھٹی میں پڑا ہو۔ میل ملاپ کے رسیا ہوں اور سر سے بڑھ کر لڑ اور بھنا شاکا ناما چڑھاؤ اور اس کی اوچ پینچ دیکھنے کی پوری سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہی باتوں کو پور پور اچھا بھلا سمجھتے ہوں۔ سب کے سب دھن کے بچے اور بات کے پورے ہوں۔ دونوں جتنوں میں سے ایسے سوچ بوجھ والوں کو الگ کر کے اور انہیں ملا کے ان کی ایک پوری کمیٹی بنائی جائے۔ جس میں بھاشا کی پانچ پار لگائے دے ایک جگہ مل کے بیٹھیں۔ جو ایک کہے دوسرے اُسے کان دھو کر سنیں جو بھی بات ہوتی ہے وہ آپ دل میں مگر کہتی ہے۔ ٹیک پتا

کوئی نہ کوئی جھوٹا نکل سامنے لے ہی آئیگی۔ یہ باتیں بہت پھیلاؤ  
چاہتی ہیں۔

اب تک ٹھٹھ اردو لکھتا رہا۔ اس ڈھب کے کوارٹریس نے  
ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انھیں بیڑے دیتا ہوں۔ انھیں  
کیوں کھولا تھا اور کس لئے بیڑا جا رہا ہے یہ کوئی بعید نہیں جو آپ  
سے چٹیا ہوا ہو۔ تو اب جو لکھنا لکھنا ہو گا عربی، فارسی، ہندی  
اب سب بولوں کو بلا جلا کے لکھوں گا، جیسے اس سے پہلے لکھا  
کرتا تھا۔

سید ابوالقاسم

دوسری کیٹی ٹک پورے سورج بھار کے لئے بیچ میں پندرہ دن  
مہینہ، سو اہمید جو بھی کیٹی کہے دی رکھا جائے۔ اس ڈھب کے  
اردو، ہندی جھگڑا مٹا کے رہ جائیگا۔ اور اس ڈھب کے  
اس کی پڑھتی ہوئی نے دب دیا جائیگی۔

## دوسری بات

اب تک جو بھی پورا تھا یہ دھیان کر کے اسے یوں ہی  
چھوڑ دیا جائے، ہورے گا کچھ نہ کچھ گھر آئیں کیا، آج کی باتوں  
بد سنار کا چپ سا دھنا آج ہی کے لئے ہے۔ یہی اسکی چپ

## کیفِ محبت

عذابِ زیست ہم آغوشِ آبِ احسن ہے  
مری نگاہ میں یہ "خارزار" جنت ہے  
دل تباہ میں طغیانِ رنگ دکھتے  
خیال یا تو کعبہ عالمِ مسر ہے  
دہ دروہوں کہ آئینہ محبت ہے  
حجابِ لب ہے یا پردہ لطافت ہے  
دہ جانتے ہیں، مرادِ رہنِ الفت ہے  
شریک تو ہیں محبت ہے یا عداوت ہے  
کہ ان کے دل میں بھی کھمیری قدر و قیمت ہے

نگاہِ مست، دلِ آسودہ محبت ہے  
نہ پوچھے غمِ الفت میں کتنی لذت ہے  
کسی کی یاد نے اک حشر کر دیا بر پا  
خیال یا تو کہ اندوہ دو جہاں سے غرض  
یہ ایتنا دکھاں شور میں منت میں  
یہ سوچتا ہوں کہ وہ کیوں نظر نہیں آتے  
مجھے ہو ناز نہ کیوں ان کی بے نیازی پر  
یہی بہت ہے کہ اک بھڑکی انھیں مجھے  
وہ جو ردِ ظلم ہی! یہ تو ہو گیا معلوم

## شکوہ رنگیں

نفاؤ اس ہے، عالمِ غربیِ حشر ہے  
دلِ اسیرِ سزا دار ہر اذیت ہے  
قصور و محبت ہوں، ہی محبت ہے  
یہ دل نگہ رحمتِ بسلِ نرا کرتے  
نگاہِ زود پیشیاں بھی کیا قیامت ہے  
تھیں ہے شوقِ تم، دلِ تریں لذت ہے  
یہ مانتا ہوں! غمِ ایجادِ اب طبعیت ہے  
یہ جاں کنی یہ عقوبتِ جوابِ الفت ہے

دلِ فشرہ وہاں بس کیا قیامت ہے  
ستاؤ خوب ستاؤ کے شکا یہ ہے  
گناہگار ہوں، کرتا ہوں اعتراض گناہ  
رہی نوازشِ برہم بھی ناممکن سی  
کبھی نہ پائی شکایت نے فرصتِ انہار  
مالِ جانِ حزنِ سوچنے سے کام کے  
مجھے کیا ہے مگر دشنامِ غم کس نے  
تھیں کہو یہی شیوہ ہے دلِ نوازوں کا

سرکوب شاہجہان پوری

زمانہ دیکھ رہا ہے تباہیاں میری  
مٹا ہے جو دم کی مجھے نہامت ہے

# ہماری تعلیم میں مادری زبان کا درجہ

دنیا کے جتنے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں آپ دیکھیں گے کہ ان کے نصائب میں ان کی مادری زبان کو خاص امتیاز و اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں جس طرح ان کو تمام دیگر علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح خود ان کی زبان بھی ایسی طرح سکھائی پڑھائی جاتی ہے۔

ایک انگریز کو بھارت کو آپ دیکھیں گے کہ بہترین انگریزی بولنا اور لکھنا ہے۔ ایک جرمن اگر جویت بہترین جرمنی زبان جانتا ہے۔ اور ایک فرانسیسی اگر بھارت کو آپ دیکھیں گے کہ بہترین فرانسیسی بولنا اور لکھنا جانتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ خود ذوق تو ہیں۔ ان کو اپنی ہر چیز محبوب ہے۔ اور اس کو بھی وہ ذوق رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے وہ اپنی زبان کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک انسان کی تعلیم کا مقصد اویں یہ ہونا چاہئے کہ تعلیم حاصل کر کے وہ بخیر و کمال تعلیم کے اپنی زبان بھی عمدہ طریقہ پر بول سکتا ہو اور اس میں اتنی دستگاہ رکھتا ہو کہ اپنے خیالات کا خوش اسلوبی سے اظہار کر سکے۔

ایک تعلیم یافتہ انسان کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنی پرانی روایتوں کو ذوق کرے۔ اپنی مادری زبان کو زندہ رکھے اور اس کی ترقی و ترویج کے وسائل و ذرائع سوچے اور ان کو اختیار کرے۔ ہر قوم کی بقا اس کی اپنی زبان کی بقا کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر زبان مرنے لگے تو خود وہ قوم بھی مرنے لگے۔ یہ وہ خیالات و احساسات ہیں جن کے ماتحت یورپین ممالک کے لوگ اپنی اپنی مادری زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس کی بقا کیلئے تدابیر سوچتے اور ان پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔

لیکن انہوں نے کہ ہمارے ہندوستان کی حالت ان ممالک کے بالکل برعکس و برخلاف ہے۔ یہاں تو بچے کو ابتدائی کچھ وہ پانچویں یا چھٹی جماعت میں ہوتا ہے اپنی زبان کے ساتھ نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں بچہ ٹوٹی چھوٹی انگریزی بولنے کے قابل ہوا۔ پھر وہ اردو میں کلام کرنا باعث شرم و عار سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ سن سیز کو پہنچے پر بھی اس کی وہی حالت رہتی ہے۔ بالعموم حال یہ ہے کہ اگر ایک بچی۔ اسے پاس سے انگریزی میں کچھ لکھو تو وہ بخوشی لکھ دیں گے اور اپنی استعداد کے مطابق خاصہ لکھ دیں گے۔ لیکن اگر ان سے اردو میں ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کیجئے تو وہ سو طرح کے حیلے حوائے کرینگے۔ اور اردو میں مضمون نہیں لکھیں گے۔ اگر آپ سہ ہو کر اور پیچھے پڑ کر زبردستی ان کو مجبور کر کے مضمون لکھو ایسا تو پھر آپس پچاس غلطیاں ہونگی۔ نہ اٹلا درست نہ خط درست "تی" کی جگہ "ک" لکھ رہے ہیں۔ اور "م" کی جگہ "ن" نہ تذکرہ کی تیسرے نہ تائید کی نہ دوال کو مؤنث اور ہندوئی کو مذکر لکھ رہے ہیں۔ نہ عبارت ششہ نہ مضمون صحیح نہ ترکیب چست نہ بندش عجیب اور تو اور ان ہندوستانی صاحب بہادروں میں سے بہتر ترقی صدی ایسے ملیں گے جن کو صحیح طور پر خط لکھنے کا بھی ذوق نہیں آتا

بیگم (شریک حیات - نصف بہتر) کو خط لکھ رہے ہیں تو ”عزیزہ“ یا ”محترمہ مکرمہ“ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اور والدہ ماجدہ کو ”محبوبہ“ لکھ رہے تو میری جان اماں، میری پیاری اماں اسے شروع کیا ہے۔ یہ عام شکایت ہے جو کالج کے لڑکوں کے متعلق بیان کی جاتی ہے اور عام مشاہد اس کا شاہد ہے لیکن غور کیا جائے تو اس میں ان بچاروں کا کیا تصور؟ بلکہ اصل تصور تو یہ تھا کہ تعلیم کا اور ”طرز تعلیم“ کا اور تعلیم کے ماحول اور گرد و پیش کے حالات کا۔

انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں یہ نہیں کہ اردو پڑھائی نہیں جاتی۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح پڑھائی جاتی ہے وہ نہ پڑھانے جانے کے برابر ہے۔ اور تعلیم میں ہماری مادری زبان کو جو درجہ ملنا چاہئے اس سے وہ سراسر محروم ہے۔ بچہ کو اسکول کی شروع زندگی ہی سے جو ذہنیت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو بولنا بڑی بات ہے۔ اور انگریزی بولنا فخر کی چیز ہے۔ اور ریاضت و قابلیت کی نشانی ہے۔ اس کے استاد و عزیز اس کو انگریزی بولنے کی تلقین کرتے ہیں اور اگر وہ اچھا انگریزی بولنے اور لکھنے والا بنے تو انعام و خیر وہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ پھر وہ بچہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسکول کی ادنیٰ جماعتوں میں جو تعلیم ہوتی ہے مائتر انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اردو میں نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ انگریزی زبان کا حاصل کرنا اور اس میں کمال پیدا کرنا زیادہ فخر و خودی کی بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیکھتا ہے کہ اسکول میں جتنے ماسٹر ہیں ان میں سب سے کم تنخواہ پانے والے وہ مولوی صاحب ہیں جو اردو پڑھاتے ہیں۔ اس سے بچوں کے دل میں ان مولوی صاحب کی کوئی قدر نہیں رہتی۔ اور اسی بنا پر خود اپنی زبان کی ان کے دل میں ذرہ برابر وقعت نہیں رہتی۔ پھر یہی سبب ہو کہ اسکولوں اور کالجوں میں مختلف سوسائٹیاں اور انجمنیں ہوتی ہیں۔ بحث و مباحثہ کے لئے مکتب ہوتے ہیں اور ان سب کی کاروائیاں، تقریریں اور تقریریں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اردو کا کہیں نام نہیں آتا۔ انعامات جو دیئے جاتے ہیں وہ انگریزی عمدہ بولنے والے اور لکھنے والے کو دیئے جاتے ہیں نہ کہ اردو پر۔ پھر یہ کہ حکومت کی زبان انگریزی ہے اس لئے اچھی انگریزی تعلیم بختم اور عمدہ ہوگی اس کے لئے اچھی ملازمت کے زیادہ مواقع ہیں۔ مگر اردو میں کافی دستگاہ و مہارت رکھنے والے کے لئے اس حکم کا کوئی موقع نہیں۔

سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اردو کو نصاب تعلیم میں بحیثیت ایک ضروری اور لازمی مضمون کے داخل نہیں کیا گیا۔ اور بلکہ بعض یونیورسٹی کے امتحان میں تو اردو پر چوں کی حیثیت محض اختیاری مضمون کی سی ہوتی ہے۔ مگر انگریزی کو ہلکا ضروری لازمی قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان چند اسباب و وجوہ کی بنا پر ہماری مادری زبان کو تعلیم میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ ہماری تعلیم کا ابتدائی مقصد یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم اپنی مادری زبان میں واقفیت بھرم بھنچاتے۔ کہتے شرم کی بات کہ اگر لکٹ گوبوٹ سے دریافت کیجئے کہ شکستیدہ کون تھا؟ ملٹن کس صدی کا شاعر ہے؟ ورڈس ورتھ کو انگریزی شاعری میں کیا مرتبہ حاصل ہے؟ تو وہ آپ کو ان سوالات کے جوابات صحیح دینگے۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ کلام کی خصوصیات کیا کیا ہیں؟ حیرت انگیز گئی ہیں کیا درجہ حاصل ہے۔ ذوق کس دور کے شاعر ہیں؟ تو ان سوالات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ کس قدر انوس کی بات ہے کہ ایک شخص اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلاتا ہے مگر وہ دوسروں کی زبان میں تو بے تکلف تحریر و تقریر

کر سکتا ہے اور خود اپنی مادی زبان میں ایسا کرنے سے عاجز و قاصر رہتا ہے۔

بس سخت ضرورت ہے کہ ہماری مادی زبان نصائشِ سلیم میں جس درجہ کی متقی ہے وہ اس کو دیا جائے۔  
اور یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ ہمیں سے مذکورہ بالا فاضل و مکتور خلق کیا جائے۔

جمشیدہ شمیم

## آرام کہاں!

”اپنے پھوپھ پھوپھے بھائی“ محمد دلدار خاں کی المناک موت خون کو آنسو“

اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
انگڑوں پر لوٹ رہا ہوں میں، سرگرم فغاں ہے سوزِ نہاں  
ہر دل میں نہاں بیتابی ہے، ہر روح میں جوشِ عشقِ ظاہر  
ہر نالہ میں نفیرِ زخمِ جگر، ہر زخمِ جگر ہے شعلہ فشاں  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
اک سوک سی دلیں لٹتی ہیں، جب دھیان تو آجاتا ہے  
سرِ پیٹ کے رجا تا ہوں میں، ہر دردِ بگڑا تھا جاتا ہے  
سینے کی فضا میں درد کا بادلِ جنوم کے لہر آجاتا ہے  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
ہر چندا جو پیدا ہوتے ہیں گویا میں وہ مرتے ہی نہیں  
جو اے حیاتِ انسانی، تمیرِ فنا کرتے ہی نہیں  
پھر بھی تو حجابِ ظاہر کے ناسور کبھی بھرتے ہی نہیں  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
اے خوابِ ابد کے متوالے! اللہ کی رحمت ہو تجھ پر  
ہر گھٹ نہ مرقدِ جنت ہو، ہر لولِ بارش ہو تجھ پر  
اتمام و مسودہ گراں، ہر سہیل کی نہ ساعت ہو تجھ پر  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!

اکاش چاند آبادی

اے بھائی! تجھے کچھ انکی خبر ہے غم نہیں تھے کیا حال ہے یاں  
کیا بیت رہی ہے ماں پر تری کیا کھڑکا ہو تیرے آج سماں  
اُٹھ دیکھ کیا ہو یہ تری، آنکھوں میں یہیم اشکِ واں  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
لے بھائی سناؤں کیا میں تجھے کس حال میں تیرا بھائی ہے  
کس حال میں تیرا ماموں ہی، دل کو تری آنکھ حنائی ہے  
ہر سانسِ گران ہو دنیا کی، مگر پھر یہ قیامت بھائی ہے  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
ہر آنکھ میں آنسو خون کے ہیں، نگلیں، فضا، اندر وہ جن!  
ہر ذرہ اتنی مضطرب ہے، ہر سانس ہے دردِ ضبطِ شکن  
ہر دل ہو رہا ہے بیتابی، سینوں میں ہے آتشِ غم سے جلن  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
اُن! اب بھی ہوائیں چلتی ہیں، پیغامِ مسرت دے دینے کو  
اُن! اب بھی وہی دنِ اوت کے جلوہ رخشاں ہیں لے لینے کو  
کیوں چھوڑ گیا ہے، ہر آنکھوں میں تو آگ میں کشتی کھینے کو  
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کے آرام کہاں!  
ہاں اب بھی فضا میں آج، چاند، ستارے کھینے آتے ہیں  
ہاں! اب بھی بھول چکے ہیں، طوفانِ طرب چو نکاتے ہیں  
آنکھوں سے میں دامن بھرتا ہوں، آہوئے کنول کھلتے ہیں

# میں اور بچہ

یہاں شہر اور اس کے شور و شغب سے دور، اس راستہ میں جو شاہی محل کو جاتا ہے، اس شاہی محل کو جو کل تک ضدیو اٹھیل کے لئے تھا اور پھر اس کا نہ ہو سکا، مصری دیوتاؤں کی سرزمین پر، اینزس کی دادیوں میں، گرم سیر دریائے نیل کو کنارہ جس کی گہرائیوں میں دوشیزگان جن کی بوسیدہ ہڈیاں دفن ہیں۔۔۔۔۔۔ یہاں ایک نغمہ آگئیں جہنستان ہے جو ہر آنیلے کیلئے کھلا ہوا ہے۔ اور اس کی فضاؤں میں غلگین تماشاٹیوں کے خواب اب تک محفوظ ہیں۔

میں ایک منور روشن دن کی صبح کو وہاں جا چکی۔ میں نے شہری آداب کو خیر باد کہا اور زمین پر لیٹ گئی جس طرح خانہ بدوش صحرا کے ریت پر لیٹ جاتے ہیں۔ ایک درخت کے سایہ میں سرسبز گھاس پر میں دراز کھٹی۔ میرے قدموں کو پاس ایک جگمگہ نصب تھا۔

اس وقت مجھے سوائے دو انگریز خواتین کے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ ان میں سے ایک کے ساتھ تین بچے تھے۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ان میں سے ایک بچہ میرے پاس آ نکلا، اس کی عمر کوئی چار سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے اس کو آواز دی ”یہاں میرے پاس آؤ نیچے“ وہ خوش خوش مسکراتا ہوا میرے قریب آ گیا، میں نے اس سے کہا ”کیا میری گود میں نہیں آؤ گے“ وہ خاموشی سے میرے گھٹنے پر بیٹھ گیا۔

جب میں نے اس کے نیچے جسم کو بوجھ محسوس کیا، تو مجھے اپنا مرحوم اکلوتا بھائی یاد آ گیا۔ میرا کبچہ منہ کو آنے لگا اور اُنسو میری آنکھوں میں ڈب ڈبہ بننے لگے۔ میں اس بچے کے شیریں رخسارے جلد جلد چومنے لگی۔ اور ان بوسوں سے اپنے اس غم کو بھلائی کی کوشش کرنے لگی جو میرے دل کی گہرائیوں سے اس طرح بجھ کر چھا گیا تھا، جیسے کہ کالی گٹھائیں سمندر کے ساحلوں سے اٹھتی ہیں۔

بچوں کے معصوم بوسے کس قدر شیریں ہوتے ہیں!، اور اُن کی مسکراہٹ کتنی عطر بیز ہوتی ہے!

میں نے اس بچے سے سوال کیا۔ ”تمہارا کیا نام ہے، بچے!“

اس نے کہا۔ ”روبرٹ“

اس وقت میں نے اس کے چہرے کو بے نظر غور دیکھا، جس پر انگریزی جن و جمال کی چمک تھی۔ صاف شفاف چہرہ گویا وہ گلاب اور یاسمین سے گندھا ہوا ایک میخما مادہ تھا جس کو ترش کر ایک انسانی چہرہ بنایا گیا تھا۔ اور گلاب کی پتیوں کا سانپانک دہانہ نزاکت و لطافت کا ننھا گلہ مستہ تھا۔ اونچی چوڑی پیشانی، جس پر سنہری بال سایہ کئے ہوئے تھے اور آنکھیں، جن میں گہری نیلاہٹ اسی طرح کروٹیں لے رہی تھی جس طرح کہ وہ عذاب آفتاب سے پہلے سمندری سطح پر چھائی ہوتی ہے۔ وہ ان بعض انگریزی آنکھوں سے بہت مشابہ تھیں، جو بیک وقت ظاہری انجانا اور باطنی حرارت نیز علالت و ملاعبت کی پردہ دار ہوتی ہیں۔ میں نے ان سب علامات کو بے غور دیکھا، پھر اس بچے سے کہا۔ ”روبرٹ! یہ آنکھیں تم کہاں سے لائے ہو؟، اور ان کی نیلاہٹ تم کو کس



دی ہے؟“ میسرے الفاظ میں سے وہ صرف ”دینے“ کا لفظ سمجھا جس کو شک اس نے جواب دیا ”اجی نے“

میسرے منہ سے یہاں تک نکلا: خدا تمہاری ماں کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے، تمہارے آبا کی کرتے ہیں؟“

اس نے لگنت آسمین لچپیں بڑی ہلکے سے جواب دیا ”ابا جان فوجی ہیں، میں بھی ان کی طرح فوجی ہوں۔“

میں نے کہا ”تم بہت خوبصورت ہو روبرٹ! اور مجھے تم پر بہت پیارا آتا ہے۔ لاؤ ذرا اپنا ہاتھ تودو مجھے!“

بچوں کے ہاتھ بھی اُن کے تبسم کی طرح شیریں و دل فریب ہوتے ہیں۔ میں نے روبرٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا،

اور دست قضا و قدر نے خطوط کی صورت میں جو کچھ تحریر کر دیا تھا اُسے بڑھنے لگی۔ وہ ایک مربع بڑی بڑی آنکھوں والا ہاتھ

تھا اور اس میں زندگی، عقل اور دل کی نکیریں ظاہر و واضح تھیں۔ مزے کا اُبعد خطرناک حد تک اس نئے ہاتھ میں نمایاں تھا۔۔۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا،۔

”یہ وہ ہاتھ ہے جس کے خطوط آج فرشتوں کے پوشیدہ اشاروں کا پتہ دے رہے ہیں، یہ وہ ہاتھ ہے جو ہمیشہ صرف

خوشبوؤں اور بھولوں سے چھپر چھا کر کے کیلے بڑھیں گے۔ یہ تمہارا خوبصورت ہاتھ عنقریب ایک فوجی کا ہاتھ ہوگا عنقریب

اس ہاتھ میں تلوار اور جنگی ہتھیار ہوں گے اور آتشیں گولے توپوں کے دہانے سے فضا میں بھینکے گا، عنقریب یہ انسانی

زندگیوں کو فنا کرے گا، خواہ وہ شریر ہوں یا نیک۔۔۔۔“

روبرٹ نے سبز گھاس کو اپنے پاؤں سے رگڑتے ہوئے پھر کہا۔۔۔۔ ”میں بھی آبا کی طرح فوجی ہوں!“

میں نے کہا، ”ہاں، روبرٹ! جب تم اس عمر کو پہنچو گے تو یقیناً فوج میں ہو جاؤ گے۔ تم عنقریب بڑے فوجی لباس

میں خوبصورت معلوم ہو گے۔ بہت ہی خوبصورت، لیکن اتنے نہیں جتنے کہ تم آج لباس طفل میں سین معلوم ہو رہے ہو

عنقریب عورتیں تم کو دیکھ کر شکر ادا کریں گی، چونکہ وہ سچا بیوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ اور آستینوں اور سینہ کے زریں

نشانات ان کو خوراک کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ یہ نئے نئے کمزور ہاتھ بڑے مضبوط ہو جائیں گے جو ایذا پہنچائیں گے، ہلکیں

دریں گے اور موت کے ٹھاٹھ اتاریں گے، یہ ہاتھ عنقریب تخریب بربادی کے آلات کو پورے پورے عزم و استقلال سے دو بوج

لیں گے۔ تمہاری یہ خوبصورت آنکھیں اس جلاؤ کی آنکھیں ہو جائیں گی جو خون اور آنسوؤں کے دریا بہتے ہوئے دیکھتا ہو

اور اس کے دل میں رحم یا نرمی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور تمہارا دل اتم دیکھو گے کہ اُس دل کی کیا حالت ہو جائیگی، جو آج بلا کر

اور شعور سے کتنا کم بہرہ مند ہے۔۔۔۔۔!“

”تم ان لوگوں میں سے ہو گے، جو زندگی میں جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جو عیش کرتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں،

مزے اٹاتے ہیں، ہنسنے کودنے دوچار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ متفاد کیفیتیں ان پر کوئی اثر نہیں چھوڑتیں، بلکہ مہتریں اور مصائب ان پر سے

اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے بادل کے قطرے کسی شیشہ کی سطح پر گرتے ہیں اور اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے۔۔۔۔۔۔۔۔؟

یا ان انسانوں میں سے جن کا شعور و احساس تیز ہوتا ہے اور اس کے برعکس وہ کبر و تجالہ کی وجہ سے پشت گردانی کرتے ہیں۔

..... کسی عورت کے ہاتھ کا لمس کبھی تمہاری آنکھوں میں محبت کے آنسو پیدا، یا تمہارے دل میں ناامیدی کا خچر پھوٹا

کر سکے گا!

”سنو، روبرٹ! عنقریب تمہارے جسم اور روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے گی، عنقریب تم انسانی کیفیات سے دوچار ہو گے اور اپنے کوزندگی کے میدان میں اکیلا پاؤ گے، عنقریب تمہیں احتیاج بتلائے آلام اور جدوجہد مجبور کرے گی، افکار کے شعلے تمہیں ایندھن بن جائیں گے اور رنج و غم کی آگ تمہیں بجھلا کر رکھ دے گی۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو گا کہ روح کی پیاس کیا چیز ہے؟ عنقریب تم ایک مکمل انسان ہو جاؤ گے آف! کتنا ہولناک لفظ ہے!..... عنقریب تم انسان ہو جاؤ گے یعنی جو ان بھی اور خدا بھی....“

میں بہت دیر تک خاموش رہی۔

اور اس پرسکون لمحے میں جو عظمت کی گود میں گزر رہا تھا ایک شیریں نغمہ بیک باغ کے قریب سے بلند ہوا اور اس کا متوج پھولوں کی خوشبو پھیل گیا۔ یہ نؤذکر کی آواز تھی جو ظہر کی اذان دے رہا تھا، یہ دہی الفاظ تھے جو اس صبح ہوتے ادا کئے تھے۔ اور غروب آفتاب کے وقت پھر ڈھیر اٹھ گا۔

میں نے پوچھا: ”تم نے کچھ شکر روبرٹ!“

اس نے جواب دیا: ”جی ہاں“

میں نے کہا: ”عنقریب تمہیں معلوم ہو گا کہ مذہب کیا چیز ہے، عیسائیت کیا ہے، اسلام کسے کہتے ہیں۔ عنقریب تم سمجھ سکو گے کہ مذہبی، جہنی، علمی، خاندانی اور انفرادی تعصب کیا ہے۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو گا کہ جس کپڑے سے لباس عروسی تیار ہوتا ہے اسی سے شہیدوں کے کفن بنے ہیں۔ عنقریب تم قوموں کو دیکھو گے کہ وہ دوسری اقوام کی جان و مال کے درپے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اس کپڑے کے کھڑے کے گرد جمع ہیں جس کا رنگ ان کے رنگ سے مختلف ہے۔ عنقریب تم یہ سب کچھ دیکھو گے، روبرٹ! اور بذاتِ خود اس میں حصہ بھی لو گے چونکہ تم اپنے باپ کی طرح فوجی ہو!“

بغیر پیار کئے اور بغیر رسمی الفاظ ادا کئے میں روبرٹ سے مجھدا ہو گئی۔

میں نے اس لئے اسے پیار نہیں کیا کہ مستقبل انسان کیلئے میں لاہشت زدہ ہی ہو گئی تھی اور اس نے مجھے اس لئے ہوس نہیں دیا کہ میں نے اسے بسکٹ یا پٹھانی نہیں دی تھی.....

(آئسنسٹائن)

صَلَاةُ الدِّينِ قَرْنِي

## چغتائی منبر

جس میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے کم و بیش بیڑا نہایت پاکیزہ مضامین شامل ہیں۔ مزاحیہ انشائوں اور نثر محفل کے علاوہ اس میں محفل تنہا نگاہیں، شہزادی، اور سوانح کی رو ہیں، شامل ہیں۔ تقریباً دو سو صفحے کا نہایت قیمتی مجموعہ مضامین کی ایک وسیع پیمانہ وصول

لئے کاتبہ: ساقی بکڈ پوٹھلی

# آپ بے دنیا بدلی

منبر

صفحہ

(۲۱)

(۲۱)

بے غل غل بیل سے چٹک کر  
قری سرو پہ آئے چٹک کر  
شیخ و پنگا تھے بلف کر  
جوش پہ تھے ندی بھٹک کر  
کس کی پھوٹیں اسی بھٹک کر  
شیشہ نہ ٹوڑا، ہائے پٹک کر  
رحمت جس کی ہوئے جیسی  
باس ملے الفت کی بھٹک کر  
چاند کو دیکھے لیک بھٹک کر  
کوئی جلدی، کوئی بسک کر  
مجھے ملے دریا سے لپٹ کر  
کون کرے اک بہت بھٹک کر  
رہ گئی دل میں پھان اکٹ کر  
شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دنیا بدلی

جان کو پوچھیں گھونا کب بھٹ  
راؤں کو اٹھ کر ردنا کب بھٹ  
جس کے تیر چھو، اک بھٹ  
اتک کے دانے لونا کب بھٹ  
پیت کا گائیں لونا کب بھٹ  
بس ہی کر لے دل ہو گئی ہوئی  
دھار پہ تین کی سونا کب بھٹ  
دھن یوں ہی بھٹنا کب بھٹ  
دار پہ دل کے دھونا کب بھٹ  
عشق کا حاصل، ہونا کب بھٹ  
دل کا بنا نہیں کھلونا کب بھٹ  
شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دنیا بدلی

مہ نہیں اس کا دل جو ڈا  
مال پہ غیر کے اپنا بس کیسا  
ختم ہو جب کام ہی اپنا  
مل کے پھر ناغہ کم تر پنا  
کس نے سدا کو شکہ ہے دیکھا  
دل کو کھو کر حق کو پایا  
عشق و محبت غنڈ بچی گویا  
تیرے کرم کی آس خدیا  
موت کو کم نے شوق سے پایا  
چینا کہاں جب دل کو زندا  
موت نے بھی غنڈ ملا دی  
کب تھا یہ، ادکب ہے اپنا  
بعین تھا جی، اس پر چڑھا یا  
دُنیا سے پھر چلے کا غم کیا  
الفت کا اک کھیل ہے ادنیٰ  
دھلتی پھرتی چھاؤں ہے دُنیا  
الفت کا یہ راز تھا سچا  
مرگ جس کا میٹھا سچنا  
ریت نہیں تو موت ہے جینا  
آپ کے دشمن کیوں ہوں سوا  
آپ نہ کیجئے اس کا خدشا  
شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دنیا بدلی

سید شمس علی دہلوی

کس نے چھڑا سا زہر بستی  
صورت بھولی، باتیں بیٹی  
”ٹھٹھے“ جانی، ”بیٹھے“ پیاری  
کتنی خوش تھی اپنی بستی  
کیا ہوئی دُنیا کیا سے کیا، تھی  
بند نہ ہو یہ موت کی چسکی  
شکوہ کس کا، شکایت کس کی  
دل میں پھر اک ہوک نکلی  
لب پہ آئی یاد یہ کیس کی  
آن نہ کوئی دفا سے خالی  
دل میں اُمنگ اور اکھ بستی  
ہم ہیں وہی، پر بات ہی بگڑی  
خوش رہیں آپ، دھلے ہی  
غیر نہ اپنا، کوئی نہ سا رہی

آپ نہ بدلے، دنیا بدلی

کون دان تھا، آپ نہ آئے  
کس کے جلوے پیش نظر تھے  
اسکھ سے کس کی کچھ خراہے  
وہ بھی عجب تھے عشق کے غم  
”نٹ“ ”تھی نہ تیر تھے“ ”ٹھٹھے“  
گھر سے گھر نہ دیکھ نہ پائے  
چُھپ کر دیکھا، پاس نہ آئے  
روٹھ کے لوئے پہنے ہی رہے  
ہنس کر بائیں گلے میں ڈالے  
پھر تو تم تھے، پر تم کے جھوٹے  
جو نہ تیا جہل میں ڈوبے  
شکوہ کس کا، شکایت کس کی  
بہ ری برسے، بجلی کڑے  
لپٹے، پر لپٹے، کس نے چھوٹے  
پیر جی نظر سے کوئی جو دیکھے  
فوش تھے اداسی، روٹھے جاکو  
”پیت کے آگے مذہب کیا ہو“  
کام سے چھوٹے، گھر کو پہنچے  
ہم نے بھی ڈوری بہت کو ڈالے  
تک کر بیٹھے، پھر رسم بکھے  
سامنے جا کر ہاتھ جو چڑھے  
پھر کو بھولے یاد سے پہلے  
آہ اودہ دن اک خواب بکھے  
یاد وہ بھی ہو اتنی، کیا تھی

آپ نہ بدلے، دنیا بدلی

اب تو بجلی کی آس نہیں جب  
قد رکھو سپا نہیں جب  
دل میں جاں کا قیاس نہیں جب  
دل ہی دولت پاس نہیں جب  
رونا بہنا، اس نہیں جب  
مرزا کہاں کا، الفت کبھی  
یوں ہی دل کچھ اوس نہیں جب  
اس کے نام کو یا نہیں جب  
تم میں لپٹے ہر اس نہیں جب  
لپٹے کیا کی آس نہیں جب  
پیت تو گل میں یا نہیں جب  
شکوہ کس کا، شکایت کس کی

آپ نہ بدلے، دنیا بدلی

سنو، روبرو

ہو گئے اور اسے کوڑا

## تیرے بغیر

شعلے تمہیں انا بچا ہے بہار بوستاں تیرے بغیر  
چہرہ ہے لعل کون لامکاں تیرے بغیر  
چہین دل میں، نیند آنکھوں میں کہاں تیرے بغیر  
مضطرب مضطرب عمر رواں تیرے بغیر  
پہنسی کی آمد و شد، آند و کاف و حش کی دلیل  
تو نہیں کدول کی بستی میں آجا لا ہی نہیں  
ہر کاف میں تری مہر ابھی ہے اک گل کد  
آتش سیال رقصاں ہے مے دل میں کہ آج  
چاندنی راتوں کی یہ سرمستیاں بے کیف ہیں  
سیکڑوں بجے ترپتے ہیں حسین طوق میں  
نغمہ ہستی، طرب و زندگی، بزم حیات

فرحیت مہور ہے کلبہ احزاں میں ہے  
کس کو ہے تو بقیہ سیر بوستاں تیرے بغیر

## محبوب کی آمد چکر

مہر جہن کی روش روش پر بہار آئی، بہار آئی  
سکوں کے زندہ و روح افزا لہجے پیلے، انظر کی حد تک

بھلا دیو پر تے تغافل نے وجد میں اس کے شعر کہنا  
طال چھایا ہوا تھا، میرے خیال کی خوشداشتوں پر  
امید و بوی ہوئی تھی، آخر زندگی کے سادھی عروزی میں  
وہ وقت کچھ اس طرح طرہ و رخا کہ میں جانتا ہی، دل ہی  
نہ عشق نہ تھیں، گھٹا و بڑی کیفیت، آخر خوش جمالیساں ہی

خطاب بہار ہے، منتظر کی زرد و زرخور یوں پر  
طرب نظر ہو گیا، ہوں میں اب سطرنگا ہو نیچہ چار ہے  
ہو ہے محفل کیفیت آئیں۔ تصنیف کو جمال بدے

مے فرود وند و گلشن کی کیفیت پر ہر بہار ہے، گھر  
ہو اہوں، بچو۔ میں جس انداز ہی انداز کا ہے، گھر

فائلت غیر سے بارہ ٹلنگ  
نمودہ کاہر پر مفت سیمہ جاتا ہے

# جرعات

شعبہ انجمن دینی پبلیکیشنز

## جلد ۶ ساقی دہلی بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء نمبر ۶

| نمبر شمار | مضمون                          | صاحب مضمون                                      | صفحہ |
|-----------|--------------------------------|-------------------------------------------------|------|
| (۱)       | پنجواؤ میں                     | حضرت پیر محمد                                   | (۲۱) |
| (۲)       | آلوہ کی شہیں اور ان کی کہانیاں | شمس العطار مولانا عبدالرحمن                     | (۲۲) |
| (۳)       | عشق بنور                       | حضرت پیر محمد                                   | (۲۳) |
| (۴)       | ستان نقول                      | جناب ملک دھرم ناتھ فرحت کاہری بی۔ اے ایل بی۔ اے | (۲۴) |
| (۵)       | طاعت آزادی                     | جناب الطاف مشہدی                                | (۲۵) |
| (۶)       | دی ورتوں                       | جناب اختر حسین رشتہ پوری بی۔ اے (علیگ)          | (۲۶) |
| (۷)       | ایک رات                        | جناب ن۔ م۔ راشد ایم۔ اے                         | (۲۷) |
| (۸)       | کمی کی یاد                     | جناب سید وزیر حسن دہلوی                         | (۲۸) |
| (۹)       | ادب و زندگی                    | جناب حفیظ العسیمی بی۔ اے                        | (۲۹) |
| (۱۰)      | خزینہ                          | دولت گار                                        | (۳۰) |
| (۱۱)      | جیون ایک پہلی                  | جناب صادق الخیری ایم۔ اے                        | (۳۱) |
| (۱۲)      | عشقل                           | جناب کوکب شہجیان پوری                           | (۳۲) |
| (۱۳)      | فصح الملک                      | جناب سید علی منظور حیدر آبادی                   | (۳۳) |
| (۱۴)      | حشر جذبات                      | جناب نائب کاہری                                 | (۳۴) |
| (۱۵)      | خطوط معلط                      | جناب فتاح مطلق                                  | (۳۵) |
| (۱۶)      | خواجہ کی بیٹی                  | جادو شاعر حسین اختر بی۔ اے (علیگ)               | (۳۶) |
| (۱۷)      | ڈاکٹر مساریک                   | پروفیسر محمد مسلم ایم۔ اے                       | (۳۷) |
| (۱۸)      | بہی کی چھل والیاں              | جناب سید ابوطاہر دادو بی۔ ایس۔ سی               | (۳۸) |
| (۱۹)      | نئی روشنی کا اندھیر            | جناب شرف صبور دیوبلی (ضی فاضل)                  | (۳۹) |
| (۲۰)      | سرت چند رچلجی                  | فاضل                                            | (۴۰) |
| (۲۱)      | اساس حیات                      | جناب بشیر خاڑی                                  | (۴۱) |
| (۲۲)      | مرد اور عورت کے حقوق           | جناب مرزا سمیع علی خاں                          | (۴۲) |
| (۲۳)      | درست کے حضور                   | جناب اختر بی۔ اے (علیگ)                         | (۴۳) |
| (۲۴)      | الحجاب                         | جناب سید محمد محمد ایم۔ اے (عظیم آبادی)         | (۴۴) |
| (۲۵)      | حجاب رسد                       | جناب سید علی عثمان کراچی ایم۔ اے                | (۴۵) |
| (۲۶)      | حجاب                           | جناب مسعود جاوید                                | (۴۶) |
| (۲۷)      | حجاب الحجاب                    | ایک خاتون                                       | (۴۷) |
| (۲۸)      | پہلی قبرا کا راز               | جناب عبدالقادر سردری ایم۔ اے                    | (۴۸) |
| (۲۹)      | تجربیات                        | جناب تاجعلی دیوبلی                              | (۴۹) |
| (۳۰)      | جسبہری باپا شاہ                | محمد رضا علی شاہ حسین                           | (۵۰) |
| (۳۱)      | نقد و تمجید                    | ادارہ ساقی                                      | (۵۱) |

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## نگاہِ اولین

خدا کا شکر ہے کہ اس پرچے کے ساتھ سنائی کی تحریر کا کچھ ان سال پر مرکب ہر ایک شائق میں خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ قائم رہ سکے گا جو ری میں سالانہ ۱۰ جولائی میں اس وقت شائع ہوا ہے۔ ۱۰۰ سال کی مجموعی ضخامت پانسو صفحے سے زیادہ تھی۔ معمولی پرچے چھپانے والے چھپانے والے صفحے کے شائع ہونے۔ اس طرح سنائی کی سنائی نے تہذیباً پختہ اور سو صفحے پیش کئے۔ مضامین کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اردو کے بہترین انٹ پرانوں نے سنائی کو نوازنا سب سے پہلے لانا غلامیت اللہ دہلوی شکر یہ کے مستحق ہیں کہ سنائی میں شیک سپر کے دو درجے پبلٹ اور جمیلین اور ڈاکٹر ڈنکن کا فلسفیانہ ماحول اور دس اردو میں منتقل فرمایا اور انہیں پیش کر دینا کمال فخر سنائی کو حاصل ہوا۔ ان کے بنی حضرت ابو ہریرہ، مسٹر صادق الخیری، مسٹر اختر حسین رائے پوری، اور پریم پوری جی کا میں شکر گزار ہوں۔ سنائی کیلئے بہت اچھے اچھے افسانے ان حضرات نے لکھے۔ ڈاکٹر عبدالغنی شادانی نے اردو شاعری اور غزلوں پر نہایت بصیرت افروز مضامین تحریر فرمائے۔ سنا جعفری صاحب نے پریم کہانیوں کا دلکش سلسلہ سنائی میں شروع کیا اور ابھی جاری رہیگا۔ غرض کہ ہر ایک کے لیے سنائی کی کہانیوں کے کئی عمدہ تراجم پیش کئے۔ جابا علی زلی صاحبہ کے افسانے اور ادب پاسے بہت پسند کئے گئے۔

سنائی کے بعض ان خریداروں کو جوت بڑے سے سنائی کے خریدار ہیں یہ شکایت ہو کہ سنائی اب انہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس کا مجھے بھی اعتراف ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدلتی جاتی ہے اور میں اگر زندہ رہتا ہے تو زمانے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی چلنا پڑے گا۔ جو وہ مسکن کو موت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ زندہ اور پائدار ادب پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ترقی پسند ہوں۔ اٹھ سال کے عرصے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ سنائی کو ترقی بھی نہ کرنا اور زندہ بھی رہتا؟ ہماری ضروریات بدل گئیں۔ ہمارے نظریے بدل گئے۔ پہلے مشفق کہانیاں اور غزلیں ہیں بہت پسند تھیں۔ مگر اب بھوک اور افلاس، غلامی اور آزادی، سماج اور تہذیب، اور اسی نوع کے ضروری مسائل نے ہماری تمام تر توجہ جذب کر لی ہے۔ ادب تو زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ پیش نظر مسائل کا عکس ہمارے ادب پر نظر آنا ضروری ہے۔ بس اسی قسم کی چند وجوہ ہیں جن کی وجہ سے سنائی اب انہیں رہا جو سلسلہ میں تھا۔ تصاویر کی اشاعت پر بھی زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ ان کی بجائے سنائی کی ضخامت میں متوالہ صفحے کا اضافہ کر دیا گیا۔ ادبی حلقوں میں اس تجویز کو بہت کر دیا گیا۔

سنائی کے مستقل خریداروں کو انجانہ ختم ہونے سے ایک مہینہ پہلے اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ وہ آئندہ کیلئے خریداری یا عدم خریداری کے متعلق کو فکر کو مطلع کر دیں مگر بہت کم حضرات اس ضروری امر کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ سہولت اور کفایت تو اسی میں ہے کہ چندہ بدلی ہوئی آرڈر بھیج دیا جائے۔ کیونکہ وہی۔ پی۔ کی صورت میں چار آنے کی مزید باری خریدار کو ہوتی ہے۔ جو حضرات سنائی آئندہ کے نام جاری رکھنا نہیں چاہتے اگر اطلاع نامہ پائے یا دفتر کو ایک ایک کارڈ لکھ دیں تو سنائی ایک کثیر رقم کے نقصان کو بچا جاتا ہے۔

شاہد

پیشہ

# اردو کی مثلیں اور ان کی کہانیاں

اردو کی بہت سی مثلیں دوسری زبانوں کی مثلوں کی طرح قصے کہانیوں یا واقعات سے نکلی ہیں۔ کچھ ان میں سے ایسی ہیں کہ ان کا قصہ کم و بیش ان کے الفاظ ہی سے سمجھ میں آجاتا ہے جیسے مت کر ساس بُرائی آگے تیرے بھی جانی۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں، دھوہی کا کُتا گھر کا نہ گھاٹ کا نہ مگر کچھ مثلیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا قصہ ان کے الفاظ سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسی مثلوں کے قصے روز بروز بھولتے بسر تے ہیں۔ اور یہ ایک ادنی نقصان ہے۔ بولنے کو یہ مثلیں لوگ کم و بیش بولتے ہیں۔ اور سُننے والے اُن کا مدعا بھی سمجھ لیتے ہیں۔ مگر عموماً دونوں نہیں جانتے کہ مثل بنی کیسے تھی۔ آج ہم ایک ایسی مثل اور اس کا قصہ بیان کرتے ہیں۔

کہتے ہیں بس آنکھوں کی سونیاں اور روئیں میں یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ کوئی کام تھوڑا سا رہ گیا ہو اور اور اسے لگے ہاتھوں کر بھی لیٹنا چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ ساری نشت بکارت جائے اور کچھ ناچار پڑے۔ دیکھتے کہ ان کے الفاظ کہاں یہ معنی مکر وہ کہانی سُننے جس سے یہ مثل نکلی ہے۔ الفاظ دُست کا۔ بڑے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

کہانی یوں ہے کہ کسی ملک میں تھا کوئی بادشاہ بہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ ایک دفعہ وہ شہر سے شکار کو نکلا بادشاہ بیگم اور اپنی اگلیوں بیٹی کو بھی ساتھ لیا۔ امیر، وزیر، فوج فرہ، نوکر چاکر۔ خادم چشم ہر کاب ہوئے۔ ابھی ٹھہٹھا ہی تھا کہ شکار گاہ میں جا پہنچے۔ یہاں ہر قسم کے شکار کی کثرت تھی۔ شکار کا اذن عام دے کر بادشاہ۔ بادشاہ بیگم اور شاہنشاہ نے بھی اپنے گھوڑوں کی بانگیں اٹھائیں چند امیر نامدار اور خاصہ بادشاہی کے سوار پیچھے پیچھے چلے۔ یہ سب شکار کھلتے ہوئے ایک طرف کو بڑھے چلے جا رہے تھے کہ بادشاہ کی نظر ایک ہرن پر پڑی۔ اس کے سینک نہری تھے۔ بادشاہ بیگم اور شاہنشاہ نے بھی اسے دیکھا۔ تینوں نے اپنے گھوڑے اس کے پیچھے ڈالے کہ تین طرف سے دبا کر اس کو کمز سے پکڑ لیں گھوڑے ان کے ہوا ہو کر اڑے اساتھی سائے پیچھے رہے۔ اور یہ تینوں کہیں سے کہیں نکل گئے۔ ہرن بار بار کندکی زور پر آکر تیر پر ناب سے بھی دُور نکل جاتا تھا۔ مگر نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ تینوں شکاری اپنے ساتھیوں سے کچھ دُور بہت دُور نکل گئے۔ اور ایک کف دست سیاہاں میں جا پڑے۔ اب جو دیکھا تو ہرن کا کہیں بتہ نہ تھا۔ بہت گھبرائے۔ بانگیں موڑیں تو راستہ نہ ملا۔ جتنے چلے اپنی شکار گاہ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ راستہ کی تلاش میں پوئی لگا رہے چلے جاتے تھے۔ کہ دور سے ایک سیاہی سی نظر آئی سیجھے کوئی آبادی ہے۔ وہاں سے رستے کا پتہ لے گا چلا پل پہنچے پہونچے تو دیکھتے کیا ہیں ایک قلعہ کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اندر باغ لگا ہے اور پھاٹک اُس کا کھلا ہے۔ سامنے ہی آبادی خانہ ہے۔ کورے کورے گھر بے بانی سے بھرے تھے تخت بستوں سے لپٹے مٹھری کٹوروں سے ڈھکے رکھے ہیں۔ شکاریوں کا جی چاہا وہ دہاتے ہوئے باغ میں گھس جائیں۔ گھڑوں پر جا پڑیں اور ڈنگا کر خوب پانی پیئیں۔ مگر کچھ سوچ کر بادشاہ نے اپنی باگ روکی، بادشاہ بیگم بھی شاہنشاہی ان کے دل کے خطے کو سمجھ کر خود اپنے گھوڑے

سے اُتری اور یوٹی۔

”حضور، یہیں ٹھہریں میں اندر جا کر پانی اور قلعہ کی خبر لاتی ہوں بادشاہ اور بادشاہ کے بیٹے“ بایں بایں کرتے ہی رہے کہ شہزادی قلعہ کے دروازے کے اندر تھی۔ مگر وہ دروازہ کے اندر پہنچی تھی کہ ایک دہماکہ ہوا اور بھاگ بھاگ قلعہ کا بند ہو گیا۔ اب تینوں کے حواس گم عقل غائب۔ ہر چند اندر باہر سے تدبیریں کیں ادھر ادھر بھڑکے کہیں کوئی جگہ چڑھنے اُترنے کی بجائے مگر بیکار۔ بھاٹک سے لگے تینوں اندر باہر کھڑے روتے تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ سوچ سر بر آنے لگا تو شہزادی نے ہمت کر کے بادشاہ اور بادشاہ کے بیٹے سے کہا کہ حضور اب خیر سدا رہیں۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑیں۔ حضور کے اب یہاں ٹھہرنے میں سراسر نقصان بلکہ جانوں کا زبانون ہے۔ کوئی دم جاتا ہے کہ آسمان یہاں آگ برسانے کا اور زمین شعلے اُٹھنے لگی۔ ابھی وقت ہے۔ اور امید بھی کہ اللہ آپکو خیر سے اپنی ولایت میں پہنچا دے۔ وہاں سے آپ میرے لئے بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں یہاں بہر حال ایک مکان میں ہوں۔ باغ میں کھانے پینے کو کچھ مل ہی جائے گا۔ ماں باپ کا جی نہ چاہتا تھا کہ سخت جگہ بیٹی کو یوں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر کرنے کیا۔ اپنی مجبوری اور بیٹی کے اصرار سے وہ روتے دھوتے وہاں سے چلے کہ شاید کوئی راستہ مل جائے اور وہ اپنے شہر میں پہنچ جائیں تو بیٹی کی رہائی کی کوئی تدبیر کریں۔

ماں باپ کے رخصت ہونے پر شہزادی پہلے تو بہت روتی بیٹھی۔ پھر سوچی جو بڑی ہے بھگتنی ہی بڑی چلو دیکھیں تو یہ باغ کیسا ہے۔ اور حال اس کا کیا ہے۔ چل پھر دیکھا۔ تو سچی یہ کوئی شاہی قلعہ اور شاہی باغ ہے۔ اندر اس کے بڑی سی محل سرا ہے۔ دونوں پہلوؤں میں اس کے تمام شاہی کارخانے موجود ہیں۔ جو ہر قسم کے ساز سامان اور ضروریات زندگی سے بھر پور ہیں۔ اور پھر ہر چیز نئی اور تازہ ہے۔ مگر میر سامان و سربراہ کار بلکہ جاندار وہاں کوئی نہیں ہے۔ یا سب تھے اور پھر گئے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر وہ حیران تھی کہ ابھی یہ ماجرا کیا ہے بیٹی لگی ہوں یا خواب دیکھ رہی ہوں یا دیوانی ہو گئی ہوں۔ یوں ہی پھر پھر پھرتی وہ ایوانِ خوباہ میں پہنچی اور سہم کر رہ گئی۔ دیکھتی کیا جو۔ ایک نوجوان شاہانہ شکل و صورت کا ایک زرخیز مسہری پریشاں ہے اور بدن اس کا سارا سونے سے بندھا ہے۔ بہت دیر تک سہمی ہوئی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر دڑتی دڑتی آگے بڑھی۔ آپ ہی آپ زور زور سے باتیں کرنے لگی۔ ہاتھوں سے دھمکیاں دے کر کہتا کہ سونے والا جاگ اٹھے مگر سیداری کی کوئی علامت نہ پائی۔ سچی مرچکا ہے۔ کان دل سے لگا کر سنا۔ تو معلوم ہو زندہ ہے مگر سکتہ ہے۔ اللہ ناس کے دل میں رحم والا۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ آواز غریب کی سونیاں نکالیں شاید زندہ ہو جائے۔ اجر نہ سہمی دیکھی تو کہیں نہیں گئی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے سونیاں نکالنی شروع کیں۔ لیکن یہ کوئی دوچار ہر کام نہ تھا۔ اس نے وہ روز سونیاں نکالنی تھک جاتی تو باغ کی سیر کرتی۔ کھاتی پتی اور آرام کرتی۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ مسلسل کی جست پر کھڑی ہوا کھا رہی تھی۔ دیکھتی کیا ہے۔ کہ ایک قافلہ بردہ فروشوں کا زبردیا اور قلعہ ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے ایک بردہ فروش سے بات چیت کر کے ایک ملک سی لٹنڈی خرید لی۔ یوں تنہائی کا بھی غم غلط ہو گیا۔ مگر سونے والے کی سونیاں خود ہی نکالنے لگی۔ کیونکہ رفتہ رفتہ زخم کی جگہ اس کے دل میں محبت نے لے لی تھی۔ آخر شدہ شدہ دن آج کہ سونے والے کی طرف بھاگ



سویاں رہ گئیں۔ شاہزادی نے دل میں کہا اب بات ہی کیا ہے۔ او پیٹے ذرا نہیں پھر یہ سویاں نکالیں گے۔ لٹڈی کو خوابگاہ میں جھوٹا اور خود تمام میں چلی گئی۔ بیٹھے بیٹھے لٹڈی کے جی میں آئی۔ یہ سویاں میں ہی کیوں نہ نکال دوں۔ ابھی شہزادی ہٹا دھوکہ کر آئے نہ پانی تھی۔ کہ لٹڈی نے سونے والے آنکھوں کی سویاں نکال دیں۔ سویاں کا ٹکڑا تھا کہ سونے والا کلمہ پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور اُس نے لٹڈی سے پوچھا تم کون؟ کہا حضور کی خدمتگذار لٹڈی۔ اُس نے کہا اب تم خدمتگذار نہیں ہیں تمہارا خدمتگذار ہوں۔ تم نے مجھے مردہ سے زندہ کیا ہے۔ دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شہزادی بھی ہٹا دھوکہ لگائی۔ نوجوان نے لٹڈی سے پوچھا یہ کون ہیں؟ لٹڈی نے جواب بیگم۔ بتا چاہتی تھی ناک منہ چڑھا کر جواب دیا میری بندور ہے۔ شہزادی کے دل میں ایک برجھی سی لگی اور کلیجی سے پار ہوئی۔ وہیں سے وہ اُسے پاؤں پھری۔ اور پھر اُدھر کا رخ نہ کیا۔ یہ جوان جس کا حال تم نے سنا ایک شہزادہ اور اپنے باپ کا دلی عہد تھا۔ اور یہ باغ و قلعہ دارا سلطنت تھے اور اس کا خاص رمنہ تھا۔ کبھی کبھی وہاں جاتا اور تنہائی کا لطف اٹھاتا۔ ماں اس کی سوتیلی تھی۔ اس کو دیکھ دیکھ کر جلتی اور اُس کا دلی عہد سلطنت ہونا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُس پے اُس نے جادو کے زور سے شہزادے اور اس کے رفقا کا یہ حال بنادیا تھا۔ اب جو شہزادہ اچھا ہوا تو اس کے سامنے دوست اور نوکر چاکر بھی جو تھرکے ہو گئے تھے زندہ ہو گئے۔ اور سارے کارخانوں کی سربراہی ہونے لگی۔ اور لٹڈی بیگم بن بیٹھی اور نابکار نے شہزادی کو حکم دیا کہ صبح و شام کو کوٹے باغ میں اگر کرائیں کا بنیں کرتے شور مچا کر ہمارے آرام میں خلل اندازہوتے ہیں۔ تم ان کو دن کو اڑا دیا کرو۔ خبردار غفلت نہ ہو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ اب تم کچھ دنوں شہزادی کو کوٹے اڑانے اور اپنی غلطی کا خمیازہ اٹھانے دو اور دیکھو لٹڈی اب اپنے کئے کی کیا سزا پاتی ہے۔ خدا کے ہاں دیر بہت اندھیر نہیں۔

شہزادہ سویاں سے نکلا تو اُس کے دل میں یہ ترنگ آئی کہ باپ کی خدمت میں حاضر ہونے پہلے اُدھر اُدھر کا ایک سفر کرے۔ ارادے کی دیر تھی سب تیاریاں ہو گئیں چلتے چلتے شہزادے نے بیگم اور قلعہ داروں سے پوچھا کہ ان کیلئے سفر سے کیا کیا لانے کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ گل مار لٹڈی کی نوبت آئی تو اُس نے کہا کہ میرے بے حسن گڑبوں کا صندوق لائیے گا۔ شہزادہ اچھا کہتا ہوا سوار ہو گیا۔ اب خدا کا کرنا دیکھو کہ وہ پھر تا پھر اتنی شہر میں کیوں نہ جانے جہاں شہزادی کا باپ تھا۔ وہاں سے چلے کا وقت آیا تو شاہزادہ مع اپنے رفیقوں کے جہاز میں اکر سوار ہوا۔ ملاحتل نے جہاز کے بادبان کھولے اور لنگر اٹھایا مگر جہاز کسی طرح نہ چلا۔ جہاز کا کپتان چلایا۔ جہاز میں کوئی گنہگار جھوٹا آدمی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔ آج تم سب جہاز سے اتر جاؤ۔ جہاز چار دن میں چلے گا۔ جو خطا دار ہے وہ ہمارے جہاز پر نہ آئے۔ اب شہزادے کو یاد آیا کہ لنگ مارنے سے ہم نے سن گڑبوں کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اب تک نہیں لی ہیں۔ جہاز سے اترتے ہی اُس نے شہر کو آدمی دوڑائے شہر میں کسی نے سن گڑبوں کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ قضا را یہ بات کہیں ایک بڑھیلے کان میں پڑ گئی۔ یہ شاہزادی کی دوا تھی۔ وہ جانی تھی کہ سن گڑبوں کا صندوق اس کی شہزادی کے لئے بنا تھا۔ جو گم ہو گئی ہے۔ وہ دوڑی ہوئی بادشاہ بیگم کے پاس پہنچی اور سارا ماجرا بیان کیا۔ بادشاہ بیگم نے سن گڑبوں کا صندوق دوڑے کے ہاتھ شہزادے کے آدمیوں کو بھجوا دیا اور جاسوس لے کر پیچھے لگا دئے۔



## ”عشق غمخور“

جفا کا ٹور مری نا کشیدہ آہ میں ہے  
جوابِ نوحوتِ بجا مری نگاہ میں ہے  
خود کی کی تیغ و دم کا نیا بڑ بھی ہو مٹی  
اگرچہ زورِ بہت ناز کی بسپاہ میں ہے

پہ درخ سینہ میں ہر وہاں رکھتا ہوں  
حریف پر وہ حالِ نگاہ رکھتا ہوں  
عجبت لگھنٹ پر زلفت پہ چمک چمکے کیو  
چراہ رکھتا ہوں میں بے پناہ رکھتا ہوں

نیا زمند ہوں لیکن سب کمینہ نہیں  
جو پھیلنے کے لئے ہو وہ آگ بیت نہیں  
ہم حیات کی جوں بھی جاتی ہیں کہیں  
سینہ کا نہ ہوں ناخدا سفینہ نہیں

تم کرم و محبت اگر محبت ہو  
عطا اور عین جفا گرفتورِ نیت ہے  
نہیں ہو عشق سے نسبت ہوں پرستی کو  
اپنی وہ عشقِ شرفِ زلفِ ملت ہو

ایمن خرمیں، اسیا لکھنوی

## شانِ تغزل

وحشت تھی، وحشتِ پشماں تو نہیں ہم  
فرقت میں تری یاد ہے اور جوشِ تمنا  
ساقی! کبھی اس ممت بھی اک ساعِ نصیب  
مانا کہ تر ابلوۂ عریاں نہیں دیکھا  
خاموش ہیں خاموشی حیرت بھی، اک چیز  
خاک رہ اُلفت ہی تھی، ہیں ترے در پر  
جو کچھ بھی کیا ہے وہ خلوصِ دلِ مجھ سے  
صدِ شکر، کہ دنیا میں پشماں تو نہیں ہم

پابستِ غزل ہو کے نکھرنے پہ بھی فرحت  
جذبات یہ کہتے ہیں کہ عریاں تو نہیں ہم

فرحت کا پوری!

## لمحاتِ آزادی

گھٹاؤں کے سائوں کی مستی سے بڑھکر  
حسبِ بربطوں کے ترنم سے پیارے  
وطن کے حسینوں کے ناموں سے میٹھے  
ستاروں کی کرنوں کے بسترے دلکش  
محبت کے آوارہ راگوں سے پیارے  
بہاروں کی اُٹھتی جوانی سے شیریں  
فرشتوں کی پاکیزہ ہستی سے بڑھکر  
لب و لہجہ کے تقسم سے پیارے  
ننگا ہوں کے پر کیف جاموں سے میٹھے  
مہ و مہر کے سیگموں گھر سے دلکش  
سیسی کی زلفوں کے ناگوں سے پیارے  
مری عاشقی کی کہانی سے شیریں

وہ لمحات گزریں جو آزادیوں میں

وہ اوقات گزریں جو آزادیوں میں

الطافِ مشہدی

## وہ دونوں

اندھیرے میں کچھ مُردے چُپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُدھر موت کی ہلکی ہلکی تاریکی نور کی چٹانوں میں جم رہی تھی اور نیچے زندگی تاریکی کی سموریوں میں پھیل رہی تھی۔

اُن میں سے ایک نے کہا: ”اُو، اب ہم اس دُنیا کی باتیں کریں جسے ہم جیت گئے۔ چھوڑ آئے ہیں۔ دیکھو مٹی کی ٹوبہاں کتنی تیز ہے کہ اب تک وہ ہم میں بسی ہوئی ہے اور اس کی ہر موج کے ساتھ زندگی کا کوئی بھولا ہوا واقعہ ہمیں چومکا دیتا ہے۔“

دوسرے نے روشنی کا ایک گھونٹ پی کر جواب دیا۔ ”وہ زندگی میرے لئے ایک ایسی کبیر ہے جسے کسی نے ایک بیک جُٹا دیا ہو۔ سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں کیوں زندہ تھا، کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔“

لیکن میرے کانوں میں اب بھی ایک ہُنب آواز گونجا کرتی ہو۔ صبح سے شام تک روپے گننے میں نے اپنی ہر گونواں اور مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ کبھی آنکھ اٹھا کر اپنے گرد و پیش کو دیکھتا۔ تین تہا ایک بڑی سی حویلی میں بیٹھ کر میں رنگ برنگے پتھروں کو آنکھوں سے چھوتتا رہا اور جس طرح ان میں زندہ رہا اسی طرح ان میں مر بھی گیا۔ صرف ایک مرتبہ میں نے اپنے باغ میں جھانک کر دیکھا تھا۔ خزاں کا موسم آچکا تھا اور پیٹر روڈ سے مجلس کر سٹیوں میں سوئے ہوئے تھے۔ لیکن ایک جوان لڑکی گاتی ہوئی انہیں پانی دے رہی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُجڑا ہوا چمن ابھی شاداب ہو جائیگا اور اس کی ہوائیں نئی کوپلوں پر ناچنے لگیں گی۔

میرے ہاتھوں سے وہ جواہرات گر پڑے۔ میں نے دیکھا کہ میری زندگی کی پت جھڑمکی ہے اور اگر زور سے گوبلی تو یہ ابھی گر پڑی۔

میں ہر روز اُس مالن کی آمد کا انتظار کرنے لگا اور کھڑکی پر بیٹھ کر اس باغ کو دیکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کے پیٹر ہرے ہونے لگے، ایک دو پھول یہاں وہاں سے نکلے اور انھوں نے شرماتے شرماتے اپنے نئے گھر کو کن آنکھوں سے دیکھا۔

تہائی کا یہ احساس میری جان کا لاگو ہو گیا۔ میرے جسم اور میری روح سے کسی کو کوئی تعلق نہ رہا تھا اور یہ خیال کہ ان بیجان پتھروں کے سوا کوئی مجھے نہ بولے گا، میرے لئے انتہائی اندوہ ناک تھا۔ جب میں ہر جاؤنگھا تو اس زندگی سے مجھے کوئی تعلق نہ رہے گا، کوئی ایسا نہ ہوگا جو میری لاش کو آواز دے اور پکارے کہ میں اس مُردے کو مجھے واپس دے دو۔ اور میں بھی موت کے مالک سے یہ نہ کہہ سکوں گا کہ ہاں ابھی ایک بندہ صحت منانے کی زندگی سے مجھے کچھ لینا ہو، دُنیا کے بازار میں میں باسکل دیوالیہ نہیں ہوں۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ وہی مالن ہنسی اور گاتی ہوئی باغ میں آئی۔ اُس نے شمرات سے ایک پھول کے گال چپٹ

رسید کیا اور ایک نئی ٹہنی کو محبت کے مارے گلے لگایا۔

میں باہر بھاگا۔ میری ایک ٹھٹی میں تجوری کی چابی تھی، اور دوسری میں جواہرات۔ میں نے یہ سب اس کے قدموں پر ڈال دئے اور عاجزی سے کہا کہ یہ سب کے صرف زبان سے کہہ دے کہ میں تجھ سے محبت کر سکتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ تیرا تو۔ اس نے جراتی سے میرے سفید بالوں اور کاپٹے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا، پھر حقارت سے ہتھکے ان ٹکڑوں پر نظر ڈالی اور یہ کہتی ہوئی علی گئی۔ ”میرا کام سوکھے ڈنڈ کی چڑ میں بانی دینا نہیں ہے“

اور جب میں مر گیا تو وہ ساری دولت دنیا کے ہاتھ لگی اور میری تشنگام دفع اس وقت اُجالے میں آئی جب اندھی ہو چکی تھی! جب وہ خاموش ہوا تو بہت سے مردے، اہستہ سے بولے، ”ہاں، دُنیا ہمارے لیے بھی ایسی ہی تھی۔ ہم نے یہ نہیں سوچا کہ زندگی کا لطف بہت سی سین لغزشوں میں مضمر ہے۔ محبت کو ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے چھو کر دیکھا تھا۔ وہ نرم تھی ستاروں کے نغمہ کی طرح اور سخت تھی مضرب کے تاروں کی طرح۔“

مُرنے لگا اس کے تختہ پر بیٹھے بیٹھے ایک مُردے نے کہا، ”ہر شام کو وہ باؤلی کے کناے میرا انتظار کرتی تھی۔ میری یہ جرات نہ ہوتی تھی کہ سڑک سے ہٹ کر اس پچاس جاؤں اور کچھ کہوں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہاں کیوں کھڑی رہتی ہو اور اسے بھی معلوم تھا کہ یہ ادھر سے کیوں گزرتا ہے۔ اور باؤلی کا بانی ایک خاموش رانگی گاتا رہتا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں پیل کے پتے جھلکاتے تھے اور فضا کے سناٹے میں بچپن کا بھولا پن ہوتا تھا۔“

ایک روز میں نے کسی پھل داری سے بڑا سا گلاب توڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب اس کے قریب گزرا تو جھٹکے اور ڈرتے ہوئے وہ گلاب میں نے اس کے قریب پھینک دیا۔ اس نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا، گلاب کو اٹھا کر سوٹھا، اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ اور کن آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔

کئی سال گزر گئے اور ایک دن اس نے کسی دوسرے سے شادی کر لی۔ جس دن اس کی شادی ہوئی، ایک آدمی میرے نام چھوٹا سا پارسل نے ہوئے کیا۔ اس پر صرف اتنا لکھا ہوا تھا۔ ”ایک گزری ہوئی شام کی یادیں“ جب میں نے اسے کھولا تو ایک سوکے ہوئے گلاب کی پنکھڑیاں ہوا میں پھرن گئیں۔

اس پامال خاک گل کے سوا محبت نے مجھے کچھ نہ دیا۔

کسی کو نے میں دو چلنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب مُردوں نے اپنی پسلیوں سے سانس نکال کر آواز دی۔

”کچھ تم بھی اپنی کہانی سنناؤ۔ تم نے اُفت میں کیا مزا پایا۔“

مرد نے جواب دیا۔ ”محبت مرد کی تخلیق ہے۔ کیونکہ عورت منزل ہے، مرد ہر وہ ہے۔ عورت ایک مقصد ہے جو مجھے کے لئے ایک تصویر ہے دیکھنے کے لئے۔ جو مجھے والا اور دیکھنے والا مرد ہے“ ایک سیارہ کی لمبی روشنی میں اس نے عورت کا مُنہ ادھر اٹھایا۔ ”غور سے دیکھو، اس کے بالوں میں کیا ہے۔ برگہ کی سی میٹھ جن پر سیاہ رنگ پھیر دیا گیا ہو۔ ان میں یہ بل اندر خم کس نے دیا؟ میری تخیل نے۔ اور یہ آنکھ؟ اس میں یہ جھک کہاں سے آئی؟ میری محبت سے۔ اور اس کی رسیلی آواز؟ اسے میرے نغموں نے شیرنی دی۔ اس کی چال میں یہ قیامت خیزی کہاں سے

آئی؟ میری سستی سے۔ میری آرزو محبت میں رنگینی پیدا کرتی ہے اور میرا تجسس اس میں یاس و غم کی جھلک لاتا ہے۔  
مردوں نے مشتبه نگاہوں سے ہر طرف دیکھا۔ اور اس کا حاصل؟ ”عورت نے کہا۔ ”مگر زندگی کا حاصل کیا  
ہے؟ ماضی کی یاد اور مستقبل کی تاریکی۔ زندگی وہ مسافر ہے جو موت کی سرنگ میں راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کے  
ہاتھ میں محبت کی مشعل ہے۔ جب مسافر تلاش سے تھک کر کہیں بیٹھ جاتا ہے تو مشعل روشنی کی بجائے دھنواں  
دینے لگتی ہے۔ لیکن جب تک چلتے رہو وہ روشن رہتی ہے۔“

مگر مردوں نے مایوسی سے سر ہلا کر پوچھا ”اور اس کی لذت؟“

”اُس میں درد کے سوا کچھ نہ تھا۔ تمنا اور انتظار کا درد۔ کیونکہ محبت کا مزا ایک نئی ناکامی کے بعد ایک نئی  
امید پیدا کرنے میں ہے۔ محبت پیاس کا پہلا نہیں بلکہ آخری گھونٹ ہے۔“

عورت نے مرد کی بات کاٹ کر کہا۔ ”نہن ہے یہ مرد کی کیفیت ہو۔ ہماری محبت کی لو صرف ایک بار لگتی ہے  
اور ایک بار کھٹ جاتے کے بعد پھر کبھی نہیں بھر سکتی۔ پھر دھنواں کے سوا کچھ نہیں رہتا۔“

مرد نے جواب دیا۔ ”عورت دیر تک ندی کے کھاٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ پاؤں لٹکا کر دھاسے کے زور کا اندازہ  
لگاتی ہے، پھر آہستہ سے پاؤں ڈال کر نکال لیتی ہے جب اسے تھاکہ پتہ چل جاتا ہے تو وہ پانی میں تیرنے  
لگتی ہے۔ مگر مرد تشذیب صحرائی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھنور میں کود پڑتا ہے۔ باپ کے بعد شوہر اور شوہر  
کے بعد بچہ، عورت کو کھڑے رہنے کے لئے کوئی سہارا چاہیے۔ وہ ماں بن کر مرد کو اُس کی بے پایاں آرزو کی مزا  
دیتی ہے۔“

مردوں نے تالی بجا کر کہا۔ ”دیکھ لی محبت کی حقیقت۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر دم دیتے رہے۔ لیکن انہیں  
اب تک نہیں معلوم کہ ان کا مقصد کیا تھا۔“ آخر انہوں نے کیا کیا؟

عورت اور مرد نے کہا۔ ”ہم نے زندگی اور موت کے بیچ ایک دیوار بنائی۔ یہ محبت کی دیوار ہے۔ کیونکہ موت  
کی ایک رنگی سے زندگی کو بچانے والا جذبہ محبت کا ہی ہے۔“

برگ و شجر جان دار اور بیجان ————— پسے دیکھو زندگی کی الفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک  
ایسی دُنیا کے درد اواز سے کھٹکتے جاتے ہیں جس میں محبت نفرت پر حکومت کرتی ہے۔

اور کائنات کا درد اور محبت کی کشش میں ہے۔ سیارے ایک دوسرے کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔  
ماڈہ کا ہر ذرہ ایک دوسرے کی تلاش میں گردش گناں ہے۔ اس سلسلے کے سلسلے کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی  
کڑی ہماری محبت ہے۔“

”جاؤ جاؤ۔“ ان مردوں نے حدت سے کہا۔ ”ان باتوں کے باوجود تم دونوں اسی تاریکی میں رہو گے۔ محبت تمہیں موت  
کے اندھیرے سے نہیں نکال سکتی۔“

یہ سکر عورت کے لبوں پر تبسم آیا ————— اور ہر طرف اُجالا ہی اُجالا تھا! —

اختر حسین ایڈیٹوری

# ایک رات

یا وہ ہے اک رات زیر آسمان نیلگوں  
 یا وہ ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات  
 چاند کی کرنوں کا بے پایاں فسوں — پھیلا ہوا  
 سرمدی آہنگ برساتا ہوا — ہر چار سو  
 اور مرے پہلوئیں تو — !

یا وہ ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات  
 تیرے دل میں راز کی اک کائنات  
 تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم  
 جن کے سرچشمے ہیں فطرت سے قدیم

سیر خوش اظہار تیری ہر نگاہ  
 تجھ کو اک لمحے میں اُمید وصال  
 اور اُس سے پیشتر  
 تیرے جسم و جاں کو لپٹائے ہو و ہموں کے جال

تیرے سرچشمے ہیں فطرت سے قدیم  
 سیر خوش اظہار تیری ہر نگاہ  
 تجھ کو اک لمحے میں اُمید وصال  
 اور اُس سے پیشتر

تیرے سینے کے سمن ناز و نہیں بیہم لرزشیں  
 میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کیلئے  
 اپنی نکہت، اپنی مستی مجھ کو دینے کیلئے  
 یا وہ ہے وہ رات زیر آسمان نیلگوں !

تیرے سینے کے سمن ناز و نہیں بیہم لرزشیں  
 میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کیلئے  
 اپنی نکہت، اپنی مستی مجھ کو دینے کیلئے  
 یا وہ ہے وہ رات زیر آسمان نیلگوں !

ن۔م۔راشد  
 ایم۔اے۔



# کسی کی یاد

سوچتا ہوں۔ ریل کا میل جُل ہی کتنا ہوا۔ بیٹھے بیٹھے چلنے۔ کوئی کس کس کو یاد رکھے۔ پھر بھی ایک ماجرا چیتے نہیں اُترتا۔ اُٹھائے نہیں بھولتا!

ایک دفعہ آتی گرمی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ میں طوقان میل میں سوار ہوا۔ سیکند کلاس میں میں اور ایک صاحبزادے اور تھے۔ بیٹل بائیل برس کی عمر۔ تندرست۔ عصری لوہال جن سے مل کر بلا کسی کا کہا یا دوا یا کہ انسان بھی قدرت کی کسی کاریگری ہے۔ سوچ بچار میں کتنا اچھا۔ دل کی باتوں میں کتنا اچھا۔ چہرے تھرے میں کیسا بھلا۔ چال ڈھال میں کتنا دیدار۔ کام کاج میں ایسا جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ سوچہ بوجھ میں ایسا جیسے کوئی دیوتا ہو۔ دُنیا کا سُن ! کائنات کی خوبی !!

ایک سیٹ پردہ تھے۔ ایک پر میں تھا۔ ریل فرارے بھر رہی تھی۔ بہتوں سے طلبہ سا بچار ہی تھی۔ جس کی تال میل پر وہ صاحبزادے کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں بھی اخبار دیکھنے لگا۔ نظریں ان حروف پر تھیں :-  
”یہ راہاؤں کی راج نگری۔ یہ بادشاہوں کا تخت شاہی۔ یہ بیج دج کی بھولی۔ بہار کی دُنیا۔ یہ علم کا گہر جس کا ری کا گہرا نا۔ یہ دولت کا خزانہ۔ انسانیت کا پالنا۔ یہ خطہ پاک۔ یہ سکھ کی سیخ۔ یہ پیارا وطن۔ یہ ہیرالا ہندوستان۔ آہ آج اگر کچھ ہے تو.....“

لتنے میں اُٹھا کر نا کیا ہوا۔ جس سیٹ پر میں تھا اُس کے اُوپر لے چوے سے ایک سیل کی ردی کا رنگین تکیہ بگرا۔ اور مجھ سے اخبار چھینتا ہوا بیچے آ رہا۔ میں نے حیران ہو کر اُن صاحبزادے کو دیکھا، اُنہوں نے مجھے دیکھا۔ پھر وہ جھوٹے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بھی جھٹک کے اُوپر جھوٹے کو دیکھا۔ اس طرح نگاہوں کا خاصا منسلک بن گیا کیا دیکھتا ہوں۔ سر پر ایک گلستانِ حیات کھلا ہوا ہے۔ یعنی ایک نو عمری صاحبہ بھولوں کا باسی گجرِ حائل کئے ہیں۔ دونوں کہنیاں مچی ہوئی ہیں۔ اور ہتھیلیوں پر ٹھوڑی اس طرح رکھ لی ہے جیسے گلداں ہیں گلاب بند اسی مگر مسکراتی آنکھوں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ دیکھ کیا رہی ہیں۔ یوں کہو کہ آنکھوں سے شعر کہہ رہی ہیں! میں نے دیکھا تو اُن کے ہوں پر پھول سی ہنسی کھیل گئی۔ پھر کچھ رک کر بکریا کر فرباہا۔ معاف کیجئے! مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔ جانے کیوں نہ کہہ سکا۔ اور گھر کے اُن صاحبزادے کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ جو جانی میں نے اُنہیں دیکھا وہ اُوپر لڑکی کو دیکھنے لگے۔ پہلے مسکرائے پھر یاد آواز ہنسے۔ لڑکی بھی ہنسے لگی۔ اور سارے ڈبے میں نفرتی گھنٹوں کی سی آواز گونگ گئی۔ ان دونوں کے ہنسنے سے میں بھی اپنے آپ ہنسنے لگا۔ جج ہے۔ ہنستوں کے ساتھ دُنیا ہنستی ہو روئے تو کوئی کسی کا سا جی نہیں!

میں نے اخبار اُٹھایا اور پھر پڑھنے لگا۔ آنکھیں کھیں تھیں، دل کہیں تھا سامنے سے حروف اس طرح غائب ہو رہے

جاتے تھے۔ جیسے سیٹ پر سے پانی اودھردہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

لڑکا :- ہائیں؟ پھر سونے لگیں ۹۹!!

لڑکی :- جی ہاں! بس آپ کو تو میرے سونے سے دشمنی ہے!!

لڑکا :- نہیں جی۔ اب نہ سو۔ دونوں وقت ملے کو ہیں۔!

یہ کہتا ہوا لڑکا جھولے کے پاس آکھڑا ہوتا ہے۔ اور لڑکی کو سونے نہیں دیتا۔ دونوں ہنس رہے ہیں۔ مگر میرے روبرو اخبار ہے۔ ہاں آوازیں سن رہا ہوں۔ ہاں بے کچھ دیر میں لڑکی کی ہنسی نے ایک جھوٹا سا لیا۔ اور اس کی آواز سنجی سیٹ پر آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ لڑکے نے لڑکی کو جھولے سے اُتار لیا۔ اب کیا تھا۔ ہنسی دل لگی اور بڑی یہاں تک کہ دونوں کی آوازیں میں وہ بات سنائی دینے لگی۔ جو بیدار گدگدی کے سے اثر سے پیدا ہوتی ہے جسے اخبار طے کیا۔ چاہا کہ جنگل کی سیر کروں۔ تو ان پر بھی نظر پڑی۔ مجھے اخبار طے کرنا دیکھ کر لڑکا تو انجان ہو گیا۔ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نیچی نظروں ہو بیٹھی۔ خیال آیا ہو گا۔ دیر سے اودھم مچا رکھی ہے۔ شاید میں ان سے کچھ کہوں گا۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا۔

لڑکی کا سٹول سترہ کا سب سے ہے۔ اور اس میں اک آن ہے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ اس پیکر حسن کو دیکھ کر بیک نظر مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ صحت و جوانی کا سبجک ہو رہا ہے! لباس ہلکے رنگ کا سیدھا سا ہے۔ نثر سے پر رنگ شفق کھیلتا ہے۔ دونوں ہونٹ دانتوں میں دبائے ہیں کہ ہنسی نہ آئے۔ کانوں میں یا قوت کا ایک ایک آوینہ ہے ہاتھوں میں ہیرے کی ایک ایک جڑ اوجڑی ہے۔ بال سترے ہیں لائے ہیں۔ روکھے ہیں اور کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ جنہیں گردن کے پاس ایک کاسنی رین نے شیرازہ کیا ہے۔ گویا دم دار تارا زمین پر نکلا ہے! چھوٹی چھوٹی رنیں ہوا سے مٹنے پر آم آتی ہیں۔ انہیں بڑے انیسے بن سے ہٹایا جاتا ہے۔ اُس وقت ترجیحی نظروں مجھے بھی دیکھ لیا جاتا ہے! مگر میں کھڑکی میں سے جنگل کا تماشا دیکھنے لگا۔ میرا منہ پھرنا تھا کہ ان دونوں نے مل کر ہنسی کا پھر ایک ممب سر کیا۔ جو دیر تک گونجتا رہا۔ ہنسی متعدی شے ہے۔ ایک کے ہنسنے سے دوسرے کو بھی ہنسنے کی چھیڑ ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہنسنے تو مجھ پر بھی انسا ط کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اب کے بھی یہی ہو۔ اور اپنے آپ سارا جنگل سرور میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا۔

معلوم ہوا کہ ہرے بھرے جھاڑ۔ اُونچے نیچے پہاڑ۔ پھولتی شفق۔ نکلتا چاند بھی ان دونوں کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ اور ان کی خوشیوں کو دیکھنے ساتھ ساتھ میں۔ ریل فرائے ٹبھرتی چلی جا رہی ہے۔ جنگل بیابان میں کبھی جانور دکھائی دیتے۔ یہ چکارے ہیں۔ یہ نیل گائیں ہیں۔ وہ ہرن جو کرٹیاں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاری ڈار بھی ابھی سرپٹ بھاگ رہی تھی کہ ابھی رگ گئی۔ مگر ریل کو دیکھنے لگی۔ پھر کیا یک بھانگے لگی۔ کہیں دامن کوہ میں چڑھ چکی ہیں جن سے بھورا بھورا دھواں اُونچا ہو رہا ہے۔ کہیں سٹھانے کھیت ہیں۔ جن کے پاس گاؤں کی معدوم کھجوریاں سرور پر ٹوکرے۔ گودوں میں بچے تے کھڑکی میں۔ چہروں پر ہنسی ہے۔ آنکھوں میں حیرت۔ ہمیں دیکھتی ہیں کہیں

کسان کا ندھے پر ہل رکھے جاتا ہے۔ آگے آگے بیل میں پیچھے پیچھے گہروالی لکڑیوں کا کٹھڑا اٹھانے ہے۔ لوگ انہیں جو چاہے کہیں۔ یہ قدرت کا دھنا ہاتھ میں جن کی بدولت دنیا بیتی ہے! یہ اور ایسے میسیدوں سین آتے جاتے تھے۔ ایک سینما سا ہو رہا تھا کہ اتنے میں انجن سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اُٹھے۔ اور ان کی آن میں پھیل گئے۔ پھر یہ دھواں ایک سمت میں سمٹ گیا۔ اور دور افق پر سیاہ پٹی بن کر ہچکولے کھانے لگا!

چلتے چلتے ریل نے ایک ایک سیٹی دی۔ پھر ایسا دھماکہ ہوا جیسے کسی نے دو چار توپیں ملا کر داغ دیں۔ پھر یہ کہ ایک دوسرا میل گزرا تھا۔ کچھ دیر چل کر ریل نے پھر سیٹی دی۔ لڑکی نے کانوں میں انگلیاں دے کر کچھ کوئی میل نہ گزرتا ہوا منگوا کر کے میل کی جگہ اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں جو دُور سے لال سبز نلکے معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ دیر سے یہ دونوں میری طرف دالی ایک کھڑکی میں آ کر سیر دیکھ رہے تھے۔ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ہاتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ ان میں علم کی بُر بار بار بھی ہے۔ ذوق کی چاشنی بھی ہے۔ خیر شدہ شدہ اسٹیشن قریب ہوا ریل کی دوڑ بھی کم ہوئی۔ پھر اس کے پتیلوں سے ایسی آواز آئی۔ جیسے طبلہ کا بندھا ہوا ٹھیکہ بج رہا تھا کہ دفعتہ لکڑے بجنے لگے۔ آخر گاڑی اسٹیشن پہنچ گئی۔ قلی قلی کی آوازیں سنائی دیں۔ اور مسافروں کی ایک ہلڑائی مگر۔ کئی یہاں گاڑی زیادہ نہیں ٹھہری۔ کوئی دم میں چلنے کو ہی تھی۔ ایک بڑی بی ہانٹی کا ہنٹی ڈبہ کی طرف آتی دکھائی دیں۔ نوٹوں برس کا ایک مولو لڑکا ان کا ہاتھ تھلے تھا۔ گویا زندگی موت کو سہارا دے تھی!

لڑکی نے بڑی بی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کے ساتھ چوڑھا برتاؤ کیا۔ فتح پور چھو تو وہ وری بہو بیٹیاں کر سکتی ہیں جن کی تعلیم بھی اچھی ہو۔ تربیت بھی اچھی ہو۔ ورنہ ایک بے تربیت کی تعلیم کے تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ مرد ہو تو مرنے کی طرح اکڑا اکڑا پھرے۔ عورت ہو تو ناک چوٹی گرفتار ہو جائے! اچھا ایسے بد اطوار کہ اتفاق سے کبھی ولایت کی بھی ہوا زندگی ہو جاتی ہے تو سمجھو اس پر پوری ساڑھ تھی آ جاتی ہے!!

غریب پھر نہ آئی کو آدی کہتا ہے۔ نہ ہاپ کو باپ کہتا ہے! ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ لڑکی نے بڑی بی کو اپنا ہی بڑا سمجھا۔ ذرا غیریت نہیں برتی۔ حالانکہ بڑی بی یوٹیشن تھیں۔ جن سے یہ دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ ہاتوں ہاتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکا لڑکی میاں اور بیوی ہیں۔ لڑکی سسرال سے بیٹھے جا رہی ہے۔ اس بات سے اور جی خوش ہوا۔ اور ان کی ہنسی دل لگے مجھے بڑی پر معنی نظر آنے لگی۔ کیونکہ اچھی لڑکی سے کہیں زیادہ میری دانست میں وہ اب اچھی بیوی تھی۔ اور اچھی بیوی شوہر کا مکہ مکہ چین اور سماج کی ایسی برکت ہوتی ہے جو خوشیاں بڑھاتی ہے۔ تو رنجوریاں چھانٹ دیتی ہے! اس نے ان دونوں کی زندگی مجھے مسرتا مسرک شہم حیات معلوم ہوئی۔ اب جتنا سوچتا تھا مجھ پر روشن ہوتا جاتا تھا کہ ان کی باتیں ان کے معصوم دماغوں کا کام ہیں تو ان کے کام ان پیارے دلوں کی باتیں ہیں!

شام سے رات ہوئی۔ جنگل جنگل چاندنی چٹکی۔ ریل بے تحاشا بھاگ رہی ہے۔ اس وقت دو دھسی چاندنی میں تارے ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے سفید سفید چرنے میں پانی کی تکیاں ہوں! یہی حال زمین پر جگنوؤں کا ہے یہ سب کچھ ہے مگر

مجھے جانیاں آنے لگیں۔ وجہ یہ ہے کہ میں ایک دوست کی شادی سے واپس ہو رہا ہوں۔ دوراتوں سے بالکل نہیں سویا۔ بہتر چاہتا ہوں کہ نہ سوؤں۔ انہیں کی باتیں سننے جاؤں۔ انہیں کی خوشیاں دیکھنے جاؤں۔ مگر یہ بس کی بات نہ تھی۔ آخر دل نے کہا لیٹ جا۔ لیٹ کے بھی تو باتیں سن سکتا ہے! مگر یہ دل کا کہنا نہ تھا۔ ظنن نیند نے پھسلا یا تھا۔ نیند! ماتا دانی قدرت کی ٹھنڈی کوک۔ بیٹھی گودا! جس کے شکم کی سیج قطبین میں پھیلی ہوئی ہے!! ہائے! میں دل کے کہنے میں آگیا۔ ادھر لیٹا۔ ادھر سو گیا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ سوتے میں انسان جاگتے سے بھی بڑا چڑھا ہوا جانتے۔ تن کی نیند من کو جگا دیتی ہے اسی نے شاید بیچ مچ کی باتوں سے خواب کی باتیں پیاری ہوتی ہیں!

خیر میں سو گیا۔ گو دو روز سے نیند نہ تھی۔ چاہیے تھا۔ بے خبر سو جانا۔ مگر ریل کا یہ ماجرا رنج کو بھی کچھ ایسا بھاگیا کہ وہ بھی نت نئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں دیکھی بھی ایک بات سناتا ہوں۔ سوتے سوتے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دن دے جو خشک دیکھے تھے۔ ان میں کا ایک خشک ہے۔ جس میں بڑی ساری جھیل ہے۔ جہاں کہیں کہیں کنول کھلے ہوئے ہیں۔ رات کا کچھلا پہاڑ جو۔ آسمان پر کچھ چاند کی مسکراہٹ بھی کھیل رہی ہو۔ چوٹ سناتے کا عالم ہے۔ جسکو دیکھنے والیاں یا تو وہ رو پھی چھلیاں ہیں جو کبھی کبھی پانی پر تڑپ جاتی ہیں۔ یا وہ اکیلا راج ہنس ہے۔ جو لب آب گردن جھکائے ایک ٹانگ پر چپ چاپ کھڑا ہے اس وقت جھیل میں آسمان کا ایسا عکس پڑ رہا ہو۔ گویا زمین پر آسمان اتر آیا ہے۔ یہیں جھیل میں چھوٹے بڑے دو روشن تالے پاس پاس نظر آتے ہیں۔ جنہیں دکھا کر کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ دیکھ! یہ پاک رو میں انہیں ریل لے میاں بیوی کی ہیں۔

روح کی دو باتوں میں اپنے کئی گھنٹے لگ گئے۔ خدا جانے میں ابھی کتنا اور سوتا کہ معلوم ہوا مجھ پر تکیوں کی بارش ہونے لگی۔ مگر ابھی ایک ہی تکیہ برس رہا تھا کہ میں چونک پڑا۔ جاگا تو دیکھا سارا ڈبہ خالی پڑا ہے۔ سخت جبرانی ہوئی ریل رنٹاٹے سے چلی جا رہی تھی۔ اور ڈبے میں اس وقت دھیمی دھیمی سبز روشنی تھی۔ کیونکہ برقی کنول پر دہانی ریشم کا حجاب تھا۔ میں اٹھا۔ حجاب کو دور کیا تو سارا ڈبہ جگمگا گیا۔ بڑی بی نہ تھیں۔ جلنے کہاں اتر گئیں۔ ہاں جیون کے وہ دونوں تالے ابستہ ایک کو نے میں منہ چھپائے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ ان کی اس معصوم حرکت نے بڑا مزا دیا میں نے پھر حجاب کھینچ دیا۔ ان کے تکیے کو بیچ والی سیٹ پر رکھ دیا۔ اور اپنے بستر پر آ لیٹا۔ کچھ دیر میں میری پھر آنکھ لگ گئی۔ اور اب کے جاگا تو صبح ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ دونوں میاں بیوی سارے کے جوڑے کی طرح پاس پاس بیٹھے تھے۔ اور محبت یہ ہو رہی تھی کہ سامنے پہاڑیوں میں جو چاند ڈوب رہا ہے۔ وہ اچھا ہے۔ یا مشرق میں دن کی جو نوبہ نور ہے۔ وہ بھی ہے۔ لڑکی کہہ رہی ہے۔ آپ میری جگہ ہوتے۔ تو اس ڈوبتے چاند کا مزا جاتے۔ اس وقت یہ چاند مجھے چاند تھوڑی معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں یکے ہوں۔ آپ اپنے ہاں ہیں اور آپ کے دھیان میں میں اُداس ٹہل رہی ہوں! لڑکے نے یہ سننا تو ہنس کر کہا۔ معاف کیجئے! میں آپ کی جگہ کیوں ہوں؟ خدا نے مجھے مرد بنایا ہے! عورت بن جاؤں!! بانوا میں ہرگز آپ نہیں بننا چاہتا۔ میں تو میں ہی رہونگا۔ اور مشرق کے اس بڑے نور کو اپنی بھرتی اُنگوں کا پرچم بناؤنگا! یہ پیاری پیاری محبت ہو رہی تھی کہ ریل



**زندگی کا اثر ادب پر** — ادب پر زندگی کے اثر کا صحیح اندازہ لگانے کیلئے دنیا کی تمام وکمال تاریخ کا مہمان نواہی ضروری ہے اور پھر دنیا کی ہر زبان کا تہذیبیت علم لازمی ہے لیکن میں جو قسمی سے

ان دونوں سے گزر رہا ہوں۔ ہاں جو کچھ سناسنا ہے وہ کچھ یاد ہے۔ سب سے پہلے بلا کسی لحاظ لغتوں کے میں انگریزی ادب کو لیتا ہوں۔ ابتدا میں جب ہایمان انگلستان اول درجہ کے خوشی اور غیر مہذب تھے وہاں کا ادب بھی اسی قسم کا تھا جب ان میں صحیح معنوں میں ادب کی ابتدا ہوئی تو ابھی ادبی زبان بھانے والی زبان کے لاطینی و فرانسیسی مقبور کی۔ روزمرہ کی گفتگو میں وہ اپنی مادہ زبان استعمال کرتے تھے لیکن جب کوئی ادیب یا شاعر کوئی مضمون یا شعر کہتا تو پرونی زبان استعمال کرتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روم کی تہذیب اس وقت جملہ ملک یورپ پر غالب تھی دوسرے ملک کسی اچھی بات کیلئے روم کی طرف دیکھتے تھے۔ اور اس کی تقلید کرنا باعث فخر سمجھے تھے۔ لیکن جوں جوں انگریزی قوم میں جذبہ خود داری پیدا ہوتا گیا وہ اپنی زبان کو لاطینی کے شے پاک کرتے گئے۔ اور آج ان کا ادب خالص انہیں کی زبان میں موجود ہے اور روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

اب میں دیکھنا چاہئے کہ ان کی زندگی کا اثر ان کے ادب پر کیا ہوا بشرط شروع میں جب مذہب عیسائیت کی ابتدا ہوئی وہ زیادہ مذہبی قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ اور ان کا سوچ کا ادب بھی زیادہ تر مذہبی ہی ہے۔ وہ یا تو چند مذہبی نظمیں ہیں یا حضرت عیسیٰ اور مختلف ولیوں سے متعلق چند تمثیلیں جو مختلف اوقات میں بقدر سے تبدیلی مختلف ناموں سے جاری ہوتی ہیں۔ مثلاً *Morales* (مورالے) — *Mysteries* (میسٹریس) اور *Moralities* (مورالیتیز) اور اس طرح انجیل مقدس جو لاطینی زبان میں تھا اور عام نہ سمجھے تھے۔ اسے اپنے لوگ و سکات سے عام کو بھانے تھے۔ روزمرہ کو لوگ مذہبی سے دنیا دلہنے لگے اور اسی کے ساتھ ان کے ادب میں دنیا داری کا عنصر شامل ہونے لگا۔ اب مذہب و تادیب کے ساتھ ساتھ تفریح بھی چلتے تھے تو ڈراموں میں ان کی تفریح کیلئے بھی مسلمان عیسا کے جاتے تھے۔ جیسے جیسے ان کی معاشرت، ان کے رجحانات بدلتے رہے وہی وہی ان کا ادب بھی تبدیل ہوتا رہا۔ اور آخر ملک ایلیزہ کے زمانہ میں جب انگلستان کی سیاسی طاقت سب سے بڑھ گئی ان میں مزید غرور و خود داری بھی اس قدر بڑھ گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کی نقل و تقلید بھی انہیں اپنی توہین معلوم ہونے لگی۔ اور شیکسپیر نے ڈرامہ کر تمام ہر درنی اثرات سے پاک صاف کر کے بالکل وطنی بنالیا۔ اب

اس طرح ہمارے مضمون کے دو خاص حصے ہوتے ہیں۔ اول زندگی کا اثر ادب پر۔ اور دوم ادب کا اثر زندگی پر۔ اور آفریں دونوں کو مجموعی طور پر لیتے ہوئے ایک حصہ اور بھی ہوتا ہے یعنی ادب میں زندگی کی حقیقت۔ یہ حصہ کہ فلاسفے کے نزدیک ادب زندگی کی تنقید و تشریح کا ہی نام ہے۔ اور دنیا کے ہر شاعر نے ہر ادیب نے کسی نہ کسی طرح زندگی کی تشریح کی ہے بعض نے زندگی کو ”خواب“ کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہماری یہ دنیا ہی زندگی ایک وقفہ سکون و آرام کا منزل کی طرف بڑھنے کیلئے بعضوں کا خیال ہے کہ زندگی ایک حقیقت ہے خواب نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں۔ یہی دنیا ہماری منزل مقصود ہے موت کے بعد زندگی ختم لیکن کچھ لوگوں کا خیال اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ زندگی ہر دم جوں اور ہر وقت دوں ہے یعنی جو ہر انسان دم سے آشنا ہوتا نہیں۔ کچھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں بلکہ ان کے نزدیک موت تبدیل و مذاق زندگی کا نام ہے۔ بعض دنیا کے ادب میں اسی قسم کے مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق زندگی کا فلسفہ بیان کیلئے۔ اور نقل و نظریات بعد اوقات کے زندگی کی مکمل اور صحیح تشریح میرے نزدیک ممکن ہے کہ اس شعریں ہے کہ زندگی کیا ہے عیاں میں ظہور و تربیب۔ موت کیلئے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا ہے

اور دنیا کے ہر ادیب میں سے زندگی کے مختلف فلسفوں کے متعلق مثالیں چھانٹیں جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے لہذا اس بحث کو چھوڑ کر کہتے ہیں اپنے مضمون کے پہلے دو خاص حصے پر غور و غور طائرانہ نظر ڈالیں اور محض طائرانہ اس لئے کہ قسمی سمجھنے یا خوش قسمی کہ سکند کی طرح ہے سبھی آپ جیوں کا ایک خطرو نہیں چکھا ہے سکندر کی تو لوگ کہتے ہیں حضرت خضر سے ملاقات بھی ہوئی تھی مگر ایسا جواب تو اس سے بھی محروم ہیں۔ ہاں اقبال کی طرح کسی بھی جب بھانے ساحل مایا کے چھو پھلائی پر چڑھ مائی سے حقہ رکے اور گوشہ دل میں چھائے آگ جہاں افسار ہے کسی انسان کے کا پلاٹا سوچنے یا کوئی شاعر موزوں کرتے ہوئے ہیں تو اکثر حضرت خضر معراجی نرانی داری کی تصویر کی نگاہ کے سامنے تیزی سے گذرتے نظر کرتے ہیں۔ خبر خواہ کچھ ہر دم صرف طائرانہ ہی نظر ڈالیں گے۔ کیونکہ میں فرصت ہی اتنی دی گئی ہے لہذا قبل اس کے کہ میں اصل چیز پیش کر دوں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے پاس صرف محام مسائل ہے آپ اسے ”محام جہ“ سمجھ کر کہیں اس میں تمام دنیا کا فلسفہ چھو پھلائی و نہ آپ کی مایوسی کا میں ذمہ دار نہیں۔

اس نماند میں جب شیکسپیر عرفانی نام حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہاں کے باشندے جس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے اس کے ڈراموں سے ظاہر ہے وہ لوگ خوش رہنے کی انوار بازی جنگ چل رہے تھے اور غلے کے عادی تھے اور انکی اس طرز زندگی کا اثر ڈراموں پر یہ چٹا کہ شیکسپیر نے ان کے مذاق کے مطابق کافی صافان پیدا کر دیا۔ سیزر، انطونی و کلبوچر، ہیبلٹ، آویلیو، لنگ، ریکر اور کورولانس وغیرہ ڈراموں میں جن خوش مزاجیوں اور ہونا کیوں کو دیکھ کر ہم آج لرز جاتے ہیں وہ اس وقت کے لوگوں کیلئے بالکل معمولی شے تھیں۔ اور فیڈرل کے انہیں لطف بھی نہ آسکتا تھا۔ دوسری طرف لوگ غرافت و مزاح کو پسند کرتے تھے اس کے لئے اہل مذاق کے ڈراموں میں اور بعد کے ڈراموں میں مسخرہ و ڈراما ایک جزو بن گیا تھا۔ اس زمانے کے عوام اکثر دیشہ رنگتے، حصص اور شو پسند ہوتے تھے شیکسپیر کے ڈراموں میں جا بجا اسکا تذکرہ ملے گا۔ بیشہ بہشہ ادیبوں اور شاخوں میں صرف شیکسپیر ہی ایک ایسا شخص ہے کہ خوش مزاجی کی زندگی کا اثر اس کے ادیب پر نمایاں نہیں ہے۔ وہ نہ ہر ایک کی زندگی کا اثر پسند کرے گا۔ اس کے ادیب پر ضرور پایا جاتا ہے۔

شیکسپیر کے بعد دوسرا مشہور شاعر ملحق ہے۔ ملحق کی زندگی عموماً ایک تنہا گھر میں کتابوں کے درمیان گزری۔ اور اسی کی وجہ سے وہ آنکھوں سے کبھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی اس تنہائی پسندی اور کتابوں کا گہرا پیار نے اس کا اثر اس کے ادیب میں صاف نمایاں ہے۔ جب وہ کمرے سے باہر کی چڑوں کا حال لکھتا ہے تو اکثر نفسیاتی اور بعض اوقات واقعات کی غلطی کر جاتا ہے۔ دوسرے اس کی شاعری زندگی کے کچھ کامیاب اور خوشگوار نہیں گزری۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے تمام کام میں مچ اور کچھ محبت کا نہیں تذکرہ نہیں پایا جاتا تیسرے اس کی زندگی تنہائی پسندی کا یہ کہ جسے خشک اور یک طرفہ سمجھی طرح اس کے کام میں بھی تشاکم کیفیت پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد دوسرے دور آتا ہے۔ یہ عجیب و غریب قسم کا شخص تھا۔ ہر وقت محزون اور ادب و بشارتوں کی سرور شاہد عظمت سے تحقیق عشق اسکا دماغ فلسفیانہ بنا رہا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی زیادہ تر شاعری محض فلسفیانہ بحث جتنی ہے اور حقیقی شاعری سے کم کوسوں دور جا رہی ہے۔ لیکن جہاں اسکا شعر حقیقی شعر ہے وہاں بھی اپنی طرح حسن نظرت میں قائم کر دیتا ہے۔ کھڑکتا ہے اور پھر ہر طرف حسن نظرت ہی غوطہ دے دیتا ہے۔ اس نے انقلاب فرائض کا خوشگوار کاغذ اور خوش مزاجی انکھوں سے دیکھا تھا نہ اسکا دل یا دوسری وجہ سے غفلتیں تھیں۔ اور یہاں وہ ہے کہ اس کے کام میں اس انسان کی کج چلک نظر آتی ہے۔

اس کے بعد چلتے ہیں۔ یہ قسمت کا ستا ہوا عظیم زمانہ کا دلایا ہوا

سرمکش اور اپنے وطن کا شکر ادا کرنا ایکس و مجور شاعر ایک عجیب و غریب دل و دماغ لیکر آیا تھا۔ اور اگر اس پر نہ ان مصائب و توفروں کا تو وہ دور دنیا کا دھنست کا ایک بلند نظر و غیر متاثر پیر بھی اس کا وہ کام جو خود اس کی ذات سے غفلت نہیں رہتا امید افزا اور مسرت آمیز ہے۔ ہاں جب اس نے خود کے متعلق کچھ کہا ہے تو ہر حرف سے غفلت اور انسان کی غفلت ہے۔ *fall upon the horns of life* ہوں اور میری دگ رنگ خوش چکان ہے (میں نے اپنی زندگی کی تمام لذتیں اور رنج و غم کی وہ تمام ابدیتیں جو اس نے گزاری تھیں پیش کر دی ہیں۔ دوسری طرف انقلاب فرائض اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ اور جتنی پسندیدہ اور خوشگوار اصول اس کے محرک تھے اب صرف وہی شیلے کے کانوں میں سے اور محض ان اصولوں کو دیکھ کر انقلاب کی طرف سے کسی کو بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شیلے نے اس فرائض و فرائض و دنیا کو نہیں دیکھا تھا اس لئے یہ غفلت اور دوسرے اس کے کام میں غفلتیں اور بایوسی کی چمک نہیں پائی جاتی۔ وہ حقیقی حسن کا استلاشی تھا۔ محدود حسن سے اس کی تسلی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ جس حسین عورت کو دیکھتا اس طرف ماضی ہو جاتا۔ وہ ایک ایسا حسن چاہتا تھا جس سے ان فاضلی یعنی بالکل بے طرف محبت کی پاسکے۔ اس نے ایک عجمہ حقیقی حسن کا بے قصور بنالیا تھا اور بیشہ ہاں اس کا استلاشی رہا۔ اس کی جستجو ایک ایسی ناکھن کا حصول شے کیلئے تھی جس کا طالع سوامیت کے کوئی ذکر نہ ملتا تھا۔ اور آخر وہ وقت موت نے اس کی جادوگری کی۔ اور ان مصائب سے اسکا چھپا چھپا دلایا یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری غمگینی اور آسماں ہے۔ اس نے اپنی دنیا دہن سے دور اور نہرو و دشتری کے قریب بنائی تھی۔ غمگینی کے بدلے پر وہ ہمیشہ فضا میں پرواز کرتا رہتا ہے اور یہ اثرات اس کے تمام کام میں پائے جاتے ہیں۔

کینٹن کی زندگی پرانی علم الامناس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی اور اس کے اثرات اس کے کام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ناہم محبت تھا اسلئے معنی حسن و عشق کے لئے لگتا ہے۔ حسن اس کے نزدیک ایک دوائی مسرت ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے *Beauty is truth, truth is beauty, that is all ye know on earth* (حسن ہی صداقت ہے اور صداقت حسن، صرف یہی تم بتائیں جانتے ہو اور انسانی جاننے کی ضرورت ہے) یہ صرف اسکا خیال ہی خیال نہیں تھا بلکہ غمگینی کی زندگی میں اس کا اعتقاد بھی یہی تھا۔

مینیسن، تنظیم و سادگی کا دلدارہ و ماضی مستقبل سے بے نیاز صوفی حال کا گردیدہ۔ اس کی زندگی کی چند نمایاں خصوصیات انہیں بطور اس کی شاعری

کاؤں میں ملے گا۔ اس کے بعد دو سو سترہ اس درمل کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور قیور سے آزادی کے سلسلہ میں وہ اس انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا کہ اس کی بہت سی شاعری محض مفصلی شہرہ کی اور شعریت کھر بیچی۔ قیور سے دن ادب اسی انداز پر چلتا ہے کہ آخر براؤنگٹ نے بالکل نیا انداز اختیار کیا جابجا ماحول چھوٹے دن بالکل جدید لکھنا بنا کر لیکن رفتہ رفتہ لوگ اس کی مادی بننے میں نے نیا دور انگریزی کی شعراء سے بحث کی ہے بالکل ہی حال انگریزی شہر کا بھی ہے۔ تہذیب و معاشرت اور تاریخ و تمدن نے بالکل اسی طرح نشر کو بھی متاثر کیا۔ جس دور میں جرنالوں، انٹرنیٹ اور مضافات کیجے گئے ان میں اپنے مخصوص دور کے اثرات اہل نظر سے پریشیدہ نہیں۔ یہاں پر فزمری ہوتا کہ میں ہر صفت کی انصاف لیکر بحث کرتا ہوں طوالت احتراز کرتا ہوں کیونکہ ابھی لکھنا بہت ہے اور وقت کم۔

انگریز تہذیب کا دور اور اس کے بعد اٹھارہویں صدی کے ادب کو اگر ہم بغور دیکھیں تو اس زمانہ کی زندگی کا اثر اس میں نمایاں پائیں گے۔ یہ دور دولت و آرام پیش و سرسبز کا دور تھا۔ بے فکر کی تہی خوشیاں تھیں دولت تھی اور عیش تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ اس زندگی میں ہر طرف دلچسپی اور دلچسپی تھی۔ مسرت ہی مسرت تھی۔ اسلئے اس زمانہ کا ادب تمام کا سرگرم رہا تھا، ہے اس کے بعد جب سائنس کی ابتدا ہوئی تو قدرتی اعتقادات کمزور ہو گئے اور لوگ مذہب و سائنس کے درمیان بھٹکنے لگے۔ مذہب پر یقین کمزور ہو چکا تھا اور سائنس پر یقین نہیں ہوا تھا۔ نیچرل سائنس اور قیور سے نڈ کے ادب میں یہ شک و شبہ صاف جھلکتے ہیں اس کے بعد سائنس کی فتح مکمل ہو گئی۔ مذہب کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ خدا کے وجود میں بھی شک کیا گیا لگے گا وہ نہ کم از کم اسکا تصور بچائے ایک نیم و کریم طاقت کے ایک تبار و جہاں طاقت سے ہونے لگا۔ جو قدرتی انسانی زندگی کو دست بگریباں دیکھتی۔ تالیان بکاتی اور غش ہوتی ہے۔ اس کا اثر بارش کی کو دست بگریباں میں نمایاں ہے وہ بکاؤ پر ہے اور زندگی کے شعلوں اس کا نظریہ مشتاکم ہے موجودہ دور کا تمام ادب حال کی طرز زندگی کا صحیح عرق ہے۔

یہ تو برا انگریزی ادب۔ اب آئیے دیکھیں کہ فارسی ادب پر زندگی کا کیا اثر ہوا۔ جب مسلمان عرب کے ریگستان سے لشکر ایک طوفان کی طرح تمام ایشیا پر چلائے۔ ہر جگہ ان کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ ہر جگہ ان کی تہذیب پھیل گئی ہر ملک کا پورا مذہب اسلام سے تبدیل ہو گیا۔ تاہم آہائی تمدن اور مذہبی تقدیم اعتقالات بالکل فنا نہیں ہوئے اور ایک دن وہ آئنا کھلنے لگے اعتقادات نیا لباس پہن کر نقوش کی صورت میں دنیا کے اسلام پر چاٹنے ہر ملک میں نقوش کی لہر شروع ہوئی۔ ہر طرف صوفی دغا فغا کا آواز بلند

بھی ان تمام خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ اس کی بنیاد سادہ ہے۔ اشعار میں نہ سحر و سحر کے زیادہ ہے۔ نظروں کے موضوع ہمیشہ عام اور معمولی اختیار کرتا ہے اسلئے کہ اب تمدن و معاشرت میں۔ تہذیب و سماج میں عوام امر کے مقابلہ میں طاقت اور اثر حاصل کر چکے تھے۔ اور اس وقت کی تہذیب و معاشرت کا اثر نہ محض فنی سن کے کلام بلکہ اس کے دور کے ہر قسم کے ادب پر نمایاں ہے۔

براؤنگٹ ان تمام شعراء میں سب سے زیادہ باعید و وسوسہ رہنے کا عادی ہوتا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ ہر ہدی کا خاتمہ نیچر پر ہوتا ہے۔ عارضی کالیف کی وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ مدت تک اس کی طرف تو بڑھ نہیں کی گئی۔ لیکن وہ تمام تنقیدوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کے گیا اور آخر اس کو آج دنیا شاعر شعراء میں شمار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کی بھی عادت ہے جس نے اس سے لکھا یا کہ *Strove, and hold cheap the gain, nor account the pains* *never grudge the three!* اس کی دلیری اور جرات بھی موت کے وقت بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ خاموشی سے چلا چلا کر خود کو موت کے قدم میں نہیں دیتا جاتا۔

*was ever a fighter so — one fight more.* میں ہمیشہ لیکھ جھگڑا ہوا ہوں۔ بڑا لڑائی لگ *The best and the last.* سب سے آخری اور بہترین جنگ (جی)

الغرض ان تمام شعراء کے کلام میں ان کی زندگی کے علاوہ کسی طرح ہم انکی ہم عصر زندگی کے اثرات بیکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اٹھارہویں صدی میں امر و سحر داروں کا دور تھا۔ نئے نئے زیور قیمتی سفارن آرائش مروج تھے۔ اسٹورٹ باز آئینے کے دست سے جو آوازیں، عربیائیاں اور میاشاں شروع ہو گئی تھیں انکا ردعمل ہو رہا تھا۔ اس کا اثر اس صدی کے ادب پر بھی ہوا۔ یعنی نظروں کا موضوع عام نہیں ہوتا تھا۔ شاعری میں صنائع و بدائع کی کثرت سے آرائش کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس پر نئے نئے قیور لگائے گئے تھے۔ روزمرہ کے الفاظ شعراء میں استعمال کرنا ممنوع تھا۔ اس قسم کے اثرات تھے جو اس وقت کے ادب پر آج تک نمایاں ہیں۔ اس کے بعد فرد اسکا ردعمل شروع ہوا۔ عوام کی طاقت و حرکت کچھ بڑھ گئی۔ قیور سے لوگ گھبرا گئے اور گولڈ اسمتھ جی اہل دوری صدی کا شاعر ہے وہ شعراء پر اور ریاضیوں صدی کے درمیان ایک لہی ہے اس کا شروع کا کلام بالکل پوچھ کے تنقید میں ہے لیکن آخری کلام میں اس انقلاب کا اثر آج ریگستان میں ہر دم تباہی جھلکتا ہے۔ اس کی نظم و نثر کاؤں؟ اس کی شاہد ہے۔ اس وقت ادن کی تجارت بڑھ رہی تھی کاشت کی زمین چراگا ہوں میں تبدیل ہو رہی تھی اور طرح طرح کا شکار دلوں کو ان کے گھروں سے کان بکڑ کر نکالا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ آپ کو دیریں شدہ



برائے نامہ نگاری تو حساس دل اور دور اندیش نظر نے اسے دیکھا اور کوشش اذیت سے ایک ہم چلا اٹھی کہ ”دروایاں بے دواست“ اب ان کا ادب گل و بلبل سے ہلکے سیاست پر آگیا۔ ہر شخص حکومتیں رفتہ رفتہ غائب ہو کر جا رہی ہیں اور دھاریاں کے خدیوہ بیداری کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و منزلت اور ان کی بے باکی و جسارت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ زمانہ ماضی کے خفا کا فی افروزی اور عرفی و غیرہ کے قصائد پر ہے اور اس کے بعد صرف یہ شعر کہ ”بلکہ! خود سری و جبر تو ایران سوز است۔“ بمکافات تو عمر و زمن غیر ناست تو اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہوگا کہ موجودہ زندگی نے فارسی ادب کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ دوسرے سیاست آسان ہونے اور مغربی علم و ادب کی ترقی کی وجہ سے ان کی زندگی میں جس طرح مغربی تہذیب سے متاثر ہوئی اسی طرح ان کا ادب بھی مغربی اسے متاثر نظر آتا ہے یہاں تک کہ ان کی لغت تک میں سیکڑوں مغربی الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ یہ ہے ایران کی موجودہ زندگی کی تھکن اور معاشرت کا ادنیٰ کرشمہ کہ موجودہ ادب دو باضی کے اسے متاثر کر لیتا ہو کر بگیا ہے۔ ذاب اس میں وہ نازک تشبیہات اور بلند استعارات ہیں مذہب زور تختیل۔ یہ سب نتیجہ ہے موجودہ افکار و جواہر اور فطرت اب ویرانی کا۔ اب وہ دن گئے جب ایران میں نازک کہ ساقیہ کا دور وہ تھا وہ زمانہ گذر گیا جب قومی تقویٰ سیاسی برتری تھی اور ساتھ ہی ساتھ عیش تھے، بے فکر تھی اور اس بے فکر کی کے در میں دنیا جنت سے بھی عزیز معلوم ہوتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ ماضی و مستقبل کو حال میں گم کر کے جھنڈے سر میں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں کرے۔ ”بیادہ کہ بیادہ“ عمر برباد است ”ان کی زندگی میں سرسری گزرتی تھی اس میں سوا شرب شیشہ کی کسی اور چیز کا خیال کفر تھا۔ اس وقت کا ایران ایک ایسا گلزار تھا جس میں ہر طرف رنگین پھول و صحت و نفاذ دیتے تھے۔ گھول کے سایہ دار گنجوں میں اسرار و محبت ہوا کرتے۔ کالی گٹھائیں اور محرم ہوا میں ذوق باہ و خوار کی کیلئے ایک تازیانہ تھیں۔ جب ایسا گلستان ہو تو ہر سر کرنے والا کیوں نہ چلا اٹھے کہ

چہ خواہم دریں گلستان مگر خواہم شرابے بکبے، رہا بے، لگا سے اور جب ایسا گلستان ہو تو ہر جنت کی کون پروا کرتا ہے اور وہاں کی شراب کو کڑا کے خیال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ میمانہ میں بیٹھا جہم جہم کر ساقی سے برابر کہہ رہا ہے کہ

برہ ساقی سے ساقی کو رحمت تو ہوئی کنا نہ ب کنا با گلشن مصلیٰ را اب تو تہذیب بدل گئی۔ و ماغ بدل گیا۔ خیالات بدل گئے۔ اب وہاں کے شاعر کہ بجائے انکھور کے قوم کی گھول سے خون پھینکا نظر آتا ہے

ہوا۔ وہ لوگ بھی جو خود مصروفی نہیں تھے ان خیالات سے متاثر ہو کر لڑا رہی یا غیر ارادی طور پر وہ خیالات ان کی زبان سے نکل گئے۔ ادب ہم کہتے ہیں کہ فارسی کا قریب قریب تمام ادب تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مولانا نے ردیم تو خود مصروفی تھے ان کی تمام شاعری مسائل تصوف سے ملبوس ہے۔ حافظ کا کلام بھی صوفیانہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اعلان کرتے ہیں کہ

پس چارہ نہیں کن مگر تیر خیال گویر کہ سالک بے خیر تو در راہ و ہم منز لہا غرض اس وقت کے تمام ادب میں آپ بھی پائی گئے کہ ”خود کو زہ و خود کو زہ کو خود گل کو زہ“ حافظ ہمیشہ ساقی حقیقی سے باہر عرفان مانگتا ہے۔

الایا ایہا ساقی اور کا سنا دنا لہا کہ عشق آسان خود اول نے رشتا کھلایا اور پھر اس باہر عرفان سے ہمیشہ ہر کہ و سرور آئینہ غنی گاتا ہے کہ سننے والوں کو بھی بخود کر دیں۔ قیام تو ہر وقت میکدہ عرفان میں کسی خم کے سہاگے بیٹھا جام کے جام خالی کر رہا ہوتا ہے لیکن اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اسکا خالی جام ہر وقت کی طرف بڑھا رہتا ہے اور اس آتش سیال کے خم کے خم خالی کے کہ اچھی عمر و زمان سے ایسے شعلے برساتا ہے کہ ہر سننے والے کے دل میں آگ لگ دیں۔

اگر ایک طرف یہ تحریک تصوف تھی تو دوسری طرف شاہانہ عیش و سرور کی بیٹھری کا زمانہ تھا حکومت اپنی تھی۔ روٹی پیٹ بھر کے تھی تھی لہذا ”خار گندم“ کا ہونا لازمی۔ اور اسکا نتیجہ تھا مجازی عشق۔ دنیاوی محبت یہاں تک تھی کہ سعدی جیسے درویش شیاخ نے بھی مغربی اور متول کے مکالمہ میں متول کو قلعہ دوائی ہے۔ بڑے بڑے شاعر شاندار تصانیف دیتے اور بادشاہوں سے انعام و اکرام حاصل کرتے۔ اس دولت و نقیض کی فطرتی کا نام ایک نتیجہ برآمد ہوا۔ بجائے عورتوں کے حسین و خوبصورت لڑکے عشق و محبت کا مرکز بننے لگے اور بڑے بڑے بلند پایہ شاعر نے اس عشق کا اظہار کیا ہے۔ سیکڑوں غزلوں کے دیوان تیار ہو گئے اور اگر آپ ان میں سے ان کے عشق کی کاہلیہ چاہیں تو آپ کو وہ بہت جگہ میں پھینکتا ہوا اور مزہب خطا کا مالک ملے گا۔

تیسرے خاص اثر جو ان کے ادب پر نمایاں ہے وہ تشبیہات و استعارات کا دیر سے مدولت کی زیادتی کے ساتھ ان کی زندگی بھی پر تکلف و بگنی تھی وہ آرائش پسند ہو گئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں آپ دور کا رنگ تشبیہات و استعارات کی بھرپور پائی گئے۔ ان کے مضامین نظم و نثر فنی و معنوی صانع و بدائع سے مملو نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی ان کے ادب میں بھی اضطراب آ گیا۔ اب اس میں ابتداء کی سی بلندی اور طور تختیل نہیں رہا اور آخر جب ان کی طاقت

۱ سئلے پر مصر مصر کو الہامی رتبہ حاصل ہوتا۔ اور اس کی آواز قبیلوں کی تکمیل و تخریب کا باعث بن جایا کرتی تھی۔

یہ بھی ان کی تہذیب اور ان کی زندگی۔ اب ذرا غور کیجئے کہ ان کا وہاں تک اس زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جیسا اوپر بیان کیا گیا کہ بعض اوقات انفاقہ و قبیلوں کا اجتماع حسن و عشق کیلئے اور وہ بھی محض اسے حرکت نامناک اور آتش ناگ حسن و عشق ہاں تو خیر اسی حسن و عشق کیلئے ایک مسرت و تفریح دینا پیدا کر دیتا تھا۔ عربی محبت ہماری محبت کی طرح عارضی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی عربی رنگوں میں محبت کی لہر ہمیشہ کیلئے دوڑ جاتی تھی۔ پھر جب ایک عقیدہ رخت سفر باندھتا تو جب صورت پیدا ہو جاتی۔ اور ہر یہ حال کدول میں غم و اہم کا ایک شدید طوفان برپا۔ بلکہ پرا نسوؤں کے سڑے بہت لطافت لڑناں اور اس آئینے نظر میں خاموشی اور حسرت سے بیزبان حال ہو گیا کہ

مت کہو یہ کہ یاد جانا ہے دل سے صبر و قرار جانا ہے

اور ہر محل بل پر ناہ منش اور نگین چادر میں جنبش ہوتی۔ محل کے پردے اٹھ جاتے اور آخری باد عاشق کو پر حسرت ڈھبائی ہوئی آنکھیں نظر میں آتھیں بار بار اوس نظر پر محبت کا پیغام دیتیں۔ نرم و نازک صفا آواز ہوا اور اسی مقام کیلئے آہستہ سے آہستہ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دلیں ایک بار اور داغ میں ایک تصور رہ جاتا اور اس۔ اس سوچنے ایک عاشق کیلئے اس سے زیادہ جان گداز اور شیرازہ ناہ عاشق اور کدو سا ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے جو اس قبیہ اپنی کتاب "کتاب الشعر والشعراء" میں لکھتا ہے کہ عرب کے عقیدہ گو شعراء اپنی نظروں کو آواز دہو رہی ہوئی سبقتوں کے آئنا و عکاس کے رہے ہیں۔ پھر گریہ و زاری کے بعد اس دیوانے سے مخاطب کرتے اور اپنے غم و سفر کو کچھ دیر توقف کیلئے بھوکہ کرتے تاکہ وہ ان لوگوں کا تذکرہ کر سکے جو وہاں عارضی طوفان پر مقیم تھے ان مختلف سے وہ اپنی محبوبہ کی یاد کو وابستہ کرتے اور وعدہ و اقرار طرغ پر اپنی محبوبہ کی جوانی کا منظر کھینچتے۔ اور اس طرح سننے والوں کے دلوں میں ایک بھل پیدا کر دیتے کیونکہ محبت کا لکھت انسانی روح کو متحرک کر دیتا ہے خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں حمد توں سے ایک مواصلت پیدا کر دی ہے اور اس کا شاہد ہم کسی نہ کسی رنگ میں کرتے ہیں خواہ وہ ہمارے ہوا یا ناجائز۔ اس طرح جب شاعر لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ تو سفر کی مشکل۔ چکارہ۔ دوپہر کی تمازت اور آونٹ کی گری ہوئی حالت کا ذکر کرتا ہے اور جب اسے اس بے لکھت کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مخاطب اس کی تکالیف کو دہر کر کے کیلئے آواز دہے تو اس کی مدح الایا اذکا فی مبالغہ سے کام لیتا ہے کہ کوئی صلہ حاصل کر سکے یا

چونکہ ان لوگوں نے اپنے ملک کے سوا دوسری چیز میں نہ دیکھی تھیں

ساتی کے تعلق کی بجائے اب قوم کی غفلت شاعر کے جذبات کو حرکت دیتی ہے، مجبوراً ہی ہے اور وہ قوم کی حالتوں اور احوالوں اور یہ احوالوں کو دیکھ کر حیرت انگیز ہے کہ وہ خدائیں یادگار کا شہنشاہ بنیں

اب آئیے دیکھیں کہ عربی زندگی نے وہاں کے ادب پر کیا اثر کیا۔ قبل اسلام عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح کسی جتنے یا سرسبز و شاداب چراگاہ کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے نہ ان کا کہیں گھر ہوتا نہ مکانا۔ جیسے اور مختلف سامان اور ٹوٹوں اور گھوڑوں پر لیسے ہوتے ہیں۔ جہاں ذیروہ والدیا وہیں گھر ہو گیا۔ جہز و ہوشہ جب دیکھا کہ چڑھکا پانی ختم ہونے لگا تو ہر گاہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ دروازہ کیستان میں نکل گیا۔ تاکہ کسی اور شہر کا پتہ لگائے۔ اس کی اطلاع پر یہ چہرہ کی دنیا معاہدہ اپنے تمام ساز و سامان کے ہاں جا بھری۔ جب وہاں سے کسی دل بھر گیا تو کسی دوسری جگہ جا بھری۔ کٹر ایسا ہوتا کہ ایک ہی جگہ پر دو قبیلوں کا اجتماع ہوتا۔ ان میں نہ تو پردے کا رواج تھا اور نہ عمرانی زندگی کے موجودہ معاشرتی قوانین جو ایک دوسرے سے کچھ اور مختلف کرنا سکھاتے ہیں۔ دونوں قبیلوں کی لڑکیاں اور لڑکے بے تکلف آپس میں ملتے تھے۔ اہلتا ہوا چشمہ کھجوروں کے چھنڈ اور ان کے سایہ میں شاداب سبز پھل پھل جگہ جوان آنکھیں ملیں۔ جوان چہرے ایک دوسرے کے سامنے بے نقاب ہوں تو کیوں نہ ان آنکھوں میں سے محبت جھانکنے لگے انکی زندگی محدود ہوتی تھی۔ ان کی دنیا صرف یہی تھی کہ وہ دیکھتے اور جس میں گھومتے تھے کسی اور دنیا سے وہ بغیر سے بے لفظ اور اپنی اسی مختصر دنیا میں رہ کر تمام زمینی مسرت سے لطف اندوز ہو لیا جاتے تھے۔ ان کی تمام عمر محلوں اور دی کیلئے وقف تھی۔ دن کے وقت آفتاب اور رات میں جھلکاتے ہوئے تاکہ ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وقت کا تعین ثریا، انہماش اور کیوان و عطارد سے کیا گیا ہے۔ ان کے عقائد و توہمات میں شاعر کا ایک بنڈم مرتبہ ہے۔ ان کا ایمان تھا کہ شاعر فریادیں جوتا ہے۔ جب کوئی شاعر کسی قبیلہ میں پہنچتا تو لوگ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے۔ دعوتیں دیتے اور تمام حرمیں اس طرح غامضی کی بجائی تھیں گویا کسی شادی و فریاد کی خوشیاں منادی ہیں۔ چہوٹے بڑے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے پھرتے تھے۔ کیونکہ ان کا یقین تھا کہ ایک شاعر ان کی عزت کا عجبان، ان کی شہرت کو برقرار رکھنے کا ایک آلہ کار۔ ان کے ناموس کو بلند کرنے والا اور ان کے ناموس کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ شہزادہ ابن رشیق کا قول ہے کہ وہ صحن میں معنوں پر اٹھا ہوا مسرت کیا کرتے تھے پہلے پہلے کوئی لوگ اپنا ہوا دوسرے کوئی شاعر پہنچ جائے تیسرے جب کوئی گھوڑی بھیرا بنے۔ چونکہ ان کے یہاں شاعر کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا

سائنسے اگر برے لگا اسی قسم کی کوئی اور بات ظاہر ہوگی۔ ابلج ہندوستان میں بی گلوں کی بڑی بوہیاں کوسے کے برے کو کسی جہان کے آنے کی علامت سمجھی ہیں۔ توخیر عربوں میں اسی نے جدائی کے کوسے (مزلے) میں کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً "یہ بیڈنگوں طائر بگتے ہیں کہ کل صبح ہم لوگ جدا ہونے والے ہیں اور اس کی خبر اس کالے کوسے نے دی ہے۔" عرب میں دوآر نامی ایک بھلے نواب تھا جس کے گرد مختلف قبیلوں کی دوشیزہ لڑکیاں چوش حقیقت میں طوائف لکھا کرتی تھیں۔ قبیلہ فلاح کی لڑکیاں اس رقص میں زیادہ حصہ لیتی تھیں چنانچہ ناقدہ دبیانی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یہ سیاہ چتر منیل گائیں دوشیزہ لڑکیاں پہنچا ہوتی ہی نہیں گویا دوشیزہ فلاح کی ہیں جو دربار کے گرد ناچ رہی ہیں"۔

اس زمانہ میں اکثر قابل مرید پیکار کرتے تھے لہذا ان کے یہاں حسن و عشق کے علاوہ زمیرہ شاعری کا بھی کافی حصہ پایا جاتا ہے۔ وہ شعر ارجو وقت میدان کا ناز کا نقشہ کھینچتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گہر وڑوں کی ٹاپوں سے جو گنگیاں نکل رہی ہیں۔ تنواروں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اسی ضمن میں جہاں کہیں گھڑوں کا ذکر آتا ہے تو میں کچھ نہ بچھتے۔ امرا انقیس کا یہ شعر چمکتا ہے اور اپنے ادب میں اس کی مثال دہرنا ہوتے ہیں تمام عمر گزرد کیے بد میز گھڑا حملہ آور ہر تلبے۔ پھر زور ہے کہوٹ جانا ہے۔ دوبارہ آگے بڑھتا ہے اور پھر بچے پشٹا ہے جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی سے کسی بڑی پٹان کیسے لڑا دھکا دے۔

اس کے بعد اسلام پھیلا۔ عرب تمام دنیا پر چھا گئے۔ انکا محل بدل گیا۔ عام خیالات اور زندگی دوسری افق سے متاثر ہو گئی۔ کچھ تو عرب پہلے ہی سے جنگجو قوم تھی اب اسے اپنے جنگی کارنامے دکھانے کا اور موقع ملا۔ عشق و ادب میں کمی آگئی اب شاعری زیادہ تر زمیرہ ہونے لگی یا مذہبی پیرائے تک کہ حضرت علی کے دیوان میں بھی مذہب کے دوش بدوش رجز یہ اشعار کافی ہیں۔ یونانی ادب بہت کچھ عربی میں منتقل ہو گیا اور اس طرح اب عربی ادب میں علم و حکمت بھی بہت زیادہ شامل ہو گئی۔ چند صدیوں کے بعد مسلمان مکرور ہوتے گئے۔ اور آخر ان کی سلطنت چھن گئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ جب وہ قوم کی قریب قریب مٹ گئی تو اب انکا ادب کہاں حتیٰ کہ مصر کے علاوہ خود عرب میں بھی عربی ادب موقوف ہے۔ جہاں موجودہ میدان کی کے ساتھ ساتھ اب عربی ادب بھی دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اور میں تعجب سے کہتا ہوں کہ اسے دوبارہ زندہ کرنے کا سہرا عرب کے نہیں بلکہ مصر کے سر ہے۔

لہذا ان میں تکلف نام کو نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے عربی ادب میں جو مسلمان دنیا کش استعمال ہوا وہ اسی ملک سے لیا گیا ہے۔ ان کے تمام ادب میں مقامی رنگ اور ملکی تشبیہات ملیں گی۔ اس کی مجرہ کی زلفیں نہ سنیں گی کہ میں منت ہیں اور نہ ماہ کے سیاہ کی وہ جلا جھک انہیں کوئلے کی طرح سیاہ لکھتا ہے۔ لیکن اسلام کے بعد عرب بکرم سے حامل چین تک پھیل گئے تو ان میں یہ سادگی نہ رہی کیونکہ ان کی زندگی بھی بدل گئی۔ اور انہوں نے مسلمانوں کا نام کس ان میں۔ جتنی اور تو اس اور ابن قیعدہ جیسے لغز و شاعر پیدا ہوئے گروہ سادگی اور بے تکلفی کہاں جو اس آزاد معاشرہ میں بچی۔

اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو جابجا ان کے طرز زندگی کی ہلک ٹیلنگ مثلاً اس زمانہ میں عیسائیت کی ابتدا تھی، عمر میں اور مرد و دونوں زہیب ہوتے تھے ان لوگوں نے انہیں دیکھا تھا لہذا وہ بلا ارادہ اپنے اشعار میں ان کا تذکرہ کر دیتے ہیں۔ امرا انقیس لکھتا ہے "میری محبوبہ رات کے وقت تار بجی کو مشورہ دیتی ہے گویا وہ ماہب لفسد کی تاک لگایا کا چرخہ ہے"۔ ذرا اس زمانہ کے لباس کو ملاحظہ کیجئے اور محبت کا کثر بھی دیکھئے۔ "میں وہاں سے نکل پڑا میں آگے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے اور وہ اپنی منقش چادر سے جس سفر کے مناظر کشیدہ تھے ہم لوگوں کے نقش پا کو ملائی جاتی تھی اور اندر انکی نقش پا کو مٹا تا ضروری بھی ہوتا وہاں کوٹا ریا سیرت کی سرکس تو تھیں نہیں۔ رنگستان تھا اور سرسریک ہی بیگ اگر نقش پا دھنا جائے تو پکڑے جانے کے بعد کا مال سب بظاہر ہے۔

عربی اس وقت بھی گھر کا کام کاج لکھا کرتی تھیں اور مرد و باہر کا گھر جو امیر ہوئے تھے ان کی عورتیں آزاد رہتیں اور وہ چڑھے تک بستروں پر پڑی اینٹھ کر تھیں اس شعر سے اسکا اندازہ ملتا ہے۔ جب وہ چاشت کے وقت سوکر اٹھتی ہے تو ٹھنک کے برے ٹھنک کی چادر پر بکھرے ہوتے ہیں۔ وہ بہت دن چڑھے سوکر اٹھنے والی ہے اور گھر کے کاموں کیسے پٹی نہیں باندھتی ہے؟

ان کی سادگی کی یہ حد بھی کہ وہ صرف وہی تشبیہات استعمال کرتے تھے جو خالص مقامی ہوں۔ اور جڑ سے انہیں روزمرہ واسطہ پڑتا تھا۔ برسات میں بولا جلتی ہے تو کتنی نازک اور پُر کیف تشبیہ دیتی ہے کہ "اسے میرے رفیق تو نے وہ بلی دیکھی جو میں شے دیکھا ہوں جیسے محل میں سے کسی کے دو ہاتھ چمک جائیں"۔ یہ نازیوں کی طرح اس وقت عرب بھی تو ہم پرست تھے ان کا عقیدہ تھا کہ عاشق و معشوق کی جدائی سے تھوڑی دیر پہلے اس کے علامات ظاہر ہو جاتے ہیں یا تو کوئی گڑھا مکان کے





ملک کے اپنے تمام دنیا کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً ہندوہیں صدیوں میں اپنی کالیک مصنف میلادو *The Prince* لکھتا ہے جس میں بادشاہوں کے مطلق جائز و ناجائز طریقہ سے طاقت حاصل کرنے کی تبلیغ کی گئی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سترہویں صدی تک قریب قریب تمام یورپ کے بادشاہ اس کے فلسفہ پر عمل کرتے رہے اور اس عمل کے نتیجہ میں مذہب سماج اور معاشرت میں بہت سے غیر معمولی انقلاب رونما ہوئے۔ نئے قسطنطنیہ کے بعد جب یونانی حکیم دلاویہ معاہدتی حکمت و ادب کے دہان سے بھاگ کر تمام یورپ میں پھیل گئے تو ان کے ادب نے یورپ بھر کے ادب کو متاثر کیا اور اس طرح بالواسطہ یورپ میں درجہ ہفت شروع ہو گیا جس نے تمام یورپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغربی ادب نے وہ زور حاصل کیا تھا جو زندگی پر خاص اثر کر سکے بلکہ وہ خود زندگی سے متاثر ہوتا اور مذکورہ دولہا صدیوں کا ادب اپنے مختلف عہدوں کا آئینہ دلہے۔ اٹھارہویں صدی میں انگلستان میں گائونٹن پیلو اس نے *Political Justice* لکھ کر انجمنوں کی طرز زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر کے رکھ دیا۔ شیعہ اور عیسائی سن وغیرہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اوپر گائونٹن کی بیوی نے عورتوں کے حقوق اور آزادی کی تبلیغ کی اس طرح سب نے مل کر انگریز مرد اور عورتوں کی نگاہوں میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی اور ہر طرف سے انقلاب انقلاب کی صدا بلند ہونے لگی۔

فرانس میں رومو اور آلیر نے انقلابی رسالے تصنیف کئے ماس بین *Pain* نے "انسانی حقوق" *Rights of men* بھی اس سرتاسر انقلابی ادب کا یہ اثر ہوا کہ تمام رعایا بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہترین موت کا بانڈا گرم ہو گیا۔ ہوا انقلاب زندہ باد کے بلند پرواز نعروں سے گونج اٹھی۔ بولین تلوار لیا گیا اور پورے بادشاہوں کے تمام پوسپ پرچا گیا اور روس سے نیکر معرک تمام ملکوں کو روند ڈالا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ جلائی لیکن آزادی و مساوات کا خیال لوگوں کے دلوں اور فاضوں پر نقش کا لہجہ بگیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دنیا کے تمام ملکوں کا طرز حکومت بدل گیا۔ *The Prince* کے فلسفہ کو شکست چوٹی۔ طرز حکومت کی تبدیلی کے ساتھ رعایا کی حالت اور عمرانی زندگی میں بہت کچھ انقلاب آ گیا۔

اب اس کے بعد وہ اپنی دور آجوت تاریخ میں عہد کوثریہ کے نام سے مشہور ہے۔ صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد لوگوں کی عمرانی زندگی میں جو خوبیاں اور کمزوریاں آئیں انہیں انہیں نے اپنے ناولوں میں

مت سے آندہ ہے کہ صبح شب مجال یہ پیشک پر چٹا کوئی ارمان اور ہے یہاں تک کہ غالب نے بھی ناکامی وصل سے تنگ کر لیک روز نگہ یہ دیا کہ اپنی پری ریلوں پہ جنت میں لیکن انتقام قدرت حق سے ہی حرم میں لگوں چھین مگر اب جو رقصہ رکھ رہی نہیں چاہئے۔ بس میں تیرے قدموں کے پھلنے کے حرقے جو چکا ہوا یونہی فرق نیاز رہنے لے اب نہ وصل کی آندہ ہے نہ گردن میں ہاتھ ڈالنے کی خواہش اور نہ بوسہ لب کی تمنا نہ دینا چاہئے نہ معنی عرض تمام دولت کو نہیں، تمام لذائذ دنیا اور نعمت معنی میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں بس اب تو یہی درخواست ہے کہ

لٹاؤ دولت کو نہیں اور میرے لئے بس اک قسم عاجز نواز رہنے دے پہلے کی محبت جس قسم کی ہوتی ہی اس کی نہایت محبت کے ساتھ ہم یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ

جوانی کا پرچش طوفان محبت حرارت بھرے دل کا لہجہ محبت یہ ہے نفس کے دیوے زہر پونا جوانی آدمی کا شکم سیر ہونا مگر اب کی محبت کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ محبت ہے ایک آسانی لطافت کشمکش کی سب بیٹیوں سے زلفت وہ جو میرے بے لوث عبادت دل کا وہ مرکز ہے نہ زور ذات دل کا وہ فطرت کا ایک لمعان کر ہم ہے وہ اک جاوڑا فی بہار اوم ہے چلے گا حسودیت سے متاثر اور بدل شاعر محبوب سے بھی شکوہ شکایت کرتے ہوئے ڈرتا تھا مگر مجھ وہ بلند محبت اور لہر شاعر قوس سے ہی "شکوہ" کرنے میں نہیں جھکتا یہ ہے گذشتہ اور موجودہ زندگی کا فرق اوس کی ممانیت سے ماضی و حال کے ادب کا فرق۔ القصہ یہ ہے مختصر خاکہ ہمارے مضمون کے صرف ایک رخ کا یعنی ہم نے سرسری طریقہ سے دیکھ لیا کہ کہاں تک تاریخ و تمدن، تہذیب و معاشرت کسی قوم کے ادب پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہوتی۔ اب تک ہم نے صرف اس سے بحث کی ہے کہ مختلف قوموں کی اجتماعی یا کسی ادیب اور شاعر کی انفرادی زندگی نے اس کے ادب کو کہاں تک متاثر کیا اب آئیے دیکھیں کہ کسی قوم کی زندگی پر اس کے ادب کی کیا اثر ہوتا ہے اور کیا اثر ہوا ہے۔ یہ دیکھنے کے بعد زندگی اور ادب میں جو گہرا اور ناقابل سقوط تعلق ہے اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

**ادب کا اثر زندگی پر** — اگر ادب نے جب بھی زندگی کو متاثر کیا ہے تو اس وقت جب وہ جن اپنے شباب پر ہوا ہے اور صرف یہی نہیں کہ جس ملک یا قوم کا ادب ہے وہ صرف اسی ملک یا قوم کی زندگی کو متاثر کرے۔ بلکہ بلکہ ایسا ہوا ہے کہ ایک

کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کر گنجائش .... مرد شاہ کو کہتے تھے اسلئے کہ وہ ان کے قبیلہ کا نام روشن کر رہا تھا۔ کسی ایک قبیلہ کی طرح یا جو میں اس کا ایک شعر قبائمت کا کام کرتا تھا۔ مثلاً عرب میں قبیلہ بنی نضیر ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب کسی شاعر نے اس کی جو میں پر شعر کہا کہ ”

فَقَضَّصَ الظُّلَمَ رَأْسَهُ وَنَقَّصَ قَلْبَهُ  
فَلَا كَعْبًا يَأْخُذُ وَلَا يَلَا نَا  
تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اس کا نام پوچھتے تو تنبیہ کا نام چودھرا دی کہ پشتوں کے نام بتانا حق کی آخر اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہو گیا۔ الغرض عربی شاعر کے ایک شعر نے زندگی اور لوازمات زندگی پر برا اثر ڈالا ہے بعض افلاک تو یہاں تک ہوئے کہ ایک شعر نے ایک عظیم انقلاب پیدا کر کے رکھ دیا ہے۔ سارا نفاذ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں دیکھئے اور پھر اس بے پناہ اثر کا اندازہ لگائیے ابتداء سے اسلام میں عورت دم دونوں باہم ملتے جلتے تھے یہاں تک کہ کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے اور طواف میں ایک کا شانہ دوسرے شانہ سے لگے رکھا تھا۔ یہاں سلیمان ابن عبد الملک اموی کے عہد خلافت میں خالد بن عبد اللہ القسری کہ کاسر و دربار تھا اس کے کازنوں کی ایک شاعر نے یہ اشعار پورے کہ ”کیسا پیارا ہے یہ موسم۔ کیسی پیاری ہے یہ سہو کہ بڑا کیسی پیاری ہیں وہ عورتیں جو تجھ کو سو کو بسہ دینے کے وقت ہم کو گھر لیتی ہیں“ خالد نے یہ شعر سن کر کہا کہ خیر اندیشہ سے وہ تم کو نہیں گھیر جائیگا۔ اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تعزیری کر دیکھا جائے۔ چنانچہ یہ جلدی وقت قائم ہوئی تھی اب تک باقی ہے۔

ایک عرب کی تین لڑکیاں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ تھیں ان کے لئے مشہور ہونے لگے تھے مجھرا ان کے والدین مشہور شاعر احمی کے پاس گئے اور اپنی داستان غم سنائی وہ فوراً اٹھا اور سبق حکایتیں جا کر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سنایا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر نے احمی قصیدہ ختم نہیں کیا تھا کہ تینوں لڑکیوں کو شہر ہل گئے۔

عراق کا ایک تاجور مدینا آیا۔ اس کے تمام نقاب فروخت ہو گئے لیکن سیاہ نقابوں کو کسی نے نہیں پوچھا وہ مسکین الداری شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیض پر مسکینوں اور رنگ رلیوں کو جوہر سے بہت مشہور تھا لیکن اب نائب ہو کر مسجد میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ تاجور حال اس سکرہ مسجد سے باہر آیا۔ اپنا لباس زہد و تقویٰ اتار کر دبی رنڈا نہ وضع اختیار کی۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر سن کر کہا کہ تمہارے مغنیوں کو جا کر سنا دو۔

”اس مشرقی طبع رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہہ دو کہ کونے

پیش کر کے ان کی اصلاح چاہی۔ پے پسے اس نے با اختیار لوگوں کو ان برائیوں کی طرف توجہ دلائی اور اس کے نتیجہ میں — *For the Poor* دغیرہ قسم کے قوانین بن گئے ”مصنوعی انقلاب کے بعد سے عرب کا گیاروں اور مناہلوں کے ہاتھ سے روزگار پرچھوڑ کر باہر داروں کے قصص میں پہنچ گیا تھا اور اس کی وجہ سے عرب مرد و عورتوں کی زندگی جال جان بنی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ حکومت میں بھی ان کی آواز نہ تھی۔ اس مظلومیت سے متاثر ہو کر لاکھ لاکھ اور سنکت جیسے آتش کلم اور آتش زبان اپنا شعلہ ہلا دے لیکر گئے۔ اور عربی داری کے خلاف ایک عام جہاد شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور اردو کی زندگی بہت کچھ سدھ گئی۔ ان کے آرام و فائدے کیلئے حکومت نے قوانین بنائے اور رفتہ رفتہ حکومت میں ان کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ .... جہاد کثرت کے آخری اور سیوری صری کے اوائل میں ملک اور مصنف ہی اسٹیج پر نکلا اور وہ بارڈر تھا اس کا تمام ادب مشائخ کیفیت کا حامل ہے۔ اس نے اپنے نادلوں میں قسمت و تقدیر کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ نچری ہوتا اور اس کا تمام ادب بھی اسی دہریت کا سوا ہے۔ اس کے ادب کا اثر زندگی پر ہر جگہ کثرت کا ایک علیحدہ اسکول ہی قائم ہو گیا۔

ادھر دس بیس برس گزر چکے تھے اور دستور کی جیسے اشتراکی ادیب پیدا ہوئے اور ان کے ادب نے تمام ملک میں اشتراکیت کی لہر دوڑا دی۔ مذہب ان کی تہذیب میں کوئی چیز نہیں۔ صرف اشتراکیت ہے خواہ اسی کو مذہب کہو یا اخلاقیات کے نام سے تعبیر کرو۔ یہ تینوں مذکورہ ادیب مضاف کے حقیقت نگار — *For the Poor* میں ان کے ادب کا اثر محض دس ہی پر نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر تمام دنیا بالخصوص کو دبائے کی اس قدر تنقید کو کشش نہ کرتی تو اب تک تمام ملک اسی رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے۔ اور اگر جہاں لال نہرو اپنی کشش میں کامیاب ہو گئے تو بلند و ستان بھی شاید چند سال میں اشتراکی بن جائیگا۔ الغرض یہ رہا مصری ادب کا اثر زندگی پر۔ اب آئیے عربی ادب کو دیکھیں کہ اس نے زندگی پر کیا اثر کیا۔

عرب میں محمداً دو قسم کا اور اسلام کے بعد تیسری قسم کا بھی ادب عرب کی تاریخ میں ظاہر ہوا۔ یعنی رزمیہ اور دہی۔ وہاں شاعر قبیلہ کا دیوتا تھا۔ حسین حرثیں اس کی پرستش کرتے تھے اس لئے کہ وہ ان کے حسن و جمال کے رنگ لگاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نازک و جلیل جنس کا مشہور مداح عمرو ابن ابی ربیعہ کا انتقال ہوا تو حسین لڑکیوں میں ایک کپڑا لٹایا۔ وہ نالہ و شہین کرتیں اور کہتی جاتی تھیں کہ اب کون ہے جو جلدی جنس کے حسن و جمال کا رنگ لگائے گا اب کون ہے جو ہماری مصنف

ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کی طرف ایک گوشہ مسجد میں بیٹھ گیا تھا مگر وقتاً سانے لگتی اور نماز دور روزہ مسب غلات کر کے رکھ دیا پھر اے حبیبہ! سچے واسطہ ہے دین محمد کا کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اسے قتل کر دے۔“

جس وقت یہ اشعار مدینہ کی گلیوں میں پہنچے تو سب کو یقین ہو گیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو کر مسجد سے باہر گیا ہے اور تمام مدینہ میں کوئی بیخ رنگ دیو کی ایسی ندہ لگی جس نے اسے تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب فیشن میں داخل ہو گیا۔ ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم تھا۔ اس وقت عام دستور تھا کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے اور ان پر گھڑے ہو کر نوؤں اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاقاً خالد نے کسی شاعر کے یہ شعر سن لئے کہ:۔۔۔ ”کاش میں بھی ان موذلوں میں سے ہوتا جو اونچے میناروں پر گھڑے ہو کر آس پاس کی چیتوں پر نظر ڈالتے اور وہیں سے عشوہ طراویں بکریوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں“ فوراً خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دئے جائیں۔

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن بیک اسوقت ابن الاطایہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہنچتا ہے۔  
 ابعث لی عصفی وانی بلای فی واحة النحل بالهن المربح  
 اور وہ مجھے جو شے کیسا ستم ظفر کرے دشمن کو شکست دیدیتے ہیں۔  
 غلیظہ سفاح ستر امروہی امیر کے ساتھ بیٹھا ہو گا نہ انتظار کرنا ہے کہ وقتاً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے  
 اخسار و مصرع الحبیب ذیلہ و قلیلہ بجانب المہم  
 سفاح یہ سنتے ہی اتنا برہم ہو جاتا ہے کہ تمام امراء بنی امیہ کو ایک دم قتل کر دیتا ہے۔

دلیلہ مالک بن قنفذ کے قتل کا حکم دیتا ہے اور جوق غلام اسے قتل کے لئے سامنے لاتا ہے وہ گردن جھکا کر یہ شعر پڑھتا ہے۔

ادی الموت بین الخف و السیف کاغما یلا حقی من حیثا نکلت  
 و ما لی من خزن الموت و انی لا علم ان الموت فی عین وقت  
 و لکن خوفی مصیبتہ قد ترکتہم و اکبنا دھم من حیرۃ ثقہ  
 رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے ”میں نے تیری لڑائی کا وعدہ سچے معاف کر دیا۔ جاو ادب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا“

عرب کی تاریخ ادب میں بہت سے اس قسم کے واقعات ہیں

لیکن ہمارے مطلب کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں ان سے اسے اسی طرح افادہ ہو جاتا ہے کہ عربوں کی تہذیب و تمدن دسم و دوح۔ عمر بنیت و معاشرت پر کتنا گہرا اور بے پناہ اثر ڈالا۔ اسلام کے ساتھ عربی ادب میں ایک بے بہا چیز کا اور اضافہ ہوا اور وہ قرآن مجید ہے۔ عربی زبان میں جتنی بھی فصاحت و بلاغت ہے یا ہو سکتی ہے۔ جتنے صنائع و بدائع ممکن ہیں وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔ اور دیکھا کہ کوزہ میں بند کرنے کا صحیح مفہوم کی حقیقت اسی متبرک حیدر کو دیکھنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اگرچہ عربی ادب کی طرح اس شعر و شاعری سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ وہ کسی انسانی انداز کی پیداوار ہے۔ تاہم عربی ادب میں ضرور مثال کی جاسکتی ہے۔ اور اس مقدس کتاب کے بعض عرب توہمی کی کہیں بلکہ تمام دنیا کی زندگی کو بوجھ کی طرح جس طرح اور جتنا متاثر کیا ہے کر رہی ہے اور آئندہ کرے گی اسے اگر بیان کیا جائے تو سیکڑوں نظم جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ اور

دوسرے وہ عالمگیر اثر اہل نظر سے پوشیدہ ہی نہیں۔ بے تعصب اور وسیع نظردار اس کے اثر کا اعتراف کر لیا عرب کے دشمنوں اور دہندوں کو تمدن کا سبق کس نے دیا؟ جانوروں کو انسان اور انسانوں کو فحشہ گس نے بنایا؟ دنیا نے انسانیت کو پستی کے اسفل انسان فلین سے نکال کر عرش عروج پر کس نے پہنچا دیا؟ مغرب کے ظلمت گرد اپنی طرف ایک شعاع غلط انداز سے کس نے جگمگایا؟ آج عربوں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں اور سود خوار ہماروں کے خلاف دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک آواز بلند ہو رہی ہے۔ مگر کیا یہ کوئی نئی چیز ہے سود لینے کے ساتھ دنیا ہی حرام محضہ نے میں کیا مصلحت تھی؟ و غم و وساوس جس کے لئے دنیا آج اس زرد شورش جلا رہی ہے۔ قیرہ سو برس پہلے دنیا میں سب سے پہلے اسی کتاب نے پیش کی تھی۔ اشتراکیت کی تمام اسکیمیں اور کٹر یکیں زمانہ ماضی سے لیکر آج تک ناکام رہیں اور رہیں گی لیکن اس کتاب کے اصولوں پر مساوات ہمیشہ کامیاب ہوئی اور ہوگی جنوآ کی بین الاقوامی لیگ ریگستان عرب کے شہر مکہ کی اس بین الاقوامی لیگ کی میزبانی اور بیکار نقل ہے جس کا سالانہ منعقد ہوا اس کتاب نے فرض قرار دیا ہے۔ آج مغرب کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے یہ نظریہ ہم نے بنایا کہ مرد و عورت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور بس طرح علم حاصل کرنا حق مردوں کو ہے اسی طرح عورتوں کو بھی ہے یہ تیرہ سو برس پہلے کی لکھی ہوئی کتاب انسان کو مغرب و عربوں کو دکھلا دیجئے کہ یہ کیا کہا ہے۔ ”هَذَا بَشَرٌ لِّکُمْ وَ لَکُمْ بَشَرٌ لِّهَٰذَا“ (ہم انکا لباس ہو اور وہ تمہارا لباس) اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ



وہ پہلے زینے پر کھڑے ہام ترقی پر نظر پڑ جائے ہوتے ہیں اور اگر یہ بہت برقرار رہی تو بہت جلد ہم انہیں وہیں دیکھیں گے جہاں سننے ہیں کہ ہائے آباد اجداد کا مسکن بہتہ اور وہ میراث قلیل جو "تخلیث کے فرزند" کے سپہراس کے صحیح وارثوں کو مل جائیگی۔

عرض کیے جب بادشاہوں اور رئیسوں کی مدح میں ایسے ایسے قصائد پڑے جاتے تھے کہ کدوچ کو اگر خدا نہیں تو کم از کم خدا کے قریب تو ضرور ہو چکا دیا جاتا تھا۔ تو بادشاہ خود کو سب سے بلند اور قوی طاقت سمجھنے لگتے تھے بجا تعریف سے ہر شخص مغرور بھی جایا کرتا ہے اگر بادشاہ خود کو خدا سمجھنے لگے تو اس میں عجب کی کیا بات ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس وقت اس کا ہر لفظ قانون ہوتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا۔ دے جایا میں سے کسی کو زبان جانے کی بہت نہ پڑتی تھی۔ اگر وہ ظالم ہوتا تو رعایا کو خاموشی سے اس کے تمام مظالم برداشت کرنا پڑتے تھے۔ وہ آف سبھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب رنگ بدل گیا۔ اب جسارت و دلیری بڑھ گئی ہے۔ اب اگر بادشاہ ظلم کرے تو شاعر یا سیاست دان اسے خطرہ پہنکاتے ہیں کہ

کشت ملت را کردی ز بیم پاک درو شد کن قصہ چنگیز زیداد تو تو  
یاد بادشاہ کے سلسلے سے نہ نکلتے کہہاں اشتباہ ہے کہ  
بادشاہ ازاں استبداد و چواری معصوم کہ ازین کار جزا دربار و مژدہ مشرود  
تو اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شعور آزادی کی وجہ سے شخصی حکومتیں  
جیسی پہلے تھیں اب قریب قریب مفقود ہیں۔ اگر پارلیمنٹ کی سی صورت  
نہیں ہے تو کم از کم ایک مجلس وزراء تو ضرور قائم ہے۔ پہلے وزیر اور اس کے  
کو بادشاہ محکم ابھی دیتا تھا لیکن اب یہ خطرناک ہے۔ اس آزاد ادب نے  
رعایا کے ہر فرد کے دل میں آزادی کی لہر دوڑا دی ہے۔

آخر میں میں یہ ضرور کہہ چکا کہ صوفیانا ادب نے اگر زندگی پر کچھ اثر کیا  
تو صرف یہ کہ قوم کو کمزور کر دیا۔ کیونکہ ان کے فلسفہ میں دنیا اور دنیاوی دولت  
کوئی چیز نہیں۔ دنیا سے اس نام فطرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں  
سلطنت چھن گئی۔ بادشاہ رنگ ریلوں میں سست۔ رعایا انصاف میں غم  
سلطنت کی حفاظت کون کرتا۔ اور جو تہذیبی بہت رہ گئی وہ کمزور ہو گئی  
جب "جین کی لاش" اس کی بعض ڈالا معصوم ہو تو کمزوروں کو زندہ رہنے  
کا کوئی حق نہیں انہیں طاقتوروں کی لذت کام و دہن بھانجا دیا جائیگا۔ اسی  
جو اب "جین تنازع البقا" "ڈوینا کا ایک فطری قانون اور بقائے اصل"۔

Survival of the fittest —  
اصلی ہے تو صحیح دنیا میں ہر کمزور دنیا سے بے نیازی کا قیال کرنا سکندر لغو  
اور ہل بات ہے۔ جنہیں دنیا سے نفرت ہے انہیں دنیا کو قطعی چھوڑ دینا

طلب العلم فہو لیقیناً علی کل مسلم و مسلمة (طلب علم ہر  
مسلمان مرد و زن پر فرض ہے)۔ الفرض اس کتاب نے دنیا کی تہذیب تمدن  
میں جو حصہ لیا وہ ظاہر ہے اور گزشتہ سے اندازہ لگا کر ہم نہایت یقین کے  
ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ زندگی کو پہلے سے ہی زیادہ متاثر کرے گی  
یہ رواجی ادب کا اثر زندگی پر۔ اب آئیے سرسری طور سے فارسی گزرتے  
ہوئے اردو ادب کو دیکھیں۔

فارسی قدیم ادب جیسا کہ میان ہوا زیادہ تر مذہب اور تصوف سے  
تعلق رکھتا ہے اس میں عشق و عزم و عین اور مدح و تعریف و سب  
چیزیں بھی ایسی نہیں جن کا زندگی پر کچھ نمایاں اثر پڑا ہو۔ ہاں صوفیانہ ادب کا  
یہ اثر ضرور ہوا کہ لوگوں کے خیالات زیادہ صوفیانہ ہو گئے اور بہت روز  
تمام ایران پر تصوف چھا پا رہا۔ جب ایران میں صفوی خاندان کی حکومت شروع  
ہوئی تو اس کے ساتھ تصوف میں کچھ بھی آنا شروع ہوئی۔ لیکن اس کی کا  
اوسط عشق و شاعری نے پروار کیا۔ الفرض فارسی ادب شروع سے لیکر موجود  
دور تک قریب قریب یکساں رہا۔ ایک طرف تعریف سلاطین کے قریب کو  
ممنوع قرار دے رہا تھا دوسری طرف بلند پایہ شاعر بادشاہوں کے درباروں  
میں مستقل طریقہ سے تعریف پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف سعدی نے  
سلاطین کی طرف سے بے نیاز ادب پر دھڑکے ہوئے ہندو شعاع شروع کئے  
ان کا کچھ اثر ہوتا لیکن دوسری طرف تصوف و عرفانیت کے شہرے کچھ نہیں  
نہ دیا وہ وحی ملت طافین ایک دوسرے سے متصادم ہو رہی ہیں اور اس  
طرح ایک ہی اپنا اثر زندگی پر نہ پھیر سکی۔ جب اس طرح ادب و روز  
کمزور ہوتا گیا تو اسی کے ساتھ ساتھ قدیم ہیوستی کی طرف مگر تھی گئی۔ آخر  
مغربی ادب کا اثر کہنے یا خوش قسمتی سمجھ کر موجودہ دور میں چند شاعر و ادیب  
ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اس توئی پستی کا احساس کیا۔ اس کے سبب  
معلوم کئے اور ایک انقلابی ادب قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ اب  
پہلے کی سی رنگینی اور حسن آفرینی تو نہیں تاہم جو کچھ انہوں نے محسوس کیا  
اسے صاف و سادہ الفاظ میں باطل اسی طرح بیان کر دیا۔ حقیقت ہمیشہ  
اثر کرتی ہے۔ اور حقیقت کیلئے کسی مبالغہ یا یکد زبانی کی ضرورت  
نہیں۔ اور یہ تو یہ ہے کہ

فریادی کوئی ہے نہیں ہے نالہ پابند ہے نہیں ہے  
توسہرہ کی لکھ بصری آواز کیوں پابند ہے ہوئی۔ محض تخلیق نہیں  
بلکہ حقیقی قرب و اضطراب اس نالہ و فریاد کا محرک تھا۔ لہذا اس نے سننے  
والوں پر اثر کیا اور کرنا چاہے متناہی نہ ہو کہ اب ایران میں بیداری  
کے ٹھنڈے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے بدست ہندوستان سے کئی تہذیب

بتوں کے تھوڑے پچھلے دینے۔ یہ سب ہمارے اس گندہ اور بزدلانہ انداز کا نتیجہ ہے۔ جب تلوار بقیہ اس نے اپنا کام کیا مگر جب انہوں نے تلوار کو روکے ہوئے سپردہ رقم قلم سے تبدیل کر لیا تو اب جو اس قسم کے قلم کا کام ہوتا چاہئے تھا وہ ہوا۔ رجز کا جواز تو تھا ہے وہ ہوا۔ اب نغبات ہند کی غلامی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ جب خودداری اور دلیری بقیہ دینا خود بخود کا ننگا نپ کر ہمارے سامنے سے جگہ چھوڑتی تھی۔ اب ایک مکڑ اور درجیا مشرق کی ایک خدایہ تو پھر ہماری شدت غلامی کا کیا شکاں۔

آخر یہ دور حکمت و فدا کے کینک بتا۔ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جن کی دور میں نظروں نے اس پہلے ادب کے خطے کو محسوس کیا۔ اُس پر کچھ مغربی ادب نے اپنا اثر دکھایا اور آخر وہ ادب میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب رونما ہوا۔ اور جوقبال کی ہستی میں انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ لفظ نظر نفسی اپنے فلسفہ کا تیشہ لیکر دو شعاری کے کوستان پر چڑھا اور اپنے تیشہ کی چند فروں سے اس اس پہاڑ کو قریب قریب لٹا دیا اب اس میں سے ایک نثر بھی، صاف و شفاف اور مترجم جس نے اب کے شک جہان کو پہاڑ کی بوقلموں رنگینوں کی ہر خوش کردیا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے صور پیداری پر ہونکا جس کے اثر سے کبہ تو ایک دم چونک کر اس طرح بیٹھے کہ پراس کے ہم آہنگ ہو کر پیداری کے نغمے گانے لگے اور باقی کو لڑکھیں لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ پیداری یہ جوش عمل یہ آواز دے ترقی جو پیداری موجودہ سلسل میں پائی جاتی ہے سبب اس کی "صدائے دردناک" کی رہنمائی ہے۔ اب جو اس قافلہ میں ایک قطار اب دے ہوئی نظر کی ہے یہ اسی کی "ہانگ" کا کچھ ہے۔ آج ہندوستان کے دور دوروں کی پیداری اس پیام خضر کا اثر ہے جو اس نے اپنی زبان سے سرمایہ داروں کی "جلاوطنی" کو ظاہر کرتے ہوئے "ہندو مذہب کو دیا عرض اقبال اسی دولت و حکمت و حکمت میں اپنے پیغام عمل کی منور شمع لیکر ایک پیغمبر کی حیثیت سے آیا۔ اُس نے جب پیغام عمل دیا تو پیغمبری کی اور جب عشق و محبت کے نغمے گائے تو سادگی کی۔ رفتہ رفتہ اس کے مشن کو دوسرے اور شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمہ لے لیا اور جوش، سیاحت اور سافر و جہرہ نے عشقیہ مضامین کی صفحہ ساتھ قومی اور ملکی تعلیم ہی کثرت سے لکھیں۔ اور قاضی محمد اسلام نے بنگالی زبان میں وہ دھڑلے برائے کنگا لکھیں کے خرم فطنت کو پہنچا کر لکھ دیا۔ اور جو ستارہ "تغریب" جیسی بھول ڈال دینے والی طرفان نظم لکھ سکتا ہے وہ زندگی میں کون سا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

یہ تو ہوا مظلوم ادب۔ اور ہر سائنس و فلسفہ اردو ادب میں آیا اور کچھ مولویوں کی محنت گیر لوں اور شدت کا اثر کہ پرانے خلاف عقل اعتقادات کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ دس سالہ نگار ایک مدت سے مولویوں کے خلاف

چاہئے اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ مسلمانوں کے دماغ میں جب اس طرح کا لغو خیال سمایا دہ کر دیا گئے اور اس کے بعد بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ خدا ہلا کرے اس نقوص کا جس نے خدیب کو بھی سچ کیا اور دنیا بھی کوئی۔ مگر خیر اب حالات امید افزا ہیں اور اگر موجودہ ادب میں یہی جوش و ولولہ اور یہی انقلاب انگیز خیال رہیں تو انشاء اللہ کافی فائز ہو جائے گی۔ الفصحہ فارسی ادب کے بھی دو مخصوص کارنامے ہیں کہ قدیم ادب کے انہیں لہیاں دے دے کہ مسلمان ہٹا لیں موجودہ ادب کے پھر انہیں جھپٹنے دے دیکر اس کے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور اب ہمیں گذشتہ نقصان کو بھول جانا چاہئے کیونکہ ہزاروں پہلوں میں کراک کی صورت نکلتی ہے

یادوں سمجھ لیجئے۔

کہ خون صدمہ زار انجمت ہوتی ہے سحر پیدا اب آئیے دیکھیں کہ ہمارے اردو ادب نے زندگی پر کیا تنک اثر کیا اور انفس کے ساتھ کیا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں ہمارا ادب سب سے زیادہ وقیمت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ادب چند سال پہلے تک بالکل فارسی کی نقل تھا۔ جو جذبات اول و دوم سے برہنہ نہ ہوتے ہوں وہ کسی دوسرے کے دل و روح پر کیا اثر کر سکتے ہیں۔ شاعروں نے شاعری کی اسنے والوں نے تعریف کر دی۔ میں انکا مقصد حاصل اور اگر کسی نے خاطر خواہ داند دی تو پھر اس سے لڑائی اور ہمیشہ کیلئے روش اور کیوں نہ ہو۔ جب وہ شخص ادب کیلئے اتنی محنت کریں اور پھر انہیں وہ بھی دے جو انکا منتہی شاعری ہے تو پھر کیوں انہیں صدمہ نہ ہو۔ مغربوں نے چند ناممکن الوقوع واقعات جمع کر دیئے۔ بس ناول، بلیک، لوگوں نے پڑھا پھر کچھ ہو گئی۔ جیوان کا بھی مقصد پورا ہو گیا۔ تو بتائیے اس ادب کا اثر زندگی پر پڑ سکتا ہے اگر اس کا پھر اثر زندگی پر ہوا تو صرف یہ کہ ہر تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ شاعر بلیک اور باناری مذاقی کی شاعری کر کے دیوان کے دیوان سیاہ کر دئے۔

وہ تو ہر جوان لڑکے کر ہندوستان میں آئی تھی اس کے ہاتھ میں اب ٹوٹا ہوا قلم بلیک جن کی کمر میں ہر وقت ایک خوشخوار جگر تھا کہ آتا تھا ان کے کانوں پر ایک سپردہ رقم قلم رہا ہے۔ جس قوم کے بچے انھوں نے زمین آسمان میں بھول ڈال دی تھی اب اسکا نالہ و شین آسمان سے ٹکراتا ہے۔ ہوا میں گرجتا ہے اور فضا کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ جو قوم میدان جنگ میں رجز پڑھنے کی عادی تھی۔ اب وہ ادبی مخلوق خدا کی درج میں نغبات ہند گاتی ہے۔ جس قوم کی گردنیں دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت ہلنے لگتی ہیں جہاں اب وہ اپنے قلوب سے جتانے ہوئے

اور جنت نشان، بجائے۔

افترض ایک مازدہ تاجب بر طرف افلاس و کسبت حق، ہر صحت پسندی و عظمت حق، فلاں دہ ذہنیت کا رفرہ حق، ہر طرف غلامی غلام نظر آتے تھے بلکہ علم سے لپکے ہوئے اندر سے کراہتے ہوئے، اور کرب و ادب سے روئے ہوئے مزدور سے "سرماہ دار حیدر" کے خرمین بچہ میں گرفتار کٹر دہمقال ہتے امیروں کے ہاتھوں لٹے اور بچے ہوئے، زیروست سے زیروستوں کے ہاتھوں برباد کئے اور ستائے ہوئے، شاعر کی دودھ منظر اور حساس دل نے اسے دیکھا اور میا خیز اس کی زبان سے نکل گیا۔

آتش اپنی حقیقت سے بولے خدا تھا دانہ تو کھیتی ہو تو ماراں ہو تو حاصل ہو تو دانے نادانی کہ تو حجاج ساقی ہو گیا ہے تو دنیا ہی تو ساقی ہی تو بے خبر تو جو پر آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آفر ہی پیغام ہے کم فہم کی اپنی حقیقت کا احساس کرا کے اس نے غلاموں کی غفلت کو دیکھا اور یہ کہہ کر انہیں حقیقت دلائی کہ

نہیں یہ شان خود داری حق جو تو کر کچھ کر کوئی دستار رکھنے کوئی ذیہ کو کرے انہیں حقیقت دلا کر کہہ اس طرح پیغام عمل دیا کہ

مصافحہ زندگی میں سببیت خولا دیدار گشتناں صحت میں حیرہ و پریاں ہو جا تو دہریدہ رخاں جو غفلان آئینہ بینی ہر پرواز کہ صید ہر وہاں ہے تو اس کو رن

اور ابھی ہندوستان میں یہ پیغام گونے پھڑپھڑے ہی دن ہوئے تھے کہ سوئی ہوئی آنکھوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے، بیٹھی غیند سونے والے کمرے میں لیٹے تھے، "عزیز مراد مشرق میں خون زندگی دوڑا" اور آواز خود شکر نسلی آئینہ چلے میں یہ کہہ رہا ہے کہ

مزدہ لے بیہانہ بردار شتان مجاز بعد صحت کے ترے زندوں کو کچھ کو کچھ چوٹ اور اگر یہی آتش نوازی اور شعلہ باری رہی، ایک دروند کی آواز اسی طرح اتر کر گئی رہی تو چند روز میں یہ عہد خلاکت و کسبت دور نہ ہوئے بلکہ بدل جائیگا یہ عظمت فرد و جمعی سے تبدیل ہو جائیگی، نالہ و فریاد بقیہ بقیہ اور آفسروں کے بھانے جسم ہی جسم نظر آکر لگا کر خود شاعر ہی کی زبان سے سن لیجئے کہ چند روز کے بعد یہ دنیا کیا ہو جائیگی، کہتا ہے خدا جل جلالہ کہتا ہے کہ

آساں ہو گا سحر کے نوسے آئینہ پوش اول عظمت رات کی سیماں باہر جائیگی آئینے سینہ جانان جس میں سینہ جاک یعنی گل کی ہم نفس بادشاہ ہو جائیگی شہنشاہی آفریں ہی ہوا کرچی سرور و شہ اس چین کی ہر لکڑی درویشاں ہو جائیگی دیکھو تو گئے سلطنت رفتار دیا کا نالہ موج مضطرب سے زنجیر ہو جاوے گی آجکے جو کچھ دیکھتی ہے جب یہ آئینہ نہیں حقیقت ہوں کہ دنیا کیا ہے کیا ہو جائیگی

ایک گامیاب جہاد کر رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ کہ اب اسلام کا مفہوم پہلے سے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پہلے اگر اسلام نام بتالائی راہی، نیچے چھا، عام اور شیع کا توپ جو شمل اور مل انساہیت کا نام اسلام ہے، اہل ہندو میں بھی چوٹ چھات خائب ہو رہی ہے اور اگرچہ بیٹھیں کہا جا سکتا کہ یہ محض اردو ادب ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس میں بہت کچھ مغربی تہذیب و ادب کا بھی ہاتھ ہے تاہم اردو ادب نے بھی مذہب میں نمایاں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

اب کچھ لوگ آئے اور غوروں کے وکیل بن کر آئے انہوں نے اصلاحی افسانے اور ناول لکھے جن میں غوروں کی تعظیم کی طرف توجہ دلائی، ان کی غفلت کا اظہار کیا۔ اس پر مغربی تہذیب نے تازیانہ کا کام کیا۔ اور چند سال کے اندر ہندوستان کی صورت کس سے کس پر پور چڑھی، کیا پچاس سال پہلے کوئی کچھ کہتا تھا کہ ہندوستان کی صورت گول میز کانفرنس میں حصہ لے سکے گی۔ یا میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ اور کونسلوں کی صوبہ بن سکیں گی، اکثر یا وکیل ہو سکیں اور جیاب بھی ہندوستان کے بہت سے مرد ہوائی چار یا خود ان کی اصلاح میں سبیل گاڑی کے تربیت جاتے ہوئے ہی ڈرتے ہیں تو صورت اس میں بے جھک سفر کرتے کی یا تو وہ نہ تاجب بقول نہ عشت وانیہ جو نہ ریل کے نام سے دل میں دھواں اٹھاتا، ہتھیاب جیاب کبھی آپ اسٹیشن پر پورچ جائیں تو آپ کو نقاب اٹھنے ہوئے چہروں اور، لیکن ساریوں کے ہجوم میں اپنی نظر کو ایک جگہ قائم کرنا مشکل ہو جائے گا۔

سیاسی ادب میں اخبارات نے زیادہ حصہ لیا۔ اور آزادی کی حامی دو تمام ہندوستان میں دوڑ گئی، جو کبھی تحریک خلافت اور کبھی کانگریس کی صورت میں ظاہر ہوئی، غریبوں اور دوروں کی دودناگ حالت دیکھا کہ حکومت کی توجہ اس طرف ہندول کرانی گئی اور خود ان مظلوموں کو اپنی غفلت کا احساس کرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بھی ایک اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی، اور آخر حکومت کو یہ بات سنبھال کر اس کے ساتھ ساتھ قرضہ بل دینا شروع کیا، تو افسانہ ہاں کراچی پر سے اس آزادی کی غلام فوٹش کا اثر یہ ہوا کہ بھتے اور کٹر غلاموں نے مسلحانہ قومی آواز کے دل میں اپنی طرف سے اندیشہ اور خطرہ پیدا کر دیا، اگر اس اندیشہ اور خطرہ نے ایک طرف بہت کچھ اصلاح بھی کر دی، تو دوسری طرف یہ پس ایکٹ کو سخت ہی کر دیا۔ اور اگر آج پر سے پرست پابندیاں اٹھائی جائیں۔ تو ہندوستان میں بھی بہت سے دوست اور دانشور جن کی زبانیں اس ایکٹ نے بند کر رکھی ہیں شعلہ برساتے ہوئے مشرق عام پر نظر آتے نہیں، اور انقلاب فرانس سے بھی زیادہ خوفناک انقلاب یہاں پر پیا ہو جائے گا پھر یا تو تمام ہندوستان معد اپنی غلامی کے صفرو دنیا سے غائب ہو جائے گا یا پھر پہلے کی طرح "مسنے کی چڑیا"۔

الطریقہ میں نے اپنے مصنفوں کے دونوں رخ دیکھ لئے زندگی نے ادب پر چراغ کیا وہ بھی اور ادب نے زندگی کو جس طرح متاثر کیا وہ بھی۔ اور اگر ادب اور ادب ہی کیا دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیاں۔ گفتگیاں اور عنایاں ماضی زندگی کا نتیجہ ہیں تو ادب ہی کوئی معمولی اور کم اہم چیز نہیں۔ بہر حال اس تمام مصنفوں کے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر ایک طرف ہم زندگی کیلئے

یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو زندگی گزار رہے ہیں وہ علم نہ ہو، ادب نہ ہو، چرخ نہ ہو زمین نہ ہو، روز نہ ہو شب نہ ہو تو دوسری طرف ادب کے لئے یہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹکڑی نہیں اس اگر جوئے کے سخن نہ ہو، پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، مسٹر نہ ہو، چین نہ ہو حقیقتاً لعلی

## نالہ دل

(غزل دوست)

پہر خون جگر سے سینے کے میں آدابِ اجڑا بستان کروں  
بیابانی دل کا اے ہر دم اور تجھ سے حالِ بیان کروں  
لشہ نہ کر اھلرا، نہ آئینکا لطف اس کے سننے میں  
کیوں تیرے سکون میں غل ہو کر اب میں جھک جیروں کروں  
گلزارِ امید و مسرت پر پے طرح ادا سی چمائی ہے  
محبوس ہے گو آبا دی میں لیکن یہ دل صحرائی ہے  
تالیف و طابیت کا نشان ملتا ہی نہیں انسانوں میں  
اک شہر بیمار ہلے ہر دم ان فانی دیوانوں میں  
دیکھوں گی درد بھری آہیں بے معنی! اے اللہ یہ کیا ہے!  
ہے مجھ کو ساری دنیا فرضی و غلط افسانوں میں  
صادق کا حال نہوں! انصاف کا خون! باطل کی پذیرائی  
پامالی حسرت پہنے کی اب دل میں نہیں طاقت ہمد  
انصاف تو کر لے لہذا! کہتے ہیں اہلِ باطل!!  
دلِ دُوب گیا ناکامی کی موجوں کے تھپڑے کھا کھا کر  
ان! برقی رحمت نے کر ڈالا صبر و سکون و ہر دم ہر دم  
ہے میرے لب خاموش میں اک پُر درد حکایت پوشیدہ  
رگِ گم میں بے رنگ تارِ نفس ہر وقت سنا رہتا ہے  
وہ جس نے شرابِ عشق پا کر جھک کر کیا ہے دیوانہ!  
یہ یاس انگیز فضا میں ہیں پر کیف اسی کے تصور سے!  
آباد ہے اس نغمہ میگوں کی یاد سے دل کا ویرانہ!  
کچھ اور بجز اس دھن کے نہیں اللہ! تنہا اس دل کو  
سودا ہے بھی وحشت ہے بھی طبلے جبرائیل جھک

”دلفکار“

# بھون ایک پھیلی

قصہ مختصر! انٹرنس میں نہایت عمدہ نمبروں سے نکل ہوئے۔ آپ کہیں گے کہ مذہب تھے۔ میں کہتا ہوں کہ بڑی سے لوگ اعلیٰ طبیعت سے پرے دیکھے تو نفل کرنے کے ہوا آپ کو اور توفیق ہی کیا ہوگی؟ نفل ہرنے کے بعد اسکول کے ساتھ گھر بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ انا صاحب دوسری شادی نہایت بھلا سوتیلی ماں پر کیوں پسند کرتی کہ سوت کی اولاد کے سامنے پران چڑھے، چنانچہ جب گھر سے نکال دئے گئے تو روٹی کا ٹکڑا ہار روٹی تھی کہاں سے؟ چار پانچ روز تک یہ بچہ دواہر سے اُدھر مارا دھر تارا مگر کوئی کی کوئی صحت نظر نہ آئی جو چند پینے بچ رہے تھے وہ بھی ایک ایک کر کے فریج ہو گئے۔ تین وقت سے کھیل کا دانہ لگنا اور کمرز میں نہیں گیا اور شکل پر بارہ بجے لگے۔

بھوک لگنے ہونے شروع تھی اتنی ہی اس نے سوچ کر لپکے نہیں سے دور کسی دوسری طرف کچھ نہ بکیر بل ہی جائیگا ایک طرف چل کھڑا ہوا، شہر چھوڑنے کی گئی ہو گئے، اور پیٹ پیٹہ سے اٹکا، مگر پیٹ اٹکاتے ہوئے قدوس سے اٹکے ہی بڑھتا رہا۔ چند اور گھٹے گذر گئے، یہاں تک کہ شام کے بھٹ پٹے میں دانہ دکان چائے چنگا کر ہرمل اور کوئے دین سپر کر کے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف وٹنے لگے۔ لیکن مجھے پٹ بھرنے کی اب بھی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کبھی کسی زندگی کی اس ٹوٹ جاتی تو سوچتا۔ "موت کو بڑی آنا ہے تو آگے، کلم اکر بھوک سے توجھٹ جائیگے...."

اکاش پر چند رمان درجمان ہو چکے تھے۔ ۱۔ ملکی ملی پانڈی میں چاروں طرف کی چیزیں مدہم سی دکھائی دینے لگی تھیں چند گڑے فاصلے پر مٹی کی انچی مینڈھ سے گھرا ہوا ایک کھیت تھا اور کئی اور جگہ کی فصل تیار کھڑی تھی طبیعت بھری ہو گئی۔

پک کر مینڈھ پر چڑھا مگر دوسری کانٹوں میں الجھ گئی، بڑی مشکل سے اس چھٹکا ابا کر کچکے چکے دوچار بٹے توڑے، ادھر ادھر سے کچھ کھجیاں جسے کرکے آگ جلائی۔

تھوری دیر ہوئی ہوگی کہ آواز آئی "کون ہے سے؟ کیا کرت ہے؟"

رُوح فنا ہو گئی "میرا نہیں بھتیجا۔ میں سے بے چارگی سے کہا "بھئی بھون رہا ہوں۔"

"کھر بے ہی کیا" ایک ٹکڑے سے حوان سے میرے قریب آکر پوچھا۔

"خیر، تاکہاں سے؟ میں نے خوشامدنا دلجو میں کہا "بھوکا ہوں بھائی۔ کئی وقتوں کا فاقہ ہے۔"

"تو چوری کی ہے؟ سرم نہ آئی؟" وہ مجھے ذرا محنت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا کروں؟" میں نے عاجزی سے کہا "بھوک کے لڑے مر جا رہا ہوں۔ اور نہ چوری کسی نہیں کرتا"

"بڑے اپوس کی بات ہے" کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھے غور سے دیکھ کر کہنے لگا "سکل سے تو صرف معلوم ہوتا ہے برا بھوکے کا ہیکو ہے؟"

"اس نئے میں تو شریف ہی بھوکے دہتے ہیں۔ میں سے کہا "تو کیا میں یہاں بیٹھے کھاؤں؟"

وہ میری بات نہ سمجھ سکا اور نہ دلجو میں بولا "یہ اپنے نامیں تو ادھر سے جا رہا تھا۔ پرتھم کہاں رہت ہو؟"

میں نے اپنی کہانی سنائی تو وہ بڑا ملول ہوا اور دھیر سے کہنے لگا "تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں سے تھوری دور میری جھونپڑی ہے، جہاں میری کتہ اور باگک رہتے ہیں۔ تم کو وہاں باجسے کی روٹی اور گول جائیگا، ایسے چوری سے منٹ خراب ہو جائے۔"

ایک ہمدردی سے مبرول بھرا کیا یہ دیہات والے نہیں ہم حقیر سمجھتے ہیں، دوسروں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے ہیں ان کے ساتھ چلا یا اور ان کے گھر پہنچ کر مجھے اتنا بھی احساس نہ رہا کہ یہ بالاپنا پیٹ کاٹ کر میرے تن میں جان ڈال رہا ہے۔ رات گئے تک ہماری باتیں ہوتی رہیں۔ میرے کانڈے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہنے لگا "بڑا کھرب جانا ہے گڑھاری پر کیا کریں جلد تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ تیرے صبح میرے ساتھ چلنا ہیں اپنے ملک سے کہہ کر تھیں کل کھانا میں ملنا چھوڑ دینا۔ وہ بہت دیا لوہے اور مجھ کو ان سے نفرت پڑتی ہی رہی ہے، پارہہ روج ملیں گے تم کو بھوت ہیں..... اور یوں تو بڑے بڑے بالو بالو سڑی پاس کر کے بھی بھوکے مرتے ہیں۔"

"میں مزدوری کروں گا؟ میں نے دلیں کہا" سات آٹھ روپی سے میرا کیا کام مل سکا ہے۔ گو مجھے اپنے خاتون کا خیال آیا اور میرے منہ سے یہ سننے نکل گیا "ہاں ان گوری شکستہ تم مجھے لو کر لو، میں سخت مزدوری کروں گا۔"

کارخانے کا مالک، تن ہال بڑا مزاج اور مغرور شخص تھا، اسکے چہرے سے نفرت پکٹی تھی، اور تمام مزدور اس سے بے دردی تھے۔ گوری شکستہ کی سن کر ایک دفعہ اس نے مجھے سر پر تک حشرات آمیز نظروں سے دیکھا۔ "تو تم کوڑی کر دے؟ ہوں! بھر تم سے کالجے کو کنیں گے؟ کدال تم سے کیو پیوگی؟ تم تو باؤ ہو باؤ! انٹے اس لالہ میں پڑھا کر تم کو کھانا دے دو گی، جانا اب انکے پاس! تمہیں ان حالوں پہرے دیکھنے سے لجا نہیں آتی؟" مجھے اپنی نیکی پر دھڑاسا لیا کہ یہ پڑائی تو میرے فائدہ پہونچنے کے اتنی جڑی کاٹ رہی ہے۔

رتن بولا "اور تم سے کوڑی ہو گئی کیسے؟ ذرا پناہ دین تو دیکھو ایک چھارے میں تمہارا تو بازو تیرا ہاں ٹاکن میں نے پھر بھی گوری شکستہ کے ساتھ اسکی خوشامد کی جسے سن کر اس نے کجبر سے کہا "کیوں بے گوری؟ یہ تیرا دادا لگتا ہے کیا؟ کیوں سر جھٹے جانا ہے؟..... اچھا، خیر! جادو کام کر، گواہ انیشل دو، ورنہ دو آنے بھی نہ ملیں گے۔"

چار باج گھنٹے تک ٹیکس تمام میں کام کرتا رہا لیکن جسم بڑا ہو گیا اور بازو اوکھرش ہو گئی۔ میں اپنی قسمت پر آپ ہی آپ اُلگ لگولہ ہوا تھا، تھوڑی دیر میں کیا بچتا ہوں کہ رتن مزدوروں کو ڈانڈا ڈنٹا چلا رہا ہے۔ کبھی کوکلات ماری، کبھی کو موٹی سی گالی سنائی، اور کسی کی گڑھی پر زور سے پڑ دیا، میں اسے کیسے برداشت کر لیتا، چنانچہ میں نے سوچ لیا اگر مجھے کچھ بولا تو اس کو کھڑکے رکھ دوں گا۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں اٹھا اور چپ چاپ میرے پاس سے گزر گیا +

(۲)

میں جس کارخانے میں ملازم تھا وہاں نینچ قوم کی عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ مجھے یہاں کام کرتی کوئی سال ڈیڑھ سال ہوا ہوگا، کہ ہم میں ایک نئی عورت شامل ہوئی جو رتن کی چھاری تھی، گریڈ میں ایسی بے محرم ہوتی تھی، بھلا رنگ، درمیانہ قد، اچھا ناک نقشہ اور ضد حال پر شرافت کے آثار، شاد چوٹی کے سناس ہوئے کسی شریف صاحبزادے کی بھی لالہ ہو جاتی ہوگی جس کا نتیجہ سوتا کے وہ جس میں ظاہر ہوا۔ گوری شکستہ کہنے لگا "وہ جو بڑھا خرتی تھی تا وہ سوموار کو مگر، یہ کسی کی لڑائی ہے۔ بالو جی نے کرنا کر کے اسے اپنا ہی بڑا کر رکھا ہے..... بچا دی گیلی ہے۔" بات اتنی گئی ہو گئی۔

کچھ دن یوں ہی گزرے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ "ہم بھی ہیں تیسرے پرستاروں میں۔" گر خشک، آن پڑی کہ کبھی سگائی ہو چکی تھی، اوہ اس کامیاں ایک آٹھ دن میں تنے والا تھا +

بھادوں کی ایک شام تھی اور ایک بلی چھوڑ پڑی تھی۔ سورج دینا لال پئے رنگ بدلتے ہوئے کچھ کھڑک طرف دھسے جا رہے تھے اور سوتا ٹھون سے

ادنی الٹکا اٹھانے پہلے ہوتے ہوئے ایک طرف ہولے ہولے چلی رہی تھی میں بھی تھوڑے فاصلے پر اسکی گودی گودی پنڈلیوں کو اکھوں میں لپٹے چھپتا چھپتا چلا جا رہا تھا۔ جھونپڑی تک پہنچنے پہنچنے اندر ہیرا پھیل گیا، اور اسکے بالوں میں کالی رات چاروں طرف بکھری تھی۔ جھونپڑی کے پچھلے ایک کونے میں گھبراہٹ ہو کر ایک موٹے میسے سے اُسے دیکھنے لگا، اس نے اندر گر پہلے دیا جلا یا اور پھر ایک ہینڈ کی طرف برسی کہ دفعتاً..... میں نے کیا کیا..... وہ جلا دیا لو، سینہ رتن لال ہی شراب پئے ہوئے سونا کی طرف پڑا ہے سونا کیا ایک "کون"؟ لکھ پٹی، اور رتن نے ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "سونا! تو ڈی؟....." اری ہلکی میں تجھے ایک کش کھری سننے آیا ہوں..... میں تجھ سے سادی کر دوں گا..... آمیرے سینے سے لگ جا..... اور اس کو اغوش میں لینے کے لئے اس نے اپنے مضبوط ہاتھ اسکی طرف بڑھائے۔ سونا سم کر پیچھے ہٹی "کیا کہتے ہو ہمارا ج! میرا آدمی آجکل میں آجائیکا تو وہ....." "ارے چھوڑ اس آدمی کو..... رتن اسے سینے پر سے مسکی جوتی جوتی لٹپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بات کاٹ کر بولا "تیرا گوا تو نہیں ہوا پھر کس بات کا فکر کرتی ہے؟ مجھ سے سادی کر لی تو تجھے سینہ لال بناؤں گا....." یہاں تو.....

"سچ کہتے ہو ہمارا ج! سونا اسکی کی حالت میں کہنے لگی "پر دہرم بھی تو نشٹ ہو جا کر گا، اترا بھی تو پا بن ہو جا لگی....."

"ہلکی کہیں کی....." رتن اسکو ای گرفت میں لیتے ہوئے بولا "میں چکی ہو جا....."

اس نے دینے کو چھوٹا مارا کھجوا دیا تھوڑی دیر تک آواز میں آتی رہی: کیا کرتے ہو باپو..... رہنے دو..... میں بیا چتا ہوں..... میرا آدمی....." اور پھر ایک دلزدہ جھنجھٹ کے بعد مکمل تاریکی اور خاموشی چھا گئی۔

میرے پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے اور اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سنگدل سے کشت و دم کر سکتا لہذا جس طرح ہو سکا میں مہالو بھاگ گوری کے گھر پہنچا، اور اتے جھونپڑی کے دروازے سے آگاہ کیا مجھے میں اس کا خون اونٹنے لگا اور اس نے میرے ساتھ ملدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کہا "ماتنم سر چھوڑ دوں گا سارے کا کیا بھالاس نے؟ کو کسی ایت لمبی کوئی محاک ہو کیا؟"

جب تک ہم وہاں پہنچے، رتن دباں سے بچا چکا تھا اور جھونپڑی کے اندر سے آہ دہکا اور سر سکیوں کی آوازیں اس طرح آ رہی تھیں گویا رات سبکیاں لے لے کر دہری ہو چکا۔

(۱۲)

صبح ہوتے ہوئے گوری شمشیر نے سب سے مزدوروں کو خبر کر دی کہ رجب رتن کو معلوم ہوا تو اس نے بھی تھوڑی دیر میں ساما بند و بست کر لیا کسی کا دھمکی سے اور کسی کا پیسے سے منہ نہ کیا اور دھڑائی دار تھے۔ پولس کو روک دیا کھلا کر اٹا انہیں کو پھنسا دیا۔ میں اسلئے کہ میری ضروری چار آئے سے چھ آئے کر دی گئی اور گوری اسلئے کہ وہ رتن کے ہاتھ نہ لگا، اسی روز سونا کا شوہر جو ایک گرو جواں تھا یہاں آ پہنچا۔ لیکن رتن کے مسکھائے ہوئے آدیں لپٹا نے سونا کو بے نام کر کے اُسے اُس سے بٹن کر دیا۔

خام ہونے کو آئی، چرواہے بھی لگی ہوئی بانسریں کو بجاتے گائے بھینسوں اور بھیر بکرلیں کو بھنکاتے لئے جاتے تھے کہ گوری ایک دفعت کی آڑ میں سے نکل آیا، اور میرے پاس بیٹھ کر ہولے سے کہنے لگا "کیا سوچت ہو؟"

میں نے اسکے اڈا راجرے پر سجدہ کی جھلک دیکھ کر رمان سے جلب دیا "میں کو بوجھنی کو نشتر کر رہا ہوں :  
وہ شاید کچھ سمجھ گیا کیونکہ اسکے ہونٹوں پر حقارت آمیز اور طنز پر مسکراہٹ لگتی : ہوں !!..... اچھا..... ہاں، سونا کا اب کیا ہوگا :





## فضیح الملک

اب اور اگے بیٹھے، امیر کا قلعہ لکھنؤ سے دہلی کا قلعہ دہلی سے، ان دونوں اسکولوں میں جو مخالفت تھی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس مخالفت پر معاشرہ نہ شگ سے نہ ہنس سکا، باوجود اس کے صوفی باصفا امیر، دہلی کی غزل پر غزل کہتے ہیں، قطعاً ملاحظہ ہوا امیر ابھی غزل پر دہلی کی جس کا یہ مصرع ہے

بھویں تیشی میں خنجر ہاتھ میں ہو تکتے بیٹھے ہیں

امیر صاحب، دہلی صاحب سے ”دہلی گھمبیں کے لئے غزل طلب کر رہے ہیں۔“

..... موجودہ گدہ ستوں سے نزع کی صورت اگر کوئی یہ کہ محاسن معنوی میں کوشش کی جائے، اس کا طائر صرف اس بات پر کہ محدودے چند نامور شعرائے خوش فکر خوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے، آپ کی ذات سراپا صفات اس عبقریہ نامور کی انصاف اور رعایت مشاقی سے اب غزل کہہ دیا آپ کے ہائیں ہاتھ کا کہیں ہے، لہذا خواستگار ہوں کہ اپنی طبع انک پر حیر کر کے بالآخر غزل میں دینے کا وعدہ کیجئے، مگر یہ پہلے سے کہہ رکھا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم غزلیوں کو بھی کہنے کی گنجائش دے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے ڈنبا بھر کے قلم توڑ دے جائیں۔“

اچھا اسی سلسلہ میں امیر صاحب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ فرمائیے۔

”میرے پڑنے یا پڑنے کے گلسا حضرت دہلی سلامت

خداوند تو دلایا تو انیما آپ کے امرا کو بڑے اور اس فن کو چمکا

فلک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظریں تو جس قدر ہے اس کو آپ کا

دل بخوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدان کہہ کر انش کا کچھ خیال نہ کریں البتہ

کمال خصوصاً وہ جس سے زمانہ کو مخالفت کر لے رہے ہیں خود ہوا کرتے ہیں۔

مخصوصاً ہونا مرانہ ناز و فخر ہے حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے۔“

ناظم پارک، دہلی الدولہ، فضیح الملک، بیل ہندوستان۔

جہاں استاد، نواب مرزا خان بہادر دہلی کے محل شب چرخ،

راول الدولہ وغیرہ دہلی ان کے استاد بھائی تھے، انہیں کا ناز و دیکھو کہتے ہیں سے

ہم بھی جناب دہلی کے ہم درں ہیں بغیر بیل ہیں وہ طولی ہندوستان پریم

شعرا کی پرست، جو کہ اپنے اپنے کمال استاد کا ذکر کرتے ہیں نہ

کہیں کر مانتے ہیں، جس سے اکتساب فیض پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً بکر کا یہ شعر۔

فیض پہونچا اک جہاں کو ان کی تعقیفات سے

حضرت ناسخ کا کیا کہنا جلالت استاد ہیں

رند لکھنوی

بلکہ حضرت آتش سے کوہِ صحرانہ مگر کہ آپ کا یہ فعل بستاں جتنا

نسیم لکھنوی

میں ہیں اے نسیم شاگرد نسیم دہلی

خجہ کو طرزِ شاعران لکھنؤ سے کیا بھلا

نسیم بھرتوری

دلکش نہ ہوں کیوں نسیم کے شعر

خود دہلی کہتے ہیں سے

بعد استاد دہلی کے کیا کیا

شہرت انہما کلام دہلی ہوا

اس موضوع پر سینکڑوں نہیں ہزاروں شعرا پیش کر سکتے ہیں، لیکن جناب دہلی کو دیکھئے کہ ان کی ہمدی پر ان کے استاد بھائی

فخر کرتے ہیں، اپنے آپ کو طولی ہندوستان کہتے ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں بیل ہندوستان کی ہمدی کا شرف حاصل ہے

دہلی معجزیاں ہے کیا کہنا

سے نئی صاحب کی جامعیت سے یہ بہت مرحوم ہیں لیکن ”تقریباً“ کی حد تک کہی آہ دہلی اور کبھی وہ دہلی کہنا پڑتا ہے ۱۱

تذکرہ ”انتخاب یادگار“ دیکھیے! ہمیں حضرت امیر مینائی جناب  
داع کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:-

داع۔ نواب مرزا خاں خلع نواب شمس الدین خاں معذور  
چوالیس برس کی عمر، صاحب دیوان شیخ محمد ابراہیم دوق کے شاگرد  
میں فرد کا بن خوش مذاق ہونے میں بیکٹائی حاصل۔

”امام الفتن“ حضرت جلیل، حضرت امیر مینائی کے ماں  
شاگرد اور جانشین ہیں، ان خصوصیات کے حامل ہو کر کبھی فرماتے ہیں

داع فراق داع کو مدت ہوئی طویل  
اب بھی زبان پر اہل زبان کی ہے اسے داع

حقیقت بھی یہی ہے

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ، داع کس طرح تجھے مل سے بھلائیں  
جلیل کے بڑے استاد بھائی مولانا رایت خیر آبادی جلیل کے

دیوان کی تاریخ کہہ رہے ہیں بھلا داع کے ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ مگر  
نہیں موقع ہوا نہ ہو۔

داع اپنی جانے جاتا ہے

دیکھیے! حضرت ریاض، داع کو کس طرح یاد کرتے ہیں

داغون کے تھکے لکھ بعد داع کس سے کہوں درد نہان سخن  
کس سے کہوں کون بنالبد داع چارہ گرد نہان سخن

داع مٹے مٹ گئے استاد میر ہے سخن اب مرثیہ خوان سخن  
رہ گئے ”ہم“ گرد پس کا دواں نقش کف دہر دان سخن

نقش کف ابھی نہیں نقش آب خاک سر آب روان سخن  
خوڑ کیجئے! اس ”ہم“ میں کون کون ہیں اور انکی ہستی کیا ہے؟

دیکھا آپے ریاض کا اتفاق داع کے ساتھ!

امیر مینائی کے ایک اور یکمال شاگرد ہیں مولوی احسن اللہ دار  
صاحب ثاقب! انہوں نے مجموعہ مکاتیب شائع کر کے ہم شیعگان اور  
بڑا احسان کیا ہے، اس مجموعے کی ابتدا میں امیر وداع کا موازنہ کرتے ہوئے  
فرماتے ہیں:-

آخر عمر میں اُستاد نے داع کے رنگ کلام اور قبل عالم کو بیکر  
زبان کی صفائی اور تاخیر پیدا کر کے ہیں کوشش کی اور اس  
میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے، تاہم صغیر غاضد عشق  
کی جلوہ آرائی گلزار وداع کی شادابی کو نہیں پہونچی :-

یہ سب کچھ مجاں درست ہے۔ لیکن ابھی موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ  
رحمان اپنا استاد حضرت امیر مینائی کی جانب زیادہ ہے۔ چنانچہ  
فرماتے ہیں:-

مشکوہ الفاظ، مناسبت، بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے  
اشعار میں ایسی ہے کہ جو داع کے کام میں نہیں پائی جاتی۔

و مہنات سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں۔ قصاید بانوکت افز  
کہتے ہیں آخر خود ماہر ماہر، صاحب علم و فضل، داع و ان

اصناف سے معر آہیں :-

علامہ شبلی نے ثاقب صاحب کے ان دلائل تفضیل کو اسی کتاب کے  
”ریلوے“ میں یوں رد کر دیا ہے:-

داع کی مکر زواریاں اور غلطیاں دکھائی ہیں اور اس میں  
اس بات سے مدد ملی ہے کہ داع کا سراپہ علی کچھ نہ تھا۔

لیکن اہل عرب کا خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم دینی جیے  
بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا، ابھی بات کو شعر آ

جامعیت کی برابری شعرانہ اسلام نہیں کہتے۔ فارسی میں

ملے جائے بعض..... ہم وطن بزرگوں نے بعض ماسدوں کے ہکڑے کی وجہ سے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ داع کو ذوال مندی کے ”انگ“ نے مشہور

کیا ہے۔ داع جب یہاں آئے ہیں تو ان کی عمر (۶۰) برس سے بھی تھوڑی ہو گئی تھی، امیر کا تذکرہ نکلنے کے وقت وہ صرف (۴۴) برس کے تھے مگر دیکھیے امیر صاحب نے  
ان کی تعریف کن نعتوں میں کی ہے! دکن آئے سے جیشہ فرخ حضرت داع اپنی شہرت روز افزوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :-

ہندوستان دکن داع ہے شہرت تیری اب تو کچھ اور تراخت رسا کہتا ہے



دارغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں

نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میں تو اس پیشین گوئی کا قائل ہوں اور آپ؟

بندہ پروردگار کیسے خدا کو دیکھ کر

زمانہ ہوا مولانا حالی کی ایک غزلِ خزن کے ایک قدیم چڑ

میں ہم نے دیکھی تھی جس کا مقطع اب بھی ہمارے ضبط ذہن ہے ۔

نغم ابدل و دل کا حالی کلام دارغ

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

مولانا حالی اور مولانا شبلی کے بعد کسی اور دعا کی رائے پیش

کرنے سے فائدہ؟ لیکن قنداریسی بھی تو آخر کوئی چیز ہے؟ اس سے میں

علاوتِ پارہا ہوں تو آپ کیوں محروم رہیں؟

دارغ ۔ نواب مرزا خاں غلط نواب نہیں لودھیان

ہیادور ہرگز یہ ترین علامہ خاقلی ہند شیخ ابوالیم

ذوق و از شیران خاص فراں روائے رامپور میں فم اور

قابانہ آخانی است بہر چند مکافات معوری صورت لبتہ

درس نزدیکی گفتار دل آویز خوش را فرام آوردہ گلزار دارغ

نام دیولے ترتیب دادہ است، بعد طبع کیے زندانمہ گرد اور فرشتا

شوقی کہ در کلام اوست بندہ خاکم کلام در دیکھے را داؤد باشند

وزن طے کہ اور انجیدہ اند فی زمانہ کیسے راتیسر نیست، بیشتر ازین

سنایش گفتار دے پد توان گفت ۔ خیر الکلام باقل دل؟

مغز ناظرین! یہ رے بھی کسی معمولی شخص کی نہیں، نواب صدیق حسن خاں

غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، یہ رائے دہندہ اسی فرد فیکہا فرزند رشید ہے۔

الولہ مر لایہ ۔ دارغ سے متعلق بہار پاس اگرچہ دارغنا ہی ذخیرہ ہوگا جتنا

کہا کیے رد و بدو پیش کیا گیا لیکن خوف طوالت اکو نظر انداز کرتے ہیں ۔

تازہ خواہی داشتن گرداغ بائے سینہ را

گاہے گاہے یاد کن این شاعر دیرینہ را

علی منظور حسین ذآبادی

## حشر جذبات

ناز نہ کر حیات پر عظمت کا رے گذر

راہ طلبِ می عشق کا، ذوقِ قادگی جو حرم

درس لے آقا ہے، اپنے کرم کو عام کر

معجزہ نبات میں یہی بشرطِ طرز زندگی

محرم عشق ہے اگر، یاس کا ذکر ہے حرام

عاجلِ صد بقاء ہے جو اپنی وہ شرابِ معرفت

خبرِ جن و عارضی آپس نہ است مبارک

دامِ تعینات سے، اپنے کو کرکے لبند تو

ثاقب محمد بخیر دی اپنے کو کرکے نہ پست تو

برق و شرارِ خودی بن، برق و شرار سے گذر

باز قلم، کانچوری

خالد

انہیں۔۔۔۔۔ اس کا بازو اڑا کر لیا۔ شاید اُس وقت وہ اپنے  
آپ کو میرے فضل تر مخلوق سمجھ رہا تھا۔

ڈیڑی میں داخل ہو کر وہ سوچنے لگا "اب میں کیا کروں۔"

\_\_\_\_\_ سامنے منہ دیر نہ کر ایک کوا بیٹھا تھا۔ اس نے لاشعوری طور

پہلوئے کی سمت میں جواہر ایک گھنٹہ ماروا ہر شہریت کے کوڑا لگایا اور اپنے آپ سے محبت خوش ہوا اگر یہ ہوائی گھونٹہ بازی کا کھیل متیز اور بیدی کی عدم موجودگی میں چنداں دلچسپ نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اتفاقاً یہی کسی اور

منیر دیاں آجائیں ————— کی نگاہ بھائی جان کے مریے

کی طرف جا پڑی۔ اس نے غور سے دروازے کی طرف دیکھا، ایک پٹ بند

تھا اور دوسرا تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ بھائی جان نہیں ہیں۔ اس نے دل ہی

دل میں اندازہ لگایا معافے یاد آیا کہ بھائی جان کی دراز میں تصویریں

منیر کے مٹکا مار کر آتی نے اپنے بدن میں شگفتگی سی محسوس کی

اُس نے سرسری طور پر زہدہ کی طرف دیکھا جو گلی کے کمر پہ سہی ہوئی کھڑی

نقی۔ ”اُوں سیدی۔ اُوں ہم اندر حل کر کہیں“ اسے اپنا دایاں بازو دکھاتے

ہوئے کہا۔ زبیدہ نے منیر کی طرف دیکھا اور تباہی مانی جیسے

توڑی گولیاں نکال رہا تھا۔ اور سہم کر ایک قدم بھی پیٹ گئی، منہ نہ

اپنی جیسے ایک نئی پوری گولی نکالی اور اسے شعلہ شعلہ کر کے کھکھراتے ہوئے

ہوئے دلوار و مخاطب ہو کر کہا: ”بھری گونی ماتی کو دینگے ہی نہیں۔“

ماتنی نے گنگھیوں سے غلی گولی کی طرف دکھا۔

زینہ دودھ کے منہ کے پاس آگئی۔ اور اس کا بازو دگر کرنے لگی۔ "اؤ ہم گھر گھر

خدا جانے بھائی جان ان تصویریں کو چھپا چھپا کر کیوں دکھیا

کرتے تھے۔۔۔۔۔ بچے بچے منہ والی عورتیں۔ مونی مونی پنڈلیوں

ہائیں آنکھ سے شست باز عکس نقش کہکشاں بازو کا دایا کو آؤ گیا۔ وہ اپنی ہندوق پر نازاں محسوس کرتا تھا۔ مگر اسکے دل میں کوئی گہر رہا تھا "بھائی جان کی دراز میں"۔ پھر ڈوڑے بڑے بوری گوئے اسکے سامنے اٹھتے ہوئے جو بھائی جان کی میریز کا بندوں پر بڑے رہتے تھے۔ اسے "میریز کی نئی گولی یاد آگئی۔" اور اسکے پونٹوں پر ایک حقارت بھری سرسبز لٹ لٹائی۔

وہ دروازے سے بھائی جان کے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ بھائی جان کی کرسی خالی پڑی تھی۔ ان کی کتاب زمین پر گر چکی ہوئی تھی میریز وہ ڈونوں بوری گوئے پڑے تھے اور تصویروں والی دراز بھری سی باہر نکلی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ دروازہ اور دونوں گوئے اسے اندر بھیج رہے ہوں۔ اسکے دھیس کوئی کہہ رہا تھا۔ "بس صرف ایک دفعہ اس پھول والے گوئے کو تھیل پر رکھ دو" اور دراز میں سب اُپر جو تصویر ہو گئی اسے دیکھ کر وہاں لوٹ آؤنگا۔ وہ بڑے پاؤں دراز کی طرف جا رہا تھا اس کے پاؤں اس وقت اسے زبردستی سے جا رہے تھے۔

دفعہ کر کے کے دائیں کوسے اس نے کپڑوں کی سرسبز سٹی۔ ڈنبر گیا۔ مڑا۔ سامنے بھائی جان میز کی طرف مٹھ کے کھڑے تھے۔ ان کے بازو میں ایک رنگدار کپڑوں کا گٹھا سا تھا جو اوپر سے زمین تک پہنچتا تھا، اور جھکا ایک سر سے لیکر چٹی تک یہ بھی۔ بھائی جان ان کے چوٹی والے سر پر جھکے ہوئے تھے۔ بھائی جان کا سر جھکا۔ اور وہ کپڑوں کی ستون اور بھائی جان آپس میں غلط طع ہو گئے۔ ماتی وہاں کو بھاگ جانا چاہتا۔ مگر اس کی ناگس گویا پتھر ہی نہیں۔ وہ بھول گیا کہ وہ بھائی جان کے کمرے میں ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ بھائی جان گال پر ملتا ہے اس تو دگھٹے تک گال میں سرسبز سٹی ہے۔ وہ حیران تھا کہ بھائی جان اس کپڑوں کے گٹھے سے کیا کر رہے تھے۔ اور پھر اس کپڑوں کے گٹھے کی چوٹی

پھر اس نے بھائی جان کی آواز سنی۔ "عالم۔" بھائی جان اس کپڑوں کے ستون سے باتیں کر رہے تھے!!!۔ پریشانی میں اس کا ہاتھ میریز سے جا لگایا۔ دونوں شکلوں میں ایک فوری جنبش ہوئی ماتی نے ڈر کے مارے انہیں جھکائیں۔ کچھ خاموش آواز میں سنائی دیں۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

"یہ رومال تو تم بھول ہی گئیں۔" بھائی جان کی آواز آئی، اس نے ڈر سے ہوئے آنکھ اٹھائی، سامنے بھائی جان کھڑے تھے۔ بائیں طرف ان کی ٹاڑم ٹوپی میٹھے کپڑے بازو پر تھی۔ "ہاں اور دھوپ کو ٹالکر کر دینا کہ یہ کار مجھے ختم تک تیار کر لے سمجھی؟" بھائی جان کی آواز میں جھجک سی تھی۔

ہاتھ جھکی ہوئی ٹھاکہ اس سے کار لے لیا۔ اور مرد میریز آواز میں کہنے لگی "بہت اچھا۔"

ماتی نے بھائی جان کیوں مشغول دیکھا تو اسے نامعلوم سا احساس کہ اسے وہاں سے مرکب جانا چاہیے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسے وہاں کیوں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ وہ حالات کی بات تھے، اور وہ خشکوں کا گڑبڑ ہونا کیا تھا۔ البتہ وہ یہ جانتا تھا کہ جب بھی باؤ بھائی جان کے کمرے میں آتی تو بھائی جان یک لخت ماتی میں دلچسپی لینا بند کر دیتے۔ کندھے سے اتار دیتے یا باتیں کرنا بند کر دیتے۔ اور پکا لگی سے کہتے "اچھا ماتی اب تم باہر جا کر کھیلو مجھے اب پڑھنا ہے۔" اور ماتی کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی لہر اٹھتی۔ اس وقت باؤ فچی آنکھوں سے کپڑے سے میریز پر اس سے درمی جھلانا شروع کر دیتی مگر ماتی کو اس معلوم ہوتا جیسے وہ گنگھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں میں آنکھوں میں مسکرا رہی ہو۔ اس وقت اسکے گال ٹرنے سے نظرتے اور وہ ہلٹے ہلٹے مٹھنے لگتی اور "جی چھا گئے ہونے" اس کی آواز میں طبع سا آ جانا حالاکہ اندازاً اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز سمجھتی سنائی دیتی، اس کی آنکھیں جھکی اور اس کا منہ زرد سا رہتا جیسے وہ دنیائے ہیزا رہی ہو۔



ساتے کنویں پر لیک عورت پانی بھری تھی۔ اس کا دوپٹہ بار بار سر سے سرک جاتا، اور وہ بار بار اسے سنوارتی اور مٹو کر شریف کی طرف دیکھتی۔ اُسکی کالی کالی آنکھیں کنویں میں آ کر شریف پر مسکراتیں، ادھر شریف مسکرا مسکرا کر اوجھوم جھوم کر کارہاتھا۔ مائی کو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں، بغیر بولنے کے بول رہی تھیں۔ پھر اُس نے دیکھا کہ اس عورت نے پانی کا گھڑا اٹھایا۔ اس نے شریف کی طرف دیکھا، اُس کی گردن نے خم سا کھایا، اور وہ جھل پڑی۔ اور شریف بھی اُنھ کو یہی طرف چل دیا، جیسے وہ چلتے چلتے جاگتی ہو۔

مائی کے دل میں خیالات کا ایک چپتہ بھنبھار ہوتا تھا، جیسے بڑے کیوں کیسے کس نے کیا اُنکے ذہن میں آوارہ تھے۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، باتیں کرتی ہوئی بھوس، پیار سے گھورتی ہوئی پشیمانی، بال، ظالم۔ تمام اُس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

وہ پریشان سا پھر رہا تھا۔

اُپا کے کمرے میں اسے آئینہ رکھا دیکھ کر کے دل میں اپنی آنکھ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، اُس آنکھ کے سامنے کھڑے ہو کر بال بال بنایا کرتی تھیں، اس نے کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ جب بھائی حمید امان کو سلام کرنے آتے تو آپا کبھی نہ کسی بہانے ایک دفعہ میز کے قریب جا کر اپنا منہ آئینے میں دیکھ آ کر تھیں۔

آئینہ میں مڑے سے مڑو والا اور کجھڑے ہوئے بالوں والا ایک لڑکا نظر آ رہا تھا، جسکی آنکھوں میں زرد زرد سے میل کے ہوا اور کچھ نہ تھا۔ منہ پر یہاں دال کچھ دھتے سے پڑے تھے اس نے جھٹ منہ موڑ لیا۔ سامنے وہ اتنی لمبی چھری پڑی تھی، گراس وقت وہ چھری بھی اُسے لٹکیں زد سے لگی، اور وہ بے بسی اور پریشانی سے باہر نکل آیا۔

باورچی خانے میں آتاں بیٹھی کھانا کر رہی تھیں، اور آقاؤ بیٹھی آٹو چھیل رہی تھی۔ "کیسی چُپ چاپ سی بیٹھی ہے" اُس نے آقاؤ کو دیکھ کر دل میں سوچا۔ مسرت اسکی آنکھیں بھی خالی خالی اور اندک

دکھاؤں؟ "آدابہر۔ وہاں بیدی کے پاس میں نے بہت سے پرکے ہیں، بہت سے"۔ اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

مذہب مرغی کا پر کاٹ رہا تھا، بیدی کا دل بڑک رہا تھا، شوق سے پاؤں سے اور وہ منیر کے اوپر چبکی ہوئی تھی۔ اُنکے بیدی کو یوں ہیر پر چُکے جوئے دیکھا تو کلیفٹ اُسے اس کاٹنے والے چاقو میں کچھ نہ چسپ نہ رہی وہ لا پر والی سے اُنھ تھیا۔ اُس نے ہاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی تو نظر نہ آیا، پھر فوراً اُسے سوچی۔ "ہمارے بھائی جان کے پاس ایک اتنی لمبی چھری ہے" اُس نے اپنا بازو اُکھا کر کہا۔ اتنی لمبی۔ مگر شاید اُس نفع سے جتنے جالگے چاقو میں، اُس اتنی لمبی چھری سے جو ابھی تک محض ایک قصہ تھی زیادہ کشش نہ تھی۔ اسکی یہ بات بیدی کو نہر سے توڑ نہ سکی۔ شاید اسے کہ مائی کی اتنی لمبی چھری کے وجود سے وہ منکر تھے۔ اس کا وہاں ٹھہرنا بھی اسکی بے عزتی تھی۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ سامنے دروازے میں ان کا نوکر شریف بیٹھا تھا، اسے اپنی قمیص اُٹا کر بیٹھ پر ڈال رکھی تھی، اسکے سینے پر لمبے لمبے کالے بال دیکھ کر اتنی اپنی اتنی لمبی چھری بھول گیا۔ ایسے ہی بال بھائی جان کی تصویر پر تھے، جنہیں وہ دراز میں چھپا کر رکھتے تھے۔ اُس کا ہاتھ چھری چوری اپنی قمیص کے اندر گھس گیا۔ وہاں ایک بال بھی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسکے بدن پر بھی بال ہوتے۔ اور وہ اپنے آپ کو شریف کے مقابلے میں سخت حقیر سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بدن بھی شریف کی طرح موٹا موٹا اور مہلا مہلا ہو، اور اس پر بہت سے کالے کالے بال ہوں۔ اُس نے سنسنی شریف کا گارہا تھا۔ دھیمے دھیمے۔

"ظالم لوکی شیریں۔"

"ظالم!" اُس نے دل میں دُہرایا۔ بھائی جان اُس کی پڑوں ستوں سے بھید ہی کہہ رہے تھے۔ خدا جانے ظالم کون تھا۔ کیا تھا۔ معنا اُس نے دیکھا کہ شریف کی آنکھیں بھی وہی بھائی جان والی چمک تھی۔ اسکی آنکھیں شریف کی نگاہوں کی سمت تھیں۔



جا پونچا۔

اس نے دیکھا آپا کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ آپا اس تصویر کو سینے سے لگا کر چھری تھی۔

”اؤ“ اس نے ڈرنے کی غرض سے جھلا کر کہا اور ہنس پڑا۔ آپا پہلے تو گھبرائی، مگر دیکھا اور پھر اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی ”تم ہوتی۔“

شیطان۔ اور آپا نے جھٹ وہ تصویر منسل سے نکال کر صندوق میں لپک کر قفل لگا دیا، آپا کو تصور رکھتے ہوئے دیکھ کر بتائی کہ ”آپا بھائی جان

کے پاس بھی بہت سی تصویریں ہیں، میز کی دراز میں بڑی ہیں۔ اور آپا“ اس نے منہ بنا کر کہا ”ان تصویروں کے بھتہ بھتہ سے جسم اور

پلے پلے بال ہیں۔ میں تم کو دکھانا دنگا۔“

”چپ“ آپا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ایسی بات نہیں کیا کرتے۔“

”نہیں آپا، سچ۔ اتنے پلے پلے بال۔ اور آپا پلے پلے منہ والی عورتیں۔ موتی موتی ناٹھیں اور اتنی بڑی۔“

”چپ گدھا کہیں کا“ آپا نے کہا ”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔“

انہوں نے سن لیا تو بپ ہانپا ”اور آپا باہر چل گئی۔“

”کیسی باتیں؟“ وہ سوچنے لگا ”کیوں نہ کر درں۔ بھائی صاحب کے پاس تصویریں تھیں۔ اس نے خود کو دھونڈی تھیں، اور بھائی جان

خود انہیں روز دیکھا کرتے تھے۔ آپا کیوں اسے منع کرتی تھی؟ یہ کیا جھگڑا ہو

یہ لوگ کیسے ہیں؟ وہ سخت پریشان ہو رہا تھا

رات کو آدھری سُن کر اس کی آنکھ کھل گئی، کمرے میں ایک دم دم

سالمیب روشن تھا، اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس نے سنا ابکہ ہے

طرف دھنی ہوئی تھیں، ”آنکھیں بھی کیا اڈنے بڑے دلی چہرہ ہیں۔“ اس

سوچا کبھی کچھ کہی، کچھ، خدا جانے کیوں لوگوں کی آنکھوں میں کبھی چمک جاتی

تھی، اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ اس دنیا میں کوئی چیز بھی یقینی نہیں۔ اس وقت

آپا کا منہ بھی کچھ ہلکا ہوا تھا۔ خدا جانے کیا کہید ہے؟ ”ایسے سوچوں

خیالات اُس کے دل کی تہیں گھوم رہے تھے۔“

اسکی نگاہ جھٹک کر سامنے صحن میں جا پڑی۔ دیاں اسکی مرغی

چمک رہی تھی۔ اس مرغی کو وہ چیز ہی کہا کرتا تھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ کچھ ہیں

کافر فاقہ جڑی، کوئی کر باڑ۔ ”یک تخت مرغا جڑی“

سے لڑ پڑا اور اس نے دودھ کر چڑی کے سر میں چوڑی لمدی۔

پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں گڈمگڈ ہو گئے۔ خدا جانے مرغی کیا

ہوتی۔ وہ حیران تھا کہ یہ چیزیں کس طرح ایک دوسرے میں الجھ جاتی

ہیں۔ کس لئے؟

”اماں وہ دیکھو“ اس نے صحن کی طرف اشارہ کر کے کہا

”یہ مرغا خواہ خواہ میری چڑی سے لڑتا ہے۔ میں اسے مار دنگا۔ میرا

پاس باقوا بھی ہے۔ منیر کے پاس۔“

اماں نے باہر دیکھا اور پھر ایک لمبی سی مسکراہٹ روک کر باہر

غصے سے کہنے لگی۔

”چپ رہ۔ نالائق۔ ایسی گندی باتیں نہیں کرنی چاہئیں“

جا باہر جا کر کھیل، کمرے سے نکلے ہوئے اس نے دیکھا باتو کی آنکھیں

مسکرا رہی تھیں۔

”خدا جانے باہر لڑکوں سے کیسی گندی گندی باتیں سکھ آناؤ“

ماں کہہ رہی تھی گندی باتیں اُس نے سوچا گندی کہیں کوئی گندی

باتیں۔ اور وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا، باہر جا کر اُس نے اپنی دستی بندوق

سے دو ایک کوٹے اُڑائے۔ دو ایک اُڑتے ہوئے پوچھنے کے، اور حُر کے

دو ایک پر لڑنے۔ پھر وہ اُٹ سا گیا اور یونہی گھومتا ہوا آپا کے کمرے میں

جا نکلا۔ آپا صندوق کے سامنے دروازے کی طرف بیٹھنے لگی تھی۔

”چلا آپا کو چل کر دُرائیں“ اُسے سر بھی اور وہ دپے پاؤں آپا کے پیچھے

غلط ملط ہو گئیں۔

میں ماں کا ہاتھ اسکی طرف آیا اور اُسے پھٹکنے لگا۔

ساقی سوچ رہا تھا کیا دنیا کے ہر شخص کو ظلم کہا جاتا ہے

اور بھائی جان بھی ظلم کہہ رہے تھے۔ شریف بھی ظلم لگا رہا تھا۔ اور اب  
دیاں رات کے وقت بھی اسکے قریب ہی کوئی ظلم تھا۔ دیکھنے کے لئے  
اُس نے کروٹ بدلی۔ فوراً وہ آواز میں خاموش ہو گئیں۔

ایک ہاتھ اونچا ہوا، ٹیمپ کی طرف بڑا سُر میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔  
مائی ڈر گیا۔

”اماں اماں۔“ وہ بیخ مار اُٹھ بیٹھا۔

”چُپ کیسا شہر چڑیا ہے۔“

”اُمی جان اندھیرا ہے۔“ مائی نے سبوتے ہوئے کہا۔

”سوچا گیا ٹیمپ میں تیل ختم ہو گیا۔“ سارا دن دنگا فساد و

کیل کو دوسرے کٹ جاتا۔ رات کو بھی تھے آرام نہیں۔ رات کو تو سوئے دیا کر

”سوئے دیا کر“ اس نے سوچا کیا وہ سچ کہہ رہے تھے۔ سونا تو

اسے کہتے ہیں جب کہ کوئی بالکل سوجانے۔ ذرا بات نہ کرے۔ وہ چیراں سا

تھا۔ غلام۔ غلط ملط۔ اندھیرا

اگلے روز آتی زبیدہ سے کہہ رہا تھا۔

”بیدی آؤ کوٹھے پر چل کر کھلیں۔“ وہ کوٹھے پر چلے گئے۔  
”یہ کیا کھیل ہے۔“

”چُپ“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”میں ہوں آیا اور

تم۔۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔۔۔۔۔ نہیں۔ اس کیل میں ٹیمپ

بھی چلیے۔۔۔۔۔ اچھا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم ہو یا تو۔۔۔۔۔

اور میں ہوں بھائی جان۔۔۔۔۔ مینے کو بالکل نہ بتانا۔۔۔۔۔

ہیں۔۔۔۔۔ چُپ۔ اس نے چادر طرف مڑ کر دیکھا، سامنے دروازہ

کھلا تھا۔۔۔۔۔ ٹمپور۔ میں دروازہ بند کر آؤں۔۔۔۔۔ اُس نے

دبی آواز سے کہا۔ دروازہ بند کر کے وہ اسی طرح مڑ پر انگلی کے دیے پاؤں

دائیں آیا۔۔۔۔۔ ”بانو اُس نے دبی آواز میں کہا۔“ تمہیں اتار دوں۔

”اچھا۔۔۔۔۔ بیدی نے شوق اور حیرانی سے کہا۔

اور وہ انتہائے شوق اور تحیر سے بُت بنی کھڑی تھی۔

مستشرقین

## ہکر دل عزیز مصنفین کی کتابیں

مہدی، حسن کی شوخیوں اور عشق کی گرمیوں کا ایک لگداز وہاں نواز افسانہ بڑا سا نثر ۳۰ صفحہ خوبصورت جلد قیمت تین روپے

گناہ کی رانیں۔ مسات عورتوں نے اپنے گہر عصمت کو کس طرح کھوایا۔ وہ کیوں اس پر مجبور ہو گئیں، عورت کی بے بسی دیکھنے۔ قیمت چھ روپے

ناظمی کی اپ بیتی۔ ایک فاضل کی عبت اخیر آپ بیتی عشق کی دلخوش داستان جس کی دردناک کہانی، خوبصورت جلد قیمت ۸ روپے

طلسم سماہری، پنجاب کے مشہور جٹ حضرت ایم ایف کی تازہ ترین تعریف جس میں حیرت انگیز پیرے میں ہوشربا دیوتا درج میں قیمت پندرہ

نغمہ حیات۔ رنگین البیض مضامین کا قابل قدر مجموعہ ادب لطیف کے دلکش شہ پارے، جذبات و تاثرات کی مصوری قیمت چھ روپے

لیلیٰ کے خطوط اور روزنامہ چھ۔۔۔۔۔ داستان کی ایک نئی شہرہ جلد ۱۰۰ صفحہ زیادہ، ایک ہی تصویر کے دوروں، قیمت ہر دو حصے۔ تیس روپے

عجیب۔ عجیب کلبے عجیب مجریں کے عجیب حالات، پھر کتنی ہوئی آپ بیتیاں۔ قیمت صرف ایک روپیہ

الوان تصور۔ لبل ہندوستانی نائیلو کے گھن گئیں کا دلکش ترجمہ مشرقی تمدن کی خوبصورت تصویر۔ قیمت دو روپے

لئے کا پتہ۔۔۔۔۔ ساقی بک ڈپو، کھارہانی باؤلی دھڑلی

# حوا کی بیٹی!

اک طوائف بڑی کوٹھے پر کھڑی ہے بے حجاب  
عارضوں پر غارہ گلگوں، لبوں پر سرخ رنگ  
آسمان کی حور، اندر کے اکھائے گئی پری  
راہ چلتوں کی نظر پڑتی ہے لمحہ سائی ہوئی  
ریشمی ساری کا پھل سرے ڈھلکاؤ ہوئے  
بے حجابی کے تفتانے ہیں نگاہ ناز میں

شام کا دلکش سماں ہے ڈھل چکا، آفتاب  
اک بہار نشہ ہوا، اک نگار شوخ و شنگ  
مغفل زہرہ کا ایک آئینہ مجاد و گری  
حسن اور تازہ جوانی جوش پر آئی ہوئی  
سینہ و بازو پہ زلف ناز لہرائے ہوئے  
زمرے میں عشرتوں کے فقری آواز میں

بیچتی ہے حسن کی رنگینیاں بازار میں  
ظلمتوں میں غرق کر ڈلے ہزاروں ماہتاب  
تو نے کانٹوں کے عوض گل کی نزاکت چ دی  
تو نے دنیا کے لئے جنت کو سستا کر دیا

اے کہ عشرت کی بہاریں ہیں ترے گلزار میں  
کوڑیوں کے مول دی توتے جوانی کی نثر اب  
عارضوں کا رنگ ہونٹوں کی حلاوتیج دی  
اپنی رنگینی سے ہر آغوش تو نے بھیر دیا

آج اے حوا کی بیٹی جنس بازاری ہے تو  
تھر تھرتاتا ہے گنہ آلود ردحوں کا اثر  
جامہ انسانیت پر بدنما دھبہ ہے تو  
جو ترے سارے رنگینی میں مذہب کا ہوا  
عشق کی مغفل میں روشن کیں ہوس کی مشعلیں  
تو گرا ڈالے گی تہذیب و تمدن کے ستوں  
دستِ دولت آفریں اک روز ہو جائیگا شل

ایک دنیا کے لئے اذن ہوس کاری ہے تو  
رات بھر ترے شبستاں کے درود و لوار پر  
زندگی کے اک بھیانک خواب کا نقشا ہو تو  
تو نے مٹی میں ملا دی ملتوں کی آبر و  
تو نے دالیں بادۂ اُلفت کی تو نے چھالیں  
تیرا فرش کامرانی ہے بساطِ کشتِ مِخوں  
تیرے ہاتھوں سے مٹے گا بازوئے محنت کا بل

سینکڑوں شعلے ہیں تیرے عشرتوں کے لگ میں  
تو مثاڈالے گی ایک دن دہرے نیکی کا نام  
تو جلاڈالے گی دُنیا کو سنہری آگ میں  
لے رہی ہے آج تو دُنیا سے شاید انتقام

بھوک اور افلاس سے جب زندگی تھی تجھ پر تنگ  
عزت و محنت کا دشمن خود غرض سرمایہ دار  
جس نے چوسا تیری رگ رگ سے جوانی کا لہو  
جس نے ڈالے اس گنہ کی راہ پر تیرے قدم  
مُدّتوں تک بھوک کی ماری رہی جو آمتا  
بیٹ کی خاطر اگر تو بچستی، جسم آج  
تیری عزت کو نگل بیٹھایا یہ دولت کا نہنگ  
کھیلتا ہے جو برابر نوعِ انساں کا شکار  
چاک کر دی جس عزت کی قبائے آبرو  
تیری عصمت پاشیوں پر وقف ہے جس کا کرم  
کر دیا "دولت" نے اسکی آبرو کا خاتمہ  
کون ہے نفرت سے تجھ کو دیکھنے والا سماج!

کون سی محفلِ زوالیسی جس کی توسا قی نہیں؟  
سامنے دُنیا کے تلف کرتے ہیں تیرے نام پر  
راستہ میں دن کو لے سکتے نہیں تیرا سلام  
تیرے کوچے سے جنہیں ہو کر گدزنا ہے گناہ  
محفلوں میں تجھ سے کر سکتے نہیں جو گفتگو  
ان میں لیکن جراتِ اخلاق بھی باقی نہیں  
خلوتوں میں جو ترے قدموں پہ رکھتی ہیں سر  
رات کو جو تیرے ہاتھوں سے چڑھا جاتے ہیں جام  
گرم انکی سانس سے رتی ہے تیری خواہ گاہ  
تیرے آئین میں بندھی ہو انکی جھوٹی آبرو

اٹھ! اگر ایسی زندگی بے کار ہے تیرے لئے  
جس سے رہ جائے تیرے ملکِ وطن کی آبرو  
جان تک اپنے خریداروں سے لے سکتی ہو تو  
عیش گویا عیش کا آزار ہے تیرے لئے  
اپنی قیمت ایک ایسی شرط کر سکتی ہے تو  
اپنی قیمتِ عرش کے تاروں سے لے سکتی ہو تو

زندگی میں حشر ڈھا سکتا ہے یہ تیرا شباب  
منتظر ہے تیری نظروں کا سماجی انقلاب

# ڈاکٹر مساریک

۱۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کے روزناموں میں برقی اخبار کے ضمن میں ایک خبر شائع ہوئی۔

”ڈاکٹر ٹی مساریک سابق صدر ریچکوسلووکیا نے ۸ سال کی عمر میں وفات پائی“

بہت کم ہندوستانی ہونگے جنہوں نے اس خبر کو کسی توجہ سے پڑھا ہو یا یہ نام بھی ان کو یاد رہا ہو۔ ایسے ایسے صدر، وزیر اعظم، ممبر پارلیمنٹ دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں روزمرہ کرتے ہیں۔ غیر نمائندہ کے لوگ ان پر کہاں تک توجہ صرف کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ مگر ڈاکٹر مساریک ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کی زندگی پر ایک غلط اندازہ لگایا گیا ہو اور ڈاکٹر کیجیہ کہنے بغیر گزر جانا نرسہ۔ اس کی زندگی ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک شمع ہایت ہے۔ حضور راہ ہے، سبق آموز ہے، فکر عمیل ہے، اس لئے ہم مختصر اس کے سوانح حیات مفکر و دانشور اور حوصلہ مند و لوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ٹاس گارگ مساریک پانچ مئی ۱۸۷۷ء میں ریچکوسلووکیا میں جواس وقت آسٹریا کا علاقہ تھا ایک کچان کے گھر پیدا ہوا۔ بچپن میں اس کی تعلیم مغرب باپ نے ہی سہ لیا معلوم نہیں مگر ماں ہمیشہ اُس کی ہمت افزائی کرتی رہی۔ ہوش سنبھالتے ہی تحصیل علم میں اس کا غیر معمولی انہماک دیکھا گیا۔ اپنے وطن کے صدر مقام براون میں جہاں وہ تعلیم پڑھا تھا ایک پولیس افسر کے بیٹے کا شاغی معلم مقرر ہوا اور اس کے خاندان کے ساتھ ویتا جا رہا۔ وہاں اس پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ وہ لوہار کا کام کرتا تھا۔ تاہم میں سمجھتی یا سمجھتا تھا اور دل میں عظمت و عزیمت کی بلن منزل۔ اپنی تعلیم سے کبھی غافل نہ رہا۔ پھر ملکی اقتصاد کی اور خودی و ستارہ صرف مال اس کا حوصلہ بڑھتی تھی۔ خانگی طور پر اپنی علمی ترقی حاصل کر لی کہ وہ کسی ضابطہ کے امتحان کے بغیر وائٹائیویریٹ میں داخل کر لیا گیا۔ اپنی قلیل کمائی سے فیس بھی ادا کرتا رہا۔ وائٹا میں فلسفہ میں امتیاز کے ساتھ ماسٹر میں گریجویشن ہوا، پھر لیٹرک جینی میں مزید مکمل کی اور وائٹائیویریٹ میں لکچرار ہو گیا۔ ماسٹر میں پیراگپ (موجودہ زکوسلووکیا کا پارتھنت) میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔

پیشہ تعلیم کے ساتھ ادبیات، صحافت، سیاست اس کا شغل تھا۔ اپنے ملک اور باہر کے جرمانہ میں وہ مضامین لکھتا رہتا تھا۔ پھر اپنا ایک مخصوص جریہ اختیار بھی جاری کیا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ اپنی نیک زبان کی انسٹیٹیوٹ پڈیا کا مدیر مقرر ہوا۔ اس نے سیاسی انجمنیں بھی بنائیں تواریس، دوسری جماعتوں میں مدغم نہیں۔ ان کا مقصد مقامی سیاست کا الٹ سمجھنا تھا جو عام و کجی کا باعث نہیں اس لئے ہم نے نظارہ انداز کرتے ہیں۔ ماسٹر میں وہ وائٹائیویریٹ ریخت میں اور ۱۹۱۷ء میں ڈاپٹ پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی کا نمائندہ منتخب ہوا مگر ۱۹۱۹ء میں ایک دوسری برسرِ اقتدار جان نیک پارٹی سے اختلاف کی بنا پر استعفیٰ ہو گیا۔

پروفیسر اور مصنف کی حیثیت سے وہ ہمدردی، قورع انسان، مساوات کا مبلغ رہا۔ آسٹریا کی سیاسی بالسی پر وہ ہمیشہ سخت چینی کرتا رہا۔ ایک طرف جینی کے آسٹریا کا علاقہ غصب کرنے کے خلاف آواز اٹھاتی تو دوسری طرف آسٹریا کے بلقان پر دست نرازی اور روسینا کے الحاق پر صدائے مخالفت بلند کی۔ آسٹریا کی بعض اندرونی سازشوں اور خیماتوں کا راز طشت از باہر کیا۔ ۱۹۲۷ء میں مساریک بحیثیت پروفیسر، فلسفی، مذہب، مصنف ایسی شہرت و عزت کا مالک ہو چکا تھا کہ ایک دو لکھ امریکی خاتون

چارلٹ گارگ سے اُس کی شادی ہوئی۔ اور بیوی کے نام گارگ کو اُس نے اپنے نام کا جزو بنالیا۔ اُس کی بیوی معنی میں اُس کی شریک زندگی تھی۔ یہ صرف گھر میں نہیں بلکہ میاں کے تمام سیاسی جدوجہد و کمٹہ سکھ، رنج و راحت میں جان سے دوڑا۔ ابتداً سارک کے حوصلے کی پرواز مطلقاً اُس استاد سے اوجھ نہ تھی۔ مگر فلسفیانہ ذہن نے اُسے سیاست کے کانٹوں میں الجھاتے بغیر نہ چھوڑا۔ وہ اگر پروفسر کی پرزور تعانت گرویت تو ایک مصنف کی حیثیت سے بھی کوئی معمولی نہ رہتا تھا۔ مگر اُس کے ضمیر کی تڑپ، صداقت کے جوش، ایمان کے تقاضے نے اُسے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ذلت و افلاس کی کشمکش سے ٹھکرا اُس نے عزت و آرام کے بستر پر دم بھر خواب شیریں کا لطف اٹھا لیا۔ جازنہ رکھا۔ جب وطن اور محبت بنی نوع انسان کی آگ میں تڑپتا اور کانٹوں میں الجھتا رہا اور اُس کی بیوی ۱۹۳۱ء تک یعنی مرے دم تک گھر اور اولاد کی ذمہ داریوں کے باوجود اُس کی آگ اور کانٹوں میں اُنکی شریک اور مددگار رہی۔

سارک کی زندگی کا ایک نیا پر عظمت باب جنگ عظیم سے شروع ہوا۔ اُس کے سیاسی عقائد و اعمال کے جرم میں آسٹریا کی فوجی حکومت نے اس کے خلاف غذائی ادب، سوئی کا الزام عائد کیا۔ ۱۹۱۷ء میں اُسے اٹلی میں پناہ گزین ہونا پڑا اور وہاں سے سویزرلینڈ، فرانس اور انگلستان میں ہر جگہ وہ اپنی قوم کی سیاسی آزادی کا پرچار اور ان تکف جہد و جدوجہد کرتا رہا۔ اس عرصے میں وہ ونگس کا کالج لندن میں دو برس پروفسر بھی رہا۔ وہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ماہر تھا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ روس اور وہاں سے امریکہ چلا گیا۔ جہاں آسٹریا کے زوال پر اس نے نیک نیشنل کونسل کی تصدیق و توثیق حاصل کر لی۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں جب وہ نیویارک کی ایک مجلس ضیافت میں احباب و اعیان کے ساتھ شریک طعام تھا اُسے اپنے وطن سے ایک تار ملا کہ وہ نیکو سلوویچا کے نئے جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ اس نے کسی پہچان کے اظہار کے بغیر اُسے خاموشی سے جیب میں رکھ لیا اور حاضرین میں سے کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جب اس جدید ریاست کی بنا چڑی، اس کا صدر امریکہ میں گونٹ پیس میں، فوجی سائیر میں اور قوم و وطن میں شعلہ دشمنوں میں گھری ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں سات برس کے لئے دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ پھر ۱۹۲۰ء میں اس عہدے کی مزید توسیع کی گئی۔ یہ نیک نیشنل کونسل کے نظام آئینی کے خلاف تھا مگر اُس کی خاطر آئین کو ٹوٹا دیا گیا۔ نیک اور سلوویچ دو مختلف اقوام کو لاکھ ایک آزاد متحدہ ریاست قائم کرنے اور اس کی کامل آزادی کو دولی یورپ منولے کے لئے اُسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۰ء میں وہ پھر یورپ کے دورے پر نکل گیا۔ اور انتہائی جدوجہد کے بعد دولی ایتلاف ٹولڈ سے معاہدہ پبسرگ پر دستخط کرائے۔ اس کی رو سے نیک اور سلوویچ اقوام کا اتحاد اور ایتلاف کی رکینت منوکر نیکو سلوویچا کو ایک آزاد ریاست تسلیم کرالیا۔ اور دولی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ضعف پیری کے عذر سے وھدارتک مستعفی ہو گیا۔ اس کی ہشتاد سالہ سالگرہ کی تقریب میں پارلیمنٹ نے اُسے لئے اتنی ہزار پونڈ کا عطیہ منظور کیا مگر اس نے یہ رقم سرطان کے مریضوں کے لئے ریڈیم کی خرید اور مفت علاج کیلئے وقف کر دی۔

سارک کے چار بچے تھے۔ ایک بیٹا نقاش ہوا اور ۱۹۱۷ء میں فوت ہوا۔ دوسرا بی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ہوا۔ پارلیمنٹ کا ممبر تھا، نیک اور ڈوگراس ریلیگ، احمد، کا صدر جنگ عظیم میں قومی قدرتی کے جرم میں تہ تیغ خانہ میں رہا۔ تیسرا امریکہ میں ایک ممتاز قسطنطنیہ تھا اور اکل لندن میں نیکو سلوویچ سفیر جو بھی ایک بیٹا ہے جو جنگ عظیم میں باپ کی مددگار اور نگران حال رہا۔

مگر ان تمام داروں میں سب سے زیادہ لائق فخر اُسے دور دھانی وارث ہیں۔ قومی آزادی اور ملی تصانیف جن کی تعداد تقریباً چالیس ضخیم جلدوں تک پہنچی ہے اور قریب قریب سب کا موضوع فلسفہ تحریر ہے۔

## بہتی کی مچھلی والیاں

بہتی کی مچھلی والیاں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان کی تمام عورتوں سے مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر تندرستی اور تازگی کا نام سن ہے تو میں ان پر سے گفتگو کی نزاکت، گجرات کا تناسب، اور پنجاب کا رنگ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پشاور کی عورتیں ڈبل ڈول میں ان سے بہت لے جائیں گی لیکن اپنے پیروں میں وہ تیز رفتاری پیدا نہیں کر سکتیں جو ان کا طرہ امتیاز ہے۔ میں اس کو برقی رفتار کی کہتا ہوں کیونکہ وہ چلتی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سر پر مچھلیوں کی ٹکریوں کا ایک بڑا بوجھ رکھ کر، اور توجہ ہے کہ وہ اس دوڑ میں اپنے وزن کا توازن اور اپنی رفتار کا تناسب اس طرح قائم کرتی ہیں کہ جیسے مچھلیاں ان کے سر کا ایک حصہ ہیں اور بقیہ کی سڑک ان کے قدموں کا۔ بس سندھ کی مچھلیوں نے ان کا روپ دیکر اپنے مسکن کو تبدیل کر لیا ہے۔ ان کے راستے میں ٹرام، موٹر، وکٹوریہ اور آدمیوں کی بیکٹر کی طرح حال نہیں ہوتی۔ ان کے درمیان سے یہ اس طرح بچی بچتی ہوئی نکل جاتی ہیں جیسے چمکادیں رستوں اور تار کے جال میں۔

ان کا سفر اس خوبصورتی والے کا سنا نہیں ہوتا جو دروازہ دروازہ گھر تا گھر چلتا ہے بلکہ مسلسل ہوتا ہے۔ گلاب سے چرچ گیت تک یا کوئٹہ روڈ کی لمبی سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یا چرچ گیت امرن لائیں اور چنی روڈ تک یا اسپینڈ میدان، کانک روڈ اور کرافورڈ مارکیٹ تک یہ عورتیں مچھلیوں کو جھولا جھلاتی ہوئی چلتی ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کسی کے جوم میں اس طرح کھو جاتی ہیں کہ ہم ان کا پتہ نہیں لگاتے، لیکن ان سب میں ایک ہی بات مشترک ہوتی ہے اور وہ ان کی بھاگ دوڑ ہے۔ وہ تو دم لینے کے لئے بھی نہیں ٹہرتیں بس وقت کی طرح آتی ہیں اور نگہ رجاتی ہیں۔ ان کی یہ کیفیت جب کہ وہ ہوش سنبھالتی ہیں اور جب تک کہ ہوش سنبھالنے کے قابل نہ رہیں اسی طرح رہتی ہے۔ گویا ان کی زندگی ایک مسلسل مصروفیت اور ایک مقدس فرض ہے۔

انہوں نے مچھلیوں سے سڑپ سیکھی ہے اور سندھ سے لے کر ستھار لیا ہے۔ سانولے رنگ اور نرم جلد نے ان کے چہروں کو جاذب نظر بنا دیا ہے۔ جس وقت ان کے سروں پر ٹوکریاں نہیں ہوتیں تو اس وقت سیاہ بالوں کا موٹا اور گول جڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اونچے سروں پر سندھ کا جھنڈا اٹھائے پھر رہی ہیں۔ وہ ایک ساڑھی باندھتی ہیں جو اکثر سفید اور بے داغ ہوتی ہے مچھلیوں تک ان کے پیر بالکل بیہوش رہتے ہیں اور وہ ساڑھی ان کے جسم پر اس طرح کسی ہوتی رہتی ہے کہ ہندوستان کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ البتہ راپور کا رنگ پانچامہ اس کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساڑھی خود انہوں نے نہیں باندھی ہے بلکہ قدرت نے پیدائش سے قبل باندھ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ جم بڑھ گیا ہے اور کپڑا انہیں بڑھا یہاں تک کہ اب وہ اس قید و بند سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ شاید ان کی یہ تیز رفتاری اسی کشش کا نتیجہ تو نہیں۔ وہ ساری کے ایک پلو کو کہے گرد پھینک کر شانہ پر ڈال لیتی ہیں۔ جسم کے بالائی حصہ پر ایک جھٹ شلو کہ ہوتا جو جسکی آستین کہنیوں تک ہوتی ہے۔ کانوں میں سونے کے مندرے لگنے میں سونے کی بدمی اور چہرے پر اطمینان اور فراعہ البالی ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کی دوسری مظلوم عورتوں کی طرح یہ مردوں کے رواجی ظلم و ستم کا شکار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اقتصادی طور سے بالکل آزاد ہیں اور ان میں سے ہر ایک کیلئے تقریباً دس روپے روزانہ پیدا کر لے ناکوئی بات نہیں۔

ان کے پیشے نے ان کو جفاکش، نڈر اور دلیر بنا دیا ہے۔ ان کی قوم جسے اس طرف کوئی حکمت ہے مغربی ساحل پر اپنی جفاکشی کی آپ مثال ہے۔ ان کے آباء و اجداد قرونِ وسطیٰ میں تجارتی جہازوں کے لئے ایک مستقل خطہ تھے، گویا سمندر پر انہیں کی حکومت تھی۔ ان عورتوں کی دلیری سے یہ سب ثابت ڈرتا ہوں۔ کیونکہ ٹرام اور برقی گاڑیوں پر چڑھتے وقت یہ پہلے آپ اور بعد کو میں کے اصول پر عمل نہیں کرتیں۔ یہ اپنی کہنیوں سے دھکا دیتی ہوئی اپنی جگہ آپ پیدا کر لیتی ہیں۔ اکثر اوقات اس جنرپ میں بہت سے مہذب آدمی گرتے گرتے بچ جاتے ہیں اور جو بچے ان کے منہ آتے ہیں تو ان کی زبان و رازری سے منہ کی کھاتے ہیں۔ یہ نشستوں کے لئے سمجھیک بھی نہیں، ناچکتیں خصوصیت سے ٹرام کے اندر رزق برقی بازی خاتونوں کے لئے یہ ایک بلائے ناگہانی ہوتی ہیں۔ عورتوں کی مخصوص نشستوں پر بلا تعلق بیٹھ کر اپنی ہمیشیں مہذب خاتون کی ایسی ضیافت کرتی ہیں کہ وہ عجیب سی محسوس کرتی ہے کہ ایک جل ہری نے اس کو اپنے آغوش میں دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود سے قبل ہی اپنی ناک کو مضبوطی سے پکڑ کر چھچھلیوں کے اس بہنو میں سے نکل جاتی ہے اور پوری نشست تو وزانی حساب کم و بیش رائے ہوتی ان کے سپرد کر دیتی ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ پھیلی والیاں ساحل پر پھیلیاں پکڑنے والوں کی بیویاں یا بیٹیاں ہیں۔ اصل یہ انہیں ہے۔ صبح یا شام کو اگر آپ ٹہکتے ہوئے سیون ڈاک پہنچ جائیں تو آپ کو سمت در کی طرف سے شکاری کشتیاں آتی ہوئی نظر آئیں گی۔ جب یہ کتا سے پرگ جاتی ہیں تو ان میں سے کوئی مرد جو کمر تک لنگوٹی کے سولنے بالکل برہنہ ہوتے ہیں چھیلیوں کے انبار لیکر نکلتے ہیں اور دوسری طرف سے سہائی پھیلی والیاں اپنی خالی ٹوکریاں لیکر ان کے استقبال کو بڑھتی ہیں۔ اسی وقت نیلام ہوتا ہے اور اس طرح مرد پھیلیاں فروخت کرتے ہیں اور عورتیں ان کو خریدتی ہیں۔ یہ سودا کر کے اور دام چکائے میں بڑی مشاق ہوتی ہیں۔ پھیلیاں ایک ہاتھ سے دیتی ہیں اور دام دوسرے ہاتھ سے اس کے بندہ وہ اپنی ٹوکریوں کو آباد کر کے اپنے روزانہ کے دورے میں مشغول ہوتی ہیں۔ دراصل اس وقت یہ سوال نہیں ہوتا کہ کس کی پھیلیاں لذت میں بلکہ کس کا بدن زیادہ چست اور چمک رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بچوں کی طرح بھینکی کی باو یہ پلائی کرتی ہیں۔

برسات کے زمانہ میں پھیلی پکڑنے والوں کا کام منہ پڑ جاتا ہے اور ان کا تمام وقت جال کی مرمت کرنے، شراب پینے اور خاندانی جھگڑوں کو از سر نو تازہ کر کے میں گذر جاتا ہے۔ پھیلی والیاں بھی شرک پر کم نظر آتی ہیں۔ اسی زمانے میں یہ اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر بیٹیاں بچو بچو ہوتی نظر آتی ہیں۔

آخر میں میں آپ سے عرض کر دوں کہ میں ہندوستان کی مہذب عورتوں کے زرد چہرے، مہتراض جسم، اور رست رفتاری سے عاجز آ گیا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ تمام ہندوستان سمٹ بیٹا کر ایک لمبا ساحل ہو جائے جہاں تمام آبادی پھیلی والیاں ہی کی ہوا اور انہیں کے چھڑٹ میں ہم اور آپ نور کے ٹکڑے پھیلیاں پکڑنے جا رہے ہوں۔

چند چہچہا سید ابوطاہر

جس میں مرزا ظہیر بیگ چغتائی کے کم و بیش بیس بیس نہایت پاکیزہ مضامین شامل ہیں مزاحیہ افانوں اور ڈراموں کے علاوہ چغتائی نمبر اس میں بیس بہا کتابیں شش ماہی اور سوانہ کی ارد میں بھی شامل ہیں۔ تقریباً دو سو صفحے کا نہایت قیمتی مجموعہ مضامین پر قیمت ایک روپیہ (طراح محصول ڈاک)

صفحہ کاپیت۔ سنائی بک کلو۔ دہلی ۱۰



## نئی روشنی کا اندھیر

مولوی حیدر علی ترمذی اپنے وقت کے بڑے جید عالم تھے اور عالم بھی با عمل، نہایت متشرع عوام و خواص دونوں طبقوں میں احترام تھا۔ دور و دور تک تقدس کی دھوم تھی۔ انگریزی حکومت نے ان کی شہرت اور اثر سے ہر چند کام لینا چاہا۔ تو از شت شاہی کامیوں سے لدا ہوا سبز باغ دکھایا۔ یہاں تک کہ گھر بیٹے بن مانگے شہر اسلام کا خطاب بھی عنایت کر دیا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھول کر کبھی کسی حاکم یا انگریز سے مصافحہ کرنا گوارا نہ کیا۔ ہمیشہ اپنی کلی میں محکم رہے۔ جب احباب جاہ پسند نے زیادہ اصرار کیا اور گورنمنٹ میں رسوخ کے دینی فوائد دکھائے چاہے تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ بھی فقیر گوشہ نشین کو سرکار و دربار سے مطلب؛ اپنے مولا سے دو جہاں کی غلامی سے مجھے کہاں فرصت کہ دنیا کے کتوں کا سلامی بہوں۔

لیکن بایں ہمہ شان بزرگی اپنے گھر میں کوئی ان کا اثر قبول نہ کرتا تھا۔ وہاں ان کے فتوے چلتے تھے نہ سخت گیریاں۔ وینداری کے نام سے نفرت تھی۔ خدا اور رسول کا ذکر آجاتا تو بعض رسمی طور پر۔ روزہ نماز کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ حج کی آیت اور زکوٰۃ کا خیال تو دور کی باتیں ہیں۔ یعنی زندگی کے چاروں اسلامی گوشے ٹول ڈالنے کہیں ایمان کی پوری جھلک نہ تھی۔ بلکہ دنیا اور آج کل کی ازدحام سے لیسے پڑے دنیا کا سماں نظر آتا تھا۔ بیگم صاحبہ رنگین مزار، آرا و خیال۔ صاحبہ زوہ ولی کے گھر بیوت اور صاحبہ زادی کا تو پوچھنا ہی کیا نئی روشنی کا برقی لیمپ۔ تین دم اور تینوں مولوی صاحب کے مشرب کے خلاف مذہب کی توہین کرنے والے۔

خدا کی شان ہے کہ حیدر علی جیسا متقی، شہید کا پابند اور خدا پرست مولوی اور اس کے سایہ میں ایسے شیطانی اعمال پرورش پائیں۔ باہر قال اللہ اور قال الرسول ہو اور اندر ہارنوم بچیں اور عشقہ غولیں اڑیں۔ وہاں تزکیہ نفس کی تعلیم دی جائے اور یہاں نفس پرستی سے مُہلت نہ ہو۔ مردانہ حدیث و فقہ کی کتابیں کھلی ہوئی ہوں اور زمانہ نکلنے میں جدید تعلیم اور دور و حاضرہ کی معاشرت کا چرچا ہو۔ بات یہ تھی کہ مولانا کی بیگم صاحبہ کے والد خواجہ نسیم نے جو کشمیری نژاد نہایت بھر بیان واعظ تھے، کسی اتفاق سے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور ایک بیوہ پویشین خاتون کو گھر میں ڈالنے کے بعد ان کی معاشرت تقریباً انگریزی ہو گئی تھی۔ اسی مذہبی تبدیلی کی بدولت ان کے حقیقی بھائی خواجہ نسیم آج ڈپٹی کلرک کی منفرد عہدہ پر پہنچے مگر مشرک نام کہلاتے تھے۔ وہ جس قدر بھی اس جدید طرز زندگی کے دلدادہ ہوئے کم نہ تھا۔ باپ کے جیتے جی بیگم صاحبہ کو سوتیلی ماں سے سبق ملے پھر بھائی کے ہاں جب جاتیں اُن کے لکچر سنیں۔ لڑکی بھی عموماً ساتھ ہوتی۔ مولویت کی روکھی پھینکی زندگی کا رنگ کس طرح جتنا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بیگم صاحبہ تو جاہل تھیں صرف خوش غلام ہو کر رہ گئیں۔ بیٹے صاحب روٹیوں سے بے فکر تھے مری جھیتوں میں اُلجھ گئے۔ صاحبہ زادی ماموں زاد بہنوں کو دیکھ کر اڑیں۔ کہیں اسکول میں جانے کا شوق ہو۔ مولوی صاحب نے سنا تو بہت بگڑے۔ دنوں خفا رہے۔ گھر میں آتا پھوٹا دیا۔ لیکن لڑکی برابر اسکول جاتی رہی۔ اسکول کے بعد کالج کی نوبت آئی۔ اب انشاء اللہ یہ جوان ہو چکی تھی۔ اچھی خوراک، اچھی پوشاک، بصورت شکل میں پری، اللہ پنے کے دن۔ جاہ جاند کرے ہوئے لگے۔ ایک دن مولانا کے کسی شاگرد نے بھی بے نقاب دیکھ لیا۔ اور مذہبی سادگی سے مولانا کو بھی اطلاع دیدی۔ مولانا کے قصہ کا ٹکڑا نہ نہیں رہا۔ گھر میں جا کر جانا نہ بچھا، دو ہنڈیا سے، بھالایا اور جب سخت نرمی کسی بات کا اثر نہ دیکھا تو زندگی بھر گھر میں نہ جانے کا عہد کر کے خاموش باہر

چلے گئے۔

مولوی صاحب گھر میں آئیں یا نہ آئیں نہ ماں کو پروا تھی نہ بیٹی کو۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے غرض تھی تو اس کو اپنے فیشن سے اسلئے کہ آمدنی کے ذرائع بدستور موجود تھے۔ گھر کے خرچ کی رقم برابر مل رہی تھی۔ مولانا نے گھر میں گئے کا عہد کیا تھا نہ بگڑنے کے اسباب کو بند کرنے کا۔ کھانے پہننے میں فرق آتا عیش و راحت میں تنگی ہوتی تو شاید اپنے چال چلن کی برائیوں پر نگاہ جاتی۔ اب تو یہ شل ہو گئی تم روٹھے ہم چھوٹے۔ تمہارا بہت خوف تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور علی الاعلان مغرب پرستیاں ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں ادھر تو مولانا کی دختر بلند اختر خیرا بگم نے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری شروع کی ادھر خوش قسمتی سے مولانا کو ہجرت کا موقع مل گیا اور وہ جس قدر جلد ہوسکا مدیہ منورہ تشریف لے گئے۔ بال بچوں کے رہنے کیلئے اپنا مکان تو پہلے ہی سے تھا۔ تین چار ہزار کاروبار بھی ہو گا۔ چلتے دقت دو ہزار روپے نقد بھی حوالے کئے اور کھلا بیچا کہ ”تم لوگوں نے خدا اور رسول کے احکام سے انحراف کیا، میرے حقوق نہیں سمجھے تمہارا اس کا خیار ہے دیویر بھگتانا پٹے کا لیکن مجھ پر جو تہا ہے خنہیں میں انہیں بھول کر اللہ و نبی کا گنہگار نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے اطمینان رکھو کہ زندگی بھر تمہاری روٹی کپڑے سے غافل نہیں رہو بھگے“

مولوی صاحب کے اس سفر لیفاۃ اور ٹھیکٹ اسلامی سلوک سے بھی ان نا عاقبت اندیشوں کو کوئی عبرت حاصل نہ ہوئی۔ باپ کی جدائی سے نہ بیٹی کا ایک آنسو ٹھکانہ خداوند کی مغفرت سے بیوی کے دل کو ٹھنسی گئی۔ بلکہ چہرہ پر ایک قسم کی بشاشت اور اطمینان سا معلوم ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کے جاتے ہی سارا گھر آزاد ہو گیا۔ پردے کی جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ بھی اٹھ گئی۔ دن رات سیریں نہیں۔ تماشے تھے۔ آج یہاں جلسہ ہے تو کل وہاں پارٹی ہے۔ دونوں ماں بیٹیاں کبھی ساتھ اور کبھی الگ اپنی اپنی ہسلیوں اور بھوپوں میں مغربی سیلا میں بھی پھی پھرتی تھیں۔ مولوی زادہ نے تو حد ہی کر دی تھی مصلوں کی جگہ جوئے کے پائے پھینکتے تھے۔ گھر کی اس آوارگی سے تسکین نہ ہوئی تو پاؤں باہر نکالے اور آخر ایک ن کی طوائف کے ساتھ ایسے گئے کہ عمر بھر بھرنے پڑے۔

دیں بی مولوں اور مولوی زادہ تو انہوں نے یورپ میں لیڈیوں کی تقلید کے شوق میں اپنی وضع قطع، طور طریق سب بدل لیا تھا۔ ماں کو ہم ادب سیٹھ کو س بننے کی ایسی دمن سوار تھی کہ آنکھ، ناک، کان کے سائے کاٹھا اٹھا دے تھے۔ قاعدے کی بات ہے کہ رسمیات کے مقلد اپنے اماموں کی پیروی کرنے میں عوام بہک جایا کرتے ہیں چنانچہ یہ دونوں ماں بیٹیاں بھی بہک گئیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے کو بھول گئیں ساتھ ہی اپنی قومیت، اپنے ملکی رسم و رواج اور اپنی معاشرت کو کھٹا دیا۔ قریبا بگم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی چشم ماروشن دل، ماشاء، ہیست، اچھا کیا۔ ہماری آئندہ نسلیں اگر زندہ رہ سکتی ہیں تو ان ماں بیٹوں کو تعلیم دے کر۔ باس کیلئے بھی اگر مولوی حیدر علی کی بیوی اور بیٹی ہونے سے قطع نظر کر لی جائے ہم انہیں چند ماں قابل ملامت نہیں سمجھتے۔ پُرانی قسم کا ہندوستانی بے اصول تو خیر نہیں ہاں بے دھندلہ پردہ بھی اٹھا دینا کا فر نہیں بنا دیتا۔ لیکن جم کے ساتھ ساتھ خیالات کی عواینوں کو کیا کہنے گا کھلے سر، برہنہ شانے، چہرہ بے نقاب، محض اپنی نمائش کیلئے بارانوں اور نفع کے مقامات میں پھر نکالیا معنی رکھتا ہے۔

قریباً بی۔ اے کی ڈگری کیالی، مغرب کی تقلید کا ٹھیکہ لے لیا۔ بات حیت، چال و چال، رنگ و ڈھنگ، ایک ایک اداس یورپ کی شاگردی کا حق ادا کرتی تھی۔ موجودہ تمدن اور تہذیب جو سانپ کے منہ چھو نہ رہن کر رہ گیا ہے اور آج وہ خود اس سے عاجز آچکے ہیں، بی تریا کے لئے ایک نعمت تھا۔ وہ اپنے کیر کٹر میں ہر بات پیدا کرتا چاہتی تھی جو اس دور تہذیب کی خصوصیت ہے۔ قریباً کے

اب جوانی کے دن تھے۔ مرادیں ایک تاروں بھری رات کی منتظر تھیں۔ کئی مہینے سے مختلف خیال نوجوانوں کی درخواستیں بھیجی تھیں شروع ہو گئی تھیں۔ بالمو اچھے بیام سلام ہونے لگے تھے۔ اودھ اور پھر ایک معتد علم پرورد خاندان کی پہلی مسلم خاتون تھی جس نے اعزاز کے ساتھ بی۔ بی پاس کیا تھا۔ اس لئے صرف چند اچھے گھر لائے اسے اندر جذب کرنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے ہاں نئی روشنی پیدا ہو۔ ورنہ عموماً نوجوان یا تو اس کی حسن و جوانی کے خواستگار تھے یا انہیں شریا بیگم مغرب پرستی سے اپنا کوئی مفاد مد نظر تھا لیکن ان خواستگاروں میں ایک دو ایسے بھی ہوں جن کا مقصد حقیقی ازدواجی مسرت ہو۔

مرد تو خیر اس مسئلے میں خاص طور پر بدنام ہیں۔ نئی تعلیم اور نئے طرز معاشرت نے ان کی ذہنیت گندی سے گندی ہی لیکن صنفِ نازک پر یہ بھوت کیوں سوار ہو گیا۔ یہ نقاب اُلٹتے ہی اس قدر راز و خیال کس لئے ہو گئیں کہ اپنی ضمنی خصوصیات سے بھی ہاتھ اٹھالیں۔ اگر عورت کی دماغ مبارک ہستی ہے جس کی گود میں قومیں پختی، بڑھتی اور ترکتی کرتی ہیں تو اس کو ماں بننا چاہیے نہ کہ ڈاکٹر بننا۔ صنف کے محاذ سے تو عورت تھی اور تعلیم یافتہ عورت لیکن اندھی آزادی اور پرستاروں کی کثرت نے اس کے تصورات کو وہاں پہنچا دیا تھا جہاں احساسات بالکل کند ہو جاتے ہیں اور ایک عورت اپنے درجے سے بہت نیچے کر جاتی ہے۔ شریا کی رائے تھی کہ ازدواجی تعلق وہاں پیدا کیا جائے جہاں عصمت کی قیمت زیادہ سے زیادہ ملے۔ دماغ ایک ہریں مردانہ اوصاف سے زیادہ جیب کی اہمیت چاہتی تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ شوہر ہی بن سکتا ہے جو بہتر سے بہتر معاشرتی سامان جیسا کہ اسکے خواہ اس میں خاندانی، قومی، علمی مردانہ اخلاقی کوئی خوبی ہو یا نہ ہو۔ اسکے خیال میں یہ سائے امتیاز اضافی اور صرف ایک دولت ہی اصل چیز تھی۔

چوتھہ ماہ بندہ چند ہی ہفتے میں اتفاق سے شریا کو ایک حسن پرست شوقین کسی ریاست کا ریٹائرڈ وزیر مل گیا۔ ریاستوں کے بڑے عہدے دار عموماً مرتے جاتے ہیں۔ پہلے تو یہ سہ

”شوقین زندگی است موتے سفید“

کی موافقت میں چہرے کی سفید رتی روئیدگی کو کالا کرتے رہتے تھے۔ مگر اب جب کہ خطاب آج کی کارواج ہوا ہے بالوں کی کھال تک نکال ڈالتے ہیں۔ بالکل صفا چٹ میدان۔ یہی حال سرانیم سلمانی کا تھا مگر تو بیچن برس سے کم نہ تھی۔ البتہ حرکتیں ساری جوانوں کی سی تھیں۔ انگریزوں اور انگریزی معاشرت کے عاشق تھے۔ تمول اُن کا مانا ہوا تھا ایک معقول پنشن ملی تھی۔ کئی گاؤں اور تقریباً پانچ سات ہزار روپے ماہوار آمدنی کی سکنی جاتا دے، مالک تھے۔ تین لاکھ روپیہ مختلف بجوں میں جمع تھا۔ پچاس ہزار روپے میں اپنی جان بھی ہمیر کر لی تھی۔ حالیشان کو بھی میں جانتے تھے متعدد موٹر میں سواری کو تھیں۔ پھر فیشن کا کاپو چھنا۔ ان کا پیام کیا آیا شریا بیگم کی مراد آئی۔ چٹ مٹھی پٹ بیاہ۔ دو ہفتہ کے اندر رنجاک کی قانونی رعیں پوری ہو گئیں۔ نکاح کیا تھا ایک تماشا تھا۔ ایک سالو لاسا انگریز موٹر میں سوار آیا۔ دو لاکھ دہن آسنے سانے بیٹھ گئے۔ بولے نام قاضی صاحب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے۔ چلو مٹھی ہوئی۔ شریا بیگم مسرسمائی ہو گئیں۔ اور موٹر میں ایک حوریم پہلو سے لنگور یہ جاوہ جا۔

چند روز بڑی موجیں رہیں۔ شریا بیگم کا دماغ لندن اور پیرس کی سیر کرنے لگا۔ تاج محل چوٹی کو شرمیلے والی کوٹھی پہنے کو۔ بہرے خانہ سالن کرنا مذ سے دست بستہ ہر وقت حاضر۔ رنگین اور وائٹ دے کی ڈاکٹمن فیشن کی پیاس بجھانے کیلئے چاروں طرف کھلی ہوئی حکومت میں حکومت۔ اور دولت میں دولت۔ لیکن حقیقت میں ایک عورت کی اصلی تسکین ان چیزوں سے نہیں ہوتی۔ موجودہ تہذیب کے یہ

صرف فریب ہیں۔ دو چار ہفتہ کے بعد تقریباً بیگم کے کچھ خاموشی اور اس کی نظر اٹے لگیں۔ ایک دھلی ہوئی عکس کے دولہا سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی نافرمانی کے جذبہ کا احترام کرتا۔ اور اس کی نوجوانی اس کی مصنعی اعضا دلے پیرنا بالغ سے سیراب ہوتی۔ اب تقریباً بیگم کو محسوس ہوا کہ وہ اس حال میں خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کے حسن و شباب کا باغ مر جھایا جاتا تھا۔ وہ رات بھر بنگلہ کی لپٹی اور سائے دن بچپن رہتی۔ پھولوں کی مسہری بھی ہوتی خواب گاہ میں خیالی عیاشی کی تصویریں بھی منگروہ راحت جو جوانی سے جوانی کو لگے مل کر تھی ہے کہاں نصیب تھی۔ سرسیمائی عیاش مزاج آدمی نہ تھے۔ انہیں صرف نئی شادیوں کرنے کا شوق تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی کسی بیوی کو تخلیف نہیں دی۔ ان کو ہر قسم کی آزادی تھی۔ کوٹھی میں کھائیں کوٹھوں پر کھلیں۔ پھر بھی اگر ان کا پیٹ نہ بھرے تو خوشی سے رخصت کر دیتا میں بھی غدر نہ تھا۔

سرسیمائی نے اپنی بیابانہ بیوی کے بعد جس کے بطن سے سات لڑکے لڑکیاں تھیں، کئی نکاح کئے اور سب تھوٹے تھوٹے دن کے بعد اپنی مرضی سے آزاد ہو گئیں۔ لیکن تقریباً بیگم سے انہیں کچھ ایسی چسپی پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی طبعی دگی کے خیال سے بھی وہ کانپ اٹھتے تھے اور اس نے دن اپنا زیادہ وقت مشہور ڈاکٹر دل، ویدوں اور ملک کے نامور طبیعوں سے مشورہ لینے میں گزارتے تھے۔ تاکہ شریکی بیزاری میں کمی ہو اور یہ وظیفہ زوجیت کے قابل ثابت ہوں۔ اور تو سرسیمائی اپنی فکر میں تھے اور ادھر سرسیمائی اپنی ادھیڑ میں تھیں۔ ایک طرف دولت اور وجاہت تھی تو دوسری جانب جذبات اور جنسی مستریں۔ نہ اس دولت اور اعلیٰ تمدن سے ہاتھ اٹھانے بسنتی تھی نہ اپنی جوانی کا گلا گھوٹنے کو جی چاہتا تھا۔

اسی کشش میں تقریباً بیگم کے دو سال گذر گئے۔ جاہل ہوتی یا خیالات میں قدامت پسندی کا اندھیرا ہوتا تو قصہ کبھی کا تمام تھا۔ ذرا بیاہی کے کام لیتی تو طلاق ہو جاتی۔ شوہر بختی سے کام لیتا تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی یا کچھ کھا کر سو رہتی۔ لیکن تعلیم یافتہ اور خصوصاً یورپی تہذیب کے معتاد ایسی عادت نہیں کر سکتے۔ تقریباً جیسی انگریزی تعلیم کی باطل خاتون ان روایتی چیزوں سے بالاتر تھی۔ اس کا علم نظر کچھ اور تھا۔ اس نے اپنے جذبات کی تسکین کے لئے اسباب بہم پہنچا لیتے۔ سرسیمائی کی کمزوریوں اور غروت کے ذریعے ہر اس بے عزتواری میں مبتلا ہو گئی جو پست سے پست کیہ کیر کی عورتوں میں پائی جاتی ہیں مگر سونے کا جھول چڑھے ہوئے اس طبعی تمدن کو نہ چھوڑا۔ بظاہر سکون تھا۔ دل گناہ یا انفعال سے مضطرب ہوں۔ نگاہوں میں بیاہی کا تادم تھی۔ زبانیں باطل خاموش تھیں۔ انگریزی رواج کے مطابق ملتے رہتے تھے۔ کھاتے تھے پیتے تھے۔ نہ شوہر کو بیوی کے کسی رویہ پر اعتراض کا حق تھا نہ بیوی شوہر سے اپنی زندگی وابستہ تھی۔ میزبان اور مہمان کا سا تعلق تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ جہاں خانے میں ہر قسم کے عیش و آرام ہیں۔

پتاہ کے لئے انسان ہوں یا حیوان محبت اور شفقت نہایت ضروری ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات کا تو انحصار ہی محبت اور شفقت پر ہے۔ لیکن جہاں بجائے مناکحت کے تجارت کی گئی ہو اور محبت کے عوض دولت کو اس تعلق کی بنیاد تصور کیا جائے وہاں اشار اور ہمدردی تو کیا معنی مولیٰ نوعی شرافت بھی جاتی رہتی ہے۔ تقریباً بیگم نے سرسیمائی سے شادی کی تھی مگر اس سے اس کو محبت تھی۔ ان کی دولت سے بیاہ کیا تھا اس نے محبت بھی دولت ہی سے ہونی چاہیے۔ سرسیمائی تو ایک دلال کی حیثیت رکھتے تھے۔ محبت میں مشارکت کبھی کسی کو پسند ہوتی ہے جو تقریباً بیگم پسند کرتیں۔ ان کے زیرِ غور اب یہ مسئلہ تھا کہ سرسیمائی کسے پان میں اور میں لاؤ۔ اگر یہ مر گئے تو کیا ہو گا۔ ایسی کوئی ترکیب نکالنی چاہیے کہ بلا شرکت غیر اس دولت پر قابض ہو جاؤں۔ انشیاں کے کھیل بھی نرے ہیں۔ باوجود دہزار ضبط تو لپس سرسیمائی کو قتل رہ گیا۔

کچھ خوشی تھی کچھ رنج سرسلیانی سے کیا کہتیں۔ دونوں اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف۔ مگر یہ ٹھپٹے والی چیز بھی۔ تھی۔ تین چار مہینے بعد خود بخود کھلی اور تریا بیگم کو بے حیا بنکر شوہر کے کانوں تک یہ خوشخبری پہنچائی پڑی۔

سرسلیانی پرانے ربا سنی خزانے تھے سنگ مرمر کے اور خوشی کا اظہار کر کے ایام محل کی احتیاطوں کا دیر تک ذکر کرتے رہے۔ کوئی ایسی بات نہیں جس سے ناخوشگوار معلوم ہوتی بلکہ اپنے دفتر کے کمرے میں جا کر کہلا بھیجا کہ اگر اس غیر مترقبہ خوشی کے سلسلہ میں تم اپنی دوستوں کو کوئی پارٹی دینا چاہو تو تاریخ دن مقرر کر دو۔ بہتر سے بہتر انتظام ہو سکتا ہے۔ لیکن دل میں انتہائی غصہ اور طال تھلا کر فرمایا کہ نسبت جتنی افواہیں تھیں سچ ہو گئیں۔ انہیں یہ ہرگز بھی امید نہ تھی کہ ایک مولوی کی بیٹی، تعلیم یافتہ اتنی بے خبرت ہو جائے گی۔ دنیا کو کیا کہتی۔ جس کے گھر میں ہوا سی کی اولاد۔ انہیں ذہنی تخلف یہ پہونچ رہی تھی کہ حرام کی کمانی میرے ہاں پنے گی میرے نام سے پنے گی۔ میں بھاؤا دیکھو بھلا۔ اور مجھے اپنے کئے کی لاج میں کہنا پڑے گا کہ ہاں میری اولاد ہے۔ پھر ترکہ میں میری اصلی اولاد کے برابر حقدار سمجھا جائیگا۔

ان خیالات نے سرسلیانی کے مزاج میں ایک انتشار سا پیدا کر دیا اور جب تک وہ اس نتیجے پر نہیں پہونچ لے کہ غضب محل دیکھنے لگا تو کھانے لگا دینا ہی آئندہ کے تمام توہمات کو دور کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے راز دار ڈاکٹر سے صلاح لی اور ایک سخت ترین زہر کافی سے زیادہ مقدار میں لاکر اپنے سیٹ میں محفوظ کر لیا تاکہ جس وقت چاہیں کام میں لاسکیں۔ یہ زہر بے بو۔ بے رنگ اور بے ذائقہ بالکل شفاف پانی کی طرح ایک بطری سفید شیشی میں بکھرا ہوا تھا۔ یہ دولت بھی کیا عذاب ہے اور اس عذاب کو دور حاضر کے معیار معاشرت نے تو لغت ہی بنا دیا۔ سرسلیانی جیسا جھٹکین مجبور ہے کہ ایک ناقابل معافی گنا، اپنے سر پر ہے اور صرف اس لئے کہ اس کی دولت میں چوری نہ ہو۔ ساتھ ہی لٹی کی سلیانی اپنے واؤں سے غافل نہ تھیں۔ اور جس دن سے ان پر یہ راز سر بہت کھل گیا تھا کہ سرسلیانی آج سے بہت پہلے اپنی تمام املاک اپنی اولاد کے نام پر کر چکے ہیں ان کی صنعتی چالاکی کا ناجائز سے ناجائز تہ بہرے کیلئے تیار تھی۔

ثریا بیگم بظاہر یہ سمجھتی تھیں کہ سرسلیانی کا سوسلے دوچار معمولی پویوں کے کوئی نہیں ہے اور وہ بھی سب بے اولاد ہیں۔ یہ نتیجہ کچھ تو ان کی جلد بازی کا تھا اور زبان اس مخالط میں انہیں سرسلیانی کی انگریزی معاشرت نے ڈالا تھا۔ دواڑے کے یورپ میں تھے۔ تین کی تعلیم دہرہ دوں میں ہو رہی تھی۔ ان کی ابا اپنی خالہ کے پاس رہتی تھیں جنہوں نے گلگتہ میں ایک گر لور سکول کھول رکھا تھا۔ بڑے میں ایک مترقبہ یہ خود جانتے تھے اور بچوں سے مل آتے تھے۔ اتفاق کی بات بینک کے ایک خط سے ثریا بیگم کو یہ حالات معلوم ہو گئے اور اس معلومات نے اس کو چراغ پا کر دیا۔ وائٹوں سے بنی بوٹیاں کاٹنے لگی۔ منگر کیا کرتی۔ ساری چالاکی ہوشیاری اور روشن خیالی دھڑکی دھڑکی رہ گئی۔ سرسلیانی کی پیشین گوئی کا پچاس ہزار روپیہ جس میں سے پنشن تو ان کی زندگی تک ان کا مال تھا اور میر کی رقم مرنے کے بعد کی چیز تھی وہ بھی ورثا میں تقسیم ہوتی۔ قرینہ منگر کو کیا ملتا۔ وہی روپے میں چھلدا۔ ہاں اگر ثریا بیگم لاؤ لڈ نہ ہے اور اولاد بھی زیر نہ ہو تو بھگوارے کے بعد کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ اولاد کا انتظام تو قدرت کی طرف سے ہو سکتا تھا ہاں یہ سوال کہ سرسلیانی کے مرنے کا انتظار کوہ کندہ دکاہ برآوردن۔ اس نے سفر فی تقلید کی دلدادہ لڑا کے واسطے ایک ہی راستہ تھا کہ سرسلیانی کی زندگی جلد سے جلد ختم کر دی جائے تاکہ میر کی رقم ہاتھ میں لیکر اپنے بچے کے نام سے جو بیٹ میں ہے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

بہر حال سرسلیانی اور سرسرتلیانی میں ایک قسم کی خوبی کبڈی شروع ہو گئی تھی جس کا پالا دولت کی ڈھیری تھا۔ سرسلیانی اپنی گھات میں تھے اور ثریا بیگم اپنی ناک میں۔ بدبختی سے سرسلیانی کو دکام ہوا اور دکام سے بھار۔ ڈاکٹروں نے مکرہ میں قید کر دیا۔ سین

کھولنے کی ضرورت پڑی۔ سرسبز باغی کو یاد بھی نہ تھا کہ سرسیت میں غریب کے قتل کا سامان بھی ہے۔ قریباً کوئی پالی دیدیں۔ اُس نے جو سرسیت کھولا تو شیشی نظر پڑی جس پر زہر تال، کا سرخ لیل لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر برنارڈ کی چٹھی بھی دیکھی۔ ایک دھک رہ گئی۔ جون توں کر کے شیشی پر قبضہ کر سیت بند کر لیا اور آگئی۔ فحش کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں۔ پل بھر میں مارنے والے کی جان مرنے والے کے ہاتھ میں آگئی۔ ملک الموت کا رخ ایک اشائے میں ادھر سے ادھر مڑ گیا۔

دوسرے دن صبح کو سرسیت لپٹے بستر پر مرے ہوئے ملے اور آج تک پتہ نہ چلا کہ موت کا سبب کیا تھا۔ قریباً نے بیہ کی رستم کیلئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ بچے اور بچے بھی لڑکا پیدا کر کے دکھایا لیکن دوسری املاک میں تو کیا حصہ بٹاتی بیہ کی رقم سے بھی ایک جذبہ نہ ملا اولاد تو اولاد مخرج ہی سر سے ناسا نژ ثابت ہوا۔ البتہ ذات بدنامی اور پزاروں اہتمام ضرور دے دیں ملے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ تہذیب اور ہماری شاد مار معاشرت نے عورتوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ وہ شوہروں کو صرف روپے کیلئے تلاش کرتی ہیں۔ ان کی شادیاں شادیاں نہیں بلکہ ایک تجارت ہے۔ انہیں مردوں کو شوہر بنانے کی ضرورت نہیں۔ ازدواجی رشتہ سے ان کا مقصد سوسائٹی میں بلند جگہ حاصل کرنا اور عشرت پسندانہ زندگی گزارنا ہے۔ اور عشرت پسندانہ زندگی بھی وہ جو سر تاپا جناوٹ ہے جس میں حقیقی مسرت کا نام نہیں۔ اگر ہماری خواتین بھی یورپ زدہ ہو کر، سامانِ آرائش کے لئے، موٹوں کے لئے، اعلیٰ لباس کیلئے اور تفریحات کے شوق میں اپنی صنعتی لطافتوں، اخلاقی لڑائکتوں اور جنسی شرافتوں کو اسی طرح چھٹی رہیں اور ان میں عورت کا صوم کیر کٹر نمایاں نہ ہو سکا تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہماری آئندہ نسلیں ملک کیلئے کیا مفید ہو سکیں گے۔ اور ایک شریف عورت اور بازاری میں کیا فرق رہے گا۔

اشرف مصلوحی دہلوی

## محبت اور نفرت تہذیبِ محبت — نفرتِ نام!

اُردو کے سب سے جہت طراز ادیب

اختر حسین رائے پوری

کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ  
محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کے لئے! نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کیلئے!

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

مطبعہ کاہنہ ساقی بک ڈپو، دہلی

# سرت چنڈ چٹربھی

پر  
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

سرت چٹربھی! کہتے آرو وداں اس نام سے واقف ہیں؟۔ خود بنگال میں بہت سے لوگ اس کی پراسٹیوٹ زندگی کا حال سواتے اس حقیقت کو کچھ نہیں جانتے کہ وہ منکسر المزاج اور بادی النظر میں ایک کم زور انسان ہے جس پر کبھی ایک شہورادور نمازمطقت کا دھوکا نہیں ہوتا مگر ”پردہ راز“ میں اپنے کے باوجود بھی یہ شخص بنگال کا سب سے زیادہ سرولعزیز ناول نگار ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اسے سوانحیات سے قطع نظر کر کے صرف اس کے آرٹ پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی زندگی کے واقعات کا ذکر کرنے سے دیدہ و دانستہ احتراز کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی پر ایک پُر اسرار تادیکی کا پردہ پڑا ہوا ہے جس میں سے ہماری تجسس نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ سرت کی حیا چونکہ اُسے منصفہ شہود پر آنے سے باز رکھتی ہے اس لئے یہاں بھی صرف اُس کے فن سے بحث کی جاتی ہے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف ”چتر تراجن“۔ ”جنہ“ نامی ایک ماہوار رسالہ میں شائع ہوتی تھی۔ اس کے شائع ہوتے ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ناول نگاری کے میدان میں ایک نیا شہسوار اُتر رہا ہے۔ ایک ایسا ناول نویس جو سوسائٹی کے اُن تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہو جن کا ذکر پہلے صرف مخمور اور معیوب خیال کیا جاتا تھا! اس وقت سے اس کے ناول اور مختصر افسانے برابر شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے ”سماجی ناولوں“ کی ”پہنائی“ اور بنگالی ناولوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وسعت نظر لامحدود ہے، اس کی فضا سے تخیل بے پایاں۔ وہ پہلا شخص ہے جو اپنے ناولوں میں ان ”افتادگانِ قسمت“ کا ذکر کرتا ہے جن کو ہماری بے رحم سوسائٹی ”ارذل ترین خلائق“ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ لوگ اس کے قصوں میں صرف تزیین و داستان کے لئے داخل نہیں کئے جاتے۔ دراصل وہ ہی سرت کے ناولوں کی جان ہیں۔ وہ نہایت شفقت اور ہمدردی سے ان کی تصویریں کھینچتا ہے، ان کے خدو خال کو نمایاں کرتا ہے، اور اپنے بھرپور قلم کی مدد سے ان کو حیاتِ جاوداتی بخشتا ہے۔ سوسائٹی کے بلند ترین طبقے سے لیکر اسفل ترین طبقہ تک کے لوگ اس کے پردہ تصویر پر نظر آتے ہیں۔ اس کے کردار اُردو سے زبانِ مستعار اور اصل کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ناول ایک قد آدم آئینہ ہیں جس میں سوسائٹی کا عکس ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

بنگالی ناول میں ”ذیل ازیم“ راہلیت سے مطابقت کا خیال سب سے پہلے سرت ہی نے داخل کیا۔ اس سے پہلے بنگالی ناول زیادہ تر تاریخی ہوتے تھے، سماجی نہیں۔ ان میں تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہوتی تھی اور واقعیت یا راہلیت کا لحاظ بالکل نہیں کیا جاتا تھا۔ سرت نے سوسائٹی

کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں وہ ملکہ حاصل کیا ہے کہ اس کے کمال کو "ادبی فوٹو گرافی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، پھر اس کے طبع اشارات تو گویا سونے پر مہا گہ ہیں۔

مگر اُس کی "اصلیت نگاری" (realism) اُس قسم کی ملکہ وہ "اصلیت نگاری" نہیں جس کو دورِ حاضرہ کے یورپین مصنفین نے اپنا شعار بنا رکھا ہے اور جن کے خیال کے مطابق عقل و دماغ بھی ایک فن ہے۔ نزعِ ستر جیمز جاسکس کی طرح کا فن کار ہے جو "اصلیت نگاری" کا غرض پیش کر کے بیہودہ گوئی کیا کرتا ہے۔ وہ تو زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور جس حالت کا شاہدہ کرتا ہے اس کی تصویر الفاظ میں پیش کر دیتا ہے۔ کہیں کہیں تو اس کا آرٹ سیکھم ٹورکی کی یاد تازہ کر دیتا ہے، فرق صرف اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ ستر کے کردار کیفیتِ شعری سے زیادہ علو اور برجستہ انت ان ہونے کے زیادہ کمال ہوتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا یہ کمال اس کی "خاصیت نگاری" (Characterisation) اور اس فن میں کوئی دوسرا ہنگالی (ہنگاریائی) نہیں کر سکتا۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے کردار درجہِ شہرت پر پہنچتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل نگاری ہی اس متنوع کارما رہے۔ قدرت نے دو انسانی کوشیاں پیدا نہیں کیا۔ اس کے کردار پورے قصوں اور کہانیوں کے ان کٹھ پتلیوں جیسے افراد سے بالکل مختلف ہیں، جن کا وجود صرف قصہ گو یا قصہ نویس کے ذہن ہی میں ہوتا ہے اور جن کا خارجی دنیا میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ قصہ گو یا قصہ نویس کی تخلیقی قوت ان کو اپنے خیال کے مطابق صرف دو صفات — نیکی یا بدی — سے متصف کر دیتی ہے۔ قصہ میں جو شخص ایک باریک بنا کر پیش کر دیا گیا وہ ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے اور بد کبھی اپنی فطرتِ زشت بدل نہیں سکتا۔

ستر نے زندگی اس کے تمدن اور اس کے امکانات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں شادی انت ان ملنا ناممکن ہے یہاں کا قانون ہی "تغیر اور تبدیلی" کے یہاں کوئی چیز بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ زندگی جا بجا نہیں بلکہ متحرک ہے اور ہر لمحہ نئے نئے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ نیک و بد جانچنے کا معیار بھی انفرادی ہے جو ہر شخص اور ہر زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

موت کے کردار جیتے جاتے انت ان ہوتے ہیں۔ گوشت و پوست سے بنے ہوتے انت ان — جن کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہوتا ہے اور جن کے پہلوؤں میں تڑپتے ہوئے دل ہوتے ہیں۔ وہ ان پرانے قصوں اور نادولوں کی "خیالی مخلوق" سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ہم کو اچھی اور اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان سے اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ستر چلتی ہے کہ ان کا نظارہ قریب سے کرتا ہے۔ وہ صرف ان کے ضد حال ہی پیش نہیں کرتا بلکہ ان کے خیالات اور احساسات، ان کی حسرتیں اور ارمان، ان کی امیدیں اور خطرات، ان کی خوبیاں اور خامیاں — سب ہائے سلسلے پیش کر دیتا ہے۔ نیک و بد کی تقسیم ایسے نہیں آتی۔ وہ جانتا ہے کہ نیکی اور بدی کی طاقتیں زندگی کا جزو و لازمی خفگ ہیں اور علیحدہ علیحدہ نہ ہو سکتی ہیں۔ ہر شخص کے اندر نیکی والے اور اچھے ترین دونوں موجود ہوتے

۱۔ Mr. James Joyce نوٹ — ("Ulysses") جیمز جاسکس کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ دماغ انکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر جو جیسے نووہ ایک نہایت غیر دلچسپ کتاب ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اور بیکل ہے مگر یہ کم از کم مناسب ہو گا کہ "اور بیکل زیادہ ہے اور آرٹسٹ کم" — سولے اور بیکل آئی اور کو فٹ" کے اس میں اور کچھ نہیں۔

Maxim Gorki



ہیں، مگر ہر شخص میں ان کی طاقت اور عظمت کا مظاہرہ یکساں طور پر نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے ناول مزاج لطیف اور خوش طبعی کے بہترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس کی شروع شروع کی تصانیف میں یہ خوش طبعی بزرگی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ہیں بے اختیار انا طولی فرائض یا آجاتا ہے۔ وہی آب و تاب موجود ہے، مگر اس تلخی سے معزاجہ پگھلون کی آئینہ انداز میں پائی جاتی ہے۔ پھر عجیب انسانوں کی حقائق اور لغزشوں کا مشاہدہ کرتا ہے، سوسائٹی کی تباہ کن رسمیں اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہیں۔ بے رحم قسمت کی منت نئی جو روح جفا، انسان کے اندر والی متضاد اور باہم برسرِ یکا رفاقتوں کی تم نظریاں اس کی حساس طبیعت پر کبھی نہ منوں والے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ مگر ان سب کا ذکر وہ ایک ہمدردانہ تبسم کے ساتھ کرتا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی اپنے کسی حد تک بے عنوان و درشت باب ہیں، ان سب کا شکار رہ چکا ہے اور ہم کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ہماری کمزوریوں اور لغزشوں پر بخفی کے بجائے اس کے پاس باتو ایک معنی خیز مگر مظلومانہ تبسم ہوتا ہے یا ایک دلی ہوئی آہ جو باوجود کوکوش ضبط کے اس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ مگر اس کا یہ عجیب و غریب تبسم ہر ایک وقت ہمدردی اور تاسف کا مجموعہ ہوتا ہے اس گھٹی کی آواز سے مشابہ ہے جو طوفان سے پہلے بجائی جاتی ہے۔

اس کے ان ناولوں میں جو بعد کو لکھے گئے ہیں وہ بے باک اور بے ساختہ ہنسی مفقود نظر آتی ہے۔ گویا اس پر اپنی خوش مزاجی کا اثر کچھ کچھ باقی رہتا ہے مگر اب اس کا خندہ زیر لب "زہر خند" ہو جاتا ہے۔ اس کی ہنسی "زبردستی کی ہنسی" بن جاتی ہے۔ اس کے بھولے بن کی جگہ اب کسی اور چیز نے لی ہے جو زیادہ کثرت اور تلخ ہے۔ اب اس کی تصویریں اور رقمے اندوگہیں ہونے لگے ہیں۔ اس کے کردار دلی جوش سے گفتگو کرتے ہیں مگر نفاذ میں خجندی کی چھائی رہتی ہے۔ ہر چیز پر اب اندھیرا سا چھانے لگا ہے۔ زندگی بسر ہوتی ہے۔ دن کٹ جاتے ہیں..... مگر کس امید پر؟ کسی امید پر نہیں! وہ خود بھی اپنے ناول "دیو داس" میں اس کا جواب دیتا ہے، جو اس کی عظیم ترین ٹریکریڈی والیہ ہے۔ "چربی" میں کچھ امید کی جھلک نظر آتی ہے، "از کشنیا" کا انجام ہنسی خوشی ہوتا ہے، "گرگڑا دہا" زخاۃ النہیں کا انجام موبہم رہتا ہے۔ یعنی ہم اس کو اپنی مرضی اور خیال کے مطابق جیسا چاہیں سمجھ سکتے ہیں۔ مگر "دیو داس؟" "دیو داس" امید سے سراسر خالی ہے۔ اس میں صرف دل کی خلس ہے اور آنسوؤں کی تلخی!۔

دیو داس جب اپنی "پارو" دہا رہتی ہے، گھر کے سامنے دم توڑتا ہوتا ہے تو اس کے پاس ایک منتفی بھی نہیں ہوتا۔ جب صبح کو پارو کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتی ہے..... یہ زندگی اور اس کا انداز بے پرواہ!۔

ہمیں زندگی کو پھولوں کی بجائے جھنڈا چاہیے۔ گلہاتے رنگ رنگ سے یہ خالی ہے اس میں قدم قدم پر خار زار ہیں۔ پھول۔ اگر زندگی میں پھول ہو سکتے ہیں!۔ ان نباتاتی پھولوں سے بھی زیادہ عارضی ہوتے ہیں جو ہماری دنیا میں پائے

### Penguin Island by Anatole France

تہ اردو داں لہجے پر "نیو ٹیمپلز لٹریچر" دھلکے کی مشہور فلم کمپنی نے "دیو داس" اور "گرگڑا دہا" جیسے بے مثل ناولوں کو فلمی ڈراموں کی شکل میں پیش کیے واقعی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اصرعین شہر سے نہایت پاکیزہ اور عام فہم زبان میں مکالمے لکھے ہیں۔ اور جتنا اور آہل لے دیو داس میں اداکاری کا حق ادا کر دیا جو ضرورت ہے کہ سحر کے اور ناول بھی اسی طرح ملک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ لکھ "گرگڑا دہا" کا نام "نیو ٹیمپلز لٹریچر" نے دیا ہے۔ اس رقیب صفحہ ۱۸

جاتے ہیں۔ ہاں، کانٹے البتہ ہیں جو ہمارے دلوں میں نامور ڈالتے رہتے ہیں۔ قسمت رحم ناکشا ہے اور ہم کمزور اور مجبور ہم غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور حد سے زیادہ توقع رکھنے کے عادی ہیں۔ ....

مگر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پیسے کا کہ سرت چربی میں کوئی ٹھوس فلسفہ ملنا دشوار ہے اور اس کے ناولوں میں کسی ایک فلسفہ کی تلاش بھی حقاقت کے مراد ہے۔ وہ ٹوشیک پیسے کی طرح - عام اور عالمگیر ہے۔ وہ کوئی عقاید نہیں رکھتا۔ اس کے کردار محض کٹ پتلیاں نہیں جن کے ذریعے کسی فلسفہ کا اظہار کیا جاسکے۔ اس کے خیالات اور احساسات جگہ جگہ منتشر ہیں مگر ان کے مجموعے سے کوئی ایک فلسفہ تیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ہر کردار کا نقطہ نظر نرالا ہے اور خود اسی کردار کیلئے مخصوص ہے۔ سرت کے ناولوں میں "ہم خود اسکو کہیں نہیں پاسکتے" کہیں کہیں ہیں دھوکا ہو جاتا ہے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں۔ "یہاں، یہاں ہم نے نہیں پکڑا لیا ہے" مگر نہیں، وہ ہنستا ہے اور ہوا کی طرح ہمارے گردن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ اس روشنی کی طرح جگہ جگہ بھاگا بھاگا پھر کا پھر تپے جو رات کو کسی قبرستان یا دلدل میں نظر آیا کرتی ہے اور جتنا زیادہ اس کا تعاقب کیا جائے تنہی ہی دور ہوتی جاتی ہے ہم بھی سرت کا جگہ جگہ پھیرا کرتے ہیں مگر باوجود اس امر کے کہ وہ ہمیشہ ہمارے سامنے ہی رہتا ہے ہم اس سیلاب و ش مستی کا کچھ حال نہیں جانتے۔

ہاں صحت اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آخری ناولوں میں وہ پہلا فن کا، اپنے شباب کی سوئی اور رنگ کھو بیٹھا ہے۔ خوش طبعی اب بھی کہیں کہیں۔ طویل وقفوں کے بعد۔ جھلک اٹھتی ہے مگر اب اس کی روشنی دیر پا نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے بھی ٹوشیک پیسے کا حریف ہے، جسے اوپر بھی فن کا درجہ حقیقت سے ہی مختلف دور گزار ہے۔

اور ٹوشیک پیسے کی طرح اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار بھی اپنے تنوع اور رنگارنگی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہیں۔ اعلیٰ اور اسفل سب ہی تو موجود ہیں۔ کہیں وہ بے لکری سے گپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، کہیں محبت کا دھچپ مگر خطرناک کھیل کھیلے ہوئے، یا اپنے کسی لصب العین کا تعاقب کرتے ہوئے۔ سب اپنا اپنا غم غلط کرتے ہیں، اپنی اپنی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں، اور اپنے اپنے مخصوص جذبوں کی پرورش کرتے ہیں۔ غرض سرت کی دنیا اتنی ہی دھچپ اور آباد ہے جتنی خود زندگی! اڑتوی کی طرح اس نے بھی اپنے لسانی کردار زیادہ توجہ اور خوبصورتی سے پیش کئے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے یہاں عورتیں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ غلبہ اٹھان ہیں۔ اچھا، ساجترہی، کرن، موئی، پارتی، چندرا کھی۔ یہ سب کی سب آپ اپنی نظیر ہیں۔ ہندوستانی ادب ابھی تک ان سے روشناس نہ تھا اور اب کہ پہلی بار یہ سب باری باری نگاہ کے سامنے بے نقاب ہو کر آئی ہیں تو ان کے کمالات اور روحانی اور جسمانی صفات کے اعتراف میں ہم سوالے "حیرت" کے اور کوئی خراج پیش نہیں کر سکتے! انوس کا مقام ہے کہ اس کی جس تصنیف کو گوگورنٹ نے ضبط کر لیا وہی اس کا شاہکار تھی!

بے سلسلہ خود مشغول ہونے کے آخری محنت کے ایک بولی کی مناسبت سے اس کا نام "منزل" قرار دیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ نہایت بلیغ اشارات (suggestions) کا حامل ہے۔ جتنا بھی جی۔ ای۔ برو۔ اور ہر تھ کی راج۔ .... ان کا کمال آرسٹن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہندوستانی "گودا" اور خود کو تصاویر میں "منزل" ہر اقدار سے درجہ اول کی تھی ہے۔ عوام شاید اس رائے سے احتکام کریں، مگر عوام کی پسند کا کیا تہکا! Thomas Hardy & Shakespeare

اس کے شروع شروع کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں ہیں ایک ایسی دُنیا نظر آتی ہے جو ہماری دُنیا سے مختلف ہے۔ وہاں ہر چیز پر خواب کا سماں چھایا رہتا ہے۔ مثلاً ”چوہی“ جس میں برما کے ایک مصوّر اور اُس کی مشقہ کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی بیہوشی سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک تو وہ ”مصور حقیقت“ ہے نہ کہ ”مصور خیال“۔ مگر اس سے بے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرت دوسری اصنافِ ادب میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ محض خیالی افسانہ پر دازی بے سود ہے۔ اُس کے حقد میں تو زندگی کی عکاسی ہی آئی ہے اور وہ اسی کیلئے موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اپنا طرزِ تحریر بدل دیا اور الفاظ کے پیکر میں جیتے جاگتے افسانوں کو پیش کرتے کیلئے اُس نے وہ اسلوبِ نگارش اختیار کر لیا جس میں ہر لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سرت چندر کی زبان میں ایک حرا میہ خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اس کے سوائے کسی بنگالی مصنف نے کبھی ایسی ہماری دورِ بلخ شہر نہیں لکھی۔ کفایتِ شعاری۔ الفاظ کی کفایتِ شعاری۔ سدا سے اس کا شعار رہا ہے۔ اس کو پڑھ کر سچ (صحیح) کی شریا د آتی ہے، گو شیخ کے معانی بھی موجود ہیں یعنی حد سے زیادہ پر مغزی اور اختصار، ان کی خبر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بعض اوقات معانی سے لاتعلی زیادہ گراں ہوجاتے ہیں کہ اُن کا سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے اور اُس کی پیداوار عبارت اس ”ختمِ کمال“ کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی ”آرائش“ کو دیکھ کر ایک شخص پرست ”انڈیل ہائے دور دراز“ میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ یہ طرزِ انشا نامانوس ہی مگر حد درجہ نشاط انگیز و صمیمی ہوتی ہے۔ تنہم اور شگور کے بعد اگر کوئی اور بنگالی طرزِ بیان کا مالک ہوئے گا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ سرت ہی ہے۔

جو نثر کو نثر کے علاوہ کسی اور جگہ ایک طوفان کا بیان اتنا موثر نہیں ملتا جتنا ”پرترہ امین“ میں!

اس کی زبان میں ایک وقت اور بھی ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایجازِ بیان اس ہے کہ اگر ترجمہ کیا بھی جائے تو اصل کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ وہ ایک لفظ میں ایک خیال اور اکراماتا ہے۔ اس کا ایک جملہ ایک کہ دار کے بیان کیلئے کافی ہوتا ہے۔ ترجمہ میں سرت کی یہ امتیازی شان قائم نہیں رہی جاسکتی۔ اگر کوئی ”دل والا“ اس کے ناولوں کا ترجمہ کر دے تو بنگال کی اصلی روح دُنیا پر ظاہر ہو جائیگی، جو ابھی تک کوئی دوسرا بنگالی مصنف چھوٹے پر پیش نہیں کر سکا ہے۔

سرت کی دور رس نگاہ انسانی کیریکٹر کی تک پہنچتی ہے۔ اس کی قادرِ الکلامی باعثِ رشک ہے۔ وہ نہایت بے باکی سے ان گورکھ ہندو اور متون کو دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جن میں تو بے اندازہ انسانی ہمیشہ سے لہجی رہا ہے اور اُلجھی رہیگی۔ لارب، سرت چڑھی کا شمار دُنیا کے عظیم ترین اور سب سے زیادہ اور پختل ناول نگاروں میں ہو سکتا ہے۔

”ماضی“۔ دہلی

۱۹۷۷ء

جے۔ لے۔ عورت تیر نام خود داری ہے۔ اس مقولے کی صداقت ملک کے سب سے بڑے مرنے والے مصوّر طرافت مرزا عظیم بیگ چٹائی کی تازہ چٹائی تصنیف اور طرافت کی بے مثل تصویر چٹائی میں دیکھنے بڑی ہی ناگوار اور دلچسپ چٹائی طرز کی پہلی چیز ہے۔ چٹائی کی وفاداری اور چٹائی کی خود داری کی کہانی سن کر آپ تڑپ تڑپ جائیں گے قیمت ۱۰ روپے

عجلے کا پتلا، ساقی بکٹ پو۔ دہلی :

## اساس حیات

زندگی کی شورشوں پر چسکراں ہو خامشی  
ہو خرام ناز سے نا آشنا موج نسیم  
عالم ہنگام کی اک پاسباں ہے خامشی  
مطہن پردوں میں گل کے نو عود ان نسیم  
نیزم جاں کلیاں سکوں کی گود میں سوئی ہوئی  
نیمند کی گھر آئیوں میں تتلیاں کھوئی ہوئی  
یاسمین کے گنج تنہا کی گھنیری چھاؤں میں  
مست بھنوسے سو ہے ہیں رنگ بو کے گاؤں میں  
پیر پیر آموں کے محو خواب ہو کوئل کی کوکٹ  
اور خواہید وہ پیسے کے دل نازک میں ہو کٹ



عندلیب آسودہ راحت ہے نوک خار پر  
سوگ طاری ہے اُسی کی مرگ بے ہنگام  
چھا رہا ہے اک سکوتِ عنبریں گلزار پر  
بہ رہا ہو خونِ دل چھو لوں کے رنگیں جام  
فریاں زیرِ صنوبر سرنگوں بیٹھی ہوئی  
رہ رہی ہے شبِ غم غوارِ جانِ حنا رکو  
رونی نرگس کھولدی سنبھل نے بجی لہو سا  
گل گئے، بلبل گئی، گلزار میں اب کی رہا؟



دفعۃً اٹھی لگا ہوا عجب ادویاں  
لب پر اک پُرسوز نغموں کا ہجوم بیکراں  
آنکھ میں آنسو جگر میں رو کی جاں کا ہیاں  
ہاتھ میں لرزش، قدم میں جنبش شعورِ فناں  
سینچتا ہے خونِ دل سے سر زمینِ شعر کو  
نغمہ زن ہوتی ہے فطرت اک نئے انداز سے  
روحِ خفتہ جاگ اُٹھتی ہے صدائے ساز سے

شعر ہوتا ہے رواں اُس کے لبِ فریاد پر  
زندگی تعمیر ہوتی ہے اسی بُنیاد پر

پیشانی

# مرد اور عورت کے فرائض

اسلام کے وجود میں آنے ہی دنیا نے عورت کا صحیح معنوں میں سمجھ لیا، وہ عورت جو اب تک ساری دنیا کی نگاہوں میں ایک ذلیل و خوار ہستی سمجھی جاتی تھی اور جس کی ذلت دے حرمی کی کوئی حد انتہا نہیں تھی اب وہی عورت فطرت کا ایک حسین اور لطیف ترین شاہکار بن گئی، ایک پاک اور منترہ ہستی، سائے عالم کی آرائش و زیبائش، راحت دل و آرام جان، ایک ایسی محبوبہ جیل شے جس کا دل پازہ کی مدد پہنی اور لطیف کمرؤں سے بنایا گیا ہو، اسلام نے دنیا کو یہ بھی سمجھا دیا کہ مرد اور عورت کے مستقل اتحاد و اتفاق ہی سے تمام دنیاوی اور روحانی مسرتیں حاصل ہو سکتی ہیں، انسان دنیا میں خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرنے آتا ہے اور صرف وہی شخص صحیح معنوں میں خوش و خرم رہ سکتا ہے جو اپنے گھر کی چار دیواری میں مسرت تلاش کرے۔

ہماری گھر یلو زندگی میں جذبہ محبت کو بڑا دخل حاصل ہے، یہ جذبہ تمام انسانی جذبات سے زیادہ قیمتی ہے، محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام شکلوں اور شکلوں کو آسان کر دیتی ہے۔ اور یہ اُسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے حقوق اور فرائض سے کما حقہ واقف ہو جائیں۔ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا کافی احترام کر سکیں اور اپنی حسرت سے تباہ نہ کریں تاکہ تحمیل حقوق اور ادا تے فرض کی آبیاری سے نشوونما پاتا رہے۔

ڈیوک آف ڈنکسٹر، سابق شہنشاہ انگلستان و ہندوستان کا قول ہے کہ "ایسا ایسا ہے جس میں محبت کا شائبہ نہ ہو ایک غیر اخلاقی اور غیر فطری چیز ہے۔ ایک مضبوط کردار کا انسان ہر چیز کو قبول کر سکتا ہے، سوائے اُس ازدواج کے جس میں محبت نہ ہو، جو بیاہ صرف باؤی مقاصد کے تحت ہو اگر تاہم وہ نہایت مذموم اور انسانیت کے خلاف ہو جس ازدواج میں جذبہ محبت کا فرمان نہ ہو اُس کا قائم نہ رہنا ایک قدرتی اور فطری امر ہے، وہ لوگ جو آپس میں محبت نہیں رکھتے اور خلوص سے اپنی ازدواجی زندگی نہیں بسر کرتے۔ اُن کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا ہی بہت بہتر ہے" یہ زمین قبول اُس شہنشاہ کے ہیں جو صرف محبت کی خاطر اپنی اُس وسیع اور عظیم شان سلطنت سے دست بردار ہو گیا جس میں کبھی سوج غریب نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ ہے کہ محبت کرنے میں عورت ہی دنیا کی افضل ترین ہستی ہو، اُس کی محبت غیر فانی ہو جو باوجود صدمہ کی کج ادائیگی اور غفلت شکاریوں کے زیادہ مستحکم اور وسیع ہوتی جاتی ہے۔ مرد کی سیکڑیں بے اعتنائیوں اور لاپرواہیوں کے بعد بھی وہ اُس کی خدمت میں دن رات مشغول رہتی ہے، خانہ داری کی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اُس کے دوش ناتواں پر ڈال دیا جاتا ہے، بچوں کی پرورش اور تربیت کی بھی ذمہ داری خیال کی جاتی ہے، ہر حالت میں اپنے شوہر کے رنج و غم میں برابر کی شریک اور اُس کی ہمدرد و غمگساری رہتی ہے، مگر باوجود ان ساری خدمات اور ایثار کے اگر کوئی مرد ان کی صورتی بہت دیکھتی بھی نہ کرے تو افسوس ہو ایسے مرد کی عقل اور سمجھ پر۔

عورت اپنی بے لوث محبت، بے غرض خدمت اور اپنی تمام صفات حسنہ کے عوض اپنے شوہر کے مستحکم ہو جانے سے اپنی

نسبت صرف چند میٹھی باتیں سننے کی متنی رہتی ہے، یہی وہ غذا ہے جس پر اُس کی زندگی کا مدار ہے، اگر مرد اُس کی ان تمام خدمات، ایثار اور خوبیوں کے باوجود اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے، اُس کے حقوق سے اسکو محروم رکھے، اُس کے جذبات اور احساسات کو ٹھکرا دے، اُس کی وفاداری اور عصمت شعاری کو مشکوک نظروں سے دیکھے، اُس کے ہر کام میں نقص نکالے اور پھر یہ شکایت کرے کہ اُسے گھر میں راحت نصیب نہیں تو یہ اُس کی ناگہمی اور بدبختی کی دلیل ہے، گویا اُس میں اپنی رفیقہ حیات سے اچھے تعلقات پیدا کرنے اور حسن سلوک سے اُسکے اندر جذبہ محبت و ایثار بیدار رکھنے کی صلاحیت و قابلیت ہی معدوم ہے۔

ہندوستان کے نوے فیصدی گھروں میں مجسمہ محبت و ایثار بے پایہ اور غریب لڑکیاں محض اس لئے مطعون کی جاتی اور اپنے شوہروں کی نظروں میں ذلیل و خوار سمجھی جاتی ہیں کہ وہ اپنے میکے سے بیش قیمت جینز اور مرصع زیور نہیں لائی تھیں، مگر یہ نائیس پسند اور زربست مرد یہ نہیں سمجھتے کہ عورت کا محبت سے بھرپور دل مرصع و طلائی زیور اور اُس کی وفا شعاری و ایثار قیمتی زور کار اور زربین لباس سے کہیں بیش قیمت ہو جس کی بدولت ان نعمات لذت و اور حریص انسانوں کے شکستہ ہوئے دل و دماغ آرام و چین پاتے ہیں اور اسباب معیشت کی فراہمی کے تفکرات اُن کی رنگوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا کر کے اُن کے مُردہ جسموں میں ایک حیات تازہ پیدا کرتے ہیں۔

فطرت کے اصول کے موافق عورت مرد کی ایک بہترین رفیق اور غمگسار ہے، مگر اُس کی دوستی اور مودت نسبت سے استفادہ کرنا مرد کی طرز روش، اُس کی قوت فکر اور حسن سلوک پر منحصر ہے، ہمارے گھروں میں عورت کی بہت کم قدر کی جاتی ہے، ہر مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی بیوی فرشتہ خصلت بن جائے، لیکن اپنی سیرت اور کردار کو درست کرنے کی فکر نہیں کی جاتی، اپنی بُری عادات و اطوار کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں ہوتی، لیکن بیوی کے معمولی عیوب اور غلطیوں پر اُس سختی سے نکتہ چینی کی جاتی اور انہیں ایسی تنقیدی نظروں سے دیکھا جاتا ہے کہ گویا مرد کے کبھی کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی۔

خانہ جنگیوں اور اُسے دن کے جھگڑوں سے وہی لوگ نجات حاصل کر سکتے ہیں جو ایک دوسرے کی فطرت کا عمیق مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور آپس میں محبت رکھتے ہیں، ایک دوسرے کی طبیعت اور مزاج سے واقف ہو چکے بعد شعور و ایثار اور بعض وقت شعور و اجبر کر لینے سے متاثرانہ زندگی کے طویل سال نہایت خوش گوار اور کچھپ ہو جاتے ہیں اور آپس کی بد مزگیوں اور بے لطیفیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

کستوری بانی کا بیاہ جب گاندھی جی سے ہوا تو اُن کی مائے اُن کی ملائیوں میں نہایت بھدھی وضع کی چوڑیاں پہنائیں، یہ چوڑیاں انہیں میکے سے ملی تھیں اس کا دل بہت پیاری تھیں، مگر گاندھی جی کو ایک نظر نہ بھاتی تھیں، جب مسٹر گاندھی کو اپنے بچی کی مرضی کا علم ہوا تو اس خیال سے کہ شوہر کی خوشی چوڑیوں سے کہیں بہتر ہے انہوں نے اپنے بچے کے سامنے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں، گویا چوڑیاں توڑ کر بچی کا من موہ لیا، یہ ایک ہندوستانی عورت کا جذبہ شوہر پرستی!!

خانگی زندگی کی کھینچیں میاں بیوی کے درمیان منافرت کی خلق کو اتنا وسیع نہیں کر سکتیں جتنا کہ دن اور رات کی چھوٹی چھوٹی بظاہر بالکل معمولی مگر خلاف مزاج باتیں نظام زندگی کو دہرہ و دہرہ کر دیتی ہیں، چند سال پہلے کا واقعہ ہو کہ ایک شوہر نے اپنی شریک زندگی کی رفاقت سے ہمیشہ کے لئے اس نے دست برداری کر لی کہ باوجود سینکڑوں تہہ منع کر چکے اُس نے مستی کا استعمال ترک نہیں کیا، اس کم فہم اور ضدی بیوی کا مسٹر گاندھی سے مقابلہ کیجئے اور خود کیجئے کہ ایک بیوی نے محض اپنی حماقت اور ضد سے کتنی زحمت گوارا کی اور نقصان اٹھایا اور دوسری نے اپنے شوہر کی خواہش اور ناراضماندی کا احترام و احساس کرتے ہوئے اپنی چاہتی ماں کا عطیہ جوڑیوں سے ہاتھ اٹھا کر اپنے شوہر کے دل کو ہاتھ میں بیلغاٹا ایسی ہی عورتوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ ایک اطاعت کرنے والی اور شوہر کے خواہشات و احساسات کا لحاظ رکھنے والی بیوی ہمیشہ اپنے شوہر پر حکومت کرتی ہے۔

گھر کی چار دیواری کے باہر مرد کے جذبات کو براہِ حقہ کر نیوالی سینکڑوں چیزیں ہیں اور ہزاروں ایسی بھی ہیں جو اُس کے حوصلہ کو پست اور ہمت کو سرور کمرستی ہیں، لیکن وہ یہ توقع نہ رکھتا ہے کہ دنیا کی ہنگامہ خیزیوں اور غم روزگار کی پریشانیوں سے دُور اُس کا ایک ایسا ہمدرد و غمگسار رفیق بھی ہے جس کے پہلو میں اُس کے لئے ہر طرح کا آرام و سکون نصیب ہو سکتا ہے اور جو اُسے ایسی فرحت و مسرت بخش سکتا ہے جیسی کہ نکلے ہوئے سر کو ایک نرم نازک تکیہ جس پر صرف اس کا سر ہی نہیں بلکہ دل و دماغ بھی آرام کرے!! اپنی وہ صفت جو جو ہر مرد اپنی رفیقِ حیات میں دیکھنا پسند کرتا ہے، ہمیں یقین ہے کہ کوئی مرد ایسی عورت کی رفاقت سے ہرگز کنارہ کش ہونا پسند نہ کرے گا جس کے دستِ رفاقت میں اُس کے دل کے زخموں کو مندمل کرنے کا اعجاز مستور ہے۔ اور جس کی زبان میں اُس کی فکر و اور غمہائے روزگار کو بھلا دینے کا جادو پنہاں ہے ایسی عورت کی رفاقت اور موانست کے بغیر نہ مرد نیکی کی زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ اطمینان کی موت مر سکتا ہے!!

دنیا کی ساری مصیبتیں اور تکلیفیں، اقسام کے رنج و غم، پریشانیاں اور فکرات، یہ سب سب بالکل دُور ہو جاتے ہیں جب انسان اپنی چھوٹی سی مسرت اور راحت سے بھری دنیا میں بیوی، بچوں اور والدین کے درمیان ہوتا ہے، لیکن اس مختصر سی دنیا کی راحت اُس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کے دلِ شفقت پداری، مہربانری اور اطاعتِ فرزندگی سے معمور نہ ہوں۔ محبت و دین قائم رہتی ہے جہاں اطاعت ہو اور جذبات و احساسات کا لحاظ ملحوظ خاطر ہو، اپنی اس چھوٹی سی دنیا کو جنتِ ارضی بنائے تاکہ ہر عورت پر اپنے شوہر کا احترام اور اُس کی اطاعت لازم ہے اور شوہر کے لئے اپنی بیوی پر اعتماد کرنا ایسا ہی ضروری ہے، اطاعت اور اعتماد کے فقدان نے نئے نئے فیصدی گھروں کو جہنم بنا دیا ہے۔

ہر انسان، خواہ وہ مرد ہو کہ عورت، اگر راحت و آرام کی زندگی بسر کرنا چاہے تو اپنے گھر کو ایسا فونو بہشت بنائے کہ جہاں محبت کی حکمرانی ہو اس کے خیالات نیک اور متفق ہوں، خواہشات پاک اور نیک ہیں معلوم ہوں، جہاں ہونڈوں کے دلوں سے دُعا میں نکلتی ہوں، جہاں دین اپنے بھائی کو محبت اور الفت کی نگاہوں سے دیکھتی ہو۔ اور بھائی

اعتماد اور بے لوث محبت کی نظروں سے، جہاں اولاد والدین کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا فرض منصبی سمجھتی ہو، اولاد والدین اولاد کو دین اور دنیا دونوں کے کام کا بنائیکو کشش میں مشغول ہوں!

بعض ناظم بیویاں اس فکر میں دن رات گھلی جاتی ہیں کہ ان کے شوہر بہ نسبت انکے اپنی ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں! ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ”محبت“ محبت سے محبت کرتی ہے! یہ ممکن ہے کہ ماں اپنے لڑکے سے بہ نسبت اس کی بیوی کے بہت زیادہ محبت کرتی ہو! پس ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ لڑکیوں نہ اس طرف زیادہ کھینے جس طرف زیادہ قوت کا مقابلہ ہے!!

ایک حسین و رنگین بچہ کو اس شخص کی نظروں میں کوئی دلکشی اور جاذبیت نہیں رکھتا جو اس کو سرور و لذت پہنچاتا ہے اور اپنے حشام جان کو اس کی خوشبو اور عطریت سے معطر کرتا رہتا ہے، اسی طرح ہمارے بعض زوجہ حضرات ماں کی محبت کو ایسی ہی نظروں سے دیکھتے ہیں، ذرا اپنا بے اعتنائیوں اور لا پرواہیوں کا خیال کریں، اپنی شوخیوں اور گستاخیوں کے مقابلہ میں انکے صبر و ضبط، اپنے سلوک اور ہر کرداروں کے ساتھ اس کی چشم پوشیوں اور معافیوں کو یاد کریں، اس کی بے غرض محبت اور جہاں نشاری پر نظر کریں کہ ہماری صحت و سلامتی، ہمارے راحت و سکون، ہمارے آرام و تھانیش پر وہ خود کو کس طرح پروانہ دار و نثار کر دیتی ہے، اس کے لانا پھانا احسانات اور سچے و سادہ عینایات کا عرض کسی صورت ممکن نہیں اس لئے انکی خدمت اور اطاعت ہر انسان کا فرض اولین ہے، نہ صرف اس کے قدموں تلے جنت ہے بلکہ اس کی ہر نگاہ جنت بدوش ہو جسے بے پایاں راحت و مسرت اور سکون قلبی کے بحر ذخار موج زن نظر آتے ہیں۔

جتنی قسم کے تعلقات ایک انسان کو دوسرے انسان سے رکھنے پڑتے ہیں ان میں سب سے زیادہ گہرا تعلق عورت اور مرد کا ہے، انسانی عین اختلاف کسی اور تعلق میں نہیں پایا جاتا، اس تعلق کی بنیاد باہمی محبت اور رواداری پر ہوتی ہے جس کو مرد کی ضروریات و اغراض دم آخر تک قائم رکھتی ہیں، یہی ایک ایسا تعلق ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کو مخلوط کر کے ایک مکمل انسان بناتا ہے، اسی کی وجہ سے کہ رنج و راحت، دولت و مستی، عزت و آبرو، آل و اولاد وغیرہ ہر چیز اور ہر حالت میں عورت اور مرد کی شرکت ضروری قرار پاتی ہے، اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے جذبات، احساسات، حقوق اور فرائض کا لحاظ اور پاس کیا کریں تو جتنی جی بہشت کا مزہ آجائے!!

ہماری زندگی میں بڑا نقص اور عیب یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے احساسات کا خیال رکھتے ہیں اور یہ حقوق و فرائض کا لحاظ ہماری مثال نہ زندگی کی بسیم اللہ بنی غلط ہوتی ہے، معاہدہ کوئی کر لے اور اس کو نبھانا کسی اور کو ہوتا ہو، والدین نے پابند رسم و رواج ہو کر اولاد کے وہ حقوق جو اپنی شریک زندگی کے انتخاب کے متعلق اس کو حاصل ہیں چھین لئے ہیں، یہی بنیاد ہے ساری بے لطیفیوں اور خرابیوں کی جو ہماری موجودہ زندگی میں پائی جاتی ہیں۔

والدین نے اولاد کا یہ حق تو چھین لیا۔ مگر ایک دوسرا حق خواہ مخواہ خود پر لازم کر لیا کہ اولاد کی پرورش کی طرح اس کا بہانہ دینا بھی، ماں باپ کا فرض ہے، ابھی اولاد مبتلا نہ زندگی کی حقیقت، ذمہ داریوں اور اس کے نتائج کے سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی کہ والدین کو بیاہ کی فکر پڑ جاتی ہے، اولاد جب تک عمر اور قابلیت کے لحاظ سے بیاہ کے قابل نہ ہو بیاہ کا ذکر



ہی نہ کرنا چاہیے ورنہ قبل از وقت اولاد کے خیالات منتشر و پراکندہ ہونے کا قوی احتمال ہے، عمر کے علاوہ اس امر کا خیال کرنا بھی ضروری ہے کہ بیاہ کے بعد میاں بیوی کی زندگی لطف سے گزرے، اس لئے والدین کا فرض ہے اور اولاد کی خوشحالی و عاقبت اندیشی اس امر کی مقتضی ہے کہ بیاہ سے پہلے اولاد کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے قابل بنادیں، اگر والدین نے اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا اور اولاد کو اس قابل نہیں بنایا کہ بیاہ کے بعد وہ تنہا اپنی آپ کفیل ہو سکے اور مسئلہ لانہ زندگی کے حقوق و فرائض سے کما حقہ واقف ہو جائے تو ایسی اولاد کا عمر بھرن بیاہ دینا بھلا ہے!

ہر شخص اپنی اولاد کو دنیا داری اور معیشت کے احوال بتاتا ہے مگر شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو گا جو اپنے تحت جگر کو اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آئے، اس کی جائز خواہشات کے پورا کرنے اور اس کے جذبات احساسات کا احترام کرنے کی تعلیم دی ہو! کتنی مائیں ایسی ہیں جو اپنی لڑکیوں کی نسبت یہ کہہ سکتی ہیں کہ انھوں نے انکو اپنے شوہروں سے محبت کرنے یا ان کی اطاعت اور فرماں برداری کو اپنا نصب العین بنانے کا عملی سبق پڑھا یا ہے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایسی اہم اور ضروری تعلیم نہ دینے اور تربیت سے بیگانہ رکھنے کا جو نتیجہ ہوتا ہے اس سے ساری دنیا واقف ہے۔

اولاد کے بننے اور بگڑنے میں ماں باپ کو بہت دخل ہے، انسان میں دو متضاد کیفیتیں پائی جاتی ہیں، ایک طرف توحہ والدین سے عادات و خصائل، رنگ و روغن، صورت شکل اور جسمانی ساخت تک کی میراث سیکر آتا ہے اور دوسری طرف اسکو تعلیم و تربیت سے عمدہ عادتوں اور اچھی خصلتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں، جو عادات و خصائل وہ اپنے والدین سے ورثہ میں لاتا ہے اگر ان کی تعلیم و تربیت سے کامل طور پر اصلاح نہ ہوگی تو ان عادات بد کی شورش تو کچھ ضرور کم ہو جائیگی جو اس کی طبیعت میں لاسخ ہو چکی ہیں۔

اولاد کے ساتھ برتاؤ و گرنے میں والدین سے جو اضطرار تقریباً سرزد ہوتی ہے وہ بہت کچھ محتاج اصلاح ہے اولاد کی جسمانی اور روحانی زندگی کی بہتری اور اصلاح کی ذمہ دار زیادہ تر ماں ہوتی ہے جسمانی زندگی سے مراد ہے اولاد کی تندرستی اور توانائی اور روحانی سے اخلاقی اور مذہبی، یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ ماں کو اپنی جسمانی اور روحانی زندگی کے تندرست رکھنے کا خیال ہو، اپنی اور اپنی اولاد کی بھلائی برائی کے سمجھنے کی اس میں صلاحیت ہو۔

اولاد کا ماں سے جتنا گہرا تعلق ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اس عمیق اختلاط کی وجہ سے ماں کی خوب اولاد میں اچھی طرح بس جاتی ہے، کسی نے بہت قہ کہا ہے کہ بچے کیلئے ماں کی گود اس کا پہلا مکتب ہے اور ماں معلم اول ہے بچہ دل و دماغ کی لوح سادہ لئے پیدا ہوتا ہے، ماں اس پر نقوش اولین کندہ کرتی ہے، یہ نقوش ممکن ہے کہ صحیح تعلیم و تربیت سے کچھ مدہم بڑ جائیں مگر بالکل مٹ نہیں سکتے۔

اولاد کی بہت بڑی ذمہ داری والدین پر یہ ہے کہ وہ اسکو دین اور دنیا دونوں کے کام کا بنائیں، اگر والدین کو اولاد کے حقوق اور اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس ہو تو ان کی نیند حرام ہو جائے مگر ہماری سماج میں اولاد کے حقوق اور والدین کے فرائض کا جو حق ادا ہو رہا ہے اس کی اگر توضیح و تشریح کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ کس حد تک والدین اولاد کو اپنے نمونے دکھاتے ہیں اور اپنی حرکات و سکنات سے بڑی تعلیم دیتے ہیں، یہود لاڈ پیارے اچھلوں سے ایجاز ز برداریوں سے اپنے

یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ حاکم ہیں اور سب انکے حکوم انکی ہر خواہش خواہ وہ کتنی ہی گراں اور بجا کیوں نہ ہو پورا کرنا پسند فرماتے ہیں، ایسی دہلانی محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی بھی بُری عادتیں ہیں سب ہی کا تھم لا ڈالی اور لاڈ کی طبیعت میں بڑیا جاتا اور عمر کے ساتھ ساتھ وہ جڑ پکڑتا، پھوٹتا اور پھولتا پھلتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ والدین ہی اپنی اولاد کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں، یا تو وہ خود بُری عادات و خصال کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی یہ عادتیں اولاد میں راسخ ہو جاتی ہیں، یا یہ ہوتا ہے کہ اولاد کتنی ہی بجا بات کیوں نہ کرے افراطِ محبت کی وجہ سے اسکو منع نہیں کرتے بلکہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے اُس کے ہر فعل پر آمین کہتے رہتے ہیں، ایسے والدین نادان دوست کے مصداق ہیں کہ اولاد کو نکمرا، خود پسند، ہندی، سُرف اور عیش و آرام کا دلدادہ بنا کر اُسکو کسی کام کا نہیں رکھتے، نہ دین کا نہ دنیا کا، ایسی اولاد کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے، اُس کا وجود صرف تنگ خاندان ہی نہیں بلکہ ملک و قوم کے لئے باعثِ ذلت و نکبت ہو کر زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن جاتا ہے۔

میرزا سیف علی خاں

چینچینہ

## دوست کے حضور

کہ میں شاعر ہوں اور شاعر کی دنیا کیسے آیا ہوں  
متاعِ حکمت پہنچاں وہ پدائے کے آیا ہوں  
سحر کی روشنی، شبنم کا جلوہ کیا ہوں  
روائے مریم و داناں زہرا کیسے آیا ہوں  
کلاہِ خاور و تاجِ ثریا کے آیا ہوں  
حریمِ دل کا وہ زرخیز پروائے کے آیا ہوں  
میں تیری بزم میں اک سازِ یاس کیسے آیا ہوں  
کتابِ شوق کا ایک ایک پارا کیسے آیا ہوں  
بہشتِ رنگ و بو کا ایک خاک کیسے آیا ہوں  
میں تیری انجمن میں چشمِ موسیٰ کیسے آیا ہوں  
تری محض پہ چھا جانے کا دعویٰ کیسے آیا ہوں  
میں اپنی سے، میں اپنے جام و مینا کیسے آیا ہوں  
نورِ عشرتِ خوابِ زینا کیسے آیا ہوں  
تجلی سے چلے جانے کی تمنا کیسے آیا ہوں

نہ چھلے دوست تیری بزم میں کیا کیسے آیا ہوں  
کیا ہے منتخبِ فطرت نے اپنا راز داں مجھ کو  
میں تیری زندگی کے آئینہ زرا و تبسم میں  
ترے فرقِ ادا پر سایہ تقدیس کی خاطر  
میں کس شانِ تکبر سے ترے پُر نور قدموں میں  
منقش جس چشمنِ عاشقی کے کار نامے ہیں  
جسے تو چھڑ کر گردوں کے تارے توڑ سکتی ہے  
کیا ہے تیری خاطرِ جمیعِ اوراقِ پریشاں کو  
میں تیرے واسطے رنگین خوابوں کے جزیرے سے  
مری آنکھوں سے اک دن دیکھ دوئی اپنی محفل کی  
تکلفِ برطرف! دے مجھکو فروانِ غزل خوانی  
اُٹھالے اپنے پیانے، کہ اس دم تیری محفل میں  
ترے شوق و وفا و التفاتِ ناز کے مدد سے  
تجھی کو چاہے جانے کی ہوس رکھتا ہوں سینہ میں

جانِ شاعرِ شمس

محبت کی فضا میں، اُن کے س ذیل سے گوجا میں  
ہمیشہ کے لئے اک دوسرے میں جذب ہو جاتیں

## ”الجواب“

دوبہر کے ساتی میں پروفیسر محمد سلیم کا ایک مضمون ”جواب طلب“ شائع ہوا تھا اس کا کلمہ ”الجواب“ کے نام سے انصار صاحب کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔  
 ”جواب طلب“ کے سلسلے میں چار مضمون اور شائع کئے جا رہے ہیں۔

پہلا سارے لطیف!

جس خطرو سے میں تمہیں بڑھنے سے ڈرا رہا تھا آخر تمہیں اس کا شکار ہونا ہی پڑا، تم ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے مادی ہو گئے ہو بلکہ تم نے اپنی ذہنی کی روشنی ایسی بنا رکھی جو میں تمہیں ہمیشہ سے یہ بتاتا رہا ہوں کہ عقل کسی تہذیبی ذہنی کشیوں کے بلکہ وہیں تہذیبی معادن نہیں ہو سکتی لیکن تم ہمیشہ اس حقیقت کی تردید کرتے رہے ہو میں تمہیں معقول کر رہا ہوں تھا۔ اس نے تم کو میرے دعوے کے ثبوت میں مجھے عقلی دلائل طلب کرنے دیے اور میں عقل سے پرسا گفتگو کر رہا تھا تمہاری ذہنیت پر جو اثرات کا سودی اور برتاؤ ڈھانے والے ہیں، تم ان سے بے خبر ہو رہی ہو جب کہ تم نے میس کا سودی سے استفادہ کو چوری کیا، اور تم اس سے پہلے پڑھو متعلق کا سودی کی ذہنی غلامی کا اتہال کر چکے ہو تے۔ تم برتاؤ شش کی طرح سوچنے کے مادی ہو گئے ہو اور شاید۔ اسی کی طے رہ فری تنگد آنا خیال ہوئے کا فخر بھی رکھتے ہو، تمہارا عقل تمہارا سامنے بھی دیسی ہی پرہیزیاں اور گتیاں پیش کرے کی عادت پڑ رہی ہو جن میں برتاؤ شش مبتلا ہے۔

تمہاری عقل نے تمہیں ایک کشش میں گرفتار کر دیا، یہ منطق کے حوصلے کے مطابق تمہیں اس نظریے سے انتہائی بڑھتی ہیں یہ تیرا انداز کرنے پر مجبور کرنا ہے کہ بی بی کی فرمائش تم پر جاری نہیں بلکہ اس کا نفاذ تم پر واجب ہے، لیکن میں کہو گا کہ تمہارا یہ نظریہ ہی غلط بنیاد پر کھڑا ہے۔ اس کے مذہب اخلاق کے حوصلے کے کھیل نہیں کہ ان کے متعلق اس آسانی سے فیصلہ کر لو کہ وہ تمہارے کسی عالی مقصد کے متصادم ہو تو تم مقصد کے آگے انکی پرواہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں کیا خبر کہ جس مقصد کو تم نے عالی مقصد سمجھا ہے وہ اس مقصد کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو یکے حصول کا ذریعہ فطرت نے مذہب اخلاق کو بنایا ہے۔ یہ خود مصلحتات مذہب و اصولات اخلاق کو کوئی نیلی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے نزدیک ان کا جھجکا ایک نظام ہے جو کہ نہیں ہے جو افراد ضروریات و خواہشات سے قطع نظر جماعتی ضروریات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، لیکن اس نظام کا بانی کوئی انفرادی شخصیت نہیں بلکہ خود فطرت انسانی ہے۔ تمہارے جسم میں ایک پھر زائل ہے، فطرت خود اس کے اعمال کا سامان کرتی ہے، اکثر و بیشتر حالات میں تم مریض کو فطرت کے کورس پر چھوڑ دیتے ہو یا مٹاؤ گئے کے بخار میں تم ہمیشہ بیماری کی میعاد کی تکمیل کے منتظر رہتے ہو۔ اسے اگر تم اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے تے تیار ہو کہ تمہارا جسمانی نظام قائم رکھنے کے لئے فطرت نے اپنا قوانین وضع کر رکھے ہیں، جو قطعاً تمہاری دسترس سے باہر ہیں تو پھر تمہارے ذہنی نظام کے لئے بھی فطرت ہی نے کیوں نہ تو ان کی بنیاد ڈالی ہوگی جنہیں تم مذہب و اخلاق کے حوصلے کہتے ہو؟ پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم ان مصلحتات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھو انکی معقولیت و غیر معقولیت کے فروغ یا چھٹا کر دو؟

تمہارا یہ کہنا کہ ”مذہبی احکام ہیں یا اخلاقی یا قانونی میں کسی کو مطلق اور مطلق نہیں سمجھ سکتا۔ سب حالات کے متعلق ہیں۔ قطعاً درست ہے۔ اگرچہ میں قانونی احکام کو مذہبی اور اخلاقی احکام کے ہم پرکھنے کا ردوار نہیں لیکن، میرے دوست اس سے یکے ثابت تمہارے کہ ان کا اطلاق یا عدم اطلاق تمہارا کسی دوسری شخصیت کے ذاتی فیصلے پر منحصر ہے اگر ایسا ہو تو کیا کسی قانون کا نفاذ ممکن ہو سکتا تھا؟ کیا تمہارے فیصلے ان قوانین

میرے فیصلوں سے مضامین نہ ہوتے رہتے، تم لکھتے، یوسب کی روح بنی نوع انسانی کی بھلائی اور شکمہ بھی ہمیں ہول پر ہر اصول قربان کیا جاسکتا ہے، کیوں نہیں! انسان اشرف المخلوقات خیر اور اسی میں ایک آپ کی ذات بھی ہے۔ سارے قوانین کا اسکی بھلائی کے لئے ہونا کیوں نہ لازم ہو۔ تم مذہب کی کورانہ تقلید و توہم پرستی سے بھاگنا چاہتے ہو۔ لیکن غیر لازمی طور پر تم اسکی حمایت بھی کئے جاتے ہو، فطرت کی ساری توجہ و غیبات کے مزہ میں ایک آپ ہی ہیں۔ باقی کائنات آپ کے آرام و آسائش کے لئے فطرت نے نکھری کر رکھی ہے گویا فطرت پر آپ کا کوئی بڑا دین ہے جسکی ادائیگی میں فطرۃ اللہ کی آفرینش سے کوٹنا ہے۔ لیکن ہنوز یہ قرضہ اسکے سر سے نہ اترتا ہے، فلسفہ اخلاق کا پھر بار دہرے تنگ نظری، انشیک بے تمہارا نقل نہیں اس سے آگے پہنچا بھی نہیں سکتا۔ انہیں خود غرضی کی رو میں تم نے کتنا مفید ہول وضع کر لیا ہے۔ لیکن میرا بن من ذرا سوچو گو اس عام ہول کے قطع کرنا نہیں کونسا حق حاصل جو آپ کو تم اپنی ذات سے علیحدہ ہو کر ایک مکند کو پیچیدہ سوچ نہیں سکتے؟ اگر غرض میں اس ہول کو معجز بھی کیا جائے تو اسے نفاذ کے ذرائع کی تفصیل میں تمہارا کس حد تک دخل ہے؟ تم کہو گے کامل کیوں؟ مگر میں تم سے پوچھ چکا کہ اگر تم میرے ہر شخص کو اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کے ذرائع کے خارج پر مال کی قدرت حاصل ہو جائے بلکہ ان کے وضع کرنا بھی ہمیں ہو تو کیا اس مقصد کا حصول بھی ہو سکتا ہے؟ مگر کہیں اسکی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو کام تمہاری عقل کو مفید معلوم ہوتا ہے میری عقل کے نزدیک ناکارہ ثابت ہو سکتا ہے مثال کے طور پر موجودہ مفکرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مجتہد کے مسائل کی ترقی انسانیت کے لئے مفید ہے اس لئے سائنس کے ذریعہ انسان اپنے ماحول سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت حاصل کرتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ سائنس کی ترقی نے نئی ایجادات پیش کر کے ہماری ضروریات اتنی وسیع کر دی ہیں کہ ہم اس مہمانان و مسترت سے محروم ہو گئے ہیں جو ہمیں سادہ زندگی میں میسر تھی دونوں کے دلائل اپنی اپنی جگہ پر کافی مستحکم ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ انسانیت کو فائدہ لیکن ذرائع متضاد۔ اسلئے میرے دوست تمہارا یہ خیال کہ جو ذرائع تمہاری اعلیٰ مقصد کے حصول میں معاون ہوں انہیں ان پر عمل کرنا چاہیے، خواہ دفعہ ب و اخلاق کے قوانین سے متضاد ہوں کیوں نہ ہوں قطعاً غلط ہے۔ اسلئے کہ جس مقصد کو ہم اعلیٰ مقصد سمجھتے ہوں ممکن ہے اس عالمگیر مقصد کے نزدیک کوئی وقت نہ رکھتا ہو جسکی توسیع فطرت کر رہی ہو۔ اسلئے ذرائع انکے معیار غائب رہ چکی ہیں کوئی دسترس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارا پاس جو عقل کی کسوٹی ہے وہ سونا اور تانبے میں کوئی تمیز نہیں کر سکتی۔ اب تمہارے لئے سوائے اسکو کوئی چارہ کار نہیں کہ ان قوانین پر عمل کر دو جیات اجتماعی کے بنا کر وہ ہیں اور بعضی جیات کی ارتقا و پیروی میں معاون رہے ہیں وہ مذہب کے مفقود ہو گئے ہوتے، تمہارے مذہبی و اخلاقی قوانین کسی تیسری بیوی کی فرمائش پر عمل کر کے کی اجازت نہیں دیتے۔ تم قطعاً بے بس ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ دھوکہ صرف تلی ہی کے معاملہ میں کیوں سوچھائی دے دے تاکہ ایک جہاں نقل تمہاری درمزدور زندگی کے برخلاف میں ایسا اقتصاد کو یک شکل کرنا ہو۔ شاید انکی عیسویت کی وجہ سے تمہاری نگاہ ان پر نہیں پڑتی، میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تلی کی "زری مارچ کی سائیا" تمہاری دکانوں کو کھٹائی کیوں نہ معلوم ہوئی، اسکے "آراستہ کمر" میں تمہارا دم کیوں نہ گھٹنے لگا۔ "سینڈ ویچ لیگ پاگلٹ" انگور، سیب، سب تم سے کس طرح ٹھونسنے کے جب آپ تم جانتے ہو کہ اس ساری کی دلفری کے لئے کتنے ننگے بدن والے انسان فائدہ اٹھاؤ اور پھر نیند حرام کر دی ہے۔ اس کوہ کی آراستہ سٹکی کھینچتے کتنے گندہ پروردگار ٹھونچ میں رہنے والے مزدور دل سے باغیوں کی طرح کام کیا ہے۔ ان سینڈ ویچ لیگ، انگور کی لذت آفرینی میں کتنی فائدہ کش کسوں نے؟ اپنا خون پسینہ ایک کیا ہو۔ تمہارے خلق خدا کی خدمت کے جذبہ کو اس وقت سانپ کیوں سو گھونپا گیا تھا، بنی نوع انسان کی بھلائی کے عمل پر اگر تم نے گریبان میں مرڈال کو ٹھونکتے تو نہیں تلی کی ہر چائیں تک جو حقوق انسانی کی اس بیدردی سے ہمالی کر رہی تھی زمر کو وہ معلوم ہوتی اور تم سے اپنے پاس پھینکے تک دیتے۔ لیکن تمہارا وہ مندر دل جو تمہیں "کسی کے آئینہ برداشت نہیں کرنے دیتا" کہ اسے دھارکھ سکتا تھا، کہ تم تلی کو درنا اور بدبوتا چھوڑ کر اپنے اعلیٰ مقصد کی تعمیل میں وہاں اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔ اور تم بقرہ خود اسکے التفات میں کھو گئے لیکن جب پھر

اپنی گرم شدت کا بوش جو اتوار اپنی اس لغزش کی پاسداری میں لگے اس اعلیٰ مقصد کی اوٹ کھڑے، اور مذہب و اخلاق کے قوانین کو اس کا یہ مقابل نہ کرے۔ قہری تباہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، تمہیں اس وقت اپنے اعلیٰ مقصد کے مقابلہ میں ان اصولات کا استحکام کیوں متزلزل نظر آتا ہے؟ تم اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ دوسرا تم اپنے اس اعلیٰ مہول کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہو اور تمہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ کیا تمہارا یہ اعلیٰ مقصد محض ایک فریب نہیں ہے جسے تمہارے صرف مذہبی و اخلاقی قوانین کی نافرمانی کے جواز کے لئے گھڑ دیا ہے؟

کیا اس نئے تجربے کے بعد بھی تم عقل کی پاسداری پر اڑے رہو گے؟ کیا اب بھی تمہارے نزدیک عقل کی انتشار انگیزی میں شک کی گنجائش باقی ہے۔ میں تمہیں کتنی بار بتاؤں کہ عقلی دلائل و براہین کا حلق صرف ہمارے ذہن شعوری سے ہو، اور ذہن شعوری ہمارے دل و غی کے ترتیب کا محض ایک بڑی مضرب ہے، جسکی مثال سمندر کی سطح پر ان نخی نخی موجوں کی سی ہے جو ہر سکند سمندر کی بطوری کیفیات سے بنی اور گہرائی میں ہی، تم سمندر کی عظیم نشان سرگرمیوں کا راز ان موجوں میں دھونڈ سنا چاہتے ہو، تم اخلاق و مذہب کے اصولات کو ذہن شعوری کے برہان بدلنے والے مسکوں اور چٹکوں کے آئینہ میں دیکھنا چاہتے ہو، لیکن لطیف تم بھول جاتے ہو کہ آئینہ کے عکس کی جولانی خود آئینہ کے طبل و عرض پر منحصر ہے، عکس خواہ کتنی ہی عظیم نشان کیوں نہ ہو لیکن عکس ہر حال میں آئینہ کے محدود اندر ہی ہوگا، مذہب و اخلاق کے قوانین کی کیفیتیں اتنی مختصر نہیں کہ تمہاری عقل میں سما سکیں۔ انکی وضاحتیں اٹھان ہیں، تب تو اٹھانے آفرینش سے وہ حیات کی نشو و نما و ارتقا میں معاون ہوتے رہے ہیں۔ تمہاری عقل زیادہ سے زیادہ تمہارے اپنی اندرونی زندگی کے چند سطحی معاملات کے لئے قوانین بنا سکتی ہے، لیکن وہ قوانین جن کا اثر انسانیت ہی نہیں بلکہ حیات کی مکمل تاریخ پر رہا ہے کس طرح کسی ذہنی عقل کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ وہ خود فطرت کے وضع کردہ ہیں، اور انکی نوعیت و مقاصد کا علم خود فطرت کو ہو سکتا ہے۔

لطیف، تم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ تمہیں تخلیق عقل سے دست بردار ہو کر فطرۃً عقل بن جانے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے متعلق کی گھینٹا جانی سے بچو۔ یہ ورنہ یہ کج بحث تمہیں ذہنی الجھنوں کا مبتلا کر کے ایک دن صحیح فطرۃً عقل بنا کر رکھتی مذہب و اخلاق کے اصول ہی، جسکا تعلق عقل سے زیادہ وجدانیات سے ہو، اور غلبگی، ثروت کے آگے ان کی عقلیت پیچ ہو جاتی ہے، جن میں ان ذہنی الجھنوں سے بچا کر تمہارا دماغی توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ خدا کے لئے تم جی کو مذہب و اخلاق کے متعلق ان غلط فہمیوں سے نجات دلاؤ جسکی وہ شکار ہو رہی ہے اور جنہوں نے اسے تمہیں اپنا ہم مذہب سمجھ کر تمہاری طرف مائل کر رکھا ہے۔ تمہارا مسبقہ اخلاقی فرض اسوقت ہو ہے۔

میلنا کیلش، عمر نر

سید محمد محسن، ایم اے، عظیم آبادی

## جواب

لطیف،

میں نے تمہارے خط دیکھے۔ واقعی کتنے دلچسپ اور پکڑہ خیالات پر مشتمل ہیں۔ اگر ایسے شاہ کا دل کا جدید ادب میں اضافہ ہوتا رہا تو وہ دن دور نہیں کتا روز ان اپنی لطافت اور بلندی تخیل کے امتداد سے سارے عالم کے ادب کو چیلنج دے سکے۔ اور صحیح تو یہ ہے کہ ایسے نظریہ و تحقیق کے ہوتے ہوئے انسانوں کا گھر باقیہاں اپنے ادب کی تکمیل کرنا یا دوسروں کے ہاں سے چوری کرنا ہے اور یہ برا احسان کیا تم نے انہی غلطیوں کا

اردو وال طبقہ کی رہبری کے لئے نمونہ اعلان بھی کر دیا لیکن مجھے تو شک تھا کہ جس طرح تمہارے دوست نے کمال زور دی وغیرہ "مال چلنا" سیکھا ہے، اسی طرح تم نے یہ "حقیقت نگاری" بھی ایسوں ہی سے سیکھی ہوگی، ورنہ ہم مشرقی تہذیب کے بلند دستائوں میں کھلا یہ بات کب پیدا ہو سکتی ہے؟

خیر! یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی۔ اصل مقصد تو تمہارے درد کا درماں ہے۔ چچو کو تم میرے لئے اعلیٰ بلکہ فرضی ہو، اور انسانوں کے مقابلہ میں حقیقت پسند اگر اس تمام نگلفات بار کو جو درد اور کے پیوند سے انسان ہی کی شاخ ہو جاتے ہیں، بی طرف کر کے جہاں تک ہو سکے صاف الفاظ میں لغز مضمون کا جواب دیدوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا نا؟

حقیقت میں تم لوگوں کی حالت بھی کسی قدر قابل رحم ہے کہ کل ترستا ہو، ہر بات تمہیں پہونچنا، اور تمہارے ساتھ منصوبے، اگرچہ کو دا گرچہ چھپنا، ہر جا کر تم ہو جاتے ہیں۔ اسی سے تمہاری اولوالعزیز اور مقصد کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک طرف تو مذہب و اخلاق تمہارا خاص میدان رہا ہے اور مذہبی روایتی و بلند نظری کے لئے تم کا فی بد نام بھی ہو، اور دوسری طرف تمہاری ہمدردی اور جذبہ انشاد کا یہ عالم ہے کہ تم سارے مذہبی احکام کو بالائے طاق کہہ کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کو اپنا خاص نصب العین قرار دینے، اور اس جہول کے لئے سارے اصول کو قربان کر کے کوتاہی ہو۔ لیکن علی تجرکہ بھی نہیں۔ ملی ہے جاری تم سے اس ننگے مٹیسی، جو اور تم ہو کہ "پڑے قرضہ" کے باوجود گلیٹھ لٹھ لٹھ جاتے ہو۔ حالانکہ جلتے ہو، قرض کی ادائیگی اور ان بچانا، دونوں انسان کے اولین اخلاقی و انصاف ہیں۔ کبھی تمہیں اپنی ہیروی کا خیال آتا ہے اور کبھی معیار اخلاقی کا، بلکہ کبھی ایسا نہیں کرتی حالانکہ وہ بھی تمہاری "ہم مذہب" ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اعلیٰ مقصد کے آگے مذہبی فروعات قابل لحاظ نہیں ہوتے۔ اسے تو تمہاری "ایک ہی" اور مختلف رنگ کے گلوبت والی مثال یاد ہے، اور شاید یہی ہے ہی موقوفہ کے لئے، لیکن تم خود جہول گئے۔ آخر ہونا ہندوستانی!

تمہاری ہیوی جھولک دین سے اس قدر تنگ ہو کر جو علاج بھی اس کے تدارک کے لئے ہو سکے کہ اسے الکا نہیں خواہ اس میں اسکی جان ہی کیوں نہ جائے، کچھ تو اسنے کہ دیے بھی یہ ریشم کے کپڑے اس کے اندام نازک کو کھائے جا رہے ہیں اور کچھ اسنے کہ شاید اسکو بھی یہ خیال ہو گیا ہو کہ دنیا کو اب ایسی "ذر خیر" عورتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے باوجود اسے ایک بے ضرر اور یعنی علاج سے گریز بھی ہے جسکے بدلے پر اتنے بل پڑتے ہیں کہ تم حبیباً مضبوط انسان بھی مرعوب ہو کر یہ سبب انتشار ڈھیلا پڑ جاتا ہے، ہر صورت کے اگر وہ تمہیں ملی کی باری کے لئے دفعہ کو قبی توقیع نظر اس سے کہے علاج اس کا مقصد پورا ہو جاتا، اس انشاد سے وہ قدیم روایت بھی زندہ ہو جاتی کہ ایک ہندوستانی عورت اپنے شوہر کے مقصد و مرضی کے لئے خود کو قربان کر دیتی ہے یا پھر خود بخود جیشیت مذہبی ہونے کے پنا..... مثنیٰ وَتَلَا تَدْرِمَا نَعٌ" والا حیرت انگیز کہ اسکی مذہب نہ رکھتے، لیکن تم میں اتنی ہمت و عقل ہوتی تو یہ روز بد کہنا ہی کیوں نصیب ہوتا۔

ملی کے نزدیک "کچھ کشتی" سے زیادہ اعلیٰ مقصد اور کوئی نہیں۔ کیوں کو اسے بھانے نام روز شوہر کے خیال کے مطابق خودی نجات کی ضرورت ہے، جسکے لئے اس سے بہتر مقصد (خصوصاً یہ حالت ایسی) یہ ہوتا ہے کہ ایک رفاه عالم کی یا گار قدام کی جاتی اور اس پر ایک کتبہ "کچھ کشتی کی آرزو" وغیرہ کے عنوان سے لگا دیا جاتا اور وہ ایک ایسی اور بلند ترین نوعیت اختیار کرتا، لیکن اس کی تمنائیں تو ایک ایسی سی سے وابستہ ہیں جس کی تکمیل اتنی ہی مہموم اور غیر یعنی ہے جتنی کہ تمہاری اولاد سے اس کا حاصل، حالانکہ وہ جانتی ہے "قدرت کیسا متعاقب کرنا خطرناک ہے"۔

تمہاری "ہم مذہب" ہونے کے اعتبار سے گویا وہ بھی اس "مقدس نیکی" کا راز آب کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہے، لیکن مانا

کی بزرگی اور وقار کا یہ عالم ہے کہ وہ "نیکی" کی جگہ پر بھی "نوندوں" اور "بزرگوں" کا امتیاز رکھتی ہیں۔ حالانکہ سنا تھا ایسے موقعوں پر تو معمولاً یاد کی صفت بھی جدا نہیں ہوتی۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس عمر میں نوندوں سے بھیک مانگتے ہوئے انہیں شرم بھی آتی چاہئے۔ رہا اس خیانت کا سوال، تو وہ بچپن سے اسکی عادی رہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ بچپن میں بھل جاتی تھیں اور اب صرف بچ چرانا چاہتی ہیں، "ہوئے گن موئے" ساقی "تو سنا ہی ہے، پھر عترت راض کی کیا بات۔

اگر انہیں صرف مقصد باری اور محنت بانی منظور ہوتی تو جہاں اس دور جدید میں اتنے نوجوان اسکوئٹس ہر وقت، ہر منٹ کی مدد کو مہل ایمان سمجھتے ہیں۔ اس بحر غم میں بے کس مسافر کی نیا کھینے بھی کوئی، کوئی تیار ہو جاتا۔ مگر انسو اس کا ہے کہ بچپن کی بھولی "کے لے صرف" راجہ رام تلک کی ضرورت جو اور وہ بھی صرف تم جو۔

مسر باواسو اس معاملہ میں تم سب سے بڑھے ہوتے ہیں کہ صحیح معنائیں انہیں غرض صرف حصول مقصد کی ہے، چاہے وہ کسی طرح ہو، کہیں سے ہو۔ ان کی اتجاہی ہی سے صرف اتنی ہے کہ

لے جان پئے کر بھی تو بچہ اگر ملے بس سے ملے جہاں ملے جس قدر ملے

اور یقیناً انسو اس کی بات ہوتی اگر اتنی فلسفیانہ نسبت، کفارہ اور شفاعت کی بحثوں کے بعد ان میں اتنی فراخ دلی اور وسیع النظری بھی نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس طویل مدت میں بے چارے شاید یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ اتنے عرصے پر یہی "خط سالی" میں مبتلا رہی تو دراصل "تھوڑا سا" خیر واقعات کی نوعیت سے زیادہ بحث کرنا وقت گوانا ہے۔ تباہ صرف یہ تھا کہ انیس۔ میں کا فرق ہی، لیکن قصور سب کا جو اس نے سزا سب کو ملنی چاہیے، یا اعلان سب کا ہونا چاہیے۔

کسی کو حصول مقصد کا صحیح ذریعہ معلوم نہ اسکی اہمیت کا احساس، اسلئے بہتر ہوگا کہ شخص ذرا اپنی کھوپڑی کا علاج بھی کرالے تاکہ دماغوں کا توازن قائم ہو، اور ان کا استتھال اول تو میرٹ پیدا ہونے ہی نہ دے۔ اور جو ہوں بھی تو حصول مقصد کے آگے انہیں ٹھکرائے۔

مگر بے نہیں اس سے تشفی نہ ہو۔ کہ چوں کہ امراض مختلف النوع ہیں، میں پر خفیت اسکے کہ "نیم مکیم" ہوں، لیکن تمہارے لئے "خطرہ جان" جتنا نہیں چاہتا، مختلف علاج پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ تجربہ کے بعد جس کو علاج مفید ثابت ہو براہ کرم مجھے اطلاع دیدے۔ میں اسکے نام نامی سے معنون کر کے کسی جدید شای کوکب شاستر کے مدیر کے ہاں بھیج دوں گا کہ تم لوگوں کی مساعی و تجربہ سے کئی نوجوانان ملک بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

اگر تم سے ملو کیا ہے تو معلوم ہوا ہوگا کہ تم دونوں کے جوڑے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں۔ تمہیں ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو بیوی ہو، مگر جنے نہیں، اور باسکو کو ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو بیوی ہو، نہ ہو، اگرچہ ضرور، اور تمہاری بیوی کی مردم خیزی کا وہ عالم ہے اور اہر مسز باسکو کی خط الرجائی کا یہ حال، تمہاری بیوی کو جننے سے انکار، مگر شوہر کی رحمت، اور مسز آسکو کو جننے پر اسرار، مگر شوہر کی خفیت نہیں، اور وہ کہ تم مسلمان ہو اور وہ عیسائی، ایسی صورت میں اگر تم پرانہ مانو تو بادی النظر میں ایک صحیح علاج تبادلوں؟ سنو بہتر ہوگا کہ تم لوگ آپس میں مصلحت انتظامی کے تحت فی الحال تبادلوں میں "کرلو، تاکہ کچھ تبادلوں خیالات بھی ہو جائے اور فی الحقیقت تم لوگوں کو اس "حالی، گلدار کے تبادلے اپنا اپنا اصلی نرخ بھی معلوم ہو جائے، میرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی منطقی بیوی سے کہہ دو کہ وہ میری چیز

باتوں سے لڑنا چاہتی ہوئے، پھر تو اسے تم کو ملی کی بے کسی پر ترس کھائے روکنے کی کوئی حجت نہ رہی! اب رہا تمہاری غیرت کا سوال تو تم جہاں چکے ہو کبے چاکر! پاس کئے پانی میں ہیں، انکی صحت قابل رحم ہے، دودھ آج نہیں، آٹھ سال سے ایسے ہی ہیں، دودھ دھالی تو لے کھاتے کیا، ڈنگتے ہیں اور جب وہ ساری رات بیٹھ کر گدگدایتے ہیں تو ان کا برہمن غور لبللا اٹھتا ہوگا :-

”میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی لے وہ جلوت نہیں، خلوت ہی تھی“

ایسے موقعہ پرانکے لئے تمہاری بیوی سے زیادہ سکون کا باعث کون ہو سکتا؟ کیونکہ کئی عدم آباد کے مسافروں کی ضیافت کرتے کرتے مشاق بھی ہو گئی ہے۔ بیویں بھی پاس کے دن کے جہاں ہیں بہت جلد تمہارا مال تمہیں واپس مل سکتا ہے۔

پھر تو تمہارا اولیٰ کے آزاد ہونے میں کون باپ کی بیٹی روڑے اٹھا سکتی ہے اس طرح جب تمہیں اس ”مردوں نہ کروں“ کی صبر آزا حالت سے نجات مل جائے تو آسانی اپنے ”کاخیر“ کو انجام دیکھو، ”اولیٰ کو“ ٹیس کے ساتھ ساتھ تکین کا مزہ بھی معلوم ہو جائیگا۔ اخلاقی معیار کا ایک خاص موسم مقرر کر کے اس نے بھی کاچھنکارا پایا ہے مصنف اور محرک خیال تمہیں کبھی نہ ہونا چاہیے، صرف ایک گھڑی کا انقطاع اور ایک ہوسے جبر کا جوش صبر آزا ہو جائے، ”دیو گیت نہیں کس اس میری سستی کے اثر سے“ کچھ دی سوچیں ”پر بھی رنگ خضاب چڑھ گیا ہو، باضابطہ میں جل سے نازہ بہار نہ آجائے اولیٰ تمہیں“ ”زیادہ دلکش اور چین“ کیا، کنواری مٹی نہ لگے تو اسکی حیاتی قسم!۔ ویسے بھی وہ ایک ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر ہوتے ہوئے اسکی تصدیق کر دی ہے کہ تم اس کے لئے ڈاکٹر ہو تو پھر اکیڈم سے کوا انکشن دے کر قوت حاصل کر لیا کون ٹری بات ہو، اور اگر اس پر بھی تمہیں مکروری کا خیال ہوا تو میں سمجھوں گا کہ یہ نہت وہ ہے ”دہ تو بے لکڑیہ مکرور نہیں معلوم ہوئے۔ ہو، ایک شجر بھی لکھ دیتا ہوں، مگر نہ تمہارے لئے معوی ثابت ہو! جوتی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے۔ بھر کتابت چہرے صبح جب غاموش ہوتا ہے۔

اگر یہ نئے پسند نہ ہیں تو پھر تم دوروں پر پھر دور دورہ دو، وہو آج میں کوئی نہ برکیر میں گی۔ تمہاری بیوی تو اپریشن کے لئے تیار ہو چکی، اولیٰ کو بھی جو اس مقصد کی نظر میں جان کا ذرا ہی ہے اس سے دریغ نہ ہوگا۔ جہاں اس سببانی دور میں ڈاکٹر نے اتنی ترقی کر لی جو کہ مردہ کو زندہ کرنے کی سعی کیا جا رہی ہے، عورت کو مرد بنانا آ گیا ہے، بچے کی انٹری آدھی کے لگائی جا سکتی ہے، ان دونوں کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور یہ خوش نصیبی ہے کہ ان میں سے ایک عورت خود ڈاکٹر ہی، لہذا وہ آسانی اکیڈم سے کی پمدہ پوشی سے مدد کر سکتی ہیں اس سے مقصد میں کامیابی کی امید بھی قوی ہو جائیگی اور حیثیت سمجھ لوں گے اکیڈم سے کی حق میں یہ مفید ترین اثبات ہوگا اور بہترین صلہ رحم۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اندیشہ باقی ہی رہتا ہے جو تمہارے دوست عزیز کو بے کہیں ایسا نہ ہو تمہاری کوششیں بے ثمرہ جائز اسلئے میں ایک ایسے علاج کا مشورہ بھی دے دیتا ہوں جو آسانی آسان و مقبلاً دوسرے شواہد آسانی آسانی و مقبلاً دوسرے مہنگے، آسانی ہی یقینی ہے مقبلاً دوسرے غیر یقینی، اولیٰ جس کی شکست میں فتح جس کی نامزدی میں کھلے گی، جبکی گناہی میں ناموری جس کی فائیں لقا، جبکی لادلدی میں ماسا کی سنگین جس کی غرض میں بے نہائی، جگہ گناہ میں اخروی نجات جس کی حلاوت میں صحت جس کی تکلیف میں راحت، جبکی جانگی میں جانبازی جس کی بے ٹری میں باروری، اور جبکی دستبازی میں ابدی مسرت و سکون ہے، ”اور وہ صرف ایک وعدہ لاشریک ذریعہ جو جس کے حصول کے لئے مرد فرض شناسی و صحیح خودداری سکیمیں اور عورتیں بھی محبت و ایثار!۔“

تمہارا بیگانہ بہادر

احمد

سید علی شاہ، اکبر، ایم، اے









اہر ڈاکٹر لائی کے یہ الفاظ کہ ”حیثیت جنسی کا حقیقی مقصد انسان کی نگاہوں سے مستور رکھا گیا ایسا غائب کبیس نہیں ہوتا کہ ظہن کی باہمی محبت یا منگائی رعیت افزائش نسل کے باشعور ارادے پر مبنی ہو۔ افعال جنسی کی کشاکش و منہر محض شہوانی جذبات کی تشکین کے لئے کی جاتی ہے۔“

گر لائی تم سے جنسی فعل کی تمتی ہو اور محض بچے کے لئے!! —

### بیمیں تفاوت وہ اذکجا است تا بہ کجیا

یہ ممکن ضرور ہے کہ وہ اپنے جذبات کی نوعیت سے نا آشنا ہو لیکن اصلیت یہی ہو کہ جنسی فعل کو شہوانی لذات کی تئنائی سے جدا کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر اگر ہرگز نہ لائق تو کہوں کہ تم خود بھی چاہتے ہی ہو اور یہ ”چاہنا“ بھی ہی قسم کا ہے جسکو نفسیات کے اہرین صرف متفقہ ہوئے کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ تمہاری ساری تحریر کچھ ایسا ترجم طلب اسلوب رکھتی ہے، جیسے کوئی انسان مجرم و قصو کا ارتکاب کرے سے پہلے اپنی آئندہ حرکات کو سوسائٹی اور اخلاق کے سامنے ناگزیر کہہ کر جائز ثابت کرنا چاہتا ہو۔ تمہارا ایک ایک نقطہ شاہد ہو کہ اپنے ”ہمس و ہمیں کے باوجود تم پہونچنا چاہو اسی نتیجہ پر جسکی طرف لائی شعوری یا غیر شعوری حالت میں جا رہی ہے۔

اب تجھ کو امرت اتنا رہ جاتا ہو کہ تمہیں لائی کے ان شہوانی جذبات کا پاس مناسب ہے یا نہیں۔ اس کا جواب تم خود غیر شعوری کیفیت میں یوں دیکھ چکے ہو کہ — ایک معیار اخلاق معمولی معمولی بہانوں سے جذبات کی بنا پر توڑا نہیں جاسکتا۔ تمہارا بھی جوں جوں کے مد نظر مجھے ابتداء میں کہنا پڑا کہ تمہارا ضمیر اور تمہاری فطرت سلیم بنو ذہن ہی۔ ”علمیت و عقل“ کے اثرات سے کسی حد تک آزاد ہو۔

— بلی اور خود اپنی قریب خور دیگوں کو تمہارے نقاب دیکھ چکے اب ذرا اپنی بیگنی صداقت گفتاری بھی دیکھو۔ — ”جس فعل سے نہ سماج کا فائدہ نہ قدرت کا فتنہ پورا ہو۔ صرف ذاتی ہوس۔ اس کے لئے دوسروں سے اخلاقی قربانی چاہنا خود غرضی اور حماقت ہے۔“

— کہو لطیف! اب تو تم دونوں عورتوں کے خیالات کی حقیقت دیکھ چکے — اب کیا کہتے ہو؟ — تمہارا عزیز

مسعود جاوید

...

## جواب الجواب

مکرم محی عزیز صاحب، تسلیم

آپ حیران ہوں گے کہ یہ کون ہے جو فیروز جیے ہو مجھے خط لکھنے کو تمہارے بگٹی۔ یہ مجھے بتائے دیں ہوں تاکہ آپ کی حیرانی دور ہو میں آپ کے ”ریفرام“ دوست لطیف کی جاہل ہوی ہوں۔ آپ کہیں گے ”ہو، اگر مجھے خط لکھنے سے مطلب؟“ جناب گھر اپنے نہیں مطلب بھی معلوم ہوا جانتا ہے۔

— سال بھر سے کہہ زیادہ ہوا آپ کا ایک خط جو لطیف کے نام تھا میری نظر سے گذرا اس خط میں لطیف کا ایک خط بھی نفعی کیا ہوا تھا جس میں آپ نے باہمی نشان لگائے تھے، آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں چکر لپٹے شوہر کے خط پڑھنے کی عادی ہوں۔ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں خط مجھے نظر پڑ گئے۔ اور ایک دفعہ شروع کر دینے بعد ان کا بے پڑے چھوڑنا بہت مشکل تھا کیونکہ بڑے دلچسپ تھے۔ اگر یہ اخلاقی گنا تھا تو بے شک میں سے یہ گنا نہ کیا۔ خدا معاف کرے۔

خیر یہ محض مٹھنہ تھا آپ کا اور لطیف کا خط پڑھنے کے بعد مجھے ہنسی آگئی تعجب نہ کیجئے میں واقعی ہنسی تھی۔ لطیف کا یہ فقرہ میں بگم سے کوئی بات نہیں چھپانا ایک مذہب کی ضرورت تھا لیکن اس کے ساتھ کی عبارت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مذہب یہ دعوے کرتا ہے کہ میری بیوی میری راز دار ہے، جب بھی وہ بہت کچھ اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ مگر عورت کی فطرت اس کے برعکس ہے، وہ شوہر کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیتی ہے۔ اسی میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے ان دونوں کی ذریعہ محبت کا حال پڑا کہ کوئی غامض تعجب نہیں ہوا کیونکہ جب لطیف نے مجھ سے یہ باتیں کہیں تھیں اس وقت مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ چھپا رہے ہیں اور ایک ”شوہر شناس“ بیوی کے لئے یہ اندازہ لگانا کہ وہ کیا بات ہے، چنداں مشکل نہ تھا۔

میں ہنسی اس لئے کہ مجھے ”جادو دوسرے چہلہ کہہ لوے“ والی مثل یاد آگئی سا دوسرا پر بھی ہنسی آئی کہ مرد اپنی حیوانیت کو کس کس طرح کے پردوں میں چھپانا چاہتا ہے، چھپانا چاہتا ہے، مذہبی سادھاری اور مذہب نظری کے پرچار کا خلاف ”ہے تو خوش ناکٹر لوگ دھوکا کھنا سکتے ہیں۔“

جب سے لطیف نے مجھ سے ملی کا قصہ بیان کیا تھا میں بہت رنجیدہ تھی۔ ”سوت“ کے روح فرسا خیال سے نہیں، کیونکہ کم از کم مجھ میں حسد کا مادہ نہیں ہے، ہاں ہندوستانی عورت کی طبیعت کے خیال سے میرا دل بھر غم میں ڈوب جاتا ہے۔ عزیز صاحب مجھے اس صاف گوئی پر معاف کیجئے گا مگر میرا خیال تو یہی ہے کہ مرد، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر ملک کا (مستغنیات کو چھوڑ کر) جذبات پرست ہوتا ہے مجھے لطیف کا حال سن کر انٹوس تو ضرور ہوا اگرچہ نہیں ہوا۔ ہاں رنج ہوا، سخت اور دل رنج ہوا اسی کی حرکت کا اور اس کی بے حیائی اور بے وفائی کا۔

اب تک کسی بھی ہندوستانی عورت (کم از کم کسی شریعت ہندوستانی عورت) کے متعلق خواہ وہ کسی مذہب اور کسی قوم کی ہو اس قسم کی رلیک بات دیکھنا اور سننا تو کیا کہیں قصے کہانی میں پڑی بھی نہیں تھی، جناب کیا آپ اسے مانتے گے یہ سب برکت انگیزی تہذیب اور معاشرت کی ہے کہ ہندوستانی اس تہذیب کے صدقے میں اپنے مذہب اور اپنی معاشرت سے بیگانہ تو ہو رہی رہے تھے اب انسانیت سے بھی خارج ہوئے گئے۔

مردوں سے تو سخت ہوئی، اٹھ دھوکے کئے گراں تو دل میں یہ شے ہے کہ ہندوستانی عورت، وہ عورت جسکی دفاع کے افسانے تمام دنیا میں مشہور ہیں، جو اپنے شوہر کی لاش کے کپڑے زندہ جل جانا خوشی سے منظور کرتی تھی، جو اب بھی شوہر کے بعد اپنا پیش و آرام کھانا پینا منہا بولنا تک چھوڑ دیتی ہے، جو شہر سے اجازت ہوئیے اور دوسری شادی کا خیال کرنا بھی حرام سمجھتی ہے، جو شوہر کی زندگی میں اس کے بڑے ظلم و ستم کو ”سر تسلیم جھکا کر قبول کرتی ہے“ (تعب کیجئے اور نہ یہ سمجھئے کہ میں محض شہزادی کر رہی ہوں۔ اب بھی ایک دو نہیں۔ سینکڑوں ہزاروں مثالیں آپ کو اس کی نہیں لگیں گی۔ ہاں اب آپ لوگوں کی حمایت سے ملی جیسی عورتیں ہونے لگیں تو انکی نسل ان اوصاف سے خالی ہوگی اتنی گرو جاتے؟ ایسی ذلیل ہو جائے گی، اس حرکت سے نہ صرف وہی ذلیل ہوئی، بلکہ اس نے ہندوستانی عورت کے باوجود نام پر دھبہ لگا دیا۔ جس کا دل غمنا بہت مشکل ہے، اور ادب آپ جیسے لوگ اسکی کمر سہاڑیں گے تو کیوں اور اگر میری تہذیب کی دلدارہ لڑکیاں اسکی تقلید کو پڑا سمجھیں گی۔

مجھے تعجب اور سخت تعجب اس بات پر ہوا کہ آپ جیسا شخص جس کو اب تک میں (مضمون اور قصوں میں) ہرگز بہترین خیالات کا مخزن

مجھے بتی، ایسی بات کہ جسے کوئی شریف شخص ہرگز زبان سے نہیں نکال سکتا۔ معاف کیجئے۔ یہی میں نے لطیف سے کہا تھا اور یہی آپ سے پوچھتی ہوں کہ آپ لوگ اگر مسٹر باسو کی حالت میں ہوں تو آپ اس فعل کو گوارا کریں گے؟ اگر آپ اس کے جواب میں "ہاں" کہیں تو میں سوچا اسکے کہ انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑ کر خاموش ہو جاؤں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔

میرا خیال تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح سمجھا بھگا کر لطیف کو راہ پر لے آؤں گی اور اس فعل قبیح سے باز رکھ سکوں گی مگر یہ آپ کے "ناصحا نہ" خط کا اثر تھا کہ میری کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی، میری کوئی بات لطیف نے نہ سنی اور آپ کی "نصیحت" کو بدل و جان قبول کیا۔

کیا آپ اپنے اس ڈرامے کا آخری سین دیکھنا پسند کریں گے؟

تین بیٹے کے قریب ہوئے ملی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے جو سستی ہوں کہ جو بہو لطیف کی شکل ہو۔

مسٹر باسو، باجوہ اپنی پرانی منظر کے اس صحنے کو برداشت کر کے انہوں نے جب یہ سنا تھا کہ ملی کے بچہ ہو گیا اور تو بہت خوش ہوئے۔ ملی کی ہر دم دلداری کرتے اور نسبت بھی سستی ہوں پہلے سے زیادہ کرنے لگے تھے۔ ان کی صحت بھی "جاننا دے" کے "آئینی خوشخبری سے بہت بخیر گئی تھی" یہی آپ اس بار در دنیا میں وارد ہوئی اور ڈاکٹری نے لیمار اسکی صحت اس ضعیف آپ کو دکھائی تو معلوم ہے کیا ہوا؟

بچی پر نظر پڑتے ہی انہوں نے ایک دردناک جھنجھاری اور لطیف کا نام تین بار بھینک آواز میں اُنکے منہ سے نکلا اور وحش کھا کر گر پڑے۔ اُنھوں نے بے عزت بننے کی کوشش کی تھی، مگر اس میں ناکامیاب ہوئے۔ آٹھ دن تک اپنے چہلے مرض میں مبتلا رہ کر وہ اس "بے حیائی" اور "بے وفائی" کے داغ کو دل پر لے کر نہایت رخصت ہو گئے۔

ہر شخص لطیف پر اطمینان اٹھا تا تھا۔ اور انہیں بقول خود زندگی دشوار ہو گئی، ساری منطق دھری رہ گئی اور اس افسانے کو تکمیل کو پہنچانے کے لئے "مجبور ہو کر" کل انکی اور مسٹر باسو کی "شادی خانہ آبادی" انجام پائی ہے۔

عزتبر صاحب براہ مہربانی مجھے اتنا بتائیجئے کہ اس بدغیب لڑکی کا (جس کی حقیقت سے ہر کوئی واقف نہ ہو) جو لطیف، ملی، باسو اور خاص کر آپ کے ظلم کا نتیجہ ہے کیا انجام ہو گا؟

مسٹر لطیف

"ایک خاتون"

نَجْمُ السَّحَرِ

اپنے ہزار سال پہلے جب مصحفی تہذیب کے مورخ کمال پر تھے تو یہ لکھا کہ کی جی لکھ نغم السحر کے مرتفع ملکوں میں آنکھیں کھولیں، بردان چڑی جوان ہوئی، اور پھر اس کی داستان عشق شروع ہوئی جو حدودہ لائق ہے ساجہ اشتیاق کا عادیہ۔ توران مظالم، کینفر کی ہمارا رستی، شمعون غوی کی محروقتی، غرض اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصحفی کی نظر سے نہیں بچا اور اسکے دوران مطالعہ میں آپ کو ایسا معلوم ہو گا کہ ماضی کا کوشش ظم آپ حال کی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں غفلت، ہم سفارت، قیمت و دوسرے علاوہ

سِلَامْبُو

شہرہ آفاق فرانسیسی استاد ہزار گشتو فلا میر کا شہرہ آفاق ہیں قلابہ قلابہ کی تھی ہوئی تہذیب اس طرح ازمنہ و اعلا میں تو یہ لکھی ہے کہ اسے دو ہزار سال پہلے کی تصویر لکھوں کے لئے آج بھی، سلاست و مائو کی محبت کی کہانی اس قدر حیرت انگیز کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رہتے ہیں۔

دشمنوں کی لڑائیوں کا بیان جب آپ پڑھیں گے تو سانس بھی روک کر لیں گے، غرض شروع سے آخر تک یہ کتاب عجیب فریب چیز ہے خصوصاً ۵۰۰ صفحے قیمت تین روپے، علاوہ محصول و ٹیکس

لے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو، کھارہ باؤلی، لاہور

# ایلی قبرکار

سخت گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میں تفریح کی غرض سے اپنے ایک عزیز، حاجی صاحب کے ساتھ، ٹکے دہی مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ مقام بلوہ سے کوئی پچیس تیس میل کے فاصلے پر ہوگا۔ یہاں حاجی صاحب کا ایک مقلعہ اور کئی وسیع زمینات تھیں، وہ فرصت کے دنوں میں عموماً یہیں رہا کرتے تھے۔ یہاں زمینات کے علاوہ انکی کئی مقامی دلچسپیاں بھی تھیں۔ ان کی باتوں اور غسار طبیعت کی وجہ سے، اطراف کے لوگ انکے گھرے ملاقاتی اور دوست ہو گئے تھے۔

ہم ہر روز صبح اٹھ کر چیل قدمی کے لئے، دو چنگل کی طرف نکل جایا کرتے۔ ایک روز جب ہم دس بیاباں گردی سے واپس ہو رہے تھے، راستہ کے کنارے ایک قبر نظر پڑی۔ یہ بہت معمولی اور کچی قبر تھی۔ لیکن اس کے اطراف دور تک کسی اور قبر کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس بے موت قبر کو دیکھ کر مجھے کچھ تعجب ہوا۔ میں اسکی بے کسی پر دل ہی دل میں حیرت کرتا چلا جا رہا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنی بصیرت کی وجہ سے میری خاموشی کی وجہ تان گئے اور میں قبر کے مقابل پہنچ کر رڑکے، اور فرما لے گئے۔ "آپ کو یہ قبر شاید کچھ بے موت نظر آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "حاجی صاحب! کیا دل کی بات پچانی ہے۔ ہونا آخر روشن منیر۔۔۔۔۔" حاجی صاحب ایک فاختہ انداز سے فرما لے گئے۔ "مگر گڈی ہے اسی وقت کی سستی تھی۔" میں نے کہا۔ "آخر فرمائیے تو ہسی، مٹا کر کیا ہو؟"

اس پر حاجی صاحب نے عجیب سے ہنوا نکالا اور بیان چلاتے ہوئے ایک واقعہ کا راز گرداندارانہ انداز میں کہنے لگے۔ "ابھی نہیں۔ اس وقت تو کھوکھلی لگی ہو۔ گھر چل کر آتے سے فانی ہو لو پھر واقعہ سنئے میں ملتا آنگا۔"

میں خاموش ہو رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ حاجی صاحب کو خود کہنے کا شوق ہو۔ میرے پہلے مجھے بغیر ہی وہ سب کچھ، بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی بتا دیں گے۔

میرا پاس غلط نہیں تھا، ہم نائنٹھ سے فانی بھی نہ ہوئے تھے کہ حاجی صاحب نے خود چھیڑا۔ "کہئے اس کیلی قبر کے متعلق کوئی قصہ گھر آیا نہیں۔۔۔"

میں نے تجاہلِ حافظانہ سے کام لے کر جواب دیا۔ "حاجی صاحب! آپ کو خوب یاد آیا لیکن واقعات تو آپ کے دماغ میں ہیں۔ قصہ میں کیسے

گھر سکتا ہوں۔"

چاکی چالی میری طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگے۔ "تو کہو۔ سنئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "سنو گا کیونہیں، اور پھر آپ کی زبان مہاک سے۔ اگر کوئی دلچسپ واقعہ ہو تو ضرور فرمائیے۔"

"دلچسپی کی بھی ایک ہی رہی۔" حاجی صاحب نے زہر خند کرتے ہوئے فرمایا۔ "تمہارے تمام انسانوں سے بڑھ جاتے تو میرا ذمہ۔ جاننے ہو،

کہاں کی قبر ہے۔۔۔۔۔"

میں نے کہا۔ "یہی جانتا ہوتا تو پھر آپ کو کہنے کا کہاں موقع رہتا۔"

جو کچھ فرمائیے لگے۔ "پھر دی قصہ سنئے۔۔۔۔۔"

میں نے سوچا کہ کہیں بات بڑھ جائے۔ اور قصہ دو چار روز کے پھر میں نہ پڑ جائے۔ معذرت چاہی۔ ”میرا کوئی خاص نشانہ تھا۔ معاف فرمائیے۔ آپ کی باتوں میں لطف آتا ہے۔“

عاقی صاحب نے میری معذرت کو شرف قبولیت بخشا اور پاؤں چلاتے ہوئے فرمے گئے۔ ”عظیم علی خاں کو جانتے ہو؟“  
میں نے کہا۔ ”نام سنایا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کا ایک مشہور باغ ہے۔ جو ہمیں کہیں انکی زمینات سے قریب ہے۔“  
اس پر عاقی صاحب خطیبانہ انداز میں فرمے گئے۔ ”آج کل انگریزی خوان، نوجوان، پوئلہن اور ہٹلر اور سولہی کے کارناموں کو دور دہلے رکھتے ہیں لیکن ناواقف ہیں تو اپنے باپ دادا کے وطن کے مشاہیر سے.....“

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ”اور جاننے کیونکر؟ جب آپ جیسے بزرگان ملت ہی ان کو معلوم کرانے میں مشاغل ہوتے ہیں۔“  
عاقی صاحب پھر بڑبڑ گئے اور کہنے لگے۔ ”اس ٹھونس سے عرصہ میں، یہ دوسرے شخصی حوالے میں نے عرض کیا ہے آپ خواہ مخواہ ضرور ہمیں ہمیں تو کوئی بات نہیں تھی..... اچھا تو، عظیم علی خاں ہمارے وطن کے مشاہیر میں سے تھے۔ پھر توجہ پان کا جانا اور آپ کا کہنا فرض ہو گیا۔“  
”ہاں جی بڑا آدمی تھا۔ اب دیے لوگ پیدا ہی نہیں ہونگے۔ بڑا عری اور ذکی انسان تھا۔ مگر تھا بڑا کرا پٹھان۔ یہاں سے کئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پہان کا مشہور ٹانجے کی کسی دیس میں وہ شاید ہندوستان کے تخب باغوں میں ہوگا۔ ماسہلخ میں کیا نہیں تھا؟ ہر طرح کے دیسی اور دلائی میوؤں سے لہے ہوئے درخت، روشیں، انہریں۔ غرض باغ کی اس نواح کی جنت تھی۔ انہیں باغیانی سے بڑی کسی تھی۔ دودھ دانے میوے کے درخت منگا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ سیب، ناشپاتی، امرود، کیلہ، سنترے، لیموں، اور خاص طور پر چینی میوؤں، انڈلی، چھالیہ، مٹی کے بانس بھی چھو یہاں پیدا ہوتے تھے۔ ہیں نے اور کہیں نہیں دیکھے۔ پھولوں میں گلاب، سیوتی، موگرا، چنبیلی، مارواڑ، موتیا، غرض سب ہی طرح کے پھولوں کے یہاں میٹھا درخت تھے۔ آم کا تو پھل چھائی کیلے۔ بہترین آم پیدا کرے میں یہاں اپنی آپ نظر تھا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں سے بہترین انواع کے درخت منگا کر یہاں لگائے گئے تھے خود عظیم علی خاں نے غنعت انواع کے میل سے نئی نئی قسم کے آم پیدا کئے تھے جن میں ”عظیم الفز“ شاید دنیا کا بہترین آم ہوگا۔ کیا آپ نے نام بھی نہیں سنا؟ ہم کو وہ آم کھا کر کیا اتفاق ہوا۔ آم کیا تھا، مہبت کا بہترین میوہ بھی اس پر فوقیت نہیں رکھتا ہوگا.....“

میں نے قطع کلام کیا۔ ”سمان کہنے۔ کہ فرودالیا دے کھے میں جو انکی زبان سے نکلے ہو میں عاقی صاحب ان ترش رو ہو کر فرمے گئے۔  
”یہ تو مہلتاں سمجھائی گئے تھا۔“ مقصد ہے نامزد غمزہ والی بات ہو۔ سچ کہوں۔ ”عظیم الفز“ کے بعد نام کھلے کو طبیعت ہی نہیں چاہتی تھا جی تمام کا مزہ کیا جالا۔“ صبح ہائے مہبت تو نے پی ہی نہیں۔“

میں نے پھر دھکا۔ ”اس تھوڑی سی دیر میں، یہ دوسرے کفر والی دکان کھڑی۔“

”اب تم بات پر زبان پھڑپھڑے ہو تو میری کہہ چکا تم سن چکے۔ ارے میاں یہ تو میں تمہارے قصے کے لطف کے لئے کھک مروج لگا رہا ہوں اچھا تو سننا باغ کیا تھا پورا ہنسی چمن تھا لیکن اب وہاں کیا خاک ہوا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے.....“  
”جب آتش جوان تھا، کیوں عاقی صاحب میں نے دخل در معقولات کہتے ہوئے کہا۔“

”ہاں جی، جب کہ ہمارا آتش، اپنے عظیم علی خاں جوں تھا، اپنے اچھے عروج پر تھا۔ والد قبلہ اس کے عروج کا زمانہ دیکھا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ بڑا ہی خوبصورت پٹھان بچہ تھا۔ جرات اور مہبت کا یہ حال تھا کہ اکیلا ایک گاڈ کیا کھلے ایک شہر پر بھاری تھا۔ ایک کج کل کے نوجوان ہیں۔ انہیں اپنی کنگلی، چوٹی، کا بل سستی سے کہاں فرصت.....“



مجھے متفق مل گیا۔ میں جانتا تھا کہ حاجی صاحب کا طوفان میل اب رکنے والا نہیں ہو۔ ابرو پر ہل ڈال کر کہا: ”آپ کا پہلا شخصی حلہ؟“ حاجی صاحب چمکرائے، ہان کا بیڑا میری طرف بڑا کر فرمایا۔ ”لو ہاں! کھاؤ، ٹھنڈا ٹھوک دو۔“ چار روٹے سخن کسی کی طرف ہو تو وہ سیاہ۔ ”مشہور ہے کہ سپاہی کا ذوق ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بے راہ رو مذاق کا شگوفہ ہو، جس اقلیدس کے خطوط میں سخن نظر آتا ہے، کیا ہیں تہارے موجودہ مکان، سوا اقلیدس کی شکلوں کے؟ اعظم علی خاں کے مکان کو دیکھو تو ایک سپاہی کے ذوق کا صحیح پتہ چلے گا۔ مکان کیا ہے، ایک اچھا خاصا محل ہے، کیا نفیض ہے، کیسے کیسے دکش گوشے نکالے ہیں، محل، دفتر، جہان خانہ، صلیب، سرداب، جوئریزمن، راستوں سے لے ہوئے ہیں۔ دیکھنے سے تعجب نہ کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ راستے مختلف سمتوں میں، دور تک چلے گئے ہیں۔ اور گھٹنے جھکوں میں کھٹکتے ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ اعظم علی خاں کی ذکاوت ایک بڑے مدبر کی ذکاوت تھی اور ان کا زانا گویا حیدر آباد کے قرون وسطیٰ کا آخری زانا تھا، ان کا براہ ازمنہ وسطیٰ کے یورپی سوراؤں کی طرز کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ انکی طبیعت کی وسعت پذیر ہی نہ تھی، بلکہ کچھ موزوں مقام نہیں تھا، اسی لئے وہ علیحدگی اس طرف چلے آئے، اور حقیقی مضمون میں راج کرتے رہے۔

ان کے پاس منتخب جاں بازوں کی ایک جماعت تھی۔ جو نہ صرف انکے کام آتی، بلکہ غریب اور مظلوم کسانوں اور زمینداروں کی مدد اور پوری کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ ذی اثر زمیندار، چھوٹے چھوٹے مزارعین کی زمینات پر قبضہ کرنے کی ہمیشہ ناک میں رہتے ہیں۔ جہاں کسی مظلوم نے خان کا درگاہ کھٹکایا، یہ اپنے سوراؤں کے ساتھ ان کی آن میں، غاصب کے سر پر نائل ہو گئے کسی کی مجال تھی جو چھیرے ہوئے شیر سے بچ کر کسی کھانا لہا اوقات غاصب کو خود اپنی زمینات سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے تھے، اور وہ مظلوم کے حوالے کر دی جاتیں۔ یہ حقیقت میں حیدر آباد کا ”دراہنہ“ تھا۔ اعظم علی خاں کی دولت کے بڑے قصبے مشہور ہیں۔ ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ”روپیہ کی تجارت“ کرتے تھے۔ اصل میں اعظم علی خاں کی دولت کا بڑا حصہ ان کے والد ہی کا کیا ہوا تھا۔ بڑے میاں کی حالت تھی کہ صبح اٹھ کر آسامیوں سے روبات وصول کرنے بیٹھ جاتے، اور جب تک بچیس تیس ہزار ان کی تجویز میں نہ پڑ جاتے، کھائے کا ایک دانہ ان کے منہ میں نہ پڑتا۔ جس روز اتنی رقم جمع نہ ہوتی، بچھیرے لے کر ان پر کھانا حرام تھا لیکن خدا بڑا رزاق ہے۔ انکو شہ پڑ ہی گئی بھوکا رہنا پڑا ہوگا۔

سہوت بیٹے باپ کی دولت میں امنا فی کیا۔ حالانکہ وہ پرلے درجے کے شرف بھی تھے۔ ہر چیز میں توازی، بلکہ شان و شوکت تھا۔ ان کی فکر لٹ و لچبیسوں کے بے شمار قصبے مشہور ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ بمبئی سے واپس ہو رہے تھے۔ ریل کے صحن ڈبے میں یہ بیٹھے ہوئے تھے، اس میں دو انگریز، اور دو ہندوستانی مسافر اور بھی تھے۔ راستے میں، ان کی چال کے کا وقت آگیا۔ ملازم نے اطلاع دی کہ آگ بلا ٹیکا کوئی سامان نہیں ہے، اشیائے ان کے ساتھ بھی تھیں صرف پانی گرم کرنے کی ضرورت تھی، خان صاحب انتظار کو کسر شان سمجھتے تھے۔ ادھر ادھر دیکھا، جیسے ٹکٹوں، آخری ٹکٹوں کا ایک ہنڈل جیسے نکال کر ملازم کے حوالے کیا۔ اور حکم ہوا ان کو حاکم جانے تیار کیا جائے۔

مجھ سے راز نگاہیں ہر بات کاٹ کر کہا: ”کیا حاکم تھی... اس میں کوئی غلطی کی بات ہو۔“

اس پر حاجی صاحب دباؤ میں آکر فرماتے گئے: ”اب آپ ان انگریزوں کی طرح، اسکو حاکم سمجھیں، بابہ وقتنی۔ بڑے آدمیوں کی حاکمیت بھی بڑی ہوتی ہے۔ انکی ایک سیرت ہوتی ہے، انکی ایک وضع داری ہوتی ہے۔ جس کو وہ ہر حقیت کے معادضے میں خریدے پر تیار رہتے ہیں۔ انگریز سوداگر تھے اس راز کو کیا جان سکتے تھے۔ لیکن ہندوستانی مسافروں کا، ہمیں فائدہ ہی ہوا، ان کو جب معلوم ہو کہ یہ ایک حیدر آبادی شخص

ہیں، تو وہ، حیدر آباد کی دولت سے لیے مرعوب ہوئے، کہ چوکڑی بھول گئے۔ اور بجائے منزل مقصود کے، حیدر آبادی کو منزل مقصود قرار دے لیا، اور محنت، آزمائش کے لئے سیرت حیدر آباد چلے آئے۔

لیکن یہ سب اُس زمانے کی باتیں ہیں جب ہماری دولت ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اب ایسے دل گرہ رکھنے والے کہاں پیدا ہوتے ہیں! ایک اور واقعہ سنئے۔ یہ خود ان کے ملازم نے والد سے بیان کیا تھا۔ خان صاحب دسترخوان پر بیٹھے تھے، ملازم نے دیکھا کہ کاج کا گلاب پھیرا ہے وہ ڈرا کر کہیں، اس کی پاداش میں جان ہی سے ہاتھ دھونا نہ پڑے۔

خان صاحب کی نظریہ کرگلاس اٹھایا، اور آدھیں جا کر اُسے صاف کرنے لگا۔ لیکن خوف زدہ بے حد متعجلدی میں گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور چین سے پتھر پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ابھی گلاس کے ٹکڑوں کی جھنجھٹ ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُدھر سے خان صاحب نے آواز دی۔ ملازم، عزیز کا خون خشک ہو گیا اور اپنے اگلے پچھلے گناہوں کو یاد کرتا اور توبہ اور استغفار کرتا ہوا خان صاحب کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، جب وہ خائفتہ کے سامنے پہنچی تو خان صاحب نے اس کی مہبت کرائی کہ مرنے پر تکبیر پڑھو دیکھا، پھر فرمایا۔ "میر غلام! میں نے گلاس میں؟"

"مالک! مجھ معلوم نہیں، آٹھ دس ڈھن ہو گئے۔" وہ مقررہ کتاب پڑھتا۔

"اچھا اسی وقت جا، اور جتنے گلاس موجود ہیں، سب لے آ۔"

اس انوکھے حکم کی تعمیل کے لئے وہ ابیدار اور بچہ کی حالت میں گیا اور تھوڑی دیر میں دو تین ٹوکروں میں گلاس بھر کر آیا۔

خان صاحب نے فرمایا۔ "یہ گلاس لے، اور وہ گلاس جہاں گرا تھا وہیں پر ایک ایک گرا تا جا۔"

ملازم کے اور بھی حواس باختہ ہو گئے۔ وہ سمجھا کہ یہ تعزیر کا کوئی بڑا لادھنگ نکالا گیا ہے۔ لیکن حکم حاکم مرگ مغاہات۔ یا حافظ دیا ہوتا پڑھتا ہوا، گلاسوں کے ٹوکڑے اٹھا، اسی مقام پر جا کر، ایک گلاس اٹھائے اور چھوڑنے لگا۔ خان صاحب بٹ بٹے بیٹھے تھے۔ اور ادھر چین چین چھنا چھین چھن چھنا چھین چھن کی دیر و بھر کی آوازیں مسلسل اُٹھ رہی تھیں۔ کوئی گھنٹہ بھر میں یہ شغل ختم نہ ہوا۔ اور ملازم ہاتھ پونچھتا ہوا عجز کی صورت بنا کر سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ خان صاحب نے منہ پھیرتے ہوئے فرمایا، "ادھوں۔ وہ پہلی بات ہی اورو تھی۔"

خان کی اس ذہینیت کو سمجھنے سے لوگ آج تک قاصر رہے۔ لیکن یہ کہ یہ تشریف دولت اور کاروائی کی بدستی ہو۔ لیکن یہ ان کی ایک مخصوص سیرت تھی وہ اذیت و سلی کی امارت کا کمال اور ہم بزدل تھے، اور ان کے محبوب اس سیرت کا لازمی نتیجہ۔

وہ بچہ کنے وقت تنگ ل میں تھے اور فرخ حوصلہ بھی۔ ان کی سزاؤں کا ذکر سن کر جسم کے روگ لگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی ہمدردیوں کا حال معلوم کر کے، اُن کے لئے دل میں ایک لمحہ جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کے باغ کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اس پر ان کی شخصی تفریق تھی ہر روز، نماز صبح سے خان بچہ کو وہ باغ لے جاتا تھا۔ پہلے قادیان کے محل جاتے۔ اور ایک تیز فاضل کی طرح درختوں کی قطاروں کو بھونڈے کھینچے گزرتے۔ ان کے دونوں ہاتھ پیچھے کو بند ہوئے ہوتے، اور ایک بھری ہوئی دھالی بندوق اس طرح پکڑے ہوئے ہوتے کہ اس کی نالیں زمین کی طرف جھکی رہتیں۔ تھوڑا سا باغ پر چھوڑ کر نظر سبیش لگی رہتی تھی۔ خاص طور پر پاڑی قوم کے افراد، اسے اپنے پھل کو بھی چرنے سے نہیں چمکتے۔ خان صاحب کو یہ چیز سب سے ناپسند تھی۔ بلال مانگو تو وہ باغ کا سا انورہ منت دینے کو تیار تھے۔ لیکن اپنے باغ سے ایک دڑا سا پھل بھی چوری جاتا تو وہ، اس کو اپنی ہنک پیٹتے تھے چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ اندھیرے اندھیرے کوئی اُچھا پھل چرنا نظر نہ آئی۔ اور اُنہوں نے بغیر کچھ پوچھ گچھ کئے، دن سے اس پر گولی داغ دی۔ وہ مرد ہو کر گر پڑا اور یہ خاموشی سے بیٹھے ہوئے، اُن کے چل دیئے۔ ان کی اس عادت سے درد درد تک لوگ واقف تھے۔ پھر بھی چوری کی غلٹ خوف دہراں سے بھرا تھا

ہی رہتی ہو۔ ایک دفعہ کا واقعہ کہ خان صاحب، حسبِ مروت پہلے کیے تھے، ایک گوشے تہوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ یہ ابھی پوری طرح فہم نہ کر سکے تھے کہ چرکی نظر آن پہنچی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے اور وہ چلا کر، درخت سے گر تو خان صاحب کے قدموں کے پاس پہنچ کر خان صاحب کے بندوق بھینک دئی اور خود آپ ہی اسے اٹھا کر وہاں خانے تک لے گئے۔ یہاں اسے نہایت آرام سے لٹا کر چھبائی کرتے رہے کوئی گھنٹہ بھر کے بعد جب اس نے کھلم کھولی، توانکی صورت دیکھتے ہی بے تحاشہ اٹھ کر بھاگ چلا۔ لیکن پاؤں ٹکھڑے لگے اور پھر دھڑم سے گر پڑا۔ خان نے اسے دلاسا دیا۔ اور جب اسکی حالت سنبھل گئی تو جس قدر میوہ اس روز تیار بنے جمع ہوا تھا، سب نوکروں میں بھر کر اس کے حوالے کیا اور اپنے مالمیں کو اس کے ٹھکرک پہنچائی تاکہ ایک کی جیٹا جاتا لگا تو خان صاحب نے نہایت ملامت سے فرمایا۔

”اب زندگی بھر کبھی اس طرف رخ نہ کرنا“ وہ خرم سے مڑھکائے سامنے سے چلا گیا۔

عظیم علی خان نے ایک بازار بھی بسایا تھا جس میں مزار میں کیے، ممکنہ آرام بھی کیا گیا تھا۔ مڑک کی دونوں جانب میلوں تک گئے ان کے درخت لگا دیئے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھڈائے گئے تھے۔ ایک بڑا گودام بنایا گیا تھا۔ جہاں خرید و فروخت سے بچا ہوا مال آئندہ بازار کے لئے امانت رکھا جاسکتا تھا۔ ہمیں حد درجہ کی امانت داری برقی ہائی ٹی کی کسی کی مجال نہ تھی کہ ایک دانہ بھی اوپر اوپر کر سکے یہ بازار ایسا مقبول ہوا کہ دروازہ مقامات سے مزار میں اپنی پیداوار بیس لے کر آتے تھے۔ یہاں کسی چیز کے گم ہونا یا کھانا ڈنڈہ بھی نہ تھا۔ قانون خود خان صاحب کا تھا۔ یہاں تک کہ ایک پانی خزان یا دھوکے کے کچھ معاملہ کی تو کچھ بھر پیچھے کردہ تفر میں پھنس گیا، اسکی سرزدوں کا ہاتھ کانٹے سے کم نہ ہوتی تھی، اس تفریز کا یہ اثر تھا کہ کوئی ایک پانی بھی بازار میں بھول کر جاتا تو جب تک دوسرے بازار میں خود کار نہ تھا، کوئی اسکو ہاتھ لگانے کا روادار بھی نہ ہوتا تھا۔ یہ بازار آج تک بزرگ قائم ہے اس کچھ شہر ہو تو قبل کو کچھ لو پھلو، ہر طرح آؤ نالو۔ گو اب عظیم علی خان نہیں ہیں، لیکن ان کے جات ہوئے نقشے کا اثر اب تک باقی ہے۔

میں نے کہا: ”یہ سب کچھ ہوا لیکن قبر کا راز اب تک لایعجل نہ“

عاجی صاحب ایک مسخرا میر تقی سم کے ساتھ فرلے لگے۔

”ارے نہیں سچے، تم بھی بڑے بھولے آدمی ہو۔ ابھی تک نہیں سچے؟ قرآن مجید انکے فہم و فراست کے۔ پوری رام کہانی سنی پھر پوچھنے میں سستی مڑھتیا عورت تھی۔ اسی کچھ بوجھ کے بل بوتے پر افسانہ کہنے پلے ہیں۔ ایسے میاں یہ قبر عظیم علی کے ہوا اور کس کی ہو سکتی ہے؟“

میں نے عرض کیا ”میری موتی عقل کے لئے یہ نتیجہ ہیں تقدیر آسان نہیں ہے۔ صاف صاف فرمائیے۔ آخر اس غفلت بستی پر ایسی کیا آفت پڑی کہ انکی قبر اس کس قبر کی حالت میں، اس دیر نہ میں بنائی گئی؟“

”یہ بھی خان صاحب کی الوکی ذہنیت کا نتیجہ تھا۔ ان کی قبر یہاں انکی وصیت کی تعمیل میں بنائی گئی ہے۔ انکی ناکید تھی کہ انکی قبر اسی مقام پر بنائی جائے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ ایک روز وہ گھڑ پر پرا دھرتے گزر رہے تھے، ان کے کبھی دشمن نے، دشمنوں کی آڑ میں چھ کر ان پر گولی چلا دی۔ اور وہ اسی مقام پر گرے اور جاں بحق ہوئے۔“

میں نے جب یہ فحش پورا سن لیا تو عاجی صاحب کے دھوکہ دینا تھا کہ اسکو عظیم علی تھا، اور انکی، دونوں کی یادگار کے طہر پر لکھوں گا، اسنے قانون کرام سے درخواست کی کہ وہ اس قصے کو پھر اس کا قریب خان صاحب کے ساتھ عاجی صاحب کی روح پر دستِ نور کو بھی بخشیں۔ کیونکہ میرے اور ان کے لئے اس قصے کے حقیقی مصنف عاجی صاحب ہی ہیں +

عَبْدُ الْقَادِر سُرُورِی

ایم۔ اے

# تجلیات

مجھ پر وہ بزمِ غیر میں نامہرباں نہیں منظور اُن کو آج مرا امتحاں نہیں  
 ناز و نیاہِ عشق کوئی درمیاں نہیں پھر بھی حبیبِ شوق تر آستان نہیں  
 تجھ کو بصدِ حجاب بھی کچھا ہے بے حجاب میں اور کا میاب تماشا کہاں نہیں  
 صیادِ یہ تمام تصور کے تھے فریب ہر شاخِ گلُ پہ ورنہ مرا آشتیاں نہیں  
 پھر یہ بہارِ گل میں نمایاں کہ میں بھی دیوانگی میں خار سے دامن کشاں نہیں  
 اک مرگِ ناگہاں ہے مجھے ہر نفسِ مگر یہ زندگی بھی زندگی جاوداں نہیں  
 میں خود شناس ہوں مجھ کو کیا پائیگا کوئی یہ راز ہے کہ میرا کوئی راز داں نہیں  
 میرے لئے ہے ذوقِ تماشا حجابِ دست ورنہ بجز نگاہ کوئی درمیاں نہیں  
 محرومِ التفاتِ بہارِ چمن ہوں میں ایامِ گل ہیں اور غمِ آشتیاں نہیں  
 پر شوقِ انکی سمت نگاہیں ہیں بارِبا کیونکر یقین آئے کہ وہ بدگماں نہیں  
 وہ کہ ہے میں پرستشِ احوال اور میں اس طرح چپ ہوں جیسے کہ منہ میں ان نہیں  
 تماشائیں سراغِ منزلِ ہستی بتائے کون اب مجھ کو کارواں بھی پس کارواں نہیں

# مجبوری یا اشارہ؟

چھتریاں ہاتھ میں لیں اور روانہ ہوتے۔

ہم کوئی میل بھر گئے ہوں گے کہ ایک مالی شان کو ملی ہوگی جس کے سامنے ایک خوبصورت بارخ اور ایک طرف ٹینس لان بھی تھا۔ ایک بڑے وسیع برآمدہ میں دو دروازوں پر چھین پڑی ہوئی تھیں۔ تیسرے در کے سامنے ایک جین بورٹین نرس ایک آرام کر رہی تھی۔ جون رہی تھی سگر بار اس کی نظر اندک طرف جاتی تھی۔ میں لشکر کے کھڑی ہو گئی۔ جگہ کی بیماری کا حال سن کر آج مجھے ہر طرف ہی بڑھ گیا ہو گئی تھی۔ شائق نے میرا بازو پکڑا اور سامنے کا سائن بورڈ دکھا کر کہا "پر تو اب کمال جنگ تہاؤں لکھا ہوا تھا۔ میرے منہ سے ہجرت کی ایک جگہ بھلی اور میں تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ شائق بھی میرے ساتھ ہوئی۔ نرس کے قریب گئیں کھڑی تھی۔ یہ جگہ کی خاص خاموشی۔ ہم دونوں کو کوئی میں آتا دیکھ کر گھبراہٹ میں اور نرس حیرت میں رہی تھیں۔ خادمہ نے مجھے بھان لیا اور جلدی سے میرے پاس آئی۔ بولی "کلا بوری تم کہاں؟" میں نے اسے مختصر طور پر بتایا کہ یہ کلا کا نام لکھا دیکھ کر آئی ہوں۔ چھتریاں نے اس سے جگہ کی خبر میں لگ گئیں۔ میں نے مختصر سی سانس بھری۔

"بیوی، وہ تو سال بھر سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ بے جا ہو جائیو کہا تھا۔" اب صاحب یہاں لئے مگر مہینہ بھر سے بیمار ہو گیا اب تک کو دیکھی ہی ہیں؟

میں نے اپنے اڑتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر کہا کہ میں ہم جگہ سے مل چکیں گے؟ وہ یہ سن کر اندر گئی اور دو منٹ بعد کمرے سے اشارہ کیا۔ ہم دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک بڑی مہربانی پر میں پر نرم قدم گزرتے ہوئے تھے۔ پہلی تھی۔ اس کا جسم نرمی رضائی سے ڈھکا ہوا مسلمہ تھی۔ قتا۔ ہماری آہٹ سن کر اس نے کمرے کی دروازہ بند کر دی اور ہمیں کمرے سے باہر نکال دیا۔ وہ دہائی ہوئی حسین آنکھیں کس قدر تھیں اور کیف معلوم ہوئی تھیں۔ اس کا گندمی رنگ جس پر غلاب کا رنگ اور سیب کی سی نرمی، چمکی تھی۔ اس پر سروں کے پھولوں کی سی بالکل زرد تھی۔ گلدان ہاتھ سے لگے تھے۔ میرے دل کو مست کرنے

— — — — —

"شانو کچھ اور سنا"

"کیا؟"

"رفیقہ کا خط آیا ہے۔ مجھ بہت بیمار ہے۔"

"کون کچھ؟"

"تم مجھ کو نہیں جانتی؟ اب کان جنگ کی لڑکی جو میری ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک مہینہ میں نے اسے تم سے ملا بھی تو تھا؟"

"اچھا! وہ کیا بیمار ہے؟"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ کافر مریض ہے اور ساتھ ہی بیہوشی اور اختلاج کے دورے بھی پڑتے ہیں۔"

"تو جیسے! وہ تو بڑی تندہرست لڑکی تھی۔ یہ کیسے بیمار ہو گئی؟"

"میں تو ڈھائی تین سال سے اس سے ملی ہی نہیں۔ وہ تو تعلیم ختم کر کے حیدر آباد چلی گئی اور میں دہلی چلی گئی۔ پہلے تو ہماری خط و کتابت بڑے شوق سے جاری رہی۔ مگر رفتہ رفتہ مجھ کے خط آنے لگے کم ہو گئے اور جو خط آتے بھی تھے ان سے بھی بچانے دل لگی اور مذاق کے جو اس کی خاص صفت تھی اندر وہ دل ظاہر ہوئی تھی۔ میں نے دیر پہلی کو جواب نہ دیا۔ اور کہا تو خط لکھنا بند کر دیا۔ اب ہرگز تو اس کا کوئی خط آیا ہی نہ تھا۔ آج رفیقہ کے خط سے معلوم ہوا کہ سخت بیمار ہے اور ٹھیکہ آئی ہوئی ہے۔"

"تو تم اس سے ملو گی؟"

"ہاں ہاں ضرور۔ مگر اس جتنی رفیقہ نے کوئی کام نہیں لکھا۔ خیر کو پیش کریں گے تو معلوم ہو ہی جائیگا۔"

"اچھا! پتہ بتاؤ گے! اب چلنے چلو۔"

"شانو میرا دل اندر ہے کہ میں نہ جاؤں گی۔"

"مگر تیرا یہ اندر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چلو بھی چلے کو خدا کی قسم چلے گی۔"

میں نے کہا اور خط پر ہم دونوں نے بڑے کٹ پہن لئے



جہن کے پاس اس کی دھجی میں گنڈا دیتا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ نور جہاں مجھ سے کبھی بھی نہ ملے گی۔  
پہلے تو میری جگہ میں اس کی وجہ نہ آئی۔ مگر ایک مہینہ کے بعد  
نور جہاں کی نفرت کی وجہ مجھے معلوم ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ  
شاہ صاحب کی جگہ پر نظر غائب ہے۔ اکثر ایسا ہو گا کہ میں مجھ سے  
پاس ہوئی اور وہ مجھے دیکھ جاتے مگر میری نظر ٹٹے ہی نہیں  
آنکھیں جھکا لیتے اور شرمندہ سے ہوجاتے۔ اگر اتفاقاً نور جہاں  
وہاں موجود ہوتی تو ایسے غصہ کی نظروں سے مجھے دیکھتی مٹی لگتی  
پریشان ہوجاتی تھی۔ شاہد کے عادات و اطوار بہت اچھے تھے۔  
اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ سلیم الطبع اور خوش مزاج نور جہاں تھا۔ مگر اس کی  
محبت بھری نظریں مجھے ایک آن نہ بھاتی تھیں۔ جب کسی وہ مجھ  
دیکھتا مجھے اپنے پیاسے منگیزے کرنے کی یاد آ جاتی اور شاہد سے  
نفرت معلوم ہونے لگتی۔ اُدھر نور جہاں خواہ مخواہ رقابت میں مل  
جاتی تھی۔ میں مجب پریشانی میں گرفتار رہتی۔ شاہد سیکل پر  
پر رہنے کیلئے رشتہ لگایا تھا۔ اور اگر میں ایک دن نہ آتی تو مجھ پر  
رو کر ہر حال لپکتی۔ خود ذواب صاحب میرے پاس دوڑے  
آئے۔ ان کا یہ سوال میں ٹال نہ سکتی تھی اور نہ انکار کی کوئی سہولت  
وجہ بتا سکتی تھی۔ جانی تو شاہد کی محبت بھری اور نور جہاں کی غصہ  
اور نفرت زدہ نظروں کا شکار رہنا پڑتا۔ غرض عجیب طرح کی محبت  
میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ شائق میری حالت دیکھتی تھی مگر اسے مجھ کی  
کی طرف مہذب کر کے خاموش رہتی۔

۳۳

مجھ سے دور سے کہہ گئے تھے۔ حالت اچھی تھی۔ میں تھوڑے  
چوتھے دن اس کے پاس جاتی تھی۔ خانہ شاہد کی حالت کو بگڑے جگہ  
میں کیونکہ جب میں جاتی تو وہ خادستہ کر دیتی کہ کسی کو آنے نہ دیا  
میں تنہا ہی کی ضرورت ہے۔ اس طرح شاہد کی ملاقات سے تو حالت  
میں گئی مگر نور جہاں کا غصہ بدستور تھا۔ اور مجھے اس پر غصہ بھی لگتا تھا  
اور رنج بھی۔

لیکن اب صبح میں مجھ کے پاس گئی تو اسے اندازوں میں  
بحال پایا۔ اکتوبر کی آدھ ہوائے اس پر چھا اٹھی تھا۔ میرا دل  
جوش سے استقبال کیا اور اصرار کرنے لگی کہ آج رات مجھ سے  
رہ جائے۔ میرے بہت پوچھے ہوئے تھے۔

پتلی کے ذواب صاحب کے لیے گہرے تعلقات ہیں، اسی جی بگڑے  
پڑیں۔ آخر میرے آنسو کام آئے اور انھوں نے دن بھر رہنے کی  
اجازت دیدی۔

۳۴

میں روز صبح ۹ بجے مجھ کے پاس چلی جاتی اور رات کو آٹھ  
نوبے پر کاش اور شائق اگر مجھے لے جاتے۔ میں نے ذواب صاحب کے  
راہی کو لیا کہ مجھ کو دوسرے ڈاکٹروں کو دکھائیں۔ سب ڈاکٹروں  
نے کہا کہ سہرا پای ہے۔ دق جس نے بتائی بالکل غلط بتائی۔ لیکن ان  
کو کسی شرم کا مدد نہ پہنچا ہے اور اس وجہ سے دل بہت کمزور ہو گیا  
ہے۔ جس طرح ہو سکے ان کو خوش رکھا جائے۔ اور برعکس خواہش  
پوری کی جائے۔ کھل ہوا۔ اچھی غذا اور خوش رہنا ہی ان کا بہترین  
علاج ہے۔

اب مجھ کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ میں ہر وقت اس کو  
خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی چچا زاد بہن نور جہاں  
بھی نہیں تھی۔ مجھ سے اندازہ لگایا کہ مجھ سے پسند نہیں کرتی اور  
اس کی محبت میں خوش نہیں رہتی۔ اگرچہ منہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔  
ذواب صاحب ہمارے تو ہر وقت بیٹی کا منہ ہی دیکھا کرتے تھے۔  
انھیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ مجھ کی والدہ میں برس پہلے چچی  
تھیں۔ اور ذواب صاحب صرف اس کی وجہ سے اور شادی نہ  
تھی۔ مگر اب مجھ کی بیماری نے ان کی کمری توڑ دی تھی۔ وہ چاکر  
تھے کہ مجھ اپنے دل کا حال کچھ نہ کہو اس کے منہ پر مہر کی مٹی ہوئی  
تھی۔ میں بہت چاہتی تھی کہ مجھ سے پوچھوں اسے کیا غم ہے۔ مگر  
اس کی کمزوری کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی۔ مجھے یقین کرنے کو  
معلوم ہو کہ کوئی نوجوان مدت تک ذواب صاحب کے پاس اگر  
رہا تھا۔ مجھ کی اس کی بہت دوستی تھی۔ مگر سال بھر سے اس کا  
کچھ نہ تھا اور اس وقت سے ہی مجھ سے بیزار ہو گئی تھی۔ مجھ کو کھانی  
محمود اور شاہد اکثر آٹھویں دسویں دن لاہور سے اس کے پاس  
آئے تھے جن کے آنے سے مجھ بہت خوش ہوئی۔ اسے لڑائیوں  
سے خبر نہ تھی۔ نور جہاں بھی جس کا خیال شاہد سے شادی  
کوتھا، اس کے پاسی خبر نہ لگتی تھی نہ سمائی اور بڑے خوش سے  
اس کا استقبال کرتی۔ طرح طرح کے بنا تو سنگار کرتی۔ خیمہ خیم کے  
کھانے پینے کی طرح سے شاہد کو بھانسی کو شیش کوئی  
کھانے پینے کی چیزیں نہ لے کر نہیں کرتا تھا۔ جب اس کا وقت

”کلا! آج میرا شانہ غم سن لو۔ شاید تم کو نہ کرا کر رکھوں گا۔“

”نہ ہو جائے۔“

”بجئے! یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہی۔ میں خود مختاری  
محبت کی داستان سننے کو بے چین ہوں۔ مگر تمہارے مزاج سے  
خبر لگتا ہے۔“

”کیا میں بہت بد مزاج ہوں؟“

”بد مزاج تو نہیں مگر بات پر بیہوش تو ہو جاتی ہو۔ نیز  
میں تمہارا قصہ تو قدر سونگنی مگر رات کے لئے ماسی جی اجازت نہ  
دیتی۔“

”بجئے! دن میں تو بات کرنا بھی مشکل ہے۔ دیکھتی نہیں ہو تو رچنا  
بہت سہ سہ سوار رہتی ہیں۔ دروازہ بند کر تو کرو اور اس سے کان  
ٹھاکر باتیں نہ کرتی ہیں۔“

”کیا یہ فوجی حالت عجیب لڑکی ہے۔“ بجئے! آخر یہ مجھ سے کیوں ملتی  
ہے؟“

”بجئے! کیا پچھو؟ تم اب تک اس کی نفرت کی وجہ نہیں سمجھ رہے ہو۔ تم  
سے اس کا جلتا تو حق بچا ہے۔“

”میرا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔“

”شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ شاید صاحب مجھ سے محبت کرتے  
ہیں۔“

”کیا؟“

”شیک! ایسی بات ہے۔“

”بجئے! اس کی حماقت اور بدگمانی ہے۔“

”یہ بڑی بہن! میں نے اب تک ڈر کے ماتھے پر نہیں کہا  
تو صاحبہ کہ بھائی جان جبری طرح تمہاری محبت میں گرفتار  
ہوں۔“

”بجئے! میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ہتھائے  
ہوں گا۔“

”تمہارے قصور کی سزا مجھے مت دینا۔ میں جانتی ہوں کہ  
تمہاری یہ حرکت کہہ نہ سکتی ہیں۔ سب کا میں ایک طرف  
دیکھ رہی ہوں۔“

”ابھی تک اس کی بات اس کی ہے۔ وہ کسی طرح دور نہیں  
لے سکتی۔ اور وہ نہیں پا سکتی ہیں۔ مگر کلا محبت اختیار ہی بات نہیں  
کرتی۔“

”بجئے! اس شخص کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تو مجھے  
کون سا شہر اختیار کرنا چاہیے؟“

”عقیدہ میں عزم ہے۔“

”بجئے! کون؟“

”میں۔“ دتے میرا بھین کا منیتر ہے اور اگر کبھی ہماری ملاقات  
آزادی سے نہیں ہوتی، اور پچھلے دو سال سے تو ملنا ہی نہیں ہوا  
کیونکہ انھیں سیر و سفر کا بہت طوف ہے اور اکثر ہندوستان سے

باہر رہتے ہیں۔ مگر وہ ہر حال میں میرے دل و جان کے مالک ہیں  
میں دتے کو نہ صرف چاہتی ہوں بلکہ اس کی پرستش کرتی ہوں۔  
تم سمجھ سکتی ہو کہ میں شاید صاحب کی محبت کو کس نظر سے  
دیکھوں گی؟

”بجئے! کلا یاری عقدہ نہ کرو۔ میں بھائی جان کی طرف سے تم سے  
معافی چاہتی ہوں۔ اور یقین دلاتی ہوں کہ اب وہ تم پر ایک نظر  
بھی نہ ڈالیں گے۔ مگر کلا میں پھر یہی کہوں گی کہ محبت اختیار ہی  
چیز نہیں۔“

”اُسی وقت نور جہاں صاحبہ کے انداز سے اندر اٹھائی  
بجئے! اُسے دیکھ کر کچھ اس طرح گویا ہی ذکر تھا، مجھ سے پوچھا،  
”تو اب کلا تم دوسرے کی ہو جاؤ گی؟“

”نور جہاں! (جلدی سے) کیا؟ کس کی؟“

”بجئے! کچھ نہیں۔ کلا کی شادی ہوئی ہے۔“

”نور جہاں! (دیر فرما کر) کس سے؟“

”بجئے! (بے پرواہی سے) اپنے منیتر سے اور کس سے۔“

”نور! کیا نام ہے ان کے منیتر کا۔“

”بجئے! آخر تمیں کیا کہے؟“

”نور! (دیے ہی پوچھا تھا۔) دند بچے کیا مطلب۔“

”بجئے! (ہنس کر) خفا نہ ہو۔ ان کے منیتر کا نام دتے ہے۔“

”نور جہاں کے چہرے پر بفاطرت اچھی اور وہ ہنس ہنس  
کر مجھ مبارکباد دیتے تھی۔ میں دل میں تجھے کی حرکت پر ہنس رہی  
تھی مگر ظاہر میں خوشی نہ دیتی۔“

”رات کو بھائی جان مجھے اپنے منے سے مگر بجئے نے منت سماجت  
کر کے مجھے روک لیا۔ بجئے ہی کے کہنے پر میرا لنگ بچھا لیا گیا۔“

”جب سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو بجئے نے عقدہ شکنایا۔“

”کلا! جب میں تعلیم کر کے جس کا راجہ ہوں تو مجھے اپنے  
مستقبل کی فکر اور شادی کا خیال ہی خیال نہ ملے گا۔“

”ابا جان کو میری محبت کی وجہ سے شاید ہی ملے۔“



لئے کہ بکرت کے خاندان کا حال معلوم کرو۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ نکرت سے بھی اس بات کا ذکر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ اس پردہ بجائے خوش ہونے کے فکر مند سا ہو گیا۔ اور اس دن کے بعد سے اکثر متفکر رہنے لگا۔ مجھ سے کہتا تھا مجھے بھول جاؤں میں تمہارے قابل نہیں۔ میں ہنس کر رونے لگی تو خود بھی بہت متاثر ہوتا تھا۔ وقت جدبالت کو روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ شرم پر تھا۔ اور وہ میرے قدموں میں بیٹھ جاتا۔ تجھ میں ان قدموں میں تجھ کے قابل بھی نہیں ہوں۔ آہ! میں نے کیا کیا۔

اس کی یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ بعض وقت سوچتی کہ اس کو مجھ سے محبت نہیں صرف بہانہ کرتا تھا۔ مگر خیال زیادہ دیر تک نہ رہتا۔ کیونکہ اگرچہ میں انسان کو چھلانے کا ذرا سا بھی مادہ ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ گزشتہ نکتہ سے زیادہ اس کا اور فائدہ آدمی ہونا مشکل ہے۔ پھر خیال آتا کہ وہ کچھ جیسا ہے آخری خیال دل میں بیٹھ جاتا اس سے آخری نکتہ خدا کے لئے اپنا علاج کو رقم کچھ بھاری ہو، وہ جواب میں بڑے پیار سے کہتا۔ تجھ پر تھا۔ اوہم ہے میں بالکل تندرست ہوں۔ البتہ تمہیں چلنے کیا ہو گیا ہے روز بروز ذہنی اور زرد ہوئی جاتی ہو۔ مجھے تیرے لئے پریشان نہ ہو، میری محبت کو ٹھلا دو۔ آہ میں نے یہ کیا کیا تو میں رونے لگی اور پھر وہی سلسلہ قائم ہو جاتا۔

میری محبت واقعی مرنے جا رہی تھی، بھوک آؤ گئی تھی چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے دل زرد زرد سے دھڑکنے لگتا اور خود کو روئے کو دل چاہتا۔ مگر میں نے اس کا ذکر نہ کیا جان سے کیا نہ بکرت سے۔ جب یہ حالت ہوتی تو کمرہ بند کے لیٹ جاتی۔

ایک دن کچھ ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں چادر لیٹ لی تھی، دیکھا کہ نکرت چلے آئے ہیں اور بہت پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ میرے کہنے سے ذرا سا پلنگ پر بک گئے۔ اور بڑی دیر تک مجھ کو نظر جمائے بیٹھے رہے۔ چہرہ سے ایسی کیفیت ظاہر تھی جیسے سنگ کرب کی حالت میں ہو۔ میں کچھ امٹ ان کی یہ حالت دیکھ کر بیٹھ گئی۔ چپکے آٹا کہہ سکی نکرت کچھ کہو۔ آخر کیا بات ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں مگر ایک لمحہ کے بعد وہ انھیں پانی گئے۔ دفعتاً کمرے سے میرا ہاتھ پھڑک

ایمان کے ساتھ اپنا شریک زندگی تلاش کر سکی گی۔ ہماری فائز میں اکثر رکے تعلیم یافتہ ہیں اور اچھے خندوں پر مبنی ہیں۔ وہ اکثر نئی اور چھ سے ملتے بیٹھان سے مجھے نہ کوئی رعیت ہوئی اور نہ نفرت۔ ایک دن سنا کہ آبا جان کے ایک دوست کا خط لیک ایک صاحب آئے ہیں اور وہ کچھ عرصہ یہاں ٹھہر کر چدر آباد کی سیر کریں گے۔ اگلے دن شاہد بھائی نے سرفروخت سے میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ حال ہی میں ترکی کی سیاحت کر کے واپس آئی ہیں۔ اور اسی وجہ سے نکرت کا لقب اختیار کیا ہے۔ پہلی ملاقات ہی میں نکرت سے مانوس ہو گئی۔ وہ اچھی صورت شکل کا قد اور نوجوان تھا۔ عادات نہایت شائستہ۔ مزاج میں بچہ خرافات، روشن خیال اور غلام کیسہ برج کابی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ یہ تھا گھر کا امیر بھی تھا۔ والدین انتقال کر چکے تھے۔ جہاں چاہتا جاتا اور رہتا۔ سیاحت کا بہت شوق تھا۔ ایران، ترکی، افغانستان، عرب اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں چاکر تھا۔ واپس اگر ہندوستان کے شہور شہروں کی سیر کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں چدر آباد آتا ہوا۔ تو آبا جان کے ایک دوست کا خط تعارف کیلئے لائے کہ معزز لوگوں سے راہ و رسم ہو جائے۔

اس عرصہ میں برابر ہماری ملاقات ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ اہمیت پیدا ہوئی اور پھر محبت بڑھنے لگی۔ میں امکان میر نکرت سے الگ رہنے کی کوشش کرتی۔ مگر پھر بھی دن میں ایک آدھ مرتبہ ملاقات ہوتی جاتی تھی۔ میں جوں جوں اپنی محبت کو زبردستی میرا نفوت بھی ٹھٹھاتا تھا۔ سوچتی تھی کہ یہ ناؤ کیسے پار لگے گی۔ خدا جانے نکرت کون ہے، کیسا خاندان ہے، آبا جان کو معلوم ہو گا تو کیا کہیں گے۔ سب سے زیادہ فکر یہ تھا کہ وہ بھی مجھے چاہتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ وہ مجھ سے بہت عزت اور محبت سے پیش آتا تھا۔ مگر آجکل کے لیٹن ایل ڈیو اؤں کے دل کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔

غرض محبت اور قدردانی بے پناہ تھی رہی۔ یہاں تک کہ نکرت نے ایک دن افراد محبت کو دیا جس سے مجھے خوشی ضرور ہوئی۔ عکاس وقت تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ مجھ سے دامن شہرہ نہ گیا۔ اور اندھا بک لگی۔ مگر نکرت جیسے ذہین اور قیادہ شخص آدمی سے اپنی محبت کا دیا چھٹا نا تو گن تھا۔ شاہد آبا جان کے دل کا حال معلوم ہو گا تو کیا کہیں گے۔

میں۔ زندگی جیسی نعمت کو اس طرح ٹھکراتا بہت بُری بات ہے۔  
 مجسمہ۔ میرے لئے زندگی نعمت نہیں۔ فکرت نہ ہونے کو جی کر  
 کیا کرتا ہے۔

میں۔ اول تو ہم سب مل کر اس کی کوشش کریں گے کہ فکرت  
 مل جائیں۔ لیکن اگر وہ خدا نہ کرے نہ ملے تو بھی ہمیں اپنی طبیعت  
 کو سنبھالنا چاہئے۔ اس طرح اپنی حالت خراب کرنا خود کشی ہے اور  
 تم جانتی ہو کہ خود کشی حرام ہے۔ اگر کسی کو محبت میں ناگامی اور  
 اس کی خواہش پوری نہ ہو تو اسے اپنی زندگی کسی کارآمد کام میں  
 صرف کرنا چاہئے۔

مجسمہ۔ اپنی حالت سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں۔  
 میں۔ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ نہ پہلے نہ بعد ہلاکاری  
 آدمی کو محتاج دے بس کر دیتی ہے۔ دوسروں کے سہارے  
 زندگی بسر کرنا کس قدر تکلیف دہ چیز ہے۔ پیاری یہی دل مضبوط  
 کر دو اور کسی کام میں دل بہلاؤ۔

مجسمہ۔ میرا دل یہی نہیں سکتا۔ میں فکرت کے بغیر کچھ نہیں  
 کر سکتی۔

میں۔ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو انسان چاہے اور نہ  
 کر سکے۔

مجسمہ۔ کلاماً کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل ہے۔ غیر میں تمہاری  
 نصیحتوں پر عمل کر نیکی کو سریش کروں گی۔ مگر امید نہیں کہ اس  
 میں کامیاب ہوسکوں۔

————— (۴) —————

اگلے دن میں نے ڈرتے، ہچکچاتے اور شرماٹے ہوئے  
 سارا فقہ ذاب صاحب کو متناہا اور کہا کہ اگر آپ مجھ سے  
 زندگی چاہتے ہیں تو فکرت کی تلاش کیجئے۔ پچاسے پڑی پریشان  
 ہوئے۔ یہ تو میں ہی خیال کیا کرتا تھا کہ فکرت سے محبت ہوئی تو  
 اداسی ملے میں نے اس کے خاندان وغیرہ کا حال معلوم کر نیکی  
 کوشش کی تھی لیکن وہ نالائق ایسا غائب ہو کر خبری نہ دیتا۔  
 مگر مجھے خیال نہ تھا کہ مجھ سے ملے کے جان بیک کی بھی پردہ  
 نہ کرے گی۔ خیر یہی کوشش کرتا ہوں شاید اس کا کچھ ہو۔

اسی دن ذاب صاحب نے اپنے کئی دوستوں اور ایک  
 فکرت کے دوستوں کو اس سے وہ وصیت پڑھائی کہ

میں میں تمام لیا۔ اور عجب درد بھری آواز میں بولے کاش  
 میں ہاتھ ہیٹھ کے لئے نہ سکتا، ہاتھ کو ہونٹوں سے لٹکایا اور جلدی  
 سے چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گئے۔

جب تک وہ کمرہ میں تھے مجھ میں سوچنے کی طاقت نہ تھی  
 جیسے ہی وہ باہر نکلے مغامیرے دل میں خیال آیا کہ فکرت مجھے  
 چھوڑ کر چلے گئے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ دماغ ٹھوٹے گا، جسم قسم  
 کی آوازیں کانوں میں آئے نہیں اور عمر بھر میں پہلی بار بیوقوف  
 ہو کر گر پڑی۔

ہوش آیا تو اباجان اور دونوں بھائی، ایک نرس اور  
 دو ڈاکٹروں کو میٹھا پایا۔ رفتہ رفتہ دماغ میں پچھلے واقعات  
 کی یاد آنے لگی۔ میں نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا  
 فکرت وہاں نہیں تھے۔ شاید نے پیار سے کہا مجھ کی یاد رکھو۔  
 رہی ہو۔ میں نے بے خبری سے پوچھا فکرت کہاں ہیں؟ بھولی  
 نے کہا کسی کام سے باہر گئے ہیں دو چار روز میں آجائیں گے۔

مغرب ہفتہ بھر بعد میری حالت سنبھلی تو اصل حال معلوم  
 ہوا۔ فکرت میرے کمرے سے نکلنے ہی ایک انچی کس ہاتھ میں لیکر  
 روانہ ہو گئے تھے۔ اس دن سے پھر ان کا پتہ نہیں ملا۔ آبا جان  
 اور شاید نے دو ایک جگہ دریافت بھی کی۔ صرف ایک صاحب نے  
 لکھا "وہ لاٹا بالی طبیعت کا آدمی ہے پھر کہیں سیاحت کو چل دیا  
 گا" کلاماً ایسے میری ناگام محبت کی داستان۔ جب ہی کو مجھے  
 سنبھلنے کے قورسے پڑنے لگے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن میں  
 اس قدر مل جاتے ہیں کہ پلنگ سے اٹھوں اور دنیا کے کاروبار

میں سمجھوں۔

میں تو جسے مجھ کی داستان سن رہی تھی۔ درمیان  
 میں وہ کہیں کہیں حرکت بھی مانی تھی اور اپنی آنکھوں سے آنسو  
 بہاتی۔ بحرِ حقہ منانے کے بعد تو وہ بالکل ہی بے حال ہو گئی۔  
 میری کمرہ وود نہ بچا گئے۔ پھل لے چپ کیا، باوریاں  
 لگا دیں۔ جب میری حالت سنبھلی تو میں نے کہا "مجھے بیٹک نکوت  
 کی خدمت سے تعین صدر ہوا ہے۔ مگر اس کے یہ منی نہیں کہ تم  
 کو اس میں جی چھوڑ دو۔ تمہاری بیماری کا اصل سبب حمل متناہی  
 ہے۔ یہ آئی ہے۔ تمہیں چاہئے کہ سب سے پہلے اپنی صحت بحال کر لی  
 جیٹھ ش کر دو۔

موت کا خیال کر کے کیا کرتا ہے۔ مجھے جینے کی تمنا نہیں۔

میں گھس گئیں۔

تمام دن گھر پر اُداسی چھائی رہی۔ شام کو شانتی آئی تو میں اس کا بازو پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ شانتی پہ سے بتا کر کس کا خط آیا ہے؟ کیا بات ہے؟ شانتی اس اچانک سوال سے گھبر گئی۔ پہلے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ایک شرط پر بتاؤ گی تم رنج نہ کرنا۔ میرا دل دھککے ہو گیا۔ خدا جانے کیا خبر ہے قہقہا جلدی کہو۔ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔

شانتی۔ وعدہ کرو۔ زیادہ اثر نہ لو گی۔

میں۔ (بیقرار ہو کر) اسے کیا بوسے کو کچھ ہو گیا؟

شانتی۔ (جلدی سے) تو نے اچھے خاصے ہیں۔ عذاب ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔

میں۔ کیا مطلب؟

شانتی۔ بوسے کا خط آیا ہے جیسے کھلبے مجھے انوس ہے کہ میں بچوں کی مٹتی قائم نہیں رکھ سکتا۔ گلا مجھ سے اود میں گلا کو تقریباً ناواقف ہیں اور چونکہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے

محبت بھی نہیں اس لئے میں نسبت چھڑانے میں کوئی حق بھی نہیں سمجھتا۔ بزرگوں نے بچوں کا ایک کھیل سیکھا تھا۔ ایک

نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک اور جگہ میری شادی ہونے والی ہے۔ تو ہیں جب دوسرے کو اپنی پرواہ نہ ہو

تو خود ہی اس کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ وہ جائے جنم نہیں۔ میری گلا کیلئے اچھے سے اچھا بدل جائے گا وہ ہے کیا چیز؟ ہم اسے

بچتے کیا ہیں؟

میں اچھی طرح شانتی کی صورت کو دیکھ کر ہی غمی کچھ

سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ کیا ہنگام رہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ

میرا ہندو برس کا بنایا ہوا امیدوں کا قلعہ اس طرح ڈھسے جانے جس دلوں کو میں سات برس کی عمر سے اپنے دل میں رکھ کر چوٹا

کر رہی ہوں وہ اس طرح مجھے ٹھکرا دے۔ نہیں نہیں یہ غلط ہے شانتی یہ غلط ہے۔ بوسے ایسا نہیں کر سکتا۔ شانتی شانتی ہرمانا

کے لئے کہو کہ یہ سب مذاق تھا۔ شانتی نے کھینچ کر مجھے بٹایا اور بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ کو تو تم رنج نہ کرو ایسے بیوقوف اور بیکار

آؤی کی ٹھیں بے لگت صورت میں نہ دیکھتی جا رہے ہیں چپ چاپ شانتی کے سینہ سے لپٹی بیٹھی رہی۔ مجھے

اب اس رخ حقیقت کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ آنکھوں میں سیلاب

زیادہ بڑھ رہی تھی اس لئے مجھے دن ہی ہم سب لوگ ملی روانہ ہو گئے۔ میرا گھر ہی دہلی میں تھا اور بختہ کے اصرار سے دہلی جانا منظور کر لیا۔ اور نئی دہلی میں ایک کوچی کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ دہلی پہنچنے کے دس دن بعد ایک صاحب کا خط آیا جس کا خطا کہ فکرت عرب گئے ہوئے تھے۔ چند روز ہونے واپس آئے ہیں اور مکالت میں ہیں۔

بختہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ مناسب طور پر پر خبر بنا دی گئی۔ بختہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا معلوم ہوتا تھا کہ دین و دنیا کی کوئی فکرت اسے مل گئی ہے۔ اس نے اپنے کمرہ دوڑنے لگا پتھروں سے فکرت کو خط لکھا۔ اپنا سب حال لکھا اور اسے ملانے کیلئے منت سماجت کی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس نے فکرت سے ذرا سی بھی شکایت نہیں کی تھی۔ شاید ڈرتی تھی کہ وہ شرمندگی

کی وجہ سے آئینہ کا ارادہ چھوڑ دے۔

میں اور بختہ بیقراری سے خط کے جواب کی منتظر تھے۔

## ۵

پتاجی اور اسی جی کو میری شادی کی فکر پریشان کر رہی تھی

وہ چاہتے تھے کہ پرکاش کے ساتھ ساتھ میری شادی بھی ہو جائے۔ آخر تو تے مہینوں خط بھی دے دیتا تھا۔ اور سال بھر سے تو اس کا پتہ

بھی نہ تھا کہ کہاں ہے۔ بعض وقت پتاجی کو غصہ آ جاتا۔ کہتے کہ کیا نسبت پتھروں کا گا۔ ایسا لڑکا کس کام کا جو ہماری پرواہ ہی نہ کرے۔

مگر شانتی نے ان کے دل میں یہ بات بھادی تھی کہ گلا سوائے بوسے کے کسی اور سے شادی نہ کرے گی۔ اور وہ اب بھی اسے اپنا

دوتا سمجھتی ہے۔ جب پتاجی کو یہ حال معلوم ہوا تو اور بھی پریشان ہوئے۔ بوسے کے عزیز کو خط لکھا کہ بوسے سے کہیں کر لڑکی جو ان

ہو گئی ہم کہاں تک انتظار کریں۔ اس سے کہو کہ جلد شادی کر لے۔ بخود دیاں سے جواب آیا کہ بوسے خدا جانے کہاں ہے۔

اس کا پتہ لگا کر پھر آپ کو بچوں کا۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ پتاجی ایک خط لکھ کر میں لے کر گئے ہیں۔ چہرہ غصہ سے سرخ ہے۔

میں نے اسے دیکھا کہ سوچ رہا ہے اور اسی جی بڑھ رہی ہیں۔ میں نے اسے دیکھا کہ سوچ رہا ہے اور اسی جی بڑھ رہی ہیں۔

میں نے اسے دیکھا کہ سوچ رہا ہے اور اسی جی بڑھ رہی ہیں۔

بھی آگئے۔ آج جان سے معافی مانگی۔ مجھ سے معذرت کی۔ اور بڑی شرمندگی سے اس کا اقرار کیا کہ میں مسلمان نہیں تھا۔ مجھے میٹھ سے اس کا شوق تھا کہ نام بدل بدل کر سیاحت کروں۔ شروع میں محض دل لگی کے لئے تم سے محبت کا بہانہ کیا مگر رفتہ رفتہ منوں کی محبت اصلی محبت میں بدل گئی۔ اب ہر وقت یہ فکرتانی کہ میں نے ایک معصوم اور بیوقوف لڑکی کو فریب دیا۔ اسی لئے تم سے کہتا تھا کہ میری محبت چھوڑ دو۔ تمہاری حالت دیکھ کر اور پریشانی بڑھتی رہی اور آخر ایک دن دل پر پتھر رکھ کر تمہیں چھوڑ چلا گیا۔ کچھ دن بھلائے کی ناکام کوشش کی۔ آخر عرب چلا گیا اور وہاں مذہب اسلام کی تحقیق شروع کی۔ جوں جوں اس مذہب کی تحقیق کرتا گیا اس مذہب کا سچا ہونا مجھ پر ثابت ہوتا گیا۔ اور میں نے وہاں ایک مجتہد کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا حال صرف میرے ایک دوست کو معلوم تھا۔ اسی نے مجھے تمہاری بیماری کی اطلاع دی تو میں واپس آیا۔ آتے ہی تمہارا اور ذہاب صاحب کا خطاطہ میں حاضر ہوں جو چاہے سزا دو۔ پہلے تو آنا جان بہت تھا ہونے کہ میری لڑکی ایک نو مسلم کو نہیں مل سکتی۔ مگر کچھ شاہد اور محمود کو سمجھائے اور کچھ میری چھٹی حالت یاد کر کے مشکل رضاء مند مجھے۔

میں۔ کس بات پر؟

جنگمہ۔ (شرما کر) شادی پر۔

میں نے غم کو لپٹا لیا۔ غم میں تو دل سے مبارکباد

دیتی ہوں۔

جنگمہ۔ محرم کیوں اس قدر دل گرفتہ ہو رہی ہو؟

میں۔ کہ نہ پوچھو خوشی میں رنج کا ذکر اچھا نہیں لگتا۔

جنگمہ۔ نہیں نہیں تمہیں پوچھ کر ہوئی۔ آؤ کیا بات ہے؟ میں

چند منٹ تک اپنے جذبات پر مٹا پوچھتی کہ شیش میں خاموش

رہی۔ صرف اتنی بات ہے کہ کہنے نے مجھے قبول کرنے سے

انکار کر دیا ہے۔

جنگمہ۔ ایس۔ ایس۔ انہی کیوں؟

میں۔ وہ کہتا ہے ہم دونوں میں محبت نہیں ہے۔

جنگمہ۔ تو اسے تمہاری محبت کی خبر نہیں۔

میں۔ مجھ جب مولیٰ کا چہرہ دیکھتا ہوں تو ہر بات سے انکار

کر دیتا ہے۔

جنگمہ۔ اب کسی نہ کسی طرح تو اسے کہہ دینی چاہیے۔

شک مجھ میں مارا تھا مگر میری خودداری مانے آتی تھی۔ جو مجھے نفرت کرے اس کے لئے میں کیوں جان دوں؟ بار بار میرے کان میں یہ فقرہ گونجتا تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔ آہ مرد اپنا سال سب کا بھرتا ہے، اس ظالم کو کیا جزیرہ میں اسے کتنا چاہتی ہوں۔ میں حقہ سے حقہ کھانے لگی۔ شامی ڈال اور زور سے مجھے لپٹا لیا اور پیار سے بولی کھل گیا سردی لگ ہی ہے۔ اور ایک شال میرے اوپر ڈال دی۔ میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ شامی نے آہستہ سے مجھے لٹا کر اوپر مٹائی ڈال دی اور میں چند منٹ میں غافل ہو گئی۔

جب ابھی کھلی تو پرکاش کو پاس بیٹھا پایا۔ وہ غیر نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کیوں بھیا کیا بات ہے؟ میں نے پوچھا اس نے میری بیاض پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کچھ نہیں۔ قدرے حرارت ہو گئی ہے۔ شاید نزلہ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کاشی لگے اور میں کو ممکن اور بدن میں شدید درد ہے۔ اسی وقت پتلی ڈاکٹر کھینچ کر اندر آئے۔ انھوں نے کہا انفلوئنزا کا اثر ہے۔ یہ آہستہ آہستہ لگتا گیا سمجھ رہا ہے۔

دس بارہ دن بیمار رہی۔ دل میں طوفان پھاٹا مگر وہیں سے ہی نکلا تھا۔ سب کو میری اس خاموشی پر حیرت تھی۔ میں ساری مصیبت اپنے اوپر جمیل رہی تھی۔ جس آگ میں جل رہی تھی اس کی آگ سے دوسرے کو کیوں لگاؤں۔ دو تین مرتبہ اب میرے مجھے دیکھنے آئے ان سے معلوم ہوا کہ کثرت کا خطا آیا ہو۔ میرے صدمہ آجائیکا۔ میرا دل بیقرار ہو رہا تھا۔ کس طرح غم کا چہرہ لگا کر دیکھوں۔ میں ناخوار رہی تو کیا خدا مجھے کوئی باخراہ کرے۔ چند دن کے بعد چلے چلے کے قابل ہوئی۔ اور سب سے زبردستی حالت نے مجھے کے پاں پہنچائی۔ جنگمہ اب تندرست تھی۔ مینی کوئی علاج میرے لئے نہیں تھا۔ میری طبیعت نے یہ بیماری کوئی تیار کیا تھا۔ سب تمہاری عزت کے لئے۔ مگر یہ تو بتاؤ تم کیوں بیمار ہو گئیں؟ میں نے سکھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تمہاری بیماری میں

میں نے کیا کیا؟

جنگمہ۔ نہیں میری قسم ہے کہ بتاؤ۔ کیوں تو اس پر؟

میں۔ میرے لئے اس کا علاج تھا۔

جنگمہ۔ اب کسی نہ کسی طرح تو اسے کہہ دینی چاہیے۔

جغمہ۔ کلا اچھے دھوکا نہ دو۔ مجھے اس حال معلوم ہو گیا۔ سر شربت  
اس میں تمہارے مشیت کرتے ہیں۔

میں۔ نہیں بخت میں قسم کھاتی ہوں کہ کھٹ میرے ملک میں نہیں  
تم جانے کس خیال میں ہو۔ خود مشرکت سے پوچھ لو۔

جغمہ۔ (خوشی سے) مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ کلا کلا  
بتیاری چالاکی کی تعریف کرتی ہوں۔ تم نے بہت کامیابی کے ساتھ  
مجھے معاملہ میں ڈرنے کی مشیت کی۔ مجھ میں اتنی ہی اتنی ہے  
کہ حقیقت نہ سمجھ لوں۔

وہ نے۔ بخت تیار خیال ٹیکے ہیں ہی دتے ہوں۔ یہ بخت  
میں میری نسبت کلا سے کدی گئی تھی۔ مگر ایک تو ہم میں  
نہیں ہوئی تو دوسرے اب میں سلمان ہو گیا ہوں اس وجہ سے  
نسبت منوع ہو گئی۔

ایک مرتبہ پھر وہی الفاظ کہ تم میں محبت نہیں ہوئی دوسرے  
داخل میں گئے اور میں نے اپنا سر دووں ہاتھوں میں قائم کیا۔  
جغمہ کی غصے میں بھڑائی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ آپ اتنی  
بات کہہ گئے ہیں۔ دوسرے کے دل کا حال آپ کو کیا معلوم؟ ہم  
کبھی محبت نہیں ہوئی۔ نہیں میری کلا کی محبت کی کیا فکر ہو گئی؟  
وہ نے۔ بخت جھپٹے سے ہی نہیں چھپ سکتی۔

جغمہ۔ ہندوستانی شریف لڑکیاں کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی  
میری مثال نہ لیجئے میں نے عام شریف لڑکیوں کے خلاف آپ کی محبت  
کی اور آپ کے اس کا پتہ لگا لیا۔ کلا کو کیا ضرورت تھی کہ وہ آپ کی  
محبت کا اظہار کرتی۔ جب کہ اسے یقین تھا کہ آپ اس کی شادی  
ہوئی ہے۔ اگر آپ کو یہ نسبت ناپسند تھی تو کیوں ہوش منسلک  
ہی اس نسبت کو نہیں توڑ دیتا کہ وہ غریب آپ کی محبت پر  
کا خیال ہی نہ کرتی۔

وہ نے۔ عجب...

جغمہ۔ مجھے اور کچھ کہنے شے کی ضرورت نہیں۔ تم کلا سے  
اور کلا بتیاری ہے۔ اس کا حق مقدم ہے۔

وہ نے۔ بخت۔ ہم کیا کہہ رہی ہوں

جغمہ۔ (غصہ سے) وہی کہہ رہی ہوں جو میری جگہ ہر شریف لڑکی  
کرتی۔ آپ نے پہلے غریب کلا کو دھوکا دیا۔ اس سے محبت نہ کرتے  
ہی نسبت قائم رکھی۔ اور پھر بعد نصیب کو اپنی محبت کے خیال  
میں پھنسا گیا اور کچھ بخت کلا کی رباب میں بیٹھ گئی۔ آپ کو

میں۔ نہیں بخت یہ ممکن نہیں۔ جو میری محبت کی خداوند کرے چند  
برس کے بعد معاہدہ کو ذرا دیر میں توڑ دے۔ میں ایسے شخص کی منت  
نہیں کر سکتی۔

جغمہ۔ تو اب کیا ہوگا؟

میں۔ صرف یہ کہ اب کبھی میری شادی نہ ہوگی۔  
جغمہ۔ اگر کہیں دتے مجھے مل جاتا تو ایسا لڑکی کی یاد تو کرتا۔ بدلت  
ہے کہ کلا کبھی دیوی کی قدر نہیں کرتا۔

میں۔ چھوڑو اس ذکر کو۔ یہ کوئی تھاری شادی کی ہے۔  
جغمہ۔ اب اس کی خوشی نہیں۔ ہی۔ کلا رنجیدہ ہے تو بخت کو کیا خاک  
فوشی ہوگی۔

میں۔ نہیں میں تم سے زیادہ خوش ہوں۔ اچھا آپے محبوب کو ذرا  
دکھاؤ تو۔

جغمہ۔ محبت آپ کی اقدار صاحب آگئے؟

میں۔ تو کیا محبوب نام رکھا گیا ہے؟ بڑا موزوں نام ہے۔

کسی نے آہستہ سے دستک دی اور ایک شریف لڑکی اور اس  
دی بخت میں آسکتا ہوں؟ "جغمہ نے میری طرف غریب دریا بان لدا  
سے دیکھا اور کہا۔ آئے تو کوئی شخص شام کا یہ سوٹھنے کے  
میں داخل ہوا۔ میں نے جلدی سے ساڑی کا آئینہ سر پر لایا۔ اور  
نظر اوپر اٹھائی۔ یہ نہیں پس کی بیٹی رہ گئیں۔ سر میں چکر آیا کہہ کر

کھڑی ہوئی اور دو لڑکا سہارا لیا۔ میرے منہ سے نکلا۔ یہ کیا؟  
دتے یہاں؟ اور کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جغمہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کسی  
پر بھاڑا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ بخت ادہ دتے پر میری اس حالت کا کیا  
افراد کیونکہ کچھ دیر تک مجھے ہوش ہی نہ تھا۔ چند منٹ بعد میں اس  
قابل ہوئی کہ معاملہ سمجھ سکوں۔ سب باتیں سینے کے پردے کی طرح  
میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئیں اور کل معاملہ میری سمجھ

میں آگیا۔ میں نے پشیمان اپنے جذبات پر قابض کیا اور بخت پر غصہ  
ڈالی۔ وہ میرے گہمی مجھے ادہ بھی دتے کو دیکھ رہی تھی۔ ادہ دتے  
سر جھکا کر خاموش کھڑے تھے۔ میں نے بخت کے کہنا۔ بخت مجھے  
کیا ہو گیا تھا؟ شاید کسی قسم کا مادی دور دور تھا۔ میں کسے دتے

بجھا۔ جغمہ نے مجھے دیکھا غریب طرح دتے پر نظر ڈالی۔

جغمہ۔ اسے کیا میں مشرکت کو دتے بھی تھی۔ تو یہ توہ مناف  
کی مشرکت۔ میرا دل اس وقت دھلے کیوں مطلق سا ہو گیا  
تھا۔ تو مجھے کون اس طرح دیکھتا تھا؟

جسم سے شادی کرنا پڑے گی۔

بجھم کہہ ہو گمب میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔  
وے۔ کلا اگرچہ میں تمہارا قصود وار ہوں مگر تمہیں سے مدد  
کی درخواست کرتا ہوں۔

میں۔ سرِ نکرت نگہ نہ کیجئے۔ بجھم سے آپ کی شادی ضرور ہلڑ  
ہوگی۔

بجھم۔ ہرگز نہیں۔ میں اور کلا کی رقیب !

میں۔ نہیں تم میری رقیب نہیں ہو۔ اب نکرت میرے بھائی  
اور تم میری بھانجہ ہو۔

بجھم۔ کلا! ہوش میں آؤ۔

میں۔ میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ نکرت! ادھر آؤ بجھم  
کا ہاتھ پکڑ کر لو کہ میں اپنے کو تمہارے قابل نہ سمجھ کر اپنی عزت

اور پیاری بہن کو تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ اب تم میرے بہنوئی  
ہو۔ ان کی قدر کرنا۔

وے۔ کلا! کلا!!

بجھم۔ نہیں کتو نہیں! دے تمہارا ہے۔

میں۔ دے میرا تھا۔ مگر نکرت میرا نہیں تمہارا ہے۔ نکرت  
میری بہن سے بیو فانی نہ کرنا۔

یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل کر گھر روانہ ہو گئی۔



اچھے دن چٹائی سے اجازت لیکر میں لاہور پہنچا کے  
اں روانہ ہو گئی۔ تاکہ دے اور بجھم سے دور رہوں۔ شادی  
سے کہہ گئی کہ فواب صاحب کے ہاں کسی کو میرا پتہ نہ معلوم ہو۔

یہ سب کچھ کیا مگر دے کی یاد ایک منٹ کیلئے بھی تھوڑی  
نہ ہوتی۔ اکیلی بیٹھی رہتی بد نصیبی پر آشوبہا کرتی تھی۔ میرے

لے سب سے زیادہ تکلیف وہ خیال یہ تھا کہ جس سے چندہ سال  
میری نسبت رہی جس پر میں باجی نثار کے نیکو تیار ہوں اور میری

ذرا نگاہ رواہ نہیں۔ اگر کسی اندوہ سے میری دے سے شادی  
نہ ہوتی، مگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے تو میں

تمام زندگی اس فیض میں خیال کے ساتھ گزاری دیتی کہ میرا محبوب  
بھی مجھے چاہتا ہے۔ کاش میں اس دھوکے کی میں مانتی مگر اب

تو میری زندگی میں کوئی دل خوش فتن خیال نہ تھا۔ کس عید  
پر اس پہاڑ کی زندگی کو چاہتا تھا۔

سب تک میں خاموشی کے ساتھ بجھم اور دے کی گفتگو سننے  
کی۔ میرے دل میں سیکڑوں قسم کے خیالات آتی ویر میں گزر

تھے۔ یہ سوچ کر کہ میں اتنا چاہتی ہوں وہ بجھم پر فدا ہے۔ میرے  
دل میں حد کی آگ جلنے لگی تھی مگر بجھم کی گفتگو نے اس آگ پر

آبی قندیل دیا۔ ایک لمحہ کیلئے یہ خیال میرے دل میں آیا کہ اچھا تو  
بجھم دے سے شادی نہ کرے اور وہ نامراد ہی رہے۔ تب مجھے

معلوم ہو کہ دوسرے کا دل دھکا ناکیا ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال صرف  
ایک لمحہ کیلئے آیا۔ فوراً ضمیر نے لعنت طاعت کی۔ بجھم کی یہی

بالت نفروں کے سامنے آگئی، دے کی محبت پھر عود کر آئی۔ میں  
احساس و نامراد ہو رہی۔ بے لاگ محبت ہی ہے کہ دے کی خوشی کو

قدم بہوں۔ بجھم اپنی مراد کو پہنچے۔ اس وقت وہ میری محبت  
میں شادی سے انکار کر رہی ہے۔ مگر پھر وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ میں

اسی سے کمزور ہو گئی۔

میں۔ بجھم تم فصولِ سرِ نکرت سے خفا ہو۔ شادی ہمیشہ فریقین  
پر مبنی سے ہوتی چاہئے۔ وہ حتی بجانب ہیں کہ جس کو وہ پسند کریں

وے سے شادی ہونا چاہئے۔

میں۔ اگر نکرت کو مجھ سے فدا ہی ہی محبت ہے تو میرا کہنا ہرگز  
میں۔ انہیں تم سے شادی کرنا پڑے گی۔

میں۔ تو وہ راضی ہو جائیں تب ہی میں رضامند نہیں۔ بجھم  
کی بات کو دیکھ کر کسی بات کا احساس ہی نہیں۔ میں ہرگز کس

سے شادی نہیں کر سکتی جو مجھ سے محبت نہ کرتا ہو۔  
بجھم۔ کلا! مجھے خود قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔

میں۔ کہہ گئی کہ فواب صاحب ہے۔ کلا کو رضامند کرنا میرا  
کام ہے۔

میں۔ بجھم! کیوں ضد کرتی ہو۔ سرِ نکرت نے مذہب بدل لیا  
میں۔ اب کلا! اب کسی حالت میں انہیں اپنے میں شامل

کرنا کرنا۔  
میں۔ مذہب تو انہوں نے مٹا دیا۔

میں۔ بات کا کٹ کر بجھم اور دے کچھ کہیں ایک قصود  
میں۔ مگر میں بھی بدگلی نہ کروں۔ میں ان دونوں میں نہیں

کسی کو پسند کرتی ہوں۔ میں نے ساری عمری تجھ کے بعد  
کے لئے رکھی ہے۔

ایک دن پڑے پڑے مجھے اپنی اور بھئی کی وہ گفتگو یاد آئی جو مجھ کی محبت کی داستان شننے کے بعد ہوئی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ زبان سے کہنا اور بات ہے اور کر دکھانا اور چہرہ میں لے سوجا کہ اگر اسی طرح کراہتی رہی تو بیماری مجھے کسی کام کا نہ چھوڑے گی۔ ساری زندگی دوسروں کی غلامی کی حالت میں رہی ہوگی۔ اگر محبت میں ناکام رہی، بیوی اور ماں کی حیثیت سے جیسا کہ میں کوئی کام نہ کر سکی تو کیا ضرور ہے کہ کسی اور کام کی بھی نہ رہوں سوچتے سوچتے میرے ذہن میں یہ آیا کہ ملک کی خدمت سب سے مناسب بات ہے۔ اس سے میرا دل بھی بہل جائیگا اور میں میں کوئی مفید کام بھی کر سکوں گی۔ اس فیصلے کے بعد جتنے دن میں نے ہسپتال میں گزارے اپنی صحت کو بحال کرنے کی اپنی کوشش کی۔ قسے کے خیال کو دل سے دور کرتی۔ اور ہندوستان کے حالات اخباروں میں پڑھا کرتی۔

مہینہ مہینہ میں گھر آگئی۔ اگلے مہینے شادی اور بھائی کی شادی ہوئی۔ سب سے شادی کے ذریعہ کوٹھڑی کی میں شادی پر رہی ہو جاؤں مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ اب میں غلامی زندگی بسر کر چکے قابل نہیں رہی، میں نے ملک کی خدمت کیلئے زندگی وقف کر رکھی ہے۔ بھائی کی شادی کے اگلے دن میں نے بھائی کے دوست کے دفتر میں جا کر وائسٹروں میں اپنا نام درج کروا کر دیا۔

صالحہ عابد حسین کی

کسی نئی یاد (بسلہ مؤثر)

سبھی دیئے گئے وہ اسٹیشن پر مجھے اتارنا تھا۔ میں بستر لیٹے لگا۔ وہ دونوں اپنے آپ میں گھنٹے۔ بات کی بات میں اسٹیشن پر آئے۔ میں اتارنے لگا تو لڑکے نے مزاحاً پوچھا: (فرمانے صاحب آپ نے بھی تو ہماری باتیں سنیں۔ کون جیتا؟ میں یا یہ امیں؟) میں نے ہنس کر جواب دیا۔ جیت رہا ہے کہ دونوں جانب بہت کچھ کہا جاسکتا ہے: اس پر لڑنے پڑنے ہوئے کہا۔ فکر ہے آپ نے بات کوئی۔ وہ آپ کو سارے راستے کھرت باندھے بیٹھے رہے۔ امیں نے کہا۔ جی نہیں، آپ کے ساتھ خوشی کی نماز بھی پڑھتا رہا!! اس پر لڑنے لگا۔ اتنے میں گاڑے بیٹھے بھائی۔ ریل نے بھی سیٹی دی اور سچ کے فو میں ہٹائی ہوئی ریل چلی۔ اور بات کی بات میں نظروں سے اٹھل ہو گئی۔ وہ دن آج کا دن۔ اب بھی جب بھی ان ہنسے ہوؤں کی یاد آجاتی ہے تو زندگی کی خوشیاں جاگ جاتی ہیں۔ جیسے ایک خط کو ہندی کے کنارے پھول یاد آجاتے تھے تو دن کے ساتھ اس کا من بھی ہستا۔ ہنستا اور جھومنا تھا!!

سید وزیر حسن کی

اس بھرت کی دوائی گھر اور ملین نے میری صحت پر بہت دوا ڈال دی۔ چار ماہ بچتے رہے کہ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں مگر در کچھ پیار ہو۔ مگر میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ بالکل ٹھیک نہ کریں میں طبی مشورہ مست ہوں۔ یہاں تک کہ ایک دن مجھے تیز بخار آگیا۔ جفتوں مجھے ہوش نہیں آیا۔ نہ معلوم کیا گذری۔ جب ہوش آیا تو اپنے کو لاہور کے سب سے بڑے ہسپتال میں پایا۔ ماسی جی، پتاجی پرکاش، مشائی اور چاسب لوگ موجود تھے۔ چھ مہینے میں ہسپتال میں رہی شادی سے معلوم ہوا کہ کسی قسم کے دوائی، بخار کا دین شکار ہو گئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بیہوشی میں میں خوب ہڈیاں جھٹی تھی۔ جس سے صاب کو دے کا حال معلوم ہو گیا۔ یہ بھی سنا کہ فاب صاحب جید آباد چلے گئے ہیں۔ ان کے جانے سے پہلے کئی دفعہ ہمارے ہاں آئی۔ اور میرا ہاتھ پوچھا۔ مگر شادی نے معافی مانگ لی کہ دفعہ کرتی ہے۔ میں بتانے سے مجبور ہوں۔ جید آباد جا کر فکر کی بجائے اور نور جہاں کی شادی سے شادی ہو گئی۔

یہ خبر سنا کہ اب معلوم ہوا کہ کسی نے بڑے زور سے میرے دل پر دھما مارا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل کے کسی گوشہ میں اب تک امید کی کوئی کرن باقی تھی۔ آج وہ بھی غائب ہو گئی۔ اب میں بالکل تاریکی میں تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بھری قہمی یا اشارہ؟ مگر اس کا جواب ٹھیک ٹھیک میری سمجھ میں نہیں آتا۔





چند برس (۵) ڈاکٹر میگو (۶) پنٹ جہا لال جرو۔ اردو میں پہلی کتاب کی بہت کم ہے۔ انگریزی میں بہت شہرت کی کتاب کی ہے جو کہ انگریزی میں واقعہ حیات کے مطالعے میں جب طرح خود کو کما حقہ حاصل ہے کہ اس شخص نے کس حالت میں کس طرح ترقی کی۔ انگریزی کی بہت سے نظم کا ایک بند ہے:-

سب بڑے آدمیوں کی زندگیاں ایسے ہی اودھانی میں گزرتی ہیں۔  
ہم بھی اپنی زندگی کو عظیم الشان بنا سکتے ہیں۔  
اوجہ ہم یہاں سے کوچ کریں تو  
وقت کی ریت ہر آنے پر ہمیں قدم چھوڑ جائیں۔  
بڑے آدمیوں کے واقعات ہمیں درسِ بصیرت دیتے ہیں۔

میں اور اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہم ہندوستانیوں کیلئے شکوہ  
ہند کی بیوروگرافیز زیادہ مفید مانتا ہوں گی۔ اس اعتبار پر بوشا چین  
صاحب کی ویسٹف ایک قابل قدر چیز ہے۔ ہمیں معلوم کر کے مسرت  
ہوئی کہ شاہرہ ہند کی دوسری جلد ہی محقریب شائع ہونے والی ہے۔  
جس میں چھ اور شاہرہ (۱) اور اس (۲) سے (۳) سترہویں (۴) شاہرہ  
(۵) محمد علی جناح اور (۶) مہاتما گاندھی کے مشہور واقعات و حالات  
کا نام درج ہوا ہے۔ شاہرہ ہند کی ضخامت ۳۲ صفحات  
اور قیمت انگوڑی ہے۔ کتاب جلد ہے۔ شیخ عبدالقادر علی صاحب  
پارمینار جلد کاروبار کوں سے طلب کیجئے۔

[illegible]

مذہب پر مبنی دوائے کے خیال کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ اس کو ہمیں معقولہ میں "ادب لطیف" کہہ سکتے ہیں۔ کتاب مجاہد سے صفحات ۱۵۰-۱۵۱ صفحہ ۱۔ ایک روپیہ میں الطیف الدین احمد صاحب، من و نول، لاہور سے نکلی جا سکتی ہے۔

معائنہ عمرانی فرانسیسی انقلاب کے روحانی باپ روسو کی مشہور کتاب جو اکثر محرمین خاں صاحب الہم نے پڑھی۔ یہ بڑی نئی عالم فہم و فہم تبارت میں لکھا ہے۔ یہ ترجمہ مکتبہ جامعہ دہلی نے بھی دیرینہ روایات کے مطابق بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے۔ ایک بہت مشہور قول ہے کہ انسان پیدا تو آزاد و ہوا ہے مگر بعد و دیگر تجربوں میں جلا نظر آتا ہے۔ یہ قول روسو کا ہے اور اسی سے معاہدہ عمرانی کی ابتدا ہوئی ہے۔ روسو کو آدمی اور مردادت کا علم و ارتقا پہنچنے سے اس کے مزاج میں سماج کی ناہمواری اور نظام حکومت کے خلاف جذبہ بغاوت و محرز تھا۔ اسکی پماتوینٹ زندگی اخلاقی اعتبار سے بہت بلی تھی مگر اس کا ذہن واریگی جاشی نظام کو قرار دینا نہ تھا۔ معاہدہ عمرانی کے بارے میں مترجم کا بیان ہے کہ "روسو کے تمام سیاسی خیالات انہیں کو کامل پہنچنے کے ساتھ موجود ہیں۔ اس تصنیف میں روسو کے نظریوں کی اس اس قانونی فطرت ہے۔ اور روسو شروع سے آخر تک اس حقیقت پر نہایت سختی کے ساتھ مصر کے مطابق کوئی (قانون) نہیں کہا جاسکتا۔ قدرت کا ہر استعمال صرف اس صورت میں جائز نہیں کہ جسے جب وہ ارادہ اجتماعی اور قوم کی مرضی کے مطابق ہو۔ ارادہ اجتماعی سے فرد کسی خاص وقت میں تمام افراد کے ارادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ارادہ فرد ہے جس پر مسئلہ بعد تسلیم قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں روسو کی تصنیف انقلابیوں کی انجیل تھی۔" اسی ایک فقرے سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کر کے اردو پڑھنے والوں کی ایک نہایت اہم خدمت انجام دی ہے۔ کتاب جلد ہے۔ قیمت دو روپے۔

مشاعر میرزا محمد علی مدنی کے (نواب احمد علی) کے کتاب گزشتہ  
 میں ملاحظہ ہو گئی۔ شائع ہو کر مقبولیت خاص حاصل کر چکا ہے۔  
 اس وقت ہمارے نظر ان کی تازہ ترین تصنیف "مشاعر میرزا محمد علی"  
 کے نام سے اس کتاب میں آئے ہیں۔ ہندوستان کے مشاعرہ گوشتہ  
 کے ان تمام شاعروں کی فہرست (۲۱) سہولت پس



کی ذات اور ان کے کمالات سے آشنا نہیں ان مضامین سے مکمل طور پر متفق ہو سکتا۔ امید ہے کہ ناشرین اچھے اڈیشن میں اس خیال نگہیں گے۔ پھر بھی رشید صاحب کے شہدائیوں کیلئے یہ مجموعہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ لکھائی پھیلائی دیدارِ زیب۔ مضبوط جلد قیمت دو روپے۔ طے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ۔ قریل باغ دہلی۔

چودھری جے کرشن صاحب اہم۔ اے۔ کالی داس  
کتاب کے ذریعہ مسکرت کے غیر فانی شاعرِ عظیم کالی داس کو اردو دنیا میں نہایت اہمگی سے روشناس کر رہا ہے۔ یہ کتاب میں مولیٰ پرست مل ہے۔ پہلے حصہ میں کالی داس کے حالات زندگی درج ہیں۔ دوسرے میں اس کی شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے اور تیسرے میں اس کے مشہور ڈراموں اور نغموں کو کہانی کی شکل میں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور چار بجے ترجمہ صبح کے گئے ہیں۔ جہاں تک کالی داس کی شاعری اور اس کے کمالات کا تعلق ہے مصنف نے نہایت عمدہ اور فزول پیرائے میں تبصرہ کیا ہے۔ لیکن سوانحی حالات میں بعض اختلافِ امور کی بابت مصنف نے اپنی رائے بغیر کسی سند کے پیش کر دی ہے۔ ضروری تھا کہ وضاحت سے ان امور یا کتابوں کے حوالوں کا ذکر کیا جاتا جن سے مصنف نے اپنا مخصوص نتیجہ مرتب کیا۔ ان باتوں سے قطع نظر بلاشبہ اردو میں کالی داس کے حالات زندگی اور اس کی شاعری پر اس سے پہلے کوئی منظم و کامیاب تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ چودھری صاحب کی یہ کتاب اردو ادبیات میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔ ضخامت ۴۴ صفحات مضبوط جلد۔ کتابت و طباعت اوسط درجے کی۔ قیمت ۷۔ طے کا پتہ۔ چودھری جے کرشن صاحب اہم ٹرائے وکیل ایبٹ آباد۔

ہمایوں شاہ شہنشاہِ ہمایوں کی بیٹی محمد بنیم نے اپنی بیوی کے واقعات قاری میں "ہمایوں نامہ" کے نام سے لکھے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ شہید ابن من صاحب شازی دہلوی نے کیا ہے۔ بی۔ بی۔ ٹریڈ کاوش سے کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اور بھی چند مستند قلم نویس نظر رکھی ہیں تاکہ جہاں کہیں تشریح و توضیح کی ضرورت پڑے اس کا مدد سے حاشی میں کر دی جائے۔ ترجمہ کی دقتیں وہی حضرت

اردو میں یہ کتاب لکھی گئی تھی پہلی تصنیف ہے جس میں بیٹی قدون کے ارتقائی منازل سے لیکر عہدِ حاضر تک کی معلومات خوش اسلوبی و بیان کی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی شخص یون اور جنوبی ہند کے مختلف شعبہ جات سے قطعی بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ طباعت و کتابت کو اعتبار سے بھی یہ کتاب بے نظیر ہے جس سے ناشرین کی خوش مندی اور امید ہے۔ ضخامت ۲۴۸ صفحے۔ قیمت ۷۔ طے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

منشی پتہ چند آنجنائی کے تیرہ پاکیزہ اشعار کے مجموعہ "اردا" کا نام ہے جو مکتبہ جامعہ کی طرف سے حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ منشی پرچم چند کا نام نامی اردو دنیا میں شائع کا حراج نہیں۔ مرحوم نے جس روشنی خاص سے فنِ انشا نویسی کی داد دی وہ ستائش و توصیف سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مژدہ انداز بیان، وہ شیرینی اور وہ لطافت اور وہ بیہل قوتِ شاعرانہ جس سے ان کا معمولی سے معمولی انشا مالا مال ہوتا ہے، دوسری نشانہ زبوں کے انشا اس کی عالی نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے جادو نگار قلم نے انسان کو کسی کو معراج پر پہنچا دیا۔ زیرِ نظر مجموعہ میں سب کے سب انشائے ان کے اسٹائل کے بہترین نمونے ہیں۔ ہر ایک میں ان کے طرزِ تحریر کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کسی بے توصیف یہ کہ جو کچھ کے اور ایک اور نہایت عمدہ انشائے اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے مثلاً "دو بیٹیں" "کھن" وغیرہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات طباعت کتابت اعلیٰ۔ قیمت ۷۔ طے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی باغ دہلی۔

مضامین رشید  
بروفیسر رشید احمد صدیقی کے اٹھارہ مضامین کا مجموعہ مضامین کا مجموعہ جو مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی بلاشبہ اردو کے بہترین مزاح و طنز نگار ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے موصوف کے مضامین کا مجموعہ شائع کر کے شہین آردو ادب پر احسان کیا ہے۔ لیکن مضامین کا انتخاب درست نہیں ہے۔ بعض ایسے مضامین ان کی حیثیت ہنگامی و وقتی تھے۔ دیکھ کر گئے گئے۔ مثلاً "ارہر کایت" "کارا دل" "ہواست" "کچا کچو" وغیرہ۔ دوسری بھی ایسی ہیں جو بے فائدہ نظر آتی ہیں۔ یہ کہ بروفیسر رشید احمد صدیقی کے طرزِ تحریر اور ان کے مضامین کے رنگ و بھونچاؤ کو بوجھ کر اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا تاکہ ناظرین جو بروفیسر موصوف



